
بیسویں صدی
BiswinSadi



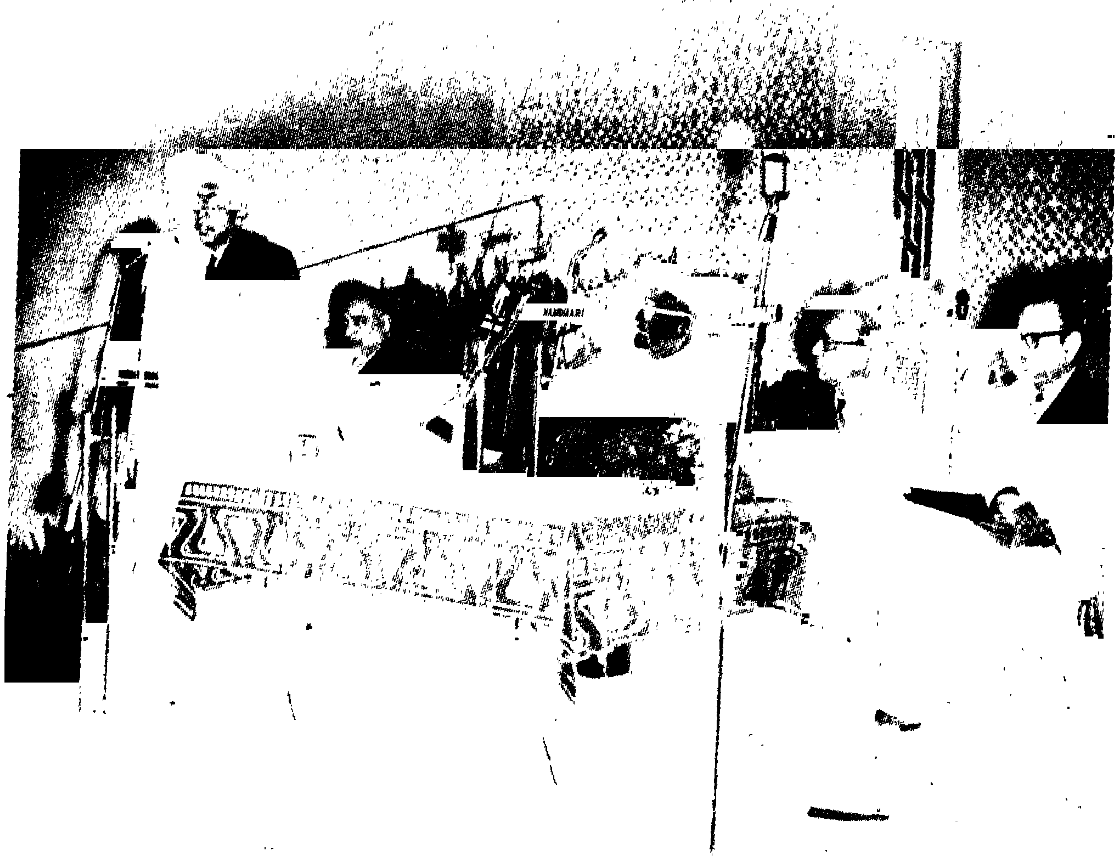
شاخ پر بھی نہیں رہ سکتا گلاب

دستِ رنگیں میں ہے جتنا شاداب ——— بسمل سعیدی

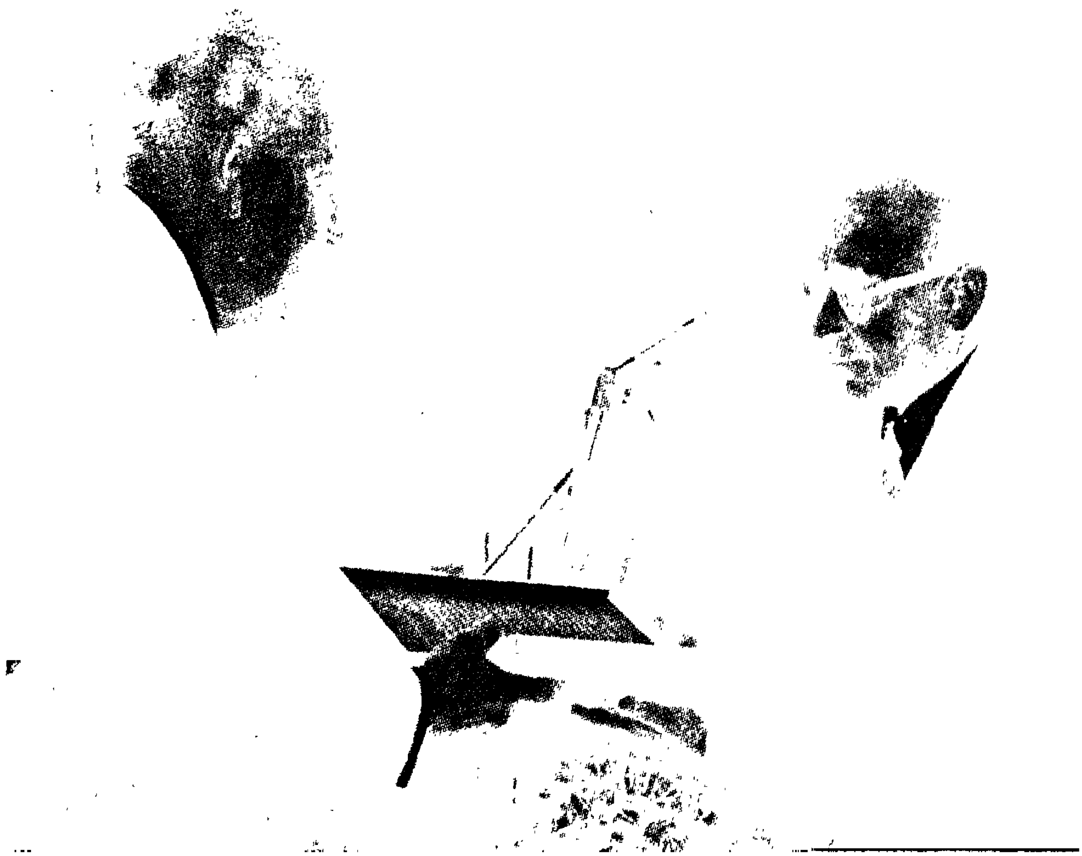
فوٹو:۔ روشن لال وشِشٹ جے پور



گذشتہ دنوں بمبئی کے بعد دِلّی میں بھی جشنِ کرشن چندر بہت دھوم دھام سے منایا گیا۔ بمبئی میں وزیرِ اعظم شریمتی اِندرا گاندھی [illegible] نفیس شریک ہوئیں اور دِلّی میں فضیلت مآب جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صدرِ جمہوریۂ ہند نے جشنِ کرشن چندر کا افتتاح فرماتے ہوئے [illegible] روپے کا چیک اہلِ دِلّی کی طرف سے اپنے دستِ مبارک سے کرشن چندر جی کو پیش کیا ـــــــ ایشیا بھر میں کرشن جی اُردو کے سب سے نامور، مایہ ناز اور مقبول ادیب ہیں۔ ہندوستان کے کسی ادیب کو اتنی قابلِ رشک اور عالمگیر شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ ایک دُنیا اُن کے فکر و فن کی مدّاح اور معترف ہے ہندوستانی زبانوں کے علاوہ دُنیا کی اکثر بڑی زبانوں روسی، جرمن، انگریزی، فرنچ، اُزبک، تفقازی، تبریزی وغیرہ میں اِن کی کتابیں چھپ کر مقبولِ عوام و خواص ہو چکی ہیں ـــــــ یورپ اور ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں میں کرشن چندر کے ادب پر تحقیقی [illegible] لکھ کر بہت سے طالب علم پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لے چکے ہیں ـــــــ یومِ جمہوریت کے موقع پر صدر جمہوریۂ ہند نے کرشن جی کو پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا ہے جو اِن کے رُتبہ کے مطابق بہت معمولی ہے اور جس سے حقیقتاً اِس خطاب کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے



جناب اِندر کمار گجرال وزیرِ رسل و رسائل نے جشنِ کرشن چندر کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں کرشن چندر جی کے ایک قدیمی نیاز مند کی حیثیت میں اُن کا ایک پُرانا مدّاح اور معتقد ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے اِس وقت وہ سارے نقشے گھوم رہے ہیں جب ہم سب لاہور میں کالج کے طالب علم تھے اور کرشن جی کے ساتھ شانہ بشانہ چل کر، تیز گامی سے مُلک کو آگے بڑھا کر، سامراج شاہی کو ختم کرنے کا بیڑا اُٹھائے ہوئے تھے"۔ جناب وی شنکر۔ آئی۔سی۔ایس سابق سکریٹری وزارتِ دفاع نے فرمایا کہ "جناب کرشن چندر کی مقبولیت اور شہرتِ عام بقائے دوام کی مُستحق ہے۔ اِن کے پرستاروں نے اظہارِ عقیدت کے لئے بمبئی میں جشنِ کرشن چندر منایا۔ حالانکہ اُردو ادب کی تاریخ کے لحاظ سے دِلّی کو پہل کرنی چاہئے تھی۔ دِلّی کے گہوارے میں اُردو نے تربیت پائی، پروان چڑھی۔ دِلّی کی گلیوں میں اِس کا بول بالا ہوا اور دِلّی والوں نے اِس کے گیسو سنوارے ہیں۔ لیکن اب دِلّی اپنے وطن ہی میں بے وطن ہو گئی تو بمبئی کی تقلید کرنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا"۔



روسی سفیر Mr: PEGOV پیگوہ نے روسی عوام کی طرف سے اعتراف نامہ پیش کرتے ہوئے کرشن جی کی پیشانی پر بوسہ دیتے ۓ کہا کہ "ہمارے دوست کرشن چندر ہمارے مُلک میں نہ صرف مشہور ہیں بلکہ ایک عظیم ادیب اور اعلیٰ پایہ کے کہانی کار اور ایک مُخلص وست کی حیثیت سے روسی عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ میں اپنے مُلک کی طرف سے اور سوویت یونین کے اُن سب لوگوں کی لرف سے مُبارکباد پیش کرنے آیا ہوں جو آپ کی کہانیاں، ناول اور افسانے نہ صرف سوویت یونین کی بہت سی زبانوں میں پڑھتے ہیں بلکہ پ کی اُردو زبان میں بھی پڑھتے ہیں۔ ٹیگور کے بعد کرشن چندر واحد ہندوستانی ادیب ہیں جو روسی عوام میں سب سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہیں" ـــــ اُردو کے نامور شاعر و ممبر پارلیمنٹ جناب آنند نارائن مُلّا نے کرشن جی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "کرشن چندر اُردو کی دین ہیں۔ اگر اُردو زبان نہ ہوتی تو کرشن چندر کبھی نہ ہوتے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مُلک میں اور بھی کرشن چندر پیدا ہوں اور جو راستہ کرشن جی نے ہمیں دِکھایا ہے اُس پر چل کر ہم آگے بڑھیں تو ہمیں کرشن چندر کی اُردو زبان کو زندہ رکھنا ہوگا"۔



بمبئی اور دِلّی نے بصد ادب و احترام کرشن چندر جی کی راہ میں آنکھیں بچھادیں اور اُن کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک دوسرے سے آگے بڑھ گئے ــــــ یہ امر موجبِ مُسرّت ہے کہ ہندوستان کے دوسرے مقامات لکھنؤ، ناگپور، پونا، بنگلور، حیدرآباد اور پنجاب میں بھی کرشن جی کے اعزاز میں عظیم الشان جلسے ہورہے ہیں اور نہایت خلوص و محبّت سے جشنِ کرشن چندر منایا جارہا ہے۔

فوٹو میں دائیں سے بائیں جلوہ افروز ہیں۔ نامور ڈرامہ نگار جناب ریوتی سرن شرما جنرل سیکریٹری جشنِ کرشن چندر کمیٹی، جناب کرشن چندر، فضیلت مآب جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صدرِ جمہوریۂ ہند، جناب اِندر کمار گجرال وزیرِ رسل و رسائل چیرمین جشنِ کرشن چندر کمیٹی، جناب وی۔ شنکر آئی۔ سی۔ ایس سابق سیکریٹری وزارتِ دفاع کنوینر جشنِ کرشن چندر کمیٹی ۔

بیسویں صدی

ٹیلیفون دفتر ——— ۲۷۱۹۲۷
ٹیلیفون رہائش ——— ۶۱۹۹۲۷



تیر و نشتر

خوشتر گرامی

• "بھوک اور افلاس کا خاتمہ کرو" اندرا گاندھی ـــــــ اور اِس کے لئے جنتا اپنے پیٹ پر پتھّر باندھے۔

• "چناؤ کے دوران جمہوری اصولوں پر سختی سے عمل کیا جائے گا" ایک عنوان ـــــــ یعنی لاٹھی ڈنڈے، اینٹ پتھّر، چھُرا چاقو سب کو شہری آزادی حاصل ہوگی۔

• "مرار جی ڈیسائی پر آوازے کسے گئے" ایک خبر ـــــــ اور ایسے بیکار رہے جیسے چکنے گھڑے پر بوند پڑے اور ڈھلک جائے۔

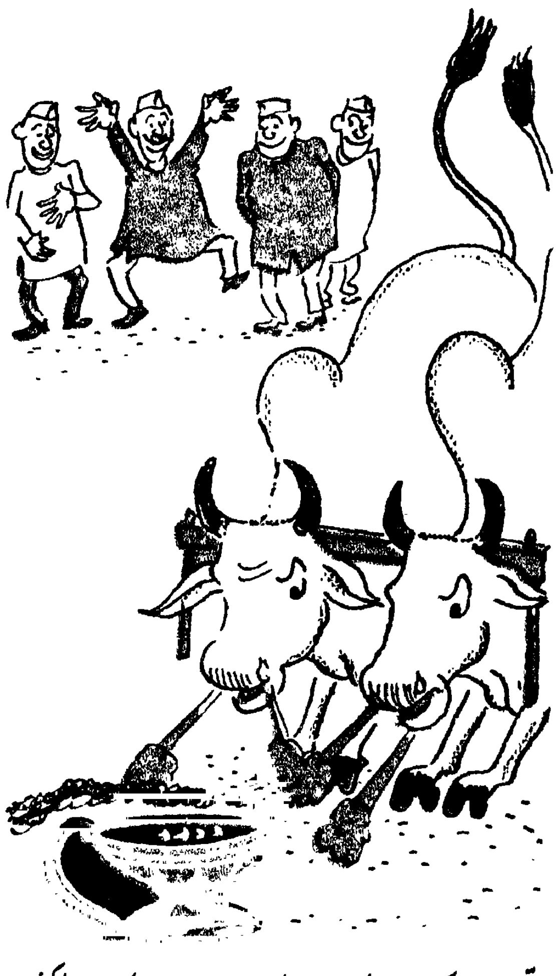
• "امتحان ملتوی نہ کرنے پر طلباء کے مظاہرے۔ پولیس کے ساتھ تصادم" ایک خبر ـــــــ امتحان دے کر کیا کرنا ہے۔ غنڈہ گردی کی سند کافی ہے۔

• "میوات میں سوکھے سے کسانوں میں بے چینی" ایک خبر ـــــــ رلیف کے نام پر کھانے کمانے اور لیڈری کرنے والوں کو خوشخبری۔

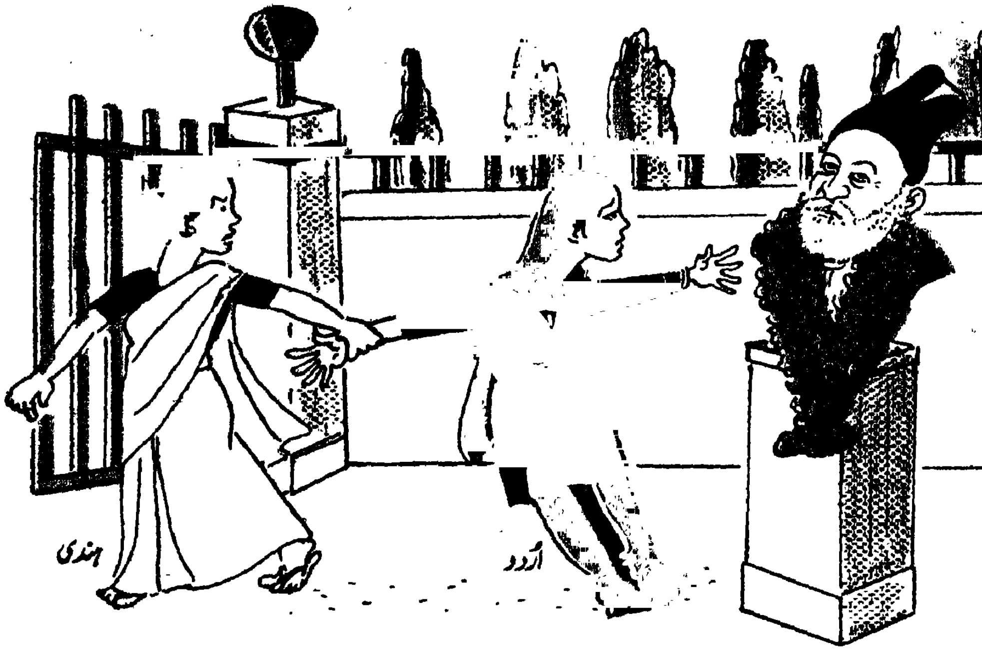
• "... باپو کی سمادھی پر بھوک ہڑتال کریں گے" ایک خبر ـــــــ یعنی باپو کے چرنوں میں ڈھونگ رچائیں گے۔

• "اپوزیشن پارٹیوں کے پاس دیش کی ترقّی کا کوئی پروگرام نہیں" مرارجی ڈیسائی ـــــــ اور وہ آپ کی جیب میں ہے۔ بجٹ سیشن آرہا ہے، معلوم ہو جائے گا۔

• "لنکا والے گاندھی جی کے آدرشوں پر عمل کرنے کو تیار" جے پرکاش نارائن ـــــــ اور ہندوستان والے عمل کی بجائے ہر وقت بھاشن کو تیار۔



دِلّی کے حلقہ لال دروازہ کا الیکشن۔



اُردو شاعر مرزا غالبؔ کی عزّت افزائی اور اُن کی زبان اُردو کو دیس نکالا۔

"کانگرس جب انگریزوں سے لڑ رہی تھی جن سنگھی انگریز کی مونچھ کا بال بنے ہوئے تھی"۔ اِندرا گاندھی کی تقریر ——— اور آج وہ انکل سام کی داڑھی کا بال بنے ہوئے ہیں۔

"بھارت کو بیرونی اور اندرونی خطرے" گورو گول والکر کی تقریر ——— بیرونی سے تو سرکار نبٹ لیتی ہے۔ آپ جیسے اندرونی خطروں سے چشم پوشی کرتے ہیں۔

"الیکشن میں بہت سی نئی سیاسی پارٹیاں میدان میں" ایک خبر ——— اللہ کرے زورِ سیاست اور زیادہ !

"ہندوستان کی ترقی کسی بھی مُلک کے لئے باعثِ فخر ہے" شہنشاہِ ایران ——— چین اِس سے مستثنٰی ہے یہی تو اُس کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔

"کانگرس کے علاوہ کوئی دوسری جماعت مُلکی نظام نہیں چلا سکتی" ایک عنوان ——— مگر کانگرس بھی اندرا کی، مرارجی کی نہیں۔

"جب صدر نکسن حلف لینے وہائٹ ہاؤس جا رہے تھے تو لوگوں نے اُن کے اوپر پتھراؤ کیا" ——— یعنی سر مُنڈاتے ہی اولے پڑے۔

"کانگرس ایک ڈُوبتا ہوا جہاز ہے" بلراج مدھوک ——— اور جن سنگھ افیون کی ٹِکیا۔

"کیرتن میں لاؤڈ اسپیکر چلتا رہا اور چور تالے توڑتے رہے" ایک خبر ——— یعنی ایک پنتھ دو کاج۔

"چناؤ میں ایک دوسرے پر کیچڑ نہ اُچھالیں گے۔ الہ آباد میں لیڈروں میں سمجھوتہ" ——— تو پھر میچ ڈرا رہے گا۔

بیسویں صدی دہلی مارچ ۱۹۶۹ء



جن سنگھ اکالی گٹھ جوڑ

• نوجوانوں کو بھوک اور افلاس کے خلاف جہاد کرنا چاہئے" ــــ اندرا گاندھی ــــ ابھی تو یونیورسٹیوں اور امتحانوں کے خلاف جہاد جاری ہے۔

• روس خلائی مہم میں امریکہ سے آگے" جانسن کا اعتراف ــــ

حیا دور وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے

• راجہ جی ماڈرن چکرورتی ہیں" ایک عنوان ــــ مکمل نہیں۔ ابھی ٹیڈی کوٹ پتلون کی کسر باقی ہے۔

• چین سے مصالحت ایک خواب" ایک عنوان ــــ آنکھ کھلی تو نیفا اور لداخ کے علاقوں پر چین کا قبضہ تھا۔

• صدر نکسن کی طرف سے دُنیا بھر کو حصولِ امن کے لئے تعاون کی اپیل" ــــ اور امریکہ بذاتِ خود اس سے مستثنیٰ ہے۔ اِس لئے کہ وہ "نئی دُنیا" میں ہے۔

• کٹھمنڈو میں طلباء نے وزیرِ خزانہ کی کار جلا دی" ایک خبر ــــ خزانہ سلامت رہے کاریں بہت۔

• گاندھی جی بھی مُسلم کلچر کو بدیشی مانتے تھے" گورو گول والکر ــــ مثل مشہور ہے ؎

اندھے کو اندھیرے میں بڑی دُور کی سُوجھی

• قومی اتحاد کا بہترین طریقہ دوسروں کی زبان سیکھنا ہے" ایک عنوان ــــ بشرطیکہ وہ زبان اُردو نہ ہو۔

• چین میں ہر مسئلے کا حل چیرمین ماؤ سی تنگ" ایک عنوان ــــ یعنی ہر مرض کی دوا ہے ماؤ سی تنگ۔



سکھ ہوم لینڈ۔ علیحدہ تلنگانہ اور خود مختار تامل ناڈ کی تحریکیں۔

"آزادی کے بعد" ایک عنوان ——

۱۔ امیر زیادہ امیر، غریب زیادہ غریب ہوگئے۔
۲۔ دو منزلہ مکان ہفت منزلہ ہوگئے۔
۳۔ بلیک کرنے والوں کے وارے نیارے ہوگئے۔
۴۔ سمگلروں کا دن عید، رات شب برات ہوگئی۔
۵۔ وزارتیں، سفارتیں اور گورنریاں مل گئیں۔

"جن سنگھ ہی کانگرس کو ختم کر سکتا ہے" باجپئی کا بیان ——
جی نہیں۔ تاوقتیکہ کانگرس کے اندر کے جن سنگھی مدد نہ کریں۔

"کانپور میں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کے بھی اشتہارات" ایک خبر
—— ووٹ جو لینے تھے۔

"قیدی کا قیدی پر چاقو سے حملہ" ایک خبر —— جیل خانہ کا نقصان۔

"پنجاب میں ہندی کی رکھشا کے لئے" ایک عنوان ——
جن سنگھیوں نے الیکشن جیتا تھا۔ پھر اکالیوں سے گٹھ جوڑ کرلیا اور چند کرسیوں کے لئے بک گئے۔

"اسکولوں میں دھارمک تعلیم ضروری" ایک عنوان —— مگر دھرم کے ٹھیکیداروں کے ذریعہ نہیں۔

"چین نے اندراجی کی پیشکش ٹھکرادی" ایک خبر —— ماؤ ٹولے کے سیاہ کارناموں میں ایک اور کا اضافہ۔

"لب سڑک شراب پینے پر چار گرفتار" —— اپنی صفائی میں یہ بیان دیجئے ؎

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشم یار کی شہ پاسکے پی گیا

• "اُردو ڈیمین میں نہ تیرہ میں" ایک عنوان ——— کہنے اور دِکھانے کے لئے چودہ (زبانوں) میں سے۔

• "کامراج کو بھی ڈپٹی پرائم منسٹر بنایا جائے" ایک خبر ——— نہیں۔ بلکہ ہر منسٹر کا درجہ ڈپٹی پرائم منسٹر کا بنا دیا جائے۔

ایک عنوان :-

"ڈھاکہ، راولپنڈی اور پشاور میں طلباء کے مشتعل ہجوم نے پولیس پر حملہ کر دیا"

دوسرا عنوان :-

"تلنگانہ ایجی ٹیشن کئی اضلاع میں پھیل گئی۔ ایک ریلوے اسٹیشن پر طلباء کا حملہ"

یعنی ؎

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

• "لندن میں کالے آدمی مظاہرہ کریں گے" ایک خبر ——— ولسن کی گوری سرکار کے خلاف۔

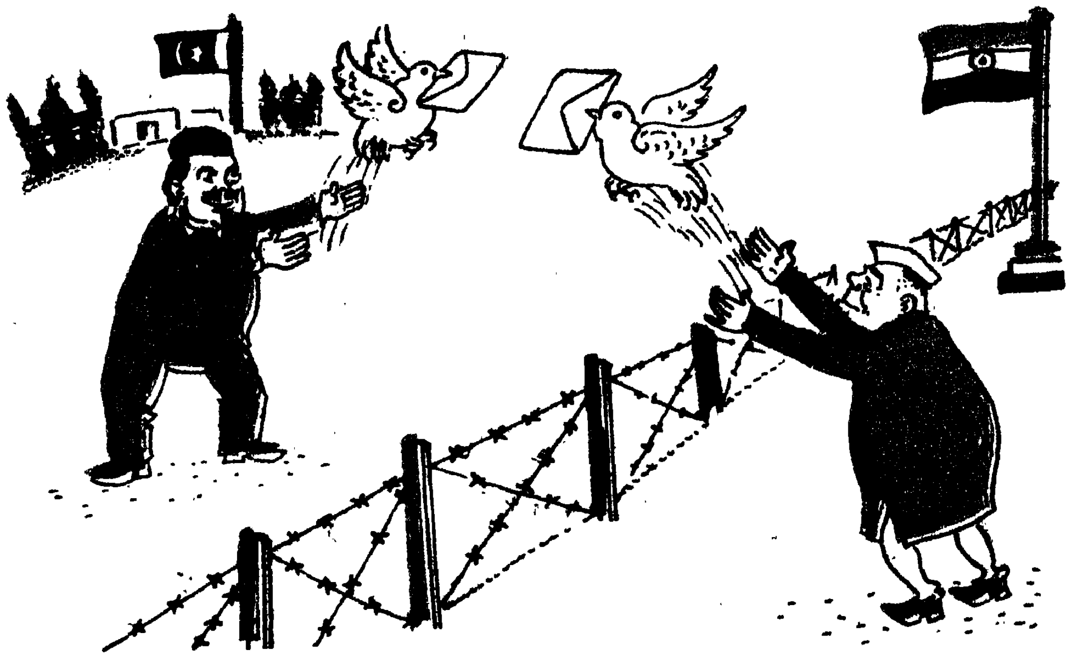
• "جن سنگھ ہر گھر کو تقسیم کردے گا" اِندرا گاندھی ——— یعنی ہر گھر میں ایک نیا پاکستان بنا دے گا۔

• "حکیم لٹ گیا" ایک خبر ——— سو دن میں ایک دن مریض تو روزانہ ہی لٹتے ہیں۔

• "موگا میں بازاری مجنوں کی پٹائی" ایک خبر ——— ؎

اِس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

• "سونی پت سے برات بیرنگ واپس" ایک خبر ——— ڈیڈ لیٹر آفس میں بھیج دی ہوتی۔



ہند پاک تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے پیغامات کا تبادلہ۔

خوشترگرامی

چہرہ کیا آفتاب ہے۔ بڑھاپے میں بھی شباب ہے۔
رنگ میں وہ نکھار ہے۔ ہر طرف بہار ہی بہار ہے ——
ہرنی کی سی آنکھیں، لمبی ناک، کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، سر پر کلاہ
پاپاخ، چغہ اور مغلئی پاجامہ۔ ادائے خاص سے نکتہ سرا ——

اسد اللہ خاں غالب



مرزا نوشہ اور ہم سب کا چچا۔ قوم کا سلجوقی۔ عبداللہ بیگ کا لڑکا۔ افراسیاب شاہِ توراں کی اولاد۔ آگرے میں پیدا ہوا۔ "دِلّی میں حکمِ دوامِ حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی (بیوی) پاؤں میں ڈال دی اور دِلّی کو زنداں مقرر کیا اور اِس زنداں میں ڈال دیا گیا" —— پھر اِسی خاک میں خوشتر گرامی کے پڑوس نظام الدّین میں پیوندِ خاک ہو گیا —— ذوقؔ و مومنؔ کا ہمعصر۔ میرؔ کا معتقد اور بہادر شاہ ظفرؔ کا اُستاد۔ الفاظ و معانی کا بادشاہ۔ صاحبِ طرزِ اِنشاپرداز۔ شاعرِ بے مثال۔ زندگی ہی میں سب بلائیں تمام ہو گئی تھیں۔ ایک مرگِ ناگہانی کی پیشگوئی تھی۔ وہ بھی اب صد سالہ جشن کی صورت میں پوری ہونے والی ہے —— اُس نے کبھی ہستی کا فریب نہیں کھایا۔ عمر بھر تمام عالم کو حلقۂ دامِ خیال کیا مگر اُردو والے فریب کھا گئے۔ غالبؔ کے ڈھول پیٹے جا رہے ہیں اور صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے مگر غالبؔ کی اُردو زبان کو ختم کیا جا رہا ہے۔ لب پر غالبؔ کا نام ہے۔ دل میں غالبؔ کی زبان سے کپٹ ہے۔ اِک طرفہ تماشا ہے جسے دیکھ کر کہ

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب

بدلے ہوئے دِل

پروفیسر زکی انور ایم۔ اے

شعبۂ اُردو، کریم سٹی کالج۔ جمشید پور

میرے بھائی جان! تسلیم

آج کل دِل بدلنے کے آپریشن پر تجربات ہو رہے ہیں۔ سُنا ہے بعض آپریشن کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ غالباً اُنھیں تجربات کا ردِّ عمل ہے کہ میرے دو کرداروں نے بھی اپنے دِل بدل لئے ہیں اور وہ دونوں کردار بدلے ہوئے دِلوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ اِن کا فائنل ملاحظہ تو آپ ہی کریں گے ——— یہ افسانہ (بدلے ہوئے دِل) مجھے اُمید آپ "بیسویں صدی" کے قارئین کے لئے پسند کریں گے . . .

آپ کا اپنا ——— زکی انور

★

اپنے اسٹوڈیو میں تو یشپال آج کل رہتا ہی نہ تھا۔ وہ لائبریری میں بھی نہ تھا، ...نگ رُوم میں بھی نہیں اور اُس کُھلی چھت پر بھی نہیں، جہاں وہ اکثر گھنٹوں خاموش بیٹھا ...ہ ذہن میں کسی تصویر کے آوٹ لائنس سوچا کرتا تھا۔ وہ کہیں بھی تو نہ تھا!

دیپالی کا دل دھڑکنے لگا۔ جبکہ اپنے دل کے بارے میں اُس کا خیال تھا کہ ...وہ بہت ہی سخت ہے۔ اِس لئے کہ اُس کے سینے میں اب یشپال کا دل تھا! وہ کہا کرتے ...ن کے دل بدل گئے ہیں۔ یشپال کا پتھر کا بنا ہوا دل، جس نے کبھی کسی لڑکی سے یشپال ...یدھے مُنہ بات نہ کرنے دی، اب دیپالی کے سینے میں تھا اور دیپالی کا نرم و نازک دل ...پال کے سینے میں دھڑکتا رہتا تھا۔ پہلے کبھی یہ بات اُنھوں نے تفریحاً کہی ہوگی، لیکن ...روزانہ بدلے ہوئے دِلوں کا تذکرہ کرتے کرتے نفسیاتی طور پر وہ اپنے دل بدلے ہوئے ...محسوس کرنے لگے تھے!

لیکن یشپال کو گھر میں کہیں نہ پاکر بہرحال دیپالی کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ چاہے ...پتھر ہی کا کیوں نہ تھا۔

اِدھر کچھ دنوں سے یشپال کچھ ایسی ایسی مایوسانہ باتیں کرنے لگا تھا کہ دیپالی ...بہت گھبرا گئی کہ وہ کہاں چلا گیا۔ جبکہ وہ عام طور پر ہر وقت گھر ہی کے کسی نہ کسی حصّے ...میں رہتا تھا۔

وہ اُسے تلاش کرتی ہوئی باہر لان میں پہنچ گئی۔ جہاں تراشی ہوئی ہری ہری گھاس ایسی نظر آرہی تھی جیسے یہاں سے وہاں تک، سارے لان میں سبز مخمل بچھا ہوا ہو۔

اُسے اپنا بچپن یاد آگیا اور بے ساختہ اُس کا جی چاہا سارے لان میں لوٹتی پھرے۔ لیکن اُس کے ذہن میں اب تک یہی سوال قیامت برپا کر رہا تھا کہ یشپال گیا تو کہاں گیا؟ لان کی ہری ہری گھاس پر لوٹنے کی بات ذہن سے نکل گئی۔ لیکن جیسے کسی غیبی طاقت نے اُسے کچھ دیر تک مخمل جیسی گھاس پر بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔

اور وہ بہت بے تکلفی سے مخمل گھاس پر بیٹھ گئی۔ پھر وہ لیٹ گئی اور پھر وہ گُنگُنا اُٹھی۔

لیکن اُسی وقت اُسے پھر یاد آگیا کہ اُسے یشپال سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی تھی اور تب یہ فکر ایک بار پھر پہلے سے بھی زیادہ شدّ و مد کے ساتھ اُس کے ذہن میں اُچھل مچانے لگی کہ صبح سویرے یشپال کہاں چلا گیا، جبکہ اُس کے ملازم نے اُسے بتایا تھا کہ اُس نے ابھی صبح کی چائے تک نہیں پی تھی۔

اور ہرن کی آنکھوں سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت دیپالی کی آنکھیں نہایت ہی بے قراری سے سارے لان میں اُسے تلاش کرنے لگیں۔ لیکن جھولے خالی تھے، حوض پر کوئی نہ تھا اور لان میں پڑے ہوئے آہنی بنچ بھی خالی پڑے تھے۔

لیکن یکایک دیپالی کی نظریں مہندی کے ایک درخت سے اُلجھ کے رہ گئیں۔

یشپال مہندی کے اُس درخت کے نیچے بیٹھا کوئی تصویر بنا رہا تھا۔

دیپالی نے اطمینان کی طویل سانس لی۔ خوشی سے اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ سوچنے لگی وہ جو کچھ یشپال سے کہنے آئی تھی شاید اب اُسے وہ سب کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ کیونکہ وہ اِس کے علاوہ اور کچھ نہ کہنے آئی تھی کہ یشپال مصوّری کے اُس بین الاقوامی مقابلے میں ضرور حصّہ لے جس کا پہلا انعام ایک بہت بڑی رقم ہے، اِتنی بڑی رقم کہ یشپال کی دو تمنّائیں اُس رقم سے ضرور پُوری ہو سکتی ہیں ــــ ایک چھوٹا سا اپنا مکان، ایک چھوٹی سی کار۔ اُس کی ایک اور تمنّا تھی ــــ ایک چھوٹی سی بیوی! اور اُس کی تیسری تمنّا کی بات سوچتے ہوئے، ننھّی مُنّی سی، نرم و نازک کلی سی دیپالی جیسے اپنے آپ سے شرما اُٹھی اور اُس کا جی چاہا وہ دَوڑ کر لان سے بھاگ جائے۔

لیکن وہ بھاگی نہیں، اِتنی دُور ہی سے یشپال کا انہماک دیکھتی رہی، جس انہماک سے وہ تصویر بنا رہا تھا۔ کِتنا منہمک تھا وہ! جیسے اپنی تصویر کے رنگوں میں کھو کر رہ گیا تھا۔ اُسے گِرد و پیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ البتہ کبھی اُس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور کبھی دوسرا!

وہ ایک خاصا خوش حال مصوّر تھا اور وہ اِس بات کا رونا کبھی نہ روتا تھا کہ اُس کا مُلک ایک قلّاش مُلک ہے جہاں آرٹ کی قدر نہیں کی جاتی۔ یشپال کے آرٹ کی بیشک قدر کی جاتی تھی اور اپنے آرٹ ہی کی بدولت وہ بڑے اطمینان سے ڈھائی سَو روپے کرائے کے مکان میں رہ کر اپنے کُنبے کی پرورش کر رہا تھا۔

لیکن جب سے دیپالی اُس کی زندگی میں آئی تھی، اُس کا زیادہ تر وقت دیپالی کے ساتھ گُزرتا تھا اور بہت ہی جبر کے ساتھ وہ کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے اپنے اسٹوڈیو میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ مصوّری کے اُس عظیم الشّان مقابلے میں حصّہ لینے کے سلسلے میں اب تک بالکل ہی سنجیدہ نہ ہو سکا تھا جس میں شریک ہونے کی آخری تاریخ بہت نزدیک آ گئی تھی۔

دیپالی حد سے زیادہ ذہین اور دُور اندیش لڑکی تھی۔ اُس کی بَلا کی ذہانت نے ہی یشپال کو اُس کی طرف متوجّہ کر دیا تھا ورنہ وہ وہی یشپال تو تھا جسے اُس کے اکثر جان پہچان کے لوگ اور بہت سی لڑکیاں "اسٹون ہرٹڈ آرٹسٹ" یا پتّھر کا دل والا مصوّر کہا کرتی تھیں اور جس نے کبھی کسی حسین سے حسین لڑکی کو بھی کوئی لفٹ نہیں دی تھی۔ دوسری طرف دیپالی وہ خوش قسمت لڑکی تھی جس کے آگے یشپال نے دامن پسار کر، ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور رُندھی ہوئی آواز کے ساتھ محبت کی بھیک مانگی تھی اور جب دیپالی نے اُس کا دامن خوشیوں سے بھر دیا تو وہ ساری دُنیا کو بھول کر صرف اور صرف دیپالی ہی کو اپنی ساری کائنات سمجھنے لگا۔

اپنے محبوب سے پیار کی اِتنی بڑی دولت پا لینا اور محبت میں اِتنا اونچا مقام حاصل کر لینا ہر ایک لڑکی کے لئے بہت بڑی بات ہو سکتی ہے۔ لیکن دیپالی کے لئے ایک طرف یشپال کا اتھاہ پیار اُسے پاگل کئے دیتا تھا تو دوسری طرف وہ یشپال کے اُس پاگل پن کو ایک بیوی کی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور گھبرا رہی تھی کہ اگر یشپال کی وارفتگی کا یہی عالم رہا تو کل کیا ہوگا ــــ کل، جب وہ اُس کی بیوی ہوگی، کل جب وہ اُس سے اِتنی قریب ہو جائے گی کہ من و تُو کا فرق ختم ہو جائے گا؟

اور رات اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کل وہ صبح سویرے یشپال سے ملے گی بہت وقار کے ساتھ تحکمانہ انداز میں کہے گی کہ اب اُسے ایک منصوبے کے تحت باقاعدہ کام بھی کرنا ہوگا اور مصوّری کے بین الاقوامی مقابلے میں بہرحال شریک بھی ہونا ہوگا۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بہت ہی وقار اور تمکنت کے ساتھ ایک مغرور ملکہ کی سی چال سے یشپال کے پاس پہنچ گئی۔

لیکن یکایک اُسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے بہت بلندی سے نیچے کسی غار میں پھینک دیا ہو۔ اُس کی ساری خوشیاں ختم ہو گئیں اور اُس نے یشپال کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کوئی مُجرم ہو۔

"شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھاری یہ تصویر دیکھ کر میں خوشی سے ناچ اُٹھوں گی؟" اُس نے بڑے رُوکھے پن سے پُوچھا۔ پھر اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر بولی: "دوسری لڑکیوں میں اور مجھ میں فرق ہے یشپال۔ دوسری لڑکیاں اپنے محبوب کو صرف محبوب سمجھ سکتی ہیں۔ لیکن میں تمھیں اپنے جیون ساتھی کے رُوپ میں دیکھتی ہوں اور مجھے اِس بات کی خوشی نہیں کہ تم نے مجھے پیار کی انمول دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ مجھے اِس بات کا احساس بھی ہے کہ کہیں تمھارا یہ پاگلوں کا سا پیار مجھے . . . مجھے . . ."

وہ اِس سے آگے نہ کہہ سکی اور یشپال نے سُننا بھی نہ چاہا۔

دیپالی اُس کے سامنے کھڑی تھی اور اُس کے ہوش و حواس رخصت ہو چکے تھے۔ اُس نے صرف اِتنا کیا کہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

چند لمحوں تک کوئی کچھ نہ بولا۔ پھر دیپالی ہی نے پُوچھا۔

"اب تک تم میری کتنی تصویریں بنا چُکے ہو؟"

"ایک بھی نہیں" یشپال مُسکرایا: "ایک مکمل تصویر وہ ہوتی ہے جو خود پُکار اُٹھے کہ میں وہی ہوں۔ لیکن تمھاری اِتنی ساری تصویروں میں سے ایک بھی ایسی نہیں، جو تمھاری صحیح عکّاسی ہو . . ."

"میں نہیں سمجھی؟" دیپالی نے کہا۔

"تم نہیں سمجھیں؟" وہ ہنس پڑا: "بہت ہی سیدھی سی بات ہے۔ ظاہر ہے تصویروں میں چہرے سب سے پہلے بنائے جاتے ہیں اور تمھارے چہروں میں آنکھیں

بنانے کے بعد بھی اگر میرے ہوش و حواس قائم رہ جائیں اور میں تصویر مکمل کر لوں، تو پھر تمہاری آنکھوں کی سچی تصویر ہوئی کہاں؟"

"تمہارے اس پیار میں ڈوبے ہوئے فلسفے سے نہ میں خوش ہوں گی نہ شرماؤں گی" وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اس لئے کہ میں جانتی ہوں پیار بھرے فلسفوں اور زندگی میں بہت فرق ہے! اور میں زندگی چاہتی ہوں"

"اور مجھے پیار چاہئے دیپی!" یشپال نے کہا "پیار اور صرف پیار! جس کے لئے میری آتما صدیوں سے ترستی آئی ہے اور جس کے لئے میری زندگی برسوں تک تڑپتی رہی ہے۔ . . اب مجھے پیار کی دولت ملی بھی ہے تو تم کیا چاہتی ہو دیپی کہ زندگی جیسی حقیر چیز پر میں اسے قربان کر دوں؟ زندگی بہت بڑی چیز ہو سکتی ہے دیپی! بہت بڑی چیز ـــــ ایک انمول دولت۔ لیکن پیار خدا ہے!"

اس نے دیپالی کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور اس کی بند آنکھوں سے آنسو کے دو قطرے نکل کر اس کے گالوں پر پھیلنے لگے۔

چند لمحوں تک دیپالی اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اک دم اس کے سینے سے لگ گئی اور دیر تک فضا میں ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز ابھرتی رہی۔

کچھ دن اور گزر گئے۔

لیکن دیپالی یشپال کو قائل نہ کر سکی کہ پیار اور زندگی میں بہت فرق ہے۔

بین الاقوامی مصوری کے مقابلے میں شرکت کی تاریخ اور بھی نزدیک آگئی۔

لیکن دیپالی اسے اس بات پر رضامند نہ کر سکی کہ وہ بھی مقابلے میں شریک ہو۔

اس نے یشپال کے اسٹوڈیو کی ایک ایک تصویر بھی دیکھی کہ شاید کوئی ایسی تصویر نکل آئے جسے وہ خود ہی یشپال کی طرف سے مقابلے میں بھیج دے۔ لیکن ایک سے ایک شاہکار تصویروں میں سے ایک بھی دیپالی کو نہ جچی۔ اس کے ذہن میں ایک شاہکار تصویر کا معیار یہ تھا کہ دیکھنے والا رو پڑے۔

وہ مایوس ہو گئی کہ یشپال مصوری کے بین الاقوامی مقابلے میں شریک نہ ہو سکے گا ـــــ اور جس دن اسے اس بات کا یقین ہو گیا، اس دن وہ سارا دن روتی رہی۔ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی اور دوسرے دن صبح سویرے وہ یشپال سے ملنے نہ پہنچی۔ اس نے شاندار میک اپ کیا اور مجسم قیامت بن کر گھر سے باہر نکل گئی۔

لیکن تین گھنٹوں کے بعد وہ مجسم قیامت اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے ساتھ یشپال کے اسٹوڈیو میں اس کے اسٹول کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے ساتھ شہر کے سب سے بڑے وکیل اور بہت زیادہ دولت مند آدمی کا بیٹا ہریش تھا جو عجیب احمق سا نظر آ رہا تھا۔

یشپال نے قیامت کی طرف بھی دیکھا اور پھر فتنہ سامانی کی طرف بھی! اور مسکرا اٹھا۔

"یشپال!" دیپالی نے اسے بڑے وقار کے ساتھ مخاطب کیا "زندگی صرف بین الاقوامی شہرت کا نام نہیں"

"میں جانتا ہوں" یشپال نہایت سنجیدگی سے بولا "اسی لئے تو میں مصوری کے اس بین الاقوامی مقابلے میں شریک ہونا کچھ زیادہ ضروری نہیں سمجھتا"

"میں کچھ سنجیدگی سے کہنے آئی ہوں یشپال" اس نے کہا "میری بات سنو"

"کہو" یشپال بڑی بے اعتنائی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"پیار بہت بڑی چیز ہے یشپال! بہت بڑی چیز" وہ کہنے لگی "یہاں تک کہ تم پیار کو خدا بھی کہتے ہو اور ٹھیک ہی کہتے ہو۔ لیکن میں ایک معمولی سی لڑکی ہوں مجھے اتنی بڑی چیز نہیں چاہئے۔ میں تو سیدھی سی، ادنیٰ سی چیز زندگی کی متلاشی ہوں۔ تم پیار ہو، بے شک مجسم پیار ہو۔ تم میرے لئے خدا ہو۔ لیکن ہریش زندگی ہے . . . اور میں یہ کہنے آئی ہوں . . . کہ . . . کہ . . . کہ یشپال . . . کہ میں نے اپنے لئے . . . کہ میں نے اپنے لئے زندگی پسند کی ہے پیار نہیں"

دیپالی رو پڑی۔

لیکن یشپال یکایک اتنے زور سے قہقہہ لگانے لگا کہ دیپالی اور ہریش دونوں ہی اس کی طرف متوحش نظروں سے دیکھنے لگے۔

اور چند منٹوں کے بعد جب قہقہوں کا طوفان تھم گیا تو اس نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

"تم نے ایک بڑی غلطی کی دیپالی!"

"میں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے" آنسو پونچھ کر دیپالی جلدی سے بولی۔ "ہریش کو پسند کرنے میں میں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا ہے . . . الوداع . . ."

"ہا ہا ہا! ٹھہرو تو سہی" یشپال نے اٹھ کر اس کا راستہ روک لیا، پھر بولا۔ "بابا میں نے یہ کب کہا کہ ہریش کو پسند کرنے میں تم نے غلطی کی ہے"

"پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس نے بہت غصے سے پوچھا "تم نے میرا راستہ کیوں روک رکھا ہے۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو اور مجھے جانے دو"

"میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں دیپی! ایک محض چھوٹی سی بات" اس نے کہا لیکن فوراً نہایت ہی روکھے پن سے دیپالی نے اسے ٹوک دیا۔

"میرا نام دیپالی ہے، دیپی نہیں۔"

"اچھا تو مس دیپالی!" یشپال بولا۔ "یہ خاکسار حضور کو صرف اتنی سی بات یاد دلانا چاہتا ہے کہ ہمارے دل بدلے ہوئے ہیں۔ حضور کے سینے میں خاکسار کا دل ہے اور اِس حقیر کے سینے میں حضور کا دل دھڑک رہا ہے اور اب میں اُس کی ایک ایک دھڑکن سمجھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ اِس لئے حضور نے غلطی یہ کی کہ اپنا منصوبہ مرتب کرنے سے پہلے دل نہیں بدل لئے۔ . . مس دیپالی! آپ کا یہ کومل دل جو میرے سینے میں مجھ سے سب کچھ کہہ چکا ہے۔ . . بہت کچھ کہتا رہتا ہے۔ . . اور اِس وقت چُپکے چُپکے کہہ رہا ہے کہ ہریش کرلئے کا عاشق ہے!"

"یشپال!" وہ زور سے چیخی اور یشپال سے لپٹ گئی۔

اور ڈرائنگ روم میں جب یشپال، ہریش اور دیپالی چائے پی رہے تھے تو یشپال کہہ رہا تھا۔

"یہ تو درست ہے دیپی کہ ایک مکمل آرٹ وہی ہے جو لوگوں کے دل کو چھو لے اور تم نے اِسی لئے میری زندگی کو المناک بنانا چاہا۔ لیکن دیپی! میرے دل کو خارجی المناکیوں کی ضرورت نہیں۔ میرا دل غموں سے چھلنی ہے۔ دل کے داغوں میں سے ایک بھی کینوس پر اُتار دوں گا اور وہ تصویر دیکھنے والوں کو رُلا دے گی ــــــ اور میں ویسی ہی ایک تصویر بناؤں گا ــــــ تیری قسم دیپی! تیری قسم!!"

"لیکن اب وہ غموں سے چھلنی دل تمہارا کہاں ہے؟" دیپالی بولی اور شرما گئی۔

اور ہریش کی موجودگی کا خیال کئے بغیر یشپال نے دیپالی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا!!

عشرتِ رفتہ

ــــــــــــ پروفیسر سراج الحسن سراج ادیبؔ ایم۔ اے

کیا سُناؤں حالِ دل اپنا تجھے اے ہم نشیں!
آہ وہ عہدِ جوانی، وہ بہارِ زندگی
آہ وہ بزمِ طرب، وہ محفلِ رقص و سرود
لے گئی تھی لُوٹ کر سرمایۂ صبر و شکیب
اب کہاں سے لاؤں وہ سیرِ گلستاں کے مزے
صبح سے تا شام وہ دورِ مئے عشرت فزا
وہ سکوتِ شب، وہ مطرب، وہ صدائے چنگ و نے
سیرِ گُل، دَورِ مئے عشرت، تماشائے جمال
آہ اب وہ آرزوئیں، وہ تمنائیں کہاں
آگیا ہے زندگی میں اب کچھ ایسا انقلاب
اب وہ عہدِ انبساط انگیز کی باتیں کہاں

لَوٹ کر وہ دورِ عشرت اب تو آ سکتا نہیں
جب نظر آتی تھی دُنیا رشکِ فردوسِ بریں
جس کا ہر ذرہ نظر آتا تھا فرحت آفریں
ایک دوشیزہ کہ تھی غارت گرِ دُنیا و دیں
وہ شراب و شعر کا عالم، وہ نغماتِ حسیں
وہ مسلسل رقصِ دلکش، وہ فضائے دل نشیں
وہ شباب و حسن کی دیوی مرے پہلو نشیں
اب میں وہ اُجڑی ہوئی دنیا بسا سکتا نہیں
جو کبھی اے ہم نفس تھیں خانۂ دل کی مکیں
چاہتا ہے دل کہ بس ہو جاؤں میں عزلت گزیں
"دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا"

ہمسفر لڑکیاں

اثر فاروقی مدیر "قومی محاذ"

"قومی محاذ" ویکلی۔ جونا بازار۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر)

محترم خوشتر گرامی صاحب! سلام خلوص

قیامِ دہلی کے دوران، آج آپ کے دفتر کے دیدار کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ فی الواقع اُردو ادب میں جو عظمت ایشیا کے عظیم ادیب کرشن چندر کو حاصل ہے وہی بلند مقام "بیسویں صدی" کا ہے ـــــ ایک کہانی پیشِ خدمت ہے۔ اُمید کہ پسند آئے گی۔ یہ کہانی افسانہ کم حقیقت زیادہ ہے . . .

خلوص کار ـــــ اثر فاروقی

★

ہمیں آرسی کا چکر کچھ ایسا چلا کہ ہمیں بھی اُسی محور پر گھومنا پڑا۔ تبادلے کے احکام آچکے تھے اور جلد ہی ترکِ مستقر کی ہدایت کی گئی تھی۔ کہتے ہیں کسی جگہ عرصۂ دراز تک رہیئے تو وہ وطن ہو جاتا ہے اور ہم آپ کو قسم کھا کر یقین دلانے کے لئے تیار ہیں (آپ جیسی بھی کہیں) کہ ہمیں یہاں رہتے ہوئے ایک دو نہیں پورے بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہیں کے کالج میں تعلیم پائی، یہیں کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں درخواست دی اور ملازم بھی یہیں ہو گئے۔ مگر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس نے ہماری سفارشں کر دی کہ اورنگ آباد جیسا تاریخی مقام ہمیں پسند نہیں ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم یہاں کی فضا سے اِتنے گھبرائے ہوئے ہیں کہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ پھر اِس خیال نے ڈھارس بندھائی کہ اِس وقت تو چل دو بعد میں دیکھا جائے گا۔ جب آزادی کے لئے ہزاروں جانیں دی جا سکتی ہیں تو کیا مُلک کے نئے خاکے کے لئے اِتنی بھی تکلیف نہیں برداشت کی جا سکتی۔ اِس خیال نے جانے پہچانے ماحول سے جُدا ہونے کے غم اور نئے مقام پر آنے والی دشواریوں کے احساس کو کم کر دیا۔ پہلی بار سارا سامان ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ اِس لئے میں نے چند ضروری چیزیں ہینڈ بیگ میں رکھیں اور اسٹیشن پر آپہنچا۔ معلوم ہوا گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔ اِس بات پر بڑی کوفت ہوئی کہ ہندوستان کی قسمت میں "لیٹ" جلی حرفوں میں لکھا ہے۔ تیسرے درجے کا ٹکٹ نکالا اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے اسٹیشن کی ایک بنچ پر جو خالی پڑی ہوئی تھی، بیٹھ گیا۔ ٹکٹ کو غور سے دیکھا۔ لکھا تھا "تھرڈ کلاس آرڈنری!"

ایک گھنٹہ بڑی اضطرابی کیفیت رہی۔ جُوں تُوں کر کے ٹرین پلیٹ فارم پر آئی۔ ٹرین آتے ہی مسافر اُس پر ٹوٹ پڑے۔ میں ایک ڈبے کے قریب پہنچا تو عجیب حالت تھی۔ باہر والے مسافر چاہتے تھے کہ پہلے وہ اندر چلے جائیں اور اندر والے اِس کوشش میں تھے کہ وہ پہلے باہر آئیں اور اِس طرح دونوں کو اپنی کوشش میں ناکام رہنا تھا۔ میں ہینڈ بیگ کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ایک ڈبہ ایسا مل گیا جہاں چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ڈبہ جدید طرز کا بنا ہوا تھا۔ لکڑی کے تختوں کی ایک دیوار نے جس کے دو حصّے کر دئے تھے۔ سامنے والے حصے میں، جو دروازے سے قریب تھا، چار نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں تاش کھیلنے میں محو تھیں۔ اُنھوں نے آدھے ڈبے پر قبضہ جما رکھا تھا اِس لئے میں وہاں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ چاروں نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے کھیل میں مشغول ہو گئیں۔ میں آگے بڑھ گیا۔ دوسری طرف ایک موٹا تازہ آدمی ایک بنچ پر پڑا خرّاٹے لے رہا تھا۔ دو پولیس مین بیٹھے بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ اُن کے بازو میں ایک نوجوان جو صورت سے دیہاتی معلوم ہوتا تھا خود بھی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنی تھیلی کے لئے بھی ایک نشست محفوظ کر لی تھی۔ اُس کے سامنے سیٹ پر چار خوش پوش نوجوان بیٹھے گپ ہانک رہے تھے۔ میں نے وہاں مایوس نگاہ ڈالی جہاں لکھا تھا: "ٹو سیٹ ٹوینٹی"

مجھے پہلے تو اُن لڑکیوں پر غصّہ آیا جو لیڈیز کمپارٹمنٹ چھوڑ کر یہاں آگئی تھیں۔ پھر دل میں آیا کہ وہاں لڑکیوں کے پاس جا کر بیٹھ جاؤں۔ لیکن فوراً ہی

اس خیال سے کہ وہاں جاکر کیا حالت ہوگی، وہاں نہ گیا۔ پھر اُس موٹے تازے بکرے کی طرح لیٹے ہوئے شخص پر غصّہ آیا، جو بڑی بے فکری سے سو رہا تھا۔ پھر کرنے کی کوتاہی پر جھلّاہٹ محسوس ہوئی۔ چھوٹا سا ڈبّہ اور اُس کے بھی دو حصّے!

میں نے جھلّاہٹ میں کہا: "ہماری عادت ہے گھر ہو، ریل کا سفر ہو، چاہے موٹر کا سفر، ہم ہر جگہ سوتے رہیں گے۔ اندر سونا، باہر سونا، اوپر سونا، نیچے سونا۔" میں نے اوپر جو نگاہ ڈالی تو وہاں بھی ایک حضرت بستر لگائے ہوئے تھے جہاں سامان رکھا جاتا ہے۔ سب نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اچانک کسی طرف سے ایک مترنم قہقہہ گونجا: "ونڈرفل، ویری ویل!" میں نے دیہاتی کی تھیلی اُٹھا کر اوپر کی طرف رکھ دی اور اُس کی جگہ بیٹھ گیا۔ تھیلی کے مالک نے پھرتی سے تھیلی پھر اپنی گود میں رکھ لی۔ مجھے اُس کے اِس رویّے پر ہنسی آگئی۔

"ونس اگین!" ڈبّے کے کسی گوشے سے آواز اُبھری۔ میں کہنے والے کو دیکھ نہ سکا۔ کیونکہ اِتنا فِٹ بیٹھ گیا تھا جیسے کسی بندوق کی گولی! آواز یقیناً نسوانی تھی اور میں سمجھ گیا کہ اب شامت آئی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چُپ سادھ لی۔ ٹرین ٹھہری ہوئی تھی۔ کھڑکیاں کھُلی تھیں پھر بھی ہوا کا نام نہ تھا۔ پنکھے بند تھے۔ میں گھُس کر کسی طرح بیٹھ تو گیا تھا مگر اب اِس شدّت کی گرمی محسوس ہو رہی تھی جیسے دوزخ کے دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوں۔ اِس خیال سے کہ دروازے میں کھڑے رہنے میں بہتری ہے، میں وہاں سے اُٹھ گیا۔ ہینڈ بیگ تو میں نے اوپر رکھ ہی دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین چل پڑی۔

وہ چاروں عورتیں اب بھی اُسی طرح کھیل میں منہمک تھیں۔ میں نے پہلے اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی تھی اور اب پُورے طور پر جائزہ لینے لگا۔ اُن میں سے دو نے شلوار قمیص کے ساتھ آسمانی رنگ کا دوپٹّہ سر پر ڈال رکھا تھا۔ اُن کی گوری رنگت پر اِس انتخاب کی مجھے داد دینی پڑی۔ تیسری کا رنگ گندمی تھا جس نے گُلابی ساری پر ایک معمولی بلاؤز پہن رکھا تھا۔ یہ چاروں میں بلند قامت تھی۔ چوتھی کو دیکھ کر مجھے بالکل حیرت نہ ہوئی۔ اُس نے ناسی رنگ کی پتلون میں سفید رنگ کا شرٹ ڈال رکھا تھا۔ اُس نے اِس سلیقے سے شرٹ کو پتلون میں ڈال رکھا تھا کہ شرٹ پر جھُرّیوں کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ اُن تینوں میں سب سے شوخ اور چنچل معلوم ہوتی تھی۔ ویسے چاروں شوخ اور چنچل تھیں۔ ورنہ مردانہ ڈبّے کے ایک حصّے پر عورتوں کا قبضہ کر لینا معمولی بات نہیں۔ اُس نے کھیلتے کھیلتے کئی بار میری طرف دیکھا اور تینوں نے صرف ایک سرسری نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ وہ جس وقت میری طرف دیکھتی میں فوراً دروازے کی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنے لگتا۔ دفعتہً مجھے اُس آواز کا خیال آیا جو تھوڑی دیر پہلے سُنائی دی تھی۔ وقتی طور پر مجھ پر ایک معمولی سی گھبراہٹ طاری ہوئی مگر جلد ہی دُور ہو گئی کیونکہ میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔

"شاید آپ کھیل جانتے ہیں۔ بڑے شوق سے دیکھ رہے ہیں۔" چوتھی چنچل لڑکی بولی۔

"جی نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "اِسے میں کیا کروں کہ آنکھیں دیکھنے ہی کے لئے ہیں۔"

وہ تینوں ہنس پڑیں۔

"اوہ ــــــ!" اُس نے خفیف ہوتے ہوئے کہا اور پھر بڑے زور سے پتّہ پھینکا۔

"کالی کا غلام اور یہی حکم ہے!" پھر اُس نے نیچے پڑے ہوئے پتّے اپنی طرف کھینچ لئے۔ وہ پھر کھیل میں مشغول ہوگئیں اور میں باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ دو تین اسٹیشن بڑی سُرعت سے گزر گئے۔ جب بھی کوئی اسٹیشن آتا میں دروازے کی کھڑکی بھی بند کر لیتا اور مسافر بے چارے ڈبّہ بھرا ہوا سمجھ کر آگے یا پیچھے چلے جاتے۔ ویسے ڈبّہ بھرا ہوا ہی تھا۔

"ہائے ری گرمی!" آواز میرے کانوں کے قریب تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا لڑکی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ اُس نے سر کے اوپر دونوں ہاتھوں کو ملا کر ایسا زاویہ بنایا تھا جیسے اب رقص کرنے لگے گی۔

"میں بھی یہاں کھڑی ہو جاؤں تو آپ کو تکلیف تو نہ ہوگی؟" اُس نے جماہی لیتے ہوئے پُوچھا۔

"یہاں تم چاہو تو کھڑی رہ سکتی ہو، بیٹھ سکتی ہو اور ہو سکے تو سو بھی سکتی ہو!" میں نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ پھر سوچنے لگا ــــــ سفر دراز ہوتا تو میں اِس سے رُومان کی پینگیں بڑھاتا۔ لیکن سفر مختصر ہے اور اِتنے کم وقت میں رُومان کی پینگیں نہیں بڑھائی جا سکتیں۔

میں نے کہا: "گھر تو نہیں ہے کہ سب کا خیال رکھا جائے۔"

"لیکن اخلاقی فرض ــــــ؟" اُس کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔

"اجی چھوڑئیے اِس اخلاقی فرض کو ــــــ" میں نے کہا: "یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔"

"خیر چھوڑئیے اِن باتوں کو۔" وہ نرم لہجے میں بولی: "آپ نے تو بال کی کھال نکال دی۔ کیا میں یہ پُوچھنے کی جسارت کر سکتی ہوں کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں تک جانے کا ارادہ ہے؟"

"ضرور!" پھر میں نے اُس کے سارے سوالوں کے جواب دے دیئے۔ اُس نے اپنا اور تینوں کا تعارف کروایا اور بتایا کہ وہ تفریح کی غرض سے سفر کر رہی ہیں اور ایک دوسرے کی سہیلیاں ہیں۔

اس خیال سے کہ وہاں جاکر کیا حالت ہوگی، وہاں نہ گیا۔ پھر اُس موٹے تازے بکرے کی طرح لیٹے ہوئے شخص پر غصّہ آیا، جو بڑی بے فکری سے سو رہا تھا۔ پھر کمرے کی کوتاہی پر جھلاّہٹ محسوس ہوئی۔ چھوٹا سا ڈبّہ اور اُس کے بھی دو حصّے !

میں نے جھلاّہٹ میں کہا: "ہماری عادت ہے گھر ہو، ریل کا سفر ہو، چاہے موٹر کا سفر۔ ہم ہر جگہ سوتے رہیں گے۔ اندر سونا، باہر سونا، اوپر سونا، نیچے سونا۔" میں نے اوپر جو نگاہ ڈالی تو وہاں بھی ایک حضرت بستر لگائے ہوئے تھے جہاں سامان رکھا جاتا ہے۔ سب نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اچانک کسی طرف سے ایک مترنّم قہقہہ گونجا: "ونڈر فُل، ویری ویل !" میں نے دیہاتی کی تھیلی اُٹھاکر اوپر کی طرف رکھ دی اور اُس کی جگہ بیٹھ گیا۔ تھیلی کے مالک نے پھرتی سے تھیلی پھر اپنی گود میں رکھ لی۔ مجھے اُس کے اس رویّے پر ہنسی آگئی۔

"ونس اگین !" ڈبّے کے کسی گوشے سے آواز اُبھری۔ میں کہنے والے کو دیکھ نہ سکا۔ کیونکہ اتنا فِٹ بیٹھ گیا تھا جیسے کسی بندوق کی گولی ! آواز یقیناً نسوانی تھی اور میں سمجھ گیا کہ اب شامت آئی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چُپ سادھ لی۔ ٹرین ٹھہری ہوئی تھی۔ کھڑکیاں کھُلی تھیں پھر بھی ہوا کا نام نہ تھا۔ پنکھے بند تھے۔ میں گھُس کر کسی طرح بیٹھ تو گیا تھا مگر اب اِس شدّت کی گرمی محسوس ہو رہی تھی جیسے دوزخ کے دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوں۔ اِس خیال سے کہ دروازے میں کھڑے رہنے میں بہتری ہے، میں وہاں سے اُٹھ گیا۔ ہینڈ بیگ تو میں نے اوپر رکھ ہی دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین چل پڑی۔

وہ چاروں عورتیں اب بھی اُسی طرح کھیل میں منہمک تھیں۔ میں نے پہلے اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی تھی اور اب پُورے طور پر جائزہ لینے لگا۔ اُن میں سے دو نے شلوار قمیص کے ساتھ آسمانی رنگ کا دوپٹّہ سر پر ڈال رکھا تھا۔ اُن کی گوری رنگت پر اس انتخاب کی مجھے داد دینی پڑی۔ تیسری کا رنگ گندمی تھا جس نے گلابی ساری پر ایک معمولی بلاؤز پہن رکھا تھا۔ یہ چاروں میں بلند قامت تھی۔ چوتھی کو دیکھ کر مجھے بالکل حیرت نہ ہوئی۔ اُس نے ناسی رنگ کی پتلون میں سفید رنگ کا شرٹ ڈال رکھا تھا۔ اُس نے اِس سلیقے سے شرٹ کو پتلون میں ڈال رکھا تھا کہ شرٹ پر جھرّیوں کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ اُن تینوں میں سب سے شوخ اور چنچل معلوم ہوتی تھی۔ ویسے چاروں شوخ اور چنچل تھیں۔ ورنہ مردانہ ڈبّے کے ایک حصّے پر عورتوں کا قبضہ کر لینا معمولی بات نہیں۔ اُس نے کھیلتے کھیلتے کئی بار میری طرف دیکھا اور تینوں نے صرف ایک سرسری نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ وہ جس وقت میری طرف دیکھتی میں فوراً دروازے کی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنے لگتا۔ دفعتہً مجھے اُس آواز کا خیال آیا جو تھوڑی دیر پہلے سُنائی دی تھی۔ وقتی طور پر مجھ پر ایک معمولی سی گھبراہٹ طاری ہوئی مگر جلد ہی دُور ہوگئی کیونکہ میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔

"شاید آپ کھیل جانتے ہیں۔ بڑے شوق سے دیکھ رہے ہیں۔" چوتھی لڑکی بولی۔

"جی نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا: "اِسے میں کیا کروں کہ آنکھیں ہی کھُلے ہیں۔"

وہ تینوں ہنس پڑیں۔

"اوہ ــــ !" اُس نے خفیف ہوتے ہوئے کہا اور پھر بڑے زور سے پتّہ پھینکا۔

"کالی کا غلام اور یہی حکم ہے !" پھر اُس نے نیچے پڑے ہوئے پتّے طرف کھینچ لئے۔ وہ پھر کھیل میں مشغول ہو گئیں اور میں باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ دو تا اسٹیشن بڑی سُرعت سے گزر گئے۔ جب بھی کوئی اسٹیشن آتا میں دروازے کی کھڑ بھی بند کر لیتا اور مسافر بے چارے ڈبّہ بھرا ہوا سمجھ کر آگے یا پیچھے چلے جاتے۔ ویسے بھرا ہوا ہی تھا۔

"ہائے ری گرمی !" آواز میرے کانوں کے قریب تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا لڑکی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ اُس نے سر کے اوپر دونوں ہاتھوں کو مِلاکر ایسا زاو بنایا تھا جیسے اب رقص کرنے لگے گی۔

"میں بھی یہاں کھڑی ہو جاؤں تو آپ کو تکلیف تو نہ ہوگی ؟" اُس نے جماہی لیتے ہوئے پُوچھا۔

"یہاں تم چاہو تو کھڑی رہ سکتی ہو، بیٹھ سکتی ہو اور ہو سکے تو سو بھی سکتی ہو !" میں نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ پھر سوچنے لگا ــــ سفر دراز ہوتا تو میں اِس رُومان کی پینگیں بڑھاتا۔ لیکن سفر مختصر ہے اور اِتنے کم وقت میں رُومان کی پینگیں نہیں بڑھائی جا سکتیں۔

میں نے کہا: "گھر تو نہیں ہے کہ سب کا خیال رکھا جائے۔"

"لیکن اخلاقی فرض ــــ ؟" اُس کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔

"اجی چھوڑیئے اِس اخلاقی فرض کو ــــ" میں نے کہا: "یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔"

"خیر چھوڑیئے اِن باتوں کو۔" وہ نرم لہجے میں بولی: "آپ نے تو بال کی کھال نکال دی۔ کیا میں یہ پُوچھنے کی جسارت کر سکتی ہوں کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں تک جانے کا ارادہ ہے ؟"

"ضرور !" پھر میں نے اُس کے سارے سوالوں کے جواب دے دیئے۔ اُس نے اپنا اور تینوں کا تعارف کروایا اور بتایا کہ وہ تفریح کی غرض سے سفر کر رہی ہیں اور ایک دوسرے کی سہیلیاں ہیں۔

یہ آپ کو مردانہ ڈبے میں بیٹھنے کی کیا سوجھی ؟" میں نے بھی نرمی اختیار کی۔

" تو پھر کہاں بیٹھتے ؟" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیڈیز کمپارٹمنٹ میں عورتیں
مار کر ہمارا ناک میں دم کر دیتیں۔"

پھر تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ ریل فراٹے بھر رہی تھی۔ شاید ڈرائیور نے
ڈے کی کسر نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

" اوئی ——— !" ایک چیخ بلند ہوئی اور میں نے جلدی سے دروازے کی
طرف اپنا ہاتھ لگا دیا۔ وہ میرے ہاتھ پر آ رہی۔ اُس نے ہاتھ سے میری کمر
یں نے اُسے سہارا دیا اور وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔ یہ سب کچھ صرف چند
یں ہوا۔

" ذرا سنبھل کر کھڑی رہیئے۔" میں نے اُسے الگ کرتے ہوئے کہا۔

" شکریہ !" اُس نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ "پیر سلپ ہو گیا تھا ورنہ
تی۔"

" پھر گرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا !" میں نے برجستہ کہا۔ وہ کھلکھلا کر
ی۔ وہ تینوں رشک آمیز ہنسی ہنس کر خاموش ہو گئیں۔

مجھے جہاں اُترنا تھا وہ اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔

" آپ اپنا پتہ بتا دیجیے تاکہ واپسی میں ملاقات ہو سکے۔" اُس نے ہلکی سی
کے ساتھ کہا۔ "ویسے آپ انسان دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔"

" اپنا پتہ اِس وقت خود مجھے نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے فی الوقت مجھے دفتر کے
یں رہنا پڑے۔" وہ میری بے رُخی دیکھ کر سنجیدہ ہو گئی۔ میں نے پھر کہا۔ "آپ اپنا
یے تاکہ قیام کے بندوبست کے بعد میں خود آپ کو مدعو کر سکوں۔" میں نے یوں ہی
کے لیے کہا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ نہ میں بلاؤں گا اور نہ وہ آئے گی۔

" شکریہ !" اُس نے پتہ لکھ دیا اور اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔

اسٹیشن آ چکا تھا۔ میں نے ہینڈ بیگ لیا اور اُن پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے
۔ میں نے بہت دیر سے سگریٹ نہیں پیا تھا۔ ڈبے میں موقع ہی نہ ملا تھا
ٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دونوں جیبیں دیکھیں۔ چمڑے کا ایک خوبصورت
میں سگریٹ بھرے ہوئے تھے، غائب تھا۔ پھر میں نے کوٹ کی اوپر کی
، ایک پرس میں پیشگی ملی ہوئی تنخواہ اور ٹکٹ تھا، وہ محفوظ تھا۔ جیسے
ت دیکھا جس کی کھڑکی میں سے مُڑے تُڑے سگریٹ بڑی تیزی کے ساتھ باہر
یں دل ہی دل میں مسکرایا۔ وار خالی گیا تھا !!

بیسویں صدی" میں وہی مضامین، نظم و نثر شائع
تے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔

لالہ زار

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور، ایم۔اے، ایم۔او۔ایل، پی ایچ۔ڈی

لگتا نہیں نگاہ ملانے سے ڈر مجھے
لگ جائے اے خدا نہ بتوں کی نظر مجھے

دریا شراب کا مرے سر سے گزر گیا
گزرے جو دیکھ کر وہ بہر رہ گزر مجھے

اصحابِ باخبر کو 'ادھر' کی خبر کہاں
میری خبر بتائے کوئی بے خبر مجھے

معجز نما رہا ہے تصوّر تمام رات
آئے نظر وہ نور فشاں میرے گھر مجھے

اے دوستو تمھاری عنایت کا شکریہ
کب تھے نصیب رنج والم اِس قدر مجھے

دم بھر کو میری گردشِ تقدیر رک گئی
جب رک گئے وہ خاک بسر دیکھ کر مجھے

نکلا ہے بارہا کلمہ لب سے کفر کا
کچھ اور ہی گمان ہے اب آپ پر مجھے

وحشت فزا ہوئی ہے یہاں تک شبِ فراق
لگتا ہے اپنے پاؤں کی آہٹ سے ڈر مجھے

پروا نہیں اگر نہ رہا آشنائے خلق
کافی ہے اک یگانۂ بیگانہ گر مجھے

یارانِ نیک نام کی شہرت نہ بڑھ سکی
بدنامیوں نے خوب کیا نامور مجھے

انور جو کس مپرس ہی رہنے تھے باہنر
پیدا خدا نے کیوں نہ کیا بے ہنر مجھے

۲/۵، ایسٹ پٹیل نگر، نیو دہلی ۸

عروسہ

مِس نگہت ریحانہ ایم اے

صباحت ہاؤس، سرکٹ ہاؤس روڈ (کیمپ) امراوتی۔ مہاراشٹر اسٹیٹ

محترم چچا جان! تسلیمات

. . . سالنامے کے لئے ایک کہانی حاضرِ خدمت ہے۔ مجھے افسوس ہے آپ کے حکم کی تعمیل میں تاخیر ہوئی۔ اتنی کہ شاید اب یہ کہانی سالنامے میں شریک نہ ہوسکے۔ پھر بھی اُمید ہے آپ کا خلوص سالنامے میں نہ سہی کسی اور شمارے میں اِسے شامل کرلے گا اور میں اپنے دل کو اِس حقیقت سے بہلا لوں گی کہ "بیسویں صدی" کا ہر شمارہ "خاص نمبر" ہوتا ہے . . .

آپ کی بھتیجی ——— نگہت ریحانہ

★

"اُف!" وہ کراہ اُٹھی۔ پھر اُس نے اپنی شعلہ بار نظریں اوپر اُٹھائیں۔ اُس کے ب لہجے۔ آواز میں آگ ہی آگ بھری تھی۔

"چھوڑ دو میرا ہاتھ!"

صباحت کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

"اِس لئے چھوڑ دوں کہ تم پھر کسی بھلے آدمی کی جیب کاٹو؟"

"شٹ اپ!"

"کیا زمانہ آیا ہے۔ لڑکیاں جیب کاٹتی پھرتی ہیں! مساوات اور برابری کا ذکر سنا تھا۔ لیکن اس فن میں بھی عورتیں مَردوں کے دوش بدوش ہیں۔ یہ نیا انکشاف ہوا ہے . . . اِتنی خوبصورت لڑکی اور چور! عجیب مذاق!!"

"اے جناب! تمھیں میری تعریف یا مذمت کا کوئی حق نہیں پہنچتا!"

"اچھا! اور میری جیب سے پرس اُڑانے کا حق تمھیں کس نے دیا؟ . .
وا کا مال سمجھ لیا تھا؟"

"خبردار جو میرے باپ کا نام لیا!"

اور نہیں تو کیا اپنی نانی جان کا نام لوں؟ آپ کو اتنی جلدی غصہ آگیا۔ ابھی
ترمہ! اِس پیشے میں بہت ضبط و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ شعلہ بننے سے کام
ہیں بنتا!"

"مجھے تمھاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں!"

"ویسے اِن نازک کلائیوں میں ہتھکڑی . . ."

"مرگئے ہتھکڑی پہنانے والے!"

"جی نہیں! ہتھکڑی پہنانے والے کا تو اب سامنا ہوا ہے!"

"واہ! جیسے کوئی پولیس افسر ہو!"

"محترمہ! اپنی ایسی قسمت کہاں جو پولیس افسر بن کر ایسے حسین چور کو پکڑ سکوں۔ سچ کہتا ہوں، اگر چور اِتنے ہی حسین ہونے لگیں نا! تو جانتی ہو کیا ہوگا؟ دُنیا بھر کے ڈاکٹر، انجینئر، وکیل اپنا پیشہ چھوڑ کر پولیس افسر بن جائیں۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو۔ میں اِس بے تکلفی کو برداشت نہیں کر سکتی!"

"ہوں! تو حضور نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں آپ کی بے تکلفی کو گوارا کرلوں گا کہ جناب اِس اپنائیت سے میری جیب . . .!"

"بکواس بند کرو۔"

"لو کردی۔ لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ہاتھ ہتھکڑی کے لئے نہیں ہیں۔ اِنھیں تو کسی گلے کا ہار ہونا چاہیئے!"

"اوہو! شیشہ دیکھا ہے کبھی؟ آپ اور مجھے ہتھکڑی پہنائیں گے! دن میں خواب دیکھنا چھوڑ دو مسٹر!"

"دن کہاں محترمہ! اب تو شام کی سیاہی بھی گہری ہونے لگی۔ اِس اندھیرے میں تو گناہ حسین لڑکیوں کا رُوپ دھار کر بازار میں بِکھرتا ہے!"

"کیا ثبوت ہے تمھارے پاس کہ یہ پرس میں نے اُڑایا ہے۔ کون یقین کرے گا؟"

وہ تو کمر کمر پر ہی ہو گئی "ذرا غور سے دیکھ کر بتاؤ، کہیں سے چور نظر آتی ہوں؟"

"تمھارا حُسن سراپا چور ہے۔ رہزنِ ہوش و تمکین ہے اور۔۔؟"

"لیکن آپ بھول گئے۔ اِس رہزنی کے جُرم میں ہتھکڑیاں نہیں پہنائی جاتیں۔ اِس مُجرم کے حضور میں سرِ نیاز خم کیا جاتا ہے!"

"جاؤ مسٹر! اپنا راستہ ناپو۔ اگر میں نے کسی سے کہہ دیا کہ تم میرا پیچھا کر رہے تھے، تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ سرِ بازار تماشا بن جاؤ گے!"

وہ مُسکرا پڑا "یہ بہت خطرناک ہو!"

"ابھی کیا دیکھا ہے!"

"پھر بھی اِتنا تو مانتی ہوں، مجھ پر تمھارا وار نہ چل سکا!"

"وہ تو غلطی سے چُوک گئی۔ ورنہ تمھارے فرشتے بھی نہ جان سکتے تھے عروسہ پر ہاتھ ڈالنا اِتنا آسان نہیں!"

"اچھا! تو تمھارا نام عروسہ ہے؟ خیر! یہ لو" صباحت نے پرس اُس کی طرف بڑھا دیا "اب اِسے لے لو!"

"مجھے بھیک نہیں چاہئے!"

"کمال ہے! چوری کرنا گوارا ہے۔ جیسے کوئی کارِ خیر ہے اور بھیک لینا پسند نہیں۔ آخر تم ہو کیا بلا؟"

"بلا نہیں ہوں کہئے! پیچھا کیا تو فضا میں معلّق ہو کر رہ جاؤ گے! نہ دین کے رہو گے نہ دُنیا کے!"

"ہاں سچ کہتی ہو۔ تمھارا قُرب دین سے تو بیگانہ کر ہی دے گا۔ ساتھ ہی دُنیا سے بھی جائیں گے۔ چور کا ساتھ دیا تو تمام عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہائے اللہ کرتے گزر جائے گی!"

"میری طرف سے جاؤ جہنّم میں!" عروسہ پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

صباحت اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اُسے تکتا رہا۔

ہلکے سبز رنگ کی ساری، اُسی رنگ کا بلاؤز، دمکتے زیورات میں جگمگاتی، بالوں میں سُرخ رنگ کا پھول۔ یہ انوکھی چور اُسے بہت بھلی معلوم ہوئی جیسے پرستان سے کسی نے بہار کی پری کو دھرتی پر اُتار دیا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر غصّہ آ گیا۔ اُس نے پرس کیوں لے لیا۔ ایسی حسین عورت پر تو قارون کا سارا خزانہ بھی لُٹا دیا جائے تو کم ہے ــــــ اگلے ہی پل وہ بُری طرح چونک پڑا۔

"ارے! یہ میں نے کیا کیا۔ وہ چلی گئی؟ ایک لڑکی جو مانا کہ انتہائی حسین تھی۔ لیکن ساتھ ہی چور بھی۔ قانون کی نگاہوں میں مُجرم! اور وہ قانون کا محافظ ہو کر اُسے گرفتار نہ کر سکا۔ کمبخت مچل ہی گئی!

اُس کے دل میں عجیب سا جذبہ جاگا۔ اِتنی حسین لڑکی اور چور! ــــــ جو سرِ راہ کسی بھلے آدمی کا پرس اُڑا لے ــــــ چور! جو کسی کنجوس سیٹھ کی تجوری کا وزن ہلکا کر دے ــــــ جو بھری محفل میں مُسکراتی آنکھوں کے کنول میں غم کے آنسو بھر دے۔ اِس کے علاوہ اور بھی اُس کے کئی رُوپ تھے۔

وہ ایک بیٹی تھی۔ اپنے والدین کی تمنّاؤں کا مرکز۔ جو سماج کی مانگ کا سیندور بننے کے بجائے اُس کے ماتھے کا کلنک بن گئی تھی۔ ایک دُلہن تھی جو اپنے سُہاگ کی پاکیزگی سرِ بازار بیچتی تھی۔ ایک ماں تھی جو اپنی اولاد کا مستقبل بیچ رہی تھی ــــــ ان گنت سوالات اُس کے ذہن میں اُبھرتے۔ جو ایک بڑے سے سوال میں تبدیل ہو جاتے۔ وہ کیا تھی؟ اور پھر یہ سوال ایک پہیلی بن جاتا۔

آج پرنس کلب کی سلور جوبلی کے موقعہ پر شاندار پروگرام تھا۔ ایک مصری رقاصہ کا دلرُبا و جاں فزا رقص تھا۔ شہر کی ممتاز ہستیوں کا اجتماع تھا۔ حُسن و جوانی کا قیامت خیز تصادم تھا۔ آج پرنس کلب کی عمارت دُلہن بنی تھی۔ خوبصورت، جوان، حسین لڑکیاں اُس کا زیور اُس کا سنگھار بن گئی تھیں ــــــ نہیں، وہ موم کی شمعیں تھیں۔ جو ہر طرف ٹھنڈے اُجالے بکھیر رہی تھیں۔ جوان خوبرو مرد پروانے تھے جو اِن ٹھنڈے اُجالوں کو سمیٹے اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کر رہے تھے ــــــ نہیں، آج پروانوں میں بھی شمع کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ حُسن عشق کی بانہوں میں مچلنے کے لئے بے تاب تھا ــــــ اور وہ ــــــ اِس سحر آگیں ماحول سے بے نیاز بالکونی کے ستون سے پُشت ٹکائے کھڑا سگریٹ کا دھواں فضاؤں میں بکھیر رہا تھا۔ دھوئیں کے ہر مرغولے میں اُسے عروسہ کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ وہ تصوّرات کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ کسی نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ پلٹا۔

"تم!" صباحت کی آواز میں ارتعاش تھا۔

"تم یہاں کہاں سے آ گئیں؟" خوشی سے اُس کا چہرہ تمتما سا گیا۔

"وہ بھی مُسکرا پڑی۔

"نیہہ نصیب! آخر آ گئا میری سُونی راہوں میں مُسکراہٹوں کے پھول بکھیر ہی دئے! پیار بھری اِس نظر کو برسوں سے ترس رہی تھی!"

اِس آواز نے اُس کے خوابوں کو جھٹکے سے توڑ دیا۔ وہ کراہ اُٹھا۔

"اوہ! تو یہ تم ہو شفیقہ! میں سمجھا وہ آ گئی!"

"وہ کون؟" شفیقہ کے ابرو تن گئے۔

"کیا اب تم بھی کسی موہ کے چکّر میں پڑ گئے؟ دیکھو صباحت ایسا نہ کرنا۔ میرے

اور تمہارے درمیان کوئی وہ نہیں آسکتی !"

اُس کی بات پر دھیان نہ دیتے ہوئے صباحت اپنی دُھن میں وہاں سے چل پڑا۔ آخری زینے پر قدم رکھتے ہوئے وہ اچانک کسی سے ٹکرا گیا۔

"اوہ ! آئی۔ ایم ایکسٹریملی سار (I am Extremely sorry.) " الفاظ اُس کے حلق ہی میں اٹک کر رہ گئے۔ اُس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا ——— اُف خدا ! ہر لڑکی میں مجھے اُسی کی شبیہہ کیوں نظر آرہی ہے۔ وہ اِس محفل میں کہاں !" وہ بہت سُرعت سے نظریں نیچی کئے آگے بڑھ گیا۔ لیکن نہ جانے کس کشِش نے پھر مُڑنے پر مجبور کر دیا اور تب وہ مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔ وہ لڑکی ——— وہ ——— وہی تھی ——— سَو فیصدی وہی ! وہ لازوال مُسکراہٹ کبھی نہیں بُھلائی جا سکتی، جو اب بھی اُس کے سُرخ لبوں پر مچل رہی تھی ——— "ارے ! اُس کے ہاتھوں میں کیا ہے ؟ میرا پرس !" صباحت کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنی جیب کی طرف گیا۔ وہ خالی تھی۔ اگلے ہی پَل وہ عروسہ کے قریب تھا۔ اُس کے حواس واپس آچکے تھے۔ وہ زینے کے قریب کھڑی اُسی کو دیکھ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے ایک بار پھر اُس کے ہاتھ صباحت کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں تھے۔

"شریفوں کی بھری محفل میں بھی چوری سے باز نہیں آئیں ؟"

"چوری !" اُس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ اچانک اُس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ تیوریاں چڑھ گئیں۔

"اے مسٹر ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟ ایک تو اپنا پرس بے پروائی میں زینوں پر گِرا دیا جو اتّفاقاً میری نظروں میں آگیا۔ اِسے واپس کرنے کے انتظار ہی میں یہاں کھڑی تھی۔ بجائے شکر گزار ہونے کی بجائے اُلٹا مجھے الزام دینے لگے !"

"اوہ !" وہ حیران رہ گیا "پرس کیسے گِر سکتا ہے ؟"

"یہ میں کیا جانوں ! سنبھالئے اپنا پرس !"

"سُنو ! کیا تم وہی چور لڑکی نہیں جس نے . . ."

وہ بھڑک اُٹھی۔

"آپ کا دماغ تو صحیح ہے ؟ نہ جانے کس کے دھوکے میں مجھے چور بنائے جا رہے ہیں۔"

وہ سُرعت سے مڑی اور بڑبڑاتی ایک طرف چلی گئی۔ صباحت نے اُس کی بڑبڑاہٹ سُن لی تھی۔

"نہ جانے ایسے لوگوں کو محفلوں میں کیوں آنے دیا جاتا ہے جو آدابِ محفل سے آشنا نہیں۔ نہ جانے کس چور گرہ کٹ سے پالا پڑ گیا۔"

وہ حیران و پریشان سا کھڑا رہا۔ آج پھر وہ اُس کے احساسات کو مجروح کر گئی ——— اُس نے ہلکے نیلے رنگ کا سُوٹ پہن رکھا تھا۔ دمکتے قیمتی زیورات تھے۔ ڈھیلے بالوں کی لمبی سی چوٹی ناگن کی طرح کمر پر لہرا رہی تھی۔ آج وہ نیلگوں آسمان سے اُتری نیلم پری نظر آرہی تھی۔ صباحت ایک بار پھر کھو گیا۔ اُس رات کئی بار اُس نے عروسہ کے قریب آنے کی کوشِش کی لیکن ہر بار وہ کترا گئی۔

مصری رقّاصہ رقص کرتی رہی۔ وہ عروسہ کے خیالوں میں کھویا رہا جو دُور بیٹھی رقص دیکھنے میں محو تھی۔ ہال میں اندھیرا سا تھا۔ روشنی کے حلقے صرف مصری رقّاصہ کے گِرد ناچ رہے تھے۔ ایک بار اُس کی نظریں بھی اُس روشنی سے اُلجھ گئیں۔ قیامت خیز اداؤں نے چند ثانیوں کے لئے اُسے محو کر دیا۔ جب یہ محویت ٹوٹی اور وہ پلٹا تو دیکھا عروسہ کی سیٹ خالی تھی۔ وہ چونک پڑا اور باہر کی طرف لپکا۔ اِتنے ہی میں برقی قمقمے روشن ہو گئے۔ رقص ختم ہو چُکا تھا ——— اچانک کسی کی چیخوں کی آواز نے اُس کے قدم روک لئے۔ وہ مُڑا۔

مِسز جوزف ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھیں۔

"میرا نکلس ! میرا قیمتی نکلس ! کسی نے چُرا لیا !!"

وہ بے تحاشا روئے جا رہی تھیں۔ صباحت کی سمجھ میں سب کچھ آگیا تھا۔ کیونکہ عروسہ اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔

اِس بار پھر اُسے عروسہ نے دھوکا دیا۔ اپنے وقت کا ذہین ترین قانون کا محافظ حُسن سے مات کھا گیا۔

خان بہادر حاجی عاصم جاہ آج ایک یتیم خانے کا افتتاح کر رہے تھے۔ جس کا نام اُنھوں نے اپنی بیٹی کے نام پر رکھا تھا۔ وہاں بہت ہجوم تھا۔ آج اُس کی ڈیوٹی بھی وہیں لگا دی گئی تھی ——— ٹھیک پَونے سات بجے خان صاحب کی کار یتیم خانے کے وسیع لان میں آکر رُکی۔ وہ کار سے اُترے۔ اُن کے پیچھے سفید سُوتی کپڑوں میں ملبوس سنگِ مرمر کی ایک مُورتی اتری۔ لیکن جلد ہی وہ ہجوم میں چُھپ گئے اور جب وہ اُس کے قریب سے ہو کر گزرنے لگی، تب اُس نے دیکھا، وہ سنگِ مرمر کی مُورتی جس میں حوروں کا تقدّس تھا، فرشتوں کی معصومیت تھی، وہ، وہ عروسہ تھی ! اُس کا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ ہر جگہ وہ اُسے ایک نئے رُوپ میں کیوں مِل جاتی ہے ؟ اچانک عروسہ کی نظریں غیر ارادی طور پر اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ پھر جلد ہی اُس کی نظریں ہٹ گئیں۔ اِس طرح جیسے کوئی اجنبی ایک اجنبی پر نظر ڈالتا ہے۔ وہ تڑپ اُٹھا۔ جی چاہا اُسے مخاطب کرے لیکن بھرے مجمع میں وہ اُسے دیکھنے کے سِوا اور کچھ نہ کر سکا۔ اِس کے بعد کیا ہوا ؟ اِس کا ہوش اُسے نہ تھا۔

سڑکوں پر لوگوں کی جیب کاٹنے والی آوارہ گرد لڑکی کروڑپتی حاجی عاصم جاہ کی اکلوتی بیٹی ہرگز نہیں ہو سکتی ! لیکن اُس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔

ہزاروں لوگوں کے ہجوم میں وہ عروسہ کو اپنی بیٹی بنائے آگے بڑھ رہے تھے اور وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ سادہ اور سنجیدہ لباس میں نظریں نیچی کر کے چلنے والی لڑکی چور ہے۔ کلب کی شمعِ محفل تتلی ہے ـــــ "تو کیا یہ اُس کی جڑواں بہن ہے؟" اُس نے اپنا سر جھٹک دیا۔

"نہیں! نہیں! یہ باتیں صرف افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ حقیقت سے اِن کا کوئی تعلق نہیں!"

آج پھر وہ ہار کر لوٹ رہا تھا۔

عروسہ نے اُسے اِتنا پریشان کیا کہ وہ چھٹی لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ لیکن یہاں بھی اُسے سکون نصیب نہ ہو سکا۔ کیونکہ یہیں تو اُس نے عروسہ کو پہلی بار گرینڈ مارکیٹ میں دیکھا تھا ـــــ اپنی چھوٹی بہن راحت کے قُرب نے پھر بھی اُسے کافی بہلا دیا۔

راحت کے کالج کی گیدرنگ شروع ہو چکی تھی۔ آج وہ اُسے بھی کالج ڈرامہ دیکھنے پکڑ لائی تھی۔ جس میں وہ جہانگیر کا پارٹ ادا کر رہی تھی۔ پردہ اُٹھا۔ جہانگیر اور نور جہاں اسٹیج پر جلوہ گر ہوئے اور صباحت کے احساسات پر پھر بجلی گری۔ "عروسہ!"

عروسہ کا یہ رُوپ اُسے بہت ہی پیارا معلوم ہوا اور اُسی وقت اُس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ واپسی پر راحت سے ملتے ہی اُس نے بہت بے چینی سے اُس سے پُوچھا۔

"وہ نور جہاں کون تھی؟"

"میری سہیلی ہے۔"

"راحی! مذاق نہ کرو۔ بتاؤ، اُس کا پتہ کیا ہے؟"

"ارے بھیّا! تو کیا سیدھے برات لے کر پہنچنے کا ارادہ ہے!"

صباحت نے اُسے گھُور کر دیکھا۔ وہ مُسکرا پڑی۔

"اچھا! بتاتی ہوں۔ وہ یہاں ہوسٹل میں رہتی ہے اور نہاں بہادر حاجی عاصم جاہ آف۔ ۔ ۔"

"بس، بس۔ میں جانتا ہوں وہ کہاں رہتے ہیں۔"

اُس کے بعد راحت کی کسی بات کا جواب دئے بغیر وہ اُسے گھر لے آیا۔ ساری راہ وہ سوالات کی بوچھاڑ کرتی رہی اور وہ خاموش رہا۔

دھیمے سے کسی نے گھونگھٹ اُٹھایا۔ وہ سِمٹ گئی۔ اُس نے اپنی آنکھیں مُوند لیں۔

دھیمے سے کسی نے کہا۔

"آنکھیں کھولو!"

شرما کر اُس نے سر جُھکا لیا۔

"آنکھیں کھولو تمھیں میری قسم؟"

اُس نے اُس کی ٹھوڑی اوپر اُٹھائی۔ گھبرا کر عروسہ نے آنکھیں کھول دیں۔

"آپ!" وہ متحیّر رہ گئی۔

"کیوں! آج بھی مجھے پہچاننے سے انکار کرو گی؟ ـــــ آج تمھیں ہر راز سے پردہ اُٹھانا پڑے گا۔ اِتنے دنوں تک جس ذہنی اُلجھن میں مبتلا رہا، اُس اذیت کو میرا دل ہی جانتا ہے۔ آج تمھیں اپنے صحیفۂ حیات کا ہر ورق میرے سامنے کھولنا ہوگا۔ بولو تمھارا اصلی رُوپ کیا ہے بولو؟"

"میں ایک وفا شعار بیوی ہوں!"

اُس نے نظریں جھکا لیں۔ آنسو کے موتی پلکوں کی چلمن سے لڑھک پڑے۔

"اور وہ عروسہ جو سرِ بازار چوری۔ ۔ ۔!"

"میں چور نہیں!"

"پھر کیا ہو؟"

"کچھ نہیں! اپنی صفائی میں اتنا ہی کہوں گی۔ ایڈونچر کا شوق لے ڈوبا!"

"ایڈونچر! اسے ایڈونچر کہتے ہیں؟ اپنے گُناہوں کو بہت خوبصورت دیا تم نے!"

"کیا آج کی رات آپ ایسی ہی باتیں کرتے رہیں گے؟"

"ہاں! آج رات ایک دُلھن کی زندگی کی انوکھی رات ہوگی ـــــ تھانہ ـــــ حوالات ـــــ جیل ـــــ!"

"نہیں نہیں!" وہ رو پڑی۔

"میں نے کوئی جُرم نہیں کیا۔ کوئی گُناہ نہیں کیا!"

"مسز جوزف کا نکلس؟"

"وہ میں نے نہیں چُرایا تھا۔ میں اُن کے پاس ضرور بیٹھی تھی لیکن میں یہ جُرم نہیں کیا۔ خدا گواہ ہے۔ میں اپنے سُہاگ کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا!" اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

"اور میرا پرس؟"

اُس نے اپنی بھیگی پلکیں اُٹھائیں۔ اُس کی روتی آنکھیں صباحت کو اُس کے مُسکراتے چہرے سے زیادہ پیاری معلوم ہوئیں۔ عروسہ کے اِس رُوپ پر وہ دل و جاں سے فریفتہ ہو گیا۔ لیکن خاموش رہا۔

"یہ اخلاقی جُرم میں نے ضرور کیا تھا۔ لیکن میں بعد میں آپ کا پرس واپس کر دیتی۔ دراصل گھر پر والد صاحب کی طرف سے مجھ پر عائد کی گئی پابندیوں او

ہوسٹل کے آزادانہ ماحول میں کچھ شوخ لڑکیوں کی صحبت نے مجھے کچھ ایسا متاثر کیا کہ اُن کے ساتھ میں بھی ــــــ لیکن خدا گواہ ہے ہم نے کوئی خطرناک کام نہیں کیا۔ کوئی گناہ نہیں کیا۔ صرف ایڈونچر اور شرارت کی خاطر ہم کبھی کبھی ایسی حرکتیں کر لیا کرتے تھے جن سے کسی کا کوئی نقصان نہ ہوتا تھا۔ اُس روز بھی میں اکیلی نہیں تھی۔ میری کچھ فرینڈس بھی ساتھ تھیں۔"

"جو بھی تھا۔ لیکن یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ مسکراہٹیں کبھی زندگی کے آنسو بن جائیں گی۔ خدارا! مجھے معاف کر دیجئے۔"

نہ جانے کس دل سے صباحت نے کہا۔

"بہرحال تم نے ایک اخلاقی جُرم کیا ہے۔ قانون کی بھی مُجرم ہو۔ آج تم قانون کے محافظ کی گرفت میں ہو۔ پولیس کے ایک ذمّے دار آفیسر کی حراست میں ہو۔ آئندہ تم جو بھی بنو۔ لیکن آج تمھیں ہتھکڑی پہنا کے رہوں گا!"

عروسہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ ہی نے کہا تھا، یہ ہاتھ ہتھکڑی کے لئے نہیں! کسی کے گلے کا ہار بننے کے لئے ہیں۔ آج انھیں کسی گلے کا ہار بن جانے دیجئے۔ پھر بھلے ہی۔ ۔ ۔"

اُس کا گلا رُندھ گیا۔ اُس نے اپنی بانہیں پھیلائیں اور صباحت نے اُس کی پیشانی پر مُہرِ محبت ثبت کر دی!!

غزلیں

محمد غلام محی الدین حبیبی ساترؔ کلکی

اِک اشارے میں ہم نے جان و تن
تیرے چرنوں میں کر دیئے ارپن

کیا نظر آئے اُس کو حُسنِ فن
میلا ہردے کا جس کے ہو درپن

جب گھٹا برسی یوں ہوا محسوس
جیسے روئے کہیں کوئی برہن

زندگی کی بہار ہے تجھ سے
اور تجھ بِن اُجاڑ یہ جیون

دل میں یوں تیری یاد کی ہلچل
جیسے ساگر میں مچلے چندر کرن

اب بھی ہیں میکر خانۂ دل میں
یادِ ماضی کے کچھ دِیئے روشن

گوہرِ علم و فن ہیں بکھرے ہوئے
بھر لے تُو اپنے ذوق کا دامن

شعر گوئی ہے ایک فنِ لطیف
مجھ کو ساترؔ ہے اس سے حُسنِ ظن

شبابؔ للت ایم اے

کیا کام مجھے اہلِ زر و سیم و گہر سے
وابستہ ہے اُمید مری آپ کے در سے

دیوانے تو آئے ہیں کفن باندھ کے سر سے
اب موت اُٹھائے گی انہیں آپ کے در سے

رُک کر کسی مظلوم کی فریاد ہی سُن لیں
اِتنی بھی توقع نہیں اربابِ اثر سے

اُترا نہ کبھی پار محبت کا سفینہ
ڈوبا ہے یہ ساحل پہ جو نکلا ہے بھنور سے

وہ رعب و رعونت سے نکلتا نہیں ہرگز
جو کام نکلتا ہے محبت کی نظر سے

تڑپایا ہے تُو نے ہمیں اَے دشمنِ اخلاص!
جا تُو بھی ہماری ہی طرح پیار کو ترسے

تُم اِس کو بصد شوق کہو صُبحِ تمنّا
شب اچھی تھی مجھ کو تو شبابؔ ایسی سحر سے


چائے جب بھی پئیں
للت چائے ہی پئیں
صبح اٹھنے کا وقت ۔ جب سویرے کی عام سستی کو دور کرنے کے لئے پیالی بھر چائے ضروری ہوتی ہے تو یہی وقت — ٹھیک للت چائے کا وقت ہے۔
اس لئے کہ للت چائے اس ڈھنگ سے خاص طور پر مرکب کی گئی ہے کہ آپ میں حقیقتاً تر و تازگی پیدا کرے، آپ کی طبیعت میں انشراح اور اُمنگ لائے جس وقت آپ کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ للت چائے نہایت پسندیدہ قسموں کی چائے سے بنائی جاتی ہے۔ اسی لئے اس کی خوشبو مرغوب اور لذت من پسند ہوتی ہے۔ اس کی پیالی بھر تیز چائے سچ مچ تسلی بخش ہوتی ہے۔
للت
چائے
جو واقعی تسکین بخش ہے
Lalit
LEAF TEA
TATA-FINLAY
ٹاٹا۔ فنلے کی چائے
سول سیلنگ ایجنٹس:۔ ٹاٹا آئل ملز کمپنی لمیٹڈ

انسان اور بھگوان

نور شاہ

شازدا کارنر، رزیڈنسی روڈ، جموں (توی)

برادرِ محترم جناب خوشتر گرامی صاحب! آداب و خلوص

"انسان اور بھگوان" حاضرِ خدمت ہے۔ اِس دَور کے انسان کے کئی رُوپ ہیں، کچھ خوبصورت، کچھ بدصورت اور گھناؤنے۔ لیکن یہ خوبصورتی بدصورتی کی تہہ میں گُم ہو کر رہ گئی ہے اور میری کہانی کے کردار بھی بے حد بدصورت اور گھناؤنے ہیں، جنھیں قریب سے دیکھ کر بھگوان بھی لرز اُٹھا! کہانی کا اختتام چونکا دینے والا ہے اور مجھے یقین ہے کہ کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ آپ کی اور قارئینِ "بیسویں صدی" کی رائے کا شدّت سے انتظار رہے گا۔ . .

آپ کا ——— نور شاہ

★

کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ کھڑکی میں سے ہوا آہستہ آہستہ اندر آ رہی تھی باہر درختوں پہ سے جھڑتے ہوئے سوکھے پتّوں کی ہلکی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ دُور آکاش کی بلندیوں پر کالے کالے بادل بکھر رہے تھے اور کمرے کی نیم تاریکی میں شیاما سِسک رہی تھی۔ اُس کا اکلوتا بچّہ درد کی شدّت سے بے حِس ہو چکا تھا۔ وہ اُس کے سرہانے آنکھوں میں آنسو لئے یاس و حسرت سے ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی ساری پُونجی ختم ہو گئی تھی اور آج کے لئے دوا دس روپے میں آ رہی تھی۔ ڈاکٹر شرما نے اُدھار دوا دینے سے انکار کیا تھا ——— کاش آج اُس کا پتی زندہ ہوتا . . . یہی سوچتے سوچتے وہ مایوس ہو کر مندر میں بھگوان سے فریاد کرنے کے لئے چل پڑی۔

مندر خالی تھا۔ سب چلے گئے تھے اور بھگوان سنہاسن پر بیٹھا مُسکرا رہا تھا۔ شیاما دبے پاؤں مُورتی کے قریب آئی، وہ بھگوان کے ہونٹوں پر رینگتی ہوئی مُسکراہٹ کو گھورے جا رہی تھی اور آنسو اُس کی آنکھوں سے چھلکے جا رہے تھے۔ وہ ایک دلدوز آہ بھر کر گھٹنوں کے بَل بھگوان کے سامنے جُھک گئی۔ اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور گرم گرم آنسو بھگوان کے پَیر دھونے لگے۔ شیاما کا ذہن بھگوان کا دھیان کرتے کرتے کہیں دُور پہنچ گیا۔ وہ دس روپے کے بارے میں سوچ رہی تھی، کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا! اُس کے سامنے اُس کے بے ہوش بچّے کی تصویر گھوم رہی تھی ——! کاش اِس سمے بھگوان کی مُورتی کی بجائے دس روپے کا ایک نوٹ یہاں پڑا ہوتا!

اُس کا معصوم بچّہ بچ سکتا تھا۔ راہو کے بعد وہی تو اُس کی تنہا ویران زندگی کا آسرا تھا۔ اُس کے بڑھاپے کا سہارا تھا۔ کچھ دیر وہ اِسی طرح سر جُھکائے پڑی رہی اور پھر جو اُس نے ایک آہ کے ساتھ آہستہ سے سر کو اوپر اُٹھا کر دیکھا تو . . . تو وہ حیران رہ گئی۔ اُسے اپنی بینائی پر شک ہونے لگا۔ سنہاسن پر بھگوان نہ تھا، اُس کی جگہ کاغذ کا ایک رنگ دار ٹکڑا چمک رہا تھا! بھگوان نے روپے کا رُوپ دھار لیا تھا۔ شیاما کے چہرے پر یک لخت خوف، حیرت اور خوشی کے ملے جُلے تاثرات پیدا ہو گئے اور وہ سوچنے لگی۔ بھگوان کتنا عظیم ہے! اُس نے میری سُن لی ——— اب وہ چاہتی تھی کہ نوٹ کو اپنی مُٹھی میں دبا کر ڈاکٹر کی طرف بھاگے۔ لیکن ایک انجانا سا خوف مانع ہو رہا تھا۔ مندر میں وہ اکیلی تھی اور کاغذ کا ایک ٹکڑا دس روپے کے نوٹ کی صورت میں سنہاسن پر پڑا تھا۔ اُس کا ہاتھ آہستہ آہستہ آگے کی طرف رینگنے لگا۔ اُس نے نوٹ کو چھُوا اور پھر تیزی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اُسے کچھ بھی نہ ہوا۔ شیاما کبھی اپنی اُس اُنگلی کو دیکھ رہی تھی جس سے اُس نے نوٹ کو چھُوا تھا اور کبھی نوٹ کی طرف جو اُسی طرح سنہاسن پر چمک رہا تھا! جب شیاما کو ذرا سا اطمینان ہوا تو اُس نے جھپٹ کر نوٹ کو اپنے کھُردرے ہاتھوں میں چھپا لیا جیسے یہ روپے کوئی اُس سے چھین کر لے جا رہا ہو اور پھر اپنی نظروں کو گھُماتے ہوئے مندر سے باہر نکل آئی اور ڈاکٹر شرما کے پاس چلی گئی۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور دل کے نزدیک قمیص کی جیب میں رکھے ہوئے تھے

بھگوان کو اِن دھڑکنوں سے ایک عجیب سا کیف، ایک عجیب سا لُطف محسوس ہو رہا تھا!!

ڈاکٹر شرما کے کلینک میں شیاما نے نوٹ جیب سے نکال لیا لیکن وہ نوٹ ڈاکٹر کو دینے میں ہچکچا رہی تھی۔ اُس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اِس نوٹ کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتی، لیکن ایک بار پھر معصوم بچّے کی صورت اُس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگی۔ اُس کی خواہش کا دم گھُٹنے لگا۔ ڈاکٹر شرما ناک سُکیڑے شیاما کی مُٹھی میں دبے ہوئے نوٹ کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہیں یہ چوری کا نوٹ نہ ہو ——— !

بھگوان نے جب شیاما اور ڈاکٹر شرما دونوں کو خاموشی سے ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے دیکھا تو اُس نے پھسلن پیدا کر کے اپنے آپ کو شیاما کی مُٹھی سے چھُڑا لیا۔ دس روپے کا نوٹ فرش پر گر گیا۔ شیاما کا دل کانپ اُٹھا۔ کہیں بھگوان کو چوٹ نہ آئی ہو! لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ڈاکٹر شرما نے نوٹ فرش سے اُٹھا لیا۔ ایک بار پھر گھُور گھُور کر دیکھا اور اُسے اُس چھوٹی سی لکڑی کی صندوقچی میں ڈال دیا جس میں وہ دن بھر کی کمائی رکھ دیتا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے دوا بنا کر شیاما کو دی۔ شیاما ٹکٹکی باندھے صندوقچی کو دیکھے جا رہی تھی۔ ڈاکٹر شرما نے کچھ سوچ کر تیز لہجے میں کہا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

وہ چونک پڑی۔ اُس نے دوا لے لی اور باہر آئی۔ ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مُسکراہٹ دوڑ گئی۔

بلیک میں دوائیں فروخت کر کر کے جب صندوقچی روپوں سے بھر گئی تو بھگوان کا دَم گھُٹنے لگا۔ دواؤں کی بُو سے اُس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اُس بُو سے خون کی بُو آ رہی تھی۔ تپِ دق کے مریضوں کی کھن کھن۔ ڈاکٹر شرما کے کلینک میں اُسے نِت نئی بیماریوں کے نام معلوم ہوئے۔ بھگوان سوچنے لگا یہ اِتنی ساری بیماریاں کہاں سے پیدا ہو گئیں؟ میں نے جب آدم کو اِس دھرتی پر بھیجا تھا تو یہ بیماریاں اُس کے ساتھ نہ تھیں، وہ صحت مند تھا۔ اِتنے میں اُسے اپنے اوپر کچھ زیادہ بوجھ محسوس ہوا۔ یہ نوٹوں کا ایک بڑا سا بنڈل تھا! ڈاکٹر شرما کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور پھر بھگوان کو ایک آواز سُنائی دی۔ اِس آواز میں ایک اَن دیکھا سا غرور تھا۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کا معاوضہ ہے۔ لیکن کوئی ایسی دوا دیجئے کہ بس بچّے کا نام و نشان کہیں نہ رہ جائے اور وہ یہ دُنیا دیکھے بغیر پیٹ ہی میں ختم ہو جائے! آپ جانتے ہیں ڈاکٹر صاحب! عزّت دار آدمی ہوں۔ کس کس بچّے کو اپنا بچّہ کہتا رہوں۔"

یہ الفاظ بھگوان کے کانوں میں گونجنے لگے اور وہ تھر تھرا سا گیا۔ معصوم بچّے کا قتل!! اِس سے آگے وہ کچھ بھی نہ سُن سکا، کچھ بھی نہ سوچ سکا!

رات گئے ڈاکٹر سارے دن کی کمائی جیب میں رکھ کر اپنے کلینک سے باہر آیا۔ گاڑی میں بیٹھا اور ڈرائیور سے کہا ——— "کلب چلو!" گاڑی کئی سڑکوں پر پھسلتی ہوئی ایک بڑی عمارت کے لان میں کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر شرما گاڑی سے اُتر کر ایک بڑے ہال میں داخل ہوا۔ یہاں بھگوان نے ایک نئی دُنیا دیکھی، نئے ماحول کو دیکھا، نئے لوگوں کو دیکھا۔ نیم عریاں عورتیں، بہکے ہوئے مرد، بکھرے ہوئے تاش کے پتّے، شراب سے بھرے جام! اُس نے اپنی پلکیں اُٹھا کر دیکھا۔ وہ جنگل کہیں نہ تھا جہاں گوتم کو نروان حاصل ہوا تھا۔ وہ ندی نالے کہیں نہ تھے جہاں انسان اپنی پیاس بُجھاتا تھا۔ وہ جنگل ایک چھوٹے سے ہال میں تبدیل ہو گیا تھا جہاں کسی کی بیوی کسی دوسرے مرد کے ساتھ تھی، کسی کا خاوند کسی اجنبی عورت کی آنکھوں میں اپنی صورت تلاش کر رہا تھا۔ وہ لوگ اپنی پیاس شراب سے بُجھاتے تھے۔

ڈاکٹر نے کئی پیگ اُنڈیل لئے اور پھر بیرے کا خاموش اشارہ پا کر ہال سے باہر آیا اور ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا جہاں ایک جوان عورت جس کے بال کولھوں تک لمبے تھے، پہلے ہی موجود تھی۔ بھگوان یہ سب دیکھ رہا تھا اور اُس کے دل میں ایک گُدگُداہٹ سی ہو رہی تھی۔

"تم آ گئے؟ بہت دیر کی تم نے آج!" عورت نے پُوچھا۔

"ہاں، کچھ مریض زیادہ تھے آج ——— وہ کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پُوچھا۔

"وہ گھر میں ہے، پھر بہانہ کر کے آئی ہوں۔"

ڈاکٹر اور قریب آیا ——— "تم کتنی خوبصورت ہو مالا!"

اور اُس کے بعد بھگوان نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھُونس لیں۔ آج آدم کی اَولاد ایک نئے رُوپ میں اُس کے سامنے تھی۔ آج حوّا کی بیٹی ایک عجیب سے انداز میں اُس کے سامنے تھی ——— یہ کیسا مِلن ہے، یہ کیسا پیار ہے، یہ کیسی زندگی ہے؟ کیا میں نے آدم کو بس اِسی لئے جنم دیا تھا ——— بھگوان نے سوچا۔

کافی دیر بعد ڈاکٹر شرما کمرے سے باہر آیا اور پھر ہال میں داخل ہو گیا۔ کئی اور پیگ اُنڈیل ڈالے اور ایک میز کے قریب آ کر دوسرے لوگوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں شامل ہو گیا۔ تاش چلتے رہے، پتّے بِکھرتے رہے، نوٹ سرکتے رہے ——— جب ڈاکٹر کلب سے باہر آیا اُس کی جیب کافی ہلکی ہو گئی تھی۔ گاڑی میں قدم رکھتے ہی اُس کی نظر بیرے پر پڑی۔ اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ بیرے کو تھما دیا۔ بیرے نے بھرپور نظروں سے نوٹ کی طرف دیکھا۔ دس روپے کا نوٹ تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مُسکراہٹ بکھر گئی۔ بھگوان نے چاہا کہ ابھی اپنا رُوپ بدل کر مندر میں سنہاسن پر اپنی جگہ سنبھال لے، پھر نہ جانے کیا سوچ کر خاموش رہا۔

اب رات کافی ہو چکی تھی اور کلب کا بیرا تارا بائی کے ہاں اُس کا گانا سُن رہا تھا ——— "ساری ساری رات مجھے نیند نہیں آتی" ——— موٹی بھدّی آواز، بے حد بدصورت ماحول! اور دس روپے کا نوٹ بیرے نے اپنی اُنگلی سے یوں لپٹا لیا تھا جیسے

وہ بھگوان نہ ہو، ایک سگریٹ ہوا موٹی بھدی آواز رات کی تاریکیوں میں اُبھرتی رہی اور دوسری صبح نوٹ تارا بائی کی سنگار میز پر کئی اور ایسے نوٹوں کے ساتھ پڑا تھا۔ بیرا نہ جانے کب چلا گیا تھا۔ تارا بائی سو رہی تھی اور بھگوان من ہی من میں سوچ رہا تھا ــــــ 'ان کے لئے رات جاگتی ہے اور دن سوتا ہے!'

کافی دن چڑھے جب تارا بائی سنگار میز کے قریب آ کر بیٹھ گئی تو بھگوان نے دیکھا، موٹا بدصورت پن اور نکھر آیا ہے۔ تارا بائی نے کل رات کی کمائی گن لی اور دس روپے کا نوٹ اپنی بوڑھی ماما کو دے دیا تاکہ وہ بازار سے سودا سلف خریدے اور یوں طرح بھگوان تارا بائی کے ہاتھوں سے نکل کر تارا چند جنرل مرچنٹ کے ہاتھوں میں آگیا۔ دُکان پر ایک بھرپور نظر ڈالتے ہوئے بھگوان کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ ہر چیز میں ملاوٹ، ہر شے میں بناوٹ اور پھر انصاف کا ترازو ہاتھ میں لئے خود تارا چند کم تول رہا تھا اور بار بار بھگوان کا نام لے کر لوگوں کو لوٹ رہا تھا۔ بھگوان نے سوچا نہ جانے تارا چند کے ہونٹوں پر یہ کس بھگوان کا نام بار بار آتا ہے؟ اور پہلی بار بھگوان کو احساس ہوا کہیں اس کائنات میں میرے علاوہ کوئی اور بھگوان تو نہیں ہے؟ کہیں بھگوان میں بھی ملاوٹ اور بناوٹ تو نہیں آگئی ہے!

اور پھر دیکھتے دیکھتے تارا چند جنرل مرچنٹ کے بہی کھاتے ضبط کر لئے گئے۔ کچھ لوگ آگئے اور دُکان کا حساب و کتاب دیکھنے لگے۔ اصل کہیں بھی نہ تھا بس نقل ہی نقل تھا! ان بہی کھاتوں میں بھی ملاوٹ اور بناوٹ تھی۔ نفع کی بجائے نقصان دکھایا گیا تھا اور پھر انکم ٹیکس دینے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا، اُس سمے بھگوان بھی کانپ اُٹھا جب تارا چند کی کتابیں اور بہی کھاتے واپس کئے گئے اور نوٹوں کی ایک بڑی گڈی انکم ٹیکس آفیسر کی جیب میں چلی گئی۔ ان نوٹوں میں بھگوان بھی شامل تھا!

بھگوان نے اپنے نئے مالک کے ساتھ چند ہی لمحے گزارے کیونکہ انکم ٹیکس آفیسر نے ان میں سے کچھ نوٹ اخبار کے ایڈیٹر کے حوالے کر دئے اور اُس سے التجا کی کہ یہ خبر اخبار میں شائع نہ ہو۔ اخبار کے دفتر کا ماحول بھی اپنی نوعیت کا تھا، ہر بات پر چائے اڑ رہی تھی، سگریٹ پھونکے جا رہے ہیں۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو غلط لکھ کر شائع کیا جا رہا ہے۔ کوئی سچائی نہیں، کوئی محبت نہیں، لوگ ہیں کہ جینے کے لئے جی رہے ہیں، موت کی کوئی پرواہ نہیں۔ لوگ بھول چکے ہیں کہ اس دُنیا کے علاوہ ایک اور دُنیا بھی ہے، ایک اور کائنات ہے جہاں سچ اور جھوٹ کو پرکھا جائے گا۔ جہاں نیکی اور بدی کے لئے جزا اور سزا ملے گی اور بھگوان اُس لمحے چونک پڑا جب ایڈیٹر نے کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بھگوان کے وجود سے انکار کیا۔ انسان کتنا بدل گیا ہے، وہ انسان کہاں ہے جسے بھگوان نے جنم دیا تھا، اس دھرتی پر بھیجا تھا، امن اور شانتی کے پھول کھلانے کے لئے!

"وہ خبر ذرا تفصیل کے ساتھ لکھنا" ایڈیٹر نے اپنے سب ایڈیٹر سے کہا۔

"کون سی خبر؟"

"تم نے سُنا نہیں، مندر سے بھگوان کی مورتی کسی نے غائب کر دی ہے! پولیس چور کی تلاش میں ہے۔ عجب زمانہ آگیا ہے۔ اب بھگوان بھی چوری ہونے لگے!" ایڈیٹر نے جواب دیا۔

"نہ جانے کتنے لوگوں کی شامت آگئی ہے، کتنے معصوم لوگ دھر لئے جائیں گے" سب ایڈیٹر نے کہا۔ ایڈیٹر نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور بھگوان کو محسوس ہوا جیسے یہ قہقہہ اُس کے وجود کا مذاق اُڑا رہا ہے۔

دس روپے کا یہ نوٹ ایڈیٹر کی جیب سے اُس وقت باہر سرک آیا جب ایڈیٹر شراب پی کر بے ہوش ہو گیا۔ ناجائز شراب بنانے والے پر پولیس کا چھاپہ پڑا۔ پولیس اُسے پکڑ کر لے گئی اور دس روپے کا نوٹ پولیس انسپکٹر کی جیب کی زینت بنا پھر اُس نے کئی جیبیں دیکھیں۔ کوئی بلیک مارکیٹ کا دھندا کرتا تھا، کوئی شراب کا اور کوئی ملاوٹ کا۔ خالص اور اصلی شے کہیں بھی نہ تھی، کسی کے پاس بھی نہ تھی ــــــ بھگوان کا دل اس دُنیا اور اس کائنات سے بھر گیا۔ اُس نے جس دُنیا کی تخلیق کی تھی وہ کہیں بھی نہ تھی۔

اور ایک شام جب سارا آکاش کالے بادلوں سے گھرا ہوا تھا، بھگوان نے اپنے وجود کو حرکت دی اور ایک اجنبی جیب سے سرک آیا۔ وہ کافی دیر تک سڑک پر پڑا رہا۔ اتنے میں کچھ لوگوں کی نظریں سڑک پر پڑے ہوئے دس کے نوٹ پر جا پڑیں۔ کئی ہاتھ ایک ساتھ آگے بڑھے۔ لیکن ہوا کا ایک جھونکا آیا اور نوٹ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ ایک عجیب تماشا تھا، کئی نظریں تھیں، کئی ہاتھ تھے اور کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ ہوا کے جھونکے آتے رہے، نوٹ اُڑتا رہا، سرکتا رہا۔ لوگ مایوس ہو کر لوٹ گئے اور بھگوان مُسکرانے لگا۔ مُسکراتے مُسکراتے بھگوان کو شیاما یاد آئی۔ شیاما کا بچہ بیمار نہ ہوتا تو شاید وہ یہ سب کچھ نہ دیکھ پاتا۔ اُس نے اپنے وجود کو ایک اور حرکت دی اور ہوا کے دوش کے ساتھ وہ دوسرے لمحے شیاما کے کمرے میں تھا!

کمرے میں بے حد تاریکی تھی۔ شیاما رو رہی تھی اور روتے روتے ڈاکٹر شرما کو کوس رہی تھی جس نے غلط دوا دے کر اُس کے بچے کی جان لے لی تھی۔ دفعتہً بجلی چمکی اور شیاما نے اپنے سامنے ایک دس روپے کا نوٹ دیکھا۔

"بھگوان ــــــ!!" شیاما کے مُنہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ اُس نے دس روپے کا نوٹ اُٹھایا اور تیز تیز قدموں سے مندر کی طرف چل پڑی۔

مندر خالی تھا۔
بھگوان کی مُورتی کہیں بھی نہ تھی۔
شیامانے دس روپے کا نوٹ سنہاسن پر رکھا اور دبے پاؤں مندر سے لوٹ آئی۔

دوسری صبح اخباروں میں یہ خبر پڑھی گئی کہ مندر سے بھگوان کی جو مُورتی چُرائی گئی تھی، مندر میں پائی گئی ہے۔ لیکن پولیس ابھی تک چور کا پتہ نہ لگا سکی۔
اور بھگوان سنہاسن پر بیٹھا مُسکرا رہا تھا!!

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے۔ بصورتِ دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

غزل

مسعودہ حیات ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

کبھی شادماں ہو کر آنسو بہائے
کبھی فرطِ غم میں بھی ہم مُسکرائے

بہارِ گل و نسترن رنگ لائے
خزاں کے چمن سے جو اُٹھ جائیں سائے

وہ مجبورِ غم کیوں نہ آنسو بہائے
خوشی جس کے سائے سے دامن بچائے

بمقدور ہم نے جہاں سے نباہی
ستم ورنہ دنیا نے کیا کیا نہ ڈھائے

خوشی چاہتا ہو جو اہلِ جہاں کی
وہ اپنی مسرت پہ کیا مُسکرائے

بجھانے اُٹھیں آندھیاں ہر طرف سے
چراغِ محبّت جو ہم نے جلائے

وہی آج بیگانۂ رسمِ دل ہیں
جنھیں ہم نے آدابِ اُلفت سکھائے

کمی ہے حیات اپنی سعیٔ عمل میں
ضرورت ہے اب دل نئے غم اُٹھائے

عنیز احمد صوفی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

رازِ غمِ پنہاں بھی ہو جاتا ہے افسانہ
جس طرح کوئی اپنا بن جاتا ہے بیگانہ

میں معتقدِ ساقی، دلدادۂ میخانہ
لیکن مری قسمت کا خالی رہا پیمانہ

گلشن کے اندھیروں میں تنویر تو کچھ پھیلی
کیا غم جو جلا ڈالا، خود اپنا ہی کاشانہ

اے پیکرِ خاموشی! اُس کا بھی خدا حافظ
تنگ آ کے تغافل سے ہو جائے جو دیوانہ

احساس کی شدّت سے لَو دیتی ہے تنہائی
داغِ دلِ محزوں سے جلتا رہا غم خانہ

فریاد و فغاں کا میں قائل تو نہیں لیکن
جب خوابِ مسرّت ہو تعبیر سے بیگانہ

آوارۂ منزل پھر تنظیمِ سفر کر لیں
آواز اگر دیدے وہ کوچۂ جانانہ

محرابِ دل و جاں میں وہ شمع بجھی صوفی
جس شمعِ محبّت کا برسوں رہا پروانہ

یادوں کے سائے

شاہدہ حسن ایم۔اے

سی آئی۔ ۵۹، آئی۔ آئی۔ ٹی کھڑگ پور، مغربی بنگال

محترم خوشتر بھائی! آداب

. . . خاموش ایثار کا ایک تاثر انگیز افسانہ پیشِ خدمت ہے۔ اگر پسند آجائے تو شریکِ اشاعت کرلیں۔ مجھے یقین ہے کہ احساس و جذبات سے بھرپور یہ افسانہ دلوں کی گہرائیوں کو چھوئے بغیر نہ رہ سکے گا ——— میں اُن تمام بھائیوں اور بہنوں کی شکرگزار ہوں جنھوں نے میرے پہلے افسانے کے بارے میں پسندیدگی کے خطوط لکھے اور اُسے سراہا۔ خصوصاً جناب نور شاہ اور آسی صاحب نے میری بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی ہے . . .

بصد خلوص و احترام ——— شاہدہ حسن

★

"سُنئے! کب سے چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" عذرا نے مجھے یاد دلایا اور میں خجل ہوکر جلدی جلدی چائے پینے لگا۔

"سُنو عذرا! ذرا سامنے والی کھڑکی بند کردو بہت تیز ہوائیں آرہی ہیں۔"

عذرا نے اُٹھ کر کھڑکی بند کردی اور میں پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھ کر مُسکرانے لگا۔ اُس نے میرے شانوں سے کوٹ اُتار کر الماری کے ہینگر میں لگا دیا اور تیز تیز قدموں سے زینے سے اُترنے لگی۔ شاید پنکو اُسے پُکار رہا تھا۔

تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کھڑکی پھر کُھل گئی۔ میرے آنگن میں لگا ہوا گل مہر کا درخت رُزدیدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ یاد کی وادیوں میں آندھیاں چلنے لگیں اور مجھے نہ جانے کیا کچھ یاد آتا چلا گیا۔ میں اپنی زندگی کا جائزہ لینے لگا ہوں۔

عذرا سے میری شادی کو کئی سال ہوچکے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی زندگیوں کی طرح میری زندگی بھی آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ عذرا کے پیار بھرے لمس سے میری صبح کی ابتدا ہوتی ہے اور اُسی کی پیار سے بھرپور دُنیا میں سمٹ کر میں سو جاتا ہوں۔ سب ہی کہتے ہیں عذرا بے حد حسین ہے۔ وہ وفا شعار ہے، سلیقہ مند ہے اور اُس کی شخصیت میں ہزاروں خوبیاں رچی بسی ہیں۔

میری زندگی کا زیادہ وقت خدمتِ خلق میں گزرتا ہے۔ اپنے شہر میں بے حد مقبول اور مشہور ڈاکٹر کی حیثیت مجھے حاصل ہے۔ ایک انسان کو اور چاہئے بھی کیا۔ عزّت، شہرت اور دولت۔ سب ہی کچھ تو میرے قدموں میں سمٹ کر آگیا ہے۔ لیکن پھر زندگی میں یہ خلاء کیوں؟ ——— اپنا وجود تشنۂ تکمیل سا کیوں معلوم ہوتا ہے؟ یہ تشنگی کا احساس کیوں ہے؟ زندگی میں جب بھی فرصت کے لمحات نصیب ہوتے ہیں خیالوں کے ہر موڑ پر بیتے دنوں کی قندیلیں روشن ہوجاتی ہیں۔ ہزاروں یادوں کے کارواں دل کے بند دریچوں کو کھٹکھٹانے لگتے ہیں۔ کتنے ہی بے نام زخموں کا احساس ہونے لگتا ہے اور پھر کہیں دل کے آس پاس وہ انگارے بھی دہک اُٹھتے ہیں جو برسوں سے میرے وجود کو جُھلس رہے ہیں۔

ہاں صبا! مجھے چار سال پہلے کی وہ شام اب بھی اُسی طرح یاد ہے جیسے ابھی ابھی گزری ہے اور تم ابھی ابھی میرے پاس سے اُٹھ کر گئی ہو۔ ساری فضا تمھارے حسین وجود کی خوشبو سے مہکی مہکی سی ہے۔ میں اپنے کمرے میں پڑھتے پڑھتے چونک پڑا ہوں۔ ہاں یہ تمھاری ہی آواز ہے۔ نغمہ ریز و نغمہ ساز آواز! ——— تم آئی ہو اور سامنے دالان میں بیٹھی امّی سے کچھ باتیں کر رہی ہو۔ امّی اپنے مُرجھائے چہرے اور اُداس لہجے میں کچھ کہہ رہی ہیں۔ امّی کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ اور تاثّرات سے میں سمجھ گیا ہوں۔ یہ میری دونوں بہنوں کی شادی کی بات ہے۔ رضیہ باجی جو مجھ سے کئی سال بڑی ہیں اور رفّو جو مجھ سے ڈیڑھ سال چھوٹی ہے۔ بارہا امّی کے چہرے پر فکروں اور مایوسی کے یہ آتے جاتے رنگ میں نے دیکھے ہیں۔

شباب

ابھی شباب ہے کر لوں خطائیں جی بھر کے
پھر اِس مقام پہ عمرِ رواں ملے نہ ملے ——— آنند نرائن مُلّا

یہ مے چھلک کہ بھی اِس حسن کو نہ پہنچ سکی
یہ پھول کھل کے بھی تیرا شباب ہو نہ سکا ——— اختر شیرانی

اُس فتنۂ شباب کا عالم نہ پوچھئے
اِک حشر اُٹھ رہا ہے تماشا لئے ہوئے ——— حفیظ جالندھری

آیا تھا ساتھ لے کے محبت کی آفتیں!
جائے گا جان لے کے زمانہ شباب کا ——— جگر بسوانی

وہ شباب کے فسانے جو میں سُن رہا ہوں دل سے
اگر اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا ——— ثاقب

مرسلہ:- مریم یوسف بھوپال

"ہاں صبا! خاندان سے خاندان نہیں مِلتا، ہڈّی سے ہڈّی نہیں ملتی اور اگر یہ سب کچھ مِل جاتا ہے تو لڑکا قاعدے کا نہیں مِلتا۔ کتنی ہی راتیں آتی ہیں اور بیت جاتی ہیں۔ آنکھیں نیند کو ترس گئی ہیں بیٹی! تمھارے خالو صاحب بھی اِسی فکر میں گھُلے جا رہے ہیں کہ کسی طرح اپنی زندگی میں لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کر دیں۔" امّی نے اپنے دل کا سارا دُکھ درد تمھارے سامنے رکھ دیا۔ تم نے پریشان نظروں سے امّی کی طرف دیکھا۔

"لیکن خالہ جان! اُس رشتے کا کیا ہوا جس کا تذکرہ آپ نے چند دن پہلے امّی سے کیا تھا؟"

"وہ مسئلہ بھی بہت ٹیڑھا ہے بیٹی! اگر وہاں ہو جائے تو میری بچّیوں کی قسمت چمک اُٹھے۔ جج صاحب کا بہت اچھا خاندان ہے اور اُن کے دونوں لڑکے بہت لائق اور خوبصورت ہیں۔ بڑا لڑکا آئی۔اے۔ایس افسر اور چھوٹا انجینئر ہے۔ لیکن وہ لوگ بدلے کی شادی چاہتے ہیں۔ اُن کی ایک لڑکی عذرا ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں اُس کی شادی میرے عرفان سے ہو جائے۔"

اور اب تم ایکدم سے چونک پڑی ہو۔

"عرفان!" تمھاری زبان سے بے ساختہ میرا نام پھسل گیا ہے اور پھر تم پھروں آنگن میں کھڑے گل مہر کے پیڑ کو تکتی رہی ہو جو حسین پھولوں سے لد گیا تھا۔ امّی پاندان کھولے چھالیہ کترنے میں مشغول ہیں۔ اُنھیں کیا معلوم کہ تم پر کیا گذری ہے۔ تمھارے دل میں کتنے طوفان اُٹھے ہیں۔ چہرے پر کتنے رنگ آئے اور گئے ہیں اور پھر تم نے اُسی لمحہ گل مہر کے سُنہرے پیڑ سے نظریں ہٹا لیں۔

"تو پھر اِس میں مشکل ہی کیا ہے۔ یہ مسئلہ تو بہت آسان ہے۔" آج زندگی میں پہلی بار مجھے تمھاری آواز اجنبی سی معلوم ہوئی ہے۔

"نہیں صبو! یہ بات اِتنی آسان نہیں۔ عرفان اِس بات پر سر نہیں ہلاتا۔ جب بھی یہ بات چھیڑو نہ جانے کیوں وہ اُداس ہو جاتا ہے۔ میں نے بڑے ارمان سے عرفان کو پالا ہے۔ وہ ہم سب کی تمنّاؤں کا مرکز ہے۔ میں اُسے اُداس نہیں دیکھ سکتی۔ اُس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن اب تم ہی سوچو صبو! شادی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ دونوں بچّیاں اپنی تعلیم ختم کر چکی ہیں۔ اگر ایک دو سال کے اندر شادی نہ ہو سکی تو آتے ہوئے رشتے بھی بند ہو جائیں گے۔ اچھے بُروں کی زبان کو کون روک سکا ہے۔ ہزاروں باتوں کے ساتھ ایک بات اور بھی بڑھا دیں گے کہ لڑکیاں بوڑھی ہیں۔"

امّی کا گلا ایکدم سے رُندھ سا گیا ہے اور اُنھوں نے جلدی سے اپنے آنچل سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھ لی ہیں۔ تم گھبرا کر کھڑی ہو گئی ہو اور تیزی سے چند زینے طے کر کے میرے کمرے میں آ گئی ہو۔ میں نے میز پر بکھری ہوئی کتابوں پر اپنا سر رکھ دیا ہے۔ نہ جانے کیوں میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ نہ جانے تم مجھ سے کیا کہو۔ حسبِ عادت تم نے آ کر اپنی گداز اور حسین بانہیں میرے شانوں پر پھیلا دی ہیں۔

"آخر تم نے کیا تماشا بنا رکھا ہے عرفان! خالہ امّاں سے ہاں، کیوں نہیں کہہ دیتے؟"

میں حیرت سے تمھیں دیکھنے لگا ہوں۔ "یہ تم کہہ رہی ہو صبا! میرے سارے خوابوں کا کیا ہوگا۔ بچپن میں ہم نے جو گھروندے بنائے تھے۔ گل مہر کی بانہوں میں پیار کے جو جھولے ڈالے تھے۔ اُس کے سائے میں بیٹھ کر مستقبل کے جو خاکے بنائے تھے۔ جن خاکوں میں رنگ بھرا تھا، اُن سب کا کیا ہوگا؟ وہ سب کیسے مِٹ سکیں گے؟ وہ سب کیسے بُھلائے جا سکیں گے؟"

میں کراہ اُٹھا ہوں اور نہ جانے کیا کیا کہتا گیا ہوں ——— تم نے بڑھ کر میرے مُنہ پر اپنی اُنگلیاں رکھ دیں۔

"بچپن کے گھروندے، لڑکپن کے کھیل، جوانی کے خواب وہ سب بھول جاؤ عرفان! بچے تو کتنی ہی چیزوں کے لئے مچلتے ہیں۔ کیا سب چیزیں اُنھیں مل جاتی ہیں؟ جوانی میں انسان کتنے ہی خواب دیکھتا ہے۔ کیا وہ سب پورے ہو جاتے ہیں؟ رات کے خواب صبح ہوتے ہی انسان بھول جاتا ہے۔ وہ سب بھی خواب و خیال کی باتیں سمجھ لو عرفان! وقت سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی چارہ گر نہیں۔ اُس کے پاس ہر درد کا مداوا اور زخم کا مرہم ہے۔ تم خالہ امّاں کو آج ہی اپنی مرضی دے دو۔ تمھیں ہماری قسم! تم نے ہمیشہ میری

بات مانی نہ گیا آئی! اتنی سی بات نہ مانوگے۔ کیا تم خالہ امّاں کی بے بسی کے آنسو دیکھ سکوگے؟ اچھا اب میں چلی!" اور پھر تم تیزی سے چلی گئیں بہت بے دردی سے اپنا فیصلہ سُناکر۔ تم نے مڑکر بھی نہ دیکھا۔ تم امّی سے بھی نہ ملیں اور میں پہروں اُن زینوں کی طرف دیکھتا رہا جہاں اب بھی تمھارے قدموں کی آہٹ گُونج رہی تھی۔

صبا! میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم میری وفا کا اتنا سخت امتحان لوگی میرے ظرف کو اس طرح آزماؤ گی۔ تم تو "اتنی سی بات" کہہ کر چلی گئیں۔ لیکن یہ بات 'اتنی سی' نہ تھی۔ شاید تمھیں معلوم نہیں کہ سارے خوابوں کی نوعیت ایک سی نہیں ہوتی۔ کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو حقیقتوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ کچھ زخم ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں وقت کی چارہ گری حیران رہ جاتی ہے۔ مستقبل کے خاکوں میں کچھ رنگ انسان ایسے بھی بھرتا ہے جنھیں کوئی بھی نہیں مٹا سکتا۔ کوئی بھی نہیں!

اب تو عنوانِ حیات بدل چکا ہے۔ زندگی کی کتنی شامیں گزر چکی ہیں۔ کتنی صبحیں بیت چکی ہیں۔ میری شادی کے بعد ایک ہفتے کے اندر دونوں بہنیں بیاہ کر اپنے گھر چلی گئیں۔ اُن کی نئی زندگی بہت خوشگوار ہے۔ امّی ابّا کے چہروں سے بھی فکروں کی سب لکیریں مٹ چکی ہیں۔ اُن کا بڑھاپا میرے بیٹے پنکو کے معصوم بچپن سے کھیلتا اور بہلتا رہتا ہے اور تمھارے لئے رشتوں کی کیا کمی تھی۔ تم بھی بیاہ کر کہیں دُور جا چکی ہو ——— اور اب یہاں کہیں عذرا کے کھنکتے قہقہے ہیں، کہیں پنکو کی معصوم شرارتیں۔ صبح بھی نکھر نکھر کر آتی ہے اور شام بھی سجی سجی سی ——— اور اب بھی جب شام ڈھلے میں مطب سے گھر آتا ہوں اور اپنے کمرے میں اُس کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا ہوں جہاں سے گُل مہر کا درخت صاف نظر آتا ہے تو مجھے وہ رات پھر یاد آجاتی ہے جب یہ درخت رنگ برنگے قمقموں سے سجا تھا۔ مراثنیں لہک لہک کر شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ ہر طرف رنگ برنگے لباس، خوشیاں، قہقہے ——— ہاں یہ رات میری شادی کی رات تھی۔

کئی دنوں سے سارا گھر، سارا خاندان شادی کے اہتمام میں مشغول تھا۔ ہاں صبا! جب بھی تم پر نظر گئی تمھیں بھی ہر کام میں پیش پیش پایا۔ یہ سچ ہے کہ اُس دن کے بعد سے میں نے کبھی تمھیں نظر بھر کر نہ دیکھا۔ میں تم پر اور تمھارے ظرف پر حیران تھا۔

پھر گھر میں ایکدم سے شور و غل میں اضافہ ہوگیا۔ اُلٹی سیدھی رسمیں شروع ہوگئیں۔ پھر بارات جانے کو تیار ہوگئی اور پھر مجمع سے کوئی بڑا بوڑھا بول اُٹھا: "ارے کوئی دولہا کے سر پر آنچل تو ڈالو!"

امّی تمھیں پکارنے لگیں۔ معلوم نہیں تم اُس وقت کہاں تھیں۔ بہت دیر بعد تم آئیں اور پھر سنہرے روپہلے لچکوں اور کرنوں سے سجا ہوا آنچل میرے سر پر پھیل گیا۔ میں نے اپنی جلتی ہوئی پلکیں بند کرلیں۔ پھر اچانک مجھے اپنی گردن اور شانوں کے پاس کسی گرم گرم شے کا احساس ہوا اور پھر وہ گرم گرم دھارے میری گردن کے پاس

میکدہ

جب میکدہ چُھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو ——— غالب

پینے والے ایک ہی دو ہوں تو ہوں
مفت سارا میکدہ بدنام ہے ——— جگر مرادآبادی

میکدے میں کبھی آ کبھی واعظ
ایک دُنیا یہاں بھی بستی ہے ——— ساحر ہوشیارپوری

میکدے سے کہ تیری آنکھوں سے
کس سے قطعِ تعلّقات کریں ——— قدم

اگر زندگی خود ہی اِک میکدہ ہے
تمنّائے جام و سبو کیا کریں ہم ——— نریش کمار شاد

مُرسلہ:- ایل۔ آر۔ چودھری بی۔ اے۔ نئی دلّی

سے ہوتے ہوئے میرے دل کے آس پاس پھیل گئے اور پھر انگارے بن بن کر میرے دل میں اُتر گئے۔ مجھے اپنا وجود جلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ میرے قدم ڈگمگا سے گئے اور پھر کسی شوخ لڑکی کا جملہ میرے کانوں میں گُونج اُٹھا۔

"ابھی سے یہ عالم ہے! جب چاند سی دُلھن پر نظر پڑے گی تب کیا ہوگا!" پھر ایکدم قہقہوں کا طوفان آگیا۔

صبا! تم نے کہا تھا نا کہ وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے۔ اب اُس کی چارہ گری کیا ہوگئی؟ ——— کبھی کے خواب اب بھی میری آنکھوں میں کیوں سجتے ہیں۔ اب بھی بیتے دنوں کی قندیلیں میری تنہائیوں میں کیوں روشن ہوجاتی ہیں۔ تمھاری یادوں کے سائے اب بھی میرے ساتھ ساتھ کیوں رہتے ہیں ——— گُل مہر کا درخت اب بھی مجھے حیرت و حسرت سے دیکھا کرتا ہے۔ جب بھی اپنی الماری کھولتا ہوں، اُس کے اندر کے رنگ برنگے سوئٹر مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ جن کے ہر ہر خانے میں تمھاری اُنگلیوں کا لمس ہے۔ جن میں تمھاری بے پناہ اور لازوال محبت کی مہک ہے۔ جب بھی بکس کھولتا ہوں چھوٹے چھوٹے حسین پھولوں سے بھرے ہوئے کتنے ہی رُومال مجھے پکارنے لگتے ہیں۔ جب بھی کبھی کتابیں قرینے سے رکھ دی جاتی ہیں، گلدان میں تازہ پھول سج

جاتے ہیں، تمھاری یاد انگڑائی لے کر جاگ اُٹھتی ہے ـــــ اور جب بھی کمرے کی بے ترتیبی حد کو پہنچتی ہے تب بھی تمھاری یاد مُسکرا اُٹھتی ہے۔ میری بے پروائی کی عادت سے عاجز آکر تم کمرے کا حلیہ اور بگاڑ دیتی تھیں نا؟ ـــــ جب بھی البم کھُل جاتا ہے، ہر طرف تم ہنستی مُسکراتی نظر آتی ہو اور میں پہروں گھنگھور گھٹاؤں اور جھیل کی گہرائیوں میں ڈوبتا رہتا ہوں۔

اکثر جب آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں۔ کنگھی کرتے کرتے ہاتھ ایکدم سے رُک جاتے ہیں۔ تمھیں میرے یہ گھنے بکھرے بکھرے بال بے حد پسند تھے نا! ـــــ جب بھی الماری سے کوئی کتاب نکالتا ہوں، کوئی ناول پڑھتا ہوں۔ ہر ہر صفحے پر تمھاری رائے، تمھاری تنقیدیں، ذرا ذرا سی بات پر لڑنے کا انداز پھر من جانے کی ادا، تمھاری پُرزور بحثیں، تمھاری پسند ناپسند، سب ہی یاد آتی چلی جاتی ہے۔

یہ گرد و پیش، یہ حسین درخت، یہ میرا چھوٹا سا گھر، سب ہی تو بیتے دنوں کی یادوں سے بسا ہوا ہے۔ اِس کے ہر طاق، ہر محراب اور ہر جھروکے سے زندگی کا کوئی شریر لمحہ، کوئی شوخ اور رنگین یاد جھانکتی رہتی ہے۔ انسان کن کن چیزوں سے آنکھیں بچا سکتا ہے۔ اکثر عذرا پُوچھ بیٹھتی ہے۔

"آپ کبھی کبھی خاموش سے کیوں ہو جاتے ہیں؟ میں نے تو اپنی سہیلیوں سے سُن رکھا تھا آپ بے حد زندہ دل اور شریر ہیں"

اب تمھیں بتاؤ صبا! میں اُسے کیا بتاؤں کہ وہ کون سے انگارے ہیں جو اکثر تنہائی میں میرے دل کے آس پاس دہک اُٹھتے ہیں۔ جن سے میرا سارا وجود جُھلس جُھلس کر رہ جاتا ہے۔

تمھارے الفاظ آج بھی کان میں گونج اُٹھتے ہیں اور میں اُنھیں کا سہارا لے کر وقت کی طرف حسرت د اُمید سے دیکھ رہا ہوں۔ شاید وقت کے سرد قدم اِن انگاروں کو کُچل کر راکھ کر دیں۔

صبا! کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ یادوں کے یہ الاؤ، یہ کسک، یہ خلش، پیار کی یہ امانتیں، تمھاری یادوں کے یہ سائے وقت مجھ سے جُدا کر دے، مجھ سے چھین لے اور میرا مسیحا بن جائے۔ میرا چارہ گر بن جائے ـــــ کاش!!

غزل

اُدھے سنگھ مصوّر

آپ سے دوستی اگر کی ہے
ہم نے ہر بات سوچ کر کی ہے

اُن کے حُسن و جمال کی یہ ضیا
آزمائش دل و نظر کی ہے

جس پہ وہ چشمِ مُلتفت کر دیں
ساری دُنیا پھر اُس بشر کی ہے

اُن کو دیکھا تو اشک بھر لائے
بات یوں ہم نے مختصر کی ہے

حاصلِ زیست ہے وہی ساعت
جو ترے قرب میں بسر کی ہے

کیا کہیں تیرے ڈھونڈنے والے
شام کس جا، کہاں سحر کی ہے

مہرباں ستم ہوئے تو یہ جانا
منزلِ عشق ہم نے سر کی ہے

آہ کی ہم نے یا دُعا دِل سے
با اثر کی ہے کارگر کی ہے

کب ترے جور پر بھریں آہیں
کس گھڑی ہم نے آنکھ تر کی ہے

عشق دو چار دن کا روگ نہیں
یہ مصیبت تو عمر بھر کی ہے

غم کے ماروں کی داستانِ حیات
موت نے آکے مختصر کی ہے

بھول ہوتی ہے قابلِ بخشش
ہر خطا ہم نے بھول کر کی ہے

غم میں بیتی کہ عیش میں گزری
ہم نے ہر حال میں بسر کی ہے

خاروگُل میں رہی نہ مجھ کو تمیز
بات یہ وسعتِ نظر کی ہے

دوستی جس کسی سے کی ہم نے
ساری دُنیا کو چھوڑ کر کی ہے

اے مُصوّر تھی قدرِ فن بھی کبھی
اب تو پُوجا بس ایک زر کی ہے

بیسویں صدی دہلی مارچ ۱۹۶۹ء


ڈھیروں خوشی
ڈھیروں بچت
دن بہ دن
Brooke Bond Tea
Red Label
Brooke Bond Tea
Red Label
Red Label
بروک بانڈ ریڈ لیبل
یعنی عمدہ چائے کی زیادہ پیالیاں

افسانہ

فراڈ

روشن آرا نیّر

حبیب پور۔ بھاگل پور نمبر ۱ (بہار)

بھائی جان! تسلیم

. . . ویسے "بیسویں صدی" کا ہر شمارہ سالنامے سے کم نہیں ہوتا ——— سالنامے میں شریک ہونے کی آرزو کسے نہ ہوگی۔ میں بھی اپنا افسانہ "فراڈ" بھیج رہی ہوں۔ پسند آجائے تو شریکِ اشاعت فرمالیں . . .

آپ کی بہن ——— روشن آرا نیّر

★

ناہید ہم سے دو سال سینئر تھی۔ سیدھی سادی سی لڑکی جس کی بادامی آنکھوں میں ہمیشہ مُسکراہٹوں کے پھُول کھِلے رہتے تھے۔ پیشانی پر گہرے نقوش جن سے اُس کی ذہانت کا پتہ چلتا تھا۔ وہ جب کبھی کسی سے گفتگو کرتی تو سُننے والوں کو اُس کی باتیں بہت ہی اچھی لگتی تھیں۔ وہ گفتگو کے دَوران ہمیشہ متانت اور سنجیدگی سے کام لیا کرتی تھی۔ اُس کی اِن سبھی باتوں سے مجھے بڑی عقیدت ہو گئی تھی۔ میری یہ خواہش رہتی تھی کہ میں اُس سے بے تکلف رہوں۔ کالج میں خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہیں رہتی۔ لیکن میں نے بارہا محسوس کیا تھا کہ لڑکوں کی نگاہیں زیادہ تر ناہید ہی کا پیچھا کیا کرتی تھیں۔ مجھے لڑکوں کی اِس عادت پر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ اِس لیے کہ ناہید ایک قبول صورت لڑکی ضرور تھی۔ لیکن اُسے خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایک دن میں ناہید کے ساتھ کالج کینٹین سے باہر آرہی تھی کہ ایک لڑکے نے کچھ اِس طرح سے پھُول کھینچ کر مارا کہ وہ ناہید کی پیشانی سے ٹکرا کر میری ساڑی میں اُلجھ گیا۔ لڑکے کی اِس نازیبا حرکت پر مجھے سخت غصّہ آیا۔ ناہید نے روکا پھر بھی میں آگے بڑھ کر اُس لڑکے سے بولی "آپ نے پھُول کیوں مارا؟"

لڑکا جو دلیپ کمار جیسے کپڑوں اور رکھ رکھاؤ میں تھا، ہونٹوں پر دل جلا دینے والی مُسکراہٹ لاکر بولا "میں تجربہ کرنا چاہتا تھا کہ لڑکی غصّے میں کیسی لگتی ہے؟"

"آپ کے اِس نایاب تجربے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی" جب تک ناہید روکتی میں نے اُسے کوئی موقع دیئے بغیر لڑکے کے مُنہ پر طمانچہ مار کر کہا "اور یہ کیسا تجربہ ہے؟" لڑکوں کی بھیڑ لگ چکی تھی۔ لیکن کسی میں آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی۔ البتہ ایک سے ایک گندہ اور بے ہودہ فقرے کَسے جا رہے تھے۔ ناہید اِن باتوں سے بے نیاز لڑکے کی بکھری کتابیں سمیٹ کر اُسے دے رہی تھی۔ مجھے ناہید کی اِس خلافِ توقع حرکت اور دلیری پر سخت غصہ آیا اور میں پاؤں پٹختی کامن رُوم چلی آئی۔ سونیا نے تالی بجا کر کہا "ویری گڈ! تم نے تو کمال کر دیا!"

"نہیں تو کیا۔ ناہید کی طرح کتاب سمیٹ کر دیتی؟"

میری بات پر لڑکیوں کا ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد ناہید آئی۔ اُس کے آتے ہی سونیا نے طنز کیا "مہادیوی کی جے!"

سونیا کی باتوں پر خوب زوردار قہقہہ پڑا۔ میں جلی بھُنی تھی پھر بھی ہنس پڑی۔ ناہید نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور باہر چلی گئی۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی ویرانی نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا اور تب مجھے اپنے رویّے پر افسوس ہوا۔ شرارت تو لڑکوں کی فطرت ہوتی ہے۔ اُس نے تو پھُول سے مارا تھا۔ میں ناہید کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ مجھے لان کے کنارے آم کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی ملی۔ سبز سبز گھاس پر سُرخ ساڑی میں ملبوس ناہید بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ قریب جا کر جب میری نگاہ ناہید کی آنکھوں پر پڑی تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ناہید کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ میں نے پُوچھا۔

"کیا بات ہے ناہید! تم رو کیوں رہی ہو؟"

"میں رو کہاں رہی ہوں" ناہید نے کہا "آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے"

"نہیں۔ تم بہانہ تراش رہی ہو!"

"نہیں بھئی" ناہید نے کہا " یہ تمھارا وہم ہے"

"میرا وہم نہیں بلکہ ———"

"اُف!" ناہید نے میری بات کاٹ کر کہا "تم واقعی ضدّی ہو"

"بھلا وہ کیسے؟"

"———"

"تم نے بتایا نہیں!؟"

"سمجھ میں نہیں آتا میں تمھیں کیا بتاؤں؟" ناہید نے اُکتائے لہجے میں کہا۔

"مجھے تمھاری اِس حرکت پر رونا پڑا"

میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ جس کے لئے میں نے اُس بچارے کی مرمّت کی، اُلٹا وہ مجھے ہی قصور وار ٹھہرا رہی ہے۔ پھر بھی ٹھنڈے مزاج سے پُوچھا۔ "ناہید! تمھیں میری قسم! یہ بتاؤ کہ تم اُس کی مرمّت پر خوش ہونے کے بجائے مجھ پر خفا ہو رہی ہو۔ آخر کیوں؟"

"اپنی اپنی فطرت ہے" اُس نے کہا "تمھیں مار پیٹ پسند ہے اور مجھے سمجھوتہ!"

"کچھ بھی ہو" میں اُس کی تلخ بھری باتوں پر دھیان دئے بغیر بولی "مجھے کسی کی بے عزّتی سے خوشی نہیں ہوتی۔ پھر بھی زیادتیاں ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہیں تو میں ایسا کر بیٹھتی ہوں اور بعد میں مجھے بے حد افسوس ہوتا ہے۔ کامن رُوم میں اپنی دلیری پر مجھے بے حد خوشی ہو رہی تھی اور اب مجھے ندامت ہو رہی ہے لیکن تمھیں غصّہ آیا ہی نہیں؟ کیوں؟ کوئی بات ضرور ہے جسے تم چُھپا رہی ہو" میں نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ ڈالیں۔

"سُنو۔ انسانی زندگی کبھی کسی واقعے سے کافی متاثّر ہو جاتی ہے اور اُس سے انسان کی فطرت بھی بدل جاتی ہے" ناہید نے سنجیدگی سے کہا "مجھے اُن لڑکوں کی حرکت سے بے حد خوشی ہوتی ہے ہے نا عجیب سی بات؟ ایک زمانہ تھا جبکہ میں اِسی کالج میں تم سے زیادہ سخت مزاج سمجھی جاتی تھی۔ لیکن میری اِس عادت کو بدل دینے میں جاوید کا ہاتھ زیادہ ہے۔ جس کی خودکشی سے میری فطرت بدل گئی"

"کون جاوید؟" میں نے پُوچھا "اُس کی خودکشی سے تمھاری فطرت کا کیسا لگاؤ تھا؟"

"جاوید ایک دیہاتی لڑکا تھا۔ جو میرا کلاس فیلو تھا اور وہ ———" ناہید یکایک خاموش ہو گئی۔ پھر اُس نے کہا "لیکن تم یہ باتیں کیوں جاننا چاہتی۔ میرے ماضی سے تمھیں کیا اُنسیت ہو سکتی ہے؟"

ناہید کی اِس جہالت گوئی سے میں جل ہی تو گئی۔ اُکھڑے لہجے میں کہا "ناہید! تم میری رشتے دار ہو اور نہ میں تمھاری سگی۔ سہیلی ایک بہن سے بڑھ کر ہوتی ہے اور اِس لئے مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ میں تم سے اِن سبھی باتوں کی وجہ پُوچھوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تم مجھے اپنی ذاتی باتوں سے دُور رکھنا چاہتی ہو!"

میرا دل بھر آیا تھا۔ میں اُٹھ کر جانے لگی تو لپک کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور قریب بِٹھا کر بولی "رشو! تم تو فوراً آگ ہو جاتی ہو۔ مجھے شک کی بیماری ہو گئی ہے۔ جانتی ہو میں ———" اور اُس نے اپنی بڑی بڑی خوفزدہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ۔ اُس کی آنکھیں بے حد خوفزدہ معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ کہنے لگی "میں... میں قاتل ہوں۔ میں نے اِنہی ہاتھوں سے جاوید کا خون کیا ہے..."

اُس کے چہرے پر پھیکا پن چھا گیا تھا۔ اُس کی حالت دیکھ کر مجھے بھی خوف محسوس ہونے لگا۔ نہ جانے اِس پر کیسا دَورہ پڑا تھا۔ اُس کی آواز دُور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ کہہ رہی تھی "جاوید بہت ہی بھولا اور خوبصورت لڑکا تھا۔ کالج میں داخلہ لیتے ہی وہ کالج کی لڑکیوں کا موضوع بن گیا تھا۔ لڑکیوں کے دِلوں میں اُس کی صورت نقش ہو گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں لڑکیوں کی حرکت پر ہنسا کرتی تھی۔ لڑکیاں جاوید کی تعریف کے لئے خوبصورت جملے ڈھونڈا کرتی تھیں۔ جاوید کی مصروفیت کی خبریں ہر لمحہ کامن رُوم میں لڑکیاں لایا کرتی تھیں۔ کبھی لاونج میں ہونے کی خبر آتی تو کبھی کلاس جانے کی۔ جاوید کے کالج آنے کے وقت لڑکیاں وینٹی بیگ کھول کر جلدی جلدی ریڈی میڈ میک اَپ کیا کرتیں اور دَوڑ کر گیٹ پر پہنچ جایا کرتی تھیں۔ گیٹ پر وہ بظاہر بے پروائی سے کھڑی ہوتی تھیں۔ لیکن اُن کے کان، دل اور دماغ جاوید کی طرف ہوتے تھے۔ جاوید آتا اور ایک غلط انداز نگاہ اُن پر ڈال کر چلا جاتا اور لڑکیاں اُس وقت چونکتیں جب کسی شریر لڑکے کی آواز آتی "کٹ۔ کٹ۔ سین ڈراپ ہوا!" تو لڑکیاں شرما کر جلدی سے بھاگ جایا کرتی تھیں۔ اُس دَوران مجھے محسوس ہوا کہ جاوید میری طرف بڑھ رہا ہے۔ کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو خوشی سے اُس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ لیکن میں اُس وقت اِن باتوں سے سخت نفرت کرتی تھی۔ پھر بھی مجھے بڑی حیرت تھی۔ اِتنی ساری خوبصورت اور فیشن زدہ لڑکیوں کے ہوتے وہ مجھ جیسی سادہ اور غریب لڑکی کی طرف کیوں بڑھ رہا ہے؟ وہ میرا پیچھا سائے کی طرح کیا کرتا تھا۔ مجھے اُس کی حرکت سے نفرت سی ہونے لگی۔ ڈر اِس بات کا تھا کہ شریر لڑکے میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور مجھ پر فقرے کسے جائیں گے، تو کہیں اشعار پڑھے جائیں گے، اور نہیں تو یہ شریر لڑکے دیواروں پر لکھنے سے بھی باز نہ آئیں گے۔

اُس دن سیکنڈ ہاف کے ایک خالی پیریڈ میں اِسی درخت کے نیچے میں کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ یکایک جاوید نے آکر مجھے چونکا دیا۔ میں نے ناگواری سے اُس کی جانب دیکھا۔ اُس نے آہستہ سے پُوچھا "تھوڑی دیر میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

"کیا یہ ضروری ہے کہ آپ میرے ہی پاس اِسی جگہ بیٹھیں؟"

"جی نہیں! اِتنا ضروری بھی نہیں۔ صرف آپ سے چند باتیں عرض کرنی ہیں!"

"کیسی باتیں؟"

"جی یہ کہ ـــــ" اُس نے بڑی معصومیت سے میری طرف دیکھا۔ اُس کی موٹی سیاہ آنکھوں میں بڑی پاکیزگی تھی۔ میں کچھ لمحے کے لئے کھو سی گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "عورت مرد کی زندگی سنوارتی ہے۔ میری نگاہوں میں آپ کا درجہ ساری لڑکیوں سے الگ ہے۔ آپ کو دیکھ کر میرے دل میں چاہت کا جذبہ اُمڈ پڑا ہے۔ کیا آپ میری زندگی کے واسطے ہاں کر سکتی ہیں؟" وہ اِتنا کہہ کر چلا گیا تھا۔ میں اپنے آپ میں آئی تو مجھے بے حد غصہ آیا۔ اُس کی اِس جرأت پر دل میں آیا کہ پرنسپل کو رپورٹ کر دوں۔ لیکن پھر اُس پر رحم آگیا۔ چپراسی کے ذریعے میں نے اُسے کامن رُوم میں بُلوایا اور لڑکیوں کے سامنے اُس کے مُنہ پر دو تین تھپّڑ مار کر کہا۔ "مجھے ایسی ویسی لڑکی تم نے سمجھ رکھا ہے۔ میں ایسی ذلیل نہیں کہ آپ جیسے لفنگے سے پیار کرتی پھروں۔ جائیے آج کے بعد ایسی حرکت نہ ہونی چاہئے۔" لڑکیاں مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن اُن میں اِتنی ہمّت کہاں تھی کہ میرے خلاف آواز بلند کرتیں۔ جاوید چند منٹ اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور پھر سر جُھکائے باہر چلا گیا تھا۔

اِس دن کے بعد وہ ایک ماہ تک کالج نہ آیا۔ بات پُرانی ہو چکی تھی کہ ایک دن یکایک خبر آئی کہ جاوید نے خودکشی کر لی۔ جاوید کی خودکشی نے سارے کالج میں تہلکہ مچا دیا۔ میں اپنے آپ سے شرمندہ تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں مجھے بُرے بُرے لفظوں سے یاد کرتے تھے اور تب مجھے محسوس ہوا کہ لوگ خوبصورت چیز سے جلد پیار کیوں کر لیتے ہیں؟ میں نے بہت سوچا کہ جاوید نے خودکشی کیا میری اِس حرکت پر کر لی؟ ـــــ اور اُس دن سے مجھے اپنے ہاتھ سے نفرت ہو گئی، اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ـــــ" ناہید کہہ رہی تھی اور میں خاموشی سے دُور ندی کے کنارے اُس کوٹھی کو دیکھ رہی تھی۔ جو اب سُنسان اور ویران ہو چُکی تھی!

ساری رات میں ناہید کی داستان سُن کر بے چین رہی۔ جاوید کے انجام پر میں جتنا غور کرتی، خوفزدہ ہوتی جا رہی تھی۔ میرا دل اندر ہی اندر انجانے خوف سے کانپ رہا تھا۔ اپنی بے وقوفی پر مجھے رونا آ رہا تھا۔ اگر اُس لڑکے نے جاوید کی طرح خودکشی کر لی تو اُس کا خون میرے سر ہوگا۔ میں بھی ناہید کی طرح اپنے ہاتھوں سے نفرت کرنے لگوں گی اور میں خدا کے آگے جُھک گئی۔ رو رو کر میں اُس کی سلامتی کے لئے دعائیں کر رہی تھی!

کالج میں دوسرے پیریڈ کے بعد میری متلاشی نظر اُس پر پڑی اور میں بے اختیار اُس کی جانب بڑھ گئی۔ اُسے زندہ اور سلامت دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکریہ ادا کیا۔ میرا رُواں رُواں خوشی سے لرز رہا تھا۔ وہ قمیص اور پتلون میں بے حد اسمارٹ لگ رہا تھا۔

میں نے قریب جا کر کہا۔ "اے مسٹر! آپ کو وہ بُلا رہی ہیں۔" میں نے ناہید کی طرف اشارہ کیا، جو پھولوں کی ایک روِش پر جُھکی گُلاب کے سُرخ پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

اُس لڑکے نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا اب بھی آپ کا دل بھرا نہیں؟"

میں کچھ بولی نہیں، دھڑکتے دل کے ساتھ محجوب کھڑی رہی۔ چند لڑکوں نے ہم دونوں کو ایک جگہ دیکھا تو اُنھیں حیرت ہوئی۔ پھر اُن کی زبان قینچی کی طرح چل پڑی۔ اُس لڑکے نے جلدی سے کہا۔ "چلئے۔"

میں لپک کر ناہید کے پاس پہنچی اور بولی۔ "تم صلح کرا دو۔ جاوید کی طرح میں اِسے کھونا نہیں چاہتی!"

"کیا واقعی!؟"

"ہاں!"

"آپ نے بُلایا ہے؟" لڑکے نے قریب آ کر پُوچھا۔

"ہاں۔" ناہید بولی۔ "کل اِن سے جو غلطی ہو گئی اُس پر اب یہ نادم ہیں۔ آپ اِنھیں معاف کر دیں۔"

"میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ لیکن ـــــ؟" وہ خاموش ہوا تو نہ جانے کیوں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر اُس نے کہا۔ "اِنھیں خود سے معافی مانگنی ہوگی۔"

اُس کی سادہ سی ضد پر میرا دل بھر آیا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ناہید نے جو بالکل میرے پاس کھڑی تھی، میرے بدن کو ٹہوکا دیا۔ میں ضبط کے باوجود بھرائی آواز میں بولی۔ "آپ مجھے معاف کر دیں؟"

"معاف کیا۔" لڑکے نے کہا اور پھر دونوں زور سے ہنس پڑے۔ میں نے تعجب سے اُن کی طرف دیکھا۔

ناہید نے کہا۔ "نیّر تمھارا کام تو ہو گیا۔ مٹھائی کے روپے لاؤ؟"

"اور پھر بگڑ جائے تو ـــــ؟"

"اب ایسا ہو ہی نہیں سکتا!"

"کیا بات ہے ناہید؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں۔" نیّر نے کہا۔ "ناہید میری پڑوس کی بہن ہیں۔ اِنھیں میں نے

اِس ڈرامے پر راضی کیا تھا۔ جس میں مجھے آپ کے نازک ہاتھ کے تھپڑ بھی کھانے تھے۔ پھر ناہید کو جاوید سے فرضی رومانس کا واقعہ سُنا کر آپ کے ذہن کو متاثر کرنا تھا۔"

میرے دماغ میں اُن کی مکمل اسکیم آگئی۔ اُف! ناہید نے کتنا شاندار پارٹ ادا کیا تھا! واقعی وہ غضب کی اداکارہ تھی۔ میں ناہید سے لپٹ کر بولی "تم دونوں فراڈ ہو!"

"فراڈ نہ ہوتا تو پھر آپ ——؟" نیّر نے کہا۔

اور جواباً میں نے گُلاب کا سُرخ پھول توڑ کر نیّر کے اوپر کھینچ مارا۔ پھول اُس کی پیشانی سے ٹکرا کر ناہید کی ساڑی میں اُلجھ گیا اور میں نیّر کا مُنہ چڑا کر بھاگ گئی۔ آنکھوں سے آنسو کے قطرے رُخسار پر لڑھک آئے تھے۔ نہ جانے یہ کیسے آنسو تھے؟؟

قطعات

سیّد منظور احمد منظور بی۔ اے۔ ایل ایل بی

اپنے ہی مرمریں پیکر سے گُریزاں ہو تم
کتنی پُر سحر، پُر اَسرار سی نازک شے ہو
جس طرح شعر میں پوشیدہ عروسِ معنی
جیسے مینائے شفق رنگ میں موجِ مے ہو

ناوکِ ناز سے ڈریں گے کیا
کھیلتے ہیں قضا کے تیروں سے
دُکھ بھی دو گے تو مسکرا دیں گے
چھیڑ اچھی نہیں فقیروں سے

کبھی غموں کے جہنّم بجھے ہیں شبنم سے
سراب سے لبِ تشنہ نے کب سکوں پایا
سُنا جو حرفِ تسلّی تمھارے ہونٹوں سے
تو ہم نے درد کو پہلے سے بھی فزوں پایا

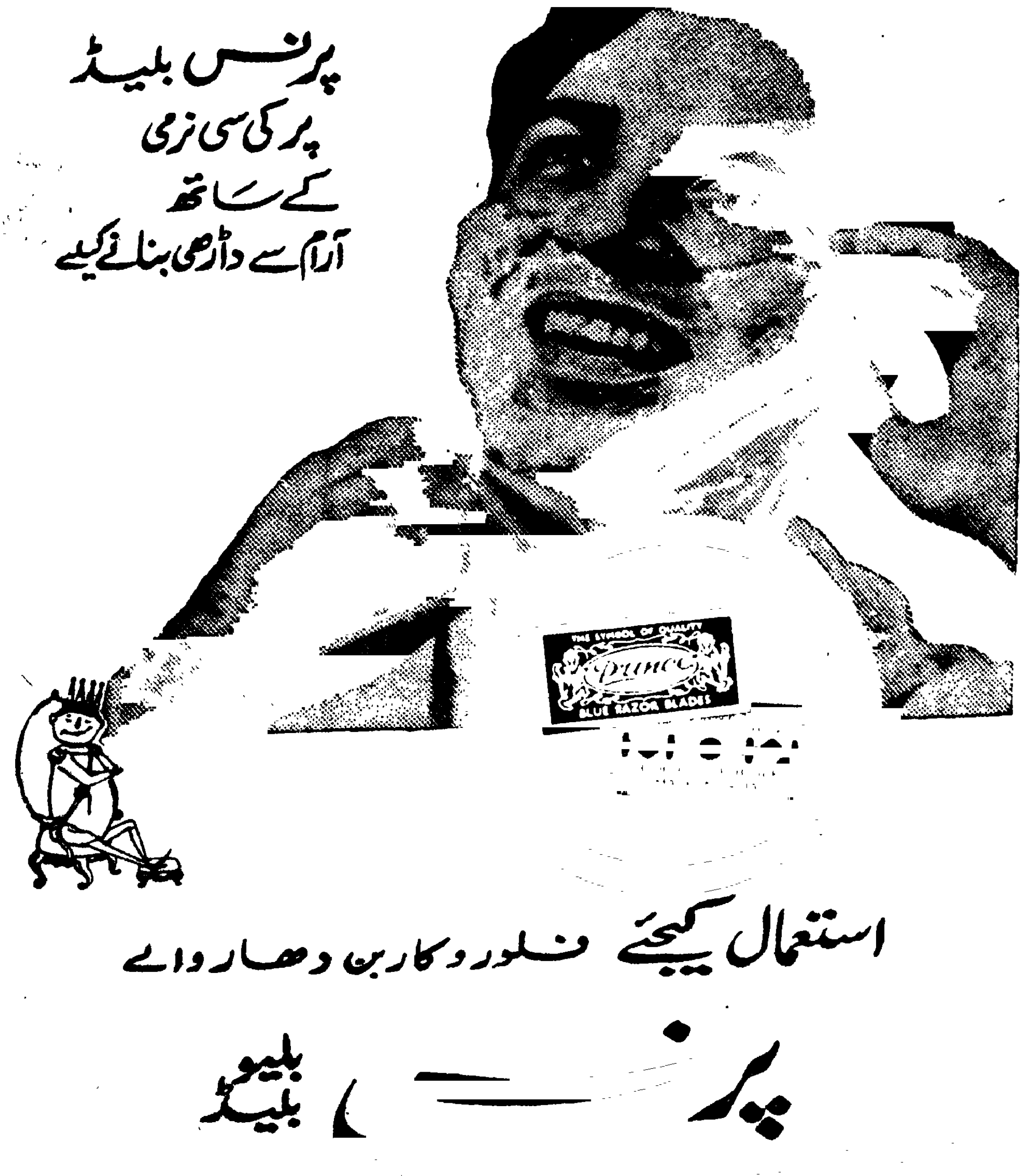
لالہ و گُل کے خنک سایوں سے محروم رہے
دشتِ غربت کی کڑی دُھوپ سہی ہے ہم نے
اس خطا پر کہ دبی ہم سے نہ آوازِ ضمیر
نوکِ خامہ پہ جو آئی وہ کہی ہے ہم نے

غزل

سیّد حباب ترمذی

حُسن کی اوّلیں نگاہ نہ پُوچھ — زندگی کب سے ہے تباہ نہ پُوچھ
اجنبیت کی اِک نگاہ نہ پُوچھ — کیا ہوئی اب وہ رسم و راہ نہ پُوچھ
کیا کہیں ربط و ضبطِ حُسن و عشق — کب سے ہے دل سے دل کو راہ نہ پُوچھ
اور بھی پوچھنے کی باتیں ہیں — مجھ سے تُو وجہِ اَشک و آہ نہ پُوچھ
کس کو معلوم کب وہ آ جائیں؟ — زندگی کیوں ہے فرشِ راہ نہ پُوچھ
تیری پلکیں نہ بھیگ جائیں کہیں — داستانِ دلِ تباہ نہ پُوچھ
لالہ و گُل میں چاند تاروں میں — ڈھونڈتی ہے کسے نگاہ نہ پُوچھ
ذرّہ ذرّہ ہے آئینہ اِس کا — مجھ سے تفسیر لا الٰہ نہ پُوچھ

حُسن ہی حُسن بن گئی ہے حباب
عشق کی جرأتِ نگاہ نہ پُوچھ



پرنس بلیڈ
پر کی سی نرمی
کے ساتھ
آرام سے داڑھی بنانے کیلیے
THE SYMBOL OF QUALITY
Prince
BLUE RAZOR BLADES
استعمال کیجئے فلورو کاربن دھار والے
پرنس
بلیو
بلیڈ

ہم رقص

ایم حبیب

ٹی۔سی۔ڈویژن نمبر۲۔گنڈک پروجیکٹ۔بتیا (بہار)

محترمی باخلوص واحترام

مزاجِ گرامی؟ ——— عظیم صاحب کے اصرار پر" ہم رقص" کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ گر قبول اُفتد ——— !

خلوص کیش ——— ایم حبیب

★

آرکسٹرا کی دُھن پر ہم بہت دیر سے والز ناچ رہے تھے۔ ہمارا ساتھ دینے والے کئی جوڑے تھک کر بیٹھ چکے تھے، لیکن ہم اب تک رقص کر رہے تھے۔ میں بھی تھک گیا تھا، لیکن تمہارا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔

ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے ——— میں تمہارے قہقہے کی آواز پر چونک کر تمہاری طرف متوجّہ ہوا تھا۔ تمہاری ہنسی اور آرکسٹرا کی دُھن میں بہت ہم آہنگی تھی۔ میں بے اختیار ہو کر تمہاری طرف کھنچا چلا گیا اور پھر میری پیشکش پر تم میری بانہوں میں رقص کر رہی تھیں!

جب آرکسٹرا کی دُھنیں تھم گئیں تو ہمارے قدم بھی رُک گئے۔ تم مجھے لے کر اپنی میز پر چلی آئیں۔ تمہاری سہیلیاں ہمارے رقص کے دَوران کسی اور طرف چلی گئی تھیں۔

"فائن! آپ تو بہت اچھا ڈانس کرتے ہیں" تم نے بیٹھتے ہی کہا۔

"لیکن آپ سے اچھا نہیں!"

"اوہو، ہو، فائن، فائن!" تمہارے قہقہے بکھرتے چلے گئے۔

پھر تمہاری سہیلیاں آگئیں اور تم اُن کے ساتھ کیفے سے باہر نکل گئیں۔ نہ میں تمہارے بارے میں کچھ جان سکا اور نہ تم نے ہی میرے بارے میں کچھ پُوچھا ——— ایک ہی راستے کے دو راہی کی طرح چند لمحے کے لئے ہم ساتھ ہوئے اور جُدا ہو گئے! یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔

دو اجنبی ملے اور اجنبی کی طرح رُخصت ہو گئے۔

پھر ایک دن میں کار سے گزر رہا تھا کہ تم شاپنگ کرتی نظر آگئیں۔ میں نے کار روک لی۔ تم نے بھی مجھے دیکھ لیا اور دُور ہی سے ہاتھ ہلایا۔

"ہائے ——— مسٹر!"

"اِتنے دنوں کہاں رہے؟" تم نے قریب آکر شکایتی لہجے میں کہا۔

"چلو کہیں چل کر بیٹھیں" تمہارے لہجے میں بہت اپنائیت تھی۔

ہم ہنٹو میں آکر بیٹھ گئے۔

آرڈر دینے کے بعد تم پھر چہکیں۔

"میں روبی ہوں اور تم؟"

"شوکت ریاض!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ تمہاری اِس بے باکی پر میں سوچ رہا تھا، کہیں تم اسٹریٹ گرل یا کال گرل تو نہیں؟

"ہاؤ سویٹ! ویری فائن!" تم چہک رہی تھیں، تمہارے قہقہے بکھر رہے تھے۔ تم اِدھر اُدھر کی گفتگو چھیڑے ہوئے تھیں اور میں تمہارے بالائی ہونٹ پر بکھرے ہوئے پسینے کے اُن قطروں میں کھویا ہوا تھا جن پر برقی قمقموں کی روشنی پڑنے سے قوسِ قزح کے رنگ بکھر جاتے۔

نہ تم نے میرے نام کے علاوہ اور کچھ جاننا چاہا اور نہ اپنے نام سے زیادہ کچھ بتایا۔ پھر ہم اُٹھ گئے۔ بِل تم نے مجھے نہیں دینے دیا۔

"نو، نو، اِٹ از مائی ڈیوٹی! پے منٹ میں کروں گی!"

اور میرے ذہن سے یہ خیال جاتا رہا کہ تم کوئی اسٹریٹ گرل ہو! باہر آکر تم نے ایک گزرتی ہوئی خالی ٹیکسی روک لی اور مجھ سے ہاتھ مِلا کر رخصت ہو گئیں۔

"پھر ملیں گے ——— ٹاٹا!"

میں تمھیں کچھ دیر اور روکنا چاہتا تھا۔ تمھیں اپنی بانہوں میں لے کر ڈانسنگ فلور پر رقص کرنا چاہتا تھا، لیکن تم آئیں اور چلی گئیں۔ تمھیں روکنے کی ہمت مجھے نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ تمھیں اپنی کار سے پہنچانے کی پیشکش بھی نہ کر سکا۔

یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔

پھر برابر ملاقات ہونے لگی۔ کبھی اچانک اور کبھی پروگرام کے تحت ہم کہیں نہ کہیں آٹکراتے۔ سنیما، کلب، ریسٹورنٹ، پارک کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔ مجھے دیکھتے ہی تم جیسے کھل اُٹھتیں۔ تم شگفتہ ہو جاتیں۔ کوئی تمھارے ساتھ موجود بھی ہوتا تو تم اُسے چھوڑ کر میری طرف چلی آتیں یا مجھے پکار لیتیں۔ پھر آپ سے آپ تمھارے قہقہے بلند ہوتے چلے جاتے۔

تمھاری ہر ملاقات میرے اوپر اپنا گہرا رنگ چھوڑتی چلی گئی اور میرے دل میں ایک انوکھا خیال انگڑائیاں لینے لگا۔ تمھیں اپنا بنا لینے کی آرزو دل میں چٹکیاں لینے لگی ـــــ لیکن مشکل یہ تھی کہ مجھے تمھارے بارے میں اس کے سوا کہ تم میڈیکل کی طالبہ ہو، کچھ معلوم نہ تھا۔ تمھاری سہیلیاں یا تمھارے دوست تمھیں مس روبی کہتے تھے اور مجھے پورا یقین تھا کہ تم اب تک اچھوتی ہو! ـــــ تمھارے چہرے پر وہی رونق اور تازگی تھی جو کنواری لڑکی کے چہرے پر ہوتی ہے۔

اِتنے دنوں کی ملاقات نے ہماری جھجک دُور کر دی تھی ہم ایک دوسرے سے کافی بے تکلف ہو گئے تھے، لیکن ابھی اُس مقام سے دُور تھے جہاں دو دلوں کی دھڑکن ایک ہو جاتی ہے۔

"ویری فائن! ویری گریٹ!"

ایک دن تم نے بیٹھے بیٹھے اچانک میرا ہاتھ اپنی مُٹھیوں میں بھینچ لیا اور بڑبڑانے لگیں۔ میرا دل سینے کے اندر زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"شوکت! مجھے اُن مردوں سے سخت نفرت ہے، جن کی عورتوں کو دیکھ کر رال ٹپکنے لگتی ہے"، تم نے میرا ہاتھ زور سے دبایا۔

"آئی ہیٹ دِم (I hate them) پہلی ہی ملاقات میں نام، عمر، شادی، بچے ساری معلومات حاصل کر لینا چاہتے ہیں!" تم بول رہی تھیں اور میں خاموشی سے سُن رہا تھا ـــــ "اور یہ جتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بس ایک اشارے پر کنوئیں میں چھلانگ لگا دیں گے! ـــــ ہماری دوستی کو اِتنے دن ہو گئے لیکن تم نے آج تک میرے متعلق خود سے کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی اور اِسی لئے مجھے تم پر فخر ہے، تمھاری دوستی پر ناز ہے!" تم نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"فائن، فائن! ـــــ کیوں؟ کیسے رہے یہ ڈائیلاگ؟؟"

جواب میں میں نے تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تمھارے لہجے کی نقل اُتاری۔

"فائن، فائن!"

اور تمھاری کھلکھلاہٹ میرے کانوں میں نقرئی گھنٹیاں بجانے لگی۔

"او، ہو، ہو، ہو! فائن، فائن!!"

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تم پھول بکھیرتی رہیں۔ تمھارے قہقہے ماحول کو گلزار بناتے رہے۔ پھر تم نے کہا۔

"میں چند روز بیزی رہوں گی۔ اِس لئے نہ مل سکوں گی۔ اگلے ہفتے ہم یہیں ملیں گے۔"

اور اِس کے بعد ہم اُٹھ گئے۔

اُس دن کی گفتگو کے بعد سے میں بہت خوش تھا۔ مجھے اپنی آرزوؤں کی تکمیل ہوتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اگلے ہفتے جب تم سے مِلوں گا، تمھیں تم سے اپنے لئے مانگ لوں گا ـــــ میں نے اپنے فیصلے سے اپنی ماں کو بھی آگاہ کر دیا تھا، جو عرصے سے بہو کی تمنّا میں جی رہی تھی۔ میں نے اُسے لکھ دیا تھا کہ اُس کے لئے میں نے بہو ڈھونڈ لی ہے!

مجھے اپنے متعلق تمھارے خیالات معلوم ہو گئے تھے۔ مجھے یقین تھا، میرے خیالات معلوم ہونے پر تم خود سے میری بانہوں میں چلی آؤ گی اور ہمارے دلوں کی دھڑکن ایک ہو جائے گی!

ایک ہفتہ گزرتے گزرتے بھی کئی دن لگ گئے۔

اُس دن میں ہنٹو دیر سے پہنچا۔

تم نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ کا اشارہ دیا۔ تمھارے ساتھ ایک خوش پوش نوجوان اور دو بچّے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ میرے لئے اجنبی تھے۔ تم نے اُن کا تعارف کرایا۔

"شوکت! اِن سے مِلو ـــــ یہ ہیں میرے ہسبنڈ عزیز اور یہ ہمارے بچّے پپّو اور منّو ـــــ اور یہ ہیں مسٹر شوکت، اے فائن فیلو، اے گڈ ڈانس پارٹنر، میرے بہت ہی اچھے دوست!"

تمھارے نقرئی قہقہے بکھرے۔ تمھارے ہونٹوں پر پسینے کے قطرے جگمگا اُٹھے!!

غزل

انور ایوبی گنگوہی

ا نقاب رُخ سے تو گلشن سنور گئے
الی جدھر نگاہ گلِ تر بکھر گئے
بے رنگ زندگی میں نئے رنگ بھر گئے
"جب وہ مرے قریب سے ہنس کر گزر گئے"

ب عزم ہے جوان تو رہبر کی کیا طلب
نزل ہمارے ساتھ رہی ہم جدھر گئے
جب عزمِ نو کے ساتھ چلی کشتیٔ حیات
بچ کر مرے قریب سے خود ہی بھنور گئے

اُن کے لبوں پہ موجِ تبسم نہ پوچھئے
صحنِ چمن میں جیسے گلِ تر بکھر گئے
ہم نے تو حادثوں سے بھی ہنس کر نباہ کی
کچھ لوگ زندگی کے تقاضوں سے ڈر گئے

سُلجھا رہا ہوں اب تو میں گیسوئے حیات کے
جب دل تھا محوِ حُسن وہ شام و سحر گئے
آئے تھے ہم تو بہرِ سکونِ دل و نظر
لیکن تمہاری بزم سے دل تھام کر گئے

اہلِ خرد تو رہ گئے با زعمِ آگہی
منزل کی سمت ہم ہی مگر بے خبر گئے
سر آفتیں زمانے کی انورؔ جو کر سکے
کچھ رنگ زندگی میں وہی لوگ بھر گئے

برساتیں

عرشؔ صہبائی

شدتِ جذبات سے آنکھیں ہیں تر برسات میں
رنگ لایا ہے محبت کا اثر برسات میں
یہ گھٹائیں اور یہ کیف آفریں رنگیں فضا
کیا بُرا تھا آپ بھی ہوتے اگر برسات میں

چار سُو ماحول میں جیسے ہو نغموں کی پھُوار
اُن کا ہنس دینا وہ اِک اِک بات پر برسات میں
مے کدے میں کم نہیں ہنگامہ ہائے مے کشاں
اور بڑھ جاتا ہے کچھ یہ شور و شر برسات میں

آپ صحنِ گلستاں میں یُوں نہ تنہا گھومیئے
فطرتاً پھسلن ہے اِک اِک گام پر برسات میں
ہر گھڑی آنکھوں میں لہراتی ہے اِک قوسِ قزح
ہم نے دیکھا ہے کسی کو جلوہ گر برسات میں

دفعتاً اُن مے فروش آنکھوں کی یاد آنے لگی
چھا گئیں جب بھی گھٹائیں جھُوم کر برسات میں
کون کافر ہے سیہ زُلفوں کو بکھرائے ہوئے
کس لئے رُو پوش ہیں شمس و قمر برسات میں

دُور ہے تُو اور ساون کی گھٹائیں چھا گئیں
اس قدر بے داد، اے بے داد گر برسات میں
اُن کی یادوں کی یہ ساری رنگ آمیزی ہے عرشؔ
پھر تر و تازہ ہوئے زخمِ جگر برسات میں

سب کے لئے کام



(ینگ انڈیا، ۶ر اکتوبر ۱۹۲۱ء)

جب تک ایک بھی
تندرست مرد یا عورت
بیکار یا بلا خوراک ہے،
ہمیں آرام کرتے،
یا پیٹ بھر کھانا
کھاتے ہوئے
شرم محسوس
ہونی چاہیئے۔

مہاتما گاندھی

davp 68/300

MAHATMA GANDHI
BIRTH CENTENARY
OCT.2,1969 TO
FEB.22,1970
महात्मा गांधी
जन्म शताब्दी
अक्तूबर 2,1969 से
फरवरी 22,1970

شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۶۳۵ - تیمار پور - دہلی

محترم خوشتر صاحب!

افسوس میں ازلی محروم عجیب و غریب دردناک حالات میں اپنے والدِ محترم جناب نوہریارام صاحب درد نکودری سے بھی محروم ہوگیا۔ بقول برادرم جگن ناتھ آزاد کیا آسمان کے مظالم میں ایک ظلم ایسا بھی ہے! میری مظلومی کی شاید کوئی جھلک آپ کو میرے اِس نئے سانیٹ میں نظر آجائے جس کا عنوان ہی "محرومی" ہے ——

کہاں کہاں نہیں موجود میرے نقشِ قدم
کہاں کہاں نہیں لُوٹا مرا دلِ حساس
کہاں کہاں نہیں تڑپی نگاہِ درد شناس
کہاں کہاں نہیں چھلکے یہ دیدۂ پُرنم

کہیں بھی ڈھل نہ سکی میرے رُخ سے گردِ ملال
کہیں بھی مِل نہ سکا کوئی جادۂ منزل
کہیں بھی رُک نہ سکا میں مسافرِ غمِ دل
یہی ہوا مری ساری مسافرت کا مآل!

گیا جہاں بھی پلٹ کر میں سوگوار آیا
کسی جگہ بھی تو تسکینِ جستجو نہ ہوئی
کہیں بھی تو نہ ملا تجھ سے گفتگو نہ ہوئی
پُکارنے کو تجھے ہر طرف پُکار آیا
جواب میں وہی آوازِ بازگشت آئی
کہاں ہوئی مری فریاد کی پذیرائی

بدنصیب —— نریش کمار شاد

★

سنٹرل لائبریری پٹیالہ میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ کسی شاعر نے اپنی غزل میں جب یہ شعر پڑھا ــــ

نہ وہ آسکیں گے نہ ہم جا سکیں گے
نہ وہ بات ہوگی نہ یہ بات ہوگی

تو اُس شاعر کے حواریوں اور حاشیہ برداروں نے داد و تحسین کے شور سے آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ یہ شور و غل نوبہار صابر کو بہت عجیب سا معلوم ہوا اور وہیں بیٹھے بیٹھے اِس شعر کی پیروڈی کرتے ہوئے اُنھوں نے یہ قطعات کہہ دیے ؎

کہا آج بھی تم نہ تشریف لائے
تو یہ شب مری آخری رات ہوگی
وہ بولے ذرا زیرِ لب مسکرا کر
نہ وہ بات ہوگی، نہ یہ بات ہوگی

کہا تم بلاؤ گے اپنے مکاں پر
کہ میرے مکاں پر ملاقات ہوگی
وہ بولے کہ سنڈے ہے پاپا ہیں گھر میں
نہ وہ بات ہوگی، نہ یہ بات ہوگی

کہا تم جو سنتے نہیں قصۂ غم
تو بس اب سے ترکِ ملاقات ہوگی
وہ بولے یونہی بور کرتے رہو گے؟
نہ وہ بات ہوگی، نہ یہ بات ہوگی!

کہا جیت لوں گا میں اِک دن یہ بازی
محبت میں آخر تمھیں مات ہوگی
وہ بولے مرے خوش گماں شیخ چلّی!
نہ وہ بات ہوگی، نہ یہ بات ہوگی!

حکیم یوسف حسن مدیر "نیرنگِ خیال" نے ایک دن علّامہ اقبال سے کسی نئی نظم کی درخواست کی تو علّامہ نے فرمایا کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ حکیم صاحب نے اُنہیں یاد دلایا کہ پچھلی ملاقات میں آپ نے ایک نیا شعر سُنایا تھا ؎

یہ پنڈت۔ یہ بنیے۔ یہ مُلّا۔ یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے

اِس کے بعد کچھ اور شعر بھی تو ہوئے ہوں گے۔ علّامہ نے جواب دیا نہیں وہی ایک ہے پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد فی البدیہہ یہ اشعار حکیم صاحب کو لکھوا دیے ؎

یہ مکتب۔ یہ اسکول۔ یہ پاٹھ شالے
یہ تکیے۔ یہ مندر۔ یہ گرجے شوالے
یہ پنڈت یہ بنیے۔ یہ مُلّا۔ یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی!

وطن کیا ہے اِک نوعِ سرمایہ داری
بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھکاری
یہ دیکھو چلی آ رہی ہے سواری
نئے جال لائے پُرانے شکاری
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی!

پریم وار بر ٹنی کے ایک دولتمند دوست جو شاعر ہیں، لیکن شراب سے سخت نفرت کرتے ہیں، ایک دن طرحی غزل کہنے میں مصروف تھے مصرعۂ طرح تھا۔ ع

جوانی میں تو ہر صورت حسیں معلوم ہوتی ہے

پریم پانچ روپیہ قرض لینے کی نیت سے جب اُن کے یہاں پہنچا تو اُنھوں نے اپنے تازہ اشعار سے پریم کی تواضع کی لیکن جب پریم نے اپنی ضرورت کا اظہار کیا تو وہ جھلا کر کہنے لگے آخر تم اِتنی شراب کیوں پیتے ہو؟ اِس کے جواب میں کچھ دیر تک سوچنے کے بعد پریم نے یہ شعر کہہ کر اُنہیں سُنا دیا ؎

اگر پی لیں تو اُڑتی ہے ستاروں سے بھی کچھ آگے
وگرنہ زندگی زیرِ زمیں معلوم ہوتی ہے

شعر کی داد تو اُنھوں نے دی لیکن رُوپے دینے سے انکار کر دیا۔ پریم مایوس ہو کر وہاں سے چل دیا اور راستے میں ایک اور شعر ہو گیا ؎

نہ جانے کون ہیں جن سے ملی ہے بے حجابانہ
ہمیں تو ہر خوشی پردہ نشیں معلوم ہوتی ہے

خان بہادر سید عبداللہ خاں رئیس جانسٹھ ضلع مظفر نگر صرف خود شاعر ہی نہ تھے شاعر گر بھی تھے۔ ہر سال جون کے مہینے میں میلہ شاہ نامر کے موقع پر جانسٹھ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کراتے تھے۔ ایک مرتبہ مشاعرہ ہوا طرح تھی ع

بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

مشاعرہ شروع ہوا۔ ہندوستان کے نامور شعرا شریکِ محفل تھے۔ خان بہادر خود صدرِ مشاعرہ تھے۔ نوجوان نابینا شاعر ناظم جانسٹھی جب اسٹیج پر لائے گئے تو انھوں نے دوزانو بیٹھ کر خان بہادر کو مخاطب کر کے کہا کہ سرکار گرہ بند مطلع آپ کی نذر ہے! اور اس کے بعد کڑک کر یہ مطلع پڑھ دیا ؎

سامنے گھر کے ہے مسجد مگر آباد نہیں
بے خودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

اِس واقعاتی مطلع پر لوگوں کے منہ فق ہو گئے۔ ایک مطلق العنان قسم کے رئیس کی شان میں یہ گستاخی! خان صاحب کی کوٹھی کے سامنے ایک بہت ہی خوبصورت مسجد تھی شیعہ حضرات ہر ایرے غیرے کے پیچھے نمازِ باجماعت نہیں پڑھتے۔ امام کے لئے مجتہد ہونا ضروری ہے اس لئے یہ مسجد کبھی آباد نہیں تھی۔ مسجد خان بہادر کے والد نے بنوائی تھی اور اُس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری خان بہادر صاحب پر عائد ہوتی تھی۔ اِس لئے ناظم کی یہ چوٹ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کی۔ کئی بار مطلع سُنا۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ رات گئی بات گئی۔ لیکن صبح کو لوگوں نے دیکھا، خان بہادر خود مسجد میں جاروب کشی فرما رہے ہیں۔ بالآخر مسجد آباد ہو گئی اور وعظ و تلقین کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اگلے سال پھر طرحی مشاعرہ تھا۔ طرح تھی ؏

وصل سے شاد کیا ہجر سے ناشاد کیا

ناظم نے یہ مقطع پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا ؎

اجر جنت میں ملے گا تجھے اس کا ناظم
تیرے اک شعر نے مسجد کو تو آباد کیا!

نوح ناروی ایک بار اپنی جائداد کے جھگڑے کے سلسلے میں عدالت کے چکر میں پھنس گئے۔ مجسٹریٹ کے کسی فیصلے کی نقل آپ کو درکار تھی۔ اُسے حاصل کرنے کے لئے آپ کو جس مضحکہ خیز صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا اُس کا اظہار زبانِ شعر میں آپ نے یوں کیا ؎

جب یہ پوچھا حکم کیا لکھا گیا درخواست پر
کہہ دیا دفتر سے تجھ کو نقل لینی چاہیے
اور دفتر سے اگر طالب ہوا میں نقل کا
تو وہ بولے اس کی بھی درخواست دینی چاہیے

خواجہ حسن نظامی نے اپنی عمر کے آخری حصے میں جب یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ برنارڈ شا بھی میرے مریدوں میں شامل ہو گیا ہے تو تلوک چند محروم نے بے اختیار یہ قطعہ کہہ دیا ؎

خواجہ حسن نظامی نے کل بزم میں کہا
برنارڈ شا بھی میرے مریدوں میں مل گیا
یاد آیا مجھ کو ذوق کا مصرع یہ برمحل
"کم بخت پاک ہو کے پلیدوں میں مل گیا!"

مولانا ابوالکلام آزاد جب رانچی میں نظربند تھے۔ پانچ سال کے بعد اُن کی رہائی کے احکام صادر ہوئے تو مولانا نے جیل کے داروغہ سے کہا کہ مجھے ایک دن کی مہلت اور دو۔ جیل کے بام و در سے میری آنکھیں آشنا ہو چکی ہیں۔ اُن سے آخری بار رخصت تو ہو لوں۔ جیل کی سلاخوں جیل کی فصیلوں اور جیل کے ساتھیوں کو الوداع تو کہہ لوں۔ اِتنا کہنے کے بعد مولانا نے فی البدیہہ یہ شعر بھی کہہ دیا ؎

قصد کرتا ہوں جو اس جائے کہیں جانے کا
دل یہ کہتا ہے کہ تو جا میں نہیں جانے کا

جوش ملیح آبادی، مانی جائسی اور شاہد صدیقی تینوں حیدرآباد میں حیرت بدایونی کے گھر تشریف لائے۔ سواری سے اُترتے ہوئے شاہد نے حیرت صاحب کے فرزند سے دریافت کیا ؏

کہاں ہیں حضرتِ علامہ حیرت بدایونی؟

جوش صاحب یہ سُن کر ایک دم چونکے اور کہنے لگے شاہد اور مانی! اس زمین میں نظم ہونی چاہیے۔ سُنو ہم ابتدا کرتے ہیں ؎

کبھی تھے شعلۂ جوالہ و برقِ تپاں، اب تو
دُھواں ہیں حضرتِ علامہ حیرت بدایونی!

شاہد صدیقی نے برجستہ دوسرا شعر چپکا دیا ؎

تلاش اُن کی تھی میخانے میں، مسجد سے صدا آئی
یہاں ہیں حضرتِ علامہ حیرت بدایونی!

اور اس کے فوراً بعد اُنھوں نے جوش صاحب سے یہ کہہ کر کہ شعر میں اجتہاد کا مرتکب ہونا چاہتا ہوں یہ شعر پڑھ دیا ؎

کبھی ہیں رہروِ راہِ محبت اور کبھی سنگِ
گراں ہیں حضرتِ علامہ حیرت بدایونی

مانی صاحب نے مقطع کہا ؎

یہ جوش و مانی و شاہد سے پوچھو کون کہتا ہے
خزاں ہیں حضرتِ علامہ حیرت بدایونی!


بازار جانے کی ساڑیاں


عمر رسیدہ عورتوں کی
ساڑیاں

بسمل سعیدی اپنے چند باذوق اور بے تکلف دوستوں میں کہیں بیٹھے شعر و ادب کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ وہاں ایک خاصے پڑھے لکھے حضرت تشریف لے آئے۔ وہ جتنے پڑھے لکھے نظر آتے تھے اپنی گفتگو سے اُتنے ہی نامعقول اور جاہل ثابت ہوئے۔ پے بہ پے اُنھوں نے کچھ ایسی لغو باتیں کیں کہ بسمل کی طبیعت منغّص ہو گئی اور اُن کے وہاں سے چلے جانے کے بعد بسمل نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؂

زندگی اُن کے لئے قہر و قیامت ہو جائے
احمقوں کو اگر احساسِ حماقت ہو جائے

شاذ تمکنت ایک دوپہر اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے کہ اُنھوں نے ایسا محسوس کیا جیسے برابر کے کمرے سے اُن کے منجھلے بھائی نے اُن کا نام لے کر پکارا ہو۔ وہ اُٹھ کر جب اُن کے پاس گئے تو معلوم ہوا کہ اُنھوں نے کوئی آواز نہیں دی۔ اتنی ہی سی بات نے شاذ کے شاعرانہ شعور کو جھنجھوڑ دیا اور اپنے کمرے میں واپس آ کر اُنھوں نے یہ نظم کہی ؂

مجھے یاد پڑتا ہے اِک عمر گزری
لگاوٹ کی شبنم میں لہجہ ڈبو کر
کوئی مجھ کو آواز دیتا تھا اکثر
بُلاوے کی معصومیت کے سہارے
میں آہستہ آہستہ پہنچا یہاں تک ـــــ
یہ ہر سمت انبوہِ آوارگاں تھا
بڑے چاؤ سے میں نے ہر اِک سے پوچھا
"کہو کیا تمہیں نے پکارا تھا مجھ کو؟
کہو کیا تمہیں نے پکارا تھا مجھ کو؟"
مگر مجھ سے انبوہِ آوارگاں نے
پریشاں پریشاں، ہراساں ہراساں
کہا صرف اِتنا "نہیں وہ نہیں ہم
ہمیں بھی بُلا کر کوئی چھُپ گیا ہے!"

مدّتوں بعد اپنے ایک عزیز اور دردآشنا دوست سے غیر متوقع طور پر اچانک کنول پرشاد کنول کی ایک بزم میں ملاقات ہوئی تو بے ساختہ کنول نے یہ قطعہ کہہ دیا ؂

ہم بھی رکھتے تھے ایک دل یہ بات
اِک زمانہ لگا بھُلانے کو

ہم نے سوچا تھا اب نہ روئیں گے
آپ پھر آ گئے رُلانے کو!

آج سے تقریباً تیس سال پہلے ہما ہرنالوی کے عزیز دوست اور شاگرد مرحوم سورج کنول سرور اپنی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں راولپنڈی سے جبل پور جانے لگے تو ہما صاحب اُنھیں رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن گئے۔ جب گاڑی روانہ ہونے لگی تو ہما صاحب نے کاغذ کے پُرزے پر کچھ لکھ کر اُن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رستے میں سرور نے دیکھا اُس پُرزے پر یہ شعر درج تھا ؂

جدا ہمارے جنابِ سرور ہو نہ سکے
نظر سے دور ہوئے دل سے دُور ہو نہ سکے

اُستاد ظہیر دہلوی جو ذوق کے شاگرد اور مومن کے مقلد تھے۔ بیس پچیس سال تک رام پور۔ الور اور جے پور میں ملازمت کرنے کے بعد اُنیسویں صدی کے اواخر میں ٹونک پہنچے اور والیٔ ریاست نواب ابراہیم علی خاں کی قدردانی کی بدولت وہیں مقیم ہو گئے۔ اُن کے لباس کی وضع قطع وہی تھی جو دہلی کے بگڑنے سے پہلے کے شرفا کے ملبوس کی ہوا کرتی تھی یعنی وہ غرارے دار پاجامے، انگرکھے، کمر پیچ اور چوغے سے آراستہ ہو کر سر پر تیس چالیس گز لمبی اور دو انگل چوڑے چیرے والی پگڑی باندھتے تھے۔ اُسی زمانے میں نواب سلیمان خاں اسد لکھنوی شاگرد اسیر بھی بہت سے نشیب و فراز دیکھ کر ٹونک سے متوسل ہو گئے۔ اُن دونوں اُستادوں کو اپنے اپنے مکتبِ شاعری پر بڑا ناز تھا اور اُن میں کبھی کبھی بڑی شائستگی سے طنز و تعریض بھی ہو جاتی تھی۔ ایک بار ایک مقامی رئیس کے وسیع دیوان خانے میں مشاعرہ ہوا۔ سب شاعر آ چکے تھے صرف اُستاد ظہیر کے آنے کی دیر تھی۔ جب ظہیر نے دیوان خانے میں قدم رکھا تو اسد کے ایک شاگرد نے اُسی وقت ایک شعر موزوں کر کے چُپکے سے پڑھ دیا جو فوراً لب بلب تمام شرکائے مجلس تک پہنچ گیا اور لب متبسم ہو گئے۔ شعر یہ تھا ؂

دیکھئے وہ میاں ظہیر آئے
سر پہ باندھے ہوئے دھجرا آئے

اکبر الہ آبادی کے یہاں بے تکلف دوست جمع تھے۔ ایک صاحب جو بالعموم نو بنو خبریں سُنایا کرتے تھے کہنے لگے، مسٹر سنہا جنہیں حال ہی میں سر کا خطاب ملا ہے اب انگریزوں ہی کے تمام طور طریقے اپنا رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اب اُنھوں نے بال میں ناچنا بھی شروع کر دیا ہے۔ یہ سُن کر تھوڑی دیر تک اکبر خاموشی سے کچھ سوچتے رہے اور پھر اُنھوں نے یہ شعر برجستہ کہہ کر سُنا دیا ؂

بیسویں صدی دہلی مارچ ۱۹۶۹ء

پاکر خطاب، ناک کا بھی ذوق ہو گیا
سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

ٹونک میں ایک شخص حافظ حیراںؔ تھے۔ اُن کی علمیت تو بہت کم تھی لیکن تھے طبیعت دار۔ افلاس اور کثرتِ اولاد کے باعث نہایت تنگ رہتے تھے۔ ایک دن شدید سردی کے ایام میں اُنھوں نے ایک قطعہ لکھ کر نواب ابراہیم علی خاں خلیلؔ والیِ ٹونک کو پیش کیا جس میں ایک رضائی عطا کئے جانے کی درخواست کی گئی تھی۔ یہ قطعہ غالبؔ کے اُس قطعے کی زمین میں تھا جس کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

جب حافظ حیراںؔ کو سرکاری توشے خانے سے رضائی مل گئی تو اُنھوں نے ایک ہفتے بعد اسی بحر اور قافیے میں ایک اور قطعہ لکھ کر پیش کیا۔ اُس قطعے کے دو شعر اب تک ٹونک میں مشہور ہیں۔ حافظ جی نے یہ بتانے کے لئے کہ ایک رضائی جملہ اہلِ و عیال کی ضرورت پوری نہیں کرتی اور جب سوتے میں کوئی بچہ اُسے اپنی طرف زیادہ کھینچ لیتا ہے تو باقی بچے ٹھنڈ سے ٹھٹھر کر چلّانے لگتے ہیں۔ لکھا تھا ؎

اپنی جانب کو کھینچ لی جس نے
مُلکِ مغرب کا بن گیا سردار
یا تو ہر فرد کے لئے ہو فرد
یا رضائی ربڑ کی ہو تیار

فراقؔ گورکھپوری کی نظر سے جب John Donne کا یہ جملہ گزرا ——

Her pure and eloquent blood spoke in her cheeks and so distinctly wrought that one might almost say that her body thought.

تو وہ ایک وجدانی کیفیت میں کھو گئے اور اُسی کیفیت میں بے اختیار یہ شعر ہو گیا ؎

ہری بھری رگوں میں وہ چھکتا بولتا لہو
وہ سوچتا ہوا بدن خود اِک جہاں لئے ہوئے

میں اُن دنوں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا جب ایک دن باتوں باتوں میں میری زبان سے نکلا کہ آج کی اخبار ابھی تک نہیں آئی۔ میرے والد صاحب حضرت وسیدؔ نکودری نے فی الفور مجھے ٹوکتے ہوئے کہا —— اخبار مؤنث نہیں مذکر ہے۔ مجھے اُس وقت اُن کی یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی اور سوچنے لگا جب خبر مؤنث ہے تو اخبار مؤنث کیوں نہیں۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے طفلانہ شوخی سے کام لیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ شعر میں کوئی سند دیجئے۔ والد صاحب کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگے کسی اُستاد کا کوئی شعر تو اِس وقت یاد نہیں آرہا۔ اور پھر فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا ؎

دشمن کی موت پر وہ جنازے کے ساتھ تھے
اے دوست آج کا کوئی اخبار دیکھنا

سنہ ۱۹۴۶ء میں آخری بار جب برٹش سرکار نے حسبِ سابق بعض ٹوڈی قسم کے ہندوستانیوں کو خطابات عطا فرمائے تو مشہور محبِ وطن اور مزاحیہ شاعر احمقؔ پھپھوندوی نے یہ قطعہ کہا ؎

جاتے جاتے بھی دے رہے ہیں خطاب
گو کہ فہرست اب کے چھوٹی ہے
سمجھیں اِس کو غنیمت "اہلِ وفا"
بھاگتے چور کی لنگوٹی ہے!

علّامہ اقبال کے اِس مشہور شعر ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کے جواب میں ن۔ م۔ راشدؔ نے یہ شعر کہا ؎

جہاں غریب کو نانِ جویں نہیں ملتی
وہاں حکیم کے درسِ خودی کو کیا کیجے

پنجاب کے کسی روزنامے میں یہ خبر پڑھ کر کہ ایک سابق وزیر نے اب ڈھابہ (طعام خانہ) کھول لیا ہے مجھ سے بے اختیار یہ قطعہ موزوں ہو گیا ؎

حکومتوں کے نشیب و فراز سے پیارے
ہم ایسے فاقہ پرستوں کو آگہی کیا ہے
جو کل وزیر تھا بیٹھا ہے آج ڈھابے میں
اُسی سے پوچھ مآلِ منسٹری کیا ہے؟

گوپی ناتھ امنؔ کانپور کے اپنے ایک رشتہ دار کے ساتھ ان کی کار میں

لکھنؤ سے کاس گنج ایک برات میں جا رہے تھے۔ اتفاق سے کار چلاتے چلاتے جب گوری شنکر اپنے شہر کانپور میں پہنچ کر آگے کاس گنج جانے کا راستہ بھول گئے تو احسن صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

جنگل کے راستوں سے تو مجنوں تھا باخبر
اپنے ہی گھر کی راہ کا اِس کو پتا نہیں!

سید انشا جب عالمِ نزع میں تھے تو مصحفی اُن کی عیادت کے لئے آئے۔ انشا کی ڈوبتی ہوئی نبض پر ہاتھ رکھا تو مصحفی نے بڑی حسرت سے یہ مصرع کہا ؎

تیرے بیمار کا ہے عزمِ سفر آج کی رات

انشا نے آنکھیں کھولیں اور بے اختیار دوسرا مصرع لگا دیا ؎

نبض چل بسنے کی دیتی ہے خبر آج کی رات

دلی میں سر سید علی غمگین کی محفل میں جرأت کا یہ مطلع پڑھا گیا ؎

گھر جو یاد آیا کسی کا اپنے گھر میں آن کر
چھپکے چھپکے روتے ہیں مُنہ پر دوپٹہ تان کر

اور سعادت یار خاں رنگین دہلوی سے فرمائش کی گئی کہ وہ اِس زمین میں فی البدیہہ کچھ فرمائیں رنگین نے فی الفور یہ مطلع سُنا دیا ؎

یوں کہوں اُس کو کہ آیا ہوں یہ جی میں ٹھان کر
چین دے مجھ کو کہیں اپنے خدا کو مان کر

اور چند روز بعد اِس زمین میں یہ شعر کہہ کر غزل مکمل کر دی ؎

بازگشتی تیر ہے پھر کر یہ تیرا دیکھنا
صدقے تیری اِس ادا پر سے مجھے قربان کر

کھوئی غفلت میں جوانی، دیکھ پیری میں توجیت
صبح صادق ہو گئی چلنے کا کچھ سامان کر

سوچ جی میں میرے ہوتے غیر کی گردن نہ مار
قتل کرنا ہے تو کر ظالم و لے پہچان کر

دیکھ مجھ کو دُور سے دینے لگا تھا گالیاں
جی میں کیا گزرا تھا کل تیرے اُدھر تو دھیان کر

آ جو آتا ہے، نہیں آتا تو دے مجھ کو جواب
بھیج کر پیغام جھوٹے روز مت حیران کر

دل بغل سے لے گئی رنگین وہ دُزدِ دیدہ نگاہ
ورنہ دل دیتا ہے کون اپنا کسی کو جان کر

بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کے زمانے میں ذوق دہلوی نے ایک قصیدہ لکھ کر پڑھا۔ جب وہ قصیدے کے اِس شعر تک پہنچے ؎

چق ترے دالان کی نازک بہت ہے نازنیں
کیا لگائیں اِس میں ہیں پائے مگس کی تیلیاں

تو شاہ نصیر کے شاگردوں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ اُنھوں نے سمجھا شاید اُستاد پر پھبتی کسی ہے۔ اِس لئے شاہ نصیر کے پُرگو اور حاضر جواب شاگرد منشی گھنشام داس عاصی نے قصیدہ ختم ہونے کے بعد فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر پڑھ دیا ؎

آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا اِس پر بھلا
یا کہ چلمن ہو اور پائے مگس کی تیلیاں
شیخ صاحب! یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں چھوڑیئے
باندھئے گر ہو سکے تارِ نفس کی تیلیاں
ذوق! اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے
قافیے میں گر نہ ہوں حضرت کے بس کی تیلیاں

میرزا داغ دہلوی کے پڑوس میں ایک مسلمان ساہوکار رہتا تھا جو کچھ مدت سے دیوالیہ ہو گیا تھا۔ احسن مارہروی جب فصیح اللغات کے لئے مثالیہ اشعار کہلوا رہے تھے تو اُنہوں نے داغ سے "بچت" کے لفظ کو بھی نظم کرانا چاہا۔ داغ صاحب کہنے لگے کہ ہم اپنے پڑوسی کا حال بیان کئے دیتے ہیں اور یہ کہہ کر برجستہ یہ شعر پڑھ دیا ؎

سودے میں جنسِ دل کے دوالہ نکل گیا
بیوپار وہ کیا تھا کہ جس میں بچت نہ تھی

تیرھواں کاغذ

برق آشیانوی

۳۵۶-۵-۱، مشیرآباد، حیدرآباد نمبر ۲۰

مکرم و محترم! خلوص و احترام

آپ کی معروف ترین شخصیت کے لئے میں اجنبی ہو سکتا ہوں لیکن ادبی دنیا کے لئے اجنبی نہیں ہوں۔ میں عرصے سے لکھ رہا ہوں۔ میری سنجیدہ تحریریں موسیٰ کلیم کے نام سے اور مزاحیہ تخلیقات برق آشیانوی کے نام سے رسائل میں آتی ہیں۔ ۔ ۔ اور دوسرے رسائل میں میری تخلیقات آچکی ہیں۔ "سب رس" میں آنے والے میرے ایک مضمون "ایک کتاب کی رسم اجراء" کو جمالستان نئے ڈائجسٹ کیا اور پھر وہی مضمون "شبستان" اگست ۱۹۶۸ء نے عنوان بدل کر "اب میں کبھی مصنف نہ بنوں گا" ڈائجسٹ کیا۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے میری ایک تخلیق "قصہ پہلی چھتری کا" ۷۶ء میں نشر ہوا ــــــ "بیسویں صدی" میں مضامین شائع نہیں ہوتے ہیں اس لئے ہلکے پھلکے مزاح کی چاشنی دے کر یہ مختصر افسانہ اس کے لئے لکھا ہے۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گا ــــــ "بیسویں صدی" کی بزم میں شرکت میرے لئے باعثِ مسرت ہوگی ۔ ۔ ۔

خلوص کیش ــــــ برق آشیانوی

★

بات صرف اتنی تھی کہ اشفاق نے دس روپے کا ایک نوٹ کھو دیا تھا۔ دس روپے کا نوٹ کھو دینا کوئی ایسی معمولی بات تو نہ تھی کہ دورِ حاضر کی ایک ہوش مند و ہوشیار بیوی اپنے بُدھو شوہر کو آسانی سے معاف کردے ــــــ پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اشفاق کی بیوی ثریا اُسے معاف کردیتی۔ آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا کہ خود ثریا نے اشفاق کو نوٹ دیا تھا۔ ذرا سی دیر میں دس روپے کا نوٹ کھو دینا اشفاق کی زبردست بھول تھی۔ اِس لئے سارے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ گھر کا کونہ کونہ ڈھونڈا جارہا تھا، چپہ چپہ چھانا جارہا تھا لیکن وہ گمشدہ بلکہ مفرور نوٹ تھا کہ مِلتا ہی نہ تھا۔ بیوی جھلّا رہی تھی، میاں پریشان تھا۔ بلکہ شرمندہ تھا کہ ایسی غلطی یا یوں کہئے کہ ایسا جُرم اُس سے کیوں سرزد ہوگیا ــــــ !؟ اُس نے دس روپے کا نوٹ کیوں کھو دیا۔ اِس سے بہتر تھا کہ وہ ایک ہاتھ کھو دیتا، ایک پاؤں گنوا دیتا ــــــ ایک آنکھ ہی کھو دیتا یا پھر اپنے آپ کو کھو دیتا۔ تاکہ یہ پریشانی یہ خجالت اور سب سے بڑھ کر بیوی کا غم و غصّہ برداشت نہ کرنا پڑتا۔

ثریا نے جب گھر کا سارا سامان اُلٹ پلٹ کر ڈالا اور وہ دس روپے کا نوٹ نہ مِلا تو تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ وہ پھر اُٹھی ــــــ ایک فاتحانہ شان کے ساتھ اُٹھی! یعنی اِس انداز سے اُٹھی جیسے اُس نے دس روپے کے نوٹ کا مقام اور مکمل پتہ مع مکان نمبر، محلّہ، شہر وغیرہ کی تفصیل کے معلوم کرلیا ہے ــــــ ایک طنز بھری مُسکراہٹ کے ساتھ اُس نے اشفاق سے دریافت کیا۔

"آپ نے اپنے کوٹ کی جیبیں دیکھ لی ہیں؟"

اشفاق نے کہا: "جی ہاں اچھی طرح!"

"ایک بار میں بھی تو دیکھوں۔ شاید نوٹ آپ کی جیب ہی میں ہو میرا مطلب ہے کاغذات میں مِل گیا ہو اور نظر نہ آیا ہو! اور اکثر ایسا ہوا بھی ہے کہ کوئی ضروری کاغذ ہر جگہ تلاش کرنے کے بعد آپ کی جیب ہی سے برآمد ہوا ــــــ" یہ کہتے ہوئے ثریا نے اشفاق کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور مُٹھی بھر کے کاغذات نکال کر نیچے پھیلا دیئے اور ایک ایک کاغذ کی تہہ کھول کر دیکھنے لگی۔

سب سے پہلے وہ اِن لینڈ کور ہاتھ آیا جو ثریّا نے دو ماہ پہلے اپنی بڑی بہن کے لئے لکھ کر اشفاق کے حوالے کیا تھا کہ پوسٹ بکس میں ڈال دے۔ لیکن ابھی تک وہ جیب ہی میں دھرا تھا۔ حالانکہ اِس اِن لینڈ کور میں ثریّا نے یہ لکھا تھا کہ وہ اپنی بڑی بہن کے بچّے کی پہلی سالگرہ میں اِس لئے شریک نہیں ہو سکتی کہ ننھا بیمار ہے۔ ڈبّہ کی بیماری ہے اور سردی کے موسم میں سَو میل کا طویل سفر کرنا ننّھے کی صحت کے لئے مُضر ہے۔ یہ اِن لینڈ کور جیب میں اب جوں کا توں برآمد ہوا تو ثریّا آگ بگولہ ہوگئی اور کہنے لگی۔

"ہوں ——— ! تو یہ خط گیا ہی نہیں۔ اِسی لئے تو آپا جان کے ہاں سے پھر کوئی خط نہ آیا۔ میں حیران ہوں کہ میں نے تو آپا جان کے دعوت نامے کا جواب فوری دے دیا تھا اور اُنھیں اپنی مجبوری سے مطّلع کر دیا تھا۔ پھر وہ کیوں ناراض ہیں ——— کیوں مجھ سے خفا ہیں ——— ؟" ثریّا نے پُوری قوت سے اُس اِن لینڈ کور کو پھینک دیا تاکہ وہ صحن میں جا گِرے۔ یا یوں کہیے کہ آپا جان کے گھر میں جا گِرے۔ لیکن وہ بے غیرت خط ایک گز سے زیادہ فاصلہ طے نہ کر سکا۔ ایک سَو میل کا سفر تو وہ کیا طے کر سکتا!

دوسرا کاغذ سرکاری دواخانے کا نسخہ تھا۔

تیسرا کاغذ ایک فہرست تھی جس کے بموجب گزشتہ ماہ سامان خریدا گیا تھا۔

چوتھا کاغذ اشفاق کے دوست کا ایک خط تھا۔

پانچواں کاغذ ننّھے کے لئے بازار سے خریدے ہوئے انجکشن کی رسید تھی۔

چھٹا کاغذ بجلی کا بِل تھا۔

ساتواں کاغذ کسی کے گھر کے کرائے نامے کی نقل تھی جو اِس لئے لائی گئی تھی کہ اپنے کرائے دار سے بھی اِسی نمونے کا کرایہ نامہ لکھوا لیا جائے۔

آٹھواں کاغذ ایک اسکور شیٹ تھا جو ایک کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے خریدا گیا تھا۔

نواں کاغذ اشفاق کی شادی کا سہرا تھا جو ایک دوست نے اُس کی شادی کے موقعے پر لکھا تھا۔ پانچ سال کے بعد ایک دوسرے دوست کے پاس ملنے پر وہ لے آیا تھا تاکہ یادگار کے طور پر کسی صندوق میں محفوظ کر دے۔ اُس سہرے کو ثریّا نے مُسکراتے ہوئے شروع سے آخر تک پڑھا اور بہت احتیاط سے اشفاق کے حوالے کر دیا۔ دو ایک بار اُس نے کنکھیوں سے اشفاق کی طرف بھی دیکھا کیونکہ اُس میں عروس کے حُسن کی بے حد تعریف کی گئی تھی اور اُسے حُوروں سے زیادہ حسین کہا گیا تھا جو اُسے بالکل حقیقت پر مبنی نظر آیا۔

دسواں کاغذ کسی یونانی طبیب کا لکھا ہوا نسخہ تھا۔

گیارہواں کاغذ کسی اخبار کا تراشہ تھا۔ اُس میں کوئی اہم خبر نہ تھی۔ سینما کے اشتہار کے ساتھ ایک اداکارہ کی نیم برہنہ تصویر تھی۔ جسے ثریّا نے نفرت کے ساتھ دُور پھینک دیا اور ایک قہر آلود نظر اشفاق پر ڈال کر پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

بارہواں کاغذ ایک مذہبی جلسے کا نظام العمل تھا۔

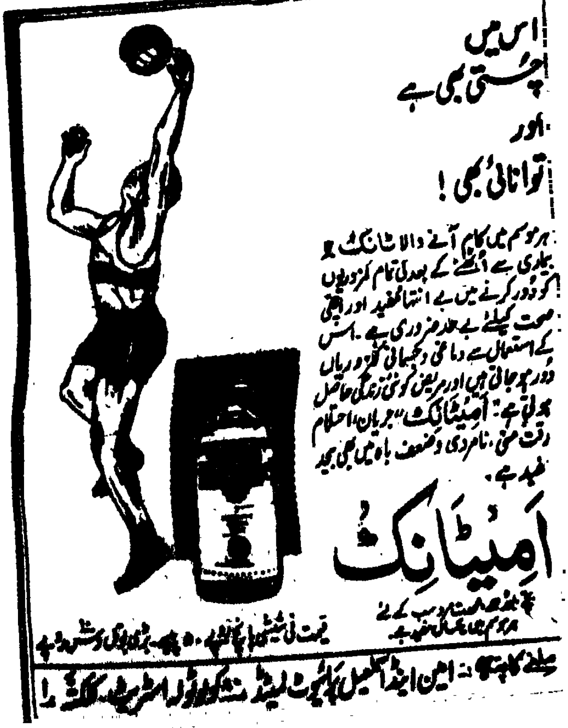
تیرہواں کاغذ ——— اُف یہ کاغذ نہیں تھا۔ قیامت تھی قیامت!! جیسے ہی ثریّا نے یہ کاغذ اُٹھایا اشفاق لپکا کہ چھین لے اور ثریّا نے تیزی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ اشفاق کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ثریّا نے کہا ——— "کیوں اِتنے پریشان کیوں ہو گئے آپ؟ ——— آخر اِس میں ہے کیا؟ ———" یہ کہہ کر ثریّا کچھ دُور ہٹ کر بیٹھ گئی اور کاغذ کو کھولا تو اُس میں سے ایک ننّھا سا فوٹو گِرا ——— یہ فوٹو ایک حسین لڑکی کا تھا اور جس کاغذ میں یہ لپٹا ہوا تھا وہ ایک خط تھا جو اِس طرح شروع ہوا تھا۔

"میری جان سے زیادہ پیارے اشفاق!"

اور اِن الفاظ پر ختم ہوا تھا۔

"تمھاری اور صرف تمھاری ——— عرفانہ"

خط میں کیا لکھا تھا۔ نہ اُس کے بیان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اُس تفصیل کی ضرورت کہ بعد میں کیا واقعات بلکہ حادثات پیش آئے ——— ؟ اب دس روپے کے نوٹ کو اشفاق بھُول چکا تھا۔ ثریّا بھی بھُول چکی تھی۔ کیونکہ اب اُن دس روپوں کی دونوں ہی کو ضرورت باقی نہ رہی تھی . . . اور ثریّا کو تو جیسے دس روپے کے نوٹ کے بجائے دس ہزار کی دستاویز ہاتھ آگئی تھی ———!! اور اشفاق ایسا شرمندہ تھا جیسے اُس نے دس ہزار کی چوری کی ہو!!



غزلیں

خالد ندیم ایم۔ اے

پرسشِ غم ہے درد کی سوغات
آنسوؤں میں نہا گئی ہے رات

ہم قتیلِ جفا، وفا پیشہ
مول لیتے ہیں رات دن خطرات

کیا گزرتی ہے موسمِ گُل میں
بیت جاتی ہے کس طرح برسات

اِک کہانی شبوں کی تنہائی
اِک فسانہ فراق کے حالات

عشرتِ زیست اک طلسمِ خیال
غم سے خالی نہیں کسی کی ذات!

فیاض الدین احمد خان فیاض گوالیاری بی۔ اے

کیوں نازِ بے نیازیٔ پیہم اُٹھائیے
وہ سامنے بھی ہوں تو نظر کم اُٹھائیے

نظارۂ بہار کو آنکھیں ترس گئیں
ہرا کے رُخ سے کاکلِ پُر خم اُٹھائیے

دو دن کی زندگی کے لئے فکرِ عیش کیا
دو دن کی زندگی کے لئے غم اُٹھائیے

کچھ زندگی میں وقفۂ راحت ضرور ہو
مرجائیے جو صدمۂ پیہم اُٹھائیے

فیاض دُکھ کا سُکھ کسی جنت سے کم نہیں
بس چل سکے تو سر پہ جہنم اُٹھائیے

رئیس رامپوری

قصداً نہ سہی پھر بھی بڑی بے ادبی ہے
رہ رہ کے نظر اُن کی طرف اٹھ تو رہی ہے

شیریں سخن و ماہ وش و سرو خراماں
سب کچھ ہیں مگر اُن میں مروت کی کمی ہے

قصّوں میں سہی، نام تو آتا ہے وفا کا
دنیا میں کہیں شمعِ وفا جل تو رہی ہے

تکلیفِ کرم کس لئے دی جائے کسی کو
اب زندگیٔ درد تو راس آہی گئی ہے

اُس شوخ کی باتوں پہ رئیس آپ نہ جائیں
اُس کی جو ادا ہے سببِ دل شکنی ہے

سلمیٰ سعادت بی ایس سی

ضبط کرلوں میں اگر لب پہ فغاں آئی ہو
کس کو منظور کہ ظالم تری رسوائی ہو

عشق کہتا ہے کہ دلکش کوئی صورت ہوتی
حسن کہتا ہے کہ میرا کوئی شیدائی ہو

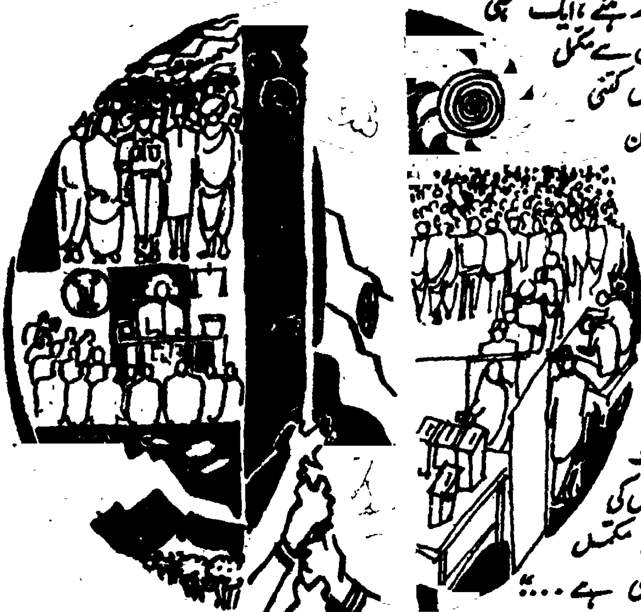
چاک دامن بھی سیوں پاؤں کے کانٹے بھی چنوں
ختم جب سلسلۂ بادیہ پیمائی ہو

پھر تو خلوت میں بھی اک بزمِ محبت ہوگی
اپنے پہلو میں اگر وہ بتِ ہرجائی ہو

عشق میں اِتنا مکمّل تو جنوں ہو جائے
ایک دیوانہ ہو اور خلق تماشائی ہو

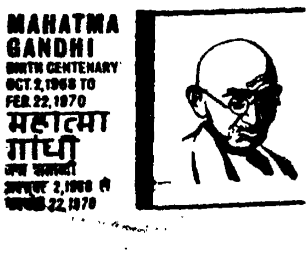
عشق وہ عشق نہیں جس میں سکوں ہو حاصل
حسن وہ حسن نہیں جس میں نہ خود رائی ہو

ایک مُلک، ایک قوم



"ایک ہی مملکت میں رہنے والے ایک ہی جھنڈے کا احترام کرنے اور اس سے مکمل وفاداری رکھنے والے لوگوں میں کتنی ساری باتیں مشترک ہیں.... کہ اُن لوگوں کے لئے جو بھارت کو ایک ملک تسلیم کرتے ہیں، اقلیت یا اکثریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ وہ ایک سی مراعات اور ایک سے برتاؤ کے مستحق ہیں.... ہمارے نظریئے کے مطابق مملکت سیکولر اور جمہوری ہونی چاہیئے، اور اس کی مختلف اکائیوں میں مکمل آہنگ لازمی ہے...."

مہاتما گاندھی



طنزیہ

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم۔ اے

۱۷۰۵۔ پہاڑی بھوجلہ دلی

یار خوشترا!

معاف کرنا فاؤنٹن پن میں روشنائی ختم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے یہ خط تم کو پنسل سے لکھ رہا ہوں۔ اِسے ٹٹول ٹٹول کر پڑھ لو اور مجھ پر تین حرف بھیجو۔ ایک بجے شب میں روشنائی کہاں سے لاؤں جبکہ راجدھانی میں بجلی کی بچت کے لئے آٹھ بجے سے ہوٹل والوں اور پان والوں کی دوکانوں کے علاوہ ساری دوکانوں کی نس بندی کا حکم جاری ہے۔ گھر سے اس وقت باہر نکلتے یوں بھی ڈر معلوم ہوتا ہے کہ جگہ جگہ سیاسی لوٹ مار کے سلسلہ میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ میرے حلقہ میں کوئی مشہور کانگریسی لیڈر در دِ غرل کے انتقال سے کارپوریشن کی ایک سیٹ خالی ہوئی ہے جس پر مختلف البطن امیدواروں کی یلغار ہے ایک خالی ناند کی طرف دس بارہ منہ مختلف اطراف سے بڑھ رہے ہیں ایک منہ دوسرے منہ کا گلا گھونٹنے پر آمادہ ہے۔ ہر اُمیدوار اپنی شادی کے کپڑوں میں کفنایا ہوا جاہل عوام کو ران سواری میں استعمال کرنے پر آمادہ ہے۔ اور اپنی ملکی و قومی خدمات کو مختلف مخارج سے واضح کر رہا ہے میں نے حفظِ ماتقدم کے خیال سے اپنے دروازے پر لکھ کر لگا دیا ہے کہ "یہاں نہایت مناسب داموں پر الکشنی امیدواروں کی تسلی بخش مرمت کی جاتی ہے"۔ لہٰذا ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی اُمیدوار میری گردن نہ مار دے ——— کل رات ایک بڑا بھیانک خواب دیکھا جس کے سبب سخت متفکر ہوں تم ہی بتاؤ اُس کی تعبیر کیا ہوگی؟ میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے عالمِ بالا سے مرزا غالبؔ کو اُن کی صد سالہ برسی میں شرکت کے لئے بلا لیا گیا ہے مگر اب اُن کی واپسی کے کرایہ کا کوئی انتظام نہیں ہے اور وہ مارے مارے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ اِس سلسلہ میں اُنھوں نے جن جن والیان ریاست کو خطوط لکھے ہیں اُن کے پاس سے جواب آیا ہے کہ چونکہ حکومت کی طرف سے اُن کا جیب خرچ بند ہونے والا ہے اِس لئے وہ خود عالمِ بالا تک جانے کے لئے پا بہ رکاب ہیں اور اُسی مصیبت میں مبتلا ہیں جس مصیبت کا سرِدست مرزا صاحب شکار ہیں۔ دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ درمیانی مدت کے انتخاب میں کانگریس کو سرخرو کرے اور مرزا صاحب کی صد سالہ برسی اُن کے کام آئے۔ اِس خواب کی تعبیر سے بواپسی ڈاک مطلع کرو ——— شکریہ کہ میری ایک کتاب "غالبِ خستہ کے بغیر ..." کے عنوان سے اِسی فروری میں شائع ہو رہی ہے جو غالبؔ سے متعلق اُن تمام مضامین پر مشتمل ہوگی جو اب تک میں لکھ چکا ہوں۔ تمہارے ہاں بیسویں صدی میں تین چار سال قبل کے شماروں میں ایک مضمون "غالبؔ فاران بانیہ کے نرغے میں" اور دوسرا "عالمِ برزخ سے مرزا غالبؔ کا خط پنڈت نہرو کے نام" شائع ہوا ہے اُس کی کوئی نقل یا کٹنگ میرے پاس موجود نہیں ہے اس لئے وہ دونوں شمارے مجھے اپنے کسی آدمی کے ہاتھ بھجوا دیں انھیں نقل کرا کے واپس کر دوں گا۔ چونکہ میں کسی مضمون کی نقل رکھنے کا عادی نہیں تھا

اور جوں کی توں اصل رسائل کو اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں اس لئے مجھے یہ زحمت پیش آ رہی ہے۔ میں بے چینی سے اُن شماروں کا انتظار کروں گا۔ کانگرس کی طرح مطلب نکل جانے کے بعد مجھے دغا نہ دینا۔

مخلص —— غلام احمد فرقت کاکوروی

مرزا غالب اور اُن کی رفیقۂ حیات ایک کمرے میں باتیں کر رہے ہیں ——

دلّی کالج میں اُردو کے مُعلّم کی ایک جگہ نکلی ہے، جس کا آج ہی سویرے ساڑھے گیارہ بجے انٹرویو ہے، مرزا صاحب بھی ایک اُمیدوار کی حیثیت سے اُس میں شریک ہیں۔ پونے دس بجنے کو ہیں۔ اور مرزا صاحب جانے کی ساری تیاریاں کر چکے ہیں۔ صرف خلعت پہننا باقی ہے جو دربارِ مغلیہ سے اُنھیں مِلا ہے۔ وہ ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے اپنی مونچھوں کے سفید بالوں کو ایک چھوٹی سی قینچی سے کاٹ کاٹ کر کم کر رہے ہیں۔

بیوی:۔ "اے میں کہتی ہوں اب جاؤ نا! دس بجنے کو ہیں اور تمہارا بناؤ سنگار ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اے وہاں تم سے کوئی یہ سوال کرنے تھوڑے ہی بیٹھے گا کہ تمہاری مونچھ میں کتنے بال سفید اور کتنے سیاہ ہیں۔ اگر تمہارے نام سے کوئی دوسرا آدمی پہنچ گیا اور لے لیا گیا تو تم ٹکھٹو کے ٹکھٹو رہ جاؤ گے، یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا اور نگوڑی، جیسی زندگی چل رہی ہے ویسی چلتی رہے گی۔"

مرزا صاحب:۔ "بھائی جانتا ہوں مگر تم یقین مانو کہ اُس جگہ پر سوائے اِس خاکسار کے کوئی دُوسرا اُمیدوار نہیں لیا جائے گا۔"

بیوی:۔ "یہ کیسے؟ اے وہاں کون تمہارا سُسر یا سالا بیٹھا ہے جو تمہیں لے لیگا"

مرزا صاحب:۔ "بھائی تم بات سمجھتی نہیں ہو اور جو مُنہ میں آتا ہے کہہ گزرتی ہو۔ بات یہ ہے کہ اوّل تو میری شہرت جسے چاہے تم تسلیم کرو یا نہ کرو دُنیا تسلیم کئے ہے۔ دُوسرے میں بادشاہِ وقت کا اُستاد ہوں اور تیسرے میری فارسی دانی کے دُنیا میں ڈنکے پٹے ہوئے ہیں۔ پھر جس کالج میں یہ جگہ خالی ہوئی ہے۔ اُس کے انگریز پرنسپل کا تو یہ عالم ہے کہ جہاں کہیں مجھے دیکھ پاتا ہے آنکھیں بچھانے لگتا ہے اور کہتا ہے آپ جیسا شاعر اور فارسی داں، اب کبھی پیدا نہ ہوگا!"

بیوی:۔ "اے انھیں شیخیوں نے تو آج تک تمھیں کچھ نہ کرنے دیا اور گھر کے بیٹھکے کے سوا کوئی دُوسرا ٹھیا بیٹھنے کو نہیں جُڑا۔ سویرے سے شام تک نجانے کہاں کہاں کے مُردے شرابی کبابی جمع رہتے ہیں۔ جن کے مرنے کو کہیں اور ٹھکانا نہیں۔ سویرا ہوا اور نگوڑے سب کے سب بھرّا مار کے مرزا کے گھر پہنچ گئے اور دن بھر دھرنا دیئے بیٹھے رہے۔ اے میں کہتی ہوں اِن مونڈی کاٹوں کا کیا دُنیا میں کوئی رونے والا نہیں ہے۔ جو دن دن بھر تمہارے گرد جھوٹی سچی اُڑانے پہنچ جاتے ہیں"

مرزا صاحب:۔ "اچھا اب ختم کرو۔ اِس رونے کو تو ساری زندگی پڑی ہے۔ سُنتے سُنتے کان پک گئے۔ آج ایک مدّت بعد جو موقع ہاتھ لگا ہے سو تم میرے دوست احباب کو کرتی اُٹھا اُٹھا کر کوس رہی ہو کہ جگہ ملتی ہو تو بھی نہ ملے۔ یہ تمہاری بددعائیں ہی تو ہیں جن کے سبب مجھے ابھی تک اِس طرح بیکاری کا بھگتان بھگتنا پڑا ورنہ نجانے آج میں کہاں سے کہاں ہوتا۔ سویرے سے شام تک خدا جانے کتنے معصوموں اور بے گناہوں کا پیٹھ پیچھے صبر لیتی رہتی ہو جس کے سبب میں اِس مصیبت میں مبتلا ہوں بُرا تم کہتی ہو اور بھگتان مجھے بھگتنا پڑتا ہے۔ کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا!"

بیوی:۔ (چیخ کر) "اے لوگو اور سُنو، یہ نگوڑے شرابی کبابی بھی اب معصوم ہونے لگے۔ میں کہتی ہوں یہ جو لوگ دن بھر چپیس۔ چوسر۔ شطرنج اور گنجفہ پر سیمرنیم کی مشق کرتے رہتے ہیں اُنھیں گھر والیاں گھر سے نکال کیوں نہیں دیتیں۔ اِن مُردوں سے تو سقر اور ہاویہ بھی پناہ مانگیں گے۔ اِنھیں کمبختوں نے تو مُنہ میں کالک لگا کر جیل بھجوا دیا اور اب بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

مرزا صاحب:۔ "ارے کیوں کسی بے گناہ کا صبر لیتی ہو۔ یقین مانو میرے دوستوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھ سے یا تم سے کسی حیثیت سے کم ہو۔"

بیوی:۔ "اے بڑی حیثیت والے بنتے ہیں، تو دس بیس ہزار روپیہ دے دیں تب میں جانوں۔"

مرزا صاحب:۔ (مسکرا کر) "میں سچ کہتا ہوں یہ عبادت اور ریاضت جو تم چوبیس گھنٹے میں پچیس گھنٹے تک کرتی ہو اس سے تو ہم رند اچھے جو کسی کے پیچھے میں پیر نہیں ڈالتے اور دیکھ لینا اتنی ریاضت کے بعد بھی تم بخشی و خشی خاک نہ جاؤ گی۔"

بیوی:۔ "اے کیا کفر کی باتیں کر رہے ہو۔ ذرا اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھو تو

بال بال گناہوں میں بندھا پڑا ہے۔"

مرزا صاحب:- "بہرصورت میں لاکھ گناہگار اور سیاہ کار سہی مگر پھر بھی تم سے ہزار گنا اچھا! بات یہ ہے کہ تم آج تک بخشش کے معنے ہی نہیں سمجھتیں تم تو عبادت صرف اپنی جنّت کی خاطر کرتی ہو اور سمجھتی ہو کہ ساری عبادت کے صلے میں تمہیں جنّت مل جائے گی اور میں بخشش کے معنے "روحانی سکون" کے لیتا ہوں۔ جو بحمد اللہ مجھے اور میرے دوستوں کو اس مفلسی میں بھی حاصل ہے اور تم دیکھ لینا مرنے کے بعد میری روح پھر سے اڑ کر مقامِ علّیین سے اُدھر نظر نہ آئے گی۔"

بیوی:- "اے اگر مقامِ علّیین تم جیسے شرابیوں کبابیوں کو ملنے لگا تو میں وہاں بھی جانے سے انکار کر دوں گی!"

مرزا صاحب:- "سُنو! اپنی عدمِ بخشش کا سبب ... یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ قیامت کے دن اُنھیں بندوں کی پکار ہوگی۔ جن کے نام گناہگاروں کے رجسٹر میں درج ہوں گے اور جنھوں نے کوئی گناہ ہی نہ کیا ہوگا اُن کا نام تو درجِ رجسٹر ہونے سے رہا۔ اِس لئے آخیر میں تم لوگ عالمِ برزخ میں جب انتظار کرتے کرتے تھک جاؤ گی تو داورِ محشر کے پاس جا کر دریافت کرو گی کہ تمہارا نام کیوں نہیں پکارا گیا اور اُس وقت تک جنت کا ہاؤس فُل ہو چکا ہوگا لہٰذا تم کو یہ جواب ملے گا کہ آپ لوگوں نے دیر کر دی۔ اب ہاؤس فُل ہو چکا ہے اور اس میں کوئی اب مزید گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا آپ نے جیسا دُنیا میں اپنے ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا۔ یہاں بھی دیجئے اور سردست عالمِ برزخ میں قیام فرمائیے۔"

بیوی:- "اے یہ انصاف تمہارے شرابی کبابی دوستوں ہی کے ساتھ ہوگا۔ وہاں جب دُرّے پڑیں گے تو ایک ایک دُرّے میں چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا!"

غالبؔ:- "دُرّے پڑیں گے تو میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ میں ہر وار ہڈی پر روکوں گا۔ اور یہ جسم کی ہڈیاں بھی تمہاری دین ہیں۔ تمھیں نے جلاتے جلاتے اِس حالت کو پہنچا دیا ہے!"

بیوی:- "اے توبہ! خدا سے ڈرو۔ یہ انصاف تو وہیں ہوگا کہ تم نے جلاتے جلاتے مجھے اِس حالت پہ پہنچا دیا ہے۔ یا میں نے تم کو۔"

غالبؔ:- "اِس سے بڑھ کر ایک شوہر کو اُس کی بیوی اور کیا جلاتی کہ تم نے جتنی اولادیں پیدا کیں اُنھیں ایسی بے توجہی سے پیدا کیا کہ کسی کو سال سوا سال سے زیادہ جینے کی نوبت نہ آئی۔"

بیوی:- "اے اُن گڑے مُردوں کو اُکھاڑتے رہو گے یا گھر سے نکلنے کا نام بھی لو گے۔ ساڑھے دس بجنے کو ہیں اور وہاں گیارہ بجے پہنچنا ہے!"

غالبؔ:- "اچھا تو بیگم! مدار خاں کو آواز دو کہ فینس تیار کرائیں۔ یہیں دِلّی کالج تک تو جانا ہی ہے اور دِلّی کالج ٹکے ٹکے ڈولی ہے۔ دیکھو داروغہ کلّو سے کہہ دو کہ پیچوان تازہ کر کے اور چلم بھر کر فینس پہ رکھ دے چلتے چلاتے حقّہ مزے پہ آجائے گا۔"

بیوی:- "اور لو یہ امامِ ضامن باندھ لو تاکہ امام کی ضمانت رہے۔"

غالبؔ:- "ارے نیک بخت! مجھے گلی قاسم جان سے حوضِ قاضی پار کر کے اجمیری گیٹ ہی تک تو جانا ہے۔ دن کا وقت ہے۔ کون مجھے لُوٹے لے رہا ہے جو امام کی ضمانت میں بھیج رہی ہو۔ جس وقت کوتوال مردود مجھے جوئے کے الزام میں پکڑ کر کوتوالی لئے جا رہا تھا۔ اُس وقت اگر تم نے امام ضامن باندھا ہوتا تب تو کوئی بات بھی تھی۔ کیوں کہ اُس وقت ایک ضامن کی تلاش تھی۔ اور اب اِس وقت تو میں ایک ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں خود وہاں پرنسپل میرے استقبال کو آئے گا۔"

بیوی:- "اے توبہ! خُدا سے ڈرو۔ تم اِس وقت بھی مذہب کو چٹکیوں پر اُڑائے جا رہے ہو۔"

غالبؔ:- "اِس کا مذہب کے ماننے نہ ماننے سے کیا تعلق۔ یُوں میں تمہارے کہنے سے امام ضامن کیا کہو تو بٹیر کی کابک اور طوطے کا پنجرہ تک باندھ لوں۔ یہ ساری کی ساری باتیں عورتوں کے ڈھکوسلے ہیں جو عام طور پہ گنہ گار ہوتی ہیں اور جو مولا علی پر ایمان نہیں رکھتیں۔ میں تمہاری طرح کفرانِ نعمت تو کرتا نہیں کہ شراب میسّر ہے تو شراب نہ پیوں۔ گھر میں دنیا کی نعمتیں موجود ہوں اور روزہ رکھوں۔"

(باہر سے آواز) "سرکار فینس تیار ہے!"

غالبؔ:- "اچھا بیگم اب جوانی کے صدقہ میں تمہارا تابعدار رخصت ہوتا ہے۔ مگر ایک خاص جوانی والی ادا سے ایک بار مجھے دیکھ لو!"

بیوی:- "اے چلو بڑھاپے میں بُڑ بھس سوار ہے!"

غالبؔ:- (ڈیوڑھی پر آکر) "کلّو میاں! ارے بھئی کلّو میاں! کہئے بھئی فینس میں پیچوان رکھ دیا؟"

کلّو:- "سرکار! پیچوان، بیاض اور حضور احتیاطاً آفتابہ بھی رکھ دیا ہے۔ کہ شاید دِلّی کالج میں کوئی حاجت پیش آجائے۔"

بیوی:- (ڈیوڑھی کے دروازے سے) "اے کلّو میاں! او کلّو میاں ذرا اپنے مرزا صاحب کو کھڑے کھڑے اِدھر تو بھیج دو۔"

اور جوں کی توں اصل رسائل کو اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں اس لئے مجھے یہ زحمت پیش آ رہی ہے۔ میں بے چینی سے اُن شماروں کا انتظار کروں گا۔ کانگرس کی طرح مطلب نکل جانے کے بعد مجھے دغا نہ دینا۔

مخلص ——— غلام احمد فرقت کاکوروی

مرزا غالبؔ اور اُن کی رفیقۂ حیات ایک کمرے میں باتیں کر رہے ہیں ———

دلّی کالج میں اُردو کے مُعلم کی ایک جگہ نکلی ہے، جس کا آج ہی سویرے ساڑھے گیارہ بجے انٹرویو ہے، مرزا صاحب بھی ایک اُمیدوار کی حیثیت سے اُس میں شریک ہیں۔ پونے دس بجنے کو ہیں۔ اور مرزا صاحب جانے کی ساری تیاریاں کر چکے ہیں۔ صرف خلعت پہننا باقی ہے جو دربارِ مغلیہ سے اُنھیں ملا ہے۔ وہ ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے اپنی مونچھوں کے سفید بالوں کو ایک چھوٹی سی قینچی سے کاٹ کاٹ کر کم کر رہے ہیں۔

بیوی:۔ "اے میں کہتی ہوں اب جاؤ نا! دس بجنے کو ہیں اور تمہارا بناؤ سنگار ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اے وہاں تم سے کوئی یہ سُوال کرنے تھوڑے ہی بیٹھے گا کہ تمہاری مونچھ میں کتنے بال سفید اور کتنے سیاہ ہیں۔ اگر تمہارے نام سے کوئی دوسرا آدمی پہنچ گیا اور لے لیا گیا تو تم تکھٹو کے تکھٹو رہ جاؤ گے، یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا اور نگوڑی، جیسی زندگی چل رہی ہے ویسی چلتی رہے گی۔"

مرزا صاحب:۔ "بھائی جاتا ہوں مگر تم یقین مانو کہ اُس جگہ پر سوائے اِس خاکسار کے کوئی دُوسرا اُمیدوار نہیں لیا جائے گا۔"

بیوی:۔ "یہ کیسے؟ اے وہاں کون تمہارا سُسر یا سالا بیٹھا ہے جو تمہیں لے لیگا"

مرزا صاحب:۔ "بھائی تم بات سمجھتی نہیں ہو اور جو مُنہ میں آتا ہے کہہ گزرتی ہو۔ بات یہ ہے کہ اوّل تو میری شہرت جسے چاہے تم تسلیم کرو یا نہ کرو دُنیا تسلیم کئے ہے۔ دُوسرے میں بادشاہِ وقت کا اُستاد ہوں اور تیسرے میری فارسی دانی کے دُنیا میں ڈنکے پٹے ہُوئے ہیں۔ پھر جس کالج میں یہ جگہ خالی ہوئی ہے۔ اُس کے انگریز پرنسپل کا تو یہ عالم ہے کہ جہاں کہیں مجھے دیکھ پاتا ہے آنکھیں بچھانے لگتا ہے اور کہتا ہے آپ جیسا شاعر اور فارسی داں، اب کبھی پیدا نہ ہوگا!"

بیوی:۔ "اے انھیں شیخیوں نے تو آج تک تمھیں کچھ نہ کرنے دیا اور گھر کے بیٹھکے کے سوا کوئی دُوسرا ٹھیا بیٹھنے کو نہیں جُوڑا۔ سویرے سے شام تک نجانے کہاں کہاں کے مُردے شرابی کبابی جمع رہتے ہیں۔ جن کے مرنے کو کہیں اور ٹھکانا نہیں۔ سویرا ہوا اور نگوڑے سب کے سب بھرّا مار کے مرزا کے گھر پہنچ گئے اور دن بھر دھرنا دئے بیٹھے رہے۔ اے میں کہتی ہوں اِن مونڈی کاٹوں کا کیا دُنیا میں کوئی رونے والا نہیں ہے۔ جو دن دن بھر تمہارے گرد جھوٹی سچّی اُڑانے پہنچ جاتے ہیں"

مرزا صاحب:۔ "اچھا اب ختم کرو۔ اِس رونے کو تو ساری زندگی پڑی ہے۔ سُنتے سُنتے کان پک گئے۔ آج ایک مدّت بعد جو موقع ہاتھ لگا ہے سو تم میرے دوست احباب کو کرتی اُٹھا اُٹھا کر کوس رہی ہو کہ جگہ ملتی ہو تو بھی نہ ملے۔ یہ تمہاری بد دعائیں ہی تو ہیں جن کے سبب مجھے ابھی تک اِس طرح بیکاری کا بھگتان بھگتنا پڑا ورنہ نجانے آج میں کہاں سے کہاں ہوتا۔ سویرے سے شام تک خدا جانے کتنے معصوموں اور بے گناہوں کا پیٹھ پیچھے صبر لیتی رہتی ہو جس کے سبب میں اِس مصیبت میں مبتلا ہوں۔ بُرا تم کہتی ہو اور بھگتان مجھے بھگتنا پڑتا ہے۔ کرے داڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا!"

بیوی:۔ (چیخ کر) "اے لوگو اور سُنو، یہ نگوڑے شرابی کبابی بھی اب معصوم ہونے لگے۔ میں کہتی ہوں یہ جو لوگ دن بھر چوپسی۔ چوسر۔ شطرنج اور گنجفہ پر سمر یزم کی مشق کرتے رہتے ہیں اُنھیں گھر والیاں گھر سے نکال کیوں نہیں دیتیں۔ اِن مُردوں سے تو سقر اور ہاویہ بھی پناہ مانگیں گے۔ اِنھیں کمبختوں نے تو مُنہ میں کالک لگا کر جیل بھجوا دیا اور اب بھی پنڈ نہیں چھوڑتے"

مرزا صاحب:۔ "ارے کیوں کسی بے گناہ کا صبر لیتی ہو۔ یقین مانو میرے دوستوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھ سے یا تم سے کسی حیثیت سے کم ہو"

بیوی:۔ "اے بڑی حیثیت والے بنتے ہیں، تو دس بیس ہزار رُوپیہ دے دیں تب میں جانوں"

مرزا صاحب:۔ (مسکرا کر) "میں سچ کہتا ہوں یہ عبادت اور ریاضت جو تم چوبیس گھنٹے میں پچیس گھنٹے تک کرتی ہو اِس سے تو ہم رِند اچھے جو کسی کے پھٹے میں پیر نہیں ڈالتے اور دیکھ لینا اتنی ریاضت کے بعد بھی تم بخشی و خشی خاک نہ جاؤ گی"

بیوی:۔ "اے کیا کفر کی باتیں کر رہے ہو۔ ذرا اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھو تو

بال بال گناہوں میں بندھا پڑا ہے۔"

مرزا صاحب:۔ "بہر صورت میں لاکھ گنا ہگار اور سیاہ کار سہی مگر پھر بھی تم سے ہزار گنا اچھا! بات یہ ہے کہ تم آج تک بخشش کے معنے ہی نہیں سمجھتیں تم تو عبادت صرف اپنی جنّت کی خاطر کرتی ہو اور سمجھتی ہو کہ ساری عبادت کے صلے میں تمہیں جنّت مل جائے گی اور میں بخشش کے معنے "رُوحانی سکون" کے لیتا ہوں۔ جو بحمد اللہ مجھے اور میرے دوستوں کو اِس مفلسی میں بھی حاصل ہے اور تم دیکھ لینا مرنے کے بعد میری رُوح پُھر سے اُڑ کر مقامِ علیین سے اُدھر نظر نہ آئے گی۔"

بیوی:۔ "اے اگر مقامِ علیین تم جیسے شرابیوں کبابیوں کو ملنے لگا تو میں وہاں بھی جانے سے اِنکار کر دوں گی!"

مرزا صاحب:۔ "سُنو! اپنی عدمِ بخشش کا سبب . . . یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ قیامت کے دن اُنھیں بندوں کی پکار ہو گی۔ جن کے نام گنا ہگاروں کے رجسٹر میں درج ہوں گے اور جنھوں نے کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو گا اُن کا نام تو درجِ رجسٹر ہونے سے رہا۔ اِس لئے آخیر میں تم لوگ عالمِ برزخ میں جب انتظار کرتے کرتے تھک جاؤ گی تو داورِ محشر کے پاس جاکر دریافت کرو گی کہ تمہارا نام کیوں نہیں پکارا گیا اور اُس وقت تک جنت کا ہاؤس فُل ہو چکا ہو گا۔ لہٰذا تم کو یہ جواب ملے گا کہ آپ لوگوں نے دیر کر دی۔ اب ہاؤس فُل ہو چکا ہے اور اس میں کوئی اب مزید گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا آپنے جیسا دُنیا میں اپنے ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا۔ یہاں بھی دیجئے اور بصد شوق عالمِ برزخ میں قیام فرمایئے۔"

بیوی:۔ "اے بیا انصاف تمہارے شرابی کبابی دوستوں ہی کے ساتھ ہو گا۔ وہاں جب دُرّے پڑیں گے تو ایک ایک دُرّے میں چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا!"

غالب:۔ "دُرّے پڑیں گے تو میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ میں ہر وار ہڈی پر روکوں گا۔ اور یہ جسم کی ہڈیاں بھی تمہاری دین ہیں۔ تمہیں نے جلاتے جلاتے اِس حالت کو پہنچا دیا ہے!"

بیوی:۔ "اے توبہ! خدا سے ڈرو۔ یہ انصاف تو وہیں ہو گا کہ تم نے جلاتے جلاتے مجھے اِس حالت پہ پہنچا دیا ہے۔ یا میں نے تم کو۔"

غالب:۔ "اِس سے بڑھ کر ایک شوہر کو اُس کی بیوی اور کیا جلاتی کہ تم نے جتنی اولادیں پیدا کیں اُنھیں ایسی بے توجہی سے پیدا کیا کہ کسی کو سال سوا سال سے زیادہ جینے کی نوبت نہ آئی۔"

بیوی:۔ "اے اُن گڑے مُردوں کو اُکھاڑتے رہو گے یا گھر سے نکلنے کا نام بھی لو گے۔ ساڑھے دس بجنے کو ہیں اور وہاں گیارہ بجے پہنچنا ہے!"

غالب:۔ "اچھا تو بیگم! مدار خاں کو آواز دو کہ فینس تیار کرائیں۔ یہیں دِلّی کالج تک تو جانا ہی ہے اور دِلّی کالج ٹکے ٹکے ڈولی ہے۔ دیکھو درد غہ کلّو سے کہہ دو کہ پیچوان تازہ کر کے اور چلم بھر کر فینس پر رکھ دے چلتے چلاتے حقہ مزے پر آجائے گا۔"

بیوی:۔ "اور لو یہ امامِ ضامن باندھ لو تاکہ امام کی ضمانت رہے۔"

غالب:۔ "ارے نیک بخت! مجھے گلی قاسم جان سے حوضِ قاضی پار کر کے اجمیری گیٹ ہی تک تو جانا ہے۔ دن کا وقت ہے۔ کون مجھے لُوٹے لے رہا ہے جو امام کی ضمانت میں بھیج رہی ہو۔ جس وقت کوتوال مردود مجھے جوئے کے الزام میں پکڑ کر کوتوالی لئے جا رہا تھا۔ اُس وقت اگر تم نے امام ضامن باندھا ہوتا تب تو کوئی بات بھی تھی۔ کیوں کہ اُس وقت ایک ضامن کی تلاش تھی۔ اور اب اِس وقت تو میں ایک ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں خود وہاں پرنسپل میرے استقبال کو آئے گا۔"

بیوی:۔ "اے توبہ! خُدا سے ڈرو۔ تم اِس وقت بھی مذہب کو چُٹکیوں پر اُڑائے جا رہے ہو۔"

غالب:۔ "اِس کا مذہب کے ماننے نہ ماننے سے کیا تعلق۔ یُوں میں تمہارے کہنے سے امام ضامن کیا کہو تو بٹیر کی کابک اور طوطے کا پنجرہ تک باندھ لوں۔ یہ ساری کی ساری باتیں عورتوں کے ڈھکوسلے ہیں جو عام طور پہ گنہ گار ہوتی ہیں اور جو مولا علی پر ایمان نہیں رکھتیں۔ میں تمہاری طرح کفرانِ نعمت تو کرتا نہیں کہ شراب مُیسر ہے تو شراب نہ پیوں۔ گھر میں دنیا کی نعمتیں موجود ہوں اور روزہ رکھوں۔"

(باہر سے آواز) "سرکار فینس تیار ہے!"

غالب:۔ "اچھا بیگم اب جوانی کے صدقہ میں تمہارا تابعدار رخصت ہوتا ہے۔ مگر ایک خاص جوانی والی ادا سے ایک بار مجھے دیکھ لو!"

بیوی:۔ "اے چلو بُڑھاپے میں بُڑھبس سوار ہے!"

غالب:۔ (ڈیوڑھی پر آکر) "کلّو میاں! ارے بھئی کلّو میاں! کہیئے بھئی فینس میں پیچوان رکھ دیا؟"

کلّو:۔ "سرکار! پیچوان، بیاض اور حضور احتیاطاً آفتابہ بھی رکھ دیا ہے۔ کہ شاید دِلّی کالج میں کوئی حاجت پیش آجائے۔"

بیوی:۔ (ڈیوڑھی کے دروازے سے) "اے کلّو میاں! او کلّو میاں ذرا اپنے مرزا صاحب کو کھڑے کھڑے اِدھر تو بھیج دو۔"

کلّو:- (مرزا صاحب کے پاس آکر) "سرکار! بیگم صاحبہ یاد فرما رہی ہیں۔"

غالب:- (ڈیوڑھی کے دروازے کے پاس آکر) "ارے بھئی کیا کہہ رہی ہو۔ آج تو منٹ منٹ پر میں تم کو یاد آرہا ہوں خیر تو ہے؟"

بیوی:- "اے خیر دیر پہ بھاڑ جھونکو۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ اگر خدا نے کہا ملازمت مل گئی اور تمہارے پرنسپل صاحب نے پیشگی تنخواہ دے دی تو اسمیں سے یاد کرکے گھنٹے والے کے یہاں سے دو روپے کا حلوا سوہن اور تین چار سیر دسہری یا ثمر بہشت ضرور لیتے آنا!"

غالب:- "مگر بیگم! تمہاری اس ادا کا بھی کوئی جواب نہیں ہے کہ ابھی ملازمت ہوا میں معلق ہے اور فرمائشوں کا تانتا تم نے پہلے سے باندھ رکھا ہے! قربانت شوم!"۔

بیوی:- "میں نے اگر کا لفظ اس لئے لگا دیا ہے۔ کہ اگر خدا نہ کردہ کوئی دوسری صورت پیش آئے۔ تو نہ لینا۔ اے میں "زین العابدین کے لئے کہتی تھی جو آج کئی دن سے آم، آم رٹ رہا ہے۔"

غالب:- "اچھا بیگم خدا حافظ!"

(آگے بڑھ کر کلّو سے مخاطب ہوکر) تو کلّو میاں! یہ فینس میں آفتابہ رکھنے کا کونسا تک تھا۔ ارے بھئی میں دلّی کالج ملازمت کے لئے جا رہا ہوں نہ کہ حوائج ضروری سے فارغ ہونے۔"

کلّو:- (ہنس کر) "اے سرکار میں نے احتیاطاً رکھ دیا معلوم نہیں وہاں پانی میسّر آئے یا نہ آئے۔"

غالب:- "اچھا کلّو میاں! اب کہاروں کو آواز دو اور اُن سے کہہ دو کہ حوض قاضی کی طرف سے چلیں۔ اور واپسی بھی اُدھر ہی سے ہوگی اور کلّو میاں ذرا اِدھر آؤ (کان میں) "واپسی پر حوضِ قاضی پر جانکی داس کی دوکان سے ایک اَدھا لے لینا اور کہہ دینا کہ مرزا صاحب کے حساب میں لکھ لیں۔ تم آگے چلو اور نیاز سے کہہ دو کہ وہ فینس کے پیچھے پیچھے آئے اور دیکھو اَدھے والی بات بیگم سے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ تم جانتے ہو۔"

کلّو:- "اے سرکار میں آپ کا پُرانا نمک خوار ہوکر ایسی اناڑی پن کی بات مُنہ سے کیوں کر نکالوں گا۔"

غالب:- "ارے بھئی میں اِس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ ابھی اُس دِن تمہاری غیبت میں میں نے ڈومنی سے جو ذرا حُقّہ تازہ کرایا تھا۔ وہ بات کسی نے بیگم سے جاکر جڑ دی۔ پھر اِس پر اُنھوں نے جو زمین و آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ اس سے تو تم واقف ہی ہو۔ اس لئے احتیاطاً میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ ممکن ہے غیر شعوری طور پر کسی وقت تمہارے مُنہ سے یہ بات نکل جائے۔"

کلّو:- "سرکار یہ ڈومنی والی بات نیاز نے لگائی ہوگی۔ وہی بیگم صاحبہ کا بہت منہ چڑھا ہے۔ ورنہ تابعدار نے اتنے عرصے میں سرکار کی لون کون سی باتیں ڈومنی کے سلسلہ میں لوگوں کو کرتے نہیں سُنیں مگر میں ہمیشہ اُن کی تردید کرتا رہا۔ بلکہ ایک مرتبہ تو میں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر جب ملار خاں کو جھوٹا ثابت کیا ہے تو حضور نے ہنس کر شاباشی بھی دی تھی۔"

غالب:- (فینس پر بیٹھتے ہوئے): "اچھا کہاروں سے کہو کہ فینس اُٹھائیں اور اجمیری گیٹ پر جو دلّی کالج ہے وہاں تک جانا ہے۔"

(کلّو کہاروں کو آواز دیتا ہے مرزا صاحب فینس پر بیٹھ کر روانہ ہوتے ہیں)

غالب:- (کہاروں سے) "ارے بھئی ہرا دیکھو۔ حوض قاضی سے ہوکر چلنا ہے اور واپسی بھی اُدھر ہی سے ہوگی۔"

کہار:- "بہت اچھا سرکار!" (یا علیؑ) کہکر کہار فینس اٹھاتے ہیں اور ٹھوکرے کھاتے ہوئے پیر بچاتے کہتے اجمیری گیٹ کی طرف جاتے ہیں (اور اجمیری گیٹ کے پاس پہنچکر)

غالب:- "وہ دیکھو جو سامنے سُرخ پتھر کی عمارت ہے فینس کو اُسی میں لے چلو اور اُس کے بعد جو دوسرا پھاٹک ہے اُس کے اندر رکھ دینا۔"

(فینس کو دوسرے دروازے پر روک کر کہار باہر چلے جاتے ہیں اور مرزا صاحب پیچوان کے کش لے لے کر انتظار کرنے لگتے ہیں)

غالب:- "نیاز او نیاز ذرا ادھر آنا۔"

نیاز:- "جی سرکار!"

غالب:- "ذرا جاؤ اور اندر کسی چپراسی کو اطلاع دو کہ مرزا صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ جیمز صاحب کو اطلاع کردو۔"

(نیاز اندر جاتا ہے اور ایک چپراسی سے مخاطب ہوکر کہتا ہے)

نیاز:- "ارے میاں سُنو۔ جیمز صاحب کو اطلاع کردو کہ مرزا صاحب سامنے پھاٹک پر فینس پر بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔

چپراسی:- "میں ایک ضروری کام سے کلاسز میں جا رہا ہوں تم سامنے وہ صاحب کے آفس کے سامنے جو چپراسی بیٹھے ہیں اُن سے کہو۔"

(نیاز دفتر کے ایک کمرے پر جس پر چق پڑی ہوئی ہے بڑھتا ہے۔)

ایک چپراسی:- "ارے کدھر کو جا رہا ہے اُدھر سے پلٹ جو پوچھنا ہے یہاں آکر پوچھ۔"

نیاز:- "ارے میاں یہاں کوئی جیمز صاحب ہیں اُن کو اطلاع کردو کہ مرزا صاحب

فینس پر بیٹھے اُن کا انتظار کر رہے ہیں"

چپراسی:- "ابے کہاں کی اُڑا رہا ہے کہاں سے پکڑ آیا ہے۔ کس کو پوچھ رہا ہے؟"

نیاز:- "جیمل صاحب کو"

چپراسی:- "جا جا! یہ بھی کوئی بنیئے بقّال کی دکان ہے!"

(ایک دوسرے چپراسی سے مخاطب ہوکر)

"دیکھ رہے ہو۔ جیمل جیمل اُڑا رہا ہے۔ جا جا! باہر کسی بنیئے کی دوکان پر پوچھ لے۔ یہ دلّی کالج ہے یہاں لڑکے پڑھتے ہیں۔ بنیئے بقّال نہیں بستے (دوسرے چپراسی سے مخاطب ہوکر)

"کہاں کے مُردے سالے کہاں دفن ہونے چلے آتے ہیں یہاں آیا ہے جیمل کو پوچھنے!"

دوسرا چپراسی:- "اماں گھبرایا ہوا معلوم ہوتا ہے چہرے سے اناڑی لگتا ہے معلوم نہیں کس کو بھجوایا ہے۔ اور کس کو پوچھ رہا ہے"

(نیاز مرزا صاحب کے پاس واپس آتا ہے اور کہتا ہے)

نیاز:- "سرکار! یہاں کے چپراسی بڑے بدتمیز ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں جیمل ویمل کوئی نہیں یہ کالج ہے وہ کسی بنیئے کی دُکان پہ ملے گا۔ سرکار بڑے بدتمیز ہیں یہ لوگ۔ پتہ پوچھو تو پتہ نہیں بتاتے"

مرزا صاحب:- "ارے جیمل نہیں۔ جیمس صاحب کو پوچھا ہوتا! اچھا پھر جاؤ اور جاکر کہو کہ کالج کے جو بڑے صاحب ہیں اُن کو بلوایا ہے"

(نیاز واپس جاتا ہے اور کالج کے چپراسیوں کے پاس آکر کہتا ہے)

نیاز:- "ارے بھائی! تمہارے جو صاحب ہیں۔ اُن کو مرزا صاحب فینس پر بیٹھے یاد کر رہے ہیں"

ایک چپراسی:- "فینس کہاں ہے؟"

نیاز:- "وہ کیا۔ سامنے والے پھاٹک میں اُسی طرف رکھی ہے"

ایک چپراسی:- "ارے وہاں سے فینس ہٹا دے اگر صاحب نے دیکھ لیا تو زمین و آسمان سر پہ اُٹھا لیں گے۔ جا جا کون صاحب ہیں (بڑبڑاتے ہوئے) آئے ہیں فینس پہ چڑھ کے! ارے یہ کالج ہے کوئی ڈیوڑھی وِیوڑھی تھوڑی ہے!"

نیاز:- "تم صاحب سے اطلاع تو کر دو"

چپراسی:- "اطلاع بعد میں ہوتی رہے گی۔ پہلے وہاں سے فینس ہٹواؤ"

نیاز:- "ارے صاحب سے اور مرزا صاحب سے بات ہو چکی ہے۔ اور تمہارے صاحب ہی نے تو اِن کو بلایا ہے"

تیسرا چپراسی:- "ارے کون مرزا صاحب؟"

نیاز:- "ارے مرزا اسداللہ خان غالبؔ جو بادشاہ سلامت کے اُستاد ہیں"

دوسرا چپراسی:- "ارے تو پوری بات بتائی ہوتی کیا مرزا صاحب خود تشریف لائے ہیں۔ اچھا تو رُکو میں ابھی صاحب سے بولے دیتا ہوں"

(چپراسی یہ کہہ کر دفتر کے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر نیاز سے کہتا ہے چلو میں چلتا ہوں)

(نیاز اور چپراسی مرزا صاحب کی فینس کے پاس آکر)

چپراسی:- (مرزا صاحب سے) "حضور! صاحب نے آپ کو سلام عرض کیا ہے اور کہا ہے کہ سرکار صاحب کے برابر والے کمرہ میں تشریف رکھیں۔ جونہی حضور کی طلبی ہوئی حضوری کو موقع دیا جائے گا"

غالبؔ:- (برافروختہ ہوکر) "یہ کن صاحب نے کہلوایا ہے؟"

چپراسی:- سرکار اس کالج کے بڑے صاحب بہادر جو جیمز صاحب ہیں اُنھوں نے فرمایا ہے"

غالبؔ:- "میں اس بے عزّتی کو ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتا! اب اپنے صاحب سے جاکر کہہ دو کہ وہ مجھے لینے آتے ہیں یا نہیں اگر وہ نہ آئیں تو میں واپس جاؤں۔ تم جاکر اپنے صاحب سے اِسی طرح کہہ دینا —— نیاز! تم گھر چلو بیگم سے کہہ دینا۔ میں ابھی آتا ہوں۔ اور ہاں میرے پہنچنے سے پہلے پیچوان کو تازہ کر کے اُس پر چلم چڑھا دینا۔ میرے پہنچتے پہنچتے حقّہ تیار رہے۔ پیچوان لیتے جاؤ اور کہاروں کو فوراً بھیج دو"

(نیاز جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد چپراسی واپس آتا ہے)

چپراسی:- "حضور! صاحب فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب کی میں بڑی عزّت کرتا ہوں اور اُن کا استقبال کرنا ہر وقت میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ مگر چونکہ اس وقت آپ ایک دوسری حیثیت سے تشریف لائے ہیں اس لئے صاحب آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکیں گے۔ آپ بغل کے کمرہ میں تشریف رکھیں"

غالبؔ:- (غصّہ سے کانپتے ہوئے) "اچھا جاؤ اپنے صاحب سے کہہ دو کہ یہاں ہاتھ پھیلانے آیا ہوں ذات بیچنے نہیں آیا ہوں۔ لاحول ولا قوۃ! میں اِس دو کوڑی کی ملازمت پر ٹھوکر مارتا ہوں جس میں انسان کی عزّت اور خودداری پر حرف آئے (غصّہ کے عالم میں) کہارو فینس واپس لے چلو!"

کہار:- "بہت بہتر حاضر ہوا۔ سرکار!"

(مرزا گھر واپس آتے ہی اور ڈیوڑھی پر پہنچ کر)

غالبؔ:- "کلّو میاں!"

سلّو:۔ "جی سرکار!"

غالب:۔ "بیگم کو اطلاع کر دو کہ ہم آگئے۔"

سلّو:۔ (ڈیوڑھی پر جاکر)۔ "بیگم صاحبہ سرکار واپس آ گئے!"

بیوی:۔ "اپنے سرکار کو اندر بھیج دو۔"

سلّو:۔ "بہت بہتر ہے (غالب کے پاس آکر) حضور! بیگم صاحبہ اندر یاد فرما رہی ہیں۔"

بیوی:۔ "اے کہو ہو آئے؟"

غالب:۔ "ہاں بیگم! گیا بھی اور واپس بھی آگیا۔"

بیوی:۔ "اے وہ جو میں نے چلتے وقت کہا تھا وہ چیزیں لائے؟"

غالب:۔ "بھئی بیگم! بس یہ سمجھ لو کر لاتے لاتے رہ گئے، تمہارے سر عزیز کی قسم جن سازگار حالات کا تصوّر کر کے میں چلا تھا وہاں حالات اُس کے برعکس نکلے۔"

بیوی:۔ "اے میں نے تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ اِدھر میں نے کوئی فرمائش کی اُدھر تمہارے حالات ناسازگار ہو گئے!"

غالب:۔ "ارے بھئی پوری بات سُنی نہیں اور لگیں میرے کان مروڑنے۔"

بیوی:۔ "اچھا بیان کرو۔"

غالب:۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تم مجھے نجیب الطرفین (نرکی النسل) مانتی ہو یا نہیں؟"

بیوی:۔ "چلو یہ بھی مان لیا۔"

غالب:۔ "تو صاحب میں ایسی ملازمت پر ٹھوکر مارتا ہوں جہاں انسان کی عزّت خطرہ میں پڑ جائے۔ ایسی ایسی ملازمتیں میری ٹھوکر میں ہیں۔ کیا معنے کہ میں کسی کے گھر پہ ملنے جاؤں اور صاحبِ خانہ اِس درجہ گستاخی پہ اُتر آئے اور مجھے لینے دروازے پر نہ آئے۔"

بیوی:۔ "میں یہ لمبی چوڑی بحث سُننے کو تیار نہیں۔ یہ بتاؤ کہ ہوا کیا؟"

غالب:۔ "ہوا کچھ نہیں۔ اُس فرنگی بچّے نے میری خودداری پہ لات ماری اور میں نے اُس کی ملازمت کے اُلٹی لات رسید کی۔ نہ وہ میرا استقبال کرنے دفتر سے باہر نکلا اور نہ میں اُس کے دفتر کے اندر گیا۔ یوں سمجھ لو کہ ہم دونوں برابر سرابر پہ چھوٹے۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا رہا اور میں اپنی فینس پر!"

بیوی:۔ "اے جب تم جا رہے تھے تب ہی میری بائیں آنکھ پھڑکی تھی اور میں سمجھ گئی تھی کہ تم جیسے جا رہے ہو ویسے ہی واپس آجاؤ گے۔"

غالب:۔ "مگر اس میں خطا کس کی ہے؟"

بیوی:۔ "اے خطا جس کی بھی ہو مگر تم کو تو بستر پہ پڑے پڑے نگوڑے شعر کہنے کا ایسا چسکا لگا ہے کہ اب زندگی بھر تو چھوٹنے سے رہا۔"

غالب:۔ "تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں شعر و شاعری بھی چھوڑ دوں۔ ارے بھئی تم نے کہا داڑھی چھوڑ دو۔ میں نے داڑھی چھوڑ دی، تم نے کہا پان چھوڑ دو میں نے پان چھوڑ دیا۔ تم نے کہا مِسّی لگانا چھوڑ دو میں نے اُسے بھی چھوڑ دیا۔"

بیوی:۔ "اے ہے۔ اِس وقت اپنی کیسی نیکیاں جتا رہے ہو اگر کوئی سُنے تو کہے کہ کیسا بیوی کا غلام ہے۔ اے سب سے پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ اِس مُردی اُمّ الخبائث کو چھوڑو، جو سویرے دوپہر اور شام کو مُنہ سے لگی رہتی ہے اُس کا نام لیتے کیوں شرم آتی ہے۔ اے میں نے جو فرمائشیں کی تھیں اُن کو تو پسِ پشت ڈال دیا گیا اور نگوڑا ایک آدھا مُنہ میں لگانے کو پھر حوضِ قلعی سے خرید لیا۔"

غالب:۔ (ہنس کر) "بیگم جب تم اُسے اُمّ الخبائث کہتی ہو تو خدا جانتا ہے میرے دل کو ایسی چوٹ لگتی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا بس ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم اپنے مُنہ سے اپنی آپ مذمت کر رہی ہو۔"

بیوی:۔ "اے اُس مُردار سے میرا کیا تعلق؟"

غالب:۔ تعلق کیسے نہیں۔ وہ تمہاری ہی جنس سے تو متعلق ہے ورنہ بجائے اُمّ الخبائث کے اُسے ابو الخبائث کہا جاتا۔ اُس میں تمہاری جنس کی بو نہیں آتی تو کیا میری جنس کی بو آتی ہے؟"

بیوی:۔ "اے خدا رسول سے ڈرو۔ یہ نام خدا کا دیا ہوا ہے۔"

غالب:۔ "بھئی بیگم مجھے تو تمہیں چھیڑنے میں لطف آتا ہے اور وہ یوں کہ ——

تم کو آتا ہے پیار پر غصّہ ۔۔ مجھ کو غصّہ پہ پیار آتا ہے"

(دُور کی آواز) "امّی جان۔ چچا جان کی ملازمت کا کیا ہوا؟"

بیوی:۔ "اے جیسے بے داغ گئے تھے ویسے بے داغ واپس آگئے!"

افسانہ

زندگی کی راہیں

ممتاز شکیب بی۔ اے

آزاد مارگ۔ ۱۴م۔ ایچ ”سی“ اسکیم۔ جے پور

محترمی خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ ایک کہانی ”زندگی کی راہیں“ بھیج رہا ہوں۔ پسند آجائے تو قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں ــــ یہ کہانی بمل کا نفسیاتی خاکہ ہے جو اِسی کہانی کا ایک مرکزی کردار ہے۔ اپنی آرزوؤں کے زنداں میں گھٹتی ہوئی اِس خاموش طبع لڑکی کے Psychological Treatment میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، اِس کا صحیح اندازہ تو آپ کی گرانقدر رائے اور قارئینِ ”بیسویں صدی“ کے بصیرت افروز خیالات کی روشنی ہی میں ہوسکے گا . . .

نیاز آگیں ــــ ممتاز شکیب

★

ستیش اور بمل نے اپنی مختصر سی دوستی کے دَوران انتہائی بے تکلف ہوجانے کے باوجود ایک دوسرے سے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہ کیا تھا۔ لیکن کل جب ستیش نے اُسے اپنی ماں کا خط دکھانے کے بعد گھر جانے کے بارے میں بتایا تو وہ ایکدم سنجیدہ ہوگئی اور اُس کے سینے میں دبی ہوئی آگ کے وہ شعلے اچانک بھڑک اُٹھے جن کی آنچ میں وہ کئی ماہ سے جل رہی تھی۔

کل رات سے اب تک بمل ستیش کے بارے میں سوچتے سوچتے اِس خیال سے اور زیادہ نڈھال ہوگئی تھی کہ ستیش آج رات فور ڈاؤن سے اپنے گھر شادی کی غرض سے جارہا ہے۔

اِسی کشمکش کے دَوران ــــ سُرمگیں شام کی اُداس آنکھوں میں جب ستاروں کی شمعیں آنسوؤں کی طرح جِھلملانے لگیں تو وہ دن بھر لیٹ کر سوچنے کا ایک بوجھ سا اپنے دماغ پر لئے بستر سے کھڑی ہوگئی اور اسٹیشن جانے کی تیاری کرنے لگی۔

یوں تو عرصہ ہوا۔ بمبئی سے آنے کے بعد ــــ یہاں آکر وہ اپنی شاہانہ زندگی کی ہر خوشگوار ہنگامہ آرائی کو فراموش کرکے اُس رنگین دَور کے ہر قیمتی، شوخ اور زرق برق لباس سے منہ موڑ کر مدّتوں سے بیواؤں جیسی زندگی گزار رہی تھی۔ لیکن آج نہ جانے کیوں ــــ ستیش کی دیرینہ آرزو کا خیال کرکے اُس نے وہی سُرخ اور سیاہ رنگ کی قیمتی ساڑی پہننے کا ارادہ کرلیا جسے ایک بار ستیش نے اپنی سالگرہ کے موقعے پر انتہائی ضد کرتے ہوئے اُسے پھر پہننے پر مجبور کردیا تھا۔

مدّتوں بعد ــــ آج پھر بمل کے سڈول موٹے سے خوبصورت جسم پر ململ کی سفید ساڑی کے بجائے وہی سیاہ زمین سے اُبھری ہوئی گہری سُرخ دھاریوں والی ریشمی ساڑی تھی جسے پہلی بار ستیش اُس کے جسم پر دیکھ کر کچھ اِن الفاظ میں اُس کی زندگی کا صحیح تجزیہ کر رہا تھا۔

”آج کی رات ــــ سیاہ و سُرخ رنگ کی اِس خوبصورت ساڑی میں تم ایسی معلوم ہورہی ہو! جیسے دُور اندھیروں میں کوئی بستی چُپ چاپ آگ کی لپٹوں میں سُلگ رہی ہے !!“

ستیش کی سالگرہ پر پہلی بار اپنی سادگی ترک کرکے جب یہی ساڑی پہن کر وہ اُس کے سامنے آئی تو ستیش اُسے دیوانوں کی طرح دیکھتا رہ گیا تھا . . . اور بمل اپنے ہاتھوں میں اُس کی سالگرہ کا تحفہ۔ ایک اُداس جاپانی گیشا کی تصویر لئے چُپ چاپ اُس کے سامنے کھڑی رہی جو اُس نے خود اپنے ہاتھ سے ریشمی کپڑے پر کشیدہ کاری کے بعد بہت اہتمام سے فریم کرائی تھی !

”اِس طرح اِتنی گہری نظر سے کیا دیکھ رہے ہو ــــ !؟“ بمل نے اپنے خوبصورت یاقوتی ہونٹ وا کرکے جب سکوت توڑا تو ستیش خواب جیسی کیفیت میں ڈوب کر کہنے لگا۔

"دیکھ رہا ہوں ـــــ لباس کی اس دلکش موزونیت پر اتنے سلیقے سے میک اپ کا شعور رکھنے والی بمل وہ لڑکی ہرگز نہیں ہو سکتی جو ڈائریکٹریٹ میں ایک کلرک کی حیثیت سے اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے اس طرح سادگی سے زندگی گزار رہی ہے۔"

"تو پھر وہ لڑکی جو کلرک نہیں ہے، اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے ـــــ!" بمل پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ایک ایسی ریاست کی شہزادی جسے اس کے بے رحم تاجدار خاوند نے چھین کر اسے جلاوطنی پر مجبور کر دیا ہے ـــــ!!" ستیش انتہائی ڈرامائی انداز میں یہ جملہ ادا کر گیا تھا۔

اور بمل ـــــ اس کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی بے ساختہ زور سے ہنسی تو

- فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ (قرآن پاک)
- امانت سے رزق بڑھتا ہے، خیانت سے افلاس لازم آتا ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- سادگی ایمان کی علامت ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- مجھے نئے کپڑوں میں دفن نہ کیا جائے۔ نئے کپڑوں کے زیادہ مستحق وہ ہیں جو زندہ اور برہنہ ہیں۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)
- جس نے باطل کی تائید کی گویا اس نے حق پر ظلم کیا۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- انسان کے لئے کتنا برا ہے کہ باطن بیمار اور ظاہر حسین رہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

اس کے تمتماتے ہوئے سرخ رخساروں پر آنسوؤں کی لڑیاں سی ٹوٹ پڑی تھیں۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر میک اپ کرتے ہوئے آج بمل کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آئینے سے ماضی کی ایک ایک یاد انگڑائیاں لیتی ہوئی ابھر رہی ہے۔

دو سال پہلے وہ ستیش سے اپنا ٹرانسفر منسوخ کرانے کے سلسلے میں اس کے دفتر جا کر ملی تھی۔ اس وقت وہ اپنی نوٹ بک سے کوئی ڈکٹیشن ٹائپ کرنے میں مصروف تھا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی وہ فوراً اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

اس دن بمل کچھ زیادہ پریشان تھی۔ اس لئے مختصر سی فرضی گفتگو کے بعد اس نے فوراً ہی اپنے مطلب کی بات شروع کر دی تھی۔

"دیکھئے ـــــ میں آپ کے پاس ـــــ ایک بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے بمل آہوجہ ـــــ"

"جی ہاں ـــــ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں ـــــ اور آپ کا نام بھی ـــــ!"

"جی ـــــ!؟" بہت معصومیت سے بمل نے اپنی پریشان زلفیں سنوارتے ہوئے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"جی ـــــ ہاں ـــــ!!" اور ستیش انتہائی بے تکلفی سے باتیں کئے چلا جا رہا تھا۔

"میں ـــــ میں نہیں سمجھی کہ سب کچھ میرے بارے میں جاننے سے آپ کی مراد ـــــ کیا ہے ـــــ!؟"

"دیکھئے ـــــ گستاخی معاف! شاید دفتر کے بابوؤں کی اس نفسیات سے آپ واقف نہیں کہ وہ اپنے یہاں کام کرنے والی ہر لڑکی کے بارے میں اچھی خاصی ڈیٹیل رکھتے ہیں!"

"لیکن میں نے آج تک ڈائریکٹریٹ میں کسی اور سے اس طرح کی بات نہیں کی!"

"اسی لئے تو سب لوگ آپ کو مغرور، تنک مزاج اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔"

"او ـــــ!!" بمل جھینپ کر سمٹ سی گئی۔

"خیر ـــــ پہلے تو آپ یہ بتائیے مس بمل! آپ ٹھنڈا پیئیں گی یا گرم؟"

"دیکھئے ـــــ میں ـــــ مس نہیں ہوں ـــــ!!" یہ کہتے ہی وہ اور سنجیدہ ہو گئی۔

"تو پھر ـــــ؟" ستیش حیرت سے بول اٹھا تھا۔

"میری شادی ہو چکی ہے ستیش صاحب! مسز آر کوترا ـــــ!" بمل نے یہ کہتے ہی اپنی آنکھیں جھکا لی تھیں۔

"لیکن آپ مدھو کنج، بی۔ ۵ میں اکیلی رہتی ہیں؟"

"جی ہاں ـــــ میں اپنے پتی کی ایک دور کی موسی کے ساتھ وہاں رہتی ہوں۔ وہ بھی اس دنیا میں اکیلی ہیں۔"

"او ـــــ" ستیش اپنے آپ ہی کچھ جھینپ سا گیا۔

"دیکھئے میرا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ لیکن میں یہاں سے کہیں اور نہیں جانا چاہتی۔ میں آج کل بہت دکھی ہوں۔ آپ ڈائریکٹر صاحب کے پی۔ اے بھی ہیں اور ان سے بے تکلف بھی۔ بھگوان کے لئے اس وقت آپ میری مدد کیجئے۔ میرا ٹرانسفر کینسل کروا دیجئے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی۔"

اس دن ایک ہی سانس میں وہ سب کچھ کہہ گئی تھی اور ستیش اس کی ویران

غزالی آنکھوں سے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر پگھلتا چلا گیا تھا۔

ستیش نے بمل کا ٹرانسفر کینسل کروا دیا تھا لیکن وہ شکریہ کے دو الفاظ تک ادا کرنے کے لئے اُس کے پاس نہ آسکی ــــــ اور ایک دن جب اُس نے ٹیلیفون پر اُسے جھاڑنا چاہا تو اُس کے دفتر سے سیکشن آفیسر نے بتایا کہ وہ پندرہ دن سے چھٹیوں پر ہے۔ یہ جان کر ستیش کو اور بھی کوفت ہوئی اور وہ بمل کے اِس غیر اخلاقی رویّے سے بدظن سا ہوگیا۔ لیکن جب اُسے دوسرے ہی دن ڈاک سے بمل کا خط ملا تو اُس کی یہ بدگمانی بھی دُور ہوگئی اور وہ خط پڑھتے ہی اُس کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

بمل نے اُسے اپنے گھر بُلانے کے لئے یہ خط لکھا تھا۔

بمل کے گھر پہنچ کر اُس نے دیکھا تو وہ دائمی مریض کی طرح مسہری پر پڑی ہوئی اپنے کمرے کی چھت کو تک رہی تھی۔ بے ترتیب سے پھیلے ہوئے اُس کے خُشک اور گھنے بالوں کے درمیان اُس کا اُداس چہرہ بُجھے ہوئے چاند کی طرح پھیکا پڑ چُکا تھا۔

"یہ تم نے ــــــ کیا حالت بنا رکھی ہے ــــــ !؟" ستیش نے اُس کے قریب جاتے ہی غیر ارادی طور سے بے تکلّف ہوتے ہوئے گھبرا کر پُوچھا تو بمل نے اُس کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اُس کے خُشک ہونٹ صرف کانپ کر رہ گئے۔

"اُف! ــــــ تمھیں تو بخار ہے!!" ستیش نے بڑھ کر اُس کی پیشانی پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ "دوا بھی پی ــــــ یا بیماری سے اِسی طرح لڑ رہی ہو!!" ستیش کے اِس سوال پر اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور مُرجھائے خُشک لب پھر خزاں رسیدہ پتیوں کی طرح کانپ کر رہ گئے۔

ستیش اُس کی یہ حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ وہ اِس وقت تنہائی سے بے حد متاثر ہے۔

"میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں!!" وہ فوراً کھڑا ہوگیا۔

"سُنیئے ــــــ !!" بمل نے چیخ کر اُسے روکنا چاہا لیکن اُس کی نحیف آواز اُس کے اپنے حلق ہی میں پھنس کر رہ گئی اور ستیش کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

کچھ دنوں پہلے جب وہ اِس بیماری کے بعد ملے تو اُن کی ماضی کی مختصر سی ملاقاتوں نے تکلّفات کی بہت سی منزلیں طے کر لی تھیں۔

"کیا سوچ رہی ہو بمل ــــــ؟"

"سوچ رہی ہوں تمھارے احسانوں کا بدلہ کس طرح ادا کروں؟"

"کیسے احسان؟"

"یہی میرے ٹرانسفر کی منسوخی، پچھلے دو ماہ کے ٹائیفائڈ کے دَوران کی تیمارداری اور میری تنخواہ نہ ملنے سے دوا دارو پر تمھارا اِس طرح سے کُھل کر خرچ کرنا۔ یہ سب مجھ پر کئے گئے بے لَوث احسان نہیں تو اور کیا ہیں؟"

"ہوں ــــــ لیکن وہ پیسہ جو میں نے تمھاری بیماری پر خرچ کیا اُس کی ایک ایک پائی چُکا کر جو کل تم نے مجھے غیریت کا احساس کرا کے تکلیف پہنچائی ہے اُس کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟" ستیش نے اُسے گھُورتے ہوئے کہا تھا۔

"دیکھئے مسٹر!" وہ اپنے شگفتہ ہونٹوں پر پُرکشش مُسکراہٹ پیدا کر کے شوخی سے کہنے لگی "میں آپ کا یہ قرض ادا نہ کرتی تو آپ مجھ پر نالش کر دیتے!"

"اور مجھے محسوس ہوتا ہے اب یہ نیک کام آپ انجام دینے والی ہیں!" ستیش نے بھی اُسی لہجے میں کہا۔

"کیوں ــــــ !؟" بمل نے اُسی طرح مُسکراتے ہوئے بڑی معصومیت سے

- جس گھر میں عورت دُکھی رہتی ہے وہ گھر جلدی تباہ ہو جاتا ہے۔
(منوسمرتی)
- حریص، بددل اور بدگو انسان شیطان سے بھی بدتر ہے۔
(مہابھارت)
- صبر اور شُکر سے بڑھ کر کوئی چیز میٹھی نہیں۔ (اُپنشد)
- بلند حوصلہ انسان کے ہاتھ میں آکر مٹّی بھی سونا بن جاتی ہے۔
(ہندی ادب)
- سچّی بات تو یہ ہے کہ میں کسی کو ناپسند نہیں کرتا۔ (جواہر لال نہرو)
ظلم سب سے بڑا گُناہ ہے۔ (مہاتما گاندھی)

پُوچھا تھا۔

"اِس لئے کہ میں تمھارے اُن دئے گئے تین سو روپوں میں سے تین روپے تہتّر پیسے اب تک واپس نہیں کر سکا ہوں!"

ستیش کے مُنہ سے یہ جُملہ سُنتے ہی وہ زور سے ہنسی تو ستیش بھی ایک پُرزور قہقہے کے ساتھ ہنسنے لگا۔

دونوں ایک دوسرے کے انتہائی قریب آچکے تھے۔ لیکن اُن کی ملاقاتوں کا سلسلہ صرف دوستی ہی کے بے لَوث خلوص کی حدوں تک محدود رہا۔ ہاں، اگر کبھی ستیش نے جذباتی ہو کر اِن حدوں سے آگے بڑھنے کی سعی کی تو وہ بات کا رُخ بدلتی رہی اور ستیش خاموشی اختیار کر کے اُس کی پُراسرار فطرت کی گہرائیوں میں ڈُوب کر رہ جاتا لیکن جو بات

اُسے بمل کو دیکھ کر شدت سے کھلتی وہ اُس کا اظہار کئے بغیر نہ رہتا۔ وہ بمل کے لباس کی سادگی، مزاج کی خشکی اور اُس کی غم پسند طبیعت پر شکایت کے چبھتے ہوئے لہجے میں اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کہہ جاتا جسے سُن کر بمل یہی سوچ کر رہ جاتی کہ ستیش اِس طرح طنز کر کے اُسے ایک بار پھر اُس میں زندگی کے آثار پیدا کرنا چاہتا ہے ــ یہی وجہ تھی، وہ بمل کو دیوالی کے دن بھی سادہ لباس میں دیکھ کر قدرے برانگیختہ بھی ہو گیا تھا۔

"تم نے آج دیوالی کے شُبھ دن بھی وہی جوگیا لباس پہن رکھا ہے بمل ـــــــ!؟"

"ہاں ـــــــ!" اُس دن بمل پر غیر معمولی سنجیدگی کا ایک خول چڑھا ہوا تھا۔

"لیکن مجھے اب تمہارے اِس جوگنوں جیسے لباس سے چڑ ہو گئی ہے!"

"اور جوگنوں سے ـــــــ؟" سنجیدگی کے عالم میں اُس کے ہونٹوں کی خفیف مُسکراہٹ نے ایک چُبھتا ہوا تیکھا پن نمایاں ہو گیا تھا۔

"میں پُوچھتا ہوں ـــــــ تم نے جوانی کے اِس حسین عالم میں یہ جوگنوں سا رُوپ کیوں دھار لیا ہے!؟"

"اِس لئے کہ میرا نے اِسی رُوپ کو دھار کر اپنے پرمیشور کو پایا تھا!" تبسّم کا وہی تیکھا پن اُس کے لبوں پر تھا۔

"جانتی ہو میرا کے اِسی "رُوپ" سے تنگ آ کر اُس کے پتی نے میرا پر کتنے ستم ڈھائے تھے؟"

"ہاں ـــــــ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ بعد میں ستم گروں نے اِسی رُوپ کی شرن بھی لی تھی!"

"لیکن تم پر ستم ڈھانے والا کسی اور کی شرن میں جا چکا ہے بمل ـــــــ!!"

"ہاں، یہ بھی جانتی ہوں!" اچانک اُس کے تبسّم کی ہلکی سی تنویر چہرے کی ویرانی میں گم ہو گئی۔

"آخر تم نے کون سا ایسا اپرادھ کیا تھا بمل! جو رنجیت نے تمھیں اتنی بڑی سزا دی؟"

"میرا کا اپنا اپرادھ کیا تھا ستیش ـــــــ!!" اُس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ستیش کی طرف دیکھا تھا۔

"یہی کہ وہ اپنے پرمیشور کی بھگتی میں لین ہو گئی تھی۔"

"اور میں نے رنجیت کو اپنا پرمیشور مان کر خود کو اُس کی بھگتی میں لین کیا تھا۔ یہ ہے عورت کا وہ اپرادھ جسے وہ ہر جنم میں کرتی چلی آ رہی ہے ـــــــ اور مرد اُسے اِس کی برابر سزا دے رہا ہے!" بمل کی آنکھیں چھلکنے لگی تھیں۔

"بہر حال ـــــــ رنجیت نے تمھیں چھوڑ دیا ہے نا ـــــــ؟" ستیش اُسے اپنے رُخ پر لا رہا تھا۔

"رنجیت نے بمل کو چھوڑا ہے، عورت کو نہیں چھوڑا ـــــــ اب کوئی دوسری بمل اُس کے دام میں آ گئی ہے!!" وہ مشتعل سی ہو گئی تھی۔

"اِس کا مطلب یہ ہوا ـــــــ رنجیت نے تم سے بے وفائی کی ہے!" وہ اپنے مقصد کی بات کے لئے زمین ہموار کر چکا تھا۔

"ہاں ـــــــ اُس نے بے وفائی کی ہے ـــــــ!!" بمل نے الفاظ چباتے ہوئے غصّہ پینا چاہا۔

"تو پھر ـــــــ ایسے میں اب تمھیں کیا کرنا چاہیئے؟" یہ کہتے ہی وہ اُس کے چہرے کو پڑھنے لگا تھا۔

"جلنا چاہیئے ـــــــ!" وہ اپنے اشتعال کو دباتے ہوئے آہستہ سے بول رہی تھی: "مجھے اُس کی بیوفائی کے غم میں جلنا ہے ستیش! ـــــــ میں اب اِسی چِتا میں خود کو جلا کر راکھ کر لوں گی!"

"اِس سے کیا فائدہ ہوگا ـــــــ؟"

"دُنیا کو یقین تو ہوگا!"

"کیسا یقین؟"

"یہی کہ عورتوں کے ستی ہونے کی رسم اِس دُنیا میں ابھی تک باقی ہے ـــــــ!!" یہ کہہ کر وہ خلاؤں میں گھورنے لگی اور اُس کی آنکھوں سے اِس طرح آنسو

اُمنڈ پڑے جیسے اب اُس کی دُنیا میں اِس غموں کی برسات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ـــــ اور ستیش اُس کے اِس المیہ رُجحان میں ارادوں کی پُختگی دیکھ کر اپنے منصوبے کی گرتی ہوئی دیواروں کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

ستیش نے بارہا بمل کے اندر کی سسکتی ہوئی زندگی کو ایسے نازک موقعوں پر بہت انہماک سے دیکھا تھا اور یہ سب کچھ اپنی رُوح میں چھپے ہوئے اضطراب کے ساتھ دیکھنے کے بعد، اُس کے ہر درد کا مداوا بننے کی سعی کی تھی۔ لیکن وہ کھُل کر ایک ـــ بار بھی اُس پر اپنی دِلی کیفیت کا اظہار نہ کر سکا اور بمل کو رنجیت کی محبت اور اُس کی بے وفائی کے ملے جُلے غم میں مبتلا دیکھ کر ہمیشہ یہی سوچتا رہ گیا کہ شاید بمل کو ابھی تک رنجیت کا انتظار ہے۔ اِسی تجسس کے آخری موڑ پر اُس نے بمل کے غم کو آخری بار کُریدنے کی غرض سے اپنی شادی کے سلسلے میں آخری کڑی کے طور پر اُس کے سامنے اپنی ماں کا خط رکھ کر کہا تھا۔

"آخر ـــــ مجبوراً ماں نے میرے لئے لڑکی پسند کر ہی لی بمل ـــ!" یہ کہتے ہی وہ اُس کے چہرے پر اِس جُملے کا ردِّ عمل دیکھنے لگا۔

"وہ پچھلے دِنوں تمھیں اپنی پسند کی لڑکی تلاش کرنے کا موقع بھی تو دے چکی تھیں۔"

بمل کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"لیکن اِس تلاش میں آج تک مجھے ناکامی کے سوا اور کچھ نہ مِلا ـــ!" ستیش کے اِس جُملے میں اُس کا رُوحانی کرب تھا۔

"تو پھر کیا ہوا۔ تمھیں ماں کی پسند کو ترجیح دینی چاہئے ـــــ یہ فرمانبرداری بھی آئندہ کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے!"

"لیکن تم جانتی ہو بمل ـــــ!" ستیش نے اُس کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔

"میں اُس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس سے میں نے محبت بھی کی ہو!!" وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

"کون ہے وہ لڑکی ـــــ؟" بمل نے اپنی ویران آنکھوں سے گھُور کر اُس کی طرف دیکھا۔

"نہ جانے کیوں اُس کا نام لینے کے لئے زبان نہیں کھُلتی ـــــ!" ستیش نے جُملے کی آہستگی سے اپنے دل کا غم واضح کرنا چاہا۔

"معلوم ہوتا ہے تمھاری محبت ابھی غلط فہمیوں کے مرحلے طے کر رہی ہے۔ اِس لئے اپنی ماں کی بات مان لو ستیش!!"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں بمل؟" ستیش پھر اُس کے چہرے پر اپنے جُملے کا تاثر دیکھنے لگا۔

"کر تو چکی ہوں ایک بار!!" وہ سرد آہ بھر کے خلاؤں میں دیکھنے لگی۔

'بیسویں صدی' اور 'خوشتر گرامی' دونوں اِس حد تک لازم و ملزوم ہو چکے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جُدا کر دینا ناممکن ہو گیا ہے۔ کئی لوگ تو 'بیسویں صدی' کو 'خوشتر صدی' کہہ کر پکارتے ہیں! اور اِنہی 'خوشتر صدی' صاحب کا سالنامہ ۱۹۶۹ء اِس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ سالنامے تو کئی رسائل شائع کرتے ہیں۔ لیکن جب بھی 'بیسویں صدی' کا سالنامہ مارکیٹ میں آتا ہے۔ اِس میں خوشتر صاحب ایک ایک صفحے پر رچے بسے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زیرِ نظر سالنامہ میں بھی کہانیاں ہیں، مضامین ہیں، نظمیں، غزلیں اور کارٹون ہیں۔ لیکن اِن میں سے ہر تخلیق کی ایک انفرادیت ہوتی ہے۔ جو صرف 'بیسویں صدی' کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہر بار اِس کے سالنامے میں کوئی نہ کوئی اچھوتا پن اور جدّت ہوتی ہے۔ چنانچہ اِس مرتبہ بھی خوشتر صاحب نے مُلک کے بلند پایہ ادیبوں سے ایک فیچر قلم بند کروایا ہے۔ عنوان ہے "میں ہوں . . ." اِس فیچر میں کنہیا لال کپور، بلونت سنگھ، فکر تونسوی، رام لعل، واجدہ تبسم، کوثر چاند پوری، حامدی کاشمیری، مہندر ناتھ، کشمیری لال ذاکر اور جوگندر پال نے اپنے قلم سے اپنے بارے میں اپنی تصاویر کے ساتھ اپنا مختصر سا خاکہ تحریر کیا ہے۔ جو اِس سالنامے کی سب سے زیادہ معرکہ خیز چیز ہے ـــــ اِس کے علاوہ 'بیسویں صدی' نے ہندوستان اور پاکستان کے اُن تمام مقتدر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات فراہم کر لی ہیں جن پر کوئی بھی اہم ادبی رسالہ فخر کر سکتا ہے . . .

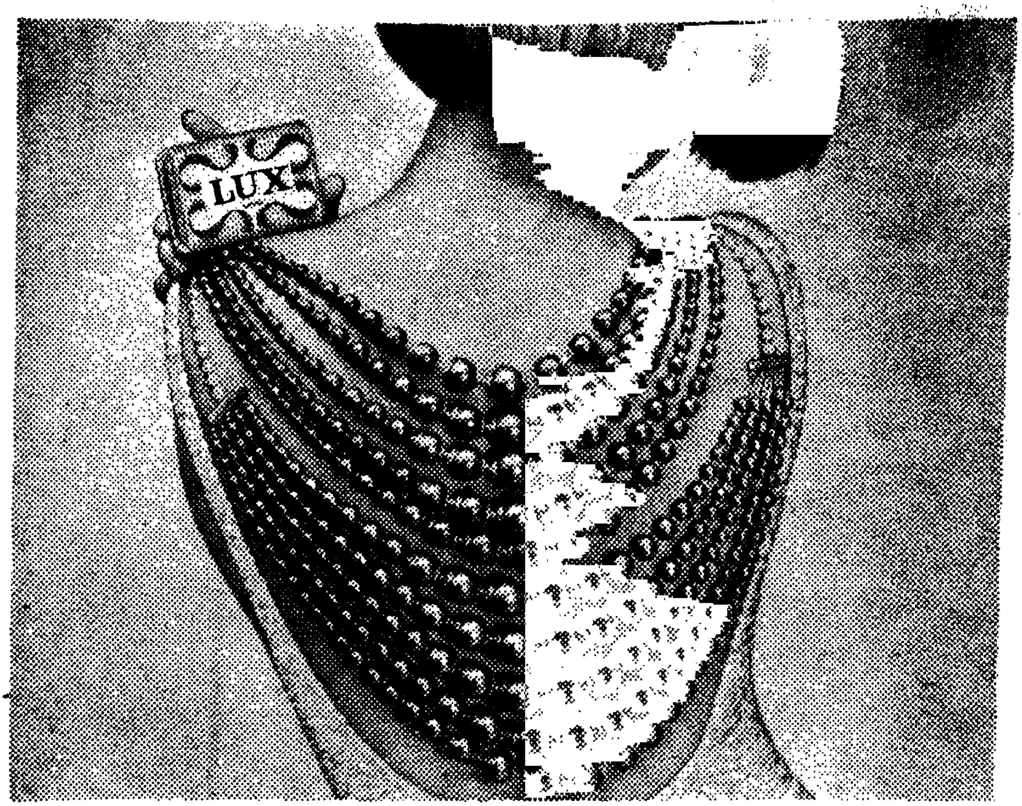
روزنامہ "ملاپ"، دِلی

"کیا رنجیت کا انتظار تا حیات کرو گی بمل ـــــ؟" ستیش نے اِس جُملے سے اُس کا جائزہ لینا چاہا۔

"انتظار تو وہ کرتا ہے ستیش، جس کے جسم میں خون کی فراوانی ہو!" اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"کیا مطلب؟" وہ حیرت سے بول اُٹھا۔

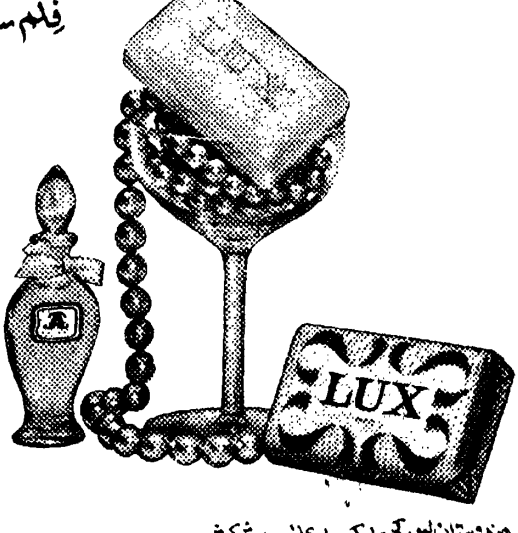
"انتظار کے چراغ بُجھ چکے ہیں۔ دل کی بُجھی ہوئی لَو سے اب صرف دھواں اُٹھ رہا ہے۔ جو بہت جلد فضاؤں میں تحلیل ہو کر زندگی کے احساس کو اندھیروں میں گم کر دے گا ـــــ تم جاؤ۔ مجھے بھٹکنے دو ـــــ تمھاری ماں نے تمھارے لئے ضرور کوئی اچھی لڑکی پسند کی ہے۔ اُس کے ساتھ خاندانی عزّت، دُنیا کی دولت اور اُس کی دوشیزگی کا انمول رُوپ بھی ہو گا اور اُس کے ماں باپ کا دیا ہوا قیمتی جہیز بھی ـــــ ایسی شادیاں زندگی کے لئے بہت فائدے مند ہوتی ہیں۔ تمھاری ماں نے یہی سب کچھ دیکھنے کے بعد تمھیں بُلایا ہو گا۔ تمھیں یہ شادی کر لینی چاہئے ستیش! ـــــ تمھیں ـــــ یہ شادی ـــــ



"اب رُوپ کا راج سِنگار ایک صابن ہے لکس"

فِلم سٹار ببیتا
کہتی ہیں





نئے لکس میں
ایک انمول نئی خوشبو ہے
اور ایک بین الاقوامی نئی شان۔

LTS. 224B-140-45 UD لنٹاس

ہندوستان لیور کی ایک اعلیٰ پیشکش

کرلینی چاہئے ـــــــــ!" وہ رُک رُک کر بولتے ہوئے اچانک خاموش ہوگئی اور پھر گھٹی ہوئی جذباتی کیفیت کو چھپانے کی غرض سے فوراً کھڑی ہوگئی اور اس سے رخصت ہوکر اپنے گھر چلی آئی اور ستیش صرف اُسے دیکھتا رہ گیا۔

گھر آنے کے بعد ساری رات بمل کے دماغ پر ستیش کی باتوں کی اذیت ناک چوٹیں سی پڑتی رہیں۔ صبح ہوئی تو ـــــــ کل رات کی پُر اضطراب گھڑیوں کے اثرات اُس کے ذہن پر اسی طرح قائم رہے اِس لئے سارا دن وہ باتوں کے اُسی الاؤ میں سُلگتی رہی اور ستیش کی ماں کے خط کے تاثر کی جلن سی محسوس کرتی رہی۔

شام کی سوگوار آنکھوں میں ستاروں کے آنسو جھلملائے تو اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زہر میں بجھے ہوئے کسی نشتر کی نوک اُس کے دل میں پیوست ہوکر ٹوٹ گئی جو رات سے اسی طرح اُس کے سینے میں کھٹک رہی ہے۔

اِسی کشمکش کے عالم میں، سُرخ و سیاہ رنگ کی ساڑی پہن کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا سوگوار عکس دیکھ کر وہ ستیش کو رخصت کرنے کے خیال سے اسٹیشن جانے کا قصد کر رہی تھی۔

اسٹیشن آکر بمل بُک اسٹال کی آڑ سے گُڈس شیڈ میں کھڑی ہوئی ستیش کی بوگی کو غور سے دیکھنے لگی اور وہ قُلی سے اپنا سامان بوگی میں رکھوا رہا تھا۔ اُس کے پاس ہی اُس کا دوست بیزل ہنس ہنس کر اُس سے باتیں کر رہا تھا۔

رات کی مضمحل گھڑیوں میں ریلوے پلیٹ فارم برقی روشنی کا سُلگتا ہوا لبادہ اوڑھے اُونگھ رہا تھا اور مسافروں کی ہماہمی پر نیند کا غُبار چھایا چلا جا رہا تھا۔

ستیش کو دیکھتے ہی بمل کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور جب ستیش بیزل کو بوگی کے پاس چھوڑ کر اُس کی طرف آنے لگا تو وہ گھبرا کر رومال میں اپنی آنکھوں کی نمی جذب کرنے لگی لیکن ستیش کے آتے آتے اُس کے ہلکے ہلکے میک اَپ کی تہہ سے اُس کا چہرہ اِس طرح تمتمانے لگا جیسے بلوریں ساغر میں بھری ہوئی ارغوانی شراب کا رنگ دہکتا ہے۔

"میں نے کہا تھا ـــــــ ایک کپ چائے کا پی لو ـــــــ خمار اُتر جائے گا!" وہ اُس کے قریب آکر آہستہ سے بولا تو وہ خاموش کھڑی رہی۔

"جانتی ہو ـــــ چہرے کے ساتھ ـــــــ آج تمھاری آنکھیں بھی سُرخ ہو رہی ہیں!"

"ہاں ـــــــ!" بمل کی نحیف سی آواز اِس طرح اُبھری تھی جیسے یہ آواز دُور کسی گنجان سی وادی سے آئی ہو!"

"بہرحال آج تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ آج پھر تم یہ میرا پسندیدہ لباس پہن کر آگئیں ـــــــ ورنہ میں ساری راہ تمھاری سادگی کے خیال کی افسردگی میں کھویا رہتا ـــــــ!"

"تمھاری ـــــــ گاڑی کا وقت ہوگیا ہے شاید!" بمل نے بمشکل تمام یہ جملہ ادا کرکے اپنی نظریں کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر جما دیں۔ لیکن گھڑی کے ڈائل پر آنسو کی ایک موٹی سی بُوند گِر کر پھیل گئی۔

"شاید ـــــــ تم رو رہی ہو ـــــــ!؟" اور ستیش کی ہلکی سی آواز کے اِس نشتر سے وہ اچانک پھُوٹ پڑی۔

ستیش کو بیزل نے آواز دے کر بُلا لیا اور وہ پھر رُومال لے کر اپنے آنسوؤں کو اُس میں جذب کرنے لگی۔ گاڑی چلنے کا وقت ہوگیا تھا۔ سگنل کا سُرخ دھبّہ سبز میں منتقل ہوچکا تھا۔ اِس لئے انجن کی وِسل جیسے ہی فضا میں گُونجی، بمل کا دل اچانک اِتنی زور سے دھڑکنے لگا جیسے آج اُس کا سینہ شق ہونے والا ہے!

"کیا ستیش سے یہ والہانہ لگاؤ کہیں ـــــــ!" ادھورا سا ایک سوال اُسی بحرانی کیفیت میں اُس کے ذہن میں اُبھرا تو وہ بوکھلا گئی۔

"ستیش ـــــــ!!" بے اختیاری کے اِس عالم میں چیخ کر جیسے ہی اُس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی سعی کی تو اُس کے ہونٹ گھُٹے ہوئے جذبات کی شدّت سے کسی زخمی پرندے کے پروں کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

"شاید ـــــ تم کچھ کہنا چاہتی ہو ـــــــ!؟" اُس کے پاس کھڑے ہوئے ستیش نے اُسے ٹوکا۔

"ہاں ـــــ!" وہ بے اختیار ہوکر بول اُٹھی "یہ تمھاری جُدائی کا غم ـــــــ برداشت نہ ہوسکے گا ستیش!!" آخر اُسے کہنا ہی پڑا۔

"میں جانتا تھا آج تم اپنے اندر کی احتجاج کرتی ہوئی بمل کے جذبات کو نہیں دبا سکتیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی رہی ہو ـــــــ!" ستیش اب مشتعل ہوکر اُس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"ستیش ـــــ!؟" وہ کراہنے کے انداز میں بول کر پھر سِسکنے لگی۔

"کیا بتا سکوگی تم نے اب تک اپنی محبت کا اظہار کیوں نہیں کیا تھا؟"

"ہاں ـــــ!!" وہ اب رونا بھُول گئی تھی۔

"آخر کیوں ـــــــ تم اب تک خاموش کیوں رہیں ـــــــ!؟" وہ جذباتی ہوگیا۔

"اِس لئے کہ میں ایک شادی شُدہ ٹھکرائی ہوئی عورت تھی۔ جسے اب کسی دوسرے مرد سے محبت یا شادی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا!"

"لیکن میں یہ سب جانتے ہوئے بھی تمھاری محبت کی آگ میں بہت دنوں سے جل رہا ہوں!"

"کیا ـــــ!؟" بمل حیرت سے بول اُٹھی۔

"میں نے تمھاری تباہی کی کہانی سنتے ہی تمھیں اپنا بنا لینے کا ارادہ کر لیا تھا!!"

"تو پھر تم اب تک کیوں ——— خاموش رہے ———؟" بمل نے کچھ کھنچی ہوئی ہلکی سی آواز میں اُس سے پوچھا۔

"یہ سوچ کر کہ تم خاموش ہو ——— اور میری محبت کے اظہار پر تم مجھے خود غرض نہ سمجھ بیٹھو کہ میں تم سے اپنے احسانوں کے صلے میں اپنی محبت کا اعتراف چاہتا ہوں! اور پھر یہ کہ تم نے ہمیشہ رنجیت کا تذکرہ اِس طرح کیا تھا جیسے تم اُس کا انتظار آخری سانس تک کرنا چاہتی ہو۔ اِس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ تم سے رنجیت کی محبت چھیننے کا ارادہ کر کے تمھیں رُوحانی تکلیف دوں!"

"لیکن اب تمھاری ماں تمھارے لئے ایک لڑکی پسند کر چکی ہیں ———" بمل کی شکست خوردہ آواز اُبھری۔

"ہم نے اب تک ایک حقیقت کو چھپانے کے لئے کتنے افسانے تراشے اور آخرکار اپنے ہی وسوسوں کا شکار ہو گئے ستیش!" یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پڑی اور فضا میں اچانک گاڑی کی ... گونج گئی۔

"اچھا ستیش ———!!" بمل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور رومال میں اپنے آنسوؤں کو جذب کرنے لگی۔ اور ستیش اُسے چُپ چاپ دیکھتا رہا۔

"تمھاری گاڑی چل دی ستیش!!" اور پھر بمل چیخ کر نڈھال سی ہو کر اُس کے بازوؤں پر گر پڑی ——— ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑنے لگی تھی۔

"تم نہیں ——— گئے ———!!" بمل کو فوراً ہی ہوش آیا تو وہ چلتی ہوئی ٹرین کی طرف دیکھ کر ستیش کو جھنجوڑنے لگی۔

"نہیں ———!!" ستیش کے چہرے پر خفیف سی مُسکراہٹ نمودار ہو کر رہ گئی۔

"کیوں ———!؟" پھٹی پھٹی سی حیرت بھری آنکھوں سے اُس نے ستیش کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اِس لئے کہ وہ لڑکی تو ابھی یہیں ہے جس سے مجھے شادی کرنی ہے!!" ستیش اب کھُل کر مُسکرا رہا تھا۔

ٹرین پلیٹ فارم چھوڑ چکی تھی اور بیزل اپنے کمپارٹمنٹ کی کھڑکی سے منہ نکال کر معنی خیز مُسکراہٹ کے ساتھ ہوا میں اپنا ہاتھ ہلاتا ہوا جا رہا تھا۔

"لیکن وہ لڑکی جو ماں نے پسند کی ہے ———!؟" بمل نے حیرت سے ستیش کی طرف دیکھ کر کہا۔

"وہ محض خیالی تھی ———!!" ستیش نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"اور ٹرین میں رکھا ہوا تمھارا سامان ———؟"

"وہ بیزل کا تھا جو آج اپنے گھر جا رہا ہے ——— جس کے آج کے سفر سے میں نے تمھیں کریدنے کی آخری سعی کی تھی۔

"یہ سب کیا ہے ———؟" بمل پر خواب جیسی کیفیت طاری ہو گئی اور اُسے محسوس ہوا جیسے وہ محوِ خواب ہے۔

"یہ تمھارے اندر گھُٹی ہوئی بمل کو جھنجوڑنے کی آخری تدبیر تھی جسے آج اُس بمل کے خلاف اُکسانے کے لئے مجبور کیا گیا تھا جس کے ہونٹ رسموں، رواجوں اور اخلاقی تقاضوں نے آج تک سی رکھے تھے۔ وہ بمل آج باغی ہو کر سامنے آ گئی تھی جس کا میں مُدت سے انتظار کر رہا تھا۔ تم اور تمھاری انمول محبت پالنے کے بعد مجھے کسی لڑکی اور اُس کے قیمتی جہیز کی ضرورت نہیں ہے بمل! ——— آج کے واقعے نے ہماری زندگی کی تاریک راہیں روشن کر دی ہیں ———!!" وہ جذباتی ہو کر آج کے واقعے کے نفسیاتی پہلو اُجاگر کر رہا تھا اور بمل اُس کے بازوؤں پر جھُکی ہوئی سِسک رہی تھی!!

غزلیں

بسمل الہ آبادی

حقیقت کب تری لے آسماں اہلِ فغاں سمجھے
اگر سمجھے تو اپنی آہِ سوزاں کا دھواں سمجھے

بس اِتنا فرق ہم اپنے تمہارے درمیاں سمجھے
زمیں اپنے کو ہم رُتبہ میں تم کو آسماں سمجھے

اجل جس وقت آجاتی ہے ٹالے سے نہیں ٹلتی
نہ طفلِ ناتواں سمجھے نہ یہ پیرو جواں سمجھے

نہ تھا جوشِ جنوں میں امتیازِ نیک و بد ہم کو
مخالف دوستوں کو دشمنوں کو مہرباں سمجھے

تجلّیٔ جمالِ دوست جب ہم کو نظر آئی
تو اپنے داغ ہائے دل کو شمعِ لامکاں سمجھے

کسی کے کام آجاتے تو کچھ جینے کا حاصل تھا
بہر صورت ہم اپنی زندگی کو رائیگاں سمجھے

ابھی تک نہیں سمجھے حسینان کماں ابرو
اُسی کو تاک کر مارا کہ جس کو نوجواں سمجھے

غزالہ اشفاق، شاہجہانپوری

دَم سے اے جانِ بہاراں ترے دیوانوں کے
تذکرے شہروں میں رہتے ہیں بیابانوں کے

آپ میں کل بھی تھیں بیگانہ روی کی باتیں
آپ میں آج بھی انداز ہیں بیگانوں کے

ماہ و انجم سے کیا کرتی ہوں شب بھر باتیں
سُننے والے نہیں ملتے مرے افسانوں کے

پہلے بھی کھائے ہیں انسان نے انساں سے فریب
اہرمن آج بھی ہیں رُوپ میں انسانوں کے

ہے جوانی بھی ابھی۔ ہے در تو بہ بھی کھلا
اور دروازے ابھی وا ہیں میخانوں کے

چشمِ ساقی سے بھی چلتے ہیں مئے ناب کے دور
ہاں مگر رُوپ بدل جاتے ہیں پیمانوں کے

بُت پرستی کے نہ الزام کا بن جائیں سبب
اے غزالہ ترے چکر یہ صنم خانوں کے

شوراج بسمل

سینے میں سوزِ عشق کو پنہاں کئے ہُوئے
بیٹھا ہُوں لُطفِ زیست کا ساماں کئے ہُوئے

کب آئی کب بہار گئی، کچھ خبر نہیں
مُدت ہوئی ہے سیرِ گُلستاں کئے ہُوئے

آتے ہیں وہ خبر کو مجھ آشفتہ حال کی
زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہُوئے

یہ بھی ہے ایک صُورتِ تسکینِ اضطراب
پھرتا ہُوں دل کے زخم نُمایاں کئے ہُوئے

اللہ رے چمن میں جنُوں خیزیٔ بہار
گُل خندہ زن ہیں چاک گریباں کئے ہُوئے

کیا تم کو میری دل شکنی کا نہیں خیال
کیوں توڑتے ہو وعدہ و پیماں کئے ہُوئے

روشن ہیں اے بہار مرے داغہائے دل
گو مدتیں ہوئی ہیں چراغاں کئے ہُوئے

آزاد گورداسپوری بی-اے

ابھی سے ٹھاتی ہے دلِ اہلِ دل کا بہار آفریں گلفشانی تمہاری
ہے بچپن میں جب یہ اداؤں کا عالم تو پھر ہوگی کیا نوجوانی تمہاری

مریضِ غمِ ہجر نے اپنے خط میں یہی ایک جملہ کسی کو لکھا تھا
گلہ کیا نہ آؤ اگر دیکھنے کو، جو آجاؤ تو مہربانی تمہاری

جہاں تک بنی راز داری نباہی محبت کے انجام کو کیا کریں ہم
چھپانے پہ بھی ہے زمانے کے لب پر فسانہ ہمارا کہانی تمہاری

تمہاری ہر اک بات میں کچھ اشارہ ہے تمہاری خوشی مجھ کو منظور ہے
مجھے غم نہیں اپنی رسوائیوں کا اگر وہ بیاں ہوں زبانی تمہاری

حدیثِ غمِ زندگی سُنتے سُنتے وہ آزاد سے اِس طرح ہنس کے بولے
سنا ہوگا قصہ نہ ایسا کسی نے جو ہم سُن رہے ہیں زبانی تمہاری


منصوبہ بند کنبہ ایسا کنبہ ہوتا ہے، جس کی
سبھی ضرورتیں آپ پوری کر سکتے ہیں
بھائی مجھے بتایئے۔ آپ اتنے اچھے طریقے سے کیسے گذر بسر کر پاتے ہیں۔ میرا گزارا تو بڑی مشکل سے چل پاتا ہے۔
میرا خرچہ کم ہے۔ کیونکہ میرا کنبہ چھوٹا ہے۔ صرف دو بچے ہیں میرے۔
دو؟ میری بیوی تو ہر برس بچہ جنتی ہے۔ لیکن میں کروں بھی تو کیا؟
وہی کرو، جو میں کرتا ہوں۔ نرودھ استعمال کیا کرو۔
بچے کا جنم روکنا آپ کے اختیار میں ہے
اختیار کا استعمال کیجیے
فیملی پلاننگ کے لئے
نرودھ استعمال کیجئے
۳ کے لئے ۱۵ پیسے - ۱ کے لئے ۵ پیسے
(سرکار کی طرف سے رعایتی قیمت)
فی الحال کچھ ضلعوں میں ہی مل رہے ہیں

طنزیہ

ادھیائے پانچواں ——

نئی مہابھارت

فکر تونسوی

اور عہدِ حاضر کے سنجے یعنی اِتہاس کار فکر تونسوی فرماتے ہیں کہ جب مرحوم راجہ شانتنو کے مرحوم بیٹوں بچتر سنگھ اور چتر سین کی رانیوں کے بطن سے باپ کی بجائے سائنس کے ذریعے راجکمار دھرت راشٹر، پنڈو اور بُدر کا ظہور ہوا تو راج پتا بھیشم نے شانتنو اسٹیٹ میں ہفتے بھر کے جشنِ عام کا اعلان کر دیا۔ جشنِ عام کے پروگراموں کی تفصیل پر بھیشم اور ستیہ وتی میں خاصی جھڑپ ہو گئی اور اِس سے پہلے کہ بھیشم بطور پروٹسٹ آمرن برت شروع کر دیتا، راج رانی ستیہ وتی نے اپنے بھائی پنچال دیش کے راجہ گندیرا سنگھ کو ٹرنک کال کر کے بُلا لیا۔ جس نے مداخلت کر کے ایک عارضی صلح نامے پر بھیشم اور ستیہ وتی کے دستخط کروا لئے۔ جب ایک پریس رپورٹر نے راج پتا بھیشم سے استفسار کیا کہ آپ تو سوشلسٹ خیالوں کے حامی ہیں آپ نے ستیہ وتی اور گندیرا سنگھ ایسے عوام دشمن حکمرانوں کے ساتھ کیسے سمجھوتہ کر لیا تو بھیشم نے ایک اُداس مُسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ”میں کیا کروں۔ رات کو خواب میں میرے جدِّ امجد مہاراج شانتنو تشریف لائے تھے۔ اُن کا حکم تھا کہ سوشلزم جائے بھاڑ میں۔ میری اسٹیٹ کی حفاظت سب سے مقدم ہے لہٰذا تم پنچ شیل کر لو۔“

بہر کیف ہفتے بھر تک شانتنو اسٹیٹ میں تینوں راجکماروں کا جشنِ پیدائش دھوم دھام سے منایا گیا۔ اسٹیٹ کے ورکروں نے کارخانوں میں ڈبل شفٹیں چلا کر پروڈکشن دگنی کر دی۔ اور یہ ڈبل شفٹیں اُنھوں نے بغیر معاوضہ لئے چلائیں۔ اسٹیٹ کے ہر ملازم نے راجکماروں کے ”پیدائش فنڈ“ میں اپنی آمدنی کا دسواں حصہ پیش کیا۔ اور اسٹیٹ نے اس کے بدلے میں ہر ملازم کی تصویر اخباروں میں چھپوائی۔ کرایہ دار یونین نے اپنے خون سے لکھ کر ایک درخواست راج رانی ستیہ وتی کو پیش کی کہ اُن کا کرایہ پانچ فیصدی بڑھا دیا جائے اور ہم سے دو دو مہینے کا پیشگی کرایہ وصول کر کے سرکاری خزانے میں جمع کرایا جائے۔ دو تین کرایہ داروں کو جمنا ندی کے سوئمنگ پول سے دھکا دے دیا گیا۔ کیونکہ وہ پیشگی کرایہ دینے کو غیر جمہوری فعل سمجھتے تھے۔ اسٹیٹ کے ہر گھر میں تینوں راجکماروں کی تصویروں کی پُوجا کی گئی اور یہ تصویریں اسٹیٹ کی طرف سے ہر گھر میں ”نہ نفع نہ نقصان“ کے آدھار پر فروخت کی گئیں۔ شانتنو کلب کے جوئے بازوں کو جوا ٹیکس میں پندرہ فیصدی کی چھوٹ دی گئی اور کلب میں وہسکی اور کھانے کے میمو پر پچاس فیصدی رعایت کا اعلان کیا گیا۔ جس سے اسٹیٹ کے امیر زادوں نے جی بھر کر فائدہ اُٹھایا۔ جشن کے آخری دن ورکروں کو صرف تین گھنٹے کی چھٹی دی گئی۔ تاکہ وہ اسٹیٹ مُورکھ منڈل کے جلوس میں شامل ہو سکیں۔ اُس جلوس میں اسٹیٹ کے بڑے بڑے امیر وزیر گدھوں پر سوار ہو کر، جوتیوں کا ہار بہت فخر سے پہنے ہوئے اور بازاری فلمی گانے گاتے ہوئے دکھائے گئے۔ اُس جلوس کی ایک فلم بھی تیار کی گئی جو بعد میں رعایا کو صرف بیس پیسے ٹکٹ پر ”مفت“ دِکھائی گئی اور یوں یہ جشنِ عام قہقہوں اور مُسکراہٹوں پر ختم ہوا۔

دھرت راشٹر نے بڑے ہو کر خوب ڈیل ڈول نکالے۔ پیدائش کے پہلے ہی دن اُس کا وزن کیا گیا تو دس کلو نکلا۔ کھانے پینے کی فراوانی تھی۔ اِس لئے دھرتِ راشٹر دن بہ دن طول و عرض میں پھیلتا چلا گیا۔ ابھی ساڑھے چار سال کا تھا کہ ایک دن کھیل ہی کھیل میں اپنے ذاتی نوکر چھوکرے کو پیس ڈالا۔ راج رانی ستیہ وتی نے آدھا خوش ہو کر اور آدھی ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ”کاش! یہ اندھا نہ ہوتا تو بڑا ہو کر یو۔ این۔ او کا صدر بن جاتا!“

نابینا ہونے کے باعث دھرت راشٹر کو تعلیم حاصل کرنے میں قدرے مشکل پیش آئی۔ اُسے اندھکار یونیورسٹی میں داخل کیا گیا۔ جہاں اُس نے ٹیپ ریکارڈوں اور ٹائپ مشینوں اور ابھرے ہوئے الفاظ و حروف کی مدد سے تعلیم حاصل کی۔

اندھوں کا طبعی جھکاؤ اگرچہ ساز و سنگیت کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن دھرت راشٹر میں جمالیاتی حس غائب تھی۔ لَے اور سُر سے کورا تھا۔ چنانچہ ایک دن اپنے میوزک ٹیچر کے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ دیا اور اُس کے پاؤں کی ایک ہڈی توڑ دی۔ جس پر اُسے میوزک کی کلاس سے اُٹھا لیا گیا اور یونیورسٹی کے پہلوانی اکھاڑے کا ممبر بنا دیا گیا۔ مگر وہاں بھی اُس نے اپنی طاقت کے وحشیانہ مظاہرے کرنا شروع کر دیئے۔ کئی سٹوڈنٹس پہلوانوں کی پسلیاں توڑ ڈالیں۔ چونکہ وہ شاہی خاندان کا راجکمار تھا اِس لئے یونیورسٹی کے وائس چانسلر اُس کی شکایت کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔

آخر تنگ آکر ایک دن وائس چانسلر نے ایک جلسۂ عام میں دھرت راشٹر کو یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعزازی ڈگری دے دی اور اُسے رخصت کر دیا۔

ڈگری حاصل کرنے کے بعد دھرت راشٹر کی شادی بامبی دیش کے ایک مارواڑی سیٹھ کی لڑکی مِس گندھرولا سے کر دی گئی۔ مِس گندھرولا چنکبرے چہرے کی تھی۔ لیکن پلاسٹک سرجری کی مدد سے جرمنی میں جاکر انتہائی حسین و جمیل لیڈی کا سرٹیفکیٹ لے آئی تھی۔ پہلے اُس نے ایک خوبصورت فلمی ہیرو پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ بلکہ اُس کے ساتھ اپنے باپ کی فلم کمپنی کی ایک فلم میں ہیروئن کے طور پر رول بھی کیا۔ لیکن فلم اور عشق دونوں جب بُری طرح ناکام ہوگئے تو کروڑپتی سیٹھ نے اُسے اندھے دھرت راشٹر کے پلے باندھ دیا۔ اِس شادی سے پہلے ایک تحریری معاہدے پر بھی دستخط کئے گئے کہ شانتنو اسٹیٹ کی طرف سے مارواڑی سیٹھ کو کچھ اشیاء کے ایکسپورٹ امپورٹ لائسنس جاری کئے جائیں گے اور سیٹھ کی تیار کردہ فلموں پر شانتنو اسٹیٹ میں کوئی تفریحی ٹیکس وصول نہ کیا جائے گا۔ بینائی سے صرف دھرت راشٹر محروم تھا، مارواڑی سیٹھ محروم نہ تھا۔ اِس لئے اُس نے داماد کے اندھے پن کو بھی منڈی کی ایک جنس بنا کر خوب فائدہ اُٹھایا۔ اُس نے ایک اندھے کو اپنی پلاسٹک کے چہرے والی بیٹی دے کر ایک قربانی دی تھی۔ ورنہ اندھے کو کون اپنی بیٹی دیتا ہے۔

اور اُدھر بھیشم نے کم اور ستیہ وتی نے زیادہ اپنے دل کو مطمئن کر لیا کہ مارواڑی سرمایہ دار کے بطن سے مِلی جُلی اکانومی کی جو اولاد پیدا ہوگی، اُس سے کم از کم شانتنو کُل تو آگے چلے گا۔ دھرت راشٹر سے جب پُوچھا گیا کہ کیا تمہاری شادی مارواڑی رئیس زادی مِس گندھرولا بائی سے کر دی جائے؟ تو وہ مُسکرا کر بولا ”اندھے کو اور کیا چاہئے مِس گندھرولا!“

اندھے دھرت راشٹر اور سُہاگنی مِس گندھرولا کی شادی بہت دُھوم دھام سے ہوئی۔ ساری برات ہیلی کاپٹروں پر بامبی دیش میں گئی۔ اُن دنوں بامبی دیش میں نشہ بندی کا قانون لاگو تھا۔ لیکن قانون بے دست و پا لوگوں کے لئے ہوتے ہیں اور طاقت اور اقتدار ہمیشہ سے قانون شکن رہے ہیں۔ اِس لئے صرف شادی کے دنوں کے لئے نشہ بندی کا قانون ڈھیلا کر دیا گیا۔ آڑ یہ لی گئی کہ شادی میں چونکہ غیر ممالک سے امیر و سفیر مہمان شامل ہوں گے۔ اِس لئے اُن کی ضیافت صرف جام مَے سے کی جاسکتی ہے ورنہ وہ مہمان ہمارے دیش کے تہذیب و تمدّن کے متعلق غلط اثرات لے کر جائیں گے۔ چنانچہ اِس آڑ میں شرابوں کے بند بند کُھل کُھل گئے۔ سمندر کے کنارے شرابِ ناب کے دریا بہنے لگے۔ صاحبِ اقتدار لوگ خوبصورت آڑ تلاش کرنے میں یدِطُولیٰ رکھتے ہیں اور داد پاتے ہیں۔ مگر بے دست و پا لوگ خوبصورت سی خوبصورت آڑ بھی ڈھونڈ لیں، پھر بھی وہ جیل پہنچا دئے جاتے ہیں۔

راجکمار دھرت راشٹر بیاہ کے فوراً بعد ہنی مون کے لئے ہمالیہ پربت پر بنے ہوئے شاہی بنگلے میں چلے گئے۔ وہاں ایک امریکی نژاد مہرشی سے ملاقات ہوئی جو آتما کی شانتی کی تلاش میں ہمالیہ اور اُس کی وادیوں کا بھرمن کرنے آیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے تھے وہ ایک خطرناک بدیشی جاسوس ہے اور کچھ لوگ کہتے تھے کالجگی اوتار ہے۔ گفتگو کرتے وقت وہ کسی یونیورسٹی کا پروفیسر معلوم ہوتا تھا لیکن اُس کے اعمال دیکھ کر شک ہوتا تھا کہ طوائفوں کا کوئی دلّال ہے۔ یوگی اور مہرشی کہلانے کے باوجود وہ چرس اور وہسکی پیتا تھا، سُور کا مانس کھاتا تھا اور اپنے نوجوان چیلوں اور چیلیوں کو عیش و عشرت کی کُھلی ترغیب دیتا تھا۔ ہمالیہ کی ایک سرسبز وادی میں ایک سَو ایک کمروں والے بنگلے میں رہتا تھا اور بھگوان کی تپسیا کرتا تھا۔ بقولِ خود آتما کی شانتی خود بھی پاتا تھا اور دوسروں کو بھی دیتا تھا۔ شانتی کیا تھی، موتی چُور کے لڈّو تھے جو حلوائی سے خرید کر بانٹے جاتے تھے ——— بہرکیف نوجوان لڑکے اور لڑکیاں نہ جانے کیوں اُس کے بہت مدّاح تھے اور اُس کے یوگا آشرم میں بیٹھ کر گانجے کے خوب دَم لگاتے تھے۔

راجکمار دھرت راشٹر کی ملاقات اُس مہرشی سے کرائی گئی کیونکہ یہ مہرشی ایسے بودم بے دال قِسم کے رئیس زادوں کی ٹوہ میں رہتا تھا جنھیں ہر وقت یہ وہم رہتا ہو کہ اُن کے راج کاج کو کہیں زوال نہ آجائے اور اُن سے یہ عیش و عشرت کی زندگی نہ چِھن جائے۔ راجکمار دھرت راشٹر کو کسی جیوتشی نے ایک بار بتایا تھا کہ آپ خوش نصیب ہونے کے باوجود بدنصیب ہیں اور آپ کو یہ جو عیش میسّر ہے اِس کا زوال پذیر ہونا لازمی ہے۔ اُسی وقت سے دھرت راشٹر کو اندھا ہونے کے باوجود خواب میں بھوت اور چُڑیلیں نظر آیا کرتی تھیں۔ نہ جانے اندھوں کو جب اور کچھ نظر نہیں آتا تو چُڑیلیں کیسے نظر آجاتی ہیں؟

راجکمار دھرت راشٹر نے امریکی نژاد یوگی مچھندر سے کہا ”میرا نام دھرت راشٹر ہے۔

میں شانتنو اسٹیٹ کا شہزادہ ہوں۔"

یوگی مچھندر نے اُسے چرس سے بھرا ہوا ایک سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ میں بھی پچھلے ایک جنم میں مہرشی ویاس تھا۔ چولا بدلتے بدلتے اب یوگی مچھندر تک آپہنچا ہوں۔ لیکن آپ ہر بار چولا بدلنے کے باوجود ابھی تک دھرت راشٹر ہیں۔ اِس کا مطلب ہے آپ کی آتما شُدھ اور پوتر ہے۔ جو چولا بدلتی ہے، کیرکٹر نہیں بدلتی۔"

اندھا دھرت راشٹر اپنی تعریف سُن کر پھولا نہ سمایا اور جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ اُس کے سامنے حال یوگی مچھندر سابق مہرشی ویاس کھڑے ہیں، تو وہ اُس کے پاؤں پر گر پڑا اور اپنے گلے کا طلائی ہار اُتار کر مہرشی کے چرنوں پر رکھتے ہوئے بولا: "اے آسمان سے اُترے ہوئے عظیم مہرشی ویاس! میں نے اخباروں میں آپ کی بے پناہ تعریف و تحسین پڑھی ہے۔ آپ مجھ گناہگار اور پاپی جیو کو بھی اپنے چرن کملوں کا داس بنا لیجئے۔"

مہرشی مچھندر نے کہا: "(موٹی مچھلی پھنسی ہے) نہیں۔ میں تم اور تمھاری پتنی دونوں کو اپنا داس بنانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ جب انسان شادی کر لے تو اُس کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔"

گندھرولا دیوی نے بھی اپنے گلے کا طلائی ہار اُتار کر مہرشی کے چرنوں پر رکھ دیا۔

مہرشی نے وِہسکی کا ایک ایک پیگ اپنے مقدس ہونٹوں سے جُھوٹھا کر کے دھرت راشٹر اور گندھرولا سے کہا: "اب اِسے نوش کر لو۔ نوش کرنے کے بعد تم دونوں میرے صفِ اوّل کے چیلے بن جاؤ گے۔ زندگی بھر تم پر کوئی بھوت چڑیل آنچ نہ لا سکے گا۔"

اور جب پیگ پیے جا چکے اور پریس فوٹوگرافروں نے راج اور دھرم کے اِس تاریخی سنگم کی تصویریں کھینچ لیں تو مہرشی مچھندر نے عروسی جوڑے کو آشیرواد دی کہ تمھارے یہاں ایک سَو اولادِ نرینہ پیدا ہو گی، جو نہ صرف شانتنو اسٹیٹ کو وسعت دے گی بلکہ اُس کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجے گا! وِشو بنک اور عالمی عدالت اور یو۔این۔او تک میں اُن ایک سَو لڑکوں کے چرچے ہوں گے اور وہ ایسے ایسے کارنامے کریں گے کہ دُنیا دانتوں تلے اُنگلیاں دبائے گی۔ لیکن وہ دُنیا کے دانت اور اُنگلیاں دونوں توڑ دیں گے!

راجکمار دھرت راشٹر کو جب یہ بردان مِلا تو اُسے اپنی بھجاؤں کی طاقت پر بے ساختہ گھمنڈ اور پیار آگیا۔ لیکن گندھرولا دیوی ایک سَو بیٹوں کو جنم دینے کے تصور ہی سے کانپ اُٹھی اور دھرت راشٹر سے سرگوشیانہ لہجے میں بولی: "مہرشی سے

> اُردو جرائد میں عوامی اور ادبی دونوں سطحوں پر "بیسویں صدی" اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں نمایاں رول ادا کرتا رہا ہے۔ گذشتہ ۳۲ سال کے عرصے میں "بیسویں صدی" نے نہ صرف افسانے کو مقبولِ عام بنایا بلکہ ادب کی اِس صنف میں نہ جانے کتنے قلم کاروں کو جنم بھی دیا ہے۔ اِس اعتبار سے جنابِ خوشتر گرامی کی گراں بہا خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ زیرِ نظر شمارہ "مدیرۂ بیسویں صدی" کی اُن خداداد صلاحیتوں کا مکمل مظہر ہے جو رسالہ کو مقبولِ عوام و خواص بنانے کا موجب رہی۔ . . .
>
> روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی

یہ تو پُوچھ لیجیے کہ صرف ایک عورت ایک سَو بچّوں کو کیسے جنم دے سکتی ہے؟ یہ تو جسمانی طور پر ناممکن ہے۔"

یوگی مچھندر بڑا عیّار تھا۔ وہ بھانپ گیا کہ نوجوان گندھرولا گھبرا گئی ہے۔ چنانچہ وہ بولا: "اے میرے پیارے چیلو! میڈیکل سائنس ترقّی کی شکھر پر جا پہنچی ہے۔ اب بچّوں کی تخلیق پُرانے گھِسے پِٹے طریقے سے نہیں، سائنٹفک طریقے سے کی جا رہی ہے۔ اِس لئے ہمارا بچن ستیہ ہے۔ یوگی کبھی جھُوٹ نہیں بولتے۔ سائنس کی مدد سے ایک سَو لڑکے ضرور پیدا ہوں گے!"

دوسرے بھائی راجہ پنڈو نے جب پر پُرزے نکالے تو معلوم ہوا کہ وہ تو لڑکیوں کی طرح نازک اور حسین و جمیل ہے۔ کئی شوخ و شنگ لوگوں نے اُس پر پھبتی بھی کَسی کہ اِسے تو "وِشو سُندری" کے انتخاب کے لئے بھیجا جانا چاہیئے۔ بھیشم دادا نے اُسے ایک کالج میں داخل کرایا تو وہاں کتابیں پڑھنے کی بجائے ڈراموں میں حصّہ لینے لگا۔ کالج کے ڈراموں میں دوشیزاؤں کا پارٹ اِس خوبصورتی سے کرتا کہ کئی کالجیٹ عاشق کلیجہ تھام کر رہ جاتے۔ خاندان میں اندھی دولت ڈانس کرتی پھرتی تھی۔ اِس لئے یونیورسٹی کے اعلیٰ سے اعلیٰ پروفیسر راجکمار پنڈو کی ٹیوشن پر مامور کر دئے گئے۔ بھیشم دادا کا دبدبہ پُوری یونیورسٹی پر چھایا ہوا تھا۔ اِس لئے راجکمار پنڈو کے امتحان کا نتیجہ ہر سال اِتنا شاندار نِکلتا کہ ذہین ترین سٹوڈنٹس دانتوں میں اُنگلیاں دبا کر رہ جاتے۔ دو تین ذہین طالب علموں نے تو اِس غم میں خودکشی بھی کر لی۔

راجکمار پنڈو نے اِس کے باوجود بی۔اے میں تھرڈ ڈویژن حاصل کی۔ رانی ستیہ وتی نے راجکمار پنڈو کے تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کا انتقام دو پروفیسروں سے لیا۔ جنھوں نے راجکمار کے پیپر دیکھے تھے۔ وائس چانسلر کی معرفت

اُن پر کالج فنڈ میں غبن کرنے کا الزام لگایا گیا اور اُنھیں معطّل کر دیا گیا۔ سٹوڈنٹس کی ایک ٹولی کو ایک سنیما ہاؤس کے فری ٹکٹ خرید کر دیئے گئے اور کہا گیا کہ کالج کے پرنسپل کی کار کو آگ لگا کر پھونک دو! سٹوڈنٹس نے فوراً تعمیل کی۔ اُن دنوں سنیما کے ایک ٹکٹ کی قدر و قیمت ایک کار سے زیادہ سمجھی جاتی تھی۔

اب بھیشم دادا کو راجکمار پنڈو کی شادی کی فکر لاحق ہوگئی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ لڑکا گریجویٹ بھی ہو اور امیر زادہ بھی، تو وہ ایک ہفتے میں آوارہ اور لفنگا ہو جاتا ہے۔ کئی شکاری لڑکیاں اپنا جال بچھا کر بیٹھ جاتی ہیں اور نوخیز راجکمار کو پھانس لیتی ہیں۔ چنانچہ ایک دن اُنھوں نے راجکمار پنڈو کو تخلئے میں بُلایا اور پُوچھا "پنڈو بیٹے! بتاؤ، کیا تمھیں ایک حسین و جمیل دُلھن لا دوں؟"

پنڈو نے لڑکیوں کی طرح شرما کر کہا "دادا! مجھے تو فلم کمپنی میں ہیرو بننے کا شوق ہے۔ میں دُلھن لے کر کیا کروں گا؟"

بھیشم دادا بھانپ گیا کہ لڑکا پڑھا لکھا بے وقوف ہے۔ اُن دنوں اُمراء اور روساء کے گھروں میں پڑھی لکھی بے وقوف اَولاد پے در پے پیدا ہو رہی تھی۔ لیکن پھر بھی بڑے بڑے عہدوں پر امیروں ہی کی اَولاد فائز کی جاتی تھی کیونکہ غریبوں کے متعلّق یہ تھیوری تسلیم کی جا چکی تھی کہ اُن میں حُکمرانی کی فطری صلاحیت نہیں ہوتی۔ اِس لئے غریب کا فرسٹ کلاس ایم۔ اے لڑکا بھی ٹائپسٹ بننے پر مجبور ہو جاتا مگر امیر کا میٹرک فیل لڑکا کسی مِل کا مینیجر بن جاتا یا انتہائی نالائق ہوتا تو اُسے آنریری مجسٹریٹ بنا دیا جاتا!

رانی ستیہ وتی نے بھیشم دادا کے نام فرمان جاری کیا راجکمار پنڈو کی مرضی کے خلاف کسی اونچے گھرانے میں شادی رچا دی جائے۔

راج ماتا کا فرمان کرنسی نوٹ کی طرح تھا۔ فوراً بھُنا لیا گیا اور راجکمار پنڈو کی شادی سابق راجپوت حال گوالوں کے راجہ (جس کے ایک سَو ایک ڈیری فارم تھے) مسٹر سُودیسن سُوَد (سُود تخلّص تھا کیونکہ وہ شاعر بھی تھا) کی ماہتاب کم اور آفتاب زیادہ لڑکی کُمنتی کماری سے ہوگئی۔ نئے دَور کا اِتہاس کار سنجے یعنی فکر تونسوی لکھتا ہے کہ بیاہ سے پہلے کُمنتی کماری کے یہاں ایک لڑکا کرن نامی بھی پیدا ہوا تھا۔ جس کا قصّہ یعنی پسِ منظر چھٹے ادھیائے میں بیان کیا جائے گا!!

آرتی

ش، نذیر الدین

معرفت غوث محی الدین صاحب۔ مکان نمبر ۲/۳۹۔ طبیب لینڈ روڈ نمبر ۲۔ تھبلی (ضلع دھارواڑ)

محترم بھائی صاحب! آداب و نیاز

اِس بار ایک کہانی "آرتی" ارسالِ خدمت ہے۔ کھنڈروں سے متعلق یہ میری تیسری کہانی ہے۔ اُمید ہے میری اور کہانیوں کی طرح یہ بھی آپ کو پسند آئے گی۔ کہانی آپ کو اور قارئینِ "بیسویں صدی" کو پسند آگئی تو سمجھوں گا میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ گرانقدر رائے سے مطلع فرمایئے گا . . .

آپ کا —— ش، نذیر الدین

★

میں مسلسل دو گھنٹے سے گھوڑے پر سوار تھا اور گھوڑا ٹٹو کی طرح اپنا سر جھکائے سانپ کی طرح بل کھائی ہوئی پگڈنڈی پر اپنے مالک کے پیچھے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ سورج کی تپش اب ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی۔ پسینہ میرے کانوں کے قریب سے بہہ بہہ کر میری شرٹ کے کالر میں جذب ہو رہا تھا۔ پسینے سے میری گردن بھیگنے سی لگی تھی۔ میں بار بار اپنی اُنگلی سے گردن پر چپکی ہوئی شرٹ کے کالر کو الگ کر دیتا مگر تھوڑی دیر بعد وہ پھر چپک جاتا تھا۔ پسینے کی نمی سے میری گردن پر گُدگُدی سی ہونے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہزاروں رینگنے والے کیڑے میری گردن پر کلبلا رہے ہوں۔

میرے پیچھے دوسرے گھوڑے پر جسونت سوار تھا۔ اُس کے پیچھے تیسرے گھوڑے پر پروفیسر گھوش تھا اور ہم تینوں کے پیچھے ایک اور گھوڑے پر ہمارا پُورا سامان لدا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ دس مزدور پھاوڑے، کُدال اور ٹوکریاں اُٹھائے پیدل چل رہے تھے۔ یہ چھوٹا سا قافلہ ڈاک بنگلے سے اُن چٹانوں کی طرف کوچ کر رہا تھا۔ جہاں ہم ایک گُپھا دریافت کرنے والے تھے۔ ہم کل ہی اِس گاؤں میں آئے تھے۔ ایک دن ڈاک بنگلے میں آرام کرنے اور کھُدائی کے انتظامات مکمل کر لینے کے بعد آج اِن چٹانوں کی طرف چل پڑے تھے۔ پروفیسر گھوش آثارِ قدیمہ کا ماہر تھا۔ میں اور جسونت اُس کے اسسٹنٹ تھے۔ پروفیسر کا خیال تھا کہ اِن چٹانوں میں ایک گُپھا دفن ہے۔ میں پروفیسر کو اور اُس کے اِس خیال کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔ کیونکہ گھوڑے پر سفر کرنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر مسلسل دو گھنٹے سے ڈولتے ڈولتے اب میری ریڑھ کی ہڈی میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے گھوم کر جسونت سنگھ کی طرف دیکھا۔ شاید اُس کا نشہ اُکھڑ رہا تھا۔ وہ جیب سے برانڈی کی چھوٹی سی شیشی نکال کر پینے لگا تھا۔ پروفیسر گھوش اپنی آنکھوں سے دوربین لگائے پہاڑیوں کے اُس پار دیکھنے لگا تھا۔ پروفیسر کی عمر پچاس برس کے قریب تھی۔ وہ بُوڑھا تھا، پھر بھی اُس کے چہرے پر اِس تکلیف دہ سفر کی تکان کی کوئی علامت، کوئی اثر نہ تھا۔

جسونت سنگھ میرے مضمحل چہرے کی طرف دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"تم بھی دو گھونٹ پی کر دیکھ لو، ساری تھکاوٹ دُور ہو جائے گی!" یہاں اپنی جان پر بنی ہوئی تھی اور اِس کمبخت کو مذاق سوجھ رہا تھا۔ میں نے جسونت کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ میرے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ڈاک بنگلے کا بُوڑھا نوکر رامو جسونت کی بات پر ہنسنے لگا تھا۔ میں نے رامو سے کہا۔

"کیوں بھئی، کیا ہم یہاں تھوڑی دیر رُک کر اپنی کمر سیدھی کر سکتے ہیں؟"

"نہیں صاحب، اب ہم اُن چٹانوں سے بہت قریب ہیں۔ آپ پانی گرنے کی آواز سُن رہے ہیں نا؟" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہ آبشار ہے اور اُس کے قریب ہی وہ چٹانیں ہیں۔ بہت خوبصورت جگہ ہے صاحب!" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

رامو نے سچ کہا تھا۔ جگہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ شور مچاتے ہوئے آبشار کا پانی ہزاروں فٹ کی بلندی سے نیچے ایک گہری کھائی میں گر رہا تھا اور وہاں سے جھاگ اُڑاتا ہوا ایک الھڑ ندی کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ ندی کی بائیں جانب پام کے درختوں کے جھنڈ کے درمیان ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ اُس کے گرد و پیش بڑے بڑے پتھر اور بھوری چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ مندر کے پیچھے دو سو گز کے فاصلے پر تیس چالیس

[illegible] مکانات تھے یہ سب کسانوں کی آبادی تھی۔ مندر کے بائیں طرف تقریباً بیس گز کے فاصلے پر بڑی بڑی بھوری چٹانیں ایک بڑے سے ٹیلے کی شکل میں کھڑی تھیں۔ پروفیسر کا خیال تھا کہ اِنہی چٹانوں میں وہ گپھا دفن ہے ـــــ ہم نے اُن چٹانوں سے تھوڑی دُور پر تین خیمے نصب کر دیئے تھے۔ ایک پروفیسر کے لئے، دوسرا میرے اور جسونت کے لئے اور تیسرا مزدوروں کے لئے۔

سورج ڈھل گیا تھا اور ہم اِن چٹانوں میں بھٹک رہے تھے۔ مزدور چٹانوں پر کھدی ہوئی تصویروں کو دھو کر صاف کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ جسونت چاک پیس لئے اِن تصویروں کے گرد مارک کر رہا تھا، میں کیمرے سے اِن کے فوٹو لے رہا تھا اور پروفیسر پلاسٹک ہیمر سے چٹانوں پر آہستہ آہستہ ضربیں لگا کر گپھا کا دہانہ تلاش کرنے میں مشغول تھا۔ تھوڑی دُور پر مندر کا بُوڑھا پجاری کھڑا حیرت

- دوزخ سے نجات چاہتے ہو تو خلق اللہ کی خدمت کو اپنا شعار بناؤ۔ (حضرت شمس تبریزیؒ)
- کیا ہی اچھا ہے وہ شخص جو اپنے عیب پر نظر رکھتا ہے اور کوئی اُس کے عیب کو بتاتا ہے تو وہ تسلیم کر لیتا ہے۔ (حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ)
- ہماری غیبت کرنے والے ہمیں خراج دیتے ہیں اور اپنے اعمالِ صالحہ ہمارے اعمال نامے میں منتقل کرتے ہیں۔ (حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ)
- کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ دل آزاری ہے۔ چاہے مومن کی ہو یا کافر کی۔ (حضرت مجدّد الف ثانیؒ)
- جسے خلقت پر شفقت نہیں وہ اللہ کی دوستی سے محروم ہے۔ (خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ)

اور غصے سے ہماری کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔ اُسے یہاں کھدائی کرنے پر اعتراض تھا۔ آج پروفیسر نے اُسے بہت مشکل سے سمجھایا تھا کہ ہم حکومت کی طرف سے آئے ہیں۔ ہمارے پاس یہاں کی کھدائی کا اجازت نامہ بھی ہے۔ ہمارے کام میں اگر کوئی حارج ہوگا تو پھر ہمیں مجبوراً پولیس کی مدد لینی پڑے گی۔ پولیس کا نام سُن کر بُوڑھا مان گیا تھا۔ ورنہ وہ یہاں کے لوگوں کو بھڑکا دیتا تو پھر ہمیں انھیں ہموار کرنے میں بہت دِقّت پیش آتی۔

اندھیرا ہونے سے پہلے ہم نے اپنا کام ختم کر لیا۔ پروفیسر نے ایک چٹان پر چاک پیس سے مارک کر دیا تھا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ گپھا کا دہانہ اِسی چٹان کے پیچھے ہے۔ کل صبح ہمیں یہاں کھدائی کرنی تھی اور اِس چٹان کو ہٹانا تھا۔ مزدور سامان سمیٹ رہے تھے۔ میں اور جسونت خیمے کی طرف چل پڑے۔ سُورج ندی کے اُس پار پہاڑیوں کے پیچھے چھُپ رہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے سُورج کی شفق کو سیاہ بدلیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ پام کے درختوں کے درمیان سے سیاہ بدلیوں میں گھری ہوئی شفق کی سُرخی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی خوش جمال نے اپنے سیاہ جُوڑے میں سُرخ گُلاب لگایا ہو۔ کسان عورتیں مٹی کے گھڑے لئے ندی سے پانی بھر رہی تھیں۔ وہ پانی سے بھرا ہوا گھڑا اپنے سر پر رکھے مندر کی بغل سے گُزری ہوئی پگڈنڈی پر خراماں خراماں گُزر رہی تھیں۔ اُن کی پازیب کی چھن چھن شور مچاتے ہوئے آبشار کے پانی کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر وادی میں سحر انگیز نغمہ بکھیر رہی تھی۔ میں نے جسونت سے کہا۔

"دیکھو جسونت! کتنا خوبصورت منظر ہے! یہاں کی زندگی کتنی پُرسکون ہے۔ کیا ہم اپنے گنجان شہروں میں اِس زندگی کا تصوّر بھی کر سکتے ہیں؟" جسونت رُک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں بہت خوبصورت منظر ہے!" یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

"وہ جانِ طرب کاش! ایسے میں آتے!"

مزدور سامان خیمے میں رکھ کر اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ مجھے اور جسونت کو آتے ہوئے دیکھ کر ڈاک بنگلے کا نوکر رامو ہمارے قریب آگیا۔

"صاحب! یہ سب مزدور رات یہاں بسر نہیں کرنا چاہتے۔ وہ آبادی کی طرف جانا چاہتے ہیں، صبح پھر آجائیں گے۔"

"کیوں؟" ہم نے تو اُن کے لئے بھی یہاں خیمہ لگا دیا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے صاحب! لیکن وہ ڈرتے ہیں۔ رات یہاں اِس مندر کے آس پاس ایک رُوح بھٹکتی ہے!"

ہم نے مزدوروں کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانے۔ اپنا سامان سمیٹ کر صبح آنے کا وعدہ کر کے وہ سب کسانوں کے مکانوں کی طرف چلے گئے۔ اب یہاں ہم صرف چار آدمی رہ گئے تھے۔ میں، پروفیسر، جسونت اور رامو ـــــ رات کے کھانے کے بعد پروفیسر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ میں اور جسونت اپنے خیمے میں آگئے۔ رامو نے بھی رُوح کے ڈر سے ہمارے ہی خیمے میں بستر لگا لیا تھا۔ جسونت اپنا بستر کھول کر بیٹھ گیا اور بکس سے شراب کی بوتل نکال کر پیالے میں اُنڈیلنے لگا۔ میں نے جسونت سے کہا۔

"جسونت! انسانوں کا نہیں تو بھگوان کا تو خیال کرو۔ اِس وقت تم بھگوان کے گھر سے بہت قریب ہو!"

جسونت نے لبریز پیالہ اُٹھا کر لبوں سے لگا لیا اور ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کرتے ہوئے لہک کر کہا ؎

"زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہ ہو"

راموؔ ہنسنے لگا۔ میں نے اُس سے پُوچھا۔

"راموؔ وہ رُوح کا کیا قصّہ ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ یہاں کوئی رُوح بھٹکتی ہے؟"

راموؔ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"ہاں صاحب، بہت دُکھ بھری کہانی ہے... وہ میری جوانی کے دِن تھے۔ کوئی بیس برس پہلے کی بات ہے۔ اُس وقت یہاں اِس مندر میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ آرتیؔ۔ وہ اِس بُوڑھے پُجاری کی بیٹی تھی۔ بہت خوبصورت تھی صاحب! بات کرتی تو مُنہ سے پُھول جھڑتے، بھیگے بھیگے رس بھرے، شہتوت کے سے ہونٹ تھے اُس کے۔ ہنستی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے جھرنا گنگنا رہا ہو۔ چلتی تو اُس کی پازیب کی چھن چھن پر نوجوان دل جھوم جھوم اُٹھتے۔ گورا گورا پُھول سا بدن تھا اُس کا۔ ظالم شباب کی دیوی معلوم ہوتی تھی..."

بُوڑھا چُپ ہوگیا۔ اُس کے چہرے کی جُھرّیوں سے جذبات کے دھارے پُھوٹنے لگے اور اُس کا چہرہ کسی نوجوان چہرے کی طرح سُرخ ہوگیا۔ وہ تھوڑی دیر تک خیمے کے باہر خلاء میں گھُورنے لگا جیسے آرتی کے سراپا کو ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ جذبات کے دھارے اُس کے چہرے کی جُھرّیوں میں گُم ہوگئے۔ "میں اُس پر جان دیتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایک شہری بابو پر فریفتہ ہوگئی تھی۔ اُن دنوں وہ یہاں آیا ہوا تھا۔ وہ شہری بھیڑیا اُسے سبز باغ دکھاکر ایک دن اُس کا سب کچھ لُوٹ کر یہاں سے غائب ہوگیا۔ آرتی روتی رہی، سِسکتی رہی، اُس پردیسی کی راہ دیکھتی رہی۔ لیکن وہ نہ آیا۔ جانے والے بھلا کب لوٹ کر آتے ہیں؟ پردیسیوں کا کیا بھروسہ!!" وہ چُپ ہوکر مجھے اور جسونت کو گھُورنے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے شدید نفرت جھانک رہی تھی۔

جسونت نے پُوچھا۔

"پھر کیا ہوا راموؔ؟"

"اُس کے پیٹ میں پاپ پل رہا تھا۔ میں نے اُس سے بہت کہا کہ میں اب بھی اُس سے بیاہ کرنے کے لئے تیار ہوں پر وہ نہ مانی۔ کہتی تھی میں اُس کی ہوچکی اور مرتے دم تک اُسی کی رہوں گی! کچھ دنوں کے بعد اُس نے ایک بچّی کو جنم دیا اور بچّی کو جنم دینے کے پانچویں دن وہ اچانک غائب ہوگئی... لوگوں کا خیال ہے کہ اُس نے آبشار سے گِر کر اپنی جان دے دی۔ اُس کی بچّی کو بُوڑھا پُجاری پال رہا تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ بھی چل بسی۔ تب سے آرتی کی رُوح مندر کے آس پاس بھٹکتی رہتی ہے۔ لوگ راتوں کو یہاں آنے سے گھبراتے ہیں۔" راموؔ چُپ ہوگیا۔ اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

ہمیں صبح جلد ہی کھُدائی شروع کردینی تھی۔ اِس لئے ہم سب جلد ہی سوگئے ——— رات کے کوئی بارہ بجے کے قریب اچانک میری آنکھ کھُل گئی۔ کسی کی آہٹ پاکر میں جاگ پڑا تھا۔ میں نے بستر سے اُٹھ کر لیمپ کی روشنی بڑھادی۔ میرے سامنے پروفیسر کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔

"کیا بات ہے پروفیسر؟"

وہ آگے بڑھ کر میرے بستر پر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔

"وہ... رُوح مجھے پریشان کررہی ہے۔ میرے خیمے میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔"

"آج آپ نشے میں تو نہیں ہیں پروفیسر؟ ہم سب تو اپنے خیمے میں آرام سے سورہے ہیں۔ ہمیں کسی رُوح نے پریشان نہیں کیا؟"

"نہیں میاں، تم تو جانتے ہی ہو کہ میں شراب نہیں پیتا... وہ رُوح ہی تھی۔ کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہولے ہولے میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی ہو، کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے اُس نے میرا ماتھا چوم لیا ہو، کبھی خیمے میں دبی دبی سسکیاں گُونجنے لگتی تھیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھتا تو کوئی نظر نہ آتا تھا۔" پروفیسر بہت گھبرایا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔

- جب تمھاری اپنی دہلیز کے زینے گندے ہوں تو پڑوسن کی چھت پر پڑی ہوئی غلاظت کی شکایت نہ کرو۔ (کنفیوشس)
- افلاس کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ اِس سے انسان کو ہمیشہ غریب رہنے کی عادت پڑجاتی ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- اگر آپ اپنے خیالات کو سلیقے سے استعمال کریں تو یہ آپ کی ناکامیوں اور آپ کی غلطیوں کو آپ کے بے پناہ سرمائے میں شامل کردے گا۔ (نپولین ہل)
- آپ کے یقین کے مطابق ہی آپ کی زندگی ہوگی۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اہم بات یہ ہے کہ انسان زندگی کو اُمید اور مسرّت سے دیکھے۔ (ڈاکٹر مارڈن)

"یہ آپ کا واہمہ بھی ہوسکتا ہے پروفیسر!"

"خیر، کچھ بھی ہو اب تو میں یہیں سوؤں گا۔"

میں پروفیسر کے لئے اپنا بستر چھوڑ کر جسونت کے ساتھ لیٹ گیا۔ رات جب بھی میری آنکھ کھُلی تو میں نے پروفیسر کو جاگتے ہوئے ہی پایا۔

صبح مزدور جلد ہی آگئے تھے اور کھُدائی کا کام شروع ہوگیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے چٹان کو رسّیوں سے جکڑ دیا۔ دس مزدور ایک ساتھ رسّی کو کھینچ رہے تھے لیکن چٹان اُسی طرح مضبوطی سے اپنی جگہ پر ٹکی ہوئی تھی۔ مندر کا پُجاری آج بھی ہماری کارروائی دیکھ رہا تھا ——— اچانک ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ چٹان اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ ہمارے چہرے خوشی سے کھِل اُٹھے۔ ہمارے سامنے گُپھا کا دہانہ کھُلا ہوا تھا۔

کچھ دیر تک ہم نے گُپھا کو اسی طرح کھُلا رہنے دیا تاکہ اُس کے اندر بھری ہوئی

گیس نکل جائے۔ تھوڑی دیر بعد پروفیسر نے آرک لیمپ روشن کر لی اور ہم سب گپھا کے اندر داخل ہو گئے۔ ہمارے پیچھے مندر کا پجاری بھی آگیا۔ ہم گپھا کی دس سیڑھیاں اُتر کر گپھا کے اندر آگئے۔ گپھا کسی تاریک اور بڑے تہہ خانے کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ گپھا میں چاروں طرف پتھروں میں تراشی ہوئی مُورتیاں تھیں۔ گپھا کے وسط میں ایک بہت ہی بڑی تقریباً پندرہ فٹ اونچی مُورتی کھڑی تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ آشیرواد دینے کے سے انداز میں اُٹھا ہوا تھا۔ اُسی مُورتی کے نیچے، پیروں کے قریب ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔

پروفیسر دو قدم پیچھے ہٹ آیا۔ مندر کا بُوڑھا پجاری اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے سسکنے لگا۔ میں نے پروفیسر کے ہاتھ سے آرک لیمپ لے کر ڈھانچے کی طرف روشنی ڈالی۔ یہ کسی عورت کا ڈھانچہ تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں ابھی تک کانچ کی چُوڑیاں تھیں۔ پاؤں میں چاندی کی پازیب تھی جو اب بالکل سیاہ پڑ گئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی اُنگلی میں ایک انگوٹھی تھی۔ اُس کا نگینہ مدّھم پڑ گیا تھا۔ پروفیسر مبہوت سا کھڑا تھا اور پجاری ابھی تک سسک رہا تھا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ کیوں رو رہے ہیں پنڈت جی؟"

وہ ہچکیاں لینے لگا۔

"یہ . . . میری بیٹی آرتی کا ڈھانچہ ہے!"

ہم سب چونک پڑے۔

"لیکن یہ یہاں کیسے آیا؟"

"یہ بیس سال پہلے کی بات ہے بابو! اُن دنوں یہاں ایک پردیسی آیا تھا۔ وہ میری معصوم آرتی کو دھوکا دے کر ایک دن یہاں سے چلا گیا۔ آرتی اُس کے بچّے کی ماں بننے والی تھی۔ ایک بچّی کو جنم دے کر اُس نے دَم توڑ دیا۔ مرتے ہوئے اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اُس کی چِتا نہ جلاؤں، اُس کی لاش کو اِسی گپھا میں ڈال دوں۔ ایک دن وہ پردیسی یہاں ضرور آئے گا اور اِس گپھا کا دہانہ دریافت کرے گا اور وہی اُس کی چِتا میں آگ بھی لگائے گا۔ اُس کے کہنے کے مطابق میں نے اُس کی لاش کو اِس گپھا میں ڈال دیا تھا اور لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ آرتی نے آبشار سے گِر کر اپنی جان دے دی۔"

بُوڑھا پھر رونے لگا۔ پروفیسر نے پُوچھا۔

"وہ بچّی اب کہاں ہے؟"

"کچھ دنوں بعد وہ بھی مر گئی۔"

"لیکن آپ اِس گپھا میں کیسے داخل ہوئے؟"

"اس گپھا سے ایک سُرنگ مندر تک جاتی ہے۔ یہ بات صرف مجھے اور آرتی ہی کو معلوم تھی۔ یہ ہمارا خاندانی راز تھا۔ آرتی ہر روز اِس گپھا کی صفائی کرتی تھی اور یہاں دِیا جلا کر پُوجا کرتی تھی۔"

میں بُوڑھے کو سہارا دے کر گپھا سے باہر لے آیا اور اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں پنڈت جی! آپ کی بیٹی کی چِتا ضرور جلے گی۔ اُس کی چِتا ہم جلائیں گے۔ کیونکہ اُس پردیسی کی بجائے ہم نے گپھا دریافت کر لی ہے اور ہم بھی پردیسی ہی ہیں۔"

شام ہونے لگی تھی۔ چِتا جلانے کا انتظام مکمّل ہو گیا تھا۔ آرتی کے ڈھانچے کو چِتا پر رکھ دیا گیا۔ میں نے پجاری سے چِتا میں آگ لگانے کے لئے کہا۔

"نہیں! میں آگ نہ لگاؤں گا، آپ ہی میں سے کوئی آگ لگا دے۔"

پجاری کے کہنے پر پروفیسر نے چِتا میں آگ لگا دی۔

آرتی، آرتی کی طرح جلتی رہی۔ اُس پردیسی کی یاد میں سُلگتی رہی اور ایک دن سِسکتے سِسکتے اُس نے چراغِ سحر کی طرح دَم توڑ دیا۔ پھر اِس وادی میں اُس کی رُوح بھٹکنے لگی۔ اُس کی لاش گپھا میں پڑی سڑتی رہی اور آج بیس سال سے گپھا میں پڑی سڑتی ہوئی لاش کی چِتا جل رہی تھی، دھواں اُٹھ رہا تھا، ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔ پام کے درخت خاموش تھے۔ ندی دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ چاروں طرف عجیب سا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف سینے میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ساری وادی سوگ میں ڈُوب گئی ہو! پتہ نہیں کون تھا وہ جو اِس معصوم دوشیزہ کو سِسک سِسک کر دَم توڑنے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ پتہ نہیں کون پتھر تھا جس نے اِس کی رُوح تک کو بھٹکنے کے لئے مجبور کیا۔ ہمارے ہی سماج کا، ہمارے ہی جیسا کوئی انسان ہوگا۔ انسان کے رُوپ میں چھُپا ہوا درندہ! —— ہم نے ہمالیہ کی چوٹی کو سر کیا ہے، ہم نے زمین کا سینہ چیر کر موہن جوڈارو کو دریافت کیا ہے۔ ہماری عقل و فہم کی اُڑان چاند تک بھی پہنچ گئی ہے، لیکن ہمارے اخلاق آج بھی وہیں ہیں

جہاں پتھر کا زمانہ تھا۔ ہم نئے سماج اور نت نئی تہذیبوں کے معمار ہیں۔ ہم نے نئے نئے قانونوں کو جنم دیا ہے، ہم نے ہر جُرم کی سزا تجویز کی ہے، لیکن کیا اِس درندہ نُما انسان کے جُرم کی بھی کوئی سزا ہے؟ اُس نے تو وہ گُناہ کیا ہے کہ اگر وہ خود چاہے بھی تو اِس کا کفّارہ ادا نہیں کر سکتا۔ کاش! آج آرتی کی بھٹکتی ہوئی رُوح کو سکون مِل جائے۔

چِتا جل کر بھسم ہو گئی۔ سب اُداس تھے۔ ہمیشہ عیش و عشرت اور شراب کی باتیں کرنے والے جسونت کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ ہم سب پر اتنی اُداسی چھا گئی تھی کہ ہم کام نہ کر سکے۔ ہم سے رات کا کھانا بھی نہ کھایا جا سکا۔ ہم یوں ہی سو گئے۔

صبح میں جلد ہی اُٹھ گیا۔ مزدور آ گئے تھے۔ پروفیسر ابھی تک اپنے خیمے سے نہیں نِکلا تھا۔ شاید آرتی کی بھٹکتی ہوئی رُوح کو سکون مِل گیا تھا۔ کیونکہ کل رات پروفیسر اپنے خیمے ہی میں سویا تھا۔ میں نے رامو کے ساتھ چار مزدوروں کو گُپھا کی طرف بھیج دیا تاکہ وہ جلد از جلد گُپھا کی صفائی کر دیں۔ جسونت بھی انگڑائیاں لیتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔

"بھئی، پروفیسر کو جگا دو نا!" میں پروفیسر کے خیمے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں دو چار قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ پیچھے سے رامو اور مزدور دَوڑتے ہوئے آ گئے۔ میں گھبرا گیا۔

"صاحب . . . پروفیسر! . . ." رامو ہانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟"

"وہ . . . پروفیسر!" رامو کے مُنہ سے آواز نہیں نِکل رہی تھی۔ میں اور جسونت گُپھا کی طرف بھاگے۔

سامنے گُپھا کے درمیان، پندرہ فٹ اونچی مُورتی کے اُٹھے ہوئے ہاتھ سے مفلر باندھے پروفیسر لٹک رہا تھا!!

غزل

ایم۔ اے شمیم سرونجی (ایم اے)

اب اُن کے دل کی بات مرے دل کی بات ہے
کتنی حسین عشق کی یہ وار دات ہے!

تم نے جو غم دیا وہ متاعِ حیات ہے
اب ہم بلاکشوں کی یہی کائنات ہے

صحرائے غم کی، وادیٔ غربت کی بات ہے
دشوار کتنی دوستو! راہِ حیات ہے!!

اُف چاند زرد ہے کسی بیمار کی طرح
کتنی اُداس ہجر کے ماروں کی رات ہے

شامِ غمِ فراق تری دلنواز یاد!
تاریکیوں میں شمعِ فروزاں کی بات ہے

یہ ہے بقولِ راہیؔ[1]، شمیمؔ اپنی داستاں
"اک نامرادِ کُشتۂ صد مُشکلات ہے"

لہ راہی قاسمی

غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

بہارِ بزم کہاں لُٹ گئی خدا جانے
سحر ہوئی تو نہ پھر شمع تھی نہ پروانے

وہ شوق کیا کہ جو پابندِ لفظ و معنیٰ ہو
وہ عشق کیا جسے تیری نظر نہ پہچانے

رضائے دوست میں گم ہو کے رہ گیا ہوں میں
وصال و ہجر کی شرطیں مری بلا جانے

وہ نامرادِ جہاں ہوں کہ ڈُوبنے جو گیا
تو ڈال لی شکن اپنی جبیں پہ دریا نے

بڑے سلوک سے طے ہو رہی ہے راہِ جنوں
یہ کون راہنما ہے مرا خدا جانے

کچھ ایسے اب بھی ہیں رندانِ تشنہ لب جوہرؔ
جدھر نگاہ اُٹھا دیں، ہزار میخانے

ہریانہ شاہراہِ ترقی پر

ہریانہ نے اپنی زندگی کے پہلے دو برسوں میں ہر پہلو ترقی کی ہے جو ذیل کے حقائق سے بخوبی ظاہر ہے:-

	تشکیل نو کے وقت صورت حال	موجودہ صورت حال
زراعت		
غذائی اجناس کی پیداوار (لاکھ ٹنوں میں)	۲۵٫۷۰ (۶۷-۱۹۶۶ء)	۳۹٫۵۲ (۶۸-۱۹۶۷ء)
کیمیائی کھادوں کی کھپت (لاکھ ٹنوں میں)	۰٫۶۰ (۶۷-۱۹۶۶ء)	۲٫۵۰ (۶۹-۱۹۶۸ء)
آبپاشی		
آبپاشی کے تحت رقبہ (لاکھ ہیکٹروں میں)	۱۲٫۷۶ (۶۷-۱۹۶۶ء)	۱۳٫۰۱ (۶۸-۱۹۶۷ء)
نصب کردہ ٹل کنوئیں	۴۳۵ "	۲۲۳۵ "
نصب کردہ پمپنگ سیٹ	۳۷۴ "	۲۱۷۴ "
کھودے گئے کنوئیں	۶۱۳ "	۱۹۱۳ "
صنعت		
چھوٹے پیمانے کے صنعتی یونٹ	۳۵۰۰	۴۵۰۰
رجسٹرڈ شدہ چالو کارخانے	۱۱۱۷	۱۳۳۰
روزگار مہیا کرنے کی اہلیت	۶۸۰۰۰	۷۶۴۳۳
تعلیم		
سکولوں میں طلباء کی تعداد	۹۶۱۴۷۳	۱۱۶۲۰۰۰
کالجوں " " " "	۲۹۰۰۰	۳۹۰۰۰
پرائمری سکولوں " " " "	۴۴۶۵ (۶۷-۱۹۶۶ء)	۵۷۰۰
مڈل سکولوں " "	۷۴۲ "	۱۳۰۲
ہائی/ہائر سیکنڈری سکولوں " "	۵۹۷ "	۶۵۴
طب و صحت		
ہسپتال اور ڈسپنسریاں	۲۸۵	۲۸۹ (۱۷ آیورویدک ڈسپنسریوں میں منتقل کیے گئے)
دستیاب بستر	۴۵۸۴	۵۰۶۶ (جنوری ۶۹ء)
غور و پرداخت مویشیاں		
مویشیوں کے ہسپتال	۲۱۵	۲۲۵
بجلی کی سہولیات		
بجلی سے مستفید ہونے والے دیہات	۱۲۵۱ (اپریل ۶۷ء)	۱۴۳۶
ٹل کنوؤں کو دیے گئے بجلی کے کنکشن	۲۰۱۹۰	۲۷۵۸۹ (اپریل ۶۸ء) ۴۵۵۸۹ (۶۹-۱۹۶۸ء)
کل کنکشن	۳۱۱۹۱۴	۳۷۹۴۲۸ (اکتوبر ۶۸ء)
ذرائع آمد و رفت		
بسوں کی تعداد	۴۷۵	۵۹۳
چالو راستے	۲۱۳	۲۳۶
بسوں کا روزانہ سفر (میلوں میں)	۶۴۰۰۰	۸۰۰۰۰

جاری کردہ:- محکمہ تعلقاتِ عامہ ہریانہ

دِلّی کا خط لندن کے نام

خوشتر گرامی

مائی ڈیر لندن!

اکیس برس قبل ہم نے آپ کے برطانیہ عظمیٰ سے جس کی سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا، رشتہ توڑ کر آدھی رات آدھا دن کر دیا تھا اور غلامی کے بندھنوں کو آزادی کے سنہرے رشتے میں بدل کر آپ سے برابری کے تعلّقات کا ایک نیا باب شروع کیا تھا یعنی برطانیہ اور ہندوستان دولتِ مشترکہ کی دو ہم شیر مملکتیں بن گئی تھیں ——— کوئی سَوا صدی کے بعد آزادی آئی تو ہاضمہ بگڑ گیا۔ سیاسی آزادی انگریز دے گیا تھا، اقتصادی اور سماجی آزادی ہمیں حاصل کرنی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ اقتصادی طور پر تو بندھن بڑھے مگر سماجی زندگی میں البتہ ہر طرف بہار آگئی اور ہوتے ہوتے ہم مادر پدر آزاد ہو گئے اور دَوڑے سرپٹ ——— پیرس، ٹوکیو، واشنگٹن، نیویارک اور شکاگو سے آگے نکلنے کے لئے!

پیارے لندن!

آپ کی ملکہ وکٹوریہ نے شامِ اودھ کا حال پڑھا ہوگا لیکن اب ہمارے کناٹ پلیس نئی دِلّی میں ایوننگ اِن پیرس کا سماں ہوتا ہے۔ موسیقی کی دُھنیں، رقص کے نظارے، ہوٹلوں میں رات گئے تک رہنے والے حسین جمگھٹے، رقص و سرود کی محفلیں، نوجوان جوڑوں کے دلفریب ڈانس اور جُملہ لوازم سبھی کچھ تو ہیں۔

ہم نے اپنی سرپٹ دَوڑ کا نام کلچرل ترقی رکھا ہے۔ نت نئے ہال، اوپن ایئر تھیٹر، کلوز ڈور کلبیں، رنگ شالائیں تیزی سے بن رہی ہیں۔ رنگ شالا کا نام زبان پر آیا ہے تو صرف آپ کی اِطلاع کے لئے عرض ہے ؎

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ

جب بنگال میں سیلاب سے زبردست تباہی و بربادی آئی ہے۔ لاکھوں بے گھر اور تباہ حالوں کی ریلیف کے لئے کروڑوں روپے کی ضرورت ہے۔ ہم نے اُن کے زخموں پر پھاہا رکھنے کے لئے بنگال کے شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کی یاد میں نئی دِلّی میں ۴۶ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک رنگ شالا تیار کی ہے اور عین سیلاب کی تباہی و بربادی کی دلخراش خبروں میں مِلا کر اِس مُسکنِ قلب و جگر خبر کو بھی شائع کیا ہے۔

بات مُنہ سے نکلی کوٹھے چڑھی۔ کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ اب ہم نے کلچرل میدان میں پالا مار لیا ہے۔ آپ کے اور پیرس کے برابر ہوا ہی چاہتے ہیں نیم عریانی اور اب عریانی کے قریب قریب ہم پہنچ رہے ہیں۔ ڈر ہے کہ آپ سُن کر یہ نہ پُکار اُٹھیں ؎

اللہ کرے برہنہ تن اور زیادہ

پارکوں میں حسین بانہیں گردنوں میں حمائل نظر آنا۔ ہوٹلوں کے کیبن کورٹ شِپ کے لئے بُک رہنا۔ سیر و سیاحت کے مقامات پر نوجوان جوڑوں کا کلیلیں بھرنا تو اب پُرانی باتیں ہو گئی تھیں۔

اے برطانوی تہذیب کے مرکز!

اب میرے دامن میں نائٹ کلب کا انتظام بھی ہونے لگا ہے تاکہ نہ صرف غیر ممالک سے آنے والے سیاح لُطف اندوز ہوں بلکہ بھارت واسی بھی دادِ عیش دیں۔

اس لئے مُژدہ ہو لندن سے آنے والوں کو کہ بھارت سرکار نے آفیسرز ہوٹل کرزن روڈ نئی دِلّی میں نائٹ کلب کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ اب آپ کے سپوت نئی دِلّی آئیں گے تو اپنے آپ کو اجنبی نہیں پائیں گے۔ اُن کو اپنی سماجی زندگی کے جُملہ سامان میسّر آئیں گے۔ قلب و نظر کی تسکین کے لئے وہ سب کچھ ہوگا جو آپ کے یہاں ہوتا ہے۔

مائی ڈیر لندن!

ہمارے سماج پر پہلے شرم و حیا کی کچھ چادریں شاید پُرانے کپڑوں کا بیوپار کرنے والوں سے خرید کر ڈال دی گئی تھیں اور فلموں کو فرشتوں کے دیکھنے کے لئے بنانا شروع کر دیا گیا تھا جن میں بوسے بازی پر دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی تھی اور جسے توڑنے کی سستی شہرت حاصل کرنے والے لیڈروں کو بھی جُرأت نہیں ہوئی تھی لیکن اب انڈین موشن پکچر پروڈیوسر ایسوسی ایشن کے نئے صدر آئی۔ ایس جوہر نے فلموں میں بوسے بازی کے متنازعہ مسئلہ کو ختم کرنے کے لئے 'بوسے' پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا اعلان کیا ہے۔ اِس میں بوسے بازی کے تاریخی اور مجلسی پس منظر پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی جائے گی۔ مختلف قوموں اور مُلکوں کی زبانوں میں بوسے بازی کی سماجی اہمیت واضح کی جائے گی ——— اس لئے آپ اپنے یہاں کے چوٹی کے سینما گھروں میں اِس کی ایڈوانس بکنگ کر لیں اور

پیرس اور واشنگٹن میں بھی تار بھیج دیں تاکہ ایسی "باکس ہٹ" پکچر کو ریلیز کرنے کے جملہ انتظامات کر لئے جائیں۔ بری، فضائی، بحری غرضیکہ جملہ اقسام کے فوجی دستے بلا لئے جائیں اور ایڈوانس بکنگ کا کام شروع کر دیا جائے۔

ڈیر لندن!

آپ کے ہوائی اڈے کے ستم ظریف حکام نے ہماری جوگندر کور کو اُلٹے قدموں لوٹا دیا اور اُسے اپنے ماں باپ سے بھی نہیں ملنے دیا گیا۔ اُس کی ساڑی اُتار کر دیکھی گئی تو معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو سولہ سالہ لڑکی ظاہر کر کے برطانیہ میں داخل ہونے والی لڑکی ایک ہندوستانی نوجوان ہے جو ساڑی باندھ کر، لڑکی بن کر اپنے والدین سے ملنے آیا تھا کہ آپ کے تیز نظر حکام نے بھانپ لیا کہ ضرورت سے زیادہ چوڑے کندھوں والی یہ لڑکی کون ہے۔ اُنھوں نے ہوائی اڈے کی نرس کو بلوا لیا اور جب اُس کی ساڑی اُتاری گئی تو اُس کی بال دار ٹانگیں سامنے آ گئیں اور اُس لڑکے کو جس کے پاسپورٹ پر جوگندر کور لکھا ہوا تھا فوراً ہوائی جہاز سے بھارت واپس کر دیا ——— لیکن اِس کا یہ نسخہ دِلّی میں بھی آزمایا گیا۔ یہاں ایک نوجوان نے اُسے اپنایا تھا لیکن پکڑا وہ بھی گیا۔ وہ ساڑی باندھ کر ایک مکان میں چوری کے لئے داخل ہوا تھا مگر یہ تو پہلا واقعہ تھا ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اگر لندن سے آنے والی ہر خبر پر لبیک کہنے اور مقابلے کا یہی عالم رہا تو آگے چل کر کیا ہوگا؟

جب سے یہ خبر آئی ہے کہ بی بی سی ٹیلی ویژن پر ایک ڈاکیومینٹری فلم دکھائی گئی ہے جس میں مرد اور عورت کے پوشیدہ اعضاء کو دکھایا گیا ہے، ہنستے کھیلتے نوجوان جوڑوں کو تیراکی کے تالاب پر اور بعد میں گرمائی کیمپوں میں گرم ہوتے اور بات چیت کرتے پیش کیا گیا ہے تو میں لرز گئی ہوں کہ دیکھئے یہاں سے کیا گرہ لگائی جاتی ہے۔ ڈر ہے کہ اب تک تو ہم طرحی مشاعرے کے قائل ہیں آپ کے دئے ہوئے مصرع پر ہی گرہ لگاتے رہے ہیں۔ لیکن ڈیر لندن! ——— یہاں ایک واقعہ تو ایسا ہوا ہے اِس کی مثال آپ کے یہاں کیا، دُور دُور تک ملتی نظر نہیں آتی۔

نئی دِلّی کے تھانے میں ایک اپٹوڈیٹ بت طناز نے پہنچ کر کہا: "میری رپٹ درج کیجئے"۔

محرّر نے قلم دوات سنبھالتے اور رجسٹر کھولتے ہوئے پوچھا: "کیا معاملہ ہے؟"

جواب مِلا: "میرے ساتھ . . . دست درازی ہوئی ہے"۔
پوچھا گیا: "کب اور کیسے؟"
جواب ملا: "۴ اکتوبر کی شب کو گیارہ بجے"۔

کانسٹبل پولیس (محرّر) حیران رہ گیا۔ اُس نے کہا: "آج تو ۲ اکتوبر ہے"۔

اِس عشوہ طراز نے بڑے طمطراق سے کہا: "ہاں مجھے بھی تو آج ہی پتہ چلا ہے"۔

محرّر کی حیرانی اور بھی بڑھ گئی۔ اُس نے پوچھا: "وہ کیسے؟"

حسینہ نے نہایت بے باکی سے جواب دیا کہ "چیک آج ہی طرس آنر ہو کر بنک سے واپس آیا ہے"۔

تھوڑے لکھے کو بہت جانو اور اب اجازت دو۔ موقع ہوا تو پھر کبھی یاد کروں گی۔

آپ کی ——— دِلّی

("ایشیا" ویکلی برمنگھم، لندن کے شکریہ کے ساتھ)



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱★ انناس ـــــ ایک صحت بخش پھل

یہ مفرح پھل ہے۔ قلب و جگر کو تقویت بخشتا ہے۔ مقوّی دماغ ہے۔ اِس کا سونگھنا بھی دماغ کو طاقت بخشتا ہے۔ مقوّیِ معدہ بھی ہے۔ بُھوک بڑھاتا ہے، چہرے کے رنگ کو نکھارتا اور جسمانی کمزوری کو دُور کرتا ہے۔ لاغر کو فربہ اور کمزور کو طاقت بخشتا ہے۔ ضعفِ معدہ اور ضعفِ قلب کے مریض اِسے ضرور استعمال کریں۔ گرم مزاج والوں کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ پیاس اور بے چینی کو دُور کرتا ہے۔ بخار میں تسکین دیتا ہے اور کھول کر پیشاب لاتا ہے۔ یرقان اور جگر کی کمزوری کے لئے بے حد مفید ہے۔ ضعفِ جگر اور ورمِ جگر کی حالت میں یا استسقاء کا مریض روزانہ ایک نناس کھائے تو یہ شکایت آہستہ آہستہ رفع ہو جائے گی۔

انناس کا پانی خناق کے لئے بہت مفید ہے۔ اِس مرض میں حلق میں ورم ہونے کے علاوہ ایک جھلّی پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے نرخرے کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور کوئی پتلی چیز بھی حلق کے نیچے نہیں اُترتی۔ خناق کے مریض کو بار بار آبِ انناس پلانے سے یہ جھلّی کٹ جاتی ہے اور حلق کا ورم بھی جاتا رہتا ہے۔

گلوکوز میں انناس کا پانی مِلا کر غشی اور دل کے دَورے کے مریض کو پلانا بے حد فائدہ بخش ہے۔

آبِ انناس ایک تولہ کے چند قطرے آنکھوں میں ڈالنے سے آنکھوں کی سُرخی جاتی رہتی ہے۔ آنکھوں کے درد اور سوزش کے لئے بھی مفید ہے۔

انناس کے عرق میں مصری مِلا کر پینے سے ہچکی کا آنا بند ہو جاتا ہے۔

انناس کا مُربّہ ضعفِ معدہ اور ضعفِ قلب میں بہت مفید ہے۔ دل کی دھڑکن کو دُور کرتا ہے۔ ضعفِ معدہ اور ضعفِ جگر کی وجہ سے اسہال ہونا، نیز بخار کے بعد ضعف و نقاہت میں انناس کے مربّے کا استعمال فائدہ بخش ہے۔

ہر چیز میں فائدے کے ساتھ کچھ نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ انناس بھی بعض لوگوں کے لئے مُضر ہے۔ حاملہ عورتوں کو انناس ہرگز نہ کھانا چاہیئے۔ حلق، ہَوا کی نالی، پھیپھڑہ اور سینے کے لئے انناس مُضر ہے۔ نمک اور ادرک مِلا کر کھانے سے اِن اعضاء کو نقصان نہیں پہنچتا۔

انناس سرد مزاج والوں کے لئے بھی مُضر ہے۔ اِس لئے اُنھیں ادرک اور نمک مِلا کر کھانا چاہیئے۔ نہار مُنہ ہرگز نہ کھائیں۔

۲★ صحت کا راز

صحت ہی زندگی ہے۔ اِس لئے یہ ایسا موضوع ہے کہ اِس پر جتنا بھی لکھا جائے، جتنا پڑھا جائے کم ہے۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ جسمانی تکلیفوں پر رنج و فکر سے بڑھ کر کوئی چیز ہاضمے کو تباہ کرنے والی، معدے کو مناسب اخلاط بنانے سے روکنے والی دُنیا کے تختے پر نہیں ہے۔

ایک دانشور کہتا ہے۔ جس انسان کا جِسم بیمار ہے، رُوح میں جان نہیں، اگر وہ اپنے بدن کی گہرائیوں میں سے طاقت اور قوت کا کچھ حصّہ نکالے، اگر حوصلہ قائم رکھے، ہمّت نہ ہارے تو اُسے بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔ اُس کے مرض میں بہت کمی ہو جائے گی ـــــ اگر تم ہر لحظہ، ہر لمحہ اپنی کمزوری کا احساس کرتے رہوگے، تم سوچتے رہوگے کہ تم بیمار رہتے ہو تو سمجھ لو تم بیمار رہا کروگے۔ تمھیں تندرستی حاصل ہی نہ ہوگی۔

تندرستی چاہو تو صحت کا خیال کرو۔ اپنے دل کی نگاہ میں چوبیس گھنٹے،

مزاج گرم و خشک
کھانے سے
...
...ہے۔ اور ک
معدہ اور جگر کو قو
زیادہ ہوں، ان
وغیرہ امراض صرف
جب خشک ہو جائے تو سو
میں ادرک کھانے سے فائدہ ہوتا
بھی ادرک سے بہت فائدہ ہے۔ ماش
میں ادرک ڈالنے سے ان کا بادی
چاہئے کے ساتھ
اور مروڑ میں فائدہ ہوتا

گرم پانی یا دہ
کا درد دور ہو جاتا ہے۔

ادرک کا اچار بھوک بڑھاتا ہے اور قوت ہاضمہ میں اضافہ کرتا ہے۔
ادرک میں گوناگوں فوائد کے ساتھ نقصان بھی ہے۔ اسے بکثرت اور روزانہ استعمال نہ کرنا چاہئے۔ اعتدال سے زیادہ ادرک کھانے سے ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے، سینے میں سوزش ہونے لگتی ہے۔ پیشاب جل کر اور سرخ رنگ کا آنے لگے گا خون میں گرمی پیدا ہو کر طرح طرح کے عوارض لاحق ہوں گے۔

٦ ★ ایک اہم نکتہ

اس اہم نکتے پر عمل کیا جائے تو شخصیتوں کی تعمیر میں یہ حیرت انگیز کردار ادا کر سکتا ہے ــــــ مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ــــــ بالڈون لو کو موٹر ورکس

ور نہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو تو یقیناً تندرست رہتے رانہ ہے!

★ روشنی کی کرن!

آپ چاہیں تو حالات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی مسرت کی کرن پھوٹ سکتی ہے۔ مسرت کی روشنی باہر سے نہیں آتی۔ دل کے اندھیرے سے پھوٹتی ہے۔ یہ کے اندر رہتی ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ــــــ زندگی میں جدوجہد، مشکلات اور مصیبتیں پریشان اور مایوس کرنے کے لئے نہیں، غیر معمولی ہمت اور قوت دینے کے لئے آتی ہیں ــــــ جب میں لوگوں کو چھوٹی چھوٹی دقتوں پر روتے، جھینکتے اور رائی کا پہاڑ بناتے دیکھتا ہوں تو مجھے وہ بڑھیا یاد آجاتی ہے جس نے اپنی مایوس اندھیری زندگی میں بھی امید اور مسرت کی جوت جلا رکھی تھی۔ اس کی وجہ پوچھنے پر بڑھیا نے جواب دیا ــــــ "میرے پاس مسرت کی ایک کتاب ہے۔ زندگی کے آغاز میں میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ ہر روز رات کو سونے سے پہلے میں اس میں خوشی لانے والے تجربے لکھا کروں گی۔ اس سے زندگی میں خوشی ڈھونڈنا ہی میری عادت بن گئی ہے۔ اس طرح مصیبتوں کی کالی گھٹاؤں میں میں ہمیشہ روشنی کی کرن ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔"

٤ ★ انسانی فطرت کی سب سے بڑی خواہش

انسان کا دل ان گنت خواہشوں کا گہوارہ ہے ــــــ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے! لیکن امریکہ کے بہت بڑے فلسفی پروفیسر جان ڈیوی نے کہا ہے ــــــ انسانی فطرت کی سب سے بڑی خواہش "اہم بننے کی اُمنگ" ہے۔

مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ــــــ "اگر ہمارے آبا و اجداد میں بڑا بننے کی دل سوز اُمنگ نہ ہوتی تو تہذیب کا وجود ناممکن ہوتا۔ اس اُمنگ کے بغیر ہم نرے حیوان ہوتے۔ بڑا بننے کی اسی خواہش نے ایک بقال کے غریب منیم کو قانون کی کتابوں کے مطالعے پر مجبور کیا جو ایک گھر کے کباڑ خانے سے ملیں اور جنھیں اس نے دو روپے کے عوض خریدا تھا۔ شاید آپ نے بقال کے اس منیم کا نام سنا ہوگا۔ اس کا نام لنکن تھا۔"

یہی احساس برتری کا جذبہ تھا جس نے ڈکنز کو غیر فانی ناول لکھنے پر ابھارا۔ اِگا ڈبلے نے مو کو سٹ فرین کو سنگ تراشی کے بہترین نمونے پیش کرنے پر اکسایا۔ اسی

٦٤٠٠٠ ٨٠٠٠٠

جاری کردہ: محکمۂ تعلقات عامّہ ہریانہ

[illegible]

[illegible] کہ ہمارے خیالات و تصورات ہماری شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ اگر [illegible] کہ اس وقت آپ کیا سوچ رہے ہیں تو میں فوراً بتادوں گا کہ آپ [illegible] ہم ہیں ہمارے خیالات ہی ہمیں ایسا بناتے ہیں، ہمارا ذہنی رجحان [illegible] تعین کرتا ہے۔" امریکی فلاسفر ایمرسن کے الفاظ میں ـــــ "ایک [illegible] ر وہ تمام دن سوچتا ہے۔" اور اس سے منسلک وہ ہو بھی گیا

[illegible] پدہ ہے کہ ہمارے سامنے سب سے بڑا اہم واحد مسئلہ صحیح خیالات کا [illegible] یں کامیاب ہو جائیں تو ہم اپنے سارے مسائل کو نہایت آسانی [illegible] یں۔

[illegible] راز

[illegible] ر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ "یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ آپ کسی [illegible] کریں جو قابلِ قبول ہو اور اس خواہش کو رفتہ رفتہ آرزوئے حیات [illegible] سامنے [illegible] تو وہ آپ کو ضرور حاصل ہوگی۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ [illegible] اس بات پر ایمان نہ لے آئیں۔ آپ اس میں کامیاب ہو کر رہیں گے ـــــ" یہ تمنا کرنے اور ایمان لانے میں فرق ہے۔ اسی ذرا سی بات کو نہ سمجھ کر لاکھوں انسان ناکامی کا شکار ہو گئے ہیں۔ جو لوگ زندگی میں کامیاب ہیں وہ اپنے ہر اقدام پر پورا پورا بھروسہ اور یقین رکھتے ہیں۔ جو لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مقصدِ حیات میں ضرور کامیاب ہوں گے تو وہ ناممکنات کے چکر میں نہیں پڑتے اور نہ وہ وقتی شکست کو قبول کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوں گے ـــــ دُنیا میں ہر بڑی کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب بہت سی چھوٹی چھوٹی ناکامیوں نے کامیابی کا راستہ روک دیا۔ ایڈیسن نے تقریباً دس ہزار تجربے کئے اور آخر ریکارڈ مشین بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

۹ ★ ہر دلعزیزی کا راز

لوگوں میں مقبول و ہر دلعزیز بننے کے لئے کچھ بڑے معرکے نہیں کرنے پڑتے۔ کوئی بڑی قربانی نہیں دینی پڑتی۔ ذرا سی توجہ صرف کر کے آپ ہر دلعزیز بن سکتے ہیں۔

مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے ـــــ "جس طرح جسم کے لئے خوراک اور ذہن کے لئے خیالات کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح لوگوں کو اپنی انا کو مطمئن کرنے کے لئے تعریف کی ضرورت پیش آتی ہے۔"

یاد رکھئے، آپ کی ہر دلعزیزی، آپ کی ترقی کا زیادہ انحصار اس بات پر ہے کہ لوگوں کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے ہیں، اُن کی اچھی رائے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی بات سُنیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُن کی دلچسپی کی باتیں کریں۔ اُن کے بارے میں باتیں کریں۔

لوگوں سے متعلق دلچسپ باتیں کرنے سے پہلے آپ اُن کی ذات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ مَردوں اور عورتوں کا غور سے مطالعہ کریں۔ اُن کا ہر پہلو سے جائزہ لیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ وہ کس بات سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

اگر آپ صرف اوپری دل سے لوگوں میں دلچسپی کا اظہار کریں گے تو وہ اُس کے بدلے میں آپ سے خلوصِ دل سے پیش آئیں گے۔ یہ احسان کا بدلہ چُکانے کی بات نہیں ہے، وہ ایسا اس اُمید پر کرتے ہیں کہ آپ برابر اُن میں دلچسپی لیتے رہیں گے۔

آپ ایسا کرکے یقیناً ہر دلعزیز بن جائیں گے۔

آٹھوں پہر توازن کا، قوت کا، زور کا، طاقت کا خیال رکھو۔ کامل تندرستی اور صحت کا نمونہ تمھاری آنکھوں کے سامنے ہو تو یقیناً تندرست رہوگے ـــــــ یہی صحت کا راز ہے!

۳ ★ روشنی کی کرن!

آپ چاہیں تو حالات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی مسرت کی کرن پھوٹ سکتی ہے۔ مسرت کی روشنی باہر سے نہیں آتی۔ دل کے اندھیرے سے پھوٹتی ہے۔ دل کے اندر رہتی ہے۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــــ زندگی میں جدّ وجہد، مشکلات اور مصیبتیں پریشان اور مایوس کرنے کے لئے نہیں، غیر معمولی ہمت اور قوت دینے کے لئے آتی ہیں ـــــــ جب میں لوگوں کو چھوٹی چھوٹی دِقّتوں پر روتے، جھینکتے اور رائی کا پہاڑ بناتے دیکھتا ہوں تو مجھے وہ بڑھیا یاد آجاتی ہے جس نے اپنی مایوس اندھیری زندگی میں بھی اُمید اور مسرّت کی جوت جلا رکھی تھی۔ اُس کی وجہ پوچھنے پر بڑھیا نے جواب دیا ـــــــ "میرے پاس مسرت کی ایک کتاب ہے۔ زندگی کے آغاز میں میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ ہر روز رات کو سونے سے پہلے میں اس میں خوشی لانے والے تجربے لکھا کروں گی۔ اِس سے زندگی میں خوشی ڈھونڈنا ہی میری عادت بن گئی ہے۔ اِس طرح مصیبتوں کی کالی گھٹاؤں میں میں ہمیشہ روشنی کی کرن ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔"

۴ ★ انسانی فطرت کی سب سے بڑی خواہش

انسان کا دل اَن گنت خواہشوں کا گہوارہ ہے ـــــــ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نِکلے! لیکن امریکہ کے بہت بڑے فلسفی پروفیسر جان ڈیوی نے کہا ہے ـــــــ انسانی فطرت کی سب سے بڑی خواہش "اہم بننے کی اُمنگ" ہے۔

مشہور مفکّر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ـــــــ "اگر ہمارے آبا و اجداد میں بڑا بننے کی دل سوز اُمنگ نہ ہوتی تو تہذیب کا وجود ناممکن ہوتا۔ اِس اُمنگ کے بغیر ہم نرے حیوان ہوتے۔ بڑا بننے کی اِسی خواہش نے ایک بقّال کے غریب منیم کو قانون کی کتابوں کے مطالعے پر مجبور کیا جو ایک گھر کے کباڑ خانے سے مِلیں اور جنھیں اُس نے دو روپے کے عوض خریدا تھا۔ شاید آپ نے بقّال کے اُس منیم کا نام سُنا ہوگا۔ اُس کا نام لنکن تھا۔"

یہی احساسِ برتری کا جذبہ تھا جس نے ڈکنز کو غیر فانی ناول لکھنے پر اُبھارا۔ اِسی جذبے نے سر کرسٹو فررین کو سنگ تراشی کے بہترین نمونے پیش کرنے پر اُکسایا۔ اِسی جذبے نے راک فیلر کو اپنی ضرورت سے زیادہ اربوں روپے جمع کرنے پر مجبور کیا۔

۵ ★ ادرک ـــــــ ایک مفید سبزی

ادرک کا مزاج گرم و خشک ہے۔ موسمِ سرما میں اِس کا استعمال بے حد مفید ہے۔ ادرک گُڑ میں مِلا کر کھانے سے سردی کم لگتی ہے، بدن میں گرمی پیدا ہوتی ہے۔ معدے کی کمزوری اور بلغم کی زیادتی میں ادرک بہت ہی مفید ہے۔ یہ غذا کو ہضم کرتی، بھوک میں اضافہ کرتی ہے۔ ریاح اور بلغم کو خارج کرتی ہے۔ دوسرے بہت سے امراض میں بھی بے حد مفید ہے۔ ادرک ہاضم اور قبض کُشا ہے۔ بلغم اور رطوبتِ معدی کو کم کرتی ہے۔ معدہ اور جگر کو قوت دیتی ہے۔ جو لوگ فربہ ہوں اور اُن کے معدے میں رطوبات زیادہ ہوں، اُن کے لئے ادرک مفید ہے۔ فالج، لقوہ، دمہ، نزلہ، زکام، بلغمی کھانسی وغیرہ امراض صرف ادرک یا سونٹھ ہی کے استعمال سے دُور ہو سکتے ہیں۔ ادرک جب خشک ہو جائے تو سونٹھ کہلاتی ہے۔ پیٹ کے درد، اپھارہ، گٹھیا جیسے امراض میں ادرک کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ معدہ، جگر اور آنتوں کی بہت سی بیماریوں میں بھی ادرک بے حد نافع ہے۔ ماش کی دال، گوبھی، مٹر اور شلغم وغیرہ بادی سبزیوں میں ادرک ڈالنے سے اُن کا بادی پن دُور ہو جاتا ہے۔

چھاچھ کے ساتھ ادرک کا عرق یا سونٹھ استعمال کرنے سے پُرانی پیچش اور مروڑ میں فائدہ ہوتا ہے۔

سردی کی کھانسی میں ادرک کا رس شہد میں مِلا کر، ذرا جوش دے کر چاٹنے سے سردی کی کھانسی جاتی رہتی ہے۔

ادرک کے رس میں مصری مِلا کر پینے سے قے بند ہو جاتی ہے۔

گرم پانی یا دودھ میں ایک ماشہ ادرک یا سونٹھ کا رس مِلا کر پینے سے کمر کا درد دُور ہو جاتا ہے۔

ادرک کا اچار بھوک بڑھاتا ہے اور قوتِ ہاضمہ میں اضافہ کرتا ہے۔

ادرک میں گوناگوں فوائد کے ساتھ نقصان بھی ہے۔ اِسے بکثرت اور روزانہ استعمال نہ کرنا چاہئے۔ اعتدال سے زیادہ ادرک کھانے سے ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے، سینے میں سوزش ہونے لگتی ہے۔ پیشاب جل کر اور سُرخ رنگ کا آنے لگے گا خون میں گرمی پیدا ہو کر طرح طرح کے عوارض لاحق ہوں گے۔

٦ ★ ایک اہم نُکتہ

اِس اہم نُکتے پر عمل کیا جائے تو شخصیتوں کی تعمیر میں یہ حیرت انگیز کردار ادا کرسکتا ہے ـــــــ مشہور مفکّر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ـــــــ بالڈون لوکو موٹر ورکس

کے صدر مسٹر سیموئل واکلین کا قول ہے —— "اگر آپ کسی اوسط درجے کے شخص کا احترام کریں اور اُسے احساس دلادیں کہ آپ اُس کی کسی نہ کسی قابلیت کی قدر کرتے ہیں تو آپ اپنی مرضی کے مطابق اُس سے بہترین کام لے سکتے ہیں۔"

آپ کسی شخص میں کوئی خاص خوبی پیدا کرنا چاہیں تو اُس کے ساتھ اس طرح پیش آیئے جیسے وہ خوبی اُس میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ شکسپیر کا قول ہے —— "آپ میں کسی خاص خوبی کا فقدان ہو تو فرض کر لیجئے کہ وہ صفت آپ میں موجود ہے۔" اسی طرح اگر آپ دوسروں میں کوئی خاص خوبی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو یہ فرض کر لینا کہ اُن میں وہ صفت موجود ہے، اچھے نتائج پیدا کرتا ہے۔ آپ کسی شخص کو کسی خاص شہرت کا مالک بتلایئے۔ وہ آپ کی توقعات پر پورا اُترنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

۷ ★ زندگی میں خیالات کی اہمیت

زندگی میں خیالات کی بڑی اہمیت ہے۔ خیالات ہی سے زندگی بنتی اور بگڑتی ہے —— مملکتِ روم کے حکمران اور عظیم فلسفی مارکس اوری لی اس نے اِس عظیم حقیقت کو سات الفاظ میں سمو دیا ہے —— "ہماری زندگی ہمارے خیالات سے بنتی ہے۔"

مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے —— "میں نے اپنی زندگی میں اہم ترین سبق یہ سیکھا ہے کہ ہمارے خیالات و تصوّرات ہماری شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اِس وقت آپ کیا سوچ رہے ہیں تو میں فوراً بتا دوں گا کہ آپ کیسے آدمی ہیں۔ جو کچھ ہم ہیں ہمارے خیالات ہی ہمیں ایسا بناتے ہیں۔ ہمارا ذہنی رُجحان ہی ہماری قسمت کا تعیّن کرتا ہے۔" امریکی فلاسفر ایمرسن کے الفاظ میں —— "ایک انسان وہی کچھ ہے جو وہ تمام دن سوچتا ہے۔" اور اِس سے مختلف وہ ہو بھی کیا سکتا ہے؟

ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے سامنے سب سے بڑا اہم واحد مسئلہ صحیح خیالات کا انتخاب ہے۔ اگر ہم اِس میں کامیاب ہو جائیں تو ہم اپنے سارے مسائل کو نہایت آسانی اور خوبی سے نبٹا سکتے ہیں۔

۸ ★ کامیابی کا راز

مشہور مفکر نپولین ہل نے لکھا ہے —— "یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ آپ کسی ایسی چیز کی خواہش کریں جو قابلِ قبول ہو اور اُس خواہش کو رفتہ رفتہ آرزوئے حیات بنا لیں تو وہ آپ کو ضرور حاصل ہوگی۔ لیکن یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ اُس بات پر ایمان نہ لے آئیں۔ آپ اُس میں کامیاب ہو کر رہیں گے —— "یہ تمنّا کرنے اور ایمان لانے میں فرق ہے۔ اِسی ذرا سی بات کو نہ سمجھ کر لاکھوں انسان ناکامی کا شکار ہو گئے ہیں۔ جو لوگ زندگی میں کامیاب ہیں وہ اپنے ہر اقدام پر پُورا پُورا بھروسہ اور یقین رکھتے ہیں۔ جو لوگ اِس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مقصدِ حیات میں ضرور کامیاب ہوں گے تو وہ ناممکنات کے چکّر میں نہیں پڑتے اور نہ وہ وقتی شکست کو قبول کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوں گے —— دُنیا میں ہر بڑی کامیابی اُس وقت حاصل ہوئی جب بہت سی چھوٹی چھوٹی ناکامیوں نے کامیابی کا راستہ روک دیا۔ ایڈیسن نے تقریباً دس ہزار تجربے کئے اور آخر ریکارڈ مشین بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

۹ ★ ہردلعزیزی کا راز

لوگوں میں مقبول و ہردلعزیز بننے کے لئے کچھ بڑے معرکے نہیں کرنے پڑتے۔ کوئی بڑی قُربانی نہیں دینی پڑتی۔ ذرا سی توجّہ صَرف کر کے آپ ہردلعزیز بن سکتے ہیں۔

مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے —— "جس طرح جسم کے لئے خوراک اور ذہن کے لئے خیالات کی ضرورت ہوتی ہے، اُسی طرح لوگوں کو اپنی انا کو مطمئن کرنے کے لئے تعریف کی ضرورت پیش آتی ہے۔"

یاد رکھئے، آپ کی ہردلعزیزی، آپ کی ترقّی کا زیادہ انحصار اِس بات پر ہے کہ لوگوں کے ساتھ آپ کے تعلّقات کیسے ہیں، اُن کی اچھی رائے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی بات سُنیں تو اِس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُن کی دلچسپی کی باتیں کریں۔ اُن کے بارے میں باتیں کریں۔

لوگوں سے متعلّق دلچسپ باتیں کرنے سے پہلے آپ اُن کی ذات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ مردوں اور عورتوں کا غور سے مطالعہ کریں۔ اُن کا ہر پہلو سے جائزہ لیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ وہ کس بات سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

اگر آپ صرف اوپر ہی دل سے لوگوں میں دلچسپی کا اظہار کریں گے تو وہ اُس کے بدلے میں آپ سے خلوصِ دل سے پیش آئیں گے۔ یہ احسان کا بدلہ چُکانے کی بات نہیں ہے، وہ ایسا اِس اُمید پر کرتے ہیں کہ آپ برابر اُن میں دلچسپی لیتے رہیں گے۔

آپ ایسا کر کے یقیناً ہردلعزیز بن جائیں گے۔

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر بیسویں صدی" دہلی)

سوال و جواب

مِس چاند بیگم۔ میسور

س۔ چچاجان! مسلسل کوشش کے باوجود ناکامی ہو تو؟

ج۔ پھر بھی کوشش جاری رکھنی چاہئے ؎

منزل اُس کے ہاتھ نہ آئی
جو گھبرایا طُولِ سفر سے

س۔ چچاجان! آپ اتنے اچھے ہیں کہ آپ کی پرستش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا آپ اسے کوری عقیدت کہیں گے؟

ج۔ حقیقت تو یہی ہے۔ آپ ہماری شخصیت کے آئینے میں اپنے وجود کا عکس دیکھتی ہیں۔

س۔ چچاجان! کیا غریب کا دل بھی کچھ ہوتا ہے اور اُس کے ارمان بھی کوئی چیز ہیں؟

ج۔ غریب کو دُنیا انسان ہی نہیں سمجھتی، اُن کے دل اور ارمان کا کیا ذکر؟

سیّد قدرت علی۔ جلگاؤں

س۔ آج کا انسان قدرت کو کیوں بھولتا جا رہا ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ نئی روشنی سے خیرہ ہو کر آنکھوں کی بصارت کے ساتھ دل کی بصیرت سے بھی محروم ہوتا جا رہا ہے۔

س۔ خوشتر بھیّا! سیاست کب خطرناک بنتی ہے؟

ج۔ سیاست ہمیشہ ہی خطرناک ہوتی ہے۔

... ٹنکی پورہ۔ سری نگر

س۔ علّامہ اقبال جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جرمنی، لندن وغیرہ بہت دُور دراز مقامات تک گئے ہیں۔ کیا اُنھوں نے کبھی حج بھی کیا ہے؟

ج۔ جی ہاں، اُنھوں نے بے شمار بار حجِ اکبر کیا ہے ——
دل بدست آور کہ حجِ اکبر ست!

س۔ آپ کی نظروں میں ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟

ج۔ ہندوستان ہو یا پاکستان، سب سے بڑا شاعر وہی ہے جو دوسروں کے اشعار کو کمال چابکدستی سے اپنا لینے کے فن میں کمال رکھتا ہے۔ جو مشاعروں کے اِسٹیج پر پیارد قوّال کو مات کر دے!

دیانند ورما۔ نظام آباد

س۔ شری کرشن، شری رام، سیتاجی اور مہابدھ، مہاتما گاندھی کے اِس پوتّر دیش کو فرقہ پرست "راونوں" سے کب نجات ملے گی؟

ج۔ جب پھر کوئی رام پیدا ہوگا!

س۔ آپ کے خیال میں مُلک میں فرقہ پرستوں کی سرکوبی کس طرح کی جا سکتی ہے اور فرقہ وارانہ فسادات کے موجودہ طوفانی سلسلے کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟

ج۔ اربابِ حکومت مصلحت اندیشی کو خیرباد کہہ کر جُرأت سے کام لیں تو فرقہ پرستوں کی سرکوبی اور فرقہ وارانہ فسادات کے طوفان کو روکنا کچھ مشکل نہیں۔

انور جمیل۔ میرٹھ

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ہندوستان کس دن آزاد ہوا؟

ج۔ جُمعہ کے دن۔

خواجہ محمد عبید علی صابری۔ سری پیٹھ

س۔ جس ملک کے سربراہ خود غرض و خویش پرور ہوجائیں، اُس ملک کا کیا حشر ہوتا ہے؟

ج۔ ایسا ملک تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔

س۔ یہ ناجائز ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، رشوت خوری کا سلسلہ کب ختم ہوگا؟

ج۔ جب حکومت کے اربابِ بست و کشاد ملک کے سربراہ صحیح معنوں میں فرض شناس بن جائیں گے۔

عبدالمجید خاں۔ برہان پور

س۔ خوشتر بھیا! لیڈری کے فوائد؟

ج۔ بے حد و بے حساب ہیں!

کے۔ ایم۔ علی ہاشمی بی۔ اے۔ اردو۔ کرنول

س۔ ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ اِن کالموں میں یہ کئی بار بتایا گیا ہے۔ آج آپ بھی سُن لیں ـــــ ۱۹۵۹ء میں شائع ہونے والے مرکزی بیان کے مطابق ہندوستان میں ۳ کروڑ، ۲۱ لاکھ، ۸۴ ہزار آدمی اُردو بولتے ہیں۔

س۔ دُنیا کے کن کن حصّوں میں اُردو بولی اور لکھی سمجھی جاتی ہے؟

ج۔ اُردو بولنے، سمجھنے اور لکھنے والے کم و بیش تقریباً ساری دُنیا میں ہیں۔

غوث محی الدین مامون۔ ہمناباد۔ ضلع بیدر

س۔ اِس سائنسی دَور میں انسان کی حیثیت؟

ج۔ اِس سائنسی دَور میں انسان کی حیثیت و قیمت روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔

س۔ عورت کے ترکش کا آخری تیر؟

ج۔ آنسو!

س۔ امیر مینائی کا کوئی شوخ شعر سنائیے۔

ج۔ انگور میں تھی یہ شے پانی کی چار بوندیں
پر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

شمس عالم آرزو۔ اورنگ آباد گیا

س۔ بھائی جان! کلی ہی پر بھونرے کیوں مرتے ہیں؟

ج۔ آپ کا خیال ہے کانٹوں پر مریں!

س۔ زندگی میں صرف خوشی ہو تو...؟

ج۔ ہے بڑی چیز انبساط مگر
غم نہ ہو تو حیات کچھ بھی نہیں

سائرہ روحی۔ جھاجھا

س۔ ہونٹوں کا تبسّم اگر سسکیوں میں بدل جائے تو؟

ج۔ جب بھی بددل نہ ہونا چاہئے ؏
زندہ ہو اگر دل تو بڑی چیز ہے غم بھی!

ڈاکٹر قلندر خاں اصغر۔ راجوری

س۔ ہمارے لیڈر افتتاحی پروگراموں میں بہت جلد حاضر ہوتے ہیں۔ لیکن فسادات اور سیلاب زدگان کو دیکھنے اتنی جلدی کیوں نہیں جاتے؟

ج۔ ہمارے لیڈر تعمیر پسند ہیں۔ اِس لئے افتتاحی تقریبوں میں جلدی پہنچتے ہیں۔ جھگڑے، فساد، سیلاب اور ایسے ہی تخریبی امور پر اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے!

س۔ اگر اودگھاٹن کے فضول اخراجات کو بچا کر مفلس و محتاج لوگوں کی مدد کی جائے تو کیا یہ قوم کی بھلائی کا کام نہ ہوگا؟

ج۔ بے شک یہ قوم کی بھلائی کا کام ہوگا لیکن اودگھاٹن جیسے اہم اور عظیم کاموں سے مفلسوں اور محتاجوں کی مدد کا کوئی مقابلہ ہے؟

آصف انصاری۔ علیگڑھ

س۔ بھائی جان! ایک حسین شعر سنائیے۔

ج۔ تیرا خیال بھیگتے لمحے سکوتِ شب
لہرا رہی ہے رُوح میں خوشبو بھری ہوا

یاسمین زیدی۔ نئی دہلی

س۔ دو خوبصورت اشعار سنائیے۔

ج۔ سُنئے ؎

آنچل میں ہواؤں کے پھر نکہتِ گیسو ہے
پھر آئینہ خانے میں لہرائی گھٹا کوئی
سمٹ کر گلستاں کی ہمہ بہاراں
لبِ نازکی پنکھڑی ہو گئی ہے

سہیل احمد۔ سری نگر۔ کشمیر

س۔ بھائی جان! یہ اشعار کس کے ہیں؟

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریبِ قسمت پر
سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر
مژہ میں روک لے آنسو کہ دل ہو آئینہ
ستارے توڑ دے اور آفتاب پیدا کر

ج۔ یہ اشعار حضرت جوش ملیح آبادی کے ہیں۔

احسان صدیقی۔ کانپور

س۔ خالقِ کائنات کی سب سے حسین تخلیق کون سی ہے؟

ج۔ پھول ـــــ عورت!!

مس یاسمین۔ لکھنؤ

س۔ بھائی جان! "یادوں" کے موضوع پر کوئی خوبصورت شعر سنایئے۔

ج۔ سُنیئے ؎

اڑتے لمحوں میں ہے خوشبو کتنی یادوں کی نہ پوچھ
ذکرِ مہر و ماہ کرکے دل کے تاروں کو نہ چھیڑ

س۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں یہ خوبصورت اشعار کس کے ہیں؟

جو محرمِ گلزارِ جہاں ہوتے ہیں
وہ اپنی لطافت کو کہاں کھوتے ہیں
ہنسنا ہو اگر ہنستے ہیں غنچے کی طرح
روتے ہیں تو شبنم کی طرح روتے ہیں

ج۔ یہ جناب نرلیش کمار شاد کی رباعی ہے۔

محمد مرتضیٰ۔ سیوان (سارن)

س۔ امیر ملک میں غریب لوگ؟

ج۔ امیر ملک میں غریب لوگ نہیں ہوتے، غریب ملک میں امیر لوگ ہیں۔

س۔ کیا زندگی زندہ دلی کا نام ہے؟

ج۔ بے شک! مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں؟

س۔ کوئی ایسا شعر سنایئے جس سے دل کا غم دُور ہو۔

ج۔ غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

ایم۔ وجیہہ الدین انجم۔ کلکتہ

س۔ سائنس کے ارتقا کی منزل؟

ج۔ ستاروں سے آگے!

س۔ لڑکیوں میں بے پردگی اور بے حیائی کا باعث سنیما ہے یا اُن کی آزاد خیالی؟

ج۔ سنیما اور مردوں کی آزاد خیالی! ــــ حضرت اکبر الہ آبادی کا یہ ارشاد آپ کو یاد نہیں ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا وہ پردہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

س۔ آج کے دَور میں سب سے خوش نصیب انسان کون ہے؟

ج۔ ہر انسان دوسرے کو خوش نصیب سمجھتا ہے۔ اِس طرح سبھی خوش نصیب ہیں۔

سیّد شبیہہ احمد بھنڈارا یڈسہہ۔ گریڈسہہ

س۔ خوشتر بھائی! روس کے وزیرِ اعظم کا اصل نام کیا ہے؟ اخباروں میں کبھی اے۔ کوسیبن چھپتا ہے اور کبھی اے۔ کوسیگن۔ سمجھ میں نہیں آتا دونوں ناموں میں کون نام صحیح ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اُن کا نام کوسیگن ہے یا کوسیبن؟

ج۔ دونوں نام صحیح ہیں۔ انگریزی اور اُردو کی بنا پر صرف تلفظ کا فرق ہے۔

موسیٰ میاں یادگیری۔ گلبرگہ شریف

س۔ کیا ہندوستان میں جمہوریت باقی ہے؟

ج۔ جی ہاں! جبھی تو سارے ملک میں لاقانونیت کا ننگا ناچ دیکھتے ہیں۔

س۔ اُردو سے اِتنی نفرت کیوں برتی جارہی ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ اُردو کو سب سے محبت ہے۔

س۔ بھیّا! میں تنہائی کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ ہمیشہ کم بولتا ہوں لیکن میرے دوست مجھے غلط سمجھتے ہیں۔ بتلایئے میں کیا کروں؟

ج۔ آپ کم بولتے ہیں۔ خاموش رہا کیجیے۔

بدنصیب۔ ناگپور

س۔ بزرگوارم! جو محسنوں کا احسان نہ مانے؟

ج۔ اُس احسان فراموش کو انسان کہنا انسانیت کی توہین ہے۔

س۔ مرد غیر ذمّے دار اور بے حس کیوں ہوتے ہیں؟

ج۔ سارے مردوں کے لئے یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔

ماہتاب عالم شاداب ویاوی۔ کلکتہ

س۔ انسان کب نادم ہوتا ہے؟

ج۔ جب کوئی بُرائی کرنے کے بعد اُس کا ضمیر جاگتا ہے۔

س۔ لوگ کسی کی بے بسی سے کیوں فائدہ اُٹھاتے ہیں؟

ج۔ سب لوگ ایسا نہیں کرتے۔ بُرے لوگ یہ کرتے ہیں اور یہ بُرے انسانوں کی فطرت ہے۔

سعیدہ خانم۔ سید آباد۔ گیا

س۔ بھیّا! زندگی میں غم ہی غم آئیں تو انھیں کیسے دُور کروں؟

ج۔ غم کو خوشی بنا کر!

مرزا جانی۔ لکھنؤ

س۔ ہندوستان میں پہلا ریڈیو اسٹیشن کب قائم ہوا؟

ج۔ ۱۹۲۴ء میں۔

نیاز محمد انصاری۔ پٹنہ

س۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں، اسرائیل میں کتنے یہودی ہیں اور مصر میں کتنے عرب ہیں؟

ج۔ اسرائیل میں ۲۰ لاکھ یہودی ہیں۔ مصر میں ۸ کروڑ عرب ہیں۔

انصاری۔ راوڑکیلا
س۔ عورتوں میں بڑھتی ہوئی عریانیت کا علاج؟
ج۔ مردوں کی عریانیت پسندی کی اصلاح!
س۔ دوسرے ممالک چاند پر جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہندوستان کیا کر رہا ہے؟
ج۔ پستی کی طرف گامزن ہے۔

سورج کرن سہرجی
س۔ انسان کی تباہی کا اصل سبب کیا ہے؟
ج۔ انسانیت سے روگردانی! انسانیت کی قدروں کا احترام نہ کرنا!
س۔ شکیل کا کوئی شعر سنائیے۔
ج۔ گلوں کے رُخ پہ وہی تازگی کا عالم ہے
نہ جانے ان کو غمِ روزگار کیوں نہ مِلا

خلیل احمد دیشمکھ چوپڑا (جلگاؤں)
س۔ بھائی صاحب! بچپن سے میری فطرت میں مایوسی رچ بس گئی ہے۔ جو بھی قدم اُٹھاتا ہوں ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملتا کیا کروں؟
ج۔ زندگی آموز و حیات افروز تحریریں پڑھئے۔

مس شہناز۔ لائل پور (پاکستان)
س۔ ہند و پاک کی حالیہ آویزش کے بعد پاکستان کے عوام کے لئے آپ کے جذبات؟
ج۔ نہایت پُر خلوص ہیں۔

عبدالخالق سہاروی
س۔ بڑے بھائی! آپ کو مذہب سے بھی دلچسپی ہے؟
ج۔ بے شک! مذہب سب سے بہتر نظامِ حیات ہے۔

س۔ اِسلام کیا ہے؟
ج۔ بہت اچھا دین۔ بہت اچھا نظامِ حیات۔

یار احمد۔ نرائن پور۔ پورنیہ
س۔ کوئی انسان بامِ ترقی پر کب پہنچ سکتا ہے؟
ج۔ جب اُس کے لئے جدّوجہد کرتا ہے۔
س۔ جب عروج کے بعد زوال لازمی ہے تو سائنس جو اتنی ترقی کر گئی ہے، اِس کا زوال کب آنے والا ہے؟
ج۔ ابھی تو سائنسدان چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مشرف علی آرزو۔ نصر الدّین لائن۔ رانچی پل
س۔ کیا ٹیڈی پینٹ پہننا حکومت کی نظر میں جُرم ہے؟
ج۔ حکومت کو کیا پڑی کہ کسی کے لباس کی یا اُس کے ننگا رہنے کی پرواہ کرے!
س۔ زندگی کا کون سا لمحہ اچھا ہے؟
ج۔ جو سکون سے گُزرے۔
س۔ ساری زندگی دُکھ میں بسر ہو تو خوشی کی زندگی کب ملے گی؟
ج۔ جب آپ دُکھ کو سُکھ اور غم کو خوشی بنا لیں گے۔

محمد ابراہیم صدّیقی۔ الہ آباد
س۔ آج کی تعلیم اور کل کا تجربہ ــــ کون بہتر ہے؟
ج۔ دونوں کا امتزاج!
س۔ شہد کی تلخی کے بجائے لوگ زہر کی مٹھاس کو کیوں برداشت کر لیتے ہیں؟
ج۔ تاکہ آپ جیسے لوگوں کے لئے ایک سوال بن جائے!

ہدایت علی ساحل۔ جھمری تلہ
س۔ انسان کو حُسن سے زیادہ لگا[ؤ] دولت سے؟
ج۔ دولت سے! جس سے حُسن بھو ہے۔
س۔ دولت اور محبت میں کس کا درجہ بلند
ج۔ آج کے دور میں دولت سب پر فوقیت

خورشید سکندر۔ واسع پور۔ دھ
س۔ جوانی میں ہر لڑکی خطرناک کیوں ہے؟
ج۔ یہ اپنے اپنے ذوق، اپنی اپنی نظر کی بات لڑکی بچپن میں خطرناک ہوتی ہے نہ جو
س۔ مرد جسم ہے اور عورت رُوح ــــ تک صحیح ہے؟
ج۔ یہ سو فیصدی صحیح ہے۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی ــــ مطبوعہ: دلّی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائیٹل و تصاویر: براڈشا پریس صدر بازار دہلی ــــ پتہ: دفتر بیسویں صدی دریا

ڈکشنریاں صنعت و حرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

بیسویں صدی کی کشیدہ کاری	کرشنا کماری ایم-اے	چار روپے
زینت کشیدہ کاری	زینت کوثر	پانچ روپے ۵۰ پیسے
شمع " "	"	چار روپے ۵۰ پیسے
رشیدکی " "	رشیدہ خاتون	تین روپے ۵۰ پیسے
دُلہن " "	زینب انور	دو روپے ۵۰ پیسے
حسین " "	"	دو روپے ۵۰ پیسے
شبنم " "	قدسیہ انور	ایک روپیہ
قدسیہ " "	"	ایک روپیہ
کامیاب درزی خانہ	زینب انور	دو روپے
تکیہ کے اشعار	مشرف بانو غفران	دو روپے
زینت کروشیا ڈیزائن بک	زینت کوثر	پانچ روپے

انگریزی اُردو میں اپنی قابلیت بڑھایئے

اُردو انگریزی کی کامیاب ترین ڈکشنریاں

جیبی پاکٹ ڈکشنری	انگریزی سے اُردو ہندی	چار روپے
مصباح اللغات		بیس روپے
اردو ہندی ڈکشنری		بیس روپے
کریم اللغات	مولوی کریم الدین	دو روپے ۲۵ پیسے
اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری	عبدالحق	بیس روپے
اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری	"	بارہ روپے
لغات کشوری	نول کشور	نو روپے
جامع اللغات		دو روپے ۵۰ پیسے
جیبی آکسفورڈ ڈکشنری	انگریزی سے اُردو ہندی	تین روپے
اُردو ادبی لغت		آٹھ روپے
فیروز اللغات جدید کلاں		چوبیس روپے
فرہنگ عامرہ		سات روپے ۵۰ پیسے
فیروز اللغات عکسی خورد		چھ روپے ۵۰ پیسے

صنعت و حرفت

الیکٹریکل انجینئرنگ بک	نریندر ناتھ	بارہ روپے
الیکٹرک گائڈ (نیا ایڈیشن)	"	آٹھ روپے
الیکٹرک وائرنگ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
موٹر کار وائرنگ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
بوٹ پالش سازی	"	دو روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک لائٹنگ	"	چھ روپے
بغیر بجلی کا ریڈیو		ایک روپیہ
تجارتی مُرغی خانہ		دو روپے
آئل و گیس انجن گائڈ	"	دس روپے
آئل انجن گائڈ	"	چھ روپے
رہنمائے بجلی	"	تین روپے ۵۰ پیسے
وائرلیس ریڈیو گائڈ	"	چھ روپے
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو مکینک)	"	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
ٹانکا لگانے کا ہنر	"	دو روپے ۵۰ پیسے
چھوٹے ڈائنمو الیکٹرک ٹرز بنانا	"	تین روپے ۵۰ پیسے
پریکٹیکل آرمیچر وائنڈنگ (اے سی۔ڈی سی)		سات روپے ۵۰ پیسے
ریفری جریٹر گائڈ	نریندر ناتھ	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
ریڈیو ریسیور	"	تین روپے
ٹرانسفارمر گائڈ		چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک موٹرز	"	آٹھ روپے
خراد شکشا یعنی ٹرنر گائڈ	"	تین روپے
ورکشاپ گائڈ (فٹر ٹریننگ)	"	تین روپے
خراد اور ورکشاپ گیان	"	چھ روپے
پریکٹیکل گھڑی سازی	رام اوتار	چار روپے ۵۰ پیسے
سائیکل ریپئرنگ	"	دو روپے ۵۰ پیسے

خانہ داری

عصمتی دسترخوان	آمنہ نازلی	تین روپے
رضیہ کا دسترخوان	رضیہ سلطانہ تمین	دو روپے ۵۰ پیسے
رنگ سازی	پروفیسر نریندر ناتھ	دو روپے ۵۰ پیسے
پلاسٹک گائڈ	"	دو روپے ۵۰ پیسے
اپٹوڈیٹ بوٹ پالش ساز	"	دو روپے ۵۰ پیسے
اپٹوڈیٹ اِنک ماسٹر / روشنائیاں بنانا	"	دو روپے ۵۰ پیسے
کنفیکشنری (انگریزی مٹھائیاں بنانا)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
ہیر آئل (خوشبودار تیل)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
بیکری بہار (بسکٹ ڈبل روٹی کیک)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
پینٹری کا کام	"	چار روپے ۵۰ پیسے
فنِ مصوری (چتر کاری)	"	چار روپے ۵۰ پیسے
پرفیومری ماسٹر	"	دو روپے ۵۰ پیسے
وارنش ماسٹر (وارنش سازی)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
آتش بازی کا کاروبار	"	دو روپے ۵۰ پیسے
اچار، مربہ، چٹنی	چھبی رانی گپتا	دو روپے ۵۰ پیسے
حلوائی ماسٹر	چندر بھان سہگل	دو روپے ۵۰ پیسے
تمباکو کا کاروبار (تمباکو کی دوکان)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
پان کی دوکان	"	دو روپے ۵۰ پیسے
فائن ٹیلر ماسٹر	"	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
انڈو یوروپین ککری بک / دیسی انگریزی کھانے	کالی چرن	چار روپے
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں	"	دو روپے ۵۰ پیسے
موم بتی کا کاروبار	"	دو روپے ۵۰ پیسے
ڈیری فارمنگ	"	چار روپے

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج ، دھلی نمبر ۶

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 690/57

BISWIN SADI

33rd. YEARS OF PUBLICATION

Telephones Office, 271637 Residence, 619927

مئی

بیسویں صدی



Rs 1.25

Biswin Sadi
DELHI



گُلستاں میں جا کر ہر اِک گُل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بُو ہے

فوٹو:۔ روشن لال وششٹ۔ جے پور

میرزا غالب نئی دہلی میں ــــــــ



غالب اکیڈمی دِلّی کی پانچ اہم مطبوعات کی اشاعت کا افتتاح صدرِ جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔ غالب اکیڈمی کے رُوحِ رواں الحاج جناب حکیم حافظ عبدالحمید یہ کتابیں اُس عظیم المرتبت ہستی کو پیش کر رہے ہیں جن کی غالب شناسی اور غالب پرستی محتاجِ تعارف نہیں۔ کلامِ غالب کے اِس حقیقی مبصر ہی کی کوششوں سے دیوانِ غالب باتصویر پہلی بار جرمنی میں اپنی لازوال رعنائیوں کے ساتھ شائع ہوا ہے



اِس تقریب کے موقع پر اکیڈمی کی پانچوں مطبوعات کا ایک سیٹ سابق وزیرِ تعلیم ڈاکٹر ترگنا سین کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ترگنا سین ایسے باعمل اور مخلص کانگرسی ہیں جن پر غالب ہی کا یہ مصرع صادق آتا ہے کہ ع ــــ سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں ــــ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا نہ کوئی بینک بیلینس ہے نہ ذاتی مکان ہے



مرزا غالب کی صدسالہ یادگاری تقریبات کے سلسلے میں غالب اکیڈمی کے قیام پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے "انسٹی ٹیوٹ آف پیپلز آف ایشیا ماسکو" کے ڈائرکٹر باباجان غفوروف نے صدرِ غالب اکیڈمی جناب حکیم عبدالحمید صاحب کو سمرقند کا وہ لباس پہنایا جو مرزا غالب کے دادا کے زمانے میں سمرقند میں پہنا جاتا تھا۔ اِس لباس میں بھی حکیم صاحب کو دیکھ کر ہم تو یہی کہیں گے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من اندازِ قدت را می شناسم



میرزا غالب کی صدسالہ تقریبات کے موقع پر اِس "عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ" سے اظہارِ عقیدت کرنے کے لئے مُلک بھر کے اُدبا، اکابر اور سیاست داں دِلّی میں جمع ہوئے۔ بہت سے دوسرے ممالک روس، امریکہ، انگلینڈ، اٹلی، جرمنی، یوگوسلادیہ، ایران، پاکستان وغیرہ میں بھی غالب کی برسی اگرچہ دھوم دھام سے منائی گئی. لیکن غالب کے شہر میں اِس کا تزک و احتشام اپنا جواب آپ ہی تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُردو کی کس مپرسی کے پیشِ نظر روحِ غالب فریاد کر رہی تھی کہ ؎

ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں، "بولیں"، گے کیا

فیض احمد فیض بمبئی میں



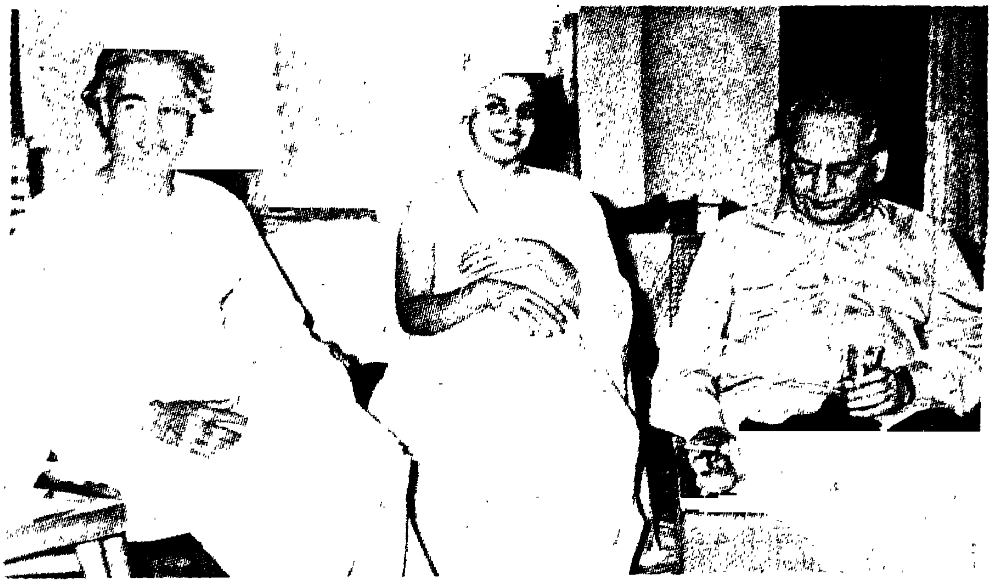
پچھلے دنوں اُردو کے تاریخ ساز شاعر جناب فیض احمد فیض پاکستان سے بمبئی تشریف لائے تو ایشیا کے عظیم فن کار جناب کرشن چندر نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ اپنی بیماری کے بعد کرشن جی کی فیض صاحب سے یہ پہلی ملاقات ہے۔ اِن تینوں کی گذشتہ ملاقات گذشتہ سال ماسکو میں ہوئی تھی۔ اس تجدیدِ ملاقات پر فیض، کرشن اور سلمیٰ صدیقی کے چہرے دفورِ مسرت سے گلاب کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ شاید تینوں ہی محسوس کر رہے ہیں کہ ؎

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا   بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے



شعر و شاعری اور قہقہہ بار پھلجھڑیوں کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ ادیبوں اور شاعروں کے اِس جھرمٹ کی پہلی رَو میں نظر آ رہے ہیں سلمیٰ صدیقی، مسز لوکوچوف، کرشن چندر، جاں نثار اختر اور ظ۔ انصاری اور پچھلی قطار میں ایستادہ ہیں ساحر لدھیانوی، مسٹر لوکوچوف، معین اختر، مہندر ناتھ، خواجہ احمد عباس اور مسٹر اکولوف۔ ادیبوں کے چہروں کی مسکراہٹ بین الاقوامی اُخوّت کی ترجمان ہے اور اِس حقیقت کا روشن ثبوت ہے کہ ؎

ادب ادب ہے ادب کا نہیں کوئی مذہب



فیض احمد فیض جام بدست لیکن کسی سوچ میں کھوئے ہوئے ہیں۔ سلمیٰ صدیقی اور علی سردار جعفری تبسم بلب فوٹوگرافر کو دیکھ رہے ہیں۔

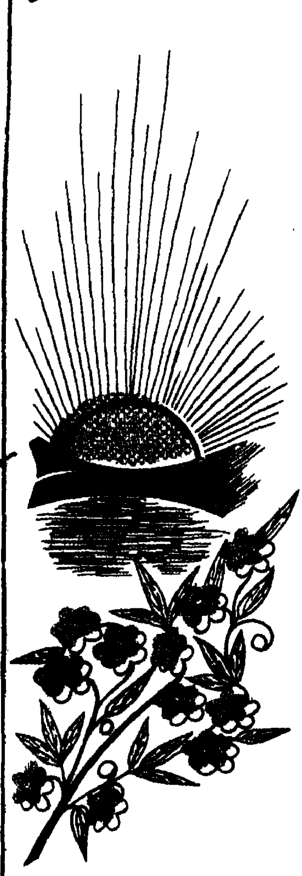


فیض کی آمد پر سلمیٰ صدیقی نے بمبئی کے دو مشہور شاعروں اور فیض کے دوستوں کیفی اعظمی اور مجروح سلطانپوری کو بھی اپنے یہاں مدعو کیا۔ تینوں مہمان شاعروں کے سگریٹ پینے کا مختلف انداز، میزبان افسانہ نگار حیرت اور دلچسپی سے کچھ اس طرح دیکھ رہی ہے کہ اس شعر کی تفسیر بن کر رہ گئی ہے ؎

آئے ہیں اس مقام پہ اب اُن کے حیرتی بیٹھے ہیں خود وہ دیدۂ حیراں لئے ہوئے

مئی ۱۹۶۹ء

ٹیلیفون دفتر ——— ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ——— ۶۱۹۹۲۷



تیر و نشتر

خوشتر گرامی



ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

• "پنجاب میں کونسل توڑ دی جائے گی"۔ ایک خبر ——— اِس لئے ممبرانِ کونسل دفتر روزگار میں نام درج کرالیں۔

• "مرارجی ڈیسائی نے استعفے کی دھمکی دی"۔ ایک خبر ——— نیک کام میں دیر نہ ہونی چاہئے۔

• "گورنر بہار کی دِلّی میں آمد" ——— یعنی دِلّی میں بہار آگئی۔

• "دِلّی میں طلباء کے لئے الگ ریڈیو اسٹیشن قائم کیا جائے گا"۔ ایک خبر ——— تاکہ طلباء ہڑتالوں، جلسوں، مظاہروں کا پروگرام نشر کرسکیں ٹیچروں اور پروفیسروں کے خلاف پرچار کرسکیں ——— اور امتحانوں کے پرچوں کے جوابات نشر کرسکیں۔

• "اردو میں حلف لینے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں گے"۔ شریمتی اندرا گاندھی ——— ؏

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

• "دِلّی میں دودھ کے بھاؤ میں اضافے پر کارپوریشن میں ہنگامہ اور واک آوٹ"۔ ایک خبر ——— دودھ پینے والے مجنوؤں کی پریشانی کا مظاہرہ۔

• "جون میں انسان کو چاند پر اُتارا جائے گا"۔ ایک خبر ——— وہاں اُترتے ہی اُس کا جون بدل جائے گا۔

• مہاراشٹر کانگریس کی طرف سے شیو سینا کی مذمت؟ ——— شاندار زبانی جہاد۔



شری چندر شیکھر کے مرار جی ڈیسائی پر سنگین الزامات

"چین ایک دو نہیں ایشیا کے کئی دیشوں کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے" ایک عنوان ——— اسی لئے اژدہا اُس کا قومی نشان ہے۔

"پنجاب کے غذائی پروگرام کے لئے سوا کروڑ روپے کی رقم۔ آٹھ لاکھ خاندانوں کو فائدہ پہنچے گا" ایک خبر ——— اور یہ خاندان وزیروں، امیروں، کارخانہ داروں، جاگیرداروں، صنعت کاروں، سرمایہ داروں اور ممبرانِ اسمبلی، اُن کے بھائی بھتیجوں پر مشتمل ہوں گے۔

"ہریانہ میں بکری ٹیکس کو آسان بنایا جائے گا" ایک خبر ——— اور بھیڑ ٹیکس، بیل ٹیکس، کُتا بلی ٹیکس کا کیا ہوگا؟

"چین کی طرف سے پھر پاکستان کو کشمیر کے سلسلہ میں ہند کے خلاف امداد دینے کے لئے یقین دہانی" ایک عنوان ——— کہا ہوگا۔ چڑھ جا بچہ سُولی بھگوان بھلی کرے گا۔

"پردیشوں کو زیادہ مالی اختیارات دینے سے مرار جی ڈیسائی کا انکار" ——— اِس لئے کہ پھر اُن کی کیا قیمت رہ جائے گی۔

"جہالت کی انتہا" ایک عنوان ——— کہ اکثریت میں ہو کر جن سنگھی ہندو دھرم کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

"شیو سینا کے ہتھکنڈے کچل دئے جائیں گے" گورنر کا ایڈریس ——— سچ ہے ——— جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔

"ملک میں جعلی نوٹوں کی بھرمار" ایک عنوان ——— سیاسی میدان میں جعلی سیاستدانوں کی بھرمار کا نتیجہ۔

"سکھ ہوم لینڈ کا مطالبہ قوم دشمنی" ایک عنوان ——— نہ صرف قوم دشمنی بلکہ سکھ دشمنی بھی۔

"دِلّی میٹروپولیٹن کونسل کو توڑنے کا مطالبہ" ایک خبر ——— توڑ پھوڑ کا دَور جو ہوا۔

"یو۔پی میں چھٹی سے آٹھویں تک جنوبی ہند کی زبانوں کی تعلیم لازمی ہو گئی" ایک خبر ——— اور یو۔پی کی اپنی زبان اُردو میں اِس کے بولنے والوں کو حلف تک لینے کی اجازت نہ ہوگی۔

"پروٹسٹ کا انوکھا طریقہ۔ سر مُنڈوا کر جلوس نکالا" ——— اِس پر اولے بھی پڑ جاتے تو پروٹسٹ کامیاب ہوتا۔

"روس کا ہریانہ کو جوتوں کا آرڈر" ایک خبر ——— پنڈت سری رام شرما، چودھری دیوی لال، پنڈت بھگوت دیال، راؤ بیریندر سنگھ اور چودھری بنسی لال کو بہت پڑتے رہے ہیں۔ سب کو سمیٹ کر روس بھیج دو۔ خوب زرِ مبادلہ ملے گا۔

"آر۔ ایس۔ ایس ہندو دھرم کی رکھشا کرنا چاہتا ہے" گول واکر ——— دوسروں کی رکھشا کو خطرے میں ڈال کر جو ہندو دھرم کی بدنامی کا موجب ہوتی ہے۔

ایک عنوان ——— میسور اسمبلی کے اندر دھرنا۔
دوسرا عنوان ——— راجستھان اسمبلی کے باہر دھرنا۔
راجستھان کے وزیرِ اعلیٰ میسور کے وزیرِ اعلیٰ کو ٹیلیفون کریں ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گُل پکار میں چلّاؤں ہائے دل

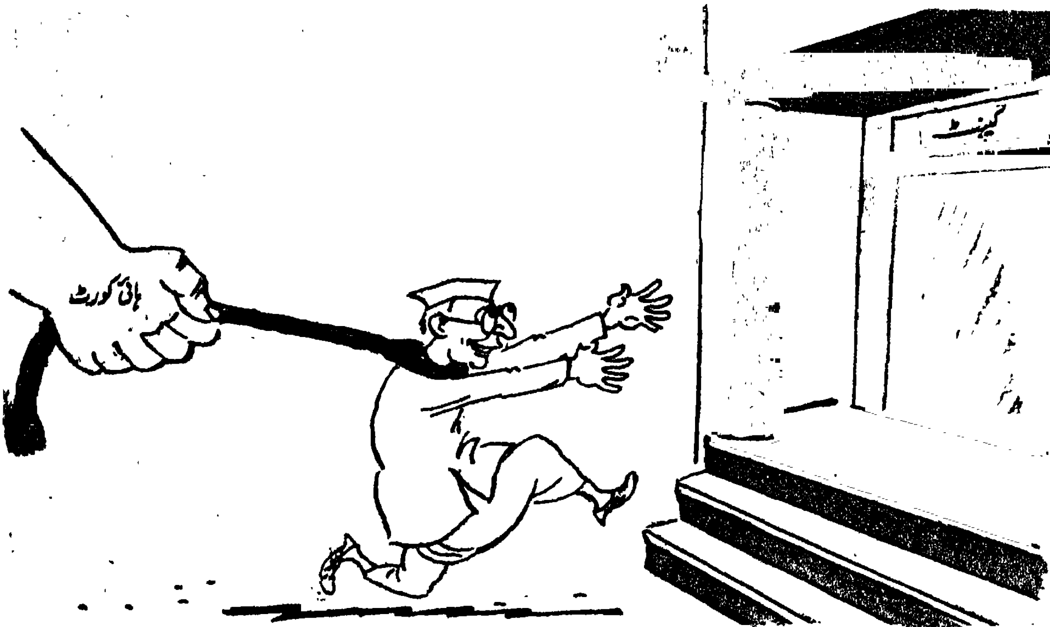
"کانگرس کے لئے کولیشن سسٹم ناگزیر ہو گیا ہے" پاٹل کا بیان ——— ہارے ہوئے لیڈروں کو ٹکٹ دینا تو پہلے ہی ناگزیر ہو گیا تھا۔

"مرکز میں بھی کانگرس کا بستر گول ہوگا" باجپائی کی پیشگوئی ——— جس طرح حالیہ انتخابات میں جن سنگھ کا ہوا ہے۔

چراغ تلے اندھیرا



نشہ بندی کے علمبردار مرارجی ڈیسائی نے شراب پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا۔



مدھیہ پردیش ہائی کورٹ کا مصرا کے خلاف فیصلہ۔ مصرا کی وزارت بنانے کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔

"بجٹ تجاویز کا قبل از وقت انکشاف" ایک سنگین الزام —— کیا اِس کی ذمہ داری بھی مرارجی ڈیسائی کے بیٹے کانتی ڈیسائی پر ڈالو گے؟

"نرودھ کا استعمال بطور غبارہ" ایک عنوان —— ہندوستان کی سائنسی دریافت۔

"نقلی ممبر پارلیمنٹ کی شناختی پریڈ" ایک خبر —— کیا اسپیکر سے کرائی تھی؟

"نائب وزیرِ اعظم کی کوٹھی پر جن سنگھی ورکروں کا دھرنا" ایک خبر —— کیا انھیں جن سنگھ میں شامل کرنے کے لئے؟

"جن سنگھ کے اعلانوں کا پول" ایک عنوان —— کھُل گیا اور ڈھول کا پول ثابت ہوا۔

"فوجی تیاری کے کام میں ابھی ڈھیل کا وقت نہیں آیا" وزیرِ دفاع شری چوہان کا بیان —— اِس لئے کہ ابھی چین سے نیفا اور لداخ کے علاقے خالی نہیں کرائے جا سکے۔ جن کو آپ نے مسٹر مینن کی جگہ وزیرِ دفاع بنتے وقت خالی کرانے کا وعدہ کیا تھا۔

"کسی ممبر کو اس کی مادری زبان میں حلف لینے کی اجازت نہ دینا خود ہندی کو نقصان پہنچانا ہے" اسپیکر سنجیوا ریڈی —— اور یو۔پی میں اِس 'خدمت' کو بعض کوتاہ نظروں نے ہندی کی خدمت اور ایک فاتحانہ اقدام سمجھا۔

"ہریانہ وزارت میں توسیع کی جائے گی" ایک خبر —— تاکہ چودھری بنسی لال چین کی بنسی بجاتے رہیں۔

"بمبئی میں بازاری مجنوؤں کی دُرگت" ایک خبر —— لیلیٰ مسکرا کر رہ گئی ہوگی۔

• ایک وزیر جن کا کوئی گھر نہیں " ایک خبر ——— مرزا غالب کی طرح ——— بے در و دیوار سا۔

• "روس چین کے خلاف ایٹمی ہتھیار استعمال نہیں کرے گا" ایک عنوان ——— اس لئے کہ روس ایک امن پسند قوم ہے۔

• "کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ایک دوسرے کے خلاف الزامات کی ممانعت کر دی" ایک خبر ——— البتہ ایک دوسرے کے خلاف سازش کی اب بھی اجازت ہے۔

• "پنجاب کے مجاہدینِ آزادی کے بارے میں کتاب" ——— پرانا موضوع ہے۔ اب تو دل بدلوں کے بارے میں کتاب ہو تو دھڑا دھڑ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو۔

• "ایک وزیر کا استعفیٰ" ——— ؎
خس کم جہاں پاک

• "بھٹنڈہ جن سنگھ کے نائب صدر کو بلا ٹکٹ سفر کرنے پر پندرہ دن کی جیل کی سزا" ——— دوسرے پولٹیکل کارکن ؎
دیکھیں انھیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

• "حکومت دباؤ کے آگے نہ جھکے گی" ایک عنوان ——— کیا ضرورت ہے۔ اب توڑ جوڑ سے کام نکل جاتا ہے۔

• "کشمیر اسمبلی میں راشٹریہ سنگھ کو رگڑے" ——— اس کے اینٹی مسلم رویّہ اور ہندو راج کے نعرے پر۔

• "ہندوستان کے لئے ایٹمی چھتری" ایک عنوان ——— جو گرمی یا برسات میں کام نہ آسکے گی۔

• "ٹیکسی ڈرائیور کے قتل کا سراغ مل گیا" ایک خبر ——— لیکن قاتل ———؟

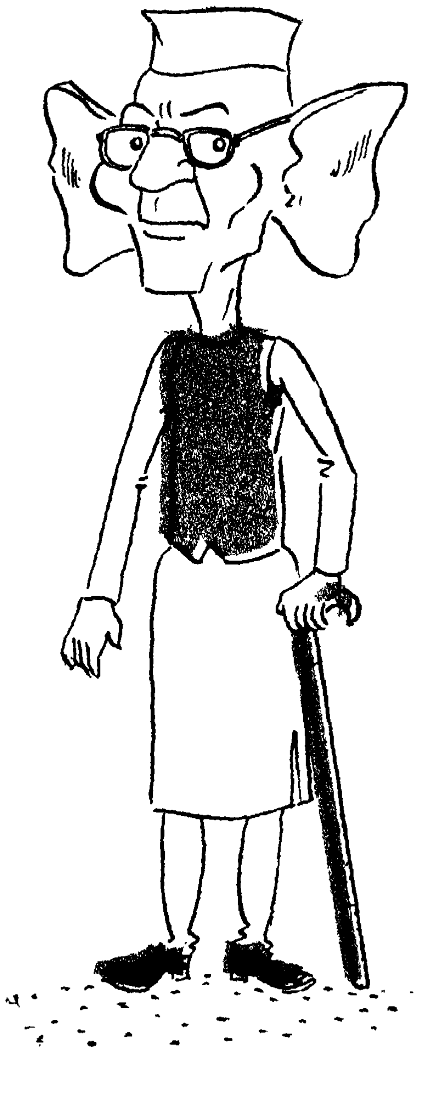


صادق اور سید میر قاسم کے اختلافات

مرارجی ڈیسائی

خوشتر گرامی

لمبا قد رنڈ جیسا اور اسی کی طرح بے فیض، بڑی بڑی آنکھیں۔ لحاظ اور مروّت سے ناآشنا۔ لمبی اونچی ناک جو ہر روز کٹ کر بھی بدستور قائم ہے۔ بڑے بڑے ہاتھی کی طرح جھولتے ہوئے کان۔ جن میں غریبوں کی آواز نہیں پہنچتی۔ کتابی چہرہ مگر کتاب دشمن۔ اسی لئے کتابوں رسالوں پر ٹیکس لگایا ہے۔ کھدر کا کرتا پاجامہ۔ کھدر کی واسکٹ ——— تن گورا۔ من کالا۔ بگلے کا سا بھوگ۔ یہ ہیں پارلیمنٹ کے شہرت یافتہ اور اخباروں کی سرخیوں کے اجارہ دار، کانتی لال ڈیسائی کے والد اور ہم پر مسلّط بحیثیت نائب وزیرِ اعظم ———



شری مورارجی ڈیسائی

سوشلسٹ کھال میں سرمایہ داروں کی رُوح۔ ہٹ دھرمی، دھرم۔ میں نہ مانوں، چلن ——— بمبئی میں دال نہ گلی اور وہاں بغاوت کے پرچم لہرانے لگے تو پنڈت جواہر لال جی نہرو ازراہِ مروّت مرکز میں لائے مگر یہاں اِن کے لئے عذاب ہوا اُن کے سوشلزم کے خواب کی راہ میں دیوار بن گئے اور اب اُن کی بیٹی کی پریشانیوں کا موجب ——— کئی بار وزارتِ عظمٰی کا خواب دیکھا مگر غنچۂ اُمید نہ کِھلا۔ پدر نتواند پسر تمام کُند کے عامل۔ جو کام خود نہیں کرتے، اُن کا سہرا فرزندِ ارجمند کانتی ڈیسائی کے سر ہوتا ہے ——— زبان پر گاندھی جی کا عمل سے گاندھی ازم سے غدّاری۔ کتابوں رسالوں پر ٹیکس لگے جس سے علم کے پیاسے ترسیں۔ شراب پر ٹیکس نہ لگائیں۔ جام پر جام لنڈھائیں ——— اور یہ پھر بھی نشہ بندی کے کہلائیں۔ کاش کوئی اِن سے پوچھے کہ

شرم تم کو مگر نہیں آتی

طنزیہ

تلاش، ایک مکان کی

سلمیٰ صدیقی ایم۔ اے

گورو نواس، نفٹیتھ روڈ، کھار، بمبئی نمبر ۵۲

محترم بھائی خوشتر صاحب! خلوص و احترام

"بیسویں صدی" کے لئے ایک ہلکا پھلکا طنزیہ بھیج رہی ہوں۔ دیکھئے کیسا ہے۔ یہ ایسی کہانی ہے جو بہتوں کو اپنی ہی کہانی معلوم ہوگی . . .

آپ کی بہن ——— سلمیٰ

★

میں جب نئی نئی اُس شہر میں رہنے کے لئے گئی تو پتہ چلا کہ بڑے شہروں کی طرح اب چھوٹے شہروں میں بھی مکان ملنے میں دِقّت پیش آنے لگی ہے۔ ہم لوگ ایک رشتے دار کے گھر ٹھہر گئے اور روزانہ صبح سے شام تک طرح طرح کے مکان دیکھنے جاتے رہتے تھے۔ مکان کی تلاش میں عجیب و غریب قسم کے مکانوں ہی سے نہیں، عجیب و غریب طرح کے مالک مکانوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ کہیں مکان اچھا ہوتا تھا تو مالک مکان چہرے مُہرے سے نادر شاہ اور چنگیز خاں کے خاندان کے قریبی فرد نظر آتے تھے۔ کہیں مالک مکان انسان نُما نظر آتے تھے تو مکان موہنجو داڑو اور ہڑپّا سے ٹکّر لیتا نظر آتا تھا۔ کہیں مالک مکان اور مکان دونوں ہی غنیمت ہوتے تو وہ محلّہ ایسا نظر آتا تھا جہاں دُور دُور تک کھلنڈرے بچّوں اور بازاری کُتّوں کی حکومت نظر آتی تھی۔ کہیں مالک مکان نیک نظر آتا تو مالکن نیک بخت نہ ہوتیں۔ کہیں مالکن ٹھیک ہوتیں تو مالک مکان شائی لاک قسم کے ثابت ہوتے۔ غرضیکہ مکان ڈھونڈنا ایک پرابلم بن گیا تھا اور ہم اپنے میزبانوں کے لئے بھی ایک مصیبت بنتے جارہے تھے۔ آخر مجبور ہوکر ایک ہوٹل میں بسیرا کیا تو پتہ چلا کہ عنقریب وہ ہوٹل بھی بند ہونے والا ہے۔ مکان کے سلسلے میں اخباروں کے اشتہار پڑھتے تو ہوش اُڑ جاتے۔ ایسی ایسی کڑی شرطیں اُس میں ہوتیں کہ ہم تو ہم ہماری آنے والی سات پُشتیں بھی اُن آزمائشوں میں پُوری نہ اُتر سکتی تھیں۔ کوئی مالک مکان اپنے مکان میں کنوارے کو رکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ کوئی بیاہے کو رکھنے سے انکاری تھے۔ کوئی پنجاب سے خار کھائے بیٹھے تھے تو کوئی یو۔پی پر اُدھار کھائے رہتے تھے۔ کوئی صرف برہمن کی تلاش میں تھے۔ کوئی صرف پارسی کے حوالے اپنا مکان کرسکتے تھے۔ کوئی بچّوں والے کرائے دار کے حق میں تھا اور کوئی بچّوں کی پُوری قوم سے بیزار تھے اور ہر دم اِس بات پر کُڑھتے رہتے تھے کہ آخر بچّوں کا مصرف کیا ہے؟ اگر دُنیا میں بچّوں کی جگہ صرف بڑے ہی بھیجے جاتے تو قانونِ قُدرت میں کون سا فرق پڑ جاتا۔ کوئی صاحب، مکان تو پُورا کرائے پر دینے کو تیار تھے۔ لیکن گھر کا اکلوتا غُسل خانہ صرف اپنے ہی قبضے میں رکھنا چاہتے تھے۔ کوئی صاحب غُسل خانہ دیتے تھے تو دوسرے کمروں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ ایک مالک مکان کو ریڈیو کی آواز سے نفرت تھی تو دوسرے کلاسیکل موسیقی کے عاشق تھے اور ہر دم تان لگاتے رہتے تھے۔ ایک مالک مکان عورت سے بیزار تھے۔ دوسرے عورت پر ضرورت سے زیادہ مہربان نظر آتے تھے۔ ایک صاحب صرف سبزی کھانے والوں کو اپنا کرایہ دار رکھتے تھے۔ دوسرے کو ایسا کرائے دار درکار تھا جو کم سے کم ایک بکرا دن میں ہضم کرسکتا ہو۔ ایک صاحب کو شراب سے نفرت تھی۔ دوسرے اِسی کا ناجائز دھندہ کرتے تھے۔

وہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ شب و روز مکان کی تلاش جاری تھی۔ دن کو طرح طرح کے مکان دیکھتے دیکھتے یہ حالت ہوگئی تھی کہ رات کو خواب میں بھی طرح طرح کے مکان نظر آنے لگے تھے۔ گو وہ خواب بہت پیارے ہوتے تھے۔ اُن خوابوں میں کچھ ایسا ہوتا تھا کہ مالک مکان تو انتہائی عاجزی اور اصرار سے مکان ہمارے حوالے کرتے تھے۔ لیکن ہم بڑی نخوت اور غرور سے اُن کی درخواست ٹھکرا دیتے تھے۔ ایک خواب میں تو سچ کہتی ہوں کہ چاہے آپ کو یقین آئے چاہے نہ آئے،

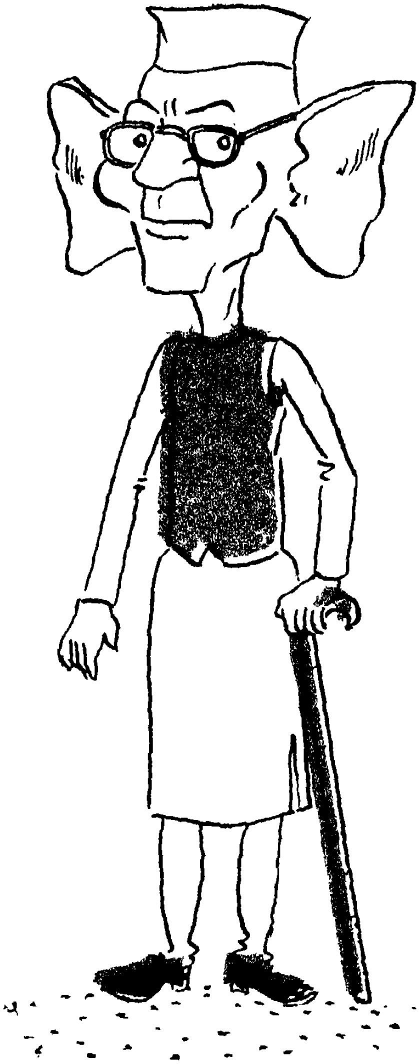
مرارجی ڈیسائی

خوشتر گرامی

لمباقد رنڈ جیسا اور اُسی کی طرح بے فیض، بڑی بڑی آنکھیں۔ لحاظ اور مروّت سے ناآشنا۔ لمبی اونچی ناک جو ہر روز کٹ کر بھی بدستور قائم ہے۔ بڑے بڑے ہاتھی کی طرح جھولتے ہوئے کان۔ جن میں غریبوں کی آواز نہیں پہنچتی۔ کتابی چہرہ مگر کتاب دشمن۔ اِسی لئے کتابوں رسالوں پر ٹیکس لگایا ہے۔ کھدر کا کُرتا پاجامہ۔ کھدر کی واسکٹ ——— تن گورا۔ من کالا۔ بگلے کا سا سجوگ۔ یہ ہیں پارلیمنٹ کے شہرت یافتہ اور اخباروں کی سُرخیوں کے اجارہ دار، کانتی لال ڈیسائی کے والد اور ہم پر مسلّط بحیثیت نائب وزیرِ اعظم ———

[illegible]

سوشلسٹ کھال میں سرمایہ داروں کی رُوح۔ ہٹ دھرمی، دھرم۔ میں نہ مانوں، چلن ——— بمبئی میں دال نہ گلی اور وہاں بغاوت کے پرچم لہرانے لگے تو پنڈت جواہر لال جی نہرو ازراہِ مروّت مرکز میں لائے مگر یہاں اِن کے لئے عذاب اور اُن کے سوشلزم کے خواب کی راہ میں دیوار بن گئے اور اب اُن کی بیٹی کی پریشانیوں کا موجب ——— کئی بار وزارتِ عظمیٰ کا خواب دیکھا مگر غنچۂ اُمید نہ کِھلا۔ پدر نتواند پسر تمام کند کے عامل۔ جو کام خود نہیں کرتے، اُن کا سہرا فرزندِ ارجمند کانتی ڈیسائی کے سر ہوتا ہے ——— زبان پر گاندھی جی کا نام۔ عمل سے گاندھی ازم سے غدّاری۔ کتابوں رسالوں پر ٹیکس لگائیں۔ جس سے علم کے پیاسے ترسیں۔ شراب پر ٹیکس نہ لگائیں۔ شرابی جام پر جام لنڈھائیں ——— اور یہ پھر بھی نشہ بندی کے علمبردار کہلائیں۔ کاش کوئی اِن سے پوچھے کہ



طنزیہ

تلاش، ایک مکان کی

سلمیٰ صدیقی ایم۔ اے

گورونواس نفشیتھ روڈ۔ کھار، بمبئی نمبر ۵۲

محترم بھائی خوشتر صاحب! خلوص و احترام

"بیسویں صدی" کے لئے ایک ہلکا پھلکا طنزیہ بھیج رہی ہوں۔ دیکھئے کیسا ہے۔ یہ ایسی کہانی ہے جو بہتوں کو اپنی ہی کہانی معلوم ہوگی . . .

آپ کی بہن ——— سلمیٰ

★

میں جب نئی نئی اُس شہر میں رہنے کے لئے گئی تو پتہ چلا کہ بڑے شہروں کی طرح اب چھوٹے شہروں میں بھی مکان ملنے میں دِقّت پیش آنے لگی ہے۔ ہم لوگ ایک رشتے دار کے گھر ٹھہر گئے اور روزانہ صبح سے شام تک طرح طرح کے مکان دیکھنے جاتے رہتے تھے۔ مکان کی تلاش میں عجیب و غریب قسم کے مکانوں ہی سے نہیں، عجیب و غریب طرح کے مالک مکانوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ کہیں مکان اچھا ہوتا تھا تو مالک مکان چہرے مُہرے سے نادر شاہ اور چنگیز خاں کے خاندان کے قریبی فرد نظر آتے تھے۔ کہیں مالک مکان انسان نُما نظر آتے تھے تو مکان موہنجوداڑو اور ہڑپا سے ٹکر لیتا نظر آتا تھا۔ کہیں مالک مکان اور مکان دونوں ہی غنیمت ہوتے تو وہ محلّہ ایسا نظر آتا تھا جہاں دُور دُور تک کھلنڈرے بچّوں اور بازاری کُتّوں کی حکومت نظر آتی تھی۔ کہیں مالک مکان نیک نظر آتا تو مالکن نیک بخت نہ ہوتیں۔ کہیں مالکن ٹھیک ہوتیں تو مالک مکان شائی لاک قسم کے ثابت ہوتے۔ غرضیکہ مکان ڈھونڈنا ایک پرابلم بن گیا تھا اور ہم اپنے میزبانوں کے لئے بھی ایک مصیبت بنتے جا رہے تھے۔ آخر مجبور ہو کر ایک ہوٹل میں بسیرا کیا تو پتہ چلا کہ عنقریب وہ ہوٹل بھی بند ہونے والا ہے۔ مکان کے سلسلے میں اخباروں کے اشتہار پڑھتے تو ہوش اُڑ جاتے۔ ایسی ایسی کڑی شرطیں اُن میں ہوتیں کہ ہم تو ہم ہماری آنے والی سات پُشتیں بھی اُن آزمائشوں میں پُوری نہ اُتر سکتی تھیں۔ کوئی مالک مکان اپنے مکان میں کنوارے کو رکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ کوئی بیلیٹ کو رکھنے سے انکاری تھے۔ کوئی پنجاب سے خار کھائے بیٹھے تھے تو کوئی یو۔ پی پر اُدھار کھائے رہتے تھے۔ کوئی صرف برہمن کی تلاش میں تھے۔ کوئی صرف پارسی کے حوالے اپنا مکان کر سکتے تھے۔ کوئی بچّوں والے کرائے دار کے حق میں تھا اور کوئی بچّوں کی پُوری قوم سے بیزار تھے اور ہر دم اِس بات پر کُڑھتے رہتے تھے کہ آخر بچّوں کا مصرف کیا ہے؟ اگر دُنیا میں بچّوں کی جگہ صرف بڑے ہی بھیجے جاتے تو قانونِ قُدرت میں کون سا فرق پڑ جاتا۔ کوئی صاحب، مکان تو پُورا کرائے پر دینے کو تیار تھے۔ لیکن گھر کا اکلوتا غُسل خانہ صرف اپنے ہی قبضے میں رکھنا چاہتے تھے۔ کوئی صاحب غُسل خانہ دیتے تھے تو دوسرے کمروں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ ایک مالک مکان کو ریڈیو کی آواز سے نفرت تھی تو دوسرے کلاسیکل موسیقی کے عاشق تھے اور ہر دم تان لگاتے رہتے تھے۔ ایک مالک مکان عورت سے بیزار تھے۔ دوسرے عورت پر ضرورت سے زیادہ مہربان نظر آتے تھے۔ ایک صاحب صرف سبزی کھانے والوں کو اپنا کرایہ دار رکھتے تھے۔ دوسرے کو ایسا کرائے دار درکار تھا جو کم سے کم ایک بکرا دن میں ہضم کر سکتا ہو۔ ایک صاحب کو شراب سے نفرت تھی۔ دوسرے اِسی کا ناجائز دھندہ کرتے تھے۔

وہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ شب و روز مکان کی تلاش جاری تھی۔ دن کو طرح طرح کے مکان دیکھتے دیکھتے یہ حالت ہو گئی تھی کہ رات کو خواب میں بھی طرح طرح کے مکان نظر آنے لگے تھے۔ گو وہ خواب بہت پیارے ہوتے تھے۔ اُن خوابوں میں کچھ ایسا ہوتا تھا کہ مالک مکان تو انتہائی عاجزی اور اصرار سے مکان ہمارے حوالے کرتے تھے۔ لیکن ہم بڑی نخوت اور غرور سے اُن کی درخواست ٹھکرا دیتے تھے۔ ایک خواب میں تو سچ کہتی ہوں کہ چاہے آپ کو یقین آئے چاہے نہ آئے،

یہاں تک ہوا کہ شہر کے ایک کروڑپتی بزنس مین جن کا عالیشان محل نما گھر میلوں کے گھیرے میں پھیلا ہوا ہے، ہمارے پاس پیدل چل کر آئے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کے اپنا گھر ہم لوگوں کے حوالے کرنے لگے اور خود اپنے محل کے سائے میں بسنے والے جھونپڑوں میں معِ اپنی بیوی بچّوں کے رہنے کا وِچار کرنے لگے !! لیکن صاحب ہمیں کسی کے محل سے کیا مطلب؟ بڑی بے مُروّتی اور بڑی لاپرواہی سے ہم نے اُن کا محل لینے سے انکار کر دیا۔ ہمارے انکار سے شاید اُن کے دل کو بڑی چوٹ پہنچی تھی۔ اِس کا اندازہ اِس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب دوسرے دن صبح ہم اُن کی چال میں ایک خالی "کھولی" کرایہ پر لینے گئے تو اُنھوں نے ہم سے مِلنے ہی سے انکار کر دیا تھا۔

بڑی مصیبتوں کے بعد ہمیں ایک دوست نے شیخ کرامت علی کا نام بتایا۔ جو بستی کے شریف اور معزز لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ بڑے مذہبی آدمی تھے۔ بہت غریب گھرانے سے تعلّق رکھتے تھے۔ آٹھویں جماعت تک پڑھے ہوئے تھے اور اِتنے ایماندار تھے کہ کہیں بھی چالیس رُوپے ماہوار سے زیادہ کی ملازمت اُنھیں نہ مِلتی تھی۔ آخر کار ایک بار کسی کمزور لمحے میں ایمانداری سے قطع تعلّق کر کے جاپان جا پہنچے ——— اور وہاں سے چوبیس سال بعد لوٹے تو شیخ کرامت علی اینڈ سنز کے نام سے اُن کی ایک فرم کُھل چُکی تھی۔ وہ خالی چیزوں کا بزنس کرتے تھے۔ یعنی ڈالڈا کے خالی ڈبّے، سگریٹ کی خالی ڈبیاں، لکڑی کے خالی کھوکھے اور شراب کی خالی بوتلوں کا دھندہ کرتے تھے اور اپنی فرم میں صرف ایسے ہی ملازم رکھتے تھے، جن کے دماغ بھی خالی ہوں۔ شیخ جی اپنے اِس "خالی" والے اصول کے بڑے پابند تھے۔ اُنھیں ہر خالی چیز بہت اچھی اور مناسب نظر آتی تھی۔ سِوائے خالی جیب کے !! خالی جیب والوں سے بہت بیزار رہتے تھے اور اِسی لئے وہ خاص طور سے اپنے گھر میں جن لوگوں کو رکھنے کے حق میں سرے سے نہ تھے، وہ "رائٹر" لوگ تھے۔ وہ اکثر بڑی حقارت سے پڑھنے لکھنے والوں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے اور کبھی کبھی موڈ اچھا ہوتا تو بیچارے "رائٹروں" پر ترس بھی کھالیا کرتے تھے۔ وہ ہر جمعے کے دن میلاد شریف کرایا کرتے تھے اور خود سر ہِلا ہِلا کے مناجاتیں سُنا کرتے تھے۔

جب ہماری اُن کے سامنے پیشی ہوئی تو وہ جمعے کا دن تھا اور شیخ جی میلاد شریف سُن رہے تھے۔ ہم نے جاکے فوراً ہی اُن کو سلام کیا اور دھیرے دھیرے مناجاتوں پر سر ہِلانا شروع کیا۔ ہماری یہ ادا شیخ جی کو بھا گئی اور اُنھوں نے ہم سے ہمارے کاروبار کے بارے میں پُوچھا اور جب ہم نے اُنھیں بتایا کہ ہم لوگ کچھ قلم کاغذ سے شوق رکھتے ہیں تو وہ بے حد خوش ہوئے اور بولے۔

"سمجھ گیا، سمجھ گیا ! آپ پلاسٹک کے فاؤنٹین پین اور کاغذ کے تھیلے بناتے ہیں ——— واہ واہ !! بہت اچھا بزنس ہے۔ خدا برکت دے ! ہاں لیکن ذرا کرایہ وقت پہ . . . !"

"جی بالکل بالکل !!"

ہم لوگوں کو شیخ جی کے ہاں رہتے ہوئے لگ بھگ تین ماہ ہو چُکے تھے۔ شیخ جی بظاہر خوش نظر آتے تھے لیکن اُن کو ہمارے گھر کی صفائی کچھ کھلنے لگی تھی۔ وہ خود گھر کے بڑے حصّے میں رہتے تھے اور ہمیں پُوربی سمت کے دو کمرے اُنھوں نے دے رکھے تھے۔ اُنھیں اکثر اِس بات پر غصّہ آجاتا تھا کہ اِتنے بڑے مکان کے مقابلے میں ہمارے دو کمرے کچھ زیادہ صاف رہتے ہیں۔ اِس کا اُنھیں خاصا دُکھ تھا۔ اِس لئے اکثر آکر ہمیں صفائی پر لیکچر دے جایا کرتے تھے اور فنائل، فلِٹ اور ڈی ڈی ٹی کا مصرف اور استعمال بتا جایا کرتے تھے۔ اُن کے گھر میں جب کاکروچوں کی تعداد گھر والوں کے مقابلے میں زیادہ ہو جاتی تھی تو فوراً وہ ہمارے پاس آتے تھے اور کاکروچ مارنے کی شرطیہ دوا کا نام لکھوا جاتے تھے کبھی کبھی صبح ہی صبح تہمد باندھے آنکھوں میں سُرمہ لگائے اور مُنہ میں مِسواک دبائے آجاتے تھے اور صفائی کے فائدے پر اور پرسنل ہائی جین کے بارے میں کچھ ضروری باتیں بتا جایا کرتے تھے۔

ایک دن میں صبح کی چائے پی کے برآمدے میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ شوہر اپنے کمرے میں اور بچّہ غُسل خانے میں تھا۔ اچانک شیخ جی نازل ہو گئے۔ کچھ گھبرائے ہوئے تھے۔ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بُڑبُڑا رہے تھے۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ آج کچھ خوش نہیں ہیں۔ میں نے پُوچھا ——— "خیریت تو ہے شیخ جی !"

بولے "اجی خیریت کہاں ——— حیرت کی بات ہے ——— افسوس کی بات ہے ——— بڑے دُکھ کی بات ہے ——— یعنی بڑی عجیب بات ہے !" میں نے گھبرا کے پُوچھا "آخر ہوا کیا ؟"

"ہونا کیا !" شیخ جی جھنجھلا کے بولے "آپ کو ذرا سا خیال نہیں ہے۔ کچھ پتہ نہیں ہے۔ کچھ معلوم ہی نہیں ہے ویسے تو بڑے صفائی والے بنتے ہیں آپ لوگ !"

میں نے بھی جھنجھلا کے پُوچھا "آخر کچھ بتائیے تو شیخ جی معاملہ کیا ہے؟"

شیخ جی نے لال پیلے ہو کر کہا "ارے صاحب قصّہ یہ ہے کہ یہ جو آپ کے سونے کے کمرے کی کھڑکی کُھلتی ہے نا ؟ جہاں آپ کے شوہر بیٹھ کے لکھتے پڑھتے ہیں اور جہاں آپ کا بچّہ کھیلتا ہے۔ وہاں تین دن سے ایک کُتّا مرا پڑا ہے !"

"ارے رے رے ؟!" میں چونک کے اُٹھ گئی۔ شیخ جی نے اپنی ناک پر رومال

رکھ کے کہا: "حیرت ہے صاحب! آپ کے کمرے کی کھڑکی اِدھر ہی کُھلتی ہے اور آپ کو بدبو تک نہ آئی۔ ویسے بڑے صفائی والے بنتے ہیں آپ لوگ۔ ہم تو ساری رات سو نہیں پائے ہیں۔ حالانکہ ہمارے کمرے دوسری طرف ہیں۔"

یہ باتیں سُن کر میرے شوہر، میرا بچّہ، مالی، گھر کا ملازم، بھنگی اور جھاڑو دینے والی بائی سب مجرموں کی طرح سر نیہوڑائے شیخ جی کے پیچھے پیچھے مرے ہوئے کُتّے کی لاش دیکھنے پہنچے۔ کُتّا واقعی میری کھڑکی کے نیچے پڑا تھا میں نے اُبکائی روکتے ہوئے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ شیخ جی نے اپنی ناک کو زور سے رومال سے جکڑتے ہوئے کہا: "دیکھیئے دیکھیئے ــــــ یہ ہے وہ کتّا جو تین دن سے آپ کی کھڑکی کے سامنے مرا پڑا ہے!"

یہ کہہ کے شیخ جی آگے بڑھے اور کُتّے کے قریب پہنچ کر جُھک کر اُسے دیکھنے لگے۔

یکایک کُتّے نے گھبرا کے آنکھیں کھولیں۔ شیخ جی کو دیکھا اور سرپٹ بھاگا جنگل کی طرف!!

"بیسویں صدی" کو ہم نے کبھی اشتہاروں کا پلندہ نہیں بنایا۔ اِس میں ۴۲۰ اور بوگس قسم کے وہ اشتہارات شائع نہیں کیئے جاتے جن کا مقصد خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے۔

غزل

حبابؔ ہاشمی ایم۔ اے، بی۔ ایڈ

آج وہ بزم میں یوں ہوئے جلوہ گر، بھول بیٹھا ہوں عالم کو میں سر بسر
اب نہ اپنی خبر ہے نہ دل کی خبر، مجھ کو گُم کر گیا میرا ذوقِ نظر

بہکی بہکی ہوا، مہکی مہکی فضا، اُف یہ پُر کیف موسم یہ کالی گھٹا
حُسنِ معصوم کو کچھ خبر ہی نہیں، کھُل گئے گیسوئے عنبریں دوش پر

رات ڈھلنے لگی، درد کجلا گیا، تارے بجھنے لگے، چاند سنولا گیا
اُن کے آنے کا اب کچھ بھروسہ نہیں، آ گلے سے لگا لیں غمِ معتبر

دِل پہ جو بھی نیا زخم لگتا ہے اب، اُس میں محسوس ہوتی ہے لذّت عجب
مجھ کو رہنے دے یونہی جراحت طلب، اے مرے چارہ گر اے مرے چارہ گر

زندگی کا ابھی تجھ کو عرفاں نہیں، تنہا چلنا مرے دوست آساں نہیں
تُو مرے ساتھ چل، چھوڑ خوف و خطر، مَیں ترا ہم سفر تُو مرا ہم سفر

چار سُو حُسن کے قافلے تھے رواں، ہر طرف تھیں بہاروں کی رعنائیاں
کتنا ویران ہے آج شہرِ طرب، کتنی سُنسان ہے پیار کی رہگذر

اے حبابؔ اپنی محرومیوں کا گلہ بزمِ اغیار میں کچھ مناسب نہیں
دن مصیبت کے آخر گذر جائیں گے زندگی ہے تری لمحۂ مختصر

غزل

خمارؔ انصاری ایم۔ اے

کچھ اپنے انتخابِ محبت کا پاس ہے
کیسے کہوں اُسے کہ وفا ناشناس ہے

تم ساتھ ہو تو نُور ہے، نکہت ہے زندگی
خوشبو سی، روشنی سی مرے آس پاس ہے

پندارِ عشق نے ہمیں خوددار کر دیا
اب کوئی التجا نہ کوئی التماس ہے

سچ تو یہ ہے کہ تیرے تعلّق سے ہے نصیب
وہ روشنی جو فکر و نظر کی اساس ہے

تم بھی نہ بھول جاؤ زمانہ کے ساتھ ساتھ
یہ بات اِس جہاں میں قرینِ قیاس ہے

زندہ دِلی بھی ایک ضرورت سہی، مگر
وہ شخص کیا کرے جو مزاجاً اُداس ہے

جو کچھ بھی میں نے پیش کیا ہے برنگِ شعر
میری ہی زندگی کا یہ سب اقتباس ہے

ا[illegible] !

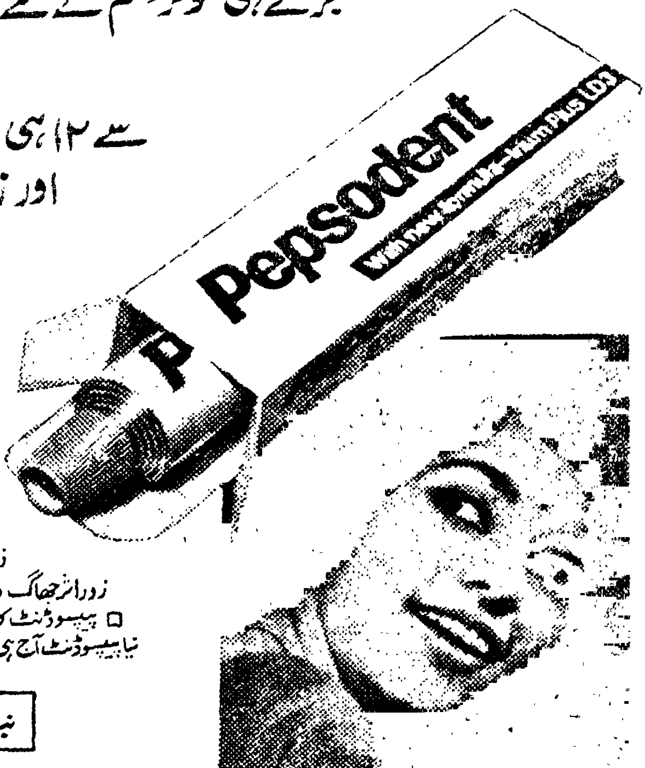
۱۲ ہی دنوں میں

زیادہ سفید دانت !

بڑے ہی موثر قسم کے نئے فارمولے کے مطابق بنائے ہوئے

پیپسوڈنٹ

سے ۱۲ ہی دنوں میں دانت زیادہ سفید
اور زیادہ صحت مند ہو جاتے ہیں !



پیپسوڈنٹ کو اب تین طرح سے بہتر بنایا گیا ہے :
نیا فارمولا ، نیا ذائقہ اور نئی پیکنگ ۔

□ برسوں کی تحقیق کے بعد تیار کئے ہوئے نئے فارمولے کی بدولت پیپسوڈنٹ میں اب ایریمم پلس ایل ڈی ۳ ملایا جاتا ہے ۔ اس کے موثر اجزاء دانتوں پر چڑھی ہوئی میلی سی تہ کو نکال کر انہیں قدرتی چمک عطا کرتے ہیں ۔

□ ساتھ ہی ساتھ یہ دانتوں کی دراڑوں میں چھپے ہوئے کھانے کے باریک باریک اور مضرت رساں جراثیم والے ذرّوں کو نکال کر دانتوں کو سڑنے سے بچا لیتے ہیں ۔ اس کا زوردار جھاگ دانتوں کی تمام دراڑوں کو پوری طرح سے صاف کر دیتا ہے ۔

□ پیپسوڈنٹ کا پہلے سے زیادہ ٹھنڈا میٹھا ذائقہ آپ کو بیحد پسند آئیگا ۔

نیا پیپسوڈنٹ آج ہی خریدیئے اور پھر دیکھئے ۱۲ ہی دنوں میں اس کا حیرت انگیز اثر !

نیا فارمولا	نیا ذائقہ	نئی پیکنگ

رجسٹرڈ یوزرس ہندوستان لیور لمیٹڈ کی معیاری پیشکش ۔

HTA-HDL-9073

افسانہ

لڑکیوں کی سڑک کا مسافر

اختر ملیح آبادی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

۲۔ چھتواپور روڈ۔ لکھنؤ

برادرِ عزیز! اسلام مسنون

خواب میں نہیں۔ تصویر میں دیکھا آپ کو! آپ کھڑے ہیں اور مادرِ اردو کی بدسلوکی کا شکوہ ہے زبان پر! کیوں نہ ہو شکوہ!؟ کیا مادرِ اردو کی گود آپ کو نصیب نہیں ہوئی تھی!؟ ——— رونا اُن سپوتوں پر آتا ہے جنھیں ماں کی گود نے پالا اور پھر وہ اُسے بھول گئے! لیکن آپ اُن سپوتوں میں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں!! ——— ایک انتہائی نازک گھڑی آئی تھی۔ مجھے یاد ہے جب آپ کو خلافِ توقع شملہ سے دہلی آنا پڑا تھا۔ رشتہ منقطع ہونے کا وہی نازک وقت تھا! لیکن جس گود نے آپ کو پالا تھا اُس کی محبت، خلوص، پیار، تعلیم و تربیت بے رنگ نہ ہونے پائی اور آپ اُس دھارے میں بہے نہیں جبکہ نہ جانے کتنے بہہ گئے۔ لیکن آج وہ فنا ہو گئے اور آپ زندہ ہیں! ایک روشنی کی طرح اور یقیناً ہمیشہ زندہ رہیں گے انشاء اللہ العزیز! ——— جب میں یہ افسانہ لکھ رہا تھا تو ہمیشہ کی طرح ایک تصویر اس بار بھی اُبھر آئی تھی آنکھوں میں۔ جو شبیہہ میں میری بہن سے ملتی جلتی تھی اور یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ تصویر میری بہن ہی کی تھی! اُس وقت ذہن و فکر میں یہ کشاکش تھی کہ جس بہن نے مجھے قلم پکڑنے کی ترغیب و تعلیم دی تھی آج وہ اس دُنیا میں نہیں لیکن اُس کا دیا ہوا قلم خدا کے فضل و کرم سے رواں دواں ہے ——— 'بیسویں صدی' کی دُنیا میری بہن سے واقف نہیں لیکن "عصمت" اور "بنات" دہلی کے فائل میری بہن کو بھلا نہیں سکتے۔ یہ دونوں معیاری نسوانی پرچے علامہ راشد الخیری مرحوم کی ادارت میں نکلتے تھے۔ علامہ راشد الخیری سر سید احمد خاں بانیٔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اُن کے اصلاحی ناول آج بھی اُردو ادب میں بلند مقام کے حامل ہیں۔ میری بہن اودھ کے ایک تعلقدار روایتی باپردہ گھرانے میں باپردہ رہ کر مضامین لکھا کرتی تھیں جس پر علامہ راشد الخیری مرحوم نے اُن کے لئے نوٹ لکھا تھا جس کی سُرخی تھی "اندھیرے گھُپ میں نُور کی کرن!" اور ایک وقت وہ آیا کہ علامہ راشد الخیری مرحوم اپنی مُنہ بولی بیٹی کو گلے لگانے اور پیشانی چُومنے دہلی سے لکھنؤ پہنچ گئے۔ کیونکہ میری بہن روایاتِ فرسودہ کے خلاف مضامین لکھتی تھیں اور علامہ اُن کی ترقی پسندی سے بے حد متاثر تھے! ——— ہمارے گھر کی روایات باپ بیٹی کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں۔ میری بہن نے جن کا نام کشور جہاں بیگم تھا اور جنھیں میں چھوٹی آپا کہتا تھا ماں سے اجازت مانگی۔ اِس لئے کہ ہمارے باپ جنھیں ہم سب 'میاں' کہتے تھے، ملیح آباد اپنی زمینداری پر گئے ہوئے تھے۔ ماں ڈر گئیں اِس لئے کہ میاں پٹھان تھے اور غصّہ ور مزاج رکھتے تھے۔ غرضیکہ وہ اپنے مُنہ بولے باپ سے نہ مل سکیں۔ جس کا اُنھیں ملال رہا۔ لیکن مادرِ اُردو کی وہ بھی بیٹی تھیں نہ بغاوت کی نہ پھوہڑ پن کا مظاہرہ کیا۔ ایک طرف یہ آن بان تھی۔ دوسری طرف لڑکی تو تھیں۔ بہرحال شگفتہ مزاج اور ذہین تھیں۔ پردے میں

رہتے ہوئے بھی روایات کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے نت نئی شرارتیں بھی کیا کرتی تھیں، لیکن دائرۂ تہذیب میں رہ کر۔ اُن کی زندہ دِلی کے کئی واقعات یاد ہیں۔ جو اگر زندگی نے وفا کی تو اپنے حالاتِ زندگی کے دَوران قلمبند کروں گا انشاء اللہ! اُن ہی یادداشتوں کی اوٹ سے کیپٹن بر جیس باہر آئی جو اِس افسانے کی رُوح ہے اور چھوٹی آپا کی زندہ دِلی ہی نہیں بلکہ پاکی اور بلندی اپنائے ہے! ــــــ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شرارت کو افسانوی کڑیوں سے جوڑ دیا گیا ہے جو اپنی جگہ [illegible] ہیں۔ کیونکہ چھوٹی آپا کی شرارت کی ایک حد ہوتی تھی اِس لئے کہ اُنھیں خاندانی عزّت، ناموس اور شرافت کو بھی یاد رکھنا ضروری ہوتا تھا جبکہ کیپٹن بر جیس کا ماحول مختلف ہے۔ اِس کے باوجود شرارت کے ابتدائی نقطے تک میں نے اپنی بہن کو افسانے میں چلتے پھرتے محسوس کیا ہے اُس نُور کی کِرن کو جو 'عصمت' اور 'بنات' کی قندیلوں میں روشنی کرتی تھی اور جس نے گھر میں "پرچم" اُڑایا تھا اور ہم سب بھائی بہن دَوڑتے کھیلتے کودتے اُن کی سِکھائی ہوئی نظمیں گایا کرتے تھے ؎

چڑھا منصور سُولی پر انا الحق کہہ کے ایراں میں
مزہ تو جب ہے تارِ ہند سے ایسی ہی گت نِکلے!

چھوٹی آپا ہی نے ہم سب کو انگریزی سامراج سے نفرت دلائی تھی۔ اُنھوں نے ہی گاندھی اور نہرو سے متعارف کیا تھا اور ہم سب نے اُن کے نقشِ قدم پر چل کر دیسی کپڑوں کو اپنے لئے منتخب کیا تھا۔ اِس لئے کہ وہ وطن پرور خیالات سے ہمکنار تھیں۔ آزادیٔ ہند کی دلدادہ تھیں۔ اُس کے خواب نہ صرف خود دیکھتی تھیں بلکہ ہمیں بھی دکھاتی تھیں ــــــ کیسا ستم ہے کہ آج کچھ لوگ دیپک لئے گھومتے ہیں اور اُنھیں مُسلم حُبّ الوطنی کے جذبات کے نشان تک نہیں مِلتے!؟ 'نُور کی کِرن' زندہ ہوتی تو کیا محجوب نہ ہو جاتی!؟ ــــــ کہنا تو بہت کچھ تھا، لیکن مختصراً یہی کہہ دوں کہ کیپٹن بر جیس کی شرارت کی اوٹ میں اگر کوئی نِگاہ 'نُور کی کِرن' کو دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتی ہے! ــــــ اور اگر میں اِس افسانے کو اپنی بہن کی یاد سے معنون کروں تو کیا یہ ناموزوں ہوگا!؟ ــــــ کچھ زبانیں پُوچھتی ہیں کہ خط لکھتے وقت کہاں رہتے ہو؟ اُن سے یہی کہنا ہے کہ میں اپنے بھائی سے باتیں کرتا ہوں۔ اُس بھائی سے جس نے ہمیشہ دل چیر کر دکھایا۔ پھر میں ایسا کیوں نہ کروں؟ آخر بات کرنے کے لئے کوئی دردمند تو ہونا چاہیئے!؟ ــــــ اچھا چلتے چلتے یہ سُن لیجئے کہ اب میں "بیسویں صدی" میں نہ لکھوں گا! آپ وجہ پُوچھیں گے؟ ــــــ کیا بتاؤں وجہ؟ "بیسویں صدی" نے مجھے لندن میں رُسوا کر دیا ــــــ وہاں سے فرمائش شروع ہو گئی جبکہ میں تارک الدُّنیا ہونے کی تیاری کر رہا ہوں۔ کچھ لوگ معترض ہیں کہ بقول اکبر الہ آبادی مرحوم ؏

گانے کا ہے شوق اُن کو اور ذوقِ عبادت بھی!

میں نمازی بھی ہوں اور کہانیاں بھی لکھتا ہوں۔ ظاہر ہے 'زاہدِ خشک' اعتراض کیسے نہ کرے!؟ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مُفتیانِ شرعِ متین بیچ اِس مسئلے کے!؟ ــــــ ؏

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

ناچیز ــــــ اختر ملیح آبادی

★

"بند کرو اِس بھڑ بھڑ کو ــــــ!" جو لڑکی آگے آگے تھی اور لڑکیوں کی ٹولی کی کپتانی کر رہی تھی، اُس نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ انداز کچھ ایسا تھا کہ تعمیلِ حکم نہ ہوئی تو اُلٹا طمانچہ بھی پڑ سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سراسیمہ ہو کر نوجوان نے جس نے لڑکیوں کی ٹولی کو آتے دیکھ لیا تھا اور موٹر سائیکل کے بریک ــــــ

لگا لئے تھے۔ حکم ملتے ہی اُس نے موٹر سائیکل کے انجن کو جام کر دیا۔

دوسرے لمحے لڑکیوں کی ٹولی قریب ہی نہیں آ گئی بلکہ آناً فاناً لڑکیاں موٹر سائیکل کے اِرد گِرد اِس طرح پھیل گئیں جس طرح عشقِ پیچاں کی بیل دوسرے پیڑوں کو اپنے گھوپے میں لے لیتی ہے۔ موٹر سائیکل والے نوجوان نے کچھ گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ اُسی انداز میں جو اسمگلر کا ہوتا ہے اور پولیس پارٹی کے گھیرے میں آجانے کے بعد متوحش ہو کر دیکھتا ہے، یہ جاننے کے لئے کہ اِس کے بعد کیا ہوگا؟

"یہ بیلوں کی عینک اُتارو!" کپتان نے دوسرا حکم دیا جس نے ابھی موٹر سائیکل کے انجن کی نامانوس آواز کو بند کرنے کے لئے کہا تھا۔ حکم ملتے ہی اُس نے بے چون و چرا آنکھوں پر سے اِس ہونّق عینک کو اُتار لیا جو ہوا سے بچنے کے لئے موٹر سائیکل سوار استعمال کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کپتان لڑکی نے ہنسی روکتے ہوئے پوچھا "اور یہ کیا ہے ہاتھوں پر؟"

"Hand Gloves ہیں" نوجوان نے جلدی سے کہا۔

"اُتارو، یہ دیو کے پنجے!" کپتان لڑکی نے تیوریاں چڑھائیں اور کہا۔۔۔ اور دوسری لڑکیاں "دیو کے پنجوں" کی اصطلاح پر ایک ساتھ ہنسنے لگیں اور نوجوان کو ایسا محسوس ہوا جیسے چاروں طرف سے نغمے پھوٹ پڑے ہوں!

چند لمحے گزر گئے۔ وہ نوجوان منتظر تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے کہ کپتان لڑکی نے بڑے رعب سے کہا "مُنہ اوپر اُٹھاؤ!"

"جی۔۔۔؟" اُس نے مُسکرا کر لڑکی کو دیکھا کہ ڈانٹ پڑی اور یہ الفاظ اُس کے کانوں سے ٹکرائے۔

"ہنسو مت! جو کہا جائے وہ کرو ورنہ۔۔۔!" اُس نے اپنا چہرہ وا کر دیا تو کپتان لڑکی نے پاس کھڑی ہوئی لڑکی سے کہا "فریدہ! دیکھو یہ نوجوان ذہنی طور پر مریض تو نہیں!؟"

فریدہ نے آنچل سمیٹا ایک قدم آگے بڑھی اور قدرے جُھک کر نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک لمحہ دیکھا اور بولی "پاگل نہیں معلوم ہوتا۔۔۔!"

"پاگل نہیں تو پھر اِس سڑک سے موٹر سائیکل پر کیوں گزرا؟" کپتان لڑکی نے پُوچھا۔

"کیا اِدھر سے موٹر سائیکل پر گزرنا منع ہے؟" نوجوان نے پُوچھا۔

"قطعی منع ہے!" پہلو سے ایک لڑکی نے برجستہ کہا "سواری یہاں نہیں آسکتی!"

"معاف کیجئے مجھے معلوم نہ تھا" نوجوان نے معذرت کی۔

"معافی کا کیا سوال ہے جی؟" کپتان لڑکی نے بے اعتنائی سے کہا "ہم پولیس والے نہیں کہ رشوت لے کر چھوڑ دیں" اور وہ نوجوان بحث کرنے لگا کہ چونکہ کوئی نوٹیفکیشن Notification نہیں تھا اِس لئے وہ خطاوار نہیں۔ جواب مِلا کہ لاعلمی بے قصوری کی بُنیاد نہیں بن سکتی۔ (Ignorence is no Excuse)

پھر اچانک کپتان لڑکی نے کشمیری شال درست کیا اور مُڑتے ہوئے کہا "فریدہ! Interogation کے لئے ڈرائنگ رُوم میں لاؤ" یہ حکم دے کر کپتان لڑکی بنگلے کی طرف ہولی اور فریدہ نے موٹر سائیکل نوجوان سے کہا۔

"تشریف لے چلئے جناب!"

"کہاں؟"

"جہنّم نہیں۔۔۔ بنگلے چلئے!" ایک شوخ لڑکی نے آگے آتے ہوئے اور ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ کے ساتھ مجھے جہنّم بھی عزیز ہے!" نوجوان نے اُتر کر موٹر سائیکل کو ہاتھوں سے دھکیلا اور سامنے والے بنگلے کی طرف ہولیا۔ لڑکیوں کے گھیرے میں نہیں، پھولوں کے جُھرمٹ میں!

"Sit Down" ڈرائنگ رُوم میں پہنچتے ہی فریدہ نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا، لڑکیوں کے پہرے میں۔ فریدہ اندر چلی گئی کپتان لڑکی کو اطّلاع دینے کے لئے۔ فریدہ نے جاتے ہی نیچی آواز سے اور ہنستے ہوئے کہا "ملزم حاضر ہے!"

برجیس (کپتان لڑکی) نے مُسکراتے ہوئے پُوچھا "مزاحمت تو نہیں ہوئی؟" فریدہ نے بتایا کہ نہیں ہوئی۔ تب برجیس نے کہا "کیا بے وقوف ہے؟" فریدہ ہنس دی۔ اُسے خود تعجّب تھا موٹر سائیکل سوار پر کہ صورت سے تعلیم یافتہ معلوم ہونے کے باوجود لڑکیوں کی شرارت کا جال توڑ نہیں پایا تھا اور بے چون و چرا تعمیل کر رہا تھا جس طرح قانون پسند لوگ پولیس سے تعاون کرتے ہیں۔

"پہلے ناشتہ پھر پُوچھ گچھ" (Interogation) فریدہ نے کمرے میں آتے ہی کہا جس پر نوجوان نے پُوچھا۔

"ملزم کو ناشتہ دیا جائے گا؟"

"بے شک!" فریدہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا "ہم لڑکیوں کی حکومت میں حقوقِ انسانی کا بھرم رکھا جاتا ہے!" ناشتہ کی کشتی ایک ملازم لڑکا لے آیا۔ وہ ناشتہ کرنے لگا۔ اِس دَوران میں پہرے دار لڑکیوں سے معلوم ہوا کہ یہاں لڑکیوں کی حکومت ہے۔ شہر سے ملحق مضافاتی سڑک پر کوئی اجنبی بغیر اجازت معادن سڑک پر قدم نہیں رکھ سکتا جب تک کہ لڑکیوں کی کپتان اجازت نہ دے دے۔ یہ احتیاط اِس لئے ضروری ہے کہ کسی قسم کی بدعنوانی اور گڑبڑ نہ ہو۔ کیونکہ معادن سڑک

کے کنارے جو بنگلے بنے ہیں وہ شرفاء کے ہیں۔ صرف لڑکیاں ہیں بنگلوں میں۔ کوئی لڑکا نہیں۔ لہٰذا لڑکیوں نے حفاظتِ خود اختیاری میں Vigilence اپنے ذمّے لے رکھی ہے۔ اِسی لئے بڑی سڑک سے کٹ کر جب اِسے معاون سڑک کی طرف آتے دیکھا تب الارم نے ہم سب کو چوکنّا کر دیا اور نتیجہ میں اِسے زیرِ نظر کر لیا گیا۔

"بہت خوب!" نوجوان نے گرم چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اور زیرِ لب مُسکراتے ہوئے کہا۔

"Attention" فریدہ نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ "Captain is Coming" جو لڑکیاں باتوں میں مشغول تھیں وہ با ادب ہو گئیں لیکن برجیس جوں ہی شکاری لباس میں ہاتھ میں فوجی بید لئے آئی تو گھبرا کر وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ کیپٹن برجیس نے آتے ہی افسرانہ انداز میں کہا۔

"Interogation Chamber لے چلو۔" اور اُسے اِنٹروگیشن چیمبر کی طرف لڑکیاں لے چلیں۔ اُس وقت وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا: کاش! یہ اِنٹروگیشن Interogation کبھی نہ ختم ہو اور وہ لڑکیوں کا قیدی سدا رہے!

"کیا نام ہے؟" اِنٹروگیشن کا پہلا سوال تھا۔

"اچھا! انور ندیم نام ہے؟" کیپٹن برجیس نے پُوچھا۔ "نام تو انور ہو گیا۔ یہ ندیم کا دُم چھلّا کیسا ہے؟"

"تخلّص ہے جناب!" کیپٹن برجیس نے فوراً متفکّر انداز سے پُوچھا۔ "کیا شاعر ہو؟ اچھا کوئی شعر سُناؤ۔ اپنا شعر!"

"چمٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے"

انور نے برجستہ پڑھا تو اِنٹروگیشن رُوم کیپٹن برجیس کی آواز سے گُونج گیا۔ اُس نے غصّے سے اور تیوریاں چڑھا کر کہا۔

"شاعر مجھے اِسی لئے ناپسند ہیں کہ ہمیشہ سفلی جذبات کے مریض ہوتے ہیں۔ تمھیں نہیں معلوم کہ لڑکیوں کے سامنے گندہ شعر پڑھنا بے ادبی ہے؟"

"حضورِ والا!" انور نے فوراً کہا۔ "یہ شعر تو اُردو کے عظیم اُستاد کا شعر ہے نہ کہ میرا۔۔۔!"

"اُستاد غیر مہذّب نہیں ہوتے" جواب مِلا۔ "اور اگر ہوں تو اُستاد نہیں ہو سکتے۔"

"لیکن ——" اُس نے کچھ کہنا چاہا کہ کیپٹن برجیس نے کڑک کر کہا۔

"خبردار! ہم بحث کے عادی نہیں —— معافی مانگو!" اُس نے اظہارِ معذرت کیا تو کہا گیا کہ اِس طرح نہیں، کھڑے ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر —— انور نے ایسا ہی کیا۔

"کتنا پڑھے ہو؟"

"بہت ہی تھوڑا!" انور نے کہا۔ "صرف بیرسٹری پاس کی ہے!"

"واقعی نیم حکیم ہو ——" کیپٹن برجیس نے برجستہ کہا۔ اِنٹروگیشن چیمبر ہلکے قہقہوں سے گُونج گیا۔ لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ کیپٹن برجیس کی تنبیہہ پر خاموش ہو گئیں۔ کیپٹن برجیس نے پُوچھا۔ "آنے کی غرض کیا تھی؟"

"آپ سے ملاقات ——!" یہ پہلا موقع تھا کہ کیپٹن برجیس نے وقفہ لیا۔ کسمسائی اور پھر کہا۔

"ادب کو ملحوظ رکھو ورنہ ——" انور سے دوبارہ سوال ہوا کہ وہ کس غرض سے اِدھر آیا تھا تب اُس نے کہا کہ "ایک گرل فرینڈ کی تلاش میں آیا تھا۔۔"

"گرل فرینڈ!؟" کیپٹن برجیس نے گھور کر انور کو دیکھا۔ ایک لڑکی نے قدرے تلخی سے کہا۔

"بن سنور کے آنے کا انداز ہی بتاتا تھا کہ نیت بخیر نہیں ہے۔۔"

"لڑکی کا نام کیا ہے؟" کیپٹن برجیس نے پُوچھا۔

"نام سے میں بھی واقف نہیں!" انور نے کہا۔ پھر تشریح کرتے ہوئے کہا کہ "چند دن پہلے وہ اِدھر سے گُزرا تھا۔ اُس لڑکی کو اِسی سڑک کی طرف مُڑتے دیکھا تھا۔ سوچا اُسے تلاش کروں۔"

لڑکیاں باہم سرگوشیاں کرتی رہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ سب بنگلوں کی لڑکیاں اِس وقت موجود ہیں۔ اِن میں وہ لڑکی ہوتی جسے اُس نے دیکھا تھا تو پہچان لیتا۔ اِس لئے یہ بیان ہی سرتاپا غلط ہے۔ کیپٹن برجیس نے لڑکیوں کی نمائندگی کر دی اور کہا۔ "دروغ گوئی سے معاملہ اور سنگین ہو گیا!" چند اور سوالات ہوئے اور کیپٹن برجیس یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ "Interogation کے نتیجے کا انتظار کرو۔"

تھوڑی دیر بعد کیپٹن برجیس آئی۔ کاغذ ہاتھ میں لئے اور بتایا کہ Interogators کی رائے میں چارج شیٹ لگنی ضروری ہے۔ لہٰذا تم پر یہ الزامات عائد کئے جاتے ہیں —— پہلا الزام یہ کہ لڑکیوں کی سڑک پر بِلا اجازت آئے، دوئم یہ کہ آنے کی غرض چھپائی، سوئم یہ کہ ہماری ہم جنس کو بدنام کرنے کی کوشش کی اور چہارم یہ کہ جان بُوجھ کر جُرم سے انکار کیا —— اِس لئے اپنی برئیت میں کوئی بنیادی بات کہنی ہے تو کہو ورنہ فیصلہ خلاف ہو گا۔"

"چارج شیٹ سُن لی؟" فریدہ نے پُوچھا۔

"سُن لی جناب!"

"پندرہ منٹ کا موقع دو تاکہ بیانِ صفائی تیار کر لیں" کیپٹن برجیس نے لڑکیوں کو اشارہ کیا۔ سب لڑکیاں باہر چلی آئیں۔ دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔

پندرہ منٹ بعد دروازہ کھلا اور فریدہ نے آتے ہی پوچھا — "اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں صاحب کہنا ہے" انور بولا۔

"کہو!"

"یہی کہ ع

پکڑے جاتے ہیں لڑکیوں کے کہے پر ناحق"

"اپنی چارشیٹ میں ایک الزام اور بڑھوالیا!" فریدہ نے کہا "اندازہ نہ ہو سکا کہ ہمارے آئین میں شعر پڑھنا بھی جرم ہے!"

"میں نے تو غزل کا شعر پڑھا!" انور نے کہا "اور لغوی معنوں میں غزل کے معنی ہیں لڑکیوں سے باتیں کرنے کے..."

"ہم اسی لئے شاعروں کو موردِ الزام سمجھتے ہیں کہ!" فریدہ بولی "شاعر چوبیس گھنٹے لڑکیوں سے باتیں کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتا — اور یہ حرکت ہماری نظر میں قابلِ سزا ہے!"

"دیکھو فریدہ!" کیپٹن برجیس نے اندر آتے ہوئے کہا "مقدمہ میں تاریخ دے دو اور ملزم کو کھانا کھلانے کا انتظام کرو۔ ہم ظالم نہیں کہ ملزم کو بھوکا رکھیں"

یہ کہہ کر کیپٹن برجیس چلی گئی اور فریدہ نے کہا "مقدمہ ملتوی ہوا اب باورچی خانے میں تشریف لے چلئے"

"وہ کس خوشی میں؟" انور نے پوچھا۔

"کھانا پکائیے جناب!" فریدہ بولی "ہمارے لئے بھی اور اپنے لئے بھی"

"بہت اچھے! یہ کس جرم کی علت میں؟"

بتایا کہ جو جرم اس سے سرزد ہوا ہے۔ جب انور نے اُسے بتایا کہ اُسے کھانا پکانا نہیں آتا تو فریدہ نے کہا "کھانا پکانا تک نہیں آتا بیرسٹر صاحب کو! اور چلے ہیں لڑکی سے فرینڈشپ کرنے؟ — کل اپنے گھر میں اگر ضرورت پڑ جائے تو کیا ہو گا؟ آج کا نوجوان کتنا ناکارہ ہوتا ہے۔ جب ہی دُنیا کی حالت ابتر ہے"

"پانی کا چھینٹا دیجئے بیرسٹر صاحب!" زرینہ نے اُس وقت کہا جب آٹا گولا بن گیا۔ انور میز پر پیتل کا کٹھونڈا رکھے کھڑا آٹا گوندھ رہا تھا۔ انور نے پانی کا چھینٹا دیا اور کہا۔

"آپ میری مدد کر دیجئے۔ آٹا گوندھ دیجئے۔ جو کہیئے نذر کر دوں"

"لڑکیاں راشی نہیں۔ مرد راشی ہوتے ہیں" زرینہ نے برجستہ جواب دیا۔

انور مسکرا کر آٹے پر مُکی لگانے لگا کہ کیپٹن برجیس کیمرہ لے کر آ گئی۔ انور نے کیمرہ دیکھا تو پوچھا "اِس کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟" کیپٹن برجیس نے بتلایا کہ تصویریں اس لئے ضروری ہیں کہ کل دوسرا جُرم ہو تب ثبوت میں کام آئیں!

کھانے کے بعد کیپٹن برجیس نے بڑے طنز سے کہا "بیرسٹر صاحب! ترکاری میں نمک بھرا تھا۔ مرچ کی آمیزش ہی نہ تھی۔ دال آئینہ بنی تھی اور روٹیاں تو سبحان اللہ! اُن کا کیا کہنا۔ گھر جا کر کھانا پکانے کی مشق کیجئے۔ آپ ناکارہ ہیں۔ زندگی کو کارآمد بنانے کی سوچئے اور اِس بھول میں نہ رہئے کہ آج بھی لڑکیاں ہی چولھا جلائیں گی اور مرد صاحبان موج اُڑائیں گے سمجھے آپ؟"

"نصیحت نوٹ کر لی جناب!" انور نے جواب دیا۔

"اچھا اب ہرجہ خرچہ نکالئے!" کیپٹن برجیس نے کہا "تاوان دیجئے مقدمہ کا فیصلہ بعد میں ہو گا"

"کس بات کا تاوان؟"

"ہمیں کوفت ہوئی، محنت کرنی پڑی اور ہمارا وقت برباد ہوا"

"لیکن بیگار میں نے کی..."

"کیا جناب بغیر محنت کے کھانا کھا لیتے؟" کیپٹن برجیس نے کہا "ہم پر کیا احسان کیا؟"

"میں پھر عرض کروں گا کہ!" انور نے کہا "جُرمانہ معاف ہو جائے تو عنایت ہو گی"

"فریدہ!" کیپٹن برجیس نے کہا "آنا کانی ہو تو جُرمانہ دوگنا کر دیا جائے!"

اِس نادر شاہی حکم پر انور نے مطلوبہ جُرمانہ ادا کیا اور جان بچالی۔

رہائی سے پہلے فریدہ نے وعدہ لیا کہ اب کبھی بغیر اجازت اِدھر کا رُخ نہ ہو گا اور یہ کہ مقدمہ محض ملتوی ہوا ہے۔ فیصلہ باقی ہے۔ طلبی پر حاضری ضروری ہے۔ انور نے منظور کیا اور موٹر سائیکل کی طرف ہو لیا — جب وہ بنگلے سے نکل کر سڑک پر پہنچا تو دُور تک لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز اُس کا تعاقب کرتی رہی۔

"اگر امّی کو پتہ چل گیا تو کیا ہو گا؟" فریدہ نے پہلی بار انجام کو سوچتے ہوئے کہا۔ جس پر کیپٹن برجیس نے بڑی بے اعتنائی سے کہا "اوّل تو ہماری شرافت کا عِلم امّی کو ہونے کا نہیں۔ اُن سے انور کی بھلا ملاقات کیسے ہو گی اور اگر راز کھل بھی گیا تب ہم صاف مُکر جائیں گے"

لڑکیوں کو اطمینان ہوا تو کھل گئیں۔ زرینہ نے دوسرے خطرے کا

احساس کیا اور کہا: "اگر پولیس آئے تحقیقات کے لئے تب؟"

"ہش!" کیپٹن برجیس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے چُپ کر دیا اور کہا۔

"لڑکیوں سے حجامت بنوانے کے بعد کون مرد ہوگا جو پولیس سے فریاد کرنے جائے گا۔"

قہقہہ پڑا اور زرینہ کا پیدا کردہ خوف دھواں بن کر اُڑ گیا۔ فریدہ نے ہنستے ہوئے کہا: "مجھے تو شبہ ہے وہ بیرسٹر ویرسٹر نہیں تھا ورنہ آسانی سے ذبح نہ ہوتا۔"

"یہ مابدولت کے رعبِ حُسن کا اعجاز ہے!" کیپٹن برجیس نے بڑے ناز سے کہا۔ سب لڑکیوں نے تائید کی۔ لڑکیاں ایک ایک بات پر لوٹی جا رہی تھیں کہ صاحب بہادر سے آٹا گوندھوا لیا، ہانڈی پکوالی اور چُولھا تک پھُنکوا لیا۔ یہ سب انہونی باتیں ہوگئیں جو عقل ہی میں نہیں سما سکتی ہیں۔ اگر رعبِ حُسن درمیان میں نہ ہوتا تو یہ ڈرامہ کھیلا بھی کیسے جا سکتا تھا؟

ڈراموں کا آغاز برجیس کے آنے کے بعد ہی ہوا تھا۔

ورنہ اِس سے پہلے کسی لڑکی نے ایسے ڈراموں کا خیال تک نہ کیا تھا۔ کھیلنا تو در کنار! ان ڈراموں کی محرک برجیس ہی تھی جس نے نوجوانوں کو ستانے اور دبانے کی تحریک شروع کی تھی — جب پہلے پہل برجیس نے اسکیم پیش کی تو لڑکیاں خوفزدہ ہوگئی تھیں۔ سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ برجیس کو اپنی ہم جنسوں کی بزدلی پر بہت تعجب ہوا تھا اور اُس نے لاہوری لڑکیوں کی بہادری کے قصّے سُنائے۔ برجیس چند سال اپنی ماں کے ساتھ لاہور میں رہ آئی تھی۔ وہاں کی لڑکیوں کی صحبت اُٹھا چکی تھی۔ اِس لئے اُس نے اُن کی ہمّت یہ کہہ کر بڑھائی تھی کہ لڑکیوں کو اپنی حفاظت خود کرنی چاہیے۔ برجیس نے لاہوری لڑکیوں کی مثال دی تھی جو لڑکوں کو سیدھا کر چکی تھیں۔ برجیس نے یقین دلایا کہ جو لڑکے لڑکیوں کو ستاتے ہیں وہ دم خم قطعی نہیں رکھتے۔ اگر لڑکیاں جوابی حملہ کریں لڑکوں کا قلعہ مسمار ہو سکتا ہے۔

پھر بھی لکھنوی لڑکیاں پس و پیش میں تھیں کہ ثریا کے ساتھ حادثہ ہوا۔ چند لڑکوں نے اُسے اتنا ستایا کہ وہ بدحواس ہوگئی۔ تب برجیس نے جوابی حملے کا پروگرام بنایا۔ اُس وقت چند لڑکیاں اُس کے ساتھ تھیں کہ ایک صاحب پھنس گئے۔ یہاں تک کہ سائیکل چھوڑ کر اُنھیں بھاگنا پڑا۔ اِس فتح نے لڑکیوں کو باہمّت بنا دیا تھا۔ ٹولی بنی اور لڑکیوں نے برجیس کو اپنا کیپٹن بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سڑک جو سرِ شام لڑکوں سے بھر جاتی تھی لڑکیوں کا نکلنا مشکل تھا۔ وہ صاف ہوگئی اور لڑکوں نے اِدھر کا رُخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا!

آج جو ایک لڑکے کی حجامت بنی وہ کیپٹن برجیس کی اُپج کا نتیجہ تھی — بنگلہ خالی تھا۔ برجیس کے والدین صبح ہی کہیں چلے گئے تھے۔ برجیس کو بھی ساتھ لے جانا چاہا لیکن وہ نہیں گئی۔ اِس لئے آج کھُل کر شرارت کرنے کا اُسے موقع مل گیا!

"ارے بھئی دیوان جی!" سب انسپکٹر نے گہرا کش لیا اور کہا۔

"جی حضور!" دیوان جی نے قریب آکر کہا۔

"نئی واردات!" سب انسپکٹر نے انور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "انوکھی بھی اور حسین بھی! (ایک لمحہ رُک کر مُسکرا کر) رنگین بھی اور معطّر بھی!"

"کیا ہوا؟" دیوان جی نے انور کو گھُورا اور پُوچھا۔ سب انسپکٹر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"صاحب بہادر انگلینڈ سے آئے ہیں اور کہتے ہیں بیرسٹر ہیں — کل دن دہاڑے لڑکیوں نے حجامت بنا دی اِن کی؟ — ارے میاں! ہم ملازم نہ ہوتے تو روزانہ خلاف ورزی کرتے تاکہ روز پکڑے جاتے — ایک یہ ہیں کہ چاہتے ہیں کہ پولیس کے جوتوں سے شگفتہ پھُولوں کو روندا دیں۔ کیا خوب؟"

دیوان جی نے پُوری رُوداد سُنی تو ہنس دیئے اور گُدگُدی کُھجانے لگے۔ پھر پُوچھا۔

"کیپٹن برجیس رہتی کس بنگلے میں ہے؟" انور نے بتایا تو دیوان جی کی ہنسی رخصت ہوگئی۔ گھبرا کر داروغہ جی کو دیکھا اور کہا: "پتہ تو ایس پی انٹیلی جنس کے بنگلے کا ہے!" یہ سُنتے ہی سب انسپکٹر نے تازہ جلایا ہوا سگریٹ پھینک دیا اور انور کو گھُور کر دیکھا اور کہا۔

"رفو چکّر ہو جایئے صاحب بہادر! ہمیں جیل میں چکّی نہیں پیسنی ہے . . ."

انور پولیس اسٹیشن اِس لئے نہیں گیا کہ رپورٹ لکھائے۔ اُسے معلوم تھا کہ پولیس بھی شوخ چنچل لڑکیوں کے خلاف اقدام نہیں کرتی۔ وہ اِس غرض سے آیا تھا کہ کیپٹن برجیس کے متعلّق معلومات کرے جس میں وہ کامیاب نہ ہو پایا تھا۔ اب دیوان جی نے راز کھول دیا تھا تب وہ مطمئن تھا کہ اُس کی کوشش رائگاں نہیں گئی۔ انور مطمئن تھا کہ کیپٹن برجیس کے باپ کو اگر قانون نے اختیارات دے رکھے ہیں تو حُسن نے برجیس کو کیپٹن بنا دیا اور اختیارات سے نواز دیا تو کیا قیامت ہوگئی!؟

انور کو اُس کی ماں نے خط لکھ کر کیپٹن برجیس کے بنگلے کا پتہ دیا تھا اور کہا تھا کہ مِل آنا اُن کا حوالہ دے کر۔ اُسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ماں کا مُدّعا کیا ہے؟ ماں کے حکم کی تعمیل میں اُس نے بنگلے کا رُخ کیا تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ کیپٹن برجیس سے اُس کی مُڈبھیڑ ہو جائے گی اور لڑکیاں اُس کی حجامت بنا دیں گی!؟

ایک دن برجیس کی ماں خط پڑھ چکیں تو برجیس اور فریدہ سے اُنھوں نے پُوچھا: "جس روز میں باہر گئی تھی کوئی مِلنے آیا تھا؟"

"پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ آدمی تو در کنار!" برجیس نے کچھ اور سمجھ کر جواب دیا۔

برجیس کی والدہ ہنسنے لگیں اور کہا: "کوئی آیا ضرور تھا۔ خط یہی بتاتا ہے۔" برجیس اور فریدہ نے یک زبان ہو کر انکار کیا۔ تب برجیس کی ماں نے لفافے سے فوٹو نکالا اور دکھاتے ہوئے پوچھا: "تم بھول رہی ہو۔ یہ لڑکا آیا ہوگا ——" دونوں نے فوٹو دیکھا تو دونوں کی سانس رُک گئی۔ پھر برجیس نے کہا۔

"اِن کے لئے تو ہم قسم کھا سکتے ہیں کہ یہ حضرت تو قطعی نہیں آئے۔" فریدہ نے ہاں میں ہاں مِلائی۔ برجیس کی ماں چُپ ہو گئیں۔ چُپ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انور کی ماں نے خط میں انور کے آنے کی بات لکھی تھی جبکہ لڑکیاں مُنکر تھیں۔ اُنھوں نے لڑکیوں کے بیان پر انور کی ماں کو لکھ دیا کہ صاحبزادے نہیں آئے تھے۔

بات ہو گئی۔ لیکن فریدہ ذرا پریشان تھی۔ اُسے راز کُھلنے کا ڈر ہوا۔ برجیس نے اپنے ڈر کا اظہار کیا۔ وہ بھی فکرمند تھی۔ اُسے شبہ ہوا کہ رُوداد خط میں نہ ہو۔ اِس لئے فریدہ سے کہا کہ خط اُڑائے۔ فریدہ نے کوشش کی لیکن خط اُس کے ہاتھ نہ لگا۔ البتہ اِتنا معلوم ہو گیا کہ اور کوئی بات خط میں نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم کر لیا کہ انور کی ماں سے ریل کے سفر میں دوستی ہوئی تھی۔ لہٰذا اُسے اطمینان ہو گیا۔

لیکن دوسرے ہفتے جب دوسرا خط آیا اور ماں کے تیور تیکھے دیکھے تب فریدہ نے بھول کی آڑ لے کر اعتراف کر لیا کہ فوٹو والے صاحب آئے تھے۔ جس پر ماں نے پوچھا۔

"خاطر کی تھی یا نہیں؟"

فریدہ نے گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا: "خاطر خوب کر دی تھی امّی! جی چاہے آپ پُچھوا لیجیے۔"

ماں نے اطمینان کا اظہار کیا اور کہا: "اچھا کیا۔ وہ جسٹس عثمان کا لڑکا ہے۔"

فریدہ نے موقع مِلتے ہی ساری بات بڑی بہن برجیس کو بتائی اور کہا: "آپا! اب خیر نہیں ہے۔ ملزم تمھارا جسٹس عثمان کا فرزند ہے!"

برجیس نے کتاب پر سے نظریں ہٹائیں اور فکرمند انداز سے پُوچھا: "کیا ہوا ——

میں بھی کیپٹن ہوں!"

دوسرے دن برجیس نے فریدہ سے کہا کہ پتہ لگائے کہ ملزم آیا کیوں تھا؟ برجیس کا تجسس جاگ چکا تھا۔ اِسی لئے فریدہ کو اُس نے کھوج لگانے کی ہدایت کی تھی ——— اور جب فریدہ نے برجیس کے کان میں آنے کی غرض کا راز بتایا تو کیپٹن ہونے کے باوجود برجیس اپنے چہرے کے رنگ بدلنے پر قابو نہ پا سکی اور فریدہ اپنی ہنسی نہ روک سکی!

جس روز منگنی تھی کیپٹن برجیس نے فریدہ کے کان میں کچھ کہا۔ وہ کِھلکِھلا کر ہنس دی اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ "ابھی جواب لاتی ہوں!" پھر لڑکیوں کو لے کر ڈرائنگ رُوم کے چکر کاٹنے لگی۔ موقع مِلتے ہی پردہ ہٹایا اور جس صوفے پر انور بیٹھا تھا اُدھر لپکی اور پُوچھا: "کیوں جناب! آپ کیسے آئے؟ —— کیپٹن برجیس سے اجازت حاصل کی یا نہیں؟"

"نہ بھُولیے کہ ایک مقدمہ ابھی فیصل نہیں ہوا۔ دوسری چارج شیٹ مِل جائے گی!" دوسری بولی۔

"ورنہ چُولھا پھُونکنا پڑے گا!" تیسری بولی۔

"اور ہرجہ خرچہ الگ دینا پڑے گا!"

"دوبارہ غلطی میں کیسے کر سکتا تھا!؟" انور نے مُسکراتے ہوئے کہا: "اِس بار میں کیپٹن کی اجازت سے آیا ہوں —— تھوڑی دیر بعد کیپٹن کی تحریر نہیں اُن کی انگشتری ثبوت میں پیش کر دوں گا!"

نکاح والی شب کو جبکہ انور سہرے کی لڑیوں میں مُنہ چُھپائے تھا کہ اُس کے دوست نے ایک پرچہ دیا۔ لکھا تھا ——

"کیوں حضرت! آپ پھر اِدھر آئے؟ کِس کی اجازت سے؟ کیا کیپٹن برجیس کا پرمی شن Permission ہے آپ کے پاس؟ —— فریدہ"

انور نے سہرے کی لڑیوں کی آڑ میں جواب لکھ دیا —— "کیپٹن برجیس کی گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا ہوں تاکہ جسٹس عثمان کے ہاں کیپٹن برجیس کو حاضر کر دوں۔ حکم عدالتِ عالیہ کا ہے لہٰذا اب مجھ سے تعرّض نہیں کیا جا سکتا —— انور"

گیارہ بجے شب کو کیپٹن برجیس کو انور کے حوالے کر دیا گیا تاکہ وہ جسٹس عثمان کے حکم کی تعمیل میں 'حاضر گھر' کر دے! جب رُخصتی ہو گئی تو فریدہ نے لڑکیوں کے جھرمٹ میں کہا: "یہ ہے انصاف ——!!"

"کیا مطلب؟" ثریا نے پُوچھا۔ فریدہ نے ہنسی پر قابو نہ پاتے ہوئے کہا۔

"Prosecutor حوالے ملزم کے ——" لڑکیوں نے قہقہہ لگایا اور زرینہ نے کہا۔

"اب مُلزم گِن گِن کر بدلے لے گا! گیلی لکڑیاں پھُنکوائے گا، برتن منجوائے گا، کھانا پکوائے گا!!"

"اور سزا بھی تو دے گا!" ثریا نے دہلا لگایا۔

"بڑی عدالتیں انصاف کرتی ہیں!" فریدہ نے ٹوکا اور کہا: "جسٹس عثمان عدالتِ عالیہ کے جج ہیں۔ چھوٹی عدالت کے مجسٹریٹ نہیں ہیں۔ اِس لئے یہ کچھ بھی نہ ہوگا۔"

"اب فریدہ کو کیپٹن بنا دیا جائے؟" ایک لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا تو فریدہ

کانوں پر ہاتھ رکھ کر بہ کہتی ہوئی بھاگ گئی۔

"اب کیا میرا وارنٹ بھی نکلوانا چاہتی ہو؟"

برجیس سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اُس نوٹ کو پڑھ رہی تھی جو ابھی ابھی اُسے فریدہ کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ فریدہ نے لکھا تھا ——

"برائے منظوری

مناسب ہوگا کہ مسٹر انور کے خلاف جو مقدمہ التوا میں ہے اُس کی سماعت ہو اور جلد از جلد فیصلہ کر دیا جائے۔ انصاف کے تقاضے کے تحت، نیز ہدایتِ دیگراں کے لئے بھی لازمی ہے کہ جلد فیصلہ ہو تاکہ لاء اینڈ آرڈر پر بھی آنچ نہ آئے۔ لہٰذا اِس سلسلہ میں جلد اقدام کی ہدایت دی جائے۔

فریدہ"

"آپ کو اِس سلسلے میں کیا کہنا ہے؟" برجیس نے انور کو مُسکرا کر دیکھا اور پُوچھا۔ جو پیچھے کھڑے رہ کر فریدہ کی تحریر پڑھ چکا تھا اور ہنس رہا تھا۔ برجیس کے استفسار پر بولا۔

"مجھے اِس نوٹ سے اتفاق ہے بشرطیکہ عدالت خود مختار ہو۔"

برجیس نے فریدہ کے نوٹ پر اپنا یہ نوٹ لکھا

"ہمیں اتفاق ہے نوٹ ہٰذا سے۔ اگلے اتوار کو عدالت میں اپنا کیس مع ثبوت کے پیش کریں۔ خصوصی عدالت کا قیام فوری طور پر ہو رہا ہے۔

کیپٹن برجیس"

غزالہ کیپٹن برجیس کی مسند کرسی عدالت پر تھی۔ عدالت کی نشست اندرونی ڈرائنگ رُوم میں تھی۔ فریدہ اور جُملہ لڑکیاں موجود تھیں۔ فریدہ نے چارج شیٹ پڑھی۔ انور نے جُرم سے انکار کیا۔ فریدہ اور دوسری لڑکیوں نے گواہی دی۔ اُس وقت کافی ہنگامہ مچا جب کیپٹن برجیس کی گواہی کے لئے انور نے مطالبہ کیا۔ فریدہ نے مخالفت کی۔ اُس کا کہنا تھا کہ Prosecution کو حق ہے کہ جس گواہ کو چاہے پیش نہ کرے۔ انور کا کہنا تھا کہ کیپٹن برجیس اہم گواہ ہیں۔ ساتھ ہی مقدمہ کی تحقیقات بھی اُن کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ لہٰذا اُن کی گواہی ضروری ہے۔ اِس لئے کہ انور نے کسی گواہ سے جرح نہیں کی تھی لیکن کیپٹن برجیس سے جرح کرنا چاہتا تھا۔ کافی شور و ہنگامہ کے بعد غزالہ نے صفائی کا اعتراض رد کر دیا اور کہا کہ صفائی کی شہادت پیش ہو۔

انور نے ثبوت میں ماں کا خط عدالت میں پیش کیا اور کہا کہ وہ خود سے ممنوعہ علاقے میں نہیں گیا تھا بلکہ ماں کے حکم کی تعمیل میں گیا تھا۔ اِس لئے وہ بے قصور ہے۔

فریدہ نے جواب الجواب میں یہ دلیل دی کہ جو خط دورانِ تحقیقات پیش نہیں کیا گیا اُس پر اب غور نہیں ہو سکتا۔ پھر جھڑپ ہوئی۔ انور نے قانون کی آڑ لی۔ فریدہ نے کہا کہ ہم اپنے قانون خود رکھتے ہیں۔ خارجی قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا آخر عدالت نے فیصلہ محفوظ رکھا اور سماعت ختم ہوئی۔

سہ پہر کو عدالت نے فیصلہ سُنا دیا —— مجسٹریٹ غزالہ نے اپنے فیصلہ میں لکھا تھا کہ "ملزم خاندانی تعلیم یافتہ مہذب اور باکردار ہے۔ اِس کا سابقہ ریکارڈ شاندار ہے۔ لڑکیوں کو چھیڑنا اِس کی خصلت نہیں۔ لڑکیوں کی سڑک پر وہ بغیر نیتِ بد کے گیا تھا۔ وہاں اُس سے جو بیگار لی گئی۔ آٹا گندھوایا گیا، کھانا پکوایا گیا اور چُولھا پُھنکوایا گیا۔ وہ شاید لڑکیوں کے قانون سے تجاوز تھا۔ چونکہ ڈیفنس نے اِس ضمن میں عدالت سے فریاد نہیں کی لہٰذا عدالت اُسے فراموش کرتی ہے۔ البتہ یہ مدِ نظر رکھتی ہے کہ خلاف ورزی کی سزا پُوری ہو چکی لہٰذا عدالت کی نظر میں ملزم بے قصور ہے اور بری کیا جاتا ہے۔ البتہ ہرجہ خرچہ قابلِ ادائیگی ہے۔ اِس خیال سے کہ مستغیث صنفِ نازک ہے اور صنفِ نازک کی دلدہی، ہمت افزائی اور ستائش کے لئے خرچ دلایا جاتا ہے۔ دونوں پارٹیز اِس مسئلے کو رضامندی باہم سے طے کر لیں۔ عدالت کو کوئی اعتراض نہ ہوگا —— غزالہ (مجسٹریٹ خصوصی)

فریدہ اور دوسری لڑکیوں نے قہقہہ لگایا اور تالیاں بجائیں۔ انور نے کھڑے ہو کر کہا ؎

"خرد کا نام جنوں رکھ لیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے"

پھر انور نے بہن کی طرف دیکھا اور کہا: "بدنام مرد ہیں کہ جانبدار ہوتے ہیں اور یہاں معاملہ کیا ہے؟ —— لڑکیاں مل گئیں لڑکیوں سے!"

"مسٹر انور!" فریدہ نے ہنستے ہوئے ٹوکا اور کہا: "Contempt of Court کے مرتکب ہو رہے ہیں آپ؟"

"میں نے اپنے الفاظ واپس لئے" انور نے جلدی سے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا اور فریدہ سے کہا کہ وہ ہرجہ خرچہ کی میزان بتلائے تاکہ وہ ادا کر دے۔

فریدہ نے کہا: "ہم سب کو سینما کے دس شو دکھایئے۔ اعلیٰ ناشتہ اور پُرتکلف کھانے کھلایئے ہر شو پر۔ ہر لڑکی کو اُس کی پسند کا ایک ایک مکمل جوڑا دیجئے اور سب کو نینی تال کی سیر کرانے کا وعدہ کیجئے!"

"میں اپیل کروں گا" انور نے کہا۔

"عدالت نے اپیل کرنے کی درخواست خارج کر دی" غزالہ نے قہقہوں کے ہجوم میں کہا۔ تب کیپٹن برجیس نے کہا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ جو ہرجہ خرچہ فریدہ نے طلب کیا ہے وہ پائی پائی ادا ہوگا۔"

"یہ آگ بھی تو آپ ہی نے لگائی تھی۔ اسے بجھایئے بھی آپ ہی!" فریدہ بولی۔

نورسنے شور و ہنگامے میں کہا "میں مقدمہ کا خرچ برداشت کر لوں گا جو فریدہ کی شادی کی مد سے پورا کر لیا جائے گا ــــ سمجھیں؟"

"شٹ اپ ڈیئر" یہ کہتی ہوئی فریدہ ڈرائنگ روم سے بھاگ گئی اور لڑکیاں بھی کھسک گئیں۔ کیپٹن برجیس نے ہنس کر انور کی طرف دیکھا اور انہوں نے بیوی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا سب کو لڑکیوں کے جادو سے بچائے!"

"جو نہ ممکن ہو سکا ہے اور نہ کبھی ممکن ہو سکے گا!" کیپٹن برجیس مسکراتی ہوئی اور دلربایانہ چال سے ڈرائنگ روم سے چلی گئی!!

غیر مطبوعہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

غزل

پروفیسر بیتاب پہلی بھیتی ایم۔کام (علیگ)

پھر مہک اُٹھے تری یاد کے خوش رنگ گلاب
پھر مچلنے لگا پہلو میں دلِ خانہ خراب

اور بڑھ جاتی ہے رنگینی و رعنائیِ حُسن
شرمگیں آنکھوں سے جس وقت جھلکتا ہے حجاب

گیسو و رُخ کی بہاروں سے نکھر آیا ہے
اے مرے دوست ترا حُسن ترا رنگِ شباب

جس کے ہر حرف میں ہو درسِ وفا کی تفسیر
لکھ رہا ہوں میں ترے پیار کی اِک ایسی کتاب

ایک بس مَیں ہی گنہگارِ محبت تو نہیں
کتنے ہی دل ہیں جو ہیں پیار کی خاطر بیتاب

سب مرے چہرے کی تحریر پڑھا کرتے ہیں
کوئی پڑھتا نہیں اے دوست مرے دل کی کتاب

آج یہ حالتِ بیتاب نہ ہونے پاتی
پیار کا پیارے مِل سکتا اگر اُس کو جواب

ن۔ن۔ نجمی ایم۔اے

ظُلم کیا جاں فزا نہیں ہوتا
اِس میں کیا لُطف سا نہیں ہوتا

دِل ہو وحدت پرست کیا؟ جب تک
ایک بُت پر فِدا نہیں ہوتا

چُوم لیتی ہے خود قدم منزل
خضر جب رہ نُما نہیں ہوتا

غم کو دیکھا ہے باوفا ہم نے
خواب میں بھی جدا نہیں ہوتا

ہر طرف حشر کے ہیں سب آثار
حشر پھر کیوں بپا نہیں ہوتا

رنج۔ غم۔ درد سوز۔ یاس۔ ملال
دِل کی دُنیا میں کیا نہیں ہوتا

غرقِ دریا کرے گا کون مجھے
نا خُدا تو خُدا نہیں ہوتا

عشق خود ہے دلیلِ رہ نجمی!
عشق کا رہ نُما نہیں ہوتا

بنجر قدیم

م۔ک۔مہتاب ایم۔اے

ڈبلیو زیڈ۔ ۱۴۴، شیونگر۔ نئی دہلی نمبر ۱۸

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب و نیاز

... آج کل تو آپ مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے لئے تقریبات میں خوب مصروف ہوں گے۔ اُردو ہی کے نہیں دوسرے حلقوں میں بھی ان کوششوں کو خوب سراہا گیا ہے ——— "بیسویں صدی" کے لئے ایک افسانہ "بنجر قدیم" ارسال ہے۔ اُمید ہے آپ اور قارئین پسند فرمائیں گے۔ "بیسویں صدی" کا حلقہ ادب ہی کا نہیں دوستی کا بھی ہے اور جتنے پُرخلوص دوست مجھے اِس حلقے سے ملے ہیں اور کہیں سے نہیں ملے ...

آپ کا ——— م۔ک۔مہتاب

★

وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

ہم کمرے میں اکیلے ہی تھے اور خود اُسی نے کہا تھا کہ آؤ ہو جائے بازی۔

لیکن اُسے پتہ نہ تھا کہ میں اِتنی زور سے سٹرائیک کرتا ہوں کہ وہ ایک گیم بھی نہ جیت سکے گی۔ میں نے اُسے ٹیبل ٹینس کی میز کے گِرد بھگا بھگا کر ہلکان کر دیا۔ جب وہ میز کے قریب آتی تو میں لانگ شاٹس سے پیچھے کھیلنے لگتا اور جب وہ پیچھے ہٹتی تو میں کھیل کو نیٹ تک محدود کر لیتا۔ تینوں گیمز ہار کر وہ آرام کرسی پر جا گری تھی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ پسینے کی دھاریں اُس کی گردن سے ہو کر سفید سینے کی جانب بہہ رہی تھیں۔ خشک بالوں کی کچھ لٹیں پیشانی پر چپک گئی تھیں اور کچھ گردن اور سینے پر پسینے میں غُسل کر رہی تھیں۔ اُس کی گہری سبز ریشمی ساڑی بجلی کے قمقموں میں آنسوؤں کی مانند چمک رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اور بھی کُشادہ ہو گئی تھیں۔ سینہ طوفانی سمندر کی مانند اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ مُنہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔

میں نے اُس کا کالا سوئٹر ہنگر سے ہٹا کر اُس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"بس بھوپی! لو اِسے پہن لو۔ سردی لگ جائے گی۔"

کارڈیگن سے اُس کا عریاں سینہ ڈھک گیا لیکن اُس نے کارڈیگن نہیں اُٹھایا۔ بلکہ کرسی سے پُشت لگائے یوں پڑی رہی جیسے اُسے اِس شکست اور تھکاوٹ میں ایک عجیب لُطف محسوس ہو رہا ہو۔

"آیئے! بیٹھیئے!! کافی منگواتے ہیں۔"

"کیوں ہارنے پر مایوس ہو گئیں؟" میں نے کرسی قریب لاتے ہوئے کہا۔

"اوں ہوں۔ مجھے کھیل کا جتنا لُطف آج آیا پہلے کبھی نہیں آیا ہو گا۔"

وہ مجھے عجیب انداز سے دیکھ رہی تھی۔ میں پہلے بھی اُس سے کئی بار مل چُکا تھا لیکن اُس کی نگاہوں میں یہ جذبہ میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

کافی کے ساتھ ہم خوب باتیں کرتے رہے۔ بھوپی خوب چہک رہی تھی جیسے اُس کے جسم کا تمام مَیل دُھل گیا ہو اور طبیعت پھُول کی مانند شگفتہ ہو گئی ہو۔

"رات ہو رہی ہے اب مجھے اجازت دیجیئے۔"

"نہیں جی۔ ابھی کہاں۔" وہ میرے بازو میں بازو ڈالے بولی۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی لڑکی تو نہیں جھانک رہی ہے۔ پھر اطمینان سے پُوچھا۔

"اور کیا؟"

"میں تو آپ کے لئے کھانا بنوا رہی ہوں اور پندرہ منٹ میں میری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔ پھر میرے کمرے میں چل کر باتیں کریں گے۔ کھانا کھائیں گے۔"

"پھر؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ چلے جایئے گا۔" اور اُس کے مُنہ سے ہنسی کا فوّارہ پھُوٹ پڑا جیسے وہ میری بات کے کوئی اور معنی سمجھ گئی ہو۔

"آپ مجھ سے زیادتی کر رہی ہیں۔"

"آپ نے کہا ہی کچھ اس ڈھنگ سے تھا۔"

"اچھا لیجئے!" اور اس نے ہنستے ہنستے اپنی ہتھیلی میرے سامنے پھیلا دی۔

"یہ کیا؟"

"دیکھیے نا؟"

"لیکن آپ کو کس نے بتایا کہ میں ہاتھ دیکھ سکتا ہوں؟"

"اردشی نے۔"

اتنے میں باہر گھنٹی بجی۔ ہوسٹل میں کوئی ملاقاتی کسی لڑکی سے ملنے آیا ہوگا۔ اور بھوپی سوئٹر پہنتے ہوئے باہر چلی گئی۔ مجھے اردشی پر غصہ آرہا تھا کہ اس نے نہ جانے کالج کی اور کس کس لیکچرر سے کہہ دیا ہوگا اور ان عورتوں سے تو خدا بچائے۔ جتنا زیادہ پڑھتی ہیں اتنی زیادہ وہمی ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن میں اردشی کا ممنون بھی تھا۔ اس عورت کی صحبت میں بیٹھنے میں کتنا لطف تھا۔ وقت اڑتا چلا جاتا تھا۔ خون اور پسینے کی خوشبو نے مل کر عمدہ کاک ٹیل کا سماں باندھ دیا تھا۔ پھر اس کی باتیں اور اصرار کا انداز جیسے کوئی پرایا مرد نہ ہو۔ "نہیں جی! ابھی کہاں؟" اردشی میری بہن کی سہیلی ہے۔ ایک دن میری بہن کے کہنے پر اس نے اپنا ہاتھ دکھایا تھا۔ میں نے کہا تھا فیس؟ اور وہ کمرے سے بھاگ گئی تھی۔ شاید اسی فیس کے عوض مجھے بھوپندر کے اتنا قریب آنے کا موقع ملا تھا۔ ورنہ اس سے میری اتنی ہی واقفیت تھی کہ وہ ایک خوبصورت اور دلکش ناز و انداز کی عورت تھی جو لیڈیز کالج کے ہوسٹل میں رہتی تھی۔ دو تین بار مختلف تقریبات پر ہمارے کالج میں آچکی تھی۔ دوسروں کی خدا جانے لیکن مجھ پر وہ ایک امٹ چھاپ چھوڑ گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اس سے مزید کھلنے کی کوشش کی مگر ہمیں قریب لانے کا سہرا اردشی ہی کے سر تھا۔ ورنہ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ مجھے ہوسٹل میں بھی مدعو کرنے لگے گی۔

کامن روم کا دروازہ کھلا۔ بھوپی دروازے میں کھڑی تھی کشیدہ قامت اور کسے ہوئے اکہرے جسم کی بھوپی جسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر آدمی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بھاری فال کی سبز ساڑی میں بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔

"آئیے میرے کمرے میں چلیں! میری ڈیوٹی ختم ہوگئی ہے۔"

اس نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا اور خود لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ میں تپائی پر رکھا میگزین دیکھنے لگا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر میرے قریب کرسی پر آبیٹھی۔ ٹیلکم پاؤڈر کی خوشبو سے کمرہ بھر گیا۔ بال سنور گئے تھے۔ چہرہ دمک اٹھا تھا۔ ہونٹ اور آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اس نے ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ میرے سامنے پھیلاتے ہوئے بولی۔

"کھانا آدھ گھنٹے میں تیار ہوگا۔ کچھ بتائیے نا!"

میں نے نہ جانے کیوں اس کا گلابی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور انگلیوں سے ابھاروں کو دبانے لگا۔ مجھے اپنے جرم کا احساس تھا کہ میں اس کا ہاتھ علم کے طور پر نہیں، جذبات کی آسودگی کے لئے دبا رہا ہوں۔ یہ اس کے قرب کا اثر تھا کہ میں اس کی خوشبو میں کھو کر اپنے وجود سے بے خبر ہو رہا تھا۔

"ہریش جی کچھ بتائیے بھی تو سہی؟" اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"بس سب ٹھیک ہے۔" میں ہنسنے لگا۔

"نہیں جی۔ نہیں۔ کچھ بتائیے بھی۔" وہ بچوں کی طرح مچلنے لگی۔

اب میں سنبھل گیا تھا۔ اس کی گٹھیلی انگلیوں، چپٹے اور مستطیل ناخنوں، ٹیڑھے اور گھٹے ہوئے انگوٹھے، وینس کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں، چاند کے ابھار پر سرخ داغوں، مریخ کے ابھار پر شادی کی لکیر اور دور سے کاٹتی ہوئی لکیروں کو دیکھ کر مجھ پر سنجیدگی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کہہ ہی دیا۔

"مس بھوپندر! آپ مس نہیں ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ کرسی کھینچ کر میرے اور قریب آگئی۔ اس کے جسم کی گرمی میرے جسم تک پہنچنے لگی۔ جیسے کسی عمدہ شراب کا نشہ ہلکے ہلکے دماغ پر چھایا جا رہا ہو۔ اس کا ہاتھ جتنا گرم اور گداز تھا، لکیریں اتنی ہی خطرناک تھیں۔ دل اور دماغ کی لکیروں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ برف پوش آتش فشاں ہے جس سے کوئی بھی تباہی خارج از امکان نہیں۔ لیکن میں تو خود ہی اس بیرونی برف کی دلکشی سے پاگل ہوا جاتا تھا اور اس لاوے کو نگل جانے کو تیار تھا۔ پہاڑ کی چوٹی سے گر کر مرنے کا خدشہ ہوتا ہے لیکن جو لطف چوٹی پر ہے وہ میدان میں کہاں؟

ہاتھ کی اضطرابی کیفیت انگوٹھے کی بناوٹ اور دھبوں کو دیکھتے ہوئے میں نے دلیری سے کہہ دیا۔

"مس بھوپندر! آپ اپنے خاوند کو قتل کر چکی ہیں!"

وہ ایک دم برہم ہو اٹھی جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے کھینچ لیا جو ٹیبل لیمپ کو جا کر لگا۔ لیمپ گر گیا۔ بلب ٹوٹ گیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ اس نے دیوار پر لگے بٹن کو دبا کر ٹیوب روشن کر دی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

"ہاتھ کی لکیریں جھوٹ نہیں کہتیں میڈم!"

"تو آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہئے تھی ایک لڑکی کے بارے میں ایسی بات کرتے ہوئے۔ آپ میری شرافت اور دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ میں نے آپ کو قریب آنے دیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھے بے شرم اور

بدکردار سمجھ کر جو کچھ چاہیں کہتے چلے جائیں۔ اگر آپ چاہیں کہ مجھے بلیک میل کر سکیں تو یہ ناممکن ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اتنے چالاک ہوں گے۔ میں نے آپ کو بلا کر سخت غلطی کی۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شعلے کی طرح بھڑک رہی تھی۔ میں کھانا کھائے بغیر باہر چلا گیا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرا اندازہ غلط نہ ہو۔ لیکن میں نے سوچا تھا کہ وہ اس دوستانہ ماحول میں میری غلطی پر قہقہے لگائے گی۔ میں نے سوچا ہی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی برہم ہو جائے گی۔ کسی کو بُری بات نہیں کہنی چاہیے۔ مجھ سے جذبات میں غلطی سرزد ہو گئی۔ دوسرے دن کالج میں میرا موڈ بہت خراب رہا۔ مجھے شرم آ رہی تھی۔ شام کو سر جھکائے کالج سے چلا آ رہا تھا کہ ایک ٹیکسی نے میرا راستہ روک لیا۔ اُس میں بھوپندر بیٹھی تھی۔ اُس نے مجھے نمستے کی اور میں نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔ اُس کے چہرے پر زردی کی تہہ پھیلی ہوئی تھی۔ بال بھی بے ترتیب تھے۔ آنکھوں پر بے خوابی کی کیفیت تھی لیکن ایک مسحور کن خوشبو نے اب بھی اُس کے گرد ہالہ بنا رکھا تھا۔

ٹیکسی جا چکی تھی۔ ہم خاموش چلتے ہوئے ایک قریبی باغیچے میں آ گئے تھے اور پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ ساتھ ٹہل رہے تھے۔

"میں آپ سے رات کی گستاخی کے لئے معافی مانگنے آئی ہوں۔" اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہئے تھی۔ کل مجھ سے بہت بے وقوفی ہوئی۔ مجھے آپ کے جذبات کو مجروح کرنے کا سخت افسوس ہے۔"

"نہیں۔ مجھے مہمان کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرنا چاہئے تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ نے مجھ سے مذاق ہی کے طور پر کہا ہو۔ آپ کھانا کھائے بغیر چلے آئے۔ میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ بہت روئی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ اروشی سے یہ بات نہ کہئے۔" اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ناک اور رخسار سرخ سرخ ہوتے جا رہے تھے۔

"آئیے باغیچے کے کارنر پر بیٹھ کر چائے پئیں۔"

"نہیں۔ پہلے مجھے کل کے لئے معاف کر دیجئے۔ میرے ہوسٹل چلئے۔ چائے بھی وہاں پیجئے اور کھانا بھی وہیں کھائیے۔"

"مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے آپ مجھے معاف نہیں کرنا چاہتے۔ آپ چاہتے ہیں میں شرم اور ندامت میں جلتی رہوں۔ آپ نہ جائیں گے تو میں کھانا نہ کھاؤں گی۔" آنسو پھر اُس کی آنکھوں سے جھڑنے لگے اور میں نے سر جھکا دیا۔

چائے کے ساتھ رس گلے، جامن، کیک، کاجو، پیسٹری وغیرہ سب کچھ تھا۔

"مطلب ہے آپ کو یقین تھا کہ میں آؤں گا۔" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ہوں۔" بھوپندر نے بجلی کی کیتلی کا بٹن دباتے ہوئے بہت اعتماد سے کہا۔

اُس کے چہرے سے غم کی گھٹا اُٹھتی جا رہی تھی، مُسکراہٹ کی کرنیں پھیلتی جا رہی تھیں، جیسے احساسِ گناہ ختم ہوتا جا رہا ہو۔ چائے پر مُلکی مسائل کے بارے میں بات ہوئی۔ کل کی کسی بات کا ذکر نہیں ہوا۔

"آج ٹیبل ٹینس نہ کھیلو گی؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اوں ہوں۔" وہ میرے کندھے سے کندھا لگاتے ہوئے بولی۔ "آپ تو مقابل کو یوں زچ کرتے ہیں جیسے اُس سے انتقام لے رہے ہوں۔ میری ٹانگیں تو اب بھی درد کر رہی ہیں۔"

"آپ نے چیلنج جو دیا تھا۔ ورنہ شاید میں اِتنی تیزی سے نہ کھیلتا۔"

ہم پھر کامن روم میں آ گئے۔ دو لڑکیاں کھیل رہی تھیں۔ اُنھوں نے جلد گیم ختم کر دی۔ میں کچھ دب کر کھیل رہا تھا اور گیم خوب جمی۔ بھوپی ایک دم بہت شاداں و شگفتہ نظر آنے لگی۔ لڑکیاں اُسے خوب داد دے رہی تھیں۔ کھیل کے بعد ہم کل کے واقعات کو بھول چکے تھے۔ ہم اُس کے کمرے میں آ گئے تھے۔

"ایک ایک پیالہ کافی!"

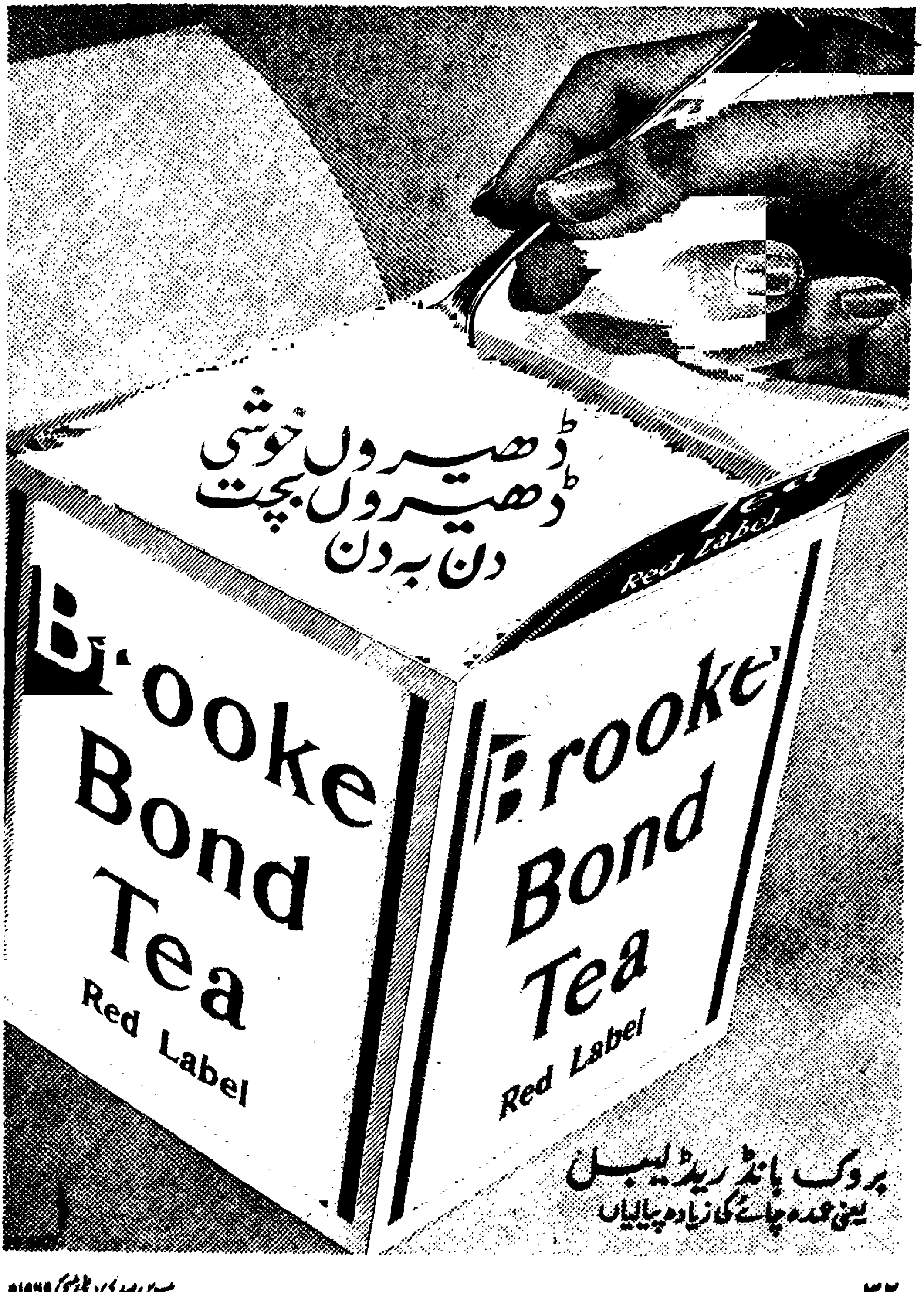
"نہیں۔" میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ جلدی ہے۔"

"اچھا تو تشریف رکھئے میں کھانے کا جلد انتظام کرتی ہوں۔"

بھوپی لباس تبدیل کر کے باہر چلی گئی اور میں اُس کی کتابوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ رابرٹ براؤننگ کی نظموں کی ایک کتاب سے بہت خوشبو آ رہی تھی۔ ورق اُلٹے تو وہاں سبز کاغذوں پر ایک خط رکھا تھا۔ دروازے کی طرف دیکھ کر میں نے خط کھولا۔ چار برس پہلے کا تھا۔ کسی راجندر کا خط تھا۔ کوئی لڑکی ہو سکتی تھی۔ تجسس بڑھا۔ میں نے پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ نہیں لکھنے والا کوئی مرد تھا۔ پیار میں ڈوبا ہوا خط! جسے کوئی بہت قریبی ہی شخص لکھ سکتا تھا۔ کہیں پہاڑ پر جانے کی دعوت تھی۔

ابھی دو صفحات باقی تھے کہ پاؤں کی آہٹ سُنائی دی اور میں نے کتاب رکھ دی۔

بھوپندر چابیوں کا چھلا اُنگلیوں میں گھماتی چلی آ رہی تھی۔ بیل باٹم پائجامے اور چھوٹی قمیص میں اُس کا جسم خوب نمایاں ہو رہا تھا۔ خشک بال بار بار اُس کے چہرے پر گھر آتے جنھیں وہ سر جھٹک جھٹک کر پیچھے ہٹا رہی تھی۔ کان کے قریب اُس نے زرد گلاب کا ایک بڑا سا پھول اُڑس رکھا تھا۔ وہ بہت خوش تھی اور میز پر کھانا لگاتے ہوئے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ میں کل کے تلخ تجربے کے


ڈھیروں خوشی
ڈھیروں بچت
دن بہ دن
ooke
Bond
Tea
Red Label
rooke
Bond
Tea
Red Label
بروک بانڈ ریڈ لیبل
یعنی عمدہ چائے کی زیادہ پیالیاں

باوجود پھر اُس کی جسمانی کشش کے دائرے میں اُلجھتا جا رہا تھا۔ لیکن سوچ رہا تھا کیسی متلون مزاج لڑکی ہے۔ کل کیسی بھڑک اُٹھی تھی۔ شام کو کیسی تصویرِ غم بنی ہوئی تھی اور اب کیسے چہک رہی ہے۔

کھانا بہت اچھا تھا۔ باتیں اُس سے بھی لذیذ! کل کی بات تو جیسے فراموش ہی ہو گئی تھی۔ اُس کی باتوں میں خلوص تھا اور وہ میرے بہت قریب آنا چاہتی تھی۔ اُس نے پکنک پر جانے کی دعوت جھٹ قبول کر لی۔

باہر کافی اندھیرا ہو چکا تھا لیکن بھوپندر کا اصرار تھا کہ کافی پی کر جانے دوں گی۔ میرا من نہ جانے کیوں کتاب میں رکھے ہوئے خط کی طرف بھٹک رہا تھا جو مجھے اُڑا لینا چاہئے تھا۔ میں بھوپندر کا قرب حاصل کرنے سے پہلے اِس معاملے کی وضاحت چاہتا تھا۔ پھر مجھے اُس کے غیر معمولی ہاتھ کا خیال آنے لگا۔ اگر وہ کل معاملے کو بگاڑ نہ دیتی تو اُس کی شخصیت کے کئی روشن اور تاریک پہلو سامنے آسکتے تھے۔ کافی ختم کرنے کے بعد ہم بہت گھل مل گئے تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ میرا اُس سے الگ ہونے کو جی نہ چاہتا تھا۔ رات ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"اب اجازت دیجئے"

اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ہتھیلی میرے سامنے پھیلا دی۔ ہم آرام کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وسط میں شیڈ لیمپ کا راڈ تھا۔ میں نے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے پانی کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ میں اُس کی ہتھیلی دیکھنے لگا۔

"بھوپندر جی! ہتھیلی جو کچھ کہتی تھی میں نے کچھ کہہ دیا۔ اب آپ کہئے یہ آنسو کیا کہتے ہیں؟"

بھوپندر نے سر میرے زانوؤں پر رکھ دیا۔ اُس کے آنسوؤں سے میری پتلون بھیگنے لگی۔ اُس کے خوبصورت گہرے بھورے بال لیمپ کی روشنی میں بہت ہی خوبصورت دکھائی دینے لگے تھے۔ میں بے اختیار اُن میں اُنگلیاں پھیرتا ہوا اُس سے کہہ رہا تھا۔

"آخر کچھ کہو تو سہی بھوپی؟"

وہ سسکتی رہی۔ مجھے ڈر تھا کہیں کوئی اندر نہ آجائے۔ دروازہ کھلا تھا۔

"کیا پڑھے لکھے لوگ یوں روتے ہیں؟"

جواب میں اُس نے زور سے ہچکی لی، سر اُٹھایا اور ہتھیلی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"ہریش جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں کنواری نہیں لیکن میں نے شادی نہیں کی"

"کیا مطلب؟ میں سمجھ نہیں سکا۔

وہ اُٹھی اور دروازہ بند کر کے پھر میرے پہلو میں آبیٹھی۔

"ہریش جی! مجھے شادی سے نفرت تھی"

"کیوں؟"

"میرے پتا جی اُتر پردیش کے ترائی کے علاقے کے ایک آبادکار تھے۔ ہمارے اور رشتے دار بھی پنجاب سے وہاں آگئے تھے۔ ہم دو بہنیں تھیں۔ میں نے جب بھی دیکھا میرے پتا جی شراب پی کر میری ماں کو بے تحاشا گالیاں دیتے اور پیٹتے تھے۔ کیا اُس کا یہ قصور تھا کہ اُس نے میرے پتا جی سے شادی کر لی تھی؟ یہ مار پیٹ دیکھتے دیکھتے میرے دل میں گرہ لگ گئی کہ میں آزاد زندگی بسر کروں گی کسی مرد کی غلامی کا جُوا گردن میں نہ ڈالوں گی۔ ہم دونوں بہنوں کو تعلیم کے لئے نیچے بھیج دیا گیا لیکن میری ماں وہاں رہنے کے لئے مجبور تھی۔ پھر ایک دن وہ اِس ظلم سے نجات پا گئی۔ میرا دل پھٹ رہا تھا مگر میں خوش تھی کہ اُسے اِس شادی کے پھندے سے نجات مل گئی۔ میرے پتا جی میری شادی کر دینا چاہتے تھے لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ جب چھوٹی بہن تعلیم ختم کر کے آئی تو اُس کی شادی کر دی گئی۔ اُسے شوہر اچھا مِلا یا بُرا مگر وہ خوش تھی۔

ایک برس بعد وہ کلکتے سے آئی تو اُس کے بچّہ ہونے والا تھا۔ بچّہ پیدا ہونے میں اُسے جتنی تکلیف ہوئی وہ میں نے سب دیکھی اور شادی پر لعنت بھیجتی رہی۔ لیکن وہ جس طرح اِس معصوم سے گلاب کے پھول سے لپٹ لپٹ جاتی جس طرح اُسے اپنی چھاتیوں سے لپٹا لپٹا کر دودھ پلاتی اِس منظر نے مجھے پریشان کر دیا۔ یہ بچّہ کیا ہے؟ وجود کا یہ ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کی طرف کس طرح کھنچا چلا آتا ہے۔ میرا خیال تھا ستیندر کو زچگی کی اِس تکلیف کے بعد شادی سے نفرت ہو گئی ہو گی مگر بچّے نے تو اُس کی دُنیا ہی بدل دی تھی۔ وہ اور تو اور مجھے بھی بھولنے لگی۔ وہ ہر وقت بچّے ہی میں مگن رہتی اور کوئی بات نہ کرتی۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا اور میں نے شہر چلے جانے کا فیصلہ کر لیا"

"پھر؟" میں نے پُوچھا۔

میں مزید تعلیم کے بہانے شہر آگئی مگر اُس بچّے کے تصوّر نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ کبھی کبھی میری چھاتیوں میں ایک درد کی لہر اُٹھتی۔ میرا جی چاہتا میرا بھی ایک بچّہ ہو جو درد کی اِس لہر کو چُوس لے۔ جس کے نرم نرم جسم کو میں چُومتی رہوں۔ لیکن مجھے تو شادی سے نفرت تھی اور شادی کے بغیر یہ کیسے ممکن تھا۔ کیا یہ شادی کے بغیر ممکن نہیں؟ اِس خیال نے مجھے ایسا پاگل کیا کہ میں نے اپنے ایک دوست راجندر کو اپنے قریب آنے کی اجازت دے دی۔ ہریش جی! جب دل چیر ہی ڈالا ہے تو پھر کچھ چُھپانے

سے کیا حاصل۔ آپ مجھے پست کار کہہ لیں گے، کہہ لیجئے۔ چور کو اگر چور کہا جائے تو اُسے ناراض نہ ہونا چاہئیے۔" میں نے اُس کے سُرخ سُرخ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور وہ میرے زانو پر سر رکھے روئے جا رہی تھی۔

"ہریش جی! مجھے ملازمت مل گئی تھی۔ راجندر کے قُرب میں زندگی بسر کرتے تین برس ہو چلے تھے۔ راجندر بہت اچھا لڑکا تھا۔ مجھے دل سے چاہتا تھا۔ جب دَورے پر جاتا تو ایسے جادُو بھرے خطوط لکھتا کہ میں جھُوم اُٹھتی۔ کئی بار ذہنی توازن بھی کھو بیٹھتی۔ پھر مجھے خیال آتا کہ شروع زندگی میں میرا باپ بھی میری ماں پر اِسی طرح قربان ہوتا ہوگا۔ مگر مرد کی آنکھوں کے رنگ کا کیا اعتبار؟ اب وہ آیا تو کہتا: چلو بھوپی شادی کر لیں۔"

مگر مجھے تو اِس لفظ ہی سے نفرت تھی۔ مجھے تو بچّہ چاہئیے تھا شادی نہیں! اور میں ٹال دیتی۔ میرے پتا جی کا اچانک سورگباس ہو گیا۔ میں گاؤں گئی ہوئی تھی۔ کچھ دن بعد راجندر بھی ماتم پُرسی کے لئے وہاں آ گیا۔ ایک رات گئے وہ میرے کمرے میں چلا آیا۔ وہ مجھے بہت دلاسا دیتا رہا۔ پھر کہنے لگا چلو شہر چل کر شادی کر لیں۔

"تم مجھے شادی کے لئے مجبور کیوں کرتے ہو؟" میں نے درشتی سے پُوچھا۔

"میں گھر بسانا چاہتا ہوں۔ زیادہ دیر والدین کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتا اور نہ خوف کی یہ زندگی بسر کر سکتا ہوں!"

"لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔" میں نے سخت الفاظ میں کہا۔

"کیوں نہیں؟" اُس نے غصّے میں میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"تم میرا شادی کا منشا پُورا نہیں کر سکتے۔" میں نے ہاتھ چھُڑا لئے۔

"تم خود ہی اِس قابل نہیں ہو۔" وہ غصّے میں کانپ رہا تھا۔ میں اور بھی بھڑک اُٹھی۔ میں اپنی ذات پر یہ حملہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اُسے تھپّڑ مارنے لگی۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے! ورنہ میں غُل مچا کر تمھیں پکڑوا دوں گی۔

تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟" وہ میرا بازو پکڑ رہا تھا۔ میں اُسے سیڑھیوں سے نیچے دھکیل رہی تھی۔ باہر سردیوں کی برفانی رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔

صبح ہمارے دو ملازم راجندر کی لاش اُٹھا کر لائے۔ رات ہماری گایوں کے احاطے کے پاس ایک شیر نے اُسے پھاڑ کھایا تھا۔"

آنسوؤں کی دھاریں بھوپی کے گالوں پر جم گئی تھیں۔ وہ پتّھر کی مُورتی کی طرح کُرسی کی پُشت سے سر ٹکائے خاموش بیٹھی تھی۔ میں کبھی اُس کی ہتھیلی اور کبھی اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"کچھ کہئیے ہریش جی! اگر آپ میرے درد کا کچھ . . ." وہ ایک سینہ شکن آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

میری کھال اگرچہ ساکن تھی لیکن میرے وجود کا ایک ایک رگ و ریشہ اندر سے کانپ رہا تھا۔ میں چند منٹ پہلے کیا سوچ رہا تھا۔ بھوپی کا چہرہ کتنا دلکش تھا۔ اُس کے گیسوؤں میں کیا شراب کا سا خُمار تھا لیکن اُس کا ہاتھ کیا کہتا تھا؟

میں اِس بنجر قدیم میں ایک اور کسان کو ہلاک نہیں کرانا چاہتا تھا۔

"آپ کو بہت لمبا پشچاتاپ کرنا ہوگا بھوپندر جی!"

میں نے اُس کی مُٹھی بند کر دی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا!!

اُدھر

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور، ایم۔اے، ایم۔او۔ایل، پی ایچ۔ڈی

مدہوشیوں نے دی نگہہ پردہ در مجھے | آتے ہیں میکدے سے دو عالم نظر مجھے
سرکی ہی تھی نقاب کہ اُس جلوہ گاہ میں | اِک برق نے لپیٹ لیا سر بسر مجھے
کاش اِلتفات آپ کا ہو بیشتر، مگر | ہونے نہ پائے اِس کی خبر بیشتر مجھے
ایسا نزار عشق کے چکّر نے کر دیا | چکرا گئے وہ ایک نظر دیکھ کر مجھے
اِس حد تک اِنہماک بڑھا انتظار میں | وہ آ گئے مگر نہ ہوئی کچھ خبر مجھے
آتے ہی آپ کے نظر آتی ہے ہر طرف | بجلی سی کوندتی در و دیوار پر مجھے
آرام پا رہا ہے مرا دِل اُسی قدر | آزار دے رہا ہے کوئی جس قدر مجھے
اِس ڈر سے اُن کی تیغِ نگہہ کو نظر نہ ہو | کرنی ہے پردہ دارئ زخمِ جگر مجھے
یارانِ نیم مست سے خالی ہے میکدہ | کروٹ دِلائے کون اِدھر سے اُدھر مجھے
ڈرتا رہا ہوں اِس قدر آغاز میں کہ اب | انجامِ عِشق سے نہیں لگتا ہے ڈر مجھے

انور یہی سبیل ہے اِخفائے رنج کی
آجائے کچھ ہنسی دمِ عرضِ ہُنر مجھے

۲۷۵، ایسٹ پٹیل نگر، نیو دلی۔۸


LUX
'نئے لکس کے
راجِ سنگار پر
میں فریفتہ ہوں'
فلم سٹار
ببیتا کہتی ہیں
نئے لکس میں
ایک انمول نئی خوشبو ہے
اور بین الاقوامی نئی شان!
آپ بھی آزما کر دیکھئے۔۔۔
رُوپ کا راج سنگار ایک صابن ہے لکس

افسانہ

آخری قطرہ

پروفیسر زکی انور ایم۔ اے

کریم سٹی کالج۔ جمشید پور

پیارے بھائی جان! تسلیم

. . . میری نظر میں آپ کے خط سے بڑی چیز کوئی نہیں ہے! آپ کے خط کا جو مقام ہے وہ چیک کو کہاں حاصل! مجھے آپ کے خط کا شدت سے انتظار تھا۔ کہانیوں پر آپ کی رائے ایک خاص بات ہوتی ہے۔ آگے بڑھنے کے لئے آپ کی رائے سے مجھے روشنی ملتی ہے۔ خط بھی لکھا کیجئے، کرم ہوگا ——— اور یہ لیجئے۔ کسی کے آنسوؤں کا ایک "آخری قطرہ" آپ کے سامنے لرز رہا ہے۔ لیکن یہ کہانی ٹریجڈی نہیں۔ میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔ ٹریجڈی تو ہماری زندگی کی ایک ایک سانس ہے۔ لیکن ہمیشہ ٹریجڈی کہانی اچھی نہیں لگتی۔ تھکا ہوا اور غم زدہ ذہن "بیسویں صدی" سے نئی لگن، نیا جذبہ حاصل کرتا ہے۔ بہرحال آپ اپنی رائے اب کے ضرور لکھئے . . .

آپ کا اپنا ——— زکی انور

★

"کہکشاں" کے لان میں شام کی چائے پر "کہکشاں" کے لوگوں کے علاوہ ایک نئی لڑکی بھی تھی۔ اس نئی لڑکی کا نام ماہ رُخ تھا اور اُسے دیکھ کر لوگ سرگوشی کر رہے تھے کہ لڑکی واقعی ماہ رُخ تھی! وہ بہت ہی خوبصورت تھی، بہت ہی نرم و نازک تھی۔ جیسے لاجونتی، یا جیسے موم کی گڑیا، یا جیسے حباب ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گوشت پوست کی کوئی لڑکی نہ تھی، ایک خیال تھی، ایک تصوّر تھی، حُسن کا ایک تخیّل تھی جو محض ذہن میں اُبھر سکتی ہے۔ یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ تھی یا نہیں تھی۔ اُس کا عدم اُس کا وجود تھا اور اُس کا وجود اُس کا عدم تھا۔ یقیناً وہ صرف محسوس کرنے کی چیز تھی جیسے بہت ہی ہلکی شراب کا نشہ!

اور پروین اُس کا تعارف کرانے لگی تو اُس کے حُسن کی تعریف کرتے ہوئے اُس نے بڑی بات پیدا کر دی۔ اُس نے بہت اطمینان اور بھروسے کے ساتھ کہا کہ ماہ رُخ، ماہ رُخ ہرگز نہ تھی، کیونکہ اُس کا چہرہ چاند جیسا نہ تھا۔ پورنیما کا چاند ماہ رُخ کے چہرے جیسا ہوا کرتا تھا۔

اور پھر شاعرہ پروین نے غالباً فی البدیہہ ایک شعر کہا۔

اور تمام لوگوں نے تالیاں بجائیں اور غالباً تالیوں کی آواز کی چوٹ سے ماہ رُخ تلملا سی گئی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

اور پھر ہوا میں بہت ہی ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا اور لوگوں کے کانوں تک انتہائی نرم و نازک ایک آواز پہنچی۔

"بس بھی کرو پروین . . . خدا کے لئے اب بس کرو!"

"ایک شرط پر!" پروین بڑی شرارت سے مُسکرائی۔

"کیسی شرط؟" ہوا کے دوش پر سرکتی ہوئی ماہ رُخ کی آواز آئی: "یا اللہ تم کہاں لے آئیں مجھے؟"

"رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے" پروین نے کہا۔

"چھی!" ماہ رُخ نے پھر چہرہ چھپا لیا: "عجیب لڑکی ہو تم! یہ ہر جگہ گانے والی بات اچھی نہیں اور وہ بھی ——— کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے ——— شرم نہیں آتی تمھیں؟"

"یہ کوئی فلمی گانا تو نہیں ہے بیٹی" مسز اختر نے کہا: "غالب کی غزل گانے میں کاہے کی شرم۔ آج کل کی لڑکیاں تو گندے گندے فلمی گیت بھی بڑی بے شرمی سے گاتی پھرتی ہیں"

"مگر کٹ ممی" پروین نے جلدی سے کہا "مثلاً توڑ کے دُنیا کی دیوار بلوا کر لے مجھ سے پیار، جو ہوگا دیکھا جائے گا..."

"پروین!" مسز اختر تقریباً چیخ اٹھیں "ایڈیٹ!" لیکن پروین پر کوئی اثر اس لئے نہ ہوا کہ بلوا کر لے مجھ سے پیار کہنے کے بعد وہ شاہد کی طرف دیکھنے لگی تھی اور اب تک پیشانی پر جھکے ہوئے اس کے بالوں میں اُلجھی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کم بخت! تو سیمسن ہے اور تیرا جادو بالوں ہی میں تو ہے یا پھر تیرے گالوں کے اُن گڑھوں میں جن پر کون نہ مر جائے۔

"بیٹی ماہ رُخ گاؤ نا!" مسز اختر نے التجا کی۔

لیکن ماہ رُخ کچھ ایسے کرب سے کسمسا رہی تھی جو کرب کسی کلی کو پھول بننے میں محسوس ہوتا ہے۔

"اور اگر تم غالب کی غزل نہیں گا سکتیں" پروین شاہد کے بالوں سے نکل بھاگی "تو پھر ڈارلنگ کوئی نعت ہی ہو جائے ـــــ میرے مولا بلا لو مدینے مجھے..."

"پری!" سلمان نے کھا جانے والی نظروں سے پروین کی طرف دیکھا ـــــ "بے تکلفی، شوخی، شرارت اور بدتمیزی سب الگ الگ چیزیں ہیں۔ مِس ماہ رُخ تمہاری بہت ہی بے تکلف سہیلی ہو سکتی ہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے لوگ تمہیں شریر اور خوش مزاج سمجھتے ہوں۔ لیکن یہاں تم بدتمیزی کر رہی ہو۔ مِس ماہ رُخ ہماری مہمان ہیں۔"

"جی بھائی جان!" پروین بولی۔ لیکن اب کے بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا اس لئے کہ اب کے وہ شاہد کے گالوں کے کسی گڑھے میں ڈوبنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ مگر وہ مسکرا کہاں رہا تھا جو گڑھے بنتے۔ پروین پر ڈانٹ پڑتی دیکھ کر وہ دُور امرود کے درخت کی طرف دیکھنے لگا تھا اور اپنے پاس بیٹھے پروین کے چھوٹے بھائی کو امرود کے فائدے بتانے لگا تھا۔

مسز اختر نے اپنی بیٹی پروین کی طرف سے ماہ رُخ سے معافی مانگنے کے بعد پھر اُس سے درخواست کی کہ وہ غالب کی غزل سُنائے اور اب ماہ رُخ رضامند ہو گئی اور جیسے ہی ماہ رُخ نے اپنی رضامندی ظاہر کی شاہد نے سلمان کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"تو ہمیں ڈرائنگ رُوم میں چلنا چاہیئے۔"

"کیوں؟" ماہ رُخ نے بہت آہستہ سے پُوچھا "یہاں کیا بُرا ہے۔"

"پیانو ڈرائنگ رُوم میں ہے" شاہد نے کہا "اور مسٹر سلمان پیانو کے ماہر ہیں۔"

"لیکن آج تم پیانو پر بیٹھو گے" سلمان نے بھی ویسی ہی معنی خیز نظروں سے شاہد کی طرف دیکھا بلکہ اُس نے ذرا آنکھ مار کر کہا "پیانو تم بجاؤ گے۔"

"نہیں" شاہد بولا "مجھے تو بخش ہی دیجیے۔"

یقیناً شرارت سے ماہ رُخ بولی "آپ کو انکار کیوں ہے؟"

"جی" شاہد کچھ سوچ کر بولا "میں پیانو بجانا نہیں جانتا۔"

بات یہیں ختم ہو جانی چاہیئے تھی بلکہ اتنی کچھ باتیں بھی پروین کے لئے بہت تھیں اور وہ کچھ عجیب نظروں سے ماہ رُخ اور شاہد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماہ رُخ کی طرف اس لئے کہ وہ شاہد کی طرف کیوں مخاطب ہو گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنا کام بھول گئی تھی؟ اور شاہد کی طرف اس لئے کہ اُس نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں جھکا کر ماہ رُخ سے بات کی تھی۔

اور ستم بالائے ستم۔ ماہ رُخ نے اُس سے پھر پُوچھا۔

"آپ کو تو پیانو بجانا آنا چاہیئے تھا؟"

"میری شکل میں کچھ ایسی بات ہے کیا" شاہد نے پُوچھا "یہ آنا چاہیئے تھا۔ سے آپ کی مُراد؟"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں" ماہ رُخ شرمائی ہوئی سی ہنسی تو پروین کو ایسا محسوس ہوا جیسے آفتاب سوا نیزے پر آگیا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ سلمان کے دل میں قیامت برپا ہو گئی اور قیامت کے ہنگامے اور بڑھ گئے جب ماہ رُخ نے کسی قدر بے تکلفی سے کہا "آپ کے بال وال، اور باتیں کرنے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ مجھے نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ آپ کو پیانو بجانا ضرور آتا ہوگا۔"

"جی نہیں" شاہد کچھ ایسے انداز میں شرمایا کہ ماہ رُخ اور مسز اختر ہنس پڑیں اور پروین اور سلمان کے علاوہ باقی لوگ مسکرانے لگے۔ وہ بولا۔ "میں بین بجاتا ہوں... بین آپ سمجھتی ہیں نا؟... بین... یعنی بین... میرا مطلب ہے وہی بین... سپیرے وہ ناگن والی بین... میرا خیال ہے 'من ڈولے میرا تن ڈولے' تو آپ کو ضرور یاد ہوگا... وجینتی مالا کو آپ جانتی ہیں نا... بس بس بس... وجینتی مالا اور بین کا تصوّر ویسے ہی لازم اور ملزوم ہے جیسے... جیسے... جیسے آپ سمجھ لیجیے ڈرائی فروٹ کی دُکان اور آلو بخارے کا تصوّر!"

مسز اختر اور ماہ رُخ کا ہنسی سے بُرا عالم تھا لیکن سلمان نے جلی بُھنی سی آواز میں کہا۔

"ہمیں ڈرائنگ رُوم میں چلنا چاہیئے۔"

اور پروین کی آواز تو کسی قدر رُندھ گئی تھی۔ اُس نے کہا۔

"شاہد صاحب! آپ کو پتہ نہیں کہ آپ استعمال کئے جا رہے ہیں۔ گانے سے بچنے کے لئے یہ مسماۃ بی بی ماہ رُخ آپ کو گپوں میں پھنسا رہی ہیں۔"

"او مائی گاڈ!" شاہد چیخا اور دونوں ہاتھوں سے اُس نے اپنا سر

[redacted]

تھام لیا اور یہ سب کچھ بھی اُس نے کچھ ایسے انداز میں کیا کہ ماہ رُخ اُس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

لیکن پھر وہ اُٹھے اور سب کے سب ڈرائنگ رُوم کی طرف چل پڑے۔

چلتے ہوئے پروین نے ماہ رُخ کا ہاتھ تھام لیا اور لوگوں سے پیچھے ہوتے ہوئے وہ ماہ رُخ سے بولی۔

"میں یہ چاہتی تھی ماہ رُخ کہ تم سلمان کا دل جیت لو... لیکن تم نے لو..."

ماہ رُخ زور سے ہنس پڑی۔ پھر اُس نے کہا۔

"ہوگا تو بہرحال وہی میری جان جو تم چاہتی ہو"

"لیکن تم شاہد کی طرف کچھ اِس طرح متوجہ ہوگئی ہو کہ..." پروین اِس بار بھی اپنی بات پُوری نہ کر سکی اور اُس کا گلا بیٹھ گیا۔

اور ماہ رُخ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔ میں وہی کروں گی جس کا میں نے وعدہ کیا ہے"

اور پھر وہ تیز چل کر آگے جانے والوں میں مل گئی۔ لیکن پروین پیچھے ہی رہی اور پھر وہ اور بھی پیچھے ہوگئی اور جب وہ لوگ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے لگے تو پروین اپنے کمرے میں گھس گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر قدِ آدم آئینے میں اُس نے دیکھا، اُس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور پھر آئینے میں اُسے اپنی جگہ ماہ رُخ نظر آنے لگی جو ٹھنڈی سانس لے کر بولی "گھبراؤ نہیں، میں وہی کروں گی جس کا میں نے وعدہ کیا ہے"

اور ماہ رُخ کی ٹھنڈی سانس اُس کا کلیجہ چھیدنے لگی اور وہ تلملا سی گئی اور بے بس سی ہو کر پلنگ پر گر گئی۔

ڈرائنگ رُوم سے پیانو کی آواز آنے لگی تھی اور چند ہی لمحوں کے بعد ایک آسمانی نغمہ ہَوا کے دوش پر تیرنے لگا ؎

رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

پروین بہت ہی زہریلے انداز میں مُسکرائی کہ خود اُس کے تن من میں زہر سرایت کرنے لگا اور پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے اُس نے کہا ؎

پُوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہوگئے

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پلنگ سے اُٹھ گئی۔

ایک بار پھر اُس نے قدِ آدم آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ لیکن اب کے اُس نے بہت اطمینان سے اپنا میک اَپ دُرست کیا، مُسکرائی اور پھر بڑے وقار کے ساتھ کمرے سے نکلی اور ایک شاہانہ تمکنت کے ساتھ ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوئی، جہاں شاید پیانو بجا رہا تھا اور ماہ رُخ قیامت خیز انداز میں کھڑی اب گا رہی تھی ؎

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گِلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہوگئے

اور جب غالب کی غزل ہوگئی تو شاہد نے پُوچھا۔

"آپ کو میرا بائی کا کوئی بھجن یاد ہے؟"

"جی نہیں" ماہ رُخ ہنس پڑی "اب معاف کیجئے"

"ماہ رُخ صاحبہ!" شاہد نے بُرا سا مُنہ بنا لیا "کیا آپ نہیں جانتیں کہ ایک گانا تو دشمنوں کو بھی نہیں سُنانا چاہئے... ایک، تین، آٹھ، نو، تیرہ وغیرہ بُرے اعداد ہیں۔ ہے تو سات بھی کوئی اچھا عدد نہیں۔ لیکن ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے الہام ہوا کہ میں سات بچّوں کا باپ بنایا جانے والا ہوں، تب سے سات کا عدد اچھا لگنے لگا ہے"

اور کوئی دن ہوتا تو شاہد کی یہ بات سُن کر پروین نہایت ہی خشمگیں نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگتی۔ اُس سے رُوٹھ جاتی اور پھر ہو سکتا تھا اُٹھ کر چلی جاتی۔ کیونکہ پروین ہی نے کبھی اپنی کسی سہیلی سے اپنی اِس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ سات بچّوں کی ماں بننا چاہتی ہے اور یہ بات شاہد کو معلوم ہوگئی تھی اور اُس وقت شاہد نے پروین ہی کو چھیڑنے کے لئے یہ بات کہی تھی۔ لیکن اُس وقت پروین لوگوں کی ہنسی میں اپنی ہنسی بھی شامل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گرچہ اُس کی ہنسی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"قصور تو میرا اپنا ہے..." وہ گردن جُھکا کر سوچنے لگی۔

اور مسز اختر کی پُرزور فرمائش پر اب کے ماہ رُخ ظفر کی غزل گانے لگی تھی ؎

نہ ہم کچھ ہنس کے سیکھے ہیں نہ ہم کچھ رو کے سیکھے ہیں
جو کچھ تھوڑا سا سیکھے ہیں، کسی کے ہو کے سیکھے ہیں

اور پروین کے لبوں پر پھر زہریلی مُسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

بے شک یہ آگ اُس کی اپنی لگائی ہوئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے اُس نے یہ نئی آفت مول لی تھی اور اب خود گھر کے چراغ سے گھر کو آگ لگ رہی تھی، یا لگنے والی تھی... لیکن پروین تو یہ سوچ رہی تھی کہ آگ لگ چکی ہے۔

وہ مسز اختر اور خان بہادر سلیم اختر صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی اور بہت ناز و نعم میں پالی گئی تھی۔ خان بہادر یا مسز اختر کوئی بھی یہ نہ چاہتا تھا کہ وہ نظروں

کبھی دُور ہو۔ چنانچہ خان بہادر نے اپنے چچازاد بھائی کے بیٹے سلمان کو، پروین کی تیسری ہی سالگرہ پر اپنی بھابی سے پروین کی سالگرہ کے تحفے کے طور پر مانگ لیا تھا۔ اور تب سے سلمان اُسی گھر میں، اُس گھر کا ایک فرد بن کر پرورش پا رہا تھا لیکن مسز اختر کا خیال تھا کہ پروین کے لئے وہ ہرگز مناسب نہیں۔ کیونکہ مختلف کلاسوں میں کئی کئی بار فیل ہونے کے بعد اب اُس نے بی۔ اے فائنل کا امتحان دیا تھا جبکہ پروین ایم۔ اے کا امتحان دے کر بہت بے چینی سے نتیجے کا انتظار کر رہی تھی۔

پروین کو بھی سلمان ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن وہ اُس وقت تک خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھی جب تک اُس کی زندگی میں شاہد نہ آیا تھا۔

لیکن ایک دن اپنے سحر کار بالوں، گُلابی گالوں کے گڑھے اور بے پناہ جاذبیت کے ساتھ ایم۔ اے کا ایک طالب علم "کہکشاں" پہنچا اور اُس نے کہکشاں کا باہر کا ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔

وہ شاہد تھا، اور شاہد بھی انگریزی ہی میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔

شاہد اور پروین کی ملاقات ہوئی، اُن کی باتیں ہوئیں، انگریزی شاعری پر اُن کی بحثیں ہوئیں اور پھر اُنھوں نے انگریزی شاعری اور اُردو شاعری کا موازنہ کیا اور پھر جیسے یہ سب کچھ ہوتے ہوئے صدیاں بیت گئیں اور تب ایک دن شاہد نے دل کڑا کر کے پروین کو مشورہ دیا۔

"Gather ye rose-buds while ye may,
Old time is still a-flying:
And this same flower that smiles today,
To-morrow will be dying"

(جب تک ہو سکے گُلاب کی کلیاں جمع کر لو ـــــ گُزرا ہوا زمانہ مائلِ پرواز ہے۔ وہ پھول جو آج مُسکراتا ہے کل کُمھلا جائے گا)

اور شوخ اور شریر پروین نے کہا تھا۔

- جی ہاں مشورہ تو بہت ہی نیک ہے ... کبھی حضور نے، کم سے کم شیو کرتے وقت تو آئینہ ضرور دیکھا ہوگا ... کیا کہنا ہے ... تو آپ گُلاب کی کلی ہیں ہے نا؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

لیکن شاہد بہت ہی جذباتی انداز میں بولا۔

" میں نہیں گُلاب کی کلی پروین! اور تم بھی نہیں ... گُلاب کی یہ مقدس کلیاں، وہ لطیف اور نرم و نازک اور آفاقی جذبات ہیں جنھیں ہم محبت کہتے ہیں"

پروین بہت شرما گئی تھی اور وہ پہلا دن تھا جب شاہد نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور پروین پسینے پسینے ہو کر گرتی پڑتی بھاگ گئی تھی ـــــ

اور پھر شاہد بھی کہکشاں کا ایک فرد ہو گیا!

اور اِس طرح قطعی طور پر انجانے انجانے سے اُنھوں نے محبت کی وادی میں قدم رکھ دیئے تھے جہاں اُنھیں آنکھوں کی جھیل مِلی، زُلفوں کے سائے مِلے، یاد کی دولت مِلی، تمنّاؤں کا گلزار مِلا، کسی انجانی مایوسی کا صحرا مِلا، کتنے ہی سراب مِلے اور تب کہیں عہد و پیمان کی منزل آئی اور ایم۔ اے کا نتیجہ شائع ہوتے ہی وہ شادی کر لینے والے تھے چاہے کتنی ہی رُکاوٹیں کیوں نہ راہ میں آجاتیں۔

مِسز اختر کے بارے میں دونوں ہی کا خیال تھا کہ وہ محبت کے فرشتوں کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوں گی۔ البتہ خان بہادر سلمان کو بہت پیار کرتے تھے۔ اِس لئے سلمان بھی یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ پروین بہر حال اُس کی ملکیت ہے۔ چنانچہ وہی ایک تھا جو ہر وقت نہ صرف یہ کہ شاہد اور پروین پر کڑی نظر رکھتا تھا بلکہ خواہ مخواہ پروین پر اپنا رعب جمایا کرتا اور شاہد کو کسی نہ کسی طرح ذلیل کرنے کی کوشش کرتا۔

ایم۔ اے کے نتیجے میں بس چند ہی روز باقی تھے اور یہی چند روز نکال لینے تھے۔

اور ماہ رُخ، یہی چند دن بخیر و عافیت نکال لینے کا ایک ذریعہ بنا کر لائی گئی تھی۔ وہ پروین کی بہت ہی عزیز سہیلی، ہم راز اور ہم جماعت تھی۔ اُسے سب کچھ معلوم تھا۔ جو کچھ ہو چُکا تھا وہ بھی، جو ہو رہا تھا وہ بھی اور جو کچھ ہونا تھا وہ بھی۔ یہاں تک کہ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ پروین سات بچّوں کی تمنّا رکھتی تھی اور یہ بھی کہ جب سے شاہد کو اُس کی اِس تمنّا کا عِلم ہوا تھا وہ روزانہ کسی نہ کسی وقت صرف ایک سے سات تک گِن دیا کرتا تھا اور پروین کا پارہ چڑھ جاتا تھا ـــــ پروین نے ماہ رُخ سے درخواست کی تھی کہ محض چند دِنوں تک وہ سلمان کو اپنی طرف متوجہ کر لے اور ماہ رُخ نے اپنی عزیز از جان سہیلی کی یہ درخواست منظور کر لی تھی۔

اور اسی لئے وہ آج شام کی چائے پر بُلائی گئی تھی۔

لیکن بات تو کچھ اور ہی ہو گئی تھی! ـــــ بات تو یہ ہو گئی تھی کہ لوگوں کی نظریں بچا کر پروین بار بار آنسو پونچھ رہی تھی اور بات تو یہ ہو گئی تھی کہ ماہ رُخ نے دوسری غزل ختم کی اور لوگوں نے تالیاں بجائیں تو لوگوں کی تالیاں ختم ہونے کے کئی لمحے بعد تک شاہد کی تالیاں پروین کے کلیجے پر چوٹ پہنچاتی رہیں۔

ڈرائنگ رُوم کی محفل ختم ہو گئی۔

اور تب یکایک پروین کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شعبدہ بازی کا کرشمہ اب تک دیکھتی رہی ہو!

ماہ رُخ نے ایک عجیب سی دلربائی کے ساتھ سلمان سے کہا۔

[redacted]

"سلمان صاحب! پلیز مجھے گھر تک پہنچا دیجئے۔"

"ڈرائیونگ بھی مجھ سے اچھی شاہد میاں کرتے ہیں" سلمان نے ایک احمق کی طرح کہا، "میرا خیال ہے آپ انھیں کو یہ شرف بخشیں۔"

"اور اگر میں آپ کو زحمت دینا پسند کروں؟" اور اب کے وہ اس طرح مسکرائی سلمان بے ہوش ہوگیا!

وہ چل پڑے۔ لیکن چلتے چلتے محض چند لمحوں کے لئے رُک کر ماہ رُخ نے پروین سے کہا۔

"میری جان محبت کا رنگ رقابت سے اور گہرا ہوتا ہے — نیور ٹیک سی رانگ!"

"ماہ رُخ! — میری ماہ رُخ — میری جان!" پروین نے اُسے چوم لیا۔

اور اُسی وقت شاہد اُن کے پاس آگیا اور اُس نے نہایت ہی معصومیت سے پروین سے پوچھا۔

"کیا میں ایک اچھا اداکار نہیں پروین؟"

لیکن اس سے پہلے کہ پروین کچھ کہتی، ماہ رُخ بول اُٹھی۔

"خدا کے لئے آئندہ کبھی ایسی اداکاری نہ کیجئے گا ورنہ میری ننھی سی گڑیا کی جان نکل جائے گی۔"

اور پروین کی آنکھ سے آنسو کا جو آخری قطرہ ٹپکا، وہ آبِ حیات کا قطرہ تھا!!

غزلیں

قمر صدیقی

تری تلاش میں دونوں جہاں سے گذرے ہیں
کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے گذرے ہیں

جہاں کہ زندگی و موت میں کشاکش ہے
تری تلاش میں اکثر وہاں سے گذرے ہیں

ہمارے عشق و وفا پر نہ کوئی حرف آیا
تمام عمر ہزار امتحاں سے گذرے ہیں

تمھاری راہ میں ایسے مقام بھی آئے
جہاں خلوص و وفا بھی گراں سے گذرے ہیں

قمرؔ بہار کی حد سے گذر گئے وہ لوگ
ہزار بار جو دورِ خزاں سے گذرے ہیں

رئیس رامپوری

برائے زیست یہ مانا خوشی ضروری ہے
مگر تمھیں تو وہی برہمی ضروری ہے

زمانے بھر کو سمجھنے کی فکر سے پہلے
خدا شناسی و خود آگہی ضروری ہے

کہیں تو ٹھیس لگے اُن کی بے نیازی کو
مری طرف سے بھی کچھ بے رُخی ضروری ہے

وہ اُن کی نیچی نگاہیں ہوں یا تبسمِ ناز
سکونِ قلب کا رہزن کوئی ضروری ہے

وہ کب سے بیٹھے ہوئے ہیں مگر رئیسؔ ابتک
جو بات کہہ نہ سکے ہیں وہی ضروری ہے


عمدہ سلائی کا آغاز
مودی دھاگا
Newfields
یہ دھاگا اعلیٰ قسم کی کپاس سے ہماری جدید ترین درآمد شدہ
خودکار مشینوں پر تیار کیا گیا ہے۔ مودی دھاگا سفید یا دھنک
کے خوبصورت اور پختہ رنگوں میں دستیاب ہے، یہ ملائم
اور مضبوط ہے، اس لئے گھریلو اور صنعتی سلائی اور کشیدہ
کاری کے لئے لاجواب ہے۔
مودی تھریڈ ملز
عمدہ دھاگے بنانے والے
پروپرائٹرز
مودی اسپننگ اینڈ ویونگ ملز کمپنی لمیٹڈ، مودی نگر (یوپی)

خوابِ آشیاں

شعیب ردولوی ایم۔ اے (علیگ)

سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ انفارمیشن ڈویژن۔ رڑکی

خوشتہ بھائی! خلوصِ بیکراں

مزاجِ اقدس! آپ کو شاید معلوم ہو گیا ہو کہ میں آپ کے دفتر میں ۲۰ تاریخ کو حاضر ہوا تھا۔ آپ سے شرفِ ملاقات کا بہت اشتیاق تھا لیکن افسوس کہ آپ اُس وقت کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ بہرکیف پھر کبھی جب موقع ملے گا حاضر ہوں گا! —— میری طویل خاموشی کے بعد دوبارہ بزمِ "بیسویں صدی" میں میرا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ میری کہانی پر اب تک جتنے خطوط ملے سبھی نے میرے اس Come back کو بہت سراہا ہے۔ یہ آپ کا خلوص اور قارئینِ کرام کا اصرار تھا کہ ایک اور کہانی کی تخلیق ہو گئی جو آپ کی نذر کر رہا ہوں —— "خوابِ آشیاں" کا مرکزی کردار "فردوس" بہت رنجیدہ و مضمحل ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ بھی اِس کے ہمدرد ہوں گے —— آپ کی رائے اور قارئینِ کرام کے ردِ عمل کا منتظر رہوں گا!

نیاز مند —— شعیب ردولوی

★

فضاؤں میں سسکیوں کی بازگشت تھی، ماحول کی نغمہ باری حالات کی چتا پر جل کر اپنا وجود کھو چکی تھی اور میں سوچتی رہی کہ انسان کی زندگی آخر تفریح کی آماجگاہ کیوں بن جاتی ہے؟ اِس کا مقدر محرومیوں میں کیوں کھو جاتا ہے؟ اچھوتے اور نازک خیال آخر حقیقت کے سانچے میں ڈھلتے کیوں نہیں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے ——؟

رُوح کی اذیت کوشی بھی کتنی کربناک ہوتی ہے۔

دل کی دیواریں اندر ہی اندر منہدم ہو گئیں۔ دل و دماغ پچھتاوے کی بھیانک آگ میں جلتے رہے اور مجھے خیال آیا کہ آج میرے ہونٹوں پر کسی کے لبوں کے سائے ہوتے، کوئی میرے چہرے پر جھک کر اپنا خاص جملہ دُہراتا —— اِن خوبصورت آنکھوں میں اِتنی کشش ہے کہ دل بے اختیار مچل اُٹھتا ہے۔ لیکن آج نہ کسی کے لبوں کے سائے تھے اور نہ اِس جملہ کی دلکشی۔ ہر چیز فنا ہو چکی تھی۔ ہر جملہ کا بھرم کھو چکا تھا۔ بس ذہنی انتشار تھا، رُوح کا کرب تھا —— آج یہ کیسا بھیانک سناٹا ہے؟

زندہ پری کے خوبصورت سانچے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے! سنگریزے دل و دماغ کو زخمی کرتے رہے!!

ایک سال پہلے میں اپنی چھوٹی سی دُنیا میں کتنی مگن تھی، کتنی مسرور تھی۔ نہ کوئی خلش اور نہ کوئی خیال۔ لیکن یہ خبر اچانک گشت کرنے لگی کہ شیراز کا خیال مجھ سے شادی کرنے کا ہے۔ میں نے جب یہ پہلی بار سُنا تو افواہ سمجھ کر ٹال گئی۔ میں نے تنہائی میں اپنے دل کو بہلا دیا کہ اِس خبر میں نہ استحکام ہے اور نہ پائیداری۔ لیکن یہی خبر جب برابر میرے ذہن کے دریچوں پر دستک دیتی رہی تو میرے دل و دماغ کی ساری سوچیں بس ایک ہی طرف مرکوز ہو گئیں۔

شیراز میرا دُور کا عزیز تھا۔ جب کبھی میرے ہاں آتا امّی اور ہم تھوڑی دیر کے لئے اُس کے پاس بیٹھتے، اُس سے باتیں کرتے اور وہ کچھ دیر بعد خاموشی سے چلا جاتا۔ اپنی تعلیم، سروس اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے وہ بہت ہر دلعزیز تھا۔ اُس کے لئے نہ جانے کتنے دروازے کھُلے ہوئے تھے۔ ایک دن میری سہیلی رخشاں میرے پاس آئی اور مجھ سے لپٹ کر میرا مُنہ چُومتے ہوئے بولی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ اِن غزالی آنکھوں سے کوئی اُلجھ پڑا تو تمام زندگی کے لئے اسیر ہو جائے گا!"

امتحان

بدنام ہوگے رہنے بھی دو امتحان کو
رکھے گا تم سے کون عزیز اپنی جان کو ——— میر تقی میر

امتحاں نالۂ دل کا تو دکھا دوں لیکن
یہ تو سمجھو کہ فلک ٹوٹ پڑے گا کس پر ——— داغ

ہمارا امتحاں کرتے ہو لیکن
تمہارا بھی اِسی میں امتحاں ہے ——— بے نظیر شاہ

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں ——— اقبال

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا ——— مومن۔

مُرسلہ: ایس، ایس، ہتکاری ایم۔ اے آگرہ

"دشمنوں کی طبیعت آج زیادہ ناساز معلوم ہوتی ہے؟" میں نے طنز کیا۔
"اری پگلی! تجھے کیا خبر کہ اِن آنکھوں میں کتنا جادو ہے!" وہ پھر چہک کر بولی۔

"خیر تو ہے؟ ——— بات کیا ہے؟" میں بالکل انجان تھی۔

"اری، تجھے کچھ خبر بھی ہے۔ شیراز تجھے اپنی بنانے والا ہے ——— !" وہ مُسکرانے لگی۔

ساری فضا میں سنگیت کی گونج تھی۔
ترنّم ریزیاں میرے ذہن و احساس پر شبنم ٹپکاتی رہیں۔
رُوح کا سکون بھی کتنا سرور آگیں ہوتا ہے!!

میں خیالات کی سمن پوش وادی میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھری کہ رخشاں میری آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ——— "یہ سارا کرشمہ اِن خوابناک آنکھوں کا ہے!"

میں ایک لمحہ کے لئے چونک پڑی۔ بیتی باتیں ایک ایک کرکے یاد آگئیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شیراز چھٹی لے کر جب بھی وطن آتا میرے ہاں ضرور آتا تھا۔ اُس کا یہ معمول اُس زمانے سے تھا جب وہ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ جب وہ گھر آتا، میں بھی تھوڑی دیر کے لئے اُس کے پاس بیٹھ جاتی، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی، لیکن نہ کبھی میں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور نہ اُس نے یہ کہنے میں کبھی فخر محسوس کیا کہ میں اُس کی طرف ملتفت ہوں۔ میرے متعلق اُس نے رخشاں سے یہ ضرور کہا تھا ——— "اِن خوبصورت آنکھوں میں اِتنی کشش ہے کہ دل بے اختیار مچل اُٹھتا ہے ———" جب میں نے یہ جملہ سُنا تو ہنس کر ٹال گئی۔ اِس جملے کو کوئی اہمیت نہ دی اور یہ جملہ ماضی کے دھندلکے میں گُم ہوگیا۔

لیکن جب میری شادی کے متعلق وہ افواہ اُسی طرح گونجتی رہی تو اُس نے میرے دل و دماغ کو سوچنے کے لئے ایک راستہ ہموار کر دیا اور میں ایک نئے راہی کی طرح اپنی نئی منزل کی تلاش میں کھو گئی۔ جب بھی کوئی شیراز کے متعلق باتیں کرتا یا اُس کی تعریف کرتا تو میں دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ جب کبھی شیراز چھٹی لے کر وطن آتا، میری یہ خواہش ہوتی کہ وہ سب سے پہلے میرے پاس آئے۔ جب کبھی کوئی اُس کے مستقبل کی باتیں کرتا، دل میں یہ تمنّا کروٹ لیتی کہ اُس کے ذکر کے ساتھ میرا نام بھی آئے۔ جب اُس کی ترقّی ہوئی مجھے اِتنی خوشی ہوئی جیسے مجھے سب کچھ مِل گیا ہو!

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پچھلی بار جب وہ میرے ہاں آیا تھا، امّی کسی عزیز کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ ابّو بھی موجود نہ تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھا مجھ سے نہ معلوم کیا کیا باتیں کرتا رہا اور میں نہ جانے کیا کیا جواب دیتی رہی۔ مجھے کچھ بھی یاد نہ تھا۔ اُس کے آجانے سے میرے دل کی کیفیت عجیب سی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ میری چھوٹی بہن سے کھیلتا رہا اور پھر مُسکراتا ہوا چلا گیا۔ میرے دل میں نہ جانے کیوں بار بار یہ خیال آتا کہ وہ کسی بھی لمحہ کہہ اُٹھے گا ——— "تمہاری اِن آنکھوں میں کتنی کشش ہے فردوس ———؟" وہ چلا گیا۔ میں نقشِ قدم دیکھتی رہی۔ دل نے بے اختیار چاہا بڑھ کر اُس کے نقشِ قدم کو چُوم لے، اُن پر سجدہ ریزیاں کرے۔ میں نہ جانے کس دُنیا میں پہنچ گئی تھی کہ میری چھوٹی بہن نے مجھے چونکا دیا۔ میں اُسے گود میں لے کر بے تحاشا پیار کرنے لگی۔

فضاؤں میں نغمے تحلیل ہو رہے تھے!
دُور کہیں شہنائیاں بج رہی تھیں!!
زندگی نئی نویلی دُلہن کی طرح شرما شرما کر مُسکرا رہی تھی!!

میری زندگی کا صحیفہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ کِتنے افسانے بکھرے ہوئے تھے، کتنی کہانیاں اپنی خوشبوئیں چھوڑ گئی تھیں، کتنی یادیں اور کتنے واقعات مہک مہک کر مُسکرا رہے تھے۔ زندگی منزل کو پانے کی جستجو میں تیز گام تھی۔ اُس کی رفتار میں اندازِ جنوں تھا، کیفِ والہانہ تھا، جوش و خروش تھا اور میں سوچتی اِتنی جستجو اور اِتنی تلاش کے بعد زندگی کی تکمیل کتنی دلآویز ہوگی ——— زندگی کا ہر آنے والا لمحہ مجھے مسرّتوں اور مستیوں

میں غرق نظر آتا۔

مجھے آج بھی اپنے جنون کا وہ عالم یاد ہے جب شیراز کسی کام سے صرف ایک دن کے لئے وطن آیا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا میں حسبِ معمول اُس کا انتظار کرنے لگی۔ ہر آہٹ پر اُس کی آمد کا گماں ہوتا لیکن وہ دوسرے ہی دن بغیر میرے ہاں آئے ہوئے واپس چلا گیا مجھے اُس کے اِس غیر متوقع رویّہ سے سخت تکلیف پہنچی میں رات کو تکیہ میں مُنہ چُھپائے دھیمے دھیمے دیر تک روتی رہی۔

'یہ کیسا پاگل پن ہے؟'

'یہ کون سا انداز ہے؟'

'دل بات بات پر رونے کو کیوں تیار رہتا ہے؟'

'کون اِن جذبوں کو تقویت بخش رہا ہے؟'

ایسے ہی نہ جانے کتنے سوالات میرے ذہن میں کبھی کبھی کروٹیں لیتے اور جب میں کسی کا بھی جواب اطمینان بخش نہ دے پاتی تو اپنے آپ پر جھنجھلاہٹ ہوتی، غصّہ آجاتا!

شیراز کے اُس روز کے رویّہ سے ایک کھٹک باقی تھی، ایک فکر سی تھی کہ شیراز کی بڑی بہن ایک دن میرے ہاں آئیں۔ دَوران گفتگو میں شیراز کا بھی ذکر آیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ شیراز ایک ضروری کام سے آئے تھے اور وقت کی کمی کے باعث یہاں بھی نہ آسکے جس کا اُنھیں افسوس تھا۔ مجھے یہ سُن کر اتنا سکون ملا جیسے کسی نے میرے دہکتے ہوئے خیالوں اور دماغ کے آتشکدہ پر شبنم پاشی کر دی ہو۔ ایک کھٹک ختم ہوگئی ایک فکر سوگئی۔ اب سکون تھا، اطمینان تھا۔

اُس رات چاندنی خوب نہا کر چمکی تھی۔ صبح سویرے تک شبنم بُوند بُوند ہو کر ٹپکتی رہی۔ پُورا ماحول ادھ کھلی کلیوں اور شگفتہ غنچوں کی خوشبو میں لپٹا ہوا تھا۔ میں خلافِ معمول دیر تک سوتی رہی۔ جب آنکھ کھلی بستر پر سُورج کی نرم و نازک کرنیں اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ پُورے جسم میں ایک لطیف سا درد تھا۔ میں نہا دھو کر ناشتہ کے لئے میز کے پاس گئی، چائے بنا کر پہلا گھونٹ لینے کے لئے پیالی کو ہونٹوں کے قریب لا رہی تھی کہ امّی کی آواز برابر کے کمرے سے آئی۔

"شیراز کی شادی مسعود حسین کی لڑکی سے طے ہوگئی ہے۔ اگلے ماہ بارات لکھنؤ جائے گی" یہ اُنھوں نے ابّو کو اطّلاع دی۔

چائے کی پیالی ہونٹوں کی قُربت حاصل کرنے سے پہلے ہی ایک جھٹکے سے ہاتھ سے چھُوٹ کر ٹوٹ گئی۔ کمرے میں جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ ہر چیز گھُومتی ہوئی نظر آئی۔ ذہن میں طوفانوں کے جھکّڑ تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میرا سر بہت زور سے چکرا رہا تھا۔ میں نے قریب پڑی کُرسی کا سہارا لیا اور اُس پر بیٹھ گئی۔ اُس وقت ہوش آیا جب امّی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

"پیالی کیسے ٹوٹ گئی بیٹی؟"

'آپ پیالی کی بات کر رہی ہیں یہاں تو دل چُور چُور ہو چکا ہے!' میں نے کہنا چاہا، لیکن دل کی بات دل میں رہ گئی۔ میں نے گھبرا کر جواب دیا۔

"کچھ نہیں امّی! پیالی سے اچانک میز کا کونہ ٹکرا گیا تھا"

میں اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر کر زار و قطار رونے لگی۔ لمبی لمبی سسکیاں، دلخراش چیخیں بند کمرے کی دیواروں سے دیوانہ وار ٹکرا رہی تھیں۔ اب آنسوؤں کا نہ تھمنے والا سیلاب تھا اور آنکھوں میں سوزش تھی۔ ایک بھیانک سنّاٹا میرے چاروں طرف پھیل گیا۔ میں نے خاموشی کی رِدا اوڑھ لی۔ میری اپنی یہی کوشش تھی کہ دل و جگر کی تباہی کا راز کوئی نہ جاننے پائے۔ جب دل ٹوٹتا ہے اُس کی آواز ذہن کے نہاں خانوں میں ہوتی ہے۔ رُوح متاثر ہوتی ہے۔ آج خوابوں سے زیادہ حسین اور چاندنی سے زیادہ دلکش ایک عمارت ڈھ گئی طلسم ٹوٹ گیا۔ غزالی آنکھوں کی بازیگری ریزہ ریزہ ہوگئی۔

آج شیراز کی شادی ہوگئی۔ طوفان نے اُسی تیزی سے ایک بار پھر سر اُٹھایا ہے، میرا وجود نرم و نازک پَودے کی طرح سر جھکائے، خستہ حال، خاموش ہے۔ میرے دل کے اندر سے ایک انتہائی کرب ناک آواز آئی ہے۔

'اِس تباہی کا ذمّہ دار کون ہے؟'

اور میں بے چین ہو جاتی ہوں!!

حُسن و عشق

اب حُسن سے بھی ہے عشق بیزار
دیوانے کی کس سے دوستی ہے ——— نامعلوم

یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
سبھی ہے حُسن مگر عشق کا جواب نہیں ——— مجازؔ

ہزار حُسن، دل آرائے دو جہاں ہوتا
نصیبِ عشق نہ ہوتا تو رائیگاں ہوتا ——— روشن صدیقی

یہ مانا حُسن کی فطرت بہت نازک ہے اے وامقؔ
مزاجِ عشق کی لیکن نزاکت اَور ہوتی ہے ——— وامقؔ جونپوری

حُسن کو مطلقاً نہیں ہے ثبات
عشق آیا ہے پی کے آبِ حیات ——— کنور ہند سنگھ بیدی سحرؔ

مرسلہ:۔ جہانگیر انس رانی پوری - چونا بھٹی - پورولیا

غزل

ایک ادبی معرکہ کے نتیجہ میں

ابر احسنی گنوری

کیسا چمن ؟ ہیں زیبِ قفس عمر بھر سے ہم
"دنیا بدل چکے ہیں بہت پیشتر سے ہم"

ایسے میں جستجو کو بھی نکلیں کدھر سے ہم
آواز انھیں کی آتی ہے گزریں جدھر سے ہم

اے اشک جلوہ زا تو کسی رنگ میں بھی ہو
آگاہ ہیں حقیقتِ لختِ جگر سے ہم

داغوں سے دلکو بھر کے وہ پردہ میں چھپ گئے
اب اِس چمن کو سینچا کریں چشمِ تر سے ہم

اے حسن کر ہماری نظر کا تو احترام
تخلیقِ حسن کرتے ہیں حسنِ نظر سے ہم

اب مٹ گئے تو اِسکا کریں کبھی ملال کیا
انجامِ عشق جانتے تھے پیشتر سے ہم

آیا تھا ایسا وقت بھی ہم پر بہار میں
زنداں کو جائے امن سمجھتے تھے گھر سے ہم

مل جائیں دل کبھی اِن کے ملانے سے کیا عجب
کچھ تم اُدھر سے ہاتھ بڑھاؤ اِدھر سے ہم

اب خود ہے شک کہ تم سے محبت ہے اِک گناہ
اب خود کو دیکھتے ہیں تمہاری نظر سے ہم

نبضوں سے دل کے روگ کو پہچان لے گا یہ!
اب کیا کہیں بتائے کوئی چارہ گر سے ہم ؟

حالانکہ کچھ نہیں۔ مگر اپنے خیال میں
اے ابر کم نہیں ہیں کسی تاجور سے ہم

غزل

مہندر پرتاپ چاند ایم اے

وہ حسنِ دل نواز نکھرتا چلا گیا
ہر نقشِ کائنات سنورتا چلا گیا

دِل ڈوب ڈوب کر جو اُبھرتا چلا گیا
دریائے غم سے پار اُترتا چلا گیا

زندہ رہیں اُسی سے محبت کی عظمتیں
دَم ہستیٔ وفا کا جو بھرتا چلا گیا

ہر سُو نگاہِ حسن جو پڑتی چلی گئی
ہر سمت ایک نور بکھرتا چلا گیا

جتنا وُہ میرے دِل میں اُترتے چلے گئے
اُتنا میں اُن کے دِل سے اُترتا چلا گیا

ہر منزلِ مقدسِ اُلفت سے بے خطر
تیرا گناہ گار گزرتا چلا گیا

تُو نے نگاہِ قہر سے دیکھا جو اِس طرف
اِک تیر سا جگر میں اُترتا چلا گیا

غم کی لطیف آنچ جو بڑھتی چلی گئی
حسنِ شعور اور نکھرتا چلا گیا

مَیں اُن کی جستجو میں بھی اے جذبِ بے خودی!
اپنی تلاش آپ ہی کرتا چلا گیا

اے چاند! اُن کی یاد جو آتی چلی گئی
دامن مرے خیال کا بھرتا چلا گیا

شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۶۳۵ تیمار پور - دہلی

محترم قبلہ خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

غالب کی شاعرانہ عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن "غالب شتابدی" میں جہاں "غالب کے پرستاروں" نے اُردو شاعری کے جملہ فضائل تنہا غالب کی جھولی میں ڈالنے کے علاوہ اُسے محبِ وطن تک بھی ثابت کر دکھایا ہے۔ وہاں آپ کے اِس نیاز مند نے یہ دو رباعیاں کہہ کر اِس نورانی تقریب کے پس منظر تاریک کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

بدلا ہے ستم گری نے بھیس غم خواری کا
کیا خوب ہے مشغلہ دل آزاری کا
اُردو کے ہیں بے پناہ دشمن لیکن
بہروپ ہے غالب کی پرستاری کا

جی بھر کے مذاقِ غم اڑاؤ ، یارو!
رونے کی جگہ ہنسو ہنساؤ ، یارو!
غالب کی زبان کی اُٹھا کر میت
غالب کی شتابدی مناؤ، یارو!

آپ کا ——— نریش کمار شاد

جوشؔ ملیح آبادی اپنی کار ڈرائیو کر رہے تھے اور گوپی ناتھ امن پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ جوشؔ صاحب ایک دم کار کو روک کر امن صاحب سے کہنے لگے ؎

میرے پہلو کو گرم کیجے آپ
گوشۂ دل کو نرم کیجے آپ

امن صاحب، جوشؔ صاحب کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے اُن کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ تو گئے لیکن ہنستے ہوئے بولے ؎

میں کہاں اور آں جناب کہاں
دیکھیے کچھ تو شرم کیجے آپ!

شاذ تمکنت کے ایک دوست کو کسی لڑکی سے بے پناہ محبت تھی۔ یہی محبت اُنہیں دن میں کئی کئی بار مسجد میں لے جاتی تھی کیونکہ خود اُن کے بقول وہ خدا سے اُس لڑکی کو مانگنا چاہتے تھے۔ حسنِ اتفاق سے اُن حضرت کی شادی اُسی لڑکی سے ہوگئی اور شادی کے بعد جب وہ بھولے سے بھی کبھی مسجد میں نظر نہ آئے تو شاذ نے یہ مطلع کہا ؎

وہ کون دیر نشیں تھا حرم کے گوشے میں
کسی کی یاد تھی یادِ خدا کے پردے میں!

بنگلور کے ایک مشاعرے کے اختتام پر جن لوگوں نے پریم وار برٹنی سے آٹو گراف لئے اُن میں ایک شوخ و طرار چنچل حسینہ بھی تھی جو اپنے دلچسپ اور انوکھے میک اپ کی بدولت کسی اور ہی دنیا کی "شے" معلوم ہو رہی تھی۔ آٹو گراف بُک بڑھاتے ہوئے جب اُس نے پریم سے کوئی تازہ شعر لکھنے کی فرمائش کی تو نظروں ہی نظروں میں پریم نے اُس کا بھرپور جائزہ لیا اور ذرا سی دیر میں یہ شعر

موزوں کرکے اُس کی آٹوگراف بک میں لکھ دیا ؎

میں ہوں فن کارِ زمیں اور تم ہو حسنِ کوہ قاف
جی میں آتا ہے کہ مانگوں تم سے خود آٹوگراف

ہماؔ ہرنالوی کے عزیز دوست اور شاگرد سورج کنول سرور طبعاً متقی اور پرہیزگار تھے لیکن کبھی کبھی احباب کے تقاضے سے مجبور ہو کر توبہ شکنی پہ بھی آمادہ ہو جاتے تھے۔ ایک بار جب وہ پارسائی کی طرف کچھ زیادہ مائل ہو گئے تو ہماؔ ہرنالوی نے یہ مطلع موزوں کرکے اُنھیں سُنا دیا ؎

رنگینیوں سے دُور ہوا جا رہا ہوں میں
سورج کنول سرور ہوا جا رہا ہوں میں

داغؔ دہلوی کے یہاں اُن کے عقیدت مند جمع تھے اور اُن عقیدت مندوں کی فرمائش پر داغ نے اپنی یہ نئی غزل سُنائی ؎

اُس کی چتون نظر میں پھرتی ہے | اِک چھُری سی جگر میں پھرتی ہے
آہ، ہر دم سفر میں پھرتی ہے | یہ تلاشِ اثر میں پھرتی ہے
نالہ کرتا ہوں تو مری آواز | گونجتی اُن کے گھر میں پھرتی ہے
اُس کے آگے زبان مشکل سے | دہنِ نامہ بر میں پھرتی ہے

نہ ملے گا وہ جستجو سے داغؔ
خلق کس دردِ سر میں پھرتی ہے

غزل سُناتے ہوئے داغؔ نے دیکھا کہ اُن کے مکان میں مزدور دیواروں پر سفیدی کر رہے ہیں اور اُنھیں غزل سُناتے دیکھ کر مزدور بھی ہاتھ روک کر ہمہ تن گوش ہیں چنانچہ غزل ختم کرتے ہی اُنھوں نے برجستہ یہ مقطع فرمایا ؎

آمد آمد ہے آج کس کی داغؔ
یہ سفیدی جو گھر میں پھرتی ہے

اور پھر چند لمحوں کے بعد پہلے مقطع کو اِس طرح شعر میں منتقل کر دیا ؎

نہ ملے گا وہ جستجو سے کہیں
خلق کس دردِ سر میں پھرتی ہے

ایک نہایت عبادت گزار بزرگ مولوی محمد تقی اکبرؔ الٰہ آبادی کے والدِ بزرگوار کے بڑے بے تکلف دوست تھے۔ اکبرؔ کی نوعمری کے زمانے میں اُن کے والدِ بزرگوار نے ایک خط دے کر مولوی صاحب کے یہاں بھیجا۔ جب اکبر وہاں پہنچے تو مولوی صاحب وظیفے میں مشغول تھے اور اُنھوں نے اکبرؔ کو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اکبر کچھ دیر تک تو چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر زحمتِ انتظار سے اُکتا کر بولے، "والد صاحب کا خط ہے۔ اگر اجازت ہو تو خط رکھ کر واپس جاؤں اور کچھ عرض کرنا ہے وہ بھی لکھ دوں۔ اِس کے جواب میں جب مولوی صاحب نے دوبارہ "ہوں، ہوں" کہا تو اکبرؔ نے ایک پرچے پہ یہ رُباعی لکھی اور والد کے خط کے ساتھ مُصلّے کے نیچے رکھ کر وہاں سے چل دئے ؎

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ | خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں مُنہ سے یا نہ بولیں حضرت | معلوم ہے مجھ کو جتنے پانی میں ہیں آپ

سیمابؔ اکبرآبادی نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں مرزا غالبؔ کی اِس مشہور غزل ؏

لرزے ہے موج مے۔ تری رفتار دیکھ کر

کی زمین میں غزل کہی جس کا مطلع تھا ؎

حیرت میں ہے قمر ترا دیدار دیکھ کر
چکرا رہا ہے چرخ بھی رفتار دیکھ کر

اور جب اِسے اپنے شہر کے ایک کہنہ مشق اُستاد محمد حسین خاکؔ اجمیری کو سُنایا تو خاکؔ صاحب نے سیمابؔ کی غزل لے کر اُس پر یہ شعر لکھ دیا ؎

سیمابؔ! شعر کہنے کا گر شوق ہے تمھیں
اُستاد بھی کرو کوئی اے یار دیکھ کر

چنانچہ خاک کا اشارہ سمجھ کر اور اُن کے اِس شعر سے متاثر ہوتے ہوئے سیمابؔ اُس زمانے میں اُنھیں سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔

جگرؔ مرادآبادی کار میں بیٹھے کسی مشاعرے میں جا رہے تھے کہ دفعتہً کالج کی شوخ و شنگ طالبات کا ایک ہجوم سڑک پر سے گزرا۔ کار رُک گئی اور ریشمی آنچلوں کی مہک سے فضا جیسے چمن زار بن گئی۔ یہ منظر دیکھ کر جگرؔ صاحب جیسے سُروں میں یہ مصرع گنگنانے لگے ؏

خوشا کہ جلوے ہی جلوے ہیں چار سُو رقصاں

ہجوم گزر گیا۔ کار چلنے لگی لیکن چند ہی قدم کے بعد کار پھر رکی۔ سامنے سے کچھ لوگ ایک جنازہ لئے سڑک پار کر رہے تھے۔ جگرؔ صاحب کے حسین و نازک ذہن کو دھچکا سا لگا اور اُس کیفیت میں شعر یوں مکمل ہو گیا ؎

خوشا کہ جلوے ہی جلوے ہیں چار سُو رقصاں | فغاں کہ فرصتِ نظّارگی بہت کم ہے

حیدرآباد دکن کے جونیئر پرنس شہزادہ معظم جاہ بہادر کے دربار میں فورٹ
میں عید کی رات کا جشن منعقد تھا کہ ایک خوب صورت لڑکا جو نرت کرنے میں
ماہر تھا عطر میں بسا ہوا سامنے سے گزرا اور شاعرِ دربار صدق جائسی کو دیکھ کر
ایک خوش گوار تبسم کے ساتھ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر
جھکا دیا۔ صدق صاحب نے بھی اُسی طرح سلام کا جواب دیا۔ خوشبو سے ماحول
معطر ہو گیا تھا اور اُس عنبریں ماحول سے متاثر ہو کر صدق صاحب نے فی البدیہہ
شعر کہا ؎

خوشبو سے ہو رہا ہے معطر مشامِ جاں
چلتی ہے کس طرف کی ہوا کچھ نہ پوچھئے

جب مہابھارت کی جنگ کے بہت دنوں بعد مہاراجہ یدھشٹر کو
جنت میں لے جانے سے پہلے جہنم کی سیر کرائی گئی تو عذاب میں پڑی ہوئی روحوں
نے یدھشٹر سے کہا کہ یہاں سے آگے نہ بڑھو ہم لوگوں پر رحم کرو۔ تمھارے آنے
سے دوزخ کے شعلے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ ہندو دیو مالا کا یہی واقعہ فراق
گورکھپوری کے اِس شعر کی تخلیق کا محرک ہوا ؎

یہ آ گیا ہے یہاں کون کافرِ معصوم
کہ ٹھنڈی پڑ گئی دوزخ کے بھی عذاب کی آنچ

شملے میں کچھ نوجوان کسی ہال میں ایک ڈرامہ کرنے والے تھے جس کا نام
تھا "تمنّا"۔ پنڈت ہری چند اختر ایک تماشائی کی حیثیت سے جب وہاں پہنچے
تو اُنھیں معلوم ہوا کہ ڈرامے کی ہیروئن کسی بات پر ناراض ہو کر وہاں سے اپنے
گھر چلی گئی ہے اور ڈرامے کے منتظمین بے حد پریشان ہیں۔ اختر صاحب نے
ایک لمحے کے لئے صورتِ حال کا نہایت سنجیدگی سے جائزہ لینے کے بعد
منتظمین اور تماشائیوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ شعر سُنا دیا ؎

تھی جس پر کامیابی منحصر چل دی وہی لڑکی
تمنّا کی جگہ خونِ تمنّا دیکھتے جاؤ

جمیل مظہری کو آخرِ ماہ کچھ رُوپوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو اپنے
ایک بے تکلّف دوست اور پٹنہ کالج کے پروفیسر سیّد حسن کو ایک چِٹ پر قلم
برداشتہ یہ قطعہ موزوں کر کے بھیج دیا ؎

آپ کا دستِ کرم دستِ شفا   مجھ کو افلاس کی بیماری ہے
گو کہ تنخواہ کو ہیں آٹھ ہی دن   آٹھ رُوپے کی طلبگاری ہے
بوجھ دل کا مرے ہلکا کیجے   آپ کی جیب اگر بھاری ہے
نگہِ لطف ہو اِس پر کہ جمیل   آپ کا شاعرِ درباری ہے

کہیں کوئی صاحب مشہور ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کے اِس
شعر کی تعریف کر رہے تھے ؎

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے!
خواب کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

قتیل شفائی نے یہ شعر سُنا تو مصرعۂ اوّل میں "لہرانے" کی رعایت
سے مصرعۂ ثانی میں ایک لفظ کی ترمیم کرتے ہوئے اِس کی پیروڈی کر دی ؎

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانپ کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

جب جوش ملیح آبادی نے ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر
پاکستان کی شہریت اختیار کر لی لیکن جلد ہی اُنھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا
اور اُنھوں نے وہ نظم کہی ع

سب شہادت کے ہیں آثار چنا جور گرم

تو شاد عارفی نے یہ شعر کہا ؎

یہ دوسری بات ہے کہ ہجرت نہ کر کے در در کی خاک چھانے
چنے نہ بیچے گا جوش کی طرح ذوقِ شعر و سخن ہمارا

سیّد محمد ٹونکی نے "چو پنچ" کے نام سے جب ایک اخبار جاری کیا اور
اخبار کی پیشانی پر چھاپنے کے لئے احمق پھپھوندوی سے ایک شعر کہنے کی فرمائش
کی تو احمق نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا ؎

"چو پنچ" نکالیں مُلاّں ٹونکی
شامت آئے نہ کیوں مُرغوں کی

پچھلے دنوں جب پاکستان میں ایوب خاں کی سرکار نے وہاں کے
مشہور اور سرکردہ صحافی شورش کاشمیری کو پھر نظر بند کر دیا تو میں نے یہ قطعہ کہا ؎

قبلہ ایوب! آپ کی کشتی   اب ہے معذور پار اُترنے سے
شورشِ قوم دب نہیں سکتی   ایک شورش کو قید کرنے سے

ایک بار جب حاجی لق لق کو یہ بتایا گیا کہ کل لاہور کی ضلع کچہری میں محکمہ آبکاری کے افسروں نے تین سالہ پرانی شراب ایک نالی میں بہادی اور ایک بھنگی اور چند دیہاتی اُس "نعمتِ غیر مترقبہ" سے اِس حد تک لطف اندوز ہوئے کہ ساری رات اُس نالی میں محوِ خواب رہے تو لق لق نے قلم برداشتہ یہ اشعار لکھ دیئے ؎

اُٹھے نہ کس لئے موجِ شباب نالی میں　　کہ محتسب نے بہادی شراب نالی میں
بنی ہے آج بدر رو بھی آفتابہ سے　　یہ کس نے پھینک دیا آفتاب نالی میں
شراب پھینک کے لطفِ مزید یہ کرتے　　کہ ڈال دیتے دو درجن کباب نالی میں
بھلا ہو بادہ پرستوں کو کیا جگہ کی قید　　شراب دیکھ کے پہنچے جناب نالی میں
سرے پہ نالی کے چلو پہ چلو چلنے لگے　　ملا شراب کا لبِ لباب نالی میں
سہ سالہ مے کا اثر تھا کہ مجمعِ رنداں　　تمام رات رہا مستِ خواب نالی میں

ایک دن نواب سعادت علی خاں نے روزہ رکھا اور حکم دیا کہ کوئی اُن سے ملاقات کے لئے آنے نہ پائے۔ سید انشا کو کوئی ضرورت تھی وہاں پہنچے تو پہرے دار نے کہا کہ آج ملنے کا حکم نہیں ہے۔ انشا نے یہ سُن کر کمر کھول، دستار سر سے بڑھا کر، قبا اُتار ڈالی اور دوپٹہ عورتوں کی طرح اوڑھ کر پہرے دار کی مزاحمت کے باوجود اندر چلے گئے اور ناز و ادا کے ساتھ اُنگلی ناک پہ رکھ کر نواب سے کہنے لگے ؎

ایسی گرمی میں نہ رکھ تجھ پہ میں واری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

جب نواب سید محمد خان رند نے لکھنؤ کے ایک مشاعرے کے لئے وہ طرحی غزل کہی جس کا مطلع ہے ؎

پھر لہو سرخ ہُوا جسم میں کالا ہو کر
رہ گیا اب کی برس پھر مجھے سودا ہو کر

تو آپ نے استاد خواجہ آتش لکھنوی کو اِس غزل میں یہ شعر سُناتے ہوئے ؎

اگر ئی کا ہے گُماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

بڑے فخریہ انداز میں کہنے لگے اُستاد! اس زمین میں 'میلا' کا قافیہ جیسا آپ کے اِس نیاز مند نے باندھا اِس سے بہتر ممکن نہیں ہے۔ آتش اُس وقت تو خاموش رہے لیکن بعد میں کسی دوسرے شاگرد کی غزل پر اصلاح دیتے ہوئے اُس میں اِس ایک شعر کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا ؎

بُلبلِ کُشتہ کو صیّاد کفن کیا دیتا!
پیرہن گُل کا نہ اُترا کبھی میلا ہو کر

سید قطب الدین لطیف ارکاٹی جو دراصل شرزہ پور ضلع بنگلور کے رہنے والے تھے لیکن زمانۂ دراز تک ارکاٹ صوبہ مدراس میں سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے جنھیں ارکاٹی کہا جاتا تھا ایک بار چند بے تکلف دوستوں میں بیٹھے تھے کہ کسی نے بہادر شاہ ظفر کا یہ مصرع پڑھا ؎

قلم تراش سے مت اُستخواں تراش کے پھینک

اور لطیف صاحب کی چابک دستی اور زود گوئی کا امتحان لینے کی غرض سے اِسی سنگلاخ زمین میں فی البدیہہ شعر کہنے کی فرمائش کر دی۔ لطیف صاحب نے یہ فرمائش اِس طرح پُوری کی ؎

قلم تراش سے مت اُستخواں تراش کے پھینک　　رواں نہ ہو تو قلم کی زباں تراش کے پھینک
اگر بہار کی رکھتا ہے آرزو دل میں　　تو گُل کے واسطے شاخِ خزاں تراش کے پھینک
یہ تیرِ عشق نہ پہنچے اگر نشانے تک　　تو توڑ تاڑ کے تیر و کماں تراش کے پھینک
تجھے قسم ہے مرے عشق کی ارے آذر　　تو مت صنم کے مقابل بُتاں تراش کے پھینک

ایک مرتبہ سلطانِ عالم واجد علی شاہ کے غسلِ صحت کی خوشی میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں منشی مظفر علی اسیر اور خواجہ اسد اللہ قلق نے نہایت طمطراق کے ساتھ قصیدے پڑھے۔ واجد علی شاہ نے حسبِ دستور اُن قصیدوں کو قبول فرما کر دونوں شاعروں کو خلعت عطا فرمائے۔ قلق کو اُس وقت تک کوئی شاہی خطاب نہیں ملا تھا اُنھوں نے خلعت لینے کے بعد دست بستہ یہ فی البدیہہ شعر پڑھ دیا ؎

خلعت وزر سے تو ہر طرح سنوارا جاؤں
ایسی محفل میں قلق کہہ کے پکارا جاؤں

واجد علی شاہ نے اِس حُسنِ طلب سے متاثر ہو کر اُسی وقت قلق کو 'آفتاب الدولہ' کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

منشی نوبت رائے نظر لکھنوی کا نواسہ گوری چار سال کی عمر ہی میں غیر متوقع طور پر انتقال کر گیا تھا۔ غالب کی زمین میں غزل کہتے ہوئے جس کا مطلع ہے ؎

پہلو میں دل وہی ہے مگر دل نہیں رہا　　یعنی اب امتحان کے قابل نہیں رہا

جب اُنھیں گوری کی یاد آگئی تو غزل کا مقطع اُسی سے متعلق ہوگیا۔

چل بیٹھیے مزار پہ گوری کے اے نظر
اپنا مکان رہنے کے قابل نہیں رہا

آگرے کے ایک مشاعرے میں مولوی نظام الدین شاہ دل گیر۔ مولوی سید نثار علی نثار۔ اسلام اللہ صوفی۔ سید وجاہت علی وجاہت اور ماسٹر یعقوب علی خاں کوکب بیٹھے ہوئے میر و غالب کی جانشینی کا ذکر کرنے بیٹھے تھے۔ میر مومن حسین صفی کے شاگرد تصوّف حسین واصف اکبر آبادی خاموشی سے سنتے رہے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا کلام سنایا اور آخر میں واصف نے فی البدیہہ یہ غزل کہہ کر سنا دی ؎

کہتے ہیں وہ بُت بے پیر بنا پھرتا ہوں
سرو سا قد جو بنا تیر بنا پھرتا ہوں

دیکھ کے مجھ کو بگڑ کر بھی ہے وہ رنگِ کشش
تجھ سے کھینچ کر تری تصویر بنا پھرتا ہوں

گردشوں سے کبھی فرصت نہیں دم بھر مجھ کو
اب تو میں اپنی ہی تقدیر بنا پھرتا ہوں

صفحۂ دہر پہ دیکھو قدِ موزوں میرا
خامۂ کاتبِ تقدیر بنا پھرتا ہوں

خاک بھی مجھ کو لیاقت نہیں پرائے واصف
دل کو یہ خبط ہے میں میر بنا پھرتا ہوں

۱۹۱۵ء میں مولانا ابوالکلام آزاد جب رانچی میں نظر بند تھے تو وہاں اُن کے علاوہ اکثر دوسرے سیاسی قیدی بھی شعر و سخن کا اچھا خاصہ مذاق رکھتے تھے جن میں ایک بہت معمّر شاعر بھی تھے غالباً رعشے کی وجہ سے جن کا سر ہمیشہ ہلتا رہتا تھا۔ جو مولانا آزاد کے پاس اکثر آتے رہتے تھے۔ ایک دن اُن قیدی شاعروں نے ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا طرح تھی ؎

پھر آگیا پلٹ کے زمانہ بہار کا

مولانا آزاد نے اُس معمّر شاعر سے دل لگی کرنے کی غرض سے یہ شعر کہہ کر ایک لونڈے کو دے دیا جس نے اُس شاعر سے خاص طور پہ مخاطب ہو کر اُسے پڑھا ؎

آئے ہیں سر ہلاتے ہوئے میکدے میں شیخ
بُڈّھے پہ آج چل گیا جادو بہار کا

جن دنوں حفیظ جالندھری اور اسرار الحق مجاز کے درمیان معاصرانہ چشمک زوروں پر تھی۔ حفیظ نے یو۔ پی والوں کے خلاف ایک نظم کہی۔ جواب میں مجاز نے صرف یہ شعر کہنے پر اکتفا کیا ؎

وہاں کا حسن تو سب کچھ ہے مانا
مگر خود عشق تو جالندھری ہے!

چند بے تکلف دوستوں کی فرمائش پر جرم محمد آبادی نے اپنے تازہ شعر سُنانے سے پہلے یہ فی البدیہہ شعر پڑھ کر سگریٹ کا مطالبہ کیا ؎

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دیجیے سگریٹ کا ڈبّہ مرے آگے

جرم صاحب کے اُستاد علامہ آرزو لکھنوی بھی اتفاق سے وہیں تھے شعر سُنا تو کچھ سوچ کر کہنے لگے —— جرم میاں غالب کا مصرعہ اپنانے کی بجائے اگر یوں کہہ دو تو کیا مضائقہ ہے ؎

پھر دیکھیے کیا ہوتی ہے تقریر دھواں دھار
رکھ دیجیے سگریٹ کا ڈبّہ مرے آگے

کسی صاحبِ ذوق نے جب سراج الدین ظفر سے یہ کہا کہ آپ کے کلام میں تصوّف کے نکات کے مقابلے میں رندی کے نقوش ہمالیہ کی طرح اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں تو ظفر نے مُسکراتے ہوئے جواب میں یہ شعر کہہ دیا ؎

ذوقِ گل و شبو میں قباحت کی کیا ہے بات
ہم اِس معاملے میں ذرا تیز ہی سہی

ایک بار خزان چند بسمل کی کسی بات سے متاثر ہو کر جب اُن کا ایک دوست اُن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا تو بسمل نے خاموشی سے اُن کی ساری بات سن کر فی البدیہہ یہ شعر کہا اور اُنھیں سُنا دیا ؎

ڈبونا جو چاہو کسی شخص کو
تو پُل اُس کی تعریف کے باندھ دو

ایک محفل میں ایک صاحبِ کمال شاعر کو جب کچھ ذی ثروت حضرات کی خوشامد کرتے ہوئے دیکھا تو کنول پرشاد کنول کے جی کو بڑی ٹھیس لگی اور اُنھوں نے بے اختیار اُس وقت یہ قطعہ کہا ؎

موت سے پہلے مر گئے، بِک کر:
وہ، جو دنیا میں نام کر جاتے
ایسے مرنے سے لاکھ بہتر تھا
زہر پی کر ہی لوگ مر جاتے

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔



ہر دانش مند
مالکن
ہمیشہ
آرتی نیل
کو ہی
پسند کرتی ہیں
آرتی نیل سے
کپڑے زیادہ پائیدار
زیادہ چمکیلے اور
زیادہ سفید رہتے ہیں
before
after
ARATI ULTRAMARINE
SETH CHEMICAL WORKS
S.C
سیٹھ کیمیکل ورکس
۲۲ جمنالال بجاج اسٹریٹ کلکتہ ۷
SCW/G 61
میسرز سیٹھ ٹریڈنگ کمپنی۔ ۲۵۲۹۔ چرداراتلک بازار۔ دہلی نمبر ۶

افسانہ

تھانیدار

جسونت سنگھ وِردی ایم۔اے۔بی ٹی

171-A سُدرشن پارک موتی نگر۔ نئی دہلی 15

محترم بھائی! تسلیم

"بیسویں صدی" کے لئے ایک خوبصورت کہانی بھیج رہا ہوں۔ یقین ہے آپ کو اور قارئین کو بھی پسند آئے گی۔ اِس کہانی میں اگرچہ رُومان نہیں ہے، پھر بھی کافی دلکش، کافی رنگین ہے۔ ساتھ ہی فکر انگیز بھی ہے...

خلوص کیش ——— جسونت سنگھ وردی

★

مجھے بہت ہی پریشان دیکھ کر چائے کے کھوکھے والے نے پوچھا۔

"آپ کا بیگ تو نہیں کھو گیا؟" ——— میرا جواب اثبات میں سُن کر اُس نے کہا، بیگ ایک لڑکی اُٹھا کرلے گئی ہے۔ بیگ ایک گھنٹہ پہلے گم ہُوا تھا، یہ جان کر اُس نے پھر کہا۔

"بس جب ہی وہ بھی یہاں سے گزری تھی۔ کئی بار اِدھر سے گزرتی ہے۔ اُونچی لمبی۔ نازک اندام سی سانولی لڑکی۔ کیرتی نگر کی طرف رہتی ہے۔"

میں نے اُس کی بات پُوری طرح نہیں سُنی اور فوراً ہی سائیکل کو کیرتی نگر کی طرف موڑ دیا۔ کچھ ہی لمحوں میں میں نے کیرتی نگر کی ویران سڑکیں چھان ڈالیں شاید وہ دیکھ دا کے بیگ کسی ویران جگہ پھینک گئی ہو۔ لیکن اُن سڑکوں پر جگہ جگہ گندے چیتھڑے۔ پھٹے ہوئے غبارے اور بیکار کانچ کے ٹکڑے تو پڑے تھے لیکن بیگ کہیں نہ تھا۔ اُس وقت مجھے بیگ میں پڑے ہوئے بہت سے ضروری کاغذات کا خیال آیا جنھیں میں نے کئی دنوں کی محنت سے تیار کیا تھا اور اگر وہ کسی بڑے آدمی کے ہاتھ آجاتے تو میری نوکری جا سکتی تھی۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور سانس اکھڑ رہی تھی۔ اگلے لمحہ میں سوچ رہا تھا کہ کیرتی نگر کے ایک ایک گھر کو سونگھوں اور بیگ کا سُراغ لگاؤں۔

یہ سوچتا ہوا میں کیرتی نگر کی مین سڑک پر آگیا تھا۔ دل میں آیا کسی دُکان سے کوکا کولا لے کر پیوں۔ پھر سوچا مجھے تو آج کھارا سوڈا بھی نہیں پینا چاہیئے۔

ابھی تک میں پینے اور نہ پینے کی اس کش مکش ہی میں تھا جب میری روشن آنکھوں نے دیکھا، میرے برابر دو لڑکیاں چلی جا رہی تھیں۔ لڑکیوں کا سڑک پر چلنا عام سی بات تھی۔ اُن کے چہروں پر لکھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھو! میرے دلکش خدوخال کو دیکھو! یہ بھی ہر لڑکی کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے لیکن اُن دونوں میں سے ایک نے اخبار کے پُرانے پیلے کاغذ میں ایک بیگ لپیٹ رکھا تھا۔ وہ لڑکی سانولی بھی تھی اور اُونچی لمبی بھی۔ بیگ کی ایک کمانی کاغذ میں سے باہر دُم کی طرح تھرک رہی تھی اور اُس کا رنگ بھُورا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے بیگ کو بغل میں اٹھائے ہوئے ہو۔ میں اُن کے پیچھے پیچھے سرکنے لگا۔ کسی لمحہ برابر بھی ہو جاتا۔ میرا جی چاہتا تھا سائیکل پر چڑھ کے اخبار کے کاغذ کے اندر جھانک لوں، لیکن میں یہ نہ کر سکا۔

وہ لڑکیاں انڈسٹریل ایریا والی سڑک پر چلنے لگیں اور میں بھی۔ سوچتا تھا کہ جب یہ چائے کے کھوکھے کے قریب سے گزریں گی تو دکاندار کو شناخت کرنے کے لئے کہوں گا۔ لیکن دکاندار کھوکھے میں نہیں تھا اور یہ موقع بھی چُوک گیا۔ مزید دو لمحوں میں اُنہوں نے لائین پار کر کے شادی پور ڈپو سے بس پکڑ لینی تھی۔ میں نے لائین کے قریب پہنچ کر جلدی سے اُنھیں گھیر لیا میں نے اُنہیں پریشانی سے گھیرا تھا لیکن اُنھوں نے مجھے بے چینی سے گھیر لیا بس

دہی سوالتی بے چینی ——— "تیرے گھر میں بہن نہیں ؟ ماں نہیں ؟ تو بہت دیر سے ہمارا پیچھا کر رہا ہے ——— بے شرم!

دو ہی لمحوں میں اُن کی بے چینی بھی ختم ہو گئی اور اب ہم بھیڑ میں گھرے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے زور سے سب کو سُنا کر کہا "تھوڑی دیر پہلے میرا بیگ کھو گیا ہے۔ اُس میں ضروری کاغذات تھے۔ اُس چائے والے نے بتایا ہے کہ ایک سانولی لڑکی اُٹھا کر لے گئی ہے۔"

اُس لڑکی کے پریشان ماتھے پر تیہری تیوریاں چڑھ گئیں۔ ایک بار اُسے سانولی کہنے پر۔ دوسری بار چور سمجھنے کے لئے اور تیسری بار اُسے راستہ میں روکنے کے لئے۔ لیکن میں نے تیوریوں کی پرواہ کئے بغیر کہا "اِس لڑکی نے اخبار میں ایک بیگ چھپا رکھا ہے۔ اِس لئے مجھے شک ہوا ہے۔ یہ بیگ بھورا بھی ہے۔"

لڑکی کی پیشانی کی تیوریاں تو ختم نہ ہوئیں لیکن اُس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر بیگ دکھا دیا۔ وہ لیڈی بیگ تھا۔ بہت بڑا۔

بھیڑ میں سے ایک آدمی بولا۔ "شاید اِس کے بیچ میں ایک دوسرا بیگ ہو!"

"یہ بیگ تو میں کھول کے نہ دکھاؤں گی" لڑکی نے کہا۔

میں نے سوچا شاید اُس بیگ میں لڑکی کے ضروری کاغذات ہوں مثلاً جذباتی محبت نامے۔ فلمی رسالے۔ خودکشی کے جذباتی نسخے۔ برتھ کنٹرول کا سامان۔ کنگھی اور شیشہ وغیرہ۔ لیکن یہ چیزیں تو ہر امیر لڑکی کے پرس میں ہوتی ہیں۔ یہ بیگ کھولنا کیوں نہیں چاہتی؟

"آپ تھانے میں رپورٹ کر دیں!" بھیڑ میں سے ایک آواز اُبھری۔

"میں تو خود سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر ہوں! بیگ میں میرے ضروری کاغذات تھے۔ کئی دن لگا کر میں نے انویسٹی گیشن کے کیس تیار کئے تھے اور اب سب کچھ ....."

میرے چہرے پر غصّے کی بہ نسبت پریشانی زیادہ تھی۔ (میں نے محسوس کیا) مجھے سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر جان کر بھیڑ ایک ہی لمحہ میں بھیڑ نہ رہی۔ کہیں میں اُنھیں سونگھ کر کوئی سازش کیس نہ تیار کر لوں!

بھیڑ کے ساتھ ہی لڑکیاں بھی سرک گئیں اور میں وہیں کھمبے کی طرح کھڑا رہا۔ میری نظروں کی زد سے دُور ہو کر لڑکی نے بیگ پھر کاغذ میں لپیٹ لیا۔ وہ پیچھے مُڑ کے دیکھتی بھی جا رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے دل میں آیا کہ جلدی سے تھانے جا کر رپورٹ کر دوں پھر سوچا۔ جب اُنھیں میرے بیگ کھو جانے کا پتہ چلے گا تو وہ پہلے زور سے ہنسیں گے کہ لوگوں کا سُراغ لگاتا لگاتا آج، میں خود ہی اپنا بیگ کھو بیٹھا! رپورٹ میرے دفتر تک ضرور پہنچ جائے گی۔ کسی گاڑی کے آنے کا وقت تھا۔ گیٹ کیپر نے ٹریفک روک دیا تو مجھے خیال آیا۔ میں بیگ تلاش کرنے کے لئے کھڑا ہوں۔ خودکشی کرنے کے لئے نہیں۔

چائے کے کھوکھے کی جانب واپس جاتے ہوئے میں اُن کاغذات کے بارے میں سوچ رہا تھا جنھیں مجھے کل دفتر میں پیش کرنا تھا۔

دو کیس تو پاس پورٹ والوں کی شناخت ہی کے تھے۔ لیکن دو کیس بہت سنجیدہ قسم کے تھے۔ ایک سرکاری افسر کی تفتیش کی تھی اور اُس کے بارے میں بہت سی جانچ پڑتال کر کے کیس تیار کیا تھا۔ وہ افسر ہر روز مجھے بہت پُرتکلف کھانا کھلاتا مزیدار چائے تیار کرواتا اور اُس کی نازک اندام سی خوبصورت بیوی ہر وقت میرے گرد مٹکتی رہتی۔ اُس کے گھر بیٹھ کے جب میں کسی ثبوت کا مطالبہ کرتا تو وہ اپنی بیوی کے ہاتھ دستاویز بھیجتا۔ کئی بار تو مجھے گھر پر بٹھا کر خود ضروری کام سے چلا جاتا اور شام تک نہ لوٹتا۔ اُس دن میں تھکا ماندہ گھر لوٹتا۔ وہ خوش نظر آتا اور میں پریشان جیسے تفتیش اُس کی نہیں میری ہو رہی ہو۔ کئی دنوں کی جان توڑ محنت سے اُس کے حق میں کیس تیار کیا تھا۔

دوسرا اسمگلروں کی یونین کا کیس تھا۔ وہ ایک چائے کے کھوکھے پر جمع ہوتے تھے اور سارا دن وہاں ہر طرح کا مال آتا اور پھر مارکیٹ میں چلا جاتا۔ میں نے کئی دن "واچ" کیا۔ ایک دن پولیس کے آدمیوں نے مجھے پہچان لیا۔ اُن کا خیال تھا کہ میں بھی کھوکھے والوں کے ساتھ ہوں۔ میرے کاغذات دیکھ کر اُن کی مونچھیں ڈاؤن ہو گئیں۔ اگلے دن تھانے میں بُلا کے اُنہوں نے مجھے اعزاز دیا۔ وہ بار بار کہتے کہ اِس دھندے میں بڑے بڑے لوگوں کے بیٹے۔ پوتے اور لڑکیاں وغیرہ شریک ہیں۔ میری تفتیش کچھ نہیں کر سکتی۔ وہ اطمینان کی روٹی کھاتے ہیں اور میں بھی کھاؤں۔

میں نے اُس کھوکھے والوں کا کیس بھی تیار کیا تھا اور میرے گھر سُکھ کی روٹی پکتی تھی۔ اسمگلر لوگ مجھے کہتے تھے کہ میں اُن کی یونین کو رجسٹرڈ کروا کے سرکار سے "ریکگنائز" کروانے میں بھی مدد کر دوں۔ میں سوچتا تھا۔ پھر تو جوہوں کی یونین بھی "ریکگنائز" کروانی پڑے گی۔ میں اُنھیں ٹالتا جا رہا تھا۔

لیکن اگر بیگ نہ ملا تو وہ لوگ ضرور ناراض ہوں گے۔

خوشی کسے ہوگی؟

خوشی ہوگی سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر کی بیوی کو جس نے اسپتال کو گھر اور گھر کو اسپتال بنا رکھا ہے۔ اُس کا ماٹو ہے۔ کنواری لڑکی کا داغ مٹانے کی فیس ایک ہزار روپیہ۔ ایک ہفتہ میں لڑکی صحت یاب!

میرا ایک دوست اپنی محبوبہ کو لے کر گیا تو اُس نے پیشگی لئے بغیر کیس کرنے سے انکار کر دیا اور لڑکی داغ ہٹانے کے لئے جمنا کے جل میں سما گئی۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو پھنسانے والی وہ وہیل مچھلی ایک دن میرے قابو میں آ گئی اب اُسے کوئی بھی بچا نہ سکے گا۔

اِس کے علاوہ بیگ میں میرے بہت سے محبت نامے تھے لڑکیوں کے میرے نام لکھے ہوئے سب محبت نامے اسی بیگ میں تھے۔ اور میں بھی کتنا احمق تھا کہ محبت نامے بھی بیگ ہی میں رکھے ہوتے تھے۔ محکمے کے ہاتھ آ جائیں تو فوراً معطل، لیکن گھر رکھتا تو بیوی کے سامنے شرمندہ ہوتا۔ وہ میری سب سے بڑی سرکار ہے! کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ محکمے نے میرے پیچھے بھی کوئی سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر لگایا ہوا ہو اور اُسی نے بیگ ....؟

لیکن بیگ گُم ہوا کیسے؟

بیگ گُم ہونے کے متعلق ایک یہ بات دل میں آئی کہ ہو سکتا ہے میں کسی خوبصورت عورت کو گھورتا جا رہا ہوں اور اچانک بیگ کی کمانی ٹوٹ گئی ہو۔ لیکن خوبصورت عورت کو گھورنے کا تعلق بیگ کی کمانی ٹوٹنے سے کیسے وابستہ ہو گیا؟

دوسرا خیال تھا کہ جن سڑکوں سے میں اکثر گزرتا ہوں۔ اُن پر شراب بیچنے والوں کے کھوکھے ہیں۔ کیا معلوم کسی کھوکھے والے سے بڑھیا نشے کا پیگ پی کے سائیکل پر چڑھ گیا ہوں اور بیگ کھوکھے پر ہی .... لیکن کس کھوکھے پر رہ گیا؟ آج میں نے تو کسی کھوکھے سے ایک گھونٹ بھی نہیں پی!

اُس چائے والے کھوکھے پر واپس آیا تو میں بہت پریشان تھا۔ میں نے اُسے لڑکیوں کے گزرنے اور اُس کے کھوکھے پر نہ ہونے کے متعلق بتایا۔

اُس نے کہا "ٹھیک ہے! میں اُس وقت کیپٹل فیکٹری کے ہیڈ کلرک کو نشے کا پیگ .... میرا مطلب ہے چائے کا گلاس دینے کے لئے گیا تھا۔"

مجھے بے چین دیکھ کر اُس نے پھر کہا۔ "آپ چھوڑیئے بیگ اور لڑکیوں کی باتیں۔ آج میری مہمان نوازی قبول فرمایئے!"

اور اُس نے خوش ہو کر نفیس شراب کا ایک پیگ مجھے تھما دیا۔ ایک گھونٹ بھرنے کے بعد میں نے اُس سے کہا۔

"ابے لفنگے! تُو نے شراب بیچنی بھی شروع کر دی ہے؟"

"حضور صرف چائے کے گاہک ہی کتنے ہیں؟"

"پھر تو دوسرا دھندہ بھی کرنا ہوگا!"

"حضور ہم گناہگار ہیں۔"

"میں سب گناہگاروں کو اندر کروا دوں گا!"

"سرکار! وہاں بھی آپ کو ہم سے یہی دھندہ کروانا ہے!"

شراب بہت نفیس اور سُرور بخش تھی۔ ایک ہی پیگ نے میرے دماغ میں سے بیگ کو گُم کر دیا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ جی چاہا سب تارے توڑ کے جیب میں بھر لوں اور بیوی کے بالوں میں ٹانک دوں بیچاری ہر وقت میری خاطر پریشان رہتی ہے۔ آج ضرور اُسے خوش کروں گا... لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ شراب ہی پی کے بیوی کی یاد کیوں آتی ہے؟

جب میں سائیکل اُٹھا کے چلنے لگا تو کھوکھے والا بولا "حضور! یہ آپ کے تھانے والے بہت پریشان کرتے ہیں!"

"سب ٹھیک کر دوں گا!" میں نے زور سے کہا۔

شام ڈوب گئی تھی اور جھُٹ پٹا پھیل رہا تھا۔ ایک فرلانگ چلنے کے بعد میں ایک کھوکھے کے سامنے رُک گیا اور زور سے کہا "خبردار! اگر کسی نے نشہ بیچا تو اندر کروا دوں گا!"

ایک بوڑھے۔ جُھرّیوں بھرے چہرے اور چُندھی آنکھوں والے آدمی نے کھوکھے سے باہر نکل کر کہا۔ "تُو تھانے دار ہے؟"

"ہاں! میں تھانے دار ہوں" اُس وقت میں زمین نام کی شے سے بہت بلند تھا۔

"میں کوتوال ہوں!" اُس نے ہوا میں گلاس اُچھال کے کہا۔

میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ سامنے تھانے کی شاندار عمارت تھی۔ اسکول سے بھی شاندار! جی چاہا اپنے ایک دو واقف کاروں کو بیگ کھو جانے کی بات بتاتا جاؤں۔ مجھے پہلے ہی وہاں آ جانا چاہئے تھا۔

"بیگ آج ہی گُم ہوا ہے؟" ٹیلیفون لئے بیٹھے مونچھوں والے حوالدار نے پوچھا۔

"ہاں۔ دوپہر ہی کو!"

اب اُس نے بائیں مونچھ کے اشارہ سے ڈیوٹی کلرک سے کچھ کہا اور اُس نے ایک بیگ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے زور سے کہا "بس یہی تو ہے! یہی تو ...."

"اِس میں بہت سے سیکریٹ پیپر ہیں جن کا کسی کو پتہ نہ چلنا چاہئے۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ اُن کے بارے میں کسی کو پتہ کیسے لگ سکتا ہے؟ لیکن فرطِ خوشی سے بولنا مشکل ہو گیا تھا اور میں ایک لفظ نہ کہہ سکا۔

غزل

پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

ہستی مری جہانِ مسرت بنی رہی
پھر بھی غمِ حیات سے وابستگی رہی

اُبھرا نہ کوئی چاند شبستانِ زیست میں
ظلمت سے ہم کنار مری زندگی رہی

مایوس ہم ہوئے نہ خوشی کی تلاش میں
جو غم ملے تھے دل کو اُنھیں کی خوشی رہی

کچھ کم نہیں ہے یہ بھی کرم اُن کے ناز کا
شائستۂ نیاز مری زندگی رہی

دل کی اُداسیوں کی کوئی انتہا بھی ہے
وہ مِل گئے تو پھر بھی طبیعت بجھی رہی

اُن کی نظر میں لطفِ نہاں بھی ستم بھی تھا
دیوانہ وار اُن کو نظر دیکھتی رہی

اُبھری تھی اِک شکن سی جبینِ حیات پر
پھر اِس کے بعد نبضِ دو عالم رُکی رہی

اُن کے حسیں لبوں پہ تبسم کو دیکھ کر
شرمندۂ کرم مری وارفتگی رہی

پرویز دل نواز ہے بسمل کی وہ غزل
"پنہاں سپردگی میں بھی پہلو تہی رہی"

غزل

ضیا فتح آبادی ایم۔ اے

صبح کی قسمت ظلمتِ شام — خوب ہے آغازِ انجام

حسن بنا خود گردشِ جام — عشق ہوا ناحق بدنام

انسانوں کو پوچھے کون — پوجے جاتے ہیں اصنام

میرا عالمِ یاس نہ پوچھ — کام مرا ہر اِک ناکام

حسن کا پرتو عشق کی آگ — یہ سورج، وہ ماہِ تمام

اُس کی دھڑکن، اُسکی تڑپ — جس دل کو ہے غم سے کام

مجھ میں، تجھ میں بھید کہاں — تیرا اللہ، میرا رام

کس کی ہے زرخیز زمیں؟ — کس کا چرخ نیلی فام

محرومی، تنہائی کیوں — میری وفا کا ہوا انعام

شرم ضیا کیسی، پی جا!
چھین کے اب ساقی سے جام

[redacted]

فاصلے کی زنجیر

سیّد شمیم اشرف

کشہری۔ پوسٹ۔ رام سنہی گھاٹ (بارہ بنکی)

مکرّم و معظم خوشتر صاحب! آداب

ایک سال ہوا میں نے کچھ نہیں لکھا۔ اپنی تنہائی اور زرعی مصروفیات کا مریضِ ناتواں بن کر رہ گیا ہوں۔ اِس عرصہ میں دوستوں کے خطوط برابر موصول ہوتے رہے۔ لیکن میری خاموشی کا مطلب اُنھوں نے یہ نکالا کہ خدا نخواستہ میں خلد آشیانی ہو چکا ہوں۔ "فاصلے کی زنجیر" اُسی غلط فہمی کے ازالے کی ایک کوشش ہے۔ میری امکانی کوشش کے باوجود کم بخت افسانہ تھا کہ کسی گلبدن کی زلفِ مُسلسل کی طرح دراز ہوتا گیا۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔ اپنی بیش قیمت رائے سے ضرور مطلع فرمایئے گا....

طالبِ دُعا ——— سیّد شمیم اشرف

اندھیرا۔ اندھیرا۔ اندھیرا ——— !!!

پھٹتی ہوئی پَو کا قرمزی آنچل ہے نہ چاند کی دودھیا انگلیوں سے ٹپکتی ہوئی چاندی۔

خلا باز۔ انجینیر۔ ڈاکٹر۔ صنعت کار۔ تاجر۔ سائنس داں۔ بینک کار۔ ٹریڈ یونین لیڈر .... لا متناہی اندھیرے میں خود اپنے شعور کی گم شُدہ راہیں تلاش کرنے میں سرگرداں ہیں۔

روحانی قحط سالی کے شب گزیدہ جلووں کی بیڑیاں پیروں میں ڈالے ہوئے!

مقدّس بُدھ کا بُت ساکت و صامت ہے۔

مہاتما گاندھی کا بُت اُداس، مغموم!

یہ بُت احتجاج کیوں نہیں کرتے؟

اِنھیں اُٹھا کر سمندر میں کیوں نہیں پھینک دیا جاتا؟

یا اِن کا مقام امراض سے متعلق تحقیقات کا قومی عجائب گھر ہے۔

وطنیت، فرقہ واریت، اخلاقی نظریہ پرستی، جمہوری اقدار کے کِرم خوردہ جسم پر اطلس و سنجاب کے خوبصورت پردے ڈال کر بین الاقوامی منڈیوں میں فروخت کرنا۔ اپنی پُر فریب اخلاقی برتری پر تیّار شُدہ مال کا لیبل لگا کر زرِ مبادلہ کمانا!

یہ خوفناک ترین امراض ہیں جنھوں نے ایک نیم وحشی معاشرے کے بدبُودار فلسفہ کو جنم دیا ہے۔

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

یہ سوال ہندوستان کی ملکیت ہے نہ پاکستان کی۔ افریقہ کی نہ یورپ کی۔ یہ ایک بین الاقوامی المیہ ہے کہ نیو کلائی انسان امراض کے آتش کدوں سے بہتی ہوئی پیپ کا مشاہدہ کرنے سے مُجرمانہ گریز کر رہا ہے۔ اُس کی منزل چاند کا وہ اُبھرا ہوا حصّہ ہے جہاں کھڑے ہو کر وہ ایک ہزار عیبوں میں اپنے فوق البشر ہونے کا خراج دُنیا سے وصول کریگا۔

انسان نے اپنی تہذیبی اور نظریاتی قدروں پر انتشار اور خوف کے دبیز پردے ڈال رکھے ہیں۔

میں اپنے سیڈر میں بلیک کافی کی چُسکیاں لے رہا تھا۔ کبھی

رات کی بانہوں میں رنگ و نور کا ایک سیلِ رواں نظر آ رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر جوتوں کی کھٹ کھٹ۔ بھنبھناہٹ۔ شور۔ خوبصورت چہرے۔ بھدے چہرے۔ زندگی سے بھرپور گلابی جسم۔ چہرے کی عمیق جھرّیوں میں غرق ہوتی ہوئی زندگی۔ رواں دواں سانسوں کا عطر بکھیرتی ہوئی ہوائیں!۔

نہ جانے کیوں مجھے یہ چہرے مصنوعی نظر آتے ہیں۔ اجنبی اُداس چہرے اِن چہروں کے پیچھے گلاب کراہتے ہیں۔ ہوائیں زخمی پرندوں کی طرح پھڑپھڑاتی ہیں۔ پہاڑی چشموں کی سانسوں میں چنگاریاں رقص کرتی ہیں۔ کون ہے جو ان چہروں کو اپنا چہرہ کہہ سکے؟ کوئی انقلابی لیڈر جو فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے دوا فروشوں کی طرح جوشیلی تقریروں کی تجارت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

کوئی ٹریڈ یونین لیڈر جو اپنے ایرکنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھا ہوا اسکاچ کی بوتلوں سے عالمی مزدور تحریک کی تاریخ مرتب کر رہا ہے۔ میں یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں؟

شاید اِس لئے کہ میری جیب میں کاغذ کے رنگین مستطیل ٹکڑوں کی ریڈیائی تابکاری ختم ہو چکی ہے یا پھر یہ دنیا ایک بھاری بھرکم جیب میں تبدیل ہو گئی ہے اور ہر شخص اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور تکنیکی استعداد کے مطابق اُسے کاٹنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔

اور ـــ وہ لڑکی جو میرے پراگندہ خیالات کی ڈگر پر حُسن و شباب کا ایک شوخ و شنگ شعلہ بن کر نمودار ہوئی تھی۔ بالوں کی سنہری رنگت۔ دل آویز نیلے نازک ہونٹ۔ گلابی بانہیں جو کافوری شمعوں کی طرح روشن تھیں۔ زندگی سے بھرپور جسم۔ مشرقی آنکھیں۔ سیاہ اور نشیلی ....اُس کے ساتھ پچاس پچپن سال کا ایک مرد تھا۔ خوبرو۔ صحت مند۔ اُس کے ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ دونوں نے اپنے گرد و پیش ایک یا ضیاتی نگاہ ڈالی۔ اُنھیں کوئی میز خالی نظر نہ آئی۔ پھر وہ دونوں چہل قدمی کے سے انداز میں چلتے ہوئے میری میز کی طرف آ رہے تھے۔ کیونکہ دو آدمی بِل ادا کر کے اُٹھ چکے تھے۔ دونوں کی نگاہیں میز پر جم گئیں اور خوشبو کا ایک خوشگوار جھونکا میری ناک سے متصادم ہو کر روح کی گہرائیوں میں آگ کا نشتر بن کر اُترتا چلا گیا۔ میں نے کافی ختم کر کے آخری سگرٹ سُلگایا۔ سگرٹ سُلگانے سے پہلے میں نے اُس پر الوداعی نگاہ ڈالی تھی۔ گویا میں ایرپورٹ پر کھڑا اپنے کسی عزیز دوست کو رخصت کر رہا تھا۔ جو ایر فرانس کے کیراوِلی طیارے سے لندن جا رہا تھا۔ مجھے بہر حال کچھ وقت تو گزارنا ہی تھا۔ جبکہ ایک لڑکی میرے قریب جلوہ افروز تھی۔

بیرا میز پر مطلوبہ لوازم لگا کر جا چکا تھا۔ خوشبودار پنیر کے رنگین ٹکڑے۔ اسٹیک اور ایک ہاٹ ڈش باربیکو چکن۔

"شروع ہو جاؤ" مرد نے سگار ایش ٹرے میں کچلتے ہوئے کہا۔

"شکریہ! میں کھانا کھا چکا ہوں۔"

"تم مشرقی لوگوں کا روایتی تکلف میری سمجھ میں نہیں آیا"

"ہماری یہ ادا ہمارے محکوم ذہنوں کی پیداوار ہے۔ ورنہ ہم قومی یک جہتی کا نقلی چہرہ لگا کر جمہوری قدروں کا قتلِ عام کرنے میں ذرا بھی تکلف نہ کرتے۔"

"اوہو! تم تو ڈاکٹر کنگ کے لہجہ کی نقل کر رہے ہو۔ اچھا کھاؤ۔ میں دیکھوں گا کہ تمہاری پلیٹ میں رکھے ہوئے پنیر کے ٹکڑوں سے کتنی جمہوری قدریں طلوع ہوتی ہیں۔"

لڑکی کے قرمزی ہونٹوں پر دلفریب مُسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ میری نگاہیں اُس کے حسین چہرے پر منجمد ہو گئیں۔ وہ گرمی کی تند شراب کے مانند نشہ آور نظر آ رہی تھی۔

مجھے نوالہ چباتے وقت ایسا محسوس ہوا جیسے لڑکی کی نشیلی آنکھیں میرے پیٹ کا چیولوجیکل سروے کر رہی ہیں اور مرد میرے دل کی گہرائیوں میں اپنے سگار کی راکھ جھاڑ رہا ہے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" مرد نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"راہُل"

"میں روڈالفو ہوں اور یہ میری لڑکی کانسیلو۔"

"اوہ! مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ غالباً اطالوی ہیں۔"

مرد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہم پہلی بار ہندوستان آئے ہیں۔ لیکن ہمیں تمہارے سیکولرازم سے کوئی دلچسپی ہے نہ خارجہ پالیسی سے۔ ہم خالص کاروباری لوگ ہیں۔ تمہارے ملک کو جدید صنعت اور جدید زراعت کی ضرورت ہے اور تم کیا ہو؟"

"آرکیٹکٹ انجینیر۔"

"کہیں ملازم ہو یا فری لانسر؟"

"فری لانسر ہی سمجھ لیجئے کیونکہ رُوسو کے قول کے مطابق انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔"

"ہوں، تو تم بیکار ہو۔" مسٹر روڈالفو کی آنکھوں سے غم جھانکنے لگا۔

"کہاں مقیم ہو؟"

"موجودہ پتہ مالابار ہل کا وہ فٹ پاتھ ہے جہاں ایک خوبصورت اوپن ایر کیفے ہے۔ میں بیروزگاری کی حالت میں بھی ذرا اونچی جگہ رہنا پسند کرتا ہوں۔"

مسٹر روڈالفو زیرِ لب مسکرائے۔ کانسیلو پتھر کے بُت کی طرح خاموش تھی۔

"غیر متوقع بارش نے سردی میں خاصہ اضافہ کر دیا ہے۔ تمہارا سامان کہاں ہے؟"

میں نے اپنا ایر بیگ کھول کر مسٹر روڈالفو کو وہ میلی کچیلی ہتھ کھڈی کی چادر دکھائی جو ایک سو دو راتوں سے کسی وفادار لیڈی کانگ کی طرح موسم کے جابر ہاتھوں سے میری حفاظت کرتی آئی تھی۔

"یہ ایک طلسمی چادر ہے۔" میں نے تلخ لیکن بجھے بجھے لہجہ میں کہا۔ "میں اسے فٹ پاتھ پہ بچھا دیتا ہوں تو یہ ایرانی قالین بن جاتی ہے۔ اوڑھ لیتا ہوں تو اس میں ریڈی ایٹر چلنے لگتے ہیں سر پہ تان لیتا ہوں تو یہ کسی اطالوی ولا کے خوبصورت ڈرائنگ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کا فرش لائنو باریہ کی ٹائلوں کا بنا ہوا ہو اور کھڑکیوں پہ فرنچ ٹائمس ڈی جوائے کے خوبصورت پردے انگڑائیاں لیتے ہوں۔ عطر بکھیرتی ہوئی ہواؤں کے نادیدہ ہاتھ انھیں گدگداتے ہوں۔ محترم! میری جیب میں پانچ کا ایک نوٹ اور بیس کا ایک سکہ ہے۔ بل ادا کرنے کے بعد میں صرف بیس پیسوں کی ایک مختصر وزارت تشکیل کر سکوں گا جو دنیا کی سب سے چھوٹی جمہوریت ہو گی۔"

مسٹر روڈالفو نے خاموشی سے بل ادا کیا اور ساتھ ہی ٹپ بھی۔ پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔ میں کانسیلو کے پیچھے تھا۔

باہر کی دنیا زندگی سے بھرپور تھی۔ بمبئی نیشنل جیوگرافک میگزین کی کوئی رنگین تصویر نظر آ رہی تھی۔

"ادھر" مسٹر روڈالفو نے ہاتھ اٹھا کر مجھے آواز دی۔ وہ کار اسٹارٹ کر چکے تھے۔ امید و بیم کے ملے جلے جذبات نے میرے پیروں میں کپکپی پیدا کر دی تھی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کار کی گونج میں میرے دل کی دھڑکنیں مدغم ہو گئی تھیں۔

چند منٹ بعد ہم ایک شاندار کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میز پر موٹی موٹی فائلوں کے مینار کھڑے تھے۔ میں کسی قتل کے ملزم کی طرح خوف زدہ ایک امبریلا چیر میں دھنسا ہوا آنے والے لمحات کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ کمرے میں کانسیلو کے بدن کی خوشبو بکھری ہوئی تھی یا ایک پُراسرار طلسمی سکوت!

کانسیلو فائلوں کے سمندر میں غرق تھی اور مسٹر روڈالفو اب سگار کے بجائے عبداللہ کے گہرے گہرے کش لے رہے تھے۔ یکایک انھوں نے ہاتھ بڑھا کر نیلے رنگ کی ایک فائل میز سے اٹھائی اور میری طرف اچھال دی۔

"اسے دیکھو" وہ نرم لہجہ میں بولے "اور ہاں۔ سگریٹ لو۔"

میں دیر تک فائل کو بغور دیکھتا رہا۔ مسٹر روڈالفو کیا چاہتے تھے۔ اب میرے ذہن کے منجمد دروازے جو صدیوں سے اجداد کے بدنصیب ہاتھوں نے مقفل کر رکھے تھے رفتہ رفتہ کھل رہے تھے۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر سگریٹ کے جلدی جلدی دو تین کش لئے۔ عبداللہ کی خوشبودار تمباکو آتش سیال کا لطف دے رہی تھی۔

"آٹوموبیل فیکٹری کے ڈیزائن معلوم ہوتے ہیں۔"

"میں ان سے بہتر ڈیزائن کی تلاش میں ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنے منصوبہ میں تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے۔ یہ ترمیم ناگزیر تھی اور ترمیم شدہ پلان کے مطابق ڈیزائن کی دستیابی مزید تاخیر کا باعث ہو گی۔ ایک ترقی پذیر معاشرے کا اہم تقاضا ہے کہ عوام کو سستے مکان اور سستی موٹریں مہیا کی جائیں زندگی میں فکر و عمل کا بیکراں جذبہ ہو اور جدید ٹکنالوجی کے محیر العقول کارنامے جو صدیوں کے گڑے ہوئے سالخوردہ میل کے پتھروں کو چند ثانیوں میں اپنے ساتھ بہا لے جائیں۔ میں عوام کو سستی موٹر کاریں دوں گا۔ آرام دہ۔ کم خرچ۔ تیز رفتار ٹیلی ویژن سیٹوں سے لیس فراگ frog موٹر کاریں سو فیصدی عوامی ہوں گی۔ ارسٹوکریٹ کے لئے بھی اور ریلوے کے دفتر میں کام کرنے والے کلرک کے لئے بھی۔"

مسٹر روڈالفو کے الفاظ میں خلوص تھا۔ وہ حسن کا سنیہ انسان تھے۔ ایک عظیم انسان! وہ اپنا پیشہ ورانہ تجربہ، محنت۔ سرمایہ اور اعلیٰ کارکردگی کا یقین محکم ملک کے پچاس کروڑ عوام کو سونپنے کے لئے بیتاب تھے۔ میں نے اپنے بیگ سے ایک مڑا تڑا پلاسٹک کا لفافہ نکال کر مسٹر روڈالفو کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ چند لمحوں بعد میں نے ان کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک دیکھی۔

"کانسیلو! اِدھر دیکھو۔ یہ ڈیزائن!"

لیکن کانسیلو کمرے میں موجود نہ تھی۔

"اور یہ ڈوم (Dome) ٹرین ہے" وہ میری طرف مُڑ کر بولے۔

"ڈوم ٹرین؟" میں خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"میں نے ڈوم ٹرین میں ٹارنٹو اور لیک لوئس کی بارہا سیاحت کی ہے۔ کناڈا کے حسین ترین کوہساروں کے درمیان یہ ٹرین چلتی ہے۔"

"مگر — یہ تو .... فیکٹری کے دفاتر کا ڈیزائن ہے۔" میری آواز کپکپا رہی تھی۔

"تم واقعی گریٹ ہو" وہ تحسین آمیز لہجہ میں بولے "جاؤ۔ آرام کرو۔ میں دیکھوں گا کہ تمہیں کیا دے سکتا ہوں۔ لیکن ٹھہرو۔ اب تمہیں مستقل طور پر میرے ساتھ رہنا ہے۔ شب بخیر!"

اُنھوں نے گرم جوشی سے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور گلاس میں شیمپین اُنڈیلنے لگے۔

میں تیزی سے سامنے والے کمرے کی طرف بڑھا لیکن دوسرے لمحہ مجھے ٹھٹک کر دروازے پر رُک جانا پڑا۔ کانسیلو میرا بستر دُرست کر رہی تھی میری آنکھوں میں تشکّر کے آنسو تھے۔

"اندر آجاؤ!" اُس کے پتلے نازک ہونٹوں پر دل آویز مُسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ وہ نائلون براکیڈ کے ہلکے گلابی مینی اسکرٹ میں دوسری دنیا کی مخلوق نظر آرہی تھی۔ وہ جانے کے لئے مُڑی اور میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ ہاتھ میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ میں وقت کی ابتدا سے گلاب کی مہکتی ہوئی وادیوں اور حُسن کے طرب زاروں میں اِن خوبصورت ہاتھوں کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں۔

"تمہارے ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔ ایک عظیم انسان! میری آنکھوں میں اُن کے لئے تشکّر اور عقیدت کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔" میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہوں" وہ شرارت آمیز لہجہ میں بولی "میں ارواحِ خبیثہ کے کنبہ سے تعلق رکھتی ہوں۔ کیوں؟"

"ایسا نہ کہو" میں اُس کے مُنہ پہ ہاتھ رکھ کر بولا "تم میری محبت ہو! میری زندگی تنہائی کا تنگ و تاریک غار بن چکی تھی۔ سورج کی زرکار شعاعوں کا نورانی پیکر اُس کے لئے اجنبی تھا۔ چاند کی ہتھیلی سے پھوٹتی ہوئی خنک کرنوں نے اِس ویران غار کی دراڑوں سے جھانکنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ پہاڑی چشموں کی آغوش میں مچلتی ہوئی چاندی کی لہروں نے کبھی اِدھر کا رُخ نہ کیا۔ لیکن اب محبت کے اِس گداز اور نرم بستر پہ لیٹ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ماضی کی کفنائی ہوئی لاش لاشعور کی نادیدہ گہرائیوں میں دفن ہو چکی ہے اور فاصلے کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں!"

غزل

شمیم فتحپوری

آنکھیں غمِ فراق سے ہیں تر اِدھر اُدھر
غم کا اثر ہے آج برابر اِدھر اُدھر

تھے جو وفا شعار وہ نذرِ ستم ہوئے
اب کس کو ڈھونڈتا ہے ستم گر اِدھر اُدھر

دنیا کا حال دیکھ کے گھبرا رہا ہے دل
بہتے ہیں درد و غم کے سمندر اِدھر اُدھر

محفل میں تیرے حسن پہ، قربان ہوگا کون
دیوانے چل دیئے جو نکل کر اِدھر اُدھر

ساقی کے ساتھ رونقِ میخانہ بھی گئی!
ٹوٹے پڑے ہیں، شیشہ و ساغر اِدھر اُدھر

ایسا نہ ہو زمانہ، ہنسے تم پر ایک دن
دیکھو نہ میرے حال پہ ہنس کر اِدھر اُدھر

آیا یقین رہ گزرِ یار دیکھکر
سُنتا تھا ذکرِ شورشِ محشر اِدھر اُدھر

دل میں کبھی ہے درد، جگر میں کبھی خلش
جیسے چبھے ہوں، سینے میں نشتر اِدھر اُدھر

اپنی غزل سناؤ شمیم اہلِ ذوق کو
ضائع کرو نہ فکر کے جوہر اِدھر اُدھر

غزل

اُودے سنگھ مصوّر

ہر لب پہ تشنگی ہے اچھی یہ مے کشی ہے

میری خوشی وہی ہے جو آپ کی خوشی ہے

اچھی ہے یا بری ہے پھر بھی یہ زندگی ہے

موجوں سے کھیلتا ہوں طوفاں سے دوستی ہے

یہ ہے کمال میرا جو تم سے دوستی ہے

یہ بلبلے کی ہستی دم بھر کی سرکشی ہے

مہمل سی عیب جوئی بنیادِ دشمنی ہے

ہنسنا ہے جزوِ صحت صحت ہی زندگی ہے

بے زر ہے گو مصوّر
دل کا مگر غنی ہے

طنزیہ

ادھیائے ساتواں

نئی مہابھارت

فکر تونسوی

اندھے دھرت راشٹر کے یہاں ایک سَو لڑکے پیدا ہوئے اور سُبھاکھے پنڈو کے گھر صرف پانچ لڑکے۔ تاریخِ عالم میں اندھوں نے ہمیشہ سُبھاکھوں کو پچھاڑا ہے۔

قدرت کی نیرنگی دیکھیئے کہ کہاں تو شانتنو سٹیٹ کا ہائی کمانڈ گدّی کے ایک جانشین کے لئے ترس رہا تھا اور کہاں ایک دم ایک سَو پانچ جانشین نمودار ہو گئے اور فیملی پلاننگ اندولن کے باوجود پیدا ہو گئے! اُن دِنوں راج پِتا بھیشم فیملی پلاننگ کمیشن کے چیرمین تھے۔ جب ایک اخباری رپورٹر نے راج پِتا کی ماہانہ پریس کانفرنس میں استفسار کیا کہ :۔

۱۔ کیا دھرت راشٹر نے ایک سَو بچّے پیدا کر کے اُس عظیم تاریخی اندولن کی توہین نہیں کی جو راج پِتا اور راج ماتا کے حکم سے جاری کیا گیا تھا۔

۲۔ کیا راج پِتا اِس توہین کا بدلہ لینے کے لئے فیملی پلاننگ کمیشن کی چیرمین شِپ سے استعفٰی نہ دے دیں گے۔

راج پِتا بھیشم نے شانتنو راجیہ کے آئین کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ شاہی کُنبے کے افراد کو آئین میں کچھ امتیازی حقوق دیئے گئے ہیں جن کا استعمال وہ وقتاً فوقتاً کر سکتے ہیں۔ اِس لئے جب تک آئین میں تبدیلی نہیں کی جاتی، رائل فیملی جتنے چاہے بچّے پیدا کر سکتی ہے ــــــ اور اِس سے چیرمین کی کوئی خاص توہین نہیں ہو گئی۔ اِس لئے بدلہ لینے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔

اور دوسرے دن اُس اخباری رپورٹر کو اخبار کے مالک نے نوکری سے الگ کر دیا۔ کیونکہ اُس "بے وقوف" نے بھری کانفرنس میں شانتنو سٹیٹ کے آئینی ہیڈ کی توہین کی تھی اور اِس جرم میں سرکار نے اُس اخبار کو سرکاری اشتہارات بند کرنے کی دھمکی دے دی تھی۔

دھرت راشٹر کی اَولاد کرود کہلائی۔ حالانکہ اِس سے پہلے یہ سارا خاندان چندر ونش کہلاتا تھا۔ اُس وقت سے اِس عظیم خاندان کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ یعنی پہلے چندر ونش کا صرف نام مٹایا گیا اور اُس کے چند سال بعد پورا چندر ونش ہی صفحۂ ہستی سے مِٹا دیا گیا ــــــ اور مِٹا دینے کا تاریخی فرض ایک خاتون نے انجام دیا جو دھرت راشٹر کی بیوی تھی۔ اُس نے اس شرط پر اندھے دھرت راشٹر سے شادی کی تھی کہ آئندہ میری نسل میرے ہی نام پر چلے گی۔ ایک اندھے کے نام پر نہیں۔ اور چندر ونشی خاندان کی تاریخ میں پہلی بار مرد کی بجائے عورت کے نام پر نسل چلائی گئی۔ جو بالآخر مہابھارت کی جنگ کا کارن بنی۔ دُنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں کسی نہ کسی عورت کی نگاہِ غلط اندازہی کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔

دھرت راشٹر کی بیوی خود کورو فیملی میں سے آئی تھی۔ اِس لئے اُس کی اَولاد بھی کورو کہلائی۔ مجبور ہو کر راجہ پنڈو نے اپنے پانچ بیٹوں کا نام بھی پانڈو رکھ دیا اور یوں ایک ہی خاندان دو فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔ جس سے شانتنو راجیہ میں فرقہ پرستی نے جنم لیا جس کے زہریلے اثرات آنے والی کئی صدیوں تک پھیل گئے۔

دھرت راشٹر کے سب سے بڑے بیٹے کا نام دریودھن تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تو آسمان پر فرشتے اور جنگلوں میں گیدڑ زار و قطار روئے۔ ایک جیوتشی نے پیش گوئی کی کہ یہ برخوردار بہت بڑا سمگلر بنے گا، جُوئے بازی میں نام پیدا کرے گا، شرفاء کی سرِ بازار پگڑیاں اُچھالے گا، پرائی بہو بیٹیوں کی ناموس پر ہاتھ ڈالے گا، دولت اور طاقت کے زعم میں دھرم، اخلاق، تہذیب، مروّت اور صداقت کی مِٹّی پلید کرے گا اور بالآخر ایک ایسی گھناؤنی "سِول وار" چھیڑ دے گا جس میں خود تو ڈُوبے گا ہی، کُل کا کُل بھی ڈُوب جائے گا۔

وِدھان کی رُو سے ہر شہری کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل تھی۔ یہاں تک کہ کوئی بھی آدمی سٹیج پر کھڑے ہو کر شاہی خاندان کی مذموم حرکات کو بے نقاب کر سکتا تھا۔ اِس لئے اُس جیوتشی نے بھی مفادِ عامّہ کی خاطر راجکمار دریودھن کا زائچہ اور پیش گوئی ایک پوسٹر کے ذریعے شائع کر دی کیونکہ اخباروں نے اِس پیش گوئی کو شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُن کے خیال میں اِس سے دشمن مُلک فائدہ اُٹھائیں گے۔ وِدھان کی رُو سے اخباروں کو بھی کوئی چیز شائع

کرنے یا نہ کرنے کی آزادی حاصل تھی۔ ودھان چور اور شریف دونوں کی برابر حفاظت کرتا تھا۔

پیش گوئی کا پوسٹر شائع ہوتے ہی راجدھانی اندر پرستھ میں تہلکہ مچ گیا۔ لیکن راج ماتا ستیہ وتی کے اس بیان کے بعد یہ تہلکہ مدھم پڑ گیا کہ سرکار اپنی رعایا کے کسی فرد کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے گی کیونکہ ودھان کی رُو سے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ تہذیب کے دائرہ میں رہ کر شاہی کنبے کے افراد پر کوئی سا بھی تبصرہ کرے۔

ایک ہفتہ بعد اُس جیوتشی کی لاش ایک ریلوے لائن کے اندر کٹی ہوئی حالت میں پائی گئی۔ اُس کی جیب سے ایک چٹھی بھی برآمد ہوئی کہ وہ ایک گھریلو تنازعے کی وجہ سے خودکشی کر رہا ہے۔ اُن دنوں ودھان کی رُو سے گھریلو تنازعوں کی بھی آزادی حاصل تھی اور خودکشی کی بھی!

جب کوروؤں اور پانڈوؤں نے ذرا ہوش سنبھالا تو راج پتا اور راج ماتا کو اُن کی تعلیم کی فکر لاحق ہوئی۔ اُن دنوں شانتنو راجیہ میں یہ دستور عام تھا کہ غریبوں کے بچے خیموں والے تھرڈ ریٹ سکولوں میں پڑھا کرتے تھے اور امیروں کے بچے سنگِ مرمر کی بلڈنگوں والے سکولوں میں تعلیم پاتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ تھرڈ ریٹ سکولوں میں پڑھنے والے بچے بڑے ہو کر رعایا بنیں اور اعلیٰ سکولوں کے طالب علم بڑے ہو کر راج کاج سنبھالیں۔ کوروؤں اور پانڈوؤں کو بڑے ہو کر ایڈمنسٹریشن کے فرائض سرانجام دینا تھے اس لئے راج پتا اور راج ماتا نے فیصلہ کیا کہ ایک سو پانچ راجکماروں کے لئے ایک علیحدہ یونیورسٹی قائم کی جائے جو غریبوں کے سکولوں اور کالجوں سے نہ صرف کافی فاصلے پر ہو۔ بلکہ اگر کوئی غریب لیکن بدقسمتی سے ذہین لڑکا اُدھر کا رُخ کرنا بھی چاہے تو ریل بھاڑا ادا نہ کر سکنے کے جرم میں یونیورسٹی تک پہنچ ہی نہ سکے۔

شانتنو سٹیٹ کی راجدھانی اندر پرستھ سے بیس میل کے فاصلے پر ایک ہرے بھرے جنگل میں شانتنو یونیورسٹی کے نام سے ایک پانچ منزلہ بلڈنگ تعمیر کرائی گئی۔ ہوشیار اور طرار راج ماتا ستیہ وتی نے اس یونیورسٹی کو جمہوری سوشلزم کے ماڈرن مندر کا نام دیا اور اپنی رعایا سے اپیل کی کہ یونیورسٹی کی بلڈنگ کے لئے فنڈ جمع کریں تاکہ رعایا کے خون پسینے سے کمائے ہوئے پیسے سے جب یہ یونیورسٹی جنم لے اٹھے تو اپنے بطن سے آنے والے سوشلسٹ سماج کے لئے حاکم اُگل سکے —— اس اپیل کے جاری ہوتے ہی ایک مہینے میں یونیورسٹی فنڈ کے لئے پانچ کروڑ روپیہ اکٹھا ہو گیا۔ اس فنڈ میں جہاں سلم ایریا میں رہنے والے قلاش مزدوروں نے سوا سوا روپیہ دان دیا، وہاں اسٹیٹ کے بڑے بڑے امیروں، گورنمنٹ کے کنٹریکٹروں، بلیک مارکیٹروں، سٹہ بازوں، رشوت خوروں، یہاں تک کہ عبادت گاہوں کے اجارہ داروں نے بھی بڑھ چڑھ کر چندہ دیا۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق اس فنڈ میں پونے پانچ کروڑ روپے امیروں نے اور باقی چوتھائی کروڑ غریبوں نے دان دیا۔ اُن دنوں غریبوں اور امیروں کی کمائیوں کے درمیان اسی تناسب کا رواج تھا۔

یونیورسٹی کا نام شانتنو یونیورسٹی رکھا گیا اور جس جنگل میں یہ یونیورسٹی قائم کی گئی وہ "گردگام" کہلائی۔ یہ نام بعد میں اس بُری طرح بگڑا کہ گوڑ گاؤں بن گیا۔ پروفیسر اروِنا آچاریہ اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ جو غریب ہونے کے باوجود بے حد ذہین تھے اور بے حد ذہین ہونے کے باوجود غریب تھے۔ راج ماتا ایسے غریبوں کو کرپٹ کرنے میں ید طولیٰ رکھتی تھی جو ذہین ہوتے تھے۔ پروفیسر اروِنا آچاریہ کو صرف اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر کرپٹ بن جانے پر مجبور کر دیا گیا اور کورو اور پانڈو راجکماروں کو پولیٹیکل سائنس پڑھانے لگا۔ ذہانت کی ٹریجڈی ہر زمانے میں یہی رہی ہے کہ وہ طاقت اور ثروت کے ہاتھوں کا کھلونا بنتی رہی ہے۔

پروفیسر اروِنا آچاریہ کو تنخواہ کم اور تمغے زیادہ ملا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ راجیہ کے آنے والے حکمرانوں کو دیانتداری سے پڑھایا کرتا تھا۔ حالانکہ اُن دنوں سماج میں علم و فن بھی منڈی کی ایک جنس بن گیا تھا۔ گورو اور چیلے کا رشتہ بالکل ایسے تھا جیسے طوائف اور تماش بین کا ہوتا ہے۔

گورو اور چیلہ دونوں کا یہی عقیدہ تھا کہ پیسے سے ہر شے خریدی جا سکتی ہے۔ طوائف کے گلابی رخسار اور گورو کی عالمانہ قابلیت۔ پیسے دو، پیشانی

مچوم لو۔ پیسے دو، شاعری سیکھ لو۔ جتنے پیسے دو اُتنی ہی شاعری سیکھ لو۔

لیکن پروفیسر اردنا آچاریہ اگلے وقتوں کی بچی کھچی نشانی تھے۔ اُنھوں نے راجکماروں کو جی جان سے پڑھایا۔ لیکن کچھ دیر تک پڑھاتے پڑھاتے اُسے محسوس ہوا کہ دریودھن تعلیم میں کم اور غنڈہ گردی میں زیادہ ہوشیار ہے۔ اُس کے مقابلے پر پنچ پانڈو پُتر بیک وقت ذہین بھی ہیں اور بہادر بھی۔ حالانکہ ذہانت اور بہادری کبھی ایک جگہ اِکٹھی نہیں رہتیں۔ یونیورسٹی میں کھیلوں کے جتنے مقابلے ہوتے یہ پانچوں پانڈو بھائی سبھی ٹرافیاں اور انعام جیت کر لے جاتے۔ تقریروں کے مقابلے ہوتے، مصوّری اور ڈراموں اور سنگیت کے فیسٹول ہوتے، درمیانی عرصے کے امتحانات ہوتے، سبھی میں پانچ پانڈو ہی بازی لے جاتے۔ جس سے دریودھن، ورشاسن اور اُس کے بھائی بس اندر جل بُھن کر سیخ کباب ہو جاتے اور راج پِتا بھیشم اور راج ماتا ستیہ وتی کے پاس جا کر پروفیسر اردنا آچاریہ کی شکایت کر دیتے کہ وہ راج گدی کے وارثوں میں جان بُوجھ کر پھُوٹ ڈال رہا ہے اور پانڈوؤں کو خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے۔ لیکن بھیشم اور ستیہ وتی اِس شکایت پر کوئی خاص ایکشن نہ لیتے۔ صرف اُس شکایت کی ایک نقل پروفیسر اردنا آچاریہ کو بھجوا دیتے تاکہ نفسیاتی طور پر اُس پر یہ خوف طاری رہے کہ راجکمار چیلوں کی ایک بہت بڑی اکثریت اُس کے خلاف ہو رہی ہے۔ اِس لئے کسی وقت بھی اُس کی نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

لیکن دریودھن اینڈ کمپنی کئی مقابلوں میں پانڈوؤں سے واقعی بازی لے جاتے تھے۔ مثلاً ایک بار فیشن پریڈ ہوئی تو اُس میں دریودھن کے الٹرا ماڈرن کٹ کے لباس کو اوّل درجے کا انعام ملا۔ دوسری بار "کُتّا شو" منعقد کیا گیا تو اُس میں دریودھن کا کُتّا سب سے بہترین قرار دیا گیا۔ تیسری بار صرف تفریح پیدا کرنے کی خاطر یونیورسٹی میں جھوٹ بولنے کا مقابلہ ہوا تو دریودھن کو "یونیورسٹی کا سب سے بڑا جھُوٹا" کا خطاب عطا کیا گیا۔

کلاس رُوم میں پانڈوؤں کو الگ پانچ نشستیں الاٹ کی گئی تھیں اور کوروؤں کو الگ۔ ایک دن دریودھن جب کلاس رُوم میں داخل ہوا تو نجانے چرس کا دَم لگا کر آیا تھا یا وہسکی کے نشے میں تھا۔ پانڈوؤں کی نشستوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: "آج تو یہ اچھوت بچّے بڑے سج دھج کر آئے ہیں۔ اِنھوں نے کوئی بینک لُوٹا ہے کیا؟"

یہ سُنتے ہی پانڈوؤں میں سب سے زیادہ شہزور راجکمار بھیم سین طیش میں آ گیا۔ وہ ہاکی کا بہت مشہور کھلاڑی مانا جاتا تھا۔ اگر دریودھن اور اُس کے بھائی کسی سے دبتے تھے تو صرف بھیم سین سے اور بھیم سین کو بھی اگر لڑائی جھگڑے سے منع کرتا تھا تو یُدھشٹر ہی کرتا تھا۔ چاروں پانڈو یُدھشٹر کو بے حد بور انسان سمجھتے تھے لیکن بڑا بھائی ہونے کے ناطے اُس کی آگیا مان لیا کرتے تھے۔

لیکن اُس دن جب دریودھن نے اُنھیں اچھوت کہا تو بھیم سین ایک دم اُبل پڑا۔ ہاکی لے کر دریودھن کی طرف جو لپکا تو ایک، دو، تین، چار تابڑ توڑ ہاکیوں سے دریودھن کلاس رُوم ہی میں گر پڑا اور گرتے ہی چیخ کر اپنے بھائیوں سے بولا: "دیکھتے کیا ہو گیدڑو! ایک دم سب کے سب ٹوٹ پڑو!" یہ سُنتے ہی مستقبل کے حکمران طاقت اور جوانی کے نشے میں سرشار ہو کر بھیم سین پر پل پڑے۔ کوئی ڈنڈا لے کر، کوئی کرسی اُٹھا کر، کوئی ہاکی تان کر اور کوئی اپنے گھُونسے کمان پر چڑھاتے ہوئے اکیلی جان پر حملہ آور ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا بہت سے خونخوار بھیڑیئے ایک شیر کا گھیراؤ کئے ہوئے ہیں ـــــ لیکن بھیم سین اپنی ہاکی چاروں طرف یوں تیزی اور طرّاری سے گھُما رہا تھا کہ جو بھی اُس کی طرف آگے بڑھتا، لہولہان ہو جاتا۔

ایک گھنٹہ تک یہ چھوٹی سی مہابھارت جاری رہی

باقی چار پانڈو اِس لڑائی میں شریک نہیں ہوئے۔ بلکہ دُور سے کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ کیونکہ ارجن نے جو پستول چلانے میں بہت اعلیٰ نشانہ باز مانا گیا تھا، تمام بھائیوں سے کہہ دیا کہ اگر میں اِس میدان میں کُود پڑا تو اِن کوروؤں میں سے ایک بھی اِس کلاس رُوم میں سے زندہ بچ کر نہ جائے گا اور میں نہیں چاہتا کہ تعلیم مکمّل کئے بغیر یہ یونیورسٹی لاشوں کا قبرستان بن کر رہ جائے۔

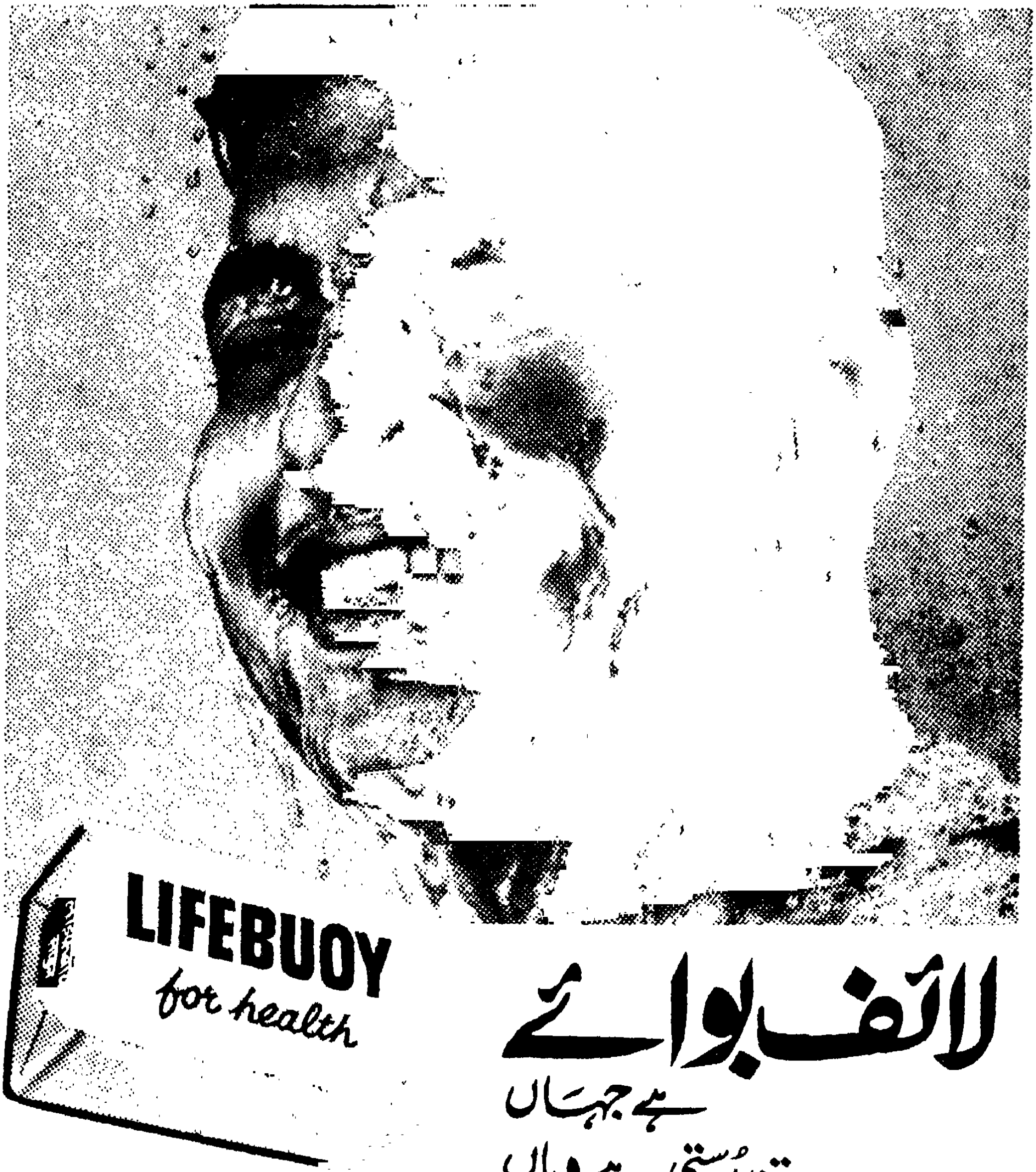
بڑا بھائی یُدھشٹر سٹیج پر کھڑا ہو کر "اوم شانتی شانتی شانتی اوم!" کے منتر کا جاپ کرتا رہا۔

پروفیسر اردنا آچاریہ کو جب یہ اطّلاع ملی کہ سٹوڈنٹس بالکل انقلاب زندہ باد ہو گئے ہیں تو اُس نے فوراً مہاراج دھرت راشٹر کو ٹیلیفون کیا کہ فوراً پولیس کا ایک دستہ بھیج دیجئے۔ ورنہ مہاراج کے برخوردار یونیورسٹی کا فرنیچر اور کھڑکیاں اور ریکارڈ ہر شے کو آگ لگا دیں گے۔

لیکن مہاراج دھرت راشٹر نے ٹیلیفون پر جواب دیا کہ وِدھان کی رُو سے یونیورسٹی کے احاطے میں پولیس داخل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس سے راجکمار سٹوڈنٹس کی آزادانہ نشو و نما میں رُکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ اگر وہ آپس میں کسی سوال پر لڑ رہے ہیں تو لڑنے دیجئے۔ کیونکہ لڑائی تو انسان کے خمیر میں ہے۔ لڑائی ہی سے انسان کی کئی خوبیاں اُبھر آتی ہیں اور کئی عیب دب جاتے ہیں۔

یہ جواب سُن کر وائس چانسلر صاحب ڈر کے مارے اپنی کوٹھی کے اندر بند ہو کر بیٹھ گئے۔

دوسرے دن یونیورسٹی کے نوٹس بورڈ پر دو کاغذ چسپاں پائے گئے۔ ایک کاغذ پر اُن طالب علموں کی فہرست درج تھی جو کل کی جنگ میں زخمی ہو کر ہسپتال میں داخل کئے گئے تھے اور دوسرے کاغذ پر یہ اطّلاع درج تھی کہ ہولیوں کی تعطیلات کی وجہ سے یونیورسٹی ایک ہفتے کے لئے بند رہے گی !!


LIFEBUOY
for health

دلِ مجروح

مس انیس قیوم بی۔ایس۔سی

۲۲/۷ سی کلاس ملے پلی۔حیدر آباد (اے۔پی)

ذاتِ محترم! صدیوں سلامت رہیں

کافی عرصہ بعد حاضرِ خدمت ہونے کا موقع ملا ہے۔تمام عرصے میں بیمار رہی ؎

عبث دکھلاتے پھرے ہائے زخمِ دلِ مجروح

کسی نے درد نہ جانا، نہ مدعا سمجھا

مومن مجروح کے ایک شعر پر مبنی ایک غمگین سی تخلیق اپنی چند حقیقتوں کے ساتھ آپ کے سامنے موجود ہے۔ اسے شرفِ قبولیت عطا کرکے مجھے ممنون فرمائیں ——— گذشتہ دنوں میری ایک تخلیق کل ہند مقابلے میں اوّل آئی...

آپ کی بھتیجی ——— انیس قیوم

آج فضا بوجھل ہونے کے باوجود کتنی لطیف معلوم ہو رہی ہے! اور میں محسوس کر رہا ہوں محبت کی ٹھنڈک جیسے میری رگ رگ میں سرایت کرتی جا رہی ہو۔ کبھی سُنا کرتا تھا کسی کا خلوص "مسیحا" کا کام کرتا ہے۔لیکن آج اُسے حقیقی رُوپ میں دیکھ رہا ہوں۔کیوں نہ ہو تم نے مجھے خلوص کے ساتھ محبت جو دی۔کبھی کبھار لکھنے پڑھنے کے دوران جب ہمارے ہاتھ ایک دوسرے مَس ہو جاتے ہیں تو ایک عجیب سی کیفیت تمہارا لمس پاکر مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔جیسے خمار سا چھا رہا ہو۔

آج تک میری زندگی میں صحرا نوردی کے سوا کچھ بھی تو باقی نہ رہا تھا۔ بس لا حاصل، مسافتوں کی دھول تھی۔جسے تمہارے خلوص نے دھو دیا اور اس دھول کے ساتھ میرے رنج والم بھی دھل گئے اور پھر جیسے تم جیسا پُرخلوص ساتھی ملے۔تم جیسا درد مند ہم سفر ملے، وہ بھلا کبھی دُکھی بھی ہو سکتا ہے؟ آج تمہارے اس سوال نے کہ میں سلیم سے مجروح کس طرح بنا؟

میرے زخموں کے ٹانکے کھول دیئے ہیں۔میں اب اِن زخموں میں محبت کا میٹھا میٹھا سا درد محسوس کرتا ہوں جو کبھی مجھے اس نے دیا تھا۔تم پوچھو گی کون تھی وہ خوش نصیب؟——— ہاں اُسے خوش نصیب ہی کہنا درست ہوگا۔وہ بھی تمہاری طرح میری ہمدرد تھی، مونسِ غم تھی۔لیکن، اُن دنوں میں کسی غم سے کبھی دوچار نہ تھا

سر پر شفیق والدین سلامت تھے۔لاڈ چاؤ تھا۔خوب گزرتی تھی میری بھی۔وہ دن یاد آتے ہیں تو بے ساختہ کسی شاعر کا یہ گیت زبان پر آجاتا ہے ؏

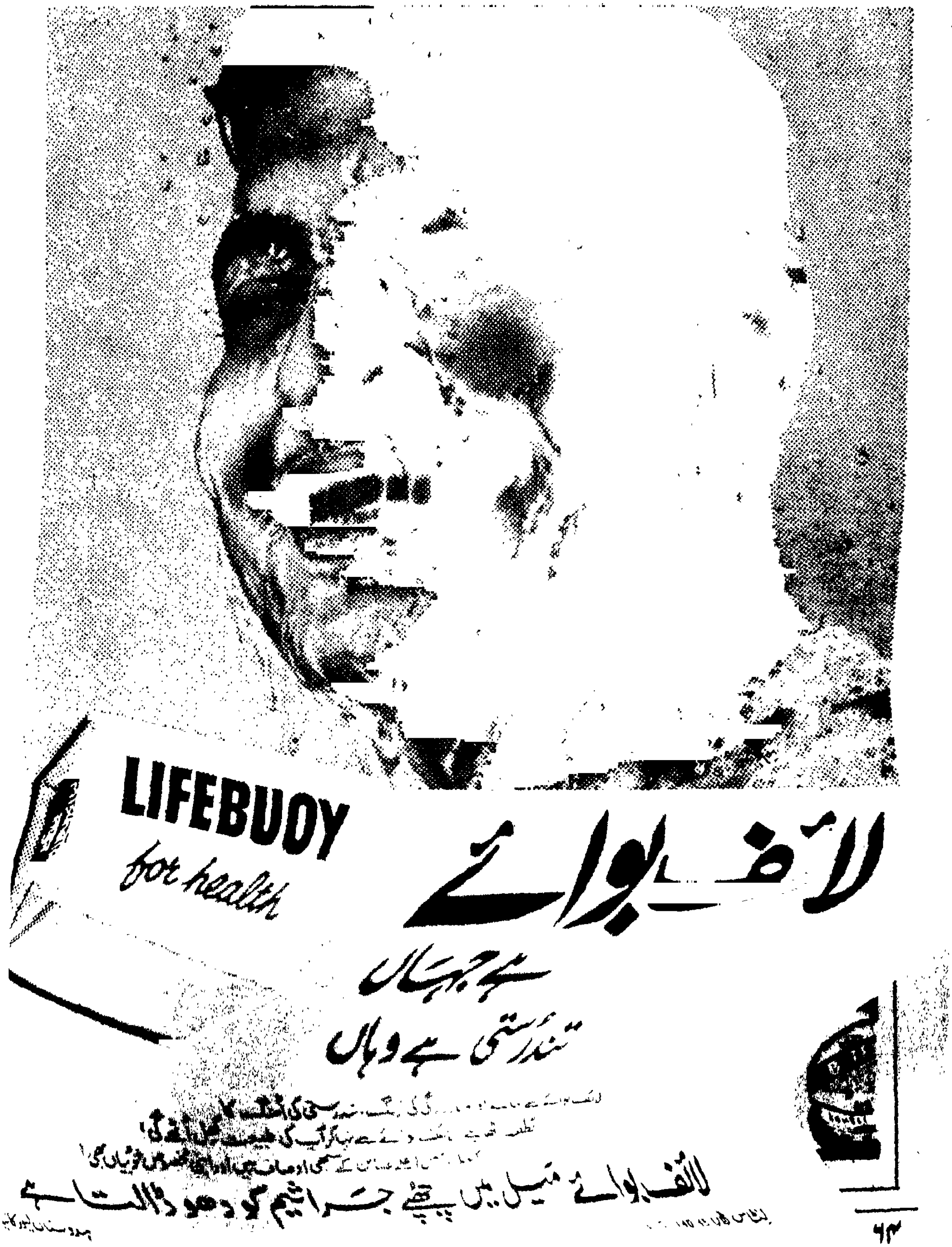
کوئی لوٹا دے میرے بیتے ہوئے دن

لیکن گزرے ہوئے دن بھلا کب واپس ہوتے ہیں جو میرے ہوتے ———! بالکل اسی طرح جس طرح کوئی عدم آباد جاکر نہیں لوٹا کرتا۔انسان بھی کتنا بیوقوف ہے گزرے ہوئے ماضی کے نام پر مٹ جانا چاہتا ہے۔حالانکہ اُسے گزرے ہوئے ماضی سے زیادہ مستقبل کی فکر کرنی چاہیئے۔ماضی اُسے کچھ نہیں دے سکتا جبکہ مستقبل اُسے بہت کچھ دے سکتا ہے۔

اُن دنوں میں نے بی کام فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تھا اور ٹھیک اسی وقت یونیورسٹی کے پہلے سال میں داخلہ لینے والی "وہ" تھی۔

یعنی رُوپا ——— یہی اُس کا نام تھا جسے میں پیار سے رُوپ کہا کرتا تھا۔ ہمارے اختیاری مضامین جُدا جُدا تھے۔لیکن ریجنل اور انگریزی کی کلاسوں کے وقت ہم اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔

اُس نے بھی اُردو، ریجنل لینگویج کے طور پر لے رکھی تھی۔اُردو میں اُسے مہارت تھی اور کیوں نہ ہوتی۔وہ بچپن سے اُردو جو پڑھتی آئی تھی۔ویسے ایک اُردو


LIFEBUOY
for health
لائف بوائے
ہے جہاں
تندرستی ہے وہاں
لائف بوائے میل میں چھپے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے

دلِ مجروح

مس انیس قیوم بی۔ایس۔سی

۲۲ ؍ ٹسی کلاس ملے پلی۔حیدرآباد (اے۔پی)

ذاتِ متبرک! صدیوں سلامت رہیں

کافی عرصہ بعد حاضرِ خدمت ہونے کا موقع ملا ہے۔ تمام عرصے میں بیمار رہی ہے

عبث دکھاتے پھرے ہائے زخمِ دلِ مجروح
کسی نے درد نہ جانا، نہ مدّعا سمجھا

موسیٰ مجروح کے ایک شعر پر مبنی ایک غمگین سی تخلیق اپنی چند حقیقتوں کے ساتھ آپ کے سامنے موجود ہے۔ اسے شرفِ قبولیت عطا کر کے مجھے ممنون فرمائیں ——— گزشتہ دنوں میری ایک تخلیق کل ہند مقابلے میں اوّل آئی...

آپ کی بھتیجی ——— انیس قیوم

★

کہ فضا بوجھل ہونے کے باوجود کتنی لطیف معلوم ہو رہی ہے! اور میں محسوس کر رہا ہوں محبت کی ٹھنڈک جیسے میری رگ رگ میں سرایت کرتی جا رہی ہو۔ کبھی سنا کرتا تھا کسی کا خلوص "مسیحا" کا کام کرتا ہے۔ لیکن آج اُسے حقیقی روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ کیوں نہ ہو تم نے مجھے خلوص کے ساتھ محبت جو دی۔ کبھی کبھار لکھنے پڑھنے کے دوران جب ہمارے ہاتھ ایک دوسرے سے مس ہو جاتے ہیں تو ایک عجیب سی کیفیت تمہارا لمس پا کر مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ جیسے خمار سا چھا رہا ہو۔

آج تک میری زندگی میں صحرانوردی کے سوا کچھ بھی تو باقی نہ رہا تھا۔ [illegible] مسافتوں کی دھول تھی۔ جسے تمہارے خلوص نے دھو دیا اور اُس [illegible] میرے رنج و الم بھی دُھل گئے اور پھر جسے تم جیسا پُرخلوص ساتھی [illegible] ملے، وہ بھلا کبھی دُکھی بھی ہو سکتا ہے؟ آج تمہارے [illegible] کس طرح بنا؟

[illegible] دیتے ہیں۔ میں اب اِن زخموں میں محبت کا میٹھا [illegible] جو کبھی مجھے اُس نے دیا تھا۔ تم پوچھو گی کون تھی وہ [illegible] سے خوش نصیب ہی کہنا درست ہوگا۔ وہ بھی تمہاری [illegible] مونسِ غم تھی۔ لیکن، اُن دنوں میں کسی غم سے بھی دوچار نہ تھا سر پر شفیق والدین سلامت تھے۔ لاڈ چاؤ تھا۔ خوب گزرتی تھی میری بھی۔ وہ دن یاد آتے ہیں تو بے ساختہ کسی شاعر کا یہ گیت زبان پر آ جاتا ہے ؎

کوئی لوٹا دے میرے بیتے ہوئے دن

لیکن گزرے ہوئے دن بھلا کب واپس ہوتے ہیں جو میرے ہوتے ——!

بالکل اُسی طرح جس طرح کوئی عدم آباد جا کر نہیں لوٹا کرتا۔ انسان بھی کتنا بیوقوف ہے گزرے ہوئے ماضی کے نام پر مٹ جانا چاہتا ہے۔ حالانکہ اُسے گزرے ہوئے ماضی سے زیادہ مستقبل کی فکر کرنی چاہئے۔ ماضی اُسے کچھ نہیں دے سکتا جبکہ مستقبل اُسے بہت کچھ دے سکتا ہے۔

اُن دنوں میں نے بی کام فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا اور ٹھیک اُسی وقت یونیورسٹی کے پہلے سال میں داخلہ لینے والی "وہ" تھی۔

یعنی رُوپا ——— یہی اُس کا نام تھا جسے میں پیار سے رُوپ کہا کرتا تھا۔ ہمارے اختیاری مضامین جُدا جُدا تھے۔ لیکن ریجنل اور انگریزی کی کلاسوں کے وقت ہم اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔

اُس نے بھی اردو، ریجنل لینگویج کے طور پر لے رکھی تھی۔ اردو میں اسے مہارت تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ وہ بچپن سے اردو جو پڑھتی آئی تھی۔ ویسے ایک اردو

ہی ایسی زبان ہے جو بآسانی سیکھی جا سکتی ہے۔ رُوپا کی اُردو سے دلچسپی اور دیش والوں کی اُردو دشمنی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

ایک بار اُس نے میرے اصرار پر ایک غزل ترنّم سے سُنائی ؎

اشکِ غم نذر کروں، اپنی وفا نذر کروں
چاکِ دل نذر کروں، تارِ قبا نذر کروں
کون سی شے تجھے اے جانِ وفا نذر کروں

میں تڑپ تڑپ گیا۔ اُس کی آواز نے ساری فضا کو جیسے پُرسکوت کر دیا تھا۔ جیسے سب مدہوش ہو گئے ہوں۔

"بہت اچھا گا لیتی ہو رُوپ! تمھاری آواز میں تو مدھم جھرنوں جیسی جھنکاریں ہیں۔" میں، داد دیئے بغیر نہ رہ سکا تو وہ بولی۔

- اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو۔ (قرآنِ پاک)
- قیامت کے دن غریب پڑوسی، اپنے مالدار ہمسایہ کا دامن گیر ہو گا کہ اُس کا خیال نہیں رکھا گیا۔ (سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم)
- بڑھاپے سے پہلے جوانی کو، موت سے پہلے بڑھاپے کو غنیمت جانو۔ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ)
- تلوار کا وار جسم کو زخمی کرتا ہے اور بُری بات رُوح کو گھائل کرتی ہے۔ (حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ)
- شریف عروج پاکر نرم ہو جاتا ہے۔ کمینے کا معاملہ اِس کے برعکس ہوتا ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)

"کیوں بناتے ہو مجھے ـــــ یہ غزل تو تمھاری ہے نا۔"

"میری ـــــ؟" میں نے اظہارِ حیرت سے کہا۔ حالانکہ غزل میری ہی تھی۔

پھر وہ بولی۔

"مجھے تمھارا تخلّص بے حد پسند ہے۔"

"اور مجھے تم پسند ہو۔" میں نے اُسے چھیڑا۔

محبتوں کی آگ سُلگتے دیر نہیں لگتی لیکن محبت کے شعلے بجھتے ضرور دیر لگتی ہے۔ ہم اب اِس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں سے لوٹ کر آنا تو درکنار ـــــ لوٹ آنے کا تصوّر بھی ناممکن تھا۔

عام چاہنے والوں کی طرح ہم نے ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان کیے۔ جبکہ ہمارے بیچ مذہب کی سب سے بڑی دیوار موجود تھی۔ جسے گرانے کی تاب ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ مذہب جو ہر کسی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مذہب جو راہ ہوتا ہے۔ جو منزل بخشتا ہے اور جو نجات دلاتا ہے۔

ایک دن میں نے اُس سے پوچھ ہی لیا۔

"رُوپ! ہم دونوں میں سے کسے مذہب تبدیل کرنا ہو گا۔ تمھیں یا مجھے؟"

رُوپا کی آنکھیں محبت کے آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ بولی۔ ".. میں نے تمھیں چاہا ہے۔ تم سے بڑھ کر چاہا ہے۔ اِس لئے میں ہی مذہب تبدیل کروں گی۔"

"رُوپا!"

میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں تمھاری خاطر ـــــ!" اُس نے سر میرے کندھے پر ٹیک دیا۔ میں اُس کی خوشبوؤں میں نہا گیا۔ ایک کیف، ایک سرور میری ہستی پر چھا گیا۔

پھر میں نے پوچھا۔

"رُوپ! اِس طرح تمھارے والدین کو اعتراض نہ ہو گا؟" میں نے اندیشہ کا اظہار کیا تو وہ بولی۔

"جب لڑکی بڑی ہو جاتی ہے تو ہمارے ہاں اُس کی پسند سے شادی کی جاتی ہے۔ ماں باپ ہر حال میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔"

"تمھارے والدین کتنے عظیم ہیں رُوپ!"

"یہ میری خوش نصیبی ہے۔"

اِن تمام باتوں کے باوجود میں چاہتا تھا کہ اُسے اپنی ہستی سے واقف کرا دوں تاکہ اُسے مجھ سے کوئی شکایت نہ رہے۔ وہ یہ تو جانتی تھی کہ میرے کتنے بھائی بہن ہیں اور اُن میں میرا کون سا نمبر ہے۔ میرے والدِ بزرگوار کیا کرتے ہیں۔ اُن کا التفات مجھ پر کتنا ہے؟

میں اُسے اپنی امّی جان سے مِلا لایا۔

امّی اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ خوش کیوں نہ ہوتیں۔ آخر کیا کمی تھی میری رُوپا میں ـــــ سانولی سلونی شام جیسا رنگ۔ بڑی بڑی بادامی غلافی آنکھیں۔ کھنچے ہوئے ابرو۔ مناسب ناک اور پتلے تراشیدہ ہونٹ!

"رُوپا! میں سُنتا تھا خدا کسی کو بے عیب نہیں پیدا کرتا۔ لیکن یہاں تمھارے پاس بیٹھ کر تو میں کُفر بھی بکنے لگا ہوں ـــــ آخر حقیقت سے انکار بھی کیسے کیا جا سکتا ہے؟"

"سلیم! میں اگر تمھیں پا لوں تو مجھے کُل کائنات مِل جائے ـــــ ورنہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جاؤں گی۔"

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو ڈارلنگ!" میں اُس کے قریب کھسک جاتا۔

"کیا کروں تم سے بچھڑنے کا تصور تو میں کر ہی نہیں سکتی۔"

"رُوپا۔۔۔!" میری آواز سرگوشی میں بدل جاتی۔

"میں بھی تو اِسی آگ میں جل رہا ہوں" کہتے کہتے میری آنکھیں بھیگ جاتیں۔

پھر ہمارے امتحانات ہوئے۔ میں نے سکنڈ ڈویژن لے لیا اور رُوپا فیل ہوگئی۔ اس کی صحت یوں بھی اچھی نہ رہتی تھی۔ امتحان کی تیاری بھلا کیا کرتی۔ خواہ مخواہ امتحان دے دیا اور نتیجہ نکلا تو وہ مزید غموں سے آشنا ہوگئی۔ بستر سے لگ گئی۔

پھر مُلک میں وبائی سلسلہ چل نکلا تو وہ بھی اُس کی زد میں آگئی۔

میں تڑپ اُٹھا۔

"رُوپ! تم میری طرف سے مایوس نہ ہونا۔ میری محبت ہمیشہ یکساں رہے گی۔"

وہ عجیب سی ہنسی ہنس کر بولی "اب مجھے چاہ کر تمھیں کیا ملے گا سلیم — دیکھتے نہیں ہو میرا چہرہ چیچک کی نذر ہوگیا۔ اِس مکروہ چہرے کے سِوا اب تمھیں میرے پاس کچھ نہ مِلے گا۔ جس کا ذِکر کرتے ہوئے بھی مجھے کراہیت آرہی ہے۔"

"رُوپا! یہ تو نصیبوں کی بات تھی۔" میں اُس کے چہرے پر جُھکنے ہی والا تھا کہ اُس نے مجھے پرے دھکیل دیا۔

"خدا کے لئے دُور ہوجاؤ سلیم! — تمھیں میری قسم!"

میں دُور جا گِرا۔ نہ جانے اُس کے کمزور وناتواں ہاتھوں میں اِتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ مجھ جیسے صحت مند کو اُس نے فرش پر دھکیل دیا۔

میں یوں بھی اُس کی بیماری سے دل برداشتہ تھا۔ رُوپا کا دل تو کسی صورت توڑنا ہی نہ چاہتا تھا کیونکہ دُنیا میں کسی نے مجھے سمجھنے کی کوشش کی تو وہی تھی۔ وہی واحد شخصیت تھی جس نے مجھے پیار سے آشنا کیا تھا۔ محبت کے لطیف احساس سے نوازا تھا۔

اُسے شاید معلوم ہوچکا تھا کہ میں ہر صورت میں اپنے ارادوں میں اٹل ہوں اور ایک دن اُسے اپنا کے رہوں گا تو اُس نے ایک دن مجھے اپنے گھر آنے سے منع کرتے ہوئے خط لکھا —

میرے اپنے سلیم!

میں نہیں چاہتی کہ تم ایک پتھر کو پھول سمجھ کر اپنی حیات سے وابستہ کرلو جو تمھیں خوشبو تو نہ دے سکے ہاں مجروح ضرور کردے گا۔ تم مطمئن رہو۔ میری وفا میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ لیکن میں تمھاری کسی قیمت پر بھی نہ بن سکوں گی — اور جب تمھاری نہ ہوسکوں گی تو کسی اور کی بھی نہیں ہوسکتی!

میں آج ہی خودکُشی کر رہی ہوں۔

بہت مشکل سے تمھارے لئے قلم سنبھالا ہے۔ حالانکہ لکھنے تک کی سکت مجھ میں نہیں۔ لیکن محبت کا جذبہ ساری طاقتوں میں عظیم ہے۔ وہ جب مُردوں کو زندہ کرسکتا ہے تو کیا مجھ بدنصیب کو چند لمحوں کی طاقت نہیں بخش سکتا۔

ہاں آج شام گھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔

تمھاری رُوپ

خط پڑھتے ہی جیسے میرے ہوش وحواس اُڑ گئے۔ میں چکرا کر گر پڑا۔

- پرایا ہو یا اپنا بھائی بند ہو، دوست ہو یا دُشمن جو بھی مصیبت میں ہو، اُس کی مدد کرنے اور حفاظت کرنے کا نام دَیا اور رحم ہے۔ (منوسمرتی)
- عِلم دریا کے مانند ہے، جتنا چاہو خرچ کرو، کم نہیں ہوتا۔ (ماتا ریسا نہ جی)
- محبت، مُلائمت اور مدھر بول دوسروں کو دل وجان سے جیتنے کے لئے موثّر ترین ہتھیار ہیں۔ (بھرتری ہری)
- خدا کی نگاہ میں جو سب کا خالق ہے ساری مخلوق برابر ہے۔ اگر اُس نے آدمی اور آدمی کے درمیان بڑے اور چھوٹے کا کوئی فرق رکھا ہوتا تو ہم سب فرق کو دیکھ بھی سکتے جس طرح کہ ہم ہاتھی اور چیونٹی کے فرق کو دیکھ سکتے ہیں۔ (مہاتما گاندھی)

سر میں بڑی چوٹ آئی تھی۔

لیکن شام کو رُوپا کے گھر پہنچنا ضروری تھا۔ اُس نے گھر آنے سے منع جو کیا تھا۔

اُف! شاید رُوپا مر چکی ہو۔۔۔!

میں دَوڑ پڑا دیوانہ وار۔۔۔ کوچہ جاناں کی طرف — دل کے مسیحا کی طرف۔ لیکن وہاں رُوپا نہ تھی۔

کوئی بھی نہ تھا۔ برادری کی چند عورتیں بیٹھی چہ میگوئیاں کررہی تھیں کہ کیسے رُوپا نے خودکُشی کرلی۔ میرا کلیجہ پھٹ جاتا اگر رُوپا کے بھائی نے مجھ سے یہ نہ کہا ہوتا۔

"سلیم بھیّا! شمشان چلیئے۔۔۔ شمشان۔۔۔ شاید اُس کا انتم دیدار ہی

تھپکر سکیں... یہ

وہ سسک رہا تھا... تڑپ رہا تھا۔

"کاش آپ نے میری بہن کو محبت نہ دی ہوتی —— تو آج وہ یوں خودکشی کرتی۔ کسی نہ کسی طرح زندہ تو رہتی"

"میں نے اُسے محبت نہیں دی کیلاش!... اُس نے ہی مجھے محبت سے نوازا تھا۔ اُس نے ہی مجھے انسان بنایا تھا۔ ورنہ میں دو، دو چار کے سوا کچھ جانتا ہی نہ تھا"

"اِتنی بلندیاں عطا کر کے آج رُوپا نے مجھے زمین پر دھکیل دیا ہے کیلاش!"

"لیکن یہ آپ کے سر کو کیا ہوا؟" اُس نے میرے مجروح سر کو دیکھ کر پوچھا۔

"یہ... یہ..." میں کچھ نہ کہہ سکا اور وہیں مجھ پر غنودگی چھانے لگی۔

شمشان پہنچ کر میں نے رُوپا کی لاش دیکھی۔

وہ برابر مُسکرائے جا رہی تھی۔ اُداس سی مُسکراہٹ... ابدی مُسکراہٹ!!

میں دیکھتا رہا... دیکھتا رہا —— کیلاش نے چِتا کو آگ دی اور رُوپا کا جسم جل کر کُندن ہو گیا!

میں دیوانہ وار لوٹ آیا۔ بار بار ذہن کے پردے پر چِتا والی تصویر اُبھرتی اور مجھے بے سکون کر دیتی۔ میں دو تین ماہ تو گھر سے باہر نہ نکل سکا۔ بیمار ہو گیا۔ اور جب نکلا تو مجروح بن کر!

میں نے اپنا تخلّص مجروح قرار دے لیا تھا۔

مجروح ——!

جو کسی کی بے وفائی سے نہیں، کسی کے سنگِ وفا سے مجروح ہوا تھا۔

میرا یہ رُوپ کتنا محبت سمیٹنے والا، کتنا ہمدردی پانے والا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔ ہر کوئی مجھ سے متاثّر ہوتا۔ ہر کوئی مجھ سے میرے درد کی وجہ پُوچھنا چاہتا۔ لیکن آج تک کسی نے یہ نہ پُوچھا۔

'کہ آپ سلیم سے مجروح کس طرح بنے؟'

"نجمہ! تمھارے اِس مختصر سوال نے اِتنا طویل جواب پا لیا اور تم نے میری حیات کو سُن لیا۔ بتاؤ تو کیسی رہی میری داستان؟"

"ارے نہیں تمھارے چہرے پر تھکن کے آثار کیوں دیکھ رہا ہوں —— تمھاری آنکھیں بوجھل کیوں ہو رہی ہیں۔ تم زندگی میں آئی ہو تو میری حیات پھر سے مُسکرانے لگی ہے —— عرصہ بعد میں نے تم جیسا ہمدرد ساتھی پایا ہے۔ نجمہ!

یقین کرو تمھیں پانے کے بعد میں ہر اُس غم کو بھول جاؤں گا جو گزرے ہوئے ماضی کی یاد سے وابستہ تھا۔ یقیناً تمھارا ہی وجود میرے اِس زخم کو بھر سکے گا۔"

"لِللہ اب تو چہرے سے ہاتھ ہٹاؤ!"

"پروفیسر صاحب!" نجمہ نے چہرے سے ہاتھ ہٹا دئے اور ایک خاموش انگڑائی لی۔

"آج آپ کچھ پڑھائیں گے نہیں؟"

"آج تم کیا پڑھوگی نجمہ! میں نے تو اپنا سب کچھ تمھیں دے دیا۔۔۔ اپنی اُلجھنیں، پریشانیاں، بے چینیاں ——"

"اوہ! —— میری زندگی بھی مُسکرائے گی پروفیسر —— شاید میں نے آپ سے اِس کا تذکرہ نہیں کیا۔"

پروفیسر جذبات میں ڈوب گیا تو نجمہ بولی۔

"ٹھہرئے میں ابھی آئی!"

وہ فوراً پھدکتی ہوئی کسی شریر ہرنی کی طرح دوسرے رُوم میں جا پہنچی اور ایک لفافہ نُما سی کوئی چیز لاکر پروفیسر کے سامنے رکھ دی۔

"دیکھئے اگلے اتوار کو میری شادی۔۔"

وہ نجمہ کی شادی کا کارڈ تھا۔ پروفیسر کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نجمہ بولی۔

"جی ہاں —— ڈاکٹر شہاب کے ساتھ!" اور اُس نے دوپٹہ اپنے چہرے پر ڈال لیا۔

"نجمہ —— نجمہ —— نجمہ!" پروفیسر کی آواز بھر آگئی۔

"تو کیا —— تو کیا تم نے میری داستان نہیں سُنی ——؟"

"داستان ——؟ کون سی داستان پروفیسر صاحب؟" نجمہ مجسّم حیرت بن گئی اور پھر کچھ یاد کرتے ہوئے —— کچھ افسوس کرتے ہوئے بولی۔

"اوہ! مجھے یاد آیا —— ہاں کچھ کہہ رہے تھے —— معافی چاہتی ہوں۔ بہت نیند آگئی تھی مجھے۔ رات وہ آگئے تھے۔ گپیں چل رہی تھیں۔ اِس لئے سو نہ سکی۔۔"

اِتنا کہہ کر وہ کھلکھلانے لگی۔

"نیند ——!!"

پروفیسر کے سارے جذبات سرد پڑ گئے۔ اُسے کچھ سُجھائی نہ دیا۔ شاید نجمہ مُوڈ میں تھی اچانک پُوچھ بیٹھی۔

"اچھا آج پڑھائیے گا نہیں تو کچھ سُنائیے گا —— پلیز —— پروفیسر صاحب! اپنی ہی کوئی چیز —— ترنّم کے ساتھ!"

وہ بچّوں کی طرح ضد کرنے پر تُل گئی۔

"میں اِس وقت کچھ سُنانے کے مُوڈ میں نہیں ہوں نجمہ! —— ہاں ابھی ابھی میں نے ایک شعر کہا ہے ؎

عبث دِکھاتے پھرے ہائے زخمِ دلِ مجروح
کِسی نے درد نہ جانا، نہ مُدّعا سمجھا

غزل

پورن کمار ہوش

ت پہلی پہلی پڑی ہے جو گگاؤں میں
جو ترے بدن کی اُڑی ہے فضاؤں میں

پھر سے طرب نواز، دلوں میں حسد کا زہر
کتنے قبیح جسم ہیں دلکش قباؤں میں

ِ اعتدال ہر اک شے میں چاہیئے
ہتے ہیں ہم یقین مگر انتہاؤں میں

ہم اپنی بات کہہ کے سرِ عام چل دیئے
آواز گونجتی رہی چاروں دِشاؤں میں

ںوں کو کھو لیے کہ انہیں ڈھونڈ لیجیے
ن ٹٹولتے ہوئے چلیے گپھاؤں میں

بے وجہ ملتوی نہ کرو رات کا سفر
لٹنے کو لُٹ گئے ہیں مسافر سراؤں میں

کیا مانگنے چلے ہو شوالے میں ہوش پھر!
چُھپ چُھپ کے مُنہ اندھیرے ستاروں کی چھاؤں میں

غزل

خزان چند بسیم

یہ بات اب کہاں، کوئی پُوچھے کسی بات
تُو نے بھی اے ندیم کہی کس صدی کی بات

سُننے کی چیز ہے تو وہ ہے ذکر آپ کا
کہنے کی ہے اگر تو وہ ہے آپ ہی کی بات

باغِ ارم کا ذکر بھی دلچسپ ہے مگر
تیری گلی کی بات ہے تیری گلی کی بات

ہوتا ہے غم نصیب کوئی خوش نصیب ہی
غم ہو تجھے نصیب تو یہ ہے خُوشی کی بات

کانٹوں سے رکھو لگاؤ کہ رہ جائے چار دن
پھُولوں کی بات تو ہے گھڑی دو گھڑی کی بات

اے شیخ بعدِ مرگ کی باتیں ہیں بے محل
زیبا ہے زندگی میں فقط زندگی کی بات

موضُوعِ بات چیت کا اور اب کہاں کوئی
جب بھی کہیں چلی تو چلی آپ ہی کی بات

احساسِ کم تری بھی نہیں مجھ کو اے بسیم
آتی نہیں جو دل میں کبھی برتری کی بات

غزل

سعادت نظیر ایم۔ اے

رازِ عشق کہتا ہوں غم کا آسرا لے کر
سن سکو تو سُن لو تم دل سے مشورا لے کر

بے سکونِ دل سب کو بزمِ حُسن میں لیکن
ایک ہم ہی بیٹھے ہیں دردِ لادوا لے کر

غیرتِ محبت کو یہ کہاں گوارا ہے؟
جائیں اُن کی محفل میں کوئی مدّعا لے کر

آپ کے کبھی آنے سے کچھ خوشی نہیں ہوتی
جب سے جی رہا ہوں میں غم کا آسرا لے کر

خامشی میں پنہاں ہیں دردِ عشق کے نغمے
پھر رہا ہوں دنیا میں سازِ بے نوا لے کر

رنگ و بو کے پردے میں کوئی جلوہ آرا ہے؟
ورنہ کیا بہار آتی اک نئی ادا لے کر

اے نظیرؔ، کیا کرتیں گردشیں زمانے کی
ان کے در سے اٹھے ہیں غم کا حوصلہ لے کر

غزل

پورن کمار ہوش

…ت پہلی پہلی پڑی ہے جو گاؤں میں
…بو ترے بدن کی اُڑی ہے فضاؤں میں

چہرے طرب نواز، دلوں میں حسد کا زہر
کتنے قبیح جسم ہیں دلکش قباؤں میں

…چند اعتدال ہر اک شے میں چاہیئے
…کھتے ہیں ہم یقین مگر انتہاؤں میں

ہم اپنی بات کہہ کے سرِ عام چل دیئے
آواز گونجتی رہی چاروں دشاؤں میں

…کھوں کو کھولیے کہ انہیں موند لیجیے
…ن ٹٹولتے ہوئے چلیے گپھاؤں میں

بے وجہ ملتوی نہ کرو رات کا سفر
لٹنے کو لُٹ گئے ہیں مسافر سراؤں میں

…کیا مانگنے چلے ہو شوالے میں ہوش پھر!
چُھپ چُھپ کے مُنہ اندھیرے ستاروں کی چھاؤں میں

غزل

خزاں چند تبسم

یہ بات اب کہاں، کوئی پوچھے کسی بات
تُو نے بھی اے ندیم کبھی کس صدی کی بات

سُننے کی چیز ہے تو وہ ہے ذکر آپ کا
کہنے کی ہے اگر تو وہ ہے آپ ہی کی بات

باغِ ارم کا ذکر بھی دلچسپ ہے، مگر
تیری گلی کی بات ہے تیری گلی کی بات

ہوتا ہے غم نصیب کوئی خوش نصیب ہی
غم ہو تجھے نصیب تو یہ ہے خوشی کی بات

کانٹوں سے رکھو لگاؤ کہ رہ جائے چار دن
پھولوں کی بات تو ہے گھڑی دو گھڑی کی بات

اے شیخ بعدِ مرگ کی باتیں ہیں بے محل
زیبا ہے زندگی میں فقط زندگی کی بات

موضوعِ بات چیت کا اور اب کہاں کوئی
جب بھی کہیں چلی تو چلی آپ ہی کی بات

احساسِ کم تری بھی نہیں مجھ کو اے تبسم
آتی نہیں جو دل میں کبھی برتری کی بات

غزل

سعادت نظیر ایم۔ اے

رازِ عشق کہتا ہوں غم کا آسرا لے کر
سن سکو تو سُن لو تم دل سے مشورا لے کر

بے سکونِ دل سب کو بزمِ حُسن میں لیکن
ایک ہم ہی بیٹھے ہیں دردِ لادوا لے کر

غیرتِ محبت کو یہ کہاں گوارا ہے؟
جائیں اُن کی محفل میں کوئی مدعا لے کر

آپ کے بھی آنے سے کچھ خوشی نہیں ہوتی
جب سے جی رہا ہوں میں غم کا آسرا لے کر

خامشی میں پنہاں ہیں دردِ عشق کے نغمے
پھر رہا ہوں دنیا میں سازِ بے نوا لے کر

رنگ و بو کے پردے میں کوئی جلوہ آرا ہے؟
ورنہ کیا بہار آتی اک نئی ادا لے کر

اے نظیرؔ، کیا کرتیں گردشیں زمانے کی
ان کے در سے اٹھے ہیں غم کا حوصلہ لے کر



منصوبہ بند کنبہ ایسا کنبہ ہوتا ہے، جس کی
سبھی ضرورتیں آپ پوری کر سکتے ہیں
بھائی مجھے بتائیے۔ آپ اتنے اچھے طریقے سے کیسے گزر بسر کر پاتے ہیں۔ میرا گزارا تو بڑی مشکل سے چل پاتا ہے۔
میرا خرچہ کم ہے۔ کیونکہ میرا کنبہ چھوٹا ہے۔ صرف دو بچے ہیں میرے۔
دو؟ میری بیوی تو ہر برس بچہ جنتی ہے۔ لیکن میں کروں بھی تو کیا؟
وہی کرو، جو میں کرتا ہوں۔ نرودھ استعمال کیا کرو۔
بچے کا جنم روکنا آپ کے اختیار میں ہے
اختیار کا استعمال کیجیے
فیملی پلاننگ کے لئے
نرودھ استعمال کیجیے
۳ کے لئے ۱۵ پیسے - ۱ کے لئے ۵ پیسے

اچھوت

شاہد فریدی بی۔ایس سی (ایگری)

مومن پورہ، میدک گلی۔ گلبرگہ (میسور سٹیٹ)

محترم چچا جان! آداب

تنگبھدرا کی نہر کے قریب صبح کے سہانے وقت طلوعِ آفتاب کا نظارہ کرتے ہوئے جہاں لارڈ رسل کی یاد آجاتی ہے وہاں آپ کی یاد کے ساتھ ساتھ آپ کا یہ قول بھی یاد آجاتا ہے کہ "من بھر تھیوری سے تولہ بھر عمل ہزار درجہ بہتر ہے!" اور یہی تولہ بھر عمل میری جھولی میں نہ صرف کسانوں کا خلوص بھر دیتا ہے بلکہ میں انجانی مسرتوں سے بھی دوچار ہوتا ہوں اور کبھی کبھی کوئی کہانی بھی مل جاتی ہے۔ معصوم دھڑکتے دلوں کی اور اس پگڈنڈی کی کہانی جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ دو دلوں میں چبھنے والی ایک لمبی پھانس ہے ——— "اچھوت" کے بارے میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ ہم عورت کو اسپاشیا کا نام دیتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ عورت کے ہونٹوں پر ماتا کے نغمے اور محبت کے گیت بھی ہوتے ہیں۔ عورت کو بے وفا اور پست حوصلہ کہنے والے شاکنتلا کو دیکھیں! ——— "تاجدارِ امن" کی زندگی میں لوگ پوچھتے تھے "نہرو کے بعد کون؟" ——— "تاجدارِ ادب" کے بارے میں آپ کے چاہنے والوں نے آپ کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی پوچھا تھا "خوشتر گرامی کے بعد کون؟" میں نے اپنے پڑھنے والوں کو جواب میں لکھ دیا ہے ———

Lives of great men all remind us
We can make our Lives sublime
And, departing, leave behind us
Foot prints on the sand of time.

ویسے علیم مسرور نے میرے دل کی بات لکھ دی ہے کہ "خوشتر گرامی زندہ ہیں تو اردو زندہ ہے۔ جہاں لاکھوں دستِ دعا آپ کی عمرِ ابد کے طالب ہیں انہیں میں کہیں میں بھی کھڑا ہوں" ——— "بیسویں صدی" پابندی سے مل رہا ہے۔ آپ کے خلوص کا معترف ہوں کہ آپ نے مجھے فراموش نہیں کیا . . .

آپ کا بھتیجا ——— شاہد فریدی

★

مجھے انکا کی ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی، پھر لیبر روم سے نرس نکلی اور کھٹ کھٹ کرتی ہوئی میرے سامنے سے گزر گئی۔ انکا کو درد سے تڑپتا دیکھ کر نرس شاید ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی تھی۔ میں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر سوچا ——— یہ محبت کا لازوال جذبہ ہی تو ہے جو عورت کے اندر مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کی قوت پیدا کرتا ہے! عورت بچپن میں سہیلیوں، بہن بھائیوں کے لئے اور شادی کے بعد شوہر اور بچوں کے لئے سب کچھ برداشت کرتی ہے۔ شاید اس لئے کہ عورت کا دل محبت کا ایک اتھاہ سمندر ہوتا ہے اور مرد؟ جتنا پانی سمندر سے ایک پرندہ اپنی چونچ میں لے سکتا ہے، شاید اتنی ہی محبت مرد کے دل میں ہوتی ہے اور اسی محرومی کے

احساس نے عورت کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا اور عورت کو اسپاشیا کا نام دے دیا۔ سقراط بھی تو ایک مرد ہی تھا اور شاید مرد ابد تک عورت کے دل کو سمجھ بھی نہ سکے گا۔ سمجھا تو برابر والوں کو جاتا ہے اور عورت تو مرد سے بہت بلند ہوتی ہے!

سامنے سے نرس لیڈی ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لئے چلی آرہی تھی۔ لیبر رُوم میں داخل ہوتے وقت لیڈی ڈاکٹر کے قدم مجھے دیکھ کر رُک گئے۔ نیان ٹیوب کی دودھیا روشنی میں نہائی ہوئی سفید ساڑی پہنے، ایک ہاتھ ایپرن کے جیب میں ڈالے دوسرے ہاتھ میں اسٹیتھسکوپ لئے، شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی، مگر میں پہلی ہی نظر میں اُسے پہچان کر مُسکرا دیا۔ میں شالنی کو اُس کی ٹھوڑی پر بچپن میں ڈالے ہوئے مثلث نما تین ہرے ٹیکے دیکھ کر ہزاروں لڑکیوں کے درمیان بھی پہچان سکتا ہوں! مجھے محسوس ہوا جیسے وقت نے اپنے ہاتھوں میں سنگِ مرمر کا

- ایسے دوست سے بچو جو تمھاری خوش حالی کا دوست ہو اور آڑے وقت پر تمھارے کام نہ آئے۔ (حضرت امام غزالیؒ)
- سخی کی تھیلی کشادہ ہوتی ہے، اُس کے ہاتھ بھی کشادہ ہوتے ہیں۔ لیکن بخیل کی تھیلی اور ہاتھ بند ہوتے ہیں اور بہشت کے دروازے بھی اُس پر بند ہوتے ہیں۔ (حضرت ابی اسحٰق ابراہیمؒ)
- جہاں تمھاری عزّت کا لحاظ نہ ہوتا ہو وہاں ہرگز نہ جاؤ۔ (حضرت سیّد علی ہجویریؒ)
- حریصوں کی آنکھ کا کوزہ کبھی نہ بھرا، جب تک سیپ نے قناعت نہ کی۔ موتیوں سے مالامال نہ ہوئی۔ (حضرت مولانا رومیؒ)

ایک حسین مجسمہ تھامے اپنے ہاتھ میرے سامنے کر دیئے ہوں۔ وقت بھی کتنا ظالم ہوتا ہے! پہلے اِسی وقت نے مجھے کبھی سوچنے کا موقع بھی نہ دیا کہ شالنی نام کی ایک لڑکی بچپن اور جوانی کے ابتدائی دنوں میں مجھ سے مِلی تھی، میرے ساتھ کھیلی تھی اور آج اِسی وقت نے شالنی کو ایک ڈاکٹر کے رُوپ میں لاکر میرے سامنے کھڑی کر دی تھی۔ پھر وہ مجھے اپنے ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکنے کے لئے ایک جانے پہچانے راستے پر چھوڑ کر اندر چلی گئی۔

اپنے بچپن میں اُس راستے پر قدم رکھتے ہوئے میں بہت خوش ہوا تھا۔ جوانی میں مجھے وہ راستہ زندگی کے تمام راستوں سے کچھ الگ سا محسوس ہوا تھا۔ زندگی کے بہت سے راستے تو کانٹوں سے بھرے ہوتے ہیں اور کئی راستے تو آدمی کو جہنم تک لے جاتے ہیں، مگر مجھے محسوس ہوا جیسے وہ راستہ جنّت کی طرف جاتا ہے۔ اُس پر فطرت نے پھولوں کی بارش کی تھی۔ مائیموسی فولیا کے اُودے اُودے اور بیوٹیا کے سُرخ سُرخ پھولوں سے وہ راستہ ڈھک سا گیا تھا۔ اُس راستے پر پھول ہی پھول بچھے ہوئے دیکھ کر میں ڈر سا گیا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ پھول کسی بڑے آدمی کے سواگت کے لئے بچھائے گئے ہیں۔ لیکن ایک کسان کو اُسی راستے سے آتے ہوئے دیکھ کر میں اُس پر بے خوف ہو کے بڑھتا چلا گیا تھا۔ جہاں وہ راستہ ختم ہوتا تھا وہاں سے ایک لہراتی بَل کھاتی ہوئی پگڈنڈی کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ایسی دوشیزہ کی کمر کا تصور اُجاگر ہو گیا تھا جس کی کمر پر گاگر ہو اور گاگر کے بوجھ سے کمر بل کھا رہی ہو۔ پھر جب میں نے اُس چھوٹے سے پہاڑ پر پہنچ کر نیچے کی طرف نظر ڈالی تو خوشی سے میری چیخ نکل گئی تھی۔ نشیب میں پہاڑیوں کے دامن میں ایک بہت ہی خوبصورت جھیل تھی۔ جھیل کے کنارے قدرتی لینڈ سکیپ کو دیکھ کر میرا جی چاہا تھا کہ میں اپنے جوتے اُتار کر ہری ہری گھاس پر دُور تک بھاگتا چلا جاؤں۔ اِس سے پہلے کہ میں نیچے کی طرف قدم بڑھاتا، کوئی چیز میرے سر سے آکر ٹکرائی میں نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا تو مجھے کوئی بھی نظر نہ آیا اور میں اپنی حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر جب میری نظریں بیری کے درخت پر گئیں تو میں نے دیکھا ایک شاخ پر ایک لڑکی اپنے دونوں پیر ہِلاتے ہوئے بیر کھا رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر کھِلکھِلا کر ہنس پڑی۔ مجھے غصّہ آگیا اور میں ایک پتھر اُٹھانے کے لئے جُھکا۔

"ہائیں ہائیں، ایسا مت کرنا۔ لو تم بھی بیر کھاؤ!" اُس نے اپنا کھایا ہوا بیر میری طرف پھینکا۔

اور میں نے اُسے گھُور کر غصّے سے دیکھا تو وہ پھر ہنس پڑی۔

"اچھا میں تمھارے لئے پکّے پکّے بیر توڑ کر پھینکتی ہوں!"

اور وہ پکے ہوئے بیر توڑ کر نیچے کی طرف پھینکتی رہی اور میں اپنا غصّہ بھُول کر اپنی قمیص کے دامن میں بیر جمع کرتا رہا۔ جب وہ درخت سے نیچے اُتر آئی تو میں اُس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔

"اِس طرح کیا گھُور رہے ہو——؟"

"یہ نشان کیسے ہیں؟" میں نے اُس کی ٹھوڑی کی طرف اشارہ کیا جہاں ہرے رنگ کے تین تِل تھے۔

"یہ نشان!" وہ پھر ہنس پڑی "جب میں چھوٹی سی تھی تو میری ماں نے ڈالے تھے۔"

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ جھیل کے کنارے لے آئی جہاں ایک بڑے پتھر کے قدرتی کٹاؤ میں بیٹھ کر میں اُس کے ساتھ بیر کھاتا رہا۔ پھر اُس نے

مجھ سے پُوچھا۔

"تم نے پنڈو کھائے ہیں کبھی ؟"

"نہیں !" میرا جواب سُن کر وہ اُچھلتی کُودتی جھاڑیوں میں غائب ہوگئی اور جب واپس آئی تو اُس کے ہاتھوں میں سُرخ سُرخ پھل تھے اور جب میں نے اُنھیں اُس کے ہاتھوں سے لینا چاہا تو اُن پھلوں کی باریک ریشم جیسی روئیں میرے ہاتھ میں چُبھ گئیں اور وہ ہنس پڑی۔ پھر وہ اُن پھلوں کو صاف کرکے مجھے دیتی رہی اور میں کھاتا رہا۔

"تمھارا نام کیا ہے ؟" میں نے سُرخ سُرخ پنڈو کھاتے ہوئے اُس سے پُوچھا۔

"شالنی !"

"تمھارا گھر کہاں ہے ؟"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے !"

"اور تمھارے ماتا پِتا ؟"

"وہ بھی نہیں ہیں !"

"اچھا تو تم میرے گھر چلو۔ میری بھابی مجھے بہت چاہتی ہیں۔ وہ تمھیں بھی پیار کریں گی اور میرے ساتھ تمھیں بھی پڑھائیں گی۔"

پھر ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے اور میں اُسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ جب چند دنوں بعد چھُٹیاں ختم ہوگئیں تو میں وہاں سے چلا آیا اور اُس کے بعد کوئی آٹھ برس تک بھابی سے مِلنے نہ جا سکا، اور جب پُورے آٹھ برس بعد میں بھابی کے گھر گیا تو مجھے یاد آیا کہ میں اپنے ساتھ ایک لڑکی کو بچپن میں یہاں لے آیا تھا اور جب وہ لڑکی میرے لئے چائے لے کر آئی تو میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر وہ شرما گئی۔

"کیا بیر نہیں کھِلاؤ گی ؟" میں نے مُسکراتے ہوئے اُس سے پُوچھا۔

اُس کے ہونٹوں پر دبی دبی سی مُسکراہٹ رقص کرنے لگی اور چہرے پر حیا کی سُرخی دَوڑ گئی۔

اُسی شام کو میں اور شالنی اُسی راستے سے گزرے جو پھُولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پھر بیر کے درخت کے قریب سے گزُرتے وقت شالنی کے قدم خود بخود رُک گئے اور وہ نہ جانے کن خیالوں میں ڈُوب گئی۔

نشیب میں اُترتے ہوئے میں نے اُس سے کہا۔

"شالنی ! بچپن میں تم میرا ہاتھ تھامے مجھے نیچے لے آئی تھیں، کیا اب نہیں تھاموگی میرا ہاتھ ؟"

وہ رُک کر میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، مگر میں مُسکراتا ہوا نشیب میں اُترتا چلا گیا اور مجھے اپنی غلطی کا احساس بھی نہ ہو سکا کہ بچپن ہم سے رُوٹھ کر کہیں دُور چلا گیا ہے اور مجھے خود شالنی کا ہاتھ تھامے اُترنا چاہیئے۔ اِس لئے کہ زندگی کے ہر نشیب و فراز میں یہ مرد ہی تو ہوتا ہے جو عورت کا ہاتھ تھامے اُسے اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ لیکن میں شالنی کا ہاتھ نہ تھام سکا۔ وہ خود ہی آہستہ قدموں سے نیچے اُتر آئی۔ پھر جب ہم جھیل کے کنارے آکر بیٹھ گئے، وہ جھیل میں کِھلے ہوئے پھُولوں کو دیکھ کر نہ جانے کِن خیالوں میں کھو گئی۔ بچپن میں ہمیشہ کِھلکھلا کر ہنسنے والی شالنی جھیل میں کِھلے ہوئے پھُولوں کو تکتی ہوئی مجھے ایسے دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

- زندگی کے ہر شعبے میں وہ لوگ ناشاد اور نامُراد ہیں جو کوئی فیصلہ کرنے میں تاخیر سے کام لیتے ہیں۔ (ڈوگلس لرٹن)
- تقریباً اسّی فیصد بیماریاں ہمارے جسم کے بجائے ہمارے دماغ سے پیدا ہوتی ہیں۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- اَولاد کے لئے سرمایہ چھوڑنا مستحسن ہے لیکن اَولاد کو روپیہ کمانے اور پس انداز کرنے کی تعلیم دینا اِس سے بھی زیادہ اچھا ہے۔ (ہربرٹ سپنسر)
- ہر شخص قلیل آمدنی سے بھی زندگی اور تندرستی قائم رکھ سکتا ہے۔ (بنجمن فرینکلن)

"شالنی ! تمھیں یاد ہے، جب تم چھوٹی تھیں، اُس وقت تم ایک پنچھی بن کر اُن پہاڑیوں کے اُس پار جانا چاہتی تھیں ؟"

میری بات سُن کر وہ شرما گئی اور میں اُسے بچپن کی باتیں یاد دِلا کر چھیڑتا رہا اور وہ شرماتی رہی۔

"اور آج اُسی لڑکی کو جو بچپن میں اپنے سر کی جُوئیں میرے سر میں ڈالنے کے لئے میرے پیچھے بھاگتی تھی، وقت نے میرے سامنے، زندگی کے ایک نئے موڑ پر، ایک ڈاکٹر کے رُوپ میں لا کر کھڑا کیا تھا۔ وقت ! جسے جو چاہتا ہے بنا دیتا ہے !

پھر شالنی جب لیبر رُوم سے نکل آئی تو میں نے اپنے ماضی کی کتاب بند کردی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

"راجیش! مجھے افسوس ہے کہ میں دو زندگیوں میں سے صرف ایک کو بچا سکی!"

پھر مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ میں ہاسپٹل کے کاریڈور میں کھڑا ایک لیڈی ڈاکٹر سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے اُس کے دونوں بازو پکڑ لئے۔

"ڈاکٹر! جلدی بتاؤ تم نے کسے بچا لیا؟"

"تمھارا کیا خیال ہے راجیش! میں نے کسے بچایا ہوگا؟"

میرے دل کی بات زبان پر آگئی۔

"ہاں! اب آپ کی بیوی خطرے سے باہر ہے!"

آٹھ ماہ گزر گئے اور اِن آٹھ مہینوں میں ہمیشہ مجھے الکا کی آنکھوں میں مامتا کا جذبہ تمنّا بن کر مچلتا ہوا نظر آیا اور جب وہ اُس بچّے کو جسے قُدرت نے ہم سے چھین لیا تھا، یاد کرتی اور میرے سینے سے لگ کر سِسک پڑتی تو مجھے محسوس ہوتا جیسے مامتا کا وہی جذبہ الکا کے دل کی دھڑکن بن گیا ہے۔ وہ تڑپتی رہی اور جب مجھ سے اُس کی تڑپ نہ دیکھی گئی تو میں شالنی سے مِلنے چلا گیا تاکہ اُس سے الکا کے لئے تھوڑا وقت مانگ سکوں۔ جب میں ایک صبح شالنی کے کوارٹر پر پہنچا، میں نے دیکھا وہ اپنے چھوٹے سے باغیچے کے گوشے میں کھڑی پھُول توڑ توڑ کر اپنا دامن بھر رہی تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ سُن کر وہ پیچھے کی طرف مُڑی اور جب میں اُس کے قریب پہنچا تو مجھے محسوس ہوا جیسے وہ میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی چیز نیچے گری ہو۔ دو پھُول میرے قدموں میں پڑے تھے۔ مجھے بیتے ہوئے دنوں کی ایک شام یاد آگئی۔ ایسی ہی ایک شام تھی جب جھیل کے کنارے شالنی کے ہاتھوں سے کیسر کے پھُول چھُوٹ کر میرے قدموں میں آگرے تھے اور جب میں نے اُنھیں اُٹھانا چاہا تھا تو اُس نے مجھے پھُول اُٹھانے نہ دیئے اور آج بھی جب میں نے جھک کر پھُول اُٹھانے چاہے تو آج بھی اُس نے اٹھانے نہ دیئے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ رُوم میں آگئی۔ ڈرائنگ رُوم کی دیوار پر ایک تصویر لگی ہوئی تھی۔ میں تصویر کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ کسی درخت کی گھنی چھاؤں میں ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی آنکھوں میں انتظار لئے ایک سُنسان راستے کو تک رہی تھی۔ جب میں نے شالنی کو فلاور پاٹس سجاتے ہوئے دیکھا تو اُس سے پُوچھا۔

"شالنی! کیا تم نے اِتنے سارے پھُول صرف کمرے کی سجاوٹ کے لئے توڑے تھے؟"

"تم نے کیا سمجھا تھا راجیش؟"

"میں یہ سمجھا تھا کہ پھُول تم نے پُوجا کے لئے توڑے ہیں!"

"پُوجا!" اُس کے ہونٹوں پر ایک یاس بھری مُسکراہٹ دَوڑ گئی "راجیش! پُوجا تو اُن کے حصّے میں آتی ہے، جنھیں بھگوان اپنی مرضی سے جنم دیتے ہیں اور میں شاید ایک ایسا خود رَو پَودا ہوں جو چٹانوں پر اُگتا ہے، جس پر کسی کی نظر نہیں پڑتی اور ایک دن خود ہی ختم ہو جاتا ہے!" پھر وہ اندر چلی گئی اور جب واپس آئی تو میں نے دیکھا وہ اپنے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لئے ہوئے کھڑی کچھ سوچ رہی ہے۔

"راجیش! میرے ہاتھوں کی بنی چائے پیو گے نا؟"

"گھر آئے مہمان سے کیا یہ بات پُوچھی جاتی ہے شالنی!" میں نے مُسکرا کر اُس سے کہا۔

"اپنے ساتھیوں کو میں نے ہچکچاہٹ سی محسوس کرتے ہوئے پایا ہے راجیش! اِسی لئے میں نے تم سے پُوچھا تھا۔ ویسے میں اچھُوت ہوں نا راجیش!"

"تم بھُول گئیں شالنی! میں نے تمھارے کھائے ہوئے بیر کھائے تھے!"

"میں نہیں بھُولی راجیش! اور بھُول بھی کیسے سکتی ہوں۔ یہ تم ہی تو تھے جو ایک بے سہارا لڑکی کو بچپن میں اپنے گھر لے گئے اور یہ تمھاری بھابی ہی تو تھیں جِنھوں نے ایک اچھُوت لڑکی کو ماں کا پیار دیا۔ یہ تمھارے بھائی ہی تو تھے جنھوں نے مجھے پڑھایا لکھایا اور میں نے جب میٹرک پاس کیا تو اُن کی وجہ سے سارے اسٹیٹ میں فرسٹ آئی اور جب تمھارے بھائی کا ٹرانسفر ہوا تو لوگوں نے تمھارے بھائی پر اور مجھ پر گندگی اُچھالی۔ یہ دُنیا کِتنی بُری ہے راجیش! جو ایک باپ اور بیٹی کے مقدّس رشتے پر بھی گندگی اُچھالتی ہے! جب میں بے سہارا تھی کسی نے بھی مجھے سہارا نہیں دیا اور جب جوان ہوئی تو سب ہی لوگ مجھے اپنے پاس رکھنے کو تیار ہوئے اور میری ذات اور گاؤں کی برادری نے تمھارے بھائی اور بھابی کے ساتھ جانے نہیں دیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور جب مجھے گاؤں کے ہر آدمی کی آنکھوں میں ہَوَس نظر آئی تو میں ایک رات گاؤں سے بھاگ نکلی اور سرکاری وظیفوں کے سہارے پڑھ کر آج اِس منزل پر پہنچی ہوں تو میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ تعلیم سب کچھ بدل ضرور سکتی ہے لیکن روایات کے سامنے آکر ہار جاتی ہے!"

میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"کالج کے زمانے میں جب میرے ساتھیوں کی نظریں میری تھوڑی پر پڑتیں تو میری حالت اُس لڑکی کی سی ہوتی جو اپنے پیروں سے چل نہ سکتی ہو اور جسے ایک رقّاصہ سے تعارف کرایا گیا ہو۔ لیکن میں کسی سے بھی نفرت نہ کر سکی اور اپنے دل میں حسرت کا پَودا لگایا اور آج میں ڈاکٹر بن گئی ہوں تو میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میرے دل میں خوشی کا ایک پَودا اُگ گیا ہے۔ جب میں مریضوں میں

گھری ہوتی ہوں تو یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں ایک ہی وقت میں دُنیا کی سب سے مقدّس کتابیں پڑھ رہی ہوں !"

"تم نے ابھی تک شادی نہیں کی شالنی ؟"

"نہیں !" اُس نے جواب دیا۔

"کوئی ٹریجڈی ؟"

"کیا زندگی خود ایک ٹریجڈی نہیں ہے راجیش ! ویسے کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ ایک اچھوت کے بارے میں سوچے ——— لو چائے پیو!" اُس نے چائے کا کپ تیار کرکے میری طرف بڑھایا۔

میں نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے سوچا، کاش اُسے اپنے اچھوت ہونے کا اتنا غم نہ ہوتا۔ میں نے اُس سے کہنا چاہا "تم ایسا نہ سوچا کرو شالنی ! تم اُن لوگوں سے بھی بہت بلند ہو جنھوں نے بڑی ذات میں جنم لیا ہے، اور ایک ڈاکٹر تو ملک و قوم کی مقدّس امانت ہوتا ہے !" میں اُس سے کہہ نہ سکا اور اُس سے پُوچھا۔

"شالنی ! تمھاری زندگی میں کبھی ایسی کبھی ہستی . . ؟"

اندر سے کسی بچّے کی رونے کی آواز آئی اور شالنی بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی اور میری بات ادھوری ہی رہ گئی۔

واپس آکر اُس نے مجھ سے کہا۔

"راجیش ! شاید تم یہ پُوچھنا چاہتے تھے کہ کیا میری زندگی میں کوئی ایسی ہستی کبھی آئی ہے جسے میں نے چاہا ہو ! ——— ایک ایسی ہستی ضرور آئی تھی جسے میں نے رُوح کی گہرائیوں سے چاہا تھا اور آج تک میں اُسے اپنے خوابوں میں بسائے پُوجتی چلی آرہی ہوں۔ ابھی تم نے جس بچّے کی رونے کی آواز سُنی یہ بچّہ اُسی کی نشانی ہے !"

"تو کیا اُس نے تمھیں دھوکا دیا شالنی ؟"

"نہیں راجیش ! مجھے وقت نے اتنی فرصت نہیں دی کہ میں اپنے دل کی بات اُس سے کہتی، ویسے بات اُس نے بھی کی، بات میں نے بھی کی۔ لیکن بات، بات ہی رہی اور سچ مچ بات نہ ہو سکی اور میرے دل ہی میں رہ گئی !"

"شالنی ! کیا تم سمجھتی ہو کہ اس طرح تمھاری زندگی کی تکمیل ہو سکے گی ؟"

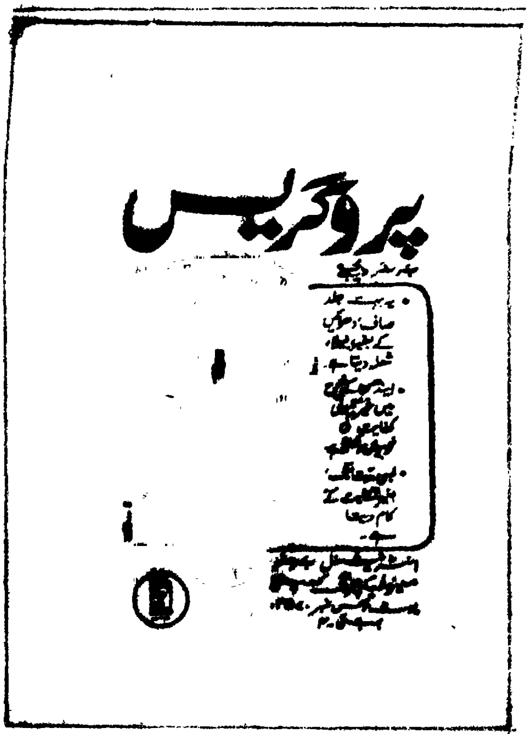
"کیوں نہیں راجیش ! عورت کی صرف دو ہی تو خواہشیں ہوتی ہیں۔ اُسے ایک اچھا سا جیون ساتھی ملے اور اُس کی ممتا کی تکمیل ہو سکے۔ وہ تو میرے ساتھ نہیں ہے لیکن کیا اُس کی یادوں کے اُجالے میرے ساتھ نہیں ہیں ! اور جب یہ بچّہ بڑا ہو کر مجھے اپنی توتلی زبان سے ماں کہے گا۔ ماں ! جو دُنیا کا سب سے شیریں اور مقدّس لفظ ہے، تو کیا میری زندگی کی تکمیل نہ ہو جائے گی ؟"

میں یہ سوچتا ہوا شالنی کے پاس سے چلا آیا کہ ممتا کا جذبہ کتنا مقدّس اور عظیم ہوتا ہے۔ اسی جذبے کی تکمیل کے لئے الکا کئی ماہ سے تڑپ رہی تھی اور یہی جذبہ اور تڑپ الکا سے تنہائی میں گڑیوں سے باتیں کرواتے تھے اور جب گڑیوں سے کوئی جواب نہ ملتا تو الکا سِسک سِسک کر رو پڑتی تھی۔

اس کے کوئی ایک ماہ بعد شاپنگ کرکے میں الکا کے ساتھ جس وقت ایک دکان سے نکل رہا تھا، شالنی اپنے بچّے کو گود میں لئے دُکان میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے الکا کا تعارف شالنی سے کرایا۔ الکا جب بچّے کو دیکھ کر مسکرائی تو بچّے کے ہونٹوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی اور جب الکا نے اپنے بازو پھیلائے تو بچّہ مچل کر الکا کی گود میں آگیا اور وہ اُسے پیار کرتی رہی اور میں الکا کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کس سوچ میں ڈوب گیا۔

اس واقعہ کے کوئی ایک ہفتہ بعد صبح ہی صبح الکا نے مجھے نیند سے جگا دیا۔

"سُنو! برآمدے میں کسی بچّے کے رونے کی آواز آرہی ہے ؟"



"بھئی الکا سونے دو مجھے! مجھے ہر وقت کسی نہ کسی بچّے کی آواز سُنائی دیتی رہتی ہے!"

الکانے مجھے سونے نہ دیا اور مجھے کھینچ کر باہر لے آئی۔ باہر سچ مچ ایک چھوٹا خوبصورت بچّہ اپنی پریشان نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا رو رہا تھا۔ الکانے آگے بڑھ کر بچّے کو اپنی گود میں لے لیا اور اُسے پیار کرنے لگی میں نے دیکھا وہ بچّہ شالنی کا تھا۔ بچّے کی بُش شرٹ میں مجھے ایک لفافہ نظر آیا۔ میں نے لفافہ نکال کر چاک کیا۔ لکھا تھا ————

راجیش!

یہ ممتا کا جذبہ بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ اِس ننّھے معصوم میں جہاں میرے لئے ممتا کی کشش تھی، وہاں اِس کے ساتھ بہت سی یادیں، میری پرستش اور بہت کچھ تھا میرے لئے اور میں اندھی ہوگئی۔ بچّے کو پاکر میں نے محسوس کیا جیسے میں نے اُسے بھی پالیا جسے اپنے خوابوں میں بسلئے پوجتی چلی آرہی تھی۔ لیکن میں یہ بھی محسوس کرتی ہوں کہ جب وقت میرے ساتھ انصاف نہ کرسکا تو اِس بچّے کے ساتھ کیا انصاف کرسکے گا۔ جب یہ بڑا ہو کر اپنے باپ کا نام پُوچھ بیٹھا تو میں اِسے کیا جواب دوں گی؟ اُس وقت اِس کے دل پر کیا گزرے گی جب دُنیا اِسے اچھوت کا بیٹا کہے گی!؟ جب یہ پڑھ لکھ کر بڑا ہو جائے تو اِس سے کہنا کہ اِسی دُنیا میں اِس کی ایک ماں اور بھی ہے جسے اُس نے پہلے پہلے اپنی گود میں کھلایا ہے، پیار کیا ہے۔ کھو گئے نا راجیش!

ابھی چند دن پہلے جب تمھاری بیوی الکانے اِسے اپنی گود میں لے کر پیار کیا تھا تو مجھے وہ بات یاد آگئی، جسے بتانا میں بھول گئی تھی کہ اب ساری زندگی تمھاری بیوی کسی بچّے کو جنم نہ دے سکے گی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں دو زندگیوں میں سے صرف ایک کی زندگی بچا سکی تھی، پیدا ہونے کے بعد میں نے بچّے کو نرس کے ہاتھوں اپنے گھر بھجوا دیا تھا۔ یہ بچّہ تمھارا ہی بچّہ ہے۔ ہوسکے تو مجھے معاف کر دینا۔ مجھے معاف کر دوگے نا راجیش ————!!

[redacted]

دِلّی کا خط لندن کے نام

خوشتر گرامی

مائی ڈیر لندن!

کہیے مزاج تو بخیر ہے۔ کیسی گزر رہی ہے؟ اپنا حال تو پتلا ہے اور پتلا کیوں نہ ہو۔ پانی سے پتلا کیا ہوا دودھ جو پینے کو ملتا ہے۔ کیا لکھوں میری گود کی رونق میرے بچے، میرے لال بلبلا رہے ہیں، لرز رہے ہیں، کانپ رہے ہیں —— خدا کے خوف سے نہیں۔ وہ تو اِس زمانے میں کسی کو رہا نہیں۔ اگر ہوتا تو بیچارے مولانا محمد علی جوہرؔ مرحوم کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی ؎

خوفِ غمّاز، عدالت کا خطر، دار کا ڈر
ہیں جہاں اِتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

یہ لوگ لرز رہے ہیں۔ اِس خبرِ دہشت اثر سے کہ اہلِ دِلّی پر تین کروڑ ۴۸ لاکھ کے مزید ٹیکس لگنے والے ہیں۔ یعنی ہر دِلّی نواسی کے سر پر دس روپے کی چوٹ پڑے گی اور اُنھیں اندرا جی کی راجدھانی میں رہنے اور جشنِ جمہوریت کی پریڈ دیکھنے کی قیمت دینی پڑے گی —— یہاں پانی کی شرح میں تین گُنا اور بجلی کی شرح میں ڈیڑھ گُنا اضافہ ہونے والا ہے۔ میرے بچے یہ محسوس کر رہے کہ صبح شام میں ہَوا پر اور سانس لینے پر بھی ٹیکس لگنے والا ہے —— اِن ٹیکسوں کی بھرمار سے بُرا حال ہے اور یہ عالم ہے ؎

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

دن رات کی اِس ٹیکس بازی کو دیکھ کر ہی تو بیسویں صدی کے ایک شاعر نے ایک بار پھبتی کسی تھی ؏

ٹیکس پر ٹیکس لگاؤ تمھیں ملی رکس کا ہے

معلوم نہیں لندن نواسیوں کا کیا حال ہے؟ اُن پر ٹیکسوں کی کیسی بھرمار ہے؟ بہر حال ہم بڑی تیزی سے لندن بننے کی کوشش کر رہے ہیں —— آزادی سے پہلے ہمارے لیڈروں نے وعدہ کیا تھا کہ یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی۔ مگر فی الحال تو شراب کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ آزادی کے بعد شراب کی پیداوار میں دس بیس گُنے ہی کا اضافہ نہیں ہوا بلکہ ۵۲ گُنے کا اضافہ ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء میں پُورے مُلک میں شراب تیار کرنے کے ۱۹ کارخانے تھے جن کی قوتِ پیداوار چھ ہزار کلو لیٹر تھی اور آج مُلک میں شراب کے ۶۵ چشمے قائم ہیں اور اُن سے شراب کی نہریں بہہ رہی ہیں اور ہر سال تین لاکھ بارہ ہزار کلو لیٹر شراب نکلتی ہے۔

جب وزیرِ کبیر پارلیمنٹ میں ایسے انکشاف کرتے ہیں تو بادہ خوار اِس مژدۂ جانفزا پر پھُولے نہیں سماتے۔ وہ اِسے اشارہ سمجھتے اور یہ کہہ کر پیتے ہیں ؎

پیتا بغیرِ اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

اور مزے کی بات یہ ہے کہ کانگرس سرکار نے نشہ بندی کا ڈھونگ رچا رکھا ہے اور ہمارے نائب وزیرِ اعظم مرارجی ڈیسائی نشہ بندی کے جھنڈے اُٹھائے پھرتے ہیں۔ لیکن جب پارلیمنٹ میں شراب کی پیداوار اور شراب کے کارخانوں میں اضافے کے انکشافات کی خبر سُنتے ہیں تو دونوں کانوں سے کام لیتے ہیں یعنی ایک کان سے سُنتے ہیں اور دوسرے سے اُڑا دیتے ہیں۔ پارلیمنٹ سے باہر آتے ہیں تو پھر وہی نشہ بندی کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ چچا غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا

مولانا محمد علی جوہرؔ مرحوم کا ذکر آیا ہے۔ اُن کا دِلّی اور لندن دونوں ہی سے تعلّق رہا ہے۔ اتّفاق سے یہ مہینہ بھی اُن کی برسی کا مہینہ ہے۔ آج سے ۴۷ برس قبل ہمارا یہ مجاہدِ وطن اور قافلہ سالارِ آزادی لندن ہی کی فضاؤں میں گُم ہو گیا تھا —— وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے لندن گئے تھے۔ اُنھوں نے وہاں جا کر کانفرنس میں اعلان کیا:-

"آج جس مقصد کے لئے میں یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے مُلک کو ایسی حالت میں واپس جاؤں جب آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک

غلام مُلک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر مُلک میں جو آزاد ہے مرنے کو ترجیح دوں گا؟ اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی۔"

اور سچ مچ مولانا اِس غلام مُلک میں واپس نہیں آئے۔ انھوں نے وہیں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ مولانا کس قسم کی آزادی چاہتے تھے خود اُن کے الفاظ میں سُنئے:۔

"میں اور میرا بھائی (مولانا شوکت علی) پہلے شخص تھے جنھیں لارڈ ریڈنگ نے جیل بھیجا تھا۔ مجھے اِس معاملے میں اُن سے کوئی شِکوہ شکایت نہیں لیکن میں بھی وہی اختیار چاہتا ہوں کہ جب لارڈ ریڈنگ ہندوستان میں کسی جُرم کے مرتکب ہوں تو میں بھی اُنھیں جیل بھیج سکوں۔"

مولانا محمد علی جوہر کے لندن پہنچنے پر وہاں کے اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" نے لکھا کہ "مولانا نے اب اپنا سیاسی عقیدہ تبدیل کر لیا ہے اور وہ اب برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مِل کر کام کر رہے ہیں۔"

اِس پر مولانا نے اپنی تقریر میں کہا۔

"میری رگوں میں وہی خون ہے جس سے لارڈ ریڈنگ کی رگیں معمور ہیں۔ جنھوں نے مجھے قید کیا تھا۔ میں سامی نسل سے تعلق رکھتا ہوں اور اگر لارڈ ریڈنگ نے اپنے مذہب سے برگشتگی اختیار نہیں کی تو میں نے بھی اِسلام ترک نہیں کیا۔ میں جہاں پہلے تھا وہیں اِس وقت تک ہوں۔ ڈیلی ہیرلڈ نے لکھا ہے کہ اب میں برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مِل کر کام کر رہا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ میں شیطان کے ساتھ مِل کر بھی کام کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ خدا کے راستے میں کام کرتا ہو۔"

لارڈ پیل کی تقریر پر تنقید کرتے ہوئے مولانا نے کہا تھا:۔

"ٹینی سن نے قدامت پسندی کی تعریف کی ہے کہ بہترین قدامت پسند وہ ہے جو خشک شاخ کو کاٹ ڈالتا ہے۔ لارڈ پیل نے صاف گوئی کے ساتھ جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سوکھی ہوئی شاخ کے مانند ہیں جسے کاٹ ڈالنا چاہیئے۔"

"لارڈ پیل نے کہا ہے کہ جب آپ (مولانا محمد علی وغیرہ) اپنے مُلک کو دستورِ اساسی لے کر واپس جائیں گے تو وہ لوگ جو آپ سے تعاون نہیں کر رہے ہیں دستور کو آپ کے ہاتھ سے چھین لیں گے۔ یاد رکھیئے کہ جب میں انگریز سے لڑ سکتا ہوں تو میں ہندوستانیوں سے بھی لڑ سکتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ میں یہاں سے غلامی کی سند لے کر جاؤں اور پھر آپ مجھ سے یہ توقع رکھیں کہ میں اپنے ہی لوگوں سے لڑوں گا۔ یہ ممکن نہیں۔"

پیارے لندن!

تمھیں شاید معلوم نہ ہو کہ مولانا محمد علی کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سیاسی لیڈروں میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک بار مولانا عربی وضع کا لباس پہن کر اسمبلی تشریف لے گئے۔ اتفاقاً پنڈت مدن موہن مالویہ سے ملاقات ہو گئی۔ مالوی جی نے دیکھا تو کہا "آہاہ! مولانا محمد علی آپ ہیں۔ میں اِس لباس سے سمجھا بیگم صاحبہ بھوپال تشریف لا رہی ہیں۔"

مولانا محمد علی نے برجستہ جواب دیا "بیگم صاحبہ بھوپال ایسی بے غیرت دل خاتون ہیں کہ اِس زنانہ مجلس میں آنا پسند نہیں کرتیں۔"

مولانا آگے بڑھے تو مرکزی اسمبلی کے صدر وٹھل بھائی پٹیل سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے اپنے کمرے میں لے جا کر ایک سرکردہ انگریز سے ملاقات کرائی۔

اِس وضع میں دیکھ کر انگریز نے بھی پھبتی کسی "مولانا آپ تو بالکل عرب معلوم ہوتے ہیں۔"

مولانا نے فوراً جواب دیا "اِس حُسنِ ظن کا شکریہ۔ لیکن جب بارہ برس تک میں انگریزی لباس استعمال کرتا رہا تو آپ میں سے کسی نے نہیں کہا کہ 'تم انگریز معلوم ہوتے ہو'۔ بلکہ 'کالا آدمی' ہی آپ کی زبان پر رہا۔ اب کہ میں نے اپنے پیغمبر کے ہم وطنوں کا لباس اختیار کیا ہے تو آپ کو بالکل عرب معلوم ہوتا ہوں۔"

۱۹۲۷ء میں مدراس کانگرس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگرس کا نصب العین مکمل آزادی پاس کرانا چاہا۔ انھوں نے تجویز پیش کی اور مولانا محمد علی نے اِس کی تائید کی۔

پنڈت مدن موہن مالویہ نے اِس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ مولانا محمد علی نے بار بار دورانِ تقریر میں اُن کے خیالات کی تردید کی۔ مالویہ جی ملک معظم کا نام لے لے کر اپنی تجویز کو اور زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

[redacted]

مولانا محمد علی نے کہا: "آپ ملکِ معظّم ملکِ معظّم کیا کہہ رہے ہیں۔ ملکِ معظّم کی حیثیت ہی کیا ہے۔ وہ صرف ایک "قانونی مغالطہ" ہیں اور بس"۔ اِس پر وہ قہقہہ پڑا کہ مالویہ جی کی آواز شور میں دب کر رہ گئی۔

مولانا محمد علی کو الفاظ میں تغیّر و تبدّل کرنے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ لارڈ برکن ہیڈ کو وہ لارڈ بروکن ہیڈ (شکستہ سر) کہتے تھے اور برطانوی وزیرِ اعظم ریمزے میکڈانلڈ کا نام انھوں نے "رام جی مکنڈا مل" اور بمبئی کے چرچ گیٹ کا نام "بابِ کلیسا" رکھا ہوا تھا۔

مولانا کی داستان تو بہت لمبی ہے اور دِلّی سے اُن کا تعلّق بھی بہت ہی گہرا تھا مگر میں نے لندن اور لندن والوں کی دلچسپی کی ہی چند باتیں پیش کی ہیں۔

مولانا کی یاد کے ساتھ بات طول پکڑ گئی۔ اب پھر میں اپنے اصل موضوع کی طرف لَوٹتی ہوں۔ دِلّی بمقابلہ لندن ——— دِلّی نے آزادی کے بعد لندن بننے بلکہ لندن کو پیچھے چھوڑ دینے اور مغربی مُلکوں سے آگے بڑھنے کے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ مگر شب و روز کی پیہم کوششوں اور تگ و دو کے باوجود مجھے اب محسوس ہوا کہ میں اور پُورا بھارت ابھی تک مغرب کے مقابلے میں بہت پیچھے اور بہت پسماندہ ہیں ——— یہاں نو نو، دس دس برس کی بچّیاں ابھی مائیں نہیں بنتیں ——— بیونس آئرز کی خبر ہے کہ وہاں قبیلۂ ازل کی ایک نَو سالہ بچّی نے اڑھائی کِلو کے ایک بچّے کو جنم دیا ہے یہ بچّہ اور زچّہ دونوں تندرست بتاتے جاتے ہیں۔ ایک دوسری خبر بردسلز کی ہے کہ ایک دس سالہ حاملہ لڑکی کو کلینک میں داخل کیا گیا ہے۔ لڑکی کی کم سِنی کے پیشِ نظر اِس لڑکی کا نام اور کلینک کا اتا پتا خفیہ رکھا گیا ہے۔ خیال ہے کہ یہ لڑکی چند روز میں ماں بن جائے گی۔ اِس پر طرّہ یہ کہ لڑکی اِتنی پکّی ہے کہ اُس نے اپنے ہونے والے بچّے کے باپ کا نام اور پتہ بتلانے سے انکار کر دیا ہے ——— یہ خبر پڑھ کر مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا ہے کہ

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

بہر حال خدا کا شُکر ہے کہ میں ابھی اِس ترقّی سے بہت دُور ہوں ——— بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میرے بھارت میں ابھی تک کہیں کہیں اِتنی پسماندگی ہے کہ اُس پر شرم سے میری گردن جُھک جاتی ہے۔ ہم مہاتما گاندھی کا صد سالہ جشنِ پیدائش تو منا رہے ہیں مگر مہاتما گاندھی کا نام ہم نے "سیاسی تجارت" کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ اُن کے اصولوں سے ہم ہمیشہ کی طرح آج بھی دُور ہیں ——— اخباروں میں یہ خبر چھپی تو مجھے دُکھ ہوا کہ مہاتما گاندھی کے وطن گجرات کے بعض حصّوں میں ہری جنوں کو ندی کے اوپر سے پینے کا پانی لینے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ صرف نیچے سے پانی لے سکتے ہیں اور سورن (اعلیٰ ذات کے) ہندو اوپر سے پانی لیتے ہیں ——— گجرات کے پانچ دیہات میں سے ایک ایسا مضروبے کا جس میں ہری جنوں کو پانی لینے کی وہ سہولت حاصل نہیں جو سورن ہندوؤں کو حاصل ہے ——— مجھے تو یہ اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں کہیں بکری کے بچّے اور بھیڑیے کی کہانی نہ دُہرائی جاتی ہو کہ بھیڑیے نے اوپر سے پانی پیتے ہوئے بھی، نیچے پانی پینے والے بکری کے بچّے کو یہ کہہ کر پھاڑ کھایا تھا کہ تُو نے پانی گندا کر دیا ہے ——— یہ خوئے بد بھیڑیے ہی میں نہیں ہوتی۔ حضرتِ انسان بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ وہ تو کہ

خوئے بد را بہانۂ بسیار

ہیں۔ مختصر یہ کہ مجھے اِس خط میں اپنی پسماندگی کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔ خدا حافظ!

آپ کی ——— دِلّی

("ایشیا" ویکلی برمنگھم لندن کے شُکریہ کے ساتھ)

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

افسانہ لکھ رہی ہوں	خورشی باش ایم۔ اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	دو روپے
آگ اور دھواں	م۔م۔ راجندر ایم۔ اے	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
داماد	″	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
پگلی	″	تین روپے ۵ نئے پیسے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۴۵ ″
باون پتے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ ″
پہلی لڑکی	رازداں ایم اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
انور	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ ″
برہمن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ ″
ستم	″	چار روپے ۷۵ ″
گھائل	″	تین روپے ۹۵ ″
ظالم	سعید امرت	دو روپے ۵۰ ″
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۵۰ ″
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵ نئے پیسے
گناہ	″	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
حال دل	بیگم تو قیر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ ″
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
خم ابرو (نظم)	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ ″
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
فریب مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	ذکی انور	چھ روپے
برجیس	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
کانٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ ″
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ ″
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
رہ گذر	انیس مرزا	چار روپے ۵ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شاہدہ	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	تین روپے
ناظمہ کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بدایونی	دو روپے ۵ نئے پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دردانہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جلن	″	دو روپے ۵۰ ″
رادھا از بنجھر	″	دو روپے ۵۰ ″
پاپی	″	چار روپے
سونا گاچھی	″	چار روپے ۵۰ ″
طوفانوں کی کہانی	″	چار روپے ۵۰ ″
جوار بھاٹا	″	چار روپے ۵۰ ″

قیامت	ذکی انور	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
سازش	″	دو روپے ۵۰ ″
کانٹوں کی سیج	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گھرانہ	قیسی رام پوری	چار روپے ۲۵ نئے پیسے
ناگ دیوتا	مخمور جالندھری	دو روپے ۵۰ ″
خون کے چھینٹے	″	دو روپے ۵۰ ″
خوابگاہ میں	″	تین روپے ۵۰ ″
فراق	رنگین بھارتی	تین روپے ۵۰ ″
پیاسا	″	تین روپے ۵۰ ″
پراسرار رقاصہ	″	دو روپے
پراسرار قاتل	″	دو روپے
پیاس	کے۔ ایل نرلہ بی اے	تین روپے ۵۰ ″
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مالوا	میکسم گورکی ترجمہ: نریش کمار شاد	ایک روپیہ ۷۵ ″
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۷۵ ″
جی ہاں پٹے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ ″
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ ″
ملکۂ صحرا	اوم پرکاش نامی	دو روپے ۵۰ ″
خاموش نغمہ	″	چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال ″	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) ″	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) ″	ساحر	تین روپے ۵ نئے پیسے
پرچھائیاں ″	ساحر	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	(مولانا آزاد)	تین روپے ۵۰ ″
کیٹلاگ سازی	حاجی محمد زبیر	تین روپے ۵۰ پیسے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶



زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱ ★ پیاز ـــــ جدید سائنس کی روشنی میں

پیاز کو لوگ گھٹیا سی چیز سمجھتے ہیں مگر یہ ہماری غذا کا ایک ضروری جزو ہے۔ یہ موسم گرما میں لو اور برسات میں ہیضہ کی مفید دوا ہے۔ بلاشبہ یہ وبا اور اس کی مضرت سے محفوظ رکھتا ہے۔

اِس کا مزاج گرم ہے۔ شیخ بو علی سینا کے نزدیک گرم خشک ہے۔ نہایت مفید اور مقوّی ہے۔ قبض کو رفع کرتا ہے پیشاب آور ہے حیض کو کھول کر لاتا ہے۔ بھوک بڑھاتا، ریاح کو تحلیل کرتا اور ہاضمہ کو تقویت بخشتا ہے۔ اِس کے کیمیاوی تجزیہ اور جدید تحقیق سے اِس میں اجزائے لحمیہ (پروٹینز) کیلسیم، پوٹاشیم، سوڈیم، سلفر (گندھک) اور فولاد وافر مقدار میں پائے گئے ہیں۔ اِس میں قوتِ تریاقیہ بھی ہے۔ وبائی ہواؤں کے اثرات کو زائل کرتا ہے۔ اِسی لئے ہیضہ اور طاعون کی وبا پھیلنے کے زمانے میں اِسے اپنے پاس رکھنا اور کھانا مفید ہوتا ہے۔ ہیضے کے مریض کو پیاز کا عرق دینا بہت فائدہ بخش ہے۔ اِس کا عرق قاتلِ کرم ہے۔ اِس لئے اِس کا انجکشن سِل اور دِق کے جراثیم کا قاتل ثابت ہوا ہے۔

ہمارے جسم سے روزانہ گندھک خارج ہوتی ہے۔ اِس لئے اِس کمی کو پورا کرنے کے لئے روزانہ پیاز کھانا بہت ضروری اور مفید ہے۔ پکا کر کھانے کی نسبت کچا زیادہ مفید ہے۔

کچا پیاز کھانے سے منہ سے بدبو ضرور آتی ہے مگر پیاز کھانے کے بعد اخروٹ بریان کھا لیا جائے یا دھنیا چبا لینے سے بھی بدبو دُور ہو جاتی ہے۔

دوائی اعتبار سے بھی پیاز گوناگوں خواص کا حامل ہے ـــــ پیاز، شہد اور ادرک کا رس مساوی ملا کر چاٹنے سے طاقت بڑھتی ہے اور باہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ پیاز میں ادرک، نمک اور لیموں نچوڑ کر چٹنی کے طور پر کھانے سے انسان وبائی امراض بدہضمی، قے و متلی سے محفوظ رہتا ہے۔ پیاز سنگِ مثانہ کو خارج کرتا ہے اور تلّی کے ورم کا بھی علاج ہے۔

پیاز کا کاجل بنا کر آنکھوں میں لگانے سے آنکھ کے جلے جالے اور پھوڑے دفع ہوتے ہیں۔ صاف کپڑے کی بتی بنا کر پیاز کے پانی میں بھگو دیں۔ بتی خشک ہو جائے تو چراغ میں بتی رکھ کر تل کا تیل ڈالیں اور روشن کر کے کاجل حاصل کریں۔

سُرمہ سیاہ کو پیاز کے پانی میں تین دن تک کھرل کریں۔ یہ سُرمہ آشوبِ چشم، دھند اور جالے میں بہت مفید ہے۔

پیاز کا پانی اور شہد ہم وزن، کافور چوتھائی وزن۔ سب کو ملا کر شیشی میں محفوظ کر لیں۔ موتیا بند کی ابتدائی حالت میں رات کے وقت آنکھوں میں دو دو سلائیاں لگانے سے پانی اُترنا بند ہو جاتا ہے اور جو پانی آیا ہوا ہو وہ بھی دفع ہو جاتا ہے۔

پیاز کا عرق پینے سے بھڑ اور بچھو کا زہر اُتر جاتا ہے۔

پیاز کو پیس کر نمک ملا کے دیوانے کُتے کی کاٹی ہوئی جگہ پر لیپ کرنا بہت مفید ہے۔

پیاز اور انجیر ہم وزن کو باریک پیس کر، نمک ملا کر سانپ، بچھو، کُتے، کنکھجورا اور بھڑ کے کاٹے ہوئے مقام پر لیپ کرنا مفید ہے۔ جب تک موزوں علاج میسّر نہ آئے زخم پر پیاز کُچل کر باندھنا اور پیاز کھانا نافع ہے۔

۲ ★ انسان کی سب سے بڑی قوت

یقین اور خود اعتمادی انسان کی سب سے بڑی قوت ہے۔ یقین کی

کی طاقت ور انسان کو کمزور بنا دیتی ہے۔ یقین اور خود اعتمادی کمزور انسان کو بھی طاقت ور بنا دیتی ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— "انسان کے یقین کے مطابق ہی انسان کی زندگی ہوتی ہے۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اہم بات یہ ہے کہ انسان زندگی کو اُمید اور مسرت سے دیکھے اور اپنی قوتوں پر یقین رکھتا ہوا کامیابی کی طرف بڑھتا رہے۔"

"اگر میں ناکام ہو گیا تو؟" بس اسی شک اور یقین کی کمی نے بہت سے انسانوں کی زندگیوں کو ناکام بنا دیا۔ اگر ہم خود اعتمادی سے سوچنے لگیں، ناکامی کے شک کو دل سے نکال دیں تو زندگی ہی بدل جائے۔ ہم جبھی ناکام ہوتے ہیں جب اپنی صلاحیت پر شک کر کے خود اعتمادی کو کھو بیٹھتے ہیں۔

یقین اُس چشمے کے دروازے کھول دیتا ہے جو زندگی دھارے کا منبع ہے۔ کسی انسان کے یقین ہی کے ذریعے ہم اُس کی زندگی کی کامیابی ماپ سکتے ہیں ——— یقین ہی انسان کی سب سے بڑی قوت ہے۔

۳ ★ صحت کا راز

یہ ایسا موضوع ہے، اتنی اہم بات ہے کہ اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ اس کی طرف لوگوں کی جتنی توجہ دلائی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— "ہر قسم کی افراط و تفریط کمزوری کا باعث ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا سبب ہے کہ اکثر لوگ جو اچھے کام کر سکتے ہیں، بہت بُرے کام کرتے ہیں ——— ایک وجہ تو مجھے معلوم ہے اور وہی بڑا سبب ہے۔ انسان غفلت، افراط و تفریط اور ہر طرح کی بے قاعدگیوں سے اپنی صحت تباہ کر لیتا ہے۔"

اگر جسمانی حالت کمزور ہے تو ہمت پست ہو گی۔ خیالات پریشان ہوں گے اور تھوڑے سے کام کے بعد طاقت جواب دینے لگے گی۔ جو کام انسان کرتا ہے، اُس کا اثر اُس کے بدن پر، اُس کی جسمانی حالت پر پڑتا ہے اور ضرور پڑتا ہے۔ اُس کی ذہنی اور دماغی حالت اُس کی جسمانی حالت سے الگ نہیں ہوتی۔ جسم صحت مند ہے تو ذہن چُست۔ دماغ روشن ہے اور اگر جسم ہی بیمار ہے تو دماغ بھی کام کرنے کے قابل نہیں۔

یہی صحت کا راز ہے ——— !

۴ ★ ایک بڑی غلطی

یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ غذا ہی پر صحت کا دارومدار ہے اور صحت ہی زندگی ہے ——— لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے انسان نے اپنے لئے صحت بخش اور صحیح غذا کے انتخاب کی صلاحیت کھو دی ہے، اسی لئے کچھ لوگ فربہی کا شکار ہوتے ہیں اور کچھ ناقص اور ناکافی تغذیہ کا۔

قریب قریب سارے ہی معالجوں کا تجربہ اور فیصلہ ہے کہ ناقص اور غلط قسم کی غذائیں صحت کو تباہ کر دیتی ہیں۔ انسان کو طرح طرح کے امراض میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ کھانسی، زکام، انفلوئنزا، بدہضمی اور بخار وغیرہ کا سبب بنتی ہیں یا ان بیماریوں کو اُبھارتی ہیں۔

اکثر آدمی سستی اور کاہلی کی وجہ سے یا نئی چیزوں کی شوجھ بُوجھ نہ ہونے کی وجہ سے یکساں اور بے تنوع غذائیں کھاتے ہیں۔ یہ ایک بڑی غلطی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے جسم کو مختلف اور طرح طرح کی غذاؤں کی ضرورت ہے۔ تاکہ جن مختلف اجزا کی اُسے ضرورت ہے، وہ غذا کے ذریعے مہیّا ہو سکیں۔

جو غذا آپ روزمرّہ کھاتے ہیں اُسے بدلنا آسان نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے جسم کی صلاحیت اور کارگزاری میں ۷۵ فیصدی اضافہ کرنا چاہتے ہوں تو ماہرینِ غذائیات کی ہدایتوں پر عمل کرنا بہت مفید ہو گا۔ کیونکہ اُنھوں نے مدّتوں مطالعہ اور تجربات کرنے کے بعد غذا کا صحیح نظام مرتّب کیا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگ جاسوسی اور رومانی ناول بہت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ دوسری کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن صحت اور زندگی کے موضوع سے بہت کم لوگ دلچسپی لیتے ہیں، اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں، اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے ——— اور یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

۵ ★ زندہ رہنے کے لئے

گزرنے کے لئے ہر طرح زندگی گزر جاتی ہے۔ لیکن کس طرح زندگی گزارنی چاہئے؟ کس طرح اچھی زندگی گزر سکتی ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے ——— "زندہ رہنے کے لئے پہلا قدم سوچ کر اُٹھانا چاہئے۔ کیونکہ آپ اور آپ کی زندگی ہمہ گیر اور بلند اہمیت رکھتے ہیں۔ حکومت، مُلک اور دُنیا بھی اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی آپ ——— صرف آپ!

اس بلند اور سادہ حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسے گرہ میں باندھ لیں۔ یہ خیال نہ کریں کہ یہ تو خود غرضی اور انانیت پر مبنی ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ تو بہت سادگی سے آپ کی فطرت خود آپ کو سکھاتی ہے۔ اپنی قدر پہچاننا اور خود اعتمادی کی طرف یہ پہلا قدم ہے۔

کامیاب و کامراں زندگی بسر کرنے کی طرف دوسرا قدم اُٹھانا اِس حقیقت کو سمجھنا ہے کہ آپ یا آپ کے ساتھیوں اور دوسرے لوگوں کو کن حالات میں رہنا چاہئے۔ ہم چاہیں تو اُن حالات کو جان سکتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ اُن کی طرف سے آنکھیں بند کئے گزر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم سب جانتے ہیں کہ زندگی بہت مختصر ہے، لیکن کیا ہم زندگی کی اِس حقیقت کو صحیح معنوں میں سمجھ کر کوئی ٹھوس قدم اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں؟ بہت سے لوگ اِس بے نیازی اور بے پروائی سے جینے کے عادی ہوگئے ہیں جیسے اُن کی عمر پانچ سَو سال کی ہو! اُنھیں وقت ضائع کرنے کا بالکل احساس ہی نہیں ہوتا۔

٦★ کیا آپ اپنے شوہر سے بیزار ہیں؟

بہت سی خواتین ایسی ہیں جو اپنے شوہروں کی تلخ و تُرش باتوں اور بُرے برتاؤ سے اُن سے بیزار رہتی ہیں۔ خدا نہ کرے آپ بھی اُنھیں خواتین میں ہوں۔ اگر ایسا ہے تو مشہور مفکّر ڈیل کارنیگی کا یہ مشورہ آپ کے لئے بہت ہی سکون بخش ہوگا۔

"دوسروں کی خامیوں کو زیادہ اہمیت نہ دیجئے۔ یقیناً آپ کا شوہر خامیوں اور غلطیوں سے مبرّا نہیں ہے۔ وہ دیوتا ہوتا تو کبھی آپ سے شادی نہ کرتا۔ ٹھیک ہے نا؟ کسی کی بیوی بہت پریشان اور دہشت زدہ ہوتی جارہی تھی۔ وہ ہر وقت اُسے ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کرتی اور اُس میں خامیاں نکالتی رہتی۔ جب اُس سے پوچھا گیا "اگر تمھارا شوہر مرجائے تو پھر کیا کروگی؟" اُسے اِس تصوّر ہی سے اِتنا صدمہ پہنچا کہ وہ فوراً بیٹھ گئی اور اپنے شوہر کی خامیاں بھُول کر اُس کی خوبیوں کی طویل فہرست گِنا ڈالی۔

جب آپ بھی محسوس کریں کہ آپ کی شادی کسی ظالم اور بے رحم مرد سے ہوگئی ہے تو آپ بھی اِس طریقے پر کیوں نہیں عمل کرتیں؟ ہوسکتا ہے اُس کی خوبیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اِس نتیجے پر پہنچیں کہ آپ کا شوہر ایسا آدمی ہے جس سے مِل کر آپ کو خوشی ہوگی!

٧★ کامیابی کا راز

آپ دوسروں کو کامیاب دیکھ کر اُن پر رشک کرتے ہیں، حیرت بھی کرتے ہیں، لیکن یہ بھی سوچتے ہیں، اُن کی کامیابی کا راز کیا ہے؟

مشہور مفکّر کے۔ نولسن نے لکھا ہے ــــ "ہم آئے دن دیکھتے ہیں، لوگ کس طرح ملازمت یا زندگی کے دوسرے دائروں میں اپنی قابلیت کو فروخت کرنے میں کامیاب یا ناکام ہوتے ہیں۔ چاہے یہ دائرہ ادب کا ہو یا سائنس کا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض لوگ بغیر کسی تگ و دو کے دُنیا کی نگاہوں میں کامیاب و کامراں گردانے جاتے ہیں اور اُن کے برعکس بعض لوگوں کو جانفشانی کرنے کے بعد بھی وہ یا اُس سے کم درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ایک شخص ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ محنتی بھی ہے تو اُسے لوگوں کو اپنی زبان سے اپنی خوبیاں بتانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ آنکھیں رکھنے والے فوراً پہچان جاتے ہیں وہ کن خوبیوں کا مالک ہے۔ ایسے شخص کو ملازمت کی تلاش میں ایک آفس سے دوسرے آفس میں پھرنا نہیں پڑتا، ملازمت خود اُس کی تلاش میں نکلتی ہے۔ کسی کام میں ماہر ہونے کے لئے مسلسل محنت اور مشق ضروری ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ اُسے یہ دولت فطرت کی طرف سے تحفتہً ملی ہے۔

٨★ اندازِ گفتگو

زندگی کی کامیابی اور ناکامی میں انسان کے کاروبار کو بڑا دخل ہے اور کاروبار کی کامیابی یا ناکامی میں اندازِ گفتگو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مشہور مفکّر کے۔ نولسن نے لکھا ہے ــــ "انسان کس طرح وہ اندازِ گفتگو سیکھ سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرسکے اور موقع سے فائدہ اُٹھانے میں کامیاب ہوسکے؟ کامیاب انسان الفاظ کا تلفّظ صحیح بولتا ہے۔ جہاں وقفہ آتا ہے، ٹھہر کر بات کرتا ہے۔ لیکن وہ جدید اور قدیم کتابوں میں دئے ہوئے پُرتکلف طریقوں پر بات نہیں کرتا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اُسے خدشہ ہے کہ کہیں اُس میں مصنوعی انداز نہ آجائے اور لوگ اُس کا مذاق اُڑانے کے ساتھ ساتھ کہیں اُس سے نفرت بھی نہ کرنے لگیں۔"

اِس سلسلے میں صرف ایک ہی شاہراہِ کامرانی ہے اور وہ ہے اَن تھک مشق! ہوسکتا ہے وہ دوسرے لوگوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر بہت کچھ سیکھ لے۔ لیکن جس درس گاہ میں وہ صحیح تربیت پاسکتا ہے وہ اُس کی اپنی ذات ہے۔

روزمرّہ کی زندگی میں جب آپ دوسرے لوگوں سے مِلتے ہیں تو یہ بات اور بھی ضروری ہوتی ہے۔ انسان کی تعلیم میں یہ ایک حقیقی عنصر ہے۔ اِس کی مدد سے اُسے وہ لطیف فن حاصل ہوجاتا ہے جس کے سہارے انسان ہر محفل میں کھُلے ہاتھوں لیا جاتا ہے۔ اِس سے انسان کی ملاقاتوں کا سلسلہ طویل ہوجاتا ہے اور کاروبار میں فروغ کی نئی راہیں کھُلنے لگتی ہیں۔

ناردرن ریلوے

نوٹس

یکم اپریل 1969 سے ٹائم ٹیبل میں عام ترمیم ہوگی اور جو اہم تبدیلیاں ہوں گی وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

جن ٹرینوں کی رفتار تیز کی گئی

(I) میل اور ایکسپریس

(I) 11-اَپ مغلسرائے اور دہلی کے درمیان 43 منٹ (II) 208 ڈاؤن (ایم جی) جودھپور اور پھلیرا کے درمیان 25 منٹ (III) 82-ڈاؤن دہلی اور مغلسرائے کے درمیان 15 منٹ (IV) 207۔اَپ (ایم جی) پھلیرا اور جودھپور کے درمیان 10 منٹ (V) 60 ڈاؤن پٹھانکوٹ اور نئی دہلی کے درمیان 8 منٹ (VI) 59۔اَپ نئی دہلی اور پٹھانکوٹ کے درمیان 5 منٹ۔

(II) پسنجر

(I) 1 جے ڈی پی (ایم جی) دیگانہ اور پھلیرا کے درمیان 82 منٹ (II) 2 جے ڈی پی (ایم جی) پھلیرا اور دیگانہ کے درمیان 55 منٹ (III) 372 ڈاؤن دہلی اور ہردوار کے درمیان 45 منٹ (IV) 209۔اَپ (ایم جی) پھلیرا اور مارواڑ کے درمیان 30 منٹ (V) 2 یو۔این انبالہ چھاؤنی اور نابھہ کے درمیان 20 منٹ (VI) 210 ڈاؤن (ایم جی) مارواڑ اور پھلیرا کے درمیان 20 منٹ (VII) 2 اے ایل ایف۔ امرتسر اور فیروزپور کے درمیان براستہ لدھیانہ 15 منٹ (VIII) 349-اَپ دہرہ دون اور امرتسر کے درمیان 7 منٹ۔

ٹرین کے اوقات میں اہم تبدیلیاں

(I) 11-اَپ ہوڑہ دہلی ایکسپریس 5-6 کی بجائے 35-5 بجے دہلی آئے گی (II) 84 ڈاؤن

لکھنؤ ایکسپریس 7.25 بجے کی بجائے 7.50 بجے لکھنؤ آئے گی (III) 4 -اَپ جھانسی میل لکھنؤ سے
7.30 بجے کی بجائے 7.5 بجے روانہ ہوگی (IV) 106 لکھنؤ جھانسی فاسٹ پسنجر 15.15 بجے کی بجائے
15.40 بجے لکھنؤ سے روانہ ہوگی (V) 372 ڈاؤن ہردوار دہلی پسنجر 17.5 بجے کی بجائے 16.20 بجے
دہلی پہنچے گی (VI) 3 ایل سی پسنجر -/10 بجے کی بجائے 10.45 بجے لکھنؤ سے روانہ ہوگی (VII) 6 اے
ایف پسنجر 16.45 بجے کی بجائے 17.15 بجے فیض آباد سے روانہ ہوگی (VIII) 2-ایم ایل پسنجر
16.20 بجے کی بجائے 16.40 بجے فیض آباد سے روانہ ہوگی (IX) ہوڑہ اور بمبئی وی ٹی کے درمیان
ہفتہ میں دو بار جنتا ایکسپریس جاری رہے گی اور الہ آباد اور بمبئی کے درمیان ہفتہ میں دو بار چلنے
والی جنتا ایکسپریس ہفتہ میں چار بار کر دیا جائے گا۔ یہ الہ آباد سے سوموار، بدھ وار، شکر وار اور
سنیچر وار کو روانہ ہوگی اور بمبئی وی ٹی سے سوموار، منگل وار، برہسپت وار اور سنیچر وار کو روانہ ہوگی۔
الہ آباد اور بمبئی کے درمیان چلنے والی ٹرینوں کا نمبر 41 ڈاؤن/ 42 -اَپ ہوگا۔

اشتراک

207 -اَپ/ 95-اَپ اور 208 ڈاؤن/ 96 ڈاؤن میرٹا روڈ اور جودھپور سیکشن پر کمبائنڈ
ٹرین کی حیثیت میں چلیں گی۔

جن ٹرینوں کو ٹریفک کے فقدان کی وجہ سے منسوخ کر دیا گیا

(I) 1-ایم ایس این/ 2-ایم ایس این انبالہ چھاؤنی اور ننگل ڈیم کے درمیان (II) 1 اے اے/
2-اے اے امرتسر اور اٹاری کے درمیان (موسمی ٹرین جو صرف گرمیوں کے مہینوں میں چلتی ہے (III)
1-ایچ ایچ/ 2-ایچ ایچ ہاتھرس جنکشن اور ہاتھرس قلعہ کے درمیان (IV) 1 جے پی بی/ 2 جے پی بی
پیپر روڈ اور بلارا کے درمیان (V) 1 جے ایم ایم/ 4 جے ایم ایم میرٹا روڈ اور میرٹا سٹی کے درمیان
(VI) 1 جے بی پی/ 2 جے بی پی بلوترا اور پچ پدرا سالٹ ڈپو کے درمیان۔
(نوٹ) (اے) ٹرین نمبر 1-این جے پی نئی دہلی کی بجائے دہلی سے چلے گی اور اس کا نمبر 1-ڈی
جے پی ہوگا (بی) 2-این ایس بی نئی دہلی کی بجائے دہلی پر ختم ہوگی اور اس کا نیا نمبر 2
ڈی ایس بی ہوگا۔

نئے سٹیشن کھلیں گے

رمانیا ہالٹ سمداری بھیلڑی سیکشن پر۔ میاں کا باڑہ لونی باڑمیر سیکشن پر پیتھرالہ ہالٹ، ہنومان گڑھ

بھٹنڈہ سیکشن پر۔

راستہ کی تبدیلی

(1) 55 - اَپ/60 ڈاؤن سرینگر/ایکسپریس جو نئی دہلی اور پٹھانکوٹ کے درمیان براستہ جالندھر سٹی کیریاں چلتی ہے وہ بدلے ہوئے راستہ پر جالندھر شہر کو چھوڑ کر براستہ جالندھر کنٹونمنٹ کورٹ چلے گی (11) 52 ڈاؤن اے سی ایکسپریس جو شکروار کو نئی دہلی سے روانہ ہوتی ہے اُس کا نمبر 104 ڈاؤن ہوگا اور وہ براستہ مغلسرائے، پٹنہ، ہوڑہ جائے گی۔ اِسی طرح 51 - اَپ اے سی ایکسپریس جو اتوار کو ہوڑہ سے روانہ ہوتی ہے اُس کا نمبر 105 - اَپ ہوگا اور وہ براستہ پٹنہ مغلسرائے نئی دہلی جائے گی۔

ٹھہرنے کی نئی جگہیں

531 - اَپ/4 ڈی ایس یو 1 - این ایم/2 - این ایم دہائی ہالٹ پر۔ 15 - ڈاؤن 25 ڈاؤن حضرت نظام الدین پر۔ 4 - اے بی پی چھینا پر۔ 1 پی بی پاراور پر۔ 4 سی ایم گھتمال پر۔ 2 بی ڈی بی جبوڑلا جوری سمپکا پر۔ 93 - اَپ پٹودی روڈ پر۔ 47 - اَپ/48 ڈاؤن پارسی پور پر۔ 106 - اَپ مگرواں پر۔ 2 - ایل سی مگرواں اور جیتی پور پر۔

ٹھہرنے کی جگہیں جو ختم کر دی گئیں

51 - اَپ/52 ڈاؤن۔ گوسائیں گنج اور ریڈ گنج پر۔ 14 ڈاؤن پارسی پور پر۔ 52 ڈاؤن دلیل نگر پر۔ 2 اے ایل ایف تنگرا، سورا نوسی اور جہیرد پر۔ 91 - اَپ پٹودی روڈ پر۔ 107 ڈاؤن مگروارا، جیتی پور اور اموسی پر۔

یکم اپریل 1969ء سے براڈ گیج ڈویژنوں کی کچھ برانچ لائنوں کی ٹرینوں سے ناکافی استعمال کی وجہ سے I اور II کلاس کے ڈبے نکال لئے جائیں گے۔

اوقات، براہ راست/سیکشنل کیریج کے اضافہ اور منسوخی اور ٹرینوں میں جگہوں کی درجہ بندی و ردّ و بدل وغیرہ کے سلسلہ میں مفصّل معلومات کے لئے اپریل 1969ء کا ٹائم ٹیبل دیکھیں جو اہم سٹیشنوں کے ریلوے بکنگ/ریزرویشن/معلومات کے دفاتر اور بک شالوں پر برائے فروخت دستیاب ہے۔

چیف اوپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ R.O.9.O.

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

سوال و جواب

سعیدہ بانو۔ پلی بھیت

س۔ بھائی صاحب! مجھے کچھ اچھی باتیں بتایئے نصیحت کی باتیں۔ مجھے ایسی باتیں سُننے کا بہت شوق ہے۔

ج۔ نیکی کا کام پابندی سے کرو، چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو ——— جو جھوٹ سے بچ گیا وہ سارے گناہوں سے بچ گیا ——— سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں ——— کم کھانا صحت ہے، کم بولنا حکمت۔ اور کم سونا عبادت ہے۔

محمد عمیر الدین آرزو۔ آسنسول۔ بردوان

س۔ سیاست کیا ہے؟

ج۔ خوبصورت جھوٹ!

س۔ آرزوؤں کی زیادتی؟

ج۔ حضرت! آپ خود آرزو ہیں۔ یہ آپ کو ہم سے زیادہ جاننا چاہیئے ——— حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد سُنئے ——— "ترکِ آرزو ہی تونگری ہے"!

س۔ نغمہ اور حُسن جب ایک ہو جاتے ہیں تو انسان کی کیفیت کیسی ہو جاتی ہے؟

ج۔ انسان مدہوش و سرشار ہو جاتا ہے۔

محمد حسین۔ احمد آباد

س۔ زندگی کی ناؤ بھنور میں پھنس جائے۔ ہاتھ سے پتوار بھی چھوٹ جائے۔ تمام جدّوجہد ناکام ہو جائے۔ ایسے وقت میں کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ جب بھی مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ اِس حقیقت پر ایمان رکھنا چاہیئے ———
ناخدا جس کا نہ ہو اُس کا خدا ہوتا ہے!

س۔ سب سے عظیم گُناہ؟

ج۔ گُناہ کو گُناہ نہ سمجھنا! اپنے گُناہوں پر پشیمان نہ ہونا!

عبداللہ حسن۔ کاماریڈی (آندھرا)

س۔ وہ کون سی طاقت ہے جو انسان کو اندھا دھند بُرائی کی طرف بڑھنے سے بچا سکتی ہے؟

ج۔ روشن ضمیر!

س۔ زندگی سے انسان کب بیزار ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب عزم و حوصلہ کی کمی سے زندگی حُسن و کشش سے محرومِ ہو جاتی ہے۔

رُوح القدّوس انعامدار۔ بیجاپور

س۔ کیا کشمیر ایک حسین عورت کی مانند ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ جبھی تو اِسے جنّتِ ارضی کہتے ہیں۔

س۔ عورت، دولت اور سیاست، شادی کیا ہیں؟

ج۔ دولت اور سیاست حسین فریب ہیں۔ عورت اور شادی روشن حقیقت ہیں۔

سلمیٰ نقّاش۔ سرینگر۔ کشمیر

س۔ دل کا سکون کیسے مِل سکتا ہے؟

ج۔ دوسروں کے دل کو سکون بخش کر، دوسروں کو خوشی دے کر۔

س۔ یہ خود غرض دُنیا کب بدلے گی؟

ج۔ جب خود غرض لوگ بدلنے دیں گے۔

سیّد معین احمد۔ پوسد

س۔ سامنے انسان خدا کی مخلوق ہیں، لیکن ایک کے پاس شراب کے لئے دولت ہے تو دوسرا صرف روٹیوں کے لئے کیوں محتاج ہے؟

ج۔ خوش حالی و بدحالی اپنے اپنے عزم و حوصلہ، اپنی جدّ و جہد پر موقوف ہے ؎

لے شکوہ سنج شوئی تقدیر دیکھنا
ذوقِ عمل ہی تیرا کہیں خام تو نہیں

س۔ گہرے دوست کو اپنی کن کن باتوں سے آگاہ کرنا چاہیئے؟

ج۔ ایسی باتوں سے جو کبھی دوست کے دشمن بن جانے پر نقصان نہ پہنچائیں۔

س۔ عورت، دولت اور شراب ـــــ ان تینوں میں کون سی چیز زیادہ تباہ کن ہے؟

ج۔ آپ کی بلند نگاہی قابلِ داد ہے! شراب جیسی تباہ کن چیز کے ساتھ آپ نے عورت کو بھی شامل کرلیا! جس عورت کے متعلق مشہور مفکر ہیلن نے کہا ہے ـــــ "عورت زندگی کی کٹھن منزل کے لئے رہبرِ کامل ہے" ـــــ اور ایمرسن نے کہا ہے ـــــ "تمدن نیک عورتوں کے اقتدار اور احترام کا دوسرا نام ہے"۔

ثریا خانم۔ لکھنؤ

س۔ بھائی جان! آپ پردہ کے حامی ہیں یا مخالف؟ کیا آپ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں قید رکھنا ضروری سمجھتے ہیں؟

ج۔ ہم ضرورتی پردہ کے حامی ہیں۔ اُسے عورتوں کے لئے، معاشرہ کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ رہی عورت کو گھر کی چار دیواری میں قید رکھنے کی بات ـــــ تو ہم حضرت اکبر الہ آبادی کی زبان میں کہیں گے ؎

فرض عورت پر نہیں ہے چار دیواری کی قید
ہو اگر ضبطِ نظر کی اور خودداری کی قید
ہاں مگر خودداری و ضبطِ نظر آساں نہیں
منہ سے کہنا سہل ہے کرنا مگر آساں نہیں

روشن نیازی پیغمبر پور۔ دربھنگہ

س۔ میں آپ سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہوں ـــــ اس لئے یار لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ کا دوسرا نام خوشتر گرامی ہے، تو کیا آپ کا دوسرا نام بھی روشن نیازی ہونا چاہئے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

ج۔ آپ کی خوشنودی و دلجوئی ہمیں دل و جان سے منظور ہے۔ آپ ہمیں جس نام سے چاہیں یاد کرسکتے ہیں۔

س۔ کچھ دن ہوئے میں نے آپ کی خدمت میں ایک غیر مطبوعہ افسانہ "لڑکی ایک ـــ مصیبت" ارسال کیا ہے۔ آپ اس افسانہ کو شریک اشاعت کر رہے ہیں؟

ج۔ ہم لڑکی کو مصیبت نہیں سمجھتے، اس لئے ایسا افسانہ کیسے شائع کرسکتے ہیں جس کی تھیم ہمارے نزدیک غلط ہے۔

مس بتول رتلامی۔ رتلام

س۔ انسان کی انسانیت بلندی سے کب گر جاتی ہے؟

ج۔ جب وہ انسانیت کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

وصال احمد صدیقی۔ نوریا۔ پیلی بھیت

س۔ خوشتر بھائی! ہم لوگ اپنے قصبہ میں انجمن ترقی اُردو کی تنظیم کر رہے ہیں۔ کیا آپ اس سلسلہ میں ہماری کچھ مدد کرسکتے ہیں؟

ج۔ آبِ زر سے لکھنے کے قابل یہ پیغام دیں گے ـــ جو ہزاروں امداد سے بڑی امداد ہے ؎

بڑھے جاؤ خلوصِ کار کی سچی حرارت سے
نکل آتی ہے جوئے شیر بھی پتھر کی فطرت سے

س۔ مجھے افسانہ نویسی کا بے حد شوق ہے۔ ایک افسانہ بھی بھیجنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے افسانہ کو 'بیسویں صدی' میں جگہ دیں گے؟

ج۔ آپ کے لئے ہمارا پُرخلوص مشورہ یہ ہے کہ افسانہ نویسی کا شوق ہے تو پہلے کسی جاننے والے سے استفادہ کیجئے ـــ بلندی تک زینہ بزینہ پہنچا جاسکتا ہے۔

قرار اقبال کے۔ جی۔ ایف۔ مقیم بنگلور

س۔ محترم خوشتر صاحب! مہربانی فرما کر اپنی لکھی ہوئی کتاب شائع کرنے کے لئے سرکاری کارروائیوں سے مطلع فرمائیے۔

ج۔ ماہوار رسائل، ہفت روزہ یا روزانہ اخبار نکالنے کے لئے سرکاری اجازت ضروری ہوتی ہے۔ اپنی لکھی ہوئی کتاب شائع کرنے کے لئے اجازت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

محمد راشد۔ غازی پور

س۔ ہندوستان میں اُردو کا مستقبل؟

ج۔ اُردو کے بدخواہوں کے خیال میں تاریک، اُردو کے بہی خواہوں کے خیال میں روشن و تابناک ہے۔ اُردو کی خوبیاں اس کے قیام و دوام کی ضامن ہیں۔

س۔ فانی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ مری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہگذر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا

بلقیس بانو۔ دہلی

س۔ بھائی جان! گوئٹے کے اِس قول کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ ——— ”ہر بلند مرتبہ مرد کی رہنمائی عورت کے شیریں الفاظ کرتے ہیں“
ج۔ گوئٹے نے بہت صحیح کہا ہے۔

آغا عماد الدین احمد۔ دربھنگہ

س۔ گُزشتہ الیکشن میں میری سیاسی موت ہوگئی۔ مجھے بڑی ذِلّت کا سامنا کرنا پڑا۔ اِسی لئے میں اِس جنوری ۶۹ء کے الیکشن میں ہاتھ بٹانا نہیں چاہتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
ج۔ آپ کا خیال مبارک خیال ہے!
س۔ میرے چھ بچّے بچیاں ہیں۔ میں بیوی کی بدسلوکی کی وجہ سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا کیا مشورہ ہے؟
ج۔ آپ تنہائی میں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں گے تو دل سے آواز آئے گی ———
اُنھیں الزام دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا!

فائزہ بیگم احسنی۔ ارسیکرہ

س۔ چچا جان! مُدّتِ دراز سے میں ’بیسویں صدی‘ کا دلچسپی سے مطالعہ کرتی آئی ہوں۔ لیکن دل کو سیری ہی نہیں ہوتی! ایسا کیوں ہے؟
ج۔ یہ تو آپ کے دل کی بات ہے۔ بہت سے دوسرے لوگ بھی ہم سے یہ پُوچھتے ہیں۔ دوسروں کے دل کی بات بھلا ہم کیسے جان سکتے ہیں۔
س۔ چچا جان! ارمان بھرے آنسو حسرتیں میں ڈھل جائیں تو؟
ج۔ یہ شعر گنگنائیے، اِس حقیقت پر ایمان لائیے ؎

زندگی اُس کو راس آئی ہے
جس نے غم سے حیات پائی ہے

عزیز حسن عزیزؔ تلہری۔ تلہر۔ شاہجہاں پور

س۔ خوشترؔ بھیّا! نفرت کس سے کرنی چاہیئے؟
ج۔ ہر بُرائی سے!
س۔ خوشترؔ بھیّا! آنسو کب بہانا چاہیئے؟
ج۔ مرد کو کبھی آنسو نہ بہانا چاہیئے۔
س۔ خوشترؔ بھیّا! شاعر کو کس کا سہارا ہوتا ہے شراب کا یا عورت کا؟
ج۔ اپنے خیالات و احساسات اور جذبات کا۔

عابد انصاری کلچرم شریف۔ ضلع میدک (آندھرا)

س۔ آپ کے ادارے میں تُلسی داس صاحب کس کا نام ہے؟ جہاں تک میرا خیال ہے یہ آپ ہی کا نام ہوگا۔ کیا یہ دُرست ہے؟
ج۔ یہ ہَوائی کسی احمق نے اُڑائی ہوگی۔ ویسے ہم تُلسی ہی کے داس نہیں، سب کے داس ہیں۔
س۔ راجہ مہدی علی خاں کے انتقال کی تاریخ سے مطلع فرمائیے۔
ج۔ ۲۷ جولائی ۶۶ء
س۔ ایک ایسا شعر سُنائیے جس سے بے خودی کے بجائے بیداری ہو۔
ج۔ ایک ہی کیوں دو شعر سُنئیے ؎

بڑھے جاؤ خلوصِ کار کی سچّی حرارت سے
نِکل آتی ہے جُوئے شیر بھی پتّھر کی فطرت سے
تیرگی اپنے مقدّر کی مِٹانے کے لئے
چھین کر چاند ستاروں سے اُجالا لے لو!

رضیہ قریشی۔ مراد آباد

س۔ بھائی جان! فاؤنٹن پن کس نے اور کب ایجاد کیا؟ میری سہیلی شاہینہ کہتی ہے ــ فاؤنٹن پن کے موجد کا نام مارس ہے۔
ج۔ ٹیلیفون کے موجد کا نام مارس ہے۔ فاؤنٹن پن واٹرمین نے بنایا۔ ۱۸۸۶ء میں۔

محمد ناصر حسین۔ سکیٹہار

س۔ خوشتر صاحب! دُنیا کے کِتنے ممالک میں اُردو اور ہندی بولی جاتی ہے؟
ج۔ تقریباً دُنیا کے سارے مُلکوں میں اُردو بولنے والے ہیں۔ ہندی کی بات ہمیں نہیں معلوم۔
س۔ زیادہ تر ممالک میں سرکاری زبان اُردو ہے یا ہندی؟
ج۔ انگریزی۔ ہندی ہندوستان کے علاوہ اور کہیں بھی سرکاری زبان نہیں ہے۔

نصرت علی انصاری۔ سہسرام

س۔ رقبہ کے اعتبار سے دُنیا کا سب سے بڑا شہر؟
ج۔ لندن ہے۔ اُس کا رقبہ ۷۰۰ میل ہے۔

ایم۔ ایس۔ انصاری۔ گنج ڈونڈوارہ (ایٹہ)

س۔ طبّی اصول سے شادی کے لئے لڑکی کی عمر اور قد لڑکے سے کم ہونا لازمی ہے؟
ج۔ جی ہاں لڑکی کی عمر اور قد لڑکے سے کم ہوا بہتر ہے۔
س۔ زیادہ دولت مند جگہ شادی کرنا کیسا ہے؟
ج۔ اپنے برابر کی حیثیت والے کے یہاں رشتہ کرنا چاہیئے۔

صبیحہ بانو۔ امروہہ

س۔ بھائی جان یہ شعر کس کا ہے؟

پُختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

ج۔ یہ شعر علاّمہ اقبالؔ کا ہے۔

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
طوفان کی کلیاں	″	چار روپے
گدھے کی واپسی	″	تین روپے
الٹا درخت	″	دو روپے پچھتر پیسے
دروازہ	″	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
سسٹر ۵۰	″	تین روپے پچاس پیسے
بقراط	″	دو روپے پچاس پیسے
جی ہاں پڑے ہیں	″	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	″	پانچ روپے
داماد	″	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	″	گیارہ روپے
دودھ کی قیمت	″	تین روپے
خاک پروانہ	″	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	″	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	″	ایک روپیہ پچاس پیسے
سیدہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	″	چار روپے
گرد کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
سنگ وخشت	″	دو روپیہ پچاس پیسے
سونا گاچھی	جمنا داس اختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	″	دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود ہمایوں	چار روپے پچیس پیسے

شکست ظلمت	مخمور جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	″	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	″	ایک روپیہ پچیس پیسے
خوابگاہ میں	″	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	″	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سعید امرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	″	تین روپے
اکبری دروازہ	″	چار روپے
دوشیزۂ روم	″	تین روپے
دیوانہ	″	تین روپے
دو دیوانے	″	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	″	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	″	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	″	تین روپے پچانوے پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	″	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	″	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	″	پانچ روپے
ریحانہ	″	سات روپے

وعدہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچھتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوشش	حضرت جوش ملسیانی	چھ روپے
کفر وایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لنکن نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکنیک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
آواز تو پہچانو	″	تین روپے
چراغوں کا سفر	″	چار روپے پچاس پیسے
انتظار کے قیدی	″	دو روپے
کل کی باتیں	″	پانچ روپے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہار اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفٰے احسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھے نا	ست پرکاش سنگر	دو روپیہ
ابراہیم لنکن	چندر موہن لانبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	جے سی داس صاحب	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
پچیس سال بعد	امرتا پریتم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چاند	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

[redacted]

کرم الٰہی تابش۔ لائل پور

س۔ قرآنِ پاک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ قرآنِ پاک ایمان و ایقان کا سرچشمہ، رشد و ہدایت کا مخزن و منبع ہے۔ مشہور عالم مفکر جرجے بول نے لکھا ہے ــــ "تمام اہلِ علم اس پر متفق ہیں کہ قرآن اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے ایک حیرت انگیز کتاب ہے"۔ ــــ طاس کارلائل نے لکھا ہے ــــ "قرآن نے امن و سکون، اُلفت و محبت کے جذبات کو نشوونما دی۔ بادۂ عیش کے متوالوں کو پرہیزگار بنا دیا"۔

ایم۔ زیڈ۔ رحمان نورپوری کشن گنج۔ پورنیہ

س۔ کیا دُنیا میں دولت ہی سب کچھ ہے؟

ج۔ آج کے دَور میں تو دولت ہی سب کچھ ہے۔

س۔ دُشمن سے انتقام کس طرح لینا چاہیئے؟

ج۔ چین کا چاؤ نہ ہو تو اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

انور عالم۔ بدایوں

س۔ ناگاساکی کہاں ہے؟

ج۔ اب کہاں ہے۔ جاپان کا یہ شہر دوسری جنگِ عظیم میں ایٹم بم سے جل کر راکھ ہوگیا۔

س۔ اخباروں میں 'غازہ' کا نام اکثر آتا ہے۔ غازہ کہاں ہے؟ میرا دوست ریاض کہتا ہے غازہ عرب کا بہت بڑا شہر ہے۔

ج۔ غازہ مصر اور اسرائیل کے درمیان زمین کی ایک پتلی سی دھجّی ہے۔

داؤد خلش۔ بھوپال

س۔ عورت ــــ؟

ج۔ بلزاک نے کہا ہے ــــ "عورت ایک بربط ہے جس کے نغموں کے راز صرف اُسی مرد پر ظاہر ہوتے ہیں جس کی اُنگلیاں اُس کے تاروں پر ماہرانہ انداز میں کھیلنا جانتی ہوں"۔ ــــ گولڈ اسمتھ نے کہا ہے ــــ "کانٹوں سے بھری ہوئی شاخ کو ایک پھول انتہائی خوبصورت بنا دیتا ہے۔ اسی طرح غریب کے دل و گھر کو نیک شعار عورت جنّت بنا دیتی ہے"۔

نوابہ احمد۔ باندا

س۔ چچا جان! اکبر الٰہ آبادی کا ایک شعر سنائیے۔

ج۔ ہوتے اس قدر مہذّب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

س۔ انسان خودکشی کب کرتا ہے؟

ج۔ جب اُس کے ہاتھ سے حوصلہ کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔

ایم عبدالواحد۔ بی۔ آر۔ بی کالج۔ رائچور

س۔ "یاد" اور "انتظار" پر مختلف شعراء کے شعر بھیجوں تو آپ "بیسویں صدی" میں شائع کریں گے؟

ج۔ اچھے اشعار ہوں گے تو یقیناً "بیسویں صدی" میں جگہ پائیں گے۔

س۔ علّامہ اقبال کا کوئی حسین شعر سنائیے۔

ج۔ علّامہ اقبال کے سارے اشعار خوبصورت ہیں۔ ایک شعر سُنیے ــ

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

نکہت جمیل۔ بدایوں

س۔ بھائی جان! آپ کی نظر میں زندگی کیا ہے؟

ج۔ عمرِ انساں ایک رخشاں جام ہے
زندگی رخشندگی کا نام ہے

نیلو عزیز آرزو۔ علی گڑھ

س۔ چچا جان! کیا عورت کی زندگی شادی کے بغیر نہیں گزر سکتی؟

ج۔ عورت ہو یا مرد شادی کے بغیر زندگی اچھی نہیں گزر سکتی۔ حضرت سرورِ کائنات کا ارشاد ہے جس نے نکاح کیا اپنا آدھا دین محفوظ کر لیا۔ باقی کے لئے خوف و تقویٰ اختیار کرے۔

س۔ انتظار کس حد تک کیا جانا چاہیئے؟

ج۔ جب تک تمنا ساتھ دے۔ جب تک ضروری ہو۔

س۔ حافظ شیرازی کا کوئی شعر سُنائیے۔

ج۔ بانو! آج عجب نہیں اُردو بولنے والے گردن زدنی قرار دے دیئے جائیں! اور آپ حافظ شیرازی کا فارسی شعر سُننا چاہتی ہیں!؟

ریاض احمد نہریار سرائے۔ دربھنگہ

س۔ یہ شعر کس کا ہے ــ

یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اُردو ہندی ہے یا قُربانی یا جھٹکا ہے

ج۔ یہ شعر علّامہ اقبال کا ہے۔

جمیل الدّین قریشی الٰہ آبادی

س۔ پاکستان کے صدر محمد ایوب خاں نے کہاں تعلیم حاصل کی ہے؟

ج۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ رائل ملٹری کالج میں۔


دلکش پھولوں والے لباس سے
اپنے گلشنِ حسن کو
آراستہ کیجئے!
اپنے کرتے یا مینی ڈریس باسمے ڈائینگ کے
پھولوں والے "ٹیرین" / کاٹن کے بنایئے
اور پھر دیکھئے آپکے گلشنِ حسن میں کیسی
بہار آجاتی ہے۔ اکھڑا کیا ہے شگفتہ پھول،
بکھریاں نام کو نہیں!
کوئی دوسرے کپڑے بھی چاہئیں آپ کو؟
تو لیجئے: دلفریب پیسلی، پاپ پرنٹ،
لان اور پاپلن۔ آج ہی تشریف لائیے
اور ملاحظہ فرمایئے!
باسمے ڈائینگ

شاہ ساجد صدیقی۔ تاڑین۔ حیدر آباد

س۔ شباب و جوانی میں انسان بھٹک کیوں جاتا ہے؟

ج۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے اور اندھی بھی!

س۔ بھائی جان! غالب کا کوئی اچھا سا شعر سنائیے۔

ج۔ رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

س۔ صحت کا راز؟

ج۔ مضرِ صحت چیزوں سے اجتناب چاہے وہ عملی ہو یا خیالی!

شوکت علی منصوری۔ بھوپال

س۔ حضرت اکبر الہ آبادی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

خورشید احمد وارثی۔ سکھر (پاکستان)

س۔ تعلیم نسواں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ہم تعلیمِ نسواں کے حامی ہیں لیکن ایسی تعلیم کے مخالف ہیں جو عورتوں کو چراغِ خانہ سے شمعِ محفل بنا دے۔

س۔ بھارت کی قومی زبان کیا ہے؟

ج۔ ہندی! لیکن ہندوستان کی اکثریت اپنے گھروں میں اردو بولتی ہے۔ فلموں اور ریڈیو کے اردو نغموں کی دلدادہ ہے!

محمد اصغر علی۔ دھنباد

س۔ دولت کو دیکھ کر انسان کی نیت کیوں ڈگمگانے لگتی ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ دولت میں بلا کی کشش ہوتی ہے۔

س۔ دوست کی دوستی پر شک ہونے لگے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اگر وہ چین کا چاؤ نہ ہو تو پھر بھی اُسے دشمن نہ سمجھئے۔ ہاں اُس سے محتاط رہئے۔

انعام نبی صدیقی۔ گریڈیہہ۔ ہزاری باغ

س۔ کوئی خوبصورت قطعہ سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

چاندنی رات کی خوشی میں
یوں کوئی مہ جمال آتا ہے
ایک شاعر کے ذہن میں جیسے
خوبصورت خیال آتا ہے

س۔ شاعری، سائنس اور فلسفہ میں کون بالاتر ہے؟

ج۔ اپنی اپنی جگہ سب بالاتر ہیں۔

مُسلم آزاد۔ رمضان پور

س۔ ہندوستان میں جمہوریت کی بُنیاد روز بروز کمزور کیوں ہوتی جا رہی ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ ہندوستان کے قومی رہنماؤں میں روز بروز خلوص کم ہوتا جا رہا ہے۔ خود غرضی بڑھتی جا رہی ہے۔

س۔ کسی کو پیار نہ ملے تو؟

ج۔ وہ سب سے پیار کرنے لگے۔ سب اُسے پیار کرنے لگیں گے۔

س۔ جس کی دُنیا اُجڑ جائے؟

ج۔ اُسے نئی دُنیا کی بُنیاد ڈالنی چاہئے۔

سیّد جمشید حسن۔ بھاگل پور

س۔ فرض اور پیٹ میں کشمکش ہو تو؟

ج۔ ہر حال میں فرض کو ترجیح دینا چاہئے۔

س۔ 'بیسویں صدی' پڑھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے آخر کیوں؟

ج۔ ہزاروں لوگ ہم سے یہ سوال کرتے ہیں — خود ستائی کبھی ہمارا شیوہ نہیں رہا۔ ورنہ ہم کہتے — 'بیسویں صدی' اِسی قابل ہے۔

محمد عبدالرشید افسر بابا پوری۔ نظام آباد۔ دکن

س۔ وہ کون سی شے ہے جو انسان کے مرنے کے بعد بھی زندہ اور باقی رہ جاتی ہے؟

ج۔ انسان کی نیکی۔

س۔ دوستی کا حق کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے؟

ج۔ جس طرح چین کے چاؤ نے کیا۔

س۔ محبت کا دوسرا نام؟

ج۔ تباہی و بربادی جنون و دیوانگی!

ہلال عباسی۔ شیخوپورہ (پاکستان)

س۔ کیا بُرے آدمی کو اچھا ماحول اچھا انسان بنا سکتا ہے؟

ج۔ یقیناً اچھا انسان بنا سکتا ہے۔

س۔ اِس دَور کا انسان دولت کا پجاری کیوں ہے؟

ج۔ انسان ہر دَور میں دولت کا پجاری رہا ہے۔

س۔ کیا 'بیسویں صدی' لاہور سے آپ کا کوئی تعلق ہے؟

ج۔ جی نہیں۔

بلونت سنگھ۔ جالندھر

س۔ پاکستان میں ہندوؤں کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ تقریباً اسّی بیاسی لاکھ۔

غلام محمد انصاری۔ مراد آباد

س۔ ہمارے صدرِ محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدارت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے کس عہدے پر تھے؟

ج۔ نائب صدر تھے، اور اس سے پہلے صوبہ بہار کے گورنر تھے۔

س۔ آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کہاں سے کیا ہے؟

ج۔ جرمنی سے۔

سیّد عالم آرزو۔ داؤد نگر۔ گیا

س۔ بھیّا! آپ بتا سکتے ہیں پاکستان میں کتنے مسلمان کتنے ہندو ہیں؟

ج۔ دس کروڑ مسلمان ہیں۔ ہندوؤں کی تعداد تقریباً اسّی بیاسی لاکھ ہے۔

سیّد صغیر احمد۔ بیدر

س۔ شاعری سے انسانی زندگی میں کیا فائدہ ہے؟

ج۔ یہ کسی ایسے شاعر سے پوچھیے جو دوسروں کی غزلوں میں اپنا تخلّص جوڑ کر کسی عرق ریزی اور دریافت کے بغیر شاعر بن جاتے ہیں۔

ابرار عالم۔ کلکتہ

س۔ جب زندگی وبالِ جان بن جائے؟

ج۔ زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ زندگی میں حُسن پیدا کرنے کے لئے سعی کرنی چاہیے۔

س۔ کیا انسان خاموش رہنے سے "بور" کہلاتا ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ بے وقوف ایسے انسان کو "بور" کہتے ہیں۔

س۔ بیوی کیسے شوہر سے خوش رہتی ہے؟

ج۔ جو اُس کی ہر جا و بے جا فرمائش پوری کرے۔

محمد رفیع انصاری بھیونڈی

س۔ بھیّا! علّامہ اقبال فرماتے ہیں ——

اِس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اِس سے ہوئے خُوئے غلامی میں عوام
ہیں ازل سے اِن غریبوں کے مقدر میں سجود
اُن کی فطرت کا تقاضہ ہے نمازِ بے قیام

اِن اشعار کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ اِن اشعار میں شاعرِ مشرق نے نہایت موثّر انداز میں روشن حقیقت پیش فرمائی ہے۔

س۔ موجودہ دَور کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سیاست کے معنی بتلایئے۔

ج۔ خوبصورت فریب!

س۔ براہ کرم شعر پُورا کیجیے ؎

جِن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

ج۔ آگ دی صیّاد نے جب آشیانے کو مرے
جِن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

ثروت اعظمی۔ اعظم گڑھ

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں، علّامہ اقبال کا انتقال کب ہوا؟

ج۔ ۱۹۳۸ء میں۔

کوثر خاتون سہاروی بمبئی (ایرلا)

س۔ خوشتر بھیّا! آپ عورتوں کو قید و بند کی زندگی گزارنے کا مشورہ کیوں دیتے ہیں؟

ج۔ بانو! آپ ضروری پردہ کو قید و بند کیوں سمجھتی ہیں؟ بے پردگی اور آزادہ روی کی بُرائیاں آپ سے چھپی ہیں؟

س۔ اگر گھر جیل ہو اور خاوند جیلر ہو۔ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔

ج۔ سلیقہ مندی سے کام لے کر گھر کو ایسا بنا دینا چاہیے کہ گھر جیل نہ رہے، شوہر جیلر رہتے ہوئے بھی جیلر نہ رہے۔

طلعت یٰسین بھوپال

س۔ کوئی خوبصورت شعر سنایئے۔

ج۔ سُنئے ؎

چہرے کے پھول، زُلف کے سائے، بدن کی آنچ
کیا کیا سمیٹ لائی تری یاد کی ہوا

الطاف احمد نظامی۔ امروہہ

س۔ اسرائیل میں کتنے یہودی ہیں؟

ج۔ ۲۰ لاکھ۔

س۔ پاکستان میں ہندوؤں کی تعداد کیا ہوگی؟

ج۔ تقریباً اسّی بیاسی لاکھ۔

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر: خوشتر گرامی ——— مطبوعہ دلّی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائیٹل دلّی تصاویر: براٹش پریس صدر بازار دہلی ——— [illegible]

ڈکشنریاں صنعت و حرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

کتاب	مصنف	قیمت
بیسویں صدی کی کشیدہ کاری	کرشنا کماری ایم اے	چار روپے
زینت کشیدہ کاری	زینت کوثر	پانچ روپے ۵۰ پیسے
شمع 〃 〃	〃	چار روپے ۵۰ پیسے
رشیدکی 〃 〃	رشیدہ خاتون	تین روپے ۵۰ پیسے
دلہن 〃 〃	زینب انور	دو روپے ۵۰ پیسے
حسین 〃 〃	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
شبنم 〃 〃	قدسیہ انور	ایک روپیہ
قدسیہ 〃 〃	〃	ایک روپیہ
کامیاب درزی خانہ	زینب انور	دو روپے
تکیے کے اشعار	مشرف بانو غفران	دو روپے
زینت کروشیا ڈیزائن بک	زینت کوثر	پانچ روپے

انگریزی اُردو میں اپنی قابلیت بڑھایئے

اُردو انگریزی کی کامیاب ترین ڈکشنریاں

کتاب	مصنف	قیمت
جیمز پاکٹ ڈکشنری	انگریزی سے اُردو ہندی	چار روپے
مصباح اللغات		بیس روپے
اردو ہندی ڈکشنری		بیس روپے
کریم اللغات	مولوی کریم الدین	دو روپے ۲۵ پیسے
اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری	عبدالحق	بیس روپے
اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری	〃	بارہ روپے
لغات کشوری	نول کشور	نو روپے
جامع اللغات		دو روپے ۵۰ پیسے
جیمز آکسفورڈ ڈکشنری	انگریزی سے اُردو ہندی	دس روپے
اُردو ادبی لغت		آٹھ روپے
فیروز اللغات جدید کلاں		چوبیس روپے
فرہنگ عامرہ		سات روپے ۵۰ پیسے
فیروز اللغات عکسی خورد		چھ روپے ۵۰ پیسے

صنعت و حرفت

کتاب	مصنف	قیمت
الیکٹریکل انجینئرنگ بک	نریندر ناتھ	بارہ روپے
الیکٹرک گائیڈ (نیا ایڈیشن)	〃	آٹھ روپے
الیکٹرک وائرنگ	〃	چار روپے ۵۰ پیسے
موٹر کار وائرنگ	〃	چار روپے ۵۰ پیسے
بوٹ پالش سازی	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک لائٹنگ	〃	چھ روپے
بغیر بجلی کا ریڈیو		ایک روپیہ
تجارتی مرغی خانہ		دو روپے
آئل و گیس انجن گائیڈ	〃	دس روپے
آئل انجن گائیڈ	〃	چھ روپے
رہنمائے بجلی	〃	تین روپے ۵۰ پیسے
وائرلیس ریڈیو گائیڈ	〃	چھ روپے
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو میکینک)	〃	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
ٹانکا لگانے کا ہنر	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
چھوٹے ڈائنمو الٹرنیٹر بنانا	〃	تین روپے ۵۰ پیسے
پریکٹیکل آرمیچر وائنڈنگ (اے سی ڈی سی)		سات روپے ۵۰ پیسے
ریفریجریٹر گائڈ	نریندر ناتھ	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
ریڈیو ریسور	〃	تین روپے
ٹرانسفارمر گائڈ	〃	چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک موٹرز	〃	آٹھ روپے
خراد مشین اینڈ ٹرنر گائڈ	〃	تین روپے
ورکشاپ گائڈ (فٹر ٹریننگ)	〃	تین روپے
خراد اور ورکشاپ گیان	〃	چھ روپے
پریکٹیکل گھڑی سازی	رام اوتار	چار روپے ۵۰ پیسے
سائیکل ریپیرنگ	〃	دو روپے ۵۰ پیسے

خانہ داری

کتاب	مصنف	قیمت
عثمانی دسترخوان	آمنہ نازلی	تین روپے
رضیہ کا دسترخوان	رضیہ سلطانہ تمین	دو روپے ۵۰ پیسے
رنگ سازی	پروفیسر نریندر ناتھ	دو روپے ۵۰ پیسے
پلاسٹک گائڈ	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
اپٹوڈیٹ بوٹ پالش سازی	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
اپٹوڈیٹ انک ماسٹر / روشنائیاں بنانا	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
کنفیکشنری (انگریزی مٹھائیاں بنانا)	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
ہیر آئل (خوشبودار تیل)	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
بیکری بہار (بسکٹ بن ڈبل روٹی کیک)	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
پینٹری کا کام	〃	چار روپے ۵۰ پیسے
فن مصوری (اچھا کاری)	〃	چار روپے ۵۰ پیسے
پرفیومری ماسٹر	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
وارنش ماسٹر (وارنش سازی)	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
آتش بازی کا کاروبار	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
اچار، مربہ، چٹنی	جمنی رانی گپتا	دو روپے ۵۰ پیسے
حلوائی ماسٹر	چندر بھان بھگل	دو روپے ۵۰ پیسے
تمباکو کا کاروبار (تمباکو کی دکان)	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
پان کی دکان	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
فاؤنٹین پین بلڈ ماسٹر	〃	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
انڈو یورپین کُکری بک / دیسی انگریزی کھانے	کالی چرن	چار روپے
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
موم بتی کا کاروبار	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
ڈیری فارمنگ	〃	چار روپے

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج ، دھلی نمبر ۶

BISWIN SADI
33rd. YEARS OF PUBLICATION
Telephones Office. 271637 Residence.619

RADIUM TONIC PILLS

نیا خون ــــ نئی طاقت

کمزوری کا زبردست علاج

ریڈیم ٹانک پلز



نیا خون بکثرت پیدا کر کے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں، وزن اور خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے کھوئی ہوئی طاقت اور صحت واپس لانے کیلئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی نئی طاقت حاصل ہوتی ہے تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز کے علاج سے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل علاج صرف چھ روپے محصولڈاک علاوہ۔

: ایجنٹ
...یل پرائیویٹ لمیٹڈ
...ٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

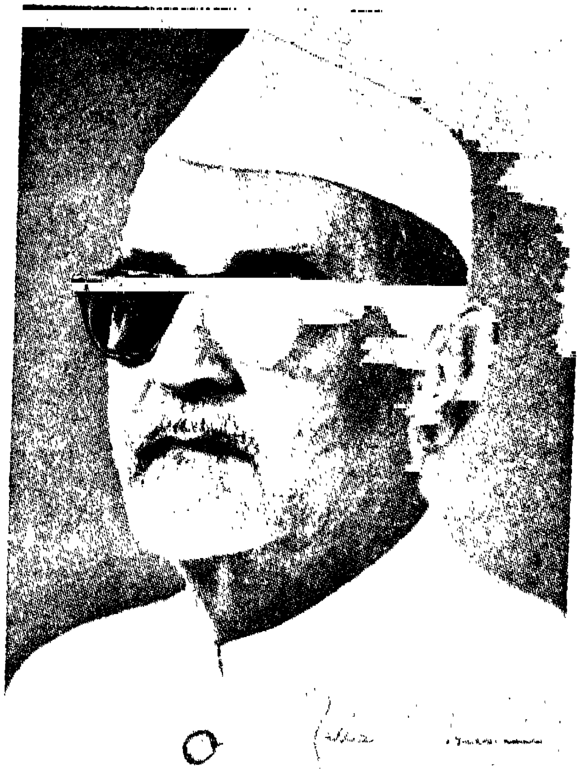
...: ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵ دہلی

بیسویں صدی دہلی

افسانہ نمبر



لائی تا دسمبر ۱۹۶۹



قطعۂ تاریخِ وفاتِ عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم ومغفور

ہند کی بزمِ سیاست پر اندھیرا چھا گیا — اُٹھ گئے روشن دل و روشن بیاں ذاکر حسین
رہ نما جتنے بھی تھے اب ہیں قضا کی گود میں — ایک ہی باقی تھے میرِ کارواں ذاکر حسین
ڈھونڈتا پھرتا ہے کیوں اُس کو وقارِ زندگی — اب کہاں دُنیا میں وہ عظمت نشاں ذاکر حسین
یہ فنا سامانیاں بھی ہیں بقا سامانیاں — اپنے مدفن کے ہیں اب رُوح و رواں ذاکر حسین
الفراق اے افتخارِ مسندِ جمہوریت — الوداع اے نازشِ ہندوستاں ذاکر حسین

عیسوی میں جوشؔ میں نے لکھ دیا یہ سالِ غم
جا بسے مُلکِ عدم میں نکتہ داں ذاکر حسین
۱۹۶۹ء

جوشؔ ملسیانی

Shamim
4666, Hauz Qazi Delhi



عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی میت کے قریب اُن کے پرسنل اسسٹنٹ جناب محمد اکرم
جناب فخر الدین علی احمد وزیرِ صنعت و کمپنی امور اور جناب یونس سلیم نائب وزیر [illegible]
غمزدہ کھڑے ہیں ——— رنج و غم کے تاثرات اُن کے پژمردہ چہروں سے نمایاں ہیں ؏

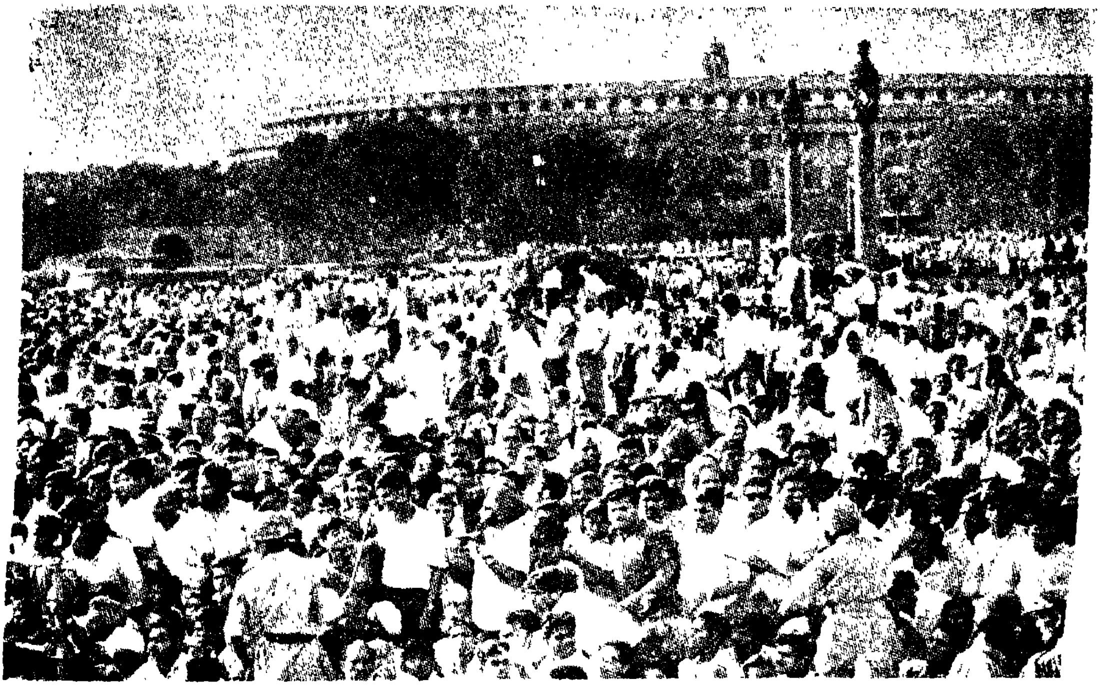
آہ، مرگِ ڈاکٹر ذاکر حسین

دِل مِرا رہ رہ کے تڑپانے لگی

آج تک تو آدمی مرتے رہے

اب فرشتوں کو بھی موت آنے لگی

لاکھوں کروڑوں عوام کے محبوب، صدرِ جمہوریۂ ہند کا آخری سفر



...روں کا بے پناہ ہجوم ——— ہر آنکھ اشکبار ——— ہر دل سوگوار۔ ہر مذہب و ملت، ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں نے اپنے محبوب صدر کو پُرنم آنکھوں سے رخصت کیا۔

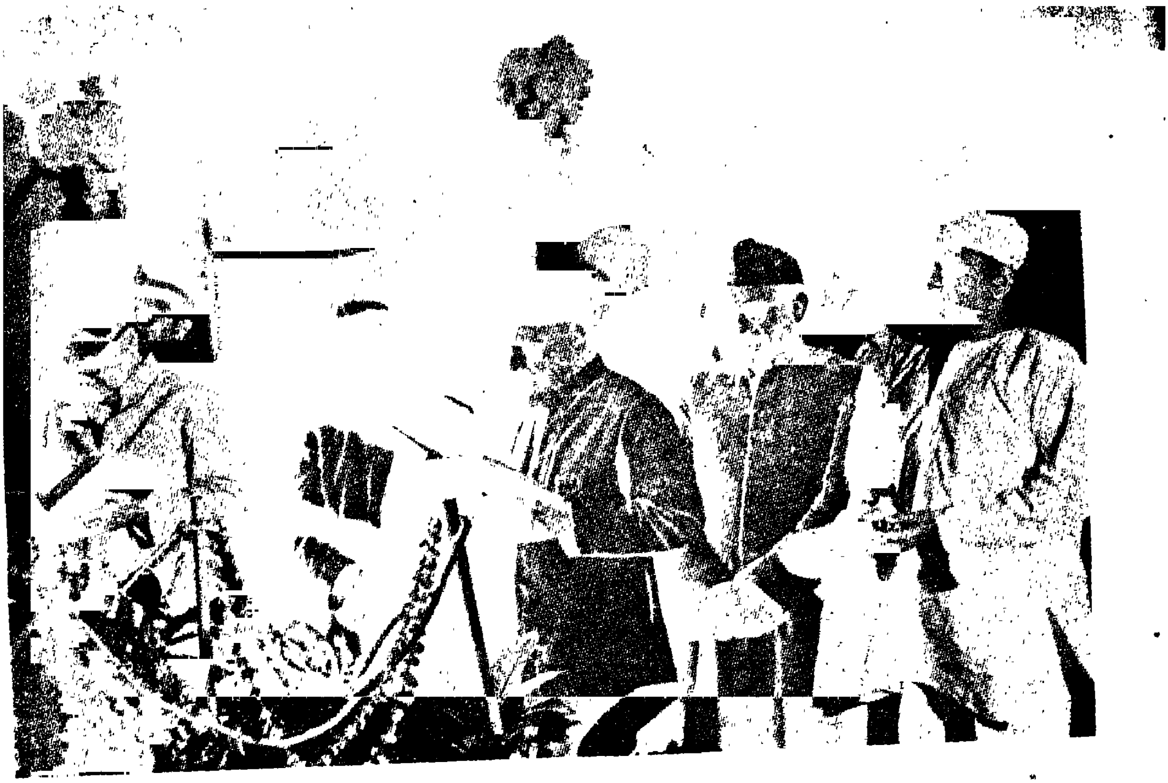
روتے ہیں اس کو حاکم و محکوم
شہر اور شہریار روتے ہیں
دیکھتا کاش، اس کے شیدائی
کس طرح زار زار روتے ہیں



روسی وزیرِاعظم کوسی گن، صدرِ جمہوریۂ ہند کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے بعد، جنازے کے جلوس میں شریک ہوئے اور محترمہ بیگم صاحبہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم و مغفور سے سر جھکائے، روسی عوام اور اپنی حکومت کی طرف سے اظہارِ تعزیت کیا ؛



اَن گنت آنکھوں نے آنسو بہائے اور لوگ پھُوٹ پھُوٹ کر روئے ——— غمگساروں کے دلوں کا غم اُن کے آنسوؤں سے رواں ہے ؛



قرآنِ پاک، گُورو گرنتھ صاحب، انجیلِ مقدّس، بھگوت گیتا کے پاٹھ کے ساتھ ہر
مذہب و مِلّت کے لوگوں نے صدرِ مرحوم کی مغفرت کے لئے دعائیں مانگیں ؏





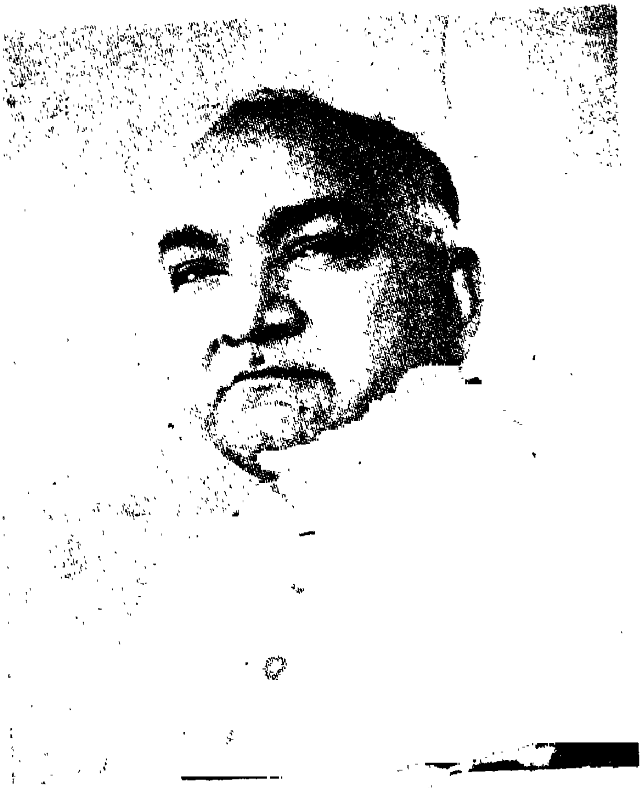


صدرِ جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے انتقال سے ۲۳ یوم پہلے نامور شاعر و ادیب حضرتِ ساغر نظامی کو اُن کی شاعرانہ عظمت اور ادبی خدمات کے پیشِ نظر "پدم بھوشن" کا اعزاز عطا فرمایا ۔



صدرِ جمہوریہ ہند کا آسام اور ناگالینڈ کا آخری سفر، جسے انھوں نے ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود اپنا فرضِ منصبی پورا کرنے کے لئے کیا ۔

★ میں ہوں عرش ملسیانی



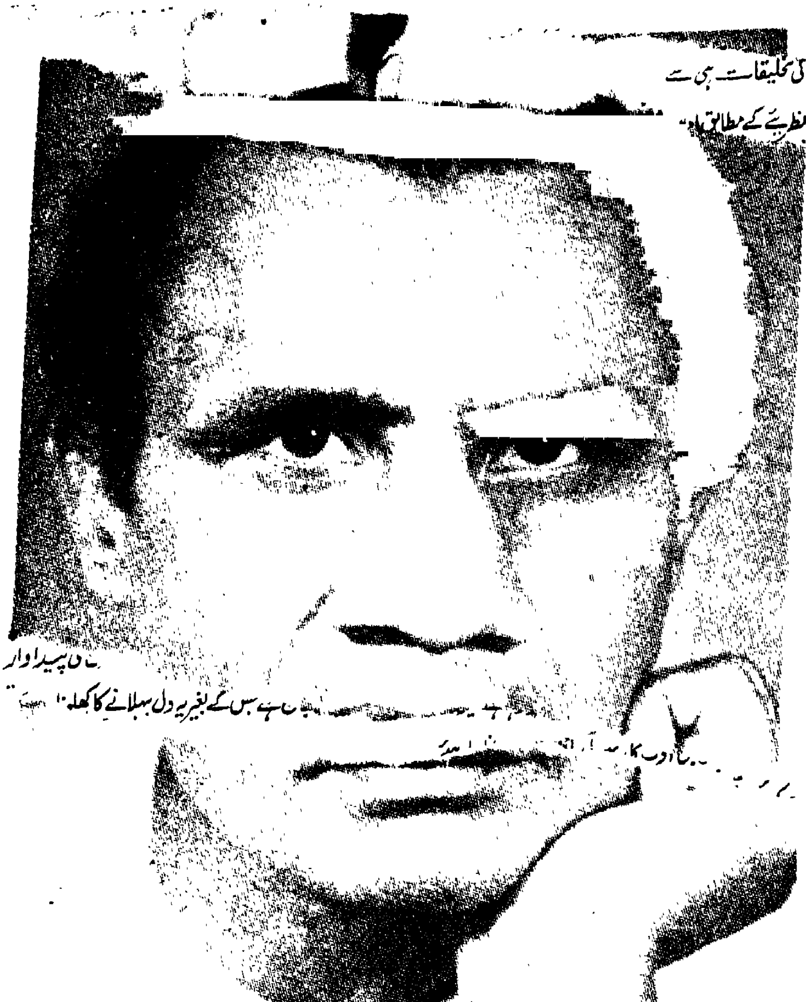
میں کیا اور میرے حالات کیا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا واقعہ یہی ہے کہ مجھے ابوالفصاحت جنابِ جوش ملسیانی کی فرزندی کا شرف حاصل ہے! اور سب سے بُرا واقعہ یہ ہے کہ خوشتر گرامی ایسے جلیل القدر انسان کے دامِ رفاقت میں گرفتار ہوں۔ شطرنج اور تاش کے علاوہ نظم و نثر بھی میرے مشغلے ہیں۔ اُنتالیس سال سرکارِ دولت مدار کا غلام رہا۔ ڈیڑھ سال کے قریب ہوا رہائی نصیب ہوئی۔ اس کا پہلا اثر ایک نظم تھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
جب نہ کچھ ہو سکے وزیر ہوئے

اوورسیر تھا، مدرّس رہا۔ دفتر کا کلرک بنا، نائب مُدیر اور مُدیر ہوا۔ بیس سال کے قریب "آج کل" سے وابستہ رہا۔ 'ہفت رنگ'، 'چنگ و آہنگ'، 'شرارِ سنگ' مجموعہ ہائے سخن شائع ہو چکے ہیں۔ 'آہنگِ حجاز' نعتوں کا مجموعہ 'پوسٹ مارٹم' نیم مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اور 'نغمۂ سرمد' سرمد کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ شائع ہو چکے ہیں۔ ہندی میں تین کتابیں مقبول ہوئی ہیں۔ 'غالب بہ حیثیت شاعر اور انسان' 'مزاحیہ شاعری کا انتخاب' 'محاورے اور کہاوتیں'۔ نصف صدی کا دَورِ ادب سامنے ہے۔ کن کن سے ملا، کس کس کو سُنا اور کس کس سے دادِ سخن لی۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ 'بیسویں صدی' کا مالک و مُدیر بڑا ظالم و جابر انسان ہے۔ پاکستان بھی قبول ہوا۔ لیکن اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ دلّی میں آکر بھی تازہ ترین کلام اُڑا لے جاتا ہے۔ خدا اس سے سمجھے! ؟

عرش ملسیانی

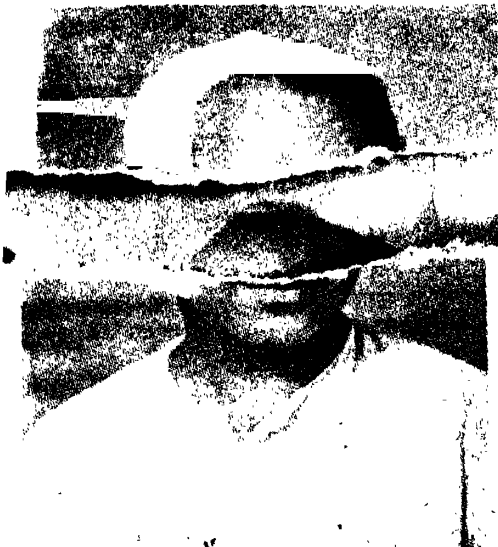
★ میں ہوں نریش کمار شاد



بلکہ میں ہوں نریش کمار

بندہ پرور! ادیب کا تعارف تو اس کی تخلیقات ہی سے ہو جانا چاہئے ادب اور فن کے متعلق میرے نظریے کے مطابق وقت ... بھی ہے اور ...

بھی۔ نریش ایک سرکاری دفتر میں ایل۔ ڈی۔ سی ہے اور خدمتِ سرکار بجالانے کے علاوہ ہر وقت شاد کی نازبرداری کرنا بھی اپنا فرضِ منصبی خیال کرتا ہے۔ شاد، نریش سے دس بارہ سال چھوٹا ہے اور جب سے پیدا ہوا ہے اُس نے نریش کے لئے اُلجھنیں ہی پیدا کی ہیں۔ اگر وہ نریش کے رستے میں حائل نہ ہوتا تو شاید نریش بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح پندرہ بیس برس کی نوکری کے بعد آج دفتر میں کوئی اسسٹنٹ یا سیکشن آفیسر ہوتا۔ بہرکیف آزاد طبع اور لااُبالی شاد ایک نامور شاعر اور ادیب ہے۔ اِتنے سال کی اُس کی عمر نہیں جتنی نظم و نثر کی کتابیں تصنیف کر چُکا ہے۔ مُلک کے کونے کونے میں اُس کے جاننے اور چاہنے والے موجود ہیں۔ لیکن نریش کا ہو کر بھی وہ نریش سے زیادہ اَوروں کا ہے۔ دوسروں کی چھوٹی چھوٹی مصیبتیں اُسے آبدیدہ کر دیتی ہیں۔ مگر نریش کی بپتا پر اُس کا دل نہیں پسیجتا۔ بایں ہمہ نریش کو شاد اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے اور وہ یہ سوچ کر کلرکی کی چکّی پیسے جا رہا ہے اور اپنے افلاس کا رونا نہیں روتا کہ اُس کی سیپی میں شاد کا جو موتی ہے وہ جھوٹا نہیں سچّا ہے۔



۷

★ میں ہوں قتیل شفائی

...یا اور میرے حالات کیا میری زندگی

...

...ن ایسی سوا ایسی ایسی تارنِ پیپہ...

...ہری پور سے خاک میری اُڑ کر لاہور تک آئی

کھاتا پیتا، بھرا پُرا اِک گھر تھا مسکن میرا

ماں کی ممتا، باپ کی شفقت جھولیاں بھر بھر پائی

بچپن بے فکری میں گذرا لیکن اِس سے آگے؟

لمبی چوڑی اِک دنیا تھی اور میری تنہائی

کٹ گیا وہ اِک پیڑ کہ دل کا چین تھا جس کا سایا
یہی وہ غم تھا جس نے میری سوچ کو ابڑ لگائی

میں نے سوچا کل تھا جیسا آج بھی ہوں میں ویسا
کیوں اپنوں بیگانوں نے پھر مجھ سے آنکھ چرائی

لوگ سجا لیتے ہیں کیوں اِک چہرے پر کئی چہرے
وقت پڑے تو بن جاتی ہے کیوں دنیا ہرجائی

مر ہوئے جب اپنی ذات کے رستے کائنات تک پہنچا
تب جا کر یہ بھید کھلا، یہ بات سمجھ میں آئی

کچھ بھی نہیں انسان کی قیمت جب تک جیب نہ چھنکے
یا گنتی رہتی ہے پیسہ پیسہ، پائی پائی

رنگ رنگ میں بانٹ دیا انسان کو اِس دنیا نے
جما رنگ انسان کی عزت، اُڑا رنگ رسوائی

سرمائے کے اِس چکر میں چکرایا فن میرا
میرے فن نے مجھ کو میرے فرض کی یاد دلائی

لے کر سارے رنگ بنا دی ایک دھنک پھر میں نے
ایک نئے انسان کی صورت میرے سامنے آئی

آج وہی انسان بنا ہے موضوعِ فن میرا
جس کے رشتے، باپ، بہن، ماں، بیوی، بچے، بھائی

آج وہی انسان دھڑکتا ہے میرے شعروں میں
جس کے پیار نے بخشی میری سوچ کو یہ گہرائی

آج وہی انسان مجھے کہتا ہے اپنا شاعر
اپنے فن کی داد اُسی انسان سے میں نے پائی

دیس دیس اب میرے فن سے پیار کیا جاتا ہے

میں ہوں اِک خوش قسمت شاعر میں ہوں قتیل شفائی

قتیل شفائی

لاہور



★ میں ہوں م.ک. مہتاب ـــــ

آپ کا ارشاد ہے اپنا تعارف کرائیے۔ یعنی اپنے ہاتھوں اپنے چھلکے اُتاریے!

بندہ پرور! ادیب کا تعارف تو اُس کی تخلیقات ہی سے ہو جانا چاہئے۔ ادب اور فن کے متعلق میرے نظریئے کے مطابق ادیب ایک آنسو ہے جو وقت کی آنکھ سے ٹپک کر صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتا ہے۔ وہ ایک آنکھ ہے جو اُس وقت بھی کھلی رہتی ہے جب دوسری آنکھیں ریشمی پلکوں کے پردوں میں محوِ خواب ہوتی ہیں۔ ادیب ایک آئینہ ہے جس میں زمانے اور ماحول کا عکس نظر آتا رہتا ہے۔ ہاں بعض اوقات اُس کا قلم اُس خیالی دُنیا کی تصویریں بھی بناتا رہتا ہے جیسی دُنیا وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن ادیب صرف ایک کیمرہ نہیں ایک نباض ہے جو زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے، معاشرے کے دل کی دھڑکنوں کو گنتا ہے اور خون کی ہر لہر کے جوار بھاٹے کو محسوس کرکے اپنے پڑھنے والوں کو اُس کا احساس کراتا ہے۔ جہاں کسی بگاڑ کا اندیشہ ہوتا ہے وہ اُس کی طرف اشارہ ضرور کر دیتا ہے۔ لیکن وہ کوئی پیامبر یا معالج نہیں۔ اُس کا دائرۂ کار اصلاح کاروں سے قطعاً الگ ہے۔ اگر وہ حالات کی رفتار ... ہی کرے تو اُس کے وجود کا مقصد پُورا ہو جاتا ہے۔ ادیب اپنے عہد اور ماحول کی پیداوار ہے۔ اِس لئے اگر اُس کی تخلیقات مقصدیت کے عنصر سے خالی ہیں تو وہ اپنا فرض ادا نہیں کر رہا ہے۔ کیونکہ مقصدیت ہی ادب کی جان ہے جس کے بغیر یہ دل بہلانے کا کھلونا ہو جاتا ہے۔ مجھے رُومانیت سے لگاؤ ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بھی ادب کا یہ پہلو ہاتھ سے نہ جانا چاہئے۔

جہاں ایک عام آدمی کسی خیال یا واقعہ سے کوئی تاثر نہیں لیتا وہاں ادیب کا ذہن معمولی سے معمولی لہر کا شدید اور دیرپا اثر قبول کرتا ہے اور اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی اِس شدّت کا اُسی طرح احساس کرا سکے جیسے اُس نے خود محسوس کیا کیونکہ بار احساس کی یہ شدّت بے چینی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ بے چینی اُس وقت تک بنی رہتی ہے جب تک قلم اِس دباؤ کو ہلکا نہیں کر دیتا۔ جو تحریر جتنی دُرستی اور صحت سے اِس احساس کو اپنے پڑھنے والوں تک منتقل کر سکے وہ اُتنا ہی اعلیٰ ادب کہلاتی ہے۔ ورنہ یہ خالی تحریر ہوتی ہے جسے آپ کوئی مقام دیں یا نہ دیں یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔

یہی کوئی چالیس سے ایک دو برس اوپر کی بات ہے مغربی پاکستان کے خوبصورت شہر لائل پور میں ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھلی تھی۔ وہیں سناتن دھرم سکول اور گورنمنٹ کالج میں تعلیم پائی جو لُدھیانہ اور جالندھر میں آکر مکمل ہوئی۔ لیکن مُلک کی تقسیم سے پاؤں ایسے اُکھڑے کہ بے چینی اور بے قراری طبیعت بن گئی۔ اِس لئے تاجر سے لے کر پروفیسر تک اور دست شناس سے لے کر محکمۂ اطلاعات کی صحافت اور ریڈیو کی ادارت ـــــ نہ جانے کون کون سے بھیس میں تماشائے اہلِ کرم دیکھ رہا ہوں اور خدا جانے آنکھ بند ہونے تک اور کتنے بھیس بنانے ہوں گے۔ اِسی بے قراری نے میرے فنی شعور کو تحریک دی ہے۔ جب پاؤں کو چین آتا ہے تو ذہن آوارہ ہو جاتا ہے۔ اِسی آوارگی کا نتیجہ قریباً دو سو افسانے اور دو تین ناول ہیں لیکن کبھی کسی پبلشر کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا کیونکہ ع

یہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

م.ک. مہتاب

میں ہوں م۔م۔ راجندر



میری پیدائش انبالے میں ایک معزز کائستھ بھٹناگر
ں ہوئی۔ بچپن ہی سے ناول اور کہانیاں پڑھنے کا
ا۔ اگرچہ میرا شمار بڑے ذہین طلباء میں ہوتا تھا
کی طرف طبیعت مائل نہ تھی اور شاید ہی کبھی نصاب
تاب پڑھی ہو۔ اُردو، فارسی اور انگریزی میں
طور پر ہوشیار تھا ——— کالج کی تعلیم
پورتھلہ اور دہلی میں حاصل کی۔ انگریزی ادب
۔اے کیا۔ لیکن کتابیں کالج میں بھی پڑھ کر نہیں
ی ایف۔ اے میں تھا کہ افسانے لکھنے شروع
تھے۔ اُردو کے جن رسائل سے شروع سے گرویدگی
میں "بیسویں صدی" بھی شامل تھا اور خوشتر گرامی
کی تحریریں اُس وقت بھی ذہن میں جادو جگاتی
۔ خوش قسمتی سے کپورتھلے میں وہاں کے چیف منسٹر
احب طرز ادیب خان بہادر میاں عبدالعزیز فلک پیما
م کی سرپرستی نصیب ہوگئی اور اُن کی وساطت سے
کے آغاز ہی میں "ہمایوں" اور "ادبِ لطیف" جیسے
ل میں لکھنے لگا۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے ——— اب
قریباً ڈھائی سو افسانے اور بڑی تعداد میں تنقیدی
ین لکھ چکا ہوں۔ براہِ راست انگریزی میں بھی لکھتا
۔ میرے بہت سے افسانوں کا ترجمہ دوسری زبانوں
ں ہو چکا ہے۔ پانچ کتابوں کا مصنف ہوں، جن میں سے دو ہندی کی ہیں ——— اُردو کے اُن افسانہ نگاروں میں سے جو مجھ سے پہلے سے لکھ رہے ہیں، کرشن چندر،
ندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور خواجہ احمد عباس نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے اور میں نے اُن کے فن سے
ہ کچھ پایا اور سیکھا ہے۔ کرشن چندر تو اِس فن کے جادوگر ہیں اور صدیوں تک اُن جیسا افسانہ نگار پیدا نہ ہوگا۔ اپنے ہم سفروں میں پریم ناتھ در جیسا فن کار نظر نہیں
ب ——— میں افسانے میں اور ہر ادبی صنف میں مقصدیت کا بڑا قائل ہوں۔ کیونکہ اعلیٰ ادب وہی ہے جو سماج کو عروج کی راہ دکھاتا ہے۔ میرے نزدیک افسانے کی
سے بڑی خوبی کرداروں اور واقعات کی اصلیت اور قدرتی پن ہے ——— نجی زندگی بڑی خوشگوار ہے اور اچھی بیوی اور بچے میری تمام مسرتوں کا محور
۔ اِس وقت ڈیفنس منسٹری کی ڈائرکٹریٹ جنرل ری سٹلمنٹ میں ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائرکٹر جنرل کے طور پر کام کر رہا ہوں اور دن رات خدا کا شکر گزار رہتا
، کیونکہ اُس کی رحمت کے بغیر کوئی بھی مسرت اور کامیابی نہیں مل سکتی ہے

★ میں ہوں بشیشر پردیپ



"جی ہاں۔ میں بشیشر پردیپ ہوں"
سائل میکینکس (Soil Mechanics) کی
لیبارٹری میں مٹی کی بنیادی قوت کو جانچنے والی
مشینوں کے درمیان گھرا۔ میں اکثر اپنے پڑھنے
والوں کے سوال کے جواب میں کہتا
ہوں اور جب پوچھنے والا حیرت سے کبھی
میری طرف اور کبھی میرے سائینٹفک ماحول
کی طرف دیکھتا ہے تو مجھے بھی شک ہونے
لگتا ہے کہ میں ہی بشیشر پردیپ ہوں؟!
میرے بہت سے جاننے والے جنھیں ادب
سے کوئی واسطہ نہیں مجھے بشیشر پردیپ کے
نام سے نہیں، بی۔ ایل۔ دھون کے نام سے
جانتے ہیں ــــ میں ۱۹۲۵ء میں چنیوٹ
ضلع جھنگ (مغربی پنجاب) میں پیدا ہوا تھا۔
پنجاب یونیورسٹی سے سائنس میں گریجویٹ
ہونے کے بعد، بنارس یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔
سی ٹیکنیکل کی ڈگری حاصل کی اور اب حال
ہی میں لکھنؤ یونیورسٹی سے سائل کیمسٹری
میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ سائنس ۲۱
اور ادب میری شخصیت کے دو متضاد پہلو ہیں۔ مٹی کی سائنس پر متعدد ریسرچ پیپرز اور آرٹیکل لکھے ہیں جو ۲۲
میں چھپ چکے ہیں ــــ اور ادب میں میرا تعلق افسانہ نگاری سے ہے۔ ۱۹۵۱ء سے افسانے لکھ رہا ہوں اور ۲۷
سے زیادہ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ دو افسانوی مجموعے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ایک سال میں اوسطاً چھ یا ۲۹
لکھ پاتا ہوں۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں ہندوستانی ادیب کی کس مپرسی دیکھتے ہوئے افسانہ نگاری ۴۳
معاش نہ بنا سکا۔ انسانی زندگی کے بنیادی جذبے یا خواہشات بےشک محدود ہیں۔ لیکن اُن کے حصول کے لئے انسان ۴۴
عجیب و غریب راستے اختیار کرتی ہے۔ افسانے میں انسانی فطرت کی اِن کوششوں کی نقاب کشائی، میری نظر میں بہترین تخلیقی عمل
ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ایک ادیب اچھے ادب کی جب ہی تخلیق کرسکتا ہے جب وہ خود بھی اچھا انسان ہو۔ میں ادب میں مقصدیت یا
ادب برائے زندگی کا حامی ہوں۔ اچھا ادب وہی ہے جو زندگی کو حُسن بخشے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے انتہا ترقی اور مصنوعی
زندگی کے اِس دَور میں ادب ہی زندگی کی اچھی قدروں کا ضامن ہو سکتا ہے ؏

بشیشر پردیپ

★ میں ہوں مُختار الرّحمٰن راؔہی ______



شعرگوئی اور افسانہ نگاری میری حیات کا ایک اہم مقصد ہے۔ لیکن کسبِ معاش نے اُس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں دو اور دو چار کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ زندگی کے اِنہی اجتماعِ ضدین، غیر متوازن کیفیتوں، شورشوں کے ساتھ نامساعد حالات اور حوصلہ شکن ہنگاموں نے میرے فطری رُجحانِ افسانہ نگاری کو اُبھارا۔ اور اب آنکھ جو دیکھتی ہے، دل جو محسوس کرتا ہے قلم اُس کا خاکہ کھینچ دیتا ہے۔ میں ہر حقیقت کو افسانہ نگار کی حیثیت سے دیکھتا ہوں اور جو کیفیت اُس عمل سے پیدا ہوتی ہے اُسے اپنے اِرد گرد کے ماحول اور سماج کی امانت سمجھ کر الفاظ کی شکل میں دیانت داری اور خلوصِ دل سے پیش کر دیتا ہوں اور دُنیا اُسے افسانہ سمجھتی ہے۔

کائنات کا گہرائی سے مشاہدہ کرنا میرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ زندگی کو میں نے مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اِس کے مختلف عنوانات قائم کئے ہیں۔ میرے قلم نے کبھی گ کو "امتحان" کہا ہے تو کبھی "پُوجا"، کبھی "اِنٹرویو" اور "غلاف"، کبھی "شریکِ غم"، تو کبھی "سگریٹ کا دُھواں" بن کر تحلیل ہوئے" بن کر اُبھری ہے۔ کبھی میں نے اِس کی "کلپنا" کی ہے تو کبھی اِس کے "آئینہ" میں اپنا اور آج کے بہت سے انسانوں کا چہرہ نظر ہی "نئی تصویر" میں اُمید بن کر اپنے نقوش اُجاگر کئے ہیں ______ آکاش وانی (ریڈیو) نے میرے کئی پلے (Play ڈ) کہانیاں اور ی۔ اخبارات اور ہندی اور اُردو کے مختلف رسائل نے میری غزلیں اور افسانے شائع کئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرتِ خوشتر گرامی اور "بیسویں صدی" ـ۔ جو پذیرائی بخشی اُس نے مجھے خود بین و خود آراء کر دیا اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ ریڈیائی لہروں سے زیادہ وسیع حلقہ "بیسویں صدی" کا ہے جو فن کو ہوا میں تحلیل کرنے کی بجائے نقشِ دوام کا رُوپ دیتا ہے ______ ادب زندگی کی تمام قدروں کا حامل اور ترجمان ہوتا ہے۔ بعض ادیب ادب کو سیاست اور مذہب سے الگ سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ادب اُن کا بھی نقیب ہوتا ہے۔ ہاں زمانے کے بدلتے ہوئے رُجحانات اور وقت کے اہم ترین تقاضوں کو سمجھنا اور اپنانا ایک ادیب کے لئے ناگزیر ہے۔ میں ادب کو آفاقی مانتا ہوں۔ لیکن "مقامی رنگ" (Local Colour) سے مُبرا ہونا بھی پسند نہیں کرتا ؛

مختار الرحمن راہی

بیسویں صدی
دہلی

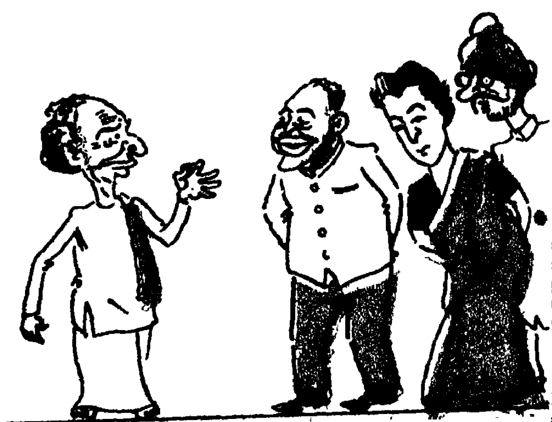
دو روپے

جلد ۳۴ — شمارہ

جولائی ۱۹۶۹ء

تیر و نشتر

خوشتر گرامی





"میرے خلاف الزامات کی مہم جاری ہے" مرارجی ڈیسائی

• "دِلّی میں اندھیر گردی" ایک عنوان ——— جبکہ جن سنگھی دیپک جل رہا ہے۔

• "ہریانہ میں مزید ٹیکس لگیں گے" ایک عنوان ——— مزید وزیر جو بڑھانے ہوئے۔

• "ایسا آدمی صدر بنایا جائے گا جو کانگرس کے اشارے پر نہ چلے" جن سنگھ کے جنرل سکریٹری کا بیان ——— بلکہ جن سنگھ کی کٹھ پتلی ہو۔

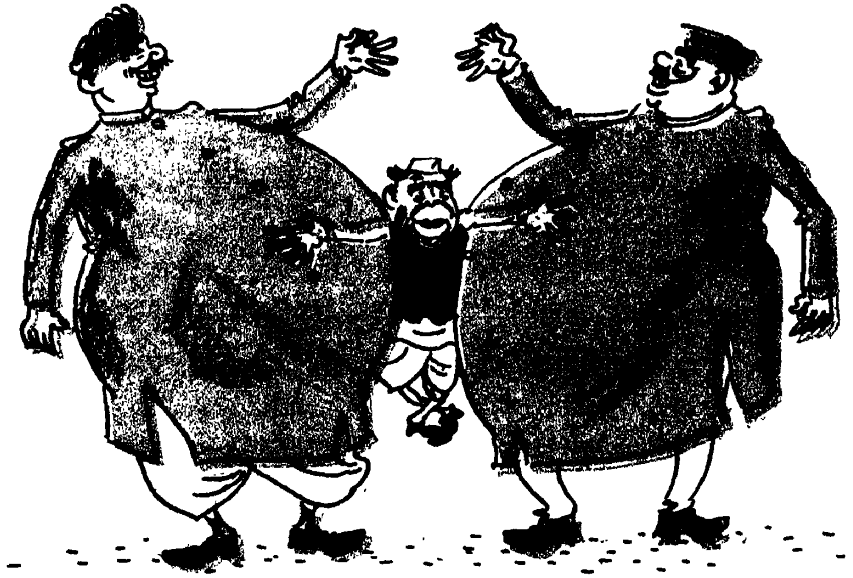
• "اسّی سالہ سادھو صدرِ جمہوریۂ ہند بننے کا خواہاں" ایک خبر ——— وہ صدر بن گیا تو گلزاری لال نندہ کو وزیرِ اعظم مقرر کرے گا۔

• "اتر پردیش اور آندھرا جیسے صوبے توڑ کر چھوٹے چھوٹے صوبے بنائے جائیں" جے پرکاش نراین ——— اور ہر صوبے میں ہوں وزیر پچاس ہزار۔

• "جن سنگھ" ایک عنوان ——— جس کا کوئی دھرم نہ کوئی اصول۔ امرتسر میں کچھ، چنڈی گڑھ میں کچھ، دِلّی میں کچھ اور ہریانہ میں کچھ۔

• "کشمیر کانگرس میں پھوٹ" ——— پھوٹ تو اپنے دیش کا میوہ ہے۔ وہاں بھی پہنچ گیا۔

• "راجیہ سبھا میں زبردست ہنگامہ" ایک خبر ——— پرانی خبریں کیوں روز روز چھاپتے ہو۔



"ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری برداشت نہیں ہوگی" جگجیون رام

"چین کا امریکہ اور روس دونوں کے خلاف اعلانِ جنگ"
——کیا پدّی کیا پدّی کا شوربہ۔

"عورت نے دو بچے مار دئے" یہ ایک خبر——فیملی پلاننگ کی جدید ترین تکنیک۔

"تیہاڑ جیل میں قیدی کی موت" یہ ایک خبر——جیل ہی سے نہیں قیدِ ہستی سے بھی آزاد ہو گیا۔

"روس میں شراب نوشی کے خلاف مہم تیز کر دی گئی" یہ ایک خبر
——اور یہاں ہریانہ وغیرہ میں جہاں پابندی تھی وہاں بھی ختم کر دی گئی۔

"چینیوں نے پھر حملہ کیا تو منہ کی کھائیں گے" ایک عنوان——کھائیں گے کیوں بھوکے جائیں گے۔

"امریکہ ویتنام میں اپنے مقاصد ترک کرنے کو تیار نہیں" امریکی وزیرِ خارجہ——اِس لئے کہ ابھی پُوری طرح مار نہیں پڑی ہے اور کمیونسٹوں سے امریکہ برابر یہ کہتا رہے گا اب کے تو مار۔

"اچھی فصل کے باوجود ہندوستان کے کاشتکار پریشان" ایک عنوان——اِس لئے کہ مرارجی ڈیسائی نے اُن پر زرعی ٹیکس کا کلہاڑا چلا دیا ہے۔

"چاند کی منزل اب دُور نہیں" یہ ایک عنوان——اتفاقات ہیں زمانے کے۔ ورنہ پہلے تو دِلّی بھی دُور تھی اور کہا جاتا تھا ؎
ہنوز دِلّی دُور است

"تعلیم کے معنی" یہ ایک عنوان——ہلّڑ بازی، ہڑتال، ہنگامہ آرائی۔

"ہندوستان میں انسداد بدعنوانی کی مہم" ایک عنوان ——— ٹیکس پر ٹیکس کے ذریعہ۔

"سنہری اصول" ایک عنوان ———

۱- وزارتوں کا حصول۔
۲- پرمٹ اور لائسنسوں کی کوشش
۳- چور بازاری، سمگلنگ
۴- غنڈوں کی پرورش اور بدمعاشوں کی ہمت افزائی
۵- ہڑتال بازی، توڑ پھوڑ اور مار پیٹ
۶- سیاسی جوڑ توڑ اور اقتدار کی رسہ کشی
۷- دل بدلی، بے ایمانی اور ضمیر فروشی
۸- دھوکا، فریب، چوری اور سینہ زوری

"زیادہ شراب پینے سے موت" ایک خبر ——— جی نہیں ابدی نشہ ہوگیا۔

"کرشنا مینن اور پاٹل پھر پارلیمنٹ میں" ایک عنوان ——— ع
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

"چین کو کچل دیا جائے گا۔ روس کے صدر کی وارننگ" ——— خالی وارننگ سے کام نہ چلے گا ع
یہ لاتوں کے بھوت ہیں یہاں باتیں نہیں چلتیں

"خونریز تصادم" ایک عنوان ——— کیا تصادم گل ریز بھی ہوتا ہے؟ پھول بھی برستے ہیں؟

"لاوارث لاش" ایک خبر ——— اسے قومی ملکیت قرار دو۔

"دلی میں غیر ہندی زبان والوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جائیں گی" ایک عنوان ——— مگر اس میں بدقسمت اردو والے شامل نہ ہوں گے۔



"فرقہ پرستی پر غور کرنے کے لئے قومی یکجہتی کونسل کا اجلاس" نشستند و گفتند و برخاستند



سیاسی پارٹیوں کو کمپنیوں کے چندے ممنوع"

"انسان کا زہرہ سیارے پر پہنچنا ممکن نہیں" روسی اخبار کا انکشاف —— اچھا وہ اس گندگی سے پاک رہے گا جو حضرتِ انسان نے اِس دُنیا میں پھیلا رکھی ہے۔

"بھوک ہڑتال کی دھمکی" ایک خبر —— روٹی دو ورنہ نہیں تو دم نکلا۔

"بھوتوں کا علاج کرنے والا ڈاکٹر" ایک عنوان —— خوش قسمت ہیں وہ —— یہاں تو انسانوں کا علاج کرنے والے نہیں ملتے۔

"ہندوستانی زبانوں میں سائنس کو مقبول بنایا جائے" ایک عنوان —— سوائے اُردو کے، باقی سب زبانوں میں۔

"سال میں چھ ہفتے پنجابی فلمیں چلاؤ" پنجاب کے سینما گھروں کو حکم —— آئندہ حکم ہفتے میں چھ دن پنجابی فلمیں چلانے کا ہوگا۔

"۲۲ سال بعد خط مل گیا" ایک خبر —— وزیرِ ڈاک و تار کا شکریہ کہ گم نہیں ہوا تھا۔

دیر آید درست آید

"دِلّی میں ایک ہزار پچاس —— چار سو بیس" —— یہ اعداد و شمار غلط ہیں۔ اِتنے تو صرف سیاسی میدان ہی میں ملیں گے۔

"بنسی لال (ہریانہ) نے بسوں کی چیکنگ کی" ایک خبر —— اور سب کو چین کی بنسی بجاتے دیکھا۔

"جگا نیا پکڑا گیا" —— کیا کہیں بھاگ رہا تھا؟

نئے بجٹ میں محصولِ ڈاک میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ آئندہ رجسٹری خرچ ۴۰ پیسے فی پیکٹ کی بجائے ۷۵ پیسے فی پیکٹ ہوگا اور "بیسویں صدی" کی ضخامت کے رسالے بدستور ۱۰ پیسے فی پرچہ کے حساب سے پوسٹ ہوں گے۔ کسی وقت "بیسویں صدی" دو نئے پیسے میں پوسٹ ہوتا تھا اور رجسٹری خرچ ۵۰ پیسے فی پیکٹ لگتا تھا۔

فرشتے کی موت

متاعِ امن وسکون لٹے ہوئے ایک ماہ ہوگیا ہے مگر دل ودماغ یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ہندوستان کے فرشتہ صفت صدرِ جمہوریہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے ہم سے جُدا ہوگئے ہیں۔ یہ لکھتے ہوئے ہاتھوں پر رعشہ سا طاری ہوجاتا ہے۔ آنکھوں میں اندھیرا چھایا جاتا ہے۔ دماغ پھٹتا اور دل ڈوبتا محسوس ہوتا ہے —— لیکن جو کچھ مقدر تھا وہ ہوچکا۔ ہم اس کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ منزل پر پہنچنے سے پہلے میرِ کارواں جاتا رہا اور اتنی دُور جاچکا ہے کہ گردِ کارواں بھی ہاتھ نہیں آسکتی۔

وہ فرشتہ صفت انسان تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک —— فرشتہ تھا اور فرشتے کی کبھی موت نہیں ہوا کرتی۔ وہ نُور ہوتا ہے اور نُور ہی رہتا ہے —— اور یہ نُور باقی ہے۔ میری آنکھوں میں اُس کا ہنستا ہوا، محبت واخلاص سے بھرپور چہرہ گھوم رہا ہے۔ کانوں میں اُس کی محبت بھری میٹھی آوازیں رس گھول رہی ہیں۔

اُس کی ذات اب ایک مینارۂ نُور بن گئی ہے۔ اُس کا جسم موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا ہے۔ لیکن اُس کی ذات تو ایک مستقل مشن تھی، ایک دائمی تحریک تھی۔ وہ مشن آج بھی جاری ہے اور وہ تحریک ایک زندہ تحریک ہے اور ابد تک جاری رہے گی —— اُس نے ہندوستان کو وہ سب کچھ دیا ہے جس پر تاریخِ عالم ہمیشہ فخر کرے گی اور انسانیت کو ناز ہوسکتا ہے۔

اُس کی ذات اُن اوصاف سے آراستہ تھی جنھیں زیورِ انسانیت کہا جاسکتا ہے۔ علم، تعلیم، درس وتدریس، شرافت و نجابت، ذکاوت وفراست، دیانت وامانت، رواداری ووضعداری، محبت و مروّت، اخلاق وتہذیب —— اور یہ سب اب ہمارا سرمایہ ہیں اور ہم انہی چراغوں سے اپنی اندھیری راتوں کو روشن کرتے رہیں گے۔

مجھے ذاتی طور پر اُن سے قُربت حاصل رہی ہے اور اس پر مجھے فخر ہے۔ میں نے اُن سے بے پناہ پیار پایا ہے۔ میں آج بھی اپنے شانوں کو اُن کے محبت بھرے ہاتھ سے تھپتھپاتا محسوس کرتا ہوں کو

سوگوار

خوشتر گرامی

عزیزی نریش کمار شاد

۱۶ر مئی کی شب کو جمنا میں ڈوب کر، عزیزی نریش کمار شاد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور دُنیائے علم وادب پر غم کی گھٹائیں چھا گئیں۔ آہ! اُردو ادب کا ایک اور روشن چراغ گل ہوگیا اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

شاد کی المناک موت پر میں اُس کی مظلوم اہلیہ سے اظہارِ تعزیت کروں یا اُس کی زخم رسیدہ بُوڑھی ماں سے —— اپنے آپ کو دلاسا دوں یا قارئینِ "بیسویں صدی" سے اظہارِ ہمدردی کروں جو ایک جدّت طراز سخنور کے جادُو اثر مضامینِ نظم ونثر سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئے —— اب وہ ہم سے بہت دُور مجاز اور اختر شیرانی کے پاس پہنچ چکا ہے۔ وہ ایک طویل عرصے سے اُن کا ہم رکاب تھا۔

عزیزی نریش کمار شاد کی جوانمرگی پر میرا دل ودماغ معطل ہوکر رہ گیا ہے اور قلم میں بھی طاقتِ تحریر نہیں رہی ہے

نہیں منّت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

سوگوار

خوشتر گرامی

افسانہ

تیاگ
(۱۹۹۸ء میں)

بلونت سنگھ بی۔ اے

۵۱۷۔نیتانگر نئی بستی۔کیڈگنج۔الہ آباد

محبی و مکرمی! تسلیم

تھوڑے عرصے کی بات ہے کہ ایک بزرگِ خضر صورت الہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر ملے تھے۔ اُن کے دل میں جھانک کر دیکھا تو بے کراں احساسِ تنہائی اور بے انتہا سناٹا پایا۔ اُن کے دل کی یہ جھلک ـــــ اہلِ بصیرت کے لئے مخصوص تھی، بھلا نوواردانِ چمن اِس راز کو کیا جانیں۔ اُن سے رخصت ہونے کے بعد کئی دنوں تک اُن کی یاد میں سازِ دل کے تاروں سے دل دوز نغموں کی صدائیں اُبھرتی رہیں۔ اللہ! اللہ! دل میں بے حد و حساب احساسِ تنہائی دبائے بظاہر اِک انجمن بنے رہنے والے لوگ رفتہ رفتہ عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ پروردگار انھیں سلامت رکھے۔ اُن کے الوداعی فرمان کو میں بھولا نہیں۔ . . اب ذرا ریشِ مبارک اور دامنِ قبا سنبھال کر دیکھیں کہ زیرِ نظر افسانہ توقع سے زیادہ لذیذ، تو نہیں ہوگیا؟

آپ کا ـــــــ بلونت سنگھ

★

جبل پور......

۱۲ر اپریل ۱۹۹۸ء

پیارے رتن لعل جی!

کیا آپ کو اب بھی اُس گُل رُخ اور شعلہ خُو کی یاد آتی ہے جس کا نام سنیہہ ہے۔ آج سے پندرہ برس پہلے وہ سولہ برس کی تھی اور حضور باون سال کے ہو چکے تھے۔ یعنی اگر اب آپ کے پاؤں قبر میں لٹک رہے ہیں تو اُس وقت چشم بد دُور، آپ قبر کی جانب قدم بڑھا چکے تھے۔ پھر بھی آپ عاشقِ باون گزے تھے۔ زندگی کے اُس خزاں رسیدہ موسم میں آپ کی حُسن شناس نگاہ مِس سنیہہ پر پڑی اور پھر لوٹ کر نہ آئی۔ جیسے اُس لالہ رُخ پر قربان ہو گئی ہو!

پہلا زمانہ ہوتا تو وہ تُند خُو کافر ادا کسی بالاخانے کی رونق بڑھاتی۔ لیکن زمانہ بدل چکا تھا۔ سنیہہ بائی جی کے بجائے سوسائٹی گرل کہلاتی تھی۔ اُس نے رقص و موسیقی میں دسترس حاصل کی، مُجرا کرنے کے لئے نہیں، "کلا" یعنی فنِ لطیف کی خدمت کرنے کے لئے۔ کلچرل پروگراموں کی جنم داتا کانگریسی سرکار کبھی کی دم توڑ چکی تھی، تاہم اِس قسم کے پروگرام اب بھی زندہ تھے۔ ایسے ہی ایک کلچرل پروگرام میں آپ نے اُس کم سِن فتنے کو دیکھا اور سَو جان سے فریفتہ ہو گئے۔

سنیہہ بھی تربیت یافتہ لڑکی تھی اور آپ ایسے فنونِ لطیفہ کے قدر دانوں کی قدر کرنا خوب جانتی تھی۔ چنانچہ آپ کے لرزتے بازوؤں میں خوب خوب بجلیاں لہرائیں۔ جو کچھ ہوا سو دُنیا جانتی ہے۔ . . یا جانتی تھی۔ اب یہ سب کچھ قصّہ پارینہ ہو چکا۔

ہاں تو پہلے کا زمانہ ہوتا تو آپ اب بھی کسی بالاخانے پر چلتے پھرتے نظر آتے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ آپ کی صحت، بگڑ گئی اور اُس برق رفتار حسینہ کی نکیل مضبوط تر ہاتھوں میں چلی گئی۔ بھلا ہوا جو چند برس

آبرو اور دولت لٹانے کے بعد تھوڑی سی اراضی دبا گئے جس کے بوتے پر اب آپ کی دال روٹی چل رہی ہے اور آپ دہلی سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر رانی کھیت میں بیٹھے اپنے پھلوں کے باغوں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ اِدھر سنیہہ کے بارے میں بھی سُنا گیا ہے کہ مخصوص محفلوں میں آپ کا ذکرِ خیر چل نکلے تو وہ غنچہ دہن آپ کی تعریف و توصیف کے گیت گاتے نہیں تھکتی۔ معلوم ہوتا ہے وہ اب بھی تہہِ دل سے آپ کی شکر گزار ہے۔ اِس لئے کہ دوسرے ناکام عاشقوں کی طرح آپ نے بات کا بتنگڑ نہیں بنایا اور آپ کی وہ بندی برحُسن وخوبی اِدھر سے اُدھر منتقل ہو گئی۔

یہاں تک میرا خط پڑھ لینے کے بعد آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے

کُریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

دُرست! سَو (سَئے) پیسے دُرست!

اب اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اطلاعاً گزارش ہے کہ اب بھی سنیہہ کا شمار سوسائٹی کی حسین ترین خواتین میں ہوتا ہے۔ اپنی آنکھوں سے اُس کے حُسنِ عالم تاب کو دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ جو کچھ سُنا وہ پہلے آپ کی زبانی اور اب دوسروں کی زبانی۔ کہنے والے کہتے ہیں جس طرح شمع بجھنے سے پہلے لَو دینے لگتی ہے اسی طرح وہ شمعِ حُسن بھی اپنی رچرم سیما، یعنی نقطۂ عروج پر جگمگا رہی ہے!

میرے ایک دوست ہیں، سیٹھ جسونت رائے۔ آج کل وہ دہلی میں قیام پذیر ہیں۔ آپ نے تو دہلی نہ جانے کی قسم کھا رکھی ہے، ورنہ آپ دیکھتے کہ سیٹھ موصوف نے وہاں محل نما کوٹھی کھڑی کر لی ہے۔ قسمت کے ایسے دھنی ہیں کہ مٹی کو ہاتھ لگاتے ہیں تو سونا بن جاتی ہے۔ سچ مچ بھگوان اُن پر بے حد و حساب مہربان ہے۔ لیکن سُنا ہے کہ ان کے دل کو ایک المیہ گھن کی طرح کھاتے جا رہا ہے۔

پچھلے دنوں دہلی سے میرے ایک دوست جبل پور آئے۔ اُن کی زبانی پتہ چلا کر آج کل آپ کی چہیتی رائے صاحب کے اکلوتے نوجوان بیٹے پر [illegible] ڈال رہی ہے۔ اِسی لئے رائے صاحب کی راتوں کی نیند اور [illegible] کا چین غائب ہے۔

حضورِ والا! [illegible] اِس خط کا! رائے صاحب نے مجھے اِس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ میں اِس سلسلے میں اُن کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ لیکن میری یہ دلی خواہش ہے کہ وہ اِس مصیبت سے چھٹکارا پا جائیں۔ خود سر سنیہہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ البتہ اُس کے دل میں آپ کا احترام باقی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اُسے دو سطریں لکھ دیں گے تو وہ آپ کی بات کو ٹال نہ سکے گی۔

رائے صاحب محض میرے دوست ہی نہیں ہیں، دیرینہ مہربان بھی ہیں۔ اُن کے ذریعہ مجھے کاروباری منافع حاصل ہوتا رہتا ہے۔ ویسے بھی اُنھوں نے بڑی ہی ب۔ لوث طبیعت پائی ہے۔ عجب مرنجاں مرنج انسان ہیں۔ اُن کی مدد کرنا عین ثواب کا کام ہے۔

آپ کا

رام راج

رانی کھیت

۲۰ اپریل ۱۹۹۸ء

میری دیرینہ دلربا، پیاری سنیہہ

پہلے اِس خط کے آخر میں میرا نام پڑھ لو۔ ضرور سوچو گی کہ باسی کڑھی میں یہ اُبال کیسا! میری طرزِ تخاطب سے تمھارے رس بھرے گداز ہونٹوں پر عجیب قسم کی مُسکراہٹ کا نمودار ہونا بھی ناگزیر ہے۔ اپنی اِس حرکت کی وضاحت بِلاشبہ مجھ پر واجب ہے۔

مانا کہ مُدّتِ دراز سے میدانِ عشق سے کنارہ کش ہو چکا ہوں لیکن خود ہی کہو کہ تم ایسے حسین کو غیر حسین انداز سے کیسے مخاطب کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی دُرست ہے کہ سامانِ عیش و عشرت کیے ہمیں ایک یُگ بیت گیا۔ ہم دیدہ دانستہ الگ ہو گئے۔ لیکن یہ جُدائی بھی قابلِ تحسین شان سے خالی نہیں تھی۔ میرا حال بالکل ویسا ہی تھا جیسے کہ کوئی خلیفہ (پہلوان) لنگر کھول کر اپنے چیلے چانٹوں کے حق میں اکھاڑے سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ کیسے تم پر تن من دھن نچھاور کرنے کے بعد بندہ گوشہ گیر ہو گیا۔ تم ایسی زیرک حسینہ یہ بات بھی بخوبی سمجھ سکتی ہے کہ الگ رہ کر بھی میں تمھیں اپنے دل سے بن باس نہ دے سکا۔ حُسن کے حضور میں عشق ایسی جرأت کرے بھی تو کیسے۔ یقین کرو کہ دل کا کلیسا ایک ہی صنم کے دم سے آباد ہے اور منوّر ہے۔ دور سے تمھارے معرکوں کی خبریں سُن سُن کر مسرور ہوتا رہا۔ رمز شناس حضرات کا قول ہے کہ مرد اپنی آخری اور عورت اپنی اوّلین محبت کو بُھلانے سے قاصر ہے۔ بندے کو تمھارے حضور اوّلین اور صادق ترین عاشق ہونے کا فخر حاصل ہے . . . لو! اب اصل مُدّعا از خود

سامنے ہے۔

مجھے خبر ملی ہے کہ آج کل تمھارے حُسن و ادا کا سَیل ایک ایسے کم سن اور نا پُختہ نوجوان کی طرف رواں دواں ہے جو ایک لکھ پتی یا کروڑ پتی کا اکلوتا چشم و چراغ ہے۔ میری مُراد سیٹھ جسونت رائے کے صاحبزادے سے ہے۔ میں نے رائے صاحب اور اُن کے فرزندِ ارجمند کو کبھی نہیں دیکھا۔ براہِ راست اُن سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ میں اُن کے ایما سے تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔ یہ خبر مجھے اپنے ایک دوست کی وساطت سے ملی جو جبل پور میں رہتے ہیں۔ وہ حضرت میرے جگری دوست ہیں۔ انھیں کے اصرار سے میں یہ جُرأت کر رہا ہوں۔ اگر تم اُس نوجوان کو نظر انداز کر دو تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ میں اپنے جبل پور والے دوست کا یہ کام نہ کر پایا تو مجھے سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک بار پھر یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اِس میں رائے صاحب کا ہاتھ بالکل نہیں ہے۔

اے ملکۂ حُسن! تجھے کمی بھی کس بات کی ہے۔ ہمارے اِس سوشلسٹ سماج میں، چشم بد دُور، لکھ پتیوں کی کمی نہیں ہے۔ تم اِک نگاہِ غلط انداز جس پر ڈالو وہی مطیع ہو جائے۔

پُرانی محبت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اپنے قلندر کی پھیلی ہوئی جھولی سے رُخ پھیر لینے کی کوشش مت کرنا۔

تمھارا غلام ابنِ غلام
رتن (بے تاب)

دہلی

۲۴ اپریل ۱۹۹۸ء

اے شہنشاہِ عشق!

بندی تسلیم عرض کرتی ہے۔ محبت نامے کے لئے شکریہ! آپ کا فرمان اور بندی سرتابی کرے؟ توبہ!

کیا عرض کروں، آپ کا نوازش نامہ پاکر دل کی کیا کیفیت ہوئی۔ رومانی زندگی کا بابِ اوّل اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ عود کر آیا اور میں دم بخود کھڑی رہ گئی۔ مکرر شکریہ! ـــــ البتہ موضوع آبگینے کی طرح نازک تھا۔

ہاتھ لگائے نہ بنے

آہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

ضیا فتح آبادی ایم۔اے

ابرِ غم اب کھُل کے برسے، ڈاکٹر ذاکر گئے
آسماں جی بھر کے رو لے، ڈاکٹر ذاکر گئے

پارسی، عیسائی، سکھ، ہندو، مسلماں، جین، بودھ
جن کو کہتے تھے ہمارے ڈاکٹر ذاکر گئے

اہلِ دنیا سے تعلق ہی نہ تھا جیسے انھیں
عالمِ بالا کو ایسے ڈاکٹر ذاکر گئے

شومیِ قسمت پہ اپنی کیوں نہ ہم آنسو بہائیں
رُوٹھ کر جب آج ہم سے ڈاکٹر ذاکر گئے

محفلِ علم و سیاست میں اندھیرا چھا گیا
دفعتاً اُٹھ کر جب اُس سے ڈاکٹر ذاکر گئے

ایک دھاگے میں پرو یا ہندیوں کو پیار کے
توڑ کر خود سارے رشتے ڈاکٹر ذاکر گئے

اے ضیا مُنہ کو کلیجا آ گیا سُن کر اُسے
دی خبرِ منحوس کس نے "ڈاکٹر ذاکر گئے"

ضیا فتح آبادی

جب میں آپ کا خط پڑھ رہی تھی اُس وقت صرف ایک بزرگ خضر صورت میرے نزدیک تشریف فرما تھے۔ اُنھوں نے میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے متاثر ہو کر بے اختیار سوال کیا "کیوں، خیریت تو ہے نا؟"

دیرینہ ملاقات نہ ہوتے ہوئے بھی میں اُن سے کافی مانوس ہو چکی تھی۔ چنانچہ بِلا تامّل سارا قصہ از اوّل تا آخر کہہ سُنایا۔ وہ بولے۔ "مسئلہ تو ٹیڑھا ہے۔ اِس کا حل ایسا ہونا چاہیئے کہ سانپ مر جائے پر لاٹھی نہ ٹوٹے۔"

میں نے جواب دیا "جی ہاں۔ ذرا غور فرمایئے کہ اِس قدر مال دار چُوزے کو ہاتھ سے کیسے جانے دوں۔ اُس کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ اگر میں چُوک گئی تو یہ سُنہرا موقع ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے جاتا رہے گا ـــــ لیکن جس محسن نے یہ فرمائش کی ہے اُس کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتی۔۔۔"

اُن بزرگ نے کافی غور و خوض کے بعد سوال کیا "یہ تو بتایئے کہ اُس نوجوان سے نوبت کہاں تک پہنچ چکی ہے؟"

"حضور ابھی تو اُسے تارِ نگاہ پر نچا رہی ہوں! ابتدا سے عشق میں ایسے اناڑیوں کو ڈھیل دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ ابھی تو

دہی حال ہے ؎

آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے
تم ہمارے ہم تمہارے ہو گئے

"شعر کچھ غلط معلوم ہوتا ہے۔ خیر ا---- میں پوچھتا ہوں کہ آپ برخوردار کو چھوڑ کر اُن کے والدِ بزرگوار کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتیں؟"

یہ سن کر ایک بار تو میں سناٹے میں آگئی۔ وہ پھر کہنے لگے "اگر وہ نوجوان ہونق آپ کے پیار میں بغاوت کر بیٹھا تو بوڑھا اُسے ساری دولت سے محروم کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ کے ہاتھ کیا لگے گا؟"

بات تو ٹھیک تھی۔ میں نے متفکر ہو کر پوچھا "وہ بوڑھا گھاگ میرے چنگل میں پھنسے گا بھی؟"

"اجی بوڑھا طوطا اور جلدی پھنسے گا! جو وہ پھنس گیا تو سارا مال اپنا ہو جائے گا۔ ایسے بدکردار چھوکرے کا باپ بھی متقی و پرہیزگار نہیں ہوسکتا۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" میں نے کچھ کچھ قائل ہوتے ہوئے کہا۔

"اُس بوڑھے کو یہ بھی تو سمجھایا جا سکتا ہے کہ جوان لڑکے کو تباہی سے بچانے کے لئے بڑھاپے کو تیاگ کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

میں خوش ہو کر بولی "خیال تو معقول ہے۔"

"بالکل معقول ہے! اِس طرح آپ کے رانی کھیت والے مہربان کی فرمائش بھی پوری ہو جائے گی اور مال بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے گا۔"

میں نے گرمجوشی سے کہا "لیکن رائے صاحب کو اِس تیاگ پر آمادہ کرنے کے لئے مفصل پلین Plan بنانا پڑے گا۔"

انھوں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "یہ سب یوں ہو جائے گا!"

میں شاخِ گل کی طرح لچک کر پہلی بار اُن کے سینے سے لگ گئی اور بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"سرکار! وہ کیسے؟"

انھوں نے پیار سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جواب دیا۔

"کیونکہ [illegible] ہونق کا باپ میں ہی ہوں!!"

آپ کے قدموں کی داسی

غزل

جگن ناتھ آزاد ایم۔ اے

تلخی سے عبارت ہے اب زیست کا افسانہ
یا تلخیِ دوراں ہے یا تلخیِ پیمانہ

آنکھیں تری شیدائی، دل ہے ترا دیوانہ
روپوش کہاں ہے تو اے جلوۂ جانانہ

یہ رات کی تنہائی، ظلمات کی گہرائی
اِس وقت دلِ شاعر اک نالۂ مستانہ

آنکھیں ہوں اگر بینا ہر ذرہ حقیقت ہے
اے بےخبرو ورنہ دُنیا ہے اک افسانہ

اب محفلِ جاناں سے کیا لوٹ کے جائیں گے
یہ کہہ کے سرِ محفل رخصت ہُوا پروانہ

فریاد ہو یا نالہ، رسموں کے سوا کیا ہیں
اندازِ محبت کے رسموں سے ہیں بیگانہ

میرا جو تعلق ہے تجھ سے وہ کہوں کیا میں
تو میری حقیقت ہے میں ہوں ترا افسانہ

آدابِ محبت میں ضبط ایک بڑی شے ہے
کچھ بھی ہو مگر اے غم آوازہ بن جانا

آنکھوں میں سمائی ہے پہلی ہی جھلک اب تک
دوبارہ تجھے دیکھے کیسے دلِ دیوانہ

دیکھی تھی جھلک تیری اِک لمحہ کبھی میں نے
بس اِس پہ بنا ڈالا دُنیا نے اِک افسانہ

ملحوظِ نظر رکھنا آدابِ محبت کے
اے اشکِ رواں اُن کے دامن پہ نہ گر جانا

اے جوشِ جنوں تیری اِس بات کے میں قرباں
جب اُن کے حضور آنا محتاطِ نظر آنا

میں تو یہی سمجھا ہوں رُودادِ سفر اے دل
بےتاب نظر آنا بےتابِ نظر جانا

کیا کہیے اُن آنکھوں کی، آزاد وہ آنکھیں ہیں
پیمانہ بہ پیمانہ، میخانہ بہ میخانہ

افسانہ

مُردہ سانپ

م۔ک۔ مہتاب ایم۔ اے

ڈبلیو۔ زیڈ۔ ۱۴۴ ۔شیونگر نئی دہلی نمبر ۱۸

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

۔۔ شرمندہ ہوں کہ اتنے قریب ہو کر بھی اتنی دور رہتا ہوں! آپ جتنی لگن اور محبت سے محنت کرتے رہتے ہیں کاش مجھے بھی وہی حاصل ہوتی ——— افسانہ نمبر کے لئے ایک افسانہ "مُردہ سانپ" ارسالِ خدمت ہے۔ انسان کس طرح جبر پر صبر کرلیتا ہے۔ اُمید ہے قارئین پسند فرمائیں گے ——— اور جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے اس کی بھی تعمیل کر رہا ہوں۔ افسانہ کے ساتھ وہ آئینہ بھی بھیج رہا ہوں جس میں پڑھنے والے مجھے دیکھ سکتے ہیں! ۔۔۔

آپ کا عزیز ——— کم مہتاب

★

"شُکروار کا دن ہے گورو مہاراج رکھشا کرے۔ جانور کے دودھ کے لئے آنہ دو آنے بابو۔ گورو مہاراج رکھشا کرے۔ شُکروار کا دن ہے"

دفتر کے باہر سُرخ پتھر کے بڑے فوارے کے قریب ایک بدحال سا سپیرا کھڑا تھا۔ وہ شکل و صورت سے کوئی سِکھ جوگی معلوم ہوتا تھا۔ سر پر گیروے رنگ کی بڑی سی پگڑی۔ کانوں میں پیتل کے چوڑے چوڑے کُنڈل اور بدن پر پیوند لگا مٹیالے رنگ کا بڑا سا کُرتہ۔ اُس کے گلے میں چتکبرے رنگ کا ایک چھوٹا سا اژدہا پڑا ہوا تھا۔ اژدہے کی گردن اور پُونچھ اُس کے سینے کی طرف لہرا رہی تھی اور جسم کا باقی حصّہ دوپٹے کی طرح اُس کی پُشت کی طرف لٹک رہا تھا۔ سانپ کی سُرخ آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ اپنی گلابی زبان بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ بار بار نکال کر تماشائیوں کو سراسیمہ کر رہا تھا۔ کچھ بچّے اور دفتر سے نکل کر آنے والے دو چار بابو لوگ سپیرے کے پاس کھڑے ناگ دیوتا کے درشن کر رہے تھے۔ سپیرا سانپ کے جسم پر ہاتھ پھیرتا ہوا کہے جا رہا تھا۔

"شُکروار کا دن ہے۔ گورو مہاراج رکھشا کرے!"

سانپ کی چمکتی ہوئی آنکھوں اور لپکتی ہوئی زبان کے جادو میں کھو کر پرکاش بھی وہیں کھڑا ہو گیا۔

"کیوں بابا! شُکروار کے دن سے کیا مُراد ہے؟"

سپیرے نے سانپ کی گردن جو کافی آگے بڑھ آئی تھی ہاتھ میں پکڑ لی اور کہنے لگا۔

"بابو جی سانپ اپنا زہر ہر شُکروار کو اُلٹ دیتے ہیں۔"

"لیکن سانپ تو آئے دن لوگوں کو کاٹتے رہتے ہیں" ایک اور شخص نے پُوچھا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں بابو جی۔ ہفتہ بھر زہر سانپ کے گلے کی تھیلیوں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ اِس دَوران میں سانپ جسے چاہے کاٹ لے۔ لیکن شُکروار کے دن تو وہ ضرور اپنا زہر کہیں نہ کہیں اُگل کر تھیلی خالی کر دیتا ہے ——— آنہ دو آنے جنگل کے جانور کے لئے۔ گورو مہاراج آپ کی صحت بنائے رکھے!"

پرکاش کی جیب میں دس دس کے تین سکّے تھے وہ اُس نے

سپیرے کی ہتھیلی پر رکھ دیئے اور آگے بڑھ گیا۔ لیکن نہ جانے سانپ میں کیا کشش تھی کہ وہ چند ہی قدم چل کر رُک گیا جیسے وہ بڑا سانپ اُس کے پاؤں میں بیڑی ڈالتا جا رہا ہو۔ پھر وہ قریب ہی لان میں پڑی لکڑی کی ایک بینچ پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

"کیا یہ سانپ اِس سپیرے کو کاٹتا نہیں؟ وہ کیسا خطرناک بوجھ اپنے گلے میں ڈالے گھوم رہا ہے۔ جیسے موت مجسّم رُوپ میں ہر وقت آنکھوں کے سامنے لہرا رہی ہو۔ پھر آج تو شُکروار ہے۔ اگر موذی سانپ نے اُسی کو کاٹ لیا تو یہ سپیرا ابھی اِس کالی سڑک کی چوڑی چھاتی پر دھڑام سے آگرے گا۔ آنکھوں سے پانی اور مُنہ سے جھاگ بہنے لگے گا۔ آنکھیں پتھرا جائیں گی اور جسم نیلا ہو جائے گا۔ یہ خطرناک زہریلا سانپ بھاگتا اُٹھتا لہراتا اِن پارکوں اور کوٹھیوں کے باغیچوں میں سے نکلتا نگاہوں سے غائب ہو جائے گا۔

یہ سپیرا سانپ کو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟ شاید سانپ کے دودھ میں سے اُسے بھی زندہ رہنے کے لئے روزی ملتی ہوگی۔ اِس طرح موت اور زندگی نے مِل کر رہنا سیکھ لیا ہوگا۔"

روزی کا خیال کرتے ہی پرکاش کو اپنی تنخواہ کا پیکیٹ یاد آگیا جو اُسے دفتر سے آج ہی مِلا تھا۔ اُس کا ہاتھ خود بخود جیب میں چلا گیا۔ زرد رنگ کا لفافہ جس پر کالے حروف میں "حکومت کی خدمت پر" کے الفاظ چھپے ہوئے تھے اور قلم سے پانچ سَو دس روپے تیس پیسے کے حروف لکھے تھے۔

پرکاش لفافہ ہاتھ میں تھامے سوچنے لگا۔ اُس کی مالی حالت گذشتہ دو برسوں میں کتنی بدل گئی ہے۔ اِس سے قبل اُسے صرف دو سَو ستّر روپے مِلتے تھے۔ پھر حالات نے کیسی کروٹ لی۔ اُس کے ذہن میں واقعات یوں اَوراق بدلنے لگے جیسے نوٹوں کی گڈی کے نوٹ ہَوا سے پھڑپھڑا رہے ہوں۔

پرکاش نے تنخواہ کا پیکٹ پھر اندرونی جیب میں رکھ دیا اور پھر سپیرے کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ اب وہاں صرف دو تین بچّے ہی کھڑے تھے اور سپیرا راہ گیروں کو متوجّہ کرنے کے لئے اونچی آواز میں صدا لگا رہا تھا۔

"بابا! تم اِس سانپ کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ یہ بوجھ گلے سے اُتار کیوں نہیں دیتے؟"

"بابو! یہ میری روزی ہے۔ یہ میرے پیٹ کا سوال ہے!"

"اگر میں تمھیں پچاس روپے دے دوں تو کیا تم یہ سانپ چھوڑ دوگے؟"

"سوچوں گا!" سپیرے نے حیران ہوکر پرکاش کی طرف دیکھا۔

"لو! دس روپے پیشگی لے لو۔ سوچ لو۔ اگر تم سانپ کو چھوڑ دوگے تو میں تمھیں پچاس روپے اور دے دوں گا۔"

سپیرے کو وہیں چھوڑ کر پرکاش پھر اُسی بینچ پر آکر بیٹھ گیا۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی سُرخ کرنیں سرکاری عمارتوں کے سُرخ پتھروں سے کھیل رہی تھیں۔ سڑکوں پر سینکڑوں بابو لوگ زندگی کا بوجھ ڈھو کر سر جھکائے سائیکلوں پر چلے جا رہے تھے۔ لیکن پرکاش کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج شُکروار کے دن کسی سانپ نے اُسے ڈس لیا ہو۔ زہر کے اثر سے اُس کی آنکھوں کے سامنے دھندھ چھا رہی ہو۔ جسم شل ہوتا جا رہا ہو اور اُس میں گھر لوٹنے کی ہمّت نہ رہی ہو۔ وہ بینچ پر بیٹھا سوچتا رہا۔

نوٹوں کے بوجھ سے اُس کی جیب کتنی بھاری معلوم ہو رہی تھی۔ آج اُس کی بیوی کو بھی تنخواہ مِلی ہوگی۔ آج گھر میں کتنے ہی نئے نئے کاسنی، نیلے، گلابی اور سبز کاغذ جمع ہو جائیں گے اور اُن سے زندگی کی کتنی آسائشیں خریدی جائیں گی۔ وہ اِس خوشحالی کے لئے اپنے انڈر سکریٹری مسٹر چودھری کا دل ہی دل میں شُکریہ ادا کرنے لگا۔ چودھری صاحب کتنے شفیق اور ہمدرد انسان تھے ——— اُن کا دل کتنی جلدی پسیج جاتا تھا۔ وہ کِسی کو مشکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سب کے درد کو اپنا درد سمجھ کر جھٹ علاج کرنے لگتے تھے۔

اِس عہدے پر ترقّی پانے سے پہلے پرکاش جس افسر کے ماتحت ایک معمولی کلرک تھا۔ اُس کی سٹینو سَشی کیسی خوبصورت لڑکی تھی۔ ایسی لڑکی کو وہ کبھی ہاتھ لگانے کا تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا۔ سَشی اُسے مَے انگوری کی ایک بند بوتل نظر آتی تھی۔ جسے وہ دُور دُور سے دیکھ کر ہی سُرور لیا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ اُس کے قریب آتی بھی تو وہ ڈر کر نگاہیں جھکا لیتا تھا کہ انگور کھٹّے ہیں! لیکن لڑکی کیا تھی مجسّم قیامت تھی! اُٹھتی بیٹھتی ہنستی بولتی تو زلزلے آتے تھے۔ مشرقی حُسن اور حیا کا ایک ایسا پیکر جسے چھُوا نہ جاسکتا تھا بس دُور سے دیکھا ہی جاسکتا تھا۔

لیکن صرف چودھری صاحب کی مہربانی کی بدولت آج وہی

لڑکی اُس کی بیوی تھی، اُس کے گھر کی شمع تھی۔ وہ خود حیران تھا کہ یہ ناممکن بات کیسے ممکن ہو گئی!

اُسے صرف اِتنا یاد تھا کہ کوئی دو برس پہلے ایک شام جب وہ فائلیں بند کر کے دفتر سے لوٹنے لگا تو ششی اپنے کیبن میں بیٹھی ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اُس کی غلافی آنکھیں سُوج کر اور بھی خوبصورت دِکھائی دے رہی تھیں۔ وہ گالوں پر گھر آئے ریشمیں بالوں کو بار بار ہاتھ سے پیچھے ہٹاتی اور اُس کی کلائیوں میں پڑی چوڑیاں کھنک اُٹھتیں۔ پرکاش ششی کے کیبن میں جا کر اُس سے کچھ پُوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ کافر ادا تو اُس کی پہنچ سے بہت بلند چیز تھی! وہ اُسے حاصل کرنا تو کُجا اُس سے اظہارِ ہمدردی کے لئے بات کرنے کی ہمّت بھی نہ رکھتا تھا۔ وہ با دلِ ناخواستہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔

ششی کچھ دِنوں سے بیمار تھی۔ دفتر نہیں آ رہی تھی۔ کلرک لوگوں میں کچھ چہ میگوئیاں بھی ہوئیں لیکن اِس طرح کی بےمعنی باتیں تو انسانی فطرت کا شیوہ۔ اُسی روز شام کے وقت اُس کے سیکشن افسر نے اُسے بُلا کر کہا۔

"پرکاش! انڈر سیکرٹری مسٹر چودھری نے تمھیں سلام بھیجا ہے۔ اُن سے مِل کر جانا۔"

ضرور کوئی غلطی ہوئی ہوگی! وہ گھبرا گیا۔ ششی کے بارے میں سب باتیں ذہن سے کافور ہو گئیں۔ وہ سینکڑوں وسوسے دل میں لئے کانپتا ہوا چودھری صاحب کے پاس پہنچا۔ چودھری صاحب نے اُس کے لئے چائے منگوائی اور خود اپنے سٹینو کو ڈکٹیشن دیتے رہے۔ سٹینو چلا گیا تو کہنے لگے۔

"پرکاش! میں نے تمھاری بہت تعریف سُنی ہے۔ دونوں سیکشن افسر جن کے تحت تم کام کرتے رہے ہو تمھارے مدّاح ہیں۔"

"حضور! یہ تو آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔ ورنہ میں کس قابل ہوں۔"

پرکاش احسان کے بوجھ تلے دبنے لگا۔ چودھری صاحب کہہ رہے تھے۔

"تمھارے دونوں افسران نے تمھاری محنت، بلند اخلاق اور ایمانداری کی بہت تعریف کی ہے۔ تمھاری آؤٹ آف ٹرن ترقّی کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ لیکن میں یہ جائز نہیں سمجھتا۔ پھر بھی کسی کا جائز حق کب تک دبا کر رکھا جا سکتا ہے۔ خیر ترقّی تو تمھاری ہو ہی جائے گی لیکن جس کام کے لئے میں نے تمھیں آج بُلایا ہے وہ یہ ہے کہ کیا تم اپنے سیکشن افسر کی سٹینو ششی سے شادی کر سکتے ہو؟"

پرکاش ایکدم سکتے میں آ گیا۔ کھڑا ہو گیا۔ پھر کانپتا ہوا بیٹھ گیا اور بولا۔

"چودھری صاحب! میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں ششی کے قابل کب ہوں؟ وہ تو میری پہنچ سے بہت اونچی چیز ہے!"

"میرے بچّے سُنو!" چودھری صاحب نہایت ہمدردی اور شفقت کے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"جب تک تم اونچے پیڑ کے پھل کے لئے ہاتھ ہی نہ بڑھاؤ گے وہ پھل تمھیں کیسے ملے گا؟"

"لیکن صاحب! وہ میرے لئے رضامند کب ہوگی۔ اُس کے لئے تو بڑے بڑے افسر لوگ دل میں نرم گوشے رکھتے ہیں۔"

"قہہ، قہہ، قہہ!" چودھری صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ "تم اِس کے متعلّق بےفکر رہو۔ تمھیں ششی پسند ہے نا؟ تو تم اظہارِ رضامندی کر دو۔ باقی ذمّہ میں لیتا ہوں۔ دفتر کے اِتنے لوگوں میں سے مجھے تم ہی ایک ایسے نوجوان نظر آتے ہو جو ششی کے لئے موزوں جیون ساتھی ہو سکتے ہو۔ کسی خوبصورت لڑکی کے لئے کشش تو ہر دل میں ہو سکتی ہے لیکن اُس کا موزوں جیون ساتھی ہر شخص نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن حضور! میں ایک غریب آدمی ہوں۔ اِتنا بوجھ۔ ۔"

"یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ ۔"

"چودھری صاحب! میں نے سُنا ہے ششی بیمار ہے۔ کچھ دِنوں سے دفتر نہیں آ رہی ہے۔ آخری دن جب میں نے اُسے دیکھا تھا وہ اپنے کمرے میں بیٹھی بےتحاشہ رو رہی تھی۔ کیا بات ہے؟"

"پرکاش!" چودھری صاحب ایک سرد آہ بھر کر بولے۔ "میرے بچّے! مجھ سے کسی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ اِسی لئے تو میں نے تمھیں بُلایا ہے۔"

"کیا تکلیف ہے اُسے؟"

"وہ بےچاری بڑی مشکل میں گرفتار ہے۔ میرے پاس آئی تھی۔ کہتی تھی وہ مر جانا چاہتی ہے۔ دیکھو پرکاش! انسان غلطی کا پُتلا ہے۔ عمر بھر غلطیاں کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ ہر غلطی پر خودکشی ہی کی سوچے تو

زندگی کا نام ہی خودکشی ہو جائے۔ ششی ایک معصوم لڑکی ہے اور معصوم لوگ نادانستہ غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ رونے سے تو غلطی دُرست نہیں ہو سکتی۔ انسان ہی انسان کا معالج ہے۔"

"مطلب؟" پرکاش کی حیرانی میں اور اضافہ ہو گیا۔

"مطلب یہ کہ وہ اب نہ تو اپنے والدین کو کچھ بتا سکتی ہے اور نہ زندگی کا خطرہ مول لے سکتی ہے۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھ کر میرے پاس آگئی اور میں نے یہی دُرست سمجھا کہ اگر تمھارے جیسا کوئی نوجوان اس کا ہاتھ تھام لے۔ اُس کے بوجھ کو اپنا بوجھ سمجھ لے تو اُس کے مرجھائے ہوئے ہونٹ پھر مُسکرانے لگیں گے۔ اُس کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئے گی اور یہ کلی زندگی کے چمن میں کچھ دیر اور خوشیاں بکھیر سکے گی۔

"لیکن میں . . ." پرکاش کے ہونٹ گھبراہٹ سے کپکپانے لگے۔

"لیکن کیا۔ میں سب سمجھتا ہوں پرکاش! کہ میں تمھیں بہت کڑوی گولی نگلنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ بڑی قربانی کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ میں تمھاری مالی حیثیت سے واقف ہوں۔ اِس سلسلے میں جتنی مدد میں کر سکتا ہوں اُس سے گریز نہ کروں گا۔ یہ راز ششی اور میرے سوا کسی تیسرے تک نہ پہنچے گا! اور یہ لو میں نے اپنے ایک دوست سے کہہ کر اُس کے دفتر میں تمھارے لئے پرسنل اسسٹنٹ کی آسامی کا تقرری نامہ حاصل کر لیا ہے۔ تمھاری تنخواہ ایک دم دوگنی سے بھی بڑھ جائے گی۔ میں ششی کو بھی پروموشن دلانے کی کوشش کروں گا تم دونوں مل کر اچھی خوشحال زندگی بسر کر سکو گے۔ دیکھو میرے بچے! یہ قربانی کا موقع بھی ہے اور مستقبل سنوارنے کا بھی! اور ایسے مواقع انسان کی زندگی میں بار بار نہیں آتے۔"

چودھری صاحب نے تقرری کا کاغذ پرکاش کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کاغذ پرکاش کے ہاتھ میں درخت کی شاخ پر خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اُس کی سانس رُک رہی تھی اور وہ جیسے زندہ رہنے کے لئے ہوا کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

"میں کسی سے مشورہ . . ." پرکاش کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن چودھری صاحب اُس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھے۔

"مجھ سے بہتر مشورہ تمھیں کوئی اور نہ دے سکے گا میرے دوست! جس وقت ششی میرے پاس آئی اُسی وقت سے میں اِس معاملے کے سب پہلوؤں پر غور کر رہا ہوں۔ تمھیں یہ فکر ہو گی کہ تم دونوں کے ملازم ہونے کی وجہ سے بچّے کی پرورش کیسے ہو گی؟ اِس ضمن میں میں تمھاری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ ششی بچّے کو ہمارے ہاں چھوڑ کر ملازمت کے لئے جا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں نوکر چاکر ہیں۔ پھر میری بیوی مجھ سے بھی زیادہ ہمدرد ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی مجھے تم سے ایک درخواست بھی کرنی ہے کہ ششی بہت جذباتی لڑکی ہے۔ بات بات پر آبلے کی طرح پھوٹ پڑتی ہے۔ بہتر ہو گا کہ اُس کی خوشی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے تم اُس سے اِس موضوع پر بات ہی نہ کرو۔ کیونکہ اِس افسوسناک سانحہ کی یاد سے تمھاری زندگی کی خوشیوں میں خواہ مخواہ تلخی پیدا ہو گی۔"

جب پرکاش پرسنل اسسٹنٹ کی تقرری کا کاغذ لے کر دوسرے دفتر میں پہنچا تو اُس نے روزی کے لئے ایک خوبصورت سانپ کا بوجھ گلے میں ڈال لیا تھا۔ نئے صاحب تو بہت ہی اچھے تھے۔ اُن کی مہربانی سے پرکاش کو ایک خوبصورت فلیٹ بھی الاٹ ہو گیا اور آہستہ آہستہ فلیٹ میں آرام اور آسائش کے وہ تمام لوازم میسر آنے لگے جن کا نام زندگی رکھ دیا گیا ہے۔

ششی پرکاش کے احسان تلے دبی ہوئی تھی اور اپنی مہک سے اُس کی زندگی کو مہکانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ زندگی کی کتاب کے کچھ اَوراق اُلٹے ــــ ششی نے نرسنگ ہوم میں ایک بچّے کو جنم دیا جو ششی سے بھی زیادہ خوبصورت تھا۔ جس کا باپ کوئی نہ تھا۔ لیکن جس کی پیشانی پر پرکاش کے نام کی ولدیت کی چٹ چسپاں کر دی گئی تھی۔

پرکاش نے جب کبھی کسی مسئلے کا چودھری صاحب سے ذکر کیا وہ توقعات سے بڑھ کر معاون ثابت ہوئے۔ بچّے کا بہت سا بوجھ بھی اُنھوں نے اور اُن کی بیوی ہی نے اُٹھا رکھا تھا۔ ششی دفتر جاتے ہوئے بچّے کو چودھری صاحب کے ہاں چھوڑ جاتی اور واپسی پر بچّے کو لے کر گھر جاتی۔

بچہ اب ڈیڑھ برس کا ہو گیا تھا۔ وہ پرکاش کو ڈیڈی ڈیڈی کہہ کر پکارنے لگا تھا لیکن پرکاش کو اُس سے ایک اجنبیت کا احساس ہوتا تھا۔ وہ اپنے اندر بچّے کو بڑھ کر اُٹھا لینے کی خواہش نہ پاتا تھا۔

پھر شششی کی تمام تر توجہ بھی بچے پر مرکوز رہنے لگی تھی جیسے گھر میں پرکاش کا وجود دوسرے درجے کا ہو جس کی روٹی کپڑے اور آرام کا فرض شششی پر جبراً عائد کر دیا گیا ہو۔ جیسے شششی اب یہ سمجھنے لگی ہو کہ پرکاش نے اِس مجبور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اُس پر کوئی احسان نہیں کیا، اپنی مالی حیثیت کو بہتر بنانے کے لئے دانستہ طور پر یہ بوجھ گلے میں ڈالا ہے۔ وہ خود ہی محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ صورتِ حال اُس زنجیر کی ایک لازمی کڑی ہے جو اُس نے اپنے ہاتھوں میں ڈالی ہے۔

پرکاش شام کو دفتر سے عام شوہروں کے سے ذوق و شوق کے ساتھ یہ سمجھ کر گھر نہ لوٹتا تھا کہ وہاں اُس کی بیوی سج سنور کر بیٹھی اُس کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ سیر و تفریح کے لئے اُس نے کوئی پروگرام بنا رکھا ہوگا۔ اُس کے تھکے ہوئے اعصاب کو راحت پہنچانے کے لئے کافی یا چائے کے لئے گرم پانی کیتلی میں اُبل رہا ہوگا۔ بلکہ اُسے یہ سوچ کر پسینہ آجاتا کہ اس وقت تو شششی چودھری صاحب کے ہاں بچے کو کھلا رہی ہوگی۔ اُن کے باغیچے سے پھول چُن کر بچے کے لباس اور بالوں میں لگا رہی ہوگی اور جس وقت وہ گھر لوٹے گی تو وہ کافی پی کر بیٹھک میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا ہوگا۔ وہ آئے گی اور بچہ اُسے تھما کر خود رسوئی میں چلی جائے گی۔ اس طرح زندگی کا وہ حصہ جہاں جوانی کی کلیاں چٹکتی ہیں خزاں زدہ خشک پتّوں کا ڈھیر دکھائی دینے لگے گا۔

پھر ایک اور شک اُس کے ذہن میں جنم لینے لگا۔ چودھری صاحب اتنے شفیق اور ہمدرد کیوں ہیں؟ کیا دوسرے بچوں کی مائیں ملازمت نہیں کرتیں؟ لیکن چودھری صاحب نہ شششی کو روتا دیکھ سکتے ہیں نہ اُس کے بچے کو۔ پھر اُس کے موجودہ افسر کو کون سی مشکل درپیش ہے کہ وہ جب کبھی شام کو چودھری صاحب کے ہاں جاتا ہے تو اُن کا ڈرائیور ہی کار میں شششی کو گھر پہنچا جاتا ہے۔ یہ بچے کے لئے کھلونے، کپڑے اور دودھ کے ڈبے کیوں دے دیتے ہیں۔

کیا ایسے بے غرض، شفیق اور مہربان لوگ دُنیا میں کہیں اور بھی ہیں؟

اور پرکاش کو بینچ پر بیٹھے بیٹھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ بھی ایک سپیرا ہے جس کے گلے میں ان لوگوں نے مل کر ایک حسین سانپ لٹکا دیا ہے۔ وہ اُن لوگوں سے روزی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ سانپ کے لئے دودھ کے نام پر اپنے پیٹ کا ایندھن حاصل کر رہا ہے تاکہ کہیں یہ سانپ بپھر کر انھیں کاٹ نہ لے، اُن کے راز کو افشا نہ کر دے!

اُس کا جی چاہا کوٹ کی جیب میں سے تنخواہ کا پیکٹ نکال کر سامنے بہتی ہوئی نہر میں پھینک دے۔ لیکن وہ تو وہاں بیٹھا سپیرے کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ اُٹھ کر سپیرے کے پاس آگیا۔

اب بھی کچھ بچے اور ایک دو چپراسی وہاں کھڑے تھے۔ سپیرے نے دس کا نوٹ اُسے لوٹاتے ہوئے کہا۔

”نہیں بابو جی! یہ تو میری روزی کا سوال ہے!“

اور پرکاش سر جھکائے پھر بنچ پر آبیٹھا اور سوچنے لگا: اگر سپیرا زندہ سانپ کو گلے سے نہیں اُتار سکتا تو وہ مُردہ سانپ کا بوجھ کیسے گلے سے اُتار سکتا ہے؟ اور اُس نے تلخ گھونٹ بھر کر تنخواہ کا پیکٹ پھر جیب میں رکھ لیا!!

غزل

ڈاکٹر امرت لعل عشرت ایم۔ اے۔ ڈی لٹ

پھول شگوفے اُجڑے اُجڑے سُوکھی ڈالی ڈالی ہے
دوست ذرا آواز تو دینا کون چمن کا مالی ہے؟

قدم قدم پہ پابندی ہے ڈگر ڈگر پہ پہرے ہیں
کس کے ہیں یہ لوگ محافظ کس کی یہ رکھوالی ہے؟

مے نوشی کی تقریبوں کو موسم پہ موقوف نہ کر
موسم کا پابند نہ ہو یہ چیز بدلنے والی ہے

سُوکھ گیا اُمید کا گلشن پھر بھی دل کی بستی میں
آنکھوں کی برسات کے صدقے بے موسم ہریالی ہے

ہم نے اپنے دوست کی خاطر دُشمن سے بھی پیار کیا
اپنا مسلک پھول سے پہلے کانٹوں کی رکھوالی ہے

سچا شعر وہی ہے جس میں اپنے دل کی بات کہیں
اوروں کی باتیں دُہرانا شعر نہیں نقالی ہے

عشرت ہم نے اُردو کا بھی ایک زمانہ دیکھا تھا
لیکن اس بدبخت زباں کا اب تو اللہ والی ہے

امرت لعل عشرت

افسانہ

میری گلی کی ایک لڑکی

کشمیری لال ذاکر ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

۱۳۶۔ سیکٹر ۱۹۔ اے۔ چنڈی گڑھ

برادرِ گرامی! تسلیم

تاخیر اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ اب مجھے کہانی نہیں بھیجنی چاہئے۔ لیکن آپ ناراض ہوجائیں گے، یہی ڈر ہے۔ ناراض تو آپ اب بھی ہوں گے اور سو سو طرح سے کوسیں گے کہ میں ہر بار آپ کے لئے پریشانی کا باعث بنتا ہوں ـــــ کہانی نہ بھیجنے سے آپ زیادہ ناراض ہوں گے . . . کچھ ہی روز ہوئے عرش ملسیانی نے اپنے ایک خط میں مجھے لکھا تھا کہ میں نے اپنا تخلص بہت سوچ سمجھ کر رکھا تھا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایک دن ایک بہت بڑے آدمی بنیں گے۔ وہ ایک بہت عظیم آدمی بنے اور پھر اچانک ماضی کا ایک حصہ بن کر ہم سے جدا ہوگئے۔ ہماری تہذیب اور روایات کا ایک نمائندہ، سارے ملک کو یتیم کر گیا۔ ہم میں سے ہر ایک یہ محسوس کرتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یوں جدا ہو جانا اُس کے لئے ذاتی صدمہ ہے اور اب یہ جانکاہ صدمہ ہی ہم سب کا سرمایہ ہے۔ آپ کا بھی، میرا بھی، ہر ہندوستانی کا!

نیاز کیش ـــــ

★

ہر گلی میں دو طرفہ مکانوں کی قطاریں ہوتی ہیں۔ ہر مکان کی ایک ڈیوڑھی ہوتی ہے، ایک آنگن ہوتا ہے، کچھ کمرے ہوتے ہیں اور ان کمروں میں مختصر یا قدرے بڑے یا خاصے بڑے کنبے رہتے ہیں اور ان میں لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ کم عمر، جوانی کی حدوں پر کھڑی، بھرپور جوان، کم خوبصورت، خوبصورت اور ایکدم بے ہوش کر دینے والی کافر ادا دوشیزائیں اور ان لڑکیوں کی آنکھوں میں رنگا رنگ سپنوں کی رعنائیاں ہوتی ہیں۔ کچھ سپنے نکھرتے ہیں، کچھ کہانیاں رقص کرتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں کم ہی ہوتی ہیں جن کے دل و دماغ میں احساسات اور جذبات کا ہیجان نہیں ہوتا اور جن کے ذہن بالکل سپاٹ اور ہموار سڑک کی طرح سوئے رہتے ہیں۔ جن پر راہگیروں کی بھیڑ نہیں ہوتی۔ کندھے سے کندھا نہیں ٹکراتا، ہنگاموں کی چہل پہل نہیں ہوتی لیکن اس قسم کی لڑکیاں ہوتی ضرور ہیں اور ایسے ہی مکانوں میں رہتی ہیں جو گلی کے دونوں طرف دھوپ کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اپنے سایوں کے زاویے بدلتے رہتے ہیں۔ اُن کی شخصیت کی حقیقی تصویر جب سامنے آجاتی ہے انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

میں آج آپ سے ایسی ہی ایک لڑکی کی بات کرنا چاہتا ہوں جو میری اس مختصر سی گلی میں سامنے والی قطار کے مکانوں میں سے آخری مکان میں رہتی ہے۔ جس کے بعد وہ گلی مڑ کر ایک اور گلی میں مل جاتی ہے۔ جیسے ایک چھوٹی سی ندی مدّھم رفتار سے بہتی ہوئی اپنے آپ کو ایک اور ندی کی آغوش میں ڈال دے! میں نے کئی بار گلی سے گزرتے ہوئے اس لڑکی کو گھر کے دروازے کے ساتھ لگے کھڑے دیکھا ہے۔ دراز قد کی پتلی سی لڑکی۔ بہت گوری بھی نہیں لیکن اس کے نقش بڑے تیکھے ہیں۔ بڑے چست کپڑے پہنتی ہے جس سے اس کی پتلی کمر اور بھی پتلی نظر آتی ہے۔ اس کے بال بہت ہی لمبے ہیں اور میں نے اکثر اُسے اپنے انتہائی لمبے بالوں کو کھول کر اُن میں کنگھی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں کہ وہ اپنے بالوں میں کنگھی

مکان کے اندر کیوں نہیں کرتی۔ یوں باہر گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر کیوں کرتی ہے۔ جواب شاید اس کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ اگر ہوگا بھی تو وہ بناوٹی اور جھوٹا ہوگا۔ سچا جواب وہ نہیں دے سکے گی یا دے گی ہی نہیں۔ لیکن وہ اس انہماک سے بالوں میں کنگھی کرتی ہے کہ اُسے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ گلی سے کوئی گزر رہا ہے یا گزر گیا ہے یا گزرنے والا ہے۔ میرا خیال ہے اُسے کسی گزرنے والے کا انتظار نہیں۔ انتظار کرنے والی آنکھوں میں جو ایک کیفیت ہوتی ہے وہ اُس کی آنکھوں میں نہیں ہے۔ دل میں اگر ہو تو اُس کی آنچ اِتنی مدھم ہے کہ ابھی دل کے آنگن سے نکل کر آنکھوں کے دریچوں تک نہیں آتی۔

کبھی کبھی وہ لڑکی نظر نہیں بھی آتی۔ اُس کے گھر کے دروازے پر کوئی نیم پلیٹ بھی نہیں جس سے اُس کے والد یا بھائی یا کسی اور کے بارے میں کچھ جانا جا سکے۔ لیکن میں نے وہاں کبھی کسی مرد کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اِس طرح یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ اُس گھر میں کوئی مرد ہے ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے اُس کا باپ کہیں باہر سروس کر رہا ہو۔ اُس کا بھائی کسی دوسرے شہر میں تعلیم حاصل کر رہا ہو۔ یا یہ دونوں باتیں ہی غلط ہوں۔ بہرحال یہ چھوٹا سا، خاموش، گلی کے نکڑ پر اُونگھتا ہوا گھر مجھے کبھی جاگا ہوا نظر نہیں آیا۔ میں جب کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلتا ہوں تو اُس لڑکی کو گیٹ کے اندر کے چھوٹے سے آنگن میں اُگے ہوئے کسی پودے پر جھکے ہوئے دیکھتا ہوں۔ کئی بار میرے پلٹ پلٹ کر دیکھنے پر بھی وہ نظر نہیں آتی۔ ایک آدھ بار جب میں سہ پہر کو ہی گھر لوٹ آیا وہ وہیں کھڑی ملی۔ دروازے کے ساتھ لگی ہوئی۔ کئی بار شام کو آیا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ اُس کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں۔ لیکن ایک پابندی ضرور ہے۔ وہ یہ کہ جب بھی گھر پر ہو اپنا وقت کمروں کے اندر نہیں باہر آنگن میں گزارتی ہے۔ میں نہیں جانتا اِس کا کارن کیا ہے؟

مجھے اِس گلی میں رہتے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو چھ ماہ تو کیا کسی گلی میں چھ سال سے بھی رہ چکے ہوں تو ساتھ کے آنے والے سے متعارف نہیں ہوں گے۔ میں نہایت اَن سوشل آدمی ہوں بلکہ اینٹی سوشل ہوں۔ مجھے لوگوں سے مل کر قطعی خوشی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اکثر لوگ بڑی ہی سطحی قِسم کی باتیں کرتے ہیں۔ بڑی ہی عامیانہ گفتگو ہوتی ہے اُن کی اور مجھے کسی سطحی قِسم کے انسان یا عام قِسم کے ماحول سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یا تو مجھے ایکدم بے جان آدمی پسند ہیں اور یا پھر ایکدم پھلجھڑی جیسی شخصیت والے لوگ۔ درمیان کی یہ خلیج جو عام اور معمولی لوگوں کی بھیڑ سے اٹی پڑی ہے مجھے ہرگز گوارا نہیں۔ اِس لئے کسی جلتے ہوئے مکان میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے والا وہ آدمی مجھے متاثر کرتا ہے جو کسی معصوم سوئے ہوئے بچے کو بچانے کی کوشش میں خود جھلس جائے اور یا پھر وہ جو بے نیاز ایک طرف کھڑا شعلوں کو ایک دوسرے پر لپکتا ہوئے دیکھتا رہے اور اپنی جگہ سے نہ ہلے جب تک کہ آگ کی زد میں آئی ہوئی عمارت راکھ کا ڈھیر نہ بن جائے۔ اِس لئے اِس گلی میں میرا کوئی شناسا نہیں۔ کوئی مجھے نہیں جانتا۔ نہ میں ہی کسی کو جانتا ہوں۔

یہ گلی مڈل کلاس کے لوگوں کی گلی ہے۔ یہاں دفتروں میں کام کرنے والے کلرک، اسسٹنٹ یا چھوٹے موٹے دُکاندار رہتے ہیں۔ اِس تنگ گلی کی طرح اِس کے مکان بھی چھوٹے اور تنگ ہیں۔ لوگوں کے ذہن بھی گھٹے ہوئے ہیں۔ شام کو گلی کی عورتیں اپنی اپنی کھاٹ گھسیٹ کر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جاتی ہیں اور اِس خاموش اُونگھتی ہوئی مُردہ گلی میں جان پڑ جاتی ہے۔ دن میں تو یہ ایکدم بے جان رہتی ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کا مالک کسی دفتر میں اسسٹنٹ ہے اور اُس کی ادھیڑ عمر کی بیوی ایک پرائیویٹ سکول میں ماسٹرنی ہے۔ اِن کے کوئی اولاد نہیں۔ میں اوپر والے دو کمروں میں رہتا ہوں اور میری پُرانی سائیکل گراؤنڈ فلور کی سیڑھیوں کے نیچے پڑی رہتی ہے۔ میں نے اُس میں کبھی تالا نہیں لگایا۔ اِس لئے کہ اِس گلی میں رہنے والے لوگوں کے کردار میں بے ایمانی کا عنصر نہیں ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ اِس طبقے کے لوگ بے ایمان نہیں ہوتے، چور نہیں ہوتے، جھوٹے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اُن سب کی سماجی حیثیت ایک جیسی ہے۔ کسی کے یہاں چوری کئے جانے کے لائق کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جھوٹ بول کر چھپانے کو کوئی راز نہیں ہوتا۔ میں سائیکل تو کیا اپنے کمروں میں بھی تالا نہیں ڈالتا۔ میرے مالک مکان نے کئی بار ٹوکا بھی ہے لیکن میں نے سدا مُسکرا کر اُس کی بات ٹال دی ہے۔ مجھے یہ مکان اِس لئے بھی پسند ہے کہ مالک مکان میرے بارے میں بے نیاز رہتا ہے۔ وہ خواہ مخواہ کے تعلقات بڑھانے کے لئے وقت بے وقت میرے کمرے میں نہیں آ ٹپکتا۔ اُس کی بیوی بھی عام عورتوں کی طرح اونچا نہیں بولتی اور فضول سی باتوں پر اپنے گھر والے سے نہیں جھگڑتی۔

اپنی گلی کے بارے میں یہ ساری باتیں میں اِس لئے بتا رہا ہوں کہ وہ کیسوں تیار ہو سکے جس پر گیٹ کے ساتھ کھڑی لمبے لمبے بالوں والی بے نیازی

سے کنگھی کرتی ہوئی اُس خاموش لڑکی کی تصویر اُبھر سکے۔ ایک ایسی تصویر جس کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہے اور ایک ایسا شاہکار ہے جسے ابھی تک کسی نمائش میں جگہ نہیں ملی۔ گلی کے مُکّڑ پر رکھی ہوئی اِس تصویر پر آہستہ آہستہ گرد جمتی جا رہی ہے اور اگر دھُول کے جمع ہو جانے کا یہ تسلسل جاری رہا تو صرف کینوس ہی کینوس رہ جائے گا۔ تصویر اوجھل ہو جائے گی اور لمبے لمبے سیاہ گیسوؤں کی گھٹا بِن برسے ہی گُزر جائے گی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کاش یہ گھٹا کہیں برس جائے اور کسی سوکھی دھرتی کو نہال کر دے۔ اُفق کے کسی زاویے سے بجلی چمکے اور گھٹا ٹوپ اندھیرا جگمگا اُٹھے۔ چاہے یہ روشنی پل بھر کی ہی کیوں نہ ہو۔

کل اتوار تھا۔ بالکل چُھٹّی کا موڈ تھا۔ میں اسٹوو پر چائے تیار کر رہا تھا۔ اسٹوو بہت آواز دینے لگا ہے۔ نیا خریدنا پڑے گا۔ بیچارے نے بہت دن ساتھ دیا ہے۔ میری مُجرّد زندگی سے اِس کا بڑا گہرا تعلّق ہے۔ اسٹوو کا شور اِتنا زیادہ تھا کہ میں اپنے مالک مکان کی آواز نہیں سُن سکا۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ مالک مکان سیڑھیوں میں کھڑا تھا۔

"غالباً اسٹوو کے شور میں آپ نے میری آواز نہیں سُنی" وہ بولا۔

"مجھے افسوس ہے۔ اندر آئیے آپ"

"نہیں، شکریہ۔ آپ نیچے آ سکتے ہیں تھوڑی دیر کے لئے؟" وہ بڑا مضطرب نظر آتا تھا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"بس نیچے آ جائیے"

میں نے اسٹوو بند کیا۔ کیتلی میں اُبلتے ہوئے پانی کو وہیں چھوڑا۔ اپنی پھٹی ہوئی بنیان کو چُھپانے کے لئے کُرتہ پہن لیا اور چپّل پیروں میں پھنسا کر دروازہ بھی کُھلا ہی چھوڑتے ہوئے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گیا۔

صحن میں محلّے کے کچھ لوگ کھڑے تھے۔

سب نے نمستے کی۔ مجھے پچھلے چھ ماہ میں پہلی بار اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ ورنہ میں تو اب تک اپنے آپ کو ایک عام سا رپورٹر ہی سمجھتا تھا۔ جو دن بھر گھوم کر اخباروں کے لئے خبریں اِکٹھی کرتا رہتا ہے۔ یہ میرا پہلا ردِّ عمل تھا۔ دوسرا ردِّ عمل یہ تھا کہ کوئی سیریس سچوایشن ہے، اِس لئے میں گھبرا گیا اور لمحے بھر میں کئی باتیں ذہن میں گھوم گئیں۔

نمستے کے لئے ہاتھ جوڑتے ہوئے میں نے کہا۔

"فرمایئے"

اُن سب کی نمائندگی کرتے ہوئے میرا مالک مکان بولا۔

"بات یہ ہے کمار صاحب کہ گلی میں ایک خودکشی کا کیس ہو گیا ہے"

"کس نے کی ہے خودکشی؟"

"گلی کے آخری مکان میں رہنے والی نرس نے" صحن میں مجتمع لوگوں میں سے ایک نے کہا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے اُس کے لہجے میں حسد کا جذبہ ہو۔

"پولیس آ گئی ہے اور سارا محلّہ اِکٹھا ہو گیا ہے" یہ دوسری آواز تھی۔

"یہ بڑا سیریس معاملہ ہے۔ اچھا ہے اگر کوئی پریس رپورٹر بھی موجود ہو" یہ تیسری آواز تھی۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے پل بھر میں ایک طوفان گُزر گیا تھا اور میرے دل و دماغ مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔

"کمار صاحب آیئے" "میں پولیس والوں سے آپ کے بارے میں کہہ کر آیا تھا" میرے مالک مکان نے باہر چلنے کا اشارہ کیا اور پھر مجھے بڑی شفقت سے بازو پکڑے باہر لے آیا۔ باقی سب لوگ بھی ساتھ ہو لئے۔

مکان سے باہر نکلا تو دیکھا گلی کے آخری مکان کے سامنے بھیڑ جمع تھی اور پولس کے سپاہی کھڑے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے پاؤں کانپ رہے ہوں۔ دونوں طرف کے مکانوں کے باہر عورتیں کھڑی تھیں۔ آپس میں باتیں کرتی ہوئی۔ لیکن میری ساری توجّہ اپنے آپ پر مرکوز تھی۔ میں جیسے کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا اور آخر گلی کے آخری مکان کے سامنے رُک گیا۔

پھر پولس کا سب انسپکٹر دو ایک معتبر آدمیوں کے ساتھ مجھے مکان کے اندر لے گیا۔ ایک نہایت ہی نفیس بستر پر لمبے لمبے بالوں والی وہ لڑکی بے جان پڑی تھی۔ اُس کے بال کُھل کر بستر پر اِس طرح پھیل گئے تھے جیسے وہ بستر پر چادر نہیں اپنے گیسو بچھا کر سوئی ہو۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ پاس ہی ادھیڑ عمر کی ایک عورت کھڑی تھی۔ جیسے وہ بہت روئی ہو اور اب اُس سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ اُس نے رُک رُک کر کہا۔

"رات یہ ہسپتال سے بڑی دیر میں آئی۔ کھانے کے لئے پُوچھا تو اُس نے انکار کر دیا۔ کہنے لگی مجھے صبح جگانا مت میری چُھٹّی ہے۔ پھر اُس نے اپنی یونیفارم اُتاری، کپڑے بدلے، برش کیا اور پانی کا جگ اور گلاس تپائی پر

رکھ کر ایک بار میرے کمرے میں آئی اور میرے ہاتھ میں تہہ کئے ہوئے نوٹ تھماتے ہوئے کہا: "پچھلے تین مہینوں کی تنخواہ کا ایریر ملا ہے، سنبھال لو" اور پھر میرا دروازہ آہستہ سے بند کرکے چلی گئی۔ میں رات کو ایک بار اٹھی تو اس کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ شاید بجھانا بھول گئی تھی وہ۔ کمرے کا دروازہ بھی اس نے اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ شاید جان بوجھ کر کہ صبح توڑنا نہ پڑے۔ صبح جب دیر تک نہیں جاگی تو میں اس کے کمرے میں آئی اور دیکھا کہ وہ مری پڑی تھی" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس کے آنسو بجلی کی روشنی میں چمکنے لگے۔ کمرے میں بتی اب بھی جل رہی تھی۔

"آپ بتا سکتی ہیں کہ اس نے کیوں خودکشی کی؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی"

"لوگ کہتے ہیں کہ آپ اس کی سوتیلی ماں ہیں"

"لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں"

"آپ سے اس کے تعلقات کیسے تھے؟"

"جیسے ایک ماں کے ایک بیٹی سے ہو سکتے ہیں" اس نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کا کسی سے ملنا جلنا تھا؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"یہاں کبھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا"

"اس کی کوئی فرینڈ اس کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہے؟"

"اس کی شاید کوئی فرینڈ نہیں تھی۔ اس نے دل کی بات کبھی اپنے آپ سے بھی نہیں کی"

"نیند کی گولیاں پہلے بھی کھائی تھیں کبھی اس نے؟"

"مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ اس نے آج تک اپنی کوئی تکلیف مجھ سے نہیں کہی"

اور میں پلنگ پر الٹی پڑی لڑکی کو اس انہماک سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ لڑکی بے جان نہیں تھی بلکہ پل بھر کو سو گئی تھی اور جانے کس وقت بول اٹھے اور کہے کہ جو کچھ بھی اس کے بارے میں کہا جا رہا تھا وہ سب غلط تھا۔ اس کے اور اس کی سوتیلی ماں کے تعلقات بے حد کشیدہ تھے۔ اس کا بہت سے لوگوں سے ملنا جلنا تھا اور اس کی ہر دوست اس کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ وہ خواب آور گولیاں کھانے کی عادی تھی اور ان کے بغیر اس کے دل میں اٹھتا ہوا درد اس سے سہا نہیں جاتا تھا۔

اور پھر سب انسپکٹر نے لفافے میں بند وہ مختصر سا خط نکالا جو اس نے آتے ہی اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔

"یہ خط پڑھیے"

اس نے مجھے وہ خط دیا۔ لکھا تھا

"میری موت کا ذمّے دار کوئی نہیں۔ زندگی سے مجھے بے حد پیار ہے اور یہی پیار میری خودکشی کا کارن ہے۔ میں نے ہمیشہ ہی دوسروں کے بارے میں اور خود اپنے بارے میں غلط اندازے قائم کئے ہیں۔ میری موت کے ذمّے دار یہ غلط اندازے ہیں جنھیں میں اپنے غلط سماجی ماحول میں پرورش کرتی رہی ہوں۔ اگر کسی عدالت میں ان غلط اندازوں پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے تو چلا کر اور انھیں پھانسی پر لٹکا دو۔ ان کے یوں قتل ہو جانے سے کتنی ہی معصوم جوانیاں بچ جائیں گی۔ پھانسی پر لٹکانے کے لئے ڈوری میرے خوبصورت بالوں سے تیار کی جا سکتی ہے۔ جنھیں میں نے اپنے غلط اندازوں کی طرح بڑی محنت سے پالا ہے۔ میرے یہ خوبصورت سیاہ لمبے بال ایک اور شخص کو بھی پسند ہیں۔ جنھیں وہ بڑی حسرت سے دیکھا کرتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو میرے یہ گیسو اُسے دے دینا۔ میں اُس شخص کو جانتی نہیں صرف پہچانتی ہوں"

خط پڑھتے ہی میرا تمام جسم پسینے سے شرابور ہو گیا اور میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ میں نے وہ خط پاس کھڑے ہوئے آدمی کو دے دیا۔

اور انہی کانپتے ہاتھوں سے میں نے محلّے کے دو اور معتبر آدمیوں کے ساتھ گواہی کے طور پر پولس کے کاغذات پر دستخط کر دئے۔ میں نے یہ پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اس کاغذ پر کیا لکھا تھا۔

گیسوؤں کی کالی گھنگھور گھٹا، میری پلکوں پر گھل کر برس گئی تھی !!



بوئے گم شدہ

آنند نرائن ملا ممبر پارلیمنٹ

اُٹھ گیا وہ جو تھا اِک عارفِ کامل ساقی
کہیں ملتا ہو تو لا اُس کا مقابل ساقی

پاک دل پاک نفس، دیدۂ بینا میں لئے
ایک میزانِ تمیزِ حق و باطل ساقی

اپنے ہر جلوۂ شب تاب پہ چادر ڈالے
اپنی لیلیٰ کو چھپائے پسِ محمل ساقی

سادگی عجز توازن، اور اک آہنگ نظر — مردِ درویش کا پہلو میں لئے دل ساقی
سادگی جو نہ تھی کم مائگیٔ رنگ کا نام — بلکہ وہ جس میں ہر اِک رنگ تھا شامل ساقی
عجز وہ جو نہ تھا بس ایک رعونت کی نقاب — بلکہ دانش کی جو ہے آخری منزل ساقی
وہ توازن کہ جو کوتاہیٔ احساس نہ تھا — بلکہ تہذیبِ دل و ذہن کا حاصل ساقی
ایک آہنگِ نظر سطحِ سیاست سے بلند — دلِ انساں کے جو ہر خواب کا حامل ساقی
کوئے دشنام میں آیا تھا لئے لب پہ سرود — سنگ و آہن کی دکانوں میں لئے دل ساقی
جام بنتے ہی رہینگے مگر آئیگی کہاں — پھر یہ فردوس کے پھولوں میں بسی گِل ساقی
کتنی بے ربط ہے دھارے پہ سفینوں کی قطار — صرف اِک ناؤ گئی جانبِ ساحل ساقی
صفِ اوّل سے فقط ایک ہی میخوار اُٹھا — کتنی سنسان ہے لیکن تری محفل ساقی
ایک ہی شمع بجھی موت کے ہاتھوں لیکن — کتنی تاریک ہوئی قوم کی منزل ساقی
اِک کلی آئی تھی خوشبو لیے کچھ دم کے لئے — وہ گئی - پھر وہی کانٹوں کی ہے محفل ساقی

دفن ہو جائے نہ خوشبو بھی کہیں پھول کے ساتھ
یہی خوشبو تو ہے اِس بزم کا حاصل ساقی

آنند نرائن ملا


ایک چھلانگ اور لگاؤ
پیارا گلوکو بسکٹ پاؤ
پھر ہم دونوں مِلکر کھائیں
کھیلیں، کُودیں، دھوم مچائیں
پارلے
گلوکو
بسکٹ
PARLE
Gluco
BISCUITS
★ بڑھیا ذائقہ
★ انوکھی لذت
★ کُرکُرے، ہمیشہ تازہ
★ بے مثال صحت و قوت
اسی لئے تو پارلے گلوکو بھارت کے سب سے زیادہ بکنے والے بسکٹ ہیں!

افسانہ

بیتے دنوں کا چور

پرنسپل جوگندر پال ایم۔ اے

پارک وِلا، مقبرہ روڈ۔ اورنگ آباد دکن (مہاراشٹر)

برادرِ محترم! خلوص

. . . یہی سوچ رہا تھا کہ کوئی اے ون تخلیق تیار ہولے تو اُسے لے کر ہی آپ کے پاس پہنچوں۔ سو اب "بیتے دنوں کا چور" لایا ہوں۔ اپنی اِس کہانی کی تعریف محض اِس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ مجھے یقین ہے، اب کے یہ نیک فرض آپ انجام دیں گے ـــــ ہے نا کوتاہ سی خواہش؟ پر کیا کروں؟ عظمت کی کوتاہی سے اعلانِ جنگ کرنے کا حوصلہ نہیں ـــــ چھوڑیئے یہ قصّہ، اور کہانی پڑھئے اور خوش ہوئیے اور مجھے بھی خوش کیجئے۔

آپ کا ـــــ جوگندر پال

★

آج میرا جنم دن ہے۔

پچیس سال کی عمر سے میں اپنا جنم دن باقاعدگی سے منا رہا ہوں اور ہر جنم دن پہ مجھے لگتا ہے کہ میرا پچھلا جنم دن لوٹ آیا ہے، اِس لئے پینتالیس برس کا ہو کر بھی مجھے یہی محسوس ہو رہا ہے کہ میں پچیس برس کا ہوں۔ مجھے ساری دُنیا بدستور نوعمر نظر آ رہی ہے۔ سب عورتیں اُسی طرح خوبصورت ہیں اور انھیں دیکھ دیکھ کر میں اُسی طرح ایک بے چین سی مسرّت سے سرشار ہو جاتا ہوں اور مجھے اپنا بدن ہرا بھرا محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے کسی پُرانے پیڑ کے توانا تنے پر ہرے بھرے پتّے پھوٹے ہوئے ہوں۔ میں اُسی طرح نو بہ نو ہوں۔ ابھی ابھی میرا یہ وسیع حال میرے خوش پوش دوستوں سے بھر جائے گا۔ مِس سونی اپنے رنڈوے بھائی کے ساتھ ساتھ ـــــ نہیں، اُس کے آگے آگے چلتی ہوئی ـــــ نہیں، اُڑتی ہوئی آئے گی اور پھر اِس ہال کے اندر اُڑ اُڑ کر یہاں سے وہاں اور پھر وہاں ـــــ وہاں یا وہاں جا بیٹھے گی اور میرے ہاتھ نہ آئے گی اور پھر میں تھک کر مِسز ڈُوڈ کے پاس آ بیٹھوں گا۔

"مِسز ڈُوڈ! مسٹر ڈُوڈ کو ساتھ کیوں نہیں لائیں؟"

"لاؤں کیسے؟ وہ مجھے آج کل نظر ہی نہیں آتا۔ کہیں اپنی جنّت میں پڑا رہتا ہے!"

"ہاں، جنّت میں تمھارا داخلہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے مِسز ڈُوڈ؟" میں مُسکرا کر اُس کے قریب سرک آؤں گا۔ "میں تو تمھیں نظر آ رہا ہوں مِسز ڈُوڈ۔ مجھے اپنے ساتھ کہیں لے چلو۔"

مِسز ڈُوڈ خوش ہو جائے گی۔

"کہاں لے چلوں، یُوسَن آف ڈیول؟"

"اور کہاں؟ اپنے جہنّم میں، جہاں تم اپنے شوہر کی نظر سے اوجھل رہتی ہو؟"

مِسز ڈُوڈ کی مصنوعی ناراضگی اُسے اور خوبصورت بنا دے گی اور میری طرف دیکھ کر وہ خفا ہونا بھول کر شرما جائے گی۔ کسی کانوینٹ ہائی سکول گرل کے مانند جس کے سامنے اُس کے بوائے فرینڈ نے موقع پا کر اپنی خواہش کا اظہار کیا ہو اور وہ شرما گئی ہو اور شرما کر اُسے خیال آیا ہو کہ 'نا' کہہ دے مگر اُسے ڈر ہو کہ کہیں اُس کا بوائے فرینڈ سچ مچ کی 'نا' نہ سمجھ لے۔ تو پھر، ہاں ـــــ نہیں، ایسا کیسے؟ ـــــ نہیں؟ ـــــ نہیں!

مجھے عورتوں کا یہ فیصلہ کُن غیر فیصلہ پن بڑا بھلا لگتا ہے۔ دو ٹوک عورتیں بھی مجھے یوں ہی معلوم ہوتی ہیں جیسے وہ محض اِس لئے

دوٹوک ہوں کہ دراصل دوٹوک نہیں ہونا چاہتیں۔

دیوکا مجھ سے پندرہ بیس برس چھوٹی ہے ——— شاید بیس برس چھوٹی ہے، اور پندرہ بیس برس کہہ کر میں شاید اپنے آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ وہ مجھ سے صرف پندرہ برس چھوٹی ہے، یعنی محض دس پندرہ برس، یہی پانچ دس برس! یہ بھی کوئی فرق ہے؟ ہم دونوں ہم عمر ہیں، ہم دونوں کی خواہشات بیک شدّت جوان ہیں۔

لیکن دیوکا کا رویّہ مجھ سے دوٹوک ہے۔

"دیوکا! آج شام کو آسکو تو تمھیں ایک نہایت عمدہ کتاب دوں گا!"

دیوکا مجھ سے یورپی ادب کی کتابیں لے کر پڑھتی ہے لہٰذا میں یہ کتابیں اپنے بجائے اُس کے پڑھنے کے لئے لے آتا ہوں اور انھیں اس لئے پڑھتا ہوں کہ دیوکا سے ان کے بارے میں (؟) بات چیت کر سکوں۔ اس بات چیت میں میرا لہجہ اتنا فراواں ہو جاتا ہے کہ مجھے اپنی ذہانت پر تعجّب ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ اپنی یونیورسٹی کلاس میں طلباء سے کوئی ادبی بحث کرنے کے بجائے میں انھیں نوٹس لکھوا لکھوا کر اپنا سارا ٹائم پورا کر دیتا ہوں تاکہ کم سے کم باتیں کرنے کی گنجائش پیدا ہو۔

دیوکا میری ذہانت سے بہت مرعوب ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ دوٹوک ہے۔

"آج شام کو میں نہیں آسکتی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں اور رگھو آج فلم دیکھنے جا رہے ہیں۔" رگھو اُس کے شوہر کا نام ہے۔

"فلموں میں کیا رکھا ہے دیوکا؟"

وہ خاموش ہے مگر میں نے اپنے آپ کو جواب دیا ہے: "رگھو!"

"کتابیں پڑھا کرو۔" میں نے اپنے آپ کو بتایا ہے کہ کتابوں میں میرے سوا کیا رکھا ہے۔

"کتابیں پڑھا کرو دیوکا!"

"وہ تو پڑھتی ہی رہتی ہوں لیکن آج رگھو بہت مشکل سے فری ہوا ہے۔ پہلے ہم چھ بجے کا شو دیکھیں گے۔ پھر کسی نہایت عمدہ ریستوران میں ڈنر لیں گے۔ پھر ———"

میں اُسے سُن نہیں رہا ہوں بلکہ اُس کے ہونٹوں کی ترشی ترشی باریک گولائیوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کہہ رہی ہے۔

"رگھو سے میرا رشتہ بدن کا رشتہ ہے، ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہوئے ہم بے اختیار اُس وقت تک بڑھتے چلے جاتے ہیں جب تک بغلگیر نہ ہو جائیں ——— اور کتابوں کا رشتہ؟ کتابوں سے بزرگ و خورد کا رشتہ بنتا ہے۔ آپ میرے بزرگ ہیں، میرے ———"

(دیوکا کا باپ مجھ سے پانچ ہی برس بڑا ہوگا)

——— میں دیوکا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کہیں تم میری محبت کو پدرانہ شفقت پر محمول تو نہیں کرتیں ——— نہیں، دوٹوک ہونے کے باوجود دیوکا چاہتی ہے کہ میری غلط فہمی باقی رہے۔ دُھند صاف نہ ہو، کیونکہ اِس دُھند میں میرے فراواں لہجے پر اُسے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ سحاب کے جھنڈ کے جھنڈ عرشِ بریں سے اُتر اُتر کر اُس سے کوئی ایک ہاتھ کی بلندی تک آپہنچے ہیں اور وہ کسی جل پری کی طرح آبی تہوں کے نیچے آرام سے جی رہی ہے۔

میں اکثر جھلّا جاتا ہوں۔ کیا میں اُس کا سٹوَرڈ ہوں اور میرا کام یہی ہے کہ اُس کے عیش و آرام کے اسباب مہیّا کرنے کی خاطر اپنی باتوں سے اُس کے آس پاس کی ایر کنڈیشننگ کرتا رہوں؟ ——— کہ رگھو اِس ایر کنڈیشنڈ اپارٹمنٹ میں بلا جھجک آکر بے اختیار کہہ دے: "بیوٹی فل!" دیوکا کے ذہن کو میں اپنی فکرِ جمیل کے اِتنے انجکشن اِس لئے دیتا رہتا ہوں کہ وہ اپنا سارا جمالِ رُخ مجھے سونپ دے۔ مگر میری فکر کی بوند بوند اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد وہ رگھو کی باتیں کرنا شروع کر دیتی ہے اور مجھے دُھند کے ہٹنے کا احساس ہونے لگتا ہے تو اُس کی فلرٹنگ مُسکان سے از سرِ نَو دُھند برآمد ہونے لگتی ہے۔ صبح نشانات ماند پڑنے لگتے ہیں اور میری کُنچڑی کُنچڑی سوچ پھر مستعد ہونے لگتی ہے۔ اِسی استعداد کی بھرپور کیفیت میں بہ آوازِ بلند سوچنے کے انداز میں میں اُس سے پوچھ لیتا ہوں۔ محبت کرنے کے لئے کیا یہی کافی نہیں دیوکا، کہ آدمی کی خواہش جوان ہو؟

مگر اِس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے دیوکا سے محبت ہے۔ مجھے دراصل جوانی سے محبت ہے۔ ہر جوان شے مجھے شراب کی بھری ہوئی بوتل کے مانند نشہ آور معلوم ہوتی ہے اور مجھ میں اِتنا بھی دَم نہیں ہوتا کہ تحمّل سے اُس کا کاک کھول کے، اُسے گلاس میں اُنڈیل کر تہذیب و شرافت سے اِس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھروں۔ بس ساری کی ساری کاک اور لیبل

اور شیشے سمیت نظر ہی نظر میں اپنے حلق میں انڈیل لیتا ہوں۔ میری خواہشات اتنی جوان اور تُند اور بے لگام ہیں کہ مجھے بے بس کر دیتی ہیں۔ ہر جوان دیوکا مجھے اپنی ہی خواہش معلوم ہوتی ہے۔ میری پچیسویں سالگرہ کی خواہش، جو آج پینتالیسویں سالگرہ کے موقع پر میرے اندر جوں کی توں شباب پر ہے۔

آج میری پینتالیسویں سالگرہ ہے اور میں نے حسبِ معمول شہر کی سب خوبصورت عورتوں کو اُن کے شوہروں کے نام دعوت نامے بھیجے ہیں۔ تھوڑی دیر میں یہاں جمال و جوانی کا سیلاب اُمڈ آئے گا اور پُرانی مِٹی بہہ جائے گی اور چٹان اسی طرح کھڑی رہے گی، سرتاپا دُھل کر نوشگفتہ نکل آئے گی اور حسبِ سابق میں بڑی سرگرمی سے اپنی عمر کے پچیسویں سال میں قدم رکھوں گا اور رنجنہ، کنول، سونی، ٹوڈی، دیوکا —— یہ سب دیوکائیں پُراستعجاب توصیف سے میری طرف دیکھ رہی ہوں گی۔

میری گذشتہ سالگرہ پر کسی مسز رانا نے پوچھا —— "آج آپ اپنی عمر کے کتنے سال پورے کر چکے ہیں؟"

"میں کوئی بوڑھی عورت تو ہوں نہیں جو جھوٹی عمر بتاؤں —— چوبیس!"

"تعجب ہے!"

"میں اپنی کنپٹیوں پر سفید لکیریں پینٹ کر لیتا ہوں مادام!" میں نے اُسے بتایا۔ "جیسے بوڑھی عورتیں اپنے سفید بالوں کو سیاہ کر لیتی ہیں کہ جوان معلوم ہوں۔ ویسے جوان مرد اپنے سیاہ بالوں میں سفیدی بھر لیتے ہیں کہ اُن کے پختہ شعور کا اشتہار ہو ——"

"ہاں" معصوم سی مسز رانا نے جواب دیا۔ "میں بھی حیران تھی کہ آپ اتنے جوان ہیں، پھر اتنے بوڑھے کیوں لگ رہے ہیں؟"

"کیونکہ میں اتنا جوان ہوں!"

سچ ہی تو ہے۔ جوانی کی چاہ ہی ہمیں بوڑھا بناتی ہے۔ بڑھاپے میں جوانی کی چاہ نہ ہو تو سب بوڑھوں کے چہرے جھریوں سے مبرّا ہوں۔ ہمارا دودھ والا بوڑھا بے حساب بوڑھا ہے۔ نہ جانے کب پیدا ہوا، کب جوان، کب بوڑھا۔ اَن گنت سالوں سے یونہی ایک سا نظر آرہا ہے۔ ہر صبح وہ اپنی کھاٹ سے اُٹھتا ہے تو گویا اس کی پیدائش ہوتی ہے اور سارا دن جی بھر کے جی لینے کے بعد ہر رات کو کھاٹ پر لیٹتے ہی اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ساری عمر روز بروز جیتا ہے اِس لئے اُسے جوانی کی



چاہ ہے نہ بڑھاپے کا علم! اور اس کا چہرہ اس کے کھرے دودھ کی طرح گاڑھا اور اُجلا ہے۔

لیکن میرے چہرے پر گذشتہ چند برس سے بڑھاپے کے آثار پیدا ہونا شروع ہو چکے ہیں۔ میری جوانی مجھے سال بہ سال بوڑھا کئے جا رہی ہے۔ میں ایک ایک دن کی عمر لے کے نہیں آیا، ایک ہی عمر لے کے آیا ہوں۔ میری عمر کا دھاگا ایک بار ٹوٹ گیا تو میری سدا کی موت ہو جائے گی۔ میں بہت پڑھا لکھا آدمی ہوں اور میرا یقین ہے کہ ایک دفعہ مر کے میں دوسری بار پیدا نہ ہوں گا۔ اِس لئے مجھ میں مرنے کا حوصلہ نہیں۔ رات کو سوتے ہوئے میں اپنے اوپر ہمیشہ ایسی کیفیت طاری کر لیتا ہوں کہ نیند میں بھی اسی جاگتی جاگتی زندگی کا احساس رہے۔ میں سوتا بھی ہوں تو حقیقت میں جاگتا ہوتا ہوں۔ آپ یقین کیجئے کہ میں کبھی نہ سو پایا۔ اس دن سے کبھی نہ سو پایا (کس دن سے؟) وقت کو اپنی گرفت میں لئے رکھنے کی خاطر میں اپنے سونے کی خواہش سے لڑتا رہتا ہوں۔ بے خوابی نے میرے اعصاب کھینچے کھینچے رہتے ہیں۔ میرا بدن ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ میں بوڑھا ہو رہا ہوں، لیکن وقت کو میں نے اپنی مٹھی میں زور سے دبا رکھا ہے تاکہ جب تک میں زندہ رہوں، اپنے پچیسویں برس سے وداع نہ ہوں۔ پچھلے بیس برس سے میں اپنے

پچیسویں برس سے نکل کر پھر پچیسویں برس میں داخل ہو جاتا ہوں۔ میں پچیس برس کا بوڑھا ہوں۔ میری جوانی ہی نے مجھے بڑھاپے کے اِس دوزخ میں آمار رکھا ہے۔

آج میرا جنم دن ہے۔

پچیسواں (پینتالیسواں)

تھوڑی دیر میں یہاں جوان عورتوں کی برات اُتر آئے گی۔ آج میں پیدا ہوا تھا۔ ماں کے پیٹ سے نکل کر کائنات کے پیٹ میں اُتر آیا تھا۔ ابھی مجھے پیدا ہونا ہے۔ کائنات کے پیٹ سے باہر آؤں گا تو پیدا ہوں گا، مر جاؤں گا تو پیدا ہوں گا۔ کیونکہ مرنے کے بعد آدمی کسی اور پیٹ میں نہیں اُترتا، بلکہ باہر آجاتا ہے۔ موت کی بدولت آزاد متنفس زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔

لیکن میں نے یہ کیا بکواس شروع کر دی ہے۔ آج خوشی کا دن ہے۔ میرا جنم دن! اسی دن میں دُولہا بھی بنا تھا۔ شادی سے پہلے میں ممی سے اتنی محبت کرتا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ میں اُسے کبھی نہ پا سکوں گا۔ ممی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے اور زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری بھی ہو جائے تو خواہش مند بے چارہ اُس کے پورے ہونے کے انتظار ہی میں بیٹھا ہوتا ہے۔ میری یہ خواہش پوری ہو گئی مگر ــــــ

مگر آپ کو بور کیوں کروں؟

آج میرا جنم دن ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں لوگ آنا شروع ہو جائیں گے ــــــ نہیں، کوئی آ رہا ہے۔ میں اپنے مہمان کے استقبال کے لئے ہال کے دروازے کی طرف قدم اُٹھا رہا ہوں۔ میرا اصول ہے کہ اپنے جنم دن کی تقریب پر اپنی پہلی مہمان خاتون کا استقبال کرتے ہوئے نتائج سے بے پروا ہو کر میں اُس کے ہاتھ چوم لیتا ہوں اور اُس سے اصرار کرتا ہوں کہ وہ اپنی کوئی خواہش بیان کرے۔

"ہیلو، روزی!" میں نے شکر ادا کیا کہ پہلی مہمان روزی کی ماں کے بجائے روزی ہے!

روزی کے ہاتھ چوم کر میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

"میں اپنی ہر پچیسویں سالگرہ پر کسی حسین عورت کی ایک خواہش پوری کرتا ہوں۔ بولو روزی! تمھاری کیا خواہش ہے؟"

"پورا اولڈ بولئے!" روزی نے محبوبانہ انداز میں کہا۔

"بولو روزی!"

"وعدہ کرتے ہو کہ میری خواہش پوری کرو گے؟"

"ہاں، شیور، روزی!"

"میں تمھارا بیڈ رُوم دیکھنا چاہتی ہوں ــــــ"

یہ کیسی لڑکی ہے!

"چلو" میں نے اُس سے کہا ہے، حالانکہ کسی غیر عورت کو میں اپنی خوابگاہ میں کبھی نہیں آنے دیتا۔

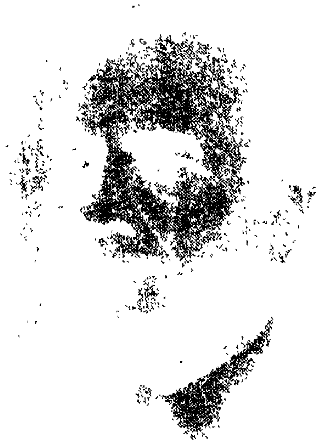
میرے بیڈ رُوم میں داخل ہو کر سب سے پہلے سامنے کی بالائی دیوار پر ایک بڑی خوبصورت تصویر نظر آتی ہے۔ میرے شکست خوردہ ضمیر کی تصویر!

"ہاؤ بیوٹی فل!" روزی اِس نہایت خوبصورت فُل سائز پورٹریٹ کو دیکھ کر مبہوت رہ گئی ہے۔ "یہ کس کی تصویر ہے؟"

میری نظر بھی تصویر پر جمی ہوئی ہے۔

"کیا یہ تمھاری بیٹی ہے اولڈ مین؟"

یہ تصویر میری بیوی ممی کی ہے جو میری پچیسویں سالگرہ کی شام کو ایک حادثے کا شکار ہو کر اچانک چل بسی۔ اسی لئے اِس بڑھاپے میں بھی میری زندگی کی یہ سب سے بڑی خواہش جوں کی توں جوان ہے!!



لالہ زار

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور، ایم۔اے، ایم۔او۔ایل، پی ایچ۔ڈی

تُو نے دِکھا کے جلوۂ ہر پردہ در مجھے
بخشے ہیں دیدہ ہائے دو عالم نگر مجھے

کیا بات تیرے حُسنِ تجلّی طراز کی
آتی ہے تجھ پہ اپنی نظر بھی نظر مجھے

مجھ میں تری نگاہ نے چھوڑا ہی کچھ نہیں
اِک برق تھی جو پھونک گئی سر بسر مجھے

کس موڑ سے گزار رہا تھا انھیں خیال
مُڑ مُڑ کے دیکھتے تھے سرِ رہ گزر مجھے

معلوم کچھ نہیں دمِ دیدار کیا ہُوا
ہے انتہائے بے خبری تک خبر مجھے

عُمرت دراز! رنج کی باتوں سے فائدہ؟
یہ رنج وہ نہیں جو رہے عمر بھر مجھے

خوش فہم کر دیا تری اُلفت نے اس قدر
آرام کا گمان ہے آزار پر مجھے

آزادیاں ہیں قیدِ شدید اے ستم شعار
آزادیوں کی قید سے آزاد کر مجھے

اُٹھتے ہیں جلد جلد مرے پاؤں خود بخود
کیا سہل تر ہوئی رہِ دشوار تر مجھے

تجھ سے ترا مزاج بھی میں پوچھتا نہیں
اتنا ترے مزاج سے لگتا ہے ڈر مجھے

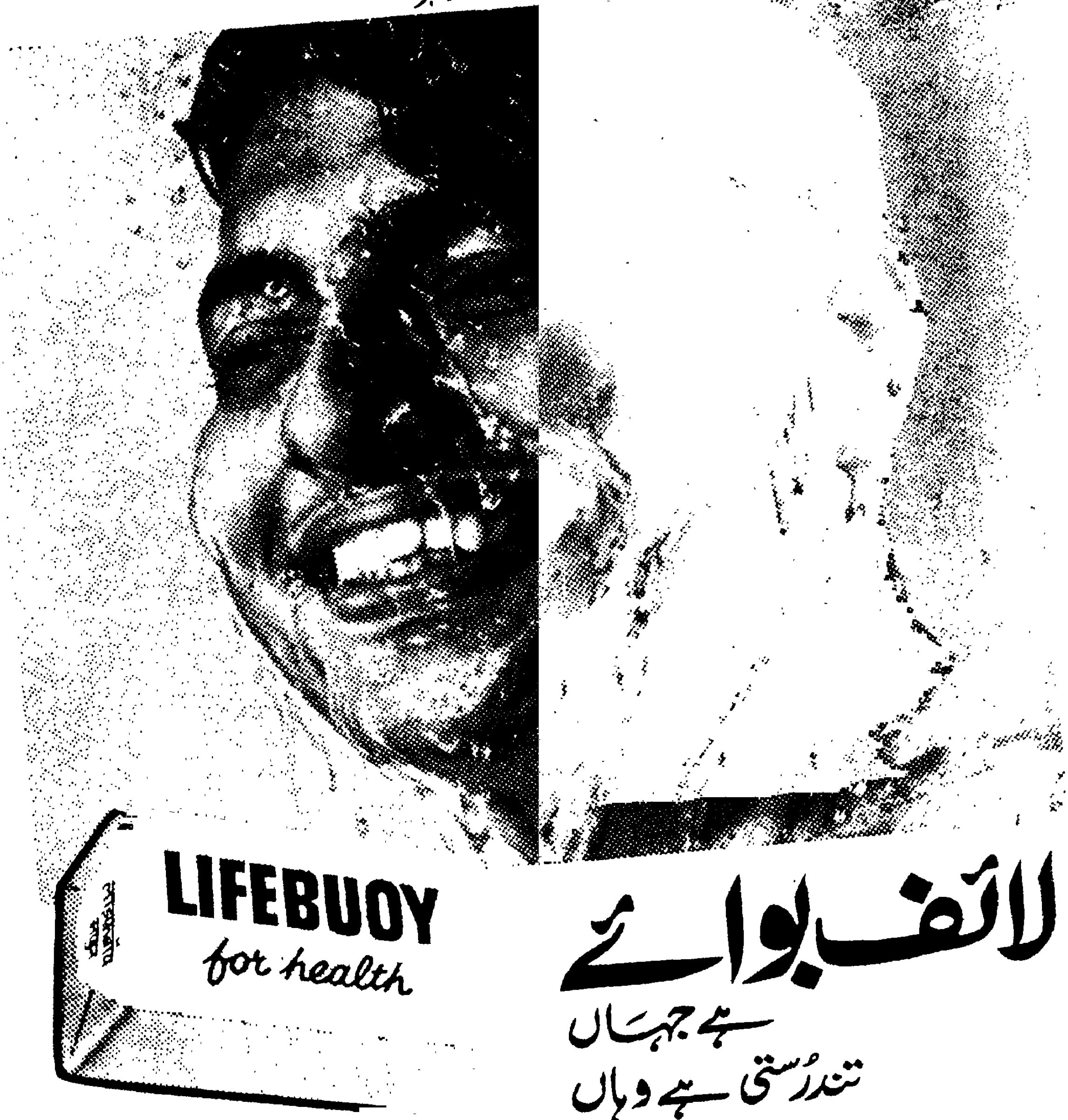
دیدارِ دوست ہو سحر و شام جن دنوں
وہ دن دکھائے گردشِ شام و سحر مجھے

وہ بھیج کر پیام بلاتے ہیں گاہ گاہ
جاتا ہوں جب تو بند ہی ملتا ہے در مجھے

انور بڑے مزے سے گزرتی تمام عمر
ملتا جو لطفِ صحبتِ اہلِ ہنر مجھے

منوہر سہائے انور

۳۱/۵، ایسٹ پٹیل نگر، نیو دہلی — ۸


LIFEBUOY
for health

افسانہ

بھگوان!

کوثر چاندپوری

ہمدرد کلینک، آصف علی روڈ۔ نئی دہلی

برادرِ گرامی! خوشتر صاحب!

... جشنِ غالب کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ چکی ہیں لیکن ہند و پاک میں "غالب نمبر" برابر نکل رہے ہیں۔ بعض رسائل نے دو حصّوں میں غالب نمبر شائع کیا ہے! جہاں تک شہرت اور قدرشناسی کا تعلق ہے غالب کو یقین تھا کہ۔

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن!

نجومی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ مرنے کے بعد انھیں "آبِ زر" سے غسل بھی دیا جائے گا۔ اندازہ ہے کہ دنیا بھر میں غالب صدی کے موقع پر تقریباً دو کروڑ کی رقم صرف کی جا چکی ہے۔ غالب کو جیتے جی پچاس لاکھ بھی مل جاتے تو اُسی وقت اُن کا انتقال ہو جاتا، اربابِ سیاست اُن کے نام پر جس فیاضی سے روپیہ لٹا رہے ہیں۔ معلوم نہیں اِس سے غالب کی روح کو کیا فائدہ ہوگا۔ کاش! غالب کی زبان پر بھی لوگ توجّہ کریں، اب صرف اُردو ہی کو یادگارِ غالب کہا جا سکتا ہے۔

کوثر چاندپوری

★

جسونت راؤ فلائنگ آفیسر پہلی مرتبہ ہوٹل پیراڈائز میں داخل ہوا تو اُس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں، ٹھنڈی فردوسی فضا میں ڈوب کر رہ گئیں۔ ایک لمحہ بعد اُبھرا تو اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر میزوں کے گرد بڑے قرینے سے کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اُن پر لوگ مختلف رنگ کے کپڑے پہنے بیٹھے تھے۔ کسی کی داڑھی چڑھی ہوئی تھی۔ کوئی کلین شیو تھا بعض کے پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بعض ننگے سر تھے۔ بیویاں تقریباً سب ہی کے پہلو میں تھیں۔ سامنے کھانے کی ڈشیں تھیں چمکدار چمچے اور کانٹے تھے۔ چھُریاں تھیں، قہقہے گونج رہے تھے اور مُسکراہٹیں اس طرح پھیلی ہوئی تھیں جیسے ہرے یا نیلے بلب سے روشنی چھن کر آ رہی ہو اور نگاہوں کو خیرہ کئے بغیر اپنے حسنِ خاموش کی داد چاہ رہی ہو راؤ نے رُومال سے پیشانی پونچھی اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دُور ایک جانب دو خالی کرسیاں نظر آئیں، وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا اُسی سمت کو چلنے لگا۔ ابھی وہ میز سے تین چار فٹ اِدھر ہی تھا کہ بائیں بازو سے ایک دوشیزہ سُنہری لٹیں شانوں پر بکھیرے آئی اور ایک کرسی اُس نے گھیر لی۔ دوسری پر راؤ نے قبضہ جما لیا، دوشیزہ کے کپڑوں سے سینٹ کی مہک آ رہی تھی۔ راؤ کو ایسی تیز خوشبوؤں سے الرجی ہو جایا کرتی تھی۔ فوراً چھینکیں آنے لگتی تھیں، لیکن پہلا موقعہ تھا کہ اُس کے احساس نے اس عطر آگیں ہوا کو ہضم کر لیا، کوئی چھینک نہ آئی وہ لمبے لمبے سانس لے کر سینٹ کی آوارہ مہک کو اپنے اندر جذب کر لینے کی کوشش کرتا رہا۔

دوشیزہ کی سُنہری لٹیں پنکھے کی ہوا سے دھیرے دھیرے ہل رہی تھیں اُس کے لالہ گوں رخسار اِس طرح دمک رہے تھے جیسے دھنک کے رنگ سورج کی ترچھی کرنوں سے جگمگایا کرتے ہیں راؤ کی نظریں کبھی سُنہری لٹوں میں اُلجھ جاتیں اور کبھی قوسِ قزح کے دلفریب رنگوں میں کھو جاتیں۔ وہ سفید بش شرٹ اور اُسی رنگ کا پینٹ پہنے ہوئے تھا، سینٹ میں ڈوبے ہوئے جھونکے

راؤ کے دل سے ٹکراتے رہے۔ دھڑکنیں تیز اور تیز تر ہوتی گئیں، دو تین منٹ ٹھہر کر اُس نے بیرے کو کھانے کا آرڈر دیا۔

"بریانی ـــــ سیخ کے کباب ـــــ"

"مرغ اور کوئی سبزی؟"

دوشیزہ نے اس طرح راؤ کو دیکھا جیسے ڈیزل سے چلنے والے انجن کو دیکھ رہی ہو۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

"کیا اکیلا کھا جائے گا یہ اِتنی چیزیں؟"

"کوئی سویٹ ڈش ہے؟"

"ہے صاحب پڈنگ، آئس کریم، چاول کی کھیر!"

بیرے نے سب چیزیں میز پہ جا دیں۔ راؤ نے ایک خاص انداز سے دوشیزہ کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"کھانا حاضر ہے!"

پھر آپ ہی آپ کانوں میں مہین سی آواز گونجی ـــــ

"جی نہیں شکریہ!"

ذرا دیر بعد اُس کے لئے بھی ڈبل روٹی کے دو پیس آگئے ساتھ میں سبزی کی پلیٹ بھی تھی۔ اُس نے سلاد نہیں لیا کھانا شروع کر دیا راؤ بھی کھاتا رہا۔ بیرا آئس کریم لایا تو راؤ کا جی چاہا کہ دوشیزہ کی تواضع کرے۔ اگر وہ زمین کی رہنے والی ہے تو میں بھی چاند یا مریخ کا باشندہ نہیں ہوں، مذاق جُدا سہی دونوں کی زبان ایک ہے۔ اُس نے بہت جُرأت سے کام لیا اور سویٹ ڈش سرکاتے ہوئے بولا ـــــ

"کھائیے!"

وہ دلفریب انداز سے مُسکرائی۔ پتلے ہونٹ پھُول کی پنکھڑی کے مانند متحرک ہوئے۔

"تھینک یو میٹھا نہیں کھاتی میں"

"ساس ملادوں ذرا سا آئس کریم کا ذائقہ بدل جائیگا"

وہ ہنس کر بولی ـــــ

"بہت دلچسپ بات کہی آپ نے! سانس کا سہارا بھی نہیں لیا کرتی میں"

"پھر ٹنک سہی تھوڑا سا مگر کھائیے ضرور!"

اُس نے چمچے سے ذرا سی آئس کریم نکال لی ـــــ

"اور!"

"بس شکریہ!"

"یہیں رہتی ہیں آپ؟"

"صرف یہاں رہتی ہی نہیں پیدا بھی یہیں ہوئی ہوں"

"میرا نام جسونت راؤ ہے"

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

"فلائنگ آفیسر ہوں"

"اچھا ہوا سے باتیں کرتے ہیں! آپ کیا۔ پیٹ نہیں بھرتا ہوا سے؟"

"دل ضرور بھر جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زمین کی سی بُو باس نہ ہوا میں ہے نہ کہیں اور"

"چاند سورج میں بھی نہیں؟"

"بالکل نہیں، جنّت صرف نام ہی کی ہے۔ اُس میں اِس پیراڈائز والی رونق کہاں؟"

"روزانہ ہی اُڑتے پھرتے ہوں گے آپ؟"

"ایک محدود ایریا میں، لو فلائٹ میں میرا بڑا نام ہے دوائیں چھڑکتا ہوں ہوائی جہاز سے"

"بیہوشی کی دوائیں؟"

"نہیں کیڑے مارنے کی!"

"پھر تو نہ جانے آپ کتنی تتلیوں کے قاتل ہو لے گے!"

راؤ گھبرا گیا۔ اُسے اپنے وجود سے نفرت سی ہونے لگی۔ تتلی کیڑے ہی کی تعریف میں آتی ہے یہ بات آج ہی اُس کی سمجھ میں آئی کہ وہ پھولوں کی محبوب تتلی کو بھی کیڑوں کے ساتھ مار ڈالتا ہے۔ وہ سوچنے لگا چاند اور مرّیخ میں تتلیاں نہیں، پھُول بھی نہیں، پھر وہاں جانے کی انسان کیوں کوشش کر رہا ہے، جہاں یہ دونوں چیزیں نہیں وہاں محبت اور حُسن کا وجود نہیں، اِن دونوں چیزوں کے بغیر سائنسداں تو زندہ رہ سکتے ہیں لیکن وہ انسان جس کا خمیر ذوقِ جمال ہی سے تیّار کیا گیا ہے سانس بھی نہیں لے سکتا!

راؤ دانستہ بات چیت کو طول دے رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ موقع جتنی دیر تک حاصل رہے اچھا ہے۔

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"بہت دیر میں یاد آیا! اپنا نام بتانے سے پہلے ہی پوچھ لینا چاہیئے تھا ـــــ مجھے روشنی کانتا کہتے ہیں"

"کیا کرتی ہیں نوکری ؟"

"ایک فرم میں میرا حصہ ہے، پاس ہی کی بلڈنگ میں شوروم ہے آئیے کبھی۔"

"اجازت ہوگی تو روزانہ ہی آؤں گا، معلوم ہوا صرف یہ ہوٹل ہی پیراڈائز نہیں آس پاس کا سارا علاقہ اسی تعریف میں آتا ہے۔
ہوٹل پیراڈائز کی وہ شام جسونت راؤ کے ذہن پہ نقش ہوگئی۔ روشنی کی باتیں تتلیوں کے پروں کی مدھم نغمگی کے مانند شعور میں گونجتی رہی، یہ موسیقی لوفلائٹ کے دوران میں بھی اُس کے کانوں میں رس گھولتی رہتی ——

"ہوا سے باتیں کرتے ہیں آپ"

"روزانہ ہی اُڑتے پھرتے ہوں گے۔"

وہ تیسرے دن ضرور ہوٹل پیراڈائز میں جاتا۔ ساتھی اُسے بخیل کہا کرتے تھے لیکن پیراڈائز میں پچیس تیس روپے کا بل ادا کرنے میں اُسے کوئی تکلیف نہ ہوتی اکثر یہ آرزو دل میں مچلنے لگتی تھی کہ کھانے والے دو ہوں اور بل پچاس کا آئے، یہاں آتے وقت وہ بہت سے نوٹ پرس میں بھر کر لاتا اسی ہوٹل میں اُس نے پہلی مرتبہ وہسکی کا ذائقہ چکھا اور اُس کے سرور سے لذت آشنا ہوا۔ وہ روشنی کے شوروم میں بھی گیا۔ دو چار بار روشنی سے ملاقات ہوئی۔ بہت ہی پر رونق جگہ تھی۔ آرائش میں حسن اور آرٹ کی مہارتیں نمایاں تھیں۔ چیزوں کو جاننے اور اُنھیں مناسب جگہ رکھنے میں وہ سلیقہ نمایاں تھا جو ایک جوان لڑکی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ ایک بار راؤ نے دو درجن رومال، تین فاؤنٹین پین خریدے روشنی نے آپ ہی سب چیزیں پیک کیں۔ کلرک سے بل بنوایا خزانچی سے رسید لی اور راؤ کے سامنے رکھ کر مسکرانے لگی۔ راؤ نے قیمت ادا کرنے کے لئے ضد کی۔ روشنی نے سر کو جھٹکا دیکر کہا——

"نمک تو نہیں کھایا پر شکر کھائی ہے آپ کی !"

"آپ نمک بھی کھا لیتیں تو کچھ نہ ہوتا۔ وہ میرا نہیں تھا۔"

راؤ نے بہت چاہا لیکن روشنی نے قیمت نہیں لی۔ جسونت راؤ بہت مغرور اور سرکش نوجوان تھا وہ کسی کا شکر گذار نہ ہوتا تھا مگر آج ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کا سر ہمیشہ کے لئے روشنی کے آگے جھک گیا ہے، برتری کا احساس تک باقی نہیں رہا۔



راؤ اور روشنی کی ملاقاتیں پیراڈائز ہی میں ہوتی رہیں۔ راؤ کہیں چلا جاتا اور ہوٹل نہ آتا تو روشنی کو ایسا محسوس ہوتا جیسے پیراڈائز اور دوزخ کی درمیانی دیوار ٹوٹ گئی ہے اور پگھلے ہوئے انگارے پیراڈائز میں بھر گئے ہیں اُن میں شعلوں کی جگہ آگ کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ راؤ دو چار روز کا ناغہ کر کے آتا تو معذرت کرتے ہوئے کہتا۔

"نوکری ہے مس روشنی، باہر جانے کا دو سو روپے روز الاؤنس بھی دیتی ہے کمپنی۔"

روشنی اُس کی چمکدار اور چیتے کی مانند تیز آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ——

"پھر تو روزانہ ہی باہر جانا چاہیئے !"

"یہ ممکن نہیں روشنی! تم سے دور رہ کر نہ جانے میرا کتنا خون سوکھ جاتا ہے !"

"کیا گرمی بہت پڑتی ہے خلا میں —— کیوں نہ ہو سورج پاس آجاتا ہوگا۔"

"یہ بات نہیں خون تو اندر کی آگ سے سوکھتا ہے۔"

"کوئی ہیٹر جلا رکھا ہے آپ نے اپنے اندر ؟"

"میں نے نہیں تم نے جلا دیا ہے ہیٹر میرے اندر !"

"میں نے؟" ——— روشنی مسکرا کر چپ ہو جاتی۔ اُس کے رخساروں پر شفق سی کھِل جاتی، ایسا محسوس ہوتا جیسے آبگینہ کے نیچے انگارے دہک رہے ہیں۔

روشنی سے راؤ کہتا۔ میں خوشی سے پیرا ڈائز کی کوئی شام مس نہیں کرتا، یہاں کی خوبصورت شاموں سے مجھے زندگی ملتی ہے جینے کا ڈھنگ میں نے یہیں بیٹھ کر سیکھا ہے جی چاہتا ہے آتے جاتے منیجر کی پیشانی چوم لیا کروں!

"بہت حسین ہے؟"

"وہ خود حسین نہیں، خوبصورت چہروں کی نمائش کرتا ہے!" ایک دن جسونت راؤ اپنی یونیفارم ہی میں ہوٹل چلا گیا، جس میز پر وہ روشنی کے ساتھ بیٹھا دیر تک باتیں کیا کرتا تھا وہ خالی پڑی تھی۔ وہاں روشنی نہ تھی۔ اِدھر اُدھر بہت سی عورتوں کے ریشمیں بال لہرا رہے تھے رخسار دہک رہے تھے لیکن اُن میں مہک نہ تھی، وہ چمک نہ تھی جو روشنی کے سنہرے بالوں میں نظر آیا کرتی تھی۔ اُن کے ہر تار میں نہ جانے کتنے آفتاب اور ماہتاب اُلجھے رہتے تھے رخساروں پر ہر لمحہ کلیاں سی چٹکتی رہتی تھیں راؤ دیر تک انتظار کرتا رہا اُس نے کسی چیز کا آرڈر نہ دیا۔ سگار منہ میں دبائے بیٹھا رہا۔ ایک ایک منٹ پہاڑ گزرتا رہا آنے والی عورتوں کے پیروں کی آہٹ سن کر اُس کا دل زور سے دھڑکنے لگتا دُور سے ہر آنے والی خاتون روشنی معلوم ہوتی۔ بالکل ویسی ہی سنہری لٹیں اور وہی سُرخ و سفید رخسار لیکن جب وہ کسی اور کے پاس بیٹھ جاتی تو راؤ غصہ میں سگار بجھا دیتا اور آتشِ سیال کا ایک پیگ چڑھا لیتا۔ پون گھنٹہ بعد روشنی کے آنے کی چاپ سنائی دی، بالکل اِس انداز سے جیسے کوئی غنچہ چٹک گیا ہو۔ سبز غلاف کو چیر کر سُرخی جھلک آئی ہو، روشنی قریب آ گئی۔ کرسی پر بیٹھ جانے کے بعد بھی وہ روشنی ہی رہی۔ راؤ نے نگاہِ غلط انداز سے اُس کی طرف دیکھا بہاریاسمین مُسکراتی محسوس ہوئی۔ روشنی کے ساتھ ایک معصوم سا خوبصورت بچہ بھی تھا۔ راؤ کھڑا ہو گیا اور پھر کھڑا ہی رہا ———

"بہت دیر کر دی!"

"بابا مچل گیا تھا۔ ضد کرنے لگا کہ ممی میں بھی چلوں گا!"

راؤ چونک گیا جیسے لو فلائٹ کے دَوران میں اُس کا جہاز مندر، مسجد یا گرجا کے کلس سے ٹکرا گیا ہو۔ ٹینک سے لپٹیں نکلنے لگی ہوں!

"آپ کھڑے کیوں ہیں، بیٹھ جائیے۔"

"کیا نام ہے بابا کا؟"

"روشنی چرن!"

"بیوٹی فل بڑا پیارا نام ہے۔"

"آپ کھوئے کیوں گئے؟"

"نہیں میں کھو نہیں گیا، جہاز کو زمین پر لا رہا ہوں۔"

"شاید آپ کے نازک جذبات کو ٹھیس لگا دی میں نے۔ آپ مجھے مس کہتے رہے ہیں اب تک۔ میں مس نہیں ہوں۔ یہ غلط فہمی اِس وقت دُور ہو رہی ہے۔ چار سال پہلے میری شادی ہو چکی ہے مگر اب میں اکیلی ہوں۔" روشنی کی آنکھیں بھیگ گئیں روشنی چرن پہلی مرتبہ اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"ممی ——— ممی! رونے نہ دوں گا میں تمہیں ——— تم نے ڈرا دیا ممی کو!" اُس نے جلتی ہوئی تیز نگاہوں سے راؤ کو دیکھا۔

"نہیں، نہیں روشنی چرن یہ مجھے نہیں ڈراتے ——— چرن نے مجھے فریب دیا، وہ ایک لڑکی کے ساتھ یورپ چلا گیا، معاف کیجیے میں نے آپ کو کتنے دنوں تک اندھیرے میں رکھا۔"

"میں ایک پل بھی تاریکی میں نہیں رہا روشنی! میرے نزدیک تم اب بھی مس ہو، تمہاری آنکھوں میں کلیوں کی سی دوشیزگی ہے، رخساروں پر کوئی لمس دہکتا محسوس نہیں ہوتا۔ میں اندھیرے میں نہیں رہا شعور میں پہلے بھی سورج طلوع ہو رہے تھے، اب بھی میرے آس پاس کرنیں رقص کر رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے آپ کو ایک بچے کی ماں کہکر تم مجھے فریب دے رہی ہو، میں سمجھتا ہوں بابا کو تم نے گود لیا ہے، تمہاری معصوم آنکھوں اور حسین لبوں میں دوشیزگی کی کومتا صاف صاف دکھائی دے رہی ہے۔"

روشنی کے اِس انکشاف سے کہ وہ شادی شدہ ہے راؤ کے احساس پر ذرا بھی چوٹ نہ لگی بلکہ بہت سی چوٹوں کے نیل مٹ گئے۔

روشنی کو راؤ سے گہری ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ اُس کے احساس سوگواری کو رگوں سے کھینچ لینا چاہتی تھی۔ اُس نے پیرا ڈائز ہی میں کہا ———

"مسٹر راؤ پیتے بہت ہو۔"

"سگار؟" راؤ نے سگار بجھا دیا۔

"نہیں کچھ اور! میں التجا کرتی ہوں اِس آگ کو مُنہ نہ لگاؤ؟"

"کیونکر ممکن ہے روشی!" وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "میں آگ نہیں وہ ٹھنڈا پانی پیتا ہوں جس سے ماضی کی جلتی ہوئی یادیں بجھ جاتی ہیں، روشی یادوں کے سانپ دن رات مجھے ڈستے رہتے ہیں۔ یہ آگ ہی اُن کے زہر کا تریاق ہے۔"

روشی کی آنکھیں بھیانک انداز سے پھیل گئیں وہ راؤ کے اُوقار چہرے کو دیر تک دیکھتی رہی جیسے وہاں کوئی کتاب کھلی رکھی ہو اور وہ اُسے پڑھنے لگی ہو۔

"روشی چرن کتنا حسین اور نازک نام ہے! اِس کا ایک حصّہ آبگینہ کا ہے دوسرا فولاد کا!"

"آپ نے بالکل ٹھیک سمجھا، چرن بابا کے باپ کا نام تھا۔ جی نہ مانا کہ اُس کے حصّہ کی معصومیت چھین لوں۔ یہ چرن کے جانے کے بعد پیدا ہوا ہے۔ اُس کا سایہ تک اِس پر نہیں پڑا۔ میں نے باپ اور ماں کے نام سے اِس کا نام بنایا ہے۔"

"روشی!" راؤ نہ جانے کتنے گہرے پانی کے اندر سے بولا "میں بھی ایک بچّی کا باپ ہوں وہ مسوری میں پڑھ رہی ہے۔"

"کیا نام ہے"

"کملا راؤ"

"اور اُس کی ماں؟"

"روشی!" راؤ نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں چھپالیں۔ جیسے یاد کا اژدھا اُس کے قریب ہی کہیں پھنکار رہا ہو۔ "وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی نہیں، اُس نے موت کی آغوش میں منہ چھپالیا، میں اُسے بھولنا چاہتا ہوں مگر نہیں بھول سکتا، صہبائے تند کے ساغر میں اُس کا وجود غرق نہ ہو سکا عالمِ خمار میں اُسکی مُسکراہٹیں بالکل اس طرح ذہن پر پھیل جاتی ہیں جیسے شفق نے آسمان پر بہت بڑا نیم دائرہ بنا دیا ہو۔ اُس کی مُسکراہٹ کے سارے رنگ شعور میں بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ بڑی خوبصورت، نازک اندام اور خوش مزاج تھی، وہ میرے جیون میں رات رانی کے پھول کی مانند کھلی، مہکی اور خزاں کے گرم جھونکے کی طرح چمنِ حیات کو جُھلس کر غائب ہو گئی۔"

روشی کے دل میں راؤ کی محبت کا بیج پھوٹ نکلا، اُس کا جی چاہا یادوں کا زہر راؤ کے احساس سے چُوس لے، اُس کی نگاہوں میں راؤ کا قد بلند ہوتا گیا آہستہ آہستہ وہ ہمالیہ سے بھی اونچا ہو گیا۔ وہ اُس کے سامنے بونوں کی طرح دکھائی دینے لگی۔

راؤ کے مشورے سے چرن کو بھی مسوری بھیج دیا گیا۔ اُس نے کملا راؤ سے کہا۔

"کملا چرن تیرا ساتھی ہے"

روشی راؤ کے بہت قریب آگئی۔ دونوں ایک دوسرے سے بیکراں محبت کرنے لگے، جب وہ ساتھ ہوتے دنیا بہت حسین اور رنگین ہو جاتی اُس میں غنچوں اور اُن کی مہک کے سوا کچھ نہ ہوتا، شراب اندر ہی اندر راؤ کو مسموم کرتی رہی وہ اُس کے زہر کو اُسی سے دبانے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کی حالت تیزی سے بدلنے لگی ایک مرتبہ اُس نے کیف و سرخوشی کے عالم میں اُڑان کی۔ افسران کو اس کا پتہ چل گیا۔ اُسے فوراً ملازمت سے ہٹا دیا گیا۔ راؤ اِس حادثہ کی تاب نہ لا سکا اُس نے کمپنی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا مگر اُس کی صحت نے جواب دے دیا۔ راؤ کی نیند غائب ہو گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے ماحول کو دیکھتا رہتا اُسے فضا میں ہر طرف جہاز اُڑتے نظر آتے تھے روشی اپنا —— کام چھوڑ کر راؤ کی خدمت کرنے لگی وہ رات دن اُس کے پاس رہتی۔ بعض اوقات راؤ آپے سے باہر ہو جاتا۔ ایک بار روشی کے مُنہ پر طمانچہ مارتے ہوئے بولا ——

"تُو نے زہر دیا ہے مجھے! مجھ سے چرن کا انتقام لینا چاہتی ہے تُو!"

روشی نے اُس کے پیروں پر سر رکھ دیا اور روتے ہوئے بولی ——

"راؤ ایسی باتیں نہ کرو"

"میں خود چاہتا ہوں کہ ایسی باتیں نہ کروں لیکن اِس کے علاوہ موت کو بُلانے کا اور کیا طریقہ ہے بیداری کا نام زندگی نہیں نیند بھی اِس کا ایک رُخ ہے۔"

روشی نے اُسے ہسپتال میں داخل کر دیا وہاں اُسے بتایا گیا کہ راؤ کے دونوں گُردے ماؤف ہو چکے ہیں وہ بچ نہیں سکتا۔ اُس کی ساری پونجی بیماری اور مقدمہ کی نذر ہو گئی، روشی نے اُسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"راؤ! غم نہ کرو۔ روپیہ میرے پاس بہت ہے"

"مجھے کوئی غم نہیں، سوچتا ہوں کملا کا کیا ہوگا؟"

"جو چرن کا ہوگا!"

"جھوٹ روشنی! اِن دونوں میں بہت فرق ہے۔ میرے بعد تمھیں کوئی اور راؤ مل گیا تو کملا اکیلی رہ جائے گی!"

روشنی بگڑ گئی اُس نے غصّہ میں راؤ کا کان پکڑ کر کہا۔

"میرے اور تمہارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ نہیں، پھر میں دوسرا راؤ، کیوں، تلاش کروں گی؟ تمہارے بعد؟"

راؤ بچوں کی طرح رونے لگا۔ اُس نے روشنی سے معافی مانگ لی۔

"روشنی! تم میری محبوبہ ہو! بیوی نہیں ہو۔"

"اور جانتے ہو تم میرے کیا ہو؟"

"نہیں" راؤ کے لبوں پہ آخری مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"بھگوان! ـــــــ اور وہ مرا نہیں کرتا!!"

راؤ نے ہسپتال ہی میں جان دیدی، روشنی دونوں بچوں کو پڑھاتی رہی۔ وہ مسوری گئی تو کملا نے پوچھا۔

"ممی ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"وہ خلا میں پرواز کر رہے ہیں!"

اُن کا جہاز چاند کے چکر کاٹ رہا ہے۔ اُنھوں نے وہاں گھر بنا لیا تو ہم تینوں بھی وہیں چل کر رہیں گے!" کملا اور چرن نے ایک ساتھ غور سے ممی کو دیکھا اور ـــــــ

روشنی کی نگاہیں اوپر اُٹھ گئیں۔ چودھویں کا چاند آسمان کی بیکراں نیلاہٹوں میں تیر رہا تھا۔ قریب ہی دو ستارے چمک رہے تھے۔ روشنی چونک گئی۔ اُس نے ستاروں پر سے نگاہیں ہٹالیں اور کملا اور چرن کو دیکھنے لگی جو ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے مُسکرا رہے تھے، روشنی نہ جانے کب تک اُنھیں دیکھتی رہی!

غزل

پنڈت بالمکند عرشؔ ملسیانی بی۔ اے ـــــ

جو میرا ہوش کا عالم ہے بیخودی تو نہیں
میں جس کو اپنا سمجھتا ہوں اجنبی تو نہیں

خدا گری کا یہ ماہر کچھ اور ہی شے ہے
تم آدمی جسے کہتے ہو آدمی تو نہیں

یہ اور بات ہے محرومِ التفات ہوں میں
ترے کرم کے خزانے میں کچھ کمی تو نہیں

ثبوت ملتا ہے اِس سے کسی تعلق کا
کمالِ برہمیٔ دوست دشمنی تو نہیں

نگاہ و دل میں بھی لازم ہے اِک مروّتِ کیف
نمودِ عارض و گیسو ہی دلبری تو نہیں

نزولِ برق ہے شاید یہ آشیانوں پر
تُو روشنی جسے سمجھا ہے روشنی تو نہیں

تمہارے چہرے پہ آثار ہیں خوشی کے مگر
جو میرے چہرے سے ظاہر ہے وہ خوشی تو نہیں

پئے شراب عبادت گزار ہو اے شیخ
مگر حضور یہ شایانِ بندگی تو نہیں

نہ جانے کیوں مرے دل کو یقیں نہیں آتا
جو تُو نے جلوہ دکھایا ہے عارضی تو نہیں

سنا ہے توبہ سے ہوتا ہے تازہ تر ایماں
ہزار شکر کہ یہ عارضہ ابھی تو نہیں

تباہیوں کے لئے مستعد ہیں اہلِ جہاں
یہ آگہی کہیں توہینِ آگہی تو نہیں

بس ایک مرگِ مسلسل بس ایک رنجِ دوام
کچھ اور شے ہے یہ اے عرشؔ زندگی تو نہیں

عرشؔ ملسیانی

بیسویں صدی دہلی جولائی ۱۹۶۹ء

طنزیہ

ڈاکٹر بالغ

پرنسپل کنہیا لال کپور ایم۔ اے

دیانند متھرا داس کالج۔ موگا (پنجاب)

ڈیر مولانا خوشتر گرامی صاحب ! جے بیسویں صدی

غالب کی دلّی میں رہتے ہوئے آپ نے "بیسویں صدی" کا "غالب نمبر" نہیں نکالا۔ اب کعبے کس مُنہ سے جاؤ گے خوشتر! ـــــ افسانہ نمبر کے لئے مرزا غالب پر ایک مزاحیہ مضمون بھجوا رہا ہوں۔ تاکہ غالب کی جناب میں آپ کے تغافل کی کچھ تلافی ہو سکے۔ اِسے شائع کر کے میری بلائیں اور غالب کی دُعائیں لیجئے۔ . .

نیاز مند ـــــ کنہیا لال کپور

اگر صرف ایک فقرے میں ڈاکٹر بالغ کا تعارف کرانا مقصود ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ موجودہ دَور کے سب سے بڑے غالب شناس ہیں اور سچ تو یہ ہے اُنھیں یہ سعادت یونہی نصیب نہیں ہوئی۔ گذشتہ پچیس برس سے وہ غالب، خاص کر دیوانِ غالب پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اِس وقت تک پانچ سو صفحات لکھ چکے ہیں جو بقول اُن کے محض تمہید کے طور پر تحریر کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر بالغ اگر چاہتے تو اِس طویل تمہید میں اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ کر قارئین کا وقت ضائع کر سکتے تھے۔ لیکن خدا کا شکر ہے اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اُنھوں نے اِن پانچ سو صفحات میں ساڑھے چار سو اپنی ذات کے لئے وقف کئے ہیں۔ لیکن باقی پچاس میں غالب سے متعلق واقعی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "شروع شروع میں تو میں سمجھتا رہا کہ دیوانِ غالب کا مصنّف مرزا ہر گوپال تفتہ ہے۔ کیونکہ غالب کو شطرنج کھیلنے اور "اِک گونہ بےخودی" سے جو اُن پر دن رات طاری رہتی تھی فرصت ہی کب ملتی تھی کہ وہ شعر کہہ سکیں۔ اُنھوں نے اپنے شاگردِ رشید مرزا تفتہ سے فرمائش کی ہوگی کہ وہ اُن کے لئے ایک دیوان تیار کریں جس کا نام دیوانِ غالب ہو۔ لیکن دو سال اِس تھیوری پر کام کرنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ تب میں نے قیاس لگایا کہ دیوانِ غالب نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی تصنیف ہے۔ تین سال اِس تھیوری پر تحقیق کرتا رہا۔ جب یہ بھی غلط ثابت ہوئی تو میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ دیوانِ غالب کو دو شعراء نے مِل کر لکھا اور وہ تھے اسد اور غالب۔ اِس لئے دیوانِ غالب کی بجائے اِسے دیوانِ اسد و غالب کہنا چاہئے۔ تحقیق کے دَوران دو ایک بار مجھے شک ہوا کہ دیوانِ غالب میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ کیونکہ لفظ "بالغ" میں غالب کے تمام حروف شامل ہیں اور اگر غالب کے مقطعوں میں بالغ پڑھا جائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً ؎

عِشق نے بالغ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر یک لخت مجھے یاد آیا کہ میں سرے سے شعر ہی نہیں کہہ سکتا۔ اِس لئے دیوانِ غالب کا مصنّف کس طرح ہو سکتا ہوں!

ڈاکٹر بالغ کی رائے میں یہ امر بعید از قیاس ہے کہ غالب کے دو تخلص تھے۔ اِس ضمن میں وہ لکھتے ہیں "کوئی درباری شاعر دو تخلص کس طرح کر سکتا تھا۔ کیا باقی شعراء یہ اعتراض نہ کرتے کہ جہاں مقطع میں غالب بطور تخلص نہیں لایا جا سکتا وہاں اسد لایا جا رہا ہے جو کہ اصولِ غزل گوئی کے سراسر خلاف ہے . . . اصلیت یہ ہے کہ اسد اور غالب جگری دوست تھے۔ اُنھوں نے مِل کر دیوان چھپوانے کا قصد کیا۔ کیونکہ دونوں کا شعری سرمایہ بے حد قلیل تھا۔ اگر علیٰحدہ علیٰحدہ دیوان چھپواتے تو اوّل تو وہ اپنی مضحکہ خیز

ضخامت کی وجہ سے مقبول نہ ہوتا۔ دوسرے مصارف بھی زیادہ کرنے پڑتے ہیں۔

آگے چل کر ڈاکٹر بالغ فرماتے ہیں: "بہرحال اگر اتمام حجت کی خاطر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اسد اور غالب ایک ہی شاعر کے دو تخلص ہیں تو یہ عین مناسب ہوگا کہ اب تمام مقطعوں میں اسد یا غالب کی بجائے "مرزا" کر دیا جائے۔ تاکہ آنے والی نسلیں اسے دو کی بجائے ایک شاعر کا کلام سمجھیں۔ غالب اور مرزا ہم وزن الفاظ ہیں۔ اس لئے جن مقطعوں میں غالب تخلص آیا ہے وہاں مرزا لکھ دینے سے بخوبی کام چل سکتا ہے۔ مثلاً ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان مرزا
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

البتہ اسد کی بجائے مرزا لکھتے وقت مصرعوں میں معمولی تصرف کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

کی بجائے یہ لکھنا ہوگا ؎

ہستی کے مت فریب میں اے مرزا آئیو

اسی طرح ؎

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد

کی نئی صورت یہ ہوگی ؎

خوبرویوں کو ہیں مرزا چاہتے

ڈاکٹر بالغ کی تحقیق کے مطابق کاتب کی غلطی سے دیوانِ غالب میں متعدد اشعار غالب کے معاصرین کے شامل ہو گئے ہیں۔ ان کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: "کیا کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس یہ باور کر سکتا ہے کہ مندرجہ ذیل اشعار غالب کے ہیں ؎

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

ان اشعار کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ یہ مولانا حالی کے ہیں۔ چونکہ مرزا صاحب کو حالی بہت عزیز تھے۔ اس لئے انھوں نے یہ اشعار ازراہِ محبت اپنے دیوان میں شامل کر لئے۔ یہ بھی ممکن ہے یہ اشعار مولانا حالی کے اصرار پر شامل کئے گئے ہوں تاکہ سارے دیوان میں دو شعر تو ایسے ہوں جنھیں ایک عام قاری سمجھ سکے۔

غالب کی غزل جس کا مطلع ہے ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن

اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ یہ در اصل داغ دہلوی کی غزل ہے۔ خاص کر اس غزل کا مقطع تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں داغ کا ہوں غالب کا نہیں ؎

ڈھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

داغ کا ایک اور شعر جو خواہ مخواہ دیوانِ غالب میں در آیا ہے۔ یہ ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اور اس شعر کا خالق تو میر تقی میر کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

دیوانِ غالب میں کتابت کی غلطیوں کا ذکر کرتے وقت ڈاکٹر بالغ نے چند حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں۔ ان کی رائے میں غالب کے کئی اشعار محض کاتب کی غفلت شعاری سے نشتر کی بجائے شعر بن کے رہ گئے ہیں۔ بالغ صاحب نے مشتے از خروارے کے مصداق پانچ اشعار منتخب کئے ہیں۔ جو اگر صحیح صورت میں لکھے جاتے تو بیت الغزل کہلاتے ؎

(شعرِ غالب) کوئی صورت نظر نہیں آتی
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
(کاتب) کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
(شعرِ غالب) دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
(کاتب) دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے
(شعرِ غالب) اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
(کاتب) اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر



(شعرِ غالب) لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
(کاتب) لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
(شعرِ غالب) اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
(کاتب) اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ڈاکٹر بالغ کی ریسرچ میں ایک مقام ایسا بھی آیا ہے جہاں تحقیق تحقیق نہیں رہی، الہام بن گئی ہے۔ سالہاسال کی دماغ سوزی کے بعد انھوں نے اُس ستم پیشہ ڈومنی کا نام ڈھونڈ نکالا ہے جس پر غالب مرتے تھے اور جسے انھوں نے عمر بھر کے لئے مار رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی دانست میں اُس کا نام ناز تھا۔ اپنے اِس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے غالب کے چند اشعار پیش کئے ہیں ؎

میں نے کہا کہ بزمِ "ناز" چاہیئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

(نوٹ) غالب نے نثر میں اپنی محبوبہ کو ستم پیشہ کا لقب دیا تھا۔ اِس شعر میں اُسے "ستم ظریف" کہہ کر یاد کیا ہے۔

چند اور مثالیں ملاحظہ فرمایئے ؎

ہماری سادگی تھی التفاتِ "ناز" پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

اِک نوبہارِ "ناز" کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

دشنۂ غمزہ جاںستاں، ناوکِ "ناز" بے پناہ

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جائے
نگاہِ "ناز" کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

ڈاکٹر بالغ کے خیال میں جس محبوبہ کی وفات پر مرزا نے اپنا مشہور مرثیہ لکھا تھا وہ "ناز" ہی تھی۔ جیسا کہ اُن کے اِس شعر سے ظاہر ہے ؎

گلفشانی ہائے "ناز" جلوہ کو کیا ہوگیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

آپ نے ڈاکٹر بالغ کے تمہیدی مقالہ سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائے۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فنِ تحقیق میں اُن کا کیا مقام ہے۔ اب بھی اگر مرزا غالب یہ شکایت کریں کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا تو چاہے آپ غالب کے طرفدار ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ محسوس کریں گے کہ مرزا صاحب ڈاکٹر بالغ کے ساتھ بے انصافی کر رہے ہیں اور اُن کا شکوہ نہ صرف بے جا ہے بلکہ بے بُنیاد بھی ہے!!

افسانہ

اندھا مُغل

رام لعل

آر ۳۹/II ملٹی اسٹوری، چار باغ۔ لکھنو نمبر ۱

برادرم خوشتر صاحب! آداب

... سُنا ہے آپ کے یہاں چوری ہوگئی ہے۔ کیا واقعی آپ کے پاس بہت سا مال جمع ہو گیا تھا ؟ آپ تو مال جمع کرنے کے شوقین نہیں! آپ ہمیشہ لُٹایا ہی کرتے ہیں! بہر حال افسوس ہوا کہ اُسے آپ خود کیوں نہ لُٹا سکے!——— پچھلے دنوں میرے ساتھ بھی دو چھوٹے چھوٹے واقعات پیش آئے۔ لکھنؤ سٹی اسٹیشن پر کالج کے اسٹوڈنٹس نے چلتی گاڑی میں ہاتھ بڑھا کر میرا چشمہ اُتار لیا۔ شاید اُسے بیچ کر اُنھیں سنیما دیکھنے کے پیسے تو ضرور مِل گئے ہوں گے۔ لیکن میرے تو ساٹھ روپوں کا صفایا ہو گیا! کچھ روز بعد چنڈی گڑھ اسٹیشن پر کسی جیب کترے نے ستر روپے صاف کر لئے! میں اسٹوڈنٹس اور جیب کتروں کا ہمیشہ ہمدرد رہا ہوں۔ اُن پر کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ اِس کے باوجود اُنھوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا! شاید فطرت اور پیشے کے سُنہری اصولوں کا تقاضا یہی تھا!——— بہر حال چوکنے رہیے۔ آپ سے اب کوئی چور صحت چھین کر نہ لے جائے! ...

آپ کا مخلص ——— رام لعل

★

اپنے سوبھاؤ کے بارے میں بھی تھوڑا سا بتا ہی دوں! ضدی واقع نہیں ہوا ہوں! اگرچہ سوستی نے مجھے ہمیشہ ضدّی ہی کہا۔ اب کوئی لڑکی اپنے چاہنے والے کو ضدّی ہونے کا الزام دے تو وہ الزام کتنا رُومانٹک ہو جائے گا! وہ آدمی تو ہر دم یہی چاہے گا کہ زیادہ سے زیادہ ضدی ہوتا چلا جائے! لیکن اُس کی بھی کوئی حد ہوگی! کوئی کسی کا کہاں تک ضدی ہونا برداشت کرتا رہے گا!

یہ بات سوستی کے اور میرے بارے میں ہو رہی ہے۔ ہم دونوں کے سوبھاؤ کے بارے میں۔ ایک کو ضدّی کہہ کر پکارنا اچھا لگتا رہا۔ دوسرے کو ضدّی کہلانا۔ یاد آرہا ہے۔ میری ماں بھی مجھے یہی الزام دیا کرتی تھی لیکن اُس کی بات میں ممتا کتنی تھی! غصّہ بھی ہوتا تھا کبھی کبھی! میرے پتا جی چل بسے تو میں پڑھائی وڑھائی چھوڑ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لینا چاہتا تھا یعنی جس چھوٹے سے گھر میں میری ادھیڑ عمر ماں اور چھوٹی بہن پر مپرا رہتی تھیں، اُس پر اب میں اپنا قبضہ چاہتا تھا۔ کما کر لے آنے والا گھر پر قابض ہی تو ہو جاتا ہے! ماں نے بھی یہی سمجھا اور خوش ہوئی۔ میں اپنے مرحوم پتا کی جگہ لے سکتا ہوں لیکن اُس نے کچھ اور بھی سوچا۔ اُسے میرا سو سوا سو کما کر لے آنا اچھا نہ لگا۔ یہ بہت کم تھا۔ کوئی بھی ماں اپنے بیٹے کے بارے میں اِس طرح کا سپنا ہرگز نہیں دیکھتی کہ وہ اِتنی کم تنخواہ لے کر آیا کرے۔ اکثر وہ تو شروع سے ہی اپنے بیٹوں کو راجہ کہہ کر پُکارنے لگتی ہیں۔ راجہ یعنی بڑے دھن دولت والا! بڑے اختیار والا! اب اختیارات کی تفصیلات میں نہ اُلجھا جائے تو اچھا ہوگا! کوئی کوئی ماں تو بیٹے کے معمولی سے اختیار ہی سے مطمئن ہو جاتی ہے اور کوئی بڑے سے بڑے اختیار پر بھی راضی نہیں ہوتی! میرے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس نے میرا اصلی نام بگاڑ کر راجو کر دیا۔ بہت مُدّت تک راجو ہی چلا۔ جب میں کسی قابل ہو گیا تو پہلا کام یہ کیا خود کو راجو کے معصوم پیکر میں سے نکال کر ایک باوقار راجندر کمار بنا دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد راجندر کمار مِٹّھا کر دیا۔ اب میں خاصہ بارعب بھی معلوم ہونے لگا۔ نام اور صورت، دونوں کے اعتبار سے۔

سوستی مجھے ملی اور مجھ سے خاصی بے تکلف بھی ہوگئی تو مجھے صرف بڈھا ہی کہہ کر پکارنے لگی۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ میں اپنے بچپن کی خاص خاص باتیں بتا رہا ہوں۔ جن سے میرا ضدّی ہونا ظاہر ہو سکتا ہے! پہلے اپنی ماں کی نظر میں۔ مگر میرا خیال ہے وہ مجھ سے کہیں زیادہ ضدّی تھی!

اُس نے مجھے نوعمری میں نوکری کرنے سے روکا۔ پہلے بی۔ اے کرایا پھر ایم۔ اے۔ پھر بی۔ ایڈ، ایم۔ ایڈ، پی۔ ایچ۔ ڈی وغیرہ۔ اِس طرح میں آٹھ سو روپے کما کر لے آنے والا ٹریننگ کالج کا لیکچرار ہو گیا۔ بتلایئے اب کون ضدّی ثابت ہوا؟ میری ماں یا میں!

اُسی زمانے کا ایک واقعہ اور بھی ہے، جب میرے پتاجی چل بسے تھے۔ میری ماں اُس وقت چالیس کے لگ بھگ ہوگی! مجھے ماں کا وہ رُوپ اچھی طرح یاد ہے۔ بہت دلکش تھیں وہ۔ ماں کے رُوپ میں تو تھیں ہی۔ ایک عورت کے طور پر بھی تھیں! مرحوم پتاجی کے ایک بہت ہی قریبی دوست جو اتفاق سے رنڈوے بھی تھے۔ میری ماں کو مجبور کرنے لگے کہ وہ اُن کے ساتھ شادی کر لے! یہ بات میری چھوٹی بہن اور میں نے کہیں اِدھر اُدھر سے سُن لی تھی۔ سچ بتاؤں اِس خبر سے ہم دونوں سہم گئے۔ اُن دنوں ہر لمحہ یہی لگتا کہ اب ہم پُوری دُنیا میں تنہا رہ جائیں گے! گو ہمیں اپنی ماں کے پیار پر پُورا پُورا اعتماد تھا۔ لیکن ایسی باتیں بھی تو سُن رکھی تھیں کہ بعض عورتیں دوسری شادی کرنے کے بعد اپنے پہلے پتی کے بچّوں کو بُھلا دیتی ہیں! مگر ہماری ماں نے ایک دن اچانک اُس آدمی کا گھر میں آنا بند کر دیا۔ اُسے سختی سے منع کر دیا۔ خود ایک دفتر میں ملازمت کر کے ہماری تعلیم و تربیت میں لگ گئی۔ اِسی میں وہ دن بدن بُوڑھی بھی ہوتی گئی۔ میں یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا کہ میں نے اپنی ماں کو بڑی سُرعت سے بُوڑھا ہوتے بھی دیکھا ہے۔ اور سچ، بہت غور سے دیکھا ہے! جب وہ مر گئیں تو اُن کے کاغذات میں سے اُس آدمی کا اچانک ایک بہت ہی پُرانا فوٹو بھی نکل آیا تھا۔ پتاجی کے اُسی دوست کا! پرمیرا اور میں فوٹو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ ہماری ماں اُس آدمی سے بہت پہلے سے محبت کرتی تھی۔ ہمارے پتاجی کے ساتھ بیاہ سے بھی بہت پہلے سے! کیونکہ وہ فوٹو اُس آدمی کی عین جوانی کا تھا۔ جس عمر میں ہم اب پہنچے تھے۔ ماں نے زندگی بھر اپنی محبت کو چھپائے رکھا سب سے۔ پتاجی نہیں رہے تب بھی اُس نے اُس آدمی سے شادی کرنا منظور نہ کیا۔ صرف ہماری خاطر! یہ بھی اُن کی ضد نہ تھی تو پھر کیا تھا؟ لیکن اُس میں کتنا تیاگ تھا! —— کتنی عظمت تھی اور ہمارے لئے محبت بھی! ہم دونوں کا سر اُن کی مقدّس یاد میں جُھک گیا۔ ہمیں غصّہ نہیں آیا۔ ندامت بھی محسوس نہ ہوئی۔ بلکہ دُکھ ہی محسوس ہوا! ہم نے اپنی ماں کو کتنی بڑی خوشی سے محروم رکھا!

کچھ باتیں میری بہن کے بارے میں بھی ہیں۔ سوستی کے ذکر تک پہنچنے سے پہلے پرمیرا کا ذکر بھی ضروری ہے۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی نہیں ہے۔ دراصل ہم دونوں ہی بہن بھائی اُتنے خوبصورت نہیں ہیں جتنی ہماری ماں تھی۔ ہم دونوں اپنے پتا ہی پر گئے ہیں۔ وہ معمولی ناک نقشے کے تھے۔ ویسا ہی ناک نقشہ ہمیں ورثے میں مِلا ہے۔ میں بڑی کوششوں کے بعد پرمیرا کی شادی کرا سکا۔ بدقسمتی سے وہ جلد ہی بیوہ ہوگئی اور میرے ساتھ رہنے کے لئے آگئی۔ اب وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے اُسے مجبور کر کے ایک اور جگہ بیاہ دیا۔ اب وہیں رہتی ہے۔ وہ بہت سُکھی ہے۔ اُس کے بارے میں اب کوئی بھی بات غیر ضروری ہی ہوگی لیکن ایک بات یقیناً ضروری ہے۔ وہ میرے بیاہ کے بارے میں ہمیشہ فکرمند رہتی۔ اُس نے کئی لڑکیاں دیکھ ڈالیں۔ مجھے بھی دکھائیں۔ کسی ایک کے ساتھ شادی کر لینے کے لئے مجھے بہت مجبور کیا۔ لیکن میں نے ہمیشہ انکار ہی کیا۔ اِس لئے نہیں کہ مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں آتی تھی! پتہ نہیں کیوں بہن کے دوبار بیاہے جانے تک میرے اندر اپنی شادی کے لئے کوئی اُمنگ نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ایسے ہی زندگی گزار دوں گا۔ زندگی یوں بھی گزر سکتی ہے! جب سپنے پریشان نہ کرتے ہوں! خواہشیں بہت شدید نہ ہوتی ہوں! کسی کی رہگذر کا خیال بھی نہ ستاتا ہو! ایسی کوئی بھی تو بات نہ تھی! کبھی کبھی یہ سوچ کر حیرت بھی ہوتی کہ میں نے محبت کیوں نہیں کی؟ میں تنہا کیوں ہوں؟ لیکن مجھے اپنی تنہائی سے بھی کوئی وحشت تو نہیں ہوتی تھی۔ میں ایک خاص روش کا مالک بن چکا تھا۔ میں جس محکمے میں ملازم تھا اُس میں کتنی ہی لڑکیوں اور لڑکوں کو پڑھا لکھا کر زندگی کی بڑی بڑی ذمّہ داریوں کی طرف بڑھا دیا تھا۔ اِسی میں مجھے بہت اطمینان مِلتا تھا۔ کسی غیر معمولی طور پر دلکش چہرے کو اپنے بہت قریب پاکر بھی میں کبھی نہیں گھبرایا۔ میرے سامنے کتنے لڑکوں اور لڑکیوں نے کلاس رُوم میں عشق کیا ہے۔ پھر ایک ہو کر یہاں سے چلے گئے ہیں۔ میں نے اُنھیں کبھی نہ ٹوکا! بلکہ ہمیشہ اُن کا حوصلہ بڑھایا۔ مجھے اِسی میں بے پناہ مسرت ملتی ہے۔ ایک عجیب سی طمانیت! حسد یا محرومی کا احساس کبھی نہیں ہوا ہے!

جس زمانے میں سوستی پردھان نے آکر میری کلاس میں داخلہ لیا۔ اُن دنوں بھی میں بے حد نارمل تھا۔ سوستی کا انٹرویو لیتے وقت بھی میرے اندر

کسی قسم کی تحریک نے جنم نہیں لیا۔ یہ بات مجھے یوں یاد ہے کہ اُسے دیکھتے ہی میرے دل میں یہ خیال بھی اُبھر آیا تھا کہ اِس معمولی قد اور راؤنڈو نیپال ناک نقشے والی لڑکی پر کون تعلیم یافتہ نوجوان فدا ہو سکے گا! اِس میں ذرا سی بھی تو کوئی ایسی کشش نہیں ہے!

دو تین ماہ بعد یونیورسٹی کی طرف سے سوستی پردھان نے روندرالیہ میں ایک بیلے پیش کیا۔ اُسے اپنے تھارو قبیلے کے سنگیت اور لوک ناچوں میں گہری دلچسپی تھی۔ یہ بات شو دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہوئی۔ شو بے حد کامیاب رہا۔ میں نے سوستی پردھان کی پیٹھ تھپتھپا کر اُسے مبارک باد دی۔ ایسے موقعوں پر لوگ بڑی بے تکلفی سے سر یا ہاتھ بھی چوم لیتے ہیں۔ گلے سے بھی لگا لیتے ہیں۔ وہ جو عمر میں آرٹسٹ سے ذرا بڑے ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے سوستی کے نرم و نازک بدن کا وہ لمس بالکل یاد نہیں ہے۔ اُسے چھوتے وقت میں نے کوئی خاص کیفیت محسوس نہیں کی تھی۔ خاص خاص لمحوں میں کبھی کبھی آدمی پتھر ہو جاتا ہے۔ بالکل بے حس ہوتا ہے۔ جامد بھی۔ خاص خاص لمحوں میں ہی کیوں؟ میں شروع سے ہی ایسا تھا۔ یہ بات میری بہن پرمیرا نے تو اکثر میرے مُنہ پر کہی ہے۔ پتہ نہیں اور بھی کتنی لڑکیوں یا عورتوں نے ایسا ہی کیا ہوگا! من ہی من میں میرے بارے میں یہ سب سوچا ہوگا! مجھے کبھی پتہ ہی نہ چلا۔ آدمی آدمی کے بارے میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچا ہی کرتا ہے۔ کبھی پتہ چل جاتا ہے، کبھی نہیں!

ایک روز میں اپنے آفس میں چھٹی کے بعد بڑے اطمینان سے سگریٹ سُلگائے کسی رجسٹر کی خانہ پُری کر رہا تھا۔ یہ اُس بیلے کے پیش کئے جانے کے دوسرے دن کا واقعہ ہے۔ اچانک پردہ ہٹا کر سوستی نے پوچھا۔

"سر! میں آ سکتی ہوں؟"

میرے اثبات میں سر ہلا دینے پر وہ دونوں بازوؤں میں کتابیں اور کاپیاں بھرے ہوئے اندر آ گئی اور اُنھیں میز کے ایک کونے پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اپنے اسٹوڈنٹس کو میں نے اجازت دے رکھی ہے کہ اگر کرسی خالی ہو تو مجھ سے پوچھے بغیر ہی بیٹھ جایا کریں۔

اُس نے پوچھا: "سر! کل آپ نے میری بہت تعریف کی تھی!"

میں نے رجسٹر سے نظر ہٹا کر اُس کی طرف دیکھا۔ سوستی مُسکرا رہی تھی۔

میں نے کل کی بات کی تائید کی: "ہاں! تعریف کی تھی یقیناً!"

"تو سر! اچھی پرفارمنس (Performance) کے لئے صرف تعریف ہی تو کافی نہیں ہوتی!"



میں چونک اُٹھا لیکن رجسٹر پر پھر سے جھکتے ہوئے پوچھا: "کوئی انعام چاہیئے؟"

"جی ہاں سر! انعام ہی لینے کے لئے آئی ہوں! پر مُنہ مانگا ملے تو بات ہے!"

میرا خیال ہے اُس وقت بھی وہ مُسکرا رہی تھی۔ اُس کی آواز میں ہنسی کی آمیزش تھی۔ اُس روز وہ خلافِ توقع بے تکلف بھی تھی۔ آدمی کسی کام میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر لینے اور پھر بے پناہ تعریف سُننے کے بعد تو جذباتی ہو ہی جاتا ہے۔ میں خوش ہوا۔ وہ اِتنی آزادی سے انعام طلب کرنے آ گئی ہے۔ کہا: "بولو کیا چاہیئے؟"

میرا خیال تھا اُسے چائے یا کافی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہوگی —! میرے بعض اسٹوڈنٹس سخت تھکان کے لمحات میں اِسی مقصد کے لئے آ جاتے ہیں۔ جب کینٹین بند ہو جاتی ہے۔ میں اپنے آفس میں الیکٹرک پرکولیٹر رکھے ہوتے ہوں۔ کنڈنسڈ ملک اور چینی بھی۔ وہ خود ہی چائے بناتے اور پیتے ہیں۔ مجھے بھی پلاتے ہیں۔ لیکن سوستی نے کہا: "سر! اِس وقت میں ایک بڑی انوکھی درخواست کرنا چاہتی ہوں! گستاخی معاف ہو تو عرض کر دوں؟"

اب میں نے رجسٹر پرے کھسکا دیا۔ ہونٹوں میں دبی سگریٹ سے گری ہوئی راکھ کو پھونک سے اُڑایا اور حیران ہو کر کہا: "بولو تو؟"

اُس نے میز پر سے سگریٹ کی ڈبیا اُٹھالی۔ کہا" سر! مجھے سگریٹ پینے کی عادت ہے۔ ہاسٹل میں کئی کئی پیکٹ پھونک ڈالتی ہوں یہاں تو سب کے سامنے ایسا کرنے کی بات بھی نہیں سوچی جاسکتی۔ یونیورسٹی سے فوراً ٹرمی نیٹ (Terminate) کر دی جاؤں گی۔ لڑکے ہی نہیں جینے دیں گے! سگریٹ پینے والی لڑکی دم بھر میں مشہور ہو جائے گی! اگر آپ کی اجازت ہو تو کبھی کبھی آپ کے دفتر میں آکر اسموک کر لیا کروں؟"

میں چُپ سا بیٹھا رہ گیا۔ اُس کی طرف دیکھتا ہوا سا!

باریک بھوؤں، چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور چپٹے چہرے والی لڑکی آج اچانک بدل کیوں گئی ہے۔ جیسے یونیورسٹی میں پہلی بار آئی ہے۔ مجھ سے پہلی بار ملی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے اندر بے حد خوشی محسوس کی۔ کوئی لڑکی میرے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ بھی پی سکتی ہے۔ ایک دوست کی طرح!

لیکن میں نے کسی قدر جھجک کے ساتھ ہی اُسے اجازت دی۔ کم سے کم اُن لمحوں میں آس پاس کوئی اور نہیں تھا۔ کسی کے آجانے کی اُمید بھی نہیں تھی۔ یہ انعام اُسے دے ہی دیا جائے۔

اُس نے سگریٹ نکال لیا۔ میں نے سُلگانے میں مدد کردی۔ وہ "تھینکس" کہہ کر بڑے اطمینان سے دھواں اُڑانے لگی۔

جب وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ میں اُس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ پہلی لڑکی تھی جسے میں نے اچانک ــــ اپنے قریب محسوس کیا تھا۔ اُس سے پُوچھا" تمھارے وہاں عورتوں میں سگریٹ پینے کا رواج ہے؟"

بولی" رواج تو وہاں بہت سے اور بھی ہیں۔ ایسے جنھیں یہاں کے مرد بھی اپناتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ جیسے ہم شراب بھی پیتی ہیں۔ وہاں کوئی پابندی نہیں ہے۔ بچپن ہی سے اُس کی عادت ڈال دی جاتی ہے۔"

میں یقین کرنے کے لئے تیار نہ ہوسکا۔ اُس نے کہا" سر! میں جانتی تھی آپ یقین نہیں کریں گے۔"

پہلا سگریٹ ختم کرکے اُس نے ایک اور سگریٹ لینے کی اجازت چاہی۔ اور کہا" آپ شراب پیتے ہیں؟"

میں نے کہا" لیکن یہ میرا بالکل ذاتی معاملہ ہے۔ تم کیوں پُوچھتی ہو؟"

بولی" یونہی! جاننے کے لئے کہ آپ اپنے ذاتی معاملے کو کتنی امپارٹنس دیتے ہیں!"

وہ ہنس پڑی۔

مجھے اُس کی ہنسی بہت اچھی لگی۔ کانوں میں بجتی ہوئی سی۔ میں بھی ہنس دیا۔ پُوچھا" تو کیا تم اپنے وارڈ میں شراب بھی پیا کرتی ہو؟"

"جی ہاں، کبھی کبھی!"

"کسی کو پتہ نہیں چلا ابھی تک!"

"جی نہیں۔ سوتے وقت ہی چند گھونٹ پی کر لیٹ جاتی ہوں۔"

گزشتہ چھ مہینے سے میرے ہی یہاں تعلیم پانے والی لڑکی اچانک ــــ کتنا رُوپ بدل کر آگئی ہے۔ ابھی تک کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ اُس روز بھی اُس کا رُوپ چونکا دینے والا تھا جب وہ اِس طرح سفید ساڑی، سفید بلاؤز اور اونچے جوڑے کے ساتھ نہیں بلکہ کالا لہنگا اور سُرخ بلاؤز پہنے ناچ رہی تھی گلے میں پیلے اور ہرے منکوں کی کئی مالائیں تھیں۔ ایک بھاری مالا روپے پیسوں کے سکّوں کی بھی تھی۔ کانوں میں چاندی کے سکّوں سے بنائے گئے ٹاپس، پاؤں اور کلائیوں میں چھن چھن بجتے ہوئے چاندی کے کھوکھلے کڑے اور سر پر بندھا ہوا ریشمیں رومال! اُس وقت وہ کتنی مختلف تھی۔ اُسی قسم کے نباس اُس کے ساتھ ناچنے والی دوسری لڑکیوں نے بھی پہن رکھے تھے لیکن وہ سب شمالی ہند کی تھیں۔ کھڑے ناک نقشے والی۔ تھارو قبیلے کی نہیں لگتی تھی۔

میں نے کہا" سوتی! تم کل والے لباس میں پھر کبھی نظر آؤ!"

وہ جیسے میرے دل کے بہت اندر تک پہنچ گئی۔ ہنس کر بولی" بہت اچھی لگی تھی آپ کو؟"

میں نے جھوٹ بولنا اچھا نہ سمجھا۔ کہہ دیا" ہاں!"

بولی" اچھا!"

"پھر کب؟"

"جب چاہیں!"

وہ سگریٹ ختم کرکے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی" اب اجازت دیجئے ــــ بہت سی اسکیمیں تیار کرنی ہیں۔ چارٹ بھی بنانے ہیں۔ کام کرتے کرتے آدھی رات تو ہو ہی جائے گی۔"

میں نے سگریٹ کا پیکٹ اُس کے آگے پھینک دیا" لے جاؤ۔ انعام ہے تمھارا!"

اُس نے مُسکرا کر پیکٹ پرس میں رکھ لیا۔ کتابیں اور کاپیاں اُٹھا کر چلی گئی۔

میں کتنی ہی دیر تک گُم سُم سا بیٹھا رہا۔ اُسی کے بارے میں سوچتا رہا، ڈرتا رہا۔ خواب کہیں ٹُوٹ تو نہیں گیا ہے! وہ سچ مچ آئی تھی نا! میرے سامنے

سگریٹ پیتے پیتے باتیں کرتی رہی تھی !!

دوسرے دن پھر آئی۔ ٹھیک اُسی وقت۔ جب چھٹی ہوگئی۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ میں منتظر تھا۔ دن بھر اُسی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ آئے گی یا نہیں آئے گی ! سچ مچ آگئی تھی۔ آتے ہی سگریٹ نکال کر پینے لگی۔ میں نے اُس سے چائے بنانے کے لئے کہا تو وہ فوراً تیار ہوگئی۔ جیسے مجھے خوش کرنے کے لئے ایک بہت ہی آسان نسخہ اُس کے ہاتھ لگ گیا ہو !"

ہم جب چائے پی رہے تھے۔ میں نے پوچھا ــــ "تم تھارو بن کر کب آؤ گی ؟"

"جب کہئے !"

بہت عجیب سا لگا اُس کا جواب۔ میں نے کہا " اسٹیج پر تو اب کوئی شو ہونے سے رہا۔ تم لوگ اب امتحان میں مصروف ہو جاؤ گے "

وہ ہنس پڑی " تو پھر کالج ہی میں ایک دن وہی لباس پہن کر آجاؤں ؟ سب ہنسیں گے تو ہنستے رہیں ! آخر کو یہ میرے یہاں کا اور جنگل لباس تو ہے ہی ! لوٹ کر پھر وہی پہنوں گی !"

میں نے کہا " کیا ایسا نہیں ہوسکتا میں شام کو گومتی پر تمھارا انتظار کروں اور تم وہیں مل جاؤ۔ اُسی لباس میں !"

وہ پھر ہنس دی ــــ "لوگ دیکھیں گے تو سمجھیں گے آپ کہیں سے 'مال' مار لائے ہیں !"

مجھے فوراً غلطی کا احساس ہوگیا۔ شہری زندگی میں شہری اور قبائلی لباس کا میل کتنا عجیب ہوسکتا ہے ! لوگ واقعی باتیں بنائیں گے۔ اُسے ساتھ لے کر گھومنا خود میرے لئے مشکل ہو جائے گا۔

میں نے کہا ــــ " اچھا تو تم مجھے اپنے گاؤں لے چلو۔ تمھارے قبیلے کو دیکھوں گا کیسے رہتے ہیں ؟ کیسے ناچتے، گاتے اور کھیتی باڑی وغیرہ کرتے ہیں !"

بولی ــــ " وہاں جا کر آپ کو بڑی مایوسی ہوگی سر ! ہم لوگ بہت پچھڑے ہوئے ہیں۔ غیر مہذّب بھی ہیں۔ کم سے کم آپ کے مقابلے میں تو یقیناً ! معلوم ہے آپ کو، سینکڑوں سال پہلے ہزاروں راجپوت عورتیں راجپوتانے سے نکل نکل کر ترائی میں چلی آئی تھیں ! گھروں سے ہزاروں میل دُور۔ اپنے مَردوں کو لڑائی کے میدانوں میں لڑنے کے لئے چھوڑ کر۔ اِس اُمید پر کہ اُن کے مرد لڑائی جیت لینے کے بعد اُنھیں واپس لے جائیں گے۔ لیکن وہ لوگ پے درپے لڑائیاں ہارتے رہے اور ختم ہوتے رہے۔ عورتیں جنگلوں میں گھر بنا کر اُن کا انتظار کرتی رہیں اور برہا کے گیت گاتی رہیں ! کتنی ہولیاں گزر گئیں۔ کتنی دیوالیاں اور کتنے دوسرے تیوہار ! جو عورتوں اور مَردوں کے رشتوں کو ہی نہیں پورے سماج کے بُنیادی ڈھانچے کو جوڑتے اور مضبوط کرتے ہیں ! مرد واپس نہیں پہنچے۔ عورتیں ہر پھر غنیم کے تعاقب سے خوف زدہ ہو کر جنگلوں کے اندر اور دُور تک [illegible] چھپتی پھریں۔ اُن کے ساتھ نوکر تھے۔ چھوٹی ذاتوں کے رکھوالے [illegible] اپنی نسلوں کے ختم ہو جانے کا احساس ہوا تو اُنھوں نے اُنھیں نوکروں [illegible] کے ساتھ شادیاں رچالیں۔ وہ اب بھی اُنہی کے ساتھ بیاہ کر لیتی ہیں۔ لیکن اُنھیں برابر کا درجہ کبھی نہیں دیتیں۔ اپنے ساتھ چارپائی پر نہیں بیٹھنے دیتیں۔ اُنھیں رسوئی میں بھی نہیں گھسنے دیتیں۔ اُن کے ہاتھ میں گھر کا روپیہ پیسہ تک نہیں رکھتیں وہ شوہر ہو کر بھی گھر میں نوکروں کی طرح رہتے ہیں۔ صدیوں کے اِن رشتوں نے عورتوں کی شکل و صورت تک بدل دی ہے۔ وہ اب کسی زاویے سے بھی راجپوت معلوم نہیں ہوتیں۔ اُن کی زبان تک بدل چکی ہے۔ صرف رسم و رواج نہیں [illegible] ہیں۔ لوک ناچ اور گیتوں کے سُر تال ابھی تک وہی ہیں تیوہار بھی وہی [illegible] آپ کو پسند آئے گا ؟ وہاں آپ کے رہنے کے لائق کوئی ایک مکان بھی نہیں ملے گا ! کوئی آپ سے بات بھی نہیں کرے گا۔ وہاں اجنبیوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ عورتیں اور لڑکیاں تو اُن کے سائے سے بھی ڈرتی ہیں کھیتوں میں کام کرتی ہوتی ہیں تو اُن کی جھلک پاتے ہی کام چھوڑ چھوڑ کر ہرنیوں کی طرح چھلانگیں مارتی ہوئی بھاگ نکلتی ہیں۔ جب تک یہاں نہیں آئی تھی میں بھی کئی بار تم کو دیکھ کر بھاگ بھاگ نکلی ہوں !"

میں ہنس پڑا۔ خوش ہوا۔ اصرار کیا " ایک بار ضرور لے چلو ! امتحان ختم ہونے کے بعد تمھارے ساتھ چلوں گا۔ دیکھنے کے لئے ! جو کچھ تم نے بتایا ہے۔"

اُس نے جواب نہ دیا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ اُسے ایک اور سگریٹ [illegible] سوچتے سوچتے ہی سارے سگریٹ پی گئی۔ کوئی اور بات نہ کہی اُس نے۔

ہم کالج کے احاطے سے باہر آئے تو میں نے کہا " اب تو تم شہری ہوگئی ہو ! شہروں میں رہ کر تم نے کتنی اچھی زبان سیکھ لی ہے۔ اب تم یہیں رہ جاؤ۔ یہیں کہیں نوکری بھی مل جائے گی "

بولی " اپنے قبیلے کی میں پہلی لڑکی ہوں جس نے اتنی تعلیم حاصل کی ہے یہاں سے لوٹ کر مجھے وہاں کئی اسکول کھولنے ہیں۔ وہاں سب لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں "

میں نے کہا " میں تمھیں واپس ہی نہ جانے دوں گا۔ میری مرضی کے بغیر کیسے جا سکو گی ؟ نہیں مانو گی تو امتحان میں فیل کر دوں گا۔ ہر سال فیل کرتا رہوں گا !"

"اُفوہ! کتنے ضدی ہیں آپ!" وہ ہنس رہی تھی۔ لیکن میں جو کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ سچ بھی ہو سکتا تھا۔ اتنا سچ کہ اس کی وجہ سے ہم دونوں میں جھگڑے کا بھی امکان تھا۔ آج بھی کل کی طرح یاد ہے۔ اپنی کہی ہوئی بات۔ ایک عجیب سی شدت میرے رگ و پے میں اچانک سما گئی تھی۔ سوچتا تھا سوستی چلی گئی تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

میں اُسے روکنے کے منصوبے بنانے لگا۔ فیل کرنے کے علاوہ۔ فیل کر دینا دراصل میرے اختیار میں تھا ہی نہیں۔ جو کچھ میں پڑھاتا تھا، اُس کا امتحان دوسرے لیتے تھے۔ میں نے بالکل دوسرے طریقے سے سوچا۔ اُسے شہر کی موڈرن لائف کے اِس قدر قریب کر دوں کہ پھر وہ اپنے قبیلے کی طرف لوٹنے کی بات سوچ ہی نہ سکے۔ ایک اپاہج کی طرح جو سڑک کے کنارے بٹھا دیا جاتا ہے۔ فرصت کے اوقات میں اُسے اپنے ساتھ ساتھ گھمانے لگا۔ لوگوں کو ہم دونوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ سوچنے کا موقع ملا۔

تھوڑے ہی دنوں میں وہ اور بدل گئی۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے بال جن کا وہ پِن کی مدد سے جُوڑا بنایا کرتی تھی اب چھلکتے ہوئے آبشار بن گئے۔ چہرے کے دونوں طرف۔ وہ پہلے سے زیادہ جاذب نظر ہو گئی۔ جس کلب میں میں جایا کرتا تھا وہاں اُسے بھی لے گیا۔ بار، بلیرڈ، تاش سب کچھ تھا وہاں۔ اور بھی عورتیں جاتی تھیں وہاں۔ وہ ایک دوسری دُنیا ہے۔ شہر کی دُنیا کے بیچ ایک اور ہی دُنیا! روزمرّہ کے کاروباری معمول سے اُکتائے ہوئے لوگ! جو وہاں جا کر بھی کاروبار ہی کی باتیں کرتے ہیں۔ اپنی عورتوں سے اُکتائے ہوئے لوگ جو اپنے ساتھ اپنی بیویوں کو لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن وہاں اپنی بیویوں کو دوسروں کے پاس بٹھا کر خود اُن کی بیویوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی وہاں مل جاتے ہیں جنھیں دن میں کسی کے ساتھ بات کرنے کا موقع نہیں مل پاتا۔ لیکن وہاں جا کر بھی اُن کے انٹلکچول افکار کو سُننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ چھچھورے، بداخلاق اور باتونی لوگوں میں شامل نہ ہو کر وہ کسی کونے میں الگ تھلگ بیٹھ کر شراب پیتے رہتے ہیں اور اُسی طرح سوچتے رہتے ہیں۔

سوستی نے اُس فضا کو اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے دیکھا۔ وہاں جا کر بہت خوش ہوئی۔ مگر وہ سمجھ نہ سکی وہاں اُسے کیوں لے جاتا ہوں! لوگ اُس کی طرف رشک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُس کے ساتھ باتیں کرنے کے بھی متمنی ہوتے۔ لیکن میں اُس کا بہت چالاک اور ہوشیار محافظ تھا۔ قدم قدم پر ساتھ رہتا تھا۔ وہاں اُسے اپنے ہی قریب رکھنے کے لئے لے جاتا تھا۔

اُس کے ایگزام ختم ہو گئے تو ایک روز اُسی کلب میں سوستی کو اسٹیج پر پیش کرنے کا پروگرام بن گیا۔ قبائلی ناچ اور گانے کے لئے۔ جس کے لئے وہ مشہور ہو گئی تھی۔ حسبِ توقع وہاں بھی وہ بے حد کامیاب رہی۔ شو کے بعد میں نے اُسے کپڑے تبدیل نہ کرنے دیئے۔ اُسی لباس میں اپنے ساتھ لے کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ اُس رات کو اُس کا کھانا میرے گھر تھا۔ راستے میں اُسے ترغیب دی۔ وہ اب واپس جانے کا فیصلہ بدل دے۔ یہاں وہ ہمیشہ ہردلعزیز بنی رہے گی۔ ملازمت بھی مل جائے گی۔ لیکن اُس نے میری بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔

اُس روز وہ اپنے قبائلی لباس میں پہلے سے کہیں زیادہ پُرکشش لگ رہی تھی۔ میں نے من ہی من میں ارادہ کر لیا کہ آج اُسے ہوسٹل میں بھی واپس نہیں جانے دوں گا۔ جب اُسے آگاہ کیا تو وہ بھڑک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کھانے کے بیچ میں ہی۔ فوراً باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ مجھے اُس وقت اور تو کچھ نہ سُوجھا۔ اُسے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ فیصلہ کر لیا، اب یہی ہو گا۔ اُسے کسی قیمت پر آزاد نہیں کروں گا۔ جب تک وہ میرے ساتھ شادی کر لینے کا وعدہ نہیں کر لیتی، یہیں رہنے کا فیصلہ نہیں کر لیتی۔ میں اُسے مجبور کر سکتا ہوں۔ آخر وہ ہے ہی کیا! وہ میری خواہشات کے سامنے کیوں نہ جُھکے! اگرچہ اُسے رضامند کرنے کے سارے حیلے، ساری منطقیں ناکام ہو چکی تھیں۔

وہ اندر سے دروازہ پیٹتی رہی۔ چیختی رہی۔ گالیاں دیتی رہی۔ ضدی ضدی کہتی رہی! آخر میں رونے لگی۔ لیکن میرا دل نہ پسیجا۔ اب میں بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لئے تیار تھا۔ میں بھی ایک عجیب سے غُصّے کے عالم میں تھا۔ پھر وہ چُپ ہو گئی۔ دیر تک خاموش رہی۔ میں اطمینان سے ساتھ والے کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھتا رہا تھا۔ سگریٹ پھونکتا رہا تھا۔ کبھی کبھی اپنی اِس حرکت کے نتائج پر بھی غور کرنے لگتا تھا جو مجھے یونیورسٹی کی ملازمت سے الگ کروا سکتی تھی۔ جیل کی ہوا بھی کِھلا سکتی تھی۔ لیکن پھر وہی خواہش ہر خطرے پر غالب آ جاتی۔ اُسے پا لینے کی خواہش!

میرا خیال تھا وہ اب روتے روتے نڈھال ہو کر سو گئی ہے۔ اُسے جگا کر چائے پلاؤں۔ سگریٹ بھی! اور بہت ہی نرم و موثر الفاظ میں معافی مانگ کر اُسے پھر مجبور کروں۔ دروازہ کھول کر اندر گیا تو حیران رہ گیا۔ وہ کھڑکی کھول کر نیچے کود گئی تھی۔ بیس فٹ نیچے۔ بھاگ نکلنے کے شدید جذبے نے اُسے ایک عجیب سی قوت دے دی تھی۔ لیکن نیچے وہ صحیح و سلامت ہرگز نہیں پہنچی ہو گی۔

کوئی نہ کوئی ہڈی یقیناً ٹوٹی ہوگی!

اب میں پہلے سے کہیں زیادہ خوفزدہ ہونے لگا۔ جس طرح سوچا بھی تھا۔ وہ یہاں سے نکل کر پولیس اسٹیشن بھی جا سکتی ہے! یونیورسٹی کے اونچے ادھیکاریوں کے پاس بھی!

صبح دیر تک انتظار کرتا رہا۔ انہی خطروں کے سچ ہونے کا۔ لیکن میرے پاس کوئی نہ آیا۔ فون کی گھنٹی بھی نہ بجی۔ جی چاہا اس کے ہوسٹل میں خود ہی فون کرکے اس کی خیریت پوچھوں۔ لیکن ہمت نہ ہو سکی۔ میں تیار ہو کر کالج چلا گیا۔

بعد دوپہر وہ بھی دکھائی دی۔ میں نے کھڑکی میں سے بیٹھے بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ صحیح سلامت تھی۔ بظاہر کوئی ہڈی ٹوٹی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ لائبریری میں کتابیں واپس کرنے جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے میرے دفتر میں بھی آنا چاہئے۔ ضمانت کے جمع کئے ہوئے روپے لینے کے لئے۔ لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ آئے گی!

کچھ دیر بعد وہ آگئی۔ چپ چپ سی آکر بیٹھ گئی۔ اس کی بائیں کنپٹی پر کاٹن کا پھاہا چپکا ہوا تھا۔ ایک بازو کی کہنی پر بھی۔ مجھے بہت صدمہ پہنچا۔ الفاظ ٹٹولنے لگا۔ اس کے سامنے کیسے اعتراف کروں۔ میں کتنا بڑا بروٹ (Brutus) ہوں! کتنا بڑا سنگدل! ان دشمنوں سے کہیں زیادہ جو اس کے آباؤ اجداد پر ظلم ڈھانے کے لئے بدنام ہوگئے!

اچانک میری نظر اس کے سر کی طرف اٹھ گئی۔ اس کے ترشے ہوئے بالوں کے درمیان ایک پتلی سرخ لکیر کھنچی ہوئی تھی۔ جیسے کسی نے تیز دھار والے ہتھیار سے ایسا کر دیا ہو! اور جلد میں سے خون رس رس کر جمع ہو گیا ہو اور سوکھ گیا ہو! لیکن وہ خون نہیں تھا۔ سیندور تھا۔ سچ مچ سیندور!

مجھے حیران دیکھ کر وہ بولی "آج صبح اچانک جے سنگھ آگیا۔ ہمارے کمپیوٹر میں کام کرتا [illegible] میں نے اس کے آتے ہی اس کے [illegible] بھی چلی جاؤں گی!"

[illegible] کچھ کہہ نہ سکا۔ وہ میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک میری سگریٹ کی ڈبیا اٹھا کر بولی "سر! ایک سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟"

بھیجتے وقت کوپن میں ی آرڈر پر ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیل ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے یا منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶ لکھنا کافی ہے۔ منیجر

آہ ذاکر حسین خاں

بسمل سعیدی

اے وائے مرگِ حضرتِ ذاکر حسین خاں
دُنیا کا غم ہے رحلتِ ذاکر حسین خاں

تا حشر لوحِ وقت پہ ہو کر رہے گی ثبت
مانندِ مہر، عظمتِ ذاکر حسین خاں

کچھ بندگانِ خاص کو ملتے ہیں جو صفات
تھے وہ ازل سے قسمتِ ذاکر حسین خاں

ہر لمحۂ حیات میں تھے محوِ ذکرِ دوست
ہر سانس ی عبادتِ ذاکر حسین خاں

تھا ہم مزاجِ دَیر و حرم آپ کا مزاج
تھی صُلح کُل طبیعتِ ذاکر حسین خاں

وہ بے نیاز دولتِ دُنیا رہے مدام
تھے علم و فضل دولتِ ذاکر حسین خاں

دِلّی ہے جیسے ہند میں یا دل ہے جسم میں
ہے جامعہ میں تربتِ ذاکر حسین خاں

ہر پھول میں گلاب کے خوشبو ہے جس طرح
ہر دل میں ہے محبّتِ ذاکر حسین خاں

وہ دل، وہ دل ہے جس میں نہ ہو اپنا احترام
جس دل میں ہو نہ عزّتِ ذاکر حسین خاں

بھٹکا نہ کوئی راہروِ جادۂ وطن
تھی خضرِ رہ قیادتِ ذاکر حسین خاں

ہر حال میں بلند رہا اُن کا حوصلہ
ضرب المثل ہے ہمّتِ ذاکر حسین خاں

جب تک دلوں میں جذبۂ خدمت ہے قوم کا
بھُولیں گے ہم نہ خدمتِ ذاکر حسین خاں

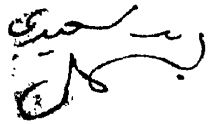
ذاکر حسین خاں کا تدبّر تھا خیرِ عام
تھی حُبِّ کُل سیاستِ ذاکر حسین خاں

ہندوستان بھر کے دلوں میں، نگاہ میں
گھر کر گئی ہے صورتِ ذاکر حسین خاں

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"
کہتی ہے لوحِ تربتِ ذاکر حسین خاں

وہ دن کبھی اُن کی عمر میں شامل ہوا جب تلک
محسوس ہو ضرورتِ ذاکر حسین خاں

بسملؔ خدا ہی جانے قیامت کب آسکے
کب ہو سکے زیارتِ ذاکر حسین خاں





بیسویں صدی دہلی ، ۱۹۶۹ء

افسانہ

دلوں کے اُجالے

م۔م۔ راجندر ایم۔ اے

۵۶۹، موتی باغ ساؤتھ۔ نئی دہلی نمبر ۲۳

برادرِ مکرم! تسلیم

گرامی نامہ ملا۔ اُسے پاکر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو فراموش نہیں کرتے۔ لیجئے آپ کی فرمائش کی تعمیل میں افسانہ نمبر کے لئے ایک تازہ افسانہ "دلوں کے اُجالے" حاضرِ خدمت ہے۔ یہ دو نوجوان دلوں کی بے لوث محبت اور قربانی کی کہانی ہے اور اُمید ہے آپ کو اور آپ کے بلند ذوق قارئین کو پسند آئے گی ―― غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات کے سلسلے میں دِلّی آئے ہوئے کئی مشہور ادیبوں اور نقادوں سے آپ کا ذکر آیا تھا اور سب ہی آپ کے خاموش اور عظیم کام کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن چند لوگوں نے یہ خوشتر کے بعد کون یا کیا کا کیا، قصہ چھیڑ دیا؟ لوگوں کو تو یہ دعا کرنی چاہئے کہ آپ دیر تک سلامت رہیں اور اُردو کی خدمت کرتے رہیں اور پھر آپ کی حیثیت تو ایک انجمن یا ادارے کی ہے جن کے کام نہیں رُکا کرتے . . .

مخلص ―― م۔م۔ راجندر

جب شام کے دُھندلکے میں کیپٹن راجیش اپنی دائیں مصنوعی ٹانگ اور چھڑی کے سہارے لنگڑاتا ہوا اپنی بیوی سُنیلا کے ساتھ مال روڈ پر سیر کے لئے نکلتا اور اُس کا دو سال کا لڑکا سندیپ کبھی اُس کی اور کبھی سُنیلا کی اُنگلی پکڑتا تو کیپٹن راجیش ایک نئی ہی دُنیا میں پہنچ جاتا۔ اُس کا چہرہ مسرت سے اور تمتما اُٹھتا اور وہ سُنیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔

"اِس وقت میری دُنیا، میرا جہاں میرے ساتھ ہے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں!"

اور سُنیلا صرف مُسکرا دیتی اور آہستہ سے کہتی۔

"میرے تو دونوں جہان میرے ساتھ ہیں۔ میری خوش نصیبی کی انتہا نہیں!"

اور دونوں کے ذہنوں پر چار سال پہلے کے واقعات جھلملانے لگتے اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کچھ سوچتے اور پھر مُسکرا دیتے۔

ہاں صرف چار سال پہلے!

کالج کے لان شام کے سُرمئی دُھندلکوں میں ڈوب گئے تھے۔ ایک سناٹا، ایک اندھیارا دُور درختوں تک پھیل گیا تھا۔ لان میں کھیلتے ہوئے لڑکے چلے گئے تھے۔ لیکن راجیش اپنی ہاکی لئے لان میں بیٹھا رہا تھا۔ وہ سُنیلا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پہلی بار اُس نے کسی لڑکی کے بارے میں سوچا تھا اور سوچ کی یہ ننھی سی لہر ایک طوفان بن کر اُس کے ذہن پر چھا گئی تھی۔ لیکن سُنیلا جتنی خوبصورت تھی اُتنی ہی مغرور اور ضدی بھی تھی۔ وہ کلاس میں اور کالج کے لان میں قہقہے لگاتی اور چہچہاتی پھرتی تھی لیکن راجیش کو دیکھتے ہی سنجیدہ ہو جاتی اور اُس نے راجیش کی نظروں میں پیار کے پیغام اور التجا کو کبھی محسوس نہ کیا۔ راجیش تھا کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اُس کا پڑھنے میں جی لگتا تھا نہ ہاکی میں۔ وہ ہر وقت سُنیلا کے بارے میں سوچتا رہتا اور اب تو کالج کے لڑکوں نے بھی اُسے سُنیلا کا نام لے کر چھیڑنا شروع کر دیا تھا۔

سُنیلا اور راجیش دونوں بی ایم۔ اے فائنل میں تھے اور دونوں کا

ایک ہی مضمون تھا۔ اگر سُنیلا اُس کالج کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی تو راجیش بھی کالج کے حسین ترین لڑکوں میں سے تھا۔ لمبا قد، ورزشی جسم، چوڑا سینہ، جاذبِ نظر چہرہ اور خوبصورت بال۔ سُنیلا ایک بڑے سرکاری افسر کی لڑکی تھی اور شاید اُس کے غرور کی کچھ وجہ یہ بھی تھی۔ وہ لمبے قد اور پتلے لیکن سڈول جسم کی بے حد حسین لڑکی تھی۔ اُس کا رنگ گلاب کے پھول کی طرح سُرخ و سپید تھا اور چہرہ اِتنا دلکش تھا کہ گھنٹوں دیکھتے رہنے پر بھی جی نہ بھرے۔ بڑی بڑی کٹورہ سی غلافی آنکھیں جو گھنی اور لمبی پلکوں کی وجہ سے نشیلی سی معلوم ہوتی تھیں۔ متناسب گال اور ناک اور گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم، شاداب اور بھرپور ہونٹ جو بات بات پر دلآویز مُسکراہٹ میں کھِل اُٹھتے۔ اُس کے بال بھی بے حد خوبصورت، گھنے اور لمبے تھے۔ وہ کالج کی دوسری لڑکیوں کی طرح میک اپ کرکے نہ آتی تھی۔ وہ شاید اِس کی محتاج بھی نہ تھی۔ وہ ایسے قدرتی حُسن کی مالک تھی کہ جہاں بھی کھڑی ہوجاتی وہ جگہ منوّر سی ہوجاتی! اور وہ جب چلتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا کہ کسی لہراتے سفید پانی میں کسی نے کوئی لہراتی ہوئی خوبصورت کشتی چھوڑ دی ہو۔

راجیش سُنیلا سے دل ہی دل میں پیار کرتا تھا لیکن اُس سے کچھ کہنے کی ہمت اُس میں نہ تھی۔ وہ اُس کی طرف دیکھتا رہتا تھا اور جب وہ بھی اُس کی طرف اتفاق سے دیکھ لیتی تو وہ نظریں جُھکا لیتا تھا۔ کلاس میں وہ ایک دوسرے سے بولتے تو تھے لیکن یہ باتیں صرف کلاس کی کوئی بات پُوچھنے یا کسی بحث میں حصّہ لینے تک محدود رہتی تھیں۔ کئی بار جب وہ ذہنی طور پر بہت پریشان ہوجاتا تو سوچتا اُسے ایک پرچہ لکھ کر دے دوں کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو اور میں تمھیں پیار کرتا ہوں لیکن پھر وہ ڈر جاتا۔ یہ بات تو نہ تھی کہ سُنیلا یہ سمجھتی نہ تھی کہ راجیش اُس میں دلچسپی لے رہا ہے کیونکہ اُس نے بار بار راجیش کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ اُسے بہت ہی زیادہ دیکھتا ہے۔ نہ یہ بات تھی کہ راجیش اُسے پسند نہ تھا کیونکہ راجیش حسین ہونے کے علاوہ پڑھنے میں بھی ہوشیار تھا اور کالج کی ہاکی ٹیم کا ایک مقبول کھلاڑی تھا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سُنیلا اُن عام لڑکیوں میں سے نہ تھی جو کالج میں رومان کی دلچسپی میں یقین رکھتی ہیں۔ راجیش نے کئی بار اُس سے کالج کے لان میں مِلنے اور بات کرنے کی کوشش بھی کی لیکن بات کرتے کرتے جب کبھی راجیش جذباتی ہونے لگتا تو وہ مُسکرا کر اُس سے جانے کی اجازت مانگ لیتی اور وہ اپنے دل کی بات نہ کہہ پاتا۔

ایک دن راجیش سے نہ رہا گیا اور اُس نے ایک چھوٹے سے پرچے پر یہ لکھ دیا ——

"شاید زندگی بیت جائے گی لیکن تم میرے دل کی دھڑکن کو نہ محسوس کروگی۔ آج بہت مجبور ہوکر اِس پرچے کا سہارا لے رہا ہوں۔ جب سے تمھیں دیکھا ہے دل ہی دل میں تمھاری پرستش کرتا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں کیا محبت یک طرفہ بھی ہوتی ہے۔ تم ہو کہ ایک بُت کی طرح چُپ چاپ اور بے حِس ہو اور میں ہوں کہ شمع کی طرح آنسو بہاتا اور پگھلتا رہتا ہوں۔ کیا تمھارے دل میں میرے لئے کوئی بھی احساس یا جذبہ نہیں ہے؟"

اُس نے شام کو یہ پرچہ لکھ تو لیا تھا اور اگلے دن کتاب میں رکھ کر وہ اِسے لے بھی آیا لیکن اُس کے اندر اِسے سُنیلا کو دینے کا جو حوصلہ کل تھا، وہ آج نہ تھا اور وہ کلاس میں سر جُھکائے بیٹھا رہا۔ یہ پیریڈ ختم ہوگیا تو سُنیلا اُس کے پاس آئی اور اپنی کاپی کھول کر اُس کے ڈیسک پر رکھتے ہوئے بولی۔

"آپ نے کچھ دن ہوئے جن کتابوں کا ذکر کیا تھا اُن کے نام ذرا یہاں لکھ دیجئے۔ میں اگلے پیریڈ میں کاپی آپ سے لے لوں گی۔"

سُنیلا چلی گئی اور راجیش کا حوصلہ لوٹ آیا۔ اُس نے یہ موقع غنیمت جانا اور اُس نے اُس صفحے پر کتابوں کے نام تو لکھ ہی دئے ساتھ ہی وہ پرچہ بھی پن سے اُس کے اوپر لگا دیا اور اگلے پیریڈ میں سُنیلا نے وہ کاپی اُس سے لے لی۔

اُس دن اُس نے سُنیلا کی طرف نہیں دیکھا اور اُمید و بیم کی حالت میں بیٹھا رہا۔ نہ سُنیلا ہی نے کوئی ردِّعمل ظاہر کیا اور آخری پیریڈ ختم ہوتے ہی وہ کالج سے چلی گئی۔ اگلے دن ایک خالی پیریڈ میں جب وہ لان میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا تو سُنیلا اُس کی طرف آئی۔ وہ اُسے آتے ہوئے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ سُنیلا پاس پہنچ کر بولی۔

"آپ نے وہ پرچہ میری کاپی میں رکھ کر اچھا نہیں کیا۔ کل میں بہت غصّے میں تھی اور میں نے کئی بار چاہا کہ پرنسپل کو جاکر وہ پرچہ دے دوں لیکن پھر کچھ سوچ کر چُپ ہوگئی۔ میں آپ کو یہ بتلانے آئی ہوں کہ میں عام لڑکیوں جیسی نہیں ہوں۔ کالج میں کھیلے جانے والے محبت کے سستے کھیل سے مجھے نفرت ہے۔ میں ابھی پڑھنے کے سوا اور کسی بات کے بارے میں

سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نہیں جانتی کہ محبت کیا ہے۔ دوسرے میرے دل میں آپ کے لئے کوئی ایسا جذبہ نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ آپ اِس وہم کو دل سے بالکل نکال دیجئے اور آئندہ کبھی کوئی ایسی بات کرنے کی کوشش نہ کریں کہ میں آپ کی شکایت کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔"

وہ دن راجیش کے لئے بہت اُداس، پھیکا پھیکا سا تھا۔ اُس کے خوابوں کا محل دھم سے نیچے آگرا تھا۔ وہ واقعی پتھّر کے ایک بُت سے پیار کرتا رہا تھا اور آج اِس مغرور لڑکی نے اُس کے دل کو کتنی ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ باقی کسی پیریڈ میں نہیں گیا اور یہیں درخت کے تلے بیٹھا رہا۔ جذبات کی شِدّت سے مغلوب ہوکر وہ رونے لگا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ سُنیلا سے اُس کی سرد مہری کے باوجود پیار کرتا ہے اور سُنیلا کے بغیر کالج کی یہ زندگی، بلکہ اُس کی اپنی ہی زندگی بیکار اور بے سُود ہے۔ وہ وہاں سے اُٹھ کر کالج کی لائبریری میں چلا گیا اور آج کا اخبار پڑھنے لگا۔ ایک جگہ اُسے ایک اشتہار نظر آیا کہ ہند فوج کے لئے ایمرجنسی کمیشن آفیسرز کی ضرورت ہے۔ اُس نے پتہ نوٹ کرلیا اور اُسی دن درخواست کے فارم کے لئے لکھ دیا۔

فارم آگیا اور اُس نے بھر کر بھیج دیا۔ اِنٹرویو وغیرہ ہوئے اور اُسے کمیشن مِل گیا۔ اُس نے صرف اِس موقعے پر اپنے گھر والوں کو لکھا کہ اِس وقت مادرِ وطن کو اُن نوجوانوں کی ضرورت ہے جو اُس کی حفاظت کرسکیں۔ اُس نے پڑھائی چھوڑ کر فوج میں کمیشن لے لیا ہے اور وہ ٹریننگ کے لئے پونہ جا رہا ہے۔ ایسا لکھ کر راجیش نے جھوٹ نہیں بولا تھا کیونکہ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان کی سرحدوں پر خطرہ بڑھ گیا تھا اور سارا دیش اِس دھرتی کے چپے چپے کی حفاظت کے لئے کمر کس رہا تھا۔ جس دن راجیش پونہ کے لئے روانہ ہوا، وہ اُداس نہ تھا۔ اُس کے دل میں ایک نئی اُمنگ اور جوش ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اُس نے یہ خط سُنیلا کو بھی کالج کے پتے پر ڈاک سے بھیج دیا۔

اچھی سُنیلا!

صرف یہ آخری خط لکھنے کی اجازت دے دو۔ تمھارا پیار کھو کر فوج میں کمیشن کے لئے درخواست میں نے اپنے آپ سے بدلے کے جذبے میں دی تھی کیونکہ تمھارے بغیر زندگی کا میں تصوّر بھی نہ کرسکتا تھا۔ یہ میری بد قسمتی ہے کہ میرے لئے تمھارے دل میں کوئی بھی جذبہ نہیں، لیکن میں تمھیں چُپکے ہی چُپکے پیار کرتا رہا ہوں۔ نہ جانے اِن دنوں میں کتنی بار رویا ہوں اور ہر بار تمھارے ہی بارے میں سوچ کر۔ لیکن جو بات میں تمھیں اب کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اب جب مجھے کمیشن مِل گیا ہے، تمھارے پیار کی جگہ ایک نئے اور انوکھے جذبے نے لے لی ہے اور وہ ہے اپنے وطن کے لئے مر مٹنے کا جذبہ۔ سوچا کہ یہاں سے ہمیشہ کے لئے چلے جانے سے پہلے تم سے مِل کر الوداع کہہ دوں لیکن پھر اِس خط کا سہارا لے رہا ہوں۔ ایم۔ اے کے امتحان میں اب صرف دو مہینے باقی ہیں۔ افسوس کہ میں اپنا ایم۔ اے پُورا نہ کرسکا۔ لیکن تمھاری شاندار کامیابی کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں۔ پرماتما تمھیں سدا خوش رکھے۔"

اِس طرح سے یہ پیار کی کہانی ختم ہوگئی اور ایک اور کہانی شروع ہوگئی۔ سُنیلا کو راجیش کا خط مل گیا۔ لیکن اُس نے اِسے اپنی چند سہیلیوں کو دکھا کر چند قہقہے لگا دیئے۔ کالج میں جتنے مُنہ اُتنی باتیں اُڑ گئیں۔ عام طور پر یہ کہا جا رہا تھا کہ راجیش نے سُنیلا کی محبت میں ناکام ہوکر پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور فوج میں بھرتی ہوا ہے۔ راجیش کو سب اِتنا چاہتے تھے کہ اُس کے کالج چھوڑنے پر سبھی کو افسوس ہوا اور کئی لڑکے اور لڑکیوں نے تو سُنیلا کو طعنے بھی دیئے۔

آخر جو خدشہ تھا وہ پُورا ہوا اور پاکستان سے ایسی لڑائی چھڑ گئی جو سرکاری طور پر جنگ نہ کہلاتی ہوئی بھی بڑے پیمانے پر بھیانک جنگ تھی۔ اِس وقت سوال دیش کی حفاظت کا تھا اور ہمارے بہادر جوان ہر محاذ پر اِس کا ثبوت دے رہے تھے۔ نوجوان راجیش اب لفٹیننٹ راجیش تھا اور اُس کی یونٹ کشمیر کے محاذ پر چھمب جوریاں میں تعینات تھی۔ ایک ہفتے کی سخت گولہ باری میں راجیش نے غیر معمولی جوانمردی اور شجاعت کا ثبوت دیا اور وہ بار بار اپنے جوانوں کو لے کر آگے بڑھا اور دشمن کی چوکیوں پر دھاوا بول دیا۔ ایسے ہی ایک موقع پر اُس کے پَیر پر دشمن کی کئی گولیاں لگیں اور وہ شدید طور پر زخمی ہوگیا۔

وہ پہلے ملٹری ہسپتال جالندھر میں رہا اور بعد میں ملٹری ہسپتال پونہ میں منتقل کر دیا گیا جہاں اُس کے دائیں پَیر کو ران کے اوپر سے کاٹنا پڑا۔ اِس دَوران میں جنگ بھی ختم ہوگئی تھی۔ جن جوانوں اور افسروں نے غیر معمولی شجاعت کے جوہر دکھائے تھے اُن میں لفٹیننٹ راجیش کا نام بھی تھا۔ اُسے اپنے فرض کی ادائیگی پر بہت فخر تھا اور ہسپتال میں پڑے ہوئے کبھی اُسے یہ خیال تک نہیں آیا کہ اُس کا دایاں پَیر کٹ گیا ہے۔

راجیش کو چھ مہینے ہسپتال میں ہو گئے تھے۔ اُس کے بائیں پیر میں جو دو گولیاں لگی تھیں اُنھیں نکال دیا گیا تھا اور وہ پیر اب ٹھیک تھا۔ اُس کا دایاں مصنوعی پیر ابھی لگنا باقی تھا اور چند دن میں اُسے اِس کے لئے جانا تھا۔ ہسپتال میں سب رشتے دار اور دوست اُس سے ملنے آچکے تھے اور اُس نے اُن سے مل کر بڑا حوصلہ پایا تھا۔ کبھی کبھی اُسے سُنیلا کا خیال بھی آجاتا تھا اور اِس خیال کے آتے ہی اُسے سب پچھلی باتیں یاد آجاتی تھیں۔ اُس کی تو شادی شاید اب ہو چکی ہوگی اور نہ جانے وہ اب کہاں ہوگی۔

ایک دن اُسے ایک تار ملا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ یہ تار سُنیلا کا تھا اور وہ کل اُس سے ملنے آرہی تھی! اُس نے تار کو بار بار پڑھا اور اُسے یقین نہ آیا کہ یہ تار سُنیلا ہی نے بھیجا ہے اور وہ اُس سے واقعی ملنے آرہی ہے۔ وہ دن بہت بے چینی اور اضطراب کی حالت میں گزرا اور اگلے دن جب سچ مچ سُنیلا اُس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ سُنیلا ویسی ہی خوبصورت، ویسی ہی سادہ تھی اور اُس کے لباس اور سادگی سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ وہ راجیش کو دیکھ کر مُسکرائی اور راجیش بھی مُسکرا دیا۔ وہ اُس کے پلنگ ہی پر اُس کے پاس بیٹھ گئی اور اُداس اُداس سی نظروں سے راجیش کو دیکھنے لگی۔

"تم؟" راجیش بولا "تم یہاں کیسے؟ کتنے دنوں بعد تمھیں دیکھ رہا ہوں۔ تم اچھی تو ہو؟"

سُنیلا نے جواب نہ دیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ راجیش کی پیشانی پر رکھ دیا اور پھر اُس کے بالوں کو سنوارنے لگی۔ پھر نیچی نظریں کر کے بولی۔

"مجھے یہ تو پتہ لگ گیا تھا کہ آپ زخمی ہو گئے ہیں اور آپ کا ایک پیر بھی کٹ گیا ہے لیکن یہ نہ پتہ لگا کہ آپ کس ہسپتال میں ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے مجھے کسی نے بتایا کہ آپ پونہ میں ہیں اور میں نے اُسی وقت آپ کو تار دے دیا اور چلی آئی۔"

"تمھارا بہت بہت شکریہ! یہاں آکر تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔" راجیش بولا۔

سُنیلا چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر اچانک آہستہ آہستہ رونے لگی۔ اور رو چکی تو رُندھے ہوئے گلے سے بولی۔

"کیا آپ مجھے معاف کر سکیں گے۔ آپ ایک عظیم انسان ہیں۔ میں آپ کو پہچان نہ سکی۔ دوسرے میں کالج میں پڑھنے کے سوا اور کسی بات کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد جب کبھی آپ کا خیال آیا تو میں نے ایک گناہ کا احساس کیا کہ صرف میری وجہ سے آپ نے اپنی پڑھائی چھوڑی اور فوج میں گئے۔ جتنا آپ کا خیال آتا اتنا میں آپ کے قریب آتی گئی۔"

وہ ایک منٹ کے لئے چُپ ہو گئی اور پھر بولی۔

"میں آپ کے بارے میں جتنا کچھ پتہ لگ سکتا تھا معلوم کرتی رہی۔ جب پتہ لگا کہ آپ لڑائی میں سخت زخمی ہو گئے ہیں تو میں نے بہت بے چینی محسوس کی اور اگر میرے پر ہوتے اور آپ تک پہنچ سکتی تو اُڑ کر آجاتی۔ پھر یہ پتہ لگا کہ آپ کا دایاں پیر کٹ گیا ہے اور یہ سُنتے ہی میں روئی تو لیکن ساتھ ہی میرا سر عقیدت سے جھک گیا۔ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ سے کتنا پیار کرتی رہی ہوں۔ بولئے کیا آپ مجھے اپنی داسی بنا لیں گے؟"۔

راجیش چونک پڑا۔ سُنیلا نے اُس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا تھا اور وہ شاید پھر رونے لگی تھی۔ راجیش نے اُس کا سر اُٹھایا اور بولا۔

"میں سمجھا نہیں۔ کیا تم میری بننا چاہو گی یعنی مجھ سے شادی کر سکو گی؟"

"جی" سُنیلا آہستہ سے بولی۔

"لیکن سُنیلا میں اب تمھارے قابل کہاں رہا۔ میں تو اب ایک معذور اور اپاہج آدمی ہوں اور ساری عمر لنگڑا کر چلوں گا۔ تم ایک بڑے گھر کی پڑھی لکھی بے حد خوبصورت لڑکی ہو۔ میں اِتنا خود غرض نہیں ہوں کہ اپنی خوشی کی خاطر کسی کی زندگی برباد کر دوں۔ شادی کے بارے میں تو میں اب سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ایسا نہ کہیے، میں آپ کا انتظار کرتی رہی ہوں میں ایک ہندوستانی لڑکی ہوں جس کے لئے اُس کا شوہر جیسا بھی ہے اُس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ آپ محبت کی خاطر اِتنی بڑی قربانی دے سکتے ہیں، وطن کے لئے مر مِٹ سکتے ہیں اور کیا میں آپ کو یہ سہارا بھی نہیں دے سکتی۔ میں تو اب آپ کی ہوں، چاہے قبول کیجئے یا ٹھکرا دیجئے!"

"لیکن سُنیلا تمھارے گھر والے؟"

"میرے گھر والے سب مان چکے ہیں۔ میں اُن کی مرضی ہی سے یہاں آئی ہوں۔ اُنھیں آپ کے بارے میں میں نے سب کچھ بتا دیا ہے اور اُنھیں میرے فیصلے اور میرے انتخاب پر بہت فخر ہے۔"

راجیش نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہاں کر دی۔ سُنیلا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو اُمڈ آئے اور اُس نے ایک دفعہ پھر اپنا سر راجیش کے سینے پر رکھ دیا۔ دونوں کے دل ایک نئے اُجالے سے معمور ہو گئے!

اور اِس طرح قربانی کی یہ دو کہانیاں مل کر ایک کہانی بن گئی۔ کوئی کہتا راجیش نے قربانی دی اور کوئی سُنیلا کو قربانی کا پیکر بتاتا لیکن سبھی نے ان دونوں کے جذبوں کو بے حد سراہا اور اُن کی شادی پر دل کھول کر مبارکباد دی۔

اور یہ کہانی صرف چار سال پہلے شروع ہوئی تھی ——— آج جب مال روڈ پہ یہ چھوٹا سا کنبہ شام کی سیر کو نکلتا ہے تو کیپٹن راجیش اور سُنیلا دونوں ہی ایک دوسرے کو اپنی دُنیا، اپنا جہاں سمجھتے ہیں۔ کس کا جہاں، کس کی دُنیا کتنی حسین ہے! یہ صرف وہ خود ہی نہیں، اُنھیں دیکھنے والے دوسرے بھی محسوس کرتے ہیں۔ دلوں میں اُجالا ہو تو یہ دُنیا کتنی حسین بن جاتی ہے!!

غزل

پروفیسر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ ایم۔ اے

جب سے کہا ہے ساجن تم کو
پایا جان کا دشمن تم کو

آئینہ ہے حُسن تمہارا
کون دکھائے درپن تم کو

آنکھ مِلاکر آنکھ چُرانا
کس نے سکھایا یہ فن تم کو

یہ تو جگر ہے صرف ہمارا
سونپ دیا ہے جیون تم کو

دل کو بخشی درد کی دولت
دوست کہوں یا دشمن تم کو

ہم خود اپنی بربادی کا
کیا بتلائیں کارن تم کو

دل کی رام کہانی سُنکر
ناحق ہوگی اُلجھن تم کو

اپنی دھرتی ہم کو پیاری
بخشا چاند کا آنگن تم کو

جس کو سوزِ دل کہتے ہیں
منشاؔ مِلا ہے وہ دھن تم کو

محمد منشاء الرحمٰن خان منشاؔ

غزل

حقی حزیںؔ۔ ایم۔ اے

وہ جب سے واقفِ غم ہو گیا ہے
تڑپنا خود بخود کم ہو گیا ہے

کوئی کیا ہم سے برہم ہو گیا ہے
پریشاں نظمِ عالم ہو گیا ہے

خوشی سے خوش نہ غم سے ہے یہ غمگیں
عجب کچھ دل کا عالم ہو گیا ہے

ہُوا ہے اس طرح کوئی مخاطب
مرا مفہوم مُبہم ہو گیا ہے

یہاں تک ہے فریبِ عشق رنگیں
یقیں کچھ اور مُحکم ہو گیا ہے

خدارا رحم کر اے شکوۂ غم
ندامت سے وہ سر خم ہو گیا ہے

وہی ہر ایک سے بیگانگی سی
جو اُن کا تھا وہ عالم ہو گیا ہے

ہُوا ہے جب بھی نظروں کا تصادم
دلوں میں درد پیہم ہو گیا ہے

وہ کہتے ہیں غزل سُن کر حزیںؔ کی
وہی ہے ساز مدہم ہو گیا ہے

حقی حزیںؔ ایم۔ اے



تمام لوگوں کے لئے
اور
ہر قلم
کے لئے
Sulekha
SPECIAL
BLUE-BLACK ✱ ROYAL BLUE
BLACK ✱ BROWN
Sulekha
GENERAL
BLUE-BLACK ✱ BLACK
ROYAL BLUE ✱ RED
GREEN ✱ VIOLET
Sulekha
EXECUTIVE
Permanent BLUE-BLACK, NAVY BLUE & SUPER BLACK.
Washable ROYAL BLUE, EMERALD GREEN & SCARLET RED
Sulekha
BLACK
EXECUTIVE INK
Sulekha
SELECT ANY TO MATCH YOUR TASTE
SULEKHA WORKS LTD.
SULEKHA PARK
CALCUTTA-32
Progressive/SW.39

افسانہ

انتخاب

ڈاکٹر ششیر پردیپ ایم۔ ایس۔ سی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

۱۸ انگلستان کالونی، بندریا باغ، لکھنؤ

محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

لیجیئے افسانہ نمبر کے لئے "انتخاب" حاضرِ خدمت ہے۔ ڈائری کے صفحات اور خطوں پر مشتمل یہ مختصر افسانہ امید ہے آپ کو ضرور پسند آئے گا۔ محبت تنگدلی یا تنگ نظری کی شکار ہو جائے تو اُس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ یہی اِس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔ خطوں اور ڈائری کے صفحات کی تاریخوں کے درمیانی عرصے میں کیا ہوا، اِسے پڑھنے والوں کے تصور پر چھوڑ دیا گیا ہے . . . بیسویں صدی کے لئے نیک دعاؤں کے ساتھ

آپ کا ——— ششیر پردیپ

۵ جنوری ۱۹۶۸ء

انتخاب ہی کی بات ہوتی تو میں گریش کے مقابلے میں رونِدر کو چُنتی۔

لیکن یہ دل کا معاملہ بھی ہے اور میرا دل۔ میرا دل گریش کی طرف مائل ہے! رونِدر اور گریش دونوں ہی مجھے چاہتے ہیں۔ اِن دونوں میں سے کس کی محبت سچّی ہے؟ میرے لئے یہ بتانا مشکل ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست بھی ہیں۔ ایک ہی کمپنی میں ملازم ہیں۔ دونوں لیدر ٹیکنالوجسٹ ہیں لیکن رونِدر سینئر ہے اور گریش جونیئر ——— اور دونوں مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں ——— ہو سکتا ہے، دونوں ہی مطمئن ہوں کہ دوسرے کے مقابلے میں میں اُسے چاہتی ہوں! ہماری دوستی کو تین ماہ ہو چلے ہیں اور اِن تین مہینوں میں میں کئی بار اُن دونوں سے مِل چکی ہوں۔ کبھی الگ الگ اور کبھی ایک ساتھ۔

گریش کا ٹیلیفون آتا ہے ———

"مالتی جی! میں نے کل شام کے شو کے لئے ہیر پیلس میں دو سیٹیں ریزرو کرائی ہیں۔ کل شام ساڑھے پانچ بجے آپ کو گھر سے لے لوں گا۔ تیار رہیئے گا! ——— ہاں"

رونِدر نوکر کے ہاتھ خط بھجواتا ہے۔

"بھارت ناٹیہ کلا کیندر کی طرف سے 'فلم سٹار نائٹ' پیش کیا جارہا ہے۔ کئی مشہور فلم سٹار اور پلے بیک سنگر آرہے ہیں۔ میں نے دو ٹکٹ خرید لئے ہیں۔ سنیچر وار رات کے نو بجے پروگرام ہے۔ نوٹ کر لیجیئے!"

اور کبھی دونوں ساتھ میرے ہاں آتے ہیں۔

"پرسوں شام، ہماری کمپنی کے سالانہ کھیلوں کے سلسلے میں، بیڈ منٹن کا میچ ہے۔ آپ کو ضرور آنا ہے۔ ضرور!"

اور ایسی کئی ملاقاتوں کے بعد بھی، میں نے اُن پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میرا جھکاؤ دونوں میں سے کس کی طرف ہے! لیکن کب تک ———؟

سروپ نگر، کانپور

۵ مارچ ۱۹۶۸ء

مائی ڈیر رونِدر!

تمہارے پچھلے خط کا جواب ابھی تک نہ دے سکا۔ تم نے یہاں کے حال چال پوچھے ہیں۔ تو لو سُنو! کل ہم لوگوں نے پکنک منائی تھی۔ یعنی میں، مالتی، اُس کا چھوٹا بھائی اور میرے تینوں بہن بھائی۔ ہم لوگ کملا ریٹریٹ گئے تھے۔ مالتی کا چھوٹا بھائی ٹیٹو تو تم جانتے ہی ہو بہت شریر ہے۔ لیکن اُس کی شرارت میرے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اچانک بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگا

اور کہنے لگا۔

"انکل! ہم نے ایک چیز دیکھی ہے۔ لیکن ہم بتائیں گے نہیں ——— ہاں ——— "

میں نے پوچھا۔

"کیا ہے بھئی، کیا دیکھا ہے تم نے؟ بتاؤ نا کیا ہے؟"

"بتاؤں دیدی ——— بتادوں؟"

اس کی آنکھوں سے شرارت ٹپکنے لگی۔ مالتی کچھ گھبرا سی گئی۔

میں نے ٹیٹو سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بھئی؟"

مالتی نے اس کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ وہ کچھ سہم سا گیا تھا۔ لیکن میرے پھر پوچھنے پر بولا۔

"مالتی دیدی کی کتاب میں آپ کی تصویر ہے۔"

مالتی شرم سے گلنار ہو گئی۔ اس نے ٹیٹو کو چپت لگانے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن وہ اٹھ کر بھاگ گیا۔ اس وقت اور سب لوگ ٹینک کی طرف گئے ہوئے تھے اور صرف میں، مالتی اور ٹیٹو ہی اس جگہ پر تھے۔ ٹیٹو ڈر کر بھاگا تو میں نے مالتی سے کہا۔

"مالتی! نہ تم مجھ سے کہہ رہی تھیں اور نہ میں ہی تم سے کہہ پا رہا تھا۔ اب اس بچے نے ہماری مشکل حل کر دی۔"

دوست! یہ سب تمھیں بتانے کے لئے میں بہت بے چین تھا۔ کتنا خوش نصیب ہوں میں! اگر تم یہاں ہوتے تو مجھے گرم جوشی سے مبارکباد دیتے۔ اب مبارکباد کا خط ہی لکھ دینا۔ لیکن اب تو تم مدراس سے آنے والے ہوگے۔ اب تو تمھارا کام ختم ہونے والا ہوگا! ——— اچھا دوست، بائی بائی!

تمھارا ——— گریش

۱۵ر مارچ ۱۹۶۸ء

آج میں اور گریش دونوں رویندر کو لینے سٹیشن پر گئے تھے۔ میں نہیں جانا چاہتی تھی لیکن گریش نہ جانے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے کیوں مُصر تھا!؟

"مالتی! وہ کیا سمجھے گا۔ گریش کی محبوبہ بننے کے بعد، اب تم اُسے اپنا دوست بھی نہیں سمجھتی ہو۔" لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے پیچھے رویندر کو نیچا دکھانے کا جذبہ کارفرما تھا!

لیکن میں ——— میں اسٹیشن پر کیوں نہیں جانا چاہتی تھی؟! رویندر کے مقابلے میں میں گریش ہی کو تو چاہتی تھی اور اس بات کو اب سب جانتے ہیں۔ اگر رویندر بھی جان گیا ہے تو کیا ہوا۔ گریش نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے رویندر کو خط میں سب کچھ لکھ دیا تھا۔ پھر اس کے سامنے جانے سے مجھے جھجک کیوں تھی!؟ گھبراہٹ کیوں تھی!؟ یہ کیسی گھبراہٹ تھی!؟ جب رویندر فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے دروازے میں نمودار ہوا تو میرا دل چاہا میں کہیں چھپ جاؤں۔ اس کے سامنے نہ جاؤں۔ لیکن رویندر ——— مجھے وِش (نمسکار) کرتے وقت اس کے چہرے پر ذرا بھی تو شکن نہ تھی! گریش سے بھی کس گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تھا اس نے! لیکن گریش کے چہرے پر برتری کا احساس تھا۔ جیت کا احساس! جیسے ایک جیتنے والا، ایک ہارنے والے سے ہاتھ ملاتا ہے! پھر اچانک مجھے رویندر کی آنکھوں میں ایک کرب سا ابھرتا نظر آیا۔ کرب! جسے وہ اپنے اندر دبا کر رکھے ہوئے تھا۔ یہ کرب، اُسے غافل پاکر اس کے اندر سے باہر جھلکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ کھوسا گیا تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پاکر وہ پھر سنبھل گیا۔ اس کی آنکھیں پھر مسکرانے لگیں۔ کار میں، سٹیشن سے رویندر کے فلیٹ تک آنے کے دوران، گریش صرف اپنی خوش نصیبی ہی کی باتیں کرتا رہا۔ یعنی ایک زخم خوردہ انسان کو وہ اور بھی چوٹیں پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہند لیدر بورڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمٹیڈ، کانپور

۱۲ر مئی ۱۹۶۸ء

آفس آرڈر

کمپنی کے ڈائرکٹرز کی ۱۱ر مئی ۱۹۶۸ء کی خصوصی میٹنگ میں یہ طے پایا ہے کہ شری رویندر کو ڈپٹی چیف لیدر ٹیکنالوجسٹ کا عہدہ دیا جائے۔ خصوصی میٹنگ کے اس فیصلے کو آج عمل جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ اُمید ہے شری رویندر آئندہ بھی اسی محنت اور لگن سے کام کرتے رہیں گے۔

دستخط مینیجنگ ڈائرکٹر

ہند لیدر بورڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمٹیڈ، کانپور

۱۵ر مئی ۱۹۶۸ء

عجیب بات ہے۔ اب گریش میرا رویندر کے ساتھ ملنا بھی پسند نہیں کرتا!؟ رویندر کے مدراس جانے سے پہلے کئی بار میں ان دونوں سے

الگ الگ ہو چکی ہوں ——— اور گریش نے مجھے کئی بار اُس کے ساتھ دیکھا ہے اور یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں! اور اب وہ کہتا ہے ——— "مالتی! مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تم رویندر سے ملو!" یعنی اُسے مجھ پر بالکل اعتماد نہیں ہے! اُسے اپنی محبت پر بالکل اعتماد نہیں ہے! یہ کیسی محبت ہے!؟

پھول باغ۔ کانپور

۱۲ جون ۱۹۶۸ء

مس مالتی! ہمیشہ خوش رہو

کتنے ہی دن ہو گئے آپ سے ملے ہوئے۔ اپنی پروموشن کے سلسلے میں میں نے جو پارٹی دی تھی، اس میں آپ آئیں نہ گریش ہی آئے۔ نہ جانے کیوں ناراض ہیں آپ لوگ ———؟ گریش سے پوچھنے پر اس نے طبیعت ناساز ہونے کا بہانہ کر دیا۔ آپ نے نہ جانے کیا بہانہ سوچ رکھا ہے!؟ لیکن آپ سے پوچھوں بھی تو کیسے؟ آپ تو ملنا ہی نہیں چاہتیں!

آپ کا ——— رویندر

---

۲۱ جون ۱۹۶۸ء

اِس وقت رات کے بارہ بج رہے ہیں اور میری آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔ میرا دل بہت بے چین ہے۔ شام کو گریش نے بتایا تھا کہ رویندر نے کمپنی سے استعفیٰ دے دیا ہے! اتنی شاندار ملازمت کو چھوڑ دینے کا فیصلہ ——— اور وہ بھی پروموشن ملنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ——— اگریش بہت خوش ہے۔ اُسے یقین ہے رویندر کی پوسٹ اُسے مل جائے گی "مالتی! میری پروموشن اب یقینی ہے۔ تین سو روپے ماہوار کا اضافہ ہوگا میری تنخواہ میں۔ تین سو روپے ماہوار کا۔ کتنا خوش قسمت ہوں میں!" رویندر نے کیوں استعفیٰ دیا ہے؟ گریش اِس کی وجہ نہ بتا سکا۔ سوچ رہی ہوں رویندر سے مل کر وجہ دریافت کروں۔ لیکن مجھے اُس کے ذاتی معاملے میں مداخلت کرنی چاہئے!؟ وہ اپنا نفع نقصان خود سمجھتا ہے۔

پھول باغ۔ کانپور

۲۲ جون ۱۹۶۸ء

مس مالتی! ہمیشہ خوش رہو

میں جلد ہی یہ شہر چھوڑ کر جانے والا ہوں۔ نہ جانے پھر کب آنا ہو؟ آپ سے ایک استدعا ہے کہ آج شام کی چائے میرے ساتھ پیجئے۔ مجھے یقین ہے، ایک دُور جانے والے کی اِس چھوٹی سی خواہش کا آپ خیال رکھیں گی۔ میں شام کو چھ بجے کوالٹی میں آپ کا منتظر رہوں گا۔

آپ کا ——— رویندر

---

۲۳ جون ۱۹۶۸ء

میں کل شام رویندر کے ساتھ چائے پینے کوالٹی گئی تھی۔ کیا میں نے غلط کیا تھا؟ وہ اِس شہر سے دُور جا رہا ہے۔ نہ جانے پھر کب آئے؟ کب ملاقات ہو اُس سے!؟ میں اُس کی یہ چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ کرتی! اِس میں آخر بُرائی کیا تھی؟ گریش نے اِتنا محسوس کیوں کیا؟ وہ آج صبح میرے ہاں آیا تھا۔ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا ——— اُف!

اشوک نگر۔ کانپور

۲۶ جون ۱۹۶۸ء

گریش صاحب!

جو خط میں آپ کو آج لکھ رہی ہوں۔ اُس کے لئے مجھے کبھی افسوس نہ ہوگا۔ کیونکہ ساری زندگی کے پچھتاوے سے تو یہ بہتر ہے کہ زندگی کی اِسی منزل پر راستہ بدل لیا جائے! تنگدل محبت زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے! آپ کو ایک بات بتاؤں؟ ٹیٹو نے میری جس کتاب میں آپ کی تصویر رکھی دیکھی تھی۔ اُسی کتاب میں اگلے صفحوں میں رویندر کی بھی تصویر تھی جسے ٹیٹو نے نہیں دیکھا! مطلب یہ کہ اُس وقت تک آپ دونوں ہی میرے قریب تھے! اور پھر ٹیٹو کی بات نے، اُس ایک لمحے نے آپ کو میرے بہت قریب کر دیا ——— اور پھر ——— پھر اُس کے بعد ——— میں آہستہ آہستہ خود کو آپ سے دُور ہوتی محسوس کرنے لگی ——— اور اب ———؟ لیکن اب بھی ہم دوست تو رہ ہی سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو ——— رویندر کو اِس میں کبھی اعتراض نہ ہوگا ——— اِس کا مجھے یقین ہے ——— اور ہاں ——— میں بھی رویندر کے ساتھ ہی جا رہی ہوں ——— ساری زندگی ساتھ دینے کے لئے!

آپ کی دوست ——— مالتی



رشکِ سروش

کرشن موہن ایم اے

صاحبِ فکر و ذکر، صاحبِ ہوش
واقعی جس کے خیال کی آغوش
اُٹھ گیا آج بزمِ عالم سے
مردِ ایثار کیش و اُلفت کوش

تھا سراپا پیامِ یکجہتی — ہادیانِ زماں کے دوش بدوش
جستجو رنگ اُس کا ذہنِ بلیغ — دردِ آہنگ تھا دلِ پُر جوش
تھی بیک وقت فطرتِ عالی — سنگِ فرہنگ اور گلاب فروش
علم و فن کو فروغ دیتے تھے! — چشمِ بینا و گوشِ نغمہ نیوش
صدرِ جمہوریت کی عظمت کا — دلِ جمہوریہ تھا سحر خموش
ہر عقیدے کے ماننے والے — اُس کے اخلاص کے تھے حلقہ بگوش
تھا سکونِ دروں فسونِ جنوں — ناموافق مگر خرد کا خروش
کیوں گوارا ہو اہلِ باطن کو — ذہن و دل پر تفوقِ تن و توش
ایک تھا اُس کا ظاہر و باطن — رہبرِ خوش طبیعت و خوش پوش
اُس کے دل کو نہ کر سکے مغلوب — زیست کے سرد و گرم نیش و نوش
اُس کا تن من تھا پیار کا درپن — اُس کا سندیش شانتی سنتوش
جس کا آدرش عرشِ رفعت تھا — ایک انسان تھا وہ رشکِ سروش

جس کے دم سے وطن فروزاں تھا
آج وہ شمعِ رُشد ہے خاموش

کرشن موہن

طنزیہ

مرزا غالب ہڑتالی طلبہ کے نرغے میں

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم۔اے

۱۷۰۵۔پہاڑی بھوجلہ۔ دِلّی

ڈیر خوشتر گرامی!

مرزا صاحب کی جان کو روتے روتے میری آنکھیں سُوج گئیں اور تم ہو کہ مرزا صاحب سے تمہارا دل ہی نہیں بھرتا۔ کیا مجھے بھی کثرتِ استعمال سے اچھا بھلا مالک رام بنا دوگے! ایک نیام میں دو تلواریں رکھنا کوئی تم سے سیکھے۔ کیوں اِس عمر میں چھپتن چھری بنتے ہو۔ اچھا یہ مضمون لو اور اب آئندہ مرزا صاحب کا نام نہ لینا۔ ورنہ گھر سے گریبان پھاڑ کر نکل جاؤں گا۔ ؎

اور تم پھرو گے چاک گریباں کئے ہوئے

کس مصیبت سے ضربیں مار مار کر اس مضمون کو بولا ہے۔ جس طالب علم نے یہ مضمون لکھا ہے اُس کا خط کئی مولویوں سے بہتر ہے۔ کم از کم نوک پلک سے تو درست ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مضمون بولنے کے بعد بعض جگہ اُس کے خط کی حجامت مجھے دُرست کرنی پڑی۔ آج کل ماشاء اللہ دن رات دمے کے دَورے پڑتے ہیں۔ کمزوری کی انتہا نہ پُوچھو۔ حال یہ ہے ؎

اُڑتا پھرتا ہوں ہَوا کے دوش پر　　　مجھ پہ میری ناتوانی ختم ہے

یہ شعر اور اِسی قبیلے کا دوسرا شعر اور سُنتے چلو ؎

دھوم ہے مقتل میں میرے قتل کی　　　آج اُن کی مہربانی ختم ہے

یہ باتیں ۳۶ء سے قبل کی ہیں، جب آتش جوان تھا! دیکھو تو وقت کتنی تیزی سے گزرا ہے۔ ۳۶ء کی بات ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے! اِتنی فضول باتیں کرنے کے بعد اب ایک کام کی بات سُنو۔ یار! وہ جو "غالبِ خستہ کے بغیر" کے عنوان سے میری کتاب مکتبۂ شاہراہ دہلی سے چھپ رہی ہے، اُس میں میں نے مرزا غالب کے عالمِ برزخ سے آئے ہوئے خطوط بھی شامل کر دئے ہیں۔ مجھے جہاں تک یاد آتا ہے میں نے چھبّیس خطوط لکھے تھے جن میں سے چھ سات مل سکے۔ بقیہ اِس وجہ سے شامل نہ ہو سکے کہ اُن کی کوئی نقل میرے پاس محفوظ ہے اور نہ وہ رسائل ہی جن میں وہ شائع ہوتے ہیں۔ ایک صاحب بتلاتے تھے کہ ایک خط تو تمہارے ہی نام تھا اور بقیہ میں وہ نسیم احمد، دانش علی، مولانا امتیاز علی عرشی، محمد حسین شمس فروغِ اردو والے، عبدالرحمٰن چغتائی، وجاہت علی سندیلوی، شمیم کرہانی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد مرحوم کا نام لیتے ہیں۔ میرا گھر ایک یتیم خانہ ہے جہاں پہنچ کر ہر چیز یتیم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جو پرچے آتے ہیں اُن کے دو ایک مضامین پڑھ کر جب میں رکھ دیتا ہوں تو وہ انگیٹھی کی نذر کر دئے جاتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ رات ہی کوئی مضمون لکھ کر فرش کے نیچے رکھا تو معلوم ہوا کہ وہ انگیٹھی کی نذر ہو گیا۔ یہ حرکت اگرچہ شرمناک ہے۔ مگر ہے! اور ایک حقیقت کی طرح زندہ چلی آ رہی ہے —— ہائے تمہارے بسمل سعیدی ٹونکی پر کیا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا ہے۔ ایک جوان لڑکی جل کر ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئی۔ دوسری ہسپتال میں علیل پڑی ہے۔ کیا دل گردے کا

انسان ہے۔ نہ جانے کس کے سہارے زندہ ہے۔ جب یہ شخص داورِ محشر کے رُوبرو اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے طلب کیا جائے گا تو اُس وقت اگر یہ صرف اِتنا کہہ دے گا کہ اِن صدمات کے بعد بھی میں زندہ رہا تو اُس کے سارے گُناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ اِسی کا دوسرا نام صبرِ ایوبی ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پُوچھے کہ صبر و ضبط کا دوسرا نام کیا ہے، میں کہہ دوں گا بسمل سعیدی ٹونکی! ——— مجھے نہیں معلوم کہ تم مجھ سے کم درجہ کے بداعمال ہو یا مجھ سے زیادہ سینئر ہو۔ بہرصورت اگر گھٹیا درجہ کے بداعمال ہو تب بھی تھوڑے عرصہ تو دوزخ میں تمھارا ساتھ ہوگا ہی۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ادباء اور شعراء کی کثرت دیکھ کر وہاں بھی تمھارے منہ میں پانی نہ بھر آئے اور تم وہاں سے بھی "بیسویں صدی" نکالنا شروع کر دو۔ یہاں بھی چھلاں پیری بن کر سب پر سواری کے مزے لوٹ رہے ہو اور وہاں بھی ادیبوں اور شاعروں کے سر پر شیخ سدو بنے نظر آؤ گے۔ اچھا شعراء کے لئے ایک مزاحیہ قطعہ کہا ہے سنو اور داد دو ؎

نئی جیل لمبی حوالات ہوگی — ہر اِک رات نغموں بھری رات ہوگی
جہنم میں جانے کی اِتنی خوشی ہے — کہ سب شاعروں سے ملاقات ہوگی

مخلص ———

★

مرزا غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر حکومتِ ہند نے روس اور امریکہ کے اُن سائنسدانوں کو جو ابھی حال میں چاند کی تحقیق کر کے واپس ہوئے ہیں امریکی اور روسی حکومتوں سے اپنے یہاں طلب کر لیا ہے اور اُن سے فرمائش کی ہے کہ وہ مرزا غالبؔ کو کوئی گیس استعمال کر کے کم از کم دو ہفتوں کے لئے زندہ کر دیں تاکہ وہ اپنی صد سالہ برسی کی تقریبات میں شریک ہو سکیں۔ اِن سائنسدانوں نے حکومتِ ہند کی فرمائش کو منظور کر لیا ہے۔ چنانچہ نظام الدین اَولیاء کے مزار کے احاطے میں مرزا غالبؔ کی قبر کے گرد و پیش ایک میلہ سا لگا ہوا ہے اور مرزا صاحب کی قبر میں روسی اور امریکی سائنسدانوں نے مختلف قسم کے موٹے موٹے زہر کے ٹیوب دوڑا دیئے ہیں۔ جن کے ذریعہ اُن کے سو برس پُرانے کرم خوردہ جسم کو دوبارہ اپنی اصلی شکل میں لانے کے لئے مختلف طرح کی گیسیں استعمال کی جا رہی ہیں۔

ایک روسی سائنسداں جو چہرے بُشرے سے بہت زیادہ تجربہ کار نظر آ رہا ہے اُس نے کچھ سوچ کر ایک گیس کی پُوری شیشی ایک ٹیوب میں اُنڈیل دی ہے اور مرزا صاحب کی قبر پر اِس طرح ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا ہے جیسے وہ قبر کی نبضیں دیکھ رہا ہے۔ اِس کے اِس عمل کو چند ہی منٹ گُزرے ہوں گے کہ اچانک اندر سے مرزا صاحب کی آواز "یا علیؑ!" کہتی ہوئی سُنائی پڑی اور قبر بُری طرح ہِلنے لگی۔ روسی سائنسدان نے یہ آواز سُنتے ہی نہ جانے کون سی گیس قبر پر اُنڈیل دی کہ قبر کے اوپر کا حصّہ ایک دم دُور جا گرا اور قبر کے اندر مرزا صاحب اپنا جسم اِس طرح ٹٹولتے نظر آنے لگے جیسے وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے جسم پر سے وہ کپڑے کیا ہوئے جو مرتے وقت وہ زیبِ تن کئے ہوئے تھے اور اِس کے بعد ہی مرزا صاحب کی آواز یہ کہتی فضا میں گُونج گئی۔

مِرزا صاحب: "ارے لوگو! میرے جسم کے وہ کپڑے کیا ہوئے جنھیں پہن کر میں ابھی رات سو رہا تھا۔ آخر میرے سارے کپڑے کس نے اُتار لئے؟" اس کے بعد اُنھوں نے زور زور سے چِلّانا شروع کیا۔

مِرزا صاحب: "نیاز! او نیاز! ارے جلدی چل۔ کوئی شقی رات سوتے میں میرے جسم کے تمام کپڑے اُتار کر بھاگ گیا ہے اور میں بالکل ننگا بیٹھا ہوا ہوں! خدا کے لئے جلدی سے میرے صندوق سے دوسرے کپڑے نکال کر مجھے دے دے۔"

حکومتِ ہند نے پہلے ہی سے اِس خیال کے پیشِ نظر کہ اگر مرزا صاحب دوبارہ زندہ ہو گئے تو وہ قبر میں برہنہ ہوں گے۔ مرزا صاحب کے لئے ایک نہایت نفیس جوڑا تیار کرا لیا ہے اور مالک رام صاحب جو غالبیات کے

ماہر ہیں اور ترکی میں حکومتِ ہند کے ٹریڈ کمشنر رہ چکے ہیں اور گزشتہ دنوں ساہتیہ اکیڈمی کے سکریٹری تھے اس جوڑے کو لئے مرزا صاحب کی قبر کے پاس موجود ہیں۔ چنانچہ جوں ہی مرزا صاحب نے قبر میں کپڑوں کی فرمائش کی انھوں نے ہاتھ بڑھاکر مرزا صاحب کو اُن کا نیا جوڑا حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"مرزا صاحب! آپ اطمینان سے کپڑے بدل لیں۔ ہم سب لوگ دوسری طرف مُنہ پھیرے کھڑے ہیں"

مرزا صاحب جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگے تھوڑی دیر بعد کپڑے بدل کر نہایت خجل اور شرمندہ صورت بنائے قبر سے باہر آئے اور سارے مجمع سے معافی مانگتے ہوئے بولے۔

"حضرات! میں اپنی بے پردگی اور گستاخی پر بے حد نادم ہوں اور آپ سب حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مگر میں "مولا علی" کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ شب میں ننگا نہیں سوتا اور وہی پورا لباس پہنے رہتا ہوں جو دن میں میرے جسم پر ہوتا ہے۔ مگر سوتے میں نہ جانے کون ملعون میرے سارے کپڑے اُتار کر چلتا بنا اور مجھے نیند کی غفلت میں اِس کا بھی ہوش نہ رہا کہ کوئی شخص میرے کپڑے اُتار رہا ہے۔ اِس کی تصدیق آپ میری محترمہ سے بھی کر سکتے ہیں" اِس پر سارا مجمع قہقہہ لگاکر تالیاں پیٹنے لگا اور پورے مجمع نے مرزا صاحب کو بآوازِ بلند اِس بات کا یقین دلایا کہ اُن میں سے کسی نے مرزا صاحب کو ننگا نہیں دیکھا۔ اِس کے بعد پورے مجمع نے روسی اور امریکی سائنسدانوں کو اُن کی اِس حیرت انگیز کامیابی پر مُبارکباد دیتے ہوئے پھولوں اور گجروں سے لاد دیا۔ اِس پر اُن لوگوں نے بھی ہاتھ ہِلا ہِلاکر پورے مجمع کا شکریہ ادا کیا۔ اِس کے بعد غالب اکیڈمی کے صدر جناب حکیم عبدالحمید صاحب مرزا صاحب کو غالب اکیڈمی کی نئی عمارت میں لے گئے۔ جو اُنھوں نے مرزا صاحب کی صد سالہ برسی کی یادگار کے طور پر بنوائی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سارا پروگرام حکومتِ ہند سے مشورہ کرنے کے بعد پہلے ہی سے تیار کر لیا گیا تھا اور مرزا صاحب کے قیام و طعام کے سلسلہ میں اُن کی بنوائی ہوئی اُس نئی عمارت کو مخصوص کر دیا گیا تھا۔

مرزا صاحب کے دوبارہ پیکرِ وجود میں آنے کی خبر آل انڈیا ریڈیو سے اِس مصرع کے ساتھ نشر ہوئی کہ

یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور

تو ساری دِلّی میں ایک دھوم مچ گئی اور اُسی روز ساری دِلّی میں جتنے بچے پیدا ہوتے تھے اُن کے والدین نے اپنے بچوں کے ناموں کے آگے پیچھے بِلا تخصیصِ مذہب و ملت غالب کا نام لگانا شروع کر دیا۔ مثلاً غالب رام، غالب دوتی، غالب آراء، غالب حسین، غالب الدّہر، غالب پرشاد، غالب نرائن وغیرہ۔ اور اِس کے بعد غالب اکیڈمی کی نئی عمارت کے گرد و پیش سویرے سے شام تک لوگوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ جس سے فائدہ اُٹھاکر مرزا صاحب کی دکھلائی پر اُسی طرح ٹکٹ لگا دیا گیا ہے جس طرح آزادی کے بعد قطب مینار اور تاج محل پر۔

مُلک کا اُردو داں طبقہ مرزا صاحب کی اِس خلافِ توقع بازولادت پر اِس وجہ سے خوش ہے تاکہ دوبارہ وجود میں آنے کے بعد مرزا صاحب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس زبان کو وہ مرتے دم دلّی اور لکھنؤ میں پھولتا اور پھلتا چھوڑ گئے تھے، آزادی کے بعد وہ کِس کس مپرسی کے عالم میں ہے اور مُلک کا اُردو داں طبقہ کن حالات سے دوچار ہے اور حکومت اُس زبان کی بقاو ترویج کے سلسلے میں کیسے کیسے زبانی وعدے کرتی رہتی ہے۔ مرزا صاحب کو زندہ کرانے کے بعد حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ ایک دن مُلک کے "اسٹرائیک" کرنے والے طلباء کو جو تھوڑا بہت اُردو زبان سے بھی واقف ہوں۔ اُنھیں دِلّی میں جمع کرکے اُن کے سامنے مرزا صاحب کی اخلاقیات پر ایک تقریر کرائی جائے تاکہ طلباء کی اخلاقی حالت میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو سکے اور اُن کی توڑ پھوڑ، سرکاری عمارتوں کی تباہی و بربادی، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو ہفتوں اور مہینوں بند کرانے کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو۔ کیونکہ مُلک آزاد ہونے کے بعد طلباء کے اخلاق کی جگہ آزادی کچھ اِس طرح رچ بس گئی ہے کہ اُنھوں نے آزادی سے بدحواس ہوکر اپنے اپنے اساتذہ کی مار پیٹ شروع کر دی ہے جس کی وجہ سے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہفتوں اور مہینوں تعلیم کا سلسلہ بند رہتا ہے۔ مرزا صاحب سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ طلباء کو اپنی تقریر میں بتائیں کہ آزادیِ وطن کی راہ میں مُلک کے محبانِ وطن نے کتنی قربانیاں دے کر مُلک کو غلامی سے نجات دلائی ہے اور اُنھیں کس طرح اِن رہنماؤں کے نقشِ قدم پر چل کر مُلک کے تعمیری کاموں میں حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ سارے مُلک میں اِس کی پبلسٹی کی جا چکی ہے کہ فلاں فلاں تاریخ کو مرزا صاحب طلباء کو خطاب کریں گے اور اِس سلسلہ میں راجدھانی کے ایک بہت بڑے ہال میں اُن اُردو داں اور غیر اُردو داں طلباء کو جمع کیا گیا ہے جو ایسے چند صوبوں سے آئے ہیں جہاں ابھی تھوڑی بہت اُردو زبان کا چلن ہے اور جہاں چند اسکولوں،

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم باقی رہ گئی ہے طلباء اور طالبات کو یہ بھی ہدایت کی گئی ہے کہ مرزا صاحب کا لیکچر سننے کے بعد وہ اپنے اپنے صوبوں کے طلباء میں اخلاقیات کی تبلیغ کریں۔

جس ہال میں مرزا صاحب طلباء کو خطاب کریں گے اُس میں بنچیں اور اور ڈیسکیں پڑی ہیں اور طلباء مرزا صاحب کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اِتنے میں مرزا صاحب بہادر شاہ ظفر آخری تاجدارِ مغلیہ کی دی ہوئی خلعت میں ملبوس ایک چوگوشیہ نوک دار ٹوپی سر پر رکھے ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ خلعت مرکزی حکومت کے وزیرِ اوقاف میاں فخرالدین علی احمد سے مانگی گئی ہے جو مرزا صاحب کے خاندان سے ہیں اور جن کے پاس یہ خلعت مرزا صاحب کی یادگار کے طور پر سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے اور انھیں وزیرِ سلطنت کی حقیقی بہن حمیدہ سلطان نے جو دِلّی کی انجمنِ ترقیٔ اُردو کی ایک سرگرم رُکن ہیں بڑی احتیاط سے اُسے اپنے پاس ایک صندوق میں رکھ چھوڑا ہے۔

مرزا صاحب کو ہال میں آتے دیکھ کر ہال کے سارے طلباء اپنی اپنی بینچوں پر لیٹ جاتے ہیں۔ مرزا صاحب جب ہال میں داخل ہوکر اِدھر اُدھر نظریں دَوڑاتے ہیں اور کسی طالب علم کو بیٹھا نہیں پاتے تو بے حد گُز بُز ہوکر فرماتے ہیں۔

مرزا صاحب :۔ "لاحول ولاقوۃ ! یہاں تو دُور دُور تک کوئی طالبِ علم نظر نہیں آتا! پھر تقریر کس کے سامنے کروں؟"

مرزا صاحب کے یہ الفاظ سُن کر تمام بینچوں سے آوازیں بلند ہوتی ہیں۔

"مرزا صاحب! گھبرایئے نہیں۔ ہم سب حاضر ہیں لیکن کئی ہفتوں سے دن رات ہم لوگ اِسٹرائیک کرانے میں مُبتلا رہے ہیں ہم اس لئے بہت تھک گئے ہیں۔ آپ اپنا لیکچر شروع کیجئے۔ ہم سب لیٹے لیٹے سُنتے رہیں گے۔"

مرزا صاحب :۔ "میاں! یہ تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کہیں آج تک دُنیا میں طالب علموں نے لیٹ کر بھی کوئی تقریر سُنی ہے؟"

کئی آوازیں :۔ "مرزا صاحب! اگر آپ کو کوئی زحمت ہو رہی ہو تو آپ بھی میز پر لیٹ کر تقریر فرمائیں ہم سب ہمہ تن گوش ہیں۔"

مرزا صاحب :۔ "حضرات! میں لیٹ کر تقریر کرنے کا کبھی عادی نہیں رہا ہوں لہٰذا میں آپ حضرات سے گزارش کروں گا کہ آپ میری تقریر اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر سُنیں۔"

کئی آوازیں :۔ "مرزا صاحب! تقریر سُننے کا یہ طریقہ جو آپ فرما رہے ہیں وہ انگریزوں کے دَورِ غلامی میں رائج تھا۔ اب ہمارا دیش آزاد ہوچکا ہے۔ اِس لئے ہم کو لیٹ کر ہی تقریر سُننے میں مزہ آتا ہے۔ ہم بیٹھ کر لکچر سُننے کو اوّل تو ایک قِسم کی اخلاقی گراوٹ سمجھتے ہیں۔ دوسرے گذشتہ بیس اِکّیس سال سے ہم اِس کے بالکل عادی نہیں رہے۔"

مرزا صاحب :۔ "مگر میں بھی تو بیٹ بیٹھ کر تقریر کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

کئی طلباء :۔ "تو حضور! آپ کُرسی پر بیٹھ کر لکچر دیں ہم لوگ اِسے بھی برداشت کرلیں گے۔"

ایک آواز :۔ "مرزا صاحب! لیٹنے اور بیٹھنے میں حرج بھی کیا ہے؟ کیونکہ لیٹنا اور بیٹھنا دونوں اضافی قدریں ہیں۔ اِسی لئے ہم آپ سے پھر بصد احترام گزارش کریں گے کہ آپ پُرانی قدروں کو زندہ کرکے ہمیں دَورِ غلامی کی یاد نہ دلائیں۔ آپ ہم لوگوں کے اِس مطالبہ کو منظور نہ کریں گے تو ہم سب احتجاجاً اپنے اپنے گھروں میں جاکر چارپائیوں پر لیٹ رہیں گے۔"

مرزا صاحب :۔ "اچھا آپ زیادہ برہم نہ ہوں کیونکہ مجھے تو آپ کی سرکار کا حُکم بجالانا ہے ؎

حکمِ حاکم مرگِ مفاجات

البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ میں آپ لوگوں سے اپنا تعارف کرادوں کہ میں کون ہوں؟ میاں مجھے اسداللہ خاں غالب کہتے ہیں۔"

ایک لڑکا :۔ "اچھا وہ جن کی اُردو زبان میں ایک فلم آئی تھی جس کے ٹائیٹل پر ہندی لکھا تھا اور جس میں مرزا صاحب کو طوائفوں کے کوٹھے پر آتے جاتے دکھایا گیا ہے۔"

دوسرا لڑکا :۔ "مرزا صاحب! ایک خدا لگتی بات آپ سے پوچھوں۔ آپ بُرا تو نہ مانیں گے؟"

مرزا صاحب :۔ "نہیں بیٹا! ایک نہیں تم دو باتیں مجھ سے پوچھو۔ بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔"

وہی لڑکا :۔ "مرزا صاحب! یہ جو زبان آپ بول رہے ہیں اِس کا کیا نام ہے؟"

مرزا صاحب :۔ "ارے بھئی یہ بھی کوئی پُوچھنے کی بات ہے۔ یہ وہی ریختہ

یعنی اُردو ہے جس میں میں نے شعر کہے ہیں اور جس سے متاثر ہو کر آج آپ کا مُلک میری صد سالہ برسی منا رہا ہے!"

دوسرا لڑکا:۔ "مگر مرزا صاحب! آپ کو شاید اِس کا علم نہیں کہ اب ہمارے مُلک میں اِس قسم کی کوئی زبان نہیں بولی جاتی۔ آزادی حاصل ہونے کے بعد اِس کی نس بندی کر دی گئی ہے۔ کیونکہ یہ بھی مُلک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھی اور ہمارے مُلک کو اِس کا خطرہ لاحق ہو چلا تھا کہ کہیں یہ مُلک کی ساری زبانوں کو ہضم نہ کر جائے اور اِس کے بول ایسے میٹھے ہوتے ہیں کہ جو لوگ مٹھاس کے عادی نہیں ہیں وہ بھی اِس کے بول سُن کر اپنے ہونٹ چبانے لگتے ہیں۔ اِسی لئے اِس کی فلموں کی بھی نس بندی کی جا رہی ہے۔ اِس کے چٹورپن کا اندازہ آپ اِس سے کریں کہ بغیر پُوچھے گچھے یہ دیسی زبانوں کے خوش ذائقہ الفاظ اور فقرے تو چاٹتی ہی تھی۔ اِس کے بعد اِس نے غیر مُلکی زبانوں کی ناندوں میں بھی مُنہ ڈالنا شروع کر دیا۔"

دوسرا لڑکا:۔ "اور مرزا صاحب! اِس کے مشاعروں سے تو اللہ بچائے۔ اِس کے شاعر جب کسی مشاعرہ میں جمع ہو کر اِس کی تانیں لگاتے ہیں تو انسان تو انسان جانور تک دم بخود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کُتّے اِس کے شعراء کا کلام سُن کر بھونکنا بند کر دیتے ہیں اور بلّیاں اِس کے اشعار سُن کر رونا بھول جاتی ہیں۔ آپ نے ہز میجسٹی والا گراموفون اگر خریدا ہوگا تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب اِس کا موسیقی کار اپنے نغمات نشر کرتا ہے تو اُس کے سامنے ایک کُتّا سوالیہ جُملے کا نشان بنا دکھائی دیتا ہے۔"

تیسرا لڑکا:۔ "اور مرزا صاحب! یو۔ پی اور بالخصوص لکھنؤ جو کسی زمانہ میں اِس زبان کا گڑھ تھا اور جہاں دُور دُور مُلکوں سے لوگ اِس کے نغمات سُننے آتے تھے۔ وہاں اِس کے بولنے والے تو آپ کو ملیں گے لیکن اِس کے لکھنے والے دوا کو بھی میسّر نہ آئیں گے کیونکہ وہاں تمام تعلیمی اداروں کی ایسی نس بندی کی گئی ہے کہ اُن اداروں میں پڑھنے والے طلباء اور طالبات کے مخارج تک مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔"

مرزا صاحب:۔ "تو پھر آج کل یہاں کون سی زبان بولی جاتی ہے؟"

ایک لڑکا:۔ "مرزا صاحب! بولی تو یہی زبان جاتی ہے۔ مگر اب اُسے ایسے انجکشن دئے جا رہے ہیں جو عام طور پر جنس بدلنے والوں کو دئے جاتے ہیں جن سے لڑکا لڑکی بن جاتا ہے اور مرد عورت کی جنس اختیار کر لیتا ہے!"

مرزا صاحب:۔ "تو کیا یہ کوئی نئی زبان ہے جو ایجاد کی جا رہی ہے؟"

دوسرا لڑکا:۔ "مرزا صاحب! آزادی حاصل ہونے کے بعد ہمارے رہنما اپنے مُلک کے رہنے والوں میں ایک ایک مرد کو ہر معاملہ میں اتنا آزاد دیکھنا چاہتے ہیں کہ دُنیا کے تمام آزاد ممالک نہ صرف ہمارے مُلک کی آزادی پر رشک کریں۔ بلکہ ہمارے مُلک کے افراد کی آزادی کو دیکھ کر دم بخود ہو جائیں۔ آزاد ہندوستان کے لئے جو جدید زبان وضع کی جا رہی ہے، وہ اپنے میں اِس درجہ انفرادیت رکھتی ہے کہ ہر فرد جو زبان بولتا ہے اُسے وہ خود تنہا سمجھتا ہے۔ ہم اہنسا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اِس لئے دوسروں کو اپنی زبان سمجھنے کی زحمت بھی نہیں دینا چاہتے۔ اِسی زبان کی رعایت سے ہم نے آزاد ہونے کے بعد جو طریقہ تعلیم جاری کیا ہے وہ اِتنا بلند پایہ ہے کہ ہم نے اپنی گذشتہ بیس سالہ آزادی میں اِتنے مُستند جاہل پیدا کر دیئے ہیں کہ دُنیا کے دوسرے ممالک ابتدائے آفرینش سے اب تک اِتنے مُستند پڑھے لکھے نہ پیدا کر سکے۔ مگر زبان تو ایک ایسی چیز ہے جس کا ایک ایک لفظ جب مُدّتوں بولا جاتا ہے تب کہیں جا کر عوام کے دربار سے شرفِ قبولیت حاصل کرتا ہے۔"

تیسرا لڑکا:۔ "مگر مرزا صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم ہر کام دُنیا کی عام روش سے ہٹ کر کرتے ہیں۔ اِسی لئے دُنیا کی زبانوں کی ترویج کے طریقوں میں اور ہمارے طریقے میں فرق ہے۔ ہماری عوامی سرکار ضرور ہے لیکن زبان کے معاملے میں ہماری عوامی سرکار کی پابند نہیں ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جس سُرعت سے ہمیں آزاد کر کے انگریز اپنے وطن بھاگا اُسی سُرعت کو ہم نے اپنے ہر فعل و عمل میں شامل کر لیا۔ ہم کانا اور لے دوڑی کے قائل ہیں۔ ہم پُرانے اور دقیانوسی طریقوں کو پسند نہیں کرتے۔ آپ کے زمانے میں کسی لفظ کو ایجاد کر کے اُس کے مستعمل ہونے کا انتظار کیا جاتا تھا جس میں خاصہ

حُسن و عشق

کیا حُسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے —— جگر مرادآبادی

بہت نہ بیکسیٔ عشق پہ کوئی رُوئے
کہ حُسن کا بھی زمانے میں کوئی دوست نہیں —— فراق گورکھپوری

عشق کا ذوقِ نظارہ مفت میں بدنام ہے
حُسن خود بیتاب ہے جلوہ دکھانے کے لئے —— مجازؔ لکھنوی

حُسن آخر حُسن ہے اور عشق آخر عشق ہے
وہ کہیں ملتے نہیں اور ہر جگہ پاتا ہوں میں —— نامعلوم

ہائے وہ وقت کہ جب حُسن پہ آتا ہے شباب
اُف وہ ہنگام کہ جب عشق جواں ہوتا ہے —— جگر مرادآبادی

مرسلہ:۔ ایس، ایس، ہتکاری ایم۔ اے۔ آگرہ

وقت ضائع ہوتا تھا۔ ہم ہتھیلی پر سرسوں جلتے ہیں۔ ہماری زبان کے محقق بال کی کھال نہیں نکالتے۔ وہ کھال کا بال نکالتے ہیں۔"

چوتھا لڑکا:۔ "مرزا صاحب! آپ کے بارے میں تو یہ مشہور تھا کہ آپ مر چکے ہیں۔ پھر آپ دوبارہ کیسے نمودار ہو گئے؟"

مرزا صاحب: "جی ہاں میں ذرا مر تو گیا تھا مگر آپ کے دیس میں اِس سال جو میری صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے۔ اِس سلسلہ میں آپ کی سرکار نے کچھ سائنسدانوں کی مدد سے مجھے ایک دو ماہ کیلئے زندہ کرا لیا ہے تاکہ میں اپنی صد سالہ برسی میں شریک ہو سکوں اور آپ کے سامنے اخلاقیات پر تقریر کر سکوں۔"

ایک لڑکا:۔ "مرزا صاحب! آپ کے مرنے کے کم و بیش اسّی سال بعد جب ہمارا مُلک آزاد ہوا تو اُس وقت اخلاقیات کا بھی تو جنازہ نکل گیا تھا۔ پھر کیا آپ اُسے بھی اپنے ہمراہ زندہ لائے ہیں؟"

مرزا صاحب: "مگر مجھے تو اِس کی کوئی اطلاع نہیں۔ میں آپ کے سامنے صرف اخلاقی قدروں پر روشنی ڈالوں گا جو میرے زمانے میں رائج تھیں۔"

کئی آوازیں: "مرزا صاحب! کیا اُن پر روشنی ڈال کر آپ ہم سبھوں کی زندگیاں تلخ کر دیں گے؟"

چوتھا لڑکا: "مرزا صاحب! کیا اب دوبارہ زندہ ہو کر آپ یہیں رہنے لگیں گے؟"

مرزا صاحب: "نہیں بیٹا! مجھے تو چند روز کے لئے سائنسدانوں نے زندہ کیا ہے۔ اُس کے بعد میں پھر مر جاؤں گا۔"

دوسرا لڑکا: "پھر تو آپ کو دوبارہ مرنے میں بڑی تکلیف برداشت کرنا پڑے گی۔"

تیسرا لڑکا: "نہیں بھائی ایک مرتبہ مرنے کے بعد مرزا صاحب کو مرنے کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اِس لئے اِس مرتبہ انھیں مرنے میں زیادہ زحمت نہ ہوگی۔"

پانچواں لڑکا: "اچھا مرزا صاحب! آپ اپنی تقریر شروع کیجیے۔"

مرزا صاحب: "تو بیٹا پہلے تو تم کو یہ بتا دوں کہ جس زمانہ میں میں زندہ تھا اُس وقت میں احاطہ کالے صاحب میں رہتا تھا۔"

ایک طالب علم: "جو ہمدرد دواخانے کے پاس ہے؟"

مرزا صاحب: "جی ہاں۔ وہی گلی قاسم جان کے برابر والا احاطہ۔"

دوسرا لڑکا: "ارے جس کے بارے میں پہلے یہ مشہور تھا کہ آپ کی صد سالہ برسی کے موقع پر اُسے خرید کر پھر سے بنوایا جائے گا مگر بعد میں اُسے ٹال دیا گیا۔"

تیسرا لڑکا:۔ "مرزا صاحب! ہمدرد دواخانہ کے مالک عبدالحمید صاحب نے تو آپ کے نام پر غالب اکیڈمی قائم کرائی ہے۔"

مرزا صاحب: "اچھا! مگر میں نے تو سُنا تھا کہ سرکار کی طرف سے میرے لئے کوئی یادگار قائم کی جانے والی ہے۔ جس کے معنی میں یہ سمجھا تھا کہ آپ کی حکومت کو اردو ادب اور اُس کی نشر و اشاعت سے بہت دلچسپی ہے۔"

دوسرا لڑکا: "اجی ہماری جنتا جب سے آزاد ہوئی ہے اُسے اِس زبان سے اتنی محبت ہے کہ بس نہیں جو اُسے دفن کروا کر اُس پر قوالیاں شروع کروا لئے، اِس کے عرس منائے اور اِس کی قبر پر چادریں اور لڈو چڑھوائے اور اپنی ساری زندگی یہ ظاہر کرنے میں ختم کر دے کہ کس کس عنوان سے وہ اپنی عقیدت کا ثبوت دے رہی ہے۔ اُن شیدائیوں میں سب سے آگے

یو۔پی کی جنتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ دفتروں اور تعلیمی اداروں سے نکل کر وزیروں کے دلوں میں سکونت اختیار کرے۔ اس کی محبت اور ہمدردی کو دیکھ کر مُلک کا سارا کا سارا اُردو داں طبقہ حیران ہے کیونکہ اردو زبان سے ایسی ہمدردی تو آپ کی سلطنتِ مغلیہ نے بھی اپنے دَور میں کبھی ظاہر نہیں کی تھی۔"

ایک لڑکا: "مگر مرزا صاحب! یہ آپ دوبارہ زندہ کیسے ہوگئے؟"

مرزا صاحب: "بیٹا! مجھے اِس کی خبر ہی نہیں کہ مجھے کیونکر زندہ کیا گیا۔ میری حیثیت تو یہ ہے کہ لٹھے کو کھڑا کیا کھڑا ہے!"

(ہر طرف سے قہقہے)

آٹھواں لڑکا: "مرزا صاحب! اگر آپ کسی ترکیب سے دوبارہ زندہ ہونے کا نسخہ بتا دیتے تو اِدھر اسٹرائیک کے سلسلہ میں پولیس نے جو جگہ جگہ فائرنگ اور لاٹھی چارج کرکے ہمارے کئی ساتھیوں کو مار ڈالا ہے۔ انھیں ہم دوبارہ زندہ کرلیتے اور اوّل تو اُن سے ہمیں دوبارہ ملنے کا موقع مل جاتا۔ دوسرے اب تک مرنے کا جو خوف ہمارے اسٹرائیکوں کو ناکام بنا دیتا ہے وہ بھی ہمارے دلوں سے دُور ہو جاتا۔"

مرزا صاحب: "بھئی میں تو صرف دوبارہ زندہ ہونے کا گنہگار ہوں۔ البتّہ ابھی جب میں آپ کے یہاں آرہا تھا تو رستے میں کچھ لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ مرزا صاحب کو اُردو داں طبقہ کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟"

کئی آوازیں: "ہاں جی ہم لوگوں نے بھی یہی بات سُنی ہے کہ کچھ نیتاؤں نے مِل کر آپ کے ساتھ یہ سیاسی چال چلی ہے۔ مگر مرزا صاحب! اب کانگریس ہے کہاں؟ وہ تو گاندھی جی کے ساتھ چلی گئی۔ صرف ہمارے دیش میں نیتاؤں کو چھوڑ گئی ہے۔ جو آج کل درمیانی مدّت کے الیکشن لڑنے میں مست ہیں اور قومی سرمایہ کی ناندوں میں مُنہ ڈالے پڑے ہیں۔"

مرزا صاحب: "بھئی میں یہ فضول باتیں تو جانتا نہیں۔ میں تو صرف تم لوگوں سے یہ پُوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم نے اپنے مہاتما جی کو دیکھا ہے۔ جنھوں نے تمہارے دیس کو آزاد کرایا تھا؟"

کافر

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہوگیا
آہ یارب! رازِ دل اُن پر بھی ظاہر ہوگیا ——— میر سوز

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا ہوں میں
کیا ڈیڑھ چلّو پانی میں ایمان بہہ گیا ——— ذوقؔ

تجھے اے بزمِ ہستی کون کافر یاد رکھے گا
مسافر راہ کی باتوں کو اکثر بھول جاتے ہیں ——— عدمؔ

چیتونوں سے ملتا ہے کچھ سُراغ باطن کا
چال سے تو کافر کی سادگی برستی ہے ——— یگانہؔ چنگیزی

کعبے میں مسلمان کو کہہ دیتے ہیں کافر
بُتخانے میں کافر کو بھی کافر نہیں کہتے ——— نامعلوم

مرسلہ:- سراج وجیہہ۔ شورا پور۔ ضلع گلبرگہ

بہت سی آوازیں: "وہ جنھیں ابھی حال میں بنگال کی جادوپور یونیورسٹی میں کسی آدمی نے سُوّر کا بچّہ بنایا تھا؟"

ایک لڑکا: "حضور! ہم نے کہیں کہیں اپنے نام نہاد کانگریسی نیتاؤں کی الیکشنی تقریروں میں بھی اُن کا نام سُنا۔ شاید وہی مہاتما جن کو جنتا سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور جن کی شان میں ابھی حال میں جادوپور یونیورسٹی میں ایک صاحب نے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں کہ ہم اِس لفظ کا نام بھی نہیں لے سکتے۔"

مرزا صاحب: "کیا مہاتما جی کی شان میں کسی نے ایسے شرمناک الفاظ استعمال کئے ہیں؟"

دوسرا لڑکا: "جی ہاں اُس نے زبانی ہی نہیں اُن کی شان میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں، اپنی تحریری تقریر میں بھی لکھ دیئے ہیں۔"

مرزا صاحب: "ایسے غدّاروں کی سزا تو ہر مُلک میں کم از کم موت ہوتی ہے!"

تیسرا لڑکا: "جی ہاں مرزا صاحب! ہمارے یہاں تو آزادی کے بعد سے اِس قسم کے الفاظ عام ہوگئے ہیں اور ہر گالی ادبِ عالیہ بن گئی ہے۔"

مرزا صاحب: "حد ہو گئی!"

چوتھا لڑکا: "مگر مرزا صاحب! گذشتہ بیس سال سے ہمارے ملک کی اسمبلیوں اور پارلیمینٹ تک میں ایک ممبر دوسرے ممبر کے خلاف گالیاں بکتا ہے، بلکہ وہاں تو جوتے بازی اور ڈنڈے بازی تک ہوتی ہے اور ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس سے دُنیا والوں کو پتہ چلتا ہے کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں اور کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔"

مرزا صاحب: "اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ کسی دن تم بھی میرے لئے اسی طرح کے الفاظ استعمال کروگے۔"

وہی لڑکا: "مرزا صاحب! ابھی پرسوں ہمارے کسی دوست نے جو جن سنگھ میں ہیں اُردو والوں کے لئے ایسے ہی الفاظ استعمال کئے تھے اور گذشتہ بیس سال میں تو ہم اپنی بول چال میں مادر پدر کو بھی بُرا نہیں سمجھتے اور حرامی اور حلالی کے الفاظ ادب عالیہ کے طور پر ایک دوسرے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان الفاظ میں خلوص پایا جاتا ہے۔ مُلک سے انگریز کے نکلتے ہی ہم نے گنو تنتر راج قائم کیا ہے۔ اس لئے اس کی رعایت سے ہمیں دیسی زبان بھی آپس میں بولنا چاہئے جو صوتی یا غیر صوتی حیثیت سے ہمارے راج کے شایانِ شان ہو۔"

مرزا صاحب: "ارے صاحب! یہ تو جو آپ کہہ رہے ہیں وہ تو اُردو زبان میں ایک فحش گالی ہے۔"

تیسرا لڑکا: "اسی لئے تو مرزا صاحب ہم اُردو کا ملک میں بیڑا غرق کرنا چاہتے ہیں۔ جو زبان حرامی جیسے میٹھے اور رس دار لفظ کو استعمال میں لانا ذلت سمجھے اُس کا تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ اسی لئے یو۔پی، بہار، مدھیہ پردیش میں تو ہم نے اُسے بیخ و بُن سے اُکھاڑ دیا ہے۔ لیکن ابھی بہت سے صوبے باقی ہیں جہاں عوام اس کمبخت زبان کو بولتے ہیں۔"

پانچواں لڑکا: "اجی مرزا صاحب! معمولی سی بات یہ ملاحظہ ہو کہ اس زبان نے تو ہمارا کہنا چاہیئے کہ ہمارے بول و براز تک پر پابندی لگا دی ہے۔ سالے پیشاب کو قارورہ کہتے ہیں۔ یہ بھی جیسے کسی شربت کا نام ہے۔"

مرزا صاحب: "ارے صاحب! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لوگ اخلاقی طور پر اس منزل میں آ چکے ہیں تو میں ایک نہیں سو لاکھ بار بھی خوشامد کرتے۔ میں کسی قیمت پر زندہ ہونے کو تیار نہ ہوتا۔ اس عالم میں مجھے اخلاق درست کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ مجھ پر ہزار لعنت ہو جو اب میں کل سے یہاں قدم بھی رکھوں!"

چھٹا لڑکا: "مرزا صاحب! اگر آپ کو یہ باتیں بُری لگتی ہیں اور آپ کو ان معمولی معمولی باتوں پر غصہ آتا ہے تو آپ ہم لوگوں کو جو بات بتا رہے تھے وہ بتا دیجئے اور تھوڑی دیر کے لئے اپنا غصہ تھوک دیجئے۔"

ساتواں لڑکا: "اچھا تو مرزا صاحب! آپ مہاتما جی کے بارے میں بتا رہے تھے کہ وہ ہمارے دیش کے بہت بڑے بھگت تھے اور شاید ہم سے پُوچھ رہے تھے کہ ہم نے اُن کی تصویر دیکھی ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ہم صرف اپنے دیش کے الیکشنی نیتاؤں کو پہچانتے ہیں جو روز ایک نیا چولا بدل کر ہمارے سامنے الیکشنوں کے سلسلے میں آتے جاتے رہتے ہیں اور جنھیں ہم مختلف بہانوں سے طرح طرح کے جھنڈے دکھاتے رہتے ہیں۔"

دوسرا لڑکا: "تو مرزا صاحب! جہاں تک مہاتما جی کی تصویر کا تعلق ہے وہ ایک جگہ ہمارے محلّہ کے پنڈت دیارام کے یہاں اب تک لگی ہوئی ہے۔ نہ جانے کیوں اُنھوں نے اپنے یہاں لگا رکھی ہے۔ کیونکہ اب مُلک سے وہ بھی تیزی سے غائب ہو رہی ہے۔"

مرزا صاحب: "یہ تو بہت بُرا ہو رہا ہے!"

ایک لڑکا: "مرزا صاحب! بات یہ ہے کہ اب ہمارے دیش میں اچھائیوں کی جگہ بُرائیوں نے لے لی ہے۔ اس لئے ہر اچھی چیز خود بخود غائب ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اُسی میں مہاتما جی کی تصویر بھی شامل ہے۔ اب بیس اکیس برس بعد ہم اس کا پتہ لگانے میں مصروف ہیں کہ مہاتما جی کو جن لوگوں نے شہید کیا تھا اُس میں کون کون لوگ شریک تھے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارا مُلک کس مستعدی سے تعمیری کاموں میں لگا ہوا ہے!"

دوسرا لڑکا: "مرزا صاحب! اب ہم سب لوگ خالص سیاسی کاموں میں،

لگے ہیں جس میں سب سے مقدم چیز الیکشن کا جیتنا اور ممبری حاصل کرنا ہے۔ ہم جنتا کی سیوا کے فضول کاموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔"

مرزا صاحب:۔ "بھئی میں تو یہ کہتا ہوں کہ مہاتما جی جیسے لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔"

ایک لڑکا:۔ "مرزا صاحب! اب ہمیں مہاتما جی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس اُن سے کہیں بڑے کام ہیں۔ اب تو ہمیں ساری فکر ہندی زبان کو فروغ دینے کی ہے اور ہم نے آپ کو اسی لئے دوبارہ زندہ کرایا تھا کہ اُردو داں طبقہ کی توجہ اُن کی منحوس زبان کی طرف سے ہٹ کر آپ کی صد سالہ برسی کی طرف لگ جائے۔ ہم نے اب یہ پروگرام بنایا ہے کہ ۲ اکتوبر تک تو آپ کی صد سالہ برسی منائی جائے اور اس کے بعد ہم مہاتما جی اور گورو نانک جی کا جشن منانے میں لگ جائیں گے اور اس طرح ہم آئندہ الیکشن پھر جیت لیں گے۔ گورو نانک جی کی برسی منانے کی ضرورت ہمیں اس لئے پیش آئی کہ ہمارے ہاتھ سے پنجاب نکلا جا رہا تھا اور وہاں کے لوگوں نے ہندی کی مخالفت شروع کر دی تھی جس کے فروغ کے لئے ہم نے مُلک تک کو بازی پر لگا دیا ہے۔ اب چاہے بھارت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے لیکن ہم اپنی دیش بھاشا کو مُلکی زبان بنا کر رہیں گے!"

دوسرا لڑکا:۔ "مرزا صاحب! آپ کو ابھی دوبارہ زندہ ہوئے جمعہ جمعہ دو تین ہفتے ہی تو ہوئے ہیں اس لئے آپ اس قلیل مدّت میں ہماری مُلکی سیاست کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے مُلک میں ماشاء اللہ ایک سے ایک نمبری پڑا ہے جو ادیبوں، لیڈروں، مہاتماؤں، رشیوں اور مُنیوں کو نمبر پر لگانے کا ڈھنگ جانتا ہے اور ہم اُسی کو اپنا تعمیری کام سمجھتے ہیں۔"

تیسرا لڑکا:۔ "مرزا صاحب! میں آپ سے ایک بات پوچھوں۔ بتلایئے گا؟"

مرزا صاحب:۔ "کیوں نہیں۔"

وہی لڑکا:۔ "اچھا مرزا صاحب! یہ بتایئے کہ یہ اہنسا کیا چیز تھی جس کے ذریعے مشہور ہے مہاتما جی نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ کیا یہ کوئی اٹیمک انرجی ہے؟ یا مہاتما جی کا تخلص ہے؟"

مرزا صاحب:۔ "ارے بھئی حیرت کی بات ہے کہ تم سب ہندوستان میں رہتے ہو اور مجھ سے اہنسا کے معنے پُوچھتے ہو جبکہ یہ لفظ تمھارے ہی دیش سے نکلا ہے۔ اِس کے معنی عدمِ تشدّد کے ہیں۔"

(سارے لڑکے قہقہے لگانے لگتے ہیں)

ایک لڑکا:۔ "مرزا صاحب! تو کیا آپ کے مہاتما جی گوتم بُدھ کے چیلوں میں تھے جو ہمارے مُلک میں پھر بُدھ مذہب لانا چاہتے تھے جسے ہم نے ہرش وردھن کے بعد سے مُلک سے نکال باہر کیا تھا۔"

دوسرا لڑکا:۔ "تب تو وہ چھوت چھات کو بھی بُرا سمجھتے ہوں گے؟"

مرزا صاحب:۔ "وہ تو چھوت چھات کے سخت مخالف تھے اور اسی لئے اُنھوں نے ہریجن تحریک چلا کر پست طبقہ کے لوگوں کو عام انسانوں کی سطح پر لانے کی کوشش کی تھی اور اسی لئے ہمارے گنرا تنتر راج میں چھوت چھات کو جُرم قرار دیا گیا ہے اور اچھوتوں کے لئے مخصوص طور پر الگ نشستیں مقرر کر دی گئی ہیں۔"

ایک لڑکا:۔ "تو اسی لئے ہمارے گُرو گول والکر جی اور شنکر جی اُن کے خلاف ہیں۔ اس کے معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ وہ سرے سے نہ صرف ہندو دھرم ہی کے خلاف تھے بلکہ بھگوان کے بھی خلاف تھے۔ جو منش کے کرموں کو دیکھ کر بار بار اچھے اور بُرے لوگوں میں پیدا کرتا ہے اور اُنھیں پچھلے جنم میں پاپ کرنے پر سزا دیتا ہے۔ پھر تو جس نے مہاتما جی کو شہید کیا اُسے بقول گُرو جی کے پاپی نہ کہنا چاہیئے۔"

دوسرا لڑکا:۔ "ہاں، کیوں نہیں جس نے اپنے پچھلے جنم میں پاپ کیا ہے اُس کی سزا تو اُسے ملنی ہی چاہیئے۔ چاہے وہ ہندوستان میں پیدا ہو یا دُنیا کے کسی حصّہ میں پیدا ہو۔"

تیسرا لڑکا:۔ "تو پھر مرزا صاحب! بُدھ دھرم میں اور ہندو دھرم میں فرق ہی کیا رہا؟"

ایک لڑکا:۔ "اچھا اب میں سمجھا کہ ہمارے دیش کے موجودہ نیتا مہاتما جی کا نام سُن کر کیوں ہنسنے لگتے ہیں۔ مرزا صاحب اُن کی اہنسا پر تو ہم کو بھی ہنسی آتی ہے۔ اچھا ہوا کہ ہم اِس لفظ کے معنوں سے واقف نہ ہوئے ورنہ مُلک تباہ ہو جاتا اور پاکستان ایک دن میں ہمیں فتح کر لیتا۔"

مرزا صاحب:۔ "مہاتما جی کی تمام تحریکوں کی بُنیاد اہنسا پر تھی۔"

دوسرا لڑکا :۔ "اسی لئے تو آزاد ہونے کے بعد اُن کی تحریکوں کا کوئی نام تک نہیں جانتا۔"

مرزا صاحب :۔ "اور ہاں ایک بات اور بتاؤں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔"

ایک لڑکا :۔ "تو کیا وہ سیاست داں نہیں تھے؟"

مرزا صاحب :۔ "نہیں میاں وہ سیاست دانوں میں سادھو تھے اور سادھوؤں میں سیاست داں تھے!"

تیسرا لڑکا :۔ "مرزا صاحب! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ سیاسی انسان بھی تھے اور سچ بھی بولتے تھے۔ بھلا سچ کا سیاست سے کیا تعلق؟"

مرزا صاحب :۔ "سچ سے میری یہ مُراد ہے کہ مہاتما جی ہمیشہ سچّی سچّی بات کہتے تھے۔"

دوسرا لڑکا :۔ "پھر تو شاید ہی کوئی اُن کی بات سُنتا ہوگا؟"

مرزا صاحب :۔ "مگر میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ اُن کے تمام ساتھی جب تک دُنیا میں رہے سچ بولتے رہے اور سچائی اور صدق دِلی کے ساتھ اُن کے کہنے پر عمل کرتے رہے۔ اُنھوں نے سچائی، صداقت اور اہنسا کے ہتھیاروں سے آزادی کی لڑائی لڑی اور مُلک کو آزاد کرایا۔ مہاتما جی کی اہنسا کی تحریک سے انگریزوں کی رُوح فنا ہوتی تھی۔"

آٹھواں لڑکا :۔ "مرزا صاحب! کیا سچ اور اہنسا سے لوگ بھاگنے لگتے ہیں؟"

دوسرا لڑکا :۔ "ارے یہ مرزا صاحب سے کوئی پُوچھنے کی بات ہے؟ خود ہمارے دیش ہی میں دیکھ لو کہ کس طرح لوگ سچ سے بھاگ رہے ہیں!"

چھٹا لڑکا :۔ "مرزا صاحب! معاف کیجئے گا، یقین مانئے گا ہم اپنے مُلک کو چھوڑ کر بھاگنا نہیں چاہتے۔ اِس لئے ہمارے سامنے سچ کا نام نہ لیجئے۔ ہم تو پہلے نیتا بنیں گے اور جب جھُوٹ بولنے کی خاصی مشق ہوجائے گی تو حکومت پر قبضہ کرلیں گے۔ اب تو توڑ پھوڑ کرنے کے بعد ہی لوگ اونچے درجے پر پہنچتے ہیں۔ ہمارے دیش میں کتنے ہیں جو صرف توڑ پھوڑ کے ذریعہ وزیر بنے بیٹھے ہیں۔"

مرزا صاحب :۔ "بیٹا! دیکھو ایسی باتیں نہیں کرتے۔ سچ میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ مہاتما جی ایک سچّے انسان تھے۔ اِس لئے دُنیا میں ہر مُلک کے رہنے والے اُن کو عزّت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یاد رکھو! سچّے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور سچ بولنے سے عمر بڑھتی ہے اور جھُوٹ صرف وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔"

دوسرا لڑکا :۔ "مرزا صاحب! اِسی لئے تو ہم وہی چیز اختیار کئے ہوتے ہیں جو عارضی اور وقتی ہے۔ کیونکہ زندگی بھی بقول آپ کے عارضی ہے۔ ہم سچ کیوں بولیں جبکہ ہم کو ہمیشہ دُنیا میں زندہ رہنا نہیں ہے۔ جھُوٹ ہماری زندگی کی طرح عارضی ہے۔ اِس لئے ہم کیوں نہ اُسے اختیار کریں اور اب رہا عمر بڑھانے کا سوال تو مُلک میں جو گرانی اور اتیاچار ہورہا ہے اُس کی وجہ سے جو تھوڑی بہت زندگی ہم کو مِل رہی ہے ہم اُسی سے عاجز ہیں۔ ہم عمر بڑھا کر اپنے آپ کو کیوں مصیبت میں مبتلا کریں کیونکہ جوں جوں عمر بڑھے گی ویسے ویسے گرانی بھی تو بڑھے گی اور ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ انسانوں کو ہوا تک کھانے کو میسّر نہ ہوگی۔ مرزا صاحب! جس زمانہ میں لوگ سچ بولتے ہوں گے اُس زمانہ میں کھانے پینے کی چیزیں بھی تو خالص اور سستی ہوتی ہوں گی۔ دوسرے آپ ہم سے سچ بولنے کو کہتے ہیں۔ سچ ہی بولنے پر تو مہاتما جی کو گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ پھر آپ کیا چاہتے ہیں کہ سچ بول کر ہم بھی گولی کا نشانہ بنیں؟"

کئی لڑکے جو اِن تمام طلبہ کے سربراہ معلوم ہوتے ہیں چُپکے چُپکے (ایک دوسرے سے) "مرزا صاحب اب بور (Bore) ہوتے جارہے ہیں۔" اِس لئے سب ایک کنارے سے تالیاں پیٹنے لگتے ہیں اور مرزا صاحب ہال چھوڑ کر باہر نِکل بھاگتے ہیں۔

رباعیات

مخمور سعیدی

خوابوں کے اُفق پہ جگمگایا کوئی   خورشید صفت وہ مُسکرایا کوئی
ٹُوٹا یہ طلسمِ شبِ غم اب ٹُوٹا   آیا نگہِ شوق ! وہ آیا کوئی

★

سوئی ہوئی یادوں کو جگاتا گزُرا   احساس میں ہلچل سی مچاتا گزُرا
تجدیدِ رہ و رسم ہو جیسے منظور   یوں پاس سے کوئی مُسکراتا گزُرا

★

غنچوں کے لبوں پہ مُسکراہٹ آئی   بجھتے تاروں میں جگمگاہٹ آئی
دل پچھلے پہر آج کچھ ایسے دھڑکا   جیسے ترے قدموں کی اب آہٹ آئی

★

وہ لمحہ بھی کس قدر حسیں ہوتا ہے   پہلے بھی ملے ہیں ہم، یقیں ہوتا ہے
قرنوں کی ملاقات نکل آتی ہے   ہر اجنبی ، اجنبی نہیں ہوتا ہے

★

احساس کے زخم جیسے سِل جاتے ہیں   کچھ پھُول نظر میں یوں بھی کھِل جاتے ہیں
وہ لوگ بھی ہیں مونسِ تنہائیِ دل   دم بھر کو سرِ راہ جو مِل جاتے ہیں

★

خاموشی کی گُفتگو سہی ہے برسوں   یوں اُس کی سُنی اپنی کہی ہے برسوں
میں اُس کے لئے نیا نہ وہ میرے لئے   خوابوں میں ملاقات رہی ہے برسوں

★

پھر ہجر کی تیز دُھوپ سنولائی ہے   پھر شامِ ملاقات قریب آئی ہے
قلبِ مُتلاطم میں کچھ اِس وقت ندیم   ٹھہری ہوئی جھیل کی سی گہرائی ہے

مخمور سعیدی

★

ادھوری تصویر

نور شاہ

شاردا کارنر ریذیڈنسی روڈ جموں (توی)

محترم و مکرم جناب خوشتر گرامی صاحب! آداب!

"ادھوری تصویر" پیشِ خدمت ہے ـــــ اس کہانی کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک ڈاکٹر کی محبت، ایثار اور قربانی کی کہانی ہے۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی ـــــ یہاں گرمیاں اپنا رنگ دکھانے لگی ہیں۔ میں اپریل کے آخری ہفتے میں سرینگر جا رہا ہوں ـــــ !!

نیاز کیش ـــــ نور شاہ

شنکر آچاریہ کے دامن میں پھیلا ہوا وسیع قبرستان ہے۔ یہاں اَن گنت بے ترتیب قبریں ہر سمت بکھری ہوئی ہیں۔ ہزاروں کے سنگِ لوح تک دھ جانے کب خاک میں مل چکے ہیں اور کتنوں کے کتبے ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ ان قبروں میں کچھ ایسی بھی ہیں جن میں اب بھی سینکڑوں تمنائیں، سینکڑوں خواہشیں سسک سسک کر دم توڑ رہی ہوں گی، نہ جانے کتنے کنوارے خیالات اب بھی پرواز کے لئے جدوجہد میں معروف ہوں گے نہ جانے کتنے ادھورے خواب اپنی تعبیر کی تلاش میں بھٹک رہے ہوں گے اور کتنے محبت بھرے دل اپنے محبوب کے انتظار میں بے قرار ہوں گے!

چنار کے سائے میں جو نئی نئی قبر دکھائی دے رہی ہے یہ قبر ڈاکٹر ذکیہ کی ہے ـــــ !!

اور میں ـــــ میں ایک مصور ہوں، ایک مقبول اور نامور مصور! میں کئی برسوں سے رنگوں سے کھیلتا آیا ہوں، کئی انعام حاصل کر چکا ہوں۔ میری بنائی ہوئی تصویریں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں لیکن میں ایک قاتل بھی ہوں، میں نے قتل کیا ہے، ایک لڑکی کا، اُس کی تمناؤں اور آرزوؤں کا، اُس کے کنوارے خیالوں اور ادھورے خوابوں کا ـــــ ہاں میں قاتل ہوں اور میں نے ڈاکٹر ذکیہ کا قتل کیا ہے ـــــ !!!

ذکیہ ـــــ جس میں تقدس تھا، معصومیت تھی، حُسن تھا، جس میں کلیوں کی سی پاکیزگی تھی، بہار کی پہلی صبح کا سا اُجالا تھا جو نرم چاندنی سے بھی زیادہ دلفریب اور پُرکشش تھی اور جس کے عارض گلاب کے پھولوں سے زیادہ شاداب اور تر و تازہ تھے ـــــ ڈاکٹر ذکیہ کو سب سے پہلے میں نے ہسپتال میں دیکھا۔ شام کے دُھندلکوں میں میرا اسکوٹر ایک تیز رفتار کار سے ٹکرا گیا اور میرے جسم پر کئی زخم آئے۔ کسی راہ گیر نے مجھے ہسپتال پہنچا دیا مرہم پٹی کے بعد جب میں ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو ہسپتال کے ایک چھوٹے سے سائڈ روم میں پایا۔ ایک لمحے کے لئے میں بالکل حیران رہ گیا۔ میں نے جب کچھ کہنے کی کوشش کی تو ایک نرم ملائم سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"دیکھئے آپ بولنے کی کوشش نہ کیجئے۔"

میں نے اپنی آنکھوں کو ذرا سی جُنبش دی اور نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والی ایک لڑکی کو دیکھا۔ اُس نے شاید میری نیم وا آنکھوں میں کئی سوال پڑھ ڈالے تھے۔

"میں ڈاکٹر ہوں ـــــ ڈاکٹر ذکیہ! آپ کو کئی چوٹیں آئی ہیں آپ میری نگرانی میں ہیں، خدا کا شکر ہے خطرہ ٹل چکا ہے لیکن آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔"

میں نے اپنی آدھ کُھلی آنکھیں بند کر لیں!

کئی لمحے آئے اور گذر گئے۔

اور ایک رات اپنے سائڈ روم سے باہر آ کر میں نے دیکھا کہ میں

ایک طلسمی ماحول میں قید کر لیا گیا ہوں۔ اجنبی اجنبی سے برآمدے سے گزرتے ہوئے مجھے ہر سمت سناٹا سا چھایا ہوا محسوس ہوا۔ مدھم مدھم سی روشنی میں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سارے مریض مر چکے ہوں اور ایسے میں کہیں سے کسی کی آہ یا کراہ کی مدھم مدھم سی آواز اس خاموش سناٹے میں ایک گونج بن کر اُبھرتی اور کبھی کسی نرس کے قدموں کی ہلکی ہلکی سی چاپ اِس گہرے سناٹے کو توڑنے کا باعث بنتی اور پھر وہی خاموشی، وہی تو سکاسناٹا ——— میں پلٹ آیا۔ ڈاکٹر ذکیہ میری منتظر تھی!

"اب آپ کافی اچھے ہو گئے ہیں۔ دو ایک روز میں آپ کو گھر جانے کی اجازت مل جائے گی۔"

"شکریہ ڈاکٹر!" میں نے کہا۔

وہ میرے لئے دوا بنانے لگی!

"یہ کام آپ کیوں کر رہی ہیں؟"

"یہ میرا فرض ہے۔"

"لیکن یہ دوا تو نرس بھی بنا سکتی ہے۔"

"نہ جانے کیوں مجھے..... لیجئے دوا پی لیجئے۔" اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بہت تلخ ہے یہ!"

"زندگی کو رس دار بنانے کے لئے کبھی کبھی کڑوے کسیلے گھونٹ بھی پینے پڑتے ہیں۔"

میں خاموش رہا!

"آپ کیا سوچنے لگے؟"

"سوچ رہا ہوں آج ایک تصویر بناؤں اور خود کسی چنار کی ٹھنڈی ٹھنڈی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو جاؤں۔"

اور پھر کئی دن ایک ساتھ گزر گئے!

میں اپنے گھر لوٹ آیا۔ میرا گھر، میرا سٹوڈیو۔ میں پھر اپنے رنگوں کی کائنات میں کھو گیا لیکن ذہن کے کسی گوشے میں ایک تصویر کے خدوخال بنتے اور مٹتے رہے۔ میں چاہ رہا تھا کہ میرے دل میں ایک ایسی شخصیت کا گزر ہو جو میری تکلیف دہ تنہائی کے سکون کو توڑ کر ہلچل سی پیدا کر دے!

شگوفوں کا موسم ختم ہو چکا تھا۔

"شکریہ ڈاکٹر! کئی دنوں سے دل کی آرزو تھی کہ آپ کا پورٹریٹ بناؤں ———"

ڈاکٹر ذکیہ نے اپنی جھکی جھکی پلکوں کو جنبش دی اور ساڑی کو سنبھالتے ہوئے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے کینواس کو درست کیا اور آہستہ آہستہ اُس پہ قوسِ قزح کے رنگ بکھیرنے لگا۔ جب دوپہر کا سورج ڈھل کر مغربی آسمان پر شفق بکھیرنے لگا میں ڈاکٹر ذکیہ کے گلاب جیسے عارض کا رنگ کینواس پہ پھیلاتا چلا گیا۔ رنگ کینواس پہ پھیل تو رہے تھے لیکن مجھے زندگی میں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ یہ رنگ مجھے دھوکہ دے رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا میرے ہاتھ کے برش کو میری اُنگلیاں حرکت کرنے سے روک رہی تھیں۔ شاید میں ڈاکٹر ذکیہ کے عارض کا رنگ کینواس پہ لانے میں کامیاب نہ ہو رہا تھا۔ شام کے دُھندلکے بڑھنے لگے!

ڈاکٹر نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ——— "سات..... میں اب جاؤں؟"

میں نے تھکی ہوئی نظر سے اُس کی طرف دیکھا اور اپنا برش ایک طرف رکھ دیا اور ہاتھوں کی اُنگلیوں کو ملنے لگا۔

"جاؤ، لیکن آپ جائیں گی کہاں ڈاکٹر ——— آپ اپنا جسم اِس کمرے سے باہر لے جا سکتی ہیں، اپنی روح نہیں!"

"میں اپنا جسم بھی لے جا رہی ہوں اور روح بھی ——— یہ دونوں میرے مریضوں کے لئے ہیں۔"

میں اُسے دیکھتا ہی رہا اور وہ ایک مہک سے بھرپور ہوا کے جھونکے کی طرح دروازے سے باہر چلی گئی!

اور وہ تصویر ادھوری ہی رہی۔

ملاقاتیں قائم رہیں اور اِن ملاقاتوں نے میرے دل میں پیار کے ایک چراغ کو جِلا بخشی۔

"ایک وعدہ کرو کہ تم ہر روز مجھ سے ملو گی۔"

"تمہارا یہ حکم ہے؟"

"نہیں ایک التجا ہے میری ——— میں ایسا کیوں چاہتا ہوں میں خود بھی نہیں جانتا بس صرف اِتنا محسوس کرتا ہوں کہ جب کبھی زندگی کی کسی اَن دیکھی راہ میں کھو جاؤں گا تم مجھے تلاش کرو گی۔"

وہ رونے لگی۔ اُداس آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے!

"تم رونے لگیں؟"



"میں مجبور ہوں۔"

"کیسی مجبوری؟"

"تم بھول رہے ہو کہ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں۔ میرے کچھ فرائض ہیں۔ کچھ کام ہیں جن کے لئے میں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔"

"تو کیا میں سمجھوں کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟"

"تم ایسا کیوں سوچنے لگے۔ محبت اور فرض دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میں نے تم سے محبت کی ہے، کرتی ہوں اور اپنی آخری سانس تک کرتی رہوں گی۔"

"لیکن"۔

"دل چھوٹا نہ کرو۔ میری فرصت کا ہر لمحہ تمہارے لئے وقف ہے۔"

آکاش پر چاند آہستہ آہستہ سرکتا جا رہا ہے۔ ماحول میں اُداسی پھیلتی جا رہی ہے اور میں اپنے ذہن میں خیالات کے ان گنت ہجوم سے سائڈ روم کی کھڑکی سے جھانک رہا ہوں ——— ہسپتال کا وہی سائڈ روم ہے جہاں میں کبھی مریض بن کر آیا تھا اور ڈاکٹر ذکیہ سے ملا تھا کتنی عجیب بات ہے وہی ویرانی ہے، وہی سنّاٹا ہے لیکن میں مریض نہیں ہوں۔ پلنگ پر میری بیوی لیٹی ہوئی ہے۔ اُس کے جسم کے اندر سُرخ سُرخ خون، لال گاڑھا خون بھرا جا رہا ہے۔ نہ جانے سُرخ رنگ کی ہر شئے کو دیکھ کر میں ایک عجیب سی کیفیت سے کیوں دوچار ہوتا ہوں نہ جانے کیوں ڈاکٹر ذکیہ کے عارض میری نگاہوں کے سامنے پھر جاتے ہیں اور وہ ادھوری تصویر یاد آجاتی ہے!

ڈاکٹر ذکیہ!

دراصل ڈاکٹری کا پیشہ ہی ہم دونوں کی محبت کے درمیان آگیا میں چاہتا تھا کہ اُس کی زندگی کا ہر لمحہ میرے لئے وقف ہو، میں چاہتا تھا کہ اُس کے ساتھ گزرے ہر لمحے کو اپنے رنگوں میں قید کر لوں لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ میری محبت کے ساتھ ساتھ اُس کے دل میں مریضوں کے لئے محبت تھی، تڑپ تھی خدمت کرنے کا جذبہ تھا۔

"سنو!"

کیا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں تمہارے پیشے اور نام کے درمیان ایک وسیع خلا پیدا ہو جائے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں ڈاکٹر اور ذکیہ کو دو وجودوں میں بانٹنا چاہتا ہوں۔"

"تم کیسی باتیں سوچتے ہو، میں تو تمہارے لئے صرف ذکیہ ہوں اور ڈاکٹر اپنے مریضوں کے لئے۔"

"میں ڈاکٹر ذکیہ سے پیار نہیں کر سکتا۔ ذکیہ سے پیار کرتا ہوں اور ڈاکٹر.... ڈاکٹر ذکیہ کو....!"

"قتل کرنا چاہتے ہو!" اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا

"ہاں!" بے ساختہ میرے مُنہ سے نکل گیا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم ذکیہ کو قتل کر سکتے ہو لیکن ذکیہ کے اندر چھپے ہوئے ڈاکٹر کو نہیں!"

ہم دونوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہی اور میں اپنی ضد پر قائم رہا ——— ملاقاتیں کم ہو گئیں اور ایک بھیگی برسی شام کو ذکیہ سے انتقام لینے کے لئے میں نے شہزادی سے شادی کر لی!

شہزادی کو پاکر مجھے وہ سکون نہ ملا جس کی مجھے ازل سے تلاش

تھی۔ وہ لمحے نہ ملے جنہیں میں اپنے رنگوں میں چھپاکر قید کر لیتا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی زہر میرے جسم میں سرائیت کر چکا ہے، کوئی آگ ہے جس میں، میں اندر ہی اندر جھلس رہا ہوں، کوئی تپش ہے جو مجھے زندہ جلا رہی ہے، میرے سوچنے کی قوت سلب ہو گئی، میرا دل نادیدہ غم کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا اور مجھے محسوس ہوا جیسے ایک دن دل کی یہ دھڑکنیں بند ہو جائیں گی —— پھر بھی زندگی کا سفر آہستہ آہستہ طے ہوتا رہا!

مجھے تصویروں کی نمائش کے سلسلہ میں بمبئی جانا پڑا۔ نمائش ہوئی۔ کامیاب رہی۔ بہت کچھ ملا۔ اور میں نے اپنے آپ کو بمبئی کے ہنگاموں میں گم کر دینے کی کوشش کی —— آخر کب تک۔ ایک صبح مجھے تار ملا کہ شہزادی سخت بیمار ہو گئی ہے۔ میں واپس لوٹا۔ شہزادی —— ہسپتال میں زندگی اور موت کے درمیان تڑپ رہی تھی۔ میری نگاہیں ذکیہ کو تلاش کرتی رہیں لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آئی —— اور جب شہزادی موت کو شکست دینے میں کامیاب ہوئی تو ڈاکٹر شفیع نے مجھ سے کہا

"آپ کی بیوی تو بچ گئی شکر کیجئے لیکن ڈاکٹر ذکیہ ...."

"ڈاکٹر ذکیہ۔ کیا ہوا انھیں؟"

"آپ کی بیوی کو بچانے کے لئے انہوں نے خون دیا ہے، اور وہ بھی تین بوتلیں —— ایک صحت مند انسان ایک وقت ایک بوتل سے زیادہ خون نہیں دے سکتا لیکن وہ خون دینے کے لئے اصرار کرتی رہیں، ادھر اُس گروپ کا خون ہسپتال میں موجود نہ تھا۔"

"ذکیہ اب کہاں ہیں؟"

"آپ انھیں جانتے ہیں کیا؟"

"ڈاکٹر شفیع پلیز، مجھے اُن کے پاس لے چلئے!"

ذکیہ پلنگ پہ بے سُدھ پڑی تھی —— اُس کے عارض کے گلاب مُرجھا چکے تھے ——!!

"تم نے یہ کیا کیا ذکیہ؟"

وہ خاموش تھی لیکن اُس کی آنکھیں بول رہی تھیں —— مجھ سے کہہ رہی تھیں، —— میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے، تم بھول رہے کہ میں ذکیہ ہی نہیں ڈاکٹر ذکیہ بھی ہوں —— اپنے مریضوں کے لئے....!"

غزل

ذکیہ سلطانہ نیّر ——

کیوں پیار بے وفا سے کیا میں نے کیا کیا
آنے لگی ہے اُس کو حیا میں نے کیا کیا
قدموں کو اُن کے چوم لیا میں نے کیا کیا
دیر و حرم میں حشر اُٹھا میں نے کیا کیا
مفہومِ شوق اور بھی اے دل اُلجھ گیا
کیوں خط کو بار بار پڑھا میں نے کیا کیا
جنکو وفا کی شرم نہ عہدِ وفا کی لاج
کی اُن سے آرزوئے وفا میں نے کیا کیا
اِس بے وفا نے کس سے [illegible] میں
کیوں دل پہ اعتبار کیا میں نے کیا کیا
نیّر جو نغمہ، نغمۂ فردا کی لَے میں تھا
وہ نغمہ آج چھیڑ دیا میں نے کیا کیا

بہ دبیرہ سدری نسرین

شہزادی صحت یاب ہو کر گھر لوٹ آئی!

میں ذکیہ کی ادھوری تصویر کو دیکھ رہا ہوں۔ میرے ہاتھ میں برش ہے اور میں ایک بار پھر شاید آخری بار رنگوں سے کھیل رہا ہوں میں نے ادھوری تصویر کے نیچے کسی راہی کے قدموں کے دُھندلے دُھندلے نشان بنائے ہیں جو پستیوں کی جانب بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں خود ایک مریض ہوں اور قدموں کے وہ دُھندلے دُھندلے نشان میری موت کے قدموں کے نشان ہیں جو پستیوں کی تاریکیوں میں دھنستے چلے جا رہے ہیں ——

میں اپنے گھر میں ہوں۔ میرا یہ گھر میرے لئے ایک قبر ہے!

ذکیہ اپنی قبر میں ہے اور وہ قبر اُس کے لئے گھر ہے!!

قبر اور گھر کے درمیان میں کھڑا سوچ رہا ہوں، میرا ٹھکانہ کہاں ہے —— میرا گھر کہاں ہے —— میری قبر کہاں ہے ——!!!

افسانہ

برکھا برسے ساری رات

پُشکرناتھ بی۔ اے

تارانواس، نئی سڑک، دِگی پیر مٹھا جموں (توی)

براد رِمحترم! آداب و نیاز

لیجئے "برکھا برسے ساری رات" حاضرِ خدمت ہے۔ قدرے طویل ہے۔ کافی رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر اِس کہانی کو لکھا ہے۔ آج کل صحت کی حالت کچھ ایسی ہی ہے۔ ایک دل تھا سو وہ بھی خراب نکلا ــــــ اُمید ہے آپ کو یہ کہانی پسند آئے گی۔ پہلے ہی بہت تاخیر ہوگئی ہے، جس کے لئے میں شرمندہ ہوں ــــــ اُن دوستوں اور کرم فرماؤں کا میں شکرگزار ہوں، جو وقتاً فوقتاً مجھے "بیسویں صدی" کے لئے میرے فرض کو یاد دلاتے رہتے ہیں . . .

خیراندیش ــــــ پُشکرناتھ

★

باہر زوروں کی بارش ہو رہی ہے۔ صبح ہی سے آسمان کچھ اُداس سا، کچھ مغموم سا نظر آرہا ہے۔ جانے کیا بات ہے کہ جب آسمان اُداس ہوتا ہے تو میں بھی اُداس ہو جاتا ہوں جیسے میرے دل کے اندر آسمان کا کوئی ٹکڑا آکے بس گیا ہے۔ اِس ٹکڑے نے جو شاید ہیرے کی ایک چھوٹی سی کنی کے برابر ہے، مجھے جینا اجیرن کر دیا ہے۔ کئی بار میں نے اِس ہیرے کی کنی کو دل سے نکالنا چاہا، مگر دل ہی زخمی ہوگیا۔ کنی بدستور موجود رہی۔

اب آسمان روتا ہے تو مجھے بھی رونا پڑتا ہے اور آسمان مسکراتا ہے تو میرے ہونٹوں پر بھی زہرخند پھیل جاتا ہے۔ میرا اور آسمان کا یہ رشتہ بہت پرانا ہے، مگر اِس کے باوجود بھگوان دور ہے ــــــ بہت دُور ہے۔

بارش کے قطرے میرے کمرے کی کھڑکیوں پر مسلسل دستک دے رہے ہیں۔ میں یہ دستک نہیں سننا چاہتا۔ کیونکہ جب میں کھڑکی کھولوں گا تو یہ دستک مجھے کہیں لے جائے گی۔ لیکن اب میں وہاں جانا نہیں چاہتا۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ انگ انگ چور ہے۔ روم روم ہانپ رہا ہے۔

مگر نہیں! میں ضرور کھڑکی کھولوں گا اور پھر اِس دستک کا ہاتھ تھامے وہاں چلا جاؤں گا۔ کیونکہ ایسا بارہا ہوا ہے۔ بارہا میں نے اِس دستک کو سننے سے انکار کیا، آخرکار مجھے جانا ہی پڑا۔

آہ! یہ مسلسل دستک۔ کھڑکی کھولنی ہی پڑے گی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے۔ بارش لگاتار برس رہی ہے۔ منزل بہت دُور ہے۔ ابھی بارش میں بھیگا ہوا، بدحواس سا، کھویا کھویا سا، میں اُس چھوٹے سے بنگلے میں جاؤں گا، جو پہاڑی کے ڈھلوان پر سرو کے پودوں سے گھرا ہوا ہے اور جس کی سُرخ چھت دُور سے نظر آتی ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے لال رنگ کی چُنری میدان میں سکھانے کے لئے ڈال دی ہو۔

اِس بنگلے کی نچلی منزل میں ایک کمرہ ہے، جس کی تمام کھڑکیاں بند ہیں۔ دروازہ مقفّل ہے۔

کمرے کے اندر ایک مَیلی سی، باسی سی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ چیزیں بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک کرسی کی پُشت سے ایک اسکارف لٹک رہا ہے جیسے ابھی کوئی یہاں سے اُٹھ کے چلا گیا ہے۔

مگر یہ سب ایک سراب ہے۔ نظر کا دھوکا ہے۔ کیونکہ یہ کمرہ پچھلے پندرہ سال سے کسی نے نہیں کھولا ہے۔ اِس کمرے کے باہر لٹکتا ہوا یہ

زنگ آلودہ تالا اس بات کی گواہی دے گا۔ اصل میں یہ تالا خود میں نے آج سے پندرہ برس پہلے لگایا تھا اور چابی سڑک کے موڑ کے نیچے اس کھائی میں پھینک دی تھی۔ جہاں ——

وہ دو بہنیں تھیں۔ ایک منہ زور پہاڑی ندی کی طرح پتھروں کو روندتی، لپکتی، جھپکتی جھاگ اڑاتی —— اور دوسری کھیتوں کو سیراب کرنے والی نہر کی طرح کومل، آہستہ خرام، جس کا بہاؤ گھاس کے ایک تنکے سے متاثر ہوتا ہے۔ جیسے ایک کو کسی بے پروا باپ نے پالا ہے اور دوسری کو کسی شفیق ماں نے۔ سب سے پہلے میں نے پہاڑی ندی کو دیکھا۔ ان دنوں میں نے پہاڑی کی ڈھلوان پر بنا ہوا یہ خوبصورت بنگلہ نیا نیا خرید لیا تھا اور گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے یہاں چلا آیا تھا۔

اس دن میں برآمدے میں بیٹھا نشیب میں اُگے ہوئے چیل کے درختوں کی خوبصورتی دیکھ رہا تھا کہ وہ نشیب سے گھوڑے پر بیٹھی گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتی اوپر کی جانب آتی نظر آئی۔ تن پر گھوڑ سواری کا لباس ہاتھ میں چابک اور چہرے پر خشونت لئے۔ یہ لڑکی ہے یا ہنٹر والی کی بیٹی؟ میں نے اپنے سامنے پڑے کافی کے کپ سے پوچھا۔ وہ سیدھی بنگلے کی طرف آ رہی تھی۔ پھاٹک سے گزر کر اس نے گھوڑا برآمدے کے سامنے روک دیا۔

"اس بنگلے کا کیا کرایہ ہے؟"

اس نے چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈال کر پوچھا۔

میں اس اچانک سوال پر چونک اٹھا۔

"جی؟ کرایہ؟ یعنی ——" میں بوکھلا گیا۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔ میں خوبصورت لڑکیوں کو اچانک سامنے دیکھ کر بوکھلا جاتا ہوں۔

"جی ہاں۔ کرایہ۔ میں پورے سیزن کا کرایہ پیشگی ادا کروں گی۔"

"آپ کو یہ جگہ شاید پسند آ گئی ہے؟"

"اتنی پسند نہیں کہ میں اسے خرید ہی لوں!"

"خرید ہی لوں؟ یعنی ——"

"جی ہاں۔ میں ہر پسندیدہ چیز کو خرید لیتی ہوں۔"

"ایسا؟"

"جی —— کتنا کرایہ دینا ہوگا؟"

"کرایہ تو بہر حال جو ہوگا سو ہوگا۔ آپ کو یہ جگہ پسند ہے تو اندر تشریف لائیے۔ میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

"آپ —— یہاں رہتے ہیں؟"

"ہاں بدقسمتی سے فی الحال میں ہی یہاں رہتا ہوں۔"

"کتنا کرایہ دے رہے ہو؟"

"کرایہ تو بہت زیادہ دے رکھا ہے۔ مگر کوئی بات نہیں۔ آپ تشریف لائیے۔"

"بہت زیادہ؟ —— کتنا زیادہ؟"

"صرف ایک عدد دل۔ دل دے دیا ہے اس جگہ کے بدلے۔"

میرا جواب سن کر اس نے ایک لمحے کے لئے اپنے ہاتھ میں سنبھالے ہوئے چابک کی طرف دیکھا۔ پھر گھوڑے کی لگام کو ایک زور کا جھٹکا دے کر اس کا رُخ پھاٹک کی جانب پھیر دیا۔ پھر کاٹھی پر مڑ کر میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور گھوڑے کو اس زور سے ایڑ لگائی کہ وہ اچھلا اور سرپٹ بھاگتا ہوا، دھول اڑاتا ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے کافی کے کپ میں دھول کی ایک تہہ جم گئی۔

اس وقت تو بات یہیں تک ہی محدود رہی۔ مگر رفتہ رفتہ یہ دھول میرے اندر گھس آئی اور میں ایکدم میلا ہو گیا۔

یہ پگڈنڈی مجھے بہت پسند ہے۔ کیونکہ اس کے دونوں طرف گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ڈوبے ہوئے دھان کے پودے دور دور تک —— بکھرے ہوئے ہیں۔ اس پگڈنڈی کے کنارے کنارے ان گنت مینڈک اچھلتے پھدکتے پھرتے ہیں اور لگتا ہے جیسے یہ پگڈنڈی سانس لے رہی ہے۔

یہ پگڈنڈی اوپر گھنے جنگل کے بیچ میں بنی ہوئی باولی تک جاتی ہے۔ اس دن میں اس پگڈنڈی کے سانسوں کے اتار چڑھاؤ میں مگن جا رہا تھا کہ ایک جگہ راستہ بند ہو گیا۔ کئی مینڈک پھدک کر دھان کے کھیتوں میں کود گئے۔ میں نے گھبرا کر دیکھا تو سامنے وہ کھڑی تھی۔

ہلکے سبز رنگ کی شلوار اور قمیص پہنے۔ بال گھٹاؤں کی طرح شانوں پر بکھرائے۔ پلکیں جھکی جھکی سی، بدن سمٹا سمٹا سا چہرے پر شفاف چاندی کا پرتو سا۔ چند لمحوں تک پگڈنڈی نے جیسے سانس روک لی۔

"کافی تنگ جگہ ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"جی ہاں۔ یہ تو صرف ایک آدمی کے چلنے کے لئے بنائی گئی ہے۔" میں نے مسکرانے کی ناکام سی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"زندگی کی پگڈنڈی بھی تو تنگ ہی ہوتی ہے۔ مگر اس پر دو آدمی



چلتے ہیں۔"

"جی نہیں۔ زندگی بہت وِشال ہے۔"

"زندگی نا ـــــ لیکن وہ راستہ جس پر زندگی چلتی ہے بس اِتنا ہی تو ہوتا ہے۔"

"آپ کہتی ہیں تو پھر سچ ہی ہوگا۔"

یکایک میں مُسکرایا۔ وہ بھی مُسکرائی۔ پگڈنڈی پھر سانس لینے لگی۔

"ٹھہرئیے! میں کھیت میں اُترتا ہوں۔ آپ کے لئے راستہ بن جائے گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ اِس گدلے پانی میں آپ کے کپڑے خراب ہوں گے۔"

"تو پھر آپ اُتریں گی کھیت میں؟"

"جی نہیں۔ تھوڑا سا آپ سمٹ جائیے۔ تھوڑا سا میں سمٹ جاؤں گی۔ دونوں نکل چلیں گے۔"

مگر سمٹتے سمٹتے میں اپنا توازن کھو بیٹھا اور پانی میں گر گیا۔ جب وہ خوب جی بھر کے ہنس چکی اور میں بھی نچوڑ نچوڑ کر اپنے کپڑوں کا حلیہ بگاڑنے میں کامیاب ہوگیا تو اُس نے اچانک پوچھا۔

"آپ کی شادی ہوگئی ہے کیا؟"

"نہیں۔"

"جبھی تو ـــــ"

"کیا جبھی تو ـــــ؟" پانی میں گرنے سے میری ساری جھجک ـــــ گویا دُھل گئی تھی۔

"پانی میں گر گئے۔"

"پانی میں گرنے کا اور میرے شادی شُدہ ہونے کا آپس میں کیا تعلق ہے ـــــ؟"

"اِس کا جواب زندگی دے گی۔ جو بقول آپ کے وِشال ہے اور بقول میرے ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلتی ہے۔"

اور مجھے لفظوں کے اِس گورکھ دھندے میں پھنسا کر وہ چلی گئی۔ یہ دوسری بہن تھی۔ میں دیر تک کھڑا اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا یہاں تک کہ دُور جا کر وہ آسمان کے اوپر ایک چھوٹا سا نقطہ بن کر رہ گئی۔ کسی سُہاگن کے ماتھے پر چمکتی ہوئی بِندیا کی طرح!

باہر بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ میں کمرے میں آتشدان کے قریب بیٹھا ٹھٹھر رہا تھا۔ گیلی لکڑیاں سُلگنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ سرور نیچے بازار کچھ سامان لینے چلا گیا تھا اور برآمدے میں راکی ایک کُرسی کے نیچے دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک وہ کُرسی کے نیچے سے نکل آیا اور دروازے کے پاس کھڑا ہو کر غور سے کچھ سُننے لگا

"راکی!" میں نے اُسے آواز دی۔

"ہپ" جواب میں وہ ایک بار بھونکا۔

"سرور ہوگا ـــــ اِدھر آؤ۔"

"ہپ" وہ دوبارہ بھونکا۔ جیسے کہہ رہا ہو میرے کام میں مداخلت مت کرو۔

باہر پھاٹک چرچرانے کی ہلکی سی آہٹ ہوئی اور پھر راکی باقاعدہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بھونکنے لگا۔ میں بادلِ ناخواستہ کرسی سے اُٹھا اور دروازے کے قریب راکی کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اِتنے میں بارش میں بھیگی ہوئی دو لڑکیاں برآمدے میں آگئیں۔ ایک تو وہ ہنٹر والی! اور دوسری۔ آہ! اِس دوسری لڑکی کی بات ہی اور تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے قُدرت نے اِسے بارش میں بھیگنے کے لئے ہی بنایا ہو۔ اچانک میرے دل پر گھنگھور گھٹا چھا گئی۔ جیسے ابھی جل تھل ہو جائے گا۔

"آپ؟" میں نے بیک وقت دونوں سے پُوچھا۔

ہنٹر والی لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ میرے قریب سے گُزر کر کمرے میں چلی گئی۔ اُس دوسری لڑکی نے ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا۔

"یہ میری دیدی ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ بھی میرے قریب سے گزر کر کمرے میں چلی گئی۔ میں اور راکی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کچھ کچھ میں بھی حیران تھا اور کچھ کچھ وہ بھی پریشان!

"آدمی کہاں جانور ہے!"

"دیدی پلیز——"

"جس آدمی کو آگ جلانا نہ آئے، وہ اور کیا ہوتا ہے؟"

"دیدی! وہ سُن رہے ہیں۔"

"سُن رہا ہے تو کوئی پھانسی دے دے گا کیا۔"

کمرے کے اندر جو باتیں ہو رہی تھیں، اُن کو سُن کر میری ہمت

- میرے پاس حسب نسب لے کر نہیں، اعمال لے کر آؤ
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جسے اُس کے عمل نے پیچھے کی صف میں دھکیل دیا، نسب اُسے اچھی صف میں نہیں لا سکتا۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- تم جس سے نفرت کرتے ہو اُس سے ہوشیار رہو۔
(حضرتِ عمر فاروقؓ)
- جانور اپنے مالک کو پہچانتا ہے لیکن انسان اپنے خدا کو نہیں پہچانتا! (حضرتِ عثمان غنیؓ)

جواب دے گئی اور میں برآمدے میں کرسی پر گویا ڈھیر ہو گیا۔ بارش کی پھواریں برآمدے کے اندر آ کر مجھے پریشان کرتی رہیں اور بے چارہ راکی کرسی کے نیچے گھس کر کپکپاتا رہا۔ کئی بار میں نے سوچا کہ اُٹھ کر کمرے میں چلا جاؤں اور ان دونوں بہنوں کے بال پکڑ کر گھسیٹوں اور باہر پھینک دوں——!

دونوں بہنوں کو——؟ نہیں نہیں! صرف ایک بہن کو——

دوسری لڑکی کے لئے تو ابھی مجھے مینہ برسانا تھا اور اُس کے تن من کو دھو ڈالنا تھا۔

"آپ کے ہاں کافی ہو گی——؟" دوسری لڑکی نے برآمدے میں آ کر پوچھا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام ورشا ہے اور میری دیدی کا ریکھا——آپ کے ہاں کافی ہے یا نہیں؟"

"ہو گی صاحب۔ ضرور ہو گی۔ مگر وہ سرور——نہ جانے کہاں مر گیا کمبخت۔ اِن چیزوں کی خبر اُسی کو رہتی ہے۔"

"پھر میں کچن میں جا کر دیکھ لوں؟"

"جی ہاں——جی ہاں ضرور دیکھئے۔ میں بھی چلتا۔ مگر وہ—— آپ کی دیدی سے ڈر لگتا ہے۔"

"ارے——!!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کرسی کے نیچے راکی غرّایا۔ جیسے کہہ رہا ہو، جاؤ کافی پیو اور دفع ہو جاؤ——ایک بار پھر مجھے اپنے آپ پر غصّہ آیا۔ آخر یہ کیا بات ہوئی کہ میں یہاں بارش میں بھیگتا رہوں، سردی سے کپکپاتا رہوں اور وہ ہنٹر والی میرے گھر کو کھنگالتی رہے۔ جیسے اُس کے باپ کی جاگیر ہو۔ مگر میں غصّہ پی گیا، کیونکہ سرور باہر تھا اور ورشا اندر تھی۔

"کافی پیجئے گا؟"

"آپ پی لیجئے——سرور اب آتا ہی ہو گا۔"

"ہم تو پی بھی چکے۔ یہ آپ کے لئے لائی ہوں۔"

ورشا نے مجھے کافی کا کپ تھما دیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ، پلیٹ اور اُس پر دھرا ہوا کپ، تینوں چیزیں اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیں اور پھر میں جیسے بے ہوش ہو گیا۔

"ورشا!"

"جی کہئے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں——میرا ہاتھ تو چھوڑ دیجئے۔"

"کیسے چھوڑ دوں گا؟ اِس ہاتھ ہی کی تو کہانی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ ابھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اِس کے لئے پوری زندگی چاہئے۔"

"جانے کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ دیدی اندر کیا سوچ رہی ہوں گی——"

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ایک ساتھ کتنی چیزیں ہو گئیں۔ چھناکے کے ساتھ کافی کا کپ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ راکی لپک کر کرسی کے نیچے سے باہر

چلا آیا اور بھونکنے لگا۔ ہنٹر والی نے برآمدے میں آکر دروازہ زور سے بند کیا۔

"چلو ورشا! یہ آدمی اچھا نہیں ہے۔"

صرف راکی تھا، جسے میری بے قراری کا علم تھا۔ سرور ٹھہرا پٹھان کا بچہ! اُسے صرف دو چیزوں کی فکر رہتی تھی۔ ایک اپنی دونالی بندوق کی اور ایک جنگل میں بولنے والے چکوروں کی۔ کیا مجال کہ رات کے دو بجے کوئی چکور غلطی سے بولے اور سرور اپنی بندوق لے کر جنگل کی طرف نہ لپکے اور اُن دنوں تو چکور دن رات بولتے رہتے تھے اور سرور اور اُس کی بندوق گھر سے باہر ہی رہتی تھی۔ یہ عالم تھا جیسے سارا سیزن ہی بارش نے ٹھیکے پر لے رکھا ہے۔ کبھی گھنٹے بھر کو دھوپ نکل بھی آتی تھی، تو شرمائی شرمائی سی ـــــ اُس دن بھی ایسی ہی شرمائی شرمائی سی دھوپ نکلی تھی۔ میں اور راکی حسبِ معمول پگڈنڈی کے راستے باؤلی کی طرف جا رہے تھے۔ سامنے ورشا نظر آئی۔

"ہیلو ـــــ" میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"ہائی ـــــ" اُس نے جھک کر کہا اور جھک ـــــ کر راکی کو سہلانے لگی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ آپ سخت ناراض ہوں گے۔" اُس نے جھجکتے جھجکتے ہی کہا۔

"ناراض؟ نہیں تو ـــــ کیوں بھلا؟"

"اُس دن ڈیڈی نے آپ کو نہ جانے کیا کیا کہہ دیا تھا۔"

"ٹھیک ہی تو کہا تھا ـــــ مجھے آپ کا ہاتھ پکڑنے کا کوئی حق نہ تھا۔"

"ہاتھ پکڑنے میں کیا ہے۔"

"بہت کچھ ہے ورشا! ہاتھ پکڑنے کا مطلب ہے کہ میں ساری عمر آپ کا ہاتھ پکڑے رکھوں۔"

"تب بھی کیا ہے ـــــ یا شاید آپ نے خیال چھوڑ دیا۔"

پھر نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ میں نے دھکیل کر راکی کو کھیتوں کے پانی میں پھینک دیا اور ورشا کا ہاتھ پکڑ کر وہیں پگڈنڈی پر بیٹھ گیا۔ پھر میرے دل میں چھائی ہوئی وہ گھٹا کھل کر برسی اور ہم دونوں کے تن من کو دھو گئی۔ راکی بھیگا بھیگا سا دُور پگڈنڈی پر پھدکتے ہوئے مینڈکوں کے ساتھ کھیلتا رہا اور کبھی کبھی چور نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ جیسے کہہ رہا ہو، موج اڑاؤ شہزادے! اب تو تمھیں میری ضرورت بھی نہ رہی۔

کھیتوں کے آس پاس اندھیرے کے حریری پردے منڈلانے لگے تھے۔ دُور گوجروں کے کھاروں سے دھوئیں کے لچھے آسمان کی طرف لپکنے لگے تھے۔ مگر ہمیں وقت اور اُس کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔

اچانک راکی دھیرے سے غرّایا۔ ہم دونوں نے چونک کر دیکھا۔ سامنے ریکھا کھڑی تھی۔ اُس نے ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ ہماری آنکھوں میں اُسے جانے کون سا پیغام نظر آیا۔ اُس نے جلدی سے اپنی نظریں پھیر لیں اور بغیر کچھ کہے چلی گئی۔

"غضب ہو گیا۔" ورشا نے دھیرے سے کہا۔

- ایشور سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اُس کی مخلوق سے محبت کرو۔
(گرو نانک دیو جی)
- ایشور سے پیار کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اُس کے غریب بندوں سے پیار کرو۔ (گرو گرنتھ صاحب)
- دُکھ آنے پر دُکھی نہ ہو، سُکھ ملنے پر اپنے آپ کو سُکھی نہ سمجھو۔ دولت ملنے پر غرور نہ کرو۔ غریبی میں افسردہ نہ ہو۔ ہر حال میں خوش رہنے والا سچا یوگی ہے۔ (شری گرو ارجن دیو جی)
- ضبطِ نفس خواہ کسی نیت سے کیا جائے انسان کے لئے ہمیشہ مفید ہے۔ (مہاتما گاندھی)

"کیوں؟"

"ڈیڈی مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"ہم نے کوئی گناہ تو نہیں کیا ہے۔"

"آپ نے نہیں، مگر میں نے ضرور کیا ہے۔ میں نے ڈیڈی کا کھلونا چھین لیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور لپک ـــــ کے اُس جانب بھاگ گئی جس طرف ریکھا گئی تھی۔

میں حیران اور ششدر چاروں طرف پھیلتے ہوئے اندھیروں کو دیکھتا رہ گیا۔ دیکھتا ہی رہ گیا۔

کئی راتوں سے میں بالکل نہیں سو سکتا۔ عجیب طرح کے خدشات رہ رہ کر، ٹھہر ٹھہر کر دل کے اندر سر اُبھار رہے ہیں۔ کہتے ہیں محبت آدمی کو بے قرار کر دیتی ہے۔ مگر یہ کیسی بے قراری ہے؟ کچھ اسرار ہیں جن پر سے پردہ اُٹھتا بھی ہے اور نہیں بھی اُٹھتا ہے۔

جب پردہ ایک لمحے کے لئے اُٹھتا ہے تو مجھے ریکھا کی آنکھوں میں کچھ نظر آتا ہے۔ کوئی مبہم سا اِشارہ! اور جب پردہ گرتا ہے تو وہی خشونت، وہی کھلونے توڑنے کی خواہش، وہی تحس نحس کرنے کی خُو۔ یا یہ شاید میرا وہم ہو۔

ورشا کا وہ جُملہ رہ رہ کر، ٹھہر ٹھہر کر میرے دل میں چُٹکیاں لے رہا ہے "میں نے دیدی کا کھلونا چھین لیا ہے"۔ کیا میں دیدی کا کھلونا ہوں؟

ورشا نے تو اِس کے بعد زبان پر تالے ڈال دیتے ہیں کچھ بولتی ہی نہیں۔ صرف اندر ہی اندر گرم توے پر رکھی ہوئی مکھن کی ڈلی کی طرح پگھل رہی ہے۔ میں رہ رہ کر اُس کی یہ کیفیت بھانپ رہا ہوں۔ بار بار وہ میری طرف دیکھتے دیکھتے کتنی دُور نکل جاتی ہے اور میں تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہوں۔

آہ! یہ اُمید و بیم کی منزل۔ اِس منزل سے میں کب گزر سکوں گا؟

اُس دن ہم تینوں گوجروں کی بستی میں گئے تھے۔ یکایک کالے بادلوں نے ہمیں گھیر لیا اور ہم ایک کٹھار میں پوری رات گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ کٹھار میں سُوکھی ہوئی گھاس کا فرش تھا۔ درمیان میں آگ جل رہی تھی۔ باہر چھاجوں بارش برس رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا لگا، جیسے ریکھا کی نگاہیں انگاروں میں تبدیل ہو گئی ہوں۔ پھر یہ انگارے میرے جسم کے ایک ایک حصّے کو جلاتے گئے ــــــ جلاتے گئے۔

ورشا حسبِ معمول زبان پر انگارہ رکھے چُپ تھی۔

"کوئی بات کرو ورشا!" میں نے سکوت کے پردے کو چیرا۔

"شی! خاموش رہو" اُس نے اُنگلی ہونٹوں پر رکھ دی۔

اچانک ریکھا نے تیز کٹیلی آواز میں کہا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ دُنیا کی ہر چیز بکاؤ ہے۔ بِچی اور خریدی جا سکتی ہے؟"

"نہیں ــــــ یہ غلط ہے"

"تم سمجھتے ہو کہ ورشا ایک امیر باپ کی بیٹی ہے اور تم محبت جتا کے اُسے خرید سکو گے"

"دیدی ــــــ!" ورشا کراہی۔

"یہ آپ سے کس نے کہا؟ میں تو ورشا کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں"

"اچھا ــــــ؟ تب تو بڑی اچھی بات ہے" ریکھا کے طنزیہ لہجے نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔

"آپ خوش نہیں ہیں کیا؟" میں نے ٹٹولنا چاہا۔

"خوش؟ کیوں نہیں۔ مگر سوچتی ہوں ورشا نے جلدی کی ہے۔ اب اُسے انتظار کرنا پڑے گا"

"کیوں؟ ــــــ انتظار کیسا؟"

ایک لمحے کے لئے ریکھا کے چہرے پر ایک منحوس سا سایہ تیر گیا۔ مگر دوسرے لمحے وہ دوبارہ سنبھل گئی۔

"ورشا چھوٹی بہن ہے اور میں نے ابھی شادی کے بارے میں سوچا ہی نہیں ہے"

"ہم انتظار کریں گے"

میں نے ورشا کی طرف دیکھا۔ مگر وہ الاؤ کے کوئلوں میں کچھ کھوج رہی تھی۔ اُس کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا تھا۔ جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

میرے دل میں ایک پھانک سی لگ گئی اور اچانک میرے بدن میں ایک جھرجھری سی آ گئی۔ کہیں ــــــ کہیں ریکھا ــــــ؟

نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

دل میں، ایک عجیب طرح کا خوف بس گیا ہے۔ جیسے کسی وقت بھی کچھ ہو جائے گا۔ ہر چیز کاٹنے کو دوڑتی ہے، ہر آہٹ پر دل دھڑکتا ہے۔ ریکھا نے سرور کے ہاتھ مجھے پیغام بھجوا دیا ہے۔ اُس نے مجھ سے میری قیمت پُوچھی ہے۔

"ورشا کو بھول جانے کے لئے کتنے دام لو گے ــــــ"

مجھے غصّہ بھی آیا اور ندامت بھی محسوس ہوئی۔ اُس کا تو کوئی قصور نہیں۔ قصور تو میرا اور ورشا کا ہے۔ ہمیں سنبھل سنبھل کر چلنا چاہئے تھا۔ نظروں سے بچ بچ کر رہنا چاہتے تھا۔ ہم نے ناحق اپنا راز فاش

کر دیا تھا۔

اُس سیزن کا وہ شاید سب سے زیادہ منحوس دن تھا۔ صبح ہی سے آسمان کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک عجیب طرح کی بے قراری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ جنگل میں چکور زور زور سے بول رہے تھے۔ اِس لئے سرور بھی اپنی بندوق لئے غائب تھا۔ میں اور راکی کمرے کے اندر آتشدان کے قریب دبکے سے بیٹھے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور روشنی کی ایک لکیر بھیگے ہوئے برآمدے کے ایک حصّے کو نمایاں کر رہی تھی۔ یہ وہ دن تھا، جب چار ہی بجے شام ہو گئی تھی۔

دوپہر کو ورشا ہانپتی کانپتی آئی تھی اور چند لمحے میرے سامنے کھڑے مجھے عجیب انداز سے گھورتی رہی۔

"کیا بات ہے۔ بیٹھو گی نہیں؟"

"نہیں۔ ڈیڈی اور میں اوپر جنگل کی طرف جا رہے ہیں۔"

"بادل بہت گہرے ہیں۔ کسی وقت بھی بارش ہو سکتی ہے۔"

"ہاں! بادل بہت گہرے ہیں ——— ایک بات کہوں؟" اُس کی آواز بہت اُداس تھی۔ جیسے اندر کہیں چوٹ لگی ہو۔

"کہو۔"

"تم مجھے بھول جاؤ۔"

"ورشا ——— !" میں چلّایا۔ مگر ——— وہ جا چکی تھی۔ جلدی میں اُس کا اسکارف فرش پر گر گیا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ اسکارف اُٹھایا اور ایک کرسی کی پُشت پر ڈال دیا ——— اور اب شام ہونے لگی تھی۔

دیر سے باہر کا پھاٹک مسلسل چرچرا رہا تھا۔ شاید ہوا کے کسی جھکّڑ سے کھل گیا ہو۔ راکی رہ رہ کر، ٹھہر ٹھہر کر غرّا رہا تھا۔ دل میں کچھ خواہ مخواہ کے وسوسے اور خدشات سر اُبھار رہے تھے ——— اِتنے میں دیکھا ہانپتی کانپتی برآمدے میں آگئی۔ راکی ایک بار بھونکا اور پھر وہ بدحواسی کے عالم میں کمرے میں آگئی۔ اُس کا سارا جسم بارش سے شرابور تھا۔ بال سارے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں کا کاجل پھیل کر عجیب سی کالکھ میں بدل گیا تھا۔

"کیا ہوا ——— ؟" میرا دل گولی لگے ہوئے چکور کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔

"ورشا ——— سڑک کے موڑ سے پھسل گئی ——— اور نیچے کھائی میں جا گری۔"

ایک لمحے کے لئے میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ لیکن میری اپنی آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی تھیں۔

بدحواسی کے عالم میں گرتا، پھسلتا میں سڑک کے موڑ تک آگیا۔ موڑ پر چند آدمی کھڑے نیچے اندھیری کھائی کی طرف جھانک رہے تھے۔ مگر کھائی خاموش تھی۔ صرف بارش کا شور سُنائی دے رہا تھا۔ میں نے گلا پھاڑ پھاڑ کے

ناقابلِ تلافی نقصان ——— ساغر نظامی

عزیزی نریش کمار شادؔ کی عبرتناک موت مُلک و قوم کا ایسا نقصان ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی ——— وجوہ اور اسباب سے بحث نہیں۔ لیکن فن کار اور سماج کے مابین جو خرمن ناشناسی اور ظالمانہ بے تعلّقی ہے وہ اِس قسم کی اموات کا سبب بنتی ہے اور بنتی رہے گی۔ اگر یہ خلیج نہیں پٹتی ہے تو ہر فن کار کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی تمام تر قوّتیں سوسائٹی کو صالح بنانے کے لئے صرف کر دے۔ جو قوّتیں وہ سماج سے سپر انداز ہو کر اپنی ذات پر حملہ آوری کی صورت میں ضائع کرتا ہے ——— شادؔ جمنا کی سحر آلود موجوں کی سیڑھیوں سے اُتر کر آسانی سے عدم کے ناپیدا کنار سمندر میں کُود سکتا ہے۔ مگر دوستو! اب کوئی شادؔ دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اب راتوں کو جمنا کی سیر کرنے والی نسیمِ سحری دوبارہ نہیں چل سکتی، نہیں چل سکتی۔ شادؔ نے نارسائیوں کے باوجود اپنے فن کو فروغ دینے کی انتھک کوشش کی۔ نوجوانی ہی میں، افکار میں اُس پُختگی کا آجانا جو نصف صدی سے پہلے نہیں آسکتی کوئی کھیل نہیں۔ شادؔ کی موت اُس بسے بسائے شہر کی تباہی کے مانند ہے جو زلزلہ کے جھٹکوں سے یکایک زمین میں دھنس جائے۔ شادؔ قصرِ اُردو کے آثارِ قدیم کے نئے ستونوں میں سے ایک مضبوط ستون تھا۔ جو وقت کے زلزلوں میں گھرے ہوئے اُردو محل کو اپنے شانوں پر اُٹھائے ہوئے ہیں۔ تخلیق اور تعمیر کتنی ہی سرگرمِ کار رہی مگر جو ستون گر گیا ہے، اُس کی جگہ اب دوسرا ستون نہیں اُبھر سکتا۔ شادؔ کے ساتھ سوسائٹی نے اچھا سلوک نہیں کیا۔ وہ کسی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی۔ کیونکہ یہ سوسائٹی نہ رفاعی ہے نہ مذہبی ہے۔ اِس لئے اِس سے انسانیت اور انسان نوازی کی اُمید کرنا عبث ہے ...

ساغر نظامی

آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن نئی دہلی

ورشا کو پکارا۔ مگر

اِتنے میں راکی کہیں نیچے سے بھونکا۔ میں آواز کی طرف لپکا۔ تھوڑی دیر کے لئے ہوا میں معلّق ہو گیا۔ اس کے بعد چیل کی شاخوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کپڑے تار تار کئے اور جگہ جگہ سے رِستے ہوئے خون کو چاٹنے لگیں۔ راکی نے اپنی تھوتھنی سے میری ننگی ٹانگ کو چھوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے ورشا پڑی تھی۔ اس کے جسم کے ہر حصّے سے خون بہہ رہا تھا۔ کپڑے کیچڑ میں لت پت اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔

میں نے آہستہ سے اس کا سر اُٹھا کے گود میں رکھا۔

"ورشا ــــــ ورشا ــــــ"

میں اُسے دھیرے دھیرے پکارنے لگا۔ تھرتھراتی آواز میں، کانپتی ہوئی زبان سے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری آواز اس کے کانوں پر بار گزرے اور وہ پلٹ کر نہ آئے۔ میں دھیرے دھیرے بلاتا رہا ــــــ بلاتا رہا ــــــ ایک لمحے کے لئے آجاؤ ورشا ــــــ! ایک لمحے کے لئے صرف۔ مجھے اپنی آنکھوں میں جھانکنے دو۔ ابھی تو ہمیں سمٹ سمٹ کر، بچ بچ کر زندگی کی پگڈنڈی پر چلنا سیکھنا ہے۔ ابھی تو ہمیں بہت کچھ کہنا سُننا ہے۔ ابھی ہم نے کیا ہی کیا ہے۔ نہ کھُل کر باتیں کی ہیں، نہ جی بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا ہے۔ نہ چاندنی رات کا جادو جانا ہے، نہ بارش میں بھیگے ہیں۔ نہ جی بھر کر روئے ہیں۔ ایک لمحہ ــــــ صرف ایک لمحہ میری جھولی میں پھینک دو۔ میں اُسی کو سنبھالتا ہوا، مارا مارا پھرتا رہوں گا۔

اس نے ایک بار آنکھیں کھولیں۔ ایک بار مجھے بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ دُور ــــــ بہت اوپر سے ریکھا کی آواز آ رہی تھی۔

وہ اپنی بہن کو پکار رہی تھی۔

اب پکار اُسے گلی گلی، بستی بستی!

بہت رات گئے میں باہر کے پھاٹک سے گزر کر اندر برآمدے میں آ گیا۔ راکی سر جھکائے میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ آج کل میں اکیلا چلا جاتا ہوں۔

بارش میں بھیگا ہوا۔ کیچڑ میں لت پت۔ راکی چھ سال بعد مر گیا تھا۔

اندر کمرے کا منظر وہی ہے، جو پندرہ برس پہلے اُس دن تھا۔ سرور ایک ہاتھ میں بندوق تھامے اور دوسرے ہاتھ میں دو چکور لئے کمرے میں بیتابی سے ٹہل رہا ہے۔ ایک چکور کی گردن سے خون کی ایک ایک بوند نیچے فرش پر گر رہی ہے۔ میں دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحب! خون ہو گیا" سرور مجھے دیکھ کر کہہ رہا ہے۔

"ہاں ــــــ مر گئی"

"وہ چڑیل کہاں گئی۔ خدا کی قسم آج وہ میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جاتی۔ مگر بارش نے کام خراب کر دیا"

"کیا کہہ رہے ہو سرور؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں صاحب! میں نے ایک فائر کر بھی دیا، مگر پھر نال میں پانی چلا گیا"

"کس پر فائر کر دیا سرور؟"

"جانے کیا نام ہے صاحب! وہ ہنٹر والی چڑیل! مگر بچ گئی۔ میں سارا دن جنگل میں ان کمبخت چکوروں کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا۔ کوئی چار بجے کے قریب، جب وہ اندھیرا سا چھا گیا نا۔ اُسی وقت مجھے وہ دونوں نظر آئیں۔ وہ بہت نیچے سڑک پر جا رہی تھیں۔ جب موڑ کے پاس پہنچیں تو چھوٹی لڑکی دیوار پر جھک کر نیچے جھانکنے لگی ــــــ اور ایسے میں اُس چڑیل نے اُسے دھکّا دے کر نیچے کھائی میں گرا دیا۔ میں نے فائر کیا۔ مگر ــــــ"

"کیا بک رہے ہو تم؟"

"ٹھیک بک رہا ہوں صاحب! ــــــ میں نے چوکی میں رپٹ لکھوا دی ہے"

اچانک میں کمرے کے اندر لپکا اور سرور کے ہاتھ سے وہ چکور چھین لیا، جس کی گردن سے ایک ایک قطرہ خون رِس رہا تھا ــــــ اور ــــــ اور اُسے دُور اندھیرے میں برستی بارش میں پھینک دیا۔

اب یہ چکور کبھی نہیں بولے گا ــــــ کبھی نہیں بولے گا ــــــ!!

غزل

شباب للت ایم۔ اے

شایانِ عشق جو نہ ہو وہ بات کیوں کریں
تم بے وفا ہو تم سے ملاقات کیوں کریں

ہلکی سی اِک نگاہ بھی خیرات کیوں کریں
ہم سے حضور پرسشِ حالات کیوں کریں

محفل میں اُلٹے سیدھے سوالات کیوں کریں
جو ناگوارِ حُسن ہو وہ بات کیوں کریں

ماضی کی رنجشوں کی شکایات کیوں کریں
بے لطف اپنی شامِ ملاقات کیوں کریں

کیوں اُٹھ کے مے کدے کا بدل دیں نہ ہم نظام
تلچھٹ کے آسرے بسر اوقات کیوں کریں

رُوٹھے تھے جو وہ خود کریں تجدیدِ رسم و راہ
اپنی طرف سے ہم ہی شروعات کیوں کریں

حالات کو بدلنے کی ہمت اگر نہیں
ہم لوگ شکوۂ غمِ حالات کیوں کریں

محفل میں جن کو آنکھ ملانے سے ہے گریز
چھُپ چھُپ کے پھر وہ ہم کو اشارات کیوں کریں

جب اُن کو رسم و راہ بڑھانے سے عار ہے
پھر ہم بھی التماسِ ملاقات کیوں کریں

کیوں بیچ دیں ٹکوں کے لئے ہم وقارِ فن
دُنیا جو چاہتی ہے وہی بات کیوں کریں

مے خانے میں ملیں گے تجھے اے غمِ حیات!
ہم اپنے گھر پہ تیری مدارات کیوں کریں

نا اہلیت ہی جب ہو ترقی کا راستہ
اہلِ شعور کسبِ کمالات کیوں کریں

بھٹکا نہ دیں کہیں ہمیں جدت پسندیاں
ہم اے شباب ترکِ روایات کیوں کریں

شباب للت ایم اے

غزل

سراج الحسن سراج ادیبؔ ایم اے

تیرگی نور سے گئی ہے بدل
جل اُٹھے میری حسرتوں کے کنول

مہ و انجم کا یہ سماں دلکش
ہے کسی حور کا حسین آنچل

وہ تصور میں جلوہ گر ہیں مرے
دل میں ہے اِک عجیب سی ہلچل

رُخِ روشن پہ کاکلِ شبگوں
جس طرح چاند پہ سیہ بادل

ہے رہِ عشق پُر خطر یکسر
دلِ ناداں، ذرا سنبھل کر چل

جاں فزا اُن کے لطف کا انداز
ہے نگاہِ عتاب پیکِ اجل

فی الحقیقت ہوا ہے اِک اِک سال
فرقتِ جانگزا کا اِک اِک پل

رندِ میخوار کی بن آئی ہے
گھِر کے آئے ہیں پھر سیہ بادل

نگہِ لطفِ یار میں مضمر
ہے مری ساری مشکلوں کا حل

ہو گئے بن کے منہدم کتنے
میری معصوم حسرتوں کے محل

ترجمانی کرے نہ جو دل کی!
شعر کہلائے کیوں نہ وہ مہمل

زیست میں بھی وہ سطوتیں ہیں نہاں
سامنے جن کے سرنگوں ہے اجل

دعوتِ فکر دے رہی ہے سراجؔ
آج اہلِ نظر کو میری غزل

سراج الحسن سراج ادیب ایم اے


رف ایک چٹکی
آرتی نیل
بالٹی بھر
دھلے کپڑوں کو
چمکا دے گی
پھر دیکھئے
اپنی کشش
کپڑوں کے
زیادہ سفیدی و
چمکیلے پن
اور بھرپور زندگی کا راز
آرتی نیل
ARATI ULTRAMARINE
आरती नील
SETH CHEMICAL WORKS CALCUTTA
سیٹھ کیمیکل ورکس
۱۶ جمنا لال بجاج اسٹریٹ۔ کلکتہ ۷
SC
میسرز سیٹھ ٹریڈنگ کمپنی۔ ۲۵۲۹۔ چرداراں۔ تلک بازار۔ دہلی نمبر ۶

افسانہ

اشکِ شبنم رشکِ شبنم

مختار الرحمٰن راہی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

ماسٹر منیر منزل۔ سمگزار مسجد گھاٹ گیٹ۔ جے پور۔۳

برادرِ محترم حضرتِ خوشتر گرامی صاحب تسلیم

"افسانہ نمبر" کے لئے آپنے جس خلوص کے ساتھ مجھے افسانہ بھیجنے کے لئے حکم دیا ہے۔ اُس کے احترام اور تعمیل میں تازہ افسانہ "اشکِ شبنم رشکِ شبنم" ارسالِ خدمت ہے۔ میرا کام کسی خاص وقت میں کسی خاص جذبہ کے تحت اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ کسی خاص کردار کی نفسیات کا مطالعہ کر کے کہانی کا رُوپ دینا تھا وہ میں آپ کی پسند کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے کر چکا ہوں۔ اب حضرتِ خوشتر گرامی جیسے ادب نواز، ادیب ساز، فن شناس اور ناقدانہ نظر رکھنے والے پُختہ کار مدیر کا کام ہے کہ وہ "اشکِ شبنم رشکِ شبنم" کو کیا مقام دیتے ہیں۔ یوں "بیسویں صدی" میں تقریباً چودہ سال سے لکھتے رہنے کے باعث آپکی پسند کا مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا ہے اور آپ کی پسند" بیسویں صدی" کے غیر محدود حلقہ کے بے شمار پڑھنے والے اہلِ نظر حضرات کی پسند ہوتی ہے — آپ نے مجھ سے خاموشی کی وجہ بھی دریافت کی ہے۔ بھائی جان! یہ تحریر کرتے ہوئے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے کہ محترمہ والدہ صاحبہ دو ماہ کی علالت کے بعد ۴ جنوری ۶۹ء کی اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئیں۔ خدا انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین! اِس سانحۂ عظیم کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا ہے۔ ماں کی بے پناہ شفقت اور دعاؤں سے محروم ہو جانے پر انسان کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ اس کا مجھے اب احساس ہوا۔ لیکن بے بس انسان صبر کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے اور صبر کرنے والوں کے ساتھ خداوندِ کریم ہوتا ہے۔ بہت سے احباب اور میرے کرم فرما قارئین حضرات میری خاموشی کی وجہ پوچھتے ہیں اور جواب نہ ملنے پر مجھ سے بدظن بھی ہو گئے ہیں۔ اُمید ہے کہ "بیسویں صدی" میں یہ چند سطور پڑھ کر وہ میری خاموشی کو بداخلاقی پر محمول نہیں فرمائیں گے — آجکل ۷ اپریل ۶۹ء سے ۱۹ ہفتے کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آفیسرز ٹریننگ اسکول جے پور میں ہوں اُس کے بعد دیکھئے کس محکمہ میں پوسٹنگ ہو۔۔۔۔

آپ کا اپنا ہی — مختار الرحمٰن راہی

★

۲۰ فروری ۶۹ء — اِس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں میرے سامنے میز پر گلاب کے پھولوں کی مالائیں پڑی ہوئی ہیں۔ میں چند منٹ پہلے کالج ایتول فنکشن سے فارغ ہو کر آئی ہوں اور عجیب سی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں حالانکہ آج کے اِس ایتول فنکشن میں مجھے بے انتہا عزّت اور شہرت ملی۔ پرنسپل اور پروفیسرز نے بھی میرے پڑھے ہوئے اشعار کو بے حد پسند کیا اور سراہا۔ لیکن اِس سب کے باوجود دل میں ایک کسک، ایک انجانا خوف، گھٹن اور خلش محسوس ہو رہی ہے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کیونکہ جو کچھ مجھے ملا اُس کی مُستحق میں نہیں،

انجم صاحب میرے ہونے والے ہیں۔ ہوا یوں کہ اکثر میں اپنے پسندیدہ شاعر انجم صاحب کے اشعار گفتگو کے دوران بھی پڑھ دیا کرتی ہوں اور تنہائی کے اوقات میں گنگنایا بھی کرتی ہوں۔ بات بات پر برجستہ اشعار پڑھنے کی وجہ سے میری کلیگ شہناز، برجیس اور شیلا نے مجھے ایک شاعرہ کی حیثیت سے اِس فنکشن میں متعارف کرا دیا اور پھر سب نے غزل سُنانے کی فرمائش کی اور یونین کے صدر اور پرنسپل صاحب نے بھی زور دیا تو بحالتِ مجبوری انجم صاحب کی تازہ غزل جو اُنہوں نے مجھے خط کے ساتھ بھیجی تھی پڑھ دی جس کے ہر شعر پر خوب خوب داد ملی۔ اور یہ اشعار تو بار بار پڑھوائے گئے ؎

جہاں سے آگے کوئی نقشِ پا نہیں ملتا
وہیں پہ آکے کوئی کارواں لٹا ہوگا

وہ اشک جن سے کبھی آنکھ تر نہیں ہوتی
اُنہی سے دامنِ احساس تر ہوا ہوگا

جہاں زبان کبھی خاموش ہو گئی ہوگی
وہاں پہ خامشی نے حال کہہ دیا ہوگا

ابھی تو آتشِ فرقت میں میں ہی جھلسی ہوں
تمہاری سمت یہ شعلہ گیا تو کیا ہوگا

اِس شعر میں "جھلسا ہوں" کی بجائے میں نے "جھلسی ہوں" پڑھا تھا اور جب میں غزل پڑھ کر اسٹیج سے اپنی کرسی پر آئی تو میں گلاب کی مالاؤں سے لدی ہوئی تھی۔

اور اب میں سوچ رہی ہوں، جو کچھ ہوا بہت بُرا ہوا۔ میری ذرا سی غلطی نے کتنی بڑی اُلجھن پریشانی۔ ذہنی کوفت اور اذیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ کالج کے بہت سے لڑکے جو شعر و شاعری سے شوق رکھتے ہیں اُنھوں نے مجھے جلد ہی ہونے والے خصوصی مشاعرے میں شرکت کی دعوت بھی دی ہے۔ میں نے شرکت سے انکار کر دیا تھا لیکن پرنسپل صاحب اور نوجوان شاعر شمیم صاحب نے کچھ اِس طرح اصرار کیا کہ مجھے اقرار کرنا پڑا۔

جو کچھ ہونا تھا وہ تو خیر ہو چکا اس کے لئے انجم صاحب کو معذرت نامہ لکھ دوں گی لیکن آئندہ کیا ہوگا؟ یہ میں کس آزار میں مبتلا ہو گئی؟ کچھ دنوں کے بعد پرنسپل صاحب اور شمیم صاحب مشاعرہ میں شرکت کے لئے مجھے لینے آ جائیں گے۔ اُف! میں کیا کروں؟ پندرہ اشعار گنگنا کر ہی تو شاعرہ نہیں بنایا جا سکتا۔ شعر کہنا میرے بس کی بات نہیں۔۔۔

---

۲۱ رفروری ۶۹ء ـــــ آج میں نے انجم صاحب کو تفصیل سے خط لکھ دیا ہے جس میں اپنی غلطی اور غیر اخلاقی حرکت کا اعتراف کرتے ہوئے معافی چاہی ہے۔ لیکن میں اپنا سکون کھو چکی ہوں۔۔۔۔ ہر وقت دل پر ایک بارِ گراں محسوس کرتی ہوں۔ میں نے آج شعر موزوں کرنے کی کوشش بھی کی لیکن فرش پر بکھرے ہوئے کاغذ کے پھٹے اور مسلے مسلائے پُرزے میری کم مائیگی اور بے بسی کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ ایسے عالم میں شبنم کی آنکھیں آنسو گرانے کے علاوہ کیا کر سکتی ہیں جنہیں اپنے ہی دامن سے صاف کرنا پڑتا ہے۔

---

۲۲ رفروری سے ۲۴ رفروری ۶۹ء تک ـــــ اپنی حالت پر آنسو بہانے اور شعر موزوں کرنے کی کوشش میں کاغذ سیاہ کر کے پھاڑنے کے سوا کوئی خاص بات قابلِ تحریر نہیں۔

---

۲۵ رفروری ۶۹ء ـــــ آج مجھے انجم صاحب کے جواب کا انتظار تھا اُن کے خطوط اب تک میرے لئے باعثِ مسرت ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اکثر مجھے اپنی پُرکشش تحریر اور حیات افروز اشعار کے ذریعہ نئی زندگی کا پیام دیا کرتے ہیں۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کر رہے ہیں اِس کے بعد وہ کیا کریں گے۔ اِس سلسلہ میں اپنے گذشتہ خط میں اُنہوں نے لکھا تھا ـــــ "اپنے مستقبل کا فیصلہ میں تنہا نہیں کر سکتا۔۔۔ میں صرف نئی حیات کا خاکہ بنا سکتا ہوں۔۔۔ اِس میں رنگ آمیزی کر کے پایۂ تکمیل تک پہنچانا کسی اور کے ہاتھ میں ہے شبنم!" اور اِس کے بعد ایک شعر بھی لکھا تھا ؎

سوزِ غمِ حیات کی شدت میں ہو کمی!
اِس چشمِ نم سے خنکیِ شبنم سمیٹ لیں

ہاں تو مجھے انتظار انجم صاحب کے خط کا تھا لیکن ابھی ابھی عزیز بھائی کا تار آیا ہے کہ وہ کل یہاں آ رہے ہیں۔ یہ عزیز صاحب ہمارے چچازاد بھائی ہیں۔ پانچ سال پہلے جب وہ چچا اور چچی کے ساتھ آئے تھے تو میں نے اُنھیں خوب چھیڑا تھا۔ ہر بات پر اُن کا مذاق اُڑایا تھا

اور وہ بے چارے خاموشی سے برداشت کرتے رہے مجھے یاد ہے ایک دن عزیز بھائی نے کہا تھا.... جو کچھ میں نے امی اور تائی جی کی باتوں سے اندازہ کیا ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ... "

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ اِس طرح ہکلانے کیوں لگے۔ صاف صاف کہیے نا؟" میں نے ترشی سے کہا تھا۔

"مطلب یہ کہ.... کہ تمہیں اب مجھ سے پردہ کرنا چاہئے۔" اُنہوں نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اُن کی آنکھیں نیچی تھیں۔

"کیوں کیا آپ بدنظر ہیں؟ اگر ایسا ہے تو بے فکر رہئے میں نظر پروف ہوں!" اور عزیز بھائی سٹ پٹا کر چلے گئے۔ میرے قہقہے نے اُن کی رفتار تیز کر دی تھی۔

اور اب پانچ سال بعد عزیز بھائی آ رہے ہیں۔ اگر میں اِس پریشانی میں مبتلا نہ ہوتی تو بڑا لطف آتا.... لیکن اب تو تبسّم کو بھی لب ترس گئے ہیں۔ شبنم کا کام اشک بہانا ہی تو ہے۔

---

۲۶ رفروری ۶۹ء ـــــــ آج میں بے حد خوش ہوں۔ عزیز بھائی آ گئے، اِس لئے نہیں، بلکہ آج انجم صاحب کا خط آ گیا جس کا مجھے بے چینی سے انتظار تھا۔ اُنھوں نے ایک تازہ غزل شبنم کے تخلص سے کہہ کر بھیجی ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے "اچھا ہوا آپنے مجھے حالات سے آگاہ کر دیا۔ میں اب وہ غزل کسی مشاعرہ میں نہ پڑھونگا اور نہ کسی پرچے ہی کو بغرضِ اشاعت بھیجوں گا۔ اِس غزل کو بھی اپنی ہی سمجھئے۔ ہاں میں آٹھ دس دن کے لئے الہ آباد، بنارس دِلّی اور آگرہ غالبؔ کے صد سالہ جشن کے مشاعروں میں شرکت کے لئے جا رہا ہوں اِس لئے آپ مجھے خط نہ لکھیں، میں خود وقتاً فوقتاً جس جگہ ہوں گا آپ کو خط لکھتا رہوں گا۔"

کتنے اچھے ہیں انجم صاحب میرے محبوب فنکار۔ اُنھوں نے کسقدر اپنائیت اور یگانگت کا اظہار کیا ہے اور مجھے ہر لمحہ ڈستے رہنے والی اذیت سے بچا لیا۔ آج عزیز بھائی کے آنے کے ایک گھنٹہ بعد ہی انجم صاحب کا خط آ گیا تھا۔ اِس لئے میں عزیز بھائی کے سامنے روتی بسورتی حالت میں نہیں آئی ورنہ خدا جانے وہ کیا سمجھ جاتے۔ کھانے کی میز پر عزیز بھائی سے ملاقات ہوئی۔ وہی کسی سوچ میں ڈوبی آنکھیں، پریشان بال ہونٹوں میں دبے ہوئے سگریٹ کے فضا میں تیرتے ہوئے دھوئیں کے بادل۔

"ارے عزیز بھائی! میں نے مسکراتے ہوئے کہا "پانچ سال کی مدت نے زمانے کو بدل دیا لیکن آپ ویسے ہی ہیں جیسے تھے!"

وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر بڑی سنجیدگی سے بولے۔

"میں وہیں ہوں جہاں پہ پہلے تھا
تم نہیں ہو وہاں جہاں پہ تھیں پہلے
فرق صرف اِسقدر ہے دونوں میں
تم وہاں پر سے چل کے آئی ہو
مجھکو جانا ابھی جہاں پر ہے
کسی منزل کی جانب.... "

"ارے واہ! چل کے میں کہاں آئی ہوں .... آپ آئے ہیں یہاں ـــــــ ہاں آپنے شاعری تو شروع نہیں کر دی؟"

"اب تو آپ بھی اچھی اُردو بول لیتی ہیں.... رہا سوال شاعری کا تو کبھی کبھی کچھ کہہ لیتا ہوں۔"

"اوہ۔ بہت خوب.... تو پھر کوئی غزل سنائیے نا!" میں نے اصرار کیا۔ اور جب وہ غزل پڑھ چکے تو میں نے یہ شعر دُہرایا ؎

تم کو اپنا ہی سمجھ کر تو شکایت کی تھی
اور تم مجھ سے خفا ہو، مجھے معلوم نہ تھا

"کیا کہنا ہے! کتنا اچھوتا خیال ہے، کیسا مرصّع شعر ہے! کیا یہ غزل آپنے ہی کہی ہے؟" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی" اُنھوں نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔

"جی" میں نے تمسخرانہ لہجہ میں کہا "شاعرِ اعظم صاحب! کم از کم یہ تو خیال کیا ہوتا کہ یہ غزل اِسی ماہ کے "تنویر" میں انجم صاحب کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ آخر اتنی بڑی جُراَت آپنے کیسے کی؟" اور وہ گھبرا گئے۔ اُنکی پیشانی پہ پسینے کی بوندیں اُبھر آئیں چہرے پر اعترافِ جُرم اور ندامت کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر کچھ دیر بعد خود پہ قابو پا کر بولے۔

"مجھے اپنی غلطی کا احساس اور اعتراف ہے شبنم صاحبہ! لیکن آپنے اصرار کیا تو مجبوراً آپکی خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے یہ غزل پڑھ دی اور...."

اور میں نے سوچا میں بھی تو ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہو چکی ہوں لیکن پھر بھی میں نے کہا ـــــــ "آئندہ ایسی حرکت نہ کیجئے گا۔ مجھے بے حد دُکھ ہوا ہے۔ کیونکہ انجم صاحب میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔

"جنکی غزل آپ نے پڑھی ہے"

"کیا یہ انجم صاحب اسی شہر میں رہتے ہیں؟" اُنہوں نے پوچھا۔

"بے فکر رہیئے۔ وہ یہاں نہیں رہتے۔"

اور پھر وہ اُٹھ کر چلے گئے اور میں انجم کے تصور میں کھو گئی۔

---

۲۷ فروری ۶۹ء ——— آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں اپنے کمرے میں بستر پہ لیٹی ہوئی انجم صاحب کی غزل گنگنا رہی تھی اور تصور کی آنکھ نے انجم کے خدو خال کو اُبھار کر جس خیالی پیکر کا رُوپ دیا تھا اُس میں محو تھی کہ اچانک عزیز صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"سلام اور انداز تکلم کے حسین سنگم ہی کو شاید جادو کہتے ہیں!"

"اوہ! عزیز صاحب! کہیے کیسے تکلیف کی آپ نے؟" میرے لہجہ میں برہمی اور بیزاری تھی۔

"بس یونہی .... آپ کی دلکش آواز سُن کر آ گیا!" وہ بوکھلا گئے پھر بولے "کیا یہ غزل آپ ہی نے کہی ہے؟"

"تو کیا آپ کا خیال ہے میں بھی آپکی طرح دوسروں کی غزلیں پڑھتی ہوں؟"

"اوہ! معاف کیجئے میرا مطلب یہ نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ .... کہ ترنم تو خیر دلآویز اور دلکش ہے ہی لیکن اشعار میں خیال آفرینی اور موثر انداز بیان نے براہ راست دل کو متاثر کیا اور میں اِدھر سے گذرتا ہوا بے ارادہ آپ کے کمرے میں آ گیا۔"

"شکریہ!" میں نے رُوکھے پن سے کہا "بس یا اور کچھ کہنا ہے؟"

"کہنا تو بہت کچھ ہے اگر آپ سُنیں!"

"اب میرا موڈ تو آپنے بگاڑ ہی دیا ہے اس لئے کہہ ڈالئے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ .... انجم صاحب سے ...."

"آپ اپنی بات کہنا چاہتے ہیں یا انجم صاحب کے متعلق کچھ دریافت کرنا مقصود ہے؟"

"بات ایک ہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میرے لہجہ میں تلخی اور سختی تھی۔

"میری اور آپ کی امی ہم دونوں کی نسبت کے لئے رضامند ہیں .... لیکن آپ شاید انجم صاحب کو .... پسند کرتی ہیں .... ایسی صورت میں ...."

"آپ کا خیال دُرست ہے کہ انجم صاحب میری حیات کا مقصد ہیں۔ اب آپ جو چاہیں راستہ اختیار کریں۔" اور وہ بغیر جواب دئے خاموشی سے گردن جھکائے چلے گئے۔

---

۲۸ فروری ۶۹ء ——— مجھے انجم کے خط کا انتظار ہے۔ جانے وہ کہاں مشاعرے میں اپنے اشعار اور ترنم کا جادو جگا رہے ہوں گے۔ میں بھی کتنی خوش قسمت ہوں کہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر ہی ہم کتنے قریب آ گئے ہیں۔ اور میں اُن کے بغیر اپنی زندگی نامکمل اور سُونی سُونی سی محسوس کرتی ہوں اور وہ صرف میرے فیصلے کے منتظر ہیں .... جب وہ مشاعرے پڑھ کر واپس لکھنؤ پہنچ جائیں گے۔ تو میں اپنے مقصدِ حیات کو اُن پر واضح کر دوں گی۔ آخر کب تک خاموش رہ کر اس طرح سُلگتی رہوں گی۔ ہاں یہ عزیز صاحب بھی بڑے اونچے کلاکار نکلے۔ آج فرسٹ شو میں بلقیس اور میں "میرے حضور" دیکھنے کے ارادے سے گھر سے نکلے۔ "جیم" کے سامنے یہ حضرت کھڑے تھے میں نے سمجھا یہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ ایک نوجوان اور جاذب نظر لڑکی اُن کے قریب آئی "ہلو!" کہا اور اُن کا ہاتھ پکڑ کر ٹکٹ کی کھڑکی کی طرف لے گئی۔ جانے کیوں مجھے عزیز پر بہت غصہ آیا۔ سینما ہال میں وہ دونوں ہمارے سامنے والی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ وہ لڑکی بات بات پر ہنس رہی تھی اور سرگوشی کے انداز میں کچھ کہتی بھی جا رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی اور جب انٹرول میں عزیز کی نظر مجھ پر پڑی تو اس طرح مُنہ پھیر لیا جیسے مجھ سے شناسا ہی نہ ہوں اور یہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا ——— میں واپس گھر آ گئی۔

اِس وقت عزیز بھی گھر آ چکے ہیں اپنے کمرے میں کسی شاعر کے شعر گُنگنا رہے ہیں۔ آج شمیم صاحب آئے تھے۔ کل مشاعرہ ہے اور وہ مجھے لے جانے کے لئے کل رات کو آٹھ بجے آئیں گے۔ میں بھی کل عزیز صاحب کو اِتنا ستاؤں گی، اِتنا جلاؤں گی کہ وہ بھی یاد رکھیں گے!

یکم مارچ ۶۹ء ۷ بجے شام ——— آج صبح عزیز صاحب میرے کمرے میں آئے اور خاموش کھڑے ہو گئے۔

"اب کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" میں نے بے رُخی سے پوچھا۔

"مجھے فریدہ کے ساتھ دیکھ کر آپ کو مزید غلط فہمی ہوئی ہوگی اُسے دور کرنا چاہتا ہوں اور.... دوسری بات یہ کہ میں آج رات کو ساڑھے بارہ بجے والی گاڑی سے جا رہا ہوں۔ میرے یہاں کے قیام سے اور میری باتوں سے آپ کو دُکھ پہنچا، اِس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔"

"لیکن آپ اُس فریدہ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ چچی جان سے کہہ دیجئے میرا مسئلہ بھی اِس طرح حل ہو جائے گا۔"

"یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ فریدہ کی شادی ہو چکی ہے۔ ہمارے مکان کے برابر میں رہتی ہیں یہاں اپنے میکہ آئی ہوئی ہیں۔ کل راستہ میں اچانک ملاقات ہو گئی تھی اور سینما کا پروگرام بن گیا۔"

"خیر مجھے اِس سے کیا" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"آج مشاعرہ میں آپ شرکت کرینگی؟"

"ارے ہاں آپ مشاعرہ سُنکر چلے جائیے نا۔ گاڑی جانے میں کافی وقت رہیگا۔"

"مجھے مشاعروں سے کوئی دلچسپی نہیں اور پھر میں یہ پسند کرونگا کہ آپ سینکڑوں لوگوں کے سامنے غزل پڑھیں؟"

"اوہ! تو... نوبت بہ ایں جا رسید ....." میں نے سخت لہجہ میں کہا "مجھے آپ کے اِس فرسودہ اور دقیانوسی مشورے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو اختیار ہے کسی وقت بھی جا سکتے ہیں!"

اور پھر وہ یہ شعر پڑھ کر گردن جُھکائے چلے گئے؎

صحنِ گلشن میں خُنک تابئ شبنم اے دوست
وقتِ رخصت بھی تو اک رقصِ شرر مانگے ہے

یکم مارچ ۶۹ —— اِس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ مجھے مشاعرے سے آئے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے ہیں لیکن میں ابھی تک نہیں سو سکی ہوں طرح طرح کے خیالات کا لامتناہی سلسلہ میرے دماغ پر محیط ہے۔ میں چاہتی ہوں اِن سوچوں کی طویل ڈور کو سمیٹ کر کسی گوشے میں کھوؤں اور نیند کی آغوش میں چلی جاؤں لیکن انتہائی کوشش کے باوجود اِن سے پیچھا چھڑانے میں ناکام رہی ہوں۔

رات جب میں مشاعرے گاہ میں پہنچی تو ہزاروں آنکھوں کو اپنا منتظر پایا۔ میں لیڈیز کارنر میں ایک سیٹ پر بیٹھ گئی جہاں میری بہت سی سہیلیاں بھی تھیں اور سب کی نظریں میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ کئی شعراء پڑھ چکے تو اسٹیج سیکریٹری شمیم صاحب نے مائک پر اعلان کیا۔

"میں سامعین حضرات کے ذوق و شوق کا احترام کرتے ہوئے محترمہ شبنم صاحبہ سے ترنم ریز ہونے کی درخواست کروں گا لیکن اِس سے قبل یہ اعلان کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں کہ ہماری خوش قسمتی سے یہاں ملک کے مشہور، ممتاز اور صاحبِ طرز نوجوان شاعر حضرت عبدالعزیز انجم بھی تشریف لائے ہوئے ہیں اور وہ ابھی کی گاڑی سے لکھنؤ جانے والے ہیں اِس لئے میں حضرت انجم صاحب سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے کلام سے ہمیں محظوظ فرمائیں۔"

آہ! ڈاکٹر ذاکر حسین

انجم لدھیانوی

جذبۂ انسانیت کے ترجماں ذاکر حسین
دم زدن میں ہو گئے خُلد آشیاں ذاکر حسین

وُہ تدبر وہ تفکر کس میں آتے اب نظر
اک نرالی شان کے تھے نکتہ داں ذاکر حسین

فلسفی، وُہ عالمی شہرت کے اسکالر، ادیب
علم میں، دانش میں تھے فخرِ زماں ذاکر حسین

خاک اِن کی قدر و قیمت کا ہو اندازہ ہمیں
لعل و گوہر سے بھی تھے بڑھ کر گراں ذاکر حسین

دیش بھگتوں میں نہیں کوئی مجاہد آپ سا
عہدِ پیری میں بھی تھے مردِ جواں ذاکر حسین

اُن کی رحلت کا کسی صورت یقیں آتا نہیں
دُور جا کر بھی ہیں اپنے درمیاں ذاکر حسین

رو پڑے انجم مہ و خورشید بھی اِس موت پر
ہو گئے نظروں سے پنہاں ناگہاں ذاکر حسین

انجم لدھیانوی

اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ عزیزہ صاحب کھنکھناتے ہوئے مائک پر آئے اور فرمانے لگے "میں صرف دو قطعے پڑھ کر اجازت چاہوں گا کیونکہ گاڑی روانہ ہونے کا وقت قریب ہے۔"

حالات کی اِس ستم ظریفی اور اپنی بدقسمتی پر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔ میں سوچنے لگی۔ آخر عزیزہ صاحب نے مجھ سے حقیقت کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ اپنی شخصیت کو راز میں کیوں رکھا؟ نادانستگی میں اُن کے ساتھ میں نے کتنا بُرا سلوک کیا... کیا سوچا ہوگا انہوں نے میرے اِس طرزِ عمل پر؟ — اچانک انجم صاحب کی پُر درد آواز گونجی۔ وہ پڑھ رہے تھے ؎

تجھ سے مل کر بھی خلش ہوتی ہے دل میں پیہم
پھر نہ کیوں ترکِ تعلق کو گوارا کر لوں
میرے احساس کی رگ رگ میں سمانے والے
میں نے سوچا ہے کہ اب تجھ سے کنارا کر لوں

ہر طرف سے داد کا شور اُٹھ رہا تھا لیکن انجم نے بے نیاز ہو کر پھر پڑھنا شروع کیا۔

اپنی تخیل کی سنسان گزرگاہوں میں
تجھ کو آواز دی ویرانہ سجانے کے لئے
جب نہ آیا مری آواز کا کوئی بھی جواب
سلسلے توڑ دئے ہوش میں آنے کے لئے

میں بخوبی سمجھ گئی کہ ان دونوں قطعوں میں انجم صاحب کس سے مخاطب ہیں اور کس سے کیا شکوہ ہے۔ میرا دل جیسے سمندر کی گہرائی میں ڈوبا جا رہا ہو اور میں سوچ رہی تھی، اب میں اِن سے کس طرح نظریں ملاؤں گی۔ حالات نے اچانک مجھے کس مقام پر لا کر چھوڑا ہے جہاں میں خود کو اجنبی محسوس کر رہی ہوں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ سٹیج سے چلے گئے اور میں انجانے جذبے کے تحت بے اختیار پنڈال سے باہر آ گئی۔ کچھ ہی فاصلہ پر انجم اور فریدہ کار میں بیٹھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انجم صاحب رُک گئے۔ ان کے لبوں پر معنی خیز تبسّم تھا۔

"مجھے معاف کر دیجئے انجم صاحب! میں بے حد نادم اور شرمندہ ہوں مجھے کیا خبر تھی کہ...."

"ارے شبنم معافی کی کوئی بات نہیں۔ اچھا وقت بہت کم رہ گیا ہے اسلئے مجھے اجازت دیجئے۔"

"تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے معاف نہیں کیا گیا۔ کاش اِس وقت آپکو میرے دل کی کیفیت کا اندازہ ہوتا!" میری پلکیں نم ہو چکی تھیں۔ میری آواز شدتِ غم سے ڈوبی جا رہی تھی۔

"ارے شبنم کی آنکھ میں شبنم!" وہ بولے "یہ دو آتشہ آنسو.... میرے دل کی بساط تو کیا ہے فولاد کو بھی پگھلا سکتے ہیں!"

"انجم صاحب!" میں نے ہچکیوں کے درمیان کہا "یہ آپ ہی کا تو مطلع ہے نا ؎

فاصلے جو ہیں دلوں کے وہ مٹاؤ یارو
ہو گئی بات جو ہونی تھی ہٹاؤ یارو

"میں آپ کو یقین دلاؤں شبنم کہ میرا دل صاف ہے مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔"

"تو پھر آج نہ جائیے.... رُک جائیے نا.... ورنہ میں سمجھوں گی کہ آپنے مجھے معاف نہیں کیا!" میرے لہجہ میں التجا تھی اور آنکھوں میں اُمید کی کرنیں۔

"اچھا!" وہ مُسکرائے اور فریدہ سے کہا "ہمیں اسٹیشن کی بجائے شبنم صاحبہ کے گھر پہنچا دیجئے۔" اور میرا دل اِس طرح کھل اُٹھا جیسے کوئی کلی آمدِ فصلِ بہار پر اپنی تمام تر نکہتوں کے ساتھ شگفتہ ہو جاتی ہے!

ہمیں گھر چھوڑ کر فریدہ نے مجھ سے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔ "انجم بھائی کا خیال رکھئے ایسا نہ ہو کہ رات کو اُٹھ کر چلے جائیں اور...."

اور میں مُسکرا کر رہ گئی۔

اور اِس وقت انجم صاحب اپنے کمرے میں محوِ خواب ہوں گے لیکن میں جاگ رہی ہوں اور میری آنکھوں میں اِس وقت بھی آنسو جھلملا رہے ہیں۔ لیکن یہ آنسو رُخِ حیات پر گذرے ہوئے حالات اور وقت کے چھوڑے ہوئے ناخوشگوار نقوش کو مٹائیں گے۔ یہ آنسو حسین اور تابناک مستقبل کے آئینہ دار بھی ہیں.... بہارِ بے خزاں اور بے پناہ مسرتوں کے پیامبر بھی!

کیا خبر تھی کہ عزیزہ کے رُوپ میں مجھے اچانک میرا انجم مل جائیگا! جو اشکِ شبنم کو رشکِ شبنم بنا دے گا!!

بیسویں صدی دہلی جولائی ۱۹۹۹

غزلیں

ابرا حسنی گنوری

ایک ادبی معرکے کے نتیجہ میں

گھر جائیں آگ میں کہ گزر جائیں سر سے ہم
گلزار تو نہ چھوڑیں گے گلچیں کے ڈر سے ہم

پہرے قدم قدم پہ ہیں رعبِ جمال کے
اُن کے قریب جائیں تو جائیں کدھر سے ہم

افسانۂ فراق کی سُرخی یہ بن نہ جائیں
لکھ تو رہے ہیں خط اُنھیں خونِ جگر سے ہم

ہم جانتے تھے جو رہے بدلا وفاؤں کا
تیار اِس کے واسطے تھے پیشتر سے ہم

دل حادثاتِ دہر کو لاتے نظر میں کیا
ٹکرا چکے ہیں دل کو کسی کی نظر سے ہم

رستے ہزار الگ ہوں وہ مرکز ہے بزمِ دوست
پہنچیں گے بے خطر وہیں جائیں جدھر سے ہم

گردش میں چشمِ ناز کی سب گُم ہیں گردشیں
آزردہ شام سے ہیں نہ خوش ہیں سحر سے ہم

وہ سادہ دل ہیں ہم کہ ہمیں کچھ خبر نہیں
آگاہ عیب سے ہیں نہ واقف ہنر سے ہم

پھولوں کی اوٹ سے نہیں تاروں کی اوٹ سے
وہ زینتِ نگاہ تھے گزرے جدھر سے ہم

ناقوس اور اذاں کے گلے بیٹھنے لگے
اب تو بتاؤ تم کو پکاریں کدھر سے ہم

اچھا ہوا کہ لُٹ کے سبق مل گیا ہمیں
تھے مطمئن کبھی ابرؔ بہت راہبر سے ہم

ابرا حسنی گنوری

ن۔ ن نجمی ایم۔ اے

سوز پھر اُٹھا ہو جیسے — رُوح پھر آبلہ سا ہو جیسے

ہجرِ پیہم ہی بلا ہو جیسے — زیست اِک دورِ فنا ہو جیسے

تیری خوشبو کا اب ایک ایک نفس — میرے تن من میں بسا ہو جیسے

غم ہے دل کا مدارِ ہستی — غم ہی کچھ دل کی غذا ہو جیسے

تُو نے بھی اے غمِ دوراں! مجھ پر — مدتوں ناز کیا ہو جیسے

یُوں تلاطم میں لئے جاتا ہے — ناخُدا میرا خُدا ہو جیسے

تیرے نغموں میں بھی اے مطربِ وقت! — دردِ غم، سوز بھرا ہو جیسے

شکرِ یہ، ظلم و ستم کا بھی کروں — یہ بھی اِک شرطِ وفا ہو جیسے

ہائے وہ عہدِ گزشتہ کی کسک! — دل پہ کچھ بیت گیا ہو جیسے

چین آتا سا نظر آتا ہے — وقت نے زخم بھرا ہو جیسے

ہائے یہ آپ کی ظاہر داری! — آپ نے کچھ نہ کیا ہو جیسے

اہلِ عالم کا یہ عالم، نجمی!
کوئی مخلص نہ رہا ہو جیسے

ن۔ ن نجمی


ا ے !
۱۲ ہی دنوں میں
زیادہ سفید دانت !
بڑے ہی موثر قسم کے نئے فارمولے کے مطابق بنائے ہوئے
پیپسوڈنٹ
سے ۱۲ ہی دنوں میں دانت زیادہ سفید
اور زیادہ صحت مند ہو جاتے ہیں!
Pepsodent
With new formula
پیپسوڈنٹ کو اب تین طرح سے بہتر بنا گیا ہے :
نیا فارمولا ' نیا ذائقہ اور نئی پیکنگ ۔
□ برسوں کی تحقیق کے بعد تیار کئے ہوئے نئے فارمولے
کی بدولت پیپسوڈنٹ میں اب ایریتھم پلس ایل ڈی ۲
ملایا جاتا ہے ۔ اس کے موثر اجزا دانتوں پر چڑھی ہوئی
میلی سی تہ کو نکال کر انہیں قدرتی چمک عطا کرتے ہیں ۔
□ ساتھ ہی ساتھ یہ دانتوں کی دراڑوں میں چھپے ہوئے
کھانے کے باریک باریک اور مضرت رساں جراثیم والے
ذروں کو نکال کر دانتوں کو سڑنے سے بچا لیتے ہیں ۔ اس کا
زوردار جھاگ دانتوں کی تمام دراڑوں کو پوری طرح سے صاف کر دیتا ہے ۔
□ پیپسوڈنٹ کا پہلے سے زیادہ ٹھنڈا میٹھا ذائقہ آپ کو بیحد پسند آئیگا ۔
نیا پیپسوڈنٹ آج ہی خریدیئے اور پھر دیکھئے ۱۲ ہی دنوں میں اس کا حیرت انگیز اثر!
نیا فارمولا
نیا ذائقہ
نئی پیکنگ
رجسٹرڈ یوزرس
ہندوستان لیور لیمیٹڈ کی معیاری پیشکش

جوائننگ رپورٹ

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم۔ اے
نمبر ۲۴۱-مین اسٹریٹ۔ مہو (مدھیہ پردیش)

برادرِ محترم! آداب و تسلیمات

... "جوائننگ رپورٹ" حاضر ہے۔ خدا کرے وقت پر مل جائے ـــــ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا...

آپ کا بھائی ـــــ ظفر احمد نظامی

★

مسز نغمی بس کا انتظار کر رہی تھیں۔ بس اسٹاپ پر لمبے کیو میں کھڑے کھڑے انھیں کافی دیر ہو چکی تھی۔ اب تک جتنی بسیں گزری تھیں اُن میں بہت کم گنجائش تھی۔ اِسی لئے اُن کا نمبر نہ آسکا تھا۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ اُکتا جاتیں اور اُلجھنے لگتیں۔ مگر آج اُن کی اضطرابی کیفیت میں بھی اطمینان کا پہلو تھا ـــــ لیکن اُن کے احساسات کروٹیں بدل کر نئی نئی کیفیتوں میں ڈھل رہے تھے۔ اُن کی اُمنگیں اُمید کے پھول مہکا رہی تھیں ـــــ وہ ایک نیا تجربہ محسوس کر رہی تھیں۔ ایک بالکل نیا احساس، جس کی لذّت سے وہ پہلے کبھی آشنا نہ تھیں۔ اُن کا ذہن حال کی بلندی سے مستقبل کے دریچوں میں جھانک رہا تھا ـــــ آج وہ اپنے ہی کالج میں لکچرار کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کرنے والی تھیں۔ ایک ایسی زندگی کا آغاز، جس کا خواب جانے کب سے اُن کی بڑی بڑی آنکھوں کی لمبی پلکوں کے سائے میں پلتا رہا تھا جہاں سے منزل کی شاہراہ ملتی تھی۔ ایسی شاہراہ جس پر چلنے کے لئے اُن کے قدم مدّت سے بے چین تھے۔ پڑھنا پڑھانا اُن کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ مدرّس کی زندگی کو انھوں نے ہمیشہ انسانیت کی مشعل سمجھا۔ وہ اُسے روشنی کے ایسے مینار سے تعبیر کرتی تھیں جس کے اُجالوں سے سماج کو جِلا ملتی ہے ـــــ اچانک ہارن کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔ لوگوں کی طویل قطار بس میں جگہ حاصل کرنے کی غرض سے بے چینی کے ساتھ متحرک تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس ہی ایک سیٹ پر آبیٹھیں اور پھر سوچوں کے طویل سلسلے سے اُلجھ کر رہ گئیں۔

مسز نغمی متوسط خاندان کی فرد تھیں۔ اُن کے شوہر ایک فرم میں ملازم تھے۔ گھر کے اخراجات کے لئے اُن کی تنخواہ بہت کافی تھی لیکن اب تک وہ مستقبل کے لئے کوئی رقم پس انداز کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ مسز نغمی نے معاشیات میں ایم۔ اے کر کے کالج میں ملازمت کے لئے درخواست دے دی۔ اُن کی نظر میں اِس ملازمت کا مقصد خدمت کے علاوہ تن آسانی کے اُن لوازم کو مہیا کرنا بھی تھا جو نئی نئی ساریوں، لپ اسٹک، پاؤڈر، کریم، سنو اور سینٹ کی شیشیوں کو میز پر سجانے کے ارمان سے متعلق تھے۔ جن کو عورت کی فطری کمزوری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ درخواست دینے کے کچھ دن بعد ہی اِنٹرویو کال آگیا۔ سلیکشن بورڈ کے بیشتر ممبر اُن سے واقف تھے۔ خود اُن کے پروفیسر اُس میں شامل تھے۔ وہ اپنی باری آنے پر کمرے میں داخل ہوئیں تو پرنسپل نے چیئرمین کی حیثیت سے پوچھا۔

"آپ ہی مسز نغمی ہیں؟"

"جی ہاں"

"بیٹھئے"

"شکریہ"

انھیں گھبراہٹ ضرور محسوس ہوئی۔ مگر اپنے پروفیسر پر نظر ڈالتے ہی وہ مطمئن ہو گئیں۔ کیونکہ انھیں کے ایما پر مسز نغمی نے درخواست دی تھی۔

وہ اُن کی Pet Student رہ چکی تھی۔ سوالات شروع ہو گئے۔

"آپ نے ایم۔اے کہاں سے کیا؟"

"اِسی کالج سے۔"

"کِس ڈویژن میں؟"

"فرسٹ ڈویژن میں!"

"کون کون سے پیپرس آفر کئے تھے آپ نے؟" مِسز نغمی نے تفصیل بتادی اور پھر دل ہی دل میں اِس عجیب رسم کا مذاق اُڑانے لگیں۔ اُن تمام سوالات کے جواب اُن کی درخواست میں تفصیل سے موجود تھے۔ مگر بار بار اُنہی کو دُہرایا جا رہا تھا۔

"آپ کالج کی ملازمت کیوں چاہتی ہیں؟"

"جذبۂ خدمت کی تکمیل کے لئے۔"

"کیا اِس کا کوئی اور ذریعہ نہیں؟"

"اپنے لئے میں اِسی کو بہتر سمجھتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"یہ میرے ذوق کی بات ہے!" اور چیئرمین ہُوں کر کے رہ گیا۔

دوسرے ممبر نے اُن کے چہرے پر آنکھیں مرکوز کرتے ہوئے پُوچھا۔

"آپ کا مشغلہ؟"

"کتابیں پڑھنا۔"

"اور...؟"

"انسانیت کے لئے سوچنا۔" مسز نغمی کی زبان سے ایکدم نکل گیا۔

"تو آپ کی فکر کا موضوع انسانیت ہے؟"

"یہی سمجھ لیجئے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں خود بھی ایک انسان ہوں ——— اگر میں دوسروں کے لئے نہیں سوچتی تو وہ بھی میرے لئے نہیں سوچیں گے۔"

"یہ تو خود غرضی ہوئی۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی ——— سماج انسانیت کے مضبوط دھاگے میں بندھا ہے اور یہ رشتے بہت پائدار ہیں۔"

اور ممبر تحسین آمیز نگاہوں سے اُنھیں دیکھتے ہوئے پروفیسر کی طرف متوجہ ہو گیا جو مضمون کے ایکسپرٹ تھے۔ اُنھوں نے مِسز نغمی سے پُوچھا۔



[illegible]

[illegible] ہیں۔"

"ان کی تفصیل بتائیے۔"

"پہلی قسم بنیادی ضرورتوں کی ہے جو زندگی کے وجود سے متعلق ہیں۔ دوسری آسائشیں مہیا کرتی ہیں اور تیسری قسم کا تعلق تعیش پسندی کے سامان کی فراہمی سے ہے۔"

اور وہ خوش ہو اٹھیں۔ کتنا معمولی سوال کیا تھا اُن کے پروفیسر نے۔ اِس کا جواب تو معاشیات کا ایک معمولی طالب علم بھی دے سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ انھیں اُلجھانا نہ چاہتے ہوں —— پھر بورڈ کے عوامی نمائندے نے پوچھا۔

"آپ کی نظر میں کون سی ضروریات اہم ہیں؟"

"پہلی یعنی بنیادی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اُن کا تعلق سماج کے ہر فرد سے ہے۔ اُن کی تکمیل کے بغیر زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں۔"

"سماج اور بنیادی ضرورتوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"سماج کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اُن کے حصول میں مدد دے۔ اگر کوئی شخص عیش کی زندگی بسر کرے اور اُس کا ہمسایہ فاقہ کشی کا شکار ہو تو اُس کی تعیش پسندی ایک جرم ہے۔"

"کیا ہر شخص کا یہی نظریہ ہوتا ہے؟"

"ہونا تو چاہیے۔ اگر سب اِس پر عمل کرنے لگیں تو ایک مثالی سماج تخلیق ہو سکتا ہے۔"

"آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اگر میری بنیادی ضرورتیں بآسانی پوری ہو جاتی ہیں تو دوسروں کو اُن کا حق دینا میرا فرض ہے۔"

"آپ طلباء میں یہ جذبہ پیدا کر سکیں گی؟"

"کوشش ضرور کروں گی۔"

"اِس کے لئے آپ کو خود ایک مثالی کردار بننا پڑے گا۔"

[illegible] انٹرویو ختم ہو گیا۔ وہ بہت خوش تھیں۔ [illegible] کرنے لگی۔ خواہ مخواہ نروس ہو رہی تھی۔ چند الفاظ کے استعمال اور اعلیٰ درجے کے اخلاق کی نمائش نے ممبروں کو بہت متاثر کیا جس میں اُن کے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ چلتے وقت اُنھوں نے دیکھا کہ پروفیسر کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ اِس کا مطلب وہ خوب سمجھتی تھیں۔ دراصل اُنھیں انٹرویو کے تاثر کا عکس صاف جھلک رہا تھا —— اور وہ Select کر لی گئیں۔

مسز نغمی یہیں تک سوچ پائی تھیں کہ بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ڈرائیور نے سڑک پر ایک بھکارن کو بچانے کے لئے بہت بڑی Risk لی تھی۔ وہ بھی گرتے گرتے بچیں۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی کسی لڑکی نے پشت میں Rod پر رکھے اُن کے ہاتھ کا سہارا لے کر اپنے آپ کو گرنے سے بچا لیا تھا۔ اُنھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور سوچنے لگیں۔ اُنھوں نے اُسے کہیں دیکھا تھا —— مگر کہاں؟ کچھ یاد نہ آیا —— ! اور پھر ایک دم جیسے اُن کی یادداشت نے اُسے پہچان لیا۔ وہ اُن کے ساتھ انٹرویو دینے والے اُمیدواروں میں تھی۔ اُنھوں نے سوچا، اُس سے پوچھیں Select ہوئی یا نہیں۔ مگر پھر جلد ہی اُن کا ذہن اپنے خوش آیند مستقبل کی حسین دھنک کے رنگوں میں گم ہو گیا —— روپے کی ریل پیل ہو گئی، بینک بیلنس بڑھنے لگا، بنگلہ تعمیر ہو گیا اور پورچ میں بالکل نئے ماڈل کی پسندیدہ کار آ گئی —— اُن کی سوچوں کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ پشت کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کسی کے [illegible] [illegible] کہہ رہی تھی

وہ اُن کی Pet student رہ چکی تھی۔ سوالات شروع ہو گئے۔

"آپ نے ایم۔اے کہاں سے کیا؟"

"اِسی کالج سے۔"

"کس ڈویژن میں؟"

"فرسٹ ڈویژن میں!"

"کون کون سے پیپرس آفر کئے تھے آپ نے؟" مِسز نغمی نے تفصیل بتادی اور پھر دل ہی دل میں اِس عجیب رسم کا مذاق اُڑانے لگیں۔ اُن تمام سوالات کے جواب اُن کی درخواست میں تفصیل سے موجود تھے۔ مگر بار بار [illegible] کو دُہرایا جارہا تھا۔

"آپ کالج کی ملازمت کیوں چاہتی ہیں؟"

"جذبۂ خدمت کی تکمیل کے لئے۔"

"کیا اِس کا کوئی اور ذریعہ نہیں؟"

"اپنے لئے میں اِسی کو بہتر سمجھتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"یہ میرے ذوق کی بات ہے!" اور چیرمین ہُوں کر کے رہ گیا۔

دوسرے ممبر نے اُن کے چہرے پر آنکھیں مرکوز کرتے ہوئے پُوچھا۔

"آپ کا مشغلہ؟"

"کتابیں پڑھنا۔"

"اور۔۔۔؟"

"انسانیت کے لئے سوچنا۔" مِسز نغمی کی زبان سے ایکدم نکل گیا۔

"تو آپ کی فکر کا موضوع انسانیت ہے؟"

"یہی سمجھ لیجئے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں خود بھی ایک انسان ہوں ـــــــ اگر میں دوسروں کے لئے نہیں سوچتی تو وہ بھی میرے لئے نہیں سوچیں گے۔"

"یہ تو خود غرضی ہوئی۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی ـــــــ سماج انسانیت کے مضبوط دھاگے میں بندھا ہے اور یہ رشتے بہت پائدار ہیں۔"

اور ممبر تحسین آمیز نگاہوں سے اُنھیں دیکھتے ہوئے پروفیسر کی طرف متوجہ ہو گیا جو مضمون کے ایکسپرٹ تھے۔ اُنھوں نے مِسز نغمی سے پُوچھا۔

"[illegible] کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟"

"معاشیات کی رو سے تین حصوں میں۔"

"اُن کی تفصیل بتلائیے۔"

"پہلی قسم بنیادی ضرورتوں کی ہے جو زندگی کے وجود سے متعلق ہیں۔ دوسری آسائشیں مہیا کرتی ہیں اور تیسری قسم کا تعلق تعیش پسندی کے سامان کی فراہمی سے ہے۔"

اور وہ خوش ہوا ٹھیں۔ کتنا معمولی سوال کیا تھا اُن کے پروفیسر نے۔ اِس کا جواب تو معاشیات کا ایک معمولی طالب علم بھی دے سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ انھیں اُلجھانا نہ چاہتے ہوں ــــــ پھر بورڈ کے عوامی نمائندے نے پوچھا۔

"آپ کی نظر میں کون سی ضروریات اہم ہیں؟"

"پہلی یعنی بنیادی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ اُن کا تعلق سماج کے ہر فرد سے ہے۔ اُن کی تکمیل کے بغیر زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں۔"

"سماج اور بنیادی ضرورتوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"سماج کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اُن کے حصول میں مدد دے۔ اگر کوئی شخص عیش کی زندگی بسر کرے اور اُس کا ہمسایہ فاقہ کشی کا شکار ہو تو اُس کی تعیش پسندی ایک جرم ہے۔"

"کیا ہر شخص کا یہی نظریہ ہوتا ہے؟"

"ہونا تو چاہیے۔ اگر سب اِس پر عمل کرنے لگیں تو ایک مثالی سماج تخلیق ہو سکتا ہے۔"

"آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اگر میری بنیادی ضرورتیں بآسانی پوری ہو جاتی ہیں تو دوسروں کو اُن کا حق دینا میرا فرض ہے۔"

"آپ طلباء میں یہ جذبہ پیدا کر سکیں گی؟"

"کوشش ضرور کروں گی۔"

"اِس کے لئے آپ کو خود ایک مثالی کردار بننا پڑے گا۔"

اور پھر ایسی باتوں کے بعد انٹرویو ختم ہو گیا۔ وہ بہت خوش تھیں۔ [illegible] سوال کا معقول جواب دیا تھا۔ انھیں اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔



خواہ مخواہ نروس ہو رہی تھی۔ چند الفاظ کے استعمال اور اعلیٰ درجہ کے اخلاق کی نمائش نے ممبروں کو بہت متاثر کیا جس میں اُن کے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ چلتے وقت اُنھوں نے دیکھا کہ پروفیسر کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ اِس کا مطلب وہ خوب سمجھتی تھیں۔ دراصل اُن میں انٹرویو کے تاثر کا عکس صاف جھلک رہا تھا ــــ اور وہ Select کر لی گئیں۔

مسز نغمی یہیں تک سوچ پائی تھیں کہ بس ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ ڈرائیور نے سڑک پر ایک بھکارن کو بچانے کے لئے بہت بڑی Risk لی تھی۔ وہ بھی گرتے گرتے بچیں۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی کسی لڑکی نے پشت میں Road پر رکھے اُن کے ہاتھ کا سہارا لے کر اپنے آپ کو گرنے سے بچا لیا تھا۔ اُنھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور سوچنے لگیں۔ اُنھوں نے اُسے کہیں دیکھا تھا ــــ مگر کہاں؟ کچھ یاد نہ آیا ــــ! اور پھر ایک دم جیسے اُن کی یادداشت نے اُسے پہچان لیا۔ وہ اُن کے ساتھ انٹرویو دینے والے اُمیدواروں میں تھی۔ اُنھوں نے سوچا، اُس سے پوچھیں، Select ہوئی یا نہیں۔ مگر پھر جلد ہی اُن کا ذہن اپنے خوش آئند مستقبل کی حسین دھنک کے رنگوں میں گم ہو گیا ــــ روپے کی ریل پیل ہو گئی، بینک بیلنس بڑھنے لگا، بنگلہ تعمیر ہو گیا اور پورچ میں بالکل نئے ماڈل کی پسندیدہ کار آ گئی ــــ اُن کی سوچوں کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ پُشت کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کسی کے جواب میں کہہ رہی تھی۔

"بالکل ویسا تو اچھا رہا۔ میں نے سوالوں کے جواب بھی بہت اچھے دیئے۔ مگر .... اتنے میں ایک درمیانی اسٹاپ آگیا۔ لوگ سیٹ حاصل کرنے کے لئے کیو بنائے کھڑے تھے۔ مگر بس میں صرف ایک مسافر کی گنجائش تھی۔ کیو میں اگلے آدمی کے پیچھے ایک کمزور سا شخص کھڑا کانپ رہا تھا۔ اس نے خود کو پیچھے دھکیل کر اسے بس پر چڑھ جانے دیا۔ مسز نغمی کو اس سے ہمدردی ہوگئی۔ کنڈکٹر نے بھی سیٹ سے اٹھ کر اسے اپنی جگہ بٹھا دیا ——— اور اگلا شخص پھر کیو میں بس کا انتظار کرنے لگا ——— مسز نغمی پھر پیچھے سے ابھرنے والی سرگوشیوں پر متوجہ ہوگئیں۔ لڑکی کہہ رہی تھی

"ابھی کالج جا رہی ہوں۔ چھوٹی بہن کی فیس داخل کرنی ہے۔ ورنہ اس کا نام کٹ جائے گا۔ وہاں سے ہسپتال جاؤں گی!"

"کس لئے؟"

"پاپا کی دوا لانا ہے، ممی پہلے ہی سینی ٹوریم میں داخل ہیں۔ بھائی بہنوں کی ذمہ داری مجھی پر ہے۔ سب سے بڑی ہوں نا!"

"تم نے کہیں اور ملازمت کیوں نہ کرلی؟"

"اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں۔ کوشش تو ہر جگہ کر چکی ہوں۔ مگر بدنصیبی کہ ضرورت مند ہونے کے باوجود کامیاب نہیں ہوئی ——— اور دوسرے ——— وہ ہیں کہ ——— بے ضرورت بھی ملازمتیں ان کے قدم چومتی ہیں ——— "

بس کالج کی عمارت کے سامنے ٹھہر چکی تھی۔ مسز نغمی کا چہرہ کھل اٹھا۔ کل تک وہ اسی جگہ ایک طالبہ بن کر آتی رہی تھیں۔ مگر آج وہ ایک باوقار لکچرار کی حیثیت سے عمارت میں داخل ہو رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے متانت اور سنجیدگی نمایاں تھی۔ ہونٹوں پر ہمیشہ کی طرح ایک خوبصورت سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ جس سے ان کے دلی جذبات کی ترجمانی ہو رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے کالج کے دفتر تک چلی گئیں۔ سب نے انھیں خوش آمدید کہا اور تقرری پر مبارکباد دی۔

"آپ آگئیں مسز نغمی!" ہیڈ کلرک پروفیسر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یس سر!"

"میں آپ ہی کے لئے ٹھہرا ہوا ہوں اب تک۔ کلاسز تو کب کے ختم ہو چکے۔"

"تھینک یو سر!"

"پرنسپل صاحب آگئے ہیں۔ فوراً ان میں جوائن کر لیجئے۔ تاکہ نئے ٹائم ٹیبل میں آپ کی سہولت کے پیش نظر .... کا تعین ہو سکے۔"

"ویری گڈ سر!" کہتی ہوئی مسز نغمی نے کلرک کے دیئے ہوئے کاغذ پر قلم کو حرکت دی اور پرنسپل کے چیمبر میں داخل ہوگئیں۔

"گڈ مارننگ سر!"

"آیئے مسز نغمی گڈ مارننگ۔ نئی پوسٹ مبارک ہو۔"

"تھینک یو سر!"

"کیا جوائننگ رپورٹ لائی ہیں؟"

جواب میں مسز نغمی نے کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا۔ پرنسپل نے عینک درست کر کے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پڑھا۔ لکھا تھا۔

"چند وجوہ کی بنا پر میں ملازمت کرنے سے قاصر ہوں۔"

"یہ کیا مسز نغمی؟" پرنسپل کی گرج دار آواز گونجی۔

مگر مسز نغمی ویٹنگ لسٹ کے تصور میں بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے لمبے کیو کی طرف چل دیں ———!!

اضطرابِ تمنّا

رشی پٹیالوی

تیرِ ادا کا سحر ذرا آزمائیے
پردہ اُٹھا کے ہوش پہ پردہ گرائیے
پھر کوئی دلفریب کرشمہ دکھائیے
آنکھوں میں آ گئے ہیں تو دل میں بھی آئیے

سجدے میں جھک گئی ہے جو اُٹھتی نہیں جبیں
میں اور عرضِ حال کی جرأت؟ نہیں! نہیں!!
کچھ آپ ہی دکھائیے شانِ کرم کہیں!
کس منہ سے میں کہوں مری بگڑی بنائیے

تھا جس کے جور پر بھی گماں التفات کا
دل لے کے دے گیا ہے جو اک دردِ لا دوا
اے سوزِ اضطرابِ تمنا! ذرا بتا
یاد اس کو کیجیے کہ اُسے بھول جائیے؟

آنے نہ پائے حرفِ محبت کی آن پر
الزام کیوں دھرے کوئی اُلفت کی شان پر
عشقِ و وفا کی راہ میں بن جائے جان پر
پھر بھی زبان پہ حرفِ شکایت نہ لائیے

ہوتا ہے دل کا خون جو ہوتی ہے جستجو
سینے سے آہ بن کے نکلتی ہے آرزو
یا چھوڑ دیجیے تمنا کے رنگ و بو
یا گل کے ساتھ خار کا بھی غم اُٹھائیے

لطفِ سکوں کے نام کو ترسے گی زندگی
دل آئے گا کسی پہ تو جائے گی جان بھی
کچھ اور کہہ رہا ہے ہواؤں کا رُخ رشی
کچھ سوچ کر چراغِ محبت جلائیے

رشی پٹیالوی

غزل

سید حباب ترمذی

زخمِ نو دل پہ کھا رہے ہیں ہم
اور پھر مسکرا رہے ہیں ہم

ہر نفس عطر بیز ہے اپنا
اُن کی محفل سے آ رہے ہیں ہم

آ کے دل میں محبتوں کے چراغ
جانے کب سے جلا رہے ہیں ہم

تیز تر کیوں ہیں دھڑکنیں دل کی
کیا اُنھیں یاد آ رہے ہیں ہم

حُسن کے جلوہ ہائے رنگیں سے
دل کی محفل سجا رہے ہیں ہم

خاک ہو کر رہِ محبت میں
سارے عالم پہ چھا رہے ہیں ہم

آج تھوڑی سی پی کے دیکھیں گے
مدتوں پارسا رہے ہیں ہم

برق سے رسم و راہ رکھی ہے
پھر نشیمن بنا رہے ہیں ہم

دوست تو دوست دشمنوں کے بھی
وقت پر کام آ رہے ہیں ہم

پردۂ شعر میں کسی کو حبابؔ
آپ بیتی سنا رہے ہیں ہم

سید حباب ترمذی

"ہمدم" اور "راجپوت گزٹ" کے ایڈیٹر تھے۔ وہ جب یاد کرتے جب انھوں نے لاہور سے اپنا مزاحیہ اخبار "گگڑوں کوں" جاری کیا تھا۔ اُس دور کی سرگزشت بیان کرتے جب وہ لاہور میں "اردو مرکز" سے وابستہ تھے بڑے دلکش انداز میں بڑے بڑے مشاعروں، ادبی معرکوں اور یاس یگانہ۔ تاجور نجیب آبادی جگر مرادآبادی۔ حفیظ جالندھری۔ اختر شیرانی۔ خوشتر گرامی اور نہ جانے کتنے مشہور شاعروں۔ ادیبوں اور اخبار نویسوں سے اپنی صحبتوں کا ذکر کرتے اور اپنے وہ اشعار سناتے جو انہوں نے میرے پیدا ہونے یا ہوش سنبھالنے سے پہلے کہے تھے۔ اِس روپ میں دیکھ کر مجھے اُن پر بڑا پیار آتا اور پیار کے ساتھ یہ سوچ کر ترس بھی آتا کہ اُن کا خوب صورت ذہن اِس گندے ماحول میں تیزی سے مرجھایا جا رہا ہے اور میرا دل بری طرح کڑھتا کہ آخر وہ اِس غلیظ ماحول سے کنارہ کشی کیوں اختیار نہیں کر لیتے بڑے اشتیاق سے اُن کی باتیں سنتے سنتے جب اچانک میری زبان سے نکل جاتا ——

"بابو جی! آپ یہاں کیوں پھنسے ہوئے ہیں۔ لاہور کے کسی اچھے سے اخبار میں نوکری کیوں نہیں کر لیتے؟"

"ٹھیک کہتے ہو" وہ بے تامل میری بات کی تائید کر دیتے۔ لیکن جب صبح ہوتی تو جیسے سب کچھ بھول جاتے۔ معمول کے مطابق دفتر میں جا کر لکھن سنگھ کی فرمائشوں کی تکمیل کرتے ہوئے ریاستوں کے نوابوں اور راجاؤں کو خوشامدانہ خطوط لکھتے اور ان کی تعریف و توصیف میں مضامین نظم و نثر تحریر کرنے میں منہمک ہو جاتے۔ لکھن سنگھ بظاہر والد کا بہت احترام کرتا تھا۔ یہ والد ہی تھے جو اُس کے سامنے بیٹھ کر سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہتے تھے اور بسا اوقات سگریٹ کی راکھ لکھن سنگھ کے لباس تک جا پہنچتی تھی لیکن جلد ہی مجھے محسوس ہونے لگا کہ والد نے اپنے آپ کو شراب سے زیادہ لکھن سنگھ کو سونپ دیا ہے۔ لکھن سنگھ نے شاید کسی غیبی طاقت سے والد کی پوری شخصیت کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اُس کی رضا اور خوشنودی کے خلاف کوئی بات کہنے کی والد میں جرأت ہی نہ تھی۔ حالانکہ والد کے زمانۂ طالب علمی کے معلم حضرت جوش ملسیانی کے بیان کے مطابق والد فطرتاً بے باک اور حاضر جواب تھے۔

لیکن والد کی فطری بے باکی اور حاضر جوابی لکھن سنگھ نے جیسے اپنے جادو سے بزدلی اور بے بسی میں منتقل کر دی تھی اور اپنی بزدلی اور بے بسی کا صحیح تجزیہ کرنے کی بجائے وہ اُلٹا دنیا کی ریاکاری کے شکوہ گزار تھے چنانچہ کہا کرتے تھے ——

دین نہیں ایمان نہیں ہے چوروں کی سردار ہے دُنیا
اِس دُنیا سے بچ کر رہیئے درد بڑی مکّار ہے دُنیا

اور اِس مکار دنیا کے سردار لکھن سنگھ سے بچ کر رہنے کی بجائے وہ اِس کے باقاعدہ تنخواہ دار ملازم تھے۔

والد کی باتیں سُن سُن کر ہی مجھے اُردو شعر و ادب سے لگاؤ ہو گیا۔ والد نے بھی اُس زمانے میں اِس لگاؤ کی نشوونما میں میری خاص معاونت کی۔ اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد جب کبھی میں اُن کے دفتر میں جاتا تو وہ بچوں کے بڑے دیدہ زیب باتصویر پرچے جو اُن کے اخبار کے تبادلے میں موصول ہوا کرتے تھے مجھے پڑھنے کے لئے دے دیتے۔ عام بات چیت میں بھی اگر میں اُردو کا کوئی غلط جملہ بول دیتا تو وہ اُسی لمحہ میری اصلاح کر دیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار میں نے باتوں باتوں میں کہیں کہہ دیا "آج کی اخبار ابھی نہیں آئی"

"اخبار مونث نہیں مذکر ہے" والد نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

اُس وقت مجھے والد کی یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ جب خبر مونث ہے تو اخبار مونث کیوں نہیں۔ میں نے شوخیٔ طفلانہ سے کام لیتے ہوئے مطالبہ کیا "کوئی سند دیجئے!"

والد نے چند لمحوں تک سوچنے کے بعد کہا کسی استاد کا شعر تو اِس وقت یاد نہیں آ رہا اور پھر خود ہی فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا ؎

دشمن کی موت پر وہ جنازہ کے ساتھ تھے
اے دوست! آج کا کوئی اخبار دیکھنا

اُن دنوں والد اپنے اخبار میں ایک مزاحیہ کالم "تازیانے" کے عنوان سے بھی لکھا کرتے تھے جو خاص طور پر مجھے بہت پسند آتا تھا۔ انہیں ایام میں مولانا حسرت موہانی حج کر کے جب واپس آئے تو والد نے اُس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد یہ شعر بھی "تازیانے" میں لکھا تھا ؎

حج ہو گیا تو مل گئیں دنیا کی نعمتیں
حسرت کے دل میں اب کوئی حسرت نہیں رہی

لیکن جلد ہی اُن کی خوش مذاقی کی یہ ٹمٹماتی ہوئی جوت بھی بجھ گئی یعنی وہ اب تو مکمل طور سے اپنے بال بچوں بلکہ اپنے آپ سے بھی جیسے کٹ کر رہ گئے۔ اُن کے اِس رویے نے مجھے اُن سے قطعی مایوس کر دیا تھا اور گھر کی ناموافق فضا مجھ سے میری زندگی کا یہ سب سے پہلا شعر بھی کہلوا چکی تھی کہ ؎



؎ نہ ماں اپنی نہ باپ اپنا
ہے بندہ خود ہی آپ اپنا

میں اُن دنوں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ ایک دن اچانک خلافِ توقع میری دلی مُراد بر آئی۔ والد کے ذہن کی راکھ میں بیباکی کی کوئی چنگاری نہ جانے کیونکر باقی رہ گئی۔ وہ لکھمن سنگھ سے کچھ ایسے برہم ہوئے کہ اُنھوں نے نوکری چھوڑ دی۔ لکھمن سنگھ کے ہزار روکنے اور سمجھانے کے باوجود وہ ہم سب کو لے کر اپنے وطنِ مالوف نکودر میں آ گئے جہاں اُنہوں نے "مرکزِ تصنیف و تالیف" کے نام سے ایک اشاعتی ادارے کی طرح ڈالی اور اُس ادارے کی طرف سے اپنے اُستاد قبلہ جوشؔ ملسیانی کا مجموعۂ کلام "بادۂ سرجوش" شائع کیا۔ صرف اُنہیں ایام میں والد کو میں نے قدرے سنجیدگی سے ادبی سرگرمیوں کی طرف مائل دیکھا۔ اُنھیں دنوں ہوشیار پور میں "بزمِ گرامی" کا سالانہ طرحی مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ دو طرحیں تھیں ؎

کوئی حسرت ہے نہ ہے کوئی تمنا دل میں (تمنا قافیہ)

اور ؎

بس خوں ٹپک پڑا انکھ انتظار سے (انتظار قافیہ)

اُس مشاعرے میں والد کے ساتھ میں بھی شاعر کی حیثیت سے مدعو تھا۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں بطورِ شاعر میں شریک ہوا۔ میں نے دوسری طرح میں چند ٹوٹے پھوٹے اشعار کہے تھے اور یہ مطلع مجھے عرشؔ ملسیانی نے کہہ کر دیا تھا ؎

تُو دور کیوں رہی ہے دلِ داغدار سے
پوچھے یہ جا کے کوئی نسیمِ بہار سے

والد نے بھی اِسی زمین میں غزل کہی تھی۔ میں نے پہلی بار اُنہیں کسی مشاعرے میں سُنا تھا۔ وہ تحت اللفظ پڑھتے تھے بڑے جلال، طمطراق اور اعتماد کے ساتھ! جس کا اُن کی عملی زندگی میں مجھے تو ہمیشہ فقدان ہی نظر آیا۔ والد چونکہ مزاجاً غیر دنیادار اور غیر کاروباری قسم کے انسان واقع ہوئے تھے اِس لئے جوشؔ صاحب کا مجموعۂ کلام فروخت ہو جانے کے باوجود یہ اشاعتی ادارہ مالی اعتبار سے اُن کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا اور وہ یہ کاروبار چھوڑ چھاڑ کر نکودر سے کپورتھلہ چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے اپنے دیرینہ دوست پنڈت سوہن لال ساحرؔ کے اشتراک سے ایک نہایت پُر وقار ادبی ماہنامے "نویدِ مشرق" کا اجرا کیا۔ مے نوشی کے معاملے میں ساحرؔ صاحب بھی والد صاحب سے کم نہیں اِس لئے "نویدِ مشرق" ایک ہی جھلک دکھا کر اِن دونوں کی رندی کی نذر ہو گیا اور اُس کا دوسرا شمارہ شائع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اُس کے بعد کپورتھلہ ہی میں وہاں کے مزاحیہ شاعر بھورام پاگلؔ کو والد نے ایک ماہنامہ شائع کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ یہ ماہنامہ "غریب" کے نام سے شائع ہوا جس سے والد زیادہ دنوں تک وابستہ نہ رہ سکے کیونکہ "غریب" اُن کی غریبی کا علاج کرنے کا اہل نہ تھا۔ والد کپورتھلہ میں تھے۔ میں نکودر کے ہائی اسکول میں پڑھ رہا تھا اور ہمارے گھر میں شدید بدحالی کا دَور دورہ تھا۔ اِس بدحالی میں ہمارے نہایت قریبی رشتہ داروں نے بھی ہم سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اِس بدحالی کو والد بھی کچھ کم شدت سے محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اُنہیں دنوں اُنہوں نے ایک نظم "مفلس کا خطاب اپنے بچوں سے" کہی جس کے یہ شعر آج بھی میرے حافظے میں ایک امانت کی طرح محفوظ ہیں ——

کیا اب بھی دُودھ سے نفرت ہے کیا اب بھی پھل ٹُھکراتے ہو
کیا اب بھی لباسِ کہنہ سے اے بچو! تم شرماتے ہو
کیا اب بھی بھگتو نوکر کی خدمات میسر ہیں تم کو!
افسانے عیش و عشرت کے کیا اب بھی ازبر ہیں تم کو
تم خوار سمجھتے ہو اپنا کیا اب بھی رشتہ داروں کو

قسمت کے معنی کب پوچھتے ہیں بچو! افلاس کے مارول کو
تم جن کو اپنا سمجھتے ہو انسان نہیں حیوان ہیں وہ
خوں خوار درندوں سے بڑھ کر انسان نما شیطان ہیں وہ
وہ اپنی غرض کے بندے ہیں وہ رحم و مروت کیا جانیں
افلاس کے معنی کیوں سمجھیں ایثار کی وقعت کیا جانیں
کچھ مانگ کر اُن سے اے بچو! مجھ کو نہ کہیں رُسوا کرنا
دُکھ جان پر اپنی سہہ لینا منظور نہ ہرگز وا کرنا
یہ وقت بدلنے والا ہے قسمت کے مارو صبر کرو
کچھ اور سہو یہ رنج و الم کچھ دل پر اپنے جبر کرو

والد کا وجود مکھن سنگھ کے لئے ایک ٹکسال سے کم نہ تھا۔ جب انتہائی تلاش کے باوجود اُسے والد کا نعم البدل نہ مل سکا تو وہ برابر انھیں پھر "ترقیق" اخبار سے وابستہ ہونے کی پیش کش کرتا رہا۔ اقتصادی پریشانیوں سے تنگ آکر بالآخر والد نے مکھن سنگھ کی پیش کش منظور کر لی۔ اب سوچتا ہوں کہ والد پست قامت تو قدرت کی طرف سے تھے لیکن مکھن سنگھ کی کرامت نے اُنہیں پست ہمت بھی بنا دیا تھا۔ اِس حد تک پست ہمت کہ اُن کی آرام طلب علمی لیاقت اور مکھن سنگھ کی ان پڑھ فراست لازم و ملزوم ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہم سب لوگ پھر کوٹ رادھا کشن چلے گئے۔ اُسی گھُٹے گھُٹے متعفن ماحول میں جہاں مجھے اپنا دم گھُٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہاں آکر والد کے ذہن و دماغ میں ادبیت کا جو شعلہ ذرا سا بھڑکنے لگا تھا پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔ مے نوشی کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ وہ صرف اخبار کی اشد ضرورت کے وقت شعر کہتے جو عموماً کسی والیٔ ریاست کے قصیدے پر مشتمل ہوتے اور اُس قصیدے کے اکثر و بیشتر مصرع بھی کسی پُرانے کہے ہوئے قصیدے کی بازگشت ہوتے یا اُس زمانے میں سونگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے لئے انگریزی سرکار کے حق میں جنگی پروپیگنڈے کی نظمیں کہتے۔ اُس ڈیپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر جنرل حفیظ جالندھری اور صوبۂ پنجاب کے ناظمِ اعلیٰ پنڈت ہری چند اختر تھے۔ یہ دونوں اصحاب والد کے قدیمی اور بے تکلف دوست تھے اور اس بہانے والد کی کچھ مالی معاونت کرنا چاہتے تھے۔ والد نے اُس ڈیپارٹمنٹ کے لئے متعدد جنگی نظمیں کہیں جن میں سے بعض بعد میں "وطن کے گیت" کے نام سے دو کتابچوں کی صورت میں بھی شائع ہوئیں۔ اُن نظموں میں کوئی نظم مجھے یاد نہیں ہے۔ وہ یاد رکھنے کے قابل بھی نہ تھیں۔ البتہ اِس سلسلے میں اُن کے کہے ہوئے تین دوہے نہ جانے کیوں کر ابھی تک مجھے بھول نہ سکے ؎

معرکے رن سے پیٹھ دکھا کے بھاگ گیا رومیل
ٹینک، لاریاں اور طیارے پڑے رہے بن تیل

مسولینی سے کہتی ہے یہ افریقہ کی ریت
اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

ہٹلر بھاگا، گوئرنگ بھاگا، بھاگا سین ٹراپ
گوبلز اپنے گھر میں رہ کر کرتا ہے ودلاپ

میں بہت کوشش کرتا تھا کہ وہ سنجیدگی سے پھر شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوں لیکن اِس کے لئے اُن کا ذہن آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔ میرا اصرار جب بہت بڑھتا تو محض میرا دل رکھنے کے لئے وہ دو چار شعر کہہ دیتے جو بالعموم اُن کی دردمندی، قنوطیت اور پسپائیت کے ترجمان ہوتے۔ اپنا کلام محفوظ رکھنے کے وہ عادی ہی نہ تھے۔ اِس لئے اُن شعروں کا ریکارڈ کہیں نہیں ہے۔

جلد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ والد کی جھولی میں اپنے ماضی کی یادوں اور کارناموں کے سوا اب کچھ نہیں ہے۔ حال اور مستقبل کی ہر فکر سے وہ بے نیاز ہیں۔ اسی لئے اُنہوں نے اپنی ناکام زندگی پر بظاہر حد تک بے نیازی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ میں اُن کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور پڑھنے لکھنے کا شوق بھی مجھے دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت زیادہ تھا لیکن اب اُنھیں میری تعلیم کی بھی کچھ زیادہ پروا نہ تھی۔ چنانچہ کوٹ رادھا کشن کے مڈل اسکول میں جب میں نے آٹھویں جماعت کا امتحان دیا تو امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی ایک دن میری عدم موجودگی میں اُنہوں نے میری درسی کتابیں آدھی قیمت میں بیچ کر اُس رقم کی شراب پی لی۔ جب میں مڈل میں کامیاب ہو گیا تو اُنہوں نے اپنے ایک دوست کا سفارشی خط دلا کر مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں (ضلع لاہور) میں داخل کرا دیا۔ اسکول میں میری فیس معاف تھی۔ وہاں میں اسکول کے ہوسٹل ہی میں رہتا تھا اور غالباً ہوسٹل کے اخراجات کے سلسلے میں بھی مجھے اسکول کی طرف سے کچھ مراعات حاصل تھیں۔ اسکول کے باذوق اور انتہائی شریف النفس ہیڈ ماسٹر [illegible]

دوست کے دوست تھے۔ میری ذہانت اور ادبی شوق سے بہت جلد غیر معمولی طور پر متاثر ہوگئے۔ یہ انہیں کی شفقت اور التفات کا نتیجہ تھا کہ میں نے اپنی زندگی کے یہ دو سال نہایت امن و سکون کے ساتھ بسر کرلئے ورنہ میں طبعاً اِس حد تک جذباتی اور حساس تھا کہ وہاں احساسِ کمتری کا شکار بھی ہوکر رہ سکتا تھا کیونکہ میں مالی طور پر اتنا بدحال تھا کہ والدین کی موجودگی میں بھی یتیم دکھائی دیتا تھا۔

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد مجھے پھر کوٹ رادھاکشن آنا پڑا۔ گھر کا ماحول پہلے سے کہیں زیادہ تلخ اور ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ والد کی شراب نوشی اُس تلخی میں برابر اضافہ کر رہی تھی۔ والدہ مخبوط الحواس اور والد شرابی اور ہم ماں باپ کے تغافل کا شکار بہن بھائی معصومیت کی بجائے مظلومیت کے پیکر نظر آتے تھے لیکن مکھن سنگھ کا معیارِ حیات پہلے سے بھی بلند ہو چکا تھا۔ اُس کے بچوں کو عیش و عشرت کے تمام سامان میسر تھے اور وہ شہزادوں کی طرح دن گزار رہے تھے۔ یہ تضاد ایک زہریلے سانپ کی طرح میرے ذہن و شعور کو ڈسنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے احساسات میں جیسے زہر گھل گیا۔ والد پر ترس کی جگہ اب مجھے غصہ آنے لگا اور مکھن سنگھ کے علاوہ تمام طالبانِ ریاست سے بھی بے حد نفرت ہوگئی اور اس بات پر بھی شرم آنے لگی کہ والد نے ایسے خود فروش کے ذلیل اخبار کے نام پر میرا نام رکھا ہوا ہے۔ میں نے اُس ماحول سے بغاوت کر دی اور ہرچہ بادا باد کا نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے میں کوٹ رادھاکشن سے بھاگ کر لاہور آگیا۔ زندگی کی جدوجہد کے میدان میں کسی سہارے اور تجربے کے بغیر یوں اندھا دھند کودنا مجھے بہت مہنگا پڑا۔ صحت خراب ہوگئی۔ تعلیم ادھوری رہ گئی اور فیملی سسٹم کے اثرات سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوکر رہ گیا۔ لیکن اُس آوارگی نے میری خود اعتمادی کو بھی پروان چڑھایا۔ زندگی کی سنگین حقیقتوں کو نہایت قریب سے دیکھنے کی وجہ سے میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ آگے نکل گیا۔ جابجا ٹھوکریں کھا کر میں جسمانی طور پر اذیت محسوس کرتا تھا لیکن روحانی اعتبار سے مجھے آسودگی حاصل تھی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ میری یہ فراریت والد کی فراریت سے مختلف بلکہ اُس کے برعکس مثبت اور صحت مند ہے۔ میں نے اُس دوران میں چینی کے ایک ڈیپو ہولڈر کے ہاں نوکری کی۔ اخبارات بیچے اور کالجوں کے بعض طالب علموں کو اُن کے ناموں سے معاوضہ لے کر غزلیں تک لکھ کر دیں۔

چند ماہ بعد جب میٹرک کا نتیجہ شائع ہوا اور میں امتیازی طور پر کامیاب ہوگیا تو میں نے لاہور چھاؤنی میں ملٹری کے ایک دفتر میں ملازمت کی درخواست دے دی اور راولپنڈی کے الیف۔ سی۔ ایم۔ اے کے دفتر میں میرا تقرر ہوگیا۔ کچھ مدت کے بعد میں نے راولپنڈی سے ڈوگرہ رجمنٹ جالندھر چھاؤنی کے دفتر میں اپنا تبادلہ کروالیا۔ اُن دنوں ایک مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے والد کوٹ رادھاکشن سے جالندھر آئے اور مجھ سے کسی قسم کی برہمی کا اظہار کرنے کی بجائے اُنہوں نے میری روش کو لائقِ ستائش قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہا کہ اچھا ہی ہوا کہ تم کوٹ رادھاکشن سے چلے آئے۔ اُس وقت میں نے انتہائی شدت سے محسوس کیا کہ وہ خود زندگی کی حرارت سے بالکل تہی ایک برف پارہ بن کر رہ گئے ہیں اور اُس کے برخلاف میری زندگی میں ایک سیمابی بے چینی تھی۔ اُسی بے چینی کی وجہ سے کسی ماحول میں بھی بہت دنوں تک رہنا میرے لئے محال ہو چکا تھا۔ چند مہینوں بعد میں اُس ملازمت سے مستعفی ہوکر پھر لاہور آگیا۔ چند چھوٹے موٹے اخبارات و رسائل سے منسلک ہونے کے بعد میں نے اُردو کے مشہور ماہنامہ "بیسویں صدی" کے ادارہ میں شمولیت کرلی۔ بعد میں جب حضرت خوشتر گرامی کو معلوم ہوا کہ میں اُن کے دیرینہ رفیق درد نکودری کا فرزند ہوں تو ایک دم خوشتر صاحب نے میرے مشاہرہ میں اتنا اضافہ کر دیا جس کا میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ ملازم سے زیادہ اپنے بیٹے کی طرح مجھ سے برتاؤ کرنے لگے۔ میرے قیام کے لئے بھی اُنہوں نے اپنی کوٹھی ہی میں مجھے جگہ دے دی اور اکثر و بیشتر کھانے پر بھی مدعو کرنے لگے۔ اُس دوران میں والد متعدد بار کوٹ رادھاکشن سے لاہور آکر مجھ سے ملتے رہے۔ اُسی زمانے میں ایک دفعہ جب وہ لاہور آئے تو میں نے اُنہیں بتایا کہ آپ کے دیرینہ دوست اختر شیرانی آج کل یہیں ہیں۔ چند دن ہوئے میں نے ایک مشاعرے میں اُنہیں دیکھا تھا۔ موہنی روڈ پر کسی ظفر صاحب کے ہاں رہتے ہیں۔ آپ چاہیں تو آپ کو وہاں لے چل سکتا ہوں۔ اچھا ہے مل لیجئے۔ یہ سُن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ جب دو پہر کے وقت ہم اختر صاحب کے یہاں پہنچے تو اختر صاحب اُس وقت بھی نشے میں دُھت تھے۔ لیکن اُس کیفیت میں بھی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ والد سے نہایت تپاک کے ساتھ ملنے کے بعد میری نظر سے ذرا دُور اُنہیں سیڑھیوں میں لے گئے۔ وہاں ٹھرے کی بوتل سے اُنہیں بھی پلائی اور خود بھی اور پی اور پینے کے بعد جب نشے ہی کے عالم میں اختر صاحب کی زبان سے نکلا ؎

یہ عالم عالمِ ہوش نہیں یہ عالم عالمِ مستی ہے

تو والد نے بھی اُسی عالمِ مستی میں شعر یوں مکمل کر دیا ؎

پینے کا نام ہی جینا ہے تُو پیتا جا تُو جیتا جا
یہ عالم عالمِ ہوش نہیں یہ عالم عالمِ مستی ہے

اختر صاحب نے جھوم جھوم کر جب اِس شعر کو بار بار پڑھا اور اصرار کیا کہ اِس زمین میں کچھ اور شعر بھی ہونے چاہئیں تو والد نے یہ دو شعر بھی وہیں کہے ؎

اے درد ہماری ہستی بھی کیا طرفہ تماشا ہستی ہے
ہے رات کو شغلِ مے نوشی اور صبح کو فاقہ مستی ہے
تخریب کا راز بھی مضمر ہے تعمیرِ جہاں میں اے واعظ!
کیوں میرے حالِ شکستہ پر یہ ظالم دنیا ہنستی ہے

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ وطن کے وقت میں لاہور میں تھا اور والد کوٹ رادھا کشن میں۔ ہم علیحدہ علیحدہ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ دو ایک مہینوں تک ہمیں ایک دوسرے کا کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر انہیں تلاش کرتے کرتے مجھے معلوم ہوا کہ وہ لکھن سنگھ کے ساتھ فیروزپور چھاؤنی میں پہنچ گئے ہیں۔ فیروزپور چھاؤنی میں والد کے علاوہ گھر کے باقی تمام افراد کو زندہ سلامت دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اگرچہ اُن کے حُلیے بالکل گداگروں کے سے ہو چکے تھے اور تن کے میلے کچیلے پھٹے پُرانے کپڑوں کے سوا اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا، تاہم انھیں لکھن سنگھ کے چنگل سے چھڑانے کا یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اِس لئے لکھن سنگھ کی مزاحمت کے باوجود میں گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ والد کو جالندھر لے آنے میں کامیاب ہو گیا۔

جالندھر میں ایک بار پھر میں نے سرکاری ملازمت کی اور امپلائمنٹ ایکسچینج کے دفتر میں کلرک بن گیا۔ والد نے پہلے تو ایک رشتہ دار کے اشتراک سے اپنا روزنامہ "بھارت" جاری کیا بعد ازاں لالہ جگت نارائن کے روزنامہ اخبار "ہند سماچار" میں ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ والد ایک مشاق اخبار نویس اور اعلےٰ پائے کے مترجم تو تھے لیکن اُن کا اپنا کوئی سیاسی نقطۂ نظر نہ تھا۔ وہ ایک ایسے صحافی تھے جو بوقتِ ضرورت ہر سیاسی نظریئے کے تحت ادارت کے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکتے تھے۔ "زمیندار" اخبار میں اگر وہ ٹوڈی تھے تو "ہند سماچار" سے متعلق ہونے کے بعد ایک دم کانگرسی بن گئے۔ کھدّر کے لباس کے علاوہ کچھ مدت تک گاندھی ٹوپی بھی پہنتے رہے اور جب لالہ جگت نارائن نے کانگرس چھوڑی تو وہ بھی اینٹی کانگرسی ہو گئے۔

"ہند سماچار" سے وابستہ ہو کر والد کی بے قاعدہ لااُبالی زندگی میں کسی قدر خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی۔ اُس ملازمت کے دوران میں انہوں نے بعض اہم سماجی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش بھی کی۔ سب سے پہلے مجھ سے چھوٹی میری بہن کی شادی کی۔ پھر میری زندگی میں توازن پیدا کرنے اور آوارگی ختم کرنے کے لئے میری خواہش کے خلاف میرے پاؤں میں بھی ازدواجی زنجیر ڈالی اور میرے بعد یکے بعد دیگرے میری دو اور چھوٹی بہنوں کی شادیاں کیں۔ میرے سب سے چھوٹے بھائی کو بی۔ اے تک تعلیم دلوائی۔ ہمارے گھر کے بگڑے ہوئے حالات اور بھی سنور جاتے اگر والد کی شراب نوشی حائل نہ ہو گئی ہوتی۔ اُن کی مے نوشی کا براہِ راست مجھ پر نہایت مہلک اثر پڑا۔ میں اکثر سوچتا ہوں، اگر میرے والد بلانوش نہ ہوتے۔ میری پرورش ٹھیک ڈھنگ سے ہوئی ہوتی۔ نوعمری ہی میں مجھے آزاد چھوڑنے کی بجائے اگر وہ ایک ذمّہ دار باپ کی طرح میری نگرانی اور سرپرستی کرتے تو شاید میں اِس بُری طرح اِس عادتِ بد کا شکار نہ ہوتا۔ میری رندانہ بے اعتدالیوں کے سلسلے میں والد بھی اپنے آپ کو قصور وار سمجھتے تھے چنانچہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو جب میرا چہل سالہ جشن منعقد کیا گیا اور میرے دوستوں نے میرے بارے میں مضامینِ نظم و نثر پر مشتمل ایک کتاب شائع کی تو اُس کتاب کا پہلا مضمون والد نے لکھا جس میں میری شراب نوشی کا تذکرہ کرتے ہوئے اُنہوں نے تسلیم کیا کہ شاد کی شراب نوشی کی ذمّہ داری زیادہ تر مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ بچپن ہی میں شراب کے چند قطرے سردار لکھن سنگھ جن کے پاس میں ملازم تھا اسے دے دیا کرتے تھے۔ لیکن جب ذرا گہرائی سے غور کرتا ہوں تو اِس ضمن میں زیادہ قصور وار وہ ماحول معلوم ہوتا ہے جس میں والد نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے بچّوں کے مستقبل کی عنان بھی لکھن سنگھ کے ہاتھ میں تھما دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ والد کا قصور ہے تو صرف اِتنا کہ وہ ضرورت سے زیادہ سادہ مزاج تھے۔ اِس ریاکار سماجی نظام کے بازار میں اپنی سادگی کی وجہ سے اُنہوں نے اپنے آپ کو بڑے سستے بھاؤ بیچ دیا اور جب اِس حد تک تن آسان ہو گئے کہ زندگی میں کچھ کرنے کا جذبہ ہی اُن میں نہ رہا تو اپنی ناقدری اور مسخ شُدہ شخصیت کے غم کو فراموش کرنے کے لئے شراب خانوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئے۔ لکھن سنگھ نے والد کی پُوری نفسیاتِ حیات کے دھارے کا رُخ ہی نہایت غلط سمت کو موڑ دیا تھا۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اُس گھناؤنے ماحول سے نکل کر بھی والد اُس کے مہلک اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ لکھن سنگھ فیروزپور چھاؤنی سے بٹھنڈہ چلا گیا۔ وہاں اُس نے کچھ مکان، دکانیں اور ایک پریس اپنے نام الاٹ کرانے کے بعد "ریاست" اخبار پھر جاری کر لیا لیکن اب نئے ہندوستان میں ریاستیں ختم ہو جانے کی وجہ سے یہ پُرانا دھندا اُسے کچھ زیادہ راس نہ آیا تاہم اُس نے والد سے رابطہ قائم رکھا اور کبھی کبھی جالندھر آ کر اُن سے اپنے اخبار کے لئے

مضامین وغیرہ لکھواتا رہا اور حقِ محنت کے طور پر تھوڑا بہت نذرانہ بھی پیش کرتا رہا اور اُن کے ساتھ پینا پلاتا بھی رہا یعنی دوسرے لفظوں میں لکھن سنگھ نے والد کی زندگی میں بے دلی کا جو بیج بویا تھا اُس کی آبیاری کرتا رہا۔

اُسی دَوران میں ایک بار چیمسفورڈ کلب نئی دہلی کے ایک مشاعرے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ سے کہہ کر میں نے والد کو بھی جالندھر سے مدعو کروایا اور مشاعرے میں جب اُنہیں شعر پڑھتے سُنا تو یہی محسوس کیا کہ اب اُن کے پڑھنے کے انداز میں بھی سامعین کو بے کیف کر دینے والی بے دلی ہے۔ مشاعرے سے اگلے روز میں اُنہیں حضرت خوشترؔ گرامی سے ملانے "بیسویں صدی" کے دفتر میں لے گیا۔ خوشترؔ صاحب نے بہت پُرتکلف دعوت دی اور والد کے گنجے سر کے بالوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا "دردؔ صاحب! آپ کے بال تو ابھی سیاہ ہیں لیکن میرے بال سفید ہو چکے ہیں!"

عینک کے شیشوں سے ڈھکی ہوئی والد کی آنکھوں میں ایک پھیکی سی مُسکراہٹ لہرائی جس کی تہہ میں وہی اُن کی مخصوص بے دلی تھی حالانکہ مجھے اُس وقت بے اختیار اُنہیں کا یہ شعر یاد آ رہا تھا ؎

آور دسیہ کاریٔ ما رُوب سیاہی

باشد کہ پیری بہ ہر کارِ خضابے

شراب خانہ خراب ہی کی وجہ سے چند سال پہلے والد اِس حد تک مضروب ہوئے کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے۔ میرا چھوٹا بھائی جو درگ (مدھیہ پردیش) میں ڈرائی کلیننگ کا کاروبار کرتا ہے اُنہیں اپنے ساتھ درگ لے گیا۔ وہاں چند مہینے کے بعد جب وہ چلنے پھرنے کے کچھ قابل ہوئے تو پھر جالندھر واپس آ گئے۔ اِس بار اُنہوں نے وہاں کے ایک جن سنگھی روزنامہ "پردیپ" میں ملازمت کر لی۔ اُس کے بعد پھر روزانہ "ہند سماچار" ہی میں آ گئے۔ لیکن نہ "پردیپ" میں وہ چیف ایڈیٹر تھے اور نہ اب کے "ہند سماچار" ہی میں اُنھیں یہ پوزیشن حاصل ہو سکی۔ تنخواہ تو شاید پہلے سے کچھ زیادہ تھی لیکن اُن کی حیثیت اب ایک عام مترجم کی سی تھی۔ صرف اِتنا امتیاز ضرور تھا کہ "ہذیانات" کے عنوان سے وہ ہر روز اخبار میں پہلے کی طرح چند نیم مزاحیہ شعر بھی لکھا کرتے تھے لیکن اب اُن شعروں میں پہلی سی بات بھی نہ ہوتی تھی۔ اُنہیں کچھ ایسا احساس ہو گیا تھا جیسے ہند سماچار میں اُن کی اب پہلی سی قدر و قیمت نہیں رہی۔ اپنی وضع قطع بھی اُنہوں نے بُری طرح بگاڑ لی تھی۔ ہفتوں تک نہ نہاتے نہ لباس تبدیل کرتے تھے بینائی بیحد کمزور ہو چکی تھی افسردہ ہڈیوں کا ایک نحیف و نزار ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے۔ اپنی بُجھی ہوئی زندگی میں عارضی اور لمحاتی رنگ و نُور پیدا کرنے کے لئے شراب کا آسرا لیتے لیکن شراب بھی اب اُن کی افسردگی کو اور گہرا کر دیتی۔ عموماً تنہا پیتے اور پینے کے بعد نہایت خاموشی کے ساتھ شراب خانے سے رکشا پر سوار ہو کر گھر آ جاتے۔ کئی کئی دن گھر میں بھی نہ آتے تھے۔ "ہند سماچار" کے دفتر ہی میں سو جایا کرتے تھے۔ اُن کی بے دلی اب انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اُسی دَوران میں ایک بار میں دہلی سے جالندھر گیا تو بڑی حسرت سے کہنے لگے "اب مجھ سے نوکری نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو آپ دہلی میں میرے پاس آ جائیے۔"

کچھ سوچنے کے بعد بولے "تمہاری سب سے چھوٹی بہن بی۔ اے پاس کر لے اور اُس کی شادی ہو جائے تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ چھوٹی بہن ابھی بی۔ اے ہی میں پڑھ رہی تھی کہ ۱۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کا وہ منحوس دن آیا جب وہ صبح گھر سے نکلے اور آج تک پلٹ کر نہ آئے! اِس حادثے کے کچھ دن بعد جب میں دہلی سے جالندھر پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ اٹھارہ ستمبر کی صبح کو اُن کی جیب میں سات آٹھ سو روپے کے نوٹ تھے اور اُنہوں نے اُس دن ایک دیسی شراب خانے میں شراب بھی پی تھی اور شراب خانے سے وہ نہ جانے کہاں چلے گئے۔

اُن کی پُراسرار گمشدگی کے بعد کچھ مہینوں تک میں نے اُنہیں ڈھونڈنے کی بے انتہا کوشش کی لیکن ہر مقام پر جب نامُرادی ہی سے دوچار ہونا پڑا تو میں نے بھی مایوسی کی شدّت میں شراب کا سہارا لینے کی موروثی حماقت کا ارتکاب کیا۔ بے تحاشہ پی۔ اِس حد تک بے تحاشہ کہ کسی وقت بھی میری موت کا حادثہ وقوع پذیر ہو سکتا تھا۔ شاید نیم شعوری طور پر میں چاہتا بھی یہی تھا اور آخر جب میں والد کی زندگی اور اپنی موت سے نااُمید ہو گیا تو الکوحل کا یہ طوفان بھی تھم گیا۔ خدا کرے یہ طوفان اب تھما ہی رہے ورنہ میری شدّت پسندی مجھے یقیناً لے ڈوبے گی اور یوں شراب کی وجہ سے ہمارے خاندان کی بربادی کے المیے کا آخری باب بھی مکمل ہو جائے گا۔

والد قدرتی موت سے اُٹھ جاتے تو شاید طبیعت پر جبر کر کے میں صبر بھی کر لیتا لیکن اِس صورتِ حال میں تو "سُلگتا" بنا ہی میرا مقدر ہو گیا ہے۔ والد کے جُدا ہونے کے بعد سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہزار اختلاف کے باوجود مجھے اُن سے نہایت گہرا لگاؤ تھا۔ میں اُن کے اندر خوابیدہ شاعر و ادیب کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی جو شعوری کوشش کرتا رہا وہ بھی اِسی لگاؤ کا نتیجہ تھی۔

میں آج تک یہی سمجھتا تھا کہ اپنی زندگی کی جدوجہد کے میدان میں جتنا بھی تھوڑا بہت دوڑا ہوں وہ اپنے اور صرف اپنے ہی بل بوتے پر دوڑا ہوں لیکن اب سمجھ رہا ہوں یہ محض میری خود فریبی تھی۔ ایسا سمجھ کر میں اپنی انا کو ایک جھوٹا سہارا دے رہا تھا۔ ورنہ اُن کی مفارقت کے بعد ایسا کیوں محسوس کرتا کہ میں اپاہج ہو کر رہ گیا ہوں اور اُن کی عدم موجودگی سے میری روح میں ویران مزاروں کی گھنی خاموشی کیوں سمٹ آتی۔

والد کی گمشدگی کی وجہ سے اگرچہ میں بھی اپنی والدہ کی طرح ذہنی طور پر ماؤف ہو چکا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دل و دماغ میں اندھیرے اور صرف اندھیرے کے سوا اب کچھ بھی تو نہیں تاہم اِس تاریکی میں اکثر اوقات اِس قسم کے سوالات بھی سانپوں کی طرح لہراتے پھنکارتے رہتے ہیں کہ کیا والد صاحب ابھی تک زندہ ہیں اور تارک الدنیا ہو گئے ہیں یا اپنی نظم "کاسۂ گدائی" گنگناتے ہوئے کہیں بھیک مانگ رہے ہیں یا زندگی سے ہار مان کر اُنہوں نے اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا یا کسی نے اُن کے رُوپے چھیننے کے لئے اُن کی زندگی بھی چھین لی یا اُنھیں پھر کوئی اور لکھن سنگھ مل گیا جو ذاتی مفاد اور استحصال کے لئے اُنہیں پھر کسی نئے کوٹ رادھا کشن میں لے گیا!۔

غزل

ساغر نظامی

اُس کے لب چُوم کے آئی ہے نسیمِ سحری
سنگ پاروں کو ہے صحرا میں دمِ نغمہ گری

سُن کے یہ خوش خبری موت کی حسرت ہے مجھے
کہ حسینوں کو عطا ہوگی مری نوحہ گری

نکتہ چیں کیوں ہے مری بے خبری پر دُنیا
میرے جینے کا سہارا ہے مری بے خبری

زندگی سے نیا پیمان وہاں میں نے کیا
کانپ اُٹھے تھے جہاں چارہ گر و چارہ گری

ہم سے پہلے تری آنکھوں میں کہاں تھی یہ کشش
ہم نے بخشی ہے تجھے دولتِ جادو نظری

بربط و نے میں یہ اعجاز کہاں نغموں کا
جو ترے جسم میں ہے معجزۂ نغمہ گری

اُٹھا اور اُٹھ کے پتہ غیر کا بتلا ہی دیا
مجھ سے دیکھی نہ گئی اُن کی پریشاں نظری

اُس نے گھبرا کے جو سینے پہ مرے ہات دھرا
بڑھ گئی اور مرے شوق کی آشفتہ سری

موسمِ گُل میں بھی پھولوں کا وہی عالم ہے
جیسے ہر شاخ پہ ہو کاسۂ دریوزہ گری

یہی ساقی یہی ساغر یہی نشہ یہی مے
اور کچھ اِس سے بھی بڑھ کر ہے مری بے خبری

ساغر نظامی

غزل

باداکرشن گوپال مغمومؔ بی۔اے

ہر غم کو اپنی زیست کا عُنواں کئے ہُوئے
ہم جی رہے ہیں موت کا ساماں کئے ہُوئے

آخر کو ہم نے عمرِ محبت گُزار دی
درماں کو درد، درد کو درماں کئے ہُوئے

یہ دِل اِنہیں کا ہے، یہ کلیجہ اِنہیں کا ہے
گُل ہنس رہے ہیں چاک گریباں کئے ہُوئے

نظّارہ کش ہُوں میں رُخِ محبُوب کا، مگر
اپنی نظر نظر کو نگہباں کئے ہُوئے

وُہ فتنۂ بہارِ مجسّم کب آئے گا؟
اِک اِک ادا کو برق بداماں کئے ہوئے

دُوری کے باوجُود جیُوں گا تو اِس طرح
تجھ کو قریبِ شاہ رگِ جاں کئے ہُوئے

تقدیسِ حسُن و عشق نہیں جن کے بس کی بات
پھرتے ہیں زخمِ دل کو نمایاں کئے ہُوئے

مِلتے ہیں دوست مجھ سے، مگر اِس ادا کے ساتھ
جیسے وُہ مجھ پہ ہوں کوئی اِحساں کئے ہُوئے!

مغمومؔ! آؤ! حسُن پرستی کا دَم بھریں
مُدّت ہوئی ہے مدحِ حسیناں کئے ہُوئے

باداکرشن گوپال مغموم

افسانہ

ڈگری

جسونت سنگھ وِردی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

الیف ۱۷، ارشد رشن پارک۔ موتی نگر۔ نئی دہلی نمبر ۱۵

برادرم خوشتر صاحب! خلوص و احترام

افسانہ نمبر کے لئے ایک خیال افروز افسانہ ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ یقین ہے میرے افسانہ "چاند کا سفر" کی طرح یہ افسانہ بھی پسند کیا جائے گا۔ "چاند کے سفر" کے سلسلہ میں ہند و پاک ہی سے نہیں دوسرے ممالک سے بھی بہت سے خطوط آئے۔ اِتنے زیادہ خطوط آئے کہ میں محوِ حیرت رہ گیا! میں نہیں کہہ سکتا اِس کا باعث میرے فن کی بلندی ہے یا "بیسویں صدی" کی عظمت!....

خلوص کیش ——— جسونت سنگھ وردی

★

دن یا تاریخ مجھے یاد نہیں۔ لیکن اگلی صبح میرے گھر کے باہر دروازے پر یہ نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی

"ڈاکٹر ایس ایس سرکاریا، ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی"

چڑھتے سورج کی دھوپ سے نیم پلیٹ چمک رہی تھی اور گلی سے گزرنے والا ہر آدمی لحہ بھر کے لئے رُک کر میرا نام پڑھتا اور پھر مُسکرا کے آگے بڑھ جاتا۔ میں چاہتا تھا کہ دُنیا کا ہر راہگیر یہ نیم پلیٹ پڑھ کر ہی آگے بڑھے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں کے پاس اِتنی فرصت ہی کہاں تھی؟

جب مجھے چوتھی بار بھی ایم۔ اے میں فیل کر دیا گیا تو میں نے اپنا نام روشن کرنے کے لئے یہ اسکیم بنائی تھی۔

جب میں نیم پلیٹ کو دیکھتا تو مجھے محسوس ہوتا میں بدلا ہوا انسان ہوں۔ ایک وہ تھا جو ایم۔ اے میں چار بار فیل ہوتا رہا تھا اور دوسرا وہ جو رات کی تاریکی کے بعد ہی ڈاکٹر سرکاریا ایم۔ اے پی ایچ ڈی بن گیا تھا! یہ ڈگری میں نے خود ہی اپنے آپ کو دی تھی!

جب بیوی نے میرے یہ حرکت دیکھی تو بولی "مجھے آپ کا یہ کام پسند نہیں!"

"کون سا؟"

"یہی جھوٹ موٹ کا ڈاکٹر بن جانا۔"

"تیرے خیال میں یہ گناہ ہے؟"

"ہاں!"

"ٹھیک ہے.... مگر۔ کون پیدا ہوا ہے جو گنا ہگار نہیں.... تُو وارث کی ہیر تو پڑھ لیتی؟"

"میں تو خود ہی ہیر ہوں۔ مجھے کسی "وارث" کی ہیر پڑھنے کی ضرورت نہیں!"

"پھر تو بحث ہی ختم ہو گئی!"

"کیسے؟"

"جب تُو اپنے آپ ہی ہیر بن سکتی ہے تو میں بھی ڈاکٹر بن سکتا ہوں.... اور تجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر بننے کے لئے کونسی محنت کرنی پڑتی ہے؟"

"محنت نہیں کرنی پڑتی؟ ——— لوگ کئی برس مطالعہ کرتے ہیں تب کہیں جا کر ڈاکٹر....."

"شاید تجھے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر ایم۔ این سنگھ نے خود ہی فرضی نام سے سو نظمیں قدیم زبان میں لکھ لیں اور اُسے اپنی تحقیق کہہ کر

ڈگری لے لی تھی ۔"

"آپ اُتنی ہی محنت کر لیں ؟"

"اب اُتنی محنت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک محنت کرتا رہوں گا۔ ڈاکٹر ودیارتھی جیسے لوگ سادھوؤں کے ڈیروں سے قدیم شاعری کے نسخے لاکر ڈگری لے جائیں گے ۔"

اندر باورچی خانہ میں ہیٹر پہ پڑا دُودھ اُبل رہا تھا۔ جلتے دودھ کی سوندھی سوندھی خوشبو سُونگھ کر میری بیوی باورچی خانہ کی طرف بھاگ گئی اور میں لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف ہو گیا۔

اب میں بڑا آدمی بن گیا تھا اور میری ذمہ داریاں کافی بڑھ گئی تھیں۔ مجھے بہت کچھ سوچنے سمجھنے، لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن میں نے اب طے کر لیا تھا کہ میں بہت کچھ پڑھ لکھ چکا ہوں اور میرے مطالعہ کے دِن کبھی ختم ہو گئے ہیں۔ میں کسی بھی شخص کو جس پر ادیب ہونے کا گمان ہو روک کر پوچھ سکتا ہوں۔ "کیوں بھئی دردی ؟ اب تم نے لکھنا چھوڑ دیا ہے ؟" اور وہ کوئی جواب نہ دے سکے گا۔ حالانکہ اُسے کہنا چاہئے۔ "ہاں! ڈاکٹر صاحب! جب سے آپ نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے!

شہر کی سڑکوں پر حسبِ معمول ہی آمد و رفت کی بھیڑ، بازاروں میں رونق اور چہروں پر شباب تھا —— آج مجھے سب کچھ بھلا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ میرے گھر کے سامنے سے گزرنے والے ہر شخص کی آنکھیں میرے نام کی ڈگریوں کے بوجھ سے جھکتی جا رہی تھیں اور میری گردن پہلے کی بہ نسبت چھ انچ اونچی ہو گئی تھی! —— میں بہت خوش تھا۔

لیکن ابھی میں پُورے طور پر خوش نہ ہوا تھا۔ جب اچانک مجھے خیال آیا کہ کوئی نہ کوئی صداقت پسند انسان دھرتی پر ضرور ہو گا جو میری اُستادی کا پردہ فاش کر دے گا۔ لیکن اگلے ہی لمحہ میں نے سوچا مجھے کون سا زندگی میں کسی کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے ؟ لوگ تلاش و تحقیق اُس وقت کرتے ہیں جب مقابلہ کا جذبہ پیدا ہو جائے اور میں کسی کا حق مارنا چاہوں۔ لیکن اب تو میں اِن پست باتوں سے بلند ہو کر عظیم انسان بن گیا ہوں! کسی کے ساتھ مقابلہ کے جذبہ کا سوال ہی نہیں اُٹھتا!

اچانک میری بیٹھک کے دروازہ پر دستک ہوئی اور محلے کے کچھ نوجوان لڑکوں کے غم گین چہرے نمودار ہوئے۔ آج تک یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ آج کے نوجوانوں کے چہرے غم گین کیوں ہیں ؟ اِن کے دلوں میں مایوسی کا زہر کیوں گھُلتا جا رہا ہے ؟

وہ غم گین نوجوان تین تھے لیکن معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تین نہیں بہت سے ہوں! سب کے سب نوجوان!

میں نے اُنھیں اندر آجانے کے لئے کہا۔ وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور میرے ساتھ ہی چٹائی پر بیٹھ گئے (اگلے مہینے صوفہ سیٹ ضرور لے آؤں گا۔ ورنہ لوگ مجھے ڈاکٹر ماننے سے انکار کر دیں گے! فریج بھی ضرور خرید دوں گا۔)

بیٹھتے ہی اُن میں سے ایک نے کہا۔

"آپ نے اِس بار پھر ایم اے کا امتحان نہیں دیا تھا ؟"

"اور فیل ہو گئے تھے ۔" دوسرے نے بات پُوری کی۔

"بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے!"

"پھر یہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کہاں سے لے آئے ہیں ؟"

"میں نے اپنی یونیورسٹی بنائی ہے!"

یہ بات سُن کر اُن کے چہروں پر خوشی کی ایک گلابی لہر دَوڑ گئی

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا ہے!" تینوں ایک ساتھ بول اُٹھے

ہمارے سامنے گوشہ میں کھڑے شیشے قدِ آدم آئینہ میں اُن کے ہیولے میرے ساتھ ہی منعکس ہو رہے تھے اور اُنکی نظریں بڑی سنجیدگی سے میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

پھر پہلا بولا "آپ کو معلوم ہے آج کل امتحان میں آدمی کی عقل نہیں پرکھی جاتی ۔"

"اچھی ڈگریاں صرف سفارشوں ہی سے ملتی ہیں ۔"

"یا پھر پیسے والے ہی ڈگری لے سکتے ہیں!"

"یا پھر پروفیسروں کے پاؤں پر تیل مالش کرنے والے ہی ڈگری پاتے ہیں۔ یا پروفیسروں کی بیویوں کا قُرب حاصل کرنے والے ہی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں ۔"

"آپ کی باتیں بالکل دُرست ہیں"!

"پھر ہمیں بھی کوئی راہ بتائیے! کیا کریں ؟ کئی برسوں سے بی۔ اے پاس نہ کر سکے ۔"

"بی۔ اے پاس ہونے پر کیا آپ کو ڈپٹی کمشنر کی کرسی پر بٹھا دیا

جائے گا۔" دل میں میں نے سوچا لیکن اُن سے کہا۔ "آپ بھی اپنی اپنی یونیورسٹی بنائیں۔"

"ہماری یونیورسٹی چل پڑے گی؟" اُنہوں نے بھولے پن سے پوچھا۔

"میں نے چلا ہی لی ہے!" میں نے آنکھیں موند کر کہا۔

"یہ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے!"

اُن کے جانے کے بعد ہوا بہت تیزی سے چلنے لگی تھی۔ اور ہوا کی سائیں سائیں نے سرگوشی میں مجھ سے کہا ـــــ "تیرے کارنامے کی افواہ سارے شہر میں پھیل گئی ہے!"

"افواہ کیا ہوتی ہے؟"

"یعنی شہرت!"

"پھر ٹھیک ہے!"

اُس دن میں نے پہلی بار ٹائی باندھی، اور داڑھی کو نکسو سے سنوارا۔

ابھی میں دوپہر کا کھانا کھا ہی رہا تھا کہ ڈاکیہ دو ایکسپریس تار دے گیا۔ یہ دونوں شہر کے دوسرے کنارے سے آئے تھے۔ ایک میں لکھا تھا:-

"آپ کے ڈاکٹر بننے کی خوشی میں میں پاگل ہو رہا ہوں! براہِ مہربانی جلدی سے میری مبارک باد قبول فرمائیں ـــــ کل جیت والیہ"

دوسرے تار میں لکھا تھا:-

"آپ اپنی یونیورسٹی سے بہت ہی سستے داموں میں ڈگریاں دیتے ہیں۔ براہِ کرم میٹرک سے لے کر پی ایچ ڈی تک۔ سبھی ڈگریاں وی۔ پی کر کے بھیج دیں۔ وی۔ پی جلد ہی چھڑا لی جائے گی ـــــ

نوٹ:- آپ کی یونیورسٹی کی ڈگری مجھے کالج کا پرنسپل بنا سکتی ہے؟

سریندر بترا"

ابھی میں یہ تار پڑھ ہی رہا تھا کہ باہر سے آوازوں کے طوفان گونجے ـــــ

"ہمیں بھی ڈگریاں دیں!"

"نہیں تو یونیورسٹی بند کریں!"

اُن کی آواز بڑی تیز۔ کرخت اور پُرجوش تھی۔ لیکن وہ اُکتائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میں نے باہر مُنہ نکالا تو وہ تمام خاموش ہو گئے۔ یہ اُن کی بزدلی کی نشانی تھی وہ میرے گھر کے باہر بے جان پتھروں کی طرح گرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ صرف آنکھوں کے جھپکنے سے زندگی کی دھڑکن کا احساس ہوتا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میرا جی چاہا پولیس کو بلا کر آج انھیں بتاؤں کہ آنسو گیس کا استعمال کیسے ہوتا ہے؟ لیکن اگلے لمحہ میں نے سب کے چہروں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ سب ہی کو ڈگریاں مل گئیں۔ لیکن ایک شرط ہے!"

ڈگریاں ملنے کے نام پر وہ سب ہی مُسکرا پڑے لیکن "شرط" کی بات سُن کر دوسرے ہی لمحہ مُرجھا گئے۔ خزاں زدہ پتّوں کی طرح تھرکتی آواز

قطعاتِ تاریخِ وفات

جنابِ نریش کمار شاد

قمر سنبھلی

(۱)

اُف اچانک جہانِ فانی سے
اے قمر شاد ہو گئے رُوپوش
فکرِ تاریخ تھی، ندا آئی
"آج شمعِ ادب ہوئی خاموش"
۱۳ ھ ۸۹

(۲)

دنیائے ادب نوحہ گر و گریہ کناں ہے
برداشت کریں کس طرح اللہ غمِ شاد
ہر اہلِ سخن اہلِ ادب محوِ فغاں ہے
"کس درجہ جگر سوز ہے یہ آہ غمِ شاد"
۱۹ ء ۶۹

(۳)

فرقتِ شاد سے ہر اہلِ سخن
آج ہے محوِ ماتم و فریاد
اے قمر لکھ دو مصرع تاریخ
"وائے داغِ جُدائی دے گئے شاد"
۱۳ ھ ۸۹

قمر سنبھلی

کانپی۔

"شرط کیا ہے ؟"

"اپنے بچپن کی تصویریں لے آئیں۔"

"کیوں ؟"

"کیونکہ کانٹوں کے مُنہ پیدائش ہی سے تیکھے ہوتے ہیں۔ میں پرکھ کروں گا، اور پھر۔۔۔"

"ٹھیک ہے !"

وہ جانے لگے تو میں نے پھر روک کر کہا ۔۔۔ "فی الحال آپ اپنے بزرگوں کے لئے ڈگریاں لے جایئے۔"

کچھ جا چکے تھے۔ لیکن باقی اُمید وار اشتیاق کے ساتھ مجھے دیکھنے لگے۔ یہ سب شہر کے بڑے آدمیوں کے بیٹے تھے۔ اُن میں سے ایک کا باپ سرحد پار سونا اور عورتیں پہنچا کر آدھا شہر خرید چکا تھا۔ اُسے میں نے "مہگدیش چند اسمگلر" کی ڈگری دے کر بھیج دیا۔ ایک دوسرے نوجوان کا باپ پولیس کے ساتھ مل کر جھوٹی گواہیاں دیتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے خلاف بھی جھوٹی گواہی دے چکا تھا۔ میں نے اُسے "ستھا سنگھ ٹُٹیا" کی ڈگری عطا کی۔ ایک دوسرے لڑکے کا باپ شہر کا لیڈر تھا اور ساری ساری رات مینا بازار میں گھومتا اور نازک اندام مجبور عورتوں کی کمائی کا دسواں حصّہ کھاتا اور اُنھیں "کھٹمل کی طرح کاٹتا رہتا تھا۔ اُسے میں نے "دِل مار کمار کھٹمل" کی ڈگری دے دی۔

جلوس نکالنے والوں کے اِس ہجوم میں دو لڑکیاں بھی تھیں جن کی مائیں کہاوت کے مطابق۔ شہر کی "مرن پہ دھان" تھیں۔ میں نے اُنھیں بھی ڈگری دینی چاہی تو وہ سب کی سب غائب ہوگئیں۔

ایک دو ایسے چہرے بھی تھے جن کے نقوش "شیکسپیر۔ دستووائسکی اور پریم چند سے ملتے جُلتے تھے" یہ ضرور ادیب بنیں گے! میں نے سوچا اور اِنھیں ڈگری کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اُن کے بزرگوں کو ڈگری دینا میں بھول ہی گیا۔

موسم بہت خوش گوار تھا اور دل میں گُدگُدانے والی ہوا چل رہی تھی۔ موسم کی شرارت سمجھئے یا وقت کی نزاکت۔ اب تک سارا ہجوم منتشر ہو چکا تھا اور میرے پاس بہت سی ڈگریاں باقی بچ گئی تھیں۔

لیکن ابھی تک میرے پاس وہ نوجوان نہیں آیا تھا جسے درحقیقت ڈگری کی ضرورت تھی اور جو حق دار بھی تھا۔ شاید اُسے ابھی تک احساس ہی نہ ہوا تھا کہ اُس کا حق دیا جا رہا ہے!

خیالات کے دُھند کو جھٹک کر جب میں نے نظر اُٹھائی تو ایک ماں میری دہلیز پر کھڑی تھی۔ "میرے حسّاس بیٹے کو اِس بار بھی ڈگری نہیں ملی اور اُس نے خودکشی کرلی۔"

اُس وقت میں نے سوچا میں شاید اِس لئے خودکشی نہ کرسکا کہ میری ماں زندہ نہیں ہے یا ۔۔۔ میں حسّاس نہیں ہوں۔

ابھی تک میں اِس کش مکش ہی میں تھا جب کہ شہر کا ایک محافظ میرے خلاف کورٹ کی ڈگری لے آیا!

میں نے اُس سے کہا۔ "ڈگریاں تو یونیورسٹی سے ملتی ہیں تو کورٹ سے ڈگری کیسے لے آیا ہے؟"

"کورٹ بھی ڈگریاں دیتا ہے!"

"اِس کا مطلب ہے کورٹ کی اپنی الگ یونیورسٹی ہے!"

"ہاں جی" اُس نے میری بات سمجھے بغیر کہا۔

"چلو پھر میں بھی کورٹ کو ڈگری دے دیتا ہوں۔"

"آپ ڈگری نہیں دے سکتے!"

"کیوں؟"

"آپ کا کوئی کورٹ نہیں!"

"ہم بھی کورٹ بنا لیتے ہیں!"

"کورٹ صرف حکومت ہی بناتی ہے۔"

"حکومت ہماری بھی تو ہے۔"

"ہاں! اُسی حکومت نے آپ کے خلاف ڈگری دی ہے کہ آپ غلط طریقوں سے ولیش۔ قوم اور عوام کو فریب دے رہے ہیں اور معزز شہریوں کے امن و امان کی زندگی میں خلل انداز ہو رہے ہیں۔"

"پھر؟"

"آپ کو بامشقت قید کی سزا ہوگی!"

ہوا پھر بہت زور سے چلنے لگی تھی اور شور و غل کرتے ہوئے میرے گھر کی دہلیز پر بہت سے معزز شہری جمع ہو گئے تھے۔ یہ سب وہی لوگ تھے جنھیں میں نے ڈگریاں بخشی تھیں۔ وہ بہت فکرمند معلوم ہو رہے تھے۔ کانپ بھی رہے تھے۔ لیکن میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ وہ ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کے ہار لئے ہوئے۔

تھے۔ وہ لوگ اس طرح میرے گھر کی طرف بڑھے آرہے تھے جیسے صبح کے وقت مندر کی طرف جا رہے ہوں۔

اُس وقت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پتھر کا بُت بن گیا ہوں۔

اِسس پتھر کے بُت کو ایک نے کہا۔ "آپ برہم گیانی (غیب داں) ہیں۔"

دوسرا۔ "اور ہم دُنیاوی انسان ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی دُنیاوی انسان ہوں اور بھرپور زندگی جینا چاہتا ہوں!"

"نہیں نہیں.... آپ دُنیا کے دھندوں میں دخل نہ دیجئے اس دُنیا کو یوں ہی رہنے دیجئے!"

"ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے!" ایک پُرزور آواز گونجی۔

"بالکل ہی ٹھیک!!" کئی آوازیں گونجیں۔

پھر وہ جلدی جلدی سے میرے گلے میں گلاب کے پھولوں کے ہار ڈالنے لگے اور اُن کی باسی خوشبو سے میری سانس گھٹنے لگی اور بولنا بھی مشکل ہو گیا بلکہ نا ممکن!

(پھر اُنہوں نے مجھے ڈگریاں دینے والے ایک ادارہ کا چانسلر بنا دیا!)

ماتمِ شاد

مہدی نظمی بی۔ اے

وہ شاد کہ اک پھول تھا گلزارِ سخن میں
بے کل جو سا گرمیٔ آغوشِ چمن میں

اٹھا ہے جواں فکر و تخیّل کا جنازہ
ماتم ہے بپا حلقۂ اربابِ سخن میں

جدت تھی خیالات میں، افکار میں وسعت
نُدرت تھی نگارش میں فصاحت تھی سخن میں

دھیما سا ترنّم وہ لبِ بنتِ عنب کا
ملتی سی کھنک ساغرِ صہبا کی سخن میں

خُم خانۂ ہستی میں تھی سرمستیٔ سرمد
سرشاریٔ منصور تھی زندگی کے چلن میں

پیتا ہی رہا آتشِ صہبائے تمنا
جلتا ہی رہا شمعِ محبت کی لگن میں

ہر غم کا تحمّل ہے پئے تزئینِ گلستاں
ہر غم کی طلب حسرتِ تعمیرِ وطن میں

سوزِ غمِ محرومیٔ و شوریدہ سری نے
پایا ہے سکوں دامنِ امواجِ جمن میں

وہ دَور ہے یہ دَور کہ اربابِ فن و علم
جلتے ہیں، سُلگتے ہوئے اُردو کے کفن میں

آوارہ و دیوانہ و سرمست و بلانوش
القاب تھے کیا کیا ترے یارانِ وطن میں

صد حیف کہ گُل ہو گئی نظمی وہ قضا سے
جو شمع کہ ضَو پاش تھی فانوسِ سخن میں

مہدی نظمی



افسانہ

جھوٹی

مہندر سنگھ جوشی ایم۔ اے

آفیشل لینگویج لیجسلیٹو کمیشن، منسٹری آف لا۔ بھگوان داس روڈ۔ نئی دہلی نمبر۱

محترم خوشتر صاحب! تسلیم

"بیسویں صدی" کے لئے اپنی ایک تازہ کہانی "جھوٹی" بھیج رہا ہوں ——— کہانی کا عنوان "جھوٹی" ہے۔ لیکن حقیقت کا پہلو لئے ہوئے۔ مجھے یقین ہے آپ کو اور قارئین "بیسویں صدی" کو میری یہ کہانی بھی پسند آئیگی۔۔۔۔

خلوص کیش ——— مہندر سنگھ جوشی

★

وہ گلی کے موڑ پہ پہنچی تو میں نے آگے بڑھ کے اُس کا راستہ روک لیا۔

"ہردیپ!"

"جی!" اُس کے چہرہ پر نہ غصہ تھا نہ ناراضگی۔ اگر اُس کے چہرہ پہ حیرت تھی تو وہ ——— وہ مجھے نظر نہ آئی۔

"ایک بات کہوں؟ بہت دنوں سے کہنے کے لئے سوچ رہا ہوں۔ اگر اجازت دو تو کہوں۔"

"کہئے۔"

ایسا معلوم ہوا جیسے کہنے کی اجازت دیتے وقت اُس کا صبر و استقلال قائم نہ رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے یہی محسوس ہوا۔ یا یہ میرے دل کا شک رہا ہو۔

"میرے ساتھ گھومنے چل سکو گی؟ کسی طرف بھی چلو جہاں تمہارا جی چاہے۔"

جواب کا انتظار کرتے ہوئے پریشان ہونے سے پہلے ہی میرے سینہ میں نقارے بجنے لگے تھے۔

"کیوں؟"

مجھے اِس بات کا اندیشہ تھا۔ بارہا دل کو سمجھایا کہ خواہ مخواہ مصیبت مول کیوں لیتا ہے۔ بعد میں بھگتنا پڑے گا۔ لیکن دل کسی طرح نہ مانا۔

اُس کا ردِ عمل کتنا فوری اور تیز تھا۔ معلوم ہوتا تھا اُس کا "کیوں" لفظ میرے ہی لبوں سے نکلا ہے۔

اُس نے میرے چہرہ کی طرف دیکھا ——— ایک پُر احتجاج نگاہ! اور وہ نگاہ میرے دل میں اُتر گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ بولی۔

"کیوں نہیں! آپ جب بھی کہئے۔"

"پھر کل چھٹی کے بعد۔"

مجھے اپنی قسمت پہ زیادہ بھروسہ نہ تھا۔

"اچھا!" اور میری طرف پھر دیکھے بغیر ہی وہ اپنے راستہ پہ چل دی۔

کچھ دن ہوئے میں نے اپنی زندگی کے باون برس پورے کئے تھے۔ ٹینس کے پانچ سیٹ کھیلتے ہوئے قطعی تھکن محسوس نہ ہوتی تھی۔ بیس میل پیدل چل سکتا تھا۔ سیکریٹریٹ کے سارے افسر میری صحت پر رشک کرتے تھے۔ اگر ہم جانتے کہ کنوارا ہونے سے چہرہ اِس طرح جگمگ کرتا رہتا ہے تو ہم بھی بیاہ نہ کرتے یہ اُن کا مذاق بن گیا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں میں محسوس کرنے لگا تھا جیسے زندگی لاکھوں مساموں سے تیزی سے بہتی جا رہی ہو اور اب اختتام پہ پہنچنے والی ہو۔ ایک عجیب سی بے چینی دل و دماغ پہ طاری تھی، ایسی حالت میں اُس شام بے سوچے سمجھے ہردیپ کا

راستہ روک لیا تھا۔

پر انتظار طویل ہوتا ہے ——— گھڑی کی بڑی سوئی اپنی دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچ گئی تھی جب چنچل ہرنوں کی طرح متحرک جوان لڑکیوں کا ایک گروہ نظر آیا۔

میں بظاہر بہت خوش تھا میرا دل پُر امید تھا لیکن کچھ گھبرایا ہوا بھی پھر اُداس ہو کر دل شکستہ ہو گیا۔ نہ جانے کہاں تک یہ رنگ رنگ کی مختلف تتلیاں چلی گئی تھیں کسی بزاز کے کاؤنٹر پر پڑے ہوئے بہت سے تھانوں کی طرح لیکن میری توجہ باہر راستہ کی طرف مرکوز رہنی چاہیے تھی۔ مجھے اُن تتلیوں کا جائزہ لے کر کیا لینا تھا۔

اُس کی صورت اُس گروہ میں کہیں نہ نظر آئی۔ میں سوچنے لگا کلاس روم میں رُک گئی ہوگی تاکہ کوئی سے مجھے ملتے ہوئے نہ دیکھے یا شاید کوئی کام ادھر پیریڈ پڑھانا باقی ہو ——— ہم پونے پانچ بجے بھی کہیں جا سکتے تھے۔ جس سنجیدگی سے اُس نے میرے ساتھ کہیں گھومنے چلنے کے لئے ہاں کہا تھا، اُس میں تصنع کی جھلک بھی نہ تھی۔ پچیس برس کی لڑکی ہنسی مذاق تھوڑا ہی کر سکتی تھی۔

کافی دیر تک کوئی نظر نہ آیا۔ کوئی بول بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے سوچا اسکول کے کمرے بند ہو گئے ہوں گے شاید پانچ بج گئے۔ میں نے اسٹارٹر کو جھنجھوڑا۔ انجن مٹی کے کسی تودے کی طرح جامد تھا۔ جب تو بٹ پر ایک اور گردن توڑ جھٹکا لگایا تو گاڑی اُدھر ہی چل دی جدھر اُس کا رُخ تھا۔ پہیے گھومتے رہے۔

کتنے ہی نام میری نظروں سے ٹکرائے شاہجہاں روڈ۔ رفیع مارگ اورنگ زیب روڈ۔ تلک مارگ۔ ماتا سندری۔ نورجہاں۔ سردار پٹیل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وقت اور مقام کی باریک باریک دھول گرد و غبار میں بھٹک رہی ہے۔ جب تک پٹرول کا آخری قطرہ نہ ختم ہو گیا میں بے مقصد گھومتا رہا۔ اور پھر کار ایک بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑی کر کے گھر لوٹ آیا۔

"یہ سب تم آئیں نہیں اس دن؟" وہ ایک بار پھر مجھے راستے میں مل گئی تھی۔

"بولو!"

"...... ڈر لگتا تھا۔"

"تمہیں ڈر لگتا تھا۔ میں ..." میرے حلق کا اسفنج آنسوؤں سے نچڑنے لگا۔

"مجھے معلوم ہے آپ پریشان ہوئے ہوں گے۔ آئی۔ ایم ساری!"

"ساری! واہ خوب رہی! بس ساری؟ خدا کے لئے ایک بار میرے ساتھ چلی چلو ——— ایک بار۔"

"......"

"صرف ایک بار!"

"اچھا۔ پرسوں ساڑھے چار بجے اسکول سے پک اپ کر لیں۔ اِس بار نہ بھولوں گی۔"

آنے والے سارے گھنٹوں میں مجھے ہوش نہ رہا۔ نہ جانے کتنی دیر تک اُس کے وعدہ کا خمار رہا اور کتنی دیر تک اپنے اندیشوں کا بخار!

میں عین موقعہ پر پہنچا۔ معلوم تھا کہ انتظار کے لمحے بموں کے ٹکڑوں کی طرح بکھر جائیں گے اور رُوئیں رُوئیں کو زخمی کر دیں گے۔

میں پہنچا تو وہ گیٹ سے باہر کھڑی تھی بس اسٹاپ کے پاس۔ میری گاڑی رُکتے ہی دروازہ کھول کر وہ اگلی سیٹ پر آ بیٹھی۔

"کہاں چلیں؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں بھی آپ کا دل چاہے۔"

میری پتلیاں اُلٹی گھوم گئی ہوں گی۔ اپنے اندر سو رنگ کے چھوٹے بڑے بے شمار انار چھوٹتے نظر آ رہے تھے۔

قطب کا مینار نہ جانے کس بحرِ اعظم کے کنارے تھا۔ بدھا گارڈن کون سے سمندر کے درمیان تھا ——— شام ڈھلنے تک کچھ بھی نہ آیا۔ میں نے ڈپلومیٹک انکلیو کے قریب ایک ویران سی جگہ میں کار روک لی۔

"یہاں کوئی دیکھ رہے گا؟" اُس نے ایک راہگیر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ہم یہاں کار کے اندر تاریکی میں ہیں۔ لوگ باہر روشنی میں۔ اگر تمہارا بھائی شری بھی کار کے قریب سے گزرے تو وہ بھی ہمیں پہچان نہ سکے گا۔"

"اوئی!" اُس نے مصنوعی سے خوف کے ساتھ چیخ ماری اور میرے کندھے پر گر پڑی۔"

"اب کب ملوگی ہردیپ؟"

"آج کی ملاقات تو ختم ہو گئی نا؟" وہ کھِل کھِلا کے ہنسی۔

میرا سوال واقعی مضحکہ خیز تھا۔ اپنی دیوانگی مجھ سے کبھی پوشیدہ نہ رہی۔ زبان بے حد شرمسار تھی۔ لیکن آنکھیں اب بھی ہردیپ کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں اور جیسے چیخ رہی تھیں ——— ملوگی نا؟ ملوگی نا؟

"جس دن بھی آپ کہیں گے۔" وہ بولی جیسے سب ان کہے میں سے کچھ سمجھ رہی ہو۔

جب میں نے اُس سے ایک بار ملنے کے لئے کہا تھا مجھے معلوم تھا کہ مصیبت مول لینے لگا ہوں۔ ملنے کے بعد دل بار بار ملنے کے لئے مضطرب ہوگا اور مجھ سے پھر کہا نہ جائے گا۔ اب ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بھی دیوانی ہے۔ میں اپنے دل کے پیچھے بھاگا تھا، وہ کسی کے دل کے پیچھے چل پڑی۔

میں اپنا سر اُس کی گود میں رکھ کے بسورنے لگا۔ بسورنے لگا نہیں بسورنا چاہتا تھا۔ لیکن دل کو سمجھا لیا ——— لُطف اندوز ہونے کے لئے آنسو بہانے ضروری نہیں ہوتے۔ ایسے وقت میں آنسو زیب نہیں دیتے۔ کبھی کبھی کوئی بات دل مان بھی لیتا ہے۔

تھوڑے سے گلاب جامن میں اپنے ساتھ لایا تھا اور امرتی اور چائے کا تھرمس بھی۔ ایک گلاب جامن اُس کے لبوں سے چھُوا ——— تھوڑا سا منہ میں بھی دیا اور باقی بغیر چبائے ہڑپ کر گیا۔ اُس نے امرتی اُٹھائی۔ میرے منہ میں ڈالی اور باقی خود کھالی۔ کپ ایک ہی تھا۔ اُس میں باری باری ہم دونوں چائے کے گھونٹ بھرتے رہے۔

لفافہ میں اور بھی جامن اور امرتیاں تھیں بوتل بھی تھی جو ابھی آدھی ہی خالی ہوئی تھی۔ لیکن میں اُس کی کھائی ہوئی گلاب جامن کھا چکا تھا۔ چائے کے کپ پر ٹھیک اُسی جگہ ہونٹ لگائے تھے جہاں اُس کے لب لگے تھے۔ آج اِس زندگی میں مجھے اور کیا کھانا، کیا پینا تھا۔

میرا ہاتھ انجانے طور پہ اُس کی کمر پہ جا پڑا ——— معلوم نہیں اپنی تپش تھی یا پرائی۔ ہتھیلی کی جلد جلنے لگی تھی۔

ہردیپ کی کسی رگ نے ریگانے لمس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہ کیا۔ جسم کے ایک بھی رُونگٹے نے مزاحمت میں سر نہ اُٹھایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مالک چور آنے پر بھرے ہوئے گھر کے کھُلے دروازے چھوڑ کر

ماتمِ سخت

عرشؔ ملسیانی بی۔ اے

لوگ اُس کو شادؔ کہتے تھے، کہتا تھا میں نرلیش
شُہرت تمام مُلک میں پائی نرلیش نے
رندِ مُدام مست کی اللہ رے تشنگی
جمنا میں جا کے پیاس بُجھائی نرلیش نے

عرشؔ ملسیانی

باہر کھسک گئے ہوں۔

میرا بازو اُس کی گردن کے گرد لپٹ گیا۔ اُس نے منہ پھیر لیا۔ پھر میرے احساس پہ ایل ایس ڈی جیسا نشتر چھا گیا ———

سڑکوں پر بھیڑ تھی۔ آنکھیں چندھیائی ہوئی ہیڈ لائٹ تھیں۔ مجھے اس کی جائے وقوع یاد نہ تھی۔ سار پالتو جانور کی طرح خود بخود شکتی نگر پہنچ گئی تو مجھے خیال آیا کہ اتنی جلدی بھی کیا تھی! گھنٹہ آدھا گھنٹہ اور اس طرح گزار سکتا تھا کہ کسی پارک میں جا بیٹھتے یا وہیں رُک جاتے۔ یہاں اندھی دہلی میں کون کسی کی طرف دیکھتا ہے۔

"اچھا ——— پھر میں چلوں؟" وہ بول اُٹھی مجھے انکار کرنے کے لئے کوئی بہانہ نہ ملا۔

"پھر ملوگی نا؟" میں نے دل مضبوط کر کے دل کی بات کہی۔

"ہاں۔ ہاں۔ جب بھی آپ چاہیں گے۔"

آدھی رات تھی جب بستر پہ لیٹے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اُس سے پوچھنا تھا کہ اِس کا سوال حصّہ بھی تمہیں مجھ سے محبّت بھی ہے یا نہیں؟ جتنی مجھے تم سے محبّت ہے۔ یہی تو ایک بات کرنے والی تھی۔ پھر میں نے سوچا۔ کیا ہوا آئندہ بھی ملے گی اور اب تو ملتی ہی رہے گی۔ بہت سی باتیں

پا پچھلوں گا۔ یوں بھی پوچھنے کی ضرورت کون سی ہے۔ رہ کیا گیا پوچھنے کو!

ایک ہفتہ میرا خمار کم نہ ہوا۔ پھر اُسے دیکھنے، اُس سے ملنے اور اُسے چھونے کے لئے اضطراب بیدار ہوا اُٹھا ——— اور بے اختیار میں نے اُس کا راستہ روک لیا۔

"گھومنے کب چلنا ہے ہردیپ؟"

"گھومنے؟"

"تم نے کہا تھا نا جب بھی کہو گے!"

"آپ نے نہیں کہا تھا ایک ....ک بار ملنا ہے۔ صرف ایک ....ک بار!" اُس نے میرے الفاظ میرے منہ پہ دے مارے

"پھر تم نے وعدہ کیوں کیا تھا۔ جب بھی چاہو گے .... "میں نے بچوں کی طرح کہا۔

"ایک بار ملنا تو مان ہی لیا تھا نا۔ اگر آپ سے یوں نہ کہتی تو آپ کو اُس بار ملنا بھی کیا اچھا معلوم ہوتا؟"

میں جواب سوچ رہا تھا۔ لیکن سُننے والا کہاں تھا!

غزلیں

پروفیسر ایم اے حفیظ بنارسی، ایم اے۔ بی ایڈ

ترے بغیر کچھ اِس طرح جی رہا ہوں میں
کہ زیست مجھ سے خفا، زیست سے خفا ہوں میں

اگرچہ پھولوں کی آغوش میں پلا ہوں میں
پڑا ہے وقت تو کانٹوں پہ سو گیا ہوں میں

ہنوز تشنگیٔ دل کا ہے وہی عالم
ہزار بار اُن آنکھوں سے پی چکا ہوں میں

شبِ فراق کے تارو گواہ رہنا تم
زمانہ خواب میں ہے اور جاگتا ہوں میں

جو پارسا ہیں گنہگار کہہ رہے ہیں مجھے
گناہگار سمجھتے ہیں پارسا ہوں میں

یہ بات الگ ہے کہ خالی ہے خود مرا دامن
ستارے وقت کے دامن پہ ٹانکتا ہوں میں

زمانہ شوق سے دیکھے نہ کیوں مری جانب
ترے جمال کا آئینہ بن گیا ہوں میں

جفا کے دور میں گاتا ہوں پیار کے نغمے
حفیظ نام ہے اور بندۂ وفا ہوں میں

شہر یار پرواز ایم۔ اے

فراق میں کبھی آنسو چھلک بھی جاتے ہیں
چھلک کے نوکِ مژہ پہ چمک بھی جاتے ہیں

جو راہِ عشق میں اَسرار داں ہیں منزل کے
کبھی کبھی وہی رہبر بھٹک بھی جاتے ہیں

ہزار خشک سہی ہجر میں تری آنکھیں
وفورِ غم سے یہ ساغر چھلک بھی جاتے ہیں

ہزار مُردہ ستارے سہی مرے آنسو
کبھی یہ گرمیٔ غم سے چمک بھی جاتے ہیں

ہمارا شوقِ ملاقات راست ہے ہرچند
کبھی ہم اُن کی گلی میں بھٹک بھی جاتے ہیں

جو بادہ نوش لُنڈھاتے ہیں خُم کے خُم ساقی
تری نگاہ سے پی کر بہک بھی جاتے ہیں

ہزار خضر سہی راہِ عشق کے ماہر
کبھی کبھی یہی حضرت بھٹک بھی جاتے ہیں

نہیں ہے دُرد کبھی جن ساغروں میں اے واعظ
کبھی کبھی وہی ساغر چھلک بھی جاتے ہیں!

افسانہ

نئی ہیروئن

پروفیسر زکی انور ایم ۔ اے
کریم سٹی کالج جمشید پور

محترم بھائی جان ! آداب

. . . یہ کہانی یہ ایک ہلکی پھلکی، سیدھی سادی سی کہانی ہے جسے بہرحال تفریحی ہی کہا جا سکتا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ ہلکی پھلکی تفریحی کہانیاں بھی ضرور لکھی جائیں۔ یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں اپنی کم مائیگی پر پردہ ڈالنا چاہتا ہوں . . . میں تو جیسا ہوں ویسا رہوں گا۔ پردہ ڈالنے سے کیا حاصل ؟ ـــــ لیکن "بیسویں صدی" کے قارئین کے خطوں سے مجھے اس بات کا ضرور اندازہ ہوا ہے کہ بہت سے تھکے ہوئے اور افسردہ یا روزمرّہ کے بکھیڑوں سے پریشان لوگوں کے لئے تفریحی ادب بہت ہی ضروری چیز ہے ـــــ لیکن فیصلہ تو آپ کے ہاتھ ہے یا پھر پڑھنے والوں کے ہاتھ کہ کہانی کیسی ہے ؟ . . .

آپ کا ـــــــــ

★

ہاؤس فل ہو چکا تھا۔

'رنگ محل' کا سارا ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ شو ساڑھے چھ بجے شروع ہونا تھا اور اس وقت سات بج چکے تھے۔ 'رنگ محل' کے ڈائرکٹر اور لوگوں کے بہت ہی محبوب اداکار راجیش کی درخواست پر لوگ اب تک خاموش بیٹھے تھے۔

راجیش کی اطلاع کے مطابق ڈرامے کی ہیروئن اور بہت سے دلوں کی ملکہ، رنگ محل کی سب سے حسین اداکارہ مہ جبیں کو کسی وقتی ضرورت کے تحت آنے میں دیر ہو گئی تھی۔

لیکن مہ جبیں آ چکی تھی۔ وہ راجیش کو صرف اس قدر بتانے آئی تھی کہ وہ بیمار ہے اور رول کرنے سے معذور ہے۔ لیکن راجیش کو علم تھا کہ وہ بیمار ہرگز نہیں، وہ اس سے اس کی بے توجہی کا بدلہ لینا چاہتی ہے اور اس کے لئے آج کا دن بہت ہی مناسب دن تھا جبکہ نہایت ہی دھوم دھام اور تزک و احتشام کے ساتھ ایک بالکل نیا ڈرامہ اسٹیج کیا جانے والا تھا، جس میں مہ جبیں ہیروئن کا رول ادا کر رہی تھی اور اس کی بڑی پبلسٹی کی گئی تھی۔

مہ جبیں کو یقین تھا کہ راجیش اس کے رول نہ کرنے کی خبر سنتے ہی چونک اُٹھے گا اور کیا عجب ہے کہ وہ بے ہوش ہو جائے۔ وہ بے ہوش ہو یا نہ ہو بے ہوش ہونے کی حد تک بوکھلا اُٹھے گا۔ اس کی خوشامد کرنے لگے گا۔ اس سے معافی مانگے گا اور پھر مہ جبیں اُسے پا لینے میں کامیاب ہو جائے گی !

لیکن یہ سب کچھ بھی نہ ہوا۔ راجیش نے بڑے اطمینان سے اس کے رول نہ کرنے کی بات سنی اور پھر اطمینان سے بولا۔

"خیر کوئی بات نہیں"۔

اور پھر وہ اس کی خیریت پوچھنے لگا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ اطمینان کے ساتھ پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ اور جنرل یحییٰ خاں کے صدر ہو جانے کے موضوع پر بات کرنے لگا تھا۔

لیکن اس وقت تک اندر ہال میں کچھ بے چینی شروع ہو گئی تھی اور رنگ محل کے سب سے پرانے شاعر منشی تشنہ کئی بار ہال سے متعلق پریشان کن خبریں لے کر آ چکے تھے۔ لیکن اُن خبروں کو بھی راجیش نے کچھ اس انداز سے سنا جیسے وہ خبریں معمولی خبریں ہوں جن میں پریشان ہونے کی کوئی بات ہی نہ ہو !

پاکستان میں مارشل لا کا نفاذ اور جنرل یحییٰ خاں کا صدر ہو جانا تا کچھ زیادہ دیر پا موضوع ثابت نہ ہو سکا اور تب راجیش مہ جبیں کو بھنڈی کے فوائد بتانے لگا اور اُسے مشورہ دینے لگا کہ وہ سبزی خور ہو جائے تو کبھی بیمار نہ ہو گی!

اور اسٹیج کے بائیں بازو کے کمرے میں دوسرے اشارہ یک آپ کھڑے بیٹھے یہ سوچ رہے تھے کہ آج رنگ محل کا ہزاروں کا نقصان ہو گا!

منشی تشنہ پھر کوئی نئی خبر لے کر آئے تھے اور یقیناً یہ نئی خبر پہلی خبروں سے بھی زیادہ وحشت ناک تھی۔ کیونکہ وہ بُری طرح ہانپ رہے تھے اور اُن کی آنکھیں بہت ہی وحشت زدہ سی نظر آ رہی تھیں۔

راجیش کے پاس پہنچ کر وہ چند لمحوں تک اپنی بے ترتیب سانسیں درست

- وہ غلطی قابلِ درگزر نہیں جو دیدہ و دانستہ ہو۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- عورت کے ساتھ نیک خُو رہنا چاہیے۔ اُسے رنج نہ دے بلکہ اُس کا رنج برداشت کرے۔ (حضرت امام غزالیؒ)
- بُرے اخلاق سے اُسی طرح بچو، جیسے لقمہ حرام سے بچتے ہو۔
(حضرت شیخ ابو بکر وراقؒ)
- بڑے گناہوں کا کفارہ، ضعیف اور درماندہ لوگوں کی اعانت و دستگیری ہے۔ (حضرت شفیق بلخیؒ)
- بھوک سے پہلے کھانا مکروہ بھی ہے مذموم بھی۔ (حضرت امام غزالیؒ)

کرنے کے لئے خاموش کھڑے ہانپتے رہے۔ پھر وہ راجیش سے اور بھی قریب ہو گئے اور پھر اُس کے چہرے کے پاس جُھک کر بہت ہی رازدارانہ انداز میں کہنے لگے۔

"حضرت! اب تو آگے والے بھی گالیاں بکنے لگے ہیں، گندی گندی گالیاں جناب! اور کم بخت ایک روپے والے تو کرسیاں پٹخنے کی مشق کر رہے ہیں اور میرا تیس سال کا ناٹک کی دُنیا کا تجربہ بولتا ہے حضور کچھ ایک روپے والے یقیناً سڑے ٹماٹر، گندے انڈے اور پھٹے پُرانے جوتے لانے چلے گئے ہیں... اُف! غضب ہے... قسم اللہ پاک کی غضب ہے! ـــــ حضور میری مانئے اور رادھا رانی کو..."

"منشی جی!" راجیش نے منشی تشنہ کی بات کاٹ کر کہا۔ "فکر نہ کیجئے، جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دیجئے۔ آپ نہیں جانتے رادھا رانی سے وہ رول نہ ہو سکے گا۔"

"حضرت! آپ کو نہ معلوم ہو گا۔" منشی تشنہ کچھ اِس انداز سے راجیش کی طرف دیکھنے لگے جیسے اُنھیں کوئی بہت ہی اہم راز کی بات معلوم ہو۔ وہ ذرا سا مُسکرائے، پھر کہنے لگے "رادھا رانی کو سارے ڈائیلاگ یاد ہیں۔ ایک جگہ بھی پرامپٹ کی ضرورت نہ ہو گی۔"

"لیکن منشی جی!" راجیش ہنس پڑا۔ "گستاخی معاف! ناٹک کی دُنیا کا آپ کا تیس سالہ تجربہ یہ بھی تو بولتا ہو گا کہ محض ڈائیلاگ کا زبانی یاد ہو جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

"بالکل درست فرمایا حضور نے۔" منشی تشنہ نے کہا۔ "لیکن بندہ پرور! آخر اِتنے دنوں سے وہ لڑکی محض جھک تو نہیں مار رہی ہے۔"

راجیش نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ پھر بہت ہی مطمئن انداز میں مہ جبیں کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے ایک سگریٹ سُلگا لیا اور اپنے آگے کے اسٹول پر پاؤں پھیلا دئے۔

منشی تشنہ بڑی حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اب گھنٹے آدھ گھنٹے میں ہال میں بیٹھے لوگوں کے صبر کا پیمانہ چھلک جائے گا۔ لوگ اسٹیج پر سڑے ٹماٹر، گندے انڈے اور پھٹے پُرانے جُوتے پھینکنے لگیں گے ـــ کرسیاں پٹخی جانے لگیں گی۔ لوگ بلند آواز سے گالیاں بکنے لگیں گے۔ کیا عجب ہے کہ پردے کو آگ بھی لگا دی جائے۔ لیکن یہ راجیش کتنے اطمینان سے پاؤں پسارے سگریٹ پی رہا تھا۔

منشی تشنہ سے ضبط نہ ہو سکا اور اب کے وہ مہ جبیں سے مخاطب ہو گئے۔

"مہ جبیں صاحبہ! اب خدا کے لئے بس بھی کیجئے، ہو گئی جتنی ہٹ کرنی تھی آپ کو۔ ڈائرکٹر صاحب معافی مانگنے پر رضامند ہوں یا نہ ہوں، میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ اگر ہم سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے۔ غصہ تھوک دیجئے محترمہ! گرین رُوم کو جائیے اور میں اِدھر اعلان کئے دیتا ہوں کہ آپ تشریف لے آئی ہیں... یقین کیجئے مہ جبیں صاحبہ! آپ کے آنے کی اطلاع پاتے ہی لوگ مطمئن ہو جائیں گے اور پھر... اور پھر محترمہ وہ تو دم سادھے قیامت تک آپ کا انتظار کر سکتے ہیں۔ اب ختم بھی کیجئے قصہ... لیکن مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ قصہ آخر ہے کیا؟"

"منشی جی!" مہ جبیں نے کہا۔ "قصہ وصہ کچھ نہیں ہے۔ میں بیمار ہوں اور کام نہ کر سکوں گی۔ مجھے جان دینا نہیں ہے۔"

راجیش زور سے ہنس پڑا اور پھر وہ سنجیدہ ہو گیا اور پھر اتنی دیر میں پہلی بار اس نے ایک کام کی بات کہی۔

"مہ جبیں! باہر کے تو بہت سارے لوگ اور ہم میں سے کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ اداکاری ہمارا پیشہ ہے اور روزی روٹی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ۔ ذریعۂ معاش! ____ اور جانتی ہو مہ جبیں اگر کوئی اداکاری کو ذریعۂ معاش کہتا ہے تو میں سمجھتا ہوں اس نے اِس فن کو سب سے گندی گالی دے ڈالی ہے۔ فن کو زندہ رکھنے کے لئے فن کار کو زندہ رہنا ہے۔ یہ درست ہے لیکن فن بہر حال ایک عبادت ہے، ایک ریاضت ہے، ایک سادھنا ہے۔ مہ جبیں ایک سادھنا اور یہ عبادت، یہ ریاضت، یہ سادھنا ہم سے کبھی کبھی قربانیاں بھی چاہتی ہے۔"

"میں فن پر قربان ہونے کو تیار ہوں راجیش!" مہ جبیں غصّے کے ساتھ بولی۔ "میں بیماری کی حالات میں بھی رول کروں گی چاہے مر ہی کیوں نہ جاؤں لیکن تمھیں بدنام ہونے نہ دوں گی... لیکن... لیکن... لیکن تم سے بھی تو میں کسی قربانی کی اُمید کر سکتی ہوں۔"

"کیسی قربانی؟" راجیش نے پوچھا۔

"اگر تم انجان بنتے ہو۔" مہ جبیں کا غصّہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ "اور مجھی سے سُننا چاہتے ہو تو سُنو... تم مجھے یاد رکھو یا بھول جاؤ اِس کا دار و مدار میری قسمت پر ہے، لیکن تم صرف اِتنا کرو کہ دیپالی کو بھول جاؤ... بس... صرف یہی ایک چھوٹی سی قربانی... کہو یہ سودا منظور ہے؟... بس صرف دیپالی کو بھول جاؤ!"

"جو بات کسی کو یاد ہی نہ ہو اُسے بھول جانے کی فرمائش کیسی عجیب سی بات ہے" وہ ہنسنے لگا۔ "مجھے حیرت ہے مہ جبیں کہ تم دو برسوں سے میرے ساتھ کام کر رہی ہو اور اب تک مجھے پہچان نہ سکیں... میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ دیپالی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

"بہت سی لڑکیاں تمھاری دوست ہیں۔" مہ جبیں نے کہا۔ "کیا میں نے کبھی، کسی لڑکی کے بارے میں تم سے کچھ کہا؟... بے شک میں دو برسوں سے تمھارے ساتھ کام کر رہی ہوں اور اِن دو برسوں میں یقیناً میں نے تمھیں بالکل درست سمجھا تھا کہ تم سنگِ مرمر کے ایک بُت ہو، جس کی پُوجا تو کی جا سکتی ہے لیکن جس کے چکنے پیروں پر آنسو کا ایک قطرہ بھی پل دو پل کے لئے رُک نہیں سکتا۔ میں یہی کچھ سمجھتی رہی تھی۔ لیکن... لیکن..."

اُس کی آواز رُندھ گئی اور وہ خاموش ہو گئی۔

"لیکن شاید میرے بارے میں تمھاری اسٹڈی غلط ثابت ہو گئی؟"

راجیش ہنسنے لگا۔ "یعنی میری زندگی میں دیپالی آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سنگِ مرمر کا وہ بُت موم کا مجسمہ بن گیا!"

"ہاں ہاں ہاں" مہ جبیں نے دانت پیس کر کہا۔ "تم انکار نہیں کر سکتے کہ دیپالی سے تم محبت کر رہے ہو!"

"پھر تمھاری اسٹڈی نامکمل ہے" وہ ہنسنے لگا۔ "میں صرف دیپالی ہی سے محبت نہیں کرتا، مجھے منشی تشنہ سے بھی محبت ہے، رادھا رانی سے بھی اور تم سے بھی اور اُن تمام لوگوں سے جو رنگ محل میں کام کرتے ہیں اور اُن تمام لوگوں سے بھی جو رنگ محل کے باہر ہیں... نفرت تو مجھے کسی سے بھی نہیں... تم جب نہیں آئی تھیں تو شامیلی نام کی ایک اسٹار نے میرے چہرے پر تیزاب پھنکوانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں اُس کمبخت سے بھی نفرت نہ کر سکا... محبت

- خالقِ کائنات کی سب سے عظیم تخلیق انسان ہے۔ یہ اُس کے عزم و عمل پر موقوف ہے کہ وہ عظیم رہے یا حقیر بن جائے۔ (ڈیل کارنیگی)
- اپنی بُرائیوں پر کڑی نظر رکھنے سے اُنھیں دُور کیا جا سکتا ہے۔ (کے۔ نولسن)
- یقین کی طاقت اور بصیرت کے تناسب سے ہماری زندگی شاندار یا معمولی، عظیم یا کمتر بن جاتی ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- وہ انسان خوش رہتا ہے اور صرف وہی خوش رہ سکتا ہے جو آج کے دن کو اپنا سمجھتا ہے! (سی۔ جی۔ ڈڈکان)
- حق تو یہ ہے یقین ہی فتح کی کلید ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)

تو مجھے تم سے بھی ہے... سچ کہتا ہوں تم سے بھی... لیکن مہ جبیں کیا تم مجھے ایک اُلجھن سے نجات دلا سکتی ہو؟"

مہ جبیں نے اُس سے اُس اُلجھن کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ لیکن راجیش خود ہی کہنے لگا۔

"محبت کیا ہے مہ جبیں؟" وہ ایک بالکل معصوم بچّے کی طرح پُوچھنے لگا۔ "کیا یہ محبت دو دلوں کے ایک ہو جانے کا نام ہے، یا دو رُوحوں کا آپس میں مدغم ہو جانا محبت ہے... یا یہ کہ دو جسم ایک ہو جائیں؟... کیا خیال ہے تمھارا... میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ محبت اِتنی سستی چیز ہرگز نہیں ہو سکتی کہ اُسے ہوس کی بُنیاد پر کھڑا سمجھا جائے... تم کیا کہتی ہو؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم" مہ جبیں نے کہا۔ "میں اِس کے علاوہ اور کچھ

نہیں جانتی کہ میں تمھیں دیپالی کے ساتھ دیکھنا پسند نہیں کرتی۔"

"عجیب بات ہے۔" راجیش ہنس پڑا۔ "مہ جبیں! دیپالی ایک بہت حسین لڑکی ہی نہیں ہے، میرے بہت ہی عزیز دوست کی بہن بھی ہے اور اُس کی ماں مجھے اپنے سگے بیٹوں سے کچھ کم نہیں چاہتی۔ پھر میں کیسے اُس سے تعلق توڑ لوں۔ ایک تو یہی میں نے بُرا کیا ہے کہ دیپالی کی ماں ایک دن شادی بیاہ کا تذکرہ کرنے لگی اور مجھ سے پُوچھنے لگی کہ میں شادی کیوں نہیں کر لیتا تو میں نے نہایت ہی واہیات سا جواب دیا کہ رنگ محل کے ساتھ میں شادی کر چکا ہوں۔ بے چاری کو یقیناً مجھ سے کچھ اُمید وابستہ تھی اور میں نے اُس کی اُمید پر پانی پھیر دیا۔ اب تو دیپالی مجھ سے تقریباً پردہ کرنے لگی ہے۔۔۔ بالکل تعلق کیسے توڑ دوں مہ جبیں، تم ہی سوچو نا۔"

"نہ سہی۔" مہ جبیں نے مونڈھے سکیڑ لئے۔ "یہ تو تمھاری اپنی مرضی ہے اور میری مرضی یہ ہے کہ میں آج رول نہ کروں گی! میں جا رہی ہوں۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"جاؤ نہیں۔" راجیش نے کہا۔ "میری رائے ہے اوپر جا کر باکس میں چھپ کر بیٹھ جاؤ اور اپنی آنکھوں سے رنگ محل کی تباہی کا تماشا دیکھو۔ بے شک تم یہ بھی دیکھو گی کہ لوگ کس حد تک تمھارے دیوانے ہیں!"

"ہاں میں یہی کروں گی۔" مہ جبیں نے کہا۔ "تاکہ تم اسٹیج پر جا کر لوگوں کو اپنی مجبوری کا دُکھڑا سناؤ کہ ضدّی اور ہٹی مہ جبیں آئی ہوئی ہے اور باکس میں چھپی بیٹھی ہے لیکن کام کرنے پر رضامند نہیں۔۔۔ پھر وہ لوگ جو میرے دیوانے ہیں اوپر چلے جائیں گے اور پتہ نہیں کس کس طرح میری دُرگت بنانے لگیں گے اور تم شاندار اداکاری کے ساتھ قہقہہ لگاؤ گے۔۔۔ لیکن میں تمھارا ارمان پُورا کر رہی ہوں راجیش! بے شک میں اوپر جا کر باکس میں بیٹھ جاؤں گی۔۔۔ سمجھے تم!"

اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی اُس کمرے سے باہر چلی گئی اور اندرونی راستے سے ہو کر بالکونی پر چلی گئی۔

منشی تشنہ جو اب تک بہت خاموشی سے سب کچھ سُن رہے تھے، یک لخت چیخ اُٹھے۔

"بدتمیز چھوکری!۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں، سیٹھ سے جھگڑا ہو جائے تو ہو جائے، اٹھارہ سال کی رنگ محل کی نوکری چھوٹ جائے تو چھوٹ جائے لیکن منشی تشنہ بھی دیکھے گا کہ کل سے اِس مہ جبیں کی بچی کو رنگ محل کے کسی ناٹک میں کسی ادنیٰ ملازمہ کا رول بھی کیسے ملتا ہے!"

"نہیں منشی جی!" راجیش مُسکرایا۔ "کم سے کم اِس مقدّس آرٹ کو تو دُنیا کی ہوا نہ لگنے دیجئے۔ ہماری اِس معصوم دُنیا میں انتقام، جنگ اور نفرت کا کیا کام؟۔۔۔ مہ جبیں جب تک چاہے رنگ محل میں رہے گی اور یقیناً وہی رول کرتی رہے گی جو اُس کے لئے مناسب سمجھا جائے گا۔"

"راجیش بابو۔۔۔" منشی تشنہ غصّے سے کانپنے لگے تھے۔ "آپ آدمی ہیں، آدمی! فرشتہ بننے کی کوشش نہ کیجئے۔ آدمی اگر فرشتہ بننے کی کوشش کرتا ہے تو شیطان بن جاتا ہے۔"

"شاید آپ نے کبھی فرشتہ بننے کی کوشش کی تھی!" راجیش ہنستا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

اور منشی تشنہ ہال سے اُٹھنے والے شور کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر بڑے غصّے سے بولے۔

"لیجئے، سادھو جی مہاراج اب سنبھالئے اِس ہنگامے کو!"

منشی تشنہ گرین روم میں جا کر بیٹھ گئے۔

اور راجیش اسٹیج پر پہنچا، بڑے اطمینان سے اُس نے ڈراپ سین کے آگے کا مخملی کور اسکرین کے بیچ میں پہنچ کر اُس کے دونوں حصّوں کو ہاتھوں سے نہایت ہی آہستگی کے ساتھ الگ کیا اور کور اسکرین کے آگے پہنچ گیا۔

اور ابھی اُس نے ہاتھ جوڑ کر تماشائیوں کو سلام ہی کیا تھا کہ ایک سڑا ٹماٹر ٹھیک اُس کی ناک پر آ کر لگا۔ اُس نے جیب سے رومال نکالا اور نہایت ہی بے نیازی سے چہرہ صاف کر لیا۔ لیکن جب ہی ایک انڈا اُس کے سینے پر آ کر پھوٹ گیا اور وہ ہنس پڑا۔

لیکن راجیش کی بے نیازی اور اطمینان کو دیکھ کر شاید ٹماٹر اور انڈا پھینکنے والوں کو مایوسی ہوئی اور جب چند لمحوں تک پھر کچھ اور اسٹیج پر نہ پھینکا گیا تو راجیش نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"حضرات! ایک پھٹے پُرانے جُوتے کی کمی رہ گئی! بلکہ اب تک تو کئی کُرسیاں بھی توڑی جا چکی ہوتیں۔۔۔ لیکن حیرت ہے کہ آپ اِتنی خاموشی کے ساتھ ڈرامے کے شروع ہونے کا انتظار کر رہے ہیں جبکہ تقریباً ایک گھنٹے کی تاخیر آل ریڈی ہو چکی ہے۔ ناٹک کی دُنیا میں آپ کا یہ اطمینان ایک بڑی عجیب بات ہے اور ہمارے منشی تشنہ کا ناٹک کی دُنیا کا تیس سالہ تجربہ بولتا ہے کہ آج ہال میں آگ لگا دی جائے گی۔۔۔ حضرات! اگر ایسا ہوا تو مجھے نہ حیرت ہوگی اور نہ افسوس۔ آپ پیسے خرچ کرتے ہیں، اپنی حسین شام قربان کرتے ہیں اور اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اور آپ کی اِتنی ساری قربانیوں کے بعد اگر آپ کے

ذوق کی تسکین نہ ہو تو اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو غصّے کے عالم میں میں بھی ہنگامہ کرتا، سڑے ٹماٹر پھینکتا، گندے انڈے پھینکتا، پھٹے پُرانے جوتے پھینکتا، کرسیاں توڑتا اور پردے میں آگ لگا دیتا۔ لیکن حضرات . . ."

"ہم تقریر سُننے نہیں آئے ہیں!" ایک آواز آئی۔

"اور میں تقریر کرنے نہیں آیا ہوں" راجیش نے کہا "میں صرف یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ کسی خاص وجہ سے آج مس مہ جبیں رول نہ کر سکیں گی۔ جبکہ اُن کا رول ہیروئن کا رول تھا۔ تو پُوچھنا یہ ہے حضرات کہ مس مہ جبیں کے بدلے اگر کوئی اور اداکارہ ہیروئن کا رول کرے تو کیا آپ رنگ محل پر احسان کرکے اُس اداکارہ کا رول زہر مار کر سکیں گے؟"

"نہیں!"

"ہاں"

"چلے گی"

"چلے گی مگر وہ بُڑھیا رادھا رانی نہ ہو!"

"کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہیئے"

"نہیں ـــــ مہ جبیں کو بھیجو!"

"نہیں نہیں کوئی بھی چلے گی۔ مگر اب ڈرامہ شروع کرو"

دیر تک مختلف قسم کی آوازیں آتی رہیں اور تب راجیش نے کہا۔

"میں رائے شماری تو نہ کر سکا، لیکن میرا خیال ہے آپ میں سے زیادہ تر لوگ ـــ رادھا رانی کے علاوہ کسی اور اداکارہ کو قبول کر لیں گے"

"ہاں"

"ہاں ـــــ لیکن وہ کون ہے؟"

"وہ کون ہے؟" راجیش کچھ سوچنے لگا۔ یقیناً اُس وقت راجیش کے سامنے ایک سخت ترین مسئلہ تھا۔ مکالمے رادھا رانی کو یاد تھے اور لوگ ـــ رادھا رانی کو پسند نہ کرتے تھے۔ شاہیہ، روبی اور واسنتی یقیناً بہت اچھا رول کرتی تھیں لیکن اُنھیں مکالمے یاد نہیں تھے اور تین گھنٹوں کا کُل لنگھڑ پلے پلاٹ پر چلانا ایک خطرناک ذمّہ داری تھی!

اور غیرارادی طور پر اُس کی نظر سامنے اوپر بائیں طرف کے باکس کی طرف اُٹھ گئی، جس میں سیاہ چشمہ لگائے بیٹھی مہ جبیں مُسکرا رہی تھی لیکن راجیش نے دوسرے ہی پل اپنی نظریں جُھکا لیں۔

"وہ کون ہے جلدی بتاؤ!" زوردار آواز آئی۔

"ہاں ہاں بتاؤ وہ کون ہے؟" دوسری آواز آئی۔

شمعِ ادب بجھ گئی

جن دوست احباب کو ریش بکار شادؔ سے لگاؤ تھا اُن کے لئے شادؔ کی یہ موت انتہائی افسوسناک سہی لیکن قطعی غیر متوقع نہ تھی۔ ہم سب یہ جانتے تھے کہ شادؔ خود اپنی زندگی کے درپئے آزار ہیں۔ بہی خواہوں نے، ڈاکٹروں نے اور اعزّہ و اقربا نے ہر ممکن کوشش کی کہ اُنھیں جامِ آتشیں سے باز رکھا جائے۔ لیکن یہ تمام کوششیں ناکام رہیں اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ شادؔ نے شراب کو ختم کرنا چاہا۔ لیکن وہ خود شراب کے ہاتھوں ختم ہوا اور عین شباب میں ہم سب کو داغِ مفارقت دے گیا۔

شادؔ کتنا عزیز دوست تھا اِس کا احساس اب ہوا ہے اور کس شدّت کے ساتھ۔ شادؔ سے میرا غائبانہ تعارف رسالہ "چندن" کے ذریعے ہوا جو ساحر ہوشیار پوری کی زیرِ قیادت کانپور سے شائع ہوتا تھا۔ شروع ہی سے اُس کے کلام میں ندرت اور تیکھا پن تھا۔ ہر شعر میں، ہر رباعی میں، ہر قطعے میں، کوئی نہ کوئی پتے کی بات کہتا تھا۔ اُس کی شاعری محض برائے شاعری نہ تھی۔ بلکہ ہر شعر ایک مقصد، ایک پیغام لئے ہوتا تھا اور اُس پر اسلوبِ بیان سونے پہ سُہاگے کا کام دیتا تھا۔ شادؔ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اور کامیاب رہا۔ نثر میں بھی انفرادیت حاصل کی۔ وہ جہاں ایک بیباک اور نکتہ رس شاعر تھا وہاں ایک محقق ادیب بھی تھا۔ وہ خود میٹرک سے آگے نہ گیا۔ لیکن اُس کی تصانیف ایم۔ اے کی جماعتوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اِس سے بڑھ کر اُس کی خداداد قابلیت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اِس قلیل عمر میں وہ پچیس تیس کتابوں کا مصنّف ہو چکا تھا۔ رسائل و جرائد میں اُس کے مضامین، انٹرویو اور لطائف وغیرہ بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔

پچھلے دنوں اُس کے والد کا انتقال ہو گیا، جس سے شادؔ کو شدید صدمہ ہوا اور ایک عرصے تک اُسے دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ہونا پڑا۔ لیکن اِس عرصے میں اُس نے جو المیہ نظمیں، سونٹ اور قطعات کہے، وہ اُس کے حسّاس دل کے آئینہ دار ہیں۔ شادؔ وہ شمعِ سخن ہے جو گُل ہونے سے پہلے پُوری تابندگی کے ساتھ ضیا پاش رہی اور ہر محفلِ شعر و سخن کو منوّر کیا۔

میری دانست میں اُردو ادب میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوا ہو جس نے اِتنے تھوڑے عرصے میں اِتنا کچھ کہا اور اِس خوبی سے کہا۔ اُس کی شاعری جدید اور قدیم کا ایک حسین امتزاج تھی۔ اُس کے پڑھنے کا انداز بھی انوکھا تھا۔ کلام میں وہ پختگی تھی جو بڑے بڑے کہنہ مشق شاعروں کو بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اُس کی ذہانت اور سنجیدگی نے اُس کی شاعری کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

کاش کہ وہ کچھ دیر اور زندہ رہتا۔ دُنیائے اُردو ادب اُسے دیر تک روئے گی۔ وہ رند قضا نوش ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا۔ شراب اُس کے حق میں زہرِ قاتل ثابت ہوئی۔ اِس انگور کی بیٹی نے کئی گھر اُجاڑے۔ مجازؔ گئے، شادؔ گئے۔ اب خدا جوشؔ صاحب کو سلامت رکھے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر راجیش نے کہا۔

"دوستو ——— ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ وہ کون ہے؟"

"وہ میں ہوں" پس منظر سے ایک آواز مائیک کے ذریعے سارے ہال میں گونج اٹھی۔ "وہ میں ہوں ... وہ میں ہوں!"

کور اسکرین کے اندر سے منشی تشنہ نے راجیش کی قمیص پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔

اور دوسرے ہی لمحے رنگ محل کے مخصوص آرکسٹرا کے ساتھ مخمل کا کور اسکرین درمیان سے شق ہو کر دو حصوں میں سکڑنے لگا۔

اور پھر بانسری کی نہایت ہی لطیف آواز کے ساتھ ڈراپ کا پردہ اٹھنے لگا۔

پردہ اٹھ گیا اور تماشا شروع ہو گیا۔

اور ڈرامہ "پیار کی دنیا" کا راج کمار اپنے کمرے میں نشے میں دھت، جھومتا ہوا، کھڑکی کے سامنے کھڑا باہر کی زوردار بارش کا نظارہ کرتے کرتے اسٹیج کے درمیان آ گیا اور بری طرح لڑکھڑاتا ہوا بولا۔

"یہ رات ... یہ برسات ... یہ تنہائی کا عالم ... ایسے میں کوئی چھم سے جو ... آ جائے تو کیا ہو؟"

اور ایک انتہائی حسین لڑکی چھم سے اس کے شبستان میں آ گئی۔

"تم کون ہو اے اپسرا ... تم کون ہو؟" راجکمار نے پوچھا۔

"میں تمہارا وہ خواب ہوں راجکمار جو تمہاری نیندوں پر چھا گیا ہے۔"

"کون لڑکی ہے یہ؟" کسی تماشائی نے سوچا۔

"غضب کی لڑکی ہے!" کسی اور تماشائی نے کہا۔

"مہ جبیں کہاں گئی تماشا کرانے والو؟" کسی ایک رونے والے نے زور سے کہا۔

"پیا کماری کی نائیکا تھی مہ جبیں ... اب پتہ کٹا!" کوئی اور بڑبڑایا۔

"غضب کی دریافت ہے راجیش کی!" اونچے کلاس کے کسی باذوق نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ساتھی سے کہا۔ "اور کمبخت نے پلے شروع کرنے میں اسی لئے تاخیر کی تھی کہ تماشائیوں کا تجسس زیادہ ہو!"

اور پھر سارے ہال میں سکوت طاری ہو گیا۔

اور تماشا ہوتا رہا۔

لیکن یہ سوال تماشا کرنے والوں کے دماغ میں بھی ہلچل مچاتا رہا اور تماشا دیکھنے والوں کے دماغ میں بھی کہ وہ نئی لڑکی کون ہے جو بالکل نئی ہونے کے باوجود اس قدر اہم اور سخت رول کتنا شاندار کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ منشی تشنہ بھی اسے نہیں پہچان سکے تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کا میک اپ کیا تھا۔

البتہ تماشا کرنے والوں میں سے ایک راجیش تھا جو اسے پہچان رہا تھا اور نہایت ہی مستعدی کے ساتھ اس کے مکالمے پرامپٹ کر رہا تھا۔

اور تماشا دیکھنے والوں میں سے ایک مہ جبیں تھی جو اسے پہچان رہی تھی اور جسے باکس کے گدے کا صوفہ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر کانٹے پڑے ہوں اور سارے جسم میں چبھ رہے ہوں!

اور پھر تماشا ختم بھی ہو گیا لیکن راجیش اور مہ جبیں کے علاوہ باقی تمام لوگوں کے لئے وہ لڑکی راز ہی بنی رہی۔

لیکن تیسرے دن وہ راز فاش ہو گیا۔ اس دن پھر "پیار کی دنیا" کھیلا جانے والا تھا اور شہر میں چاروں طرف بڑے بڑے پوسٹروں میں اس لڑکی کی تصویر مسکرا رہی تھی اور اس تصویر کے نیچے لکھا تھا ———

"مسز دیپالی راجیش!!"

غزلیں

صغیر احمد صوفی بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی

اور کبھی تسکینِ حرفِ آرزو ہونے لگی
اُن سے موضوعِ وفا پر گفتگو ہونے لگی

ہر مسیحا اب جمودِ زیست سے بیزار ہے
شہر میں قاتل کی سب کو جستجو ہونے لگی

ورد پھوٹا، سج گیا، پھر آنسوؤں کا اک چمن
زخمِ دل مہکا، فضا بھی مشکبو ہونے لگی

وہ مرا ہی قتل تھا جس کی بنا پر شہر کے
ہر گلی کوچے میں اِتنی گفتگو ہونے لگی

میں نے ماضی کے خزانوں سے چرائے قہقہے
جب طبیعت بے نیازِ رنگ و بو ہونے لگی

اُس پری چہرہ کا پھر آیا پیامِ التفات
رغبتِ جامِ شرابِ آرزو ہونے لگی

اجنبی بن کر رہے اِس شہر میں ہم تم مگر
بات ربطِ باہمی کی کو بکو ہونے لگی

شاعری سرقہ توارُد سے کبھی غافل نہ تھی
نقل اب آواز کی بھی ہُو بہو ہونے لگی

سو گئے دِلّی کے ہنگاموں میں جب صوفی کے راز
کس لئے بیدار یادِ لکھنؤ ہونے لگی

نذیر بنارسی

کبھی خاموش بیٹھو گے کبھی کچھ گنگناؤ گے
میں اُتنا یاد آؤں گا مجھے جتنا بھلاؤ گے

کوئی جب پوچھ بیٹھے گا خموشی کا سبب تم سے
بہت سمجھانا چاہو گے مگر سمجھا نہ پاؤ گے

کسی ہنستے ہوئے چہرے کا جب بھی سامنا ہوگا
ہمارا غم تبسم کے حجابوں میں چھپاؤ گے

کوئی تقریب، ہو احساسِ تنہائی رُلائے گا
خوشی کی بزم میں جاؤ گے، آنسو لیکے آؤ گے

نہ گیسو کہیں نظریں کہیں دامن کہیں ہوگا
ہماری یاد آتے ہی سنورنا بھول جاؤ گے

کبھی دنیا مکمل بن کے آئیگی نگاہوں میں
کبھی میری کمی دنیا کی ہر اک شے میں پاؤ گے

تصور میں کبھی آؤں گا لمحاتِ حسیں بنکر
کبھی آہٹ مری پاؤ گے اور مجھکو نہ پاؤ گے

بڑھا دیگی ہماری یاد آکر دل کی بیتابی
ہماری یاد ہی سے تم سکونِ دل بھی پاؤ گے

مجھے پانے کی کوشش میں کہیں خود کھو نہ جانا تم
مجھے کیا اب مرا نقشِ کفِ پا بھی نہ پاؤ گے

نذیر اب اُن کو مت ڈھونڈو چراغِ آرزو لیکر
وہ تم کو پا سکینگے وہ نہ اب تم اُن کو پاؤ گے

اخگر مشتاق رحیم آبادی

سچ ہے گذرے ہوئے لمحات کہاں ملتے ہیں
اب وہ خوبانِ خرابات کہاں ملتے ہیں

مُسکرانے کی تمنّا تو ہمیں بھی ہے مگر
مُسکراتے ہوئے حالات کہاں ملتے ہیں

جتنے رنگین سوالات کئے جاتے ہیں
اُتنے رنگین جوابات کہاں ملتے ہیں

میرے اُجڑے ہوئے دل کی بھی سیاحت کر لو
ایسے دلچسپ مقامات کہاں ملتے ہیں

ہم تو ماضی کو ابھی ڈھونڈ کے لاتے لیکن
اُس کے قدموں کے نشانات کہاں ملتے ہیں

کچھ نہ کہہ کر بھی جو کہہ جاتے تھے سب کچھ مجھ سے
ہائے اب ایسے اشارات کہاں ملتے ہیں

جس قدر قیمتی ہوتے ہیں تمہارے وعدے
اُس قدر قیمتی لمحات کہاں ملتے ہیں

کچھ سوالات ہیں اپنے بھی لبوں پر یارو
کوئی بتلاؤ جوابات کہاں ملتے ہیں

ڈھونڈتے پھرتے ہیں بیکار وہ اخگر کا مکاں
لامکانوں کے مکانات کہاں ملتے ہیں

افسانہ

چمتکار

وجاہت علی سندیلوی بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی ایڈوکیٹ

نصرت منزل۔ سندیلہ (یو۔پی)

معظمی خوشتر صاحب اخلوص و نیاز

"گیہوں کی تلاش" اور "ملازمت کی تلاش" کی اشاعت کے ایک عرصے بعد حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں۔ آپ اپنی شفقت سے ہر ماہ پابندی سے "بیسویں صدی" بھیجتے رہتے ہیں۔ میری مصروفیتوں کے درمیان وہ مجھے لکھنے کے لئے برابر اکساتا رہتا ہے۔ ایک مختصر سا طنزیہ افسانہ ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ آپ پسند فرمائیں گے...

نیاز کیش ——— وجاہت علی

★

مانیہ بھولو داس ریاست کے کھاد منتری، اِس وقت ساری دُنیا سے سخت بیزار بلکہ اُسے گولی مار دینے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ وہ جب غصّے میں ہوتے، تو اپنی بائیں مونچھ پر بل دینے لگتے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اُن کی اِس حرکت کے باعث اُن کی بائیں مونچھ دائیں مونچھ سے چھوٹی ہو گئی تھی اور کچھ لوگ یہ قیاس کرتے کہ اُن کی بائیں مونچھ دائیں مونچھ سے پیدائشی چھوٹی تھی اور اِس حرکت کی آڑ لے کر وہ اُسے برابر کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال اِس وقت وہ اِتنے غصّے میں تھے کہ وہ اپنی بائیں مونچھ پر بل نہیں دے رہے تھے بلکہ نوچ رہے تھے۔

وہ ابھی ابھی دیہات سے نہر کی ایک پُلیا کا اُدگھاٹن کر کے لوٹے تھے۔ لیکن دراصل آج خود اُن کا اُدگھاٹن ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ گئے تو تھے وہ اِس اُمید سے کہ وہاں شاندار شامیانہ، جھنڈیاں، مان پتر، ہار، دعوت اور اُن کے جے کارے لگاتا ہوا ایک بڑا مجمع ہوگا لیکن وہاں کا عجیب ہی عالم تھا——ڈپٹی کمشنر، کپتان پولیس اور چند وہ مقامی نیتا جنھوں نے انھیں بہت اصرار سے بُلایا تھا، کچھ درختوں کی آڑ میں چوروں کی طرح چھپے کھڑے تھے اور کوئی ایک درجن کانسٹبل اور تحصیل اور بلاک کے کچھ اہلکار، کئی ہزار آدمیوں کے ہجوم کو جو کالے جھنڈے لئے "کھاد منتری ہائے ہائے!" "کھاد منتری واپس جاؤ!" کے نعرے لگا رہا تھا۔ کبھی لاٹھیاں دکھا کر اور کبھی ہاتھ جوڑ کر، روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ شامیانہ ایک طرف گرا پڑا تھا اور منچ کے پاس بُچی کُھچی جھنڈیاں اور ہار کسی عاشقِ جانباز کے مزار کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ ایسے نازک موقع پر بھولو داس کی موٹر کا نمودار ہونا بس غضب ہی تو ہو گیا۔ جیسے کسی نے جلتے پر تیل کیا پٹرول چھڑک دیا ہو! ہر قسم کی روک ٹوک کو توڑ کر ہجوم ایک بپھرے ہوئے طوفان کی طرح اُس پر جھپٹا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ ڈرائیور نے بڑی عجلت سے موٹر موڑ لی اور اُسے لے کر اُلٹا بھاگا۔ ورنہ بھولو داس کے خیال میں آج اِن کے سورگباش ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اِس پر بھی موٹر کے پیچھے اور چھت پر تڑاتڑ کئی ڈھیلے آکر گرے تھے اور بھولو داس جو اپنی سیٹ پر اوندھے پڑے بڑی رِقّت انگیزی سے رام دُھن گا رہے تھے، مارے خوف کے ایک ایک بالشت اُچھل پڑے تھے۔

جان بچی لاکھوں پائے خیر سے بدھو گھر کو آئے، کے مصداق جب اُن کی موٹر اُن کی کوٹھی کے پورٹیکو میں آکر رُکی تو وہ اپنے ہمراہ آنے والے پرسنل اسسٹنٹ پر برس ہی تو پڑے۔

"یہ پُلیا کا اُدگھاٹن تھا یا کسی پاگل خانے کا؟ آپ کلکٹر سے جواب طلب کیجئے"

"بہت اچھا حضور! کلکٹر نے کچھ روز پہلے لکھا تھا کہ وہاں کے لوگ سُوکھا پڑ جانے کی وجہ سے بہت بیکل ہو رہے ہیں اور دو تین آدمی بھوک سے مر بھی چکے ہیں"

"جھوٹ سب جھوٹ بمجھے تو ایک بھی بھوکا دکھائی نہ دیا وہاں توپوں کی طرح داغ رہے تھے نعرے اور پھینک رہے تھے ڈھیلے سب!"

"جی حضور!"

"اچھا تم کلکٹر سے کچھ نہ پوچھنا بلکہ اخباروں میں میری ایک تقریر جو مجھے وہاں کرنی تھی چھپوا دو۔ یہی کہ اب کی پنج سالہ یوجنا میں وہاں کے لئے سرکار پانی کا انتظام کرنے والی ہے اور امریکہ سے اناج کا جہاز آتے ہی گاؤں گاؤں راشن کی دکانیں کھول دی جائیں گی اور یہ بھی لکھ دینا کہ بہت شاندار سواگت اور آدگھاٹن رہا!" پاس ہی کھڑے ہوئے اردلی کو انھوں نے حکم دیا۔ "دیکھو میں آج کسی سے نہیں مل سکتا۔ میری طبیعت سست ہے۔"

اپنے کمرے کی تنہائی میں پہنچ کر مانیہ بھولپو داس انگاروں پر لوٹنے لگے۔ آدگھاٹن کی گڑبڑ تو ایک معمولی سی بات تھی۔ ایک پنساری سے منتری بن جانے کی لمبی سیاسی زندگی میں ان پر ایسے یا اس قسم کے واقعات بیسیوں بار بیت چکے تھے لیکن آج سویرے کابینہ کی بیٹھک کے سلسلے میں ان پر جو حادثہ گزرا تھا وہ اسے یاد کرتے تو کراہ کراہ اٹھتے۔ ان کی رائے میں آج کے دن کی ابتدا ہی بڑے بیہودہ طریقے سے ہوئی تھی۔

سویرے کابینہ کی بیٹھک ہونے والی تھی اور چونکہ شرما جی مکھیہ منتری بیماری کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکتے تھے لہٰذا قاعدے سے ان کی نیابت یعنی کابینہ کی صدارت کا حق بھولپو داس کو پہنچتا تھا۔ وہ سب منتریوں میں سب سے زیادہ سینئر اور ساتھ ہی ساتھ موٹے بھی، مطلب یہ کہ رعب داب والے تھے۔ بھولپو داس سیاست کے میدان کے پرانے کھلاڑی اور دور کی کوڑی لانے والے پرانے گھاگ تھے۔ وہ اڑتی چڑیا کو پہچانتے اور ہوا کے بدلے ہوئے رخ کو ماہر موسمیات سے پہلے سونگھ لیتے۔ وہ آج رسمی طور سے مکھیہ منتری کی نیابت کرنے کے پردے میں اپنے بہت پرانے خواب کی تعبیر کی پرچھائیں دیکھ رہے تھے۔ ایک دفعہ وہ مکھیہ منتری کی گدی پر جھوٹ موٹ بھی پہنچ جائیں تو آئندہ کے لئے اس پر ان کا حق قائم ہو جائے گا اور پھر کس کے منہ میں دانت ہیں جو ان کے جیتے جی انھیں اس سے محروم رکھ سکتا ہے۔ ایسا غدر مچا دیں گے پارٹی میں وہ کہ اس کی چولیں تک ہل جائیں گی۔ ان کے ہمدرد ایک بہت پہنچے ہوئے سیاسی لال بجھکڑ نے ان کے کان میں پھونک رکھا تھا کہ موجودہ مکھیہ منتری کے خلاف کچھ سرکاری ٹھیکوں میں گول مال کرنے کے سلسلے میں جو انکوائری برسوں سے چل رہی تھی اس کی رپورٹ مرکزی سرکار کو پہنچ چکی ہے۔ وہ سولہ آنے شرما جی کے خلاف ہے اور خاص پارٹی کے ممبر اس رپورٹ کو منظر عام پر لانے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ پارٹی کا اعلیٰ کمان چاہتا ہے کہ اس معاملے کو رفع دفع کرنے اور پارٹی کی بچی کھچی عزت بنائے رکھنے کے لئے شرما جی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیں اور ان کی اس قربانی کے انعام میں انھیں کسی ریاست کا راج پال بنا دیا جائے۔ عام لوگ اس ہونے والے ناٹک سے بالکل ہی بے خبر تھے۔ لیکن بھولپو داس نے اس میں اپنا سوانگ بھرنے کے لئے بہت پہلے سے تیاری شروع کر دی تھی۔ انھوں نے ابھی کچھ ہی دن پہلے اپنے محکمے کی سرکردگی میں ساری ریاست میں ایک چوہے مار ہفتہ منوایا تھا اور ریاست کی جنتا کو اپنی راسئے میں ان کے آئندہ ہونے والے مکھیہ منتری سے اچھی طرح روشناس کرانے کے لئے ایک اشتہار میں ایک موٹے سے چوہے کے مقابل میں اپنی بھی تصویر چھپوا کر جس میں ان کی مونچھیں چوہے کی مونچھوں سے کچھ زیادہ ہی شاندار نظر آتیں، ساری ریاست کے ایک ایک کوچے اور گلی میں چپکوا دیا تھا۔ اشتہار کا عنوان تھا "ان کو مار و یہ خطرناک ہیں!"

کابینہ کی بیٹھک کے وقت کا اعلان نو بجے کیا جاتا تھا۔ لیکن عام طور سے سب منتری دس بلکہ ساڑھے دس بجے سے پہلے اکٹھا ہی نہ ہو پاتے۔ خود مکھیہ منتری کی گھڑی ہمیشہ کم سے کم ایک گھنٹہ سست رہتی۔ آج چونکہ بھولپو داس کو بیٹھک میں شرکت کے لئے زیادہ بے چینی تھی۔ لہٰذا وہ تیار تو ساڑھے آٹھ بجے ہی ہو گئے تھے اور چاہتے تو فوراً روانہ بھی ہو جاتے لیکن اپنی دور اندیشی کے تحت انھوں نے کچھ توقف کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ انھوں نے خیال کیا کہ اگر وہ خلاف معمول وقت پر پہنچ جائیں گے تو اس سے کچھ اوچھا پن ظاہر ہوگا۔ لوگ سوچیں گے کہ وہ مکھیہ منتری کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے حد سے زیادہ بے چین ہیں۔ ان کا رویہ تو کچھ ایسا ہونا چاہئے جیسے وہ اس کے لئے نہیں بلکہ خود یہ کرسی ان کے لئے تڑپ رہی ہے! بات تو جب ہے کہ سارے منتری اور ان کے پیچھے ان کے سکریٹری اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوں اور صدر میں مکھیہ منتری کی کرسی ان کے انتظار میں کسی عاشق ناکام کی آغوش کی طرح خالی پڑی ہو۔ وہ مسکراتے ہوئے کابینہ کے کمرے میں داخل ہوں تو سب اٹھ کر ان کی تعظیم کریں اور وہ اس متانت اور وقار کے ساتھ جیسے ریاست کی ساری پریشانیوں کا بوجھ وہ تنہا اپنے مضبوط کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کرسی کو کھینچ کر اس پر براجمان ہو جائیں۔

کابینہ کے کمرے میں اپنے بھاری بھرکم داخلے کے متعلق اُنھوں نے ایک کے بعد ایک جتنی بھی تصویریں اپنے ذہن کے پردے پر کھینچیں وہ شاندار سے شاندار تر ہوتی چلی گئیں۔ بھولو داس کا جی تو یہی چاہتا کہ وہ گھنٹوں بیٹھے یہی شغل جاری رکھیں اور اپنے اِس جُملہ حقوق محفوظ والے سنیما سے لُطف اندوز ہوتے رہیں۔ لیکن پھر وہ اپنی فطری بے چینی اور بوکھلاہٹ سے مجبور ہو گئے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ دس بجے سے پہلے پہنچنا قبل از وقت ہوگا۔ وہ ساڑھے نَو بجے اپنی موٹر پر سیکرٹریٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔

سیکرٹریٹ پہنچ کر وہ لپکتے جھپکتے کابینہ کی بیٹھک کے کمرے کی طرف بڑھے تو سیڑھیوں کے پاس برآمدے میں اُنھیں دیو دت مصرا اور شیخ چراغ اللہ باتیں کرتے ہوئے مل گئے۔ بھولو داس اِن دونوں کو اپنا خاص آدمی سمجھتے تھے۔ لیکن اِس وقت اِن دونوں کے سلام کرنے اور پھر مُسکرانے کے انداز میں اُنھیں کچھ مِلی بھگت کی بُو محسوس ہوئی (سیاست میں دیکھنے اور سُننے سے زیادہ زیادہ ضرورت سُونگھنے کی ہوا کرتی ہے) لیکن اِسے نظر انداز کرکے اُنھوں نے پکارا: "میٹنگ میں نہیں چلئے گا؟" اِس پر شیخ چراغ اللہ نے پان کی پیک بھرے منہ سے کچھ ایسا غوں غوں جواب دیا کہ سمجھ میں نہ آیا، البتّہ اُن کے ہاتھ ہلانے کے انداز سے کچھ ایسا پتہ چلا جیسے "تو چل میں آیا" والا مضمون ہے۔

بھولو داس آگے بڑھے تو کابینہ کی بیٹھک کے کمرے کی طرف سے قریب قریب سارے منتری جس میں لالہ چھجّو مل سب سے آگے تھے، آتے ہوئے ملے۔ اُن کا ماتھا ٹھنکا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ لیکن اُنھوں نے نمستے کے لئے ہاتھ اُٹھا کر مُسکراتے ہوئے پُوچھا: "کیا آج بیٹھک کا ارادہ نہیں ہے؟"

"ہو بھی چکی بیٹھک، نَو بجے کا وقت تھا اور اب تو دس بجنے والے ہیں۔ بڑھاپے میں سویرے ذرا جلدی اُٹھنا مشکل ہی ہوتا ہے۔" بھاشکر بابو نے جو لالہ چھجّو مل کی ناک کے بال تھے چبا چبا کر کہا۔ اُن کے آخری جملے پر کئی منتری بھی مُسکرائے دیئے۔

بھولو داس پر بجلی سی گری لیکن سیاست کے داؤ پیچ سے پُوری طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سیاست میں کوئی شخص اُس وقت تک ہار ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ خود اپنی ہار مان نہ لے، اِس لئے زہر کا گھونٹ پی کر بھی ہنستے ہوئے بولے۔

"اجی اِن پُرانے چاولوں کی قدر آپ کیا جانیں؟ وقت پڑنے پر بڑا کام دیتے ہیں یہ!"

"اجی قحط میں پُرانے کیا نئے چاول بھی غنیمت ہوتے ہیں" لالہ چھجّو مل نے کہا۔ لیکن بھولو داس سُنی اَن سُنی کرکے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ بڑھاپے والی چوٹ سے وہ اور بھی تلملا اُٹھے تھے۔ اِدھر چند ہفتوں سے وہ کابینہ کے لئے پُرانے خون اور نئے خون کی کچھ باتیں سُن رہے تھے لیکن اُن کی سمجھ میں اِس کے متعلق کچھ نہ آیا تھا۔ اُن کی عمر قریب اَرسٹھ سال کی تھی لیکن وہ اپنے خون میں کسی طرح کی بوسیدگی محسوس نہ کرتے۔ اُن کے دشمن اُنھیں کابینہ سے نکالنے کے لئے اِس طرح کی ہوائیاں اکثر اُڑاتے رہتے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اُنھوں نے اپنے اردلی کو حکم دیا کہ وہ فوراً اُن کے سکریٹری کو بُلا لائے۔

بھیگی بلّی بنا سکریٹری آیا تو بھولو داس اُس پر خونخوار دوڑے۔

"کِس وقت شروع ہوئی میٹنگ؟"

"نو بجے۔"

"صدارت کس نے کی؟"

"لالہ چھجّو مل نے۔"

"کِس نے پیش کیا تھا اُن کا نام؟"

"بھاشکر بابو نے۔"

"معاملہ میرے محکمے کا تھا۔ مرکزی سرکار کو ریاست کے غلّے کی مانگ کا بیورا بھیجا جانے والا تھا اور میٹنگ میرے بغیر شروع کر دی گئی؟ آپ نے کاغذات کیوں پیش کیے؟"

"مجھ سے کاغذات مانگے ہی نہیں گئے۔ زبانی یہ پرستاؤ پاس کر دیا گیا کہ چونکہ مکھیہ منتری بیمار ہیں اِس لئے اِن کے نائب کی حیثیت سے لالہ چھجّو مل فوراً بذریعہ ہوائی جہاز دہلی جائیں اور مرکزی سرکار کو قحط سالی کی صورتِ حال بتا کر ریاست کے لئے زیادہ سے زیادہ غلّہ الاٹ کرانے کی کوشش کریں۔"

بھولو داس کو چکّر سا آ گیا لیکن اُنھوں نے بڑی مشکل سے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا: "قحط سالی کی کانفیڈنشل فائل فوراً میرے پاس لے آیئے۔"

اور پھر جیسے ہی سکریٹری نے اُنھیں فائل لا کر دی اُنھوں نے اُسے اپنے ڈیسک کے ڈبل لاک میں بند کر دیا اور اُس کی کُنجیاں اپنی

ی کی اندرونی جیب میں رکھ لیں۔ ایک ہلکی سی ایسی مسکراہٹ
ہونٹوں پر نمودار ہوئی جیسے کسی بھوکی بلی نے کوئی مسلم چوہا نگل کر
ن کی سانس لی ہو!

بھولو داس کی الجھن اور گھبراہٹ دیکھ کر اُن کی شریمتی جی
ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انھوں نے جلدی سے انھیں ہلکا پھلکا
ھلایا اور جلد سو جانے کا مشورہ دیا۔
رات کے گیارہ بج چکے تھے اور بھولو داس اگر سو نہیں تو
بھی نہیں رہے تھے۔ دفعتاً اُن کے سرہانے رکھے ہوئے ٹیلیفون کی
ھنٹی بجی۔ یہ ٹیلیفون اُن کا خفیہ تھا اور اس کا نمبر سوائے اُن کے پرسنل
اسسٹنٹ اور چند مخصوص دوستوں کے اور کسی کو معلوم نہ تھا۔ انھوں نے
ڑبڑا کر ٹیلیفون کا رسیور اٹھا لیا۔
"ہیلو! میں ہوں بھولو داس کمار منسٹری! آپ کون
صاحب [illegible]

[illegible]

اب آپ کو کسی دوسرے کو اطلاع دینے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں
پرماتما کی دیا سے سب انتظام ٹھیک کر لوں گا۔"
اور اس کے بعد بھولو داس نے نہ صرف رات بھر پلک نہ جھپکائی،
بلکہ زمین و آسمان کے قلابے ملا کر رکھ دیئے۔ راج پال کو اپنا پرسنل
اسسٹنٹ بھیج کر اطلاع، کابینہ کے منتریوں، چیف سکریٹری اور صوبے
کے سارے اعلیٰ افسران کو ٹیلیفون، اخبار نویسوں کو بیانات۔ صوبے بھر
میں تین روز سوگ منانے کے لئے چھٹی کا اعلان۔ تمام سرکاری عمارتوں پر
جھنڈوں کے سرنگوں کرنے جانے کا حکم۔ چیف سکریٹری اور پولیس کے
اعلیٰ افسران سے مشورے کے بعد جنازے کے جلوس کے راستے کی تجویز۔
فوجی گاڑی اور بینڈ کا انتظام۔ سورگ گھاٹ پر انتم سنسکار کا پورا
پربندھ۔ وغیرہ وغیرہ۔ مکھیہ منتری کے اچانک دیہانت سے بھولو داس
سب سے سینئر منتری ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو اُن کا قدرتی جانشین
سمجھنے لگے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ سنبھالتے ہی وہ جو پہلا کام کر
وہ یہی کہ [illegible]

[illegible]

وہ
مطلب یہ کہ
پرانے کھلاڑی اور [illegible]
اڑتی چڑیا کو پہچانتے اور
پہلے سونگھ لیتے۔ وہ آج رسمی طور
میں اپنے بہت پرانے خواب کی تعبیر
دفعہ وہ مکھیہ منتری کی گدی پر جلوہ
لئے اس پر اُن کا حق قائم ہو جائے گا اور
اُن کے جیتے جی انھیں اس سے محروم رکھ سکتا
پارٹی میں وہ کہ اس کی جڑیں تک ہل جائیں گی
پہنچے ہوئے سیاسی لال جھگڑو نے اُن کے
موجودہ مکھیہ منتری کے خلاف کچھ سرکاری
سلسلے میں جو انکوائری برسوں سے چل رہی تھی

ہوئے جارہے ہوں۔ مجمع کو اُن کی یہ ادا بہت پسند آئی اور اس نے اُن کے "زندہ باد" کے دو چار نعرے غم سے بوجھل فضا میں اور جھونک دئے۔

بھولو داس کو اپنے علاوہ کوئی دوسرا منتری موقع پر نظر نہ آیا۔ وہ دل ہی دل میں مُسکرائے کہ اس ساری کارگزاری کا سہرا صرف انہیں کے سر رہے گا۔ انھیں بوڑھا کہنے والوں کو آج مُنہ کی کھانا پڑے گی۔

سات بجے راج کوٹلا کی طرف سے مُکھیہ منتری کی موٹر اور اس کے پیچھے ایک اسٹیشن ویگن آتی دکھائی دی۔ فوجی سپاہی، پولیس کانسٹبل اور سب افسران اپنی اپنی جگہوں پر چوکنا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ بینڈ نے دھیمے سُروں میں ماتمی دھن بجانا شروع کر دی۔ مجمع میں کھلبلی مچ گئی اور وہ بڑے والہانہ انداز میں "شرما جی امر ہو گئے!" "شرما جی امر ہو گئے!" کے نعرے لگانے لگا اور بے اختیار آگے کی طرف جھپٹا۔ اس کو قابو میں رکھنے کے لئے امدادی پولیس کو تھوڑا سا لاٹھی چارج بھی کرنا پڑا۔ ایک بڑے فوجی دستے نے اُلٹے بندوق یا دوں کے ساتھ دو سمتوں سے پیش قدمی کی اور موٹروں کے یکے بعد دیگرے رُکتے ہی بڑے ضبط و نظم کے ساتھ سلامی دی۔

آنے والی پہلی موٹر میں سے ایک بہت ہی متعجب اور حیرت زدہ مُنہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے ریاست کے مُکھیہ منتری شرما جی جلدی سے اُتر کر سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی!!



سازِ دل پر چھِڑا ہے غم کا راگ
ہر نفس ڈس رہا ہے بن کر ناگ

سانس شعلہ، نظر شرر، دل آگ
ہائے یہ زندگی کا دیپک راگ

ہے جوانی میں یوں غمِ دوراں
جیسے لپٹا ہو شاخِ گُل سے ناگ

زندگی کے قریب رہنا ہے
تو غمِ زندگی سے دُور نہ بھاگ

آشیانوں سے اُٹھ رہا ہے دُھواں
لگ نہ جائے کہیں چمن پہ آگ

صبح آئی ہے خیر مقدم کو
اے دلِ شب گزیدہ اب تو جاگ

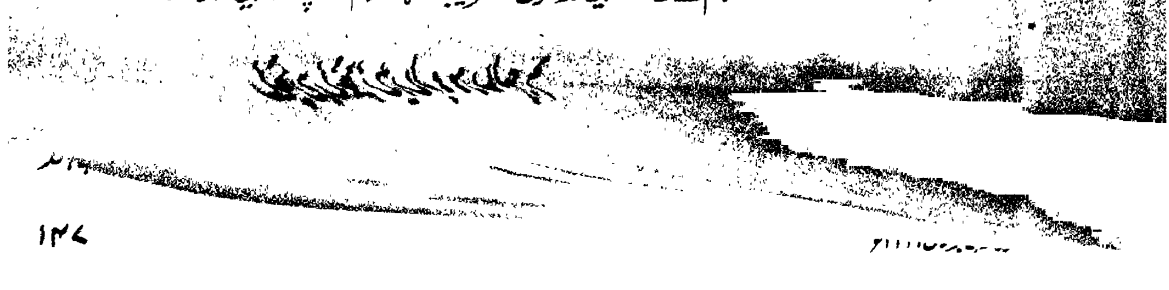
زندگی تو سدا سہاگن ہے
کون اُجاڑے گا زندگی کا سہاگ

آگ دل میں لگا تو دی تم نے
کیا بجھا بھی سکو گے دل کی آگ

اب وہ دل ہے نہ دل کی کیفیت
اب نہ وہ بزم ہے نہ ساز نہ راگ

ہم نے کھائے ہیں دوستوں کے فریب
ہم نے پالے ہیں آستیں میں ناگ

سرعتاجگی بی۔ اے



طنزیہ

میری بھارت یاترا

فکر تونسوی

خوشتر صاحب (خدا انھیں دل اور کار چُرانے والوں سے محفوظ رکھے۔ آمین!) کا تقاضا ہے کہ میں ایک نئے سلسلۂ مضامین کا آغاز کروں۔ یہ تقاضا اُنھوں نے کچھ عاشقانہ اور کچھ محبوبانہ انداز میں کیا ہے۔ اُنھوں نے انکشاف کیا ہے کہ وہ اور میں ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں۔ آہ! اُنھوں نے یہ انکشاف اُس وقت کیا جب ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

بہر کیف اظہارِ عشق چاہے کسی منزل پر کیا جائے، وہ عشق ہے اور عاشق و محبوب پر لازم آتا ہے کہ وہ اُس کی پیروی کریں۔ (بے چارے!)

"میری بھارت یاترا" — میرے اِس نئے سلسلۂ مضامین کا عنوان ہے۔ بظاہر یہ انتہائی غلط بلکہ مضحکہ خیز عنوان دکھائی دیتا ہے۔ لیکن قلم اُٹھاتے وقت میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں بھارت میں ایک اجنبی ہوں اور کسی غیر مُلکی سیّاح کی طرح ہندوستان کی یاترا پر آیا ہوا ہوں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم سب ہندوستانی اِس دیش میں اجنبی ہیں اور ہندوستان کے متعلق ہماری معلومات بالکل ویسی ہیں جیسے چراغ تلے والے اندھیرے کو ہوتی ہیں۔ یعنی ع

اِس گھر کو کھا گیا ہے اندھیرا چراغ کا

اِس لئے میں نے یہ بہتر سمجھا کہ اپنے پیارے ہندوستان کو ایک غیر مُلکی سیاح کی آنکھ سے دیکھا جائے کیونکہ اپنا عیب اور حسن اگر دوسروں کی آنکھ سے دیکھا جائے تو تصویر ذرا صاف آجاتی ہے۔ وظیفہ خواہ شاعر کا عقیدہ نہیں بنتی۔

ہندوستان دُنیا کا واحد مُلک ہے جو خود ہندوستانیوں کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ اِس لئے ہر ہندوستانی اپنے ہندوستان کو سمجھنے کے لئے دو طریقے استعمال کرتا ہے:-

۱۔ برٹش میوزیم لائبریری کا رُخ کرتا ہے۔ جہاں وید اور اُپنشد سے لے کر نالیاں صاف کرنے کے ہندوستانی طریقے پر کتابیں پڑھتا ہے اور ہندوستان میں واپس آکر اعلان کرتا ہے کہ ہمارا ہندوستان ایک عظیم مُلک ہے۔

۲۔ غیر مُلکی سیّاحوں کو ہندوستان آنے کی دعوت دیتا ہے اور اُن کے ہندوستان آنے سے پہلے پہلے پینٹر سے بڑے بڑے بورڈ لکھواکر چوراہوں پر لٹکا دیتا ہے: "بدیشی سیّاح ہمارے مہمان ہیں اور ہم ہندوستانی روایتی طور پر مہمان نواز ہیں" — اور پھر بدیشی سیّاح صرف دو گھنٹے تک تاج محل میں گھوم کر اُس پر ایک ہزار صفحے کی کتاب لکھ ڈالتے ہیں جسے ہندوستانی لوگ اُسی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، جس ذوق و شوق سے سمگلنگ کے سونے کے زیور بنواتے ہیں۔

چنانچہ ایک دن ایک ہندوستانی رئیس زادے مسٹر پانڈے نے برٹش میوزیم لائبریری میں مجھے ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ مسٹر پانڈے تواریخِ ہندوستان کی ہائر اسٹڈی کے لئے لندن تشریف لائے تھے۔ مگر یہاں آکر اُنھیں ایک انگریز سٹینوگرافر لڑکی سے عشق ہو گیا اور تواریخِ ہند، انگریز لڑکی کے عشق کے بوجھ تلے دب گئی۔ جس وقت وہ مجھے برٹش میوزیم لائبریری میں ملے، اُس وقت وہ اپنے رئیس والد صاحب کی طرف سے واپسی کرائے کی رقم کے انتظار میں اپنے عشق کی باقیماندہ زندگی گزار رہے تھے اور لائبریری میں جنوبی ہند کی دیوداسیوں کی تصویریں دیکھ دیکھ کر دلِ وحشی کو بہلاتے تھے۔

میں نے پُوچھا: "مسٹر پانڈے! آپ کی اُس انگریز محبوبہ کا کیا بنا؟"

وہ اُداسی اور اشتعال کے ملے جلے لہجے میں بولا: "میں نے اُسے طلاق دے دیا ہے۔ اگرچہ اُس کی پنڈلیاں گوری اور گداز تھیں، جو میرے تنفس میں ہیجان برپا کر دیتی تھیں۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جنوبی ہند

صدری کی اندرونی جیب میں رکھ لیں۔ ایک ہلکی سی ایسی مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی جیسے کسی بھوکی بلّی نے کوئی مسلّم چوہا نگل کر اطمینان کی سانس لی ہو!

بھولپوداس کی اُلجھن اور گھبراہٹ دیکھ کر اُن کی شریمتی جی کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُنھوں نے جلدی سے اُنھیں ہلکا پھلکا کھانا کھلایا اور جلد سو جانے کا مشورہ دیا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے اور بھولپوداس اگر سو نہیں تو جاگ بھی نہیں رہے تھے۔ دفعتہً اُن کے سرہانے رکھے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ ٹیلیفون اُن کا خفیہ تھا اور اِس کا نمبر سوائے اُن کے پرسنل اسسٹنٹ اور چند مخصوص دوستوں کے اور کسی کو معلوم نہ تھا۔ اُنھوں نے ہڑبڑا کر ٹیلیفون کا رسیور اُٹھا لیا۔

"ہیلو! میں ہوں بھولپوداس کھاد منتری! آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں ہوں تیواڑی۔ شرما جی مکھیہ منتری کا ابھی دس بج کر گیارہ منٹ پر راج کوٹلا کے ڈاک بنگلے میں دیہانت ہو گیا!"

"شرما جی کا دیہانت ہو گیا؟" بھولپوداس کے بجلی کا کرنٹ سا لگ گیا اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔

"جی ہاں جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا وہ آج تین روز ہوئے بحالیٔ صحت کے لئے راج کوٹلا آئے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ مصرا اُن کے ڈاکٹر بھی تھے۔ نو بجے وہ سونے کے لئے لیٹے۔ دس بجے اُنھیں ایک ڈکار آئی۔ اور چند ہی منٹ میں وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے۔ مرنے سے چند منٹ پہلے اُنھوں نے آپ کو اطّلاع دینے کے لئے بھی کہا تھا۔"

"ظاہر ہے کہ وہ اپنا جانشین کو مکھیہ منتری بنانا چاہتے تھے۔ بڑے ہی سمجھ دار اور دُور اندیش نیتا تھے وہ۔ اچھا تو میں راج کوٹلا کے لئے فوراً روانہ ہو رہا ہوں۔"

"جی نہیں آپ وہاں سب انتظام کیجئے۔ ہم لوگ شرما جی کو لے کر سات بجے سویرے پہنچ رہے ہیں۔ لال چوکی کے میدان میں آپ لوگ مِل جایئے گا۔"

بھولپوداس جن کے ہوش و حواس اب پورے طور پر بیدار ہو چکے تھے کافی زور سے چیخے۔ "دیکھئے آپ نے مجھے اطّلاع دے دی ہے، اب آپ کو کسی دوسرے کو اطّلاع دینے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں پرماتما کی دیا سے سب انتظام ٹھیک کر لوں گا۔"

اور اِس کے بعد بھولپوداس نے نہ صرف رات بھر پلک نہ جھپکائی، بلکہ زمین و آسمان کے قلابے مِلا کر رکھ دیئے۔ راج پال کو اپنا پرسنل اسسٹنٹ بھیج کر اطّلاع، کابینہ کے منتریوں، چیف سکریٹری اور صوبے کے سارے اعلیٰ افسران کو ٹیلیفون، اخبار نویسوں کو بیانات۔ صوبے بھر میں تین روز سوگ منانے کے لئے چھٹّی کا اعلان۔ تمام سرکاری عمارتوں پر جھنڈوں کے سرنگوں کر دیئے جانے کا حکم۔ چیف سکریٹری اور پولیس کے اعلیٰ افسران سے مشورے کے بعد جنازے کے جلوس کے راستے کی تجویز۔ فوجی گاڑی اور بینڈ کا انتظام۔ سورگ گھاٹ پر انتم سنسکار کا پورا پربندھ۔ وغیرہ وغیرہ۔ مکھیہ منتری کے اچانک دیہانت سے بھولپوداس سب سے سینئر منتری ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو اُن کا قدرتی جانشین سمجھنے لگے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ پد سنبھالتے ہی وہ جو پہلا کام کریں وہ اُن کا چمتکار ثابت ہو اور اُن کے دوستوں اور دشمنوں پر یکساں طور سے اُن کی سوجھ بوجھ اور اُن کی انتظامی قابلیت کی ایسی دھاک بیٹھ جائے کہ پھر اُن کے علاوہ کسی دوسرے کا نام بحیثیت پارٹی لیڈر پیش کرنے کی کسی میں ہمّت ہی باقی نہ رہے۔

معمولی سے معمولی جزئیات تک پر بھی بھولپوداس کی دُور رس نظریں دیکھ کر اعلیٰ سے اعلیٰ افسران تک عش عش کر گئے۔ رات کے تین بجے سے سارے شہر کو لاؤڈ اسپیکروں نے سر پر اُٹھا لیا۔ مکھیہ منتری کے اچانک دیہانت کی خبر کے ساتھ ہی ساتھ مانیہ بھولپوداس کی طرف سے جنتا سے نویدن تھا کہ وہ سویرے چھ بجے ہی شہر سے باہر لال چوکی کے میدان میں جمع ہو جائے۔

رات بھر جاگنے اور سر مغزنی کرنے سے بھولپوداس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ اُن پر بار بار رومال رکھ کر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ یہ مسلسل آہ و زاری کا نتیجہ ہے۔ بازو پر ایک بڑا سیاہ بِلّا لگائے وہ ساڑھے چھ بجے لال چوکی کے میدان میں پہنچے تو پندرہ ہزار کے مجمع نے "شرما جی امر ہو گئے!" کے ساتھ ہی ساتھ "بھولپوداس زندہ باد!" کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ فخر اور خوشی کے مارے اُن کا سینہ کئی انچ پھول گیا۔ لیکن موٹر سے اُترتے وقت اُنھوں نے مصلحتاً اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا اور تھوڑی سی کمر بھی جھکا لی جیسے وہ مارے غم کے نڈھال

ہوتے جا رہے ہوں۔ مجمع کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور اس نے اُن کے "زندہ باد" کے دو چار نعرے غم سے بوجھل فضا میں اور جھونک دیتے۔

بھولو داس کو اپنے علاوہ کوئی دوسرا منتری موقع پر نظر نہ آیا۔ وہ دل ہی دل میں مُسکرائے کہ اِس ساری کارگزاری کا سہرا صرف انھیں کے سر رہے گا۔ انھیں بُوڑھا کہنے والوں کو آج مُنہ کی کھانا پڑے گی۔

سات بجے راج کوٹلا کی طرف سے مُکھیہ منتری کی موٹر اور اس کے پیچھے ایک اسٹیشن ویگن آتی دکھائی دی۔ فوجی سپاہی، پولیس کانسٹبل اور سب افسران اپنی اپنی جگہوں پر چوکنا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ بینڈ نے دھیمے سُروں میں ماتمی دُھن بجانا شروع کر دی۔ مجمع میں کھلبلی مچ گئی اور وہ بڑے والہانہ انداز میں "شرما جی امر ہو گئے!" "شرما جی امر ہو گئے!" کے نعرے لگانے لگا اور بے اختیار آگے کی طرف جھپٹا۔ اس کو قابو میں رکھنے کے لئے امدادی پولیس کو تھوڑا سا لاٹھی چارج بھی کرنا پڑا۔ ایک بڑے فوجی دستے نے اُلٹے ہتھیاروں کے ساتھ دو سمتوں سے پیش قدمی کی اور موٹروں کے یکے بعد دیگرے رُکتے ہی بڑے ضبط و نظم کے ساتھ سلامی دی۔

آنے والی پہلی موٹر میں سے ایک بہت ہی متعجب اور حیرت زدہ، مُنہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے ریاست کے مُکھیہ منتری شرما جی جلدی سے اُتر کر سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مجمع میں بھگدڑ مچ گئی!!

غزل

رعنا جگی بی۔ اے

سازِ دل پر چھڑا ہے غم سا راگ | ہر نفس ڈس رہا ہے بن کر ناگ
سانس شعلہ، نظر شرر، دل آگ | ہائے یہ زندگی کا دیپک راگ
ہے جوانی میں یوں غمِ دوراں | جیسے لپٹا ہو شاخِ گُل سے ناگ
زندگی کے قریب رہتا ہے | تو غمِ زندگی سے دُور نہ بھاگ
آشیانوں سے اُٹھ رہا ہے دُھواں | لگ نہ جائے کہیں چمن پہ آگ
صبح آئی ہے خیر مقدم کو | اے دلِ شب گزیدہ اب تو جاگ
زندگی تو سدا سہاگن ہے | کون اُجاڑے گا زندگی کا سہاگ
آگ دل میں لگا تو دی تم نے | کیا بُجھا بھی سکو گے دل کی آگ
اب وہ دل ہے نہ دل کی کیفیت | اب نہ وہ بزم ہے نہ ساز نہ راگ
ہم نے کھائے ہیں دوستوں کے فریب | ہم نے پالے ہیں آستیں میں ناگ

ہم جہاں ہو وہاں ہیں پھول ہی پھول
ہم جہاں ہیں وہاں ہے آگ ہی آگ

رعنا جگی

طنزیہ

میری بھارت یاترا

فکر تونسوی

خوشتر صاحب (خدا انھیں دل اور کار چرانے والوں سے محفوظ رکھے۔ آمین!) کا تقاضا ہے کہ میں ایک نئے سلسلۂ مضامین کا آغاز کروں۔ یہ تقاضا انھوں نے کچھ عاشقانہ اور کچھ محبوبانہ انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ وہ اور میں ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں۔ آہ! انھوں نے یہ انکشاف اس وقت کیا جب ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

بہر کیف اظہارِ عشق چاہے کسی منزل پر کیا جائے، وہ عشق ہے اور عاشق و محبوب پر لازم آتا ہے کہ وہ اس کی پیروی کریں۔ (بے چارے!)

"میری بھارت یاترا" — میرے اس نئے سلسلۂ مضامین کا عنوان ہے۔ بظاہر یہ انتہائی غلط بلکہ مضحکہ خیز عنوان دکھائی دیتا ہے۔ لیکن قلم اٹھاتے وقت میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں بھارت میں ایک اجنبی ہوں اور کسی غیر ملکی سیّاح کی طرح ہندوستان کی یاترا پر آیا ہوا ہوں کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم سب ہندوستانی اس دیش میں اجنبی ہیں اور ہندوستان کے متعلق ہماری معلومات بالکل ویسی ہیں جیسے چراغ تلے والے اندھیرے کو ہوتی ہیں۔ یعنی ع

اس گھر کو کھا گیا ہے اندھیرا چراغ کا

اس لئے میں نے یہ بہتر سمجھا کہ اپنے پیارے ہندوستان کو ایک غیر ملکی سیّاح کی آنکھ سے دیکھا جائے کیونکہ اپنا عیب اور حسن اگر دوسروں کی آنکھ سے دیکھا جائے تو تصویر ذرا صاف آجاتی ہے۔ وظیفہ خواہ شاعر کا عقیدہ نہیں بنتی۔

ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جو خود ہندوستانیوں کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ اس لئے ہر ہندوستانی اپنے ہندوستان کو سمجھنے کے لئے دو طریقے استعمال کرتا ہے:۔

۱۔ برٹش میوزیم لائبریری کا رخ کرتا ہے۔ جہاں وید اور اپنشد سے لے کر نالیاں صاف کرنے کے ہندوستانی طریقے پر کتابیں پڑھتا ہے اور ہندوستان میں واپس آکر اعلان کرتا ہے کہ ہمارا ہندوستان ایک عظیم ملک ہے۔

۲۔ غیر ملکی سیّاحوں کو ہندوستان آنے کی دعوت دیتا ہے اور اُن کے ہندوستان آنے سے پہلے پہلے پینٹر سے بڑے بڑے بورڈ لکھوا کر چوراہوں پر لٹکا دیتا ہے۔ "بدیشی سیّاح ہمارے مہمان ہیں اور ہم ہندوستانی روایتی طور پر مہمان نواز ہیں" — اور پھر بدیشی سیّاح صرف دو گھنٹے تک تاج محل میں گھوم کر اس پر ایک ہزار صفحے کی کتاب لکھ ڈالتے ہیں جسے ہندوستانی لوگ اُسی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، جس ذوق و شوق سے سمگلنگ کے سونے کے زیور بنواتے ہیں۔

چنانچہ ایک دن ایک ہندوستانی رئیس زادے مسٹر پانڈے نے برٹش میوزیم لائبریری میں مجھے ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ مسٹر پانڈے تواریخِ ہندوستان کی ہائر اسٹڈی کے لئے لندن تشریف لائے تھے۔ مگر یہاں آکر انھیں ایک انگریز سٹینو گرافر لڑکی سے عشق ہو گیا اور تواریخِ ہند، انگریز لڑکی کے عشق کے بوجھ تلے دب گئی۔ جس وقت وہ مجھے برٹش میوزیم لائبریری میں ملے، اس وقت وہ اپنے رئیس والد صاحب کی طرف سے واپسی کرائے کی رقم کے انتظار میں اپنے عشق کی باقیماندہ زندگی گزار رہے تھے اور لائبریری میں جنوبی ہند کی دیو داسوں کی تصویریں دیکھ دیکھ کر دلِ وحشی کو بہلا رہے تھے۔

میں نے پوچھا "مسٹر پانڈے! آپ کی اس انگریز محبوبہ کا کیا بنا؟"

وہ اداسی اور اشتعال کے ملے جلے لہجے میں بولا "میں نے اسے طلاق دے دیا ہے۔ اگرچہ اس کی پنڈلیاں گوری اور گداز تھیں جو میرے تنفس میں ہیجان برپا کر دیتی تھیں۔ لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جنوبی ہند

کی دیوداسیوں کی پنڈلیاں بھی گوری اور گُداز ہوتی ہیں چنانچہ میں نے سوچا کہ اگر میں لندن آنے کی بجائے جنوبی ہند کا رُخ کرتا تو مقابلتاً کم خرچ پر مجھے پنڈلیوں کا علم حاصل ہو جاتا۔"

میں نے اپنی مُسکراہٹ دباکر کہا۔ "صرف علم حاصل ہوتا، پنڈلیاں حاصل نہ ہوتیں۔ جبکہ لندن میں آپ کو علم اور پنڈلیاں دونوں حاصل ہو گئی تھیں۔"

مسٹر پانڈے بھڑک اُٹھا۔ "یہی تو ہم ہندوستانیوں کی بے وقوفی ہے کہ تین سو سال تک انگریزوں نے پنڈلیوں کے جھانسے پر ہمیں غلام رکھا۔ کاش! ہماری ہندوستانی لڑکیاں اپنی گوری اور گُداز پنڈلیوں کو چُھپا چُھپا کر نہ رکھتیں تو ہم کبھی غلام نہ بنتے۔ لیکن مہاتما گاندھی کی دُور رس ذہانت کی بدولت ہم اب دیش بھگت ہو گئے ہیں اور اب انگریز حسیناؤں کی گوری ننگی پنڈلیاں ہمیں گمراہ نہیں کر سکتیں۔ انگریز لڑکی صرف ایک اچھی محبوبہ بن سکتی ہے، اچھی بیوی نہیں۔"

"اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟" میں نے اُس دیش بھگت سے پُوچھا جو تین سو سال کے بعد عقل مند ہو چُکا تھا اور انگریز محبوبہ کو یوں طلاق دے چُکا تھا۔ جیسے اس نے سامراج سے آزادی حاصل کی ہو۔

وہ "انقلاب زندہ باد" قسم کے لہجے میں بولا۔ "میں ہندوستان لَوٹتے ہی جنوبی ہند کی ایک دیوداسی سے شادی کر لوں گا۔ اُس کی گوری اور گُداز پنڈلیوں کو ننگا رہنے کا حکم دوں گا اور پھر ہندوستان بھر میں ایک آندولن شروع کروں گا کہ اپنی آزادی کی حفاظت چاہتے ہو تو ہندوستانی مہلاؤں کے اندر دیش بھگتی پیدا کرو اور اُن کی پنڈلیوں کو ننگا کر دو۔"

چنانچہ کچھ مہینے بعد جب میں ہندوستان کی یاترا پر آیا تو مسٹر پانڈے کی شادی ہونے والی تھی۔ مگر جنوبی ہند کی کسی دیوداسی سے نہیں بلکہ پلاسٹک کے برتن بنانے والے ایک کارخانہ دار کی لڑکی سے۔ لڑکی بھی "ولایت رِٹرن" تھی اور وہاں ایک انگریز آرٹسٹ سے ناکام عشق کر چُکی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستانی لڑکے اور لڑکیاں عشق کرنے کے لئے ولایت جاتے ہیں۔ مگر شادیاں ہندوستان میں آکر کرواتے ہیں۔ کیونکہ شادی اُن کے لئے دیش بھگتی کا "سمبل" ہوتی ہے۔

دراصل ہندوستانی لوگ "عشق" کو بداخلاقی سمجھتے ہیں اور شادی کو اِس بداخلاقی کا مُنہ توڑ جواب کہتے ہیں۔ جب میں نے ایک ہندوستانی جرنلسٹ سے اِس بداخلاقی کے متعلّق استفسار کیا تو وہ کچھ جھینپ گیا اور پھر اپنی جھینپ مِٹانے کے لئے انگریزی میں بولنے لگا۔ "یہ غلط اِتّہام ہے۔ یہ انگریزوں کا جھُوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ ہمارے ہندوستان میں بہت سے لوگ "لَو میرج" کرتے ہیں اور اگر "لَو میرج" ناکام ہو جائے تو۔ ۔ ۔"

"جو عام طور پر ہو جاتی ہے۔" میں نے بات کاٹی۔

"تو ہم ایک دوسرے کو طلاق نہیں دیتے۔ بلکہ الگ الگ زندگی گزارنا شروع کر دیتے ہیں، تاکہ عمر کے کسی مرحلے پر بھی ہم دونوں پھر ازدواجی زندگی گُزارنے پر آمادہ ہو جائیں۔ ہمارے یہاں محبت ایک مقدّس جذبہ ہے، لیکن ازدواج دو رُوحوں کا ازلی اور ابدی ملاپ ہے۔"

وہ جرنلسٹ اپنی پہلی محبوبہ عرف بیوی کو چھوڑ چُکا تھا اور آج کل ایک اور لڑکی عرف محبوبہ سے عشق کر رہا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ بالآخر اپنی پہلی محبوبہ سے تعلّقات کی تجدید کر لے گا اور موجودہ محبوبہ کو مجبور کر دے گا کہ وہ خودکشی کرنے کی بجائے کسی دوسرے آدمی سے شادی کر لے۔

چند دن بعد میں نے ایک ہندوستانی اخبار میں پڑھا کہ ایک جرنلسٹ اور اُس کی محبوبہ نے ایک ہوٹل میں خودکشی کر لی۔ میں نے اِس خوف سے اُس خبر کی مزید تفتیش کرنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں یہ وہی جرنلسٹ نہ ہو۔ اور اُس کی یہ محبوبہ اُس کی پہلی بیوی نہ ہو۔



کیونکہ اس تفتیش سے عشق کی بداخلاقی نمایاں ہو جاتی۔

ہندوستانی عشق کے کردار میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ خاموش ہوتا ہے۔ اس میں کوئی آواز نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہندوستانی لوگ عشق سے نہیں ڈرتے، آواز سے ڈرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں ننانوے فیصدی عشق بے آواز رہ جاتے ہیں۔ کسی کو علم بھی نہیں ہوتا کہ فلاں لڑکی فلاں لڑکے سے عشق کر رہی ہے۔ بلکہ کئی مرتبہ تو محبوبہ اور عاشق دونوں کو علم نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے سے عشق کر رہے ہیں۔ اس خاموش اور بے ضرر عشق کا انکشاف صرف اس وقت ہوتا ہے، جب دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اور خاوند اپنی بیوی سے کہتا ہے "میں تو تمہارے پہلے ہی تیرِ نظر کا گھائل ہو گیا تھا۔"

اور بیوی ساڑی کے پلّو کو اپنے منہ میں چباتے ہوئے شرما کر کہتی ہے "ہائے! کیسی بے شرمی کی بات کرتے ہیں آپ؟ گھائل تو میں بھی ہوئی تھی۔ لیکن میں نے شرم کے مارے آپ کو بتایا نہیں تھا۔"

مجھے ایک ہندوستانی دوست کی شادی میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ لوگ اپنی شادی پر ایک جلوس نکالتے ہیں۔ جیسے ورکر لوگ اپنے مطالبات کا چارٹر لے کر ایوانِ حکومت کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ جلوس میں بے حد جوش و خروش ہوتا ہے اور وہ فاتحانہ شان سے چلتا ہے۔ سب سے آگے بینڈ باجہ پارٹی ہوتی ہے۔ جس کے ممبروں کی وردی کسی انتہائی ناقص ٹیلر ماسٹر کی سلی ہوئی ہوتی ہے۔ دُور سے وہ موسیقاروں کی بجائے سرکس کے جوکر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بیگار کیمپوں کے نہایت بیزار اور تھکے ہوئے انسان دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بینڈ پر فلمی گانوں کی دُھنیں بجاتے ہیں۔ اوریجنل دُھنیں نہیں بجا سکتے۔ کیونکہ انھیں معاوضہ کم ملتا ہے۔ ان بینڈ باجے والوں کے متعلق ہندوستان میں ایک لطیفہ بھی مشہور ہے جو ان کی دُھنوں سے زیادہ پُرلطف ہے کہ ایک مرتبہ جب دُلھن اپنے دُولھا کے گھر جانے کے لئے ڈولی میں سوار ہوئی تو ہندوستانی رواج کے مطابق وہ گھونگٹ میں منہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔ چنانچہ بینڈ باجہ پارٹی نے صورتِ حالات کی دردناک تصویر کھینچنے کے لئے ایک غمناک دُھن بجانا شروع کر دی جس کے شروع کے بول تھے ؂

اب روتی ہے وِدھوا بچاری

ہندوستانی لوگوں کی یہ عظمت ہے کہ وہ اپنے آنسوؤں کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ اپنا مذاق آپ اڑانا مذاق نہیں ہے۔ مگر ہندوستانی



اس معاملے میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔

جلوس میں بینڈ باجے کے پیچھے ایک گھوڑی ہوتی ہے۔ جس پر دُولھا یوں سوار ہوتا ہے، جیسے وہ حملہ آور فوج کا کمانڈر انچیف ہو۔ اس کے سر پر ایک تاج ہوتا ہے، جو کرائے پر مل جاتا ہے۔ گھوڑی بھی کرائے پر لی جاتی ہے۔ ہندوستانی روایات کے مطابق گھوڑی نہیں بلکہ گھوڑا بادشاہ کی سواری تھی اور اُسے فاتح اور حاکم کا سمبل سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی دُولھا کی حیثیت بھی ایک فاتح کی سی ہوتی ہے، جو دُلھن کو ایک مُلک سمجھ کر اس پر حملہ آور ہوتا ہے، اس پر غاصبانہ قبضہ کرتا ہے اور پھر بینڈ باجے کے ساتھ فاتحانہ شان سے، گھوڑی پر سوار ہو کر دُلھن کے دارالسلطنت میں داخل ہوتا ہے اور پھر وہاں اشوبیدھ یگیہ کرتا ہے ——— امتدادِ زمانہ کے باعث جب روایات کا زوال شروع ہوا تو گھوڑا غائب ہو گیا اور اس کی بجائے گھوڑی آ گئی اور وہ بھی مریل اور کرائے کی گھوڑی۔ ہندوستانی ہر شے ترک کر سکتے ہیں مگر اپنی روایت ترک نہیں کر سکتے۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں روایت کو ضرور زندہ رکھتے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کے جدید ترین زمانے میں بھی گھوڑی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ میں جس ہندوستانی دوست کی شادی میں شریک ہوا تھا، اس کے پاس اپنی تین کاریں اور ایک جیپ تھی۔ لیکن روایت سے

اُسے اتنا پیار تھا کہ وہ گھوڑی پر سوار ہو کر دُلہن پر قبضہ کرنے کے لئے چلا۔
میں نے اُس سے پوچھا: "اِس گھوڑی کا کتنا کرایہ ادا کیا گیا؟"

وہ بولا: "پچّیس روپے۔"

میں نے کہا: "اگر تم جیپ پر چڑھ کر جاتے تو صرف پانچ روپے کا پٹرول خرچ ہوتا۔"

وہ کہنے لگا: "مگر گھوڑی میں ایک شاہانہ وقار ہوتا ہے۔ اِس پر بیٹھ کر انسان بہادر لگتا ہے۔"

حالانکہ جب اُسے گھوڑی پر سوار کیا جا رہا تھا تو تین آدمیوں نے اُسے سہارا دے رکھا تھا کہ کہیں گھوڑی بدک نہ جائے اور دُولہا مع تاج نیچے نہ گر پڑے۔

شادی کے اِس جلوس میں دُولہا کی گھوڑی کے پیچھے نوجوانوں کی ایک ٹولی ہوتی ہے، جو ڈانس کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ ڈانس مغربی دُھنوں کے ہوتے ہیں اور کوٹ پتلون پہن کر کئے جاتے ہیں۔ اِن کے ساتھ ایک ڈھول ہوتا ہے جو ہندوستانی دُھنیں بجاتا ہے۔ ہندوستانی دُھنوں پر مغربی دُھنوں کا ڈانس بڑا لطف دیتا ہے اور مشرق و مغرب کا یہ ملاپ دیکھ کر آنکھوں میں خوشی کے آنسو آجاتے ہیں۔

اِس ڈانس پارٹی کے پیچھے باقی براتی ہوتے ہیں جو عام طور پر پیدل ہوتے ہیں اور جماہیاں لیتے ہوئے چلتے ہیں۔ زرق برق لباس پہنے ہوئے عورتیں بھی ہوتی ہیں جو شادی کے گیت گاتی ہوئی چلتی ہیں۔ اُن میں سے جو عورتیں شادی شُدہ ہوتی ہیں اُن کی آوازوں میں ایک عبرت ناک آہ و بُکا ہوتی ہے اور جو کنواریاں ہوتی ہیں اُن کی آوازوں میں اپنے مستقبل کا خوابناک نغمہ ہوتا ہے۔

شادی کا یہ جلوس جب یلغار کرتا ہوا دُلہن کے گھر پہنچتا ہے تو اُن کا استقبال کاغذی پھولوں کا ایک دروازہ کرتا ہے۔ یہ دروازہ بھی کرائے پر مل جاتا ہے۔ دروازے پر ایک شاعر کھڑا ہوتا ہے جو دُولہا اور اُس کی فوج کی تعریف میں ایک مدحیہ قصیدہ پڑھتا ہے۔ یہ شاعر بھی کرائے پر مل جاتا ہے۔ ایک شاعر ایک ہی قصیدے کو کئی شادیوں میں کرائے پر چڑھاتا رہتا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے ایک ہی گھوڑی ایک ہی دن میں کئی کئی شادیوں میں کرایہ وصول کرتی ہے۔ ہندوستان میں شاعری اور گھوڑی کے درمیان سے تکلف کی دیوار ہٹا دی گئی ہے۔

اس کے بعد اہلِ جلوس تو خورد و نوش میں مصروف ہو جاتے ہیں اور دُولہا اور دُلہن کو ایک برہمن کے سپرد کر دیا جاتا ہے، جو چند مذہبی رُسوم کے رُومانٹک طلسم کی وادی میں دونوں کو لے جاتا ہے اور پھر اعلان کر دیتا ہے کہ اب اِن دونوں کو کوئی مائی کا لال جُدا نہیں کر سکتا اور آج سے اگر آنکھ دُولہا کی ہو گی تو آنسو دُلہن بہائے گی۔ عینک دُلہن لگائے گی تو نظر دُولہا کو آیا کرے گا۔

میں نے اپنے اُس دوست سے پُوچھا: "تم نے شادی سے پہلے اِس لڑکی سے محبت بھی کی ہو گی؟"

وہ بولا: "نہیں، ہمارے ہندوستان میں شادی کے بعد محبت کی جاتی ہے۔ اگر پہلے محبت کی جائے تو اُس پر فلمیں تو بن سکتی ہیں، شادی نہیں ہو سکتی!!"

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (مینیجر بیسویں صدی دہلی)

افسانہ

اگر اعتبار ہوتا

مس انیس قیوم بی۔ایس سی (عثمانیہ)

۲۲، بسی کلاسس سلے پلی۔ حیدرآباد (اے۔پی)

کرم فرما چچا جان ! اخلاص و تسلیم

میری کہانی "ثابت قدم رہیں گے ...." کی پسندیدگی کا شکریہ ! ــــ مرزا غالب نے کہا تھا ــ

تیرے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا ٭ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

"اگر اعتبار ہوتا" کے عنوان سے ایک افسانہ ارسال خدمت ہے۔ مجھے یقین ہے آپ اُس لگاؤ کو، اُس خلوص کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکیں گے جو ایک فنکار اور پرستار کے درمیان پیدا ہو جاتا ہے ....

تشنۂ کرم ــــ آپ کی بھتیجی ــــــ انیس

اُفّوہ کتنے دنوں بعد لکھا تم نے ! کب سے میں تمہاری تحریر کے لئے تڑپ رہی تھی، کب سے انتظار میں پلکیں بچھائے بیٹھی تھی ! زرینہ نے فرطِ محبت میں اِس گلابی لفافے کو چُوم چُوم لیا .... آنکھوں پر رکھ لیا اور بے خبری خیالات کی وادیوں میں اُڑنے لگی۔ اُن وادیوں میں، اُن فضاؤں میں جنھوں نے اُسے محبت بخشی تھی۔ یادیں سمٹ کر ایک نقطے پر آ گئیں۔

اور اُس کی نگاہوں میں ساحر کا سراپا گھوم گیا۔

ساحر کو اُس نے کئی بار دیکھا تھا، مشاعروں میں سُنا تھا اور بیحد متاثر ہوئی تھی۔

سب سے پہلے اُس نے بنگلور کے مشاعرے میں دیکھا۔ ساحر کے آنے میں ابھی دیر تھی ــــ لیکن لوگ پہلو بدل رہے تھے اور کچھ بے چین اصحاب بار بار گھڑی کی سوئیوں کو ٹٹول رہے تھے کہ کہیں کمبخت رُک نہ گئی ہو ــــ !

لیکن خدا جانے وقت کیوں تھم گیا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا وہ ساحر کو مشاعرے میں سُننے آئی تھی۔ اِس لئے اُس کی دید کی مشتاق بھی تھی۔ اُس نے انجم سے سُن رکھا تھا کہ ساحر صاحب نہایت ہی خوش گو ــــ خوش آواز ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی ہیں۔ عام شاعروں کی طرح وہ اپنا حُلیہ بگاڑ کر نہیں آتے۔ سوٹ پینٹ پہن کر اور ٹائی باندھ کر آتے ہیں۔ نوجوان ہیں لیکن نہ جانے کیوں اُن کے چہرے سے حسرت برستی ہے۔ جس کسی نے دیکھا اُنھیں سوگوار دیکھا۔ مضمحل دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں ــــ ؟

یہ انجم کا بیان تھا ــــ اور زرینہ سوچ رہی تھی ــــ خدا کرے ساحر جلدی آ جائیں۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوں۔ لیکن ساحر تھے کہ آنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ انجم کی باتیں سُن سُن کر تو اُسے ایسا اشتیاق ہو چلا تھا کہ وہ بے خود ہوتی جا رہی تھی۔ ایک شاعر، ایک فنکار کو دیکھنے اور نگاہوں کو سیراب کرنے کی تمنا رہ رہ کر انگڑائیاں لے رہی تھی ــــ کہ دفعتہً سارے اسٹاف میں شور بلند ہوا۔ سب اُٹھ اُٹھ کر استقبال اور دیدار کے لئے دَوڑنے لگے۔ کئی ہاتھ اُن سے مصافحہ کے لئے ابھی سے بے چین ہونے لگے۔

زرینہ بھی بھیڑ چیر کر انجم کے ساتھ بالکل آگے نکل آئی۔ جہاں سے وہ اپنے محبوب شاعر کو اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے جب ساحر کے سراپا پر نظر ڈالی تو دیکھتی ہی رہ گئی ! سیاہ سوٹ میں ملبوس سب شاعروں کے جھرمٹ میں وہ چاند جیسے معلوم ہو رہے تھے ــــ حالانکہ بیشتر شاعر

سیاہ رنگ کی شیروانیاں پہنے ہوئے تھے۔ سب اُن کی جانب اشتیاق سے دیکھ رہے تھے لیکن اُن کی نظریں کسی سے نہیں مِل رہی تھیں۔ وہ بار بار زمین کو تکنے لگتے یا پھر خلاؤں میں گھورنے لگتے۔

"عجیب ہیں یہ ساحر صاحب!" زرینہ نے انجم سے کہا۔ ساری دنیا ایک طرف اور یہ صاحب ہیں کہ خیالوں میں مگن!

"آخر شاعر ہی تو ہیں!"

"تو کیا اور دوسرے شاعر نہیں ہیں یہاں —— اور بھی تو شاعر موجود ہیں —— اُنھیں دیکھو کیسے ہنس بول رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساحر صاحب خود سے بیزار ہیں۔" زرینہ نے کہا۔

تعارف ہوتا رہا —— ڈائس پر شعراء آتے رہے اور اپنا کلام سُناتے رہے۔ سب سے آخر میں ساحر کی باری آئی۔

اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبت نبھا تو دی!

ساحر نے وہ سماں باندھا کہ سب بے خود ہو گئے۔ سب پر ایک سُرور ایک کیف سا چھا گیا۔ اُن کی شاعری اور پھر اُن کی آواز —— گویا سونے پر سہاگہ تھی۔

سب ڈوبے ڈوبے محسوس ہو رہے تھے۔

کچھ لوگوں نے اپنی طرف سے گلپوشی کی اور کچھ آٹوگراف لینے آگے بڑھے۔ زرینہ نے ایک لمحہ سوچا —— میں بھی ساحر صاحب کا آٹوگراف لوں تو کیسا رہے گا؟ چنانچہ اُس نے اپنی چھوٹی سی نیلی بک نکالی جسے وہ صبح آتے وقت لیتی آئی تھی۔

"کیا ساحر صاحب ہی سے شروع کرنے کا ارادہ ہے؟" انجم نے مُسکرا کر ٹہوکا دیا۔

"ہاں بڑے شاعر ہیں نا —— اس لئے!"

کچھ ہچکچاہٹ اور کچھ جھجک کے بعد وہ ساحر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی اور سب کی طرح اُس نے بھی اپنا نوٹ بک والا ہاتھ ساحر کی طرف بڑھا دیا۔ سب کے چہرے ساحر کے تاثرات کو پڑھ رہے تھے۔

وہ خاموش، متین بنے آٹوگراف دیئے جا رہے تھے۔

لیکن جیسے ہی اُن کی نظر زرینہ کے کومل ہاتھ پر پڑی —— اُنھوں نے شانِ بے نیازی سے ایک اُچٹتی نگاہ زرینہ کے سراپا پر ڈالی زرینہ کسمسا کر رہ گئی۔

اور ساحر نے اُس کی نوٹ بُک پہ لکھا ؎

"ہائے کیا پاسِ روایت ہے کہ دنیا والے
دل کے ہر داغ کو پیمانِ وفا کہتے ہیں"

زرینہ لوٹی تو اُس کے خیالوں کے پردوں سے ساحر ہی جھانکتے رہے۔ ساحر —— ساحر —— وہ ایک پل بھی قرار نہ پا سکی —— پھر اُس نے ساحر کو خط لکھا —— لیکن ساحر کیسے پہچان سکتے تھے کہ اُنھوں نے جس لڑکی کی نوٹ بُک پر وہ شعر لکھا تھا یہ اُسی کا خط ہے۔

اُدھر زرینہ نے انتظار کی طویل گھڑیاں کاٹیں۔ کوئی جواب ساحر کی طرف سے نہ ملا تو وہ بے حد اُداس ہو گئی۔ مایوس ہو گئی۔ اُس نے پھر ایک خط لکھا۔ لیکن دو ہفتے بعد بھی کوئی جواب نہ ملا تو اُس کی اُمیدیں دم توڑ کر رہ گئیں۔ اور سولھویں دن اُس کے سامنے میز پر ایک لفافہ پڑا تھا۔

اجنبی سی تحریر —— سب کچھ اجنبی سا اور انداز کچھ اِس طرح۔

محترمہ!

معروفیتوں کے باعث آپ کے خلوص کا جواب نہ دے سکا تھا۔ اِس کے لئے آپ مجھے معاف کریں۔ آپ کی ستائش پر، آپ کی حوصلہ افزائی پر دل سے شکر گزار ہوں۔ وقت بالکل نہیں ہے۔ اِس لئے اجازت دیں۔

خلوص کیش —— ساحر

وہ اِس خط کو کیا سر پہ دے مارتی —— لکھا بھی تو کس طرح ——؟

زرینہ نے سوچا کیسی عجیب بات ہے! ایک فنکار کے ہزاروں چاہنے والے ہوتے ہیں۔ اُن میں سے کتنے تو فنکار کو اپنے دل کی دھڑکن سمجھتے ہیں۔ لیکن فنکار تو اُنھیں پہچان بھی نہیں پاتا —— نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے!

دوسری بار یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ساحر کو مدعو کیا گیا تو وہ سب سے پہلے فنکشن میں موجود تھی —— لیکن اِس بار بھی ساحر لیٹ تھے۔

نہ جانے کیوں وہ ہمیشہ دیر سے آنے کے عادی تھے۔ شاید اِس لئے کہ ہزاروں آنکھیں اُنکی دید کی مشتاق رہیں۔ اِس بار بھی آٹوگراف لیتے وقت سب لوگوں کے جھرمٹ میں زرینہ نے بھی اپنی نوٹ بک بڑھا دی۔ جس پہ ایک بار ساحر ایک شعر لکھ چکے تھے۔ جس کے بعد کسی اور کے

آٹوگراف نہیں تھے۔

ساحر نے نوٹ بک ہاتھوں میں لی ــــ پچھلا ورق اُلٹ کر دیکھا۔ایک سال پہلے کی تاریخ درج تھی۔اور اُن کا آٹو مُسکرا رہا تھا۔ لیکن وہ خود مُسکرانا کم جانتے تھے۔اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پیدائشی شاعر تھے ــــ ایک حادثہ نے اُنھیں شاعر بنا دیا تھا۔لیکن وہ حادثہ کیا تھا اُس کے متعلق بہت کم لوگ جانتے تھے۔ وہ محبت میں ہارے ہوئے انسان تھے ــــ لوگوں کو اتنا پتہ تھا۔ نوٹ بک سے سر اُٹھا کر ساحر نے دیکھا ایک مضمحل چہرہ اُنھیں تک رہا تھا۔

"آپ کا کیا نام ہے محترمہ ــــ!"

سینکڑوں میں سے صرف زرینہ ہی کی مخاطبت پر سب زرینہ کو تکنے لگے۔لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔صرف اُس نے چہرہ دوسری جانب کر لیا ــــ شاید اُس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔

ایک طوفان تھا کہ اُمڈ رہا تھا۔

پھر ساحر نے پوچھا۔

"میں آپ کا نام پوچھ رہا تھا خاتون ــــ!"

"کہدو نا ــــ کہدو نا ــــ" سب نے زرینہ سے کہا اور اُسے کہتے ہی بنی۔

"زرینہ !!!"

شاید اُنھوں نے نہیں سُنا اور نوٹ بک واپس کر دی۔زرینہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا ــــ آنسوؤں کے آئینے میں یہ حسین شعر مُسکرا رہا تھا ؎

ہونٹوں پہ کچھ سوال اُبھر آئے تھے مگر
وہ بھی تری اُداس نگاہوں میں کھو گئے

وہ اِس حسین شعر پر سر دُھنتی رہی ــــ محسوس کرتی رہی

اُس رات وہ بالکل نہ سو سکی ــــ رہ رہ کر ساحر کا لکھا ہوا شعر ذہن میں اُبھرتا رہا۔اُس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔وہ یہ بھی نہ جانتی تھی کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔وہ ساحر سے کیا چاہتی ہے ــــ وہ ساحر کو کیوں اپنی بے چینیاں لکھ بھیجنا چاہتی ہے۔وہ کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ایک ایسا لگاؤ ــــ ایسا اُنس ساحر سے ہو گیا تھا کہ وہ سنبھلنے نہیں پا رہی تھی۔

سو تو وہ نہ سکی تھی ــــ جیسے ہی رات کے سناٹے میں دل

قطعہ تاریخِ وفات ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

انور صابری

رہنمائے عصر، صدرِ مملکت
خوش دماغ و خوش خیال و خوش نگاہ
صاحبِ دانش مُفکر۔ ذی شعور
عالمِ بالغ نظر، حکمت پناہ
آدمیت کے نگہبانِ قدیم
زندگی کی منزلوں میں خضرِ راہ
انورِ ماتم کُناں، بعدِ وفات
ہے ہر اِک لب پر غمِ ذاکر ہ آہ
[illegible] انور صابری

کلاک نے تین بجائے وہ اُٹھ بیٹھی۔

کیا کرے ــــ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

اُس نے ساحر کی تصویر کو دیکھا جو ایک اچھے رسالے میں پورے صفحہ کی زینت بنی مُسکرا رہی تھی ــــ اُداس سی مُسکراہٹ جیسے کوئی گہرا گھاؤ کھائے ہوئے ہو ــــ جیسے کوئی راز اُس کے پیچھے چھپا ہو۔ زرینہ کی حالت عجیب تھی۔پاگلوں کی طرح اُس نے خود کو بنا لیا تھا۔کالج بھی پابندی سے نہیں جا رہی تھی۔سہیلیاں اُسے سنیما کھینچ لے جاتیں لیکن وہاں بھی اُسے ساحر ہی کی شبیہ نظر آتی۔

"تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا زرینہ ؟" نکہت نے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

"مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے" زرینہ کے اِس جواب پر سب سہیلیاں سنجیدہ ہو گئیں۔

انجم نے زرینہ کی پیٹھ تھپتھپائی۔

ارے . . . . اس کا سینہ تو خالی معلوم ہوتا ہے۔اِس کا دل تو کہیں کھو گیا ہے نکہت!

زرینہ نے گہری گہری نظروں سے گھور کر انجم کو دیکھا اور پھر چُپ چاپ بیٹھ گئی۔

پچھلا کیا تھا کہ لطف آتا ـــــ باہر نکلنے پر سب نے اُسے پریشان کیا۔

"اچھی زری بتانا ـــــ تُو کیوں اُداس ہے ؟"
"تُو کیوں بے چین ہے ـــــ ؟"
"تُو کیوں بے قرار ہے ؟"
"تُو کیوں کھوئی کھوئی ہے ؟"

جواب میں زرینہ نے نظریں خلاؤں پر جما دیں۔

تم کیا جانو کس نے میرا قرار چھین لیا ہے ـــــ کس نے مجھے بے سکون کر دیا ہے، اور کس نے میری نیندیں لُوٹ لی ہیں ؟

جب سے میں نے ساحر کو دیکھا ہے۔ ساحر کو سُنا ہے ـــــ ساحر سے ملی ہوں ایک پل کے لئے کبھی اُن کے خیال سے دُور نہ رہ سکی ہوں۔ ہر وقت سوتے، اُٹھتے، بیٹھتے چلتے پھرتے سایہ کی طرح اُن کا خیال ساتھ لگا ہوا ہے۔ کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اُن کے غم بانٹ لینے کے لئے میں نے خط لکھا تو اُنھوں نے اِتنا مختصر جواب دیا کہ بس سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں مجھے کچھ ہو نہ جائے ـــــ میں خود کو اُنکے خیال سے آزاد کرنے کے قابل ہی نہیں پاتی ـــــ تم ہی کچھ صلاح دو" کچھ مشورہ دو ـــــ مجھے خوشگوار زندگی کی سوغات دو ـــــ یا پھر مجھے زہر دے دو۔

اِتنا سب کچھ زرینہ نے کہہ دیا۔ لیکن آنکھوں کی زبان کوئی نہ سُن سکا کوئی نہ سمجھ سکا۔

سب حیران تھے کہ اچانک زرینہ کو کیا ہو گیا۔
یہ اتنی دیر چُپ کیسے ہو گئی ؟
"کیا سوچ رہی ہو ـــــ!" انجم نے پھر ٹھوکا دیا۔
"اے ....کونسی دنیا میں گُم ہے ؟"

"مم .... میں یہیں پہ ہوں ـــــ تم لوگوں کے ساتھ ـــــ" وہ بوکھلا گئی تھی۔ اپنی بے بسی پہ اُس کے آنسو اُمڈنے لگے تو اُس نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ـــــ اور باہر دیکھنے لگی۔ سہیلیاں بھی یکلخت چُپ ہو گئیں۔ پھر کسی نے نہ پوچھا۔ کہ تُو کیوں اُداس ہے ـــــ تُو کیا سوچ رہی ہے ؟"

اس کے بعد پے در پے زرینہ نے ساحر کو خطوط لکھے ـــــ اپنی بے چینیاں لکھ بھیجیں ـــــ قرار کی بھیک مانگی دامن پسار کر کچھ دینے کی تمنا کی ـــــ لیکن اُس طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

کوئی دو مہینے بیتے ـــــ غالب صدی کے موقع پر پھر مشاعرہ منعقد کیا گیا۔

لیکن زرینہ چاہتے ہوئے بھی نہ جا سکی ـــــ! اب اُس میں ساحر سے سامنا کرنے کی تاب نہ تھی۔ لیکن مشاعرہ کی شام ساحر نے لاکھوں عوام کے جمِ غفیر میں زرینہ اور صرف زرینہ کو نظروں سے ڈھونڈھا۔

لیکن زرینہ نہیں تھی ـــــ وہ اپنے کمرے میں بند سِسک رہی تھی ـــــ تڑپ رہی تھی۔

اور تین دن بعد ـــــ

جیسے ہی اُس کے کمرے کے باہر پوسٹ مین نے آواز دی۔ وہ لڑکھڑا کر بے جان سی لاش کی طرح شیشے کی کھڑکی کے پاس پہنچی۔ پتلی سی درز سے پوسٹ مین نے ایک گلابی لفافہ اندر ڈال دیا۔ زرینہ کا دل دھک سے رہ گیا، لفافے کے پیچھے ـــــ ساحر ترکش منشن کارٹر روڈ بمبئی لکھا تھا۔

اور زرینہ نے فرطِ مسرت میں اُسے چوم لیا۔ اور کھو گئی۔
آہستگی سے اُس نے لفافے کو چاک کیا اور پڑھنے لگی ـــــ

زرینہ!
اپنی ایک نظم "غم گسار ہی" تمہارے نام معنون کرتا ہوں۔
اور یہی تمہارے خلوص تمہاری محبت کا جواب ہے۔
تمہارا ـــــ ساحر

خط پڑھنے کے بعد اُس کی پلکوں پر آنسوؤں کے ستارے جھلملانے لگے۔

دِلّی کا خط لندن کے نام

خوشتر گرامی

مائی ڈیر لندن!

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُو سیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تاریخ کے ایک ایسے باب کو دوبارہ پڑھنا ہے جو اس وقت کتنا ہی تلخ رہا ہو مگر آج تو وہ ہمارا سرمایۂ حیات اور عزیز ترین باب ہے۔

مائی ڈیر!

اگر آپ اِسے طنز نہ خیال کریں تو ہم آپ کے ایک فرزند جنرل ڈائر کے ممنون ہیں۔ اگر وہ سرزمینِ جلیانوالا باغ امرتسر پر تاریخ کا وہ باب بہ نوکِ تفنگ نہ لکھتے جو انھوں نے ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو لکھا، تو کون جانتا ہے ہم کب غلامی کی نیند سے بیدار ہوتے۔ لیکن اس نے پنجاب کے بہادر نوجوانوں اور سرفروش سپوتوں کے خون کے دھاروں سے جلیانوالے باغ کو سینچ کر ہزاروں نہیں آزادی کے لاکھوں پروانوں کو جنم دیا ——— اور ہم نے اِس سال اِس خونی واقعہ کی پچاسویں یادگار منائی۔

مائی ڈیر لندن!

تاریخ اپنے عمل میں خواہ کتنی ہی ظالم اور سفاک ہو، عمل کا رنگ ——— رُوپ خواہ کتنا ہی گھناؤنا اور ذائقہ کتنا ہی تلخ ہو مگر اس کے اثرات اور نتائج اکثر شیریں ہوتے ہیں۔ اِس لئے جلیانوالا باغ کا واقعہ عمل کی تلخیوں کے باوجود نتائج کے اعتبار سے شیریں اور دلآویز یادوں کا ایک ——— گلدستہ ہے اور لندن اور دِلّی کے درمیان اب کسی تلخی کا موجب نہیں رہا اور میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا ؏

ہے شُکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

باقی یہ ہے کہ ؎

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو   تب کہا ہے بطرزِ استفہام

جلیانوالا باغ کا ایک درس آپ کے لئے ہے کہ ؏

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں

اور ایک سبق ہمارے لئے ہے کہ

جلیانوالا باغ میں ہندوؤں، مُسلمانوں، سِکھوں، ہری جنوں سب ہی کا خون بہا ——— اور مل کر اور ایک دھار ہو کر بہا ——— اور جو آزادی ہمیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملی۔ اس کے لئے کی جانے والی جدّوجہد کی بُنیادوں کو اِس خون نے مضبوط کیا۔ مگر اب آزادی کے بائیس برس بعد یہاں کچھ ایسے سر پھرے پیدا ہو رہے ہیں جو اب پھر چھوت چھات کی لعنت کو سماجی نظام بنانا اور معاشرے کی تقسیم کی بُنیاد بنانا چاہتے ہیں۔ اِن کی پیشوائی فرمائی ہے پوری کے جگت گورو شنکر اچاریہ نے ——— اور وہ اِتنے تاؤ میں آئے کہ وِشو ہندو دھرم سمیلن ہی سے واک آؤٹ کر گئے اور اِس طرح ہندو دھرم کی بُنیادوں کو کمزور کرنے کا سامان پیدا کر دیا ——— یہی نہیں اُنھوں نے ہمارے قومی ترانے کی بھی توہین کی۔

لیکن ——— اب ہندوستان بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ گورو جی نے دو ہی دن بعد یہ محسوس کر لیا کہ اُنھوں نے بھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ ہر طرف سے لعن طعن شروع ہو گئی۔ کوئی کہتا ہے جگت گورو کو گرفتار کرو، کوئی کہتا ہے اُنھیں جیل خانے میں ٹھونس دو، کوئی مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر رہا ہے تو کوئی اُن پر بغاوت کا الزام لگا رہا ہے ——— جگت گورو نے دو روز بعد قلابازی کھائی۔ مگر پھر جو عُذر کیا وہ عُذرِ لنگ بھی ہے اور عُذرِ گناہ بدتر از گناہ بھی ہے۔

خیر خوشی اِس بات کی ہے کہ اب ہندوستان ایسے "زائد المیعاد" لوگوں سے نپٹنے کا حوصلہ پیدا کر چکا ہے۔

مائی ڈیر!

آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ ماہ چچا غالب کی یاد میں ٹکٹ جاری کرتے ہوئے ہمارے وزیرِ خزانہ مرارجی ڈیسائی نے کہا تھا کہ غالب کے کلام میں اتحاد و رواداری کی جو تلقین ہے اس پر نظر رکھئے اور شراب کی جو تعریف ہے اُس پر دھیان نہ دیجئے اور حضرتِ ناصح نے نہ صرف دوسروں کو وعظ و نصیحت فرمائی بلکہ خود بھی اس پر عمل کیا اور بجٹ بناتے وقت نشہ بندی کے ہمارے "کاغذی علمبردارِ نشہ بندی" مرارجی ڈیسائی نے بجٹ میں شراب کو بالکل ہی بھلا دیا یا یوں کہیے کہ غالب صدی کے احترام میں بادہ خواروں کو چھوٹ دے دی اور اُنھوں نے سمجھا کہ

جام پہ جام لنڈھاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے

اور اس چھوٹ کا پہلا "المیہ" ہمارے سامنے آیا کہ دِلّی میں ایک شخص نے اتنی شراب پی کر پیتے پیتے قیدِ ہستی سے آزاد ہو گیا۔ واقعہ یوں بتایا جاتا ہے کہ اُس کے ہاں پانچ لڑکیوں کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جب اُسے یہ خوشخبری ملی تو وہ پھولا نہ سمایا۔ اُس نے خوشی میں شراب پینی شروع کی اور —— اتنی پی کہ دوبارہ پھر کبھی پینے کی ضرورت باقی نہ رہی —— اگر ہماری پولیس اُس کی تحقیقات کرے اور اُس پر خودکشی کا مقدمہ چلائے تو وہ برملا کہہ سکتا ہے ؎

پیتا بغیرِ اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پاکے پی گیا

مے نوشوں پر میرے یہ تیر و نشتر شاید آپ کو چبھ رہے ہوں —— اِس لئے کہ آپ کے یہاں تو اذنِ عام ہے مگر یہ تو گاندھی کا دیش ہے اور گاندھی جی نے شراب کے خلاف باقاعدہ تحریک چلائی، پکٹنگ کیا اور گرفتاریاں دیں۔ اِس لئے جب یہاں شراب پر بجٹ میں ٹیکس نظر نہ آیا تو لوگوں نے وزیرِ خزانہ کو آڑے ہاتھوں لیا —— پارلیمنٹ میں گاندھی بھگت ڈاکٹر سوشیلا نیر نے کہا کہ شراب نوشی کرپشن کا موجب ہے۔ بڑے بڑے بزنس ہاؤسوں نے اپنے لائیزن افسر مقرر کر رکھے ہیں جو افسروں کو شراب کی پارٹیاں دیتے ہیں اور لائسنس وغیرہ کے معاملے طے پاتے ہیں۔ کیا گورنمنٹ سرکاری افسران کے لئے شراب نوشی کو ممنوع قرار دے گی؟ وزیرِ قانون نے جواب میں مرکزی حکومت کی بے بسی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ معاملہ اسٹیٹوں کا اپنا معاملہ ہے۔ مرکزی حکومت اِس معاملے میں صوبائی حکومتوں پر صرف اخلاقی دباؤ ہی ڈال سکتی ہے۔ بات اور بڑھی اور ایک ممبر نے نشہ بندی کے ڈھونگ کا پردہ بالکل ہی چاک کر دیا۔ اُنھوں نے کہا نشہ بندی کے لئے ایک قومی پالیسی کی ضرورت ہے۔ کیا سرکار وزراء اور اُن کے بیٹوں نیز ممبرانِ پارلیمنٹ سے نشہ بندی کا آغاز کرے گی —— وزیرِ قانون نے جواب میں کہا۔ بہتر یہی ہے کہ خیرات پہلے گھر سے ہی شروع ہو۔ یعنی آپ کی زبان میں

Charity Begins At Home

مائی ڈیر لندن!

بات ذرا طُول پکڑ گئی۔ مگر ہے بہت ضروری۔ تاکہ مشرق و مغرب کا صحیح فرق آپ کی سمجھ میں آسکے۔ اب مغرب کی بات تو یہ ہے کہ اِٹلی کے اخبارات میں دو بارہ سالہ لڑکیوں کی خبر شائع ہوئی ہے۔ اِن میں سے ایک نے شادی کر لی ہے اور دوسری نے دو جُڑواں بچّوں کو جنم دیا ہے۔ پہلی لڑکی اِٹلی کی سب سے کم عمر دُلہن بننے کے بعد پھر اسکول جانے لگی ہے۔ اُس نے ایک اِکّیس سالہ نوجوان سے شادی کر لی ہے —— دوسری لڑکی دو جُڑواں بچّوں کو جنم دینے کے بعد



رُو بہ صحت ہے اور پبلک پراسیکوٹر نے کسی نامعلوم شخص کے خلاف ایک کم سِن نابالغ لڑکی کی عصمت دری کے الزام میں مقدمہ چلانے کی سفارش کی ہے۔ لیکن یہاں ایسی واردات کا فوراً سخت نوٹس لیا جاتا ہے۔

بات لڑکیوں کی شادی سے شروع ہوئی تھی تو یہاں کی بھی ایک دلچسپ شادی کا حال سُن لو۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔ اِس لئے اس واقعہ کو تاریخ کا اعادہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے مُلک میں پہلے سوئمبر کی ایک رسم ہوا کرتی تھی جِس کی بگڑی ہوئی صورت آپ کے مُلک میں آج بھی رائج ہے۔ آپ اُسے کورٹ شِپ کہتے ہیں۔ آپ کے ہاں لڑکے لڑکی پسند کی منزل سے پہلے ہی گھل مِل جاتے ہیں۔ بعد کو پسند قانونی طور پر ازدواجی رشتہ بن جاتی ہے —— ہاں تو یہاں سوئمبر کا ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا ہے۔ ایک لڑکی کی تین باراتیں ایک ساتھ آئیں۔ یہ ضلع بلند شہر کے گاؤں موج پور کا واقعہ ہے۔ وہاں تین باراتیں موج در موج آئیں۔ کیونکہ لڑکی کے والد نے تین مختلف کنبوں سے اپنی لڑکی کی شادی کی بات چیت کی تھی۔ تینوں لڑکوں میں فیصلہ ہوا کہ وہ تینوں لڑکی کے سامنے پیش ہوں اور اُسے اپنا شوہر منتخب کرنے کا موقع دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تینوں کی بارات ایک ساتھ آئی۔ اُس نے ایک لڑکے کو پسند کر لیا اور باقی دو لڑکے باراتی بن گئے اور اُنھوں نے ڈنر میں شرکت کی۔

خط طویل ہو گیا۔ آخر میں مغربی دُنیا کا ایک حیرت انگیز —— مگر دلچسپ کارنامہ بھی قلم بند کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ پچھلے دنوں اِٹلی کی پارلیمنٹ میں ایک فِلم پر جس کا نام ہے "میں نے عورتوں سے محبت کرنا سیکھا" بہت گرما گرمی ہوئی ہے کہ اِس فِلم میں پندرہ برس کی عمر کی لڑکیوں اور لڑکوں کے جذباتی اور جنسی مسائل کو موضوع بنایا گیا تھا۔ فِلم میں کام بھی اِس عمر کے لڑکے لڑکیوں نے کیا ہے اور یہ مُلکی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ جس کے تحت کم سِن لڑکے لڑکیوں سے جنسی تعلقات قائم کرنا جُرم ہے لیکن لُطف تو اُس وقت آیا جب ایک ممبر نے کہا کہ سرکار نے اِس فِلم کی ہیروئن پندرہ سالہ رومینا پاور کو بہترین اداکاری کا انعام تو دے دیا مگر اُسے فلم دیکھنے کے لئے سنیما گھر میں داخل ہونے کی اجازت اِس لئے نہیں دی گئی کہ پندرہ برس کی نابالغ ہے —— ممبر نے کہا اِس فلم میں رومینا پاور کو سمندر کے کنارے بالکل ننگا غسل کرتے ہوئے دکھانے کے علاوہ اور بھی کئی ہیجان انگیز سین ہیں —— اِس سے بھی حیرت انگیز اِس فلم کو پبلک میں پیش کرنے کا جواز ہے۔ پارلیمنٹ میں جب بہت ہنگامہ ہوا تو کہا گیا کہ فلم سنسر بورڈ نے اِس کو اکثریتی ووٹ سے پاس کیا ہے ؎

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

میں ہوں —— آپ کی خلوص کار

دِلّی

("ایشیا" ویکلی برمنگھم لندن کے شکریہ کے ساتھ)

اُردو ادب کا نقصان

نریش کمار شادؔ اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور اپنی عمر کے اعتبار سے نسبتاً پختہ تر شعر کہتے تھے۔ زبان و بیان کی پابندیوں کا پُورا احترام کرتے تھے اور اُن کا کلام اُن خامیوں سے پاک تھا جو اُن کے اکثر ہمعصر شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فن کی پابندیوں کا اگر زیادہ لحاظ رکھا جائے تو اِس کا شاعر کی جدّت پسندی اور اُس کے شعر کی تازگی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن اُن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اُن کے کلام میں پختگی بھی تھی اور نُدرت بھی۔

اُن کی موت پر میرا غم صرف ایک ہونہار شاعر کی موت کا غم نہیں۔ بلکہ یہ ایک عزیز کی موت کا غم بھی ہے، شخصی اور ذاتی۔ اُن کے والد نوہریارام دَرد کے ساتھ میرے اچھے مراسم تھے۔ اِس وجہ سے شاد مجھ سے ہمیشہ خوردوں کی طرح ملتے رہے۔ اُن کی شہرت ایک رِند لااُبالی کی تھی۔ لیکن ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے وہ اِتنے لااُبالی بھی نہیں تھے۔ اُن کی تخلیقی قوتوں پر شراب کا کچھ زیادہ منفی اثر نہیں پڑا اور وہ آخر وقت تک اچھے شعر کہتے رہے اور عمدہ نثر لکھتے رہے۔ اگر وہ کچھ اور جیتے رہتے تو اُردو ادب کو اُن سے بڑا فائدہ پہنچتا

گوپال مِتل ("تحریک"، دِلّی)

* "بیسویں صدی" کو ہم نے کبھی اشتہاروں کا پلندہ نہیں بنایا۔ اِس میں ۲۰۴ اور بوگس قسم کے وہ اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے جن کا مقصد خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے

صحت و زندگی

۱ • کریلا ـــــ ایک صحت بخش سبزی

کریلا برسات کے موسم کی مرغوب اور مفید سبزی ہے۔ یہ جتنا کھردرا اور ذائقے میں جتنا تلخ ہے اپنے گوناگوں خواص و اوصاف کے اعتبار سے اتنا ہی خوبصورت، مفید اور خوش ذائقہ ہے۔

اِس کا مزاج گرم ہے۔ یونانی اطباء اسے قابض اور ویدک گرنتھوں میں اسے قبض کُشا لکھا گیا ہے۔ ہمارے تجربہ کے مطابق کریلا اجابت بافراغت لاتا ہے۔ بلکہ دست آور ہے۔

کریلا غذائی اور دوائی اجزاء سے بھرپور ہے۔ اس میں لحمی اجزاء، چکنائی، نشاستہ دار اجزاء، چونا اور فاسفورس ہے۔ کریلے میں فولاد کی خاص مقدار پائی جاتی ہے۔ وٹامنز اے۔ بی۔ سی کا بھی ذخیرہ ہے۔ ایک چھٹانک کریلے میں چودہ غذائی حرارے قوت ہوتی ہے۔ یہ قوتِ باہ اور اعضائے رئیسہ کو طاقت بخشتا ہے۔

کریلا معدے کے لئے بہت مفید غذا ہے۔ یہ معدے میں مُضر جراثیم اور کیڑوں کو ہلاک کرتا ہے، معدہ کو طاقت دیتا ہے، قوتِ ہاضمہ میں اضافہ کرتا ہے، کف کو خارج کرتا ہے، بھوک لگاتا ہے۔ اس کا رس دست آور ہے۔ کریلا ریاح اور بلغم کو تحلیل کر کے جسم سے خارج کرتا ہے۔ اُچھاسے اور پیچش میں مفید ہے۔ لقوہ، گٹھیا اور پتھری کو رفع کرتا ہے۔ بادی بواسیر، یرقان، جوڑوں کے درد اور کھانسی میں بھی نافع ہے۔

اطباء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ کریلا ذیابطیس (پیشاب میں شکر آنا) کے مریضوں کے لئے قدرت کا گرانقدر عطیہ ہے۔ اس مرض کے مریضوں کے لئے بیش قیمت انگریزی اور طبی ادویہ کے مقابلہ میں یہ معمولی سبزی کہیں زیادہ شفا بخش ثابت ہوتی ہے۔

۲ • آپ بھی عظیم انسان بن سکتے ہیں

کوئی انسان عظیم پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ دُنیا کے بیشتر عظیم انسانوں کے آباو اجداد عام انسان تھے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے عظیم بن کر بقائے دوام حاصل کرنے کا راز اِن الفاظ میں بتایا ہے ـــــ "تاریخ کے صفحات میں اُن لوگوں نے بقائے دوام حاصل کر لی ہے جنھیں اِس حقیقت پر ناقابلِ شکست یقین تھا کہ وہ عظیم بن سکتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے، یقین رکھتے تھے کہ اُن کے آج کے خواب کل ضرور تعبیر آشنا ہوں گے۔ اِسی ناقابلِ شکست یقین کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کے لئے آگے بڑھتے ہوئے وہ تاریخ میں اپنا نام چھوڑ گئے۔ اُن عظیم شخصیتوں کی خود اعتمادی ہمیں اُن کی طاقت کا یقین دلا دیتی ہے ـــــ دُنیا اُن لوگوں کے لئے راستہ چھوڑ دیتی ہے جو یہ جانتے ہیں کہ اُنھیں کہاں جانا ہے۔"

۳ • کامیابی کا راز

ہر انسان عروسِ کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے۔ آپ بھی یقیناً چاہتے ہوں گے۔ مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ "قوت اور کامیابی مترادف الفاظ ہیں۔ لیکن ایک کا دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ وہ انسان جو اس راز سے واقف ہے اور دوسروں کا اشتراک حاصل کر کے قوت حاصل کرنے کے گر سے واقف ہے، وہ ہمیشہ زندگی میں کامیاب ہوتا ہے اور اُسے کوئی آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتا۔"

دُنیا کی تاریخ میں انسان کو آگے بڑھنے کے اتنے مواقع کبھی حاصل نہ ہوئے تھے جتنے آج ہیں۔ لیکن یہ اُن لوگوں کے لئے ہیں جو زندگی سے کام لینا چاہتے ہیں اور زندگی سے کام لینا جانتے ہیں۔

۴ • زندگی کی شاہراہ پر

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ "زندگی کی شاہراہ پر

چلتے ہوئے کبھی یہ نہ سوچئے کہ یہ کام نہیں ہو سکتا، یا آپ اُن لوگوں سے مختلف ہیں جنھوں نے دُنیا میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ اِس لئے کہ آپ کو وہ مواقع حاصل نہیں جو اُنھیں حاصل تھے، اُن کی صلاحیتیں آپ کی صلاحیتوں سے بہت زیادہ تھیں اور وہ آپ سے زیادہ ہوشیار تھے ـــــــ یہ ساری باتیں غلط ہیں۔ ہاں اُن میں اور آپ میں صرف ایک فرق ہے۔ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے زیادہ شدّت سے عمل کرتے تھے اور آپ کی خواہشات میں وہ گرمی نہیں ہے جو اُن کی خواہشات میں تھی۔ اُن کے سامنے ایک منزل تھی۔ وہ اُس منزل کو ہر حال میں حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ قدم آگے اُٹھا کر پیچھے رکھنا نہ جانتے تھے۔

۵ ● خود اعتمادی

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

جن لوگوں کے لئے علّامہ اقبالؔ نے یہ فرمایا ہے، اُنھیں خود اعتمادی ہی نے یہ عزم و حوصلہ، یہ بلند نگاہی بخشی ہے۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ "خود اعتمادی سے بھرپور اور خود اعتمادی سے محروم انسان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک ہمیشہ کامیابی کی طرف بڑھتا ہے اور دوسرا ناکامی و نامُرادی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ عظیم کاموں کو سرانجام دینے کے لئے مضبوط اور غیر متزلزل قوّتِ ارادی درکار ہے۔"

جن لوگوں کو اپنی صلاحیتوں اور قوّتوں پر یقین نہیں، جو خود اعتمادی سے محروم ہیں وہ آج تک دُنیا میں کچھ کر سکے ہیں اور نہ آئندہ کچھ کر سکیں گے۔

۶ ● دھنیا ـــــ بطور دوا

عام طور پر دھنیا بطور مسالہ استعمال ہوتا ہے اور مسالہ کا خاص جز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے استعمال سے سالن میں ایک پُر لطف خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دوائی اعتبار سے بھی یہ گوناگوں خواص کا حامل ہے۔

دھنیا دل و دماغ کو طاقت دیتا ہے۔ معدے کو قوی کرتا ہے۔ قبض کشا ہے، بھوک بڑھاتا ہے۔ لیکن اِس کی زیادتی خشکی بڑھاتی اور نسیان پیدا کرتی ہے۔

اِس کا مزاج سرد اور خشک ہے۔ بعض مردانہ امراض میں یہ بہت مفید ہے۔

خشک دھنیے کو باریک کر کے اُس میں بقدرِ ذائقہ نمک باریک ملا کر رکھ لیں۔ کھانے کے بعد ۶ ماشہ کی مقدار میں کھانا کمی دُور کرنے میں نافع ہے، اسہال میں بھی مفید ہے۔

خشک دھنیے کو بریاں کر کے دو تولہ کی مقدار میں پانی میں پیس چھان لیں۔ اِس کا پینا خونی پیچش، ہیضہ اور قے میں مفید ہے اور مفرّحِ قلب بھی ہے۔

خشک دھنیے کو باریک کر کے اُس کے ہم وزن شکر ملا کر رکھ لیں ۶ ماشہ کی مقدار میں روزانہ کھانا دردِ سر اور دردِ پشت گرم کے لئے بخش ہے۔

خشک دھنیے کو باریک کر کے زبان پر چھڑکنا مُنہ آنے میں مفید ہے۔ خون بہنے کے مقام پر چھڑکنے سے خون کو روک دیتا ہے۔

دھنیے کی تازہ پتّیوں کو پیس کر اُس میں سِرکہ اور تُرش و شیریں انار کا رس مِلا کر کھانے سے گرم مزاج والوں کی جوششِ معدہ کو تقویت ہوتی ہے، صفرا میں سکون ہوتا ہے اور معدے کی سوزش اور جلن دُور کرتا ہے۔

دھنیے کی تازہ پتّیاں کھانا پیاس اور قے کے لئے بھی نافع ہے۔

دھنیے کے ڈھائی تولہ پانی میں تھوڑی شکر مِلا کر پینے سے نیند آتی ہے، بھوک لگتی ہے، بدہضمی دُور ہوتی ہے۔

جسے رات میں نیند کم آتی ہو، اُس کے لئے ۲ تولہ دھنیے کا پانی پینا مفید ہے۔

۷ ● ناکامیوں سے نہ گھبرائیے

بیشتر انسان ناکامیوں سے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر آگے بڑھنے کا حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں۔ اُنھیں تقدیر کا گِلہ کرنا چاہیئے نہ حالات کا شاکی ہونا چاہیئے۔ اُنھیں اپنی ناکامی کے اسباب تلاش کرنے چاہیئں

اے شکوہ سنجِ شومیِ تقدیر دیکھنا
ذوقِ عمل ہی تیرا کہیں خام تو نہیں

مشہور مفکّر کے۔ نولسن نے لکھا ہے ـــــ "اِس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ ملازمت تلاش کرنا اور پھر نئی ملازمت کے لئے

میں پڑ جانا، وقت ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک مستقل مزاج نوجوان یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ اِس وقت غلط جگہ پر کام کر رہا ہے، اپنے کام میں فرق نہیں آنے دیتا۔ برابر محنت جانفشانی سے کام کئے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ صحیح مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ اُس نے اپنا وقت بالکل ضائع نہیں کیا۔ اُس کی کوششیں اُس کے مقاصد کا ایک حصہ تھیں۔ کیا کوشش اور کاوش کے بغیر کوئی مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جد و جہد اور تگ و دو کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

کسی نے بالکل صحیح کہا ہے ——— ہر مصیبت کو، ہر مشکل کو خوش آمدید کہو، کیونکہ ہر مشکل، ہر مصیبت عارضی ہوتی ہے۔

جس ملازمت، جس کام کو آپ اپنے مزاج کے مطابق نہیں سمجھتے، ہو سکتا ہے اُسی ملازمت، اُسی کام سے آپ کی منزلِ مقصود کی طرف کوئی راستہ نکلتا ہو، وہ ساری ناکامیاں، وہ سارے غم و اندوہ جو کج روی کے باعث آپ کو اٹھانے پڑتے ہیں، اپنے اندر کوئی نہ کوئی سبق آموز پہلو ضرور رکھتے ہیں۔ اِس لئے ناکامیوں سے ہرگز نہ گھبرانا چاہئے۔

۸ ● ایک مفید نفسیاتی مشورہ

عام طور پر لوگ بُرے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اُن کی اصلاح کے لئے اُن سے تلخ و تُرش باتیں کرتے ہیں۔

کسی بُرے اور غلط کار انسان کی اصلاح کا یہ طریقہ قطعی غلط، بے سُود اور بے اثر ہے۔

مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے ایک جگہ لکھا ہے ——— "سنگ سنگ جیل کے دارو غہ فرماتے ہیں ——— آپ کا کسی بدمعاش اور بُرے آدمی سے پالا پڑ جائے تو اُسے اچھی راہ پر لانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اُس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیجئے جو آپ ایک شریف اور باعزت آدمی سے کرتے ہیں۔ اپنے دل میں خیال کیجئے کہ وہ نیک انسان ہے۔ وہ اِس سلوک پر اِتنا خوش ہوگا کہ واقعی نیک بننے کی کوشش کرے گا اور اِس بات پر فخر کرے گا کہ کوئی اُس پر اعتماد رکھتا ہے اور اُسے اچھا انسان سمجھتا ہے"

۹ ● اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے

ہر شخص اچھی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ آپ بھی یقیناً چاہتے ہوں گے ——— مشہور مفکر سی۔ جی۔ گڈوکان نے لکھا ہے ——— "اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے اچھی خوراک کا ہونا لازمی ہے۔ زیادہ کمانے کی کوشش نہ کریں۔

قطعاتِ تاریخِ وفات جناب نریش کمار شاد

——— ڈاکٹر افتخار احمد علوی کاکوروی ———

اِس داغِ جُدائی کی
تاریخ کہو علوی
صد حیف کہ اُردو کی
آغوشِ ہوئی خالی

۱۹۶۹ء

———●———

آج کیوں ہر طرف ہے سناٹا
ساتھیو! کون ہو گیا خاموش
کہہ رہا ہے سکوتِ محفل کا!
شادؔ ہے اب اجل سے ہم آغوش

۲۷ + ۱۲۵۲ = ۱۲۸۹ھ

آپ کا کھانا "زندہ" ہونا چاہئے نہ کہ "مُردہ"

جہاں تک ہو سکے ڈبوں میں بند، برف سے محفوظ کی ہوئی کیمیکل طریقے سے تیار شدہ چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اگر آپ کا کھانا تازہ ہے، اُسے دیکھ کر بھوک میں اضافہ ہوتا ہے تو یقینی طور پر اُسے تیار کرتے ہوئے آپ ایک طرح کی خوشی محسوس کریں گے۔

اگر آپ کھانے سے لُطف اندوز نہیں ہو رہے ہیں تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو کھانا خراب ہے یا پھر کھانا آپ کی پسند کا نہیں ہے۔ اِس بات پر زیادہ سے زیادہ دھیان دیں ——— موزوں خوراک زندگی کی بہت بڑی مسرتوں میں شامل ہے۔ اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے اچھی خوراک کا ہونا ضروری ہے۔

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین [illegible] سائنسی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات [illegible] تہذیب سے گرے ہوئے [illegible] سوالات شائع [illegible] کئے جاتے۔ ہر شخص [illegible] کا خیال رکھتے ہوئے [illegible] تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے [illegible] جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جاسکے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— ([illegible])

سوال و جواب

[illegible] محمد حسین۔ برہان پور

س۔ [illegible]...؟

ج۔ [illegible] دیوتاؤں کی صنعت دیوتاؤں کی [illegible] ہے۔

س۔ مسکراہٹ...؟

ج۔ مسکراہٹ اچھی صحت کی ضامن ہے۔

س۔ دل کیوں دھڑکتا ہے؟

ج۔ زندگی کا پتہ دینے کے لئے!

کلیم احمد بسمل۔ بجواڑہ

س۔ دنیا کی سب سے حسین شے کیا ہے؟

ج۔ دنیا میں ایسی کوئی شے نہیں ہے جو ہر انسان کے لئے حسین ہو۔ کسی کی نظر میں کوئی چیز حسین ہے کسی کی نظر میں کوئی اور چیز۔

س۔ انسان کا انسانیت سے بڑھ کر بھی کوئی مرتبہ ہے؟ اگر ہے تو کیا ہے؟

ج۔ انسان کا سب سے بلند مرتبہ انسانیت ہی ہے۔

نگہت سلطانہ۔ لائل پور

س۔ بھائی جان! عورت آپ کی نظر میں؟

ج۔ ہم اُس مغربی مفکر کے ہمنوا ہیں جس نے لکھا ہے ——— ساری دُنیا کی بادشاہت مل جائے، لیکن عورت نہ ہو تو مرد بھکاری سے بھی بُرا ہے۔ اس سے وہ کنگال لاکھ درجہ خوش نصیب ہے جو سارا دن محنت کرتا ہے اور شام کو عورت کا چہرہ دیکھ کر سارا دُکھ درد بھول جاتا ہے۔

تنویر فاطمہ۔ اے پی۔ مبلبلی

س۔ بھائی جان! مفلسی کی زندگی اچھی یا مالداری کی؟

ج۔ مفلسی سب سے بڑی لعنت ہے۔

س۔ بھائی جان! زندگی آسان ہے یا موت؟

ج۔ آج کل تو زندگی سے موت ہی آسان ہے۔

س۔ دوسروں کی ترقی دیکھ کر لوگ کیوں جلتے ہیں؟

ج۔ تنگ دل لوگ دوسروں کی ترقی دیکھ کر جلتے ہیں۔ فراخ دل انسان دوسروں کی ترقی دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

محمد یوسف الدین تسلیم۔ نرمل

س۔ انسان کی خواہش کب پوری ہوتی ہے؟

ج۔ انسان جب اس کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔

س۔ کیا انسان شادی کے بعد خوش رہ سکتا ہے؟

ج۔ ہاں! اگر جیون ساتھی اچھا مل جائے۔

س۔ دل غم میں ڈوب جائے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ غم نہ کرنا چاہئے۔ اِس لئے کہ غم بھی خوشی کا دوسرا روپ ہے۔

جمال الدین [illegible] (پاکستان)

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں زمین کی عمر کتنی ہے؟

ج۔ پروفیسر ایچ ہولنگ سربراہ [illegible] سائنس اکادمی کے طبقات الارض کے تجربہ کا بیان ہے دُنیا کی عمر کا اندازہ پانچ ارب سال ہے۔

33(8)

بیسویں صدی

اگست



Rs.1.25

Bi[illegible]win Sadi

DELHI



تمھاری ایسی شباہت کو ڈھونڈتا تھا دل
تمھاری شکل نہ دیکھی تھی جس زمانے میں

فوٹو:- روشن لال وشِشٹ۔ جے پور



کیا غور سے اے جانِ جہاں دیکھ رہے ہو
تم سا کوئی آئینہ کے اندر تو نہیں ہے ——— قوی امروہوی

فوٹو: پرشاد۔ دہلی



دِلّی کے ایک مشاعرے میں جناب صغیر احمد صوفی اپنا پُر کیف کلام سُنا رہے ہیں۔ سامعین کے علاوہ اسٹیج پر جناب رام کرشن مضطر، زبیر رضوی، شہریار پرواز، مشیر جھنجھانوی اور تبسم دہلوی اُن کا کلام سُننے میں ہمہ تن گوش ہیں، ؎

بے نیازِ کشمکش تھی زندگی کل رات کی　　مِل گئی تھی ذہن کی آسودگی کل رات کو
اپنی آنکھوں میں شرابِ تُند کی مستی لئے　　ساتھ تھی اِک پیکرِ شائستگی کل رات کو
اِک تکلم سے مہک اُٹھا گُلستانِ دماغ　　اِک تبسّم سے کھِلی دِل کی کلی کل رات کو
اُس کی آمد سے مرے غمخانۂ تاریک میں　　رقص میں تھی روشنی ہی روشنی کل رات کو
شب کے سنّاٹے میں پیمان وفا باندھے گئے　　کچُھ نئے وعدوں نے کی جادُوگری کل رات کو
وہ مرے شانہ بہ شانہ صحن میں محو خرام　　چاند کے پہلو میں جیسے چاندنی کل رات کو
ہر گھڑی صوفی نشاط انگیز لمحوں میں کٹی
زِندگی تھی درحقیقت زِندگی کل رات کو



★

دِلّی کی طرح ہندوستان کے کونے کونے میں جشنِ غالب صدی بہت دُھوم دھام سے منایا گیا۔ جناب رشی پٹیالوی جشنِ غالب صدی سے مُتعلقہ مُشاعرہ (جو سرکاری اہتمام میں چنڈی گڑھ میں منعقد ہوا) میں اپنا کلام سُنا رہے ہیں ؎

اُن حسیں نگاہوں نے کیا حسیں سزا دی ہے — دِل سے گفتگو کرکے جان پر بنا دی ہے
اب اِسے ہَوا بھی دو دِل کے راکھ ہونے تک — شعلۂ محبت سے آگ تو لگا دی ہے
آپ کی عطاؤں سے کیوں نہ مُجھ کو شِکوہ ہو — جرأتِ خطا میری کس قدر بڑھا دی ہے
خاک تھی مری ہستی ، خاک سے بھی کم تر تھی — اِک نگاہ سے تُو نے کیمیا بنا دی ہے
کیوں مِٹیں نہ اہلِ دِل آپ کی عنایت پر — خاک میں مِلاکر بھی آبرُو بڑھا دی ہے
ہاں ذرا مُنوّر ہو میرے دِل کی دُنیا بھی — تیرے پرتوِ رُخ نے چاند کو ضیا دی ہے

اُتنی ہی فسُوں گر ہے اے رشی نظر اُن کی
جتنی بھولی بھالی ہے جتنی سیدھی سادی ہے



جشنِ غالب صدی کے سلسلے میں چنڈی گڑھ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ زیرِ صدارت جناب محمد یونس سلیم ڈپٹی منسٹر قانون گورنمنٹ آف انڈیا منعقد ہوا۔ جناب کشمیری لال ذاکر اپنا کلام سنا رہے ہیں ۔

جب کبھی تیری وفاؤں کا خیال آیا ہے — دل کے جلتے ہوئے زخموں نے سکوں پایا ہے

حسن اک گام بھی منزل کی طرف بڑھ نہ سکا — عشق تو دار سے بھی ہو کے چلا آیا ہے

میری بالیں پہ لئے حسنِ فروزاں کا چراغ — کون آیا ہے، سرِ شام یہ کون آیا ہے

تیری یادوں کی خنک چھاؤں ملی ہے اے دوست — جب یہ دِل غم کی کڑی دھوپ سے گھبرایا ہے

ہم نے تو حسن سے جینے کی ادا سیکھی ہے

ہم نے تو عشق سے مرنے کا مزا پایا ہے

ٹیلیفون دفتر ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ۶۱۹۹۲۷

منیجر ریڈر سیوت سندی دریاگنج دہلی نمبر ۶

تیر و نشتر



صدر جمہوریہ کے عہدے کے لئے کانگرس ... کشمکش

"کیا یہ وزارت چلے گی؟" ایک عنوان —— جتنے دن چل جائے منافع میں ہوگی اور ہاتھ رنگنے کا موقع ملے گا۔ ختم ہوگئی تو سابق وزیر کے خطاب سے سرفراز ہوں گے۔

"بہار کے کانگریسیوں کی نیند حرام ہوگئی" ایک عنوان —— اس گرمی میں ایئر کنڈیشنڈ دفتر اور بنگلے جو ہاتھ سے نکل گئے۔

"مدھیہ پردیش کانگرس پارٹی یا وزیروں میں کوئی پھوٹ نہیں" سکلا کا بیان —— معلوم ہوتا ہے وزارت کی شیرینی خوب دل کھول کر بٹی ہے وہاں۔

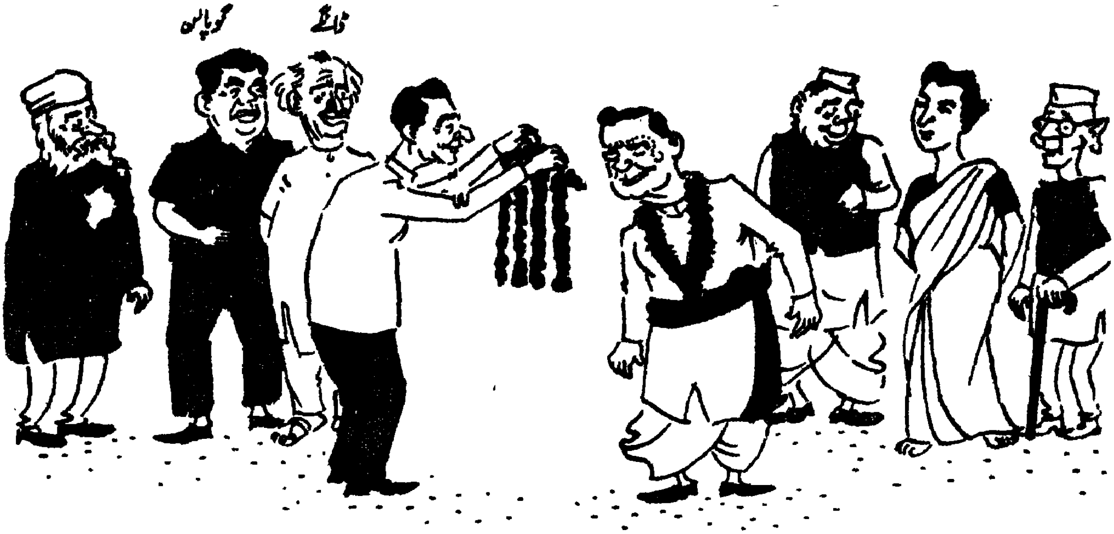
"صوبائی اسمبلیاں اور پارلیمنٹ توڑ کر راشٹرپتی راج قائم کر دیا جائے" ہندو مہاسبھا کا مطالبہ —— اور راشٹرپتی ہندو مہاسبھا کے پردھان کو بنایا جائے۔

"کانگرس ورکنگ کمیٹی سے گدیاں غائب" ایک خبر —— کیا غضب ہوا۔ گدیوں کے لئے تو ساری لڑائی ہے۔

"صدر جمہوریہ کے عہدے کے لئے کامراج بھی میدان میں ہیں" ایک خبر —— یوں کہئے کہ پانچوں سواروں میں۔

"نئی دلی میں اعلیٰ سطح پر بات چیت" ایک عنوان —— کیا قطب مینار پر ہوتی ہے۔

"تلنگانہ مسئلہ حل کرو۔ ورنہ ...!" ایک عنوان —— ورنہ پھر آندھرا کی بھی وزارتیں ہلا دی جائیں۔



"اندور کے فسادات کا سہرا جن سنگھ کے سر" ——— ایک عنوان۔

"ہریانہ وزارت میں توسیع ہوگی" ایک خبر ——— وزارت کے امیدوار لائن میں لگ جائیں۔

"فرقہ وارانہ یکجہتی کی ضرورت" ایک عنوان ——— جو موجودہ لیڈروں کے ہوتے ناممکن۔

"مسلم سینا پر پابندی لگائی جائے" یو۔پی جن سنگھ کا مطالبہ ——— اور یہ بھی تو کہئے کہ آر ایس ایس کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے۔

"اچھا اداکار کون ہے؟" ایک عنوان ——— جو جنتا کو زیادہ دھوکا دے سکے۔ ہڑتالیں، جھگڑے، فسادات اور مظاہرے کرا سکے۔

"لکھنؤ میں قابلِ اعتراض پوسٹر" ایک خبر ——— یعنی لکھنؤ بھی دِلّی کے نقشِ قدم پر۔

"ایک مظلوم شہری کی فریاد" ایک عنوان ——— بچاؤ مجھے ———

۱۔ بڑھتی ہوئی گرانی سے
۲۔ وزیروں کی فراوانی سے
۳۔ لیڈروں کی ارزانی سے
۴۔ سیاسی پارٹیوں کی بھرمار سے
۵۔ بھاشنوں کے انبار سے
۶۔ جلسوں جلوسوں کی تکرار سے

"کانگرس کے اقتصادی ریزولیوشن میں غریبوں کے لئے نئے چانسے" ایک عنوان ——— اور رائے پیش کرنے کو چانسی میں اجلاس بلایا جائے تو خوب رہے۔

"ہریجن بھی ہندو سماج ہی کا حصہ ہیں" جگت گورو کا بیان ——— لیکن اگر وہ آپ کے چرن چھو لیں تو آپ فوراً اشنان کریں گے۔



ہندوستان کے اندرونی مسائل ۔

• "لاہور میں بھولا نگر کا افتتاح" ایک خبر ——— جو جھول کر کیا گیا۔

• "موسم برسات میں چوری کی وارداتوں میں دس فیصدی اضافہ ہو جاتا ہے" ایک عنوان ——— یعنی بارش کھیتی ہی کے لئے مفید نہیں بلکہ چوروں کے حق میں بھی نفع بخش ہے۔

• "ڈی ٹی یو کی ۱۳۰ بسیں ایک مہینے سے بیکار پڑی ہیں" ایک خبر ——— دہلی ایڈمنسٹریشن کی زبان ہندی ہے۔ ہندی میں کہئے کہ وشرام کر رہی ہیں۔

• اور کسان ناچ اٹھا ایک عنوان ——— شہریوں کی جیب کاٹ کر

• "پنجاب کانگریس کے ناراض لیڈروں کا وفد صدر کانگریس سے ملے گا" ایک خبر ——— اور ان کے لئے ایک نیا درد سر پیدا کرے گا۔

• "بہار کے ٹیچروں کی دھمکی" ایک خبر ——— ٹیوشن کرنے کی اور ٹیوشن پڑھنے والے لڑکوں کو پاس کرنے کی اجازت دی جائے۔

• "جگت گورو کے خلاف مظاہرہ اور سیاپا" ایک خبر ——— لوگ کہہ رہے ہوں گے۔ ہائے جگت گورو۔ وائے جگت گورو۔

• "خبروں میں جن کا ذکر ہے" ایک عنوان ———

۱۔ ہڑتالیں اور مظاہرے
۲۔ جلسے، جلوس اور نعرے بازی
۳۔ قتل، خودکشی، اغوا اور چوری ڈکیتی
۴۔ ستیہ گرہ، دھرنا، گھیراؤ اور بھوک ہڑتال
۵۔ ایجی ٹیشن، جھگڑا، دنگا فساد

• "کلکتہ کے نزدیک قتل" یہ ایک خبر ——— مختصر ہی ہوگا۔

• "ناجائز شراب کا دھندا کرنے والوں میں لڑائی" یہ ایک خبر ——— لڑائی بھی ناجائز ہی ہوگی۔



سوتنتر پارٹی سے جن سنگھ اور بھارتیہ کرانتی دل کا الحاق۔

• "دو گمشدہ عورتوں کا کوئی سراغ نہیں ملا" پولیس کا بیان —— یعنی عورتوں کی نہیں، سراغ کی تلاش ہے۔

• "معشوقہ پر [illegible] لیا" ایک خبر —— عشق نہیں قتل کی واردات۔

• "بیوی کو تیل ڈال کر جلا دیا" ایک خبر —— خواہ مخواہ قتل کا الزام سر لیا۔ ہم ایسا نسخہ بتاتے ہیں کہ بیوی جلتی رہے اور کسی کو نظر تک —— نہ آئے۔ دوسری شادی کرلی جائے۔

• "مغربی یو۔پی میں بھی زلزلہ" ایک خبر —— کیا وہاں بھی علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک چل پڑی۔

• "کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں گدیوں کی جگہ کرسیاں" ایک خبر —— ہندوستان کا ترقی کی طرف ایک اور قدم۔

• "جادو کے بارے میں ریسرچ کرنے والے ادارے کا قیام" ایک خبر —— کیا ضرورت ہے اس فضول خرچی کی۔ جادو تو خود سر چڑھ کر بولتا ہے۔

• "جاپان ہندوستان کے ساتھ مل کر ایشیائی خوشحالی کے لئے کوشاں رہے گا" ایک اعلان —— اور چین کے سینے پر سانپ لوٹیں گے۔

• "دھرم کوشٹ میں سرکاری مداخلت" گیانی ذیل سنگھ کا بیان —— یہ ادھرمی کام۔

• "میونی ایڈمنسٹریشن میں ہندی کی رفتار ترقی" ایک عنوان —— بہت تیز ہے، اردو کی لاش پر۔

• "پٹیالہ میں مردہ زندہ ہوگیا۔ پجاری کی کرشمہ سازی" —— روس اور امریکہ کے سائنسداں اس کی شاگردی کریں۔

• دلّی، لندن اور نیو یارک میں حپاتیوں کے منصوبے نے ریکارڈ توڑ دیئے۔ ایک خبر ـــــ مقامِ فخر ہے کہ ہماری دلّی کا نام بھی لندن اور نیو یارک کی صف میں آ گیا۔

• شادی ـــــ جنّت کا دروازہ۔ ایک عنوان ـــــ جو اس میں داخل ہوا وہ بھی پچھتایا۔ جو نہیں داخل ہوا وہ بھی پچھتایا۔

• ایشیائی ملکوں کے بلاک کی روسی تجویز۔ ایک عنوان ـــــ بروقت اور برمحل ـــــ ایشیائی ملکوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا ایک راستہ۔

• بیوی نے خاوند کو ہرا دیا۔ ایک خبر ـــــ پتی ورتا کا نیا معیار۔

• بچے کی صحت اور نیک کرداری۔ ایک عنوان ـــــ اب تو ماں باپ میں بھی نہیں ملتی۔

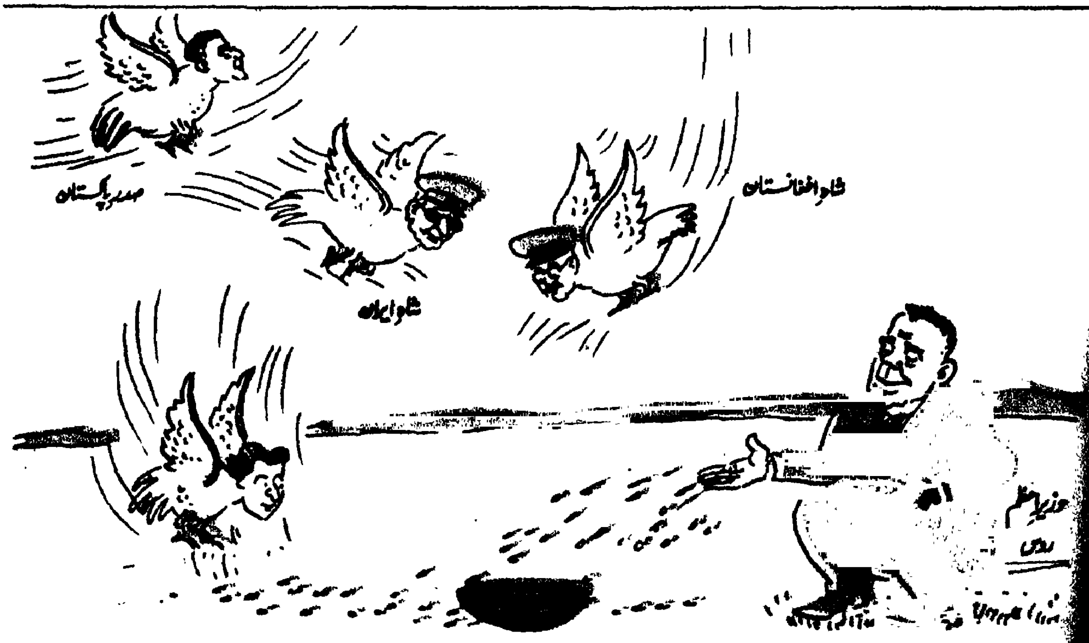
• تمام کمیونسٹ پارٹیوں پر بلا تاخیر پابندی لگا دی جائے۔ سوتنتر پارٹی کا مطالبہ ـــــ اور جب یو۔پی اور بہار میں ان کے ساتھ مل کر وزارت بنائی گئی تھی، اُس وقت خیال نہیں آیا تھا۔

• جیل میں لاٹھی چارج۔ ایک خبر ـــــ کیا لاٹھی بھی وہاں قید تھی؟

• بناسپتی کے نرخ بڑھ گئے۔ ایک خبر ـــــ اور اصلی گھی کو شرمانے لگے۔

• پاکستان میں عریانیت کا دور دورہ۔ ایک خبر ـــــ ذرا اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال کر دیکھئے۔

• سبز انقلاب لائیں گے۔ پروفیسر شیر سنگھ ـــــ کیا مسلم لیگی ہو گئے ہیں آپ؟



ایشیائی ملکوں کے اقتصادی بلاک کی روسی تجویز۔

ایس۔ کے۔ پاٹل

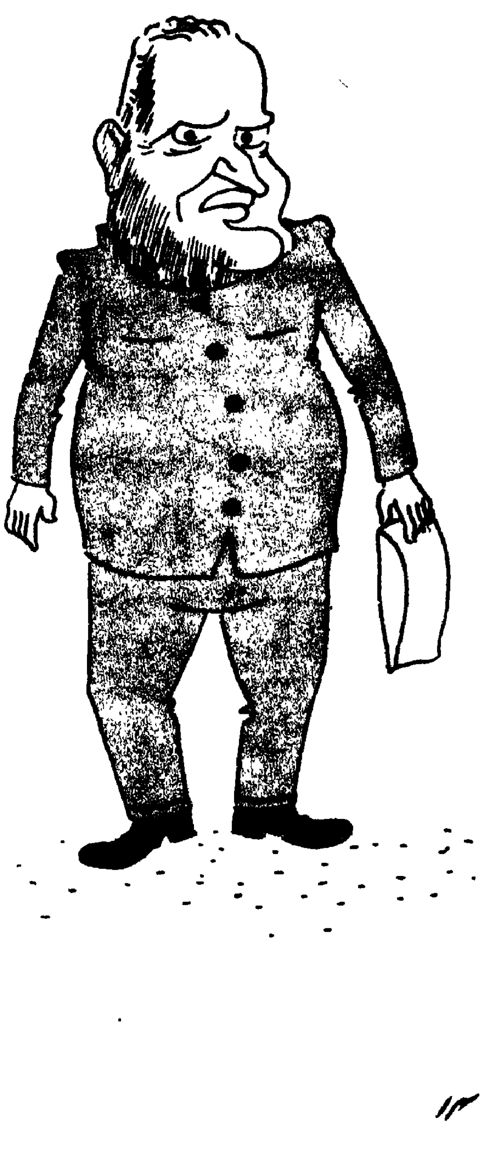
خوشترگرامی

وہ ذاتِ گرامی جن کا وجود خدا کی سرزمین کے لئے بھاری ہے۔ شخصِ طویل الحمق کی جیتی جاگتی تصویر۔ تن من کے بگلا بھگت۔ چہرہ سپاٹ۔ بے فیض آنکھوں میں فتنے۔ دل میں شرارت سازش میں یکتا۔ توڑ جوڑ کے ماہر ـــــ یہ ہیں ـــــ

شری ایس۔ کے۔ پاٹل

شر، فتنہ، فساد اور فرقہ پرستی وہ "عناصرِ خبیثہ" ہیں جو آپ کے خمیر میں داخل ہیں اور جن کا آپ کے دل و دماغ اور ضمیر پر کنٹرول ہے ـــــ کوئی کہتا ہے امریکہ کے دلال ہیں۔ کوئی کہتا ہے کانگریس میں جن سنگھ کے ایجنٹ ہیں۔ کسی کے نزدیک سوتنتر پارٹی کے ترجمان ہیں ـــــ یہ سب کچھ نہ ہو تو بھی قول و فعل سے سوشلزم کے مخالف۔ رجعت پسندی کے ترجمان، تنگ نظری کے دلدادہ۔ مختصر یہ کہ کانگریس کے چہرے پر بدنما داغ اور گاندھی و نہرو کی جماعت سے ان کی وابستگی ایک شرمناک جسارت اور ریاکاری ہے ـــــ بمبئی میں پچھلے الیکشن میں مار کھائی تھی۔ لیکن رجواڑوں، سرمایہ داروں کی دھکاپیل اور روپے پیسے کی ریل پیل سے پھر پارلیمنٹ میں گھسنے میں کامیاب اور سازشوں میں مصروف اور جوڑ توڑ میں سرگرم ہوگئے۔ صوبائی اور مرکزی وزیر رہ چکے ہیں۔ وزیرِ اعظم بننے کا سر میں سودا ہے۔ مرزا غالب نے شاید انہی کی سماعی کے لئے یہ کتبہ تصنیف فرمایا ہے ؎

عیسیٰ و مریم سے لباس میں ننگ ـــــ وجود تھا



افسانہ

کالے گورے ہاتھ

اختر ملیح آبادی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

۲۷۔ چتواپور روڈ۔ لکھنؤ

میرے بھائی خوشتر! اسلام ونیاز

ہمالہ کی نامعلوم بلندیوں سے ایک خط آیا۔ اُس خطرناک مقام سے جہاں زندگی کی بقا کا سرے سے کوئی تصوّر ہی نہیں! اور جانتے ہیں کہ اُس خط میں کیا تھا؟ ——— "ہم جناب خوشتر صاحب کے احسان مند ہیں کہ اُنھوں نے ہماری گزارش پر ہر ماہ پرچہ بھیجنے کا انتظام کر دیا اور اِس طرح ہم اور ہمارے ساتھی دل بہلا لیتے ہیں۔ . . !" یہ آواز اُن دلوں سے نکل تھی جو حفاظتِ وطن کی خاطر زندگی کی جملہ رعنائیاں تج کر دشمن کے خلاف مورچہ بند ہیں! کچھ نہ پوچھیے کہ خط پڑھ کر میرے تاثرات کا رُخ کیا تھا؟ میں بیان نہیں کر سکتا اور آپ اندازہ نہیں لگا سکتے! آپ کی انسان دوستی کو میں آپ کا مہمان رہ کر قریب سے دیکھ چکا ہوں۔ وہ سارے انمٹ نقوش قندیلوں کی طرح روشن ہو گئے ——— مہنگائی کی آڑ لے کر تو آج کل مُدیر لکھنے والوں کو پرچہ بھیجنے سے کترانے لگے ہیں اور آپ اِس کے برعکس عامل ہیں! ——— بہر کیف اپنی کہانی کی تعریف بھول کر مجھے صرف اُس خط میں آپ کی انسانیت کا عکس دیکھ کر بے انتہا مسرّت ہوئی اور اب تک ہے۔

اب میرے لئے دعا کیجیے اور ممکن ہو تو اِس کا انتظام کیجیے کہ نماز کے دَوران لڑکیاں مجھے پریشان نہ کریں ——— کوئی اِدھر سے مُنہ نکالتی ہے کوئی اُدھر سے اور اپنی اپنی کہانی سُنانے لگتی ہے اور کہتی ہے "اے مولوی صاحب! ہماری کہانی بھی لکھ دو۔ ہم بھی دلچسپ کہانی ہیں!" اب بتائیے لڑکیوں کی یلغار کو میں دورانِ نماز روکوں تو کیسے روکوں اور لڑکیوں کو شرارت سے دُور رکھوں تو کیونکر!؟ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نماز نہیں ہوئی اور گناہگار الگ ہوا!؟ تو سرکار! اب کرم کیجیے مجھ ناچیز پر! مجھ سے لڑکیوں کے افسانے لکھنے کی فرمائش نہ کیا کیجیے۔ اِس کا ذکر "آخری وقت ہیں" تو "مسلمان" بن جانے دیجیے!! . . .

عاجز و پریشان ——— اختر ملیح آبادی

★

اُن دنوں مجھے حصولِ معاش کے لئے ایک انتہائی غیر شاعرانہ اور گندی جگہ جانا پڑتا تھا!

گاندھی گارڈن سے شبیر شاہ کالونی جو مکرانیوں کی بستی تھی اور جہاں تعلیم گاہ تک میرا روزانہ آنا جانا تھا۔ حصولِ معاش کے لئے میں نے اُن گندی راہوں سے سمجھوتہ کر رکھا تھا۔ حالانکہ سمجھوتے کے باوجود میرے قلبی تاثرات پر جو بیتتی اُس کا پوری طرح اندازہ شاید میں خود بھی نہیں کر پایا تھا۔

آٹھ سال کی عمر سے لکھنؤ جیسے نازک مزاج و نفاست پسند شہر میں زندگی گزارنے سے میرا مزاج لکھنوی بن گیا تھا۔ صفائی، سلیقہ اور اخلاق پسندی مجھ میں آگئی تھی۔ مروّت اور لحاظ کا میں ذہنی طور پر پابند ہو گیا تھا اور اِس پیمانے نے مجھے جانچنے کے لئے کسوٹی عطا کر دی تھی جو اُس وقت بھی میرے پاس تھی جب قسمت نے مجھے مُنہ چڑایا اور تمسخر کے طور پر مجھے اِس گندی جگہ سے گزرنے پر مجبور کیا جہاں سے مُنہ پر رومال رکھ کر اور آنکھیں مُوند کر گزرنا مجھے منظور نہ ہوتا۔

یہی وجہ تھی کہ صبح میرے مزاج میں تلخی اُبھر آئی تھی۔ وہ ردِ عمل تھا شکست کا جسے میں اپنی زندگی سے دُور نہ ہٹا سکا تھا۔ کراچی پہنچتے ہی مجھے اچھی ملازمت مل گئی تھی اور بیکاری کا شکار نہ ہونا پڑا تھا۔ لیکن زندگی کے اِس ظاہری اہتمام کے باوجود جو میرے مزاج کے پیشِ نظر زندگی نے کیا تھا۔ میں شکست نما فتح کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ لیکن میری بیوی نے جو محض عورت تھی مجھے اُسی راہ پر سے گزرنے پر آمادہ کر لیا جسے میں اپنانے کے لئے تیار نہ تھا۔ اُس نے اُس عورت کے جاذبِ نظر تبسم اور لطیف لہجے میں کہا: "گرد و پیش کی گندگی، بداخلاقی اور پستی سے آپ کو کیا واسطہ؟ آپ کا ماحول تو صاف ستھرا اور پاک ہوگا۔ آپ علم کی شمع جلائیں گے۔ روشنی کریں گے اندھیرے میں۔ ۔ ۔" غلط نہیں کہا میری بیوی نے، لیکن میں کیا کروں کہ لکھنوی نفاست کی پیشانی پر شکن تھی۔ اُسے میری بیوی دُور نہ کر سکی تھی۔ اُس کے پیشِ نظر تو وہ بڑی تنخواہ تھی جو ہر ماہ آنے والی تھی۔ جس سے وہ خود صاف ستھری رہ سکتی تھی، اپنی بچّی کو گڑیا کی طرح سجا سکتی تھی اور میرے لئے لذیذ کھانا پکا سکتی تھی۔ یہ خواب تھے اُس کے لیکن یہ خواب اُسی وقت تعبیر آشنا ہو سکتے تھے، جب میں ایثار پر آمادہ ہوتا۔ اِسی لئے وہ مجھے برابر مان جانے پر رضامند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کہتی "پھر آپ اپنے لئے خوبصورت رائیٹنگ ٹیبل خرید لیجیئے گا۔ لکھنے کا کمرہ آرام دہ ہو جائے گا۔ سکون سے آپ لکھ سکیں گے" اور آخر میں دھمکانے کے لئے نہیں، ڈرانے کے لئے کہتی "یہ غیر شہر ہے۔ یہاں ہمارے پاس ہے کیا۔ کس کے آگے ہاتھ پھیلائیں گے اور کون غمگساری کرے گا۔ اگر آپ چاہیں تو ہمیں مسرّت مل سکتی ہے، آپ کی بچّی کو آرام مل سکتا ہے اور آپ کو ذہنی سکون جو لکھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔"

کبھی میں بیوی سے متّفق ہو جاتا۔ اُس پر اور اپنی بچّی پر ترس آ جاتا اور کبھی مجھے یہ گمان بے چین کر دیتا کہ میری بیوی مجھے سڑکوں پر دوڑنے والا اور گاڑی کھینچنے والا ٹٹو سمجھتی ہے اور اگر انسان سمجھتی بھی ہے تو افسانہ نگار نہیں سمجھتی۔ میرے جذبات کا قطعی اندازہ نہیں کرتی، نہ پاس کرتی ہے کہ لکھنے والے کو صرف روٹی ہی نہیں کچھ اور بھی چاہیئے اور اِس "کچھ اور" میں اِس رُخ کو وہ اب تک نہیں دیکھ پائی ہے کہ افسانہ نگار شوہر کے لئے ملازمت اِتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا کہ ماحول! وہ میرے ذہن میں جھانک نہیں سکی تھی اور میں اِس فلسفہ کو سمجھا نہیں سکا تھا کہ کم تنخواہ ہزار درجہ بہتر ہے اُس تنخواہ سے جسے ضمیر گوارا نہ کرے!

بیوی کی دلیل اِتنی کامیاب نہ ہوئی جتنا کہ یہ خوف کہ افسانہ نگار زندگی کا بار اُٹھانے میں پست ہمّت ہوتے ہیں اور زندگی کی کشاکش کا مقابلہ عزم سے نہیں کر سکتے۔ لہٰذا میں نے گندی راہوں پر سے گزرنا اور گندے ماحول میں درس و تدریس کا مقدّس فرض انجام دینے کی رضامندی دے دی اور اُسی دن سے وہ گندی راہیں ہمنوا بن گئیں۔

جب پہلے دن میں شیر شاہ کالونی جانے کے لئے گاندھی گارڈن کے پُرہجوم بس اسٹینڈ پر پہنچا تو شیر شاہ کالونی رُوٹ کی بس کو دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ راہیں گندی تھیں۔ تب ڈیزل بسیں ہوتیں تو تلافی نظر ہو جاتی۔ لیکن جو بس سامنے کھڑی تھی وہ اپنی بپتا کا نوحہ خود ہی سُنا رہی تھی اور اپنا بوسیدہ دامن میرے لئے پھیلائے ہوئے تھی۔ کس طرح بس میں بیٹھا یاد نہیں، اِس لئے کہ بس کے اندر جاتے ہی دوسرا غم اُبھر آیا۔ جو مسافر تھے اور جن کے ساتھ مجھے ہمسفر کرنا تھا وہ اِس قابل نہ تھے کہ اُن کے ساتھ سفر کیا جائے۔ بس مکرانی عورتوں سے بھری تھی۔ بدصورت، سیاہ، حبشی خدوخال والی عورتیں ڈھیلے ڈھالے گندے کپڑوں کے ساتھ، بس میں بھری تھیں اور چیخ چیخ کر اکھڑ زبان بول رہی تھیں۔ جس سے میں آشنا نہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح ایک موٹی بدشکل اور تنومند مکرانی عورت کے پاس والی سیٹ پر میں بادلِ ناخواستہ بیٹھ گیا۔ تعفّن سے سانس گھٹنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بس نے سیکڑوں جھٹکوں کے بعد چلنے پر رضامندی ظاہر کی اور میں نہ جانے کہاں کھو گیا ـــــ لکھنؤ کی معطّر فضاؤں میں ـــــ اُس وقت مجھے ملال یہ تھا کہ زندگی نے مجھ سے تمسخر کیوں کیا؟ اگر رزق اِسی طرح مجھے دینا چاہتی تھی تو کیا میں اِس کا حقدار نہ تھا کہ صاف ستھری عمدہ بس ملتی اور ہمسفر صاف ستھرے ہوتے!؟

چند ہی دن کے بعد مجھے اچانک محسوس ہوا جیسے میرا ذہن کند ہوتا جا رہا ہے اور فکر و نظر کی لطافت معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ رزق کی مجھے ضرورت تھی۔ لیکن شاعرانہ جذبات کی موت میں برداشت نہ کر سکتا تھا اور بیوی کو بتلائے بغیر غور کر رہا تھا کہ ملازمت کروں یا چھوڑ دوں؟ ـــــ لیکن اندر ایک آواز بھی اُبھرتی تھی جو کہیں دُور سے آتی تھی، لیکن پھر بھی اُسے سُن ضرور لیتا تھا کہ "زندگی حالات سے باعزم مقابلے کا نام ہے!" اگر زندہ رہنا ہے تو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مجھ میں زندگی گزارنے کا سلیقہ و صلاحیت موجود ہے۔ ورنہ "جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیّاد ہوتا ہے!" اور میں گومگو کی سی حالت میں ذہنی بھنور میں پھنس جاتا تھا!

پھر میرے زندہ احساس نے زندگی بخش دی۔ میں نے قربانی دے کر بیوی اور بچّی کے لئے زندہ رہنے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ دوسروں کو قربانی کا درس دینے والا اگر خود ایثار نہ کر سکا تو قول و فعل میں مناسبت ہی کیا رہے گی؟ مانا کہ

حبشی رنگ روپ اور مسخ خد و خال والی عورتوں کے ساتھ سفر میں میرے خیالات و جذبات مر جائیں گے تو مر جانے دو۔ کیا دُنیا میں ہر آدمی شاعرانہ لطیف جذبات کے سہارے ہی زندہ رہتا ہے۔ اگر افسانہ نگار مر سکتا ہے اور صرف بے حس انسان زندہ رہ سکتا ہے تو میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں عام انسان بن کر جیوں گا تاکہ میری بیوی کی مسکراہٹ زندہ رہے اور میری بچی کے گلابی عارض بے رنگ نہ ہونے پائیں!

جھٹکا لینے والی خستہ بس پر ایک گوشے میں دبکا بیٹھا کھڑکی کی طرف مُنہ کیے تازہ ہوا میں سانس لے رہا تھا اور پاس بیٹھی ہوئی مکرانی عورت مجھے دباتی چلی جا رہی تھی اور میں منزل کا منتظر تھا کہ جلد آئے تو مکرانی عورت کے بھاری جسم کے بوجھ سے نجات پاؤں۔ رہا زندگی کا دباؤ تو وہ موٹی مکرانی عورت کے دباؤ جیسا نہ تھا کہ اچانک بس کھڑکھڑاتی ہوئی لی مارکیٹ کے مکرانی بس اسٹینڈ پر رُکی اور میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جو گاؤن نما ریشمی برقعے کا نقاب ایک گورے حسین ہاتھ سے پکڑے ہوئے بس کی طرف بڑھی اور دوسرے گورے ہاتھ سے اُس نے بس کا ٹوٹا پھوٹا بے رنگ دروازہ پکڑا اور لیڈیز سیٹ پر جو ڈرائیور کے پیچھے مردانہ سیٹوں سے الگ تھی بیٹھ گئی۔ یہ پہلی بھرپور سانس تھی جو میں نے لی اور پہلی بار مجھے ہوا میں عطر کی خوشبو کا احساس ہوا!

مجھے شُبہ تھا کہ دل دھڑکن سے خالی ہو چکا ہے۔ لیکن دھڑکن نے اُبھر کر مجھے مسرور کیا کہ ابھی میں زندہ ہوں اور دل کی دھڑکنیں ناپید نہیں ہوئیں اور یہ کہ میں افسانہ لکھ سکتا ہوں اور وہ چند ہفتوں میں پہلا دن تھا جب راہوں کی گندگی کا احساس مجھے نہ ہوا اور نہ بس کے اندر کی تعفن مجھے محسوس ہوئی کیونکہ وہ گورے خوبصورت ہاتھوں والی لڑکی ایک قدم کے فاصلے پر مجھ سے آگے والی عورتوں کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ حد بندی کے لئے بیچ میں لوہے کی جالی تھی جو میرے خیالوں کی پرواز میں مانع نہ ہوئی۔ ہر لمحہ یہ دھڑکن ضرور رہی کہ وہ راستے ہی میں نہ اُتر جائے لیکن جب وہ شیر شاہ کالونی تک آئی تب مجھے اطمینان ہوا۔

میں نے کالج کی راہ لی اور وہ ایک سمت چلی گئی۔ طلباء نے میری خوش مزاجی اور طبیعت کی نرمی کا اندازہ درجے میں داخل ہوتے ہی لگا لیا تھا۔ لیکن اِس تبدیلی کا راز وہ نہ سمجھ سکے۔ البتہ پڑھاتے وقت بھی وہ لڑکی اپنے گورے اور حسین ہاتھوں کے ساتھ سامنے آ کر کھڑی ہوتی رہی اور لڑکے محسوس کرتے رہے کہ ماسٹر صاحب آج دل سے پڑھا رہے ہیں! اُن گورے حسین ہاتھوں نے مجھے زندگی کا احساس دلایا تھا اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ احساس میری زندگی کا سہارا بن گیا تھا۔ لیکن آخری پیریڈ میں اِس فکر نے مجھے بے چین کر دیا کہ وہ ہاتھ واپسی پر مجھے سہارا دے سکیں گے یا نہیں؟

یہی فکر لئے جب میں بس اسٹینڈ پہنچا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے اُس لڑکی کو بس کی اگلی سیٹ پر برقعے سے ہاتھ نکالے بیٹھے دیکھا۔

ہر روز وہ لڑکی اپنے گورے ہاتھوں کو برقع سے نکالے بس اسٹینڈ پر کھڑی ملتی رہی اور شام کو واپسی میں میری ہمسفر ہوتی رہی اور مجھے گندی راہوں کا متعفن احساس اِس شدّت سے باقی نہ رہا جو گورے ہاتھوں والی لڑکی کے نمودار ہونے سے پہلے سوہانِ رُوح کا باعث تھا اور روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا۔ نہ مکرانی بدشکل اور بدتہذیب عورتوں کی موجودگی مجھے اُس طرح کھلتی جس طرح پہلے کھلتی تھی۔ اب تو میں گھر سے کالج جانے کے لئے نکلتا تو اِس یقین کے ساتھ کہ گورے ہاتھوں والی لڑکی آ جائے گی تو فضا معطر ہو جائے گی اور میں باغ سے گزرتا ہوا کالج جا پہنچوں گا۔ اُدھر بیوی کو جو خطرہ محسوس ہوتا رہتا تھا وہ دُور ہوا اور وہ شاید یقین کر چکی تھی کہ افسانہ نگاری کا موڈ احساسِ فرض کے نیچے اِس طرح دب گیا ہے کہ مزید خطرے کا باعث نہ بنے گا۔ یہی وجہ تھی کہ بیوی مطمئن تھی اور میری خاطرداری کی طرف راغب! کیونکہ اُس کی خاطر میں نے اپنے عزیز ترین جذبات قُربان کر دیئے تھے۔ لیکن میری بیوی کو اُن گورے ہاتھوں کا علم نہ تھا جنھوں نے مجھے زندگی کی خوشبو عطا کر دی تھی۔ نہ میں اِس راز کو افشا کرنے کی حماقت کر سکتا تھا۔ کیونکہ میری بیوی اِس معاملے میں بے حد حسّاس اور بدگمان واقع ہوئی تھی!

لیکن میری بدگمانیاں دُور ہو چکی تھیں۔ زندگی سے جو بدگمانیاں پیدا ہوئی تھیں، وہ گورے ہاتھوں والی لڑکی نے نمودار ہو کر زائل کر دی تھیں اور اب میں پھر مطمئن تھا۔ میرا ذہن پھر زمین کو بھول کر آسمان کی سیر میں مشغول تھا اور میں سوچا کرتا کہ وہ کون ہے اور میری طرح شیر شاہ کالونی کیوں جاتی ہے؟ کیا وہ میری طرح مہاجر ہے اور میری طرح مجبور؟ اُس کا شغل کیا ہے اور سیاہ نقاب کے پیچھے چُھپا ہوا چہرہ کیا واقعی چُھپانے کی چیز ہے؟ ویسے کراچی میں برقع متروک تھا اور خال خال نظر آتا تھا۔ پھر اُس نے برقع کی آڑ کیوں لی؟ کیا حیا و شرم کے لئے وہ برقع ضروری سمجھتی ہے؟ اُس کے ہاتھ میں دبی ہوئی کتابیں کیا حصولِ علم کے لئے ہوتی ہیں یا تدریس کے لئے؟ اور ایسے ہی بہت سے سوالات میرے ذہن میں گونجتے رہتے تھے اور مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ گورے ہاتھ

یقیناً کسی افسانے کو جنم دیں گے!

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ جب گورے ہاتھوں والی لڑکی ایک ہاتھ سے سیاہ ریشمی نقاب پکڑے بس کی طرف بڑھی تو ایک مکرانی بدشکل عورت نے اُسے دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر سنبھل نہ سکی اور گر گئی۔ مکرانی عورتیں کھیسیں نکال کر بے ہنگم ہنسی ہنسنے لگیں۔ اُس وقت مجھ پر نہ جانے کیا بیتی کہ اپنی سیٹ سے اُٹھا، باہر آیا لپک کر اور اُسے اُٹھنے میں مدد دی۔ اُس کا نقاب ہٹ گیا تھا اور گورا حسین مکھڑا بے نقاب تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر اُس نے سب سے پہلے نقاب ٹھیک کیا اور میں نے اُس مکرانی بدشکل عورت سے درشتی کے ساتھ کہا "بہت بدتمیز ہو تم!" اور پھر مکرانی عورتوں نے چلّانا اور واویلا کرنا شروع کر دیا۔ اُلٹی سیدھی اُردو میں کہنے لگیں۔

"تم بہت کھراب ہے جو عورت کو گالی بکتا ہے۔ ۔ ۔"

"ان کے منہ نہ لگئے" وہ برقع جھاڑتی ہوئی اُٹھی اور بس کے اندر جا کر سیٹ پر اس طرح بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ لیکن میرا ذہن بُری طرح پراگندہ ہو گیا تھا۔ اگر یہ عمل میرے جذبات کے لئے ناقابلِ برداشت ہے کہ ایک تر و تازہ پھول کسی گنوار کے جوتے سے روند دیا جائے۔ تو یہ حرکت کیسے میں برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ حُسن اس طرح ذلیل کیا جائے۔ کہاں وہ بدصورتی کے سیاہ پہاڑ اور کہاں یہ حسین کلی! اور وہ احساس جو گورے ہاتھوں کے نمودار ہونے سے قبل میرے لئے سوہانِ روح تھا۔ وہ شدت اور بے چینی کے ساتھ عود کر آیا کہ جن راہوں سے مجھے اور گورے ہاتھوں کو زندگی گزارنی ہے، وہ یقیناً زندگی کا عروج نہیں، پستی ہے! اگر بس اکھڑ مکرانی سے نہ گزرتی تو یہ حادثہ کیوں ہوتا۔ ناموافق ماحول کی تلخی نے میرے مزاج کو دھکا لگایا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ گورے ہاتھوں والی لڑکی تو شاید میری طرح مجبور نہیں پھر وہ ان گندی راہوں سے کیوں گزرتی ہے؟

دن بھر میرا موڈ خراب رہا اور طلباء سہمے سہمے رہے اور انھیں بار بار احساس ہوتا رہا کہ آج کے پڑھانے کا انداز بے کیف سا ہے! خود مجھے اِس کا احساس تھا۔ لیکن میں صرف ماسٹر ہی نہ تھا۔ کچھ اور بھی تھا۔ اندر سے کچھ اور نہ ہوتا تو تذلیلِ حُسن کا حادثہ مجھے متاثر نہ کرتا اور نہ سارے جہاں کا درد میرے دل میں پیدا ہوتا۔

واپسی میں جونہی میں اسٹینڈ پہنچا تو اُس نے کہا "آپ کی انسانیت کے لئے مشکور ہوں" اسٹینڈ پر بس ابھی نہیں آئی تھی۔ روایتی جواب کے بجائے میں نے کہا "آپ یہاں کیوں آتی ہیں؟ ——— یہ اکھڑ علاقہ ہے اور ادب و اخلاق سے بے نیاز۔ ۔ ۔" میرے دردمندانہ شکوہ پر وہ ہنس دی اور پھر کہا "خدا نے میرے رزق کا انتظام یہیں کیا ہے!"

"آپ کہیں پڑھاتی ہیں ——— کہاں؟"

"ایک پرائیویٹ گرلس اسکول ہے۔ مشاہرہ اچھا ہے اِس لئے مجھے اِدھر آنا پڑتا ہے۔"

"رزق کی تلاش آپ کی ذمّے داری کیسے ہو سکتی ہے۔ ۔ ۔؟" میں نے نہ جانے کیسے یہ سوال کیا ——— اُس نے اپنے گورے ہاتھوں کی طرح اپنی زندگی کی جھلک دکھا دی ——— وہ یتیم تھی۔ ماں، چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کی کفالت اُس کے ذمّے تھی۔ وہ مہاجرہ تھی اور زندگی سے اِسی طرح برد آزما تھی جس طرح کہ میں تھا۔ وہ پڑھاتی بھی تھی اور پڑھتی بھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح میں اپنے دُکھ بھول گیا اور اُس کے دُکھوں میں کھو گیا ——— وہ گورے ہاتھ جنھیں میں جمالیاتی رُخ سے اب تک دیکھا کرتا تھا۔ اب میری نظر میں دو مرمریں مضبوط ستون بن کر اُبھر آئے۔ جن پر نئی زندگی کی نہ صرف بُنیاد رکھی جا رہی تھی۔ بلکہ تعمیرِ حیات کا سارا بوجھ اُن پر تھا۔

بس آ گئی۔ میں اور وہ اپنی اپنی سیٹوں پر جا بیٹھے اور میں یہ سوچنے لگا اب تک مجھے اپنے ہاتھوں پر ناز تھا جو تعمیرِ حیات میں مصروف تھے کہ ان دو گورے ہاتھوں نے سامنے آ کر میری غلط فہمی دُور کر دی۔ اگر مرد کے ہاتھ تعمیر کے لئے ہل سکتے ہیں تو عورت کے ہاتھ بھی تعمیر میں لگ سکتے ہیں! اور یہی وجہ تھی کہ ان ہاتھوں سے مجھے صرف خیرگی ہی نہیں، بلکہ عظمت کا احساس بھی ملا۔ حالانکہ اب تک میرا گمان یہی تھا کہ عورت کے خوبصورت ہاتھوں کا محض اِتنا مقصد ہوتا ہے کہ اُنھیں آنکھوں سے لگا لیا جائے۔ پتھروں کی مورتیوں کی طرح اُنھیں صرف احترام پیش کر دیا جائے۔ لیکن اُن دو ہاتھوں نے میرے تصوّر کو نہ صرف متزلزل کر دیا تھا۔ بلکہ مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اپنے تصوّر کے خدوخال کو درست کر لوں!

جب پہلے دن میں نے اُن گورے حسین ہاتھوں کو دیکھا تھا تو صرف مرد کی نگاہ سے، جو حُسن کی پیاسی ہوتی ہے اور اُن ہاتھوں نے مجھے اِسی رُخ سے متاثر بھی کیا تھا۔ مجھے احساس ہی نہیں، یقین ہو گیا کہ یہ گورے ہاتھ کسی کے گلے کا سفید پھولوں والا ہار بن جاتے ہوں گے اور شاید یہی اُن ہاتھوں کی سب سے بڑی خصوصیت ہو گی یا کبھی وہ ہاتھ آرائش و زینت میں مصروف ہو جاتے ہوں گے۔ اِس کے علاوہ مجھے اُن ہاتھوں سے کسی قسم کا حُسنِ ظن تک پیدا نہ ہوا تھا۔ کیونکہ میرے ذہن میں خوبصورت ہاتھوں کا کوئی کارنامہ موجود نہ تھا نہ کوئی خیال

اِس لئے اُس لڑکی کے گورے ہاتھوں سے میں یہ توقع کیسے کرسکتا تھا کہ وہ کوئی عظیم کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں یا اُن میں تعمیری افادیت ہوگی۔ بلکہ یہ کہہ دوں کہ اُن ہاتھوں کو پہلی بار دیکھ کر مجھ میں مردانہ رقابت اُبھری تھی کہ کوئی اُنھیں آنکھوں سے لگاتا ہوگا اور زندگی سے غافل ہوجاتا ہوگا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ وہ ہاتھ تو شاید گھر کی تعمیر کی صلاحیت سے بھی محروم ہوں گے۔ یہ تنگ خیالی اس وجہ سے تھی کہ خوبصورت ہاتھ عام طور سے گھر کی تعمیر سے بھی بے نیاز ہی ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ایسے ہاتھوں سے گھر بھی نہیں بنا کرتے اور بعض لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ کھُردرے بے کیف ہاتھوں میں تعمیری افادیت خوبصورت ہاتھوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتی ہے!

یہی وجہ تھی کہ اُن گورے ہاتھوں کے لئے میرے دل میں کبھی حسرت نہ پیدا ہوئی کہ کاش وہ گورے حسین ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہوتے! البتہ اِس خواہش سے میں بچ نہ سکا کہ اُن ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا سکتا! اور یہ خواہش ویسی ہی تھی جیسے کہ پیاس کے وقت شربت کا گلاس دیکھتے ہی اُبھر آتی ہے!

ایک دن اُس نے مجھے متحیّر کردیا، جب اُس نے میرا نام لیا اور پُوچھا "آپ یہاں کب آئے؟" جواب دینے کے بجائے میں اُس کے نقاب پوش چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گئی۔ اِسی لئے اُس نے کہا "آپ کی تصویریں رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔ میری نظر سے بھی گُزری ہیں۔ لیکن گُمان تک نہ تھا کہ ایک ہی بس میں ہم سفر بھی کریں گے . . ." اب میں سوچ رہا تھا کہ اس کے آخری لفظوں میں کوئی حسرت پوشیدہ ہے؟ کوئی اپیل ہے یا شِکوۂ زندگی۔ لیکن کوئی بات گرفت میں نہ آسکی۔ پھر اُس نے خود ہی اپنا نام بتایا۔ اُسی وقت بس آگئی اور سلسلۂ کلام منقطع ہوگیا۔

دوسرے دن علیک سلیک کے بعد اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے نگار نے جالی کے اوپر سے انگریزی پوئم کی کتاب اور ساتھ ہی کاپی دی اور کہا "اِس نظم کا مختصر خلاصہ لکھ دیجئے ——— میں گھر پر لکھ نہیں پائی"

"کہیں گھومنے چلی گئی تھیں؟" میں نے پُوچھا۔ نگار نے میری طرف سے پیٹھ کئے ہوئے جواب دیا "سیر و تفریح تو بس اِنھیں راہوں تک محدود رہ گئی ہے۔ نہ فرصت ہے اور نہ خواہش . . ." مجھے اپنے سوال پر پشیمانی ہوئی اور میں نے قلم نکالا اور خلاصہ لکھنے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ بدصورت مکرانی عورتیں آتے جاتے ہماری بات چیت کو تیکھی نظروں سے دیکھتی ہیں اور بُرا مانتی ہیں۔ میں مکرانی عورتوں کے حسد کو سمجھ نہیں پایا۔ آخر ایک دن اُن کے حسد نے زبان بھی حاصل کرلی اور ایک مکرانی عورت نے جس کے بال بھیڑ کی طرح گُتھے تھے پُوچھا "یہ عورت تمھاری جورو ہے؟" مجھ سے زیادہ نگار کو یہ لفظ تلخ معلوم ہوا۔ کیونکہ اُس نے فوراً گھوم کر دیکھا اور بے چین ہوکر مُنہ پھیر لیا۔ میں نے نگار کی دل شکنی کا اندازہ لگالیا تھا۔ ابھی میں جواب نہ دینے پایا تھا کہ مکرانی عورتیں بھیڑوں کے گلّے کی طرح ممیانے لگیں۔ اُن کی ہنسی اُسی طرح کی تھی۔ ہوا کا رُخ میں پہچان گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا "مائی! تم کو ایسا نہیں بولنا چاہئے . . ."

"میں کو مائی بولتا تم اور اِشکو تم مائی نہیں بولتا . . .؟" سب کی سب ایک ساتھ بھیڑوں کی طرح ہنسنے لگیں اور اپنی زبان میں باتیں کرنے لگیں۔ میں سمجھ تو نہ پایا۔ لیکن اِتنا ضرور سمجھ گیا کہ مکرانی عورتیں نگار کے متعلق بُری رائے کا اظہار کر رہی ہیں۔ ایک عورت نے تو یہاں تک کہہ دیا "پناہ گیر عورتوں کے آنے کے بعد ہمارے مرد دیوانے ہوگئے ہیں . . ." یہ پہلا موقع نہ تھا کہ میں نے پاکستان کے لئے قربانی کرنے والوں کے لئے بُرا لفظ سُنا ہو۔ بلکہ مجھے علم تھا کہ مقامی باشندے مجموعی طور پر ہمیں اِسی نظر سے دیکھتے تھے اور آج مجھے محسوس ہوا کہ نگار کو مکرانی عورت نے جان بُوجھ کر دھکا کیوں دیا تھا۔ اُس کی تذلیل جان بُوجھ کر کیوں کی تھی اور یہ راز بھی منکشف ہوا کہ مکرانی عورتیں حسین و جمیل نگار سے جلتی ہیں اور خار کیوں کھاتی ہیں!؟

بدصورتی نے ہمیشہ حُسن سے جلن محسوس کی ہے، عناد رکھا ہے اور تاریخ بھی شہادت ہے کہ بدصورتی کو جب کبھی موقع مِلا ہے حُسن و جمال کے تار پود بکھیر دئے ہیں۔ لیکن حُسن نے ہمیشہ رواداری برتی ہے، چشم پوشی کی ہے، بدصورتی کو بھی پروان چڑھنے دیا ہے۔ مکرانی بغض و عناد کی یہی وجہ تھی اور اب مجھے یقین ہوچکا تھا کہ نگار کو مکرانی عورتیں اپنا دشمن سمجھتی ہیں۔ اِس کا پس منظر کیا ہے؟ یہی وجہ تھی کہ آئے دن مکرانی عورتیں نگار سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ تدارک کیا جائے تو کیونکر؟ پریشانی اِس لئے اور زیادہ تھی کہ گورے ہاتھوں والی نگار انسانیت کے ناطے میری مدد کی خواہاں تھی اور میں خود کو مجبور پاتا تھا۔ کیونکہ مکرانی حبشیوں سے جسمانی مقابلہ میرے بس کا روگ نہ تھا۔

گورے ہاتھوں کے جمالیاتی تاثر نے جو باعظمت تاثر پیدا کیا تھا۔ وہ بھی اب نئے حالات کے تحت خطرے سے دوچار تھا۔ ایک رات میں اِسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ اچانک ایک خیال نے اِتنا پریشان کیا کہ گھنٹوں کے لئے نیند اُڑ گئی اور صبح نگار سے بات کرنے کا تہیّہ کیا۔ لیکن خلافِ اُمید اُس روز وہ

نہ آئی۔ شکوک اور بڑھ گئے۔

دوسرے دن وہ بس اسٹینڈ پر مل گئی۔ اُس نے چھُوٹتے ہی کہا۔

"میں خود کو خطرے میں پاتی ہوں۔ ۔"

"کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ دوسری جگہ ملازمت کرلیں؟" میں نے کہا۔

ایک لمحہ کے لئے وہ چُپ ہوئی۔ پھر اُس نے کہا "میں خود بھی یہی چاہتی ہوں ــــ آپ مدد کیجیئے۔"

میں نے وعدہ کرلیا۔ اُس روز بس کچھ دیر سے آئی۔ میں نے دبے دبے الفاظ میں نگار پر واضح کردیا کہ انسانی شر کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً شر کا آغاز جب عورت کے حسد سے شہ پائے۔ گورے ہاتھوں سے کالی شکلوں کو جو حسد ہو چُکا تھا اِس کا احساس نگار کو بھی کسی حد تک تھا۔ لیکن پُوری طرح نہیں۔ لیکن میں نے سمجھایا کہ وہ طوفان سے پہلے طوفان کا اندازہ کرلے تاکہ گزند سے بچ جائے۔ حُسن گزند کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بدصورتی متحمل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اُس روز وہ بڑی فکرمند رہی اور اُس کی اُداسی کا پتہ اُس کے سوال سے ہوا۔ اُس نے عجیب حسرت سے پُوچھا تھا "آپ بتایئے کہ میں نے اُن کا کیا بگاڑا ہے؟" میں نے جواب دینے کے لئے جواب دے دیا۔ اُس کی تشفّی کردی۔ لیکن یہ نہ بتا سکا کہ حسد کی وجہ اُس کا حُسن ہے جو عورت کا وصفِ اوّلیں ہونے کے باوجود اُس کی سب سے بڑی دشواری ہوتی ہے!

بس آگئی اور ہم دونوں کو لے کر چل پڑی۔ نگار لی مارکیٹ میں اُتر گئی اور میں گارڈن تک غور و فکر میں اُلجھا ہوا آگیا۔ گھر پہنچا تو بدخط تحریر میں ایک خط میرا انتظار کر رہا تھا۔ تحریر ایسی تھی کہ خط بغیر پڑھے چاک کر دینے کو جی چاہا۔ خط کا مضمون تحریر سے زیادہ پست تھا ــــــ

"تم آئے گا بیچ میں تو دو ٹکڑے کر دیا جائے گا! سمجھو
اِس بات کو جو ہم بولتا ہے۔ پھر نہ بولنا ہم سے کہ ہم بولا نہیں
تھا۔ کان کھول کر سُن رکھو۔ بس ہم نے بول دیا اور تم سُن لیا۔
ہمارا بات ختم ہوا۔"

میں نے سُن ہی نہیں لیا، بلکہ شر کی بُنیاد کو بھی سمجھ گیا۔ جس طرح بھینس بین کی لَے سُن پاتی ہے اور نہ متاثر ہوتی ہے۔ وہی کیفیت اُن دو گورے ہاتھوں کی تھی۔ بالکل بانسری کی طرح کہ اُس کے نغمۂ حُسن کو نہ تو سمجھا گیا اور نہ اُس کا اثر قبول کیا گیا۔ یہ تصوّر میرے لئے دردناک تھا کہ پھُول کھلیں۔ اُن کی مہک پھیلے تو کچھ لوگوں کے سر پھٹیں درد سے۔ چاند نکلے تو کچھ آنکھوں میں جلن ہو اور حُسن ظاہر ہو تو کچھ دلوں میں زخم پڑ جائیں۔ یہ صورت کیسے برداشت کی جا سکتی تھی اور کس طرح اِس طرف سے آنکھیں بند کی جا سکتی تھیں؟ یقیناً اُن گورے ہاتھوں کی یہ بدقسمتی تھی کہ گندی راہوں اور گندہ مزاج لوگوں کو اُن کا حُسن راس نہ آیا۔ مجھے تو اپنی نفاست پسندی کے مجروح ہونے پر کوفت تھی اور نگار کیا محسوس کر رہی ہوگی؟ اِس کا اندازہ مجھے تھا۔ خط میں نے جلا دیا۔ کاش اُس کے زہر کا تدارک بھی کر سکتا!؟

میں نے ایک ہفتہ کی رخصت لے لی تھی۔ جب ڈیوٹی پر گیا اور لی مارکیٹ کے بس اسٹینڈ پر ریشمی نقاب تھامے، گورے ہاتھ نظر نہ آئے۔ تب مجھے بے چینی کا احساس ہوا۔ یہ بے چینی اُس وقت اور بڑھ گئی جب کالج پہنچتے ہی مجھے بتایا گیا کہ ایک مکرانی ڈرائیور نے گرلس اسکول کی ایک ٹیچر کو بس کے پہیے سے روند ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ٹیچر زخمی ہوگئی تھی۔ ڈرائیور گرفتار ہوگیا۔ میرے پُوچھنے پر بتایا گیا کہ ٹیچر کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ اُس روز میں کسی پیریڈ میں ایک لفظ نہ پڑھا سکا۔ شام کو گھر کے بجائے اسپتال گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ایک ٹیچر زخمی ہو کر آئی تھی۔ اب اسپتال سے جا چکی ہے۔ مجھے یک گونہ اطمینان ہوا۔ لیکن جُوں جُوں دن گزرتے گئے اور گورے ہاتھ نظر نہ آئے، اُلجھن بڑھتی گئی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ پتہ لگاؤں۔ لیکن جاؤں کہاں؟ گھر کا پتہ نہ تھا۔ آخر کسی نہ کسی طرح گرلس اسکول سے نگار کا پتہ لگا لیا۔ گھر پہنچا لیکن وہاں نگار نہ ملی۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں اور بھائی کے ساتھ کہیں اور منتقل ہوگئی ہے۔ وہ شام اور اُس کے بعد آنے والی رات میرے لئے بے حد تلخی اور بے چینی لائی!

جب بھی بس کھڑکھڑاتی ہوئی لی مارکیٹ اسٹینڈ پر رُکتی میری آنکھیں اِدھر اُدھر اُن گورے ہاتھوں کو تلاش کیا کرتی تھیں، جنھوں نے ابتدا میں مجھے زندگی اور پھر عزم دیا تھا۔ لیکن وہ ہاتھ اب کہیں نظر نہ آتے تھے اور نہ اُمید ہی باقی تھی، اور میرا ذہن منتشر ہو کر اُس تانے بانے کو جوڑنے لگتا تھا جو افسانہ لکھنے کے لئے میں نے بُنا تھا۔ لیکن افسانہ اب تک مکمل نہ ہو سکا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اُن گورے ہاتھوں کا افسانہ لکھ دوں اور گورے ہاتھوں نے مجھے جو تاثر دیا تھا اُس کا صلہ اِس طرح دوں کہ اُنھیں حیاتِ جاودانی بخش دوں۔ لیکن اب تک میں ایسا نہ کر سکا تھا اور میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ افسانہ مکمل ہو سکے گا یا نہیں ــــ!؟

دھیرے دھیرے گورے ہاتھ دھُندلے پڑتے جا رہے تھے اور ایک وہ

وقت آگیا جب میں انھیں بھول گیا۔ اب کبھی کبھار ہی لی مارکیٹ اسٹینڈ پر میرا تصوّر گورے ہاتھوں کی طرف جاتا ورنہ بیشتر تو یہی ہوتا تھا کہ نہ گورے ہاتھ یاد آتے نہ اُن کی یاد کے سہارے نگار کی یاد آتی تھی۔ اسی کے ساتھ گندی راہوں کی گندگی، بس کے اندر کی تعفّن اور مکرانی عورتوں کے حسد کو بھی بھول گیا تھا۔ اور کبھی خیال آتا تو دوسرے رُخ کے ساتھ!

اُن گورے ہاتھوں کو کوئی قدر دان اور محافظ مل گیا ہوگا۔ اب وہ محفوظ ہوں گے مکرانی عورتوں کی جلن سے بے نیاز۔ حُسن کے پودے کو چاندی کی زمین اور سونے کا آسمان مل گیا ہوگا اور وہ زندگی کے مصائب سے پاک ہو چکے ہوں گے۔ یہ سوچ کر مجھے خوشی ضرور ہوتی تھی۔ میں اُن گورے ہاتھوں کا دشمن نہ تھا۔ دوست تھا، بہی خواہ تھا۔ کیونکہ اُن ہاتھوں نے مجھے مسرور کیا تھا۔ میری مایوسی دُور کی تھی اور مجھے زندگی کو چاہنے کا حوصلہ دیا تھا!

"اسلم کی شادی ہے۔ کارڈ آیا ہے۔" گھر پہنچتے ہی بیوی نے خوش ہو کر کہا اور کارڈ بڑھا دیا۔ میں نے کارڈ پڑھا تو نگار کا نام دیکھ کر گم سُم ہو گیا۔ یاد نہ رہا کہ بیوی کی آنکھیں میرا جائزہ لینے میں مصروف ہیں۔ میں اُس وقت چونکا جب بیوی نے حیران ہو کر پوچھا "آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟"

"کیوں نہیں؟" میں ہنس دیا۔ بیوی مطمئن ہو گئی۔ مطمئن نہ ہونے کی وجہ اُس کے لئے نہ تھی۔ لیکن میرے لئے تھی ۔۔۔۔ اِس لئے کہ اسلم کی ہونے والی بیوی کا نام وہی تھا جو میرے لاشعور سے محو نہ ہو سکا تھا اور نوید کا کارڈ پڑھتے ہی میرا ذہن لی مارکیٹ کی گورے ہاتھوں والی نگار کی طرف منتقل ہو گیا اور میں یہ سوچنے لگا تھا کہ اسلم اُس نگار کو اپنا لیتا تو کیسا اچھا ہوتا ۔۔۔۔ لیکن میری شاعرانہ تمنّائیں آج تک پُوری نہ ہوئی تھیں اور ظاہر ہے کہ یہ تصوّر کر لینا کہ اسلم کی نگار وہی ہے جس کی یاد اچانک عَود کر آئی ہے حماقت نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی؟ ۔۔۔۔ جس چاند کو بُغض و عناد کی گھٹاؤں نے چُھپا لیا ہو اُس کا نمودار ہونا کیسے ممکن تھا ۔۔۔۔!؟

شادی میں شریک ہونے کے لئے میں نے کالج سے چُھٹّی لی اور دو روز پہلے اسلم کے ہاں لاہور پہنچ گیا۔ شادی کے ہنگاموں میں یادداشتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اسی خود فراموشی میں نگار بھی کہیں چُھپ گئی تھی اور اُس کی یاد اُس موقع پر مناسب بھی نہ تھی اور میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اسلم کی نگار سے لی مارکیٹ والی نگار کا تذکرہ بھُول کر بھی نہ کروں گا۔ کیونکہ عورتوں کو راز داں بنانے کا نتیجہ بھیانک ہوتا ہے۔ ظاہر ہے نگار کی شخصیت کا تعارف اُس کے گورے ہاتھوں کے تعارف کے بغیر نامکمّل رہتا اور یہی تعارف میری بدنامی کا باعث بن جاتا اور نگار کی شخصیت اور اُس کی عظمت کو مجروح کرنے کا سبب! جسے میں برداشت نہ کر سکتا تھا۔

اسلم کی شادی ہو گئی۔ دُلھن آ گئی۔ صبح رُونمائی تھی۔ میں سوچتا رہا کہ دُلھن کا مُنہ نہ دیکھوں۔ کیونکہ ایک نگار کو دیکھنے کے بعد ضروری نہیں کہ ہر نگار کو دیکھا جائے۔ لیکن میری ایک نہ چلی اور سب سے زیادہ میری بیوی نے میری مخالفت کی۔ بالآخر مجھے جانا پڑا۔ میرے پہنچتے ہی بیوی نے دُلھن کا گھُونگھٹ اُلٹتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے آپ کے افسانوں میں اِس چاند کا ذِکر ضرور آنا چاہئے۔۔" لڑکیاں اِس جُملے پر ہنس دیں۔ دُلھن کا چہرہ تبسّم سے خالی تھا۔ لیکن چاند لاکھ سنجیدہ ہو، چاند کی چاندنی کا نُور تو کم نہیں ہو سکتا ۔۔۔۔ اور میں چند لمحوں کے لئے چاند کی چاندنی میں گُم ہو گیا ۔۔۔۔ گھُونگھٹ گر گیا۔ بیوی نے پُوچھا "دُلھن پسند آئی؟" اور میں نے لاشعوری طور پر کہا "گورے ہاتھ ہیں دُلھن کے۔۔" لڑکیاں تالیاں بجانے لگیں اور میں اپنی حماقت پر شرمسار چلا آیا۔ لڑکیاں ابھی تک کہہ رہی تھیں "دکھلایا چہرہ گیا اور نظر آئے ہاتھ۔۔"

کِسی نے کہا۔ کوئی پلاٹ بنا رہے ہوں گے گورے ہاتھوں پر اِس لئے وہی زبان سے ادا ہو گیا۔۔ کِسی نے کہا۔ افسانہ نگار ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔ اِن کی بات بے سر پیر کی ہوتی ہے۔ لیکن بیوی کا مُنہ پھُول گیا تھا کیونکہ میں نے چہرے کی تعریف نہیں کی تھی دُلھن کے گورے ہاتھوں کی تعریف کی۔ مجھے اِس ناراضگی کا احساس تک نہ تھا۔ احساس اُس وقت ہوا جب مجھے عِلم ہوا کہ تعریف کے بجائے میں نے طنز کیا! ظاہر ہے مجھے اِس الزام پر پریشان ہو جانا چاہئے تھا کہ سالے کی بیوی پر میں نے طنز کیا!؟ ۔۔۔۔ قریب تھا کہ میں پُوری کہانی دُہرا کر اعتراف کرتا کہ میں نے گورے ہاتھوں کی تعریف اِس لئے کی تھی کہ وہ خوش نصیبی کی علامت تھے۔ لیکن وقت نے میری زبان بند کر دی۔ البتّہ غلط فہمی دُور کرنے کے لئے میں نے بیوی سے ضرور کہا "ہاتھوں کے گُن گانے کے معنی ہیں چہرے کے گُن گائے۔۔"

"بھلا کوئی ہاتھوں کی تعریف کرے گا؟" بیوی نے کچھ بُرا مان کر کہا۔

"اِس میں کیا بُرائی ہے؟"

"ہاتھ ہی تو اچھے نہیں ہیں!" بیوی نے جھلّا کر کہا "تیزاب سے جلے ہوئے ہیں۔"

میرا سر چکرا گیا اور گھبرا کر پُوچھا "کیسے؟"

"مجھے کیا معلوم؟" اور اب اُن گورے ہاتھوں کو دیکھنے کے لئے خلش تڑپ اُٹھی جو تیزاب سے جلا دیئے گئے تھے! غضب ہو جاتا اگر میں انھیں دیکھنے کی تمنّا کرتا۔

لہٰذا میں خاموش ہوگیا، لیکن اندرونی طور پر مضطرب اور بے چین!

وہ لمحے یاد آگئے ـــــ گورے ہاتھ، سیاہ ریشمی برقع، پُرانی خستہ بس، بدصورت مکرانی عورتیں اور اُن کا حسد سب کچھ یاد آگیا اور تصوّر میں دو گورے ہاتھ بار بار آنے لگے، جو ابِ تیزاب سے منقّش کر دیئے گئے تھے اور مجھے ہر سانس میں تیزاب کی جلن محسوس ہونے لگی ـــــ اور واپسی میں ٹرین پر یہ خیال چٹکیاں لے رہا تھا کہ اب وہ وقت کبھی آئے گا جب گورے حسین ہاتھوں کا تصوّر ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا اور جلے ہوئے ہاتھ ہمیشہ نظروں کے سامنے رہیں گے۔

چند ماہ بعد اسلم اپنی بیوی کے ساتھ کراچی آگیا اور اُس وقت میں نے ڈرتے ڈرتے نگار کے ہاتھ دیکھے۔ اُس کے ہاتھوں پر نظر پڑتے ہی جس خیال سے میں لرز رہا تھا اُس کے بجائے اچانک احترام و عظمت کا جذبہ بیدار ہوگیا، جس نے مجھے سنبھال لیا۔ نگار نے ہنس کر کہا: "میں نگار تھی نقش سے خالی! وہ دوسروں نے دے دیئے . . ." میں اندازہ نہ لگا سکا کہ اس مسکراتے جملے میں یاس تھی یا نہیں لیکن شام کو اسلم نے یہ کہہ کر میری یاس دُور کر دی: "میں نے ہاتھ کے تیزابی نقش دیکھنے کے بعد ہی سب کی مخالفت کے باوجود نگار کو پسند کیا!"

"کیوں؟"

اسلم نے جو جواب دیا وہ میرے دل پر نقش ہوگیا: "نگار کے ہاتھوں کو زندگی بخشنے کے لئے ـــــ ایک بُرے آدمی نے انھیں جلایا اور دوسرا آدمی محبت دے کر انھیں اجنتا کے نقوش بنانے پر آمادہ ہوگیا . . ." اور یہ پہلا موقع تھا جب مجھے اسلم کی بلندی کا بھرپور احساس ہوا اور اُسے دیکھ کر خوشی سے مُسکرا دیا۔

اور ایک سال بعد جب نگار زندگی کے پھول کو ہاتھوں میں لئے مسکرا رہی تھی۔ میں نے کہا: "تم نے کہا تھا کہ نگار کے پاس نقش نہیں تھے سو وہ مل گئے ـــــ لیکن آج قدرت نے تمھیں نقش عطا کر دیا۔ مبارک ہو!" نگار ہنس دی، خوش تھی اور اُس سے زیادہ میرا دل مسرور تھا۔ یہ سوچ کر کہ ـــــ ہاتھوں نے بُغض و حسد سے گورے ہاتھوں کا حُسن چھیننے کی کوشش کی تھی، قُدرت نے اُنہی ہاتھوں کو لازوال حُسن عطا کر دیا ـــــ!

وہ سیاہ ہاتھ سڑ چکے ہوں گے۔ لیکن نگار کے گورے ہاتھ آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے!!

"بیسویں صدی" کو ہم نے کبھی اشتہاروں کا پلندہ نہیں بنایا۔ اس میں ۲۰۔۲۴ اور بوگس قسم کے وہ اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے جن کا مقصد خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے

غزل

ابوالفصاحت حضرت جوشؔ ملسیانی

بُرا کہہ دیا یا بھلا کہہ دیا
بس اب ہم نے جو کہہ دیا کہہ دیا

یہ میری ہی جرأت تھی اے ہم نشیں
جو کہنا تھا وہ بَرملا کہہ دیا

چُھپاتی تھی جس کو خموشی مری
نگاہوں نے وہ مُدعا کہہ دیا

ادا کو ستم کہنے والوں نے بھی
ستم کو تمھاری ادا کہہ دیا

وہ سُن کر ہوئے اور بھی پُر غضب
جنوں میں خدا جانے کیا کہہ دیا

انھیں کی رضا بس تھی زندگی
غلط بھی سُنا تو بجا کہہ دیا

تجھے اب خطا وار کیوں کر کہوں
ترا تیر جب بے خطا کہہ دیا

کہاں تک اب اُن کو منائے کوئی
جفا کو بھی ہم نے وفا کہہ دیا

یہ الزام کیوں کر گوارا کروں
مجھے شیخ نے پارسا کہہ دیا

بڑی چیز ہے جوشؔ یہ زندگی
جسے آپ نے اک سزا کہہ دیا

تبسّم

عظیم اقبال ایم۔ اے

گنج ۱، بتیا (بہار)

برادرم! آداب و نیاز

اِن دنوں پیہم مشغولیتوں سے برسرِ پیکار رہا۔ نتیجتاً آپ کی بزم سے آنکھیں چُرانا پڑا۔ میرے پڑھنے والوں کو مجھ سے سخت شکایت ہے کہ میں نے انھیں پڑھنے کے لئے کچھ نہیں دیا۔ کاش میں اُنھیں بتا سکتا میری مجبوریاں کیا تھیں! خیر، میں اُنھیں اپنی مایوسیوں کا شریک نہیں بنا سکتا ــــــ لیجئے ایک تازہ ترین تخلیق حاضر ہے۔ آپ اِس کہانی میں نفسیات کا بہت ہی لطیف (subtle) نکتہ پائیں گے۔ یہ دو عورتوں کی نفسیات کی عکاسی ہے۔ ایک شگفتہ ہو رہی ہے، دوسری پژمردہ! ہر عورت چاہتی ہے وہ ہمیشہ خوبرو دکھائی دے، جوان رہے، کم سِن رہے۔ اپنی گزری ہوئی عمر کو وہ روک تو نہیں سکتی، لیکن اپنی بچّی کی کم سِنی تو یقیناً عیاں کر سکتی ہے۔ تاکہ اُس کی کم سِنی سے اُس کی اپنی جواں سالی ظاہر ہو! الفاظ کے انتخاب میں میں ہمیشہ اختصار برتتا ہوں اور صرف اُنھیں لفظوں کا استعمال کرتا ہوں جو حد درجہ understatement ہوں۔ میں افسانوی فن کے اُس نکتہ سے بہر طور اتفاق کرتا ہوں کہ افسانہ کا قاری بہت ہی ذہین ہوتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اُردو افسانوں کا قاری بہت ہی ذہین، بہت ہی ژرف بیں ہے! . . .

خلوص کیش ــــــ عظیم اقبال

سب کچھ عمر کا تقاضہ تھا۔

تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی وہ برآمدے میں آئی۔ دَوڑ کر آنگن میں گئی اور پھر اُچھلتی کُودتی ہوئی زنانخانے کے بڑے دالان میں پہنچی۔ زور زور سے ہانپ رہی تھی۔ دبی دبی مترنّم ہنسی اُس کے لبوں سے پھُوٹ رہی تھی۔

"لیجئے وہ آگئی ــــــ یہاں آنا بیٹی!"

"سبحان اللہ! کیا قد ہے، کیا جسم ہے ــــــ ٹھوڑی تو آپ جیسی چوکور ہے۔ پیشانی دُولھا بھائی کی طرح!"

"سلام کرو بیٹی! یہ تمھاری خالہ جان ہیں۔"

"آداب!"

"عمر دراز ہو۔ پروردگار نظرِ بد سے بچائے!"

"اُن دنوں اِتّی سی تھی جب میں نے ترکِ وطن کیا تھا ــــــ ٹھمک ٹھمک کر روتی تھی، لہک لہک کر گاتی تھی ــــــ اب تو کافی سیانی ہوگئی۔"

"ابھی تو بچّی ہے ــــــ بارہ کا سِن کوئی عمر ہے بھلا!"

کوئی ایسی بات تو نہ تھی کہ امّی کو برس اور مہینوں کی گنتی نہ آتی ہو۔ لیکن غزالہ کی عمر بتاتے ہوئے اُن سے ہمیشہ بھُول چوک ہو جاتی۔ سنجیدگی سے اُنگلیوں پر رُک رُک کر شمار کرتیں۔ ہونٹ سکوڑتیں۔

"ہائے، میری لاڈلی! اِس سال بارہ برس کی ہو جائے گی۔" بلائیں لیتے ہوئے کہتیں۔

"ماشاء اللہ! چشمِ بد دُور!!" والہانہ پن کے ساتھ اُس کی پیشانی چُوم لیتیں۔

اُن دنوں بھی جبکہ اُس کے اعضاء آج کی طرح نکھرے نہ تھے۔ اُس کے جسم میں تناؤ تھا نہ دلکش پھیلاؤ۔ امّی غزالہ کے بارہویں برس میں قدم رکھنے کا اعلان

کرتی تھیں۔ اُس نے انگلیوں سے دِل دھڑکنے کا گُمان ہوتا تھا۔ اُس کے جسم کی ساری شِکنیں اُمّی کے ہاتھوں کے لمس سے آشنا تھیں۔ اُمّی ایسے ہی اُسے بناتیں، سنوارتیں جیسے ایک ننھی مُنّی گُڑیا ہو۔ نِت نئے طریقوں سے چوٹیاں گُوندھتیں۔ کبھی پونی ٹیل بناتیں، کبھی یونہی کھُلے بال کو رنگین رِبن سے کس دیتیں، کبھی ریشمی اسکارف لپیٹ دیتیں۔ آنکھوں میں مہین کاجل لگا کر، ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہیں ہموار کرتیں۔ گھُما پھرا کر لباس کی موزونیت کا اندازہ کرتیں۔

"سبز سُوٹ پر گُلابی دوپٹہ نہیں پھبتا۔ وہ پستئی جالی والا شیفون کا دوپٹہ اچھا رہے گا۔ ٹرنک سے نِکال لاؤ بیٹی!"

"سنبھل کر دھیرے دھیرے چلو۔ ایڑی کافی اُونچی ہے۔ پیر نہ پھِسل جائے۔"

"گردن اِتنی جھکاتی کیوں ہو۔ سر اُٹھاؤ۔ تن کر چلو!"

"شُکر اللہ!"

قدرے مطمئن ہو کر سانس آہستہ سے چھوڑتیں۔ ہونٹوں کو ذرا بھینچ لیتیں۔ ایسے لمحوں میں اُن کی لَویں سُرخ ہونے لگتیں۔

غزالہ کچھ سانولی سلونی تھی۔ اُمّی کا گوراپن اور ابّو کا گندمی رنگ اُسے نہ مِلا تھا۔ لیکن اُس کے کتابی چہرہ پر بے حد صباحت تھی۔ اُس کی بڑی بڑی شوخ آنکھوں میں بَلا کی مستی تھی۔ اُمّی کہتی تھیں ایسی آنکھیں ہرن کی ہوتی ہیں یا گُلِ نرگس کی۔ اُن میں بحرِ بیکراں کی پہنائی ہے اور نیلگوں آسمان کی وسعت! ساری کائنات کی کشش اُن میں یکجا ہو گئی ہے۔ اُمّی خود اُس کی بھویں درست کرتیں، پلکیں سنوارتیں۔ کانوں میں سُنہری بالیاں پہناتیں اور گلے میں مصنوعی موتیوں کا ہار یا طلائی نیکلس۔ کبھی جی میں آتا تو پیشانی پر جھُومر بھی سجا دیتیں اور ناک میں جگ مگ کرتی ہوئی کیل یا نتھ۔ سج دھج کر غزالہ دُلھن معلوم ہوتی۔ بس مانگ میں ایک ذرا افشاں کی کمی ہوتی اور زُلفوں میں پھُول کے گجروں کی اور دوسری مصنوعات کی جگہ مسّی اور صندل کی۔ ایسی آرائش کے بعد آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر وہ شرمانے لگتی۔ غزالہ کی حیا بار نگاہیں اُمّی کو کافی بھلی لگتی تھیں۔

خود تو وہ سادہ رہتیں۔ سفید پوشاکیں اُنھیں بے حد پسند تھیں۔ سفید ساریاں، سفید غرارے، سفید شلواریں۔ غزالہ کبھی اصرار کرتی تو گہرے سبز، سُرخ رنگوں کو ترجیح دیتیں۔ بڑے بڑے بیل بُوٹے اُنھیں اچھے لگتے۔ ریشمیں کپڑے اُنھیں زیادہ پسند تھے۔

اُن کی نفاست پسندی بے مثل تھی۔ بِلا ناغہ اُبٹن ملواتیں، ٹھنڈے پانی سے غُسل کرتیں، اہتمام سے مہندی لگاتیں، آنکھوں میں سُرمے کی سلائیاں پھیرتیں۔

خوشبوؤں کی بھی دلدادہ تھیں۔ سرِ شام عود اور اگر بتّیاں جلاتیں، حِنا، موتیا، کیوڑا، گُلاب اور دوسرے عطریات کی مِلی جُلی مہک اُن کے کمرے میں پھیلی رہتی۔ گرمیوں میں جُوہی اور بیلے کی کھِلتی کلیاں سرہانے رکھتیں۔ مُن کی سانسیں معطر ہونے لگتیں۔ ایک دبیز طمانیت بھری مُسکراہٹ اُن کے لب و رُخسار پر رقصاں ہوتی۔

دونوں کی صورت شکل، قد و قامت میں ہلکی مماثلت کے باوجود غزالہ کا بدن ذرا چھریرا، کسا کسا تھا۔ اُمّی کے جسم کے خطوط مبہم اور غیر واضح تھے۔ اُن کا سینہ اور کُولھے سپاٹ تھے۔ آنکھوں کے گِرد مدّھم سیاہ ہالے پڑ گئے تھے۔ خد و خال سِمٹنے لگے تھے۔ اپنے بالوں کو بہت اوپر کھینچ کر تنے انداز سے جُوڑا باندھتیں۔ لیکن غزالہ کی پیشانی کی کشادگی اُن کی پیشانی کی کوتاہی کو اور بھی نمایاں کر دیتی۔ دونوں جب ساتھ ساتھ لگ کر کھڑی ہوتیں تو یہ بات بھی کھُل جاتی کہ غزالہ اب سر سرا کر اونچی، لانبی ہو جائے گی۔ ممکن ہے اُمّی اور بھی جھُک جائیں۔ بہت نیچے رہ جائیں۔

غزالہ کے دانت ہموار، سجیلے اور آبدار تھے۔ اُس کی مُسکراہٹ بڑی دلفریب ہوتی۔ اُمّی کے دانتوں پر بدنما دھبّے پڑنے لگے تھے۔ وہ بڑے بڑے اور غیر متوازن تھے۔ اُمّی جب مُسکراتیں تو کراہیت ہوتی۔ ہنستیں تو دہانہ پھیل جاتا، گال سُکڑ جاتے۔ اُمّی کے بدن کی ساخت شکستہ ہوتی جا رہی تھی۔ اعضاء ڈھیلے ہو رہے تھے۔ گوری جِلد پر بہت سارے کتھئی مائل نشان اُبھر آئے تھے۔ ٹھوڑی پر، رُخساروں پر، پیشانی پر چھوٹے بڑے کتنے ہی تِل بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں کے اوپر بھُورے بالوں کی لکیر اُجاگر تھی۔

بازوؤں اور کُولھوں کے نرم پٹھوں میں انجکشن لگواتے ہوئے کتنی بار اُمّی نے محسوس کیا تھا اُن کی رگوں میں توانائی سرایت کر رہی ہے۔ رُخساروں پر سُرخی دوڑ گئی، آنکھوں میں چمک جاگ اُٹھی، بانہیں گُداز ہو گئیں، گردن خم دار، ہونٹ لعل و گُہر! چھوٹی چھوٹی زُلفیں دراز ہو کر کمر تک پہنچ گئیں!!

اُمّی قیمتی سنو، کریم سے صورت کو دلنواز بنانے کی کوشش کرتیں۔ خضاب اور لوما ہیئر آئل سے بالوں کی سفیدی چھُپاتیں۔ نوک پلک سجا کر اپنی شخصیت کو جاذبِ نظر بناتیں۔ اُن کے اُٹھنے بیٹھنے میں کافی سلیقہ تھا۔ گفتگو میں قرینہ اور سنجیدگی کی قائل تھیں۔ لیکن بات بے بات قہقہے لگا کر باطنی فسردگی کو ظاہری زندہ دلی سے منسوب کرنے کے فن سے بھی واقف تھیں۔ خوب خوب فقرے چُست کرتیں، لطیفے سُناتیں اور ہنستے ہنستے بے دم ہو جاتیں۔ سانسیں ڈگمگانے لگتیں۔ گھُٹن سی محسوس کرتیں۔ مسلسل کھانسی کا دورہ پڑتا۔ آنکھیں اُبلنے لگتیں۔ چہرہ تمتما اُٹھتا۔

غزالہ کو وہ ہمیشہ اپنے رُو برو رکھتیں۔ ایک پل کے لئے اُس کی جدائی انھیں گراں گزرتی۔ غزالہ چاہتی امّی کو جل دے کر چھت پر نکل جائے۔ ہر وقت سائے کی طرح اُن کا پیچھے لگے رہنا اُسے قطعی اچھا نہ لگتا۔ وہ تنہائی چاہتی، خاموشی چاہتی۔ بند کمرے میں اوندھے مُنہ لیٹ کر، بغلوں تلے ملائم تکیہ داب کر حسین خوابوں میں کھو جانا چاہتی۔ چھجّے پر کھڑے ہو کر سامنے والے کمپاؤنڈ میں ٹینس کے کھیل سے بہت محظوظ ہوتی تھی۔ سوچتی کاش اِس سفید گیند ہی کی مانند بن جائے۔ یونہی اُچھلتی پھرے۔

غزالہ ہر وقت خمار میں ڈوبی رہتی۔ دیکھتے دیکھتے اُس پر غنودگی چھا جاتی۔ امّی نِڈھال نِڈھال سی کروٹیں بدلتیں۔ اکثر تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ نیندیں اُڑ جاتیں تو تہجّد گزار بن کر شب بیداری کرتیں۔ سر پر سفید آنچل لپیٹے، پلکیں جھکائے دعائیں مانگتی رہتیں۔ اپنے لئے، غزالہ کے لئے، اُس کے ابّو کے لئے۔ خدایا! یہ بھی کوئی زندگی ہوئی! ساری آسائشیں حاصل ہوں پھر بھی ایک ایسی ناگزیر خواہش تو ہوتی ہے جس کی تکمیل ناممکن ہو۔ سارے ارمان گھٹ جائیں۔ خوابوں کی کوئی تعبیر نہ ہو۔ جذبات سِسکتے رہیں، کسی کی غلط انداز نگاہوں سے احساسات بیدار ہو جائیں لیکن اپنا آپ نہ پہچانا جائے۔

وہ سب کچھ تو اچانک ہو گیا تھا اور پھر مسلسل سترہ برسوں سے ابّو پر تحلیلِ نفسی آزمانے کی باتیں سوچی جا رہی تھیں۔ مگر اُن پر کسی کا بس بھی تو چلے! کسی کے سنبھالے سنبھلیں تو سہی!!

امّی کی مانگ میں صرف سیندور کی پرچھائیاں تھیں اور کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں اور ہونٹوں پر رینگتی ہوئی پھیکی پھیکی مُسکراہٹ۔ اُن کے دل میں ایک عجیب سی تمنّا دن بہ دن پروان چڑھ رہی تھی کہ غزالہ یونہی گڑیا سی رہے۔ ننھّی مُنّی، ٹُبک ٹُبک!!

سِن رسیدہ امّی کی مانگ میں سیندور، کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں اور ہونٹوں پر پھیکی مُسکراہٹ دیکھ کر غزالہ مُسکرا دیتی ——— اُس کا دلنواز تبسّم اُس کی امّی کو بھاتا یا نہ بھاتا کون جانے!!

> "بیسویں صدی" میں وہی مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔

غزل

شباب للت ابیوملے

شوق سے دردِ مُحبّت دیجئے — مُجھ کو اپنے غم کی دولت دیجئے
چھین لی ہیں آپ نے نیندیں مری — اِس شکایت کی اجازت دیجئے
آپ کی آنکھیں بہت کچھ کہہ چُکیں — اَپنے ہونٹوں کو بھی زحمت دیجئے
میری خلوت کے خشک ماحول کو — اپنی سانسوں کی حرارت دیجئے
تلخیٔ ماحول سے ہوں جاں بلب — اپنے ہونٹوں کی حلاوت دیجئے
دِل یہ کہتا ہے کہ دے کر اپنی جان — تیرے احسانوں کی قیمت دیجئے
دیکھ لیجے اِک نظر سُوئے چمن — لالہ و گُل کو لطافت دیجئے
ڈال کر اپنے تبسّم کی کِرن — اَدھ کِھلی کلیوں کو نکہت دیجئے
کیوں وفا کر کے عبث احباب کو — خود پہ ہنسنے کی اجازت دیجئے
صُبح پھر ہوگی ملاقات آپ سے — اب خدا حافظ اجازت دیجئے

آج شب اُس جانِ مستی کو شباب
کیوں نہ مے خانے میں دعوت دیجئے

نہانے کے پانی میں
آپ کو ڈیٹول
کیوں مِلانا چاہیئے؟



شاید آپ کا خیال ہے کہ اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے صابن سے نہالینا کافی ہے۔ یہ ایک حد تک ٹھیک بھی ہے مگر یہ ان جراثیم کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی نہیں جو آپ کے جسم پر ہر وقت حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ اس غرض سے نہانے کے پانی میں ڈیٹول ملا لینا نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ ڈیٹول جراثیم کو مار کر آپ کو تروتازہ اور متعدی امراض کے حملوں سے محفوظ کر دیتا ہے۔

ڈیٹول گھر میں اور بھی طرح طرح سے کام آتا ہے۔ کٹی ہوئی یا رگڑ کھائی ہوئی جلد پر اور داڑھی بنانے کے بعد لگانے کے لئے۔ غرارہ کرنے کے لئے اور عورتوں کی صفائی کی مخصوص ضروریات کے لئے۔

ڈیٹول کی ایک شیشی آج ہی گھر لیجائیے۔



آپ کے خاندان کی حفاظت کے لئے

ڈیٹول

دنیا کا سب سے بھروسے کے قابل جراثیم کش

"ہر گھر کی سلامتی کے لئے ڈیٹول کی ضرورت"۔ "خواتین کے لئے حفظان صحت کے نئے اصول" نام کے کتابچے حسب ذیل پتے سے مفت طلب فرمائیے

جی۔پی۔او۔ بکس ۹۲۱ ۔ کلکتہ ۔ ۱

ہر گھر کی
صحت و سلامتی
کے لئے ڈیٹول

DACJ URDU

اندھیرا اُجالا

مِس نگہت ریحانہ ایم۔ اے

"صباحت ہاؤس" سرکٹ ہاؤس روڈ (کیمپ) امراؤتی (مہاراشٹر اسٹیٹ)

محترم چچا جان! سلام بصد احترام

... ایک تازہ ترین تخلیق "اندھیرا اُجالا" حاضرِ خدمت ہے۔ افسانہ کے بارے میں کچھ نہ کہوں گی۔ بس خدا کرے آپ کو پسند آجائے اور آپ اِسے شرفِ قبولیت بخشیں۔ مجھے اپنی محنت کا پھل مل جائے گا اور قارئین کی آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔ جن کی خوش ذوقی "بیسویں صدی" کے ہر شمارہ میں بالخصوص سالنامہ اور افسانہ نمبر میں میری تخلیقات دیکھنا چاہتی ہے ——— اِن دنوں کالج کی چھٹیاں ہیں۔ اِس لئے جلد ہی کچھ اور تخلیقات آپ کی خدمت میں پیش کروں گی ...

آپ کی بھتیجی ——— نگہت ریحانہ

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟"

"اپنا حق!"

"حق؟ کیا تکلیف ہے تمھیں یہاں؟ یہ عالیشان کوٹھی، چمکتی کاریں، بیش قیمت زیورات، قیمتی ملبوسات، نوکر چاکر، یہ سامانِ عیش و نشاط۔ اِس سے زیادہ تمھیں اور کیا چاہیئے؟"

وہ تڑپ اُٹھی۔

"سروش! کیا یہ چیزیں پالینے کے بعد انسان کچھ اور نہیں چاہتا؟"

"میں تو سمجھتا ہوں، یہ سب کافی ہے۔"

وہ ایک دم چیخ پڑی

"تمھارے پاس بھی تو یہ سب سامان تھے۔ پھر تم مجھے کیوں بیاہ کر یہاں لے آئے؟ یہ عالیشان کوٹھی، چمکتی کاریں، بیش قیمت ملبوسات، نوکر چاکر۔ یہ سامانِ عیش و نشاط تمھارے لئے کافی نہ تھے؟"

وہ مُسکرا پڑا۔

"عیش و نشاط کے یہ سارے سامان ایک جیون ساتھی، ایک شریکِ حیات کی کمی تو پوری نہیں کر سکتے!"

"پھر تم کیوں یہ بھول جاتے ہو کہ ایک بیوی کو اُس کا شوہر ہی حقیقی مسرت بخش سکتا ہے۔ سروش! بیش قیمت زیورات، قیمتی ملبوسات پاکر عورت بہت خوش ہوتی ہے۔ لیکن یہ اُس کا سُہاگ نہیں بن سکتے ... جب بات کرنے کو جی چاہے تو کیا اِن فلک بوس دیواروں سے باتیں کروں۔ پیار کی پیاس اِس سامانِ عیش و نشاط سے نہیں بُجھ سکتی۔ تم نہیں جانتے۔ جب تم نہیں ہوتے تو یہ سب مجھے ناگ کی طرح ڈسنے لگتے ہیں۔ میرے وجود میں کانٹے سے چُبھونے لگتے ہیں۔ درد کی شدت سے میں کراہتی ہوں۔ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی ہوں۔ تب میرے زخمی وجود کو تمھاری بانہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن تم ——— تم ہفتہ میں ایک بار ——— صرف ایک بار مجھ سے ملنے آتے ہو اور پھر یہاں بھی کلب اور اپنے دوستوں میں کھو جاتے ہو۔ بتاؤ تم سے مجھے مِلتا ہی کیا ہے؟ اِس طرح کب تک ...!!"

"شہلا! تم جانتی ہو۔ میں تمھیں وہاں نہیں لے جا سکتا۔ نہ اِتنا بڑا بزنس چھوڑ کر یہاں آکر رہ سکتا ہوں۔"

اُس نے شہلا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میری طرف سے تو تم پر کوئی پابندی نہیں۔ تم چاہو تو یہیں اپنی دلچسپیوں کے سامان پیدا کر سکتی ہو۔"

"کیا اِن دلچسپیوں میں تم میرا ساتھ دے سکو گے؟"

"Oh. No! شہلا! یہ ناممکن ہے۔"

"ٹھیک ہے سروش! اب میں تمھیں کبھی کچھ نہ کہوں گی۔"

اُس کی شکست خوردہ آواز نے سروش کو چونکا دیا۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر اُس نے ایک طویل سانس لی۔ جیسے دل کا بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔ اگلے دن حسبِ معمول وہ چلا گیا۔

کار تیزی سے فرّاٹے بھرتی جا رہی تھی۔ اُس کی رفتار لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی رہی تھی اور اُس سے زیادہ تیز اُس کے خیالات کی رفتار تھی۔ جذبۂ انتقام نے اُس کے احساس میں شعلہ بھر دیا تھا۔ اُس نے سوچا۔ وہ کبھی سروش کو بتا دے گی کہ وہ اُس کے بغیر رہ سکتی ہے۔ اُسے بھی سہارے مِل سکتے ہیں۔ آج اُس کا سنگھار حُسن کے سنگھار کو شرما رہا تھا۔ جب اُس نے شیشہ میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا تو حیران رہ گئی۔ نہ جانے کیوں اُس کے ذہن میں مومن کا شعر گونج گیا ؎

دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ
غش تمھیں دیکھ کر نہ ہو جائے!

وہ شرما کر آئینہ کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ انتقام کی شب وہ مے فیر میں گزارے گی۔ مے فیر! جو شہر کا سب سے مشہور نائٹ کلب تھا۔ جہاں بگڑے رئیس دادِ نشاط دینے آیا کرتے تھے۔۔۔ مے فیر! جہاں کی سرد راتوں میں بھی آگ بھری رہتی تھی۔۔۔ مے فیر! جس کی چار دیواری میں پہنچ کر سماج کے سارے ضابطے، سارے بندھن کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتے تھے۔ جہاں باپ، بیٹی، بیوی، بہن کے درمیان کوئی شرم کی دیوار نہ تھی۔۔۔ مے فیر! جہاں حُسن و جوانی کے دریا بہتے ہیں اور جس سے سبھی سیراب ہوتے ہیں۔ جہاں تشنگی اور پیاس جیسے الفاظ اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔۔۔ مے فیر! جہاں خزاں بھی دُلھن بن کر سہاگ رات مناتی ہے۔ جہاں پیالوں ہی سے نہیں آنکھوں سے بھی پلائی جاتی ہے۔۔۔ آج شہلا بھی اپنی پیاسی رُوح کو سیراب کرنے مے فیر جا رہی تھی۔ جذبۂ انتقام کی شدّت نے تمام جذبوں کو بُھلا دیا تھا۔ بس ایک ہی خیال اُس کے دل میں تھا۔ وہ سروش کو شکست دے کر رہے گی! اپنی پیاسی رُوح کو سیراب کر کے رہے گی!

"ہلو!"

جونہی اُس نے برآمدہ میں قدم رکھا۔ ایک خوبصورت آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی —— نہیں، آواز سے زیادہ خوبصورت تو وہ ہاتھ تھا، جو اُس کی طرف بڑھا تھا —— نہیں، اُس سے زیادہ خوبصورت وہ آنکھیں تھیں، جو اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہی تھیں۔ کسی غیر مرئی طاقت کے زیرِ اثر اُس کا بھی ہاتھ بڑھا۔ جسے اجنبی نے نرمی سے تھام لیا اور وہ حیران رہ گئی۔ ایک خیال سا اُس کے دل میں پیدا ہوا۔

'ہائے اللہ! اِس سے پہلے میں اِس جنّت میں کیوں نہ آئی؟'

اجنبی اُس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھا۔ وہ بھی کھوئی کھوئی سی ساتھ ہو لی۔ ہال میں قدم رکھتے ہی اُسے محسوس ہوا۔ جیسے وہ فردوسِ بریں میں پہنچ گئی ہو۔ وسیع و عریض ہال میں حُسن ہی حُسن بکھرا ہوا تھا۔ خوبصورت نشستیں تھیں، روشنی تھی، حُسن کی روشنی! جو برقی قمقموں کی روشنی کو ماند کر رہی تھی۔۔۔ ہر طرف نشہ تھا۔ نشیلی آنکھوں کا نشہ! لرزتے ہونٹوں کا نشہ! دہکتے رُخساروں کا نشہ! جوانی کا نشہ!! جو مے ساتگین کے نشہ کو بھی شرما رہا تھا۔۔۔ بہکی جوانی، بہکتے حُسن کو سہارا دے رہی تھی۔ اپنے گرد و پیش سے بے نیاز۔۔۔ شہلا کے رُخسار شفق گوں ہو گئے۔ بارِ حیا سے پلکیں جُھک گئیں۔ اِس سحر سے وہ بھی نہ بچ سکی۔ وہ صوفوں پر بالمقابل بیٹھے تھے۔ اُس کی محویت اجنبی کی آواز نے توڑی۔

"غالباً تعارف کی تو ضرورت نہ ہو گی۔ کیونکہ یہاں جوانی جوانی سے ملنے آتی ہے، حُسن عشق سے ٹکرانے آتا ہے، دل دل سے ملتے ہیں۔ انسان کسی کو اپنا لیتا ہے، کسی کا ہو جاتا ہے، کسی میں کھو جاتا ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔!!"

اُس کی پلکیں جذبات کی شدّت سے بند ہو گئیں۔ پھر جیسے دُور، بہت دُور سے آواز آئی۔

"کیا پئیں گی آپ؟"

"جی! کچھ نہیں!" وہ چونک پڑی۔

"جی! وہ حیران رہ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"شاید آپ پہلی بار یہاں آئی ہیں؟"

"جی؟ جی ہاں!" اُس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"I see! اچھی! خیر کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ ایک جام پی لیجئے۔ شربت ہی کا سہی! پھر آپ کی اجنبیت خود بخود دُور ہو جائے گی۔"

پھر اُس نے بیرے کو اشارے سے قریب بُلایا۔ اُس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ جسے وہ سُن نہ سکی۔ تھوڑی ہی دیر میں اجنبی کے ہاتھوں میں دو جام تھے۔

"اپنے نئے ساتھی کی آمد کی خوشی میں!" اُس نے گلاس شہلا کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چمن سے آواز آئی۔ جام سے جام ٹکرائے۔ پھر اجنبی نے جام منہ سے لگا لیا۔ وہ یونہی بیٹھی رہی۔ اجنبی نے آنکھوں سے اشارہ کیا اور شہلا نے ایک فرمانبردار بچے کی طرح جام لبوں سے لگا لیا۔ ایک گھونٹ کیا لیا، جیسے اُس کے ہونٹ جل اُٹھے۔ حلق جلنے لگا۔ سینہ میں جیسے آگ ہی آگ جاگ اُٹھی۔ جیسے اُس کا سارا وجود جل اُٹھا۔ اُس نے گھبرا کر جام میز پر رکھ دیا۔ اجنبی بے اختیار ہنس پڑا۔

"گھبرائیے نہیں۔ یہ شراب نہیں۔ شربت ہے۔ کچھ تلخ ضرور ہے۔ لیکن اگر یہ تلخی آپ نے برداشت کر لی تو دُنیا جہان کی تلخیاں آپ بھول جائیں گی۔ سب کچھ۔ سب کچھ !!"

اُس کے ذہن میں یہی الفاظ گونجنے لگے۔

'دُنیا جہان کی تلخیاں آپ ... سب کچھ ... سب ... !!!'

اگلے ہی پل ہمت کر کے وہ پُورا جام چڑھا گئی اور پھر۔ پھر اُس پر مدہوشی طاری ہونے لگی اور تب اُس کی بے ہوشیوں کو اجنبی نے سہارا دیا۔ اُسے تھامے وہ زینہ کی طرف چل دیا۔ اُس نے رُک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے لبوں سے نکلا۔ "سروش !" اور وہ اُس کے شانے سے لگ گئی۔ پھر اُنھوں نے زینہ طے کیا اور وہ اوپر پہنچے۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئے۔

جب اُسے ہوش آیا تو اپنے آپ کو ایک اجنبی جگہ پا کر وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ لیکن۔ لیکن وہ یہاں کیسے پہنچی ؟ آہستہ آہستہ ذہن کے بند دریچے کھلنے لگے۔ اُسے یاد آیا۔ وہ خود کار ڈرائیو کر کے اِس نائٹ کلب تک پہنچی تھی۔ یہاں ایک اجنبی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اُس کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی۔ پھر اُس نے شربت پیا۔ نہیں وہ شربت نہیں تھا۔ اُسے کوئی نشہ آور چیز پلائی گئی تھی۔ پھر وہ اجنبی اُسے اِس کمرے میں لے آیا۔

'پھر۔ پھر کیا ہوا ؟ اور وہ اجنبی کہاں چلا گیا ؟'

بے بسی سے وہ رو پڑی۔

"ہائے اللہ ! یہ میں نے کیا کیا ——— کیا کیا ——— ؟ اب میں سروش کو کیسے مُنہ دکھاؤں گی ؟"

فون کی گھنٹی کی آواز نے جیسے اُس کے دل کے تمام تاروں کو جھنجھنا دیا۔ لرزتے ہاتھوں سے اُس نے ریسیور اُٹھایا۔ ہوٹل کے منیجر کی مودبانہ آواز آئی۔

"میڈم ! میرے لائق کوئی خدمت ؟"

"آں۔ ہاں۔ نہیں نہیں" اُس نے جلد ہی ریسیور رکھنا چاہا کہ پھر آواز آئی۔

"Just a minute please۔ آپ کے کمرے کا بِل ادا کر دیا گیا باہر پورچ میں آپ کی کار کھڑی ہے"

"بِل ! بِل کس نے ادا کیا ؟"

"جی ! وہی جو آپ کے ساتھ ... !"

"اوہ ! ہاں۔ ہاں۔ ٹھیک ہے !"

وہ گھبرا گئی۔ ریسیور اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر خود ہی کریڈل پر آ گرا۔ اُس کا سارا جسم پسینہ سے شرابور ہو گیا۔

'جی ! وہ جو آپ کے ساتھ ... !' یہ الفاظ اُس کے ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگے۔

'اُف خدا ! وہ کون تھا ؟ صرف ایک بار مجھے مل جائے تو اُس سے پُوچھوں اُن کھوئے ہوئے لمحات کا پتہ۔ جو جاتے جاتے میرا سب چھین لے گئے ! سب کچھ !!"

اُس کی آنکھیں برس پڑیں۔ روتے روتے اُس نے لباس درُست کیا۔ باتھ رُوم میں جا کر چہرہ دھویا۔ لپ اسٹک، پاؤڈر سے چہرے کو سنوارا۔ تاکہ اُس کے چہرے پر بھی غم کی گرد کوئی دیکھ نہ سکے۔ پھر وہ نیچی نظریں کئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اُس کے پیروں میں جیسے کسی نے بھاری پتھر باندھ دیئے ہوں۔ لیکن جب زینے سے اُس کی نظریں خالی ہال پر پڑیں تو جیسے اُسے ایک نئی توانائی مِلی کہ کوئی اُسے دیکھ نہیں رہا ہے۔ وہ تقریباً دَوڑتی ہوئی زینہ سے اُتر کر صدر دروازے کی طرف بھاگی اور پھر کار میں جا کر ہی دَم لیا۔ تب اچانک جیسے ایک خیال نے اُسے سہارا دیا۔ 'خودکشی !'

'تو کیا اُسے خودکشی کر لینی چاہیئے ؟ لیکن سروش ! وہ کیا سوچے گا ؟ بہتر ہو گا اگر وہ مرنے سے پہلے ایک بار سروش سے مل کر اپنی بے گناہی ... اپنی بے گناہی ؟ لیکن وہ بے گناہ تو نہیں۔ اُس نے تو اپنے سارے وجود کو گناہ سے اِس طرح داغدار کر لیا کہ اب سات جنم کی نیکیاں بھی گناہ کے اِن گہرے داغوں کو نہیں دھو سکتیں ——— اُف ! یہ میں نے کیا کیا ... ؟ نہیں نہیں۔ مرنے سے پہلے ایک بار سروش سے ملنا چاہیئے۔ شاید زخمی رُوح کو کچھ سکون ملے۔ لیکن، اِس کے لئے تو پُورا ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑے گا۔

اور یہ ایک ہفتہ شہلا کو سات صدیوں کے برابر محسوس ہوا۔ ایک مجروح آہ اُس کے لبوں سے نکلی اور اُس نے کار اسٹارٹ کر دی۔ سارے راستے اُس کی نرگسی آنکھیں شبنم کے موتی برساتی رہیں۔ کوٹھی کے پورچ میں کار رُکتے ہی وہ اُتر کر تیزی سے بیڈ رُوم کی طرف لپکی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور اپنی مسہری پر گر پڑی۔ اگلے ہی پل وہ کسی کی بانہوں میں تھی۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور جیسے اُس کے دل کی دھڑکن اِک پل کے لئے رُک سی گئی۔

"تم!" اس کے لب ہلے۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟"

اس کی قوتِ گویائی جیسے کسی نے سلب کر لی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سروش کو تکنے لگی۔

"تم کہاں گئی تھیں؟"

"سے فیر!" شہلا نے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے کہا۔ سروش کے ہاتھوں کی گرفت ایک دم ڈھیلی پڑ گئی۔ شہلا بے دم ہو کر مسہری پر گر پڑی۔ اس نے اپنا چہرہ پھر ہتھیلیوں میں چھپا لیا۔

"نہیں سروش! ایسے نہ دیکھو مجھے۔ مجھ سے اتنی نفرت نہ کرو! میں نے جان کر یہ گناہ نہیں کیا!"

"گناہ! کیا گناہ کیا تم نے؟ مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرو!"

"سروش! مجھے غلط نہ سمجھو۔ تمہیں سب کچھ بتانے ہی کے لئے تو میں یہاں آئی ہوں۔ ورنہ اب تک جسم و روح کا تعلق منقطع ہو جاتا۔"

"تو کیا تم خودکشی؟"

"ہاں سروش! اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں اپنے سہاگ کی قسم کھا کے کہتی ہوں۔ میں نے دانستہ یہ نہیں چاہا تھا۔ ہرگز نہیں! اس نے مجھے دھوکا دیا۔ شربت کے دھوکے میں مجھے شراب پلا دی اور۔ اور—— اُف خدا! ایک بار بس ایک بار مجھے اس کا پتہ چل جائے تو... !"

"تو کیا کرو گی؟"

"اس سے پوچھوں گی۔ ان کھوئے ہوئے لمحات کا پتہ جو مجھ سے جینے کا حق چھین لے گئے!" "کیپٹن رضا!"

"کیا؟ تو کیا تم! سروش! تم۔ تم اسے جانتے ہو؟"

"ہاں! اور اس رات کے ہر پل کے بارے میں جانتا ہوں۔ جسے کوشش کے باوجود تم یاد نہیں کر پا رہیں۔"

"نہیں! یہ کیسے ممکن ہے۔ تم تو یہاں سے جا چکے تھے۔ لیکن تم اس وقت یہاں کیسے؟"

"بہت دیر میں خیال آیا۔ خیر۔ میں اپنی معصوم شہلا کے پاس آیا تھا جس کا دل میں نے بری طرح توڑ دیا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اپنے آپ کو معاف نہ کر سکا۔ وہ مجھے اس بری طرح یاد آئی کہ میں کام ادھورا چھوڑ کر چلا آیا لیکن یہاں آ کر پتہ چلا کہ تم... !"

"نہیں سروش! تمہاری قسم آج پہلی بار میں نے گھر کے باہر قدم نکالا تھا۔ لیکن تمہیں یہ سب... !"

"کہہ تو رہا ہوں۔ ہر اس پل کی مجھے خبر ہے۔ جس نے بقول تمہارے تم سے جینے کا حق چھین لیا ہے۔ تم رضا کے ساتھ ہال میں گئیں۔ پھر وہ تمہیں اوپر لے گیا۔" اس نے شہلا کی حیران آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تم بہک گئیں۔ پہلے تو سروش سمجھ کر اس سے اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگیں۔ لیکن نہ جانے اچانک تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اس پر برس پڑیں۔ جو بھی چیز ہاتھ لگی۔ اس سے اس کی تواضع کرنے لگیں۔ اسے بھی غصہ آ گیا اور وہ تمہیں وہیں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹا تب شاید تم تھک کر یا نڈھال ہو کر مسہری پر گر پڑیں۔ اس نے تمہارا بیگ کھولا۔ جس میں تمہارا پتہ تھا۔ اس نے فون کیا۔ میں نے ہی ریسیو کیا تھا۔ اس نے مجھے فوراً ہی پہنچنے کی تاکید کی۔ میں اس سے پہلے کئی بار فون کر کے تمہارے بارے میں پوچھ چکا تھا لیکن ہر جگہ مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر اس فون سے میری بے قراریوں کو کچھ قرار آیا۔ میں فوراً وہاں پہنچا اور اس نے مجھ سے معافی مانگ کر تمہیں میرے حوالے کر دیا۔ تمہارا نشہ ابھی اترا نہ تھا... !"

"تو کیا وہ رات میں نے...؟"

"ہاں! وہ رات تم نے میرے ساتھ گزاری۔ لیکن میں تمہیں سزا دینا چاہتا تھا۔ اسی لئے تمہیں وہیں چھوڑ کر گھر چلا آیا۔ منیجر کو ہدایت کر آیا تھا۔ لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟—— ایسا کیوں کیا شہلا؟"

شہلا کا سر ندامت سے جھک گیا۔ اسے سروش کی باتوں کا جیسے یقین نہ آیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اس نے سر اٹھا کر سروش کو دیکھا۔ لیکن اشکِ ندامت نظروں کے سامنے دیوار بن گئے۔ وہ سروش کے قدموں کی طرف جھک پڑی۔ لیکن سروش نے اسے اٹھا لیا۔ اپنا پاؤں نہ چھونے دیا۔ نہ جانے کیوں۔ اس کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔

کچھ دیر کے بعد شہلا چائے بنانے کے لئے چلی گئی—— چائے لے کر آئی تو سروش اس کی تصویر کے سامنے کھڑا آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا ؎

زندگی ہی مری افسانۂ رنگیں بن جائے

تم سا عنواں جو کوئی میری نظر سے گزرے

قدموں کی آہٹ پا کر اس نے مڑ کر شہلا کو دیکھا تو اس کی ریشمی پلکیں صبیح رخساروں پر جھک گئیں!!

غالب

شفیق مینائی

مشرق میں بھی پھیلا ہے پیامِ غالب ۔ مغرب میں بھی گونجتا ہے نامِ غالب
سو سال ہوئے رحلتِ غالب کو شفیق زندہ ہے مگر اب بھی کلامِ غالب

ہر لفظ کو تصویرِ معانی کہیے ہر شعر کو نقشِ جاودانی کہیے
رندی میں ہے خیام کا ہمسر غالب شوخی میں اُسے حافظِ ثانی کہیے

پُر کیف ہے اب تک تری صہبائے کہن ہے آج بھی شاداب ترے فن کا چمن
تقلید طلب ہے ترا اندازِ کلام تشریح طلب ہے ترا اسلوبِ سخن

ظاہر میں تو اصنام پرستی دیکھی باطن میں شرابِ حق کی مستی دیکھی
کافر ہے کھلا اور ولی پوشیدہ اِک طرفہ تماشا تری ہستی دیکھی

تو میکدۂ شعر میں ممتاز بھی ہے رندانِ سخن میں تو سرافراز بھی ہے
پیمانے میں تیرے مئے اردو ہی نہیں شیشے میں ترے بادۂ شیراز بھی ہے

مقبول ترا طرزِ بیاں آج بھی ہے تخلیق تری وردِ زباں آج بھی ہے
دنیائے ادب میں ترا نامِ روشن ضوبار تھا کل بھی ضوفشاں آج بھی ہے

تو باعثِ توقیرِ وطن آج بھی ہے تو روحِ روانِ علم و فن آج بھی ہے
اب تک ہے زمانے کو عقیدت تجھ سے تو قبلۂ رندانِ سخن آج بھی ہے

مٹنے کا نہیں نقشِ دوامِ اُردو چھلکے گا ہر اِک دور میں جامِ اُردو
تا حشر زمانے میں رہے گا روشن نامِ غالب کے ساتھ نامِ اُردو



سر میں درد چاہے جس وجہ سے ہو
ایک ہی
سیریڈون سے
غائب!
ایک ہی سیریڈون سے درد جلد دُور ہو جاتا ہے۔
اس کے علاوہ سیریڈون میں موجود خاص اجزاء کی
بدولت نہ صرف سر کے درد، بدن کے درد،
یا دانت کے درد سے پیدا ہونے والا تناؤ ہی
دُور ہو جاتا ہے بلکہ آپ میں ایک نئی چستی اور
پھرتی بھی آجاتی ہے۔ یہی تو ہے سیریڈون کی خاصیت!
سیریڈون
(روش)
شور و غل کی
وجہ سے
سر میں درد
زیادہ کام کرنے
یا عام تھکان کی وجہ سے
سر میں درد
شدید دھوپ
اور گرمی کی وجہ سے
سر میں درد
سر میں درد
ناک بند ہونے اور سخت
سردی زکام کی وجہ سے
سر میں درد
HTA-VT.8421

یہ دُھواں دُھواں اُجالے

کلیم صدیقی بی۔ اے (عثمانیہ)

دیوڑھی حوض بیگی، روبرو میر چوک پولیس اسٹیشن، حیدرآباد (آندھرا پردیش)

شفیق و محترم بھائی! آداب و نیاز

ایک تازہ ترین تخلیق "یہ دُھواں دُھواں اُجالے" "بیسویں صدی" کی نذر کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کو اور قارئین کو بھی پسند آئے گی ...

خلوص آگیں ——— کلیم صدیقی

★

آصفہ نے جوں ہی چلتی ہوئی کار کو بریک لگائے، اچانک اِک ہلکا سا دھماکا ہوا، اِک ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا۔ اُس نے بوکھلا کر پیچھے دیکھا۔ ایک سُرخ رنگ کی فی ایٹ اُس کی کار کے پیچھے ہی لگی کھڑی تھی۔ وہ فوراً اپنی کار سے باہر نکل آئی اور اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کار کو ایک نوجوان ڈرائیو کر رہا تھا لیکن ونڈ اسکرین کے پیچھے اُسے اُس کا چہرہ صاف دکھائی نہ دیا۔ وہ جھنجھلا گئی اور کہنے لگی۔

"اے مسٹر! ——— آنکھیں بند کرکے کار چلاتے ہو کیا؟"

"لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کا دماغ آپ کے ساتھ ہے؟"

"جی!"

"میں کہہ رہا تھا ——— بیچ سڑک پر اِس طرح یکایک کار روک دینا دماغ کے غائب ہونے کی علامت ہے!"

"شٹ اپ!

"کتنے ریہرسل کے بعد سیکھا ہے آپ نے یہ؟"

"کیا ———؟"

"شٹ اپ!" اُس نے ذرا بلند آواز سے کہا۔

"یو شٹ اپ ——— نان سنس!!"

"اوکے! میڈم! ——— ٹاٹا!!" وہ آصفہ کے قریب سے کار نکالتے ہوئے اِسٹیرنگ پر ذرا سا جھکا، اپنا ہاتھ ہلا کر کہا اور ایک پل میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ غصّہ کے عالم میں اپنے پاؤں پٹختی رہ گئی۔ اُس نے اپنی کار کے پچھلے حصّہ کا جائزہ لیا۔ اُسے صحیح سلامت دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ پھر کار میں بیٹھی۔ اسٹیرنگ سنبھالا اور اسٹارٹ کردی۔ وہ کار چلاتے چلاتے ذہن پر زور دے کر کچھ سوچنے لگی، زیرِ لب کہنے لگی ——— "شاید اِسے میں نے کہیں دیکھا ہے! لیکن کہاں دیکھا ہے؟ اُونہہ! ——— وہ چاہے کوئی ہو۔ آج کل سارے ہی نوجوانوں کا یہی عالم ہے۔ اِنھیں عورتوں سے بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں۔ دو چار اوٹ پٹانگ جُملے کہہ لئے اور خوش ہوگئے کہ عورت بُری طرح نروس ہوگئی۔ آج کل یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ یہی طور، یہی طریق ہے۔ اخلاق اور کردار بگڑ رہے ہیں۔ مذاق بدل رہا ہے، معیار گِر رہا ہے۔ کوئی دلیپ کمار ثانی بنا ہوا ہے، کوئی خود کو راجکپور، دیو آنند اور شمّی کپور سمجھ رہا ہے اور لڑکیاں! اللہ کی پناہ! کوئی سادھنا، کوئی سائرہ بانو اور کوئی مالا سنہا بنی پھرتی ہے۔ جدھر دیکھیے فلمی ڈائیلاگ، سستے رُومان، سطحی محبت کی کارفرمائیاں ——— جیسے دُنیا میں محبت اور رُومان کے سوا کچھ نہیں رہ گیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ ——— ہماری ترقی، تہذیب اور کلچر پر، ہماری آزادی کے اُجالے پر آج بھی فلمی گندگی اور مغربی تہذیب کا گندہ دُھواں چھایا ہوا ہے! اور کون جانے یہ فضا کب بدلے گی؟ یہ دُھواں کب چھٹے گا اور اُجالا کب پھیلے گا؟ ——— اور ——— یہ نوجوان! ——— اوہ! خوب یاد آیا ——— یہ وہی نوجوان تو ہے جو مجھے شاید سپر نس کلب میں ملا تھا! ——— ایسا معلوم ہوتا ہے اُس نے مجھے پہچان لیا۔ اِس لئے جلد ہی کترا کر نکل گیا۔ اب تو وہ خیر سے کار نشین بھی ہوگیا ——— لیکن نہیں! ——— میں اُسے اچھی طرح پہچانتی ہوں!

وہ راجندر کی کار ہے۔ شاید اپنی ضرورت کے تحت اُس سے مستعار مانگ لی ہو۔ اُف! واقعی اُس کی پرسنلٹی اینٹریکٹیو ہے! اُس کے انوکھے اور دلچسپ اندازِ گفتگو میں کتنا طنز ہوتا ہے! اُس کے نام کی طرح اُس کا کردار بھی کچھ عجیب ہے۔ اُس دن نہ جانے کیوں مجھے اُس سے ہمدردی ہو گئی۔ وہ اُس وقت کتنا پریشان ہوا ہوگا ــــ!"

آصفہ کی ساری جھنجلاہٹ، ساری نفرت اب اُس کی ہمدردی اور تحسین میں تبدیل ہو گئی ــــ آج ایک پارٹی میں شرکت کی غرض سے جب آصفہ گھر سے نکلنے لگی تو اتفاق سے اپنے شوہر سیماب سے بُری طرح اُلجھ پڑی تھی، بُری طرح جھنجلا گئی تھی۔ اُس نے اپنی سہیلی اسنی سے وعدہ کیا تھا کہ پارٹی میں چلتے وقت وہ اُسے بھی 'خیابان کیفے' سے جہاں وہ اُس کے انتظار میں ٹھہرے گی، لیتی چلے گی۔ لیکن جب وہ اپنے تصوّر میں اپنی خانگی اُلجھنوں سے اُلجھتی خیابان سے آگے گزر گئی تو اُسے اچانک اسنی کا خیال آیا اور اپنی کار روک لی۔ اُسے اُس کا قطعاً خیال نہ رہا کہ اُس کی کار شاہراہِ عام پر دوڑ رہی ہے۔ اگر وہ نوجوان اُس وقت ہوشیاری سے اپنی کار نہ روک لیتا تو بُری طرح ٹکر ہوتی۔ دونوں کا نقصان ہوتا۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کی بجائے اُلٹا اُسی پر برس پڑی ــــ اور اب آصفہ خیابان کے شاندار ہال میں کھڑی اسنی کو ڈھونڈنے لگی۔ لیکن اُسے اسنی نظر نہ آئی۔ اُس نے اپنی رسٹ واچ دیکھی۔ اُسے محسوس ہوا وہ اُس کے بتلائے ہوئے وقت سے پچیس منٹ پہلے ہی آ گئی۔ اس لئے اب وہ اسنی کا انتظار کرنے ہال کے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھ گئی اور بیرے کو کافی کا آرڈر دے دیا۔ بیرے کو آرڈر کی تعمیل میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔ اُس نے گرم گرم کافی کی پیالی اور شکر سے بھرا شکردان اُس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ آصفہ کے ذہن سے اُس نوجوان کی تصویر ابھی تک چپکی ہوئی تھی۔ اُس نے پہلے تو کافی کی ایک چسکی لی، پھر اُس نے شکر ڈال کر آہستہ آہستہ چمچہ ہلانے لگی۔ پیالی کی سطح پر مچلتی لہروں کو غور سے دیکھنے لگی۔ کافی کی ننھی ننھی چاکلیٹی رنگ کی لہروں میں اُس کے ماضی کا رنگ تحلیل ہونے لگا، نگاہوں میں ابھرنے لگا اور وہ یادوں کی لہروں پر آہستہ آہستہ بہنے لگی۔

وہ تجمید سے شاید دو سال پہلے پرنس کلب میں ملی تھی۔ اُس دن وہ بہت اُداس تھی۔ بہت دنوں کے بعد اپنا دل بہلانے کلب گئی تھی۔ وہ جب کلب کے ہال میں ایک طائرانہ نظر ڈالتی کسی موزوں جگہ کی تلاش میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی تو اُس کی نظر ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے اجنبی نوجوان پر پڑی جو مصروفِ تکلم تھا۔ وہ اپنے سامنے بیٹھے کسی شخص کو رشوت کے موضوع پر دھواں دھار لکچر دے رہا تھا۔ اُسے اُس کی شخصیت میں، اُس کی دلچسپ باتوں میں بہت کشش محسوس ہوئی اور وہ غیر شعوری طور پر اُس کی طرف کھنچی چلی گئی۔

"اِف یُو ڈونٹ مائنڈ ــــ پلیز! ــــ آئی الاؤ تو سِٹ ہیر؟"

"اوہ! ــــ شورلی! ــــ وہائی ناٹ!!"

"تھینکس ــــ" آصفہ نے کہا اور ایک خالی چیئر کھینچ کر بیٹھ گئی۔ وہ پھر اپنے مخاطب کی طرف متوجہ ہو گیا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ــــ

"رشوت زندگی کا جزو لازم ہے۔ رشوت نہ ہو تو زندگی کے تمام کاروبار معطل ہو جائیں۔ جو رشوت نہیں لیتا وہ احمقوں کی دُنیا میں رہتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ایک محدود و مخصوص دائرہ میں تمام ضروریات کی تکمیل ہو جاتی تھی۔ لیکن اب زمانہ بدل گیا۔ ترقی کا دور ہے، ارتقاء کی لہر ہے، آبادی بڑھ گئی۔ طلب و رسد کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اب معمولی سے معمولی چیز بھی دس پندرہ پیسے سے کم میں نہیں ملتی۔ ایک روپے کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ابھی تڑوایا اور پلک جھپکتے ختم ہو گیا۔ کبھی یہی ایک روپیہ کا سکّہ حضرتِ خضر کے تھیلے کی برکات کا نمونہ ہوتا تھا۔ ساری دُنیا کی چیزیں خرید لیجئے اور روپیہ قائم کا قائم! بقول حضرت جوشؔ ملیح آبادی ؎

حال کے سِکّے کو ماضی کا جو سکّہ دیکھ لے
سَو روپے کے نوٹ کے مُنہ پر دوانی تھوک دے

دودھ نقلی، گھی نقلی، انڈا نقلی۔ یہاں تک کہ زندگی تک نقلی! ظاہری ٹیپ ٹاپ کے بغیر روزمرّہ کے کاروبار چل ہی نہیں سکتے۔ ناپ تول کے راشن کا یہ عالم ہے کہ ہفتہ ختم ہونے کے دو دن پہلے ہی اناج ختم ہو جاتا ہے پھر دوکاندار کی ریشہ دوانیاں الگ۔ کبھی گیہوں دے دیا تو چاول غائب کر دیا، کبھی چاول دے کر خوش کر دیا تو گیہوں کا داغ دے دیا اور شکر کی حلاوت تو جیسے زندگی کی تمام تلخیوں میں گم ہو گئی ــــ جب تک بلیک کے راشن کا انتظام نہ کریں پیٹ کی آگ کیسے بجھے؟ سَو سَوا سَو روپے کی ایمانداری چاٹنے والا ملازم رشوت کے بغیر بلیک کے راشن کا کس طرح متحمل ہوگا؟ اِس کے علاوہ یہ عمل صرف ایک طرفہ ہی نہیں، رشوت لینے والا کبھی کبھی خود رشوت دینے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ یہ لو اور دو کا ایک شریفانہ جذبہ ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں کار فرما ہے ــــ"

"معلوم ہوتا ہے! ــــ آپ بھی اِس شریفانہ جذبہ سے وابستہ ہیں!"

اُس کے مخاطب نے اُس سے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا دعویٰ ہے کہ آج مُلک کا ہر بڑے سے لے کر چھوٹا فرد اِس جذبہ سے وابستہ ہے ــــ وزیرِ اعظم اور اُس کی کیبنٹ کے درمیان باہمی اغراض و مراعات کی منتقلی اور اُس کا تعیّن ضروری ہے۔ ملازمین حکومت سے تنخواہوں میں اضافہ کا مطالبہ کرتے ہیں تو حکومت اُس کی اہمیت و نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے

[redacted]

اُسے پُورا کرنے کے لئے عوام سے ٹیکس کی شکل میں رشوت وصول کرتی ہے۔ اگر کوئی باپ اپنے تعلیم یافتہ بیٹے کو اپنی شادی کے لئے اپنی سُسرال سے زیادہ سے زیادہ جوڑے گھوڑے کی رقم اور جہیز طلب کرتے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے تو اُس کا کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہے۔ اِس طرح ہر جگہ، ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں امداد باہمی کے اِس سُنہرے اصول پر عمل پَیرا ہے ——" وہ کہتے کہتے یکایک رُک گیا کیونکہ اب وہاں راجندر، پرکاش، سیماب، فریدہ اور کانتا وغیرہ سبھی آ گئے تھے۔ راجندر اُسے دیکھتے ہی بے اختیار چیخ پڑا۔

"ارے تمجید! —— تم یہاں کیسے؟"

"تمھاری ہی تلاش میں آیا ہوں!" وہ اُسے جواب دے رہا تھا کہ آصفہ پر نظر پڑتے ہی سب اُس کی طرف متوجّہ ہو گئے اور سوالوں کی بوچھار کر دی۔

"آہا آصفہ! اِتنے دنوں تک کہاں تھیں؟"

"واقعی اب تو عید کا چاند ہو گئیں!"

"معلوم ہوتا ہے سیماب نے کوئی جادو کر دیا!" آصفہ کے اُداس اُداس چہرے پر ایک پھیکی مُسکراہٹ کی لکیر سی پھیلی اور غائب ہو گئی جیسے کسی شمشان میں اچانک ایک شمع جل اُٹھے اور جلد ہی بُجھ جائے۔

"آپ کی تعریف ——؟" سیماب نے اچانک اُس نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راجندر سے پُوچھا۔

"اوہ! —— آپ سے مِلئے! —— یہ میرے دوست، میرے کالج کے ساتھی ہیں، گریجویٹ ہیں! —— اِنھیں کالج میں 'پرنس آف بیوٹی' کہا جاتا تھا۔" راجندر نے کہا اور باری باری سب سے اُس کا تعارف کرایا۔

"کیوں جناب! راجندر سچ کہتا ہے نا ——؟" سیماب نے مصافحہ کے لئے اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پُوچھا۔

"جی ہاں! پبلک کا یہی خیال ہے! اور میں بھی کچھ ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ جب میں روزانہ شام کو اپنے گھر سے حسین کلر کا ٹیڈی سُوٹ پہنے، امریکن ٹائی باندھے، اپنے مخصوص دلیپ کٹ بالوں میں، اپنے کپڑوں میں بھینی بھینی خوشبو بسا کر نکلتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کِتنے ہی دیدہ و دل فرشِ راہ ہو گئے ہوں۔ سرِ راہوں کے درمیان اپنے اِرد گِرد دریچوں کی اوٹ سے اُچھل اُچھل کر رقص کرتی حسین و رنگین الفاظ کی اَن گِنت پریاں میرا استقبال کرتی ہیں اور میں اُن پر صرف 'سِتھری کیسل' کا دھواں اُڑاتا، ایک ہلکے تبسّم کی دولت لُٹاتا، اِک فاتح کی طرح گُزر جاتا ہوں ——!" اُس نے مُسکرا کر کہا اور فضا میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اُس کے کہنے کا انداز بہت دلچسپ تھا۔ وہ سب چیئرس کھینچ کر میز کے گِرد بیٹھ گئے۔

"آپ نے میری تعریف تو سُن لی! —— اب کچھ اپنی بھی سُنایئے ——؟" تمجید نے سیماب سے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کی تعریف یہ ہے کہ آپ فطرتاً رُومان پسند ہیں۔ کوئی نہ کوئی محبوبہ ہر وقت چپکی رہتی ہے اور خیر سے شادی شُدہ بھی ہیں!" راجندر سیماب کی بجائے خود ہی کہنے لگا۔

"خوب! —— یہ تو بہت اچھی ہابی ہے! —— بھئی آج کی دُنیا میں رُومان کے بغیر زندگی تو اُس غنچے کی طرح ہے جو بِن کِھلے مُرجھا جائے —— رہ گیا شادی شدہ کا سوال —— تو امریکہ میں ایک شخص نے اپنی بیوی کو اِس لئے طلاق دے دی تھی کہ اُس کی شادی سے پہلے رُومان نہ ہونے کی باعث اُسے شادی کا لُطف ہی نہ مِلا تھا۔ ہو سکتا ہے آپ بھی کسی وجہ سے اپنے اِس حق سے اِس لُطف سے محروم ہو گئے ہوں، اپنی مرضی کے خلاف شادی کر لی ہو —— اور اب کوئی چانس دیکھ کر اپنے اِس حق سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں۔" تمجید نے کہا۔

"اِن کی محبوباؤں میں اِن کے رشتہ کی ایک خالہ بھی ہیں ——!" راجندر نے اپنے ترکش کا ایک اور تیر پھینکا اور سب بے تحاشہ ہنسنے لگے۔

"تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آؤ گے ——؟" سیماب نے راجندر کو بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی رہی ہے جناب! —— اِس میں آپ کا کیا قصور! —— اگر لوگ بکتے ہیں تو بکنے دیجئے ——"

"مگر جناب! یہ سب . . ."

"میں سب سمجھتا ہوں —— آپ ذرا میری بات سُن لیجئے ——" تمجید سیماب کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگا —— "جب حضرتِ آدم عالمِ وجود میں آئے تو کہتے ہیں اُن کی پسلی سے حوّا کی تخلیق ہوئی اور اِس کے بعد اُن کی اولاد کا ظہور ہوا۔ اِس طرح اُن کی یہ اولاد آپس میں بھائی اور بہن ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اُن کے بعد پھر نسلِ انسانی کِس طرح آگے بڑھی؟ —— ظاہر ہے اُن کے باہمی اختلاط ہی سے دُنیا کی مردم شماری میں اضافہ ہوا ہوگا! اُس کے بعد جوں جوں زمانہ گُزرتا گیا، نسلِ انسانی بڑھتی گئی۔ انسان کا ذہن اور شعور پُختہ ہوتا گیا تو شاید مذہبی اور اخلاقی قدریں بھی بڑھ گئیں اور بالآخر رشتہ کی چند حدیں معیّن کر دی گئیں —— لیکن اگر آج ہم اِس راکٹ کے دَور میں، تعلیم، شائستگی اور ترقی کی بلندیوں پر پہنچ کر کبھی کبھی تاریخ کے پچھلے اوراق اُلٹنے لگیں تو حیرت

اور بُرائی کی کیا بات ہے ! جس طرح ہر چیز کی انتہا ایک ابتدا ہوتی ہے۔ اِسی طرح ممکن ہے تعلیم، عقل اور ترقی کی یہ انتہا بھی ایک ابتدا کا پیش خیمہ ہو —— اور کون جانے ایک وقت ایسا بھی آجائے کہ اچانک راکٹ، میزائلز اور ایٹمی بموں کی عالمگیر جنگ چھڑ جائے۔ دُنیا تحس نحس ہو جائے۔ نسلِ انسانی کا خاتمہ ہو جائے اور اس کے بعد جو چند لوگ بچ جائیں تو مصلحت کے طور پر یا پھر فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر، دنیا کے سارے رشتوں کو بھلا کر گذشتہ روایت کے مطابق وہ پھر ابنِ آدم کا سلسلہ آگے بڑھائیں ——!" تجمید کی یہ عجیب و غریب منطق ابھی جاری تھی کہ اچانک مائک پر رقص کے آغاز کا اعلان ہوا اور ساتھ ہی ساز اور سنگیت کی مدھر لہریں فضا میں مرتعش ہو گئیں۔ سیماب اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور فریدہ سے ہم رقص بننے کی درخواست کرنے لگا۔ فریدہ نے ایک دلفریب مُسکراہٹ کے ساتھ اس کی درخواست قبول کی اور آصفہ کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ ہو گئی۔ آصفہ سیماب کی اس حرکت پر بُری طرح جھنجھلا گئی۔ آپ ہی آپ زیرِ لب بڑبڑانے لگی۔ رنگ برنگ کے حسین جوڑے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے رقص گاہ کی طرف بڑھنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے میز خالی ہو گئی۔ صرف آصفہ اور تجمید وہاں بیٹھے رہے۔ آصفہ نے جب آہستہ آہستہ سارے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے تجمید کی طرف دیکھا تو وہ سٹپٹا گئی، اپنی نگاہیں نیچی کرلیں اور پاس ہی رکھے ہوئے ٹرانسسٹر کو غیر شعوری طور پر اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اپنے جذبات، اپنے احساسات کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ وہ اُسے بہت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مُسکراہٹ تھی۔

"یہ ٹرانسسٹر بہت خوبصورت ہے !" تجمید نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

"جی ——"

"شاید فارن کا ہو گا ——؟"

"جی ہاں !"

"کتنے بینڈز کا ہے ؟"

"تھری بینڈز، آل ورلڈ ——!" میں نے اسی طرح ٹرانسسٹر پر نظر جمائے ایک ہلکے تبسّم کے ساتھ کہا۔

"غالباً بُش ہے ——؟"

"آپ کا خیال درست ہے !"

"کیا میں آپ سے درخواست کر سکتا ہوں ——؟" تجمید نے ذرا ٹھہر کر اچانک اس سے پوچھا۔

"جی ! —— کاہے کی ——؟" اس کے لہجہ میں حیرت اور گھبراہٹ تھی۔

"رقص کے لئے کہہ رہا تھا ——" اس نے ایک بار پھر مُسکراتے ہوئے کہا۔ وہ اور بوکھلا گئی۔ لیکن جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔ تھوڑی دیر تامّل کیا۔ کچھ سوچنے لگی۔ پھر زیرِ لب یوں مُسکرا اُٹھی جیسے کسی کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور یکایک ہاتھ لگ جائے۔

"اچھا! —— چلئے !!" اس نے کہا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی ——

مغرب کے آرکسٹرا کی لَے پر مشرقی گیتیں تھرکنے لگیں۔ کلب کے ماحول پر شام کا سایہ یوں پھیلا تھا جیسے ایک عشرت کوش کی باہوں پر کسی معصوم دوشیزہ کی زُلف بکھر جائے۔ وقت کے رنگین پیمانے میں زندگی اسکاچ وہسکی کی طرح چھلک پڑی۔ غمِ ہستی کے یخ بستہ احساسات اجنبی سانسوں کی گرمی سے پگھل پگھل گئے۔ سحاب بن کر اُڑ گئے۔ تکلف، شرم و حجاب کی نازک زنجیریں پائے شوق کے ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ کر رہ گئیں۔ آصفہ تجمید کے سینے سے لگی اِس بے تکلفی سے رقص کرنے لگی جیسے وہ اُسے برسوں سے جانتی ہو۔ آج شاید پہلا موقع تھا جو وہ کسی غیر مرد کی ہم رقص بننے کے لئے رضامند ہو گئی۔ اِس سے پہلے جس نے بھی اس سے رقص کی درخواست کی، اس نے بہت حُسن و خوبی سے ٹال دی۔ اصل میں اس کا یہ اقدام سیماب کو دکھانے کے لئے تھا۔ وہ اس کی غیرت کو، اس کے احساسات کو جھنجھوڑنا چاہتی تھی۔ چند دنوں سے آصفہ اور سیماب کے درمیان رفتہ رفتہ اجنبیت اور تکلف کی دیوار اُٹھتی رہی تھی۔ بات بات پر اختلاف اور جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ ہوتا رہا تھا۔ آصفہ کی شادی ہوئے تقریباً تین سال بیت گئے تھے۔ وہ جوں ہی گریجویٹ ہوئی سیماب کی شریکِ زندگی بنا دی گئی۔ اِس میں کوئی شک نہیں سیماب خوبصورت کھاتا پیتا نوجوان ہے۔ اس کی مالی و معاشی خوشحالی کی وجہ سے اُسے ہر طرح کا آرام ملا۔ لیکن اُسے سیماب وہ نہ دے سکا جس کی اُسے ضرورت تھی۔ وہ اپنی غذا، اپنے لباس، فیشن، شراب، تاش، شوخ و شنگ لڑکیوں کو، اپنے دوستوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دے سکتا ہے۔ لیکن وہ اُسے سچے پیار اور گرم جذبات کے دو لمحے بھی نہیں دے سکتا۔

"کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے میم صاحبہ !" بیرے نے اس کے قریب آکر کہا۔ وہ ایک دم چونک اُٹھی اور اپنی حقیقی دُنیا میں یوں لوٹ آئی جیسے پردۂ سیمیں پر چلتی ہوئی فلم کی ریل بیچ میں اچانک کٹ جائے اور سینما ہال میں تیز روشنی پھیل جائے۔

"ہوں ! —— واقعی کافی ٹھنڈی ہو گئی ——!" اس نے کہا اور گھبرا کر ہال میں اِدھر اُدھر دیکھا، پھر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ اسی کے آنے میں

ابھی چند منٹ باقی تھے۔ اُس نے اطمینان کی سانس لی اور ٹھنڈی کافی کی چسکیاں لینے لگی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کٹی ہوئی فلم کی ریل پھر جڑ گئی۔ کہانی کا تسلسل آگے بڑھنے لگا۔

"کیا آپ خواب کی تعبیر دے سکتی ہیں؟" تجمید نے اُس سے رقص کے دوران یکایک سرگوشی کے انداز میں پوچھا تھا۔

"اوں ——؟" اس نے کہا اور اپنی نگاہیں اوپر اُٹھائیں۔ اُس کی آنکھوں میں 'ایوننگ اِن پیرس' کا خمار چھایا تھا۔

"میں نے ایک خواب دیکھا ہے ——!"

"کیا ——؟"

"راگ اور رنگ کی برسات تھی۔ رات بہت روشن اور حسین تھی۔ ایک بتِ کافر میرا ہم رقص اور . . ."

"جب آنکھیں جھپکیں تو طویل شبِ فراق تھی ——!" وہ اس کی بات کاٹتی ہوئی بولی اور کھلکھلا کر یوں ہنس پڑی جیسے جلترنگ بج اُٹھا ہو۔

"طویل شبِ فراق اب کہاں رہی!" تجمید نے پوچھا۔

"کیوں ——؟"

"جب سے آپ کی یہ لانبی زُلف گھٹ کر شانوں تک آگئی، وہ بھی مختصر ہوگئی!!" اس نے آصفہ کی زُلفوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بُری طرح جھینپ گئی اور ایک لمحہ کے لئے خاموشی چھا گئی۔

"کون تھا وہ سپنوں کا چاند ——؟" آصفہ نے خود ہی اُس بوجھل لمحے کے سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی میرے محبوب کو چاند کہتا ہے تو میں اُداس ہو جاتا ہوں!"

"وہ کیوں ——؟"

"کیا آپ نے دیکھا نہیں! —— امریکن راکٹ اپولو ۸ نے چاند کے زیرِ نقاب جو تصویر کھینچی وہ اخبارات میں یوں محسوس ہوئی جیسے کسی سیاہ دوشیزہ کے بھیانک چہرے پر جگہ جگہ چیچک کے داغ ہوں، گڑھے ہوں! —— اِس طرح آج سے پہلے جتنے بھی شاعروں اور ادیبوں کی محبوبائیں گزری ہیں وہ سب ایسی ہی شکل کی ہوں گی!" اس نے بہت سنجیدگی سے کہا اور آصفہ بے اختیار ہنس پڑی۔ یکایک سارے ساز رُک گئے، ہال میں تیز اُجالا پھیل گیا —— ڈانس کا ایک راؤنڈ ختم ہو گیا تھا سب اپنی اپنی میز کی طرف پر لوٹ گئے۔ آصفہ اور تجمید بھی اپنی میز پر چلے آئے اور صرف چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اسی نے دوسرے ایک میز پر آصفہ کو اشارے سے بُلایا۔ اُس نے تجمید سے معافی چاہتے ہوئے صرف پانچ منٹ میں لوٹ آنے کا وعدہ کیا اور چلی گئی۔ لیکن جب وہ لوٹ کر آئی تو وہاں میز پر کوئی نہ تھا۔ تجمید غائب تھا۔ اُس کا اپنا پرس کھلا پڑا تھا۔ اُس کا ٹرانسسٹر بھی غائب تھا! اُس نے پرس اُٹھا کر دیکھا تو اُس میں اُسے کاغذ کا ایک پُرزہ مِلا۔ وہ حیران رہ گئی۔ اُس میں لکھا تھا ——

محترمہ!

معاف کیجئے —— اِس جراتِ بے جا کے لئے شرمندہ ہوں۔ لیکن کیا کروں! ایک متوسط اور شریف گھرانے کے بھرم کا سوال ہے! —— کل شام کو گھر میں میری بہن، اُس کا شوہر، اُس کی نند وغیرہ اچانک آگئے ہیں۔ مہینے کے آخری دن ہیں۔ آپ ایک بڑے گھر کا اُجالا ہیں، آپ کیا جانیں! اِن دنوں سو سوا سو روپے ماہانہ کمانے والے ایک کلرک کا گھر جب کہ ماں باپ کے علاوہ ایک بڑے کنبہ پر مشتمل ہو، دھوئیں کے مرغولوں میں ڈوبتا چراغ ہوتا ہے۔ ہاں لیکن ایک ہندوستانی عورت کی حیثیت سے شاید جانتی ہوں گی کہ آج بھی ہندوستان میں بیٹی اور داماد کا کیا مان پان ہے۔ خاص طور پر جہاں نئی نئی شادی رچی ہو —— میں نے آج تک کبھی رشوت نہیں لی تھی اور آج جب ذرا یہ مزہ بھی چکھنا چاہا تو قسمت سے کوئی معمولی دینے والا ہی نہ ملا۔ پھر راجندر سے مدد لینے، راجندر کو ڈھونڈتا زندگی میں پہلی بار کلب میں داخل ہوا تو اُس نے بھی اپنی ننگی بغلیں اُٹھا دیں! —— اِس لئے مجبوراً آپ کا ٹرانسسٹر لے جا رہا ہوں تاکہ بلیک کے راشن کا متحمل ہو سکوں! —— زندگی نے وفا کی، ایمانداری نے دل کا ساتھ دیا تو یہ امانت ضرور لوٹا دوں گا۔ ورنہ . . . ٹاٹا!

تجمید

"ارے وہ ٹرانسسٹر! —— وہ!!" آصفہ کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا اور ذرا ٹھہر کر، ذرا سنبھل کر کہنے لگی۔

"کاش! ——

وہ مجھ سے کہتا! —— شاید میں اُس کی زیادہ سے زیادہ مدد کرتی۔ اُسے اُس کی توقع سے زیادہ نہال کر دیتی!

لیکن وہ ٹرانسسٹر ــــــ!

وہ ٹرانسسٹر تو بالکل مصنوعی تھا! پلاسٹک کا ایک خوبصورت کھلونا تھا جسے میں کچھ ہی دیر پہلے بازار سے خرید کر لائی تھی اور اپنی سہیلی شاہدہ کے ننھے کی سالگرہ پر پریذنٹ کرنے والی تھی۔

'آہ! مجید!! ــــ تم نے کس آسانی سے، کس سادگی سے اپنی محرومیوں کے دھوئیں کو جو تمہارے مستقبل کے اُجالے پر چھایا ہوا ہے مجھے دکھا دیا۔ لیکن میری اپنی آرزوؤں کے، میری اپنی اُمیدوں کے وہ روشن دریچے جھانک کر کون دیکھے جن پر مایوسی اور اُداسی کے گہرے بادل چھا گئے ہیں! ــــ کاش! قانون کی، سماج کی اتنی تیز، اتنی گہری نگاہ ہوتی! کاش! ــــ وہ اتنی حسّاس ہوتی ــــ!!'

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔

میں نشے میں ہوں

کرشن موہن ایم۔ اے

آ میرے پاس جانِ وفا، میں نشے میں ہُوں
آنکھوں سے مجھ کو اور پلا، میں نشے میں ہُوں
تُو بھی نشے میں جھوم ذرا، میں نشے میں ہُوں
آ میرے ساتھ دھوم مچا، میں نشے میں ہُوں

مچلا ہوا شباب ہے، چھلکی ہوئی شراب
یہ رنگ ہو تو کیوں نہ بھلا مَیں نشے میں ہُوں

چاہت کا رس لئے ہیں ترے ہونٹوں کے گلاب
یہ رس ہے میرے دل میں رچا، میں نشے میں ہوں

مچلی ہے چاندنی بھی ترا رُوپ دیکھ کر
شب میں ہے دُھوپ جلوہ نُما، میں نشے میں ہوں

بے کیف ہو چلا تھا یہ ہوش و خرد کا جوش
مَیں نے اِسے وداع کیا، مَیں نشے میں ہوں

بے رنگ سا سکوت خرد کا، بنا تھا بھُوت
سر سے اسے اُتار دیا، میں نشے میں ہوں

نشے میں ہے تمام سُلگتی ہوئی یہ شام
نشہ ہے جان و دل میں بسا، میں نشے میں ہوں

معذور ہوں حضور، نہیں میرا کچھ قصور
ساغر جو مجھ سے ٹوٹ گیا، میں نشے میں ہوں

دل میرا پاک و صاف ہے، رکھنا مجھے معاف
آدابِ عشق بھُول گیا، میں نشے میں ہوں

غزل

پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

جفائیں ہو رہی ہیں ہم پہ کیا کیا
ہُوا وہ آپ کا عہدِ وفا کیا؟

مرے حق میں بلائے جاں ہیں دونوں
کسی کافر کی شوخی کیا، حیا کیا

وہ کشتی غرق ہو جانا ہے جس کو
بچائے گا اُسے تُو نا خُدا کیا!

اب اپنا دل بھی اپنا دل نہیں ہے
چلی ہے بے وفائی کی ہوا کیا

یہاں اب حسرتیں ہی حسرتیں ہیں
دلِ مُشتاق میں ارماں تھے کیا کیا

اسیرانِ قفس سے یہ نہ پُوچھو
خزاں کیا ہے، بہارِ جانفزا کیا؟

مری فکر و نظر کے آئینے میں
تمہیں تم ہو، تمہارا پُوچھنا کیا

اُجالے سے تو بہتر تیرگی تھی
یہی ہے عہدِ حاضر کی ضیا کیا!

نہ آئیں گے کبھی لمحے طرب کے
نہ ہوگا غم کبھی دل سے جُدا کیا!

قیامت تھا کسی کا سامنا بھی
نہ جانے دل کا عالم ہو گیا کیا

جو خود بھٹکے ہُوئے راہی ہوں پرویز
بنیں گے وہ کسی کے رہنما کیا

ایک مچھلی جو فرائی نہ ہو سکی

پروفیسر زکی انور ایم۔ اے

کریم سٹی کالج۔ جمشید پور

بہت پیارے بھائی جان! تسلیم

لیجئے ایک افسانہ "ایک مچھلی جو فرائی نہ ہو سکی" ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ افسانہ آپ کو پسند آئے نہ آئے لیکن عنوان ضرور پسند آئے گا۔ کیونکہ اس عنوان سے ذہن میں مچھلی اور مچھلی کا فرائی ہونا جیسے لطیف تصورات اُبھر آتے ہیں۔ لیکن یہ افسانہ ایک ایسی مچھلی کا افسانہ ہے جو فرائی ہو ہی نہ سکی۔ یہ تو رہی عنوان کی بات۔ اب رہا افسانہ، تو افسانے کے بارے میں میں خود کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے کافی محنت سے لکھا ہے اور "بیسویں صدی" کے قارئین کی پسند کے قابل بنانے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی رائیں تو مجھے مل ہی جاتی ہیں۔ آپ اپنی رائے ضرور لکھئے . . .

آپ کا اپنا ——— زکی انور

★

اور پھر بھولی بھالی سی، ننھی منی سی، شوخ اور چنچل محبت جوان ہوگئی۔

شرمائی شرمائی سی، سہمی سہمی سی!

اور تب ریحانہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو اُسے اپنا جوان، صحت مند اور سرو قد سراپا دیکھ کر جمیل کی بات یاد آجاتی اور وہ شرما جاتی ——

سچ مچ اُسے آئینے میں اپنا عکس ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک قیامت اُٹھ رہی ہو!

اور اُس دن بھی قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو اُسے جمیل کی بات یاد آگئی اور غیر ارادی طور پر اُس کی نظریں جھک گئیں اور پھر جب اُس کی نظریں اُٹھیں تو اُس کے سامنے کوئی اور ہی آئینہ تھا جس میں ماضی کا عکس نظر آرہا تھا۔

اُس آئینے میں نو دس سال کے ایک کھلنڈرے بچے کا عکس تھا، جو کیچڑ میں لت پت بنیان اور نیکر پہنے، گاؤں کے کنارے کے جنگلوں سے ہو کر بہنے والی پتلی سی پہاڑی ندی میں مچھلیاں پکڑ رہا تھا!

وہ جمیل تھا!

وہ شہر کے کسی انگریزی اسکول میں پڑھتا تھا اور وہیں ہوسٹل میں رہتا تھا اور گرمی کی چھٹی گزارنے گاؤں آیا ہوا تھا۔

گاؤں کے کنارے کے جنگلوں سے ہو کر گزرنے والی پہاڑی ندی سوکھ چکی تھی۔ لیکن کہیں کہیں گڈھوں میں اب بھی پانی تھا جس میں گاؤں کے بچے مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔

ایک دن ریحانہ کا چچازاد بھائی سلیم ایک گڈھے سے مچھلیاں پکڑ رہا تھا اور ریحانہ گڈھے کے اوپر بیٹھی تھی کہ جمیل وہاں پہنچ گیا اور گڈھے میں اُتر گیا۔

"اے!" ریحانہ چیخی۔ "دیکھتے نہیں اِس گڈھے سے بھائی جان نے پانی باہر نکالا ہے۔ تم اِس سے مچھلیاں نہیں پکڑ سکتے۔"

"تم چُپ چاپ بیٹھی رہو!" جمیل نے نہایت ہی بے نیازی سے کہا اور جھک کر کیچڑ میں مچھلی ٹٹولنے لگا۔

"اے!" اب کے ریحانہ نے بڑے غصّے سے کہا۔ "خیریت چاہتے ہو تو گڈھے سے نکل جاؤ ورنہ . . ."

"ورنہ تم کیا کرو گی؟" جمیل نے جھکے جھکے ہی پوچھا۔

"میں تمہیں پیٹ دوں گی!" ریحانہ بولی۔

"کبھی تم نے ایک کھٹمل بھی مارا ہے؟" جمیل نے ہنستے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔

توبہ

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے ——— آنند نرائن مُلّا

ہم نے جب موسمِ برسات میں چاہی توبہ
بادل اِس زور سے گرجا کہ الٰہی توبہ ——— دَرد کاکوروی

پارسائی کی جواں مرگی نہ پُوچھ
توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی! ——— اختر شیرانی

اُس توبہ پہ ہے ناز تجھے زاہد اِس قدر
جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں ——— داغ

آپ پچھتائیں نہیں، ظلم سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں، داغ کا حال اچھا ہے ——— داغ

مرسلہ: ایس، ایس، ہنکاری - ایم۔ اے۔ آگرہ

"نہیں" چھ سات سال کی ریحانہ نہایت ہی معصومیت سے بولی۔
"اس کی بُو مجھے بہت بُری لگتی ہے۔ لیکن میں مچھر ضرور مار سکتی ہوں۔۔۔ اے مچھر نکل جاؤ گڑھے سے ورنہ مجھے گڑھے میں اُترنا پڑے گا"

"یہ تو بہت اچھا ہوگا!" جمیل نے کہا "کم سے کم ایک مچھلی تو میں پکڑ ہی سکوں گا! آؤ یہاں، میں تمھیں اپنی نیکر کی جیب میں ڈال لوں گا، پھر گھر لے جاؤں گا اور فرائی کر کے کھا جاؤں گا!"

"بھائی جان!" اس نے سلیم سے کہا "ذرا میاں منچو کی مرمّت کر دیجئے!"

لیکن سلیم نے جمیل کی طرف دیکھا تک نہیں، کیونکہ گاؤں کے دوسرے بچّوں کی طرح وہ بھی جمیل کے ایرگن سے مرعوب تھا۔

اور تب ریحانہ چھپاک سے گڑھے میں کُود گئی اور دوسرے ہی لمحے اس نے جمیل کی ناک پر ایک زوردار گھونسا جما دیا اور یہ سب کچھ اِتنی تیزی سے ہوگیا کہ جمیل بوکھلا گیا۔ وہ چند لمحوں تک ریحانہ کی طرف بوکھلایا ہوا سا دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے اُس کے بالوں کا ایک بڑا سا گُچھا اپنی مٹھی میں لے لیا اور پھر ہنستے ہوئے بولا۔

"تم ایک چھوٹی سی بچّی ہو، تمھیں پیٹنا بہادری نہیں ہے۔ میں تمھیں نہیں پیٹوں گا۔ تمھاری قسمت میں فرائی ہی ہونا ہے!"۔

وہ اس کے بال پکڑ کر کھینچتا ہوا گڑھے سے باہر لے آیا اور کندھوں پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اُسے بٹھاتا ہوا بولا۔

"کچھ دیر آرام سے یہاں بیٹھو۔ جب تک میں کچھ اور مچھلیاں پکڑ لوں۔ اکیلی ایک تمھیں فرائی کر کے کیا کھاؤں گا!"

ریحانہ رونے لگی۔ سلیم گڑھے سے باہر نکلا اور اسے ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔

گھر پہنچ کر ریحانہ نے اپنی ماں کو سارا واقعہ کہہ سُنایا اور اس سے کہا کہ وہ جمیل کی ماں سے اُس کی شکایت کرے۔

ریحانہ کی ماں ہنس پڑی۔ پھر اس نے کہا۔

"تم نے اس کی ناک پر گھونسا مارا ہے۔ تمھیں اس سے معافی مانگ لینی چاہیئے"

"واہ ——" ریحانہ نے بڑے غصّے سے کہا "وہ زبردستی ہمارے گڑھے سے مچھلیاں پکڑنے لگا اور میں نے منع کیا تو مجھے فرائی کر ڈالنے کی دھمکی دینے لگا۔ چوری اور اوپر سے سینہ زوری! میں نے اس کی ناک پر گھونسا مار دیا تو کیا بُرا کیا؟"

"بیٹھ جاؤ" ریحانہ کی ماں نے کہا اور جب ریحانہ اس کے پاس بیٹھ گئی تو وہ اُسے جمیل کے بارے میں بتانے لگی "ہم چار برسوں کے بعد گاؤں آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تم ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ وہ میری ایک بہت ہی پیاری سہیلی کا بیٹا ہے۔ شہر میں پڑھتا ہے اور اب وہ چھٹیاں گزار کر شہر جائے گا تو ہمارے گھر آیا کرے گا۔ کل اس کی ماں آئی تھی۔ تمھیں اس نے بہت تلاش کروایا لیکن تم نہ مل سکیں"

"جب وہ شہر میں رہتا ہے تو اب تک ہمارے ہاں کیوں نہ آیا؟" ریحانہ بولی "عجیب بدتمیز لڑکا ہے!"

"نہیں!" ریحانہ کی ماں نے کہا "وہ بدتمیز نہیں ہے۔ وہ بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ ہاں کچھ شوخ اور شریر ضرور ہے اور ہمارے ہاں اُس کے نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ خود مجھے بھی معلوم نہ تھا کہ وہ شہر میں پڑھتا ہے"

ریحانہ کا غصّہ کسی قدر ٹھنڈا ہوگیا اور اُسی دن شام کو جب ریحانہ کے ساتھ اس کی ماں جمیل کی ماں سے ملنے گئی تو وہاں ریحانہ اور جمیل کی پھر ملاقات ہوئی اور تب ریحانہ نے محسوس کیا کہ بے شک وہ ایک اچھا لڑکا تھا۔ اس نے بڑی ہمّت کر کے جمیل سے پُوچھا۔

"کیا تمھاری ناک پر کچھ زیادہ چوٹ آئی تھی؟۔۔۔ مجھے معاف کر دو"

"زیادتی تو میں نے ہی کی تھی" جمیل نے کہا۔ "تم بھی مجھے معاف کر دو۔"

دونوں ہنس پڑے اور بظاہر بات ختم ہوگئی۔ لیکن دراصل وہیں سے ایک دوسری بات شروع ہوگئی تھی اور ایک بھولی بھالی، ننھی مُنی اور شوخ اور چنچل محبت کا گھروندہ بننے لگا تھا۔

گرمی کی چھٹی ختم کر کے جمیل شہر واپس چلا گیا اور کچھ دنوں کے بعد ریحانہ کا خاندان بھی شہر چلا گیا اور اب کے جمیل ہر اتوار کو ریحانہ کے گھر آنے لگا۔

اور گھروندہ بنتا گیا... بنتا گیا۔

پھر وہ ایک محل میں تبدیل ہونے لگا۔

اور پھر بھولی بھالی سی، ننھی مُنی سی، شوخ اور چنچل محبت جوان ہوگئی۔ شرمائی سی، سہمی سہمی سی!

اُس وقت تک ریحانہ بی۔ اے پاس کر چکی تھی اور جمیل نے میڈیکل کے آخری سال میں قدم رکھ دیا تھا۔

اور اُس وقت تک محبت کا وہ محل پُورے طور پر تعمیر ہو چُکا تھا جو آج سے بہت پہلے ایک گھروندے کی شکل میں بننا شروع ہوا تھا۔

اور جبھی ایک دن جمیل نے ریحانہ سے کہا۔

"ریحانہ تم ایک قیامت ہو جو اُٹھ رہی ہو!"

اور اُس دن ریحانہ اِس قدر شرما گئی تھی کہ دیر تک اُس کی نظریں زمین میں گڑی رہ گئی تھیں اور پھر وہ نظریں جھکائے جھکائے ہی اُٹھی تھی اور جمیل کے پاس سے بھاگ گئی تھی۔

لیکن اُنھیں دنوں ایک اور قیامت اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ریحانہ کی ماں نے ریحانہ کے ابّا جان سے کہا کہ ریحانہ اور جمیل کی جوڑی بہت ہی اچھی رہے گی! اور ریحانہ کے ابّا جان نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ اُن کی نظر میں اُن کے بڑے بھائی کا لڑکا سلیم ایک بیش قیمت ہیرے کی طرح چمک رہا ہے جو جرمنی میں انجینرنگ کی تعلیم پا رہا ہے۔

بات ختم ہوگئی۔

لیکن وہ دونوں مہذّب گھرانے تھے اور ریحانہ اور جمیل اُسی طرح مِلتے رہے۔

اور اُس دن بھی ریحانہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی اپنے ذہن کے آئینے میں اپنے ماضی اور حال کے عکس دیکھ رہی تھی کہ سارے عکس دُھندلے ہونے لگے اور بہت دیر تک کھڑی روتی رہنے کے بعد اُس نے اپنے آنسو پونچھے تو قدِ آدم آئینے میں اُس کے اپنے عکس کے علاوہ ایک اور عکس نظر آنے لگا۔ وہ بائیس تیئس سال کے ایک خوبرو نوجوان کا عکس تھا جو ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا اور جس نے تیز سُرخ رنگ کی ٹائی باندھی ہوئی تھی۔

ریحانہ نے مُڑ کر دیکھا اور چونک گئی۔ جمیل اُس کے پیچھے کھڑا تھا!

"ارے واہ" جمیل اُس کے پاس پہنچ گیا اور پھر نہایت ہی عامیانہ انداز میں بولا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم رو بھی سکتی ہو... چھی چھی چھی یہ تو محبت کرنے کا نہایت ہی پُرانا طریقہ ہے۔ آج کل تو ٹوئسٹ کیا جاتا ہے۔ آؤ ہم ٹوئسٹ کریں..."

لیکن ریحانہ بالکل نہ ہنسی۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہی۔ پھر اُس نے بہت ہی نحیف آواز میں کہا۔

"شاید تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اِسی طرح ہنستے ہنساتے مر جائیں... کبھی تم نے ٹھیک ہی کہا تھا جمیل کہ میری قسمت میں فراق ہی ہونا ہے اور آج میں فراق ہو رہی ہوں۔"

"اور میں کیا اتھاہ سمندر میں تیر رہا ہوں؟" جمیل بولا۔ "لیکن گھبراؤ نہیں ریحانہ مجھے اپنے گُرُودیو پر پُورا پُورا بھروسہ ہے۔"

"گُرُودیو؟" ریحانہ نہایت ہی تلخی کے ساتھ بولی۔ وہ چاہتی تھی کہ

پھُول

ہر سمت تا بحدِ نظر پھُول کھِل گئے
تم مُسکرا دیئے کہ جہاں مُسکرا دیا ——— سید حجاب ترنم

سینہ ہے میرا صحنِ گلستاں بنا ہوا
یوں زخمِ دِل مہکتے ہیں جیسے چمن کے پھُول ——— ایم اے حفیظ بنارسی

خوشبوئے پھُول، یادِ دل، آنسوؤں سے آنکھ
ہر جام ہے شراب سے گویا بھرا ہوا ——— مضطر اکبر آبادی

کھِل پڑے جب بھی تیری یاد کے پھُول
اپنے دامن کو بھر لیا میں نے ——— خدیجہ شہناز

پھُول کے رُخ پر نمی سی ہے جو اُن کے رُو برُو
ہے ندامت کا عرق، شادابیٔ شبنم نہیں ——— منظور احمد منظور

مرسلہ: حمید احمد آرزو، مودہا، ہمیر پور

جمیل تھوڑی بہادری کرے اور وہ دونوں بغاوت کرکے جیون ساتھی بن جائیں۔ لیکن جمیل کے گُرودیو نے اُسے سختی سے ایسا کرنے سے روکا تھا اور اُنھوں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور کوئی ایسی صورت نکالیں گے کہ جمیل اور ریحانہ کی شادی ہو جائے۔ لیکن ریحانہ کو اِس بات پر یقین نہ آتا تھا۔ اُس نے کہا "ٹھیک ہے جمیل! ٹھیک ہے جو تمھارے گُرودیو کہتے ہیں وہی کرو۔"

وہ بے حد غصّہ ہو گئی تھی۔ وہ جمیل سے کچھ بھی کہے بغیر اُٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

جمیل بہت دیر تک وہاں بیٹھا اُس کا انتظار کرتا رہا اور جب وہ نہ آئی تو وہ واپس چلا گیا۔

وہاں سے وہ سیدھا اپنے بوڑھے پروفیسر ڈاکٹر ریشپال کے پاس پہنچا۔ وہ جمیل کو بیٹے کی طرح مانتے تھے اور جمیل بھی اُن سے بہت بے تکلف تھا۔ ڈاکٹر ریشپال کو سلام کرنے کے بعد وہ بڑے غصّے سے بولا۔

"گُرودیو! وہ لڑکی ریحانہ اب اپنے آپ کو ایسا محسوس کر رہی ہے جیسے وہ قربانی کی جا رہی ہو۔ وہ مر جائے گی اور تب میں بھی مر جاؤں گا اور پھر مجھے یقین ہے کہ آپ خودکُشی کر لیں گے!"

ڈاکٹر ریشپال ہنس پڑا۔ پھر اُس نے جمیل کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسے ساتھ لے کر اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔

ڈاکٹر ریشپال پھل کھانے کا بے حد شوقین تھا اور اِس شوق میں اُسے پھلیوں کی اِتنی قسموں کے نام یاد تھے کہ شاید ہی کسی کو یاد ہوں۔ لیکن مچھلی کے شکار کے نام ہی سے اُس کی نانی مرتی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ریحانہ کے ابّا جان، قاضی صاحب سے پہلی ہی ملاقات پر اُس نے مچھلیوں کے شکار کا تذکرہ چھیڑ دیا اور قاضی صاحب کو ڈاکٹر ریشپال سے مِل کر کچھ ایسی خوشی ہوئی جیسے ایک افیونی کو دوسرے افیونی سے مِل کر ہوتی ہے ــــــ اور اُنھوں نے چہکتے ہوئے پوچھا۔

"شاید آپ کو بھی مچھلیوں کے شکار کا شوق ہے؟"

"بھی؟" اُس نے آنکھیں گول کر کے کہا "اِس 'بھی' سے جناب کی کیا مُراد ہے؟ کیا آپ کا کوئی اور دوست بھی مچھلیوں کے شکار کا شوقین ہے؟"

"جی ہاں" قاضی صاحب نے کہا "دوست تو کئی ہیں جو اچھے شکاری مانے جاتے ہیں۔ میلیِن بھی۔ میں نے دوستوں کے لئے نہیں، خود اپنے لئے استعمال کیا تھا۔"

"جی ـــــ" ڈاکٹر ریشپال زور سے چیخا اور پھر وہ یک لخت جمیل کی طرف مخاطب ہو گیا "بیٹے! اُس دن تم قاضی صاحب کا غائبانہ تعارف کرا رہے تھے تو تم نے آپ کی فیّاضی، آپ کی علم دوستی، آپ کی انسانیت، آپ کی دولت سب کا تذکرہ کیا لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ آپ مچھلیوں کے اِتنے بڑے شکاری بھی ہیں... اُف! تم نے جبھی بتایا ہوتا تو مجھے ایک تو سلیقے کا آدمی اِس شہر میں مِل گیا ہوتا۔"

"بھول ہو گئی تھی سر!" جمیل نے ندامت سے کہا۔

"بھول ہو گئی تھی سر" ڈاکٹر ریشپال نے مُنہ ٹیڑھا کر کے کہا "اگر تم قاضی صاحب کے بارے میں صرف اِس قدر کہہ دیتے کہ آپ مچھلی کے شکاری ہیں تو ساری باتیں خود بخود روشن ہو جاتیں کہ آپ فیّاض بھی ہیں، علم دوست بھی، ایک عمدہ انسان بھی اور دولت مند بھی۔"

"وہ کیسے ڈاکٹر صاحب؟" قاضی صاحب نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا اچھا" ڈاکٹر ریشپال نے جلدی سے کہا "اِس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مچھلیوں کے شکار کے سلسلے میں اُس اسکول سے تعلق رکھتے ہیں جس کا کہنا ہے کہ آدمی کو آم کھانے سے رغبت ہونی چاہئے، آم کے درخت پر چڑھنے سے رغبت ہونا کوئی ضروری نہیں۔"

"میں سمجھ نہ سکا ڈاکٹر صاحب!" قاضی صاحب ڈاکٹر ریشپال کی طرف دیکھنے لگے "بات ذرا واضح کیجئے۔"

"مطلب یہ کہ آپ شکار برائے شکار کے قائل ہیں، شکار برائے لٹریچر کے قائل نہیں۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" قاضی صاحب نے پوچھا۔

"میں یہ عرض کر رہا ہوں قبلہ!" ڈاکٹر ریشپال کہنے لگا "یہ کہ آج کی دنیا میں غذا آدمی کے لئے قطعی طور پر سکنڈری چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ اوّلیت حاصل ہے تو لٹریچر کو... آپ دیکھتے ہیں نارکس سے دس دس پیسوں میں چار چار پانچ پانچ سو صفحات کی کتابیں آتی ہیں۔ اگر ایک مُرغی خانہ کی تعمیر پر پانچ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں تو اُس پالٹری سے متعلق ناول، افسانے، تنقید، انشائیہ، مثنوی وغیرہ کی اِتنی ساری کتابیں مارکیٹ میں آ جاتی ہیں جن کی مجموعی لاگت پانچ کروڑ سے کم نہیں ہوتی۔"

"ڈاکٹر صاحب!" قاضی صاحب اُکتاہٹ سے مُسکرائے "میں کچھ نہ سمجھ سکا۔"

"قاضی صاحب!" ڈاکٹر یشپال نے کہا۔ "عرض یہ ہے کہ میں نے مچھلیوں کے شکار پر سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں اور میں کنفیوشس کے قول سے اتفاق کرتا ہوں کہ مچھلیوں کے شکاری گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے ہیں اور اس خاموشی میں انھیں اپنی زندگی زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے بارے میں سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ اس لئے ایک مچھلیوں کا شکاری زندگی کے تمام تر شعبوں میں کامیاب ہوتا ہے۔"

قاضی صاحب ہنس پڑے۔ پھر انھوں نے کہا۔

"تو پھر آج بن جائے پروگرام ڈاکٹر صاحب؟"

"میں تو خود چاہ رہا تھا۔" ڈاکٹر یشپال ہنس پڑا۔ "لیکن آپ جیسی عظیم شخصیت کو زحمت دینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔"

"آپ بھی کیا بات کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب!" قاضی صاحب بولے۔ "بھئی اب تو ہم بے تکلف دوست ہو چکے ہیں۔"

"تھینک یو ویری مچ!" ڈاکٹر یشپال نے پھر قاضی صاحب سے ہاتھ ملایا۔

"تم بھی چلوگے جمیل میاں؟" قاضی صاحب نے پوچھا۔

"خواہش تو تھی۔" جمیل منمنایا۔

"ارے تو پھر منمنانے کی کیا بات ہے، چلو تیار ہو جاؤ۔۔ ڈاکٹر صاحب میں ذرا چارہ کا انتظام کر لوں۔"

"قاضی صاحب۔" ڈاکٹر یشپال نے کہا۔ "بے ادبی معاف، آپ چارہ اِس لونڈے سے بنوائیں۔ اِس کے پاس کسی سادھو کا نسخہ ہے۔" ڈاکٹر یشپال نے جمیل کے بارے میں بتایا۔ "چارہ بناتا ہے قاضی صاحب، بس حیرت ہوتی ہے ——— شیور سکسس! کیا مجال ہے کہ کوئی خالی ہاتھ آجائے!"

"ڈاکٹر صاحب!" قاضی صاحب ہنس پڑے۔ "خاکسار کے پاس بھی بہت سے سادھوؤں اور فقیروں کے دئے ہوئے نسخے موجود ہیں لیکن سب کے سب بکواس ہیں۔ میں جو چارہ بناتا ہوں آپ دیکھیں گے، کیا کرشمہ دکھاتا ہے!"

"اچھی بات ہے۔" ڈاکٹر یشپال نے کہا۔ "تو پھر آپ الگ چارہ بنائیں اور ہمارا شاگرد الگ بنائے گا۔ دیکھیں آج بازی کس کے ہاتھ رہتی ہے!"

قاضی صاحب نے ہنستے ہوئے بہت تپاک سے ہاتھ ملایا اور پھر اندر چلے گئے۔

اور جب وہ چارہ بنا کر لوٹے تو ڈاکٹر یشپال نے کہا۔

"چارے کا تھوڑا سامان ہمیں بھی عنایت کیجئے۔"

"واہ صاحب!" قاضی صاحب ہنسے۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ آپ الگ بنائیں۔ جب ہی تو آپ کا کمال دیکھا جا سکے گا۔"

"میرا نہیں قاضی صاحب!" ڈاکٹر یشپال نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "اس چھوکرے کا کمال! کم بخت مجھے نسخہ بتاتا کہاں ہے۔ ہمیشہ ٹال دیتا ہے۔"

"یہ تو الزام ہے سر!" جمیل نے کہا۔ "میں ابھی ساری چیزیں آپ کے سامنے منگوا رہا ہوں۔" اور پھر اُس نے قاضی صاحب کے ایک ملازم کو ایک روپیہ کا ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "آٹا ایک چھٹانک، بیسن ایک چھٹانک، پسی ہوئی ہلدی ایک چھٹانک، نوشادر ایک چھٹانک اور بیڑی دس عدد۔"

"بیڑی کس لئے؟" قاضی صاحب نے پوچھا۔

"جی وہ نسخے میں ہے۔" جمیل نے کہا۔ "مچھلیوں پر تازہ ترین تحقیق سے یہ پتہ چلا ہے کہ مچھلیاں نکوٹین اور الکوہل کی آدمیوں سے کچھ کم شیدائی نہیں ہیں۔ اِن تمام چیزوں کو شراب میں گوندھنا چاہئے۔ لیکن اِس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ بغیر شراب کے بھی کام چل جائے گا۔"

"نہیں نہیں۔" قاضی صاحب بولے۔ "کوئی کسر باقی نہ رہے جب ہی تو نسخے کی حقیقت معلوم ہو سکے گی۔۔" انھوں نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر ملازم کی طرف بڑھاتے ہوئے جمیل سے پوچھا۔ "وہسکی یا برانڈی؟"

"ابھی نہیں حضرت!" جمیل نے کہا۔ "معمولی ٹھرا چاہئے۔"

قاضی صاحب کا ملازم روپے لے کر چلا گیا اور جب وہ واپس آیا تو جمیل نے جھٹ پٹ چارہ تیار کر لیا اور پھر وہ روانہ ہو گئے۔

قاضی صاحب فشنگ کلب کے ممبر تھے۔ فشنگ کلب کے اپنے تالاب میں اُن کے لئے تو ایک پوائنٹ ریزرو تھا اور ڈاکٹر یشپال کے لئے انھوں نے اپنی جیب سے ایک پوائنٹ کا کرایہ ادا کر دیا۔ قاضی صاحب نے ڈاکٹر یشپال کے لئے ایک روڈ بھی لے لیا تھا اور ساری راہ ڈاکٹر یشپال اور جمیل اُس روڈ کی شان میں قصیدے پڑھتے آئے تھے! اور تب قاضی صاحب نے انھیں بتایا تھا کہ اُن کے پاس ایک سے ایک غیر ملکی روڈ اور کانٹے تھے اور انھوں نے انھیں دعوت دی تھی کہ کبھی اطمینان سے وہ وہاں آئیں تو قاضی صاحب وہ سب کچھ انھیں دکھائیں۔

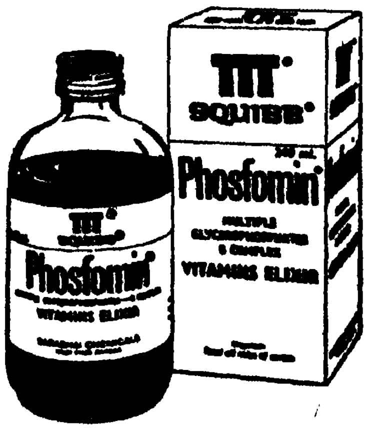
ڈاکٹر یشپال کو جو جگہ ملی اُس کا نمبر اکیاسی تھا اور وہ جگہ قاضی صاحب کی مخصوص جگہ سے تقریباً پچاس گز الگ تھی۔

وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر یشپال نے جمیل کو اکیلا ہی چھوڑ دیا

اور خود قاضی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر اُن سے باتیں کرنے لگے۔
اور تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اکیاسی نمبر کے پوائنٹ سے جمیل چیخ اُٹھا۔
"سر! دوڑیے... آیئے سر... دوڑیے... وہ مارا..."
"شور مت مچاؤ!" ڈاکٹر یشپال نے پکار کر کہا "شور مت مچاؤ ورنہ نکل جائے گی... میں آرہا ہوں!"
قاضی صاحب نے بھی اپنا روڈ ایک ساتھی کے حوالے کیا اور ڈاکٹر یشپال کے ساتھ اکیاسی نمبر کے پوائنٹ کی طرف بھاگے۔
"قاضی صاحب دیکھا آپ نے؟" ڈاکٹر یشپال نے کہا "کیا یہ کوئی معمولی شکاری ہے۔ اجی حضرت شرطیہ شکار کرتا ہے۔ شرطیہ!"
"اچھا اب تھک گئی ہے" قاضی صاحب بولے "دو گز کھینچو اور پھر ایک گز چھوڑ دینا... لیکن بچے ہو برخوردار، شور نہیں مچانا چاہیئے۔ شور سن کر مچھلی بے تحاشہ بھاگتی ہے اور اکثر نکل جاتی ہے۔"
"حضرت" جمیل کہنے لگا "آپ کے اس روڈ میں جو کانٹا ہے واللہ غضب کا ہے۔ میں نے تو آج تک ایسا کانٹا نہیں دیکھا تھا۔ بھلا اس کانٹے سے مچھلی تو کیا ہاتھی بھی نہیں نکل سکتا... عجیب چیز ہے صاحب... کہاں سے منگوایا ہے حضور آپ نے؟"
"میرے ایک جرمن دوست نے بھیجا تھا" قاضی صاحب نے کہا۔
"اچھا دیکھو اب بہت تھک گئی ہے۔ آہستہ آہستہ کھینچ لو"
"نہیں حضور" جمیل نے التجا کی "میری دِلی تمنا یہ تھی کہ مچھلی آپ ہی کے دستِ مُبارک سے باہر آئے"
قاضی صاحب نے جمیل کی درخواست منظور کر لی اور روڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور پھر تقریباً آدھ من کی ایک روہو تالاب سے باہر آگئی۔ جس کے باہر آتے ہی قاضی صاحب نے پہلے تو جمیل کی پیٹھ تھپ تھپائی اور پھر بڑے تپاک سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
"ہو تم کام کے لڑکے برخوردار!"
اور جمیل لڑکیوں کے سے انداز میں شرما گیا۔

وہ دن ڈاکٹر یشپال اور قاضی صاحب کی ملاقات کا پہلا دن تھا۔
اور پھر وہ برابر ملتے رہے۔ ڈاکٹر یشپال اور جمیل نے قاضی صاحب کے دیس دیس کے روڈ اور کانٹے دیکھے۔ ریشم، نائلن اور ٹیرالن کی ڈور دیکھی۔ طرح طرح کے وہیل دیکھے۔ اُن کے ساتھ کئی بار شکار میں گئے اور اپنی ہر ملاقات میں ڈاکٹر یشپال قاضی صاحب سے قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔
ایک دن دُور دراز کی ایک جھیل میں شکار کا پروگرام بنا اور قاضی صاحب صبح سویرے ہی سے نہایت تُزک و احتشام کے ساتھ شکار کی تیاریاں کر رہے تھے کہ نو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔
فون ڈاکٹر یشپال کا تھا اور اس نے کسی ضروری کام کے لئے محض چند منٹوں کے لئے قاضی صاحب کو بُلایا تھا۔ قاضی صاحب نے کام کی نوعیت پُوچھی تو ڈاکٹر یشپال نے بتایا کہ ابھی وہ کچھ نہیں بتا سکتا۔
سارا کام چھوڑ کر قاضی صاحب اُسی وقت ڈاکٹر یشپال سے ملنے چلے گئے۔
وہ اپنے کوارٹرز کے پھاٹک ہی پر قاضی صاحب کا انتظار کر رہا تھا اور جیسے ہی قاضی صاحب کی گاڑی پہنچی ڈاکٹر یشپال دوڑ کر اُن کی گاڑی کے پاس پہنچ گیا اور نہایت ہی بوکھلائے ہوئے انداز میں سلام کرنے کے بعد اُس نے جلدی سے پُوچھا۔
"انسپکٹر تری ویدی سے آپ کی کیسی ملاقات ہے؟"
"ملاقات؟" قاضی صاحب مُسکرائے "بھئی وہ میرا لنگوٹیا یار ہے۔ لیکن بات کیا ہے؟" وہ نہایت ہی گھبراہٹ کے ساتھ ڈاکٹر یشپال کی طرف دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر یشپال نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور پھر قاضی صاحب کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور نہایت ہی رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔
"جمیل نے رات تقریباً پندرہ بیس خواب آور گولیاں کھائی ہیں اور یہ نیک کام اُس اُلّو کے پٹھے کو کرنا بھی تھا تو میرے گھر میں۔ آج کل وہ میرے ہی ہاں اِسٹڈی کر رہا تھا اور رات کم بخت نے یہ حرکت کر ڈالی اور اِس تری ویدی کے بچے کو تو جیسے جرائم کی مہک لگ جاتی ہے۔ ایک گھنٹے دو گھنٹے سے میرے سر پر سوار ہے اور مجھ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہ خودکُشی کا کیس ہے یا کسی نے اُسے زہر دیا ہے اور اگر خودکُشی کا کیس ہے تو پھر جمیل نے خودکُشی کیوں کرنی چاہی اب آپ ہی سوچیئے..."
"آپ یہ بتایئے کہ جمیل کی حالت کیسی ہے؟" قاضی صاحب نے پُوچھا۔
"میں نے ڈاکٹر علی کو بُلا لیا تھا" ڈاکٹر یشپال کہنے لگا "اُن کا خیال ہے کہ قے کرا دی گئی ہے لہٰذا خطرہ کم ہو گیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک ہونہار نوجوان کو کھو دیں گے۔ قاضی صاحب اُس کا کلیجہ چھلنی ہو گیا ہے۔ ہوش اب تک نہیں آیا ہے اور..."
"میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں" قاضی صاحب نے کہا۔
"ہاں میں آپ کو اندر لے جاؤں گا" ڈاکٹر یشپال نے کہا "لیکن آپ سے




TIT
SQUIBB
Phosfomin
MULTIPLE
GLYCEROPHOSPHATES
B COMPLEX
VITAMINS ELIXIR

ایک گزارش ہے... خدا کے لئے تری ویدی کو یہاں سے کھسکا دیجئے میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔"

"میں اُمید کرتا ہوں کہ اگر کوئی شدید قسم کی قانونی مجبوری نہ ہوئی تو وہ میری بات مان لے گا۔" قاضی صاحب نے کہا اور پھر ڈاکٹر یشپال کے ساتھ اُس کے ڈرائنگ رُوم میں پہنچے جہاں ایک صوفے پر لیٹا انسپکٹر تری ویدی بڑی سنجیدگی سے کچھ سوچ رہا تھا۔

قاضی صاحب کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے قاضی صاحب کو سلام کیا اور جب اُس نے قاضی صاحب سے ہاتھ مِلایا تو قاضی صاحب اُسے کھینچتے ہوئے ڈرائنگ رُوم سے باہر چلے گئے۔

باہر قاضی صاحب اور انسپکٹر تری ویدی کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر انسپکٹر تری ویدی واپس چلا گیا۔

اور تب ڈاکٹر یشپال قاضی صاحب کو لے کر اُس کمرے میں پہنچا جہاں ایک پلنگ پر جمیل بے حس و حرکت پڑا تھا اور ڈاکٹر یشپال کی بیوی، اُس کی بیٹی اور ایک نرس اُس کے پلنگ کے پاس کھڑی تھی۔

قاضی صاحب چند منٹوں تک وہاں کھڑے رہے۔ پھر وہ ڈاکٹر یشپال کے ساتھ ڈرائنگ رُوم میں واپس آ گئے اور ایک صوفے پر دھم سے گرتے ہوئے اُنھوں نے نہایت ہی گھبرائی ہوئی آواز سے پُوچھا۔

"تری ویدی کو تو میں نے ٹال دیا۔ لیکن میں ضرور جاننا چاہوں گا کہ اِس نے خودکُشی کی کوشش کیوں کی؟"

"قاضی صاحب آپ یقین کیجئے۔ میرے پاس اِس لونڈے کے ایک مبہم سے خط کے علاوہ اور کچھ نہیں۔" ڈاکٹر یشپال نے جیب سے ایک خط نکالا اور قاضی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

قاضی صاحب غور سے خط پڑھنے لگے۔ لکھا تھا ——

گرو دیو!

انسان کی ساری اُمیدیں ختم ہو جائیں تو ایک —— سہارا باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے موت! میں مر رہا ہوں اور آپ کو بعد کی پریشانیوں سے بچانے کے لئے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اِس سے زیادہ میں کچھ اور نہیں کہنا چاہتا۔ کیونکہ میں اپنی موت کو کسی معصوم اور کنول جیسی پاک لڑکی کی رُسوائی کا باعث نہیں بنا سکتا —— ہاں ایک گزارش کروں گا گرو دیو۔ آپ ایک بڑے ڈاکٹر ہیں اور ہو سکتا ہے آپ مجھے موت کے مُنہ سے نِکال لینے کی کوشش کریں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر آپ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جائیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی یہ کوشش قطعی طور پر وقتی ہوگی۔ کیونکہ میرے زخم کا مرہم صرف اور صرف موت کے پاس ہے!

الوداع اے میرے گرو دیو الوداع!

آپ کا پیارا —— جمیل

خط پڑھ کر قاضی صاحب کسی بہت ہی گہرے سوچ میں ڈوب گئے اور بہت دیر تک بالکل خاموش رہنے کے بعد اُنھوں نے کہا۔

"آپ اِسے بچا لینے کی کوشش کیجئے۔"

"میں تو پُوری کوشش کر رہا ہوں قاضی صاحب!" ڈاکٹر یشپال نے کہا۔ "لیکن میں صرف ایک ڈاکٹر ہوں، خدا نہیں ہوں... یہ تو ظاہر ہے کہ یہ چکر کچھ عشق وغیرہ کا ہے۔ اگر اِس گدھے کے بچے نے اُس گدھے کی بچی کا نام لکھا ہوتا تو میرا کام بہت آسان ہو جاتا۔ مجھے یقین ہے زہر کا اثر زائل ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر علی کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن اِس کے دل پر کوئی شدید چوٹ پہنچی ہے اور اِس چوٹ کا اثر زائل کرنے کے لئے اُس اُلّو کی پٹھی کی سخت ضرورت ہے جس سے یہ فرہاد کی اولاد پریم کرتا ہے۔"

ڈاکٹر یشپال بہت غصّے میں تھا۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا اور سارا جسم کانپ رہا تھا۔

"ڈاکٹر! آپ کو اُس پر غصّہ نہ اُتارنا چاہیئے۔" قاضی صاحب نے کہا۔ "ابھی تو اُسے آپ کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔"

"ہمدردی؟" ڈاکٹر یشپال نے بڑے غصّے سے دُہرایا۔ "میں اِس نالائق لڑکے سے ہمدردی کروں؟ قاضی صاحب میرا جی چاہتا ہے کہ اِس کم بخت کو بھی گولی مار دوں اور اُس لڑکی کو بھی! آخر اُسے اور کیسا جیون ساتھی ملے گا۔ کیا وہ کسی خاص قسم کا لڑکا ہوگا؟ کسی اسپیشل خدا کا بنایا ہوا؟... لیکن نہیں... میں احمق ہوں... خط میں جمیل نے اُس لڑکی کو معصوم لکھا ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ شرارت اُس کے والدین کی ہے... قاضی صاحب میں قسم کھاتا ہوں اگر میرا جمیل مر گیا تو میں اپنی باقی عمر اِس ریسرچ میں لگا دوں گا کہ وہ کون لڑکی تھی جس سے جمیل محبت کرتا تھا اور پھر میں اُس لڑکی کے والدین کو گولی مار دوں گا... ہاں... آخر وہ اندھے لوگ اور کیسا داماد چاہتے ہیں؟... کیسا بریلینٹ لڑکا ہے۔ ہمیشہ ٹاپ کرتا ہے۔ سرکار اپنے خرچ پر اُسے لندن بھیجنے والی ہے... آخر وہ گدھے لوگ کیا

سکتے ہیں؟"

قاضی صاحب کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے اور وہ بہت گھبرائے ہوئے سے نظر آرہے تھے۔ وہ بہت بوکھلائے ہوئے بولے۔

"اچھا اب میں چلوں گا۔"

ڈاکٹر یشپال نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اُٹھے اور ڈرائنگ رُوم سے جب باہر چلے گئے تو ڈاکٹر یشپال بھی آگیا اور اُس نے کہا۔

"جانتے ہیں قاضی صاحب! یہ خالصاً خون کا مقدمہ بن سکتا ہے۔ لڑکی بھی بالغ ہے اور لڑکا بھی۔ ایسی حالت میں اگر لڑکی کے والدین کی ہٹ دھرمی اور خواہ مخواہ کی ضد کی وجہ سے لڑکا خودکشی کرتا ہے تو لڑکی کے والدین پر خون کا مقدمہ بھی بن سکتا ہے۔ قاضی صاحب آپ تو جانتے ہوں گے کہ زیرِ دفعہ تین سَو ایک تعزیرات ہند۔۔"

لیکن قاضی صاحب نے گاڑی اِسٹارٹ کرلی اور گاڑی کی آواز میں ڈاکٹر یشپال کی باقی باتیں دب کر رہ گئیں۔ اُنھوں نے بہت ہی گھبراہٹ کے ساتھ ڈاکٹر یشپال سے اپنا مرتعش ہاتھ مِلایا اور پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔

اور قاضی صاحب جیسے ہی گھر پہنچے اُن کی بیوی نے اُنھیں ہاتھ کے اشارے سے اپنے کمرے میں بُلالیا۔ وہ بہت ہی گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی اور جیسے بہت محنت کرکے اُس نے کہا۔

"ریحانہ۔۔" لیکن وہ اِس سے زیادہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ البتہ قاضی صاحب کہنے لگے۔

"میں جانتا ہوں اُس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"جی نہیں" اُن کی بیوی نے کہا۔ "ایک لیڈی انسپکٹر آف پولیس اُسے کئی بار پُوچھنے آچکی ہے۔۔۔ کیا بات ہے، کیا اِس نے کالج میں کوئی ہڑتال وغیرہ۔۔۔ یا ہوسکتا ہے خدانا خواستہ کوئی اور جُرم۔۔"

"نہیں" قاضی صاحب نے کہا۔ "اُس نے کوئی جُرم نہیں کیا ہے۔ مُجرم دراصل میں ہوں۔ پتہ نہیں مجھے اور کیسا داماد چاہئے تھا۔ سلیم میاں میں جیسے ہیرے ہی تو ٹنکے ہوئے ہیں۔۔۔ ٹھیک کہتا ہے وہ ڈاکٹر۔ میں یقیناً اُلّو کا پٹھا ہوں۔ اچھا ریحانہ کہاں ہے؟"

"میں نے اُسے پیچھے کے دروازے سے نکال کر سلمہ کے گھر بھیج دیا ہے۔" قاضی صاحب کی بیوی نے جواب دیا۔ "کچھ کیجئے نا۔۔۔ اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہ ہوگا" قاضی صاحب بولے۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور پھر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

اور قاضی صاحب کی کار پھر ڈاکٹر یشپال کے کوارٹر کے سامنے آکر رکی اور اُس میں سے قاضی صاحب کی بیٹی مس ریحانہ قاضی اُتری اور دندناتی ڈاکٹر یشپال کے کوارٹر میں داخل ہوگئی۔

ڈاکٹر یشپال سے اُس کا سامنا اندر کے برآمدے ہی میں ہوگیا وہ یک لخت اُس کے قدموں میں جُھک گئی۔

ڈاکٹر یشپال نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا۔ وہ رو رہی تھی۔ یشپال مُسکرانے لگا۔ پھر اُس نے ریحانہ کی پیشانی چُوم کر کہا۔

"نہیں میری بچّی، اب نہ رو۔ اب تجھے کوئی جُدا نہیں کرسکتا۔۔ بیٹا کل ذرا تم اور جمیل تمری ویدی جی اور لیڈی انسپکٹر مس ولیم کا شکریہ ادا کرنا۔۔۔ دونوں بہت کام آئے۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ اُس آدھ من کی زندہ مچھلی کی قیمت ایک سَو دس روپے میں ابھی تک ادا نہیں کرسکا ہوں۔۔۔ اور وہ غوطہ خور ملاح۔۔۔ نہیں نہیں اُس کی مزدوری جمیل دے چُکا ہے۔"

ریحانہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے اور اُس کے قطرے ڈاکٹر یشپال کے قدموں پر عقیدت کے پھُول بن کر گر رہے تھے!!

غزلیں

مہندر پرتاپ چاند ایم۔ اے

کسی کی یاد آئے جا رہی ہے
قیامت پر قیامت ڈھا رہی ہے
وہ جب سے مائلِ لطف و کرم ہیں
اُداسی اور بڑھتی جا رہی ہے
وفا کی آرزو میں رونے والے
ہنسی تیری اُڑائی جا رہی ہے
کوئی بے نام سی اِک خواہشِ دل
مرے جذبات کو گرما رہی ہے
ہمارے حال پر یہ زندگانی
ہمیشہ سے کرم فرما رہی ہے
کبھی سوچا بھی ہے تو نے خدایا
کدھر تیری خدائی جا رہی ہے
کہانی زیست کی سازِ اَلم پر
ازل ہی سے سنائی جا رہی ہے
معطر جو رہی ہے دل کی دنیا
تمہاری کسی کی خوشبو لا رہی ہے
تمنا بھی کسی کی اب تو اے چاندؔ
سراپا درد بنتی جا رہی ہے

ضیا فتح آبادی ایم۔ اے

ایک دو گھونٹ مے جو پی میں نے
ساری مستی سمیٹ لی میں نے
تیری دُنیا سنوارنے کے لئے
اپنی دُنیا اُجاڑ دی میں نے
بگڑے بیٹھے ہیں، مانتے ہی نہیں
بات ایسی بھی کیا کہی میں نے
جان میں کیا رکھا تھا غم کے سوا
جان دے دی خوشی خوشی میں نے
غیر مانوس سی لگی مجھ کو
اپنی آواز جب سُنی میں نے
سانس لینے کو رُک گیا دم بھر
پائی کھڑکی جہاں کھُلی میں نے
پھر بھی پایا نہ اپنے گھر کا پتہ
چھان ماری گلی گلی میں نے
کی اندھیروں میں اے ضیاؔ اکثر
دل جلا کر ہی روشنی میں نے

سید نظر برنی ایم۔ اے

چوٹ کھا کر بھی مسکراتے ہیں
جان کر بھی فریب کھاتے ہیں
ہائے نیرنگیاں زمانے کی
کل جو اپنے تھے اب پرائے ہیں
تجھ سے مِل کر بھی یار ہائے دوست
اشک آنکھوں میں جھلملاتے ہیں
منزلِ شوق جب نظر آئی
خود قدم اپنے ڈگمگائے ہیں
بعدِ مدت ہوئی نمک پاشی
زخمِ دِل آج مسکرائے ہیں
کیا کرے شکوۂ عدو جس نے
دوستوں کے ستم اُٹھائے ہیں
آپ کو کیا خبر ہے اُلفت میں
کیسی مجبوریوں کے سائے ہیں
خیر ہو اپنے شیشۂ دل کی
وہ نظر کے قریب آئے ہیں

دن ہیں بہار کے ... حُسن کے نکھار کے



دلکش، سدا بہار حُسن و جمال کیلئے...
جے صابن! جے صابن کے ملائم جھاگ سے
جلد دمک اُٹھتی ہے... اور پھول سی تازہ
اور ملائم رہتی ہے۔ من پسند چمیلی کی خوشبو
ہر ٹکیہ میں ختم ہونے تک مہکتی ہے جو آپکے
دل کو موہ لے گی۔ چمکیلے فائل ریپر میں
لپٹا ہوا جے صابن لیجئے۔

جے۔ حُسن کے نکھار کیلئے ایک ہی نام
بہت سے صفات اور تھوڑے دام!

حُسن کے نکھار کے لئے

جے

حُسن و جمال کیلئے صابن
آپکی من پسند خوشبو سے شرابور



ٹاٹا
کا بنایا ہوا

Bensons/13170

اِک قطرۂ خون کیلئے

ہربنس لال ساہنی بی - اے

جی - ۸۶ پریس کالونی، فریدآباد این، آئی، ٹی

محترمی و مکرمی خوشتر صاحب! خلوص و نیاز

آپ کے عزیز دوست سردار لچھمن سنگھ گل سابق چیف منسٹر کے اچانک سُورگ باش ہو جانے سے بہت دُکھ ہوا۔ گل صاحب بلند حوصلہ مدبّر ہی نہ تھے، بہت بڑے دوست نواز اور ادب ذوق بھی تھے۔ اُن کی اچانک وفات پر آپ سے اظہار افسوس کرنا کچھ لوگوں کے لئے عجیب سی بات ہو تو ہو لیکن وہ لوگ جو آپ کی شخصیت سے پوری طرح واقف ہیں یہ جانتے ہیں اس جہاں میں خوشتر سے بڑا دوست اور دوست نواز کوئی نہیں! جب اُس کا کوئی دوست اُس سے جُدا ہو جاتا ہے تو اُس کے حسّاس اور پُر خلوص دل میں تاب ضبط کہاں؟

اِک مسلسل خلشِ سوزِ نہاں ہوتی ہے — دوستی دل کی بڑی دشمن جاں ہوتی ہے

آپ کے حکم کی تعمیل میں گو تاخیر ہو گئی ہے اور افسانہ نمبر کی تیاریوں میں آپ مصروف ہوں گے لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ نے مجھے حکم دینے کے بعد یہ کبھی نہ سوچا ہو گا کہ میں حکم عدولی بھی کر سکتا ہوں اِس لئے افسانہ نمبر میں میری جگہ محفوظ رکھی ہو گی۔ لیجئے آپ کے بلند ذوق کے مطابق ایک طنزیہ "اک قطرۂ خون کے لئے" حاضرِ خدمت ہے۔ افسانہ نمبر کے لئے کہانی لکھنے کا ارادہ تھا لیکن آپ کے تیرِ نشتر، نے کچھ کم گھائل نہیں کر رکھا تھا کہ اب آپ نے دلّی کا خط لندن کے نام" کا سلسلہ شروع کر کے دنیائے طنز و مزاح میں نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ گذشتہ دنوں یہاں فریدآباد میں ہوئے آل انڈیا کانگرس کے سیشن نے بھی اُکسایا۔ اس طرح آپ ہی کے طفیل یہ طنزیہ آپ تک پہونچ گیا ہے "بیسویں صدی" کے قارئین اور آپ کی رائے جان کر مسرت ہو گی ....

خلوص کار ——— ہربنس لال ساہنی

★

تحقیق کی اہمیت کا احساس مجھے ایک رات اچانک ہوا۔ ورنہ اُس سے پہلے اسے کبھی میں ایک فنی صنف سمجھتا تھا۔ ادبی محققوں کے بارے میں کئی بار ایسا بھی محسوس ہوا کہ یہ لوگ جب کوئی تخلیقی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے تو خواہ مخواہ ادب کے پیچھے ہیں ٹانگ اڑانے کے لئے دفنائے ہوئے مُردے خراب کرنے کا کام لے بیٹھے ہیں۔ لیکن اُس رات کے تجربہ سے محققوں کے تئیں اپنے خیالات کو ڈیفیکشن کرنا پڑا۔ آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی جسم کے ہر جوڑ کے نٹ بولٹ ڈھیلے پڑ گئے تھے تکان سے بُرا حال تھا۔ چارپائی پر پڑتے ہی اُس رب کا شکر ادا کیا جس نے رات بنائی تھی آرام کرنے کے لئے اور بُرا ہو اس نظام کا جس نے رات اور دن کے فرق کو یکسر مٹا کر آدمی کو دو شفٹوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے اور آدمی ہے کہ دن اور رات اُس نظام کو اپنا لہو بھینٹ کر رہا ہے دو وقت کی روٹی کے لئے۔ روٹی اور لہو کا باہمی تعلق کیا صرف آدمی کی کیمونٹی ہی میں ہے یا دنیا کے تمام جیو جنتو اسی لہو اور روٹی بوٹی کے چکر میں رات دن دونوں شفٹوں میں معروفِ عمل ہیں؟ اسی جدوجہد میں جان دیتے ہیں۔ جان لیتے ہیں۔ کوئی

قتل کا مجرم بنتا ہے تو کوئی شہادت کا رُتبہ پا جاتا ہے۔ روٹی یعنی اپنے پیٹ کے لئے شہید ہونے کی سعادت جس طرح مچھر کو نصیب ہوئی ہے کسی اور جاندار کے حصّہ میں شاید آئی ہو۔

بیچارے مچھر کے متعلق لوگوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اُن کے خلاف دشمنوں نے کچھ اس قدر پراپگنڈا کر رکھا ہے کہ لوگ یقین نہ کریں گے کہ یہ غریب کتنا بے ضرر اور ستم رسیدہ ذی روح ہے۔ اس کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ یہ ملیریا جیسی موذی بیماری کا موجد ہے حالانکہ اب ہماری جمہوری سرکار نے بھی اس سرٹیفکیٹ سے ہزاروں در و دیوار پر لکھ دیا ہے کہ "مچھر رہے گا ملیریا نہیں"۔ یعنی ان غریبوں کو پہلے مفت میں بدنام کیا جاتا تھا۔ پنجابی محاورے کے مطابق "راہ پئے جا تیاّ واہ پئے"۔ جب تک آپ کسی سے قریب نہ ہوں آپ نہ اُس کی برائیوں سے واقف ہو سکتے ہیں اور نہ اُس کے اوصاف کے معترف ——— مجھے خوش قسمتی سے گذشتہ تین سال سے اس حسین و جمیل اور خوش کلام قوم کی قربت کا شرف حاصل ہے اور میں اُنکی رفاقت اور ملنساری کا اس حد تک معتقد ہوں کا اُٹھتے بیٹھتے (سونے کی بات اُن کی موجودگی میں بھلا کہاں) جاگتے جاگتے اُن کی اس محبت اور توجہ کے لئے اُن کے گُن گایا کرتا ہوں۔ پہلے میرے دل میں اُن کے تئیں کئی طرح کی غلط فہمیاں تھیں لیکن ان تین برسوں میں اُن کی مسلسل کوششوں اور ایک لمحہ بھی تغافل نہ برتنے کی اُن کی خُو نے اُنھیں سمجھنے اور جاننے کے کئی مواقع فراہم کئے۔ کئی بار کھلی آنکھوں بلکہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُن میں سے کئی ایک کی شخصیت، قد و قامت اور خد و خال کا مطالعہ کرنے کی سعی کی ——— ایک رات بھولے سے ذرا آنکھ لگی تو اپنے نچلے ہونٹ پر حضرت کی نشست کا احساس ہوا۔ اپنی نظر جہاں یہ تشریف رکھتے تھے بھلا کہاں پہونچ سکتی تھی اس لئے ہلکے سے اشارے سے انہیں ذرا ڈسٹرب کیا تو آپ بڑے پیار سے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پر آکر براجمان ہوئے۔ انگلی کو آہستہ آہستہ اپنی آنکھ کے قریب لایا بہت غور سے دیکھا۔ خد و خال بڑے باریک اور کٹیلے تھے۔ نین نقش اس قدر تیکھے اور دلآویز تھے کہ یہ یقین کرتے ہی بنی کہ آپ حضرت نہیں کوئی محترمہ ہیں۔ ایک خواہش اُبھری اور لب پہ آگئی "محترمہ! کیا آپ پھر میرے ہونٹوں پر اپنے شہد آگیں ہونٹ نہیں رکھ سکتیں؟" وہ کچھ اس انداز سے شرما کر گن سے اُڑی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ زبان کا مسئلہ نہ صرف علاقائی اور صوبائی سطح پر ہی حل ہوتا جا رہا ہے بلکہ ہم اُس دَور میں پھر داخل ہو رہے ہیں، جب لوگ طوطوں۔ گھوڑوں۔ شیروں۔ بلیوں اور کتوں کی زبان سمجھتے تھے اور بولتے تھے۔ اس یقین نے مجھے اکسایا کہ میں اس نادر مخلوق سے دو دو باتیں کروں۔ کچھ اپنی کہوں اُنکی سُنوں۔

یہ اُسی زرّیں رات کا ذکر ہے جس کا حوالہ میں نے ابتدا میں دیا ہے۔ نصف رات بیت چکی تھی لیکن ذہنی طور پر اور جہاں تک آنکھ کے علاوہ دوسرے اعضا کا تعلق ہے ابھی تک جاگ رہا تھا کیونکہ میری محسن مچھروں کی پوری بٹالین میری خدمت پر معمور تھی۔ کبھی ننگے پیروں پر، باہنوں پر پیشانی پر اور گالوں پر جب کوئی چٹکی سی بھرتا تو میرا ہاتھ میکینکی انداز سے وہیں جا پڑتا۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ غریب جو ایک قطرۂ خون کے لئے اپنے پاپی پیٹ کی مجبوری میں وہاں تک آگیا تھا وہیں شہید ہو گیا اور پھر ——— "شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر گھڑی میلے" کے مصداق اُن کی موجودگی کا احساس کانوں کے نزدیک یوں ہوتا جیسے کئی موسیقار ایک ساتھ کچے پکے گانوں کا ریاض ایک ساتھ کر رہے ہوں۔ ایک آواز کو ذرا توجہ سے سُنا تو وہ سُر تال سے پوری طرح واقف معلوم ہوئی۔ اُسی سے مخاطب ہوا۔

"اے موسیقارِ اعظم! میرے حال پر رحم فرما۔ ایسی پُر فن موسیقی تو ہر وقت آکاش وانی کے ہر ریڈیو سٹیشن سُن کر تنگ آ چکا ہوں۔ کوئی کام کی بات کر تو تیرے ہی طفیل یہ شب گذار لی جائے"۔

شاید اُس نے میری التجا پر غور کیا تھا۔ فوراً اپنی بھیرویں روک کر یوں گویا ہوا ——— "آپ صاحبِ ذوق معلوم ہوتے ہیں جو ہم نامرادوں کو منہ لگاتے ہیں ورنہ ہر کوئی ہم کو دشمن جاں سمجھتا ہے۔ خصوصی طور پر آج کل تو ہماری جان پہ بنی ہوئی ہے۔ آج سے بائیس برس پہلے یہ مصیبت پاکستان سے آنے والے ہندوؤں اور ہندوستان سے جانے والے مسلمانوں پر آئی تھی اور وہ شرنارتھی اور مہاجر بنا دیئے گئے جبکہ آج ہم اُسی حال میں نہ شرنارتھی ہیں نہ مہاجر۔ گذشتہ بیس برسوں سے یہ ٹاؤن آباد ہوا ہم بھی یہاں آباد ہوئے تھے۔ ازل ہی سے ہمیں گندی نالیاں سڑے ہوئے پانی کے جوہڑ جُھگی جھونپڑیوں میں رہنے والوں کا پڑوس ملا ——— کوٹھی۔ بنگلوں اور اونچی عمارتوں میں رہنے والے حالانکہ ہمارے اپنے ہی ہیں۔ ہمارا کھانا پینا۔ سوچنا سمجھنا ایک سا ہے پھر بھی وہ ہمیں پاس تک نہیں پھٹکنے دیتے۔ کوئی بھی سرکار آئی چلی گئی وہ آیا رام کی ہو یا گیا رام کی ہماری بربادیوں کا ذکر اُس کے لبوں پر سہا لیکن ہمیں اس طرح اُجاڑنے کا کبھی کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا جیسے اب تین چار دنوں کے ایک معمولی سے سیشن کے لئے یہ لوگ ہماری جان کے لاگو

ہو گئے ہیں، سرکار کی اپنی جماعت کا آل انڈیا سیشن نہ ہوا کوئی انہونی بات ہو گئی۔

حالانکہ اِن بیچاروں پر پڑی اِس بے وقت کی مصیبت کی وجہ مجھے اُن سے گہری ہمدردی تھی لیکن آنکھوں میں نیند بسی ہوئی تھی اور وہ بار بار اُس کے تئیں بے توجہی برتنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میرے کان کے پاس آ کر اُس نے ایک زوردار نعرہ لگایا جس کے بول تھے۔ "ہمیں جاڑے سے پہلے متبادل جگہ الاٹ کی جائے!" اُس کے ایک ہی نعرے سے نیند پھر مجھ سے روٹھ گئی کیونکہ نعرہ جمہوریت کی بُنیادی علامت ہے اور نیند ایک غیر جمہوری فعل ——— مجھے متوجہ کر کے اس نے پھر اپنی تقریر کا سلسلہ گزشتہ سے پیوستہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"گو ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہماری یہ مصیبت چار چھ روز کے لئے ہی ہے اور یہ سرکار ہماری دشمن نہیں ہے کیونکہ اگر یہ ہماری دشمن ہوتی تو پھر ان جُھگی جھونپڑی والوں کی بھی دشمن ہوتی۔ اگر یہ یہاں موجود ہیں بلکہ اِن کی آبادی بڑھ رہی ہے تو پھر بھلا ہمیں کس بات کی فکر ——— تعجب ہے بیٹھے بٹھائے ہمیں یہ اُفتاد کیوں پڑی۔ ہماری تمام کی تمام آبادی جو ریلوے اسٹیشن سے لے کر نیلم چوک تک پھیلی ہوئی ہزار ہا جُھگی جھونپڑیوں کے دامن میں بہتے ہوئے گندے نالے میں آباد تھی بے گھر ہو کر اِن دُور دراز بستیوں میں آگئی ہے اور ان گنت وہیں شہید ہو گئے۔ آہ! کتنا دردناک منظر تھا جب کئی ہزار اہلکار، جو چنڈی گڑھ، کرنال، انبالہ، کورکشیتر غرضیکہ بارہ اضلاع سے محض ہمیں ہلاک کرنے کے لئے سینکڑوں ڈی ڈی ٹی کے ڈرموں اور طرح طرح کے ساز و سامان سے لیس ہو کر آئے تھے، انہوں نے ہم پر حملہ بول دیا۔ ہماری بہت بڑی تعداد اُسی طرح موت کی نیند سو گئی جیسے پچھلی جنگ میں ہزاروں انسان زہریلی گیس سے مار دیئے گئے تھے (آپ کو معلوم ہی ہے جب انسان اپنے بس سے کسی کے مارے جانے کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کیڑے مکوڑوں کی طرح مارے گئے)۔ میں خود اس وقت جان بچا کر اسٹیشن کے پیچھے والے کوارٹروں میں بکنگ کلرک کے کمرے میں اُس کے ٹنگے ہوئے میلے کپڑوں میں دبک گیا۔ رات بھر وہاں مقیم رہا۔ صبح ہی صبح ایک دِق زدہ چہرے والا بابو نما آدمی ہاتھ میں ٹارچ لئے داخل ہوا۔ وہ اُس کمرے کا ہر کونہ کھدرا دیکھ رہا تھا بکنگ کلرک اُس سے دریافت کر رہا تھا کیا ڈھونڈتے ہو؟ تو اُس نے جواب دیا۔ ہم چنڈی گڑھ سے آئے ہیں، منسٹری نے کہا ہے ایک بھی مچھر نہ رہنا

غزل

مِس غزالہ اشفاق۔ شاہجہانپوری

ترے حضور ہر آئینہ محوِ سکتہ ہے
کسے مجال۔ تجھے کون دیکھ سکتا ہے

تمہارے سامنے کیوں میرے لب نہیں کھلتے
تمہارے سامنے کیوں میرا دل دھڑکتا ہے

چھپائے رہتی ہوں دل میں تری محبت کو
یہ بات میرے سوا کون جان سکتا ہے

ترا خیال تو وجہِ سکونِ دل تھا مگر
ترے خیال سے بھی اب تو دل دھڑکتا ہے

تری غزل ہے غزالہ کہ آنسوؤں کی لڑی
ترے قلم سے تو خونِ جگر ٹپکتا ہے

چاہئے اور پھر یہی تو وہ علاقہ ہے جہاں سے بڑے بڑے نیتاؤں سے لے کر منتریوں اور وزیروں سے لیکر وزیر اعظم تک کو اِن دنوں دن میں کئی کئی بار نکلنا ہے ——— یہ سُنتے ہی مری جان نکل گئی کہ اے خدا! یہ جگہ بھی محفوظ نہیں اسی لئے میں نے آپ کی کالونی کا رُخ کیا اور دوسرے لاکھوں مچھروں کے ساتھ یہاں پناہ گزیں ہوں۔ آفرین ہے آپ لوگوں کے ماتھے پر بل نہ پڑا!"

اُس کی نازک سی زبان خشک نہ ہو جائے اِس لئے میں نے اُسکی تقریر کا سلسلہ منقطع کر دیا اور کہا۔

"اُستاد! تم تو ایک مسلّم لیڈر کے تمام اوصاف رکھتے ہو، میرا مطلب ہے اچھی تقریر کر سکتے ہو۔ قوم کی جان پہ بنے تو جان بچا کر بھاگ سکتے ہو ——— ہے نا ٹھیک؟"

وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرایا اور ذرا بے تکلف ہوتے ہوئے بولا۔

آپ نے ٹھیک سمجھا۔ میں اپنی قوم کا سالار ہوں۔ سالا آپ کی قوم م... میں اُن میں سے کئی ایک کو تو میں بھی جانتا ہوں اِس لئے کہ وہ ہماری رکھتے ہیں۔ اس بات پر آپ حیران ہوں گے مگر حقیقت ...انوں میں کئی گُنے۔ لیڈر۔ سانپ۔ شیر اور دوسرے جانور

ہوتے ہیں اُسی طرح مچھر بھی ہوتے ہیں۔ بالکل اُسی طرح ہم جانوروں میں بھی آپ کو کئی انسان ملیں گے لیکن پہچاننے والی نگاہ ہونی چاہیئے۔ باتوں باتوں میں موضوعِ گفتگو گم ہوتا جارہا ہے اس لئے میں اِسی موضوع پر چند منٹ آپ کے ضائع کروں گا ___ میں کل اور آج سارا دن تمام شہر کا طواف اسی غرض سے کرتا رہا کہ سیشن ختم ہونے تک چار پانچ دنوں کیلئے کوئی قابلِ رہائش جگہ تلاش کی جائے۔ اِس آوارہ گردی کے طفیل کئی طرح کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ آپ کی دلچسپی کے لئے اگر کہیں تو عرض کروں ___ ہاتھوں میں سرسوں جمتی ہوئی نہ دیکھی ہو تو اب دیکھ لیں۔ صرف تین دنوں میں ایک خاص راستے میں پڑتے ہوئے تمام چوراستے میں بنے ہوئے پکے گول دائروں میں فوارے لگ گئے ہیں اور سبز گھاس کی چادریں بچھادی گئیں ہیں۔ ہر فیکٹری اور انڈسٹری کے سامنے دُلہن کی طرح سجے ہوئے بڑے بڑے دروازے لگا دیئے گئے ہیں۔ باہر سے آنے والے نیتاؤں اور مہمانوں کے ٹھہرنے کے لئے خوبصورت عمارتیں تو بنی ہی ہیں۔ اُس لڑکیوں والے سرکاری اسکول میں جہاں پڑھنے والی بچیوں کے لئے سرمایہ کی کمی کی وجہ سے کمرے تک نہیں تھے وہاں پچاس ہزار روپے خرچ کر کے فلش سسٹم لیٹرینیز صرف چار دن کے لئے بنی ہیں۔ خدا کی قسم آپ دیکھیں تو دنگ رہ جائیں ___ کاش یہی کوارٹروں کی شکل میں ہمیں الاٹ کردی جائیں۔ ہمیں سڑکوں پر چلنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اب دیکھتا ہوں جا بجا چوڑی چکنی سڑکیں دن رات کام کر کے تیار کردی گئیں ہیں تاکہ آپ کے لیڈروں کی کاریں پھسلتی چلی جائیں۔ لیکن فضول خرچی سے بچنے اور خزانہ پر غیر معمولی بوجھ نہ ڈالنے کی وجہ سے صرف وہی سڑکیں اور راستے بنائے سجائے گئے ہیں جن پر سیشن کو جانے والے نیتاؤں کو آنا جانا ہے یا پارٹی کے پردھان کا جلوس نکلنا ہے باقی راستے کسی عاشقِ مجبور کے دل کی طرح ہی اُجڑے ہوئے اور ویران ہیں!"

سالار صاحب کو یقین دلانے کیلئے کہ میں اُنکی داستان سنتے سنتے سو نہیں گیا بلکہ ہمہ تن گوش ہوں میں نے لقمہ دیا۔

"اے اپنی قوم کے محبوب رہنما! تو شاعر بھی معلوم ہوتا ہے۔ واہ واہ کیا نادر تشبیہات سے اپنی تقریر کو سجا سنوار رہے ہو مزہ آجائے اگر تمہیں بھی دس بیس منٹ سیشن میں بھاشن کے لئے مل جائیں۔" میری بات سُن کر وہ گنگنانے لگا اور سوچا یا بولا۔

"مجھے وہاں بھاشن کے لئے وقت مل جائے؟ ارے صاحب میرے نام سے نالاں ہیں وہ لوگ میری شکل سے نفرت ہے انہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرنے والے، بلیک مارکیٹیئے، رشوت خور، غیر ملکی ایجنٹ، سامراجی ممالک کے چندے پر گذر بسر کرنے والے اور نہ جانے کیا کیا کرنے والے بھیس بدل بدل کر انکی بغل میں نہ جانے کب سے بیٹھے ہیں اُنھیں تو وہ پہچان نہیں سکتے ہیں مگر ہم صرف ہم لوگ ہی اتنے روسیاہ ہیں کہ ان کے منہ نہیں لگ سکتے۔ کیوں؟ صرف اِس لئے کہ ہم ایک قطرۂ خون پر زندہ ہیں جو ہماری خوراک ہے ملاوٹ کے اِس دَور میں اب خون بھی خالص نہیں ملتا۔ آپ ذرا اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہی بتائیں کیا ہماری قوم کی صحت کم، نشوونما کا خیال ہے کسی کو ___ عام طور پہ ہماری صحت کا موازنہ آپ اپنے ہاں کے نئی نسل کے شعراء کے ذہنی ارتقاء سے کر سکتے ہیں ورنہ ہمارے احسانات اگر نسلِ انسانی یاد کرلے تو شرم سے منہ ڈھک لے۔ شاید ہمیں اپنے قریب پاکر اکثر اِسی لئے منہ پہ چادر تان لیتے ہیں، آپ لوگ۔ آپ کے سماج کو ہماری وجہ سے جو سہولیات اور فوائد ہیں اُن سے آپ کو تو انکار نہ ہوگا؟"

میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اُن کی تفصیل چاہی تو حضرت مچھر نے جو ابھی تک میری ناک کی نوک پر تشریف رکھے ہوئے تھے ایک انگڑائی لی اور پھر اپنی بادامی سی آنکھوں کو ذرا بھیچ کر بولے۔

"سب سے پہلے تو آپ مچھر دانی ہی کو لے لیں۔ کیا مچھر دانی کا مصرف صرف ہم سے بچنے تک ہی ہے یا محض بہانہ؟ ہم نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے اُس کی آڑ میں لوگ کیا کیا نہیں کرتے۔ پھر ایک ہی کمرے میں دوسرا کمرہ ہمارے نام پہ چشم زدن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر جواب دیں۔ جہاں جہاں ہمیں بے روک ٹوک آنے جانے کی آزادی ہے وہاں کبھی چوری چکاری ہوئی۔ صاحبِ خانہ کو کبھی غفلت کی نیند نہ سونے دینا اعلیٰ قسم کی چوکیداری نہیں؟ ہمارا سماجی و ثقافتی رشتہ غریب ہی طبقہ سے ہے اور فیکٹری کے عام مزدور جو گھڑی رکھنے کی توفیق نہیں رکھتے ہماری ہی خدمات سے فائدہ اٹھا کر صبح وقت پہ اپنے کام پر پہونچ جاتے ہیں۔ اور شنو مہان لوگوں کے ہاں کبھی رات بھر ٹھہرنے کا حوصلہ نہیں کرتا اِس مہنگائی کے زمانے میں اِس سے بڑھ کر امداد اور کیا ہو۔ مگر طبی طور پر اور صحتِ عامہ کی خدمت کا ذکر کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ غور کیجئے جس جس پر ہماری نظرِ کرم مسلسل رہتی ہے وہ بلڈ پریشر جیسے موذی مرض سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جاتا ہے اب آخر میں فنِ موسیقی کے متعلق میں کچھ نہ کہوں گا آپ ہی کے منہ سے سننا چاہوں گا۔"

نسلِ انسانی پر اِن کے احسانات کی فہرست شاید اور بھی طویل ہوتی لیکن یہاں میں نے اِس عظیم قوم کے عظیم رہنما سے تھوڑے دھوکا دہی کی، وہ یہ کہ اُن سے اجازت لئے بغیر آنکھیں بند کر کے سونے کا بہانہ کر کے یوں پڑ گیا جیسے ہمیں سو گئے داستاں سنتے سنتے ...."

غزلیں

مسعودہ حیات ایم۔ اے۔ بی ٹی

مہر و کرم نہیں ہے کسی پر، جفا تو ہو
دُنیا میں کوئی رسمِ محبت ادا تو ہو

حاصل ہوں زندگی کو محبت کی رفعتیں
راہِ وفا میں کوئی خوشی سے فنا تو ہو

ترکِ تعلقات کا شکوہ نہیں کہ تم
پیہم مری نگاہ میں جلوہ نما تو ہو

رنگینیوں میں ڈوب تو جائے فضائے دل
لیکن نگاہ میں کوئی رنگیں ادا تو ہو

سورج نہ بن سکو تو چراغ گزر سہی
جینے کا اس جہاں میں کوئی مُدعا تو ہو

تم بھی نہ رہ سکو گے کبھی بے نیازِ غم
اک دن ہمارے سایۂ دل سے جدا تو ہو

بربادیٔ حیات بھی اک داستاں بنے
میرے جنونِ عشق کی اتنی سزا تو ہو

آزاد گورداسپوری بی۔ اے

بہت ہوتی ہے سینے میں جلن جب تم نہیں ہوتے
محبت اوڑھ لیتی ہے کفن جب تم نہیں ہوتے

فضا محفل کی سُونی سُونی سی محسوس ہوتی ہے
بصد غمزہ شریکِ انجمن جب تم نہیں ہوتے

ستاروں کی چمک بھی دل پر اک بجلی گراتی ہے
ستاتا ہے مجھے چرخِ کہن جب تم نہیں ہوتے

نہ غنچے مسکراتے ہیں نہ سبزہ لہلہاتا ہے
نظر آتا ہے اُجڑا سا چمن جب تم نہیں ہوتے

کسی سے بات کرنے میں بھی دل پر چوٹ لگتی ہے
نہیں ملتا مجھے لطفِ سخن جب تم نہیں ہوتے

ترانہ لب تک آتا ہے تو بن جاتا ہے اک نوحہ
خوشی ہوتی ہے پامالِ محن جب تم نہیں ہوتے

غزل پڑھنے کو تو آزاد پڑھا آتے ہیں محفل میں
نہیں ملتی مگر دادِ سخن جب تم نہیں ہوتے

رضا وارثی

جس کو دیکھو، دیکھتا ہے اب حریفانہ مجھے
کہہ دیا کیوں مسکرا کے تم نے دیوانہ مجھے

تم یہ کیا جانو کہ مجھ میں تابِ نظارہ نہیں
تم نظر آئے ہی کب ہو بے حجابانہ مجھے

میں نے بربادی کا وہ معیار قائم کر دیا
دیکھتا ہے اب بڑی حسرت سے ویرانہ مجھے

آج احساسِ تباہی رہ گیا منہ دیکھ کر
موجِ صہبا لے اُڑی بے اختیارانہ مجھے

اے غمِ جاناں مبارک ہو یہ سعی کامیاب
کہہ رہے ہیں اب تو دیوانے بھی دیوانہ مجھے

جب تصور میں کبھی کرتا ہوں اُن سے گفتگو
دیکھتی ہے آرزوئے دل، رقیبانہ مجھے

رہ گیا کچھ دن جو سرمستی کا یہ عالم رضا
پیرِ میخانہ کہیں گے اہلِ میخانہ مجھے

اختر واصفی

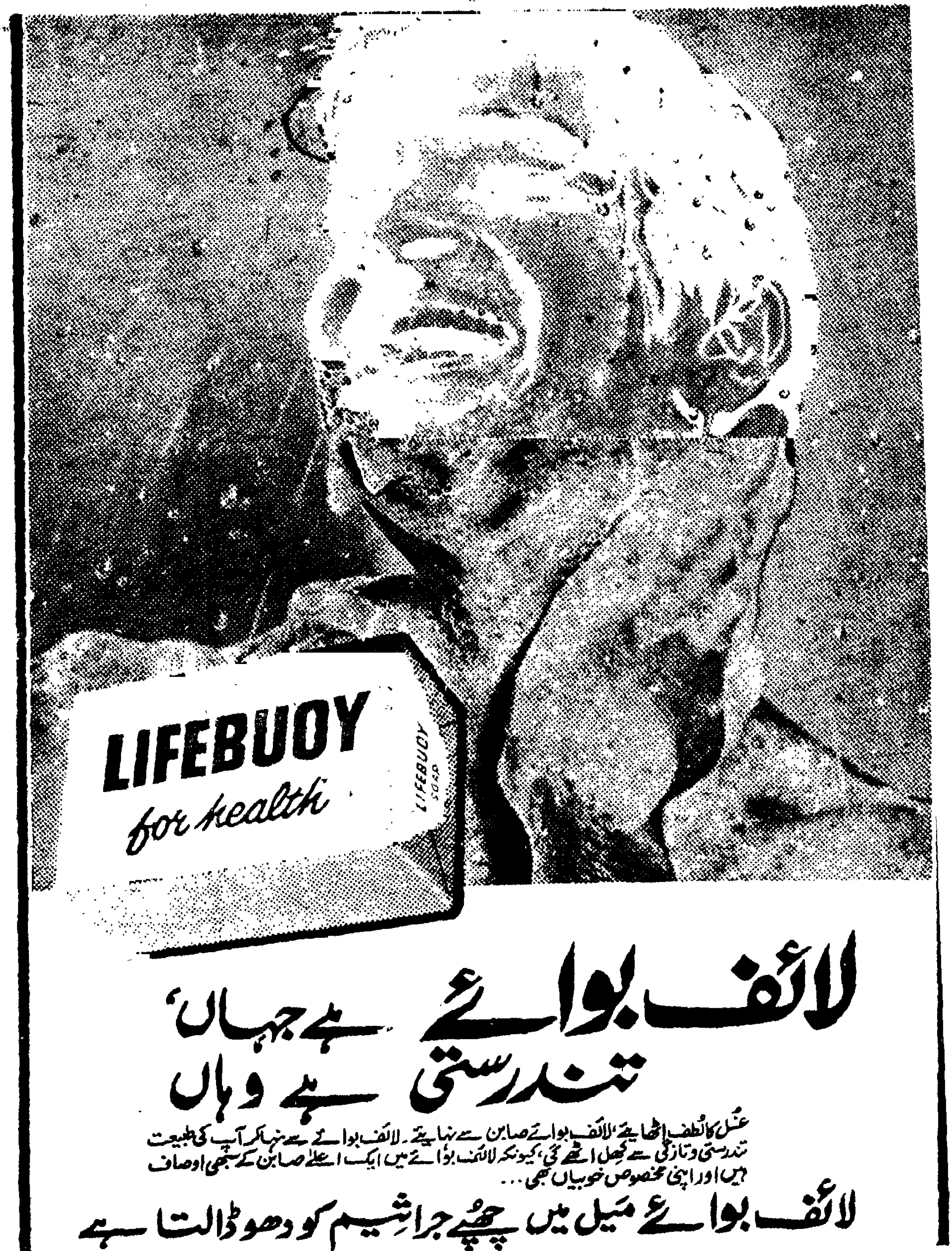
عمر بھر میں جذبِ اُلفت کچھ تو کام آ ہی گیا
موت سے قبل اُن کے آنے کا پیام آ ہی گیا

ناز تھا پردہ نشینی پر جسے، وہ دیکھنا!
رقصِ بسمل دیکھنے بالائے بام آ ہی گیا

کوششیں کیں لاکھ اخفائے محبت کی مگر
"بیخودی میں میرے لب پر اُن کا نام آ ہی گیا"

کیا کہوں وہ پوچھتے ہیں کس سے اُلفت ہے تمہیں؟
جس سے میں ڈرتا تھا وہ نازک مقام آ ہی گیا

فیضِ واصف کے تصدق اخترِ تک بند کو
کہتے کہتے کچھ نہ کچھ طرزِ کلام آ ہی گیا



بیسویں صدی دہلی اگست ۱۹۶۹ء

افسانہ

ایک لیڈر کی ڈائری

شین مظفر پوری

ہفت روزہ ”ہاتف“ مراد پور۔ پٹنہ نمبر ۴

خوشتر بھائی! آداب و نیاز

آپ نے ناچیز سے ”شاہکار“ کی فرمائش کی تھی، سو میں کہاں سے لاؤں۔ کہیں آپ کے شہر میں ”شاہکار“ کے لیبل کی دُکان ہو تو ایک خرید کر اس پر چپکا دیجئے گا! دُکان تو میرے شہر میں بھی ہے، مگر ”پرمٹ سسٹم“ ہے۔ اس لئے مجبور ہوں ——— ایک ضروری بات نوٹ کر لیجئے۔ دو تین سال سے ضرورتاً اور مصلحتاً میں اپنا نام ”ش۔ مظفر پوری“ کی بجائے شین مظفر پوری لکھنے لگا ہوں۔ کتابت میں سہو نہ ہونے پائے . . .

آپ کا دیرینہ نیاز مند ——— شین مظفر پوری

۲؍اکتوبر ۱۹۶۸ء

آج گاندھی جینتی ہے اور خوش قسمتی یا بد قسمتی سے آج پھر واقف نے ایک زبردست طعنہ دیا ہے۔ میری واقف کی یہ عادت پیدائشی ہے۔ انسان کی جو خوبی یا خامی پیدائشی ہوتی ہے وہ اُس کی دوسری ساری اچھی بُری صلاحیتوں اور خوبیوں پر غالب ہوتی ہے۔ میری واقف بھی طعنہ زنی میں اِتنی ایکسپرٹ ہے کہ بس ایک ذرا زبان ہلا کر چشمِ زدن میں آدمی تو آدمی تلوار تک کی آب اُتار کر رکھ دیتی ہے۔ بس آدمی تلملا کر رہ جاتا ہے۔ بڑے سے بڑے کمال اور بڑے سے بڑے جوہر بڑی سے بڑی خوبی پر اپنے کسی ریمارک سے ایسا بھرپور حملہ کرتی ہے کہ سب کچھ آنِ واحد میں مٹی کا ڈھیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ طعنہ زنی میں اُس کی مہارت کا اِتنا شہرہ ہے کہ کتنی ہی بیبیاں اور بیسیں اُس کی صحبت میں رہ کر ٹریننگ حاصل کرتی ہیں تاکہ بوقتِ ضرورت ایک ہی ضرب کاری سے دشمن کو ڈھیر کر دیں۔

کسی پہنچے ہوئے بزرگ کے متعلق ایک مشہور روایت ہے کہ انھوں نے پبلک میں تو اپنے کشف و کمال کی دھاک بٹھا رکھی تھی مگر بیوی کے سامنے گھر کی مُرغی دال برابر جیسے تھے۔ بیوی کو اپنے کمالات کا قائل نہ کر سکے۔ وہ ہمیشہ اُن کے نہلے پر دہلا لگا دیا کرتی۔ آخر تنگ آکر وہ بزرگ اچانک بیوی سے رُوپوش ہو گئے۔ مگر چند دِنوں بعد تھک ہار کر پھر گھر لوٹ آئے۔ بیوی نے دیکھتے ہی اپنا تیر پھینکا ”میاں بڑے صاحبِ کمال بنے پھرتے ہو۔ جب موقع آیا تو پہلے ہی سے کہیں چل دئے۔ ذرا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تب کہتے کہ ہاں کمال اِسے کہتے ہیں! سارے شہر میں ہر طرف چرچے ہو رہے ہیں۔ کل ہی کوئی نامعلوم بزرگ ہوا میں اُڑتے ہوئے دیکھے گئے۔“ بزرگ صاحب کی تو باچھیں کھِل گئیں کہ بس آج بیوی پر بھی اُنھوں نے اپنی فتح کا جھنڈا گاڑ دیا۔ بڑے فخر سے بولے ”بی بی، وہ خوش نصیب تو میں ہی تھا!“ — تب بیوی نے جھٹ کہا ”جبھی میں کہوں کہ یہ لنگڑا لنگڑا کر ٹیڑھا میڑھا کون اُڑ رہا ہے! اِس سے اچھا تو کوّا اُڑتا ہے ———“ اِس جواب کو سُن کر بزرگ نے پھر جنگل کا رُخ کیا۔

میری واقف بھی انھیں بزرگ کی سالی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میں جنگل کا رُخ کرنے والا نہیں۔ میں تو خود اُسی کو جنگل بھیج کر دم لوں گا۔ میں بھی اپنے آپ کو طعنہ پُروف بنا چکا ہوں۔ پھر بھی ظالم کبھی کبھی اپنے ترکش سے ایسا بھی تیر نکالتی ہے کہ آدمی ہزار طعنہ پروف ہونے پر بھی مُرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔

مثلاً آج ہی اُس نے ایسی بات کہہ دی کہ کئی گھنٹے گزر جانے پر بھی میرا نروس سسٹم نارمل نہیں ہو سکا ہے۔ وہ تیر اب تک کلیجے میں پیوست ہے۔ آج گاندھی جینتی ہے۔ کل ہی میں نے گاندھی جی کی تعلیمات پر ایک سبق آموز بیان جاری کیا تھا۔ جسے کسی اور اخبار نے تو شائع کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ مگر روزنامہ ”بھارت ماتا“ نے اُسے پہلے صفحہ پر نمایاں جگہ دی ہے۔ اُس اخبار کو تو بہرحال حقِ نمک ادا کرنا ہی تھا۔ کیونکہ میں اُس کے ایڈیٹر کے گھر کی ہر تقریب میں شریک ہونا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں اور کسی تقریب میں ”خالی ہاتھ“ نہیں جاتا۔ آخر ہاتھ کو ہاتھ تو پہچانتا

ہی ہے! پھر یہ کہ اُس کا نیوز ایڈیٹر بھی میری گلہ ہے گلہ ہے کی خاطر تواضع اور پوشیدہ بخششوں یعنی (ہ ہزول) سے محروم نہیں۔ میری بیوی کو اخبار سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اِس لئے کبھی کبھی میرے پڑھنے سے پہلے بھی اخبار باسی ہوکر چولھے کی نذر ہوجاتا ہے۔ اُس کے خیال میں اخبار بینی میں وقت ضائع کرنے کی بجائے عمر کم نظر آنے کی ترکیبوں میں مشغول رہنا کہیں بہتر ہے۔ لیکن آج میں نے اپنے اخبار کو اُس کی نظر بد سے بچاکر بڑے اہتمام سے موڑ کر ناشتے کی میز پر کچھ اِس انداز سے رکھا کہ اُس کی نگاہ میرے نام پر پڑجائے اور وہ اشتیاق و تجسس کے ساتھ اخبار اُٹھاکر پڑھنے لگے۔

اور جب ناشتہ ختم ہونے تک بھی اُس نے اخبار کا کوئی نوٹس نہ لیا تو چائے پیتے ہوئے میں نے اُسے متوجہ کیا۔ ”سیاست میں مشہور ہونا بھی کیا مصیبت ہے۔

- یاد رکھو ہر شخص سے کان، آنکھ اور دل کے بارے میں باز پُرس ہوگی (کہ اُس نے اِن اعضاء کا استعمال صحیح کیا یا نہیں) جہاں حق آیا اور باطل گیا گزرا ہوا یقیناً باطل گریز پا ہے۔ (قرآنِ پاک)
- ایمان کے بعد افضل ترین نیکی اللہ کی مخلوق کو آرام پہنچانا ہے۔
(سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم)
- (اللہ کو ماننے کے بعد) بہترین دانائی لوگوں سے محبت کرنا ہے۔
(سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم)
- سب سے اچھا وہ انسان ہے جس سے انسانوں کو فائدہ پہنچے۔
(سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم)

اخبار والے تنگ کئے رہتے ہیں۔ گاندھی جینتی کیا آئی کہ . . .“

ابھی مُنہ کی بات مُنہ ہی میں تھی کہ میرا مُدعا بھانپ کر وہ بیچ ہی میں بول پڑی۔ ”ہاں ہاں سُنا ہے۔ بچے کہہ رہے تھے کہ پاپا کا بیان چھپا ہے۔ اخبار کا کیا ہے۔ اُس میں تو راشٹرپتی کی تقریر سے لے کر پاکٹ ماری تک اور میدانِ جنگ سے لے کر چھُرا ماری تک کی خبریں شائع ہوا کرتی ہیں۔ مجھے یاد ہے گذشتہ سال اپنے گھر کے سامنے ایک راہگیر کو پاگل کُتّے نے کاٹا تھا تو اُس کی خبر بھی اخبار میں چھپ گئی تھی۔ پھر ایک بیان ہی چھپ گیا تو کون سا بڑا تیر مار لیا۔“

واقف کی بات نے مجھے جیسے آدھا ہلاک کر دیا۔ مگر میں نے اپنا ردِ عمل ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ سنبھالا لے کر کہا۔ ”تاریخ بتاتی ہے کہ اکثر و بیشتر آدمیوں کی بیویاں اِسی ٹائپ کی گزری ہیں۔ یعنی چراغ تلے ہمیشہ اندھیرا رہا ہے۔“

واقف ذرا مُسکرائی۔ ویسا مُسکرانا ہر کسی کو نہیں آسکتا۔ صرف میری واقف کو آتا ہے۔ اُسی مُسکراہٹ کو ذرا اور واضح کر کے بولی۔ ”یہ تو آج مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ میں کسی بڑے آدمی کی بیوی ہوں۔ کم از کم اپنے پیچھے ایک ڈائری ضرور چھوڑ جائیے گا جس سے آپ کی آئندہ نسل کو پتہ چل سکے گا کہ خاندان میں کوئی بڑا آدمی بھی گزرا ہے۔ وہ بڑا آدمی ہی کیا جو اپنی ڈائری نہ لکھتا ہو۔ حالانکہ گاندھی جی کو اِس کا شوق نہ تھا۔“

میں نے واقف کو زیادہ مُنہ لگانا بہتر نہ سمجھا۔ کیونکہ گرہست شاستروں میں لکھا ہے کہ بیوی کو زیادہ مُنہ لگانے سے وہ مُنہ چڑھی ہوجاتی ہے۔ لیکن دل ہی دل میں اِتنا ضرور طے کر لیا کہ اب سے ڈائری لکھا کروں گا۔ کیونکہ بڑے آدمیوں کی ایک پہچان اِسے بھی مانا گیا ہے۔ گاندھی جینتی کے مُبارک موقع پر میں نے آج ہی سے اِس کی ابتدا کر دی ہے۔ کم از کم مرنے کے بعد تو اِس ڈائری کو پڑھ کر واقف محسوس کرے گی کہ وہ کتنے بڑے آدمی کی بیوی ہے کیونکہ ہندوستان میں آدمی کی خوبیاں مرنے کے بعد ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ اگرچہ میرے پروگراموں میں ابھی مرنا شامل نہیں ہے۔

---

۱۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء

معلوم نہیں واقف کو قبل از وقت کیسے پتہ چل گیا کہ میں الیکشن لڑنے والا ہوں۔ حالانکہ یہ بات تو ابھی اخبار والوں کو بھی معلوم نہیں۔ کیونکہ اِس کا فیصلہ پارٹی کی ایک انتہائی خفیہ میٹنگ میں ہوا ہے۔ پارٹی نے شرط رکھی ہے کہ ٹکٹ اُسی کو ملے گا جو پارٹی کے الیکشن فنڈ میں پانچ ہزار روپے کا عطیہ دے گا اور الیکشن بھی اپنے خرچ سے لڑے گا۔ آج واقف کے کانوں میں بُندے نہیں دیکھے تو پُوچھ بیٹھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کہنے لگی ”ایک نہایت منحوس خبر سُنی ہے کہ کسی دُشمن کے بہکاوے میں آکر آپ الیکشن لڑنے کو تیار ہوئے ہیں۔ جب خطرے کی اطّلاع مِل جائے تو آدمی کو حفظِ ماتقدّم کرنا ہی چاہئے۔ میں نے اپنے سارے زیور میکے بھجوا دئے ہیں۔“

”واقف کی اِس دُوراندیشی کا میں نے زیادہ بُرا نہیں مانا کیونکہ اُس کے زیوروں پر میری نیت بد نہ تھی۔ بلکہ میں نے اِس کا کچھ اور ہی بندوبست سوچا ہے آخر میرے پاس کچھ پوشیدہ بنک بیلینس بھی تو ہے۔ دو تین چھوٹی چھوٹی جائدادیں بھی تو ہیں۔ جن میں سے کسی کو رہن بھی رکھا جا سکتا ہے۔ الیکشن کا کاروبار کچھ ایسا بُرا بھی تو نہیں۔ ایک لگاؤ سَو پاؤ کا داؤں ہوتا ہے۔ مگر حیرت اِس بات پر ہوئی کہ اُس نیک بخت کو پارٹی کی اِتنی خفیہ بات کی بھنک کیسے مِل گئی!

ذرا زور دے کر پُوچھا تو کہنے لگی۔ ”وہ جو آپ کی پارٹی کے جنرل سکریٹری ہیں

شرما جی، اُن کی پتنی سے ایک مُوڈرن پارٹی میں ملاقات ہوگئی۔ وہ بے چاری بہت پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ بلبلا بلبلا کر کہہ رہی تھی کہ شرما جی ابھی دو سال پہلے جو الیکشن لڑے تھے اس میں ناکامی ہوئی سو ہوئی اوپر سے قرض کا بوجھ بھی پڑ گیا۔ آدھا قرض تو زیوروں سے ادا ہوا۔ ابھی آدھے کا بوجھ پڑا ہی ہے کہ پھر یہ مُوا مُردار کہاں سے درمیانی الیکشن آن پڑا ہے۔ اِس میں بھی لڑنے کو کمر کسے ہیں۔ مکان گروی رکھ کر۔ ذرا تم اپنے ہسبنڈ کو بھی تو سمجھاؤ کہ میرے ہسبنڈ کو سمجھائیں۔ وہ بھی تو لڑنے والے ہیں۔ تم انھیں بھی روکو ورنہ کان میں بُندے تک نظر نہ آئیں گے۔"

بات تو کسی دن کھُل ہی جاتی سو آج ہی کھُل گئی۔ لیکن میں نے وائف کو جھانسہ دیا "تم فکر نہ کرو۔ میں تم سے ایک پیسہ بلکہ ایک کوڑی بھی نہ لوں گا۔ مجھے تو پارٹی اپنے فائدے کے لئے اپنے خرچ سے لڑوا رہی ہے۔ پیسہ جیتنے والے کنڈیڈیٹوں سے نہیں ہارنے والے کنڈیڈیٹوں سے بطور شرمانہ و جرمانہ پہلے ہی وصول کر لیا جاتا ہے۔"

وائف بولی "کچھ بھی سہی۔ آپ الیکشن لڑ کر اپنا بھرم نہ کھولئے۔ آپ ہارے ہوئے تو ہیں ہی۔ آپ جبھی جیت سکتے ہیں جب کوئی مقابلے میں کھڑا نہ ہو۔ خود میں ہی کھڑی ہو جاؤں تو آپ کی ضمانت ضبط ہو جائے گی۔ کم از کم اپنے بال بچوں پر تو رحم کیجئے کہ وہ ہارے ہوئے کنڈیڈیٹ کی اولاد کہلا کر زمانے میں رُسوا نہ ہوں۔"

میری وائف بے وقوف اور پاگل ہے۔ وہ مجھے اتنا کم تولتی ہے تو اب میں اسے ایکدم سے منسٹر بن کر دکھا دوں گا۔ جوابِ جاہلاں باشد خموشی پر عمل کر کے میں نے اُسے کچھ اور تیر چلانے کا موقع نہیں دیا۔ کہاں تو میں نے سوچا تھا اُسے عورتوں میں کنویسنگ کرنے بھیجوں گا اور کہاں یہ ابھی سے میری جڑ کاٹ رہی ہے!

---

۲۵ نومبر ۱۹۶۸ء

کافی دنوں کے بعد آج ڈائری لکھنے کا موقع مل سکا ہے۔ اتنے دنوں میں دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہوگی جبکہ میری ڈائری میلوں پیچھے رہ گئی ہے۔ اِس بیچ میں جو گُزر گئی سو گُزر گئی۔ اُسے ڈائری میں کہاں تک قلم بند کروں۔ نئی باتیں اور وارداتیں ہی اتنی ہیں کہ پُرانی باتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ گزشتہ سوا مہینے کے دوران جو کچھ بیتی ہے وہ کچھ قابلِ تحریر بھی نہیں۔ اگر قابلِ تحریر ہو بھی تو قابلِ یقین نہیں۔ بقول شاعر ؎

ہم اپنی رُوداد کیا سُنائیں، ہیں اِس میں کچھ واقعات ایسے
اگر کوئی دُوسرا سُناتا، ہمیں سمجھتے کہ ہے فسانہ

مثلاً پہلی ہی الیکشن پبلک میٹنگ میں حریفوں کی سازش اور غنڈوں کی شرارت سے جُوتے چل گئے۔ اگر جُوتے محض عوام میں چلے ہوتے اور چوٹیں صرف پبلک کو آئی ہوتیں تب بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ مگر کچھ جُوتے اور چپّل راستہ بھول کر براہِ راست فدوی پر بھی آپڑے۔ جُوتے چلتے رہے، چپّل پڑتے رہے مگر پولیس کے ڈنڈے نہ چلے۔ ظالم پولیس بھی دشمنوں سے ملی ہوئی تھی اس لئے مجمع سے ہٹ کر بلکہ میدان چھوڑ کر خاموش تماشائی بنی رہی۔ پھر چند ہی دنوں بعد ایک اور پبلک جلسے میں تقریر کرنے گیا تو نوبت پتھراؤ اور ہاتھاپائی تک پہنچ گئی۔ کُرتے اور صدری کی دھجّیاں اُڑ گئیں۔ ایک جیب بھی دامن کے ساتھ جاتی رہی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ بٹوا دوسری جیب میں تھا۔ مگر غائب ہونے والی جیب میں وہ کانفیڈینشیل لیٹر ضرور تھا جو وائف کو اُس کی امّاں نے بھیجا تھا اور جو کسی طرح میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اُس خط میں وائف کی امّاں جان نے شوہر کو قابو میں رکھنے کے لئے نئے گُر کے ساتھ ساتھ سیاست سے باز رکھنے کے ٹوٹکے بھی درج کئے تھے۔

اب ایسی باتوں کو کوئی اپنی ڈائری میں کیا لکھے! ڈائری میں اتنا طویل ناغہ ہونے کا ایک سبب یہ تو تھا ہی، دوسرے ایک سانحہ بھی گُزر گیا۔ ایک دن میری ڈائری مقفل دراز سے پُراسرار طور پر غائب ہوگئی اور دو ہفتے تک غائب رہی! وائف سے پُوچھنے کی ہمّت نہ پڑی کہ ڈائری نویسی کا راز فاش ہو جائے گا۔ البتہ ایک آئیڈیا یہ آیا کہ تھانے میں ڈائری کی گمشدگی کی رپٹ لکھوا دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کہیں تھانے والے جائے وقوع یا موقعِ واردات کا جائزہ لینے پہنچ گئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ وائف اِسے اپنی دیانتداری اور ایمانداری پر ڈائرکٹ ایکشن سمجھے گی۔ اِس لئے اپنی گمشدہ ڈائری کا داغ سینے میں چھپائے صبر کر گیا۔ گاندھی جینتی جیسے شبھ دن سے ڈائری شروع کرنا بھی کچھ اچھا شگون نہ ثابت ہو سکا۔

- کسی کا دل دُکھانا سب سے بڑا پاپ ہے۔ (شری کرشن جی)
- چاندی بظاہر سفید ہوتی ہے لیکن ہاتھوں اور دل کو سیاہ کرتی ہے۔ (پرم ہنس رام کرشن دیو)
- اُٹھو، جاگو، جب تک منزل نہ ملے چین سے نہ بیٹھو۔ (سوامی ویویکانند)
- نرم دل خالق کائنات کی سب سے بہتر تخلیق ہے۔ (مہاتما گوتم بُدھ)
- انسانیت کی بقا کے لئے امن ضروری ہے۔ (شری جواہر لال نہرو)

مگر آج یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ڈائری جہاں سے غائب ہوئی تھی پھر جوں کی توں وہیں موجود تھی! اس جاسوسی گورکھ دھندے کو دیکھ کر میرا تو دماغ چکرا گیا۔ اب مجرم کا سراغ لگانے کے لئے میں پولیس ڈاگ کی خدمات حاصل کرنے سے تو رہا۔ لیکن جب ڈائری کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا تو ایک بار پھر چونک پڑا۔ کیونکہ میرے لکھے ہوئے کے بعد اس میں کسی اور کا لکھا ہوا بھی ایک صفحہ نظر آیا۔ سوچنے لگا کسی جن یا بھوت نے یہ حرکت کی ہے یا کچھ اور ماجرا ہے؟ تحریر دیکھ کر پہلی نظر میں تو یہی گمان گزرا۔ لیکن جن بھوت کو تو کچھ خاص لکھنا پڑھنا آتا نہ ہوگا۔ ایسا ٹیڑھا میڑھا، کٹا چھٹا، ادھ کچرا تو جن بھوت ہی لکھتا ہوگا۔ مگر پڑھنے پر معلوم ہو گیا کہ بھوت گھر ہی کا ہے! اس شرارت کے پیچھے یقیناً وائف کا ہاتھ ہے۔ اس نے تیسری جماعت میں پڑھنے والے اپنے پپّو سے اس پر لکھوایا تھا۔ وہ صفحہ تو میں نے نکال کر پھاڑ ڈالا ہے۔ مگر اس میں کچھ اس قسم کی باتیں لکھی تھیں۔

"جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے اور جب شریف آدمی کی شامت آتی ہے تو وہ سیاست کا رُخ کرتا ہے اور جب خود سیاست کی شامت آتی ہے تو وہ پپّو کے ڈیڈی جیسوں کے ہاتھ لگ جاتی ہے! جیسے بندر کے ہاتھ کہیں سے ریزر بلیڈ لگ جائے اور وہ شیو بنانے کی کوشش کرے۔ سیاست کا ریزر بلیڈ وہی استعمال کرنا جانتے ہیں جنھیں جیب کاٹنے کا فن بھی آتا ہو ــــــ" اس کے علاوہ کچھ ایسی باتیں بھی لکھی تھیں جنھیں ڈائری میں ریکارڈ کرنا شایانِ شان نہیں۔ بلکہ قرینِ مصلحت بھی نہیں مثلاً "گھر کی نحوست اب قوم پر طاری ہونے والی ہے۔ جس قوم کی قیادت اور خدمت پپّو کے پتا کرتے ہوں خدا اس قوم سے پپّو کی ممّی کو خارج کر دے ــــــ" ایسی اور بہت سی باتیں۔

آج وائف رہ رہ کر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی رہی۔ اگر ظالم صرف دیکھتی ہی رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا مگر غضب یہ تھا کہ وہ دیکھنے کے ساتھ ساتھ مُسکراتی بھی جاتی تھی۔ اُس مُسکراہٹ کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ اگر وہ فلم لائن میں چلی گئی ہوتی (کاش، چلی ہی گئی ہوتی!) تو اپنے زمانے کی مشہور ترین ویمپ ثابت ہوئی ہوتی۔ مگر عزت و عافیت اسی میں ہے کہ میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لوں۔ کیونکہ میری ڈائری کا معاملہ تو غالب کے محبوب کے خط جیسا ہے۔

۷ر دسمبر ۱۹۶۸ء

آج شہر میں ہماری پارٹی کا زبردست الیکشنی جلوس نکلا۔ ہاتھی گھوڑے اور باجے گاجے کے ساتھ۔ انتظام تو ہم نے کچھ اور بھی کیا تھا۔ بمبئی کی ایک فلم ڈانسر اور ایک قوّال پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ تاکہ جلوس کے ساتھ ساتھ ڈا[illegible]س بھی ہوتا جائے اور قوّالی بھی چلتی رہے۔ پبلک کے شوق اور ذوق کا خیال تو سیاست میں بھی رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ جلوس کے ساتھ کوئی ایسی دلچسپی تو ہونی ہی چاہیئے جو پبلک کو کچھ دیر کے لئے بازار کا بھاؤ یاد کرنے کا موقع نہ دے۔ کیونکہ جلسہ جلوس کے موقع پر اگر پبلک کو لیڈروں کے وعدوں اور بازار کے کمر توڑ (بلکہ گردن مروڑ) بھاؤ کا خیال آجائے تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو کر رہ جائے۔ اس لئے ہم نے جلوس کو ایک شاندار تماشا بنانے کی ہر ترکیب پر غور کر لیا تھا۔ مگر بُرا ہو پولیس والوں کا کہ جلوس کے ساتھ ناچ گانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ عُذر یہ تھا کہ بمبئی والی چنبیلی جان کو رواں دواں دیکھ کر پبلک کنٹرول سے باہر ہو جائے گی اور شہر کا لا اینڈ آرڈر درہم برہم ہو جائے گا۔ بڑی مشکل سے دو ہیجڑوں اور چار ٹیڈی لونڈوں کو جلوس کے ساتھ "ٹوِسٹ" نچوانے کا پرمٹ مِلا۔ مصیبت یہ ہو گئی کہ جلوس کے ساتھ ٹوِسٹ ڈانس کا کمال دکھلانے کے لئے شہر کے ایک ہزار ٹیڈی لونڈوں کی درخواستیں اُستاد اور والدین کی تحریری سفارشات کے ساتھ موصول ہو گئیں۔ انتخاب مشکل ہو گیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ کسی کو محروم نہ کیا جائے۔ ایک ہزار ٹیڈیوں سے شان بھی دوبالا ہو جائے گی، تعداد بھی بڑھ جائے گی۔ پبلک بھی اپنے ہونہاروں اور نونہالوں کا کمال دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ آگے آگے ہاتھی، اُن کے پیچھے گھوڑے، اُن کے پیچھے ہیجڑے اور ہیجڑوں کے پیچھے قوم کے جگر کے ٹکڑے (یعنی ایک ہزار ٹکڑے) ہِسٹریا کے دَورے کا فنکارانہ مظاہرہ کرتے ہوئے، اُن کے پیچھے قائدین (بشمول فدوی) اُن کے پیچھے ورکر اور راہ گیر وغیرہ ــــــ واہ واہ، کیا سماں، کیا نظارہ، کیا تماشا تھا۔ جلوس کے دونوں طرف فٹ پاتھ پر، چھتوں اور چھجوں پر تماش بیں پبلک کا ہجوم تھا۔ کیا جوان، کیا بوڑھے، کیا مرد، کیا عورت اور کیا بچے۔ سب کے سب ہم پر نچھاور ہوتے جا رہے تھے۔ ایک طرف ہمارے نعرے لگ رہے تھے۔ دوسری طرف پبلک کے چہرے پر اُمید کی سُرخی جھلک رہی تھی۔

کچھ دُور تک تو جلوس مست اور مگن نہایت خیر و عافیت سے گزرتا رہا۔ لیکن جوں ہی جلوس تیسرے موڑ پر پہنچا تو عقدہ کُھلا کہ پبلک کے چہرے پر اُمید کی نہیں بلکہ غصّے کی سُرخی تھی۔ دشمنوں اور حریفوں نے ہمارے خلاف اُن کے کان بھر کر اندر ہی اندر غصّے کو بھڑکا رکھا تھا۔ جلوس اپنے شباب پر پہنچا ہی تھا کہ ایک کوٹھے سے چار پانچ گندے انڈے ایک ساتھ ہم پر گرے۔ ہم خاموشی

ے آگے بڑھتے رہے۔ پھر اچانک دونوں طرف کے مکانوں سے پرانے جوتوں، چپلوں، سڑے ٹماٹروں اور اکا دکا انڈوں کی بوچھار ہونے لگی۔ جن کے پاس کچھ نہ تھا وہ کوڑا کرکٹ ہی پھینکنے لگے۔ جلوس کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہمارے چند بگڑے دل نوجوانوں نے سماج دشمن عناصر کو للکارا تو پولیس نے صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے اُلٹا ہمیں پر لاٹھی چارج کر دیا۔ جس سے ہمارے کچھ ورکر زخمی ہوگئے اور ایک ورکر شہید ہونے سے بال بال بچ گیا، کیونکہ ہسپتال نزدیک ہی پڑتا تھا۔

ہماری یہ قربانیاں رنگ لاکر رہیں گی اور ہم الیکشن میں اپنا رنگ جما کر رہیں گے۔ ہم دکھی جنتا یعنی مظلوم پبلک کا بھلا کئے بغیر دم نہ لیں گے۔ پبلک کی خدمت کرنے سے ہمیں دُنیا کی کوئی طاقت باز نہیں رکھ سکتی —— یہاں تک کہ والف بھی نہیں! اور اب میں اپنی ڈائری بھی چھپا کر نہ رکھوں گا، کھلے عام میز پر رکھوں گا۔ دیکھوں کوئی پڑھ کے میرا کیا بگاڑ لیتا ہے!

(نوٹ:۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ میں ذرا جوش میں آکر لکھ گیا ہوں۔ ورنہ اپنے اِس فیصلے پر فوری نظرِ ثانی کرتے ہوئے فی الحال چیلنج واپس لیتا ہوں۔ الیکشن کے بعد دیکھا جائے گا۔ کیونکہ اس طرح جوش اور جذبات میں آجانا الیکشن کی اسٹریٹجی کے خلاف ہے۔ ابھی تو الیکشن تک کتنے ہی مقاماتِ آہ و فغاں پڑے ہیں!)

۲۶ر دسمبر ۱۹۶۸ء

آج باتوں باتوں میں والف سے زبردست جھگڑا ہوگیا۔ غصے میں برتن توڑنے اور بچوں کو ڈانٹنے سے لے کر پیٹنے تک کی نوبت آگئی۔ بنائے فساد والف کی یہ فرمائش تھی کہ میرے بھائی کو بھی اپنی پارٹی سے الیکشن کا ٹکٹ مع پانچ ہزار نقد دلوا دیجئے۔ جیتے گا تو کیا خاک، البتہ دو تین ہزار روپے کی اُسے بچت ہوجائے گی —— اِس پر میں نے اُس کے دماغ کا بھوسہ نکالنے کی کوشش کی تو وہ بگڑ گئی۔ بلکہ لڑ گئی۔ آج میں بھی پیچھے نہ ہٹا۔

سوچتا ہوں اپنی طرف سے صلح صفائی کی پیش کش کروں یا نہ کروں۔ ابھی کچھ طے نہ کر پایا کہ الیکشن کے دوران بیوی سے فرصت پائے رہنا، یعنی بول چال وغیرہ بند رکھنا کہاں تک مفید اور کہاں تک مضر رہے گا۔ کسی تجربہ کار کامریڈ سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کر دوں گا۔ الیکشن کے دنوں میں تو پہلے بھی بیوی سے کتنوں ہی کے جھگڑے ہوئے ہوں گے۔

۲۸ر دسمبر ۱۹۶۸ء

آج والف سے غیر مشروط صلح ہوگئی۔

آہ! روش کماوشاد

ایم ایچ ۔ رہبر انصاری ہاپوڑی

جس کے ماتھے پہ پڑی رہتی تھی اُلفت کی شکن
جس کی تابانی سے تھی پُرکیف و دلکش انجمن
جس کے اندازِ بیاں میں تھا انوکھا بانکپن
جس کے سینے میں تھی کچھ پیکانِ اُردو کی چبھن
جس کی شانِ خوش نوائی رہگذاروں میں ملی
لاش اُس کی تیرتی جمنا کے دھاروں میں ملی

جس کی آنکھوں سے ٹپکتا تھا شعورِ بندگی
جس کے سانسوں کی مہک میں تھی نرالی دلکشی
جس کا ماتم آج کرتا ہے ہجومِ بیکسی
جس نے اُردو کے لئے کی وقف اپنی زندگی
جس کی شہرت جس کی عظمت پردہ داروں میں ملی
لاش اُس کی تیرتی جمنا کے دھاروں میں ملی

جس کے جذباتِ تمدّن میں تھی کچھ نفسانیت
جس کے اندازِ تبسّم میں تھی کچھ خودداریت
جس کی تھی تخلیق میں پوشیدہ شانِ عافیت
جس کے سازِ دل میں تھا اِک نغمۂ محبوبیت
جس کی شانِ بُردباری ماہ پاروں میں ملی
لاش اُس کی تیرتی جمنا کے دھاروں میں ملی

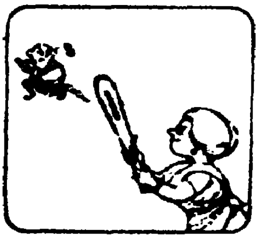
دوستوں نے مشورہ دیا کہ فوراً ہتھیار ڈال دو ورنہ یہ اعصابی جنگ تمھیں الیکشن میں لے ڈوبے گی۔ اگر ضرورت پڑے تو بچوں کی آنکھ بچا کر پاؤں بھی پکڑ لینا —— مگر خبردار بچے ہرگز نہ دیکھنے پائیں ورنہ وہ اپنی ولدیت میں باپ کی بجائے ماں کا نام لکھوانا شروع کر دیں گے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ سیاست میں والف بھی بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ بلکہ کچھ مثالیں ایسی بھی ملیں گی کہ جس کے پاس کارآمد والف ہے وہ سیاست میں زیادہ کامیاب ہے۔ اگر والف ایکدم ہی

سکڑے ہوئے لباس سے آپ کی شان میں فرق آتا ہے؟
"سینفورائزڈ" کو ساتھ لیجئے اور مسٹر شرنک کو مار بھگائیے

• SANFORIZED •
RECD TD MK



آپ کا لباس کبھی سکڑ کر تنگ نہ ہوگا اگر وہ ایسے سوتی یا سُوت ملے کپڑوں سے بنا ہے جن پر "سینفورائزڈ" کی چھاپ ہوتی ہے۔ یہ ٹریڈ مارک آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کی قابلِ اطمینان گارنٹی ہے۔ "سینفورائزڈ" چھاپ والے کپڑے کو سلائی سے پیشتر پانی میں بھگونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ "سینفورائزڈ" کا شہرت یافتہ نام بھارت میں بنے ہوئے کپڑے کی برآمدگی بڑھانے میں قابلِ قدر امداد کرتا ہے۔



گھریلو ٹائپ کی ہو تب بھی سیاست میں اُس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ وہ خانہ داری کے خرچ کے لئے تنگ نہ کیا کرتی ہو۔

دوستوں کی وارننگ کام آگئی۔ پاؤں پر گرنے کی نوبت تو نہ آئی، بس ایک نئی ساڑی سے کام چل گیا۔ یوں تو شاعر نے کہا ہے ؎

ایک تبسّم، ایک تجلّی، ایک نگاہِ بندہ نواز
اِس سے زیادہ اے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا کہیئے

لیکن یہ تبسّم وغیرہ والا معاملہ تو ہسبنڈ کے دل کے لئے ہے۔ وائف کے حق میں کبھی کبھی ایک عمدہ ساڑی ہی تبسّم کا کام کر جاتی ہے۔ ویسے بھی مرد کے تبسّم وغیرہ سے عورت ——— خاص طور پر وائف کچھ کم ہی متاثر ہوا کرتی ہے۔ چلو پچیس روپے ہی تو گئے! مگر مطلع صاف ہو گیا۔ ساڑی تو خیر قبول ہو گئی مگر "نگاہِ بندہ نواز" کا اُٹھنا ابھی باقی ہے۔ وہ بھی ہو جائے تو ذرا الیکشن کے ٹور پر نکلوں۔ پارٹی نے ٹور پروگرام بنا کر دے دیا ہے۔

اب تک تو الیکشن لڑواتے آئے تھے جب لڑنے کی باری آئی ہے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونے لگا ہے۔ پارٹی نے ٹکٹ بھی ایک دیہاتی حلقے سے دینا منظور کیا ہے، جہاں کے ووٹروں نے کبھی میرا فوٹو بھی نہ دیکھا ہوگا۔ خیر لڑنا ہے تو ڈرنا کیا!

---

۵ جنوری ۱۹۶۹ء

کل اپنے حلقۂ انتخاب کے ٹور پر نکلنا ہے۔ چار حریفوں کا مقابلہ ہے جن میں ایک تو بڑا زبردست ہے۔ جو اِس حلقے سے تین بار جیت بھی چکا ہے۔ ہماری پارٹی دراصل اُسی کا تختہ اُلٹ دینا چاہتی ہے۔ کیونکہ اسمبلی میں یہ ہماری پارٹی پر زبردست حملے کیا کرتا ہے۔ بلکہ وہ ہماری پارٹی کی دُکھتی رگیں پکڑنے کا اسپیشلسٹ مانا جاتا ہے۔ مگر اِس بار تو اُستاد کو لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے! ہماری پارٹی نے بھی چُن کر ایسا تگڑا کنڈیڈیٹ بھڑایا ہے جو چھٹی کا دُودھ یاد دلا دے گا! ——— یعنی فدوی بقلم خود! باقی جو تین کنڈیڈیٹ ہیں وہ تو چلتی ہیں۔ صرف اپنی اپنی پارٹی کا نام عوام میں مشہور یا بدنام کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔

آج کل وائف کا مُوڈ بھی ٹھیک چل رہا ہے اور اُس نے الیکشن تک طعنہ زنی سے باز رہنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ شرط یہ ٹھہری ہے کہ ضمانت کے ڈھائی سو روپے جو واپس ملیں گے وہ اُس کے ہوں گے۔ چلو سستے چھُٹے۔ ورنہ الیکشن میں دشمن کا مُنہ بند رکھنے کے لئے کنڈیڈیٹوں کو کیا کیا نہ کرنا پڑتا ہے!

آج میں نے پارٹی سے پُرانے وعدوں کی فہرست بھی لے لی ہے تاکہ تقریر کے دَوران وہ پھر نہ زبان چلانے پائیں۔ نئی ٹیکنیک کے ساتھ نئے وعدوں کی لِسٹ بھی ذہن نشین کرنی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نئے وعدوں میں فرقہ پرستی کو جڑ سے ختم کرنا بھی شامل ہے۔ اگر خدانخواستہ واقعی ایسا ہو گیا تو ہندوستانی سیاست کا سُہاگ اُجڑ جائے گا۔ پھر اِس بیوہ کا پُرسانِ حال کون ہوگا! جب سیاست کی مانگ کا یہ سیندُور ہی مِٹ جائے گا تو کیا دیکھ کر پبلک روٹی، کپڑے اور مکان کے مسئلہ کو بھُلائے رکھے گی؟ اِس وعدہ کے لئے تو ایسے محتاط اور ٹیکنیکل الفاظ کی ضرورت پڑے گی کہ جو بات فرقہ پرستی کو ختم کرنے کے لئے کہی جائے وہی اپنا اُلٹا اثر دکھائے۔ خیر یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اپنے سے بھی بڑے لیڈروں کے کچھ فنکارانہ بیانات پر اِک نظر ڈال لینا کافی ہوگا۔ بیچ بیچ میں مہاتما گاندھی کا نام تو ضرور ہی لانا پڑے گا جو سرمایہ دارانہ سیاست کا "منگل سُوتر" چھیننے کی کوشش میں خود اپنی ہی جان سے گئے!

---

۱۱ جنوری ۱۹۶۹ء

تین روز ہسپتال میں رہ کر آج گھر آنا نصیب ہوا ہے۔ ظالموں نے مارا سو مارا لیکن گھسیٹا بھی بہت۔ یوں تو ضربِ شدید اور ضربِ خفیف کا پُورا حال ڈاکٹری رپورٹ ہی میں ہے (جو فی الحال پارٹی کی تحویل میں ہے) مگر وائف کو میں نے صرف دو تین خفیف چوٹوں کا پتہ دیا ہے۔ وہ بھی یوں کہ جب حریف کے غنڈوں سے میٹنگ میں مار پیٹ ہونے لگی تو اپنے ورکروں کو بچانے کے جوش میں ایک، دو ہاتھ میں بھی سہواً کھا گیا۔ ورنہ پبلک کا یہ عالم تھا کہ مجھے ہتھیلی پر تو کیا، پلکوں پر اُٹھائے ہوئے تھی! (یہ بات تو میں نے وائف سے کہی ہے۔ ورنہ حقیقت یوں ہے کہ مجھے ہی پبلک کے ہاتھوں سے بچانے کی کوشش میں بیچارے ورکر بُری طرح پٹ گئے)

ٹریجڈی یہ ہوئی کہ میرے حلقۂ انتخاب کے کچھ دل جلوں نے "الیکشن بائیکاٹ کمیٹی" بنائی ہے۔ پرانے امیدواروں سے تو انھیں تلخ تجربہ ہو ہی چکا ہے۔ اب نئے امیدواروں کا نام انھوں نے "چور کا بھائی گرہ کٹ" رکھ دیا ہے۔ جہاں کہیں الیکشن کی میٹنگ ہوتی ہے وہاں ہڑبونگ کر دیتے ہیں۔

میرے ساتھ ایسا ہوا کہ میں جس میٹنگ سے خطاب کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اسی کی دوسری طرف سے بائیکاٹ کمیٹی کے چھوکرے رہ رہ کر لاؤڈ اسپیکر پر کورس گانا شروع کر دیتے تھے۔ جس کے بول کچھ یوں تھے ؎

جو میں ایسا جانتی کہ ووٹ دئے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ ووٹ نہ دیجیو کوئے!

چھوکروں نے اس قدر تنگ کیا کہ ضبط و تحمل سے کام لینے کے باوجود مجھے تاؤ آ گیا۔ پنڈت نہرو کے نسخے پر عمل کرتے ہوئے میں نے ہلڑبازوں کو ڈانٹ ڈپٹ کی دھونس میں لے کر شانت کر دینا چاہا۔ تاؤ میں مجھ سے کچھ سخت سست بھی نکل ہی گیا ہوگا۔ بس پھر کیا تھا، غنڈوں نے فلم "مغلِ اعظم" والی یلغار کر دی! آنجہانی پنڈت نہرو کے آزمودہ نسخے نے میری باری میں اپنا اُلٹا اثر دکھا دیا۔

مگر میں نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ میں پھر جاؤں گا۔ بار بار جاؤں گا! میرا اس حلقۂ انتخاب کا نمائندہ بننا وہاں کے ووٹروں کی قسمت میں لکھا ہوا ہے۔ یہ میرا قانونی اور آئینی حق ہے۔ مجھے وہاں جانے سے کون روک سکتا ہے! ضرورت پڑی تو میں بھیس بدل کر بھی وہاں جاؤں گا!

لیکن فی الحال تو مجھے ہسپتال واپس جانا چاہیئے۔ کیونکہ گھر میں اس سنگین چوٹوں کی تیمارداری کیسے ہو سکے گی جنھیں والفؔ سے میں نے مصلحتاً چھپایا ہے؟ دل کی چوٹ ہوتی تو دکھا دیتا، بدن کی چوٹ والفؔ کو دکھانا آئندہ کے لئے خطرے سے خالی نہیں۔

---

۱۴ فروری ۱۹۶۹ء

آہ ع

میں ہوں اور گوشۂ تنہائی ہے

ایسی تنہائی جہاں فرشتے تو کیا والفؔ بھی پر نہیں مار سکتی! آج میرے حلقۂ انتخاب کی پولنگ کا نتیجہ نکلا ہے۔ آج گویا میں کامیابی کے پہلے زینے پر پہنچ گیا۔ بزرگوں اور دانشوروں کا قول ہے کہ ہر ناکامی انسان کی کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ آج کی ناکامی نے میرے اندر کل کی کامیابی کے لئے ہمت ہی نہیں، ضد پیدا کر دی ہے! ۱۹۷۲ء کے الیکشن میں ثابت کر دوں گا کہ میں صرف ناکام ہی نہیں ہو سکتا بلکہ کامیاب بھی ہو سکتا ہوں! کیونکہ میں دوہری صلاحیت کا آدمی ہوں۔ ایک مکان رہن ہوا تو کیا ہوا۔ ابھی میرے پاس دوسرا مکان بھی تو ہے!

آج میں نے پہلی بار والفؔ کو بے چینی سے اخبار کا انتظار کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ جاننے کے لئے نہیں کہ میں ہارا یا جیتا؟ اس سلسلے میں تو اسے اپنی روشن ضمیری کا دعویٰ تھا ہی جس کا اظہار وہ کبھی کبھی دبی زبان سے کر دیا کرتی تھی۔ وہ صرف یہ جاننے کے لئے بے قرار تھی کہ ضمانت کا کیا ہوا؟ اتفاق سے وہ کم بخت بھی ضبط ہو ہی گئی۔ مجھے ۱۹۷۲ء میں اس کا بھی انتقام لینا ہے!!

بیادِ شاد ناشاد

ڈاکٹر کرشن گوپال مغموم بی۔اے

آہ اے شاد! شاعرِ ناشاد
جس کی تقدیر میں نہ تھی تکمیل
وُہ شبِ تار تھی قیامت کی
ماں کا آغوش بن گئی جمنا!
مے کشی ہی کی آڑ میں تُو نے
نامُرادی کی آخری حد پر
حیف! صد حیف! ہوگئی بے وقت
تیری سانسوں کا تار کیا ٹُوٹا
کچھ خبر بھی ہے؟ اُن پہ کیا گزُری
کرکے برداشت لغزشیں تیری
نقشِ غم خُوشتر گرامی ہیں
سَر خمیدہ ہے پہ چمِ اُردُو!
تیرے دل کے ہزار زخموں پر
تیری آنکھوں کی مُسکراہٹ میں
تیری آہوں میں کائنات کا سوز
تیرے اشکوں میں مُنعکس آفاق
بابِ فن میں تری جگر کاوی
حق تو یہ ہے کہ شاعری تیری
تیری غزلوں میں، تیری نظموں میں
تیری گُفتار میں کوئی دیکھے
تُو نے الفاظ کے ترنّم سے
فکرِ تابانِ جدّت آرا سے
ایک آہنگِ دلنواز کے ساتھ

شاملِ زندگاں ہُوا تُو بھی
ہائے! وُہ داستاں ہُوا تُو بھی
تیرگی جس کی کھا گئی تجھ کو
چین کی نیند آ گئی تجھ کو!
آپ اپنے سے اِنتقام لیا
مَوت نے بڑھ کے تجھکو تھام لیا
تیری آواز، دُور کی آواز
ٹُوٹ کر رہ گیا سُریلا ساز!
جو تجھے دِل سے پیار کرتے تھے
دَم رِفاقت کا تیری بھرتے تھے
اُن کی آنکھوں سے خُون جاری ہے
سوگواری سی سوگواری ہے
نمک افشاں رہا زمانہ بھی
آنسُوؤں کا تھا اِک فسانہ بھی
تیرا دَردِ نہاں ”ہے دردِ جہاں
تیرے نالوں میں کربِ بے پایاں
حاصلِ سوز و سازِ اُردو ہے
وجہِ صد فخر و نازِ اُردُو ہے
زندگی کا شباب رقصاں ہے
برقِ سوزاں، جَلالِ طُوفاں ہے
شعرِ اُردُو کو نغمگی بخشی
دِل کے جذبوں کو چاندنی بخشی
پڑ رہی تھی پھُوار نغموں کی

چھا گیا اب مہیب سنّاٹا!
کیا ہُوئی وُہ بہار نغموں کی؟


TF-69 UR
چائے جب بھی پیئیں
للِت چائے ہی پیئیں
Lalit
Lalit
TATA FINLAY
صبح ناشتے کے وقت — جب دن بھر کی دوڑ دھوپ میں تا
کے ساتھ نمٹنے کے لئے پیالی بھر چائے ضروری ہوتی ہے۔
تو یہی — ٹھیک للِت چائے کا وقت ہے۔
اس لئے للِت چائے اس ڈھنگ سے خاص طور پر مرکب کی گئی
کہ آپ میں حقیقی تازگی پیدا کرے، آپکی طبیعت پر
انشراح اور امنگ لائے جس وقت آپکو اس کی سب سے زیادہ
ضرورت ہوتی ہے۔ للِت چائے نہایت پسندیدہ قسموں
کی چائے سے بنائی جاتی ہے۔ اسی لئے اس کی خوشبو مرغوب
لذت میں بلند ہوتی ہے۔ اس کی پیالی بھر تیز چائے سچ مچ
تسلی بخش ہوتی ہے۔
للِت
چائے
جو واقعی تسکین بخش ہے
ٹاٹا۔ فِنلے کی چائے
سول سیلنگ ایجنٹس، دی ٹاٹا آئل ملس کمپنی لمیٹڈ

افسانہ

خوبصورت موڑ

رضیہ دستگیر ایم۔ اے

ناتال والا بلڈنگ ۔۱۰۔ا۔ کیڈل روڈ، ماہم بمبئی نمبر ۱۶

محترم خوشتر گرامی صاحب! تسلیم

طویل عرصے سے "بیسویں صدی" میرا محبوب صحیفہ ہے۔ ایک افسانہ "خوبصورت موڑ" لے کر میں بھی "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو رہی ہوں۔ اُمید ہے افسانہ پڑھنے کے بعد آپ پسند فرمائیں گے۔ افسانہ کے متعلق صرف اتنا کہونگی کہ مرضیہ کی خاموش محبت نے مجھے لکھنے کا inspiration دیا اور جب میں نے افسانہ پر نظر ثانی کی تو مرضیہ کے انجام پر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس لئے کہ یہ کردار صرف افسانوی کردار نہیں ہیں گوشت پوست کے انسان ہیں، جنہیں میں نے نہایت قریب سے دیکھا ہے ....

آپکی چھوٹی بہن ———— رضیہ

سردیوں کی سُہانی شام تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا دماغ کو فرحت اور دل کو سکون بخش رہی تھی۔ مرضیہ لان میں کرسی پر نیم دراز تھی۔ سکون کی متلاشی آنکھیں بند تھیں۔ اُس کا دلکش چہرہ نہایت ہی پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ مگر اس کے دل میں طوفان اُٹھ رہے تھے اور خیالات میں ہیجان بپا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی رضوان کی صاف گوئی، بے باکی اور حقیقت پسندی کے بارے میں اور اُس کی جلدبازی پر کفِ افسوس مل رہی تھی۔ پھر وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی اور اس لمحے کو بھی جبکہ اُس پر خود سپردگی اور وارفتگی کا عالم تھا اور وہ رضوان کے سامنے اُس کا اظہار کرنے سے باز نہ رہ سکی تھی .... نتیجہ .... رضوان کی طویل فلسفیانہ تقریر اور رُوکھا سا جواب! جس نے اُس کے شیشے کو پاش پاش کر دیا۔ وہ مجبور اور بے بس ہو کر شیشہ کی کرچیوں کو دیکھ رہی تھی جن کی چبھن وہ اپنے سارے وجود میں محسوس کر رہی تھی۔ وہ اُسے بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اُس کی یاد اور شدید ہو جاتی۔ آخر اُس نے سوچ لیا کہ وہ اپنے افسانۂ حیات کو ایک خوبصورت موڑ دے کر ختم کر دے گی۔ وہ اُسے بھول جائے گی۔
یاس بھری آواز میں وہ گنگنانے لگی

چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
.... وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اُسے ایک خوبصورت موڑ دیکر چھوڑنا بہتر ....

آنسو اُس کے رخساروں کو تر کر رہے تھے۔ یادوں کے چراغ اُسکے دل کی ویران وادی میں جھلملانے لگے۔ وہ سینٹ زیویرز کالج کی ذہین طالبہ تھی۔ انٹر آرٹس میں پڑھتی تھی۔ کالج کی extra activities میں پیش پیش رہتی۔ بزم اُردو کی سرگرم رُکن تھی۔ لڑکیاں اُس کی ذہانت پر رشک کرتی تھیں۔ لڑکے اُس کی تقریروں سے سحر زدہ ہو جایا کرتے۔ اُسکا دلکش اندازِ بیان، اندازِ گفتگو کی متانت اور ٹھہراؤ سُننے والے کے دل کو موہ لیتا۔ اُس کی متانت، سادگی، وقار اور ذہانت کیوجہ سے کالج میں تمام پروفیسر اور طلباء اُس کا احترام کرتے۔ وہ جہاں جاتی پُرتحسین نظروں سے دیکھی جاتی۔ کئی لڑکے اُس پر جان قربان کرنے کو تیار تھے وہ کسی کو لفٹ نہ دیتی تھی۔ وہ مشرقی بیٹی تھی جس کے مذہب میں کسی غیر مرد کا تصور بھی گناہِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔

لیکن ایک دن اُس کے بدن میں جھرجھری سی آئی آنکھیں کھل گئیں

چاروں طرف سناٹا تھا۔ ہوا خاموش ہو چکی تھی۔ فضا خاموش تھی۔ وہ بھی خاموش تھی۔ لیکن اُس کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ماضی کی وادی میں بھٹک رہی تھی ؎ —— ایک دن وہ کالج جانے کے لئے بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ بس آئی ایک ادائے محبوبی دکھا کر چلی جاتی۔ انتظار شدید ہوتا گیا۔ اُس نے بیزاری سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ وہ سہم گئی۔ اُس کی صبیح پیشانی پر پسینہ کے قطرے چمکنے لگے۔ وہ اُن نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ کوئی اُسے دلنواز مُسکراہٹ سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا وہ بھی مُسکرا دے۔ لیکن وہ مُسکرا نہ سکی۔ شرم وحیا سے اُس کے ہونٹ کھُل نہ سکے۔ بس آئی اُسے جگہ مِل گئی اور وہ وہیں رہ گیا۔ لاشعوری طور پر بس میں چڑھتے وقت اُس نے پیچھے دیکھا۔ وہ اسٹاپ پر کھڑا اب بھی مُسکرا رہا تھا۔ بس چلنے لگی لیکن اُس کی آنکھوں کی راہ سے دل میں اُتر کر اب بھی وہ مُسکرا رہا تھا اور وہ اُس کی مُسکراہٹ میں کھو گئی تھی۔ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب اُس کی منزل آ گئی۔ کنڈکٹر کی تیز آواز نے اُسے چونکا دیا اور وہ نیچے اُتر گئی۔ کالج میں وہ دن بھر چُپ رہی۔ یوں تو تمام پیریڈز اٹینڈ کئے۔ لیکن بے خیالی میں —— اُس کا ذہن تصوّرات کے بادلوں پر اُڑ رہا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اُس کی یہ کیفیت کیسے ہو گئی؟ وہ تو Love at a glance کی قائل نہ تھی۔ پیار اُس کے نزدیک سرپھروں کا کام تھا یا پھر اُردو کے شاعروں کا محبوب مشغلہ! پھر اُسے کیا ہو گیا؟ وہ اپنے دل میں یہ کسک سی کیوں محسوس کر رہی تھی۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ اس کے خیال سے چھٹکارا نہ پا سکی۔ اُس نے سوچا ٹھیک ہے محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے اور اِس فطری جذبے کے آگے اُسے سر جھکانا پڑا۔

دوسرے دن وہ پھر بس اسٹاپ پر موجود تھا۔ ہاتھ میں چھوٹی فائل اور ایک کتاب لبوں پر وہی جانی پہچانی مُسکراہٹ۔ اس روز وہ اُس سے آگے کھڑا تھا۔ اِس لئے اُس نے اُس کے سراپا کا بھرپور جائزہ لیا۔ درمیانہ قد۔ چھریرا بدن۔ بڑی بڑی بیباک آنکھیں۔ گھنگھریالے بال، چہرے اور لباس سے شریف اور مہذّب نظر آ رہا تھا۔ لیکن اُس کا کنکھیوں سے دیکھنا اور لبوں پر دلنشیں مُسکراہٹ کا بکھرنا ہی مرضیہ کو بھا گیا تھا۔ وہ اُس کے دل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس کے خیال سے دامن بھی جھٹک نہیں سکتی تھی۔ بس آئی اور وہ بس میں بیٹھ گیا۔ لیکن چڑھتے چڑھتے پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھتا رہا اور بس اُسے خیالات میں غوطہ زن چھوڑ کر آگے بڑھ گئی اور وہ اپنے محبوب کو الوداعی نظروں سے دیکھتی رہی۔

تیسرے دن بھی یہی ہوا۔ چوتھے دن ابھی وہ بس اسٹاپ پر پہنچی ہی تھی کہ وہ بھی آ گیا۔ وہ شرم وحیا سے نیچی نگاہیں کئے کھڑی تھی۔ آج تو وہ اس قدر قریب تھا کہ اُس کے متعلق اگر وہ کچھ سوچنا چاہتی تو بھی نہ سوچ سکتی۔ گویا اُس کی قُربت نے اِس کے ذہن پر تالے لگا دیئے ہوں۔ شرم سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ گُلابی کشمیری قمیض۔ گلابی چوڑی دار پاجامہ اور گُلابی دوپٹے میں وہ کھلتا ہوا گلاب کا پھول معلوم ہو رہی تھی۔ اِس بات کا احساس اُسے کالج میں ہوا۔ جب اُس کی سہیلیاں اُسے کشمیر کی کلی کہہ کر ستانے لگی تھیں۔ بس آئی اور دونوں سوار ہو گئے بیٹھنے کیلئے جگہ نہ تھی۔ ایک سیٹ تھی اور یہ دو تھے اُسے جگہ دے کر خود کھڑا رہا۔ چاہتے ہوئے بھی وہ اُس کا شکریہ ادا نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بعد اُسے بیٹھنے کے لئے جگہ مِل گئی۔ لوگوں کی نظریں بچا کر وہ برابر اُسے دیکھ رہا تھا۔ چھ یا سات اسٹاپ کے بعد وہ اُتر گیا۔ اُترتے ہوئے بھی وہی اُس کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ وہ بھی اُسی کو دیکھ رہی تھی۔ نظروں کا ٹکراؤ ہوا۔ وہ اُس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی اور مُنہ پھیر لیا۔ غالباً وہ وہاں سروس کرتا تھا۔

ایک سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ امتحانات ہو گئے اور گرمیوں کی تعطیلات شروع ہو گئیں۔ چھٹیوں میں وہ وطن چلی گئی۔ لیکن وہاں وقت کاٹنا اُس کے لئے مشکل ہو گیا۔ وہ اُس کے احساسات پر چھا گیا تھا۔ وہ اُس کے جذبات کا مالک بن گیا تھا۔ اُس کا خیال سائے کی طرح ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا۔ کبھی کبھار وہ رات کو چونک کر اُٹھ جاتی۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا وہ مُسکراتا چہرہ اسے بُلا رہا ہو۔ اور کبھی وہ سپنوں کی حسین وادیوں میں اُس کے ہمراہ بھٹکتی رہتی۔

آخر طویل چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ کالج کھُل گئے۔ وہ انٹر میں سکنڈ کلاس سے پاس ہو گئی۔ اب وہ بی اے میں تھی۔ اکنامکس اور پالٹیکس اُس کے خاص مضامین تھے۔ وہ صبح سویرے تیار ہو کر بس اسٹاپ پر پہنچ جاتی۔ وہ بھی وہاں آ جاتا۔ کبھی وہ آگے اور کبھی پیچھے رہتی۔ لیکن اکثر ایک ہی بس میں بیٹھ کر دونوں جاتے۔ اُس وقت اُس کا دل چاہتا، یہ خوشگوار سفر کبھی ختم نہ ہو۔ زندگی میں ایسے حسین اتّفاقات بہت کم آتے ہیں۔ وہ کھو جاتی۔ اُس کا جی چاہتا بس ہمیشہ چلتی رہے کسی نامعلوم منزل کی طرف!

اِس طرح تقریباً دو سال بیت گئے۔ لیکن وہ اُس کے متعلق کچھ نہ جان سکی۔ وہ بس اِتنا جانتی تھی کہ اُسے اِس سے دلچسپی ہے۔ وہ اُسے چاہتا ہے۔ لیکن اظہار نہیں کر سکتا۔ شاید اُس کی شرافت مانع ہے یا اُس کا اپنا وقار جس کی وجہ سے وہ اپنی محبت کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اسی وجہ سے اُس کی عزّت اُس کے دل میں اور بڑھ گئی تھی۔ وہ تمام نوجوانوں سے کتنا مختلف تھا! نہ کبھی اُس نے اِس کی تعریف میں اشعار کہے۔ نہ کبھی سرد آہیں بھریں، نہ فقرے کسے، ہمیشہ ایک شیریں اور دلنواز مُسکراہٹ سے اُس کا استقبال کرتا اور بس!

دو سال بیت گئے۔ وہ سکنڈ کلاس آنرز سے پاس ہو گئی۔ اُس کے والد نے اِس خوشی میں دوستوں اور رشتہ داروں کو شاندار پارٹی دی۔ اُس روز وہ بظاہر بہت خوش تھی اور ہر ایک کا پُرتپاک استقبال کر رہی تھی۔ لیکن اُس کا دل رو رہا تھا کیونکہ اب راستے بدل گئے اور راہی بھی بدل گئے۔ وہ اُسے بھی مدعو کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ کیونکہ اُس کے والد آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی یہ کبھی گوارا نہ کر سکتے کہ اُن کی لڑکی کسی غیر مرد کو دوست بنائے۔

اُس نے ایم اے اکنامکس میں داخلہ لیا۔ راستے بدل گئے۔ وہ یونیورسٹی جانے لگی۔ اب اُس سے ملنے کی کوئی اُمید ہی نہ تھی۔ کبھی کبھار راستہ چلتے ہوئے وہ نظر آ جاتا۔ وہ اُسے چُپکے سے اپنی کھڑکی میں سے دیکھ لیتی۔ ایکبار اُس نے اُسے دیکھتے ہوئے دیکھ لیا۔ نظریں ملیں۔ وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئی۔ ایک طویل عرصے کے بعد اُس کے محبوب نے اُسے دیکھا تھا۔

مرضیہ نے گھڑی میں دیکھا سات بج رہے تھے۔ ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی لیکن ماضی سے وابستہ یادوں کی چنگاریاں اُس کے آتشکدۂ دل میں سُلگ رہی تھیں۔ آج گھر میں اُس کے سکون کو درہم برہم کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ بالکل تنہا تھی اور اِس تنہائی نے دلوں کے فاصلوں کو کم کر کے اُس کے محبوب کو اُس کے پہلو میں لا کھڑا کیا۔ اُس کے سازِ دل کے تار یادوں کی مضراب سے تھرتھرانے لگے۔ گرمیوں کی ایک شام تھی۔ وہ ریکھا، سکانتا اور سکامنی کیساتھ یونیورسٹی لائبریری گئی تھی۔ لائبریری کے ایک گوشہ میں وہ ([illegible]) کی کتابیں ڈھونڈ رہی تھی۔ اچانک کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی جو اُس کے قریب آ کر معدوم ہو گئی۔ اُس نے نظر اُٹھا کر آنے والے کو دیکھا اور مسرّت و حیرت کے مِلے جُلے لہجے میں وہ تقریباً چیخ پڑی۔

"آپ! یہاں!؟" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں میں۔ کیا چلا جاؤں؟" وہ مجسّم سوال بنکر اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ دونوں خاموش رہے۔ آخر رضوان نے مُہرِ سکوت توڑی "آپ براہِ کرم میرے ساتھ باہر چلیں گی؟" وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی۔ اُسے سیمینار میں پڑھنے کے لئے Keynes پر تنقیدی مقالہ لکھنا تھا اور دوسری طرف اُس کا محبوب کھڑا تھا۔ جو اُس سے چند لمحات ساتھ گزارنے کی التجا کر رہا تھا۔ کچھ ثانیے سوچنے کے بعد وہ اُس کے ساتھ چل پڑی۔ اُتر کر وہ دونوں یونیورسٹی کے گارڈن میں آئے اور مناسب جگہ ڈھونڈ کر بیٹھ گئے۔ وہ ابتک خاموش تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔ اُس کے دل میں طوفان اُٹھ رہے تھے۔ طرح طرح کے خیالات و سوالات اُس کے ذہن سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے تھے۔ آخر بیتاب دل کو سنبھالتے ہوئے اُس نے پوچھا، "آپ کا نام جان سکتی ہوں؟"

"مجھے رضوان کہتے ہیں اور آپ کا نام میں بخوبی جانتا ہوں۔ بتاؤں؟"

وہ تعجب سے اُس کا مُنہ دیکھنے لگی۔ اُس نے آہستہ سے کہا "مرضیہ!"

اپنا نام اُس کے مُسکراتے لبوں سے سُنکر اُس پر مدہوشی کا عالم طاری ہو گیا۔ لیکن وہ اپنی رَو میں کہے جا رہا تھا "میری چھوٹی بہن محمودہ جو آپ کی اسکول فیلو تھی آپ کی بہت تعریف کرتی تھی۔"

"اوہ! میں اُسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ بہت ہی بھولی بھالی اور معصوم لڑکی ہے۔ کالج جاتی ہے کیا؟"

"نہیں۔ ایس ایس سی کے بعد تعلیم ختم کر دی۔ لکھنؤ میں اس کا بیاہ ہو گیا۔"

کیا آپ اس کی شادی میں شریک نہیں ہوئیں؟"

"کیا بن بُلائے آ جاتی؟ رضوان صاحب! میں تو بُھلانے ہی کی چیز ہوں۔ اُس نے فراموش کر دیا تو کوئی نئی بات نہیں۔ مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں۔"

وہ جذبات میں بہہ کر کہے جا رہی تھی۔ شدّتِ جذبات سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ رضوان اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظروں کی تاب نہ لا کر اُس نے سر جُھکا لیا۔ کچھ وقفے کے بعد رضوان نے سوال کیا

"آپ کے بی اے میں کیا مضامین تھے؟"

"اکنامکس اور پالیٹکس۔"

وہ اچھل پڑا "میرے بھی یہی مضامین تھے اور ایم اے میں؟"

"وہی۔ آپ نے بی اے کس کالج سے کیا؟"

"دس سال پہلے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ بعد وہیں سروس کرنے لگا۔ لیکن والدین کے اصرار پر یہیں سکونت اختیار کرلی۔ اسی وقت سے ایک پرائیویٹ فرم میں معمولی سے عہدے پر ہوں۔ امسال انگریزی ادب سے ایم اے کرنے کی سوجھی تو داخلہ لے لیا اور آج شکسپیر کی Antony & Cleopatra کی تلاش میں یہاں آیا تھا کہ آپ..." وہ جملہ پورا نہ کرسکا۔

شام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ معذرت چاہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ اُسے جلدی گھر پہنچنا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ ہوا کے دوش پہ اُڑ رہی تھی۔ قدم زمین پہ نہیں پڑ رہے تھے۔ آج اچانک اُس کا محبوب اُسے ملا تھا۔ اُس سے ہمکلام ہوا تھا۔ اور دل میدان پار کرکے وہ لکچرز اٹینڈ کرنے کے بجائے کالج کی طرف مڑ گیا اور رہ گئی چرچ گیٹ اسٹیشن کی طرف۔ خیالات میں گھری ہوئی وہ گھر پہنچی۔

دوسرے دن شام کو پانچ بجے وہ پھر ملا۔ خوب باتیں ہوئیں۔ پھر وہ روزانہ شام کو ملتے۔ کبھی یونیورسٹی کینٹین میں... کبھی گارڈن میں... کبھی بس میں... سارے جہاں کی باتیں... اقتصادی مسائل پہ بحث ہوتی... سیاست پر جھڑپیں ہوتیں... انگریزی ادب، انگریزی شعرا و ادبا پر طویل بحث چھڑ جاتی... اردو شاعری میں محبت کے موضوع پر خوب نوک جھونک ہوتی۔ کبھی رضوان اپنی شکست تسلیم کرتا اور کبھی اُسے ہار ماننی پڑتی۔ دونوں ایک دوسرے کے نظریات پر غور کرتے اور ایک دوسرے کے مخلصانہ مشورے قبول کرتے۔

دن گزرتے گئے۔ اُس کے دل کے اندر جذبات کا جوالا مکھی پھٹ پڑنے کے لئے بے چین تھا۔ وہ خود اظہار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ رضوان کے اظہار پہ انکار کرکے اُسے خوب ستائے اتنا ستائے کہ وہ روٹھ جائے اور پھر اقرار کرکے اُسے منالے۔ اسی لئے وہ محبت کی آگ میں خاموشی سے سُلگ رہی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ دل میں لگی یہ آگ اُس کے سارے وجود کو جلا کر خاک نہ کردے۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ اکنامکس جیسے خشک مضمون کی طالبہ ہوتے ہوئے وہ دل کی دھڑکنوں کو کیسے گننے لگی؟ وہ تنہا ہی اس آگ میں جل رہی تھی۔ کوئی اُس کا محرم راز نہ تھا۔ وہ کسی کو اپنا رازداں بنانا بھی نہ چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ لوگ زخموں پر نمک پاشی کرسکتے ہیں لیکن مرہم کا پھاہا کوئی نہیں رکھ سکتا! وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ محبت کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ آخر اس طرح ڈیڑھ سال گزر گیا۔ دونوں میں سے کسی نے بھی پہل نہ کی۔ وہ اس تجاہل عارفانہ سے پریشان ہوچکی تھی۔ دل کی اس کشمکش سے وہ چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ امتحان میں صرف چھ مہینے باقی تھے اور اُسے امتیازی نمبروں سے کامیاب ہونا تھا۔ اُس نے ٹھان لیا کہ وہ خود ہی موقع پاکر محبت کا اظہار کردے گی۔ اِس لئے کہ محبت میں وہ اب اس مقام پہ پہنچ چکی تھی جہاں من و تُو کا سوال ختم ہوجاتا ہے۔

دوسرے دن وہ نہایت ہی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ آج وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ اُس کے سامنے پیش کرنے والی تھی۔ اُس نے آج بڑی اُمنگوں سے سنگھار کیا تھا۔ بال نئی وضع سے ترتیب دیئے تھے۔ نئے انداز سے بندھی ہوئی گلابی ساڑی اُس کے خوبصورت خدوخال کو اور جاذب نظر بنا رہی تھی۔ بالوں میں تازہ گلاب کے اَدھ کھلے پھول پرو دیئے تھے۔ جس سے اس کے گلابی چہرے کی رنگت اور نکھر گئی تھی۔ گلے میں گلابی موتیوں کی قیمتی مالا جو وہ خاص موقعوں پہ ہی پہنتی تھی۔ اُس نے لکچرز اٹینڈ نہیں کئے۔ وہ لائبریری ہی میں بیٹھی خیالات کے تانے بانے بُنتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں خوش اعتمادی جھلک رہی تھی۔ اُسے اپنی محبت پر محبت کے لئے کی ہوئی خاموش ریاضت پر پورا بھروسہ تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ یہی اس کے پیار کا سدِّ باب بن جائے گا۔

ٹھیک پانچ بجے رضوان لائبریری میں آیا۔ اُسے ڈھونڈتے ہوئے وہ East Wing کے آخری سرے تک چلا گیا۔ ایک گوشے میں وہ محو مطالعہ تھی۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گیا۔ پھر اُس کے شانوں پہ آہستہ سے ہاتھ رکھا وہ چونک پڑی پھر مُسکراتے ہوئے اُس کے ساتھ چل دی

"آج میں تمہیں پہچان نہ سکا!" اُس کی گہری نظروں کو دیکھ کر وہ شرما گئی۔ دونوں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے نیچے گارڈن کی طرف جا نکلے اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ اُس کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دل کی بات کہے یا نہ کہے؟ آخر اُس نے گفتگو شروع کی

"رضوان صاحب! محبت کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟"

اُس نے فوراً جواب دیا "محبت ایک لافانی جذبہ ہے جو معصوم دلوں میں نشوونما پاتا ہے۔ کہیں یہ تاج محل کے رُوپ میں دنیا کے سامنے آتا ہے اور کہیں زندہ درگور، بے بس و مجبور انارکلی کا مزار بن کر۔ بہر حال نہ جذبۂ محبت فنا ہوتا ہے نہ محبت کرنے والے..."

"رضوان صاحب محبت کی جاتی ہے یا ہو جاتی ہے!"

رضوان چُپ ہو گیا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ مرضیہ کو کیا ہو گیا ہے جو اتنی سنجیدگی سے ایسے سوالات کر رہی ہے۔

"کہیئے نا!"

"ذرا سوچنے دو مجھے۔"

"کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا" محبت کی جاتی ہے وہ کیسے ہو سکتی ہے؟ جب تک کوئی معبود سامنے نہ ہو اور عابد کے دل میں سجدہ ریزی کی خواہش نہ ہو۔ اُس سے محبت یا لگاؤ نہ ہو۔ وہ اپنا سر والو رمحبت سے کیسے جُھکا سکتا ہے! بولو!"

"تو آپ کا مطلب ہے محبت کا جذبہ فطری نہیں ہے وہ معبود کو قریب دیکھ کر ہی بیدار کیا جاتا ہے۔ مجھے اُس سے اتفاق نہیں۔ خدا سے ہم بے پناہ محبت کرتے ہیں لیکن اُس کا وجود ہمارے لئے صرف تصوراتی ہے ہم اُسے Vision میں دیکھتے ہیں۔ کبھی وہ آپ کے سامنے آپ کی محبت حاصل کرنے آیا ہے؟ نہیں پھر بھی آپ کو اُس سے گہرا لگاؤ ہے۔ کیا یہ جذبہ فطری نہیں؟"

وہ لاجواب سا ہو کر اُس کا منہ تکنے لگا۔ کتنی عمدہ دلیل تھی۔ وہ خود بھی اپنی دلیل پر دل ہی دل میں عش عش کرنے لگی تھی۔ لیکن وہ مرد تھا جو کبھی اپنی ہار تسلیم نہیں کرتا۔

"مرضیہ! وہ عشق جو ہمیں خدا سے ہوتا ہے عشق ازلی ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کی پیدائش سے موت تک نہ صرف اُس کے دل میں بلکہ اُس کے سراپا میں سمایا ہوا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خدا سے محبت کرتا ہے لیکن یہ اور بات ہے۔ مجھے تمام حسین چیزوں سے محبت ہے۔ خوبصورت نظاروں سے پیار ہے، چٹکتی کلیوں سے عشق ہے، مہکتے پھولوں سے رغبت ہے، خوبصورت تتلیوں پر بچپن سے جان دیتا ہوں۔ چمکتے چاند سے پیار ہے۔ لیکن کیا میں ان چیزوں سے محبت کر سکتا تھا اگر یہ میرے سامنے نہ ہوتی تھیں اور میرے قریب نہ ہوتی تھیں۔ محبت میں وجود اور قربت کی اہمیت کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کسی خوبصورت شے سے ہم محبت اسی وقت کرتے ہیں جب ہم اُسے قریب سے دیکھتے ہیں۔ معبود کی اگر خواہش ہے کہ وہ چاہا جائے تو اُسے اپنے چاہنے والے کے قریب آنا چاہیئے۔ اس میں بھی خود سپردگی کا جذبہ ہونا چاہیئے۔" وہ نہایت پُرسکون لہجہ میں روانی کے ساتھ اپنے نظریات واضح کرتا جا رہا تھا اور مرضیہ اُس کی فلسفیانہ باتوں میں کھو گئی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ کچھ دیر بعد اُس نے سرد آہ کھینچ کر کہا۔

"مرضیہ ڈیر!"

"ہوں" چونک کر اس نے کہا۔

"پانچ چھ سال پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ محبت ہو جاتی ہے محبت کی نہیں جاتی۔ لیکن آج میں سختی سے اس کی تردید کرتا ہوں۔"

"کیوں؟" اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

"اس کیوں کا جواب تم اپنے دل سے پوچھو . . . پہلی بار تمہیں دیکھتے ہی میں تم پر بے اختیار مر مٹنے کو تیار ہو گیا تھا۔ سوچو محبت کوئی فطری جذبہ ہوتا تو وہی حال تمہارا بھی ہوتا۔ تمہیں بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہوتی جتنی میرے دل میں تمہارے لئے تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تم نے میری مسکراہٹ کو مذاق سمجھا۔ تم مجھ سے دُور دُور ہی رہیں۔ جذبۂ محبت سے بالکل ناآشنا۔ بولو یہ کیا ہے؟"

اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرزنے لگے۔ اُس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا کہ آخر آج رضوان نے اُس کے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیا اور وہ اُسے قبول کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکچائی —— اُس کے چوڑے شانوں پر اُس نے اپنا سر رکھ دیا۔ آنسو اُس کی قمیص میں پیوست ہونے لگے۔ رضوان اظہارِ محبت کے اس طریقہ پر گھبرا گیا اور پھر سنبھل کر گلوگیر آواز میں کہنے لگا۔

آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی

"My dear! it is too late" تم نے بہت دیر کر دی۔ مجھے اپنے اُن الفاظ کا پاس ہے۔ اُن وعدوں کا لحاظ ہے جو میں نے شمسہ سے کئے ہیں۔"

اس نے جلدی سے تھوک نگلتے ہوئے کہا "جانتی ہو شمسہ کون ہے؟ ایس ایس سی پاس معمولی شکل وصورت کی سانولی لڑکی جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ اُس سے میں نے محبت کی ہے مجھے محبت ہوئی نہیں۔"

اُس نے جھٹکتے ہوئے سر اٹھا لیا۔ رضوان کے الفاظ اس کے کانوں میں پگھلتے ہوئے سیسے کی طرح اترتے جا رہے تھے۔ وہ کچھ اور سننا نہ چاہتی تھی۔ اُس نے اپنے کان بند کر لئے۔ آنکھیں بند کر کے سر نیچے جھکائے دیر تک وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا۔ رضوان جا چکا تھا۔ وہ بھی بوجھل قدموں سے ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر لوٹ رہی تھی۔


LUX
'نئے لکس کے
راج سِنگار پر
میں فریفتہ ہوں'
فِلم سٹار
ببیتا کہتی ہیں
نئے لکس میں
ایک انمول نئی خوشبو ہے
اور بین الاقوامی نئی شان!
آپ بھی آزما کر دیکھئے ---
رُوپ کا راج سِنگار ایک صابن ہے لکس
لنتاس LTS. 227-140-45 UD
ہندوستان لیور کی ایک اعلیٰ پیشکش

اگر شاؔد مرگیا

پورن کمار ہوشؔ

گاندھی چوک بہادر گڑھ

محترمی و مکرمی خوشترؔ صاحب!

خلوص و نیاز

شاؔد کی بے وقت موت سے اُردو ادب کو جو نقصانِ عظیم ہوا ہے اُس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ آپ کے لئے اور میرے لئے تو یہ ذاتی صدمہ ہے جو نہ جانے کیسے برداشت ہوگا۔ شاؔد کی چالیسویں سالگرہ پر جشنِ شاؔد مناتے وقت کس نے سوچا تھا کہ شاؔد اتنی جلد چلا جائے گا۔ شاید خود شاؔد نے بھی نہیں۔ یہ نظم "اگر شاؔد مرگیا" میں نے جشنِ شاؔد پر شاؔد کو پیش کی ہوئی کتاب "شاؔد اور اُس کی شاعری" کے لیے کہی تھی۔ لیکن خود شاؔد نے مجھے یہ کہہ کر اسے شاملِ مجموعہ کرنے سے روک دیا تھا کہ "ابھی اِس کی ضرورت نہیں" اس لئے میں سوچ رہا ہوں کہ اب اس کا عنوان "شاؔد مرگیا" ٹھیک ہوگا یا نہیں یقیناً نہیں۔ کیونکہ شاؔد کبھی نہیں مر سکتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا ——

مقامِ حیرت ہے کہ جشنِ شاؔد کے لئے کہی ہوئی نظم ماتمِ شاؔد کے سلسلہ میں شائع ہو رہی ہے۔

سوگوار ——

پورن کمار ہوشؔ

جتنے فریب تجھ کو دیئے ہیں حیات نے
اشعارِ دلفریب کے سانچے میں ڈھل گئے

گاتے ہیں تُو نے غم میں بھی نغماتِ جاں فروز
ڈھالا ہے تُو نے شعر میں قلب و جگر کا سوز

سینچا ہے تُو نے باغِ ادب اِس سے صبح و شام
کیا خوب تُو نے اپنے لہو سے لیا ہے کام

ہر لمحہ زہر پی کے اُگلتا رہا ہے پھُول
کیف و طرب نواز ہے تیرا دلِ ملول

تیرا ہر ایک شعر سراپائے نور ہے
چہرے پہ جس کے جاگتی صبحوں کا نُور ہے

فن کار مانتے ہیں۔ تجھے کتنے اہلِ فن!
تُو واقعی ہے صبحِ ادب کی نئی کرن

حاسد بھی ہیں بہت ترے مدّاح بھی بہت
طوفان بھی ہزار ہیں ملّاح بھی بہت

سب جانتے ہیں یہ ترا رندانہ قول ہے
قلب و جگر کا خون ہو زہراب ہو کہ مئے

ہر جام پر خلوص ہے پینے کے واسطے
ہر لمحۂ حیات ہے جینے کے واسطے

لیکن جو اِس حساب سے پیتا رہے گا تُو
اِس کا بھی کیا یقین ہے کہ جیتا رہے گا تُو

غمہائے کائنات کو دھو کر شراب سے
لگتے ہیں گرچہ تلخ حقائق بھی خواب سے

لیکن یہ خواب خواب ہی رہتے ہیں اصل میں
چھُپ کر تہِ شراب ہی رہتے ہیں اصل میں

مانا کہ آدمی ہے تُو درویش تو نہیں
اور تیری شاعری کوئی اُپدیش تو نہیں

یہ بھی بجا سہی کہ وہ عالم ہو غرقِ مئے
تجھ سا ذہین شخص جہاں اِک کلرک ہے

رُسوا نہ ہوتی یہ بھی بجا تیری میکشی
گر تُو زمانہ ساز یا ہوتا خوشامدی

رُخ آئنے میں دیکھ مگر شاؔدِ سخت جاں
اُس پر بھی کچھ دنوں سے خراشوں کے ہیں نشاں

یوں کج ادائیاں تری رُسوا ہیں چار سُو
پھُولوں سے تیرے شعر ہوئے ہیں لہو لہو

"قاشیں" تجھی سے پُوچھ رہی ہیں ترا مآل
"وجدان" کے لبوں پہ بھی اب ہے یہی سوال

"اب تک جو حادثات پہ خود ہی گذر گیا
ظالم یہ سوچ کل جو وہی شاؔد مرگیا؟"

نوٹ: "قاشیں" شاؔد کا مشہور مجموعۂ قطعات اور "وجدان" اُس کا آخری مجموعۂ غزلیات۔



یادیں

سُرخ حاشیوں کا خالق۔شاؔد

رشی پٹیالوی

اے-۹۰/۱۸-چنڈی گڑھ

برادرِ محترم قبلہ خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

خودکشی کہیے کہ مرگِ ناگہاں، شاؔد کی بے وقت موت دُنیائے اُردو کے لئے ایک المناک اور دردناک سانحہ ہے۔ ہر اُردو دوست، ہر شاعر اور ہر ادیب کے لئے یہ حادثہ باعثِ رنج و الم ہے ——— وہ "بیسویں صدی" خاندان کا ایک اہم فرد تھا اور آپ کے بہت قریب تھا ——— اِس واقعہ سے آپ کے دل پر جو گزری ہو گی میں اُس کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ اِس شاعرِ باکمال کے لئے آپ کے دردمند دل میں کس قدر محبت و شفقت پوشیدہ تھی مجھے سب معلوم ہے۔ آپ اُس کی کثرتِ شراب نوشی کے خلاف بارہا اُسے اعتدال کی تلقین فرماتے رہتے۔ کچھ وقت کے لئے آپ کی نصیحت کا اُس پر اثر بھی ہوا اور وہ حدِ اعتدال تک آیا بھی اور توبہ بھی کی۔ مگر یہ سب تبھی تک جب تک وہ خود شراب پیتا تھا۔ مآل کار جب شراب نے اُسے پینا شروع کر دیا آپ کی نصیحت بھی کارگر نہ ہوئی۔ آہ! ؎

زندگی زندگی سے ہار گئی ہار کر بارِ غم اُتار گئی
شاؔد کو بھی شراب لے ڈوبی شاؔد کو بھی شراب مار گئی

مختصر سی عمر میں شاؔد نے شعر و ادب میں جو بلند مقام حاصل کیا وہ بہت کم لوگوں کے حصّے میں آیا ہے ——— آپ نے اُس پر ہمیشہ دستِ شفقت رکھا اور وہ بھی آپ کی بزرگی کا ہمیشہ احترام کرتا تھا اور اکثر کہا کرتا تھا ؎

صاف گوئی کی ایک خامی ہے
ورنہ خوشتر بڑا گرامی ہے

"سُرخ حاشیوں کا خالق۔شاؔد" بغرضِ اشاعت بھیج رہا ہوں۔ اِس رُوداد کے پس منظر اُن واقعات کا عکس جھلکتا ہے جو شاؔد کی شخصیت کے بیشتر پہلوؤں پر اور اُس کی زندگی کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالتے ہیں...

ہاں! اِس سلسلے میں مجھے آپ سے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ شاؔد تو جیسی بھی گزارنی تھی گزار گیا۔ اب سوال اُس کی مظلوم بیوہ اور معصوم بچّے کی زندگی کا ہے۔ اُس کی گزر بسر کا مستقل انتظام ہو جائے اور اِس کی تعلیم و تربیت کا مناسب بندوبست ہو جائے تاکہ وہ باپ اور دادا کی روایات کو نہ دُہرائے۔ آپ کی اور محترم کنور مہندر سنگھ بیدی کی کوشش سے یقیناً یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ کچھ مرکزی حکومت کی طرف سے اور کچھ پنجاب سرکار کی طرف سے وظیفہ مقرر ہو جائے ——— مجھے یقین ہے کہ آپ کی طرف سے اپیل کا ضرور خاطر خواہ اثر ہو گا...

نیازمند ——— رشی پٹیالوی

۳۰ مئی کے دن ...

اخباری خبر آئی "نریش کمار شاد چل بسے"؟

اِس غیر متوقع خبر نے مجھ پر سکتہ کا عالم طاری کر دیا۔ یقین نہ آیا۔ میں نے تصدیق کے لئے فوراً جناب خوشتر گرامی کے دفتر کو فون کیا۔ وہاں سے جواب ملا۔ "اُردو ادب کی بدبختی نیز شاد کے عزیز و اقارب کی بدقسمتی سے خبر میں صداقت ہے۔"

شاد مئی کے آغاز میں مجھے دلّی میں ملے تھے۔ بہت دیر تک اُن سے اِدھر اُدھر کی خوش گپیاں رہیں۔ دَورانِ گفتگو دیگر نجی قسم کی باتوں کے علاوہ اُن کے والدِ محترم جناب دَرد نکودری کی پُراسرار گمشدگی کا ذکر بھی آیا۔ شاد اِس سلسلے میں بہت پریشان خاطر نظر آئے۔

سالِ رواں کے ۲۱ مارچ کو جب وہ چنڈی گڑھ میں ہریانہ سرکار کے محکمہ الصنا کے سالانہ جلسے میں شمولیت کی غرض سے تشریف لائے تھے، میں نے اُن سے اپنے مجموعۂ کلام پر جو "ریگِ رواں" کے نام سے زیرِ ترتیب ہے تعارف لکھنے کا وعدہ لیا تھا۔ اِس ملاقات میں اُنھوں نے میرے یاد دلانے پر اِس کام کی تکمیل کے لئے ایک مہینہ کی مہلت مانگی۔ آہ! کسے معلوم تھا یہ ملاقات آخری ملاقات ہوگی اور شاد "ریگِ رواں" پر اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکیں گے۔

اِسی ملاقات میں بے حد مصروفیت، ذہنی انتشار اور درد و اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے "بیسویں صدی میں پھر سُرخ حاشیوں کا سلسلہ چل پڑا ہے۔ جون کا پرچہ دیکھا ہوگا (اُسی روز خوشتر صاحب کی قیام گاہ پر یہ پرچہ میری نظر سے گزرا تھا اور میں نے شاد کے ادبی لطائف سے لُطف اُٹھایا تھا) اگلی اشاعت کے لئے سُرخ حاشیے قلمبند کر رہا ہوں۔"

میں نے کہا "سُرخ حاشیے؟ پسند ہوں تو دو ادبی لطیفے میری طرف سے شامل کر لیجیے۔" فوراً بولے "سُناؤ" میں نے بیان کیا

ایک دن میں "بیسویں صدی" کے دفتر میں خوشتر گرامی کے پاس بیٹھا تھا۔ اچانک حضرت فراق گورکھپوری تشریف لائے۔ خوشتر صاحب اُٹھ کر تپاک سے ملے۔ میں نے بھی جُھک کر سلام پیش کیا۔ خوشتر صاحب نے فرمایا "یہ رشتی پٹیالوی ہیں۔ اِن کا کلام آپ نے "بیسویں صدی" میں اکثر دیکھا ہوگا" فراق صاحب نے عجب سُلطانی شان سے کُرسی پر دراز ہوتے ہوئے فرمایا "ہاں صاحب! میں اِس نوجوان کو اکثر پڑھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اِس نے مجھے خوب پڑھا ہوگا۔"

یہ لطیفہ سُن کر شاد نے فراق کی شاعرانہ عظمت پر ایک مختصر سی مُدلّل تقریر کی جو یُوں اختتام پذیر ہوئی "شعر کہنے کے ساتھ ساتھ تعلّی اور خود ستائی کے اظہار کا انداز بھی کوئی فراق سے سیکھے۔"

میں نے دوسرا لطیفہ بیان کیا۔ ایک موقع پر بزمِ ادب چنڈی گڑھ کو مشاعرہ کا اہتمام کرنے کے سلسلے میں ایسے ہال کی ضرورت پڑی جس میں لگی لگائی کُرسیاں مِل جائیں اور ہال کافی وسیع ہو۔ بزم کے ایک ممبر نے بیسک ٹریننگ کالج کا ہال تجویز کیا۔ طے پایا کہ جناب مغموم جو اُن دِنوں بزم کے سکریٹری تھے پرنسپل صاحب سے رجوع کریں۔ اِس لئے میرے مکان سے فون پر ملاقات کے وقت کا تعین ہو گیا۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہا۔ مغموم صاحب بزم کے نمائندہ کے طور پر آپ سے مِلیں گے اور تفصیل بیان کریں گے۔ اُنھوں نے جواب میں رضامندی کا اظہار کیا۔ اگلے دن مغموم صاحب مِلنے گئے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ دفتر کے دروازہ پر چپراسی نے پوچھا "کون صاحب مِلیں گے؟" مغموم بولے "باوا کرشن گوپال مغموم بی۔ اے۔"

میں نے اِس جُملے میں اضافہ کرتے ہوئے دُہرایا "مشہور و معروف شاعر باوا کرشن گوپال مغموم بی۔ اے۔" چپراسی مُنہ دیکھتا رہ گیا اور پھر قدرے تامّل کے ساتھ بولا "صاحب! یوں کہو ڈیپوٹیشن مِلے گا۔ فون پر تو ایک آدمی نے مِلنے کا وقت مانگا تھا۔"

شاد یہ لطیفہ سُن کر بے حد مسرور ہوئے اور بولے "بہت خوب! بھئی بہت خوب!!"

آہ! "سُرخ حاشیوں" سے سب کو مُسکراہٹیں بخشنے والے شاد ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

سب آنے والے اِس دارِ فانی سے جائیں گے۔ سب آنے والے جاتے ہیں۔ اِن جانے والوں میں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے بعد اپنے کردار و عمل کی ایک گہری چھاپ چھوڑ جاتے ہیں، جو اُنھیں دوسروں کے درمیان امتیازی درجہ عطا کرتی ہے۔ شاد کی شخصیت بھی ایک ایسی ہی امتیازی شان کی شخصیت تھی جس نے اُردو ادب کے میدان میں اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی ہے۔ مُدتوں احباب اُسے یاد رکھیں گے۔ شاد کا کلام اُن کے دِلوں میں اپنا تاثّر قائم رکھے گا۔ اُس کے حسّاس دل سے نِکلے ہوئے نشتر مریضانِ غمِ دَوراں و کُشتگانِ غمِ جاناں دونوں کے لئے جراحت کا عمل جاری رکھیں گے۔ اُس کے اشعار گُنگُنائے جائیں گے۔ اُس کے قطعات زبانِ زدِ خاص و عام رہیں گے۔ اِتنا ذہین شاعر اُردو دُنیا اب مستقبل میں شاید ہی دیکھ سکے۔

شاد کے ساتھ میرے برادرانہ تعلقات تھے۔ میں نے اُسے قریب سے دیکھا۔ جاننے کی طرح جانا اور پرکھا تھا۔ وہ شعر و سُخن کی محفلوں کا شہزادہ اپنے سینے میں بے پناہ حسّاس دل رکھتا تھا۔ اگر اُس پر سماج کی طرف سے شراب نوشی کی کثرت کا الزام نہ آتا، شراب نوشی! جس نے اُس وقت اُسے دُنیائے شعر و ادب سے

چھین لیا۔ جب دُنیائے شعر و ادب کو اُس کی بڑی ضرورت تھی۔۔۔ تو وہ دلی ہوتا فرشتہ کہلاتا۔ اُس کا لااُبالی پن بھی حسین ہوتا۔ اُس کی کمزوریاں بھی کسی کو نہ کھٹکتیں۔

مقبول و محبوب شاعر کی حیثیت سے وہ خواص ہی کی ادبی محفلوں میں سر آنکھوں پر نہیں بٹھایا جاتا تھا، عوام میں بھی اُس کے فن کے چرچے رہتے تھے۔ اُردو ادب کے منفرد و ممتاز ادبی صحیفہ "بیسویں صدی" میں اپنی غیر فسانی ادبی تخلیقات "سُرخ حاشیے"، "شانِ نزول" اور "مشاہیرے"، "اِنٹرویو" پیش کر کے وہ ہند و پاک کے گوشے گوشے میں ایک بلند پایہ فنکار کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اُس کی ان ادبی تخلیقات کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہر ماہ سیکڑوں تعریفی خطوط مُدیرِ "بیسویں صدی" کو موصول ہوتے تھے اور اِس پسندیدہ سلسلہ کو جاری رکھنے کی فرمائشیں ہوتی تھیں۔

شاؔد کی زندگی سے متعلق واقعات کے آئینہ میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شاؔد کے قالب میں ایک عظیم فنکار کا دل تھا۔ ایک دردمند انسان کا دل تھا۔ "سُرخ حاشیوں" کے خالق شاؔد کی اپنی زندگی بھی ایسے ہی "سُرخ حاشیوں" کا مُرقّع تھی جیسے "سُرخ حاشیوں" میں شاؔد دوسرے مشاہیر و فنکار ادیبوں کی روزمرّہ زندگی کے نقش اُجاگر کیا کرتا تھا۔ اُسے قریب سے جاننے والے احباب جانتے ہیں۔ جن دوستوں سے وہ کھُل کھیلتا تھا اُنھیں معلوم ہے کہ کتنے سُرخ حاشیے، اُس کے حسّاس دل نے تخلیق کئے ہوں گے۔ اپنی یادداشت کے دریچے میں جھانک کر چند سُرخ حاشیے، جو شاؔد ہی سے متعلق ہیں یہاں پیش کرتا ہوں۔

صاف گوئی ــــــ

صاف گوئی شاؔد کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ کوئی ہو کہیں ہو۔ جو بھی محسوس کرتا تھا، بغیر کسی جھجک کے کہہ گزرتا تھا۔ بعض لوگوں نے اُس کی اِس خوبی کو خامی کا نام دیا۔ نیلیئے شرما مشہور فلم پروڈیوسر سابق وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو مرحوم کے پولٹیکل سکریٹری اور نجی جیوتشی کی حیثیت سے شملہ میں مقیم تھے۔ اُنھوں نے شاؔد کو اپنی کتاب "آنسو اور موتی" کا پیش لفظ قلم بند کرنے کے لئے دو ہفتہ کے لئے شملہ میں اپنے پاس رکھا۔ یہ ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے۔ میں بھی اُن دنوں ڈاکٹر بھارگو کے پرائیویٹ سکریٹری کے طور پر وہیں مقیم تھا۔ نیلیئے شرما بظاہر اور ڈاکٹر بھارگو حقیقتاً پرہیزگار انسان تھے۔ رسوئی میں لہسن اور پیاز تک کے استعمال کی اجازت نہ تھی۔ شاؔد تنگ آ گئے۔ ایک دن نیلیئے شرما سے کہنے لگے: "اگر آپ اجازت دیں تو میں رشی کے ساتھ بازار جا کر ذرا مُنہ کا ذائقہ تبدیل کر آؤں؟" اِس پر نیلیئے شرما نے پوچھا: "کیا شراب پینے کا ارادہ ہے؟" شاؔد نے جواب دیا۔ "ہاں! مُرغ و ماہی کے ساتھ!"

کل کی فِکر ــــــ

ایک دن سرِشام شاؔد مجھے چاندنی چوک دہلی میں مِل گئے۔ فِکر تونسوی صاحب ساتھ تھے۔ مجھ سے کہا: "آؤ تمھیں چائے پلائیں۔" سامنے لکشمی ہوٹل میں

شاؔد ــــ ایک مسافر

ـــــ شاہد ماہلی ـــــ

وقت کی سرد رہگذاروں پر
رات دن چیختا کوئی کب تک
بند تھے ہر طرف سے دروازے
کوئی دے دے کے تھک گیا دستک

چمکی تھی روشنی کی ایک کرن
بے کراں ظلمتوں میں ڈوب گئی
گونج لہرائی تھی چٹانوں میں
دُور تک پھر وہی ہے خاموشی

تھک کے ناکامیوں سے بیٹھ گیا
اُس مسافر کی کیا کہانی تھی
اُس نے پھولوں کی آرزو لے کر
ہر بیاباں کی خاک چھانی تھی

بے بسی کے سیاہ کاغذ پر
خون سے حاشیے بناتا تھا
بیٹھ کر تلخیوں کے سائے میں
گیت وہ زندگی کے گاتا تھا

ڈوب کر بے خودی کے ساغر میں
اِک نیا راز پا گیا کوئی
زندگی دیتی ہی رہی آواز
انجمن سے چلا گیا کوئی

بیٹھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ سورج غروب ہونے کو آیا تو مجھ سے مخاطب
ہو کر کہنے لگے "بھئی آرشی!! تمھارا بٹوہ کدھر ہے؟"
میں نے بٹوہ جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔ شاد صاحب نے اُٹھایا،
کھولا اور صرف دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر بٹوہ مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔
"چلو چلیں" میں نے پوچھا "بس؟" کہنے لگے "صرف اَدّھے کے دام درکار ہیں۔
آج کے لئے" میں نے پوچھا "اور کل؟" کہنے لگے "کل کی فکر فکر کو ہے!"

اظہارِ شکریہ ———●

جون ۱۹۵۶ء میں سخت بیمار ہو کر جالندھر ہسپتال میں داخل ہوئے۔
یہ خبر ملی۔ میں نے اُن کے والد جناب ذرّہ نکودری سے حال پوچھا۔ اُنھوں نے
لکھا۔
"عزیزی نریش کمار شاد کی علالت کے متعلق آپ نے جس تشویش کا
اظہار کیا ہے اُس کے لئے بہت بہت شکریہ۔ شاد یہاں سول ہسپتال میں
زیرِ علاج ہے۔ لیکن میں دوا سے زیادہ دُعا پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ آپ بھی
عزیزی کے لئے دُعا کریں۔ اِس کا دماغ ماؤف اور جسم کا بایاں حصہ مفلوج
ہو گیا ہے۔ لیکن اب بتدریج ٹھیک ہوتا جا رہا ہے۔۔۔" میں نے کچھ رقم نذرانے
کے طور پر پیش کی۔۔۔ شاد رُو بہ صحت ہو کر دِلّی آئے۔ میں مزاج پُرسی کے لئے
گیا تو کہنے لگے "مجھے سب معلوم ہے۔ جنوں کی منزل میں بھی اپنے بیگانے کے سلوک
کی حقیقت مجھ پر روشن ہوتی رہی۔ مگر میں تمھارا شکریہ ادا نہ کروں گا۔ رسمی
طور پر بھی نہیں! تم پر میرا حق ہے۔"

ہمہ یاراں ———●

ایک دن جامع مسجد بازار میں اچانک مل گئے۔ شراب پی رکھی تھی۔ میں
گلی بتاشاں (واقع چاوڑی) میں جناب طالب دہلوی کے دولت کدے سے واپس آ رہا
تھا۔ مجھے بازو سے پکڑ لیا اور عقب کے ایک محلّے میں مسجد سے ملحقہ ایک ایسے
چوبارے میں لے گئے جہاں بالکل اندھیرا تھا۔ آواز دی "ظفر! ظفر میاں!!" اندر
سے نحیف سی آواز آئی "چلے آؤ!"
شاد صاحب نے دیا سلائی جلا کر سگریٹ سُلگایا اور پوچھا "چراغ کہاں
ہے؟"
"وہ رہا اُدھر کھڑکی کی طرف کارنس پر۔ مگر اُس میں تیل بھی ہو؟" ظفر صاحب

جواب دیا۔

شادؔ بولے "چلو نہ سہی، اندھیرے کا بھی اپنا لطف ہوتا ہے۔ یہ میرے ساتھ رشیؔ پٹیالوی ہے۔ آج ہمارا مہمان ہوگا" یہ کہتے کہتے وہیں چٹائی پر دراز ہوگئے۔ مجھے بھی وہیں سونے کے لئے کہا۔ ظفر کے مکتبہ کی کچھ کتابیں "ماحول" کے کچھ پرچے اُٹھا کر سرہانے رکھتے ہوئے بولے "تکیہ کا کام اِن سے لو" تمام رات مچھر اور گرمی نے ستایا۔ کمرہ میں سخت تعفّن، نہ پینے کو پانی، نہ تازہ ہوا۔ نیند نہ آئی۔ صبح اُٹھے تو آنکھیں بوجھل اور سر بھاری تھا۔ کہنے لگے "میاں! اِسے کہتے ہیں ہمسریاراں دوزخ ہمہ یاراں جنّت!"

آدمی اور فرشتہ ——●

نوبہار صابرؔ سے گہرے تعلّقات اور دوستانہ مراسم تھے جب بھی مِلتے اِن کا ذکر احترام سے کرتے۔ ایک بار ذکر آیا تو کہنے لگے "بھئی! کیا بات ہے۔ اُس آدمی کی۔ مکمّل انسان ہے۔ بس ایک ہی کمی ہے۔ شراب اُسے پینی آجائے تو آدمی سے فرشتہ ہوجائے!"

ایک اور موقع پر پٹیالہ میں نوبہار صابرؔ سے مِلے اور کہا "کہئے شاعرِ اعظم صاحب! کیا حال ہے؟" کرپال سنگھ بیدارؔ بھی وہاں موجود تھے۔

صابرؔ صاحب نے بیدارؔ صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "شاعرِ اعظم تو یہ رہے!" جھٹ مُسکراتے ہوئے بولے "یہ تو گورنمنٹ کے شاعرِ اعظم ہیں!"

نیند حرام ——●

ایسکورٹس لمٹیڈ کے زیرِ اہتمام فریدآباد میں گذشتہ برس ایک آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ منتظمین میں ایسکورٹس کمپنی میں ہونے کی وجہ سے میں بھی شامل تھا۔ مشاعرہ گئی رات تک چلتا رہا اور رات کے دو ڈھائی بجے ختم ہوا۔ مشاعرہ کے اختتام پر شعراء حضرات کو دِلّی میں اُن کے گھروں تک پہنچانے کی ذمّہ داری بھی ہم منتظمین نے اپنے اوپر لی تھی۔ چار کاریں اِس مقصد سے تیار رکھی تھیں۔ کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحرؔ، جوشؔ ملیح آبادی، بسملؔ سعیدی، عزیزؔ وارثی اور جمیلہ بانوؔ کو اپنی کار میں لے کر چلے۔ ساغرؔ نظامی اور بیگم ساغرؔ، آزادؔ اور پرؔواز ایک دوسری کار میں سوار ہوئے۔ نوبہار صابرؔ، اکمل جالندھری، عرشؔ ملسیانی، قیسؔ جالندھری اور شادؔ کو میں اپنی کار میں فریدآباد سے دہلی لایا۔ عرشؔ صاحب کو ماڈل ٹاؤن اور شادؔ کو تیمارپور چھوڑنا تھا۔ عرشؔ صاحب نے فرمایا۔ "پہلے شادؔ کو پہنچا دو"۔ میں نے تیمارپور کا رُخ کیا۔ کار سڑک پر چھوڑ کر میں شادؔ کو سڑک سے اُس کے کوارٹر تک پہنچانے گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ شادؔ وہیں برآمدہ میں فرش پر دراز ہوگئے۔ میں نے اصرار کیا "دروازہ کھلوا کر اندر جاؤ"

کہنے لگے "بیوی اور بچّے کی نیند کیوں حرام کروں؟ تم نے صرف میری نیند حرام کرنے کے دام چکائے ہیں"

انگور کی بیٹی ——●

کچھ سال ہوئے اچانک بیمار ہوکر میں دِلّی میں خوشترؔ صاحب کی کوٹھی پر زیرِ علاج تھا۔ خوشترؔ صاحب سے معلوم ہوا تو شادؔ حال پُوچھنے آئے۔ پُوچھا "کیا حال ہے؟"

میں نے مختصراً بیماری کی وجہ بیان کی۔ بولے "کیا کھاتے ہو؟" میں نے کہا "صرف اُبلی سبزیاں" پُوچھا "کیا پیتے ہو؟" میں نے جواب دیا "پھلوں کا رس" کہا "سب چھوڑ دو۔ انگور کی بیٹی سے شوق فرماؤ۔ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ سب روگوں کا ایک علاج ہے!"

دُعا ——●

ہر سال مجھ سے کمپنی کی ڈائری کا مطالبہ ہوتا۔ میں کوئی نہ کوئی ڈائری تحفتہً پیش کر دیتا۔ گذشتہ سال ڈائری میں بٹوہ بھی شامل تھا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور کہنے لگے "بہت خوب ہے!" میں نے کہا "بٹوہ بھی ساتھ ہے" بولے۔ "مگر خالی ہے۔ میری جیب کی طرح۔۔ نہیں نہیں۔ ادّھے کی طرح!" جیب سے ٹھرّے کا ادّھا نکال کر جس میں ایک آدھ پیگ باقی تھا گٹ گٹ چڑھایا اور یہ جا وہ جا! میں کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ جاتے جاتے کہتے گئے۔۔ "ڈائری کا شکریہ! خدا تمھیں شراب پینے کی توفیق دے!"

ہم قافیہ ——●

سنٹرل لائبریری پٹیالہ میں کُل ہند مشاعرہ ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی غزل کا شعر پڑھا ؎

چھان لیں خاک اُن کے کُوچے کی
پھر یہ آوارگی مِلے نہ مِلے

شادؔ نے بے اختیار بڑھ چڑھ کر داد دی۔ دوسرے شعر پر ؎

اُن کا دیدار تو محال نہیں
تابِ نظّارگی ملے نہ مِلے

شاد نے کہا: "پھر پڑھیئے۔" میں نے دوبارہ پڑھا۔ شاد نے پھر کہا۔ "مکرّر!" میں یہ سوچ کر کہ کوئی خامی نہ ہو، مقطع پڑھ کر بیٹھ گیا۔ میرے اور شاد کے درمیان ایک "گندم نما جَو فروش" قسم کے مہربان بیٹھے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے: "شاد نے شعر پر اعتراض کیا ہے۔" میں نے پُوچھا: "کیا؟" وہ صاحب بولے: "شاد کا کہنا ہے کہ صرف "تابِ نظّارہ" چاہیئے۔ تابِ نظّارگی محض تکلّف ہے۔" میں نے جواب میں کہا: "اگر شاد "نغمہ" کی جگہ "نغمگی" لکھ سکتا ہے تو تابِ نظّارہ کی جگہ تابِ نظّارگی بھی ہو سکتا ہے۔ (شاعری نغمگی کا ٹکڑا ہے۔ ضرب و تقسیم کا سوال نہیں۔ شاد) ویسے سرِ مشاعرہ ٹوکنے کا حق شاد کو نہیں اُن کے والد میرے چچا اُستاد دردؔ نکودری کو پہنچتا ہے۔ اِس لئے کہ شاد بھی میری طرح عروض و فن کے میدان میں ابھی کامل نہیں ہے۔"

شاد نے پُوچھا: "کیا کہتے ہیں؟" وہ حضرت شاد کے کان میں کہنے لگے: "رشی صاحب کہتے ہیں اِن کا باپ اعتراض کرے تو کرے یہ ابھی بچّہ ہے۔"

شاد سُن کر اُس وقت تو خاموش رہے مگر مشاعرے کے اختتام پر میرے قریب آئے اور غصّہ میں بولے: "تمھاری یہ جُرأت؟" میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ "تمھاری یہ ہمّت؟" شاد مُسکرا دیئے اور مجھ سے بغلگیر ہو کر کہنے لگے: "چلو فیصلہ ہو گیا۔ جُرأت اور ہمّت ہم قافیہ ہیں اور جائز ہیں۔ مطلع میں ہوں تو بھی اِن پر ایطا کا الزام نہیں آتا۔"

معاوضہ ———●

گزشتہ برس لدھیانہ میں ایک مشاعرہ میں میری دعوت پر شاد بھی شامل ہوئے۔ منتظمین نے بطورِ آرگنائزرِ مشاعرہ شعرا حضرات کو معاوضہ کی ادائیگی کا معاملہ بھی مجھ پر چھوڑ دیا۔ میں نے شاد کو دعوت نامہ میں لکھا تھا: "کُل مِلا کر پچھتّر مِلیں گے۔" جواب میں اُنھوں نے لکھا: "تمھاری وجہ سے قبول ہیں۔" شاد تشریف لائے۔ منتظمین اُن کے شراب کا رسیا ہونے کے راز سے واقف تھے۔ اِس لئے انتظام ہو گیا۔ مگر اُنھوں نے شراب مُنہ سے نہ لگائی۔ میں نے وجہ پُوچھی تو بتایا۔ "ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کر رہا ہوں۔" میں سُن کر بہت خوش ہوا۔ قبلہ جوش ملسیانی بھی تشریف فرما تھے۔ شاد سے کہنے لگے: "پہلے بھی کئی بار ایسا سُنا ہے۔" شاد نے کہا: "حضور! اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ ہدایت کا پابند ہوئے بغیر چارہ نہیں۔"

مشاعرہ کے خاتمہ پر میں نے معاوضہ کی رقم کا لفافہ شاد کی جیب میں ڈالتے ہوئے چُپکے سے کان میں کہا: "۷۵ کی جگہ ۹۵ کر دیئے ہیں۔" کہنے لگے: "واہ بانکے لالا اگر ہر جگہ شراب نہ پینے کا یوں بیس روپیہ معاوضہ ملے تو کون کافر اِسے مُنہ لگائے!"

جھک مار ———●

گزشتہ کچھ سالوں سے بیشتر جرائد میں شاد کے نثر مضامین کثرت سے اشاعت پذیر ہو رہے تھے۔ ایک ملاقات میں میں نے کہا: "شاد بھائی! تمھارے نثر کے مضامین بھی اپنی جگہ خوب ہیں مگر تمھارے شعری کمال کے مشتاق کہاں جائیں جس کا کوئی جواب نہیں۔ مشاعروں میں اپنے اشعار خصوصاً قطعات سے سامعین کا دل لُوٹ لینے والا شاد اپنے شعری کمال ہی سے زندہ رہے گا۔" ایک لمحہ کے لئے شاد نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا: "سچ کہتے ہو مگر غزلوں، نظموں کا خاطر خواہ معاوضہ کون دیتا ہے۔ نثر کے لئے کاوش اِس لحاظ سے سُود مند ہے کہ ہر فیچر پر بیس سے تیس روپے تک مِل جاتے ہیں۔ اِس لئے جھک مار رہا ہوں۔ کیا کروں۔ اور ہاں! زندگی میں تو مر رہا ہوں۔ موت کے بعد زندہ رہنے کا سامان کون کرے!"

صرف ایک ہزار ———●

نیلئے شرما کی فلم "کنارے" ریلیز ہوئی۔ اِس فلم کے گیتوں کا چرچا چلا۔ مجھے حقیقت معلوم تھی۔ جن دِنوں اِس فلم کے گیت قلمبند ہو رہے تھے شاد ایک مہینہ کے لئے نیلئے شرما کے بُلاوے پر بمبئی گئے تھے۔ میں نے یہ فلم دِلّی میں دیکھی۔ اگلے دن میں شاد سے مِلنے اُن کے دفتر میں گیا۔

میں نے پُوچھا: "بمبئی ہو آئے؟" کہنے لگے: "ہاں بھئی!" میں نے پُوچھا: "کچھ پلّے پڑا؟" کہنے لگے: "صرف ایک ہزار!" میں نے کہا: "بس؟"

کہا: "تمھاری طرح وہ بھی بڑا کائیاں ہے۔ ایک ہزار میں ٹال دیا۔ چلو سَودا کچھ بُرا نہیں رہا۔ صرف ایک دن میں ایک نشست کی محنت ایک ہزار! بمبئی کی سیر، خاطر تواضع الگ . . . کیا بُرا ہے؟"

سرِ شام ———●

اِس برس ہریانہ سرکار بھاشا وِبھاگ کے سالانہ جلسہ میں شاد بھی مدعو تھے۔ رات کو مشاعرہ تھا۔ دن میں میرے ہاں تشریف لائے۔ پروگرام دریافت

کرنے پر بتایا "رات کی گاڑی سے دِلّی واپس جاؤں گا۔" میں نے ایک رات اور ٹھہرنے کے لئے اصرار کیا اور مشاعرہ ختم ہونے پر کہا "چلو! گھر چلو!" بولے "آج مُوڈی ہوں!" میں نے کہا "جی بھر کر شوق پورا کرنا۔ پُوری بوتل موجود ہے" کہنے لگے "کم بخت! اِسرِ شام یہ دریا دِلی کہاں تھی؟"

ناشاد ———●

بزمِ ادب چنڈی گڑھ کی دس سالہ کارگزاری کی رُوداد میں نے "آتشِ نغمہ" کے نام سے شائع کی۔ شاد کے تعارف میں لکھا "نام: نریش کمار، تخلّص: شاد، ولادت: دسمبر ۱۹۲۸ء بہ مقام نکودر، ضلع جالندھر۔ آپ کے والدِ محترم لالہ نوہریا رام دردؔ نکودری پنجاب کے نامور شاعر ہیں اور صحافت میں آپ کا خاص مقام ہے۔ نئی پود کے شاعروں میں شاد کا بھی نہایت ممتاز مقام ہے۔ کئی کتابوں کے کامیاب مصنّف ہیں۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں نئے اسلوب اور انوکھے انداز سے کہتے ہیں۔ شعر و ادب کے ہر حلقے میں مشہور و مقبول ہیں۔ آپ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اِدھر آپ اسٹیج پر آئے اُدھر سُننے والوں کی فرمائشوں پر فرمائشوں کا شور بلند ہوا۔"

میں نے "آتشِ نغمہ" کی جِلد پیش کی۔ پڑھ کر بے حد مسرور ہوئے۔ اپنا تعارف دیکھ کر بولے "یہ بھی تو لکھا ہوتا۔ شاد ہے مگر ناشاد رہتا ہے۔"

سرقہ ———●

۱۹۵۱ء کا ذِکر ہے۔ نیلئے شرما مرحوم جو جوتشی ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور شاعر ہونے کا دعویٰ بھی کرتے تھے، نیز ناظم تخلّص کرتے تھے، شملہ میں مقیم تھے۔ شاد اُن کے بُلاوے پر وہاں گئے۔ اتفاق سے میں بھی وہیں تھا۔ ایک دن ہم دونوں سیر کے لئے نکلے۔ شاد صاحب نے تازہ کلام سُنانے کے لئے اصرار کیا۔ میں نے ایک غزل سُنائی۔ مطلع تھا ؎

شمع جل کر بُجھ گئی خاموش پروانہ ہُوا
کل ہُوا جو حادثہ وہ آج افسانہ ہُوا

اور مقطع ؎

رنگ لایا اُن کی نظروں کا تصوّر اے رشی
دل سے ہم بیگانہ ہیں دل ہم سے بیگانہ ہُوا

شاد نے غزل توجہ سے سُنی اور اپنی پسند کے اشعار پر مناسب داد دی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ پھر ایک دن شاد صاحب نے نیلئے شرما ناظم سے کلام سُنانے کی فرمائش کی۔ ناظم صاحب نے سرہانے کے نیچے کچھ ٹٹولتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر ایک اہم سرکاری کام کے لئے چیف منسٹر کی کوٹھی پر جانے کے لئے کہا۔ چنانچہ میں کمرہ سے باہر چلا گیا۔ ناظم صاحب نے وہی میری غزل مقطعے میں رشی کی جگہ ناظم رکھ کر شاد صاحب کو سُنا ڈالی۔ اُسی دن شام کو میں اور شاد جو گھومنے نکلے تو راستے میں شاد کہنے لگے "بھئی رشی! وہ غزل پھر سُناؤ" میں نے فرمائش پوری کی۔ شاد سُن کر خوب ہنسے اور کہنے لگے "رشی! تم اِس غزل سے دست بردار ہو جاؤ تو میں ناظم صاحب کے لئے اِس غزل کے مقطعے میں لفظ ناظم کی برمحل نشست اور دُرست وزن کی کاوش کروں۔ پھر دیکھیں کون، کیسے سرقہ کے اِلزام سے بَری ہوتا ہے۔"

پیش گوئی ———●

ماہِ مارچ سالِ رواں میں مجھے چنڈی گڑھ میں ملے۔ میں نے یاد دہانی کے طور پر کہا "میرے کلام پر جو 'ریگِ رواں' کے نام سے شائع ہو رہا ہے تعارف لکھنے کا اپنا وعدہ نہ بھول جانا!" بولے "سب یاد ہے۔ مگر تم کچھ غزلیں، چند قطعات اور دو چار نظمیں جلد بھیج دو تاکہ اِس فرض سے سُبکدوش ہو جاؤں۔ موت روزانہ گئی رات میرے دروازے پر دستک دینے آتی ہے۔"

میں نے کہا "مریں تمہارے دُشمن!" بولے "سچ کہتا ہوں یقین کرو!" میں نے کہا "ایسی باتیں نہ کرو" یہ کہنے لگے "اگر میں نہ مرا۔ میرے دوست حسد کے مارے مر جائیں گے!"

شاد کے چہرے پر عجیب معصومیت کھیل رہی تھی۔ میں دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔ شاد اپنی موت کی پیش گوئی دو مہینہ پہلے کر گئے تھے۔ اُس وقت کِسے معلوم تھا یہ پیش گوئی سچ نکلے گی۔ شاد آج زندہ نہیں مگر اُن کی یاد زندہ ہے، اُس کا کلام زندہ ہے، اُس کے "سُرخ حاشیے" زندہ ہیں!!

غزلیں

علیم افسر غازی پوری

ہاتھوں میں تار تار قبائے چمن لئے
آئی بہار، زخمِ گل و یاسمن لئے

آئے ہیں وہ چمن میں طلوعِ سحر کے ساتھ
ہر جنبشِ نگاہ میں پہلی کرن لئے

دل کانپتا ہے نکہتِ گل کا چمن میں آج
بادِ سحر چلی ہے ترا بانکپن لئے

کیا دشت اور کہاں کا مقامِ صلیب و دار
ہم تو چلے جنوں کو سوئے انجمن لئے

کچھ اور بھی حیات کے گیسو اُلجھ گئے
اُٹھا ہے کون زلفِ شکن در شکن لئے

افسر بہت قریب سے خوشبوئے زلفِ یار
گزری ہے اپنے ساتھ نسیمِ چمن لئے

حبیب الرحمن راہی

پہلے نظر میں تاب تو پیدا کرے کوئی
پھر اُس کو دیکھنے کی تمنا کرے کوئی

مشتاقِ دید ہو کوئی پردا کرے کوئی
کیا پیرویِ حضرتِ موسیٰ کرے کوئی

جس کا ہر ایک لمحہ اجل کا پیام دے
کیا ایسی زندگی کا بھروسا کرے کوئی

ڈرتا ہوں آ نہ جائے زباں پر کسی کا نام
حالِ دلِ تباہ نہ پوچھا کرے کوئی

بڑھتا ہے سوزِ دل کا سلگتی ہے زندگی
سازِ غمِ حیات نہ چھیڑا کرے کوئی

راہی خدا گواہ کہ میں بے وفا نہیں
ایسا سمجھ رہا ہو تو سمجھا کرے کوئی

اعجاز وارثی سنبھلی

فطرتِ عالمِ رنگ و بو دیکھ کر موسمِ گل سے ہم بدگماں ہو گئے
ٹوٹتے ہی طلسمِ فریبِ نظر قدر دانِ ثباتِ خزاں ہو گئے

اُن کی رعنائیاں اُن کا سحرِ نظر جیسے کیفیتِ شامِ حسنِ سحر
چُپ ہوئے وہ تو کلیوں کو شرما دیا جب ہنسے رشکِ صد گلستاں ہو گئے

کیا اظہارِ غم کیسے شکوے گلے آنکھ بھر آئی ہے آپ کو دیکھ کر
یہ تو آنسو خوشی کے ہیں غم کے نہیں آپ کیوں بے سبب بدگماں ہو گئے

اللہ اللہ یہ میری جبیں کے نشاں فرش کو بخش دی عظمتِ آسماں
بیخودی میں جہاں میں نے سر رکھ دیا خاک کے ذرے بھی کہکشاں ہو گئے

ہم نے دیکھی ہیں اعجاز ہر دور میں انقلابات کی کارفرمائیاں
رہبرِ کارواں راہزن بن گئے، راہزن رہبرِ کارواں ہو گئے

خالد ندیم ایم۔ اے

اک گلبدن کے نام سے اُلفت ہمیں بھی ہے
ہاں کاروبارِ شوق کی فرصت ہمیں بھی ہے

یہ کیا ضرور شغل بھی کچھ ساتھ ساتھ ہو
تنہا شراب پینے کی عادت ہمیں بھی ہے

دونوں ستم زدہ ہیں جہانِ خراب میں
شکوہ ہے آپ کو، تو شکایت ہمیں بھی ہے

گو جھوٹ ہی سے چلتے ہیں سب اپنے کاروبار
اور سچ ہے یہ کہ جھوٹ سے نفرت ہمیں بھی ہے

اس دورِ کشمکش میں ہر اک حادثے کے بعد
رسماً یہی کہیں گے کہ راحت ہمیں بھی ہے

طنزیہ

میری بھارت یاترا

فکر تونسوی

بھارت کی مٹی جو کبھی سونا اُگلتی تھی آج کل سیاست دان اُگلتی ہے۔

جب میں نے ایک سیاست دان مسٹر بھیکم ٹیکم داس سے اِس جدلیاتی تبدیلی کا سبب پوچھا تو اُس نے جواب دیا "بھارت کی مٹی نے سونا اُگلنا بند کر دیا ہے۔ کیونکہ سونا بیرونی ممالک سے سمگل ہو کر یہاں آجاتا ہے۔ لیکن سیاست دان سمگل ہو کر نہیں آسکتے اور نہ ہم سمگل کئے ہوئے سیاست دان پسند کرتے ہیں۔ ہم خالص نیشنلسٹ سیاست دانوں میں یقین رکھتے ہیں۔ اِس لئے ہم اپنی ہی مٹی سے سیاست دان پیدا کر لیتے ہیں۔"

وہ مجھ سے انگریزی زبان میں بات کر رہا تھا۔ وہ بڑے کرّ و فر سے انگریزی بولتا تھا۔ ہندی بولتے وقت وہ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی غیر مُلکی زبان بول رہا ہو۔ گرامر بھی غلط اور تلفّظ بھی۔ میں نے اُس سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ ہندی آپ اپنی مٹی سے کیوں نہیں اُگلتے، غیر مُلکوں سے سمگل کیوں کرتے ہیں۔ بولنے میں آپ کو بہت دِقّت پیش آرہی ہے۔

بھارت میں رہ کر مجھ پر ایک اور حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا کہ یہاں کے لوگ ہر اُس موضوع پر بڑے جوش اور اعتماد کے ساتھ بات کرتے ہیں جس کے متعلق اُن کا عِلم بہت محدود ہوتا ہے ——— مثلاً ہر ہندوستانی چاہے وہ سارا دن جھلّی ہی کیوں نہ اُٹھاتا ہو، سیاست کا ذِکر چھِڑے گا تو فوراً جھلّی اُٹھانا چھوڑ کر بڑے اعتماد اور غصّے کے ساتھ آپ کو بتائے گا کہ پنڈت نہرو کو سیاست کی الف۔ بے بھی نہیں آتی تھی، اور نہ کشمیر کا مسئلہ یوں کھٹائی میں نہ پڑا رہتا ——— اُس کے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ جب تک میں جھلّی بردار رہوں گا اور وزیرِ اعظم نہ بنوں گا، کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہوگا۔

ہر بھارتی سیاست پر گفتگو کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ چاہے وہ ہسپتال میں اپنی زچّہ بیوی کے بطن سے بچّہ پیدا ہونے کے انتظار میں باہر سٹول پر بیٹھا ہو اور کلینک کے اندر سے آتی ہوئی زچّہ کی چیخیں سُن رہا ہو۔ لیکن وہ قریب کے سٹول پر بیٹھے ہوئے آدمی سے یہ ضرور پُوچھے گا "کیوں صاحب! کیا آپ کو بھارت کی ویت نام پالیسی پسند ہے؟"

اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ویت نام ایک زچّہ ہے جو بچّہ جننے سے پہلے کراہ رہی ہے۔ لیکن بچّہ پیدا ہونے ہی میں نہیں آتا اور یہ بچّہ اُس وقت تک پیدا نہ ہوگا، جب تک میٹرنٹی ہسپتال کے بینچ پر بیٹھے ہوئے دو ہندوستانی یہ فیصلہ نہ کر لیں کہ ہندوستان کی ویت نامی پالیسی غلط ہے یا صحیح یا دونوں؟

ایک دن مجھے ایک بھارتی دوست کے ساتھ ایک جنازے میں شریک ہونے کا موقع مِلا اور میں اُس وقت جب ارتھی کو آگ دکھائی جا رہی تھی اور برہمن وید منتروں کا اُچارن کر کے مرنے والے کی آتما کو مستقل سکون ملنے کی دعا کر رہا تھا۔ ارتھی کے ساتھ آنے والے "ماتم پُرسان" قریب ہی گھاس کے پلاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"مرحوم بڑے دانی پُرش تھے۔ اُنھوں نے گئو رکشا کے لئے ایک لاکھ روپیہ دان دیا تھا۔"

"مگر جناب! وہ دان کِس کام آیا؟ جن سنگھ نے اُس روپے کو گایوں کی رکھشا کے بجائے الیکشن پر خرچ کر ڈالا۔ گائے کے نام پر ووٹ مانگے لیکن گائے بھُوکی رہی اور . . ."

"اور وہ خود اسمبلیوں میں پہنچ گئے!"

"شریمان جی! اگر وہ اسمبلی میں نہ جاتے تو کانگرس کے ہوش بھی ٹھکانے نہ آتے، میں تو کہتا ہوں، کانگرس کے بعد جن سنگھ ہی حکومت کرے گا!"

"مگر میرا خیال (معاف کیجئے) آپ سے ذرا مختلف ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا چانس زیادہ ہے اور ہندوستان کا آئندہ وزیرِ اعظم کرشنا مینن بنے گا!"

"کرشنا مینن تو چین کا ایجنٹ ہے!"

"نہیں حضور! وہ سچّا اور صحیح کانگرسی ہے!"

"اور کانگرس ابھی ایک سو سال تک راج کرے گی۔"

لاش کے شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔ اُن شعلوں کی تمتماہٹ میں ماتم پُرسی

کرنے والوں کے چہرے سُرخ نظر آرہے تھے۔ یہ سُرخی اور حرارت آگ کی تھی یا سینے کے اندر دبی ہوئی سیاست کی؟ اِن میں سے کوئی نہیں جانتا۔ ہندوستان میں انسان مرجاتے ہیں، پھُنک جاتے ہیں۔ سیاست کبھی نہیں مرتی، کبھی نہیں پھُکتی۔ سیاست لافانی چیز ہے۔ رُوح کی طرح۔ کیونکہ سیاست ہی بھارت کی رُوح ہے اور رُوح کے متعلق بھارت میں ہزارہا کتابیں (جن کی جلدیں اور چھپائی بڑی خوبصورت ہے) لکھی گئیں۔ لیکن آج بھی رُوح کے متعلق تازہ ترین پوزیشن یہ ہے کہ وہ اب بھی پُراسرار شے ہے اور کسی کو علم نہیں ہوسکا کہ یہ کیوں ہے؟ کہاں سے آتی ہے، چلی کیوں جاتی ہے؟ اور کب تک یونہی آتی جاتی رہے گی —— سیاست بھی ایک رُوح ہے۔ جس کے متعلق بھارتیوں کو کچھ علم نہیں۔ مگر اِس کے باوجود وہ اِس پر زور شور سے بحث کرتے ہیں۔ اِسے لذیذ لقمے کی طرح چباتے

- کریم وہ ہے جو دوسروں کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم رکھے۔
(حضرت شیخ احمد سرہندیؒ)
- جو دوست تمھارے آڑے وقت میں کام نہ آئے وہ تمھارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ (حضرت امام غزالیؒ)
- اگر تم لوگوں سے دولت میں نہیں بڑھ سکتے تو خندہ پیشانی اور حُسنِ خلق ہی میں بڑھ جاؤ۔ (حضرت زہریؒ)
- جس نے کوئی نعمت پائی سخاوت کی بدولت پائی۔
(حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ)
- دُنیا کے حادثات کی تلخی، تلخ دوا کے مثل ہے۔ (حضرت مجدد الف ثانیؒ)

رہتے ہیں۔ بغیر علم کے لقمہ چبانا اور اُس سے لذّت حاصل کرنا میں نے صرف بھارتیوں ہی میں دیکھا ہے۔ یہ ہر اُس موضوع پر بڑے اعتماد سے بات کرتے ہیں، جن کے متعلق انھیں کچھ علم نہیں ہوتا۔

وہ تو کرشنا مینن کے متعلق بھی بات کرتے ہیں۔ حالانکہ کرشنا مینن کے متعلق بھی ابھی انھیں کچھ علم نہ ہوسکا کہ یہ پتلی لمبی، لم تڑنگی سی شے آخر کیا بلا ہے؟

سیاست کے بعد بھارتیوں کی اہم دلچسپی دھرم ہے —— کھانا شروع کرنے سے پہلے اور عدالت میں، ہتھکڑی پہن کر آنے کے بعد، ہر موقع پر وہ دھرم کی عینک لگالیتے ہیں۔ اِس عینک میں یہ خوبی ہے کہ دھندلی چیزوں پر مزید دھند

پھیل جاتی ہے اور دُھند جتنی زیادہ گہری ہوتی ہے بھارتی اُتنا ہی زیادہ سکونِ قلب حاصل کرتے ہیں۔

دھرم کا استعمال (غلط زیادہ اور صحیح کم) میں نے دوسرے ملکوں میں بھی دیکھا ہے۔ لیکن بھارت میں اسے بطور آکسیجن گیس استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں دھرم کی آزادی عام ہے مگر دھرم کی غلامی اُس سے بھی زیادہ عام ہے۔ دھرم کا نام لے کر چور کمندیں پھینکتے ہیں اور جج اُن چوروں کو دھرم کی قسم دلا کر سزا دیتے ہیں۔ کسی دھرم شاستر میں لکھے ہوئے ایک فقرے کو ہاتھ میں لے کر لوگ بازاروں میں آجاتے ہیں اور خوبصورت بلڈنگیں پھونک دیتے ہیں۔ میں نے ایسی جلی ہوئی ایک بلڈنگ دیکھی۔ جس میں ایک دن پہلے بھارتیوں کے ایک دھارمک گرنتھ رامائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ لیکن دھرم کے شیدائیوں نے یہ بلڈنگ اِس لئے جلا ڈالی کیونکہ اُن کے خیال میں بلڈنگ کا مالک بلیک مارکیٹیا تھا، اِس لئے اُنھوں نے دھرم کی حفاظت کے لئے بلڈنگ اور رامائن دونوں کو آگ لگا دی!

ہر بھارتی اپنے دھرم کی حفاظت کرتے کرتے کسی کو قتل کر دیتا ہے یا خود قتل ہو جاتا ہے۔ وہ ہیرو بن جاتا ہے یا شہید کہلاتا ہے۔ اُس کی قبر پر دیئے جلائے جاتے ہیں اور اُن دیئوں کے لئے تیل وہ لوگ سپلائی کرتے ہیں جو تیل کے بڑے بڑے کارخانوں کے مالک ہیں۔ وہ دھرم کی خاطر تیل بیچتے ہیں اور تیل کی خاطر دھرم کو بیچتے ہیں۔ میں نے جب تیل کے ایک سوداگر سے استفسار کیا کہ تمھیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ تو اُس نے بھینچی ہوئی عیار مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا: "میں بزنس مین ہوں اور بزنس میں کیسی شرم؟ کیسا اخلاق؟ بزنس میں ہر وہ چیز بیچی جا سکتی ہے، جس سے منافع حاصل ہو۔ چاہے وہ چنے کی بوری ہو یا دھارمک جذبات ہوں۔ بھارتیہ سبھیتا کی یہی عظمت ہے کہ ہم چوری اور ڈاکہ زنی کو گُناہ سمجھتے ہیں، منافع کو نہیں۔ دھرم ہمیں منافع کی اجازت دیتا ہے، ڈاکے کی نہیں۔"

ایک ہفتے بعد مجھے ایک ہندوستانی اخبار کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اِس بزنس مین نے ایک ہندوستانی یوگی کی یادگار بنانے کے لئے پانچ لاکھ روپے کا ایک مندر تعمیر کروایا تھا اور جس دن اُس مندر کا اُدگھاٹن ایک منسٹر سے کرایا جا رہا تھا، عین اُسی وقت اُس کی تیل فیکٹری کے مزدوروں پر پولیس گولی چلا رہی تھی۔ کیونکہ کارخانہ دار نے مزدوروں کو بونس دینے سے انکار کر دیا تھا اور مزدور بغاوت پر اُتر آئے تھے۔ اُس بغاوت کو کچلنے کے لئے بندوقوں سے مسلح پولیس بُلائی گئی تھی۔ کارخانہ دار کا بیان یہ تھا کہ اُس نے بونس کا سارا روپیہ مندر کی تعمیر پر خرچ کر دیا ہے۔ اِس لئے میں مزدوروں کو دینے کے لئے بونس کا روپیہ کہاں سے لاؤں۔ میں یا تو بونس دے سکتا ہوں یا مندر تعمیر کر سکتا ہوں، دونوں کام بیک وقت نہیں کر سکتا۔ اِس لئے پولیس کا دھارمک فرض ہے کہ وہ دھرم کی رکھشا کے لئے مزدوروں پر گولی چلائے۔

اور مندر کا اُدگھاٹن کرتے ہوئے منسٹر صاحب نے نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا: تیل کا کارخانہ ہو یا بھگوان کا مندر، دونوں عبادت گاہیں ہیں۔ مزدوروں نے بونس کی آڑ لے کر دھرم پر جو تشدد کیا ہے، وہ بھارتیہ سنسکرتی کی سپرٹ پر تشدد ہے۔ کارخانے کا تیل بھگوان کی پوجا کے کام آتا ہے۔ جو پانچ مزدور پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوئے ہیں وہ بھگوان کی پوجا میں خلل ڈالنے کے جرم میں ہلاک ہوئے ہیں۔ دراصل انھیں پولیس نے

- مفلس جو خوشامد پر آمادہ نہیں ہوتا اور امیر جو مغرور نہیں ہوتا، دونوں خوب ہیں۔ (کنفیوشس)
- اِتنا کماؤ جتنا ہضم کر سکو، اِتنا پڑھو جتنا جذب کر سکو۔ (حکیم بوعلی سینا)
- دُنیا میں سب سے اچھا سوال یہ ہے کہ میں کون سی نیکی کرتا ہوں۔ (فرینکلن)
- عمل یا اقدام ہی ہماری تمام زندگی کا سرمایہ ہے۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- رفعِ شر کے لئے جھوٹ بولنا بُرا نہیں۔ (جالینوس)

ہلاک نہیں کیا، بھگوان نے خود ہلاک کیا ہے۔ کیونکہ مارنا اور پیدا کرنا بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔ پولیس تو صرف بھگوان کے حُکم کی تعمیل کرتی ہے۔ میں ہلاک شُدگان کے پریوار کی مدد کے لئے پانچ ہزار روپیہ منظور کرتا ہوں اور تیل کے کارخانہ دار سیٹھ جھینگر مل سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ انسانی ہمدردی کے طور پر مرنے والوں کی بیواؤں کے لئے پچیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیں۔"

ایک بھارتی کا قتل اور پچیس روپے ماہانہ بونس ——— بھارت میں قتل کرنے کا یہی ریٹ ہے اور یہ ریٹ دھرم شاستروں کے قوانین کے مطابق طے کیا جاتا ہے۔ بھارت میں کوئی کام دھرم شاستروں کے خلاف نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ دھرم شاستروں میں صرف ڈاکوؤں کی رہنمائی نہیں کی گئی، انسانی ہمدردی کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ بونس کے ریٹ اور تیل کی کوالٹی ——— بھارتیہ شاستروں

میں ہر شے کا ذکر بڑی ذمّے داری سے کیا گیا۔

ہندوستان میں دھرم کی بانہیں سلم ایریا کی جھونپڑی سے لے کر وزیر کے راج محل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جھونپڑی اور محل کے درمیان لکڑیوں کا جو پُل ہے اُس کا نام دھرم ہے۔ اُس پُل کی مرمّت کے لیے انجینئر باقاعدہ کام کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کے کلچر کو قائم بلکہ دائم رکھنے کی ذمّے داری انجینئروں پر ہے اور بھارت میں انجینئروں کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ نائیوں کی گلی سے لے کر وزیر کے بنگلے تک دھرم کی حفاظت کرنے والے انجینئروں کا ایک لمبا کیو لگا رہتا ہے۔ میں نے ناجائز شراب کے سمگلروں تک کو ہنومان جی کے مندر میں پرشاد چڑھاتے دیکھا ہے اور وزیر کی بیوی تو اپنے خوبصورت اور دلکش بنگلے کے ایک کونے میں ہنومان جی کی مورتی کی پوجا ہر شام کو کرتی ہے تاکہ اُسے رات میں اپنے گناہوں کے بھوت نظر نہ آئیں۔

بھوتوں کو بھگانے کے لیے ہندوستان میں پولیس کی گولیاں اور بھگوتی جاگرن دونوں استعمال کیے جاتے ہیں۔ بلکہ کئی بار تو دونوں ایک ہی جگہ بیک وقت استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں اگر دھارمک روایات زندہ ہیں تو اُس کی وجہ صرف یہی ہے کہ پولیس کی گولیوں اور بھگوتی جاگرن دونوں کو ایک ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس مشترکہ زاویۂ نگاہ کی ہی برکت ہے۔ جس سے متاثر ہو کر ایک بھارتی شاعر نے یہ شعر کہا تھا۔

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

بھارت میں دھرم کا احساس اُس راون کی طرح ہمیشہ زندہ رہتا ہے جس کے دس سر تھے۔ ایک سر کٹنے کے بعد دوسرا سر اُگ آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں دھرم کبھی نہیں مرتا۔ راون کی طرح وہ لافانی ہے کیونکہ راون کو بھی دھرم کے ایک متوالے نے یہ وردان دیا تھا کہ تمھیں کوئی نہیں مار سکتا۔ تمھارا ایک سر مرے گا تو لاکھوں سر اور پیدا ہو جائیں گے۔ دھرم کے راون کو ہندوستان میں آج تک کوئی نہ مار سکا۔ ہر سال ہندوستان میں راون کو مارا جاتا ہے مگر دوسرے سال راون پھر زندہ ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی دھرم کا راون کسی رام کے انتظار میں ہے جو اُسے مستقل طور پر مار دے۔ یہ رام کب پیدا ہوگا؟ رام جانے!!

جواب طلب امور کے لیے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجیے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

دلّی کا خط لندن کے نام

خوشتر گرامی

مائی ڈیر لندن!

آج میں بھارت دیش کا ایک انوکھا واقعہ لکھ رہی ہوں۔ پڑھیئے اور سر دُھنیئے ـــــ اور ممکن ہو تو درس لیجیے۔

یہاں کئی علاقوں میں بظاہر قانون کی حکومت ہے اور یہ علاقے ہند یونین کی حدود میں واقع ہیں۔ مگر وہاں ڈاکوؤں کا راج ہے اور انسانی گوشت پوست کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ لوگ خدا کے بھروسے پر جیتے ہیں اور عافیت سے گزرنے والے ہر سانس پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یہ علاقے راجستھان مدھیہ پردیش میں ہیں۔ اِن میں چنبل گھاٹی خصوصاً بدنام ہے۔

حال ہی میں وہاں سے ایک دلچسپ اطّلاع ملی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے دیش کے ڈاکو تو مفت میں بدنام ہیں۔ وہ لُوٹ مار اور قتل و غارت گری ہی نہیں کرتے "نیائے دھیش" (جج) کا کام بھی کرتے ہیں اور جہاں پولیس اور سرکار جنتا کی مدد کرنے میں ناکام رہتی ہے وہاں وہ کامیاب رہتے ہیں۔

ڈاکو عدالتیں بناتے ہیں، لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں ـــــ راجستھان کی اِطّلاع ہے کہ سمہ پُورہ کے تھانیدار کی پارٹی کا جنگل میں اچانک ڈاکوؤں کی ایک پارٹی سے مقابلہ ہوگیا۔ پولیس کے بیان کے مطابق گولی چلانے کی جگہ سے کچھ ہی فاصلے پر تقریباً سَو ڈاکو دیہاتیوں کے مقدّمات کی سماعت کر رہے تھے۔ انھوں نے باقاعدہ اُن مقدّمات کی فہرست باہر لگا رکھی تھی جن کی سماعت ہونی تھی۔ جس وقت پولیس سے تصادم ہوا اُس وقت ایک نائی کا مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔ اُس کی عورت اِغوا کر لی گئی تھی۔ نائی نے پہلے پولیس اور عدالت سے انصاف حاصل کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ اُس پر اُس نے ڈاکوؤں کی مدد لی اور اِن کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔

ڈاکوؤں نے تمام گاؤں کو اِکٹھا کر کے مقدمہ سُننا شروع کیا۔ ابھی وہ گواہوں کے بیانات قلمبند کر ہی رہے تھے کہ پولیس پہنچ گئی اور گولیوں کا تبادلہ شروع ہوگیا۔ ڈاکو بھاگنے میں کامیاب ہوگئے۔ صرف وہی نائی پولیس کے ہاتھ آیا جس کی بیوی کو اغوا کیا گیا تھا۔

نائی کا ذِکر آیا ہے تو آپ کے یہاں کی ایک نائن کا ذِکر بھی ہو جائے ـــــ مگر یہ روایتی معنوں میں نائن نہیں ہے بلکہ "ہیئر ڈریسر" ہے۔ اِسی لئے اُسے "کاکُل تراش" یا "گیسو سنوار" ہی کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ اِس کا ذِکر ایک عجیب جِدّت کے سلسلہ میں ہوا ہے۔ یہ گلاسگو کی ایک بیس سالہ دوشیزہ مِس ہارٹلے ہے۔ اِس کی آنکھیں حسین ترین قرار دی گئی ہیں اور اُس نے ۱۹۶۹ء کی حسین ترین آنکھوں والی عورت کے طور پر انعام حاصل کیا ہے۔

ججوں نے رائے ظاہر کی ہے کہ شربتی اور سُنہرے بال اور حسین ترین آنکھیں رکھنے کے علاوہ مِس ہارٹلے دلکش شخصیت اور کتابی چہرے کی بھی مالک ہے۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ جس طرح سب سے خوبصورت عورت کو "ملکۂ حُسن" یا "مِس یونیورس" کا خطاب دیا جاتا ہے۔ خوبصورت آنکھوں والی کو کیا کہا جائے گا ـــــ آہو چشم یا نرگسی چشم۔

ابھی تو آنکھوں کی باری۔ کل دہن کی ہوگی۔ پھر لبوں کی ـــــ اور اُس کے بعد نہ جانے کِس کِس عضو کی نمائش اور مقابلہ ہوگا۔ میں تو یہی کہہ سکتی ہوں ڈیر لندن! خدا محفوظ رکھے ؎

آنکھ جو کُچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

لب پر آئیں نہ آئیں۔ لیکن کچھ واقعات نوکِ قلم پر آ ہی جاتے ہیں اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں اور پھر اُن پر حیرت بھی ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کے یہاں کی ایک لیڈی منسٹر نے ایک مزدور کی جو فرمائش پُوری کی وہ ہمارے وزارتی حلقوں میں یقیناً ہلچل کا مُوجب ہوئی ہے۔ آپ کے یہاں کے اخبارات ہی میں اُس کا چرچا نہیں بلکہ یہاں بھی اُسے خوب پبلسٹی ملی ہے ـــــ میں بربرا کیسل کا ذِکر کر رہی ہوں۔ جن کے صنعتی تنازعات سے مُتعلّق بِل کی مزدور لیڈر مخالفت

کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اخبارات میں اُن کی اِس دریا دِلی اور مزدور نوازی کا چرچا بھی مِلتا ہے کہ جب وہ ایک فیکٹری کا معائنہ کر رہی تھی تو ایک مزدور نے باَوازِ بلند کہا "بربرا مجھے ایک بوسہ تو دو"

بربرا نے بڑی خوشی سے مزدور کو ایک پُرلُطف بوسے سے نواز دیا — یہ دل نواز خبر آپ کے ہاں ہی نہیں میرے یہاں کے اخبارات میں بھی جلی حروف میں شائع ہوئی ہے۔ سنجیدہ اخبارات نے بھی ڈبل کالمی سُرخیوں سے چٹخارے دار انداز اور لچّے دار الفاظ میں شائع کی ہے —— دیکھیے ہمارے یہاں کے مزدور کب اِسے مشعلِ راہ بناتے ہیں۔

ڈیر لندن! میرے مُنہ سے یہ بات عجیب سی معلوم ہوگی۔ اگر میں آپ کے یہاں کی ایک جواں سال خاتون ممبر پارلیمنٹ کے انتخاب پر اعتراض کروں۔ جس مُلک کی وزیرِ اعظم عورت ہو وہ برطانیہ میں بائیس سالہ مِس ڈیولن کے انتخاب پر کِس مُنہ سے اعتراض کرے۔ مگر دِلّی اور لندن کا فرق یہ ہے کہ یہاں کم و بیش وہ عورتیں سیاسی میدان میں آتی ہیں جو بچّوں اور خانہ داری کی منزل سے گزر چکی ہیں یا جنھوں نے زندگی میں کبھی بچّوں سے آغوش کو بوجھل کرنا پسند نہیں کیا اور اِس مصیبت سے ہمیشہ آزاد رہی ہیں۔ اگر بیس بائیس سالہ لڑکیاں ممبر پارلیمنٹ بننے لگیں تو پھر اکثر گھروں کی چار دیواریاں جو پہلے ہی کلرکوں اور ٹائپسٹوں کی فوج میں لڑکیوں کی بھرتی ہونے سے خالی نظر آتی ہیں، یکسر خالی ہو جائیں گی۔

شاید اِسی لئے اکبر الہ آبادی نے تعلیمِ نسواں کے ضمن میں کہا تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم ضروری تو ہے مگر وہ خاتونِ خانہ ہوں۔ سبھا کی پری نہ ہوں! اور شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال کی دُور رس نظروں نے آزادیِ نسواں کی رفتار سے تاڑ لیا تھا اور کہا تھا ؎

اظہارِ تشکّر

میرے داماد اور ہند و پاک کے شُہرت یافتہ، مقبول و محبوب شاعر جناب نریش کمار شادؔ کی المناک موت پر اُن کے عقیدت مندوں اور کرمفرماؤں کی طرف سے ہمیں سیدھے اور بذریعہ "بیسویں صدی" زائد از چار صد تعزیت نامے اور ماتمی تار موصول ہوئے ہیں۔ چونکہ فرداً فرداً جواب دینا مشکل ہے۔ لہٰذا بذریعہ بیسویں صدی ہم اُن تمام اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اختر بھنگالوی
ورشا رانی بیوہ نریش کمار شادؔ۔ ۱۶۲۵ تیمار پور۔ دہلی

اِس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو اب یہ سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اِس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرّد کا گلوبند

ہمارے آئین اور ہمارے مُلک نے عورت کا مقام بہت بلند کیا ہے اور زمانۂ قدیم میں اِس مُلک میں عورت سے جو ناانصافیاں ہوئی ہیں اُن سب کا آزادی کے بعد ازالہ ہو گیا ہے —— اور عورت کے سر پر وزارت، سفارت، گورنری اور پھر وزارتِ عظمیٰ کا تاج رکھ کر، پُورے طور پر کفارہ ادا کر دیا گیا ہے —— اصل میں تعلیم نسواں، آزادیٔ نسواں اور سیاسیات میں عورتوں کی شرکت الگ الگ چیزیں ہیں۔ اِن کے درمیان خط نہ کھینچا گیا اور سب عورتیں کلرک، ٹائپسٹ، اسٹینوگرافر، میونسپلٹی، اسمبلی اور پارلیمنٹ کی ممبر، وزیر اور گورنر بننے لگیں تو پھر عورت خاتونِ خانہ نہیں سبھا کی پری ہو جائے گی —— اور مرد گھر میں کچن کی نگرانی اور بچّوں کی پرورش کیا کریں گے۔

عورت اور اُس کے کردار کا ذِکر چلا ہے تو پھر اپنے ہاں کی ایک ماں کا بھی ذکر سُن لیجئے —— ہمارے یہاں تو صنفِ نازک کے کردار کا تصوّر بھی جُداگانہ ہے۔ مگر ماں ڈائن تو کبھی ہو نہیں سکتی۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ آپ یقین کریں نہ کریں میمورس (فرانس) میں ایک ماں نے پولیس کے رُوبرُو اِس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ پچھلے پندرہ برسوں میں اُس نے اپنے سات ننّھے بچّوں کو ہلاک کیا ہے۔ پولیس نے اُن میں سے دو بچّوں کی لاشیں باغیچے سے کھود نکالی ہیں۔

اِس عورت کا نام صرف ایس۔ ایل بتایا گیا ہے۔ پندرہ برس قبل اُس نے اپنے دو نوزائیدہ بچّوں کو ہلاک کیا تھا۔ اِس کے بعد سے اُس کا یہ شغل جاری رہا۔

مائی ڈیر لندن!

ہمارے یہاں کی عورتوں نے ابھی اِتنی ترقّی نہیں کی ہے۔ وہ کلرک ہوں یا ٹائپسٹ، وزیر ہوں یا گورنر۔ اُن میں عورت پن بھی ہے اور ماں بننے کا پاکیزہ جذبہ بھی۔

بہرحال عورت ذات کے متعلق آپ سے اور آپ کے پڑوس سے جو خبریں

انسان کی موت

عبدالمتین نیاز

وہ جلاتا رہا شبِ غم میں
دیپ اشکوں کے روشنی کے لئے
موت پر اُس کی روئے کیوں نہ حیات
مرگیا شادؔ زندگی کے لئے

★

خواب ٹُوٹا بکھر گیا یارو
کیا لمحہ گذر گیا یارو
مرگیا شادؔ تو یہ لگتا ہے
ایک انسان مرگیا یارو

ہمیں ملتی ہیں وہ بہت پریشان کُن ہیں۔ کیونکہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اور عورت کو دیکھ کر عورت!

بُرا نہ مانیں یہ تو ؏
مقطع میں آپڑی تھی سُخن گُسترانہ بات
اِس لئے اِتنی بات لکھ دی —— اچھا بائی بائی

آپ کی
دِلّی

("ایشیا" ویکلی برمنگھم لندن کے شُکریہ کے ساتھ)

صحت و زندگی

۱ • چنا — گیہوں سے زیادہ مفید

بدن کو غذا اور قوت پہنچانے میں چنا کسی طرح گیہوں سے کم نہیں۔ بعض اعتبار سے اسے گیہوں پر ترجیح حاصل ہے۔ چنا کی تاثیر گرم و خشک ہے۔ لیکن بھگویا ہوا چنا سرد ہوتا ہے۔ چنوں یا چنے کی دال کو رات کے وقت پانی میں بھگو دیا جائے اور صبح نہار منہ کھا کر اوپر سے وہ پانی، جس میں چنے بھگوئے گئے تھے شہد ملا کر پی لیا جائے۔ اس سے جسم میں طاقت اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ بھنے ہوئے چنوں کو پیس کر دو تولے کی مقدار ایک انڈے کی نیم برشت زردی اور دو تولے شہد میں ملا کر صبح کو نہار منہ کھانے سے بے اندازہ قوت پیدا ہوتی ہے در مادۂ تولید میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

چنا قبض کشا ہے اور اجابت بافراغت لاتا ہے۔ چنے کی دال قابض ہے۔ زیادہ کھانے سے پیٹ پھولتا ہے اور ریاح پیدا ہوتی ہے۔ چنا پیشاب آور اور حیض آور ہے۔ اس کے استعمال سے دودھ پلانے والی عورتوں کا دودھ بڑھتا ہے۔ جسم اور کمر کو قوت دیتا ہے۔ خون کو صاف کر کے بدن کو موٹا کرتا ہے۔ خون اور سوداوی امراض کو دور کرتا ہے۔

بیسن کی روٹی تر کھانسی، نزلہ و زکام میں مفید ہے۔ کسی قدر قابض اور دیر ہضم ہے۔ اس کی اصلاح انار دانہ یا گھی ملا دینے سے ہو جاتی ہے۔ تیل میں تیار کی ہوئی چنے کے بیسن کی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ان سے ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔

پھیپھڑوں کے لئے چنا ایک مفید اور مقوّی غذا ہے۔ کمزور اور تپ دق کے مریضوں کے لئے اس کا شوربہ زود ہضم اور طاقت بخش غذا ہے۔ خوب بھوک لگاتا ہے اور کمزور جسم کو طاقت بخشتا ہے۔

سفید اور زرد چنے کی نسبت سیاہ چنے کا شوربہ زیادہ مفید ہے۔ چنا تلی، جگر اور گردے کی بیماریوں میں فائدہ بخش ہے۔ مصفّی خون بھی ہے اور مقوّی بھی۔ چنے زیادہ کھانے سے ریاح پیدا ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کے معدے کمزور اور نازک ہوں انھیں چنے اور ان سے بنی ہوئی چیزیں زیادہ مقدار میں نہیں کھانی چاہئیں۔

۲ • بلند عزم ہواؤں کے رُخ بدلتے ہیں

ناموافق حالات میں بھی عزم و حوصلہ کا دامن نہ چھوڑیئے۔ ورنہ حالات کا اندھیرا اور گہرا ہو جائے گا ؎

زورِ طوفاں دیکھ کر موجوں سے جو کترا گیا
اُس زبوں ہمت کی قسمت میں کنارا بھی نہیں

نامساعد حالات میں بھی حوصلہ کا دامن نہ چھوڑیئے۔ حوصلہ بلند رکھیے۔ مشہور مفکّر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے — "حوصلہ دل کا بادشاہ ہے۔ حوصلہ پست ہوتے ہی دوسری ذہنی قوتیں بھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔ حوصلے کی رہنمائی کے بغیر کوئی بھی طاقت آگے نہیں بڑھتی۔ حوصلہ راہ دکھاتا ہے تو دوسری طاقتیں بھی اُبھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔"

حالات سے شکست قبول کر کے حوصلہ کا دامن چھوڑ دینے والا انسان اُس بے وقوف کی طرح ہے جو سورج کی طرف پیٹھ کر کے ساری دنیا میں اندھیرا دیکھتا ہے۔ اگر وہ حالات کے اندھیرے کو شکست دینا چاہتا ہے تو ضرورت ہے کہ وہ اُجالے کی طرف منہ پھیرے۔

۳ • انسان صحت سے کیوں محروم ہے؟

آج انسان کی ترقی دیکھ کر فرشتے بھی محوِ حیرت ہوں گے — آج ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

لیکن اِس ایٹمی اور راکٹ کے دور میں جہاں انسان خلائی پرواز کے

ذریعے خلائی منزل کا متلاشی ہے۔ آج بھی صحت و تندرستی کی بے حد ضرورت ہے۔ سائنس کا کارواں رواں دواں ہے۔ نام نہاد مہذب زندگی کو تہذیب و تمدن کا اعلیٰ رُوپ دیا جا رہا ہے، تو دوسری طرف کچھ لوگ اِس خیال میں بھی اُلجھے ہوئے ہیں کہ آج اِتنی نت نئی بیماریاں کیوں پیدا ہو رہی ہیں؟ اور میڈیکل سائنس اِسی دُھن میں مصروف ہے کہ اِن امراض پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے؟ یہ جاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ایمانداری سے سوچیں کہ ہمارے صحتی انحطاط کی اصل وجوہ کیا ہیں؟ اِس ترقی یافتہ دَور میں ہماری صحت کیوں گِرتی جا رہی ہے؟ تو بآسانی اُن اسباب کا سدِّباب ہو سکتا ہے۔

اِس تباہ کن حالت کو بدلنے کے لئے ایک طرف صحت بخش اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے خالص اور مقوّی غذاؤں کا استعمال ضروری ہے تو دوسری طرف روحانی پاکیزگی اور اخلاقی بلندی بھی لازمی ہے۔

۴ • فکر و پریشانی سے بچئے

بہت سے لوگ لاحاصل فکر و پریشانی سے اپنی صحت کو تباہ کر لیتے ہیں۔ لرآپ بھی اُن لوگوں میں ہیں تو اپنی حالت پر سنجیدگی سے نظر ڈالئے۔

پروفیسر گلبرٹ ادکلے نے اِس سلسلے میں لکھا ہے ـــــ کسی معاملے مسئلے پر صرف پریشانی اور سوچ سے اپنی صحت کو روگ لگانے کے بجائے لی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی معاملہ ایسا در پیش ہے جو آپ کے سکون و اطمینان کو درہم برہم کر رہا ہے تو فوراً اُسے دُور کرنے ۔لئے عمل اختیار کیجئے۔ پریشانی اور خوف سے ذہن اور جسم کو اذیّت میں تلا نہ کیجئے۔ کسی آنے والے خطرے یا مسئلے کو حل کرنے کے لئے دُور اندیشی سے کام لینا درست ہے۔ لیکن اِس مسئلے کو روگ بنا کر شب و روز اُس کے خیال سے پریشان ہونا غلط ہے۔

۵ • منزلِ مقصود سے ہمکنار ہونے کے لئے

جادۂ حیات پر چلتے ہوئے اگر آپ منزلِ مقصود سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں تو ایک عظیم مفکّر کے اِن خیالات کو مشعلِ راہ بنا لیجئے ـــــ "جو لوگ اپنی زندگی کا مکمّل ارتقاء چاہتے ہیں وہ راہ میں کبھی رُکتے نہیں۔ اُن کے قدم ترقّی کی راہ پر ہمیشہ آگے بڑھتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا مقصد ہی ہمیشہ آگے ـــــ اور آگے بڑھتے جانا ہے۔ وہ راستے میں رُکتے ہیں صرف تھوڑے وقت کے لئے صرف بیکار بوجھ کو چھوڑنے اور رُکاوٹوں کو ہٹانے کے لئے۔ پھر وہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ اِس طرح چلتے چلتے وہ زندگی کی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔"

۶ • صحیح زندگی کیا ہے؟

کِتنی ہی زندگیاں آپ نے دیکھی ہوں گی، کِتنی ہی زندگیاں آپ کے سامنے ہیں۔ آپ کے گرد و پیش کی زندگیاں آپ کے سامنے ہیں۔ آپ کی اپنی زندگی آپ کے سامنے ہے۔ لیکن صحیح زندگی کیا ہے؟ یہ سبھی جاننا چاہتے ہوں گے۔ مشہور مفکّر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ـــــ "ہماری عہدِ حاضر کی زندگی کا ایک نہایت ہی افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے اسپتالوں کے آدھے بستر دماغی اور اعصابی مریضوں کے لئے مخصوص ہو چکے ہیں۔ اُن میں سے اکثر مریض ماضی کے تہہ در تہہ تفکّرات اور مستقبل کے بے نام اندیشوں کے کمر شکن بوجھ تلے پس چکے ہیں۔ اُن میں سے بیشتر لوگ آج بھی بازاروں اور گلی کوچوں میں پھرتے ہوتے اور مسرّت بھری اور صحت مند زندگی گزارتے ہوتے اگر اُنھوں نے حضرتِ عیسیٰ کے اِن الفاظ پر ذرا بھی توجّہ کی ہوتی ـــــ "کل کے متعلّق فکر مت کرو۔"

آپ اور ہم اِس وقت ابدیتوں کے مقامِ اتّصال پر کھڑے ہیں۔ ہمارے ایک طرف لامحدود ماضی ہے، جو ازل سے جاری ہے اور دوسری طرف مستقبل ہے جو ابد تک جاری



رہے گا۔ ہم امکانی طور پر اِن دو ابدیتوں میں سے کسی ایک میں بھی نہیں جا سکتے اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش کریں گے تو ہم اپنے جِسم اور رُوح دونوں ہی کو تباہی کے غار میں دھکیل دیں گے۔ پھر کیوں نہ ہم اُسی وقت زِندہ رہنے پر قناعت کریں۔ جِتنا عرصہ تک کہ ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ اِس وقت سے لے کر سونے کے وقت تک۔

رابرٹ لوئیس سٹیونسن کہتا ہے ــــــ "ہر شخص آمدِ شب تک اپنا بوجھ اُٹھا سکتا ہے۔ خواہ وہ کِتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو۔ ہر کوئی ایک دن کے لئے اپنا کام کر سکتا ہے خواہ کِتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ ہر شخص غروبِ آفتاب تک اطمینان، مسرّت، استقلال، صداقت اور محبت کے ساتھ اپنی زندگی کے لمحات گزار سکتا ہے اور دراصل صحیح زندگی کا یہی مطلب ہے۔"

۷ ● ہم ناکام کیوں ہوتے ہیں؟

ہمارے آپ کے گرد و پیش ایسے بہت سے لوگ ہیں جنھیں کامیابی کے خاطر خواہ وسائل و ذرائع میسّر ہیں لیکن پھر بھی وہ زندگی کی دَوڑ میں ناکام ہیں۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک انسان کی ناکامی کا خاص سبب اُس کی سُستی اور کاہلی ہوتی ہے۔ تحقیقات کرنے والوں نے اِس عنصر کو معلوم کرنے کی ایک کسوٹی دریافت کر لی ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر کِسی شخص کے ذہن میں الفاظ کا ذخیرہ تو بہت ہے۔ لیکن اِسی کے ساتھ اپنے کام میں وہ خاطر خواہ کامیاب نہیں ہے تو یہ اِس حقیقت کا روشن ثبوت ہے کہ وہ کاہل ہے۔ کافی تعداد میں الفاظ کی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا حافظہ بہتر اور قابلیت اچھی ہے۔ اِس کے باوجود وہ ناکام ہے تو اِس کے سِوا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا کہ وہ پُورے طور پر دل لگا کر کوشش نہیں کر رہا ہے سُست اور کاہل ہے۔

محقّقین کی اِس دریافت کی روشنی میں ناکامی کے اندھیرے میں کامیابی کا اُجالا پا لینا کچھ مشکل نہیں۔

۸ ● کامیاب زندگی کا راز

> افسانہ نمبر دیکھ کر طبیعت خُوش ہو گئی۔ خارجی اور داخلی خُوبیوں کی کیا تعریف کی جائے۔ آپ کی اِدارت ایک قِسم کی کرامت ہے۔۔۔
>
> (ڈاکٹر) منوہر سہائے انور (ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)

خود اعتمادی میں کامیاب زندگی کا راز مُضمر ہے۔ مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ــــ "جوں جوں انسان اپنے کو زیادہ پہچانتا ہے اُس کے ارتقا کی رفتار اُتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ ہم اپنی صلاحیتوں کو جِتنا زیادہ استعمال کریں گے اُتنا ہی زیادہ وہ بڑھیں گی اور ہم اپنی زندگی کے دھارے کو ترقّی کی سمت میں ایک نیا موڑ دے سکیں گے۔"

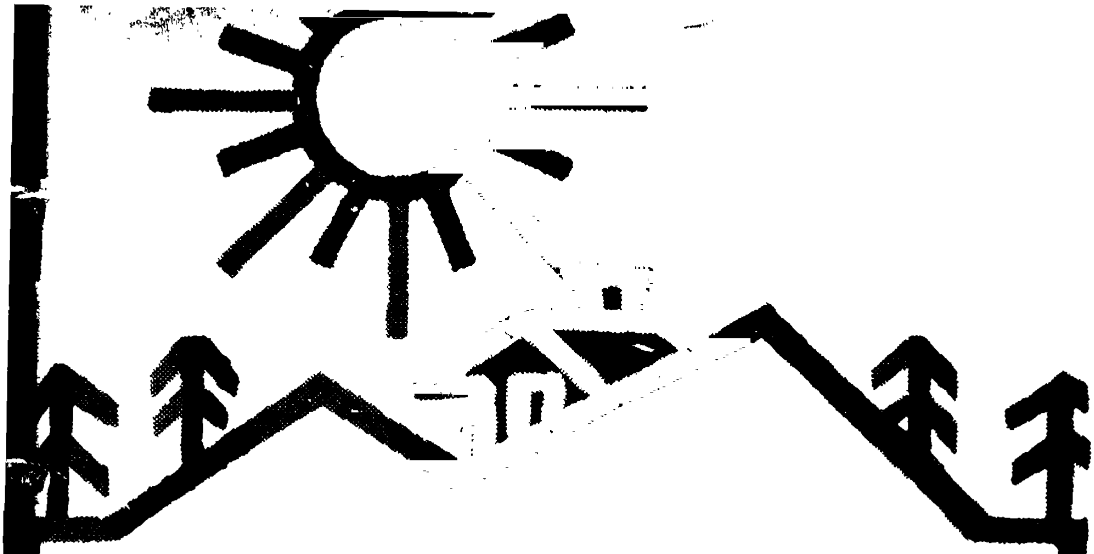
یونان کے ایک مشہور معبد کی محراب پر یہ الفاظ کندہ ہیں ــــ "اپنے کو پہچانو" یہ الفاظ وہاں کے سات عظیم فلاسفروں کے علم کا خلاصہ ہیں۔

۹ ● ہر وقت ہوشیار رہئے

اگر آپ چاہتے ہیں کہ حالات کی عنان آپ کے ہاتھ میں ہو تو ہر وقت ہوشیار رہیے۔ کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔

مشہور مفکّر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے ــــ "کام کرتے وقت خوابوں کی دُنیا میں نہ کھوئے رہیے۔ ایسی عادتیں تنہائی اور آرام کے وقت کے لئے چھوڑ دیجیے۔ ہر وقت ہوشیار رہیے۔ وقت ضائع مت کیجیے۔ اپنے تخلیقی عناصر کو بکھرنے کی کوشش نہ کریں اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے مت دیجیے۔

جو لوگ ہر وقت ہوشیار رہتے ہیں اور وقت ضائع نہیں کرتے، جو اپنی تخلیقی قوتوں کو سلب نہیں ہونے دیتے اور کِسی موقع کو ہاتھ سے نہیں نِکلنے دیتے۔ حالات کی عنان اُن کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔



سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

سوال و جواب

محمد اصغر علی۔ دھنباد

س۔ عورت گھر کی زینت ہے تو دولت؟

ج۔ دولت جیسی آنی جانی چیز سے عورت کا کیا مقابلہ؟

س۔ کوششوں کا انجام ناکامی ہو تو؟

ج۔ بددل نہ ہو جانا چاہئے ——— ناکامی کامیابی کا زینہ بنتی ہے ——— ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے ——— ہر ناکامی اپنے دامن میں کامیابی کا پھول لئے ہوتی ہے۔

ایم۔ اے لطیف آرزو

س۔ خوشتر بھائی! زندگی کے ہر قدم پر ناکامیاں ہیں۔ میں کیا کروں؟

ج۔ اِس حقیقت پر یقین رکھیئے ——— ناکامیاں کامیابی کا زینہ ہیں۔

مس نور جہاں۔ پربھنی

س۔ بھیّا! شادی کی مُبارکباد دینے کے لئے کوئی شعر تحریر فرمائیں گے؟

ج۔ غالباً آپ سہیلی کی شادی پر مُبارکباد دینے کے لئے شعر چاہتی ہیں۔ مُبارکباد سے بہتر ہوگا اِن الفاظ میں اپنی نیک تمنّائیں اور پُرخلوص دعائیں پیش کیجئے ———

تجھ کو اللہ زمانے میں سلامت رکھے
اور ہر گام پہ توفیقِ سعادت بخشے
تیرے اطوار عزیزوں میں پسندیدہ ہوں
اقربا چھوٹے بڑے تجھ سے نہ رنجیدہ ہوں
ہو بلندی تری تقدیر کو حاصل ہر دم
شاد و خرّم رہے دُنیا میں ترا دل ہر دم

س۔ بھیّا! کیا یہ سچ ہے کہ جنھیں منزل نہیں ملتی وہ قسمت کے سہارے ہیں اور اگر یہ سچ ہے تو ہر انسان کیوں اپنی ہمّت ہارتا ہے؟

ج۔ ہر انسان ہمّت نہیں ہارتا۔ بلند حوصلہ انسان ہمّت نہیں ہارتے۔

ابوالکلام آزاد، مولانگر۔ چائباسہ

س۔ ہائی کمشنر اور سفیر میں کیا فرق ہوتا ہے؟

ج۔ سفیر ہی کو ہائی کمشنر کہتے ہیں۔

س۔ مجروح سلطانپوری کا اصلی نام کیا ہے؟

ج۔ بندہ نواز! جب آپ کے نام ابوالکلام آزاد کو لوگ نقلی نہیں سمجھتے تو مجروح سلطانپوری کا نام آپ کو اصلی نام کیوں نہیں معلوم ہوتا۔

س۔ لیڈر اور وکیل میں کیا فرق ہے، جبکہ دونوں کا محبوب مشغلہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنا ہوتا ہے۔

ج۔ وکیل اور لیڈر میں بہت فرق ہے۔ وکیل جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کر کے صرف عدالت میں حاکم کو فریب دیتا ہے۔ لیڈر پوری قوم کو فریب دیتا ہے۔

عتیق احمد صدیقی۔ حیدر آباد دکن

س۔ یادوں کے سہارے کوئی کب تک جی سکتا ہے؟

ج۔ جب تک خود کو فریب دے سکے۔

س۔ محبت عبادت ہے لیکن عموماً لوگ محبت کو غلط کیوں سمجھتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ آج کی محبت محبت نہیں ہے ——— اب نام ہوس کا محبت ہے۔

رضیہ حمید۔ دہلی

س۔ بھائی جان! یہ قول کس کا ہے ـــــ "دُنیا میں عورت نہ ہوتی تو مسرّت کا لفظ کسی زبان کی لغت میں نہ مِل سکتا۔ مسرّت عورت ہی کے دم سے ہے"

ج۔ یہ قول انگریز مُفکّر ویشر کا ہے۔

نعیم پریشان۔ رانی گنج

س۔ اِس وقت ہمارا مُلک کہاں تک ترقّی کر چکا؟

ج۔ آپ کا مُلک آپ کے سامنے ہے!

س۔ ایک انسان دوسرے انسان کی بُرائی کیوں چاہتا ہے؟

ج۔ انسان سدا سے ایسا نہیں ہے۔ انسان جوں جوں انسانیت سے دُور ہوتا گیا اِس میں یہ بُرائی بڑھتی گئی۔

س۔ لوگ فلمی لباس کیوں پہنتے ہیں؟

ج۔ سب لوگ کہاں۔ صرف فِلم کے رسیا ہی دلیپ کٹ بال رکھتے ہیں، فلمی لباس پہنتے ہیں۔

ظفر عالم چیتر لوپ۔ ہزاری باغ

س۔ خوش حال کا راز؟

ج۔ خوش حال لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنا۔

س۔ دولتِ مشترکہ میں بھارت کی شمولیت کے فوائد؟

ج۔ رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

س۔ اِس زمانے میں کیسے لوگ زیادہ کامیاب ہیں؟

ج۔ ایمان دار لوگوں کے سوا ہر طرح کے لوگ کامیاب ہیں!

ہدایت علی ساحل۔ جھمری تلیا

س۔ انسان کو حقیقی مسرّت کہاں حاصل ہوتی ہے؟

ج۔ ہر انسان کے لئے ایک بات نہیں کہی جا سکتی۔

س۔ قوتِ ارادی کو کیسے مضبوط بنایا جا سکتا ہے؟

ج۔ مصیبتوں سے بددل نہ ہو کر، مشکلات سے پریشان نہ ہو کر۔

س۔ انسان کا ضمیر کب جاگتا ہے؟

ج۔ جب اُسے ٹھوکر لگتی ہے۔

سیّد عبدالمنّان مُبارک پوری۔ بیگوسرائے

س۔ دُنیا میں سب سے بڑا غریب کون ہے؟

ج۔ ایک مغربی مُفکّر نے لکھا ہے ـــــ سب سے بڑا غریب وہ ہے، جس کا کوئی دوست نہ ہو۔

س۔ دُنیا کا سب سے بڑا چور انسان کون ہے؟

ج۔ جو خدا سے بھی چوری کرتا ہے۔

س۔ دُنیا کا سب سے بڑا مسافر کون ہے؟

ج۔ سارے انسان مسافر ہیں۔ اُن کی منزل یہ دُنیا نہیں ہے۔

سائرہ بانو۔ گاندھی نگر۔ دجے واڑہ

س۔ ناکامی کے بعد کامیابی ممکن ہے؟

ج۔ کیوں نہیں۔ سچّی لگن شرط ہے!

س۔ اِندرا گاندھی کے وزیرِ اعظم ہونے سے عوام کو فائدہ ہوا؟

ج۔ یقیناً فائدہ ہوا۔ اب تک کئی وزیرِ اعظم آئے اور چلے گئے ہوتے۔ مُلک کی حکومت کا نظام اُن کا تختۂ مشق بنا ہوتا۔

س۔ موجودہ زمانے کا بہترین شاعر کون ہے؟

ج۔ جو دوسروں کے کلام کو توڑ جوڑ کر اپنا شاہکار بنالے!

مظہر الحق انصاری۔ اعظم گڑھ

س۔ بھائی جان! کوئی حیات افروز شعر سُنایئے۔

ج۔ سُنیئے ؎

یہ شعر کاش نقشِ ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں یہ شعر کس کا ہے ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

ج۔ یہ شعر کسی آشنائے رازِ حیات کا ہوگا۔

گیسو دراز خاں۔ پربھنی۔ مہاراشٹر

س۔ دوستوں میں شرط لگی ہے آپ کے نام کے لئے میں کہتا ہوں خوشتر گرامی۔ دوست کہتا ہے دوسرا نام ہے ـــــ فیصلہ کیجئے۔

ج۔ آپ شرط جیت گئے!

س۔ اکبر الٰہ آبادی کا کوئی شعر سُنایئے۔

ج۔ بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اِک مضمون لکھا
مُلک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ایم ضیاء الدین نعیم بنگل۔ نیلگری

س۔ اُردو کے افسانہ نویس زیادہ تر عشق و محبت ہی کے افسانے کیوں لکھتے ہیں؟

ج۔ آپ کا مطالعہ محدود ہوگا۔ اُردو میں ہر موضوع پر بہترین افسانے لکھے گئے ہیں، لکھے جا رہے ہیں۔

س۔ ہندو پاک کے موجودہ ادب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ ہم دوسروں کی طرح اِس سے مایوس اور بددل نہیں ہیں۔

س۔ وہ کون سی منزل ہے جہاں پہنچ کر انسان سُکھ اور چین کی زندگی گزار سکتا ہے؟

ج۔ حُسنِ عمل کی منزل!

سید فیاض احمد آرزو۔ ڈیسر گڑھ۔ بردوان

س۔ مرد شادی سے پہلے کیا خواب دیکھتا ہے؟

ج۔ بے شمار رنگین و خوش آیند خواب!

س۔ کیا ایک حسین چہرہ خاموش سفارش ہو سکتا ہے؟

ج۔ یہ تو اپنے اپنے ذوق کی بات ہے —— کسی کے لئے حسین صورت خاموش سفارش ہوتی ہے، کسی کے لئے دولت!

محمد عمر رمضانی۔ عادل آباد

س۔ معیاری حلقوں کے ادب دوست جاسوسی ادب کو سستا ادب کیوں کہتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ حقیقت یہی ہے۔

س۔ کیا محبت سگریٹ کی مانند ہے جو آگ سے شروع ہوتی ہے راکھ پر ختم ہو جاتی ہے۔

ج۔ جی ہاں۔

محمد ابراہیم۔ جودھ پور

س۔ کیا آج کی سائنس انسانی رُوح کے وجود کو تسلیم کرتی ہے؟

ج۔ کیوں نہیں۔ اِس حقیقت سے انکار کیسے کر سکتی ہے۔

س۔ میں ماہرِ نفسیات بننا چاہتا ہوں، کیا آپ بتا سکتے ہیں اس کے لئے کتنی تعلیم ضروری ہے؟

ج۔ ماہرِ نفسیات بننے کے لئے تعلیم کا تعین ضروری نہیں۔

س۔ مرد کیا ہے؟

ج۔ یہ پُوچھئے مرد کسے کہتے ہیں ؎

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے حالات کے خونیں منظر سے
اُس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

فخر الدین سکریٹری۔ رتلام

س۔ جن سنگھ کے گُرو گول والکر صاحب چیختے پھرتے ہیں کہ مسلمان بھارتی نہیں ہیں۔ یہ باہر سے آئے ہیں۔ یہ کب تک یہ راگ الاپتے رہیں گے؟

ج۔ جب تک سیاسی مصلحت اُنھیں حقیقت سے گریز و اعراض کرنے کے لئے مجبور کرتی رہے گی!

س۔ فلموں میں سے اُردو نکال دی جائے تو؟

ج۔ فلموں کی مقبولیت اِتنی کم ہو جائے گی کہ خسارہ فلم سازوں کا حوصلہ ہی نہیں کمر بھی توڑ دے گا۔

قاضی سمیع اللہ۔ کریم چک چیرہ

س۔ "آزادیٔ نسواں اور تعلیم نسواں" کیا آپ بھی سرسید کے حامی ہیں؟

افسانہ نمبر دیکھ کر محوِ حیرت ہوں! اِن حوصلہ فرسا حالات میں ایسا بے مثال نمبر پیش کرنا آپ کے عزمِ جواں کا عظیم کارنامہ ہے ...
آسی رام نگری (مغل سرائے)

ج۔ سرسید اور اکبر کی انتہا پسندی کے درمیان کی راہ ہمارا مسلک ہے۔

س۔ یہ شعر نیچرل ہے یا نہیں؟

مرے نشیمن کے چار تنکے جو میری محنت کی ملکیت ہیں
اگر سلامت یہی نہیں تو میں اِن بہاروں کو کیا کروں گا

ج۔ یہ شعر سَو فیصدی نیچرل ہے۔

اِسلام قریشی۔ الہ آباد

س۔ غالب کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟

ج۔ ۱۷۹۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔

مِس یاسمین۔ بحرین

س۔ بھائی جان! یہ خوبصورت اشعار کس کے ہیں ؎

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگیں اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینۂ زرّیں اپنا
جلوۂ شام ہے یہ صبح کے میخانے میں
زندگی اس کی ہے صبح خورشید کے پیمانے میں

ج۔ یہ اشعار علّامہ اقبال کے ہیں۔

س۔ بھائی جان! مجھے خوبصورت اشعار سے عشق ہے آپ بھی کوئی خوبصورت شعر سُنایئے۔

ج۔ علّامہ اقبال ہی کے دو اشعار سُنئے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اِسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریّا سے مُشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اِسی درج کا دُرِ مکنوں

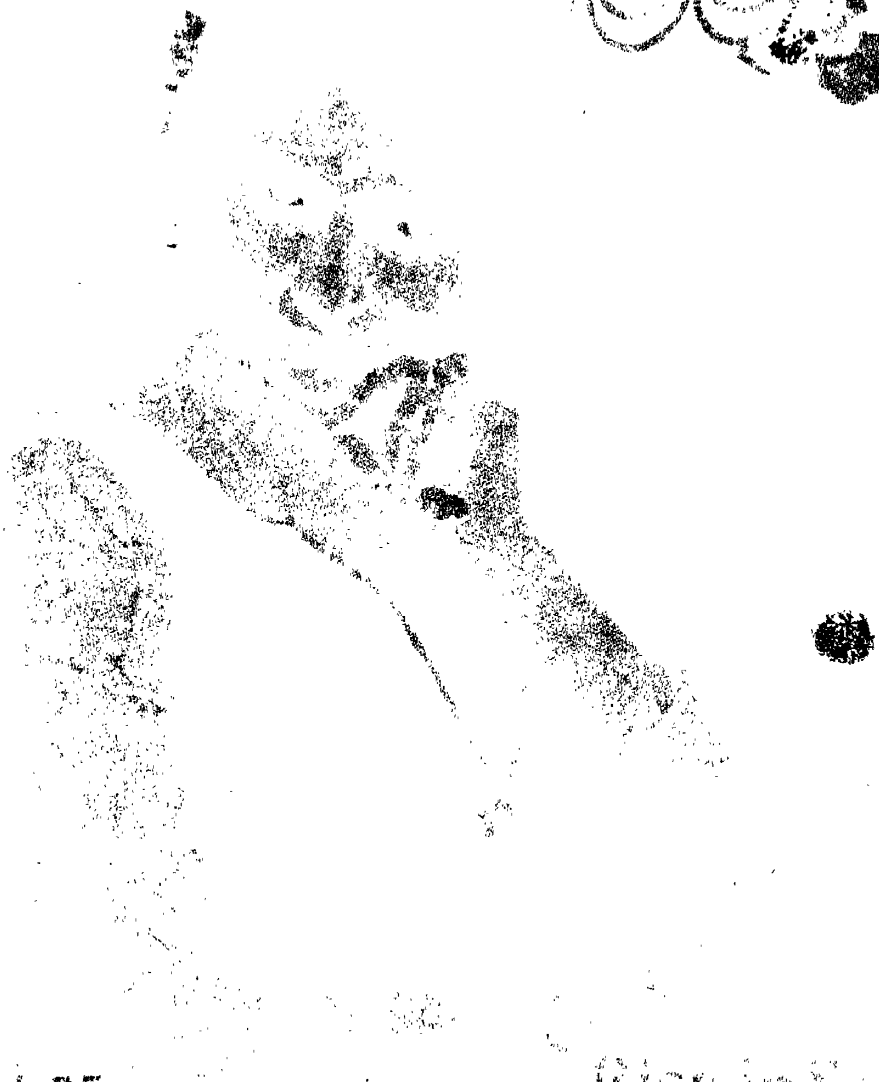
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N.

BISWIN SADI

33rd. YEAR OF PUBLICATION

Telephones Office. 271637 Residence. 619927

ستمبر



Vol. 25



دبے فتنے قیامت بن کے اُٹھتے ہیں، قیامت ہے

وہ جب انگڑائیاں لے لے کے سینہ تان لیتے ہیں ——— راسخ دہلوی

فوٹو: سورج این. شرما. جے پور



انجمن ترقی اُردو دہلی اِسٹیٹ کا سالانہ اجلاس ـــــــ روایت کے خلاف اِس بار انجمن خواص کے دائرہ سے نکل کر عوام میں پہنچی۔ یہ پہلا اجلاس ہے جو کسی چہار دیواری کے اندر ہونے کی بجائے قلعۂ معلّٰی اور مسجد شاہجہانی کے درمیان اُس وسیع سبزہ زار میں ہوا جس کے ایک گوشہ میں امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کا مزارِ مُبارک واقع ہے۔

ہزاروں کی تعداد میں دِلّی کے شہریوں نے پُرزور مطالبہ کیا کہ دِلّی میں اُردو کو علاقائی و ثانوی سرکاری زبان بنایا جائے ـــــــ انجمن کے سکریٹری جناب بہارؔ برنی نے قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا۔

"ماضی میں دِلّی کے سبھی جمہوری ادارے اُردو کی حیثیت کو تسلیم کرتے رہے۔ عوام اور اُن کے منتخب نمائندے ہر سطح پر اُردو کے حق میں آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ اُردو محض حُکمرانوں کی مصلحت کا شکار ہے اور اب تعلیمی و انتظامی سطحوں پر اِس کے ساتھ امتیاز برتا جا رہا ہے۔ اُردو والوں کی جائز شکایات کا ازالہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک وزارتِ داخلہ کے ۱۹۵۸ء کے سرکلر کو قانونی شکل دینے کے لئے آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت دہلی میں اُردو کو علاقائی و ثانوی سرکاری زبان قرار نہیں دیا جاتا۔

اجلاس کی صدارت جناب آنند نرائن مُلّا ایم۔پی نے فرمائی۔ تصویر میں بائیں سے دائیں جناب بہارؔ برنی، محترمہ بیگم حمیدہ سلطان جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو جناب آنند نرائن مُلّا کی صورت میں نمایاں ہیں ۔



جناب مقیم الدین فاروقی سکریٹری دِلّی اِسٹیٹ کمیونسٹ پارٹی نے اِس مطالبہ کی زبردست حمایت کی کہ دِلّی میں اُردو کی علاقائی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ "دِلّی کارپوریشن جو اپنے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ اُردو کو کارپوریشن کی دوسری زبان تسلیم کر چکی ہے اپنے فیصلہ پر ایمانداری سے عمل کرے"۔



اجلاس کے صدر جناب آنند نرائن مُلّا نے فرمایا "دِلّی، یو۔پی اور دوسرے علاقوں میں اردو کو اُس کا حق ملنا چاہیے۔ اُردو کا مقدمہ نہایت جامع اور جاندار ہے"۔ آپ نے حکومت سے پُرزور مطالبہ کیا کہ وہ اُردو کے حقوق کو تسلیم کرے۔



دلّی کی ثقافتی زندگی ـــــــ اپنے طویل فاصلوں اور مصروف زندگی کے باوجود دلّی آج بھی علم و ادب کا ایک مرکز ہے۔ شعری محفلیں اور ادبی ہنگامے آج بھی یہاں کی مجلسی و ثقافتی زندگی کا اہم جزو ہیں۔

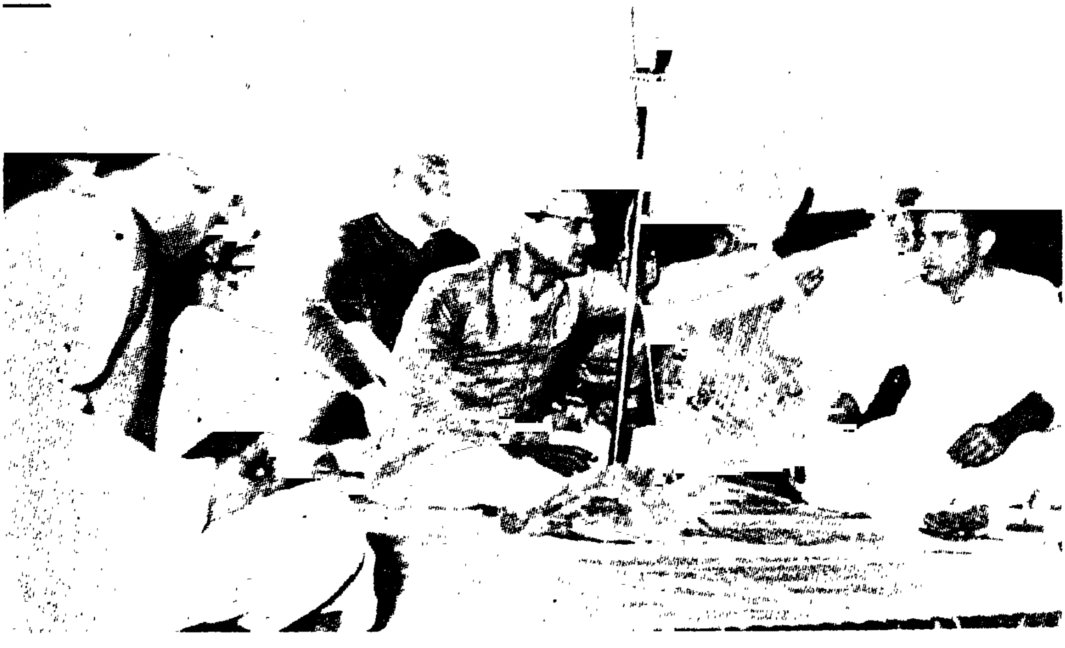
حال ہی میں مرزا غالب سے متصل غالب اکیڈمی کی پُرشکوہ عمارت میں ایک نمائندہ محفلِ شعر و سخن منعقد ہوئی۔ غالب اکیڈمی کا یہ پہلا ادبی و شعری اجتماع تھا جس کا اہتمام حضرت شمیم جے پوری نے کیا۔ جس میں باذوق حضرات شریک ہوئے اور بہت سے برگزیدہ شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ فضا کیفیاتِ شعر سے معمور تھی۔

ہندوستان کے نامور شاعر حضرت شعری بھوپالی نے سامعین کو "سخن فہم" پاکر یکے بعد دیگرے آٹھ غزلیں سنائیں۔ فضا ایک عجیب سی کیفیت سے سرشار تھی۔

تصویر میں بائیں طرف سے جناب شمیم جے پوری، پروفیسر جاوید وششٹ، پروفیسر عبداللطیف اعزازی (صدرِ مشاعرہ) جناب نثار احمد اور حضرت بہار برنی (اناؤنسر) ہمہ تن گوش نظر آرہے ہیں۔



غالب اکیڈمی کے مشاعرے میں محترمہ جمیلہ بانو دہلوی غزل سرا ہیں۔ بے خودی کی ایک کیفیت تھی جو سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھی ہے



جناب شمیم جے پوری اپنی رسیلی آواز میں، غزل سرا ہیں۔ آپ نے سامعین سے خوب داد حاصل کی ہے

ٹیلیفون دفتر — ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش — ۶۱۹۹۲۷

تیر و نشتر

خوشتر گرامی



مجھے ایک کلرک کی طرح ڈِسمس کیا گیا ہے: مرار جی ڈیسائی

• "مجھے ایک کلرک کی طرح ڈسمس کیا گیا ہے" مرار جی ڈیسائی کا شکوہ

اور آپ چاہتے تھے ——

۱۔ ڈسمس کرتے وقت جلوس نکلتا۔

۲۔ گارڈ آف آنرپیش کیا جاتا۔

۳۔ توپیں سلامی دیتیں۔

۴۔ لنچ اور ڈنر دیئے جاتے۔

• "تلنگانہ اور آندھرا کے لیڈروں کی گول میز کانفرنس بلانے کی تجویز" ایک خبر —— انھیں کانفرنسوں کی نہیں، وزارتوں اور اقتدار کی ضرورت ہے۔

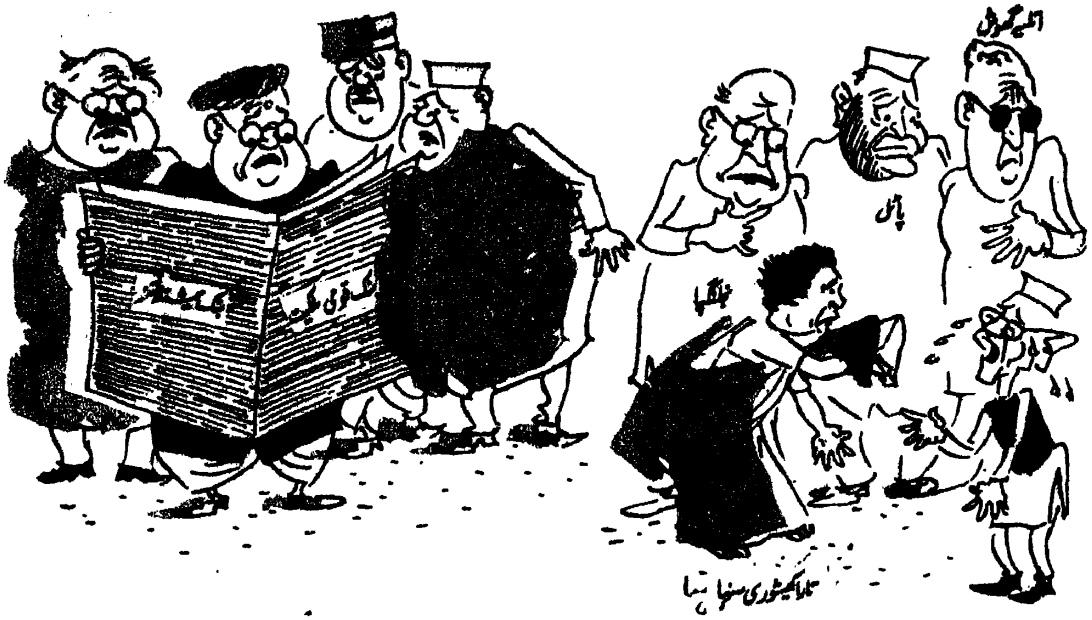
• "مرار جی ڈیسائی کے استعفے سے مالی حلقوں میں کھلبلی" ایک خبر —— بیچاروں کی کمر ٹوٹ گئی۔ بلیک اور بھرشٹاچار کا سہارا جاتا رہا۔ سرمایہ داروں پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

• "جمہوریت کی حفاظت کے لئے یہ ضروری ہے کہ دیش کا اقتصادی نظام چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں نہ رہے" ایک عنوان —— اور اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ سیاسی لیڈرشپ چند لوگوں کی جیب کا سرمایہ نہ رہے۔

• "صدارتی دنگل شروع" ایک عنوان —— فری اسٹائل ہے اور امیدواروں کی ریل پیل ہے۔

• "امریکی طلبہ کا وفد نئی دلّی میں" ایک خبر —— دھرنا، گھیراؤ، جھگڑا، فساد، ہڑتال، بھوک ہڑتال کی تکنیک سیکھنے کے لئے۔

• "کانگریس دوراہے پر" ایک عنوان —— ایک راستہ اندرا جی کی کوٹھی کی طرف جاتا ہے اور دوسرا مرار جی ڈیسائی کی طرف۔



حکومتِ ہند نے ۱۴ بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔

"نجلنگپا کی تقریر کے وقت بجلی فیل ہو گئی" یہ ایک خبر ——— بجلی کو بھی بھاشن پسند نہیں آیا۔

"جگجیون رام کو نائب وزیرِ اعظم بنایا جائے۔ ممبرانِ پارلیمنٹ کا مطالبہ" ایک عنوان ——— کیا گھٹیا مطالبہ کیا ہے۔ صدرِ جمہوریہ نہیں تو کم سے کم وزیرِ اعظم بنانے کا تو مطالبہ کرتے۔

"مرارجی ڈیسائی کا استعفیٰ۔ بنسی لال خاموش" یہ ایک خبر ——— کہ نہ جانے کب اِس منزل سے گزرنا پڑے۔

"نئی دہلی میونسپل کمیٹی میں جھڑپیں" یہ ایک خبر ——— یعنی پُرانی دہلی کے نقشِ قدم پر۔

"پنجاب میں گھوسے پر پابندی" یہ ایک خبر ——— جو کھو گیا اُس کا ذکر ہی کیا۔

"ہندی کی خاطر دھرنا" پنجاب کانگریس کے ایک لیڈر کا اعلان ——— ہندی نہیں لیڈری ہوگا۔ اسی کو خطرہ ہے۔

"آنکھیں بولتی ہیں" یہ ایک عنوان ——— خلائی دور کا ایک اور سائنسی کارنامہ۔

"نکسلیوں کی کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ" یہ ایک خبر ——— ڈاکوؤں میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

"صفائی کرمچاریوں کا مظاہرہ" یہ ایک خبر ——— گندگی کے ڈھیر سر پر رکھ کر۔

"کستوربا نگر میں شراب کے چھاپے" ——— گاندھی جی اور کستوربا کی آتما دعائیں دے رہی ہوں گی۔





پنجاب میں اکالی دل جن سنگھ کولیشن قائم رہے گی یہ سردار گورنام سنگھ

• مرارجی ڈیسائی کے استعفے سے عوام میں مسرت کی لہر یہ ایک خبر
——— مٹھائیاں تقسیم ہوئی ہیں۔ ادارہ "بیسویں صدی" کی طرف سے
ٹی پارٹی دی گئی۔

• بنسی لال کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کا فیصلہ یہ ایک
خبر ——— یعنی اب زیادہ دن بنسی نہ بجا سکیں گے۔

• جموں کے لیڈروں کا گھیراؤ ہوگا یہ ایک خبر ——— داڑھی کے
لیڈروں کی باری بعد میں آئے گی۔

Jamia millia

• مرارجی ڈیسائی کو شنٹ کرو یہ ایک عنوان ——— ٹنشیڈ۔

Illania

• جموں کے بے روزگار انجینئر نے پی استال کھول لیا یہ ایک خبر
——— چیف منسٹر سے زیادہ کمائے گا۔

okhl

• مرارجی ڈیسائی کا استعفے افسوسناک ہے سنجیوا ریڈی کا بیان
——— مگر مجبوری کا کیا کرو۔

okhla punjab

• مہاراشٹر میں ۲۹ ہزار ٹرینڈ ٹیچر بیکار یہ ایک خبر ——— چین کی بنسی
بجا رہے ہوں گے۔

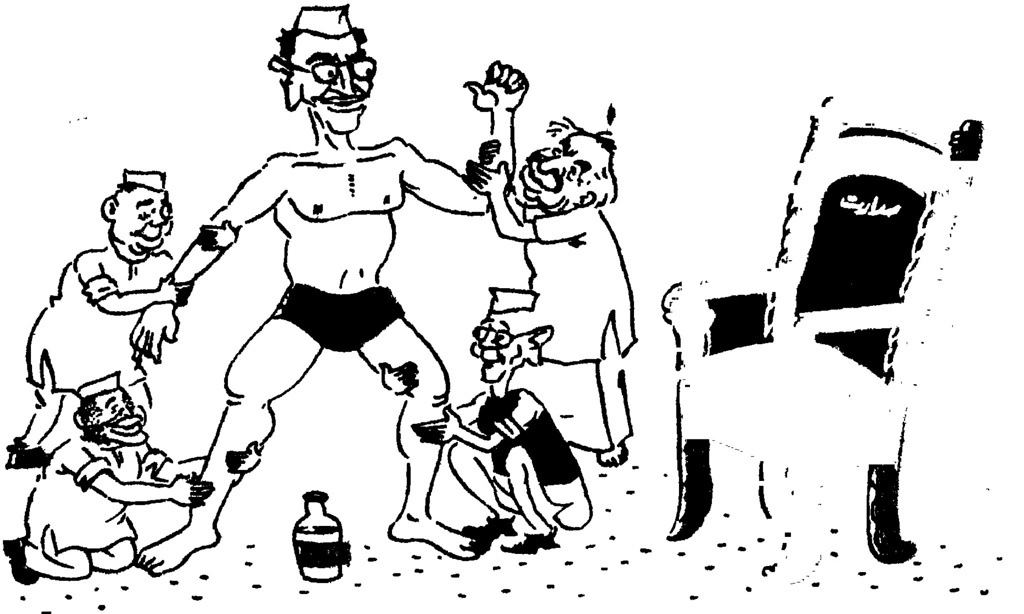
Muslim university

• پنجاب میں کسانوں کو قرضے یہ ایک خبر ——— وزیروں کے سالے
بھتیجے درخواستیں دیں گے۔

punjab..

——— • بیویوں کے طلائی زیورات کی فہرست دو یہ ایک عنوان
مجبوروں کے زیورات کی فہرست معاف۔

• ہندوستانی منتری کی کوٹھی پر چار سو عورتوں کا مظاہرہ یہ ایک
خبر ——— بدیشوں میں جا کر بالوں کی آرائش کرانے والی عورتوں کے
خلاف احتجاج۔



صدارت کے لئے کانگرسی امیدوار۔

• جن سنگھ نے پنجاب کو پنجابی زبان کا صوبہ تسلیم کرلیا ہے" ایک خبر —— یعنی صرف دو وزارتوں کے لئے۔

• بنگلور میں" ایک عنوان —— جہاں مرارجی کو چلتا کرنے کے لئے راستہ بنایا گیا۔

• چاند پر قدموں کی آہٹ" ایک عنوان —— عشاق نے دل کے کانوں سے سُنی۔

• بنک نیشنلائزیشن پر اندرا کی جے جے کار ہو رہی ہے" ایک عنوان —— اور سرمایہ داروں کے گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔

• ٹانک کی مُہر بند بوتل میں کیڑا" ایک خبر —— ٹانک کے اصلی ہونے کی دلیل ہے۔

• حاتم کی قبر پر لات" ایک عنوان —— بدتہذیبی کی بات ہے۔ پھول چڑھانے چاہئے تھے۔

• خودکشی کی ناکام کوشش" ایک خبر —— اقدامِ خودکشی کے مقدمہ کے لئے تیار ہو جایئے۔

• محبوب نگر کے قریب پُل اُڑانے کی کوشش" ایک خبر —— کسی عاشق کی کارروائی معلوم ہوتی ہے۔ تاکہ رقیبِ رُوسیاہ کا راستہ رُک جائے۔

• پانی پت کے طالب علم نے پنجاب یونیورسٹی کا ریکارڈ توڑ دیا" ایک خبر —— غنیمت ہے دوسروں کی طرح آگ تو نہیں لگائی۔ توڑا ہی ہے۔

• ہندوستان میں سگرٹوں کی بکری" ایک خبر —— اور سگاروں کا بکرا۔

یو۔پی میں غیر کانگریسی وزارت ”چرن سنگھ کی شرط ———
۱۔ چیف منسٹر چرن سنگھ کا ہوگا۔
۲۔ تمام اہم محکمے چرن سنگھ کے پاس رہیں گے۔
۳۔ وزارت میں شامل تمام پارٹیاں آنکھ میچ کر حمایت کریں گی۔
۴۔ کرانتی دل والوں کو تمام محکموں میں بھرنے کا حق ہوگا۔
۵۔ گورو جی کے سواگت کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے سرکاری مشینری استعمال کی جاسکے گی۔
۶۔ پونجی پتیوں کی سرپرستی پر اعتراض نہ ہوگا۔
۷۔ ہندو، ہندی، ہندوستان کا پرچار ہوسکے گا۔

”بس کے تمام مسافر ہلاک“ یہ ایک خبر ——— اسے کہتے ہیں حمام میں سب ننگے۔

”پارلیمنٹ کی لابیوں میں زبردست سرگرمیاں“ یہ ایک خبر ——— مرارجی ڈیسائی کا حشر دیکھ کر۔

”۱۹ بیوپاری گرفتار۔ ناجائز سٹہ کھیل رہے تھے“ یہ ایک خبر ——— جائز سٹہ کھیلتے تو گرفتار نہ ہوتے۔

”ایوننگ ٹیچروں کے مطالبات پر غور“ ——— رات شروع ہونے دو غور ہوگا۔

”کشمیر میں اوسط عمر بڑھ گئی“ یہ ایک عنوان ——— کیا وزارت کی؟

”حسین عورتوں کے ذریعہ سمگلنگ“ یہ ایک خبر ——— بدصورت اور بدکردار مردوں کا کارنامہ۔

”کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ طلباء میں تصادم“ یہ ایک خبر ——— سرمایہ داروں نے نیا میدانِ سیاست تیار کیا۔



بینکوں کو قومیانے سے ہندوستانی سرمایہ داروں کو پریشانی۔

سنڈیکیٹ

خوشتر گرامی

ہندوستانی سیاست کی ایک لعنت۔ کانگریس کی گردن کا طوقِ رُسوائی۔ اقتدار کی جنگ۔ عہدوں کی رسہ کشی۔ پارٹی توڑ جوڑ۔ بلیک میل۔ بھرشٹاچار۔ عوام دشمن کارروائیوں کے مجمعے کا نام ہے ——

سنڈیکیٹ



شخصیتیں بدلتی رہتی ہیں، کام نہیں بدلتا۔ ممبروں کی تعداد تین سے لے کر وقت اور ضرورت کے مطابق بڑھائی اور گھٹائی جاتی ہے —— آج کل یہ معجون مرکب بمبئی کے ایس۔ کے۔ پاٹل، کلکتہ کے اتلیہ گھوش اور بنگلور کے نجلنگپا پر مشتمل نظر آتا ہے۔ مرارجی اور کامراج اِن کے معاون ہیں —— اب تک اِن کا دعویٰ تھا جو ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا۔ مگر اب یہ ایک ایسی چٹان سے ٹکرائے کہ خود پاش پاش ہو گئے۔ کھلبلی اور افراتفری ہے۔ ہر شخص کو کلرک کی طرح ڈسمس ہونے کا ۲۴ گھنٹے خطرہ لاحق اور بہت بے آبرو ہوکر نکلنے کا اندیشہ ہے —— سنڈیکیٹ کا ہر ستون لرزہ براندام اور مستقبل کے بارے میں فکرمند ہے اور جہاں بجلی گری ہے اُس کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

افسانہ

ویٹنگ رُوم

رام لعل

آر-۳۹/II-ملٹی اسٹوری، چار باغ، لکھنؤ نمبر ۱

برادرم خورشید صاحب! آداب

پچھلا سارا مہینہ سفر میں گزرا۔ لکھنؤ سے گوہاٹی، گوہاٹی سے ذیرو گڑھ ۱۱ ور بھی کئی چھوٹے چھوٹے مقامات تھے جہاں مجھے کئی کئی گھنٹے تنہائی میں گزارنے پڑے۔ پہلے یہ جگہیں بے حد نئی معلوم ہوتی تھیں۔ لوگ بھی نئے معلوم ہوتے تھے۔ اجنبیت کا احساس زیادہ ہونے لگتا تھا لیکن اب ایسا محسوس نہیں ہوتا۔ اُن کی زبان نہیں بول پاتا پھر بھی سب کچھ اپنا معلوم ہوتا ہے ——— اس سفر نے مجھے چند کہانیاں دی ہیں۔ اُن میں سے ایک حاضر ہے حقیقت کو کہانی کی شکل میں پیش کرتے وقت بہت کچھ بدل دینا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو بات اتنی بدل جاتی ہے کہ اصلیت کا دُور دُور تک پتہ نہیں چل سکتا! ایسا نہ کیا جائے تو کہانی کی بجائے رپورتاژ بن کر رہ جائے ——— بعض لوگ کہتے ہیں ہماری کہانی، کہیں کھو گئی ہے جیسے آج کا آدمی کھو گیا ہے۔ آدمی تو گُم ہو سکتا ہے، اِس میں کوئی شک نہیں لیکن کہانی گُم نہیں ہو سکتی۔ کہانی ہی آدمی کو تلاش کرنے میں مدد دیتی ہے۔ وہ خود کیسے گُم ہو سکتی ہے! ہاں کبھی کبھی کہانی کی تکنیک بدل جاتی ہے۔ اظہار کا طریقہ بدل جاتا ہے لیکن بُنیادی طور پر کہانی موجود رہتی ہے۔ یہ کہانی ایک کھوئے ہوئے آدمی کی کہانی ہے۔ "ویٹنگ رُوم" ایک علامت ہے۔ اُس کی ناآسودہ اور غیر تکمیل شدہ تمناؤں کی! اُس کی شخصیت دو ٹکڑوں میں بٹی رہتی ہے۔ ایک حصّہ باہر کی شخصیت کا ہے۔ دوسرا اندر کی شخصیت کا۔ باہر کا حصّہ جب مکمل طور پر صدمے سے ہمکنار ہو جاتا ہے تو وہ گُم ہو جاتا ہے۔ اندر کا حصّہ باقی رہتا ہے۔ زندہ بھی رہتا ہے۔ پُورے احساس کے ساتھ ——— اُمید ہے کہ یہ کہانی آپ کو اور قارئینِ "بیسویں صدی" کو پسند آئے گی۔

آپ کا مخلص ——— رام لعل

★

فرنٹیئر میل سے دہلی اسٹیشن پر اُتر گیا ہوں۔ ابھی سات بجے ہیں۔ کسی قدر ٹھنڈی ٹھنڈی صبح! پونے گیارہ کی ٹرین سے امروہہ جانا ہے۔ امرتسر سے سوچتا ہوا آیا ہوں۔ ویٹنگ رُوم میں جا کر جلدی جلدی تیار ہو لوں گا۔ پبلک ٹیلی فون بوتھ سے دہلی کے دو تین دوستوں کو کونٹیکٹ کروں گا۔ جو بھی مل گیا ٹیکسی لے کر اُس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ یوں یہ تین چار گھنٹے آسانی سے گزر جائیں گے۔

کندھے سے ایر بیگ اور ہاتھ میں اٹیچی اُٹھائے میں ویٹنگ رُوم کی طرف چل پڑا۔ بک سٹال سے مارننگ پیپر اور فلم فیئر بھی خرید لیا۔ بدن کے جوڑ جوڑ میں کچھ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ شاید ساری رات جاگتے رہنے سے۔ سونے کے لئے برتھ میسّر تھا لیکن کبھی کبھی بستر ہونے پر بھی نیند نہیں آتی۔ لفٹ میں اوپر جاتے ہوئے خیال آیا۔ نہ جا کر سو رہوں تو کیسا رہے؟

حسبِ عادت میری نگاہ ایک عورت کی طرف اُٹھ گئی ہے۔ عورتیں مجھے اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کندھوں پر تولیہ پھیلائے

اور بھیگے ہوئے بال بکھرائے باتھ رُوم سے باہر آرہی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اُسی صوفے کی طرف گئی ہے جہاں اوپر نیچے بہت سا سامان رکھا ہوا ہے۔ میں نے بھی خود کو اُسی صوفے کے دوسرے کونے پر گرا سا لیا ہے۔ بہت بے نیازی سے جُوتے کھول کر اُنچی ہی پر پاؤں پھیلا دئے ہیں۔ سوئیٹر کی زِپ بھی کھول دی ہے۔ نیچے پہنی ہوئی لال رنگ کی قمیص کے کالر کھڑے کر لئے ہیں اور اخبار دیکھنے لگا ہوں۔

کوئی خبر اِتنی دلچسپ نہ تھی جتنی کہ وہ! میرے بہت قریب، صوفے کے دوسرے کونے پر چُپ چُپ سی میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کے ساتھ نظریں مِلائے بغیر میں نے اُس کی طرف دیکھ لیا۔ ایک خوبصورت چہرہ! بہت نفاست سے ترشے ہوئے نقوش! شاید بنگالن ہو! میں نے اُس کی نظروں سے بچنے کے لئے ویٹنگ رُوم کا جائزہ لے ڈالا۔ خوب بھرا ہوا تھا۔ ہر شخص جلدی میں صبح کے معمولات میں مصروف۔ کوئی شیو کرتا ہوا، کوئی برش کرتا ہوا، کوئی باتھ رُوم کی طرف بھاگتا ہوا! ایک آدمی نے ٹھنڈی چائے لے آنے پر بیرے کو زور سے ڈانٹ دیا۔

ہر طرف سے ہوتی ہوئی میری نظر اُسی عورت پر پہنچ کر ٹھہر گئی ہے۔ ہٹائے ہٹ نہیں رہی ہے۔ اب میں پہلی سی گھبراہٹ بھی محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے، بہت اشتیاق سے۔ اُس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر ایک ہی طرح کی چمک ہے حیرانی سی محسوس کرنے لگا ہوں۔ اچانک وہ میری گود میں پڑے ہوئے پندرہ روزہ فلمی رسالے کی طرف ہاتھ بڑھا دیتی ہے۔

"مے آئی سی اِٹ!" باریک سُریلی آواز!

"شیور!" میں نے جلدی سے فلم فیئر اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"اِسے آپ ابھی دیکھنا تو نہیں چاہتے ہیں نا!" کانوں میں پھر رس بھر گیا۔

"آف کورس ناٹ! آپ شوق سے دیکھئے۔ میں ابھی مارننگ پیپر ہی میں بزی ہوں!" اُس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ایک ہاتھ سے آگے آپڑے ہوئے بال آہستہ سے پیچھے ہٹا دئے۔ میں بظاہر اخبار میں کھو گیا۔ لیکن اُس میں میرے لئے کچھ نہیں رکھا تھا۔ اخبار پڑھنا اِک بہانہ سا محسوس ہوا۔

ابھی تک کوئی آدمی اِس کے پاس نہیں آیا ہے! شاید باتھ رُوم میں ہے! اُس آدمی کی موجودگی کا اندازہ اِس عورت کے پاس رکھے ہوئے سامان سے ہو رہا ہے۔ ہولڈال پر ایک مردانہ کوٹ پڑا ہے۔ فرش کو چھوتی ہوئی ایک ٹائی بھی!

اچانک ایک بیرا دکھائی دے گیا۔ کسی اور کے لئے چائے لے کر آیا تھا۔ اُسے اشارے سے پاس بُلایا۔ چائے لے آنے کے لئے کہا۔ اُس عورت کی طرف بھی دیکھا۔ پوچھا: "کیا آپ کے لئے بھی چائے کا آرڈر دے دوں؟ یا اُن کا انتظار کریں گی؟"

آخری بات خود مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔ آخر میں اُس کے آدمی کے بارے میں اِتنا کانشس کیوں ہوں! غالباً اِس بات پر وہ بھی مسکرا دی۔ بولی: "لیکن وہ اِس وقت کہیں گئے ہوئے ہیں۔ آپ کے ساتھ ایک پیالہ پی لوں گی!"

میں بے حد خوش ہو گیا ہوں۔ کچھ پریشانی بھی محسوس ہوئی ہے۔ اِسی لمحے میں نے کسی بھی دوست کے یہاں جانے کا ارادہ قطعی طور پر ترک کر دیا ہے۔ اِس عورت کی قُربت سے بہتر دوست اور کون سا ہو سکتا ہے!

میں نے پھر اخبار پر نظریں گاڑ لیں۔ وہاں اب بھی کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی۔ آگ لگے مدھیہ پردیش کی نئی کابینہ کو! کیا رکھا ہے کلکتہ کے اسٹاک ایکسچینج کے گھپلے میں! اُس وقت تو کتنی خواہشات نے میرا اپنا گھیراؤ کر رکھا تھا جن سے میں نکلنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

چائے آگئی تو اُس نے اپنے سامنے ہی ایک تپائی پر رکھوالی۔ چمچہ اُٹھا کر بولی: "شوگر کتنی لیں گے؟"

"ڈیڑھ!" میں نے کہا اور اخبار ہاتھ سے رکھ دیا۔ اُسے چائے بناتے ہوئے دیکھنے لگا۔ سر جھکانے سے اُس کے بال پھر چہرے پر بکھر گئے۔ اپنے لئے صرف ایک ہی چمچہ بھرا اُس نے۔ اِسی وجہ سے اِتنی سلم ہے! جِسم کی مناسبت نے اُسے کتنی پُر شکوہ بنا رکھا ہے!

"آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے اپنے سوال کو جلدی سے بدل بھی دیا: "یا شاید کہیں باہر سے آئے ہیں؟"

"دِلی تو ہم پہلے بھی کئی بار آچکے ہیں۔ اب کشمیر سے لوٹے ہیں۔ آگرہ جانا ہے۔ بمبئی لوٹنے سے پہلے وہاں بھی ہو لیں۔ لیکن یہ بھی کوئی ٹھیک نہیں ہے! اُن کے واپس آنے ہی پر معلوم ہوگا!"

اب میں اُس سے بات کر سکتا ہوں! ذرا اور بے تکلفی سے۔ خود ہی بے تکلف ہو کر اُس نے میری مشکل آسان کر دی ہے۔ ارے ہاں! یہ بنگالن نہیں، مہاراشٹرین ہے! لیکن اِس کی ہندوستانی کتنی صاف ہے!

"آپ کہاں سے آرہے ہیں؟" پیالہ اُس کے ہونٹوں کے ساتھ چپکا رہا۔ آنکھیں میری طرف دیکھتی رہیں۔ بڑی بڑی صاف شفّاف آنکھیں!

میں اُسے اپنا پروگرام تفصیل سے بتانے لگا: "امروہہ میں ایک صاحب کے پاس سترھویں صدی کے کچھ مسودات ہیں۔ تاریخ سے متعلق۔ میں ریسرچ اسکالر ہوں۔"

لیکن وہ نہ تاریخ میں دلچسپی رکھتی ہے نہ تعلیم ہی کے کسی دوسرے موضوع میں! حالانکہ وہ پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ اُس کے چہرے کی کیفیت کوئی اور ہوتی! میری گفتگو کا موضوع بدل دینے کے بارے میں سوچ رہی ہے! یقیناً!

اُس نے اچانک گھٹنوں پر کھلا ہوا پندرہ روزہ دیکھ کر کہا: "سری نگر میں یہ فلم دیکھی تھی، بہت دلچسپ تھی؟"

میں نے جُھک کر ہیرو اور ہیروئن کی تصویر دیکھی اور کہا: "میں بھی دیکھ چکا ہوں امرتسر میں۔ اچھی ہے!"

"کیا آپ بھی فلمیں دیکھا کرتے ہیں؟" جیسے اُسے یقین نہ ہوا ہو!

"کیوں، میں کیوں نہ دیکھوں گا؟"

جواب میں وہ ہنس دی۔

"ریسرچ جیسے خشک موضوع سے فرار مجھے فلموں ہی کے ذریعے ملتی ہے! یا کبھی کبھی انگلش تھرلرز پڑھنے سے!"

اُس کی ہنسی رُکی نہیں ہے! پھر وہی تعلیم، تاریخ اور نفسیات کی باتیں! اب وہ میری دلچسپیوں کے بارے میں کوئی نیا تار نہیں چھیڑے گی! چُپ چُپ سی چائے پینے میں لگ گئی ہے۔ کبھی کبھی نظریں اُٹھا کر دیکھنے بھی لگتی ہے۔ عجیب سی نظریں! پہلی بار احساس ہو رہا ہے اُس کی آنکھوں میں بے پناہ گہرائی ہے! کرودھ میں لپٹی ہوئی افسردگی بھی! افسردگی اُس کے مُسکرانے اور ہنسنے پر بھی فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ اور گہری ہو جاتی ہے۔

چائے ختم کر کے میں نے شیو بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اٹیچی کو اُس کے پاس ہی چھوڑ کر باتھ رُوم کی طرف چل دیا۔ اُس روز شیو بنانے اور نہانے میں ایک نیا ہی لُطف آیا۔ بدن کے روم روم سے مسرت پھوٹ نکلی۔ کسی عورت کے ساتھ بڑی اپنائیت سے چند ہی باتیں کر کے مرد کتنا خوش ہو جاتا ہے! ایک دلکش عورت کے ساتھ!

باتیں کر کے عورت کا کچھ نہیں بگڑتا! وہ کچھ بھی نہیں کھوتی۔ دوسرے مرد کو کتنا کچھ دے دیتی ہے!

مجھے اچانک دوسرا مرد ہونے کا احساس ہوا۔ آدمی 'دوسرا مرد' ہو کر بھی کتنا خوش ہو جاتا ہے!

میں نہا کر لوٹ آیا۔ وہ میری منتظر تھی۔ بولی — "انھیں لوٹنے میں کچھ دیر لگے گی۔ ایک ایم پی سے ملنے گئے ہیں۔ گیارہ تک لوٹنے کے لئے کہہ گئے ہیں۔ جب تک ہم ناشتہ کر سکتے ہیں۔ یہیں منگا لیا جائے یا ریسٹوران میں چلیں؟"

اُس کے اِس اقدام نے مجھے اور بھی مسرت بخشی۔ میں نے کہا — "آپ بادرنہ کیجئے۔ میں انتظام کئے دیتا ہوں۔ آپ لوگ تو کئی دنوں سے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔ میں ابھی ابھی گھر سے باہر آیا ہوں۔ جی چاہتا ہے جلدی سے کہیں خرچ کروں!"

وہ ہنس پڑی۔ بولی: "اوہ! ناشتے پر خرچ ہی کتنا آتا ہے! آپ تیار ہو جائیے تو ریسٹوران ہی میں چل کر بیٹھیں۔ یہاں جی نہیں لگ رہا ہے!"

میں نے جلدی جلدی کپڑے بدل لئے۔ میں نے ایک خوش رنگ سی بُش شرٹ نکال لی۔ پینٹ وہی رہنے دی۔ پالش والے سے بُوٹ بھی پالش کرا لئے۔ وہ یہ سب کچھ کرتے ہوئے میری طرف غور سے دیکھتی رہی۔

اُسے کچھ بھی نہیں بدلنا تھا۔ تولیہ کندھوں سے اُتار کر ہولڈال پر ڈال دیا۔ لمبے بالوں کو ایک ہاتھ میں لے کر اُن کے سُوکھ جانے کا احساس کیا۔ اُنھیں اُسی طرح لئے لئے میرے ساتھ ریسٹوران میں چلی گئی۔

اُس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں خود کو کسی قدر اُونچا اُٹھتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ ہوا میں اُڑتا ہوا سا۔ وہ انٹلکچول کمپے نیشن نہیں ہے لیکن خاصی دلچسپ ہے۔ عورت بھلے ہی انٹلکچول نہ ہو خوبصورت ضرور ہو! اور اِتنی آزادی پسند بھی ہے!

ناشتے پر بہت کم کھایا پیا گیا۔ باتیں زیادہ ہوتی رہیں۔ زیادہ تر پلیٹیں تو پڑی ہی رہ گئیں۔ ہم ہنستے بھی رہے۔ اب ہمارے درمیان کوئی دیوار نہیں تھی۔ کوئی جھجک نہیں تھی۔ ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہے اور مُسکراتے رہے۔ مجھے محسوس ہوا میری طرح وہ بھی رُومان کی متلاشی ہے۔ ایک شادی شُدہ عورت اپنے شوہر سے تھوڑی دیر کے لئے بھی الگ ہو جاتی ہے تو وہ فوراً رُومانٹک کیوں ہو جاتی ہے! لیکن اُس کا یہ رویّہ دلفریب ہے! میں نے ابھی تک اُس کے شوہر کو نہیں دیکھا تھا۔ بس اِتنا معلوم ہو سکا تھا وہ پورٹ ٹرسٹ کا ایک چھوٹا موٹا افسر ہے۔ مزید ترقّی کے لئے کوششیں کرتا رہتا ہے۔ اِسی لئے اپنے شہر کے ایم۔ پی سے ملاقات کرنے گیا ہے۔ وہ اُس کی کچھ مدد کر سکتا ہے۔

اُس نے اپنے پتی کے بارے میں زیادہ نہیں بتایا۔ اُس کے بارے میں زیادہ کچھ کہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میرے ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ باتیں کرنے کی متمنّی تھی۔ کسی بھی موضوع پر بولیں۔ ایک دوسرے کے قریب رہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہیں! میرے منع کرنے پر بھی اُس نے بِل ادا کر دیا۔

ناشتہ ختم کر کے ہم پھر ویٹنگ رُوم میں لوٹ آئے۔ وہاں کچھ نئے لوگ آ گئے تھے۔ کچھ جا چکے تھے۔ اُنہی کی طرف دیکھ دیکھ کر دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگے۔ مسافروں کے آپس کے رشتوں کے بارے میں کسی کسی وقت اندازہ غلط ثابت ہو جاتا تو ہم ہنس پڑتے۔

ایک ہی قسم کے مذاق پر اچانک خوش ہو جانا بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔

ایک کوئی فوجی افسر تھا۔ اُس کے پائپ میں بار بار تمباکو پھنس جاتا تھا۔ زور زور سے دُھواں کھینچتے کھینچتے جھنجلا کر پائپ کھول دیتا اور اُسے صاف کرنے لگتا۔

ایک سیلز مین اپنے بکس میں سے شیشوں کے کسی قسم کے پُرزے نکال کر چیک کر رہا تھا۔ شاید کوئی سیمپل لے آنا بھول بھی گیا تھا۔ اِسی فکر میں وہ یہ بھی بھول گیا، ابھی اُس نے آدھی ہی شیو بنائی ہے۔ آدھے مُنہ پر تو ابھی صابن لگا ہوا ہے!

ایک عورت اپنے چار بچّوں کو باری باری سے پکڑ کر باتھ رُوم میں لے جاتی تھی۔ لیکن بچّے پلیٹ فارم پر کوکتے ہوئے انجنوں کی آواز سُن کر چونک چونک اُٹھتے تھے۔

اچانک اُس نے مجھے یاد دلایا —— "آپ کو پونے گیارہ بجے کی گاڑی سے جانا ہے نا! دس منٹ باقی رہ گئے ہیں"

لیکن وہ میرے چلے جانے کے خیال سے خوش نہیں دکھائی دی۔ جیسے چاہتی ہو ابھی کچھ دیر اور اُس کے ساتھ رہوں! میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔ اُس سے کہا —— "یہ گاڑی چھوڑ سکتا ہوں۔ شام کو چلا جاؤں گا"

وہ خوش ہو گئی۔ بولی —— "آیئے اب باہر چل کر کھڑے ہوں۔ ریلنگ پر۔ یہاں بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگی ہوں"

میں نے کہا —— "میں بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ چلیے"

دونوں ریلنگ پر کھڑے ہیں۔ جُھک کر نیچے دیکھ رہے ہیں۔ اسٹیشن کے باہر کا وسیع احاطہ ہے۔ ٹیکسیاں ہیں۔ موٹریں ہیں۔ اسکوٹر اور تانگے اور قُلی اور بہت سے چلتے پھرتے مسافر! اور دُور ایک معروف ترین سڑک۔ بسیں ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ سڑک کے پار حدِ نظر تک پارک ہیں۔ پارکوں کے اندر کہیں کہیں اُبھرتی ہوئی سفید عمارتیں اور اُن کے پیچھے گُم ہوتی ہوئی دوسری عمارتیں اور ہلکی ہلکی بارش!

یہ سب ہمیں اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس وقت ہم باتیں نہیں کر رہے تھے۔ میں سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ اپنے بالوں کو بار بار لپیٹ کر جُوڑا بناتی تھی۔ پھر کھول ڈالتی تھی۔ پھر بنانے لگتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ہمارے پاس رسمی طور پر جتنا کچھ کہنے کے لئے تھا وہ اب ختم ہو گیا ہے۔ اچانک ختم ہو گیا ہے۔ اب ہماری باتیں کسی دوسری سرحد میں داخل ہونے والی ہیں۔ یہ خاموشی اُسی بات کی غمّاز ہے۔ آدمی بولتے بولتے یونہی نہیں اچانک چُپ ہو جاتا ہے۔ کوئی بات دل میں ضرور اُٹھتی ہے جو اچانک اُس کے بولنے کی طاقت سلب کر لیتی ہے۔ عارضی طور پر ہی سہی!

اِدھر اُدھر سے نظریں ہٹا کر اب میں اُس کی طرف دیکھنے لگا مُسکرایا بھی۔ اُس نے پہلی بار میری طرف حیرت سے دیکھا۔ ایک ادا سے آنکھوں کے کونوں میں بھر کر ایک سوال بھی پُوچھا —— "کیا بات ہے؟"

میں نے جلدی سے ایک بات سوچ لی۔ کہا "آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں!"

"تھینک یو!" خوش ہو کر اُس نے بال ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

"کیا اِنہیں ہمیشہ کھلا ہی رکھتی ہیں؟"

وہ ہنس پڑی "جی نہیں! ابھی سمیٹوں گی اِنہیں" اُس کا چہرہ لال بھی ہو گیا۔

"تعریف کوئی بھی کرے۔ اپنا یا دوسرا مرد! عورت کا چہرہ ہمیشہ لال ہو جاتا ہے!"

اُس نے کوئی جواب دینے سے پہلے مجھے تولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر گھڑی دیکھی اور کہا "بھوک لگ رہی ہے!"

"لیکن وہ تو آئے نہیں ابھی تک!"

پھر دوسرا آدمی! وہ کہیں نہیں ہے لیکن میرے ذہن پر بُری طرح سوار ہے۔ وہ اُس کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کرتی ہے۔ جب بھی!

بولی "ہم اُن کا انتظار نہ کریں گے۔ چلیے"

لیکن پہلے وہ ویٹنگ رُوم میں گئی۔ جلدی جلدی سلیقے سے جُوڑا باندھا۔ بہت اونچا اور پھیلا ہوا۔ پن کی مدد سے۔ پھر میک اَپ کیا۔ میں صوفے پر بیٹھا دیکھتا رہا۔ وہ تیار ہو گئی تو بالکل بدلی ہوئی سی معلوم ہوئی۔ لیکن اُس کے لئے میرے ساتھ نظریں مِلانا دُشوار ہو گیا۔ شاید احساسِ حُسن کی وجہ سے۔ چُپ چُپ سی میرے ساتھ ریسٹوران میں گئی۔ وہاں جا کر بھی نظریں جُھکائے مینو کو دیکھتی رہی۔ جان بُوجھ کر سر نہ اُٹھایا۔ یہ مجھے اچھا معلوم ہوا۔ فیصلہ کر لیا اب اُس کی اور تعریف نہ کروں گا۔ خواہ مخواہ پریشانی ہوتی ہے۔

مینو کو میں نے بھی دیکھنا چاہا۔ اچھی اچھی ڈِشز کا انتخاب کیا جائے! بُھنا ہوا مُرغ، انڈا کری، بھنڈی، نان ——!

"جیسے کبھی کبھی اچانک بادل گھِر آتے ہیں اور بُوندیں پڑنے لگتی ہیں تو کتنا اچھا لگتا ہے!"

وہ میری طرف حیران سی دیکھ رہی ہے۔ کچھ سمجھ نہ سکی!

"اور جی چاہتا ہے آنکھیں بند کر کے چہرہ آکاش کی طرف اُٹھا لیا جائے!"

"تب!" اُس نے سمجھنے کی کوشش کی۔

"تب آدمی کا جی بے اختیار ہنس پڑنے کو چاہے گا!"

"یعنی!" اب بھی نہیں سمجھی ہے۔

یعنی اِس وقت میرا جی بے اختیار ہنسنے کے لئے مچل رہا ہے۔ کیا آپ کو کچھ پتہ ہے میں اِتنا خوش کیوں ہوں؟"

وہ میری بات سمجھ گئی ہے۔ لیکن اُس کے چہرے پر
گہری سنجیدگی ہے۔ شاید چاہتی ہے میں اِسی طرح شاعری کرتا
رہوں۔ شاعری عورت کو اچھی لگتی ہے۔ اگر اُس کی سمجھ میں
آتی رہے۔ لیکن وہ میرے ساتھ ہنس پڑنے کی خواہش کا ساتھ
کیوں نہیں دیتی!

کھانے کا بل بھی اُسی نے پے کیا۔ ہم باہر آگئے۔ لمبے کاریڈور میں ٹہلنے لگے۔ الگ الگ کئی ویٹنگ رُوم تھے۔ ہر درجے کے۔ ریٹائرنگ رُوم بھی۔ ایک دوسرے سے کوئی بات کئے بغیر کئی چکّر لگالئے۔ کبھی کبھی کھُلے دروازوں میں جھانک کر بھی دیکھا۔ بے مقصد ہی۔ اب کسی کی طرف دیکھ کر نہیں ہنسے۔ اچانک ہماری ایک دوسرے میں دلچسپی جیسے ختم ہوگئی ہو!

کچھ دیر تک لِفٹ کے پاس کھڑے رہے۔ لِفٹ کے ذریعے کئی لوگ اوپر آئے۔ کئی نیچے گئے۔ پھر ایک بیمار بڑھیا کو لے کر لِفٹ اوپر آگئی۔ قُلی اُسے ہِسک چیئر میں بٹھا کر لے آتے تھے۔ اُسے آگے پیچھے ڈنڈوں سے اُٹھا کر کسی ایک ریٹائرنگ رُوم میں لے گئے۔ لِفٹ پھر نیچے چلی گئی۔ بہت گہرائی میں۔ کتنی دیر تک پھر اوپر نہ آئی۔ ہم جنگلے میں سے نیچے جھانکتے رہے۔ انتظار کرتے رہے۔ پھر کب اوپر آتی ہے!

کئی منٹ گزر گئے ہیں۔ میرا دل بیٹھنے سا لگا ہے۔
شاید وہ بھی یہی محسوس کر رہی ہے۔ لیکن لِفٹ کی آہنی رسّی
پھر حرکت کرنے لگی ہے۔ اب لِفٹ اوپر آئے گی۔ اُس کی حرکت
سے کچھ اطمینان سا محسوس ہوا ہے۔

اُس بار لِفٹ ایک خوش پوش نوجوان کو لے کر آئی۔ اُسے دیکھتے ہی وہ اُس کی طرف لپک کر بڑھی۔ مُسکرا بھی دی۔ اُسے دیکھ کر وہ بھی مُسکرا دیا۔ نوجوان نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور دونوں اندر چلے گئے۔ کسی نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ میں وہیں کھڑا سا رہ گیا۔ لِفٹ مین نے پُوچھا: "صاحب چلیے گا!" تو میں چونکا۔ "نہیں" کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا۔ کاریڈور میں سے ہوتا ہوا ریلنگ پر جا کھڑا ہوا۔

نیچے وہی ٹیکسیاں ہیں۔ موٹریں اور تانگے اور اسکوٹر
اور قُلی اور مسافر اور سامنے سڑک پر بسیں اور اُس پار پارک
اور عمارتیں اور ختم ہوتے ہوتے مکانات کے سلسلے! بارش
بند ہو چکی ہے۔ لیکن بادل ابھی آسمان سے لٹکے ہوئے معلوم
ہوتے ہیں!

یہاں کھڑے کھڑے کتنی دیر ہوگئی ہے۔ وقت کا کوئی
احساس نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن سب اچھا بھی معلوم ہو رہا ہے۔
عجیب طرح کا دُکھ بھی ہو رہا ہے۔ لیکن میں دُکھ کے بارے میں
بھی کچھ نہیں سوچنا چاہتا۔ صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔ سامنے،
ہر چیز حرکت میں ہے۔ جو کچھ دیر کے لئے ٹھہر سا جاتا ہے۔ وہ
پھر چل پڑتا ہے!

ایک ٹیکسی میں دو سواریاں داخل ہوئی ہیں۔ قُلی
نے اُن کا سامان کچھ اوپر رکھ دیا ہے کچھ پیچھے۔ مزدوری پاکر
سلام کیا ہے اور وہاں سے چلا گیا ہے۔ ایک سواری نے ذرا
سا سر نکال کر باہر دیکھا ہے۔ اوپر کی طرف نہیں دیکھا۔ پھر سر کو
اندر کر لیا ہے۔ خوبصورت گھنے گھنے بالوں سے بھرا ہوا سر!
ٹیکسی ایک لمبی 'زوں!!' کی آواز دے کر چل دی ہے۔
دوسری بھاگتی ہوئی ٹیکسیوں میں شامل ہو کر کھو گئی ہے!!

لالہ زار

پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور، ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، پی ایچ۔ ڈی

اب کیا پلٹ کے آپ میں آنے کا ڈر مجھے   بالکل اُلٹ گئی ہے تمھاری نظر مجھے
یہ تیری بھول یاد رہے گی کہ آج تک   تُو نے کبھی نہ یاد کیا بھول کر مجھے
دامن میں لعلہائے بدخشاں، زہے نصیب!   تم سے ملی ہے دولتِ غم کس قدر مجھے
کوتاہ تھی وہ نیم نگہہ، اس کے با وجود   خوش قسمتی سے چوٹ لگی کارگر مجھے
اُس رشکِ مہر و ماہ کی رُخصت کے بعد بھی   لگتا ہے اُس کے نور سے معمور گھر مجھے
زندہ شہید کا نہ سنا خوں بہا کہیں   آنکھیں ملا کے پار کرو بے خطر مجھے
اک قسم زہرِ دیر اثر ہے اگر شراب   پھر تو یہ روز چاہیئے شام و سحر مجھے
بجلی کی رَو ہر اک رگِ تن میں گزار دی   دیکھا جو تن کے اُس نے سپر رہگزر مجھے
میں خود کو رازِ دہر سے کیوں بے خبر کہوں   کیا کم ہے یہ خبر کہ نہیں کچھ خبر مجھے
دیتی ہے لطف گرم روی خار زار میں   میرے قدم چلائیں ذرا تیز تر مجھے
اے دوستو! یہ تم سے بڑی چوک ہو گئی   لُوٹا، مگر نہ دھر گئے تلوار پر مجھے
کب دی ہے میں نے بے سروپا غیب کی خبر   ہرچند خود نہیں خبرِ پا و سر مجھے

انور اگرچہ مشق بہت کی نباہ کی
پھر بھی نباہنے کا نہ آیا ہنر مجھے

۵/۳۱، ایسٹ پٹیل نگر، نیو دہلی-۸

اُڑی اُڑی سی

م۔ک۔ مہتاب ایم۔ اے

ڈبلیو۔ زیڈ۔ ۱۴۴۱۔ شیو نگر۔ نئی دہلی نمبر ۱۸

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

افسانہ نمبر ملا۔ آپ نے اپنی محنت کے اِس اعجاز سے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ زبان کی خدمت صرف غالب نمبر ہی نکال کر نہیں ہو سکتی۔ ایسے افسانہ نمبر نکال کر بھی ہو سکتی ہے۔ آپ نے اُردو دُنیا سے رنگ رنگ کے اِتنے پھول چن کر جمع کر دیئے ہیں کہ دماغ باور ہی نہیں کرتا کہ یہ اُسی اُردو زبان کا پرچہ ہے جس کی بے کسی پر آنسو بہائے جا رہے ہیں۔ اپنی اِن کوششوں کے لئے میری مبارکباد قبول فرمایئے ـــــ جنابِ شاد کی وفات "بیسویں صدی" اور اُس کے قارئین کے لئے ایک ذاتی صدمہ ہے۔ درحقیقت جنابِ درد کی گمشدگی کے بعد شاد کی تحریروں سے اِک ـــ خواہشِ مرگ جھلکنے لگی تھی اور ہر وقت ان کے بارے میں کچھ کھٹکا ہی لگا رہتا تھا۔ خدا انھیں اپنی رحمت کے سایہ میں جگہ دے ـــــ "بیسویں صدی" کے لئے ایک افسانہ "اُڑی اُڑی سی" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے قارئین حسبِ سابق شرفِ قبولیت عطا فرمائیں گے ـــــ "بحرِ قدیم" پر اظہارِ پسندیدگی کرنے والے بہت سے بھائی بہنوں کا خصوصاً سرحد کے محافظ فوجی بھائیوں کا ممنون ہوں ...

آپ کا عزیز ـــــ م۔ک۔ مہتاب

★

شدھا نارنگ اپنے فلیٹ کے سامنے چھوٹے سے لان میں ٹہل رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں سبزے پر جھکی ہوئی تھیں اور خیالات نہ جانے کہاں پرواز کر رہے تھے۔ اُس نے اپنے شہد کے چھتے جیسے بڑے سے جوڑے میں سے گلاب کا پھول نکالا اور ناک کے پاس لے جا کر زور زور سے سونگھنے لگی۔ لیکن جلد ہی اپنی نادانی پر مسکرا دی۔

'پلاسٹک کے پھولوں میں سے خوشبو کہاں سے آسکتی ہے؟'

'تو اُس نے یہ پلاسٹک کا گلاب اپنے بالوں میں لگا ہی کیوں رکھا ہے؟'

وہ ہری ہری دُوب کی طرف دیکھتی ہوئی اپنے آپ سے سوال و جواب کر رہی تھی۔

'محض اِس کی دلکشی کے لئے!'

اُس نے خود ہی جواب دیا اور گرد و پیش کے ماحول اور معاشرے کا جائزہ لیتی ہوئی خود کلامی کے انداز میں کہنے لگی ـــــ 'اب شاید لوگوں کی آنکھیں ہی آنکھیں باقی رہ گئی ہیں۔ سونگھنے اور پرکھنے کا احساس تو جیسے ختم ہو گیا ہے۔ اِسی لئے تو ہر طرف نمائش ہی نمائش دکھائی دیتی ہے۔ اگر اُس نے افزائشِ حسن کے لئے پلاسٹک کا پھول گیسوؤں میں لگا لیا تو اِس میں کیا حرج ہے۔ ایک بار تو آنکھوں کو دھوکا دے سکتا ہے اور اب یہ دُنیا بھی تو قدرت کی جلوہ گری کی بجائے انسان کی جادوگری کا کمال ہو کر رہ گئی ہے۔

شدھا نے پھول اور اُس کے ساتھ لگی دو سبز پتیوں کو پھر جوڑے میں اٹکا لینا چاہا۔ لیکن اُس کے ہاتھ جیسے رُک گئے۔

'آخر ہے تو یہ ملمع ہی!' اُس کے دل نے گواہی دی۔

'اور اُس کی زندگی کون سا کھرا سونا ہے۔ پھر پلاسٹک کے گلاب سے ہچکچاہٹ کیسی؟' اُس کے کانوں میں ایک اجنبی سی آواز گونجنے لگی۔

وہ صبح سے ہی کچھ پریشان تھی۔ نہ جانے یکایک کہاں سے ایک شدید احساس نے اُسے آ گھیرا تھا۔ ایک درد اُس کے سارے وجود میں بھرتا جا رہا تھا۔ یہ درد پہلے

کبھی کبھی بار اُسے محسوس ہوا تھا، کبھی دل میں، کبھی دماغ میں، کبھی آنکھوں میں اور کبھی زبان پر۔ لیکن اُس کا سارا وجود تو کبھی اِس طرح متاثر نہ ہوا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ دس برس کی اِس ازدواجی زندگی میں وہ اِتنی کور ڈسس (Immune) ہوگئی تھی کہ یہ چھوٹے موٹے جذباتی صدمے کوئی اثر نہیں رکھتے تھے۔ لیکن آج نہ جانے کیوں اُس کا انگ انگ دُکھنے لگا تھا۔ جیسے گزشتہ دس برس کے درد مل کر اُس کا خون نچوڑ رہے ہوں۔

صبح نارنگ صاحب کام پر جاتے ہوئے اُس سے پوچھ رہے تھے: "کیوں سدھا! آج اُداس اُداس سی ہو۔ خیریت تو ہے۔ کوئی دوا لے لی ہوتی۔ ہاں آج آخری ہفتہ ہے۔ میں جلد لوٹ آؤں گا۔ شاید ڈی سوزا بھی میرے ساتھ ہی آجائے۔ کہہ رہا تھا برج کھیلے بہت دن ہوگئے ہیں۔ اگر آیا تو کھانا بھی یہیں کھائے گا۔ تم اُس کے بلند ذوق اور نفاستِ طبع سے تو واقف ہی ہو۔ میرا کمرہ ذرا اچھی طرح ترتیب دے دینا۔ سالا پھبتیاں کسنے سے باز نہیں آتا!"

سدھا مسٹر نارنگ کے جانے کے بعد گھنٹہ بھر کمروں کی جھاڑ پھونک کرتی رہی۔ نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور میک اَپ کے بعد آکر لان میں ٹہلنے لگی۔

ایسے مواقع پر جب مسٹر نارنگ کے دوست گھر آیا کرتے تھے تو سدھا کی طبیعت خوب کِھل اُٹھتی تھی۔ دو چار گھڑی خوب شغل رہتا تھا۔ لیکن آج نہ جانے اُسے کیا ہوگیا تھا کہ طبیعت گرتی ہی جارہی تھی۔ حالانکہ خوشبودار جھاگ سے بھرے ٹب میں آدھ گھنٹہ نہانے سے تو طبیعت کلی کی طرح چٹک اُٹھتی ہے اور میک اَپ کے بعد ہلکے پھلکے ریشمی لباس میں تو جیسے جسم کو پر لگ جاتے ہیں۔ لیکن سدھا کا جسم تو اِس غسل و آرائش کے بعد بھی ٹوٹ رہا تھا۔ وہ کمرے میں آکر دیوان پر لیٹ رہی۔

سامنے پھولوں کے لمبے گلدان کے پاس قدِ آدم فرج رکھا تھا۔ کمرے کے گہرے سکوت کو فرج کی ہلکی ہلکی آواز توڑ رہی تھی۔

ڈی سوزا آج پہلی بار تو اُن کے گھر نہیں آرہا تھا۔ وہ اُسی کارخانے میں جہاں پہلے نارنگ صاحب کام کرتے تھے پروڈکشن انجینئر ہے۔ جب بھی اُس کا دل بیئر پینے کو چاہے وہ نارنگ صاحب کے ساتھ آجاتا ہے۔ آدمی واقعی بہت پیارا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پہلی بار جب وہ آیا تو وہ اُس سے بات کرتے ہوئے بھی جھجک رہی تھی۔ لیکن ڈی سوزا نے اُسے ایسا متاثر کیا کہ وہ اُس کے ساتھ برج بھی کھیلنے لگی۔

سدھا دیوان پر منہ کے بل لیٹی ڈی سوزا کے رنگ جیسے فرج کو دیکھ کر مُسکراتی ہوئی سوچ رہی تھی۔

"ڈی سوزا آدمی واقعی حسّاس ہے۔ جب تیسری بار آیا تو بیئر ساتھ لے آیا۔ سمجھ گیا ہوگا کہ پانچ چھ سو تنخواہ پانے والے کا اِتنا حوصلہ کہاں ہوسکتا ہے۔ مجھے بُرا معلوم ہوا، لیکن نارنگ صاحب کہنے لگے دوستی میں سب روا ہے۔ ہر ہفتے پانچ سات بوتلیں بیئر کہاں سے آسکتی ہے۔ ایک دن بیئر خاطر خواہ ٹھنڈی نہیں ہوسکی تو ڈی سوزا ہی نے یہ فرج بھجوا دیا۔ کہنے لگا میں اکیلا آدمی ہوں۔ گھر میں فرج بیکار پڑا رہتا ہے۔ آپ تو گھر گرہستی والے ہیں ـــــ آؤں گا تو کم از کم بیئر تو خوب ٹھنڈی ملے گی۔ جس دن ڈی سوزا نے اپنا عمدہ فرج اُٹھوا کر ہمارے ہاں بھجوا دیا تو میرے دماغ میں ایک درد سا ہوتا رہا۔ لیکن نارنگ صاحب کہنے لگے۔ کسے معلوم ہے کہ ہم نے فرج خریدا ہے یا کسی نے بطور تحفہ دیا ہے۔ سدھا! یہ چیزیں تو آج کل انسان کے وقار کی علامتیں ہیں اور ایک بار جب وقار بن جائے تو پھر کون پوچھتا ہے کہ یہ کیسے بنا؟

قریب دو برس سے یہ فرج ہمارے چھوٹے سے کُنبے کا ایک فرد بن چکا ہے۔ نارنگ صاحب نے وہ فرم چھوڑ کر اپنا کام شروع کرلیا ہے۔ لیکن ڈی سوزا کا ہمارے ہاں آنا جانا اُسی طرح قائم ہے۔ اُسے ہمارے ساتھ برج کھیلنے کا شوق ہے یا نارنگ صاحب کے ساتھ بیٹھ کر بیئر پینے کا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ یہ فرج اُس نے بھیجا تھا۔ یہ فرج نارنگ صاحب کے کتنا کام آیا۔ ورنہ فروٹ پروڈکشن کمپنی چھوڑنے کے بعد ایک بار تو میرے قدم بھی ڈگمگا گئے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ تین بچوں کی تعلیم، لباس اور خوراک کے اخراجات۔ فلیٹ کا کرایہ۔ گھر میں دوستوں کی پارٹیاں۔ یہ سب ٹیپ ٹاپ کیسے قائم رہے گی؟

اور وہ ملازمت بھی تو میری ہی وجہ سے جاتی رہی تھی۔ بات تو چھوٹی سی تھی۔ لیکن رائی سے پہاڑ بن گئی۔ کمپنی کے جنرل منیجر کے لڑکے کی شادی پر اُن کے ہاں کاک ٹیل پارٹی تھی۔ ہم لوگ بھی مدعو تھے۔ لیکن مجھے ایسی دعوتوں میں غیر مردوں کے ساتھ بانہوں میں بانہ ڈالے گھومتے رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ پھر مسٹر سدانارنگ شرما بھی تو مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ پہلے بھی میں نارنگ صاحب کے ساتھ دو بار اُن کے گھر جا چکی تھی۔ مسٹر شرما خوبصورت اور جوان لڑکیوں کو یوں حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں جیسے آنکھوں سے اُن کی کھال اُدھیڑ رہے ہوں اور ہاتھ چلاتے ہیں تو ساری رات ہاتھ حدو کرتا رہتا ہے۔ میں کاک ٹیل پارٹی پر نہ گئی تو مسٹر سدارنگ شرما نے میری غیر حاضری کا سبب پوچھ ہی لیا۔ نارنگ صاحب نے بہانہ تو معقول تراشا۔ لیکن شرما جی نے اِسے اپنی بے عزتی خیال کیا اور ایک ہی ہفتے بعد کسی نہ کسی بہانے نارنگ صاحب کو ملازمت سے جواب دے دیا۔

نارنگ صاحب کا خیال ہے کہ یہ ملازمت میری ہی وجہ سے گئی ہے۔ اگر میں وہاں چلی جاتی تو میری کوئی سی کمان آ دھمکی جاتی۔ کسی کے دیکھنے سے چار سو روپیہ ماہوار ملتے ہیں تو اُس کی کمزوری سے فائدہ نہ اُٹھانا بے وقوفی ہے۔ لوگ تو خوبصورت لڑکیوں سے شادی ہی اسی لئے کرنا چاہتے ہیں کہ وہ آگے بڑھنے کے لئے اُن کے راستے ہموار کر دیتی ہیں۔ اُن کی نمائش سے مردوں کے اپنے عیب چھپ جاتے ہیں۔ نہیں تو خانہ داری کے لئے تو کوئی بھی لڑکی بیوی ہو سکتی ہے۔

نارنگ صاحب کی باتوں سے دل میں درد سا ضرور ہوا لیکن میں سمجھتی ہوں غلطی میری ہی تھی۔

نارنگ صاحب اِس شرم و حجاب اور خواہ مخواہ کی بندشوں کو کچھ ٹھیک بھی نہیں سمجھتے۔ شادی کے بعد شروع شروع میں اُن کے دوست آیا کرتے تو میرے سامنے ہی میری تعریفوں کے قصیدے پڑھنے لگتے۔ میں جھجکتی لیکن نارنگ صاحب کی گردن فخر سے تن جاتی۔ پھر اُن دوستوں کو شربت چائے پلانا کوئی خسارے کی بات بھی نہ تھی۔ کتنی ہی ساڑیاں مجھے اِن دوستوں ہی سے تحائف میں ملیں۔ اِن کے دوست ڈاکٹر کھورانہ کتنے کام کے آدمی نکلے۔ بڑے بچے کو ایسے اسکول میں داخلہ دِلا دیا جہاں بڑے بڑے امیر کبیروں لوگوں کے بچے داخل ہوتے ہیں اور اِس محنت کا معاوضہ کیا ہے؟ کبھی آتے ہیں تو کہتے ہیں۔ بھابی! اپنے ہاتھ سے ایک پیالہ چائے پلا دو۔ میں نے کہا شکر ختم ہو رہی ہے! تو بولے۔ ذرا اِس میں اپنی اُنگلی گھما دو چائے میٹھی ہو جائے گی۔ مجھے بھی ہنسی آگئی اور وہ بھی ہنسنے لگے۔ نندہ جی ایڈوکیٹ ہیں۔ اُنھوں نے جھگڑا کر کے فلیٹ کا کرایہ آدھا کرا دیا۔ جب چھوٹی بچی بیمار ہوئی تو نارنگ صاحب کلکتے گئے ہوئے تھے۔ اُن کے دوست مسٹر منوچہ دو راتیں میرے پاس بیٹھے جاگتے رہے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو نارنگ صاحب کا خیال ٹھیک ہی ہے کہ حقیقی بزنس مین وہی ہے جو دوسروں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا سکے۔ مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے عورت! جو لوگ عورت کو دیکھتے ہی پتے پھینک دیں، اُنھیں کیوں نہ بُدّھو بنایا جائے۔ اسی لئے تو وہ چاہتے ہیں کہ بیوی ہو تو حُسن کا پیکر! اور اُنھیں یہی خیال رہتا ہے کہ شدھا کے پاس قیمتی سے قیمتی لباس ہوں۔ جدید ترین ڈیزائن کے زیور ہوں اور چہرہ ہر وقت میکس فیکٹر کی خوشبوؤں سے مہکتا رہے۔

اگر اُن کا یہ نظریہ دُرست نہ ہوتا تو آٹھ ہی دس برس میں گھر میں یہ قالین، یہ بیٹھی پردے، یہ سجا ہوا ڈرائنگ روم، یہ قیمتی فرنیچر، فرج، ریڈیو گرام کہاں سے آجاتے!

جب یہ ملازمت سے الگ ہوئے تو بڑی سوزاتی آڑے آیا۔ دو ماہ پتہ ہی نہ چلنے دیا کہ تنخواہ آرہی ہے یا نہیں۔ ہم اِس فریب کے لئے کیا کرتے ہیں یہی کہ کبھی کھانا کھلا دیا۔ کبھی ساتھ بیٹھ کر برج کھیل لی اور کبھی نارنگ صاحب نے بیئر پلا دی۔

ملازمت سے الگ ہونے کے بعد ڈاکٹر کھورانہ نے مشورہ دیا: "ملازمت کی بجائے کوئی اپنا کام شروع کیجئے۔ آپ بہت کامیاب رہیں گے۔"

اِس مقصد کے لئے مجھے بھی کچھ ہمّت کرنی پڑی۔ سرمائے کے بغیر آرڈر سپلائی ہی کا کام ہو سکتا تھا۔ گزارہ ہونے لگا۔ خدا کا شکر ہے۔ وہ تو پتھر میں بھی کیڑے کو رزق دیتا ہے۔ اِسی ایک آرڈر ہی کے سلسلے میں جین سیٹھ ہمارے ہاں آیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے دیر ہو گئی تو نارنگ صاحب اُسے اندر لے آئے کہ کھانا کھا کر ہی جائیے۔ ڈھیلا ڈھالا ملگجا سا سیٹھ جین جس کی اُبلے ہوئے آلو کی سی بیوی اِتنی موٹی ہے کہ دو برس ہوئے سیڑھیوں سے کبھی نیچے نہیں اُتری۔ بھونچکا سا بیٹھا کمرے کا ساز و سامان ڈرائنگ سیٹ، فرج اور رنگا رنگ پردوں کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا۔

"سیٹھ جی! کھانے سے پہلے پائن ایپل لیں گے یا ٹماٹو سوپ؟"

وہ کہنے لگا۔

"بیٹی! جو تمھاری مرضی آئے پلا دو۔"

وہ اپنی بجھی بجھی آنکھوں سے مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی غریب بچے نے چابی سے چلنے والا خوبصورت کھلونا دیکھ لیا ہو اور چاہتا ہو کہ کھلونا اُس کے سامنے چہکتا رہے اور اُس کی پلکیں بند نہ ہوں۔ سیٹھ کا جسم شل سا ہو گیا تھا اور وہ گوشت کے ڈھیر کی مانند کرسی پر پڑا تھا۔ نارنگ صاحب کہنے لگے۔

"شدھا! سیٹھ جی کو ٹھنڈی بیئر پلاؤ۔"

میں نے قدِ آدم امریکی فرج کا دروازہ کھولا تو جین کبھی فرج کے اندر رکھی رنگا رنگ بوتلوں اور پھلوں کو دیکھتا اور کبھی میری طرف! میں نے سفید بگلے جیسے بلوریں جام چمکتی ہوئی بیئر سے بھر کر جین اور نارنگ صاحب کے سامنے رکھ دیئے۔

جین اپنے کالے کالے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا نارنگ صاحب کے ساتھ کاروباری باتیں کرتا رہا اور بیئر پیتا رہا۔ میں دوسری بوتل نکال کر اُن کے پیالوں میں اُنڈیلنے لگی تو وہ پیالے پر اپنا بھدا سا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"بس۔ بیٹی! بس۔"

جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو جین کہنے لگا۔

"نارنگ صاحب! آپ جگہ جگہ سے مال لے کر سپلائی کرنے کی بجائے اپنا کارخانہ ہی کیوں نہیں لگا لیتے؟"

"سرمایہ کہاں ہے سیٹھ جی!" نارنگ صاحب نے مُرغ کی ٹانگ نکال کر

سیٹھ جی کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"تو میرا سرمایہ کس لئے بنکوں میں بیکار پڑا ہے؟ آپ پچاس ہزار تک لگالیں!"

"ایسے نہیں سیٹھ جی۔ آپ ہمارے پارٹنر بن جائیں" یہ میں نے کہا۔ تو وہ اپنی زبان سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"بھئی میرے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ مجھے اور آمدنی کی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ موج کرو"

مجھے جین سیٹھ کی جسمانی اور تہذیبی مجبوریوں پر رحم آرہا تھا۔ اُس کا دماغ سوچ رہا ہوگا کہ کاش! وہ بھی کوئی بانکا جوان ہوتا اور پارٹنر بننے کے بہانے اِس حسین گڑیا سے رومان لڑا سکتا! لیکن اب جس لڑکی کے ہاتھ سے وہ بیئر پی رہا تھا اُسے بیٹی کہنے پر مجبور تھا۔

ساری رات میرا جسم درد کرتا رہا، دل درد کرتا رہا، دماغ درد کرتا رہا۔ مجھے جسم اور چہرے پر لگے ہوئے میکس فیکٹر کی خوشبوؤں سے بدبو آتی رہی۔ لیکن زندگی ہر چیز پر نفرت سے تھوکتے رہنے کا نام تو نہیں۔ زندہ رہنے کا نام ہے۔

اب ہمارا چھوٹا سا کارخانہ اچھا چل رہا ہے۔ گھر میں کتنا ہی نیا نیا سامان آگیا ہے۔ ہمارے دوست رشتے دار ہماری عقلمندی اور محنت پر رشک کرنے لگے ہیں۔

جین کارخانہ دیکھنے کے لئے آتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی گھر بھی آجاتا ہے۔ بیئر کے ساتھ وہسکی بھی لے لیتا ہے اور ترنگ میں آکر کہنے لگتا ہے۔

"بیٹی! نارنگ سے کہا کرو پیسے کا فکر نہ کیا کرے۔ کام ایک بار سِٹ ہوجائے تو پشتوں کا سنکٹ کٹ جاتا ہے"

مجھے کبھی کبھی جین کی موجودگی کھلنے بھی لگتی ہے۔ لیکن نارنگ صاحب سمجھتے ہیں اور میں بھی محسوس کرتی ہوں، اگر جین کی زندگی کی بھوک اِتنی سی بات سے مِٹ جاتی ہے کہ ایک خوبصورت عورت اُس کے سامنے چہکتی رہے۔ اُسے کبھی ایک جام بناکر دے دے، کبھی ہاتھ سے کھانا کھلادے تو اِس میں اُن کا کیا بگڑتا ہے۔ اور اگر اِتنی سی بات کے بدلے وہ کوئی امداد دیتا ہے تو وہ کیوں نہ قبول کی جائے۔ جین سیٹھ کی بدولت ہی گھر کا سنکٹ کٹ گیا ہے۔ دونوں چھوٹے بچے مسوری پڑھنے کے لئے چلے گئے ہیں۔ اِس برس گرمیوں میں ہم بھی پہاڑ پر جانے کی سوچ رہے ہیں۔ میں اب لباس اور سامانِ آرائش پر اِتنا خرچ کرنے لگی ہوں، جتنا پہلے سارے گھر کی خوراک پر بھی صرف نہ ہوتا تھا۔

وقت کے ساتھ انسان کے سوچنے کا انداز بھی کیسے بدل جاتا ہے۔ نارنگ صاحب سکوٹر پر دفتر جاتے ہیں تو اب مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں سوچتی ہوں سواری تو اپنی ہی ہو تو ٹھیک رہتی ہے۔

کل دوپہر میں اور ڈی سوزا بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ڈی سوزا کچھ علیل ہے۔ کام پر نہیں جارہا ہے۔ کل دل بہلانے کے لئے ہمارے ہاں چلا آیا اور کہنے لگا۔ بھابی! طبیعت بہت بوجھل سی ہے۔ آؤ تھوڑی دیر تاش ہی کھیلیں۔ اِتنے میں جین سیٹھ بھی آگیا۔ اُس کے چہرے سے اُس کے دل کی کیفیت کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا تھا۔ اُس کے ناک سکوڑنے کا انداز ظاہر کرتا تھا کہ اُسے میرا ڈی سوزا کے ساتھ تاش کھیلنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا تھا۔ وہ صوفے پر لیٹ رہا۔ شاید وہ ڈی سوزا کو اپنا رقیب سمجھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ میں ڈی سوزا کو چھوڑ کر اُس کے ساتھ تاش کھیلوں یا باتیں کروں۔ مگر اُس کھوسٹ دھوتی پوش کو تاش کھیلنا آتا بھی ہو۔ وہ تو صرف نوٹ گن سکتا ہے۔ مگر رقابت کا جذبہ تو حقیر سے حقیر کیڑے میں بھی جوش مارتا ہے۔ جین تو گوشت پوست کا انسان ہے!

میں نے فریج میں سے کچھ پھل، بیئر کی ایک بوتل اور گلاس نکال کر جین کے سامنے تپائی پر رکھ دئے اور آکر اپنے پتّے پھر اُٹھا لئے۔

جین خوبانیاں کھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"بیٹی سدھا! اب تم گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے؟"

میں اور ڈی سوزا اپنی مالی بے بسی پر ہنسنے لگے۔ لیکن جین نے شاید اسے اپنی عزّت پر حملہ خیال کیا اور کہنے لگا۔

"روپے کی تم فکر نہ کیا کرو۔ تم گاڑی پسند کرآؤ۔ روپے کا انتظام ہوجائے گا"

جیسے اُس نے نوٹوں کی گڈیوں سے ڈی سوزا کے ہنسنے والے دانت توڑ دئے ہوں۔

اُن کے جانے کے بعد میں سوچتی رہی۔

بے چارہ جین۔ بے چارہ مرد!

میری زبان بیئر کے ذائقے کی طرح کڑوی ہوگئی۔ لیکن بیئر کچھ ہی دیر کڑوی لگتی ہے۔ شام کو میں شاپنگ کے لئے گئی تو چار سو روپے خرچ کر آئی۔ یہ سوچتے سوچتے حلق میں ایک شہد سا ٹپک رہا تھا کہ اگر میں اپنی گاڑی میں شاپنگ کے لئے آؤں تو یہ لفافے اور پیکٹ لالاکر پچھلی سیٹ کے اوپر شیشے کے قریب رکھتے ہوئے کتنا لطف آئے۔

شام کو میں کچھ دیر سے گھر لوٹی تھی۔ نارنگ صاحب کلب چلے گئے تھے۔ رات میں نے انھیں اپنا خریدا ہوا سامان دکھایا تو وہ کانجی پورم کی ساڑیاں اور سر کے لئے انگریزی طرز کے بالوں کی نوری وگ دیکھ کر بہت ہی خوش ہوتے۔ پھر کہنے لگے۔

"شدھا! اب ہمیں یہ مکان تبدیل کر لینا چاہیے۔"
"کیوں؟ اچھا بھلا مکان ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"نہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں پڑوسی کچھ ہمارے معیار کے نہیں ہیں۔"
"وہ کیسے؟" میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔
"مجھے کلب میں کسی دوست نے بتایا تھا کہ ہمارے اوپر کے فلیٹ میں جو شریمتی ہیرا سنگھ رہتی ہیں وہ سوسائٹی میں کچھ نیک نام نہیں ہیں۔ لوگ کہتے ہیں اِس بیوہ عورت کے پاس کون سی ریاست ہے جو اس شان سے رہتی ہے! میں سوچتا ہوں ایسے پڑوس میں رہ کر تو آدمی کسی وقت بھی بدنام ہو سکتا ہے۔ ہم اِسی ماہ مکان تبدیل کر لیں گے۔"
"لیکن میں تو یہیں رہوں گی!" میں نے یوں جواب دیا جیسے میرے دماغ پر کسی نے زور سے چابک دے مارا ہو۔
"کیوں؟" نارنگ صاحب حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔
میں اُنھیں کوئی جواب نہ دے سکی۔
حالانکہ میں کہنا چاہتی تھی کہ میں اپنے ہی جیسے لوگوں میں رہنا چاہتی ہوں۔ کیا اخلاق پر جسم ہی سے حرف آتا ہے۔ کیا رُوح اور ضمیر بیچنے والوں کی آبرو باقی رہ جاتی ہے؟
لیکن میری زبان کو جیسے آگ لگ گئی تھی جس میں میرا خون جل جل کر اُڑا جا رہا تھا!!

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔

غزل

سراج الحسن سراج ادیبؔ ایم اے

آج کیوں ٹوٹے نظر آتے ہیں پیمانے کئی
کیا صفِ رنداں میں بھی شامل ہیں دیوانے کئی

مجھ سے اُن کی بے رُخی کل تک ذرا سی بات تھی
آج لیکن بن گئے ہیں اس کے افسانے کئی

کیا قیامت ہے کوئی اپنا نظر آتا نہیں
پُرسشِ غم کو چلے آئے ہیں بیگانے کئی

اُن کی محفل میں کسی نے بات سدھے منہ نہ کی
تھے وہاں بھی گرچہ میرے جانے پہچانے کئی

اُن دنوں کی یاد اب لیتی ہے دل میں چٹکیاں
جب ہمارے دم سے تھے آباد میخانے کئی

شہر کے پُر ہول ہنگاموں سے گھبرا کر سراجؔ
ہم نے اب آباد کر ڈالے ہیں ویرانے کئی

غزل

مہندر پرتاپ چاندؔ ایم اے

یہ کِس کی یاد آئی جا رہی ہے!
دلِ مہجور کو تڑپا رہی ہے

نہیں ملتا جو دِل ہم سے تمھارا
نظر بھی کیوں مِلائی جا رہی ہے

ہمارے حال پر یہ زندگانی
ہمیشہ سے کرم فرما رہی ہے

کہانی زیست کی۔ سازِ الم پر
ازل ہی سے سُنائی جا رہی ہے

معطّر ہو رہی ہے دِل کی دُنیا
ہوا یہ کِس کی خوشبو لا رہی ہے!

محبت بھی کسی کی اب تو اے چاندؔ
مجسّم درد بنتی جا رہی ہے


تمہیں چاہئے تم بھی کھاؤ
دوڑ سکو تو لے لو آکر
اور مانگتے ہو کیوں بھائی
ہاتھ میں گلوکو بسکٹ لیکر
پارلے
گلوکو
بسکٹ
PARLE
Gluco
★ بڑھیا طاقت
★ انوکھی لذت
★ کرکرے، ہمیشہ تازہ
★ بے مثال صحت و قوت
اسی لئے تو پارلے گلوکو، بھارت کے سب سے زیادہ بکنے والے بسکٹ ہیں!

افسانہ

تلخ گھونٹ

ایم۔ ایچ۔ خان شاہجہانپوری

۳۰۵، تاریو جلال نگر۔ نزد مسجد قصاب شاہجہانپور (یو۔ پی)

مکرمی و محترمی! اسلام مسنون

... اِس سے پہلے جو ایک نامہ ارسالِ خدمت کیا تھا ابھی تک کوئی جواب نہ پایا۔ تشویش ہے۔ لیجئے ایک تازہ ترین افسانہ "تلخ گھونٹ" بھیج رہا ہوں ...

احقر ——— ایم۔ ایچ۔ خان

★

پڑھی نمازِ جنازے کی میری غیروں نے

مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے

"گھورے! طوفان آرہا ہے"

"آنے دو۔ دروازے پر ٹٹی لگا دو اور چھپر کس کے باندھ دو!"

"میں چھپر باندھ دوں، دروازے پر ٹٹی لگا دوں اور تم بس رنگوں کی پُتی پھیرے جاؤ۔ گھورے تم سمجھتے کیوں نا ہو۔ ایک دم اندھیرا چھا گیا ہے کچھ بھی سُجھائی نہ دے ہے۔ ہوا کے جھکڑ آفت مچائے ہیں اور تمھیں رتی بھر فکر نہیں۔ کیا تمھیں طوفان سے ڈر نہیں لگتا گھورے؟"

"اب مجھے طوفانوں سے ڈر نہیں لگتا راشو! بہت سے طوفان مرے گزر چکے ہیں۔"

"اللہ قسم گھورے ایسی باتیں کرے ہو میری تو کچھ سمجھ میں نا آوے ہے" راشو بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی اور میرے ہاتھ کا برش اب بھی کینوس پر ایک تصویر کی زُلفیں سنوارنے میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہی میں تھا، وہی میری اُنگلیاں۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ اب اُنگلیوں کی حرکت میں وہ نفاست نہ رہی تھی۔ اِنھیں اُنگلیوں نے اپنی تخلیقات سے سینکڑوں انعام حاصل کئے تھے، ڈھیروں خراجِ تحسین ملے تھے لیکن اب ———

ہوا کا ایک تیز جھکڑ آیا۔ راشو کی لگائی ہوئی ٹٹی دور جا گری۔ ساری کوٹھری میں دھول کی حکمرانی ہوگئی۔ میں نے تصویر پر پردہ ڈال دیا اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ راشو کے بڑبڑانے کی آواز اب بھی آرہی تھی۔ فضا میں سیٹیاں بج رہی تھیں، باہر بھیانک طوفان گڑگڑا رہا تھا اور ——— ایک طوفان میرے سینے میں بھی برپا تھا ——— ایک طوفان اب سے ایک سال پہلے بھی تو آیا تھا۔ اُف! کتنا وحشت ناک تھا وہ طوفان۔ جس نے مجھے تنکے کی طرح اُڑا کر کہاں سے کہاں پھینک دیا تھا۔ کاش! وہ طوفان نہ آیا ہوتا۔

ایک سال پہلے بمبئی میں Indian Art کی نمائش لگی تھی، جس میں میری بنائی ہوئی تصویر بھی پیش کی گئی تھی۔ وہ ایک پہاڑی دوشیزہ کی تصویر تھی۔ نمائش میں تماشائیوں کی ریل پیل تھی۔ ایک لڑکی میری تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ تیسری بار تصویر کو دیکھنے آئی تھی۔ وہ خوبصورت خد و خال اور دلکش انبھار کی لڑکی تھی اور یہ محض ایک اتفاق ہی تھا کہ میری تصویر کے خطوط اُس لڑکی کے نقوش سے کچھ شباہت رکھتے تھے۔ مجھے بھی اِس حسین اتفاق پر کچھ حیرت تھی۔

وہ چوتھی بار تصویر کو دیکھنے آئی تو نہ جانے کیوں میں اُس کے پاس جاکر تماشائیوں کی حیثیت سے کھڑا ہو گیا۔ وہ گرد و پیش کے احساس سے بے خبر بس گہری نگاہوں سے تصویر کو تک رہی تھی۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ اُس کے بال اُڑ اُڑ کر اُس کی پیشانی پر بکھر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہوا کے تھپیڑے کچھ تیز ہوگئے اور پھر ہوا نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ یہ آناً فاناً ہو گیا۔ کوئی کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ پھر اچانک اِتنی زور سے بادل کڑکا کہ وہ لڑکی یکبارگی لرز کر میرے شانے سے آلگی۔ وائے آفت ہو گئی۔ کچھ بھی سُجھائی نہ دے رہا تھا۔ پیہم بادل کی کڑک سے وہ سہمی سی جا رہی تھی ——— اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، میرے وجود میں بھی شدید طوفان

آگیا ہے۔ کچھ دیر بعد لائٹ ہوئی تو وہ سہم کر اس طرح مجھ سے جدا ہوگئی جیسے ابھی تک وہ ہوش میں نہ تھی۔ شرم سے اُس کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔ وہ سر تا پا لرز رہی تھی۔ اُس نے کپکپاتی آواز میں کہا "Excuse me sir!"

میری زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ میری نگاہیں پھر اُس کے سراپا کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ اب بھی حجاب کی لہروں میں شرابور ہو رہی تھی۔

"I am very sorry sir" اُس نے پھر کہا تو میں چونک پڑا۔

"کوئی بات نہیں محترمہ! یہ تو محض ایک حادثہ ہے۔ معافی کی کیا بات ہے — ایک عجیب و حسین حادثہ ہی یہ بھی ہے کہ بغیر دیکھے میرے ذہن میں آپ کی شبیہہ آگئی اور جس کا اظہار نادانستہ اُس تصویر میں ہوگیا۔ شاید آپ اسی لئے بار بار اِس تصویر کو دیکھنے آتی ہیں۔"

"جی ہاں، جی ہاں!" اُس کی شرم کچھ کم ہوگئی۔ اُس کے چہرے سے مختلف تاثرات نمودار ہو رہے تھے۔ اُس نے حیرت سے پُوچھا "تو کیا یہ تصویر آپ نے بنائی ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ حادثہ میرے ہی ذہن اور اُنگلیوں سے سرزد ہوا ہے۔"

"Really very nice picture" مجھے بے حد پسند آئی۔ آپ بہت اچھے آرٹسٹ ہیں۔" اُس نے الفاظ و نظر دونوں سے اظہارِ عقیدت کیا۔

ایک طوفان دم توڑ چکا تھا لیکن دوسرا طوفان ابھی میرے ذہن میں مچل رہا تھا۔ باہر پانی کے ہلکے ہلکے چھینٹے پڑ رہے تھے۔ وہ وقت گزاری کے لئے اب میرے بارے میں بہت سی باتیں جاننا چاہ رہی تھی۔ پھر میں نے اُسے اپنے Private Cabin میں چائے پر مدعو کیا تو وہ بلا تکلف چلی آئی۔ چائے کے درمیان اُس نے بتایا کہ وہ بمبئی کی رہنے والی ہے۔ اُس کے والد فلم ڈسٹری بیوٹر ہیں اور وہ جوہو میں رہتی ہے۔ ہوا کے جھکڑ ختم ہو چکے تھے۔ پانی رُک چکا تھا۔ وہ جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ میری نگاہیں اُس کے خوبصورت خد و خال کو الوداعی انداز میں چوم رہی تھیں۔ دل کہہ رہا تھا کاش! وہ کبھی نہ جائے۔ اِس کا وجود ہمیشہ کے لئے سایہ کی طرح میری زندگی سے وابستہ ہوجائے۔ احساسات میں اِس کے دلکش چہرے کی پرچھائیاں متحرک ہوجائیں — کاش یہ میری ہوجائے! اُس نے چلتے وقت دوسرے دن اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور میں انکار نہ کرسکا۔ پھر وہ بادِ صبا کے خوشگوار جھونکے کی طرح چلی گئی۔

نہ جانے کیوں اُس رات میں سو نہ سکا۔ دوسرے دن اُس کے گھر پہنچا تو وہ کلی کی طرح کھل گئی۔ اُس نے بہت فخر سے اپنے پاپا سے میرا تعارف کرایا۔ اُس نے پُرتکلف ناشتے سے نوازا اور چلتے وقت عجیب انداز میں کہا — "کیا آپ میری تصویر بنا دیں گے؟"

"آپ کی تصویر بنانے میں میں خوشی محسوس کروں گا" میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"لیکن تصویر —"

"آپ خود بہت اچھی ہیں۔ تصویر اِس سے بھی حسین ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں ایسی تصویر بنانے کی کوشش کروں گا جسے دیکھ کر انسان اپنا دل نکال کر رکھ دے۔ فرشتوں کے ایمان ڈگمگا جائیں۔ مہر و پروین اپنی دمک پر شبکی محسوس کرنے لگیں — اور — اور بس یوں سمجھ لیجئے کہ تصویر بنانے میں میں اپنا سارا فن ختم کر دوں گا۔"

"کیا آپ افسانہ نگار ہیں؟" اُس نے مُسکرا کر پُوچھا۔

"زندگی خود ایک افسانہ ہے۔ جب اِس کا عنوان مِل جاتا ہے تو عبارت نکھر آتی ہے۔"

"اگر آپ نے میری پسند کی تصویر بنا دی تو میں ساری زندگی آپ کا احسان نہ بھولوں گی۔ آپ جو معاوضہ مانگیں گے میں دوں گی۔"

"سعیدہ صاحبہ! فن معاوضے کا محتاج نہیں ہوتا۔ اُسے بس خلوص کی نظر چاہیئے۔"

"پھر بھی میں خوش ہوں گی اگر آپ کچھ معاوضے کے طور پر قبول کرلیں گے۔"

"اچھا اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو تصویر بن جانے دیجئے۔ اگر آپ کو پسند آگئی تو — تو میں کچھ مانگ لوں گا۔"

"آپ کب سے میری تصویر بنانا شروع کردیں گے۔ ہاں — آپ نے اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"میں پردیسی ہوں سعیدہ صاحبہ! ویسے مختصراً اتنا سمجھ لیجئے کہ میرا نام غفور ہے۔ میرے آباؤ اجداد موضع داؤد پور کے رہنے والے تھے۔ لیکن میری پیدائش کے وقت میرے والدین شاہجہانپور میں سکونت پذیر تھے۔ میں نے وہیں پرورش پائی۔ بدقسمتی سے میں بچپن ہی میں ماں کی شفقت سے محروم ہوگیا تھا — اور میرے والد نے مجھے ماں اور باپ دونوں کا بے پناہ پیار دیا۔ لیکن اب — اب ایک سال پہلے باپ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ اب میں اِس وسیع دُنیا میں تنہا رہتا ہوں۔ آرٹ کی طرف بچپن سے میرا رُجحان تھا۔ اِس لئے والد صاحب نے مجھے آرٹ کی اعلیٰ ٹریننگ دِلوائی۔ میں نے تعلیم ایل۔ ایل۔ بی تک حاصل کی۔ لیکن ذہن وکالت کی طرف راغب نہ تھا۔ اِس لئے وکالت ایک دن بھی نہ کی۔ میں اب اپنے محبوب مشغلے کو سینے سے لگائے زندگی

[redacted]

کے باقی دن گزار رہا ہوں۔ اب میں شہری زندگی کی کشمکش سے بیزار ہوگیا ہوں۔ میں نے اب مستقل طور سے داؤد پور میں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ پرسوں نمائش ختم ہونے والی ہے۔ نمائش ختم ہوتے ہی چلے جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن اب آپ کی تصویر بنانا ہے تو پروگرام ملتوی کرنا ہوگا۔ آپ کی تصویر پوری کرتے ہی داؤد پور چلا جاؤں گا۔ تصویر بننے میں تقریباً ایک مہینہ لگ جائے گا اور اس دوران روزانہ دو گھنٹہ آپ کو تصویر بنوانے کے لئے میرے سامنے بیٹھنا ہوگا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"نہیں نہیں، اِس میں بھلا اعتراض کی کیا بات ہے۔ ہاں نمائش ختم ہوتے ہی آپ اپنے سامان کے ساتھ یہاں تشریف لے آئیں۔ میں آپ کے قیام کا انتظام کر دوں گی۔ دیکھئے کوئی عذر نہ مانوں گی!" اُس نے کچھ اِس انداز میں خلوص کے ساتھ کہا کہ میں انکار نہ کرسکا۔

تیسرے دن وہ اپنے ڈرائنگ رُوم میں میرے سامنے تصویر بنوانے کے لئے کھڑی تھی۔ وہ دیدہ زیب لباس میں اور بھی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ گھنیری حمدار سیاہ زُلفیں چہرے کے چاروں طرف اِس طرح بکھری تھیں جیسے چاند کے گرد رات کی سیاہی تیر رہی ہو۔ مختلف قِسم کے رنگ میرے سامنے رکھے تھے۔ ہاتھ میں بُرش تھا ــــــ اور جانے کیوں اُنگلیوں میں لرزش تھی۔ فوٹو اسٹینڈ پر ابھی تک سپاٹ کاغذ مجھے حسرت سے تکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا اور دل کے شفاف ورق پر سعیدہ کی واضح اور دلکش تصویر مُسکرا رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دوں اور کہوں اِس تصویر کو کاغذ پر مت آنے دیجیے، دل کے آئینے پر ہی تصویر دل کی آنکھوں سے دیکھ لیجیے۔

"آپ کیا سوچنے لگے غفور صاحب؟" بہت دیر کے بعد اُس نے اپنی حجاب آگیں پلکیں اُٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا "شروع کیجئے نا تصویر بنانا!"

میری بھی تھرتھراتی نظر اُس کی طرف ایک لمحے کو اُٹھی۔ پھر میں پنسل سے کاغذ پر ہلکا سا خاکہ کھینچنے لگا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے میری نگاہ اُٹھ کر اُس کی نگاہ سے ٹکرا جاتی تو وہ سر جُھکا کر نہ جانے کیا سوچنے لگتی۔

"شاید آپ بوریت محسوس کر رہی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ جا سکتی ہیں۔ آئندہ بھی زحمت نہ دوں گا آنے کی" میں نے کہا۔

"لیکن میری تصویر ــــــ؟"

"وہ بن جائے گی"

"لیکن آپ نے تو کہا تھا۔۔"

"میرا خیال غلط تھا سعیدہ صاحبہ! اتفاق سے آپ کی تصویر پہلے ہی تیار ہو چکی ہے!"

"کہاں ہے میری تصویر؟" اُس نے حیرت سے کہا۔

"میرے ذہن میں آپ کی تصویر اتنی واضح کھنچ آئی ہے کہ آپ تصوّر بھی نہیں کرسکتیں۔ میں کوشش کروں گا کہ ہو بہو ویسی ہی آپ کی تصویر کاغذ پر بھی اُتار دوں۔ آپ جانا چاہتی ہیں تو بخوشی جا سکتی ہیں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جب تک آپ سامنے رہیں گی میری اُنگلیاں تصویر بنانے میں مدد نہ دیں گی۔"

"کیوں؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ میں تو آپ سے پُوچھنے والا تھا۔"

چند لمحے وہ مجھے مختلف زاویوں سے گھُورتی رہی۔ پھر اُٹھ کر چلی گئی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ نگاہیں چُرانے لگی ہے۔ وہ روزانہ تصویر بنانے کے وقت ڈرائنگ رُوم میں آتی تو ضرور تھی، میرے سامنے طلسم خاموشی پھیلائے بیٹھی رہتی تھی، میرے ساتھ ناشتہ کرتی تھی، کھانا کھاتی تھی ــــــ لیکن اُس کی نگاہیں کبھی میری طرف نہ اُٹھتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اُس کی نگاہیں اپنے ہی بوجھ سے دبی رہتی ہیں اور میں ذوقِ نظارہ رکھتے ہوئے بھی۔۔۔!

اُس کے گھر رہتے ہوئے پندرہ دن گزر چکے تھے۔ اُس کی آدھی تصویر بن چکی تھی۔ ایک تصویر میں کاغذ پر بنا رہا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ ایک اور تصویر میرے احساسات اور شعور پر غیرفانی انداز میں کندہ ہوتی جا رہی ہے۔ ایک دن میں تصویر بناتے بناتے تھک کر لیٹ گیا۔ ذہن میں سعیدہ کے خیالات مدّوجزر کی شکل میں اُبھر اور ڈوب رہے تھے۔ اچانک میری نگاہ اُٹھی تو سعیدہ سامنے کھڑی تھی۔ وہ گھُورنے کے سے انداز میں عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اخلاقاً اُٹھ کر بیٹھا تو وہ بھی سامنے کرسی پر ٹِک گئی اور بولی "غفور صاحب! میں محسوس کر رہی ہوں آپ جب سے یہاں آئے ہیں کچھ اُداس اُداس رہتے ہیں۔ کیا آپ کو کوئی تکلیف ہے؟"

"جب میزبان اِتنا خوش اخلاق ہو تو مہمان کو بھلا کیا تکلیف ہوسکتی ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے آپ سے برسوں پُرانا تعلق ہے!"

"شکریہ! پھر بھی آپ چُپ چُپ کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔"

"بولنا تو مجھے بھی آتا ہے سعیدہ صاحبہ! کہنا بھی بہت کچھ ہے لیکن میں کہہ نہیں پاتا۔ میں نے سُنا ہے خاموشی کی بھی زبان ہوتی ہے۔"

وہ بس مُسکرا کر رہ گئی۔ پھر تھوڑے وقفے سے بولی "میرے پاپا بھی آپ کے بارے میں پُوچھتے رہتے ہیں کہ غفور صاحب کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ انھیں بھی آپ کا بے حد خیال ہے۔"

"اور آپ کو ـــــ ؟"

"مجھے تو سب سے زیادہ آپ کا خیال رہتا ہے!"

"صرف خیال؟"

"آنکھوں میں ایک فنکار کی عقیدت بھی ہے۔"

"اور ـــــ ؟"

"اور میں آپ کی اس زحمت کے لئے بے حد ممنون ہوں۔"

"بس؟ ذہن میں میرا خیال، آنکھوں میں عقیدت، لبوں پر شکریہ کے الفاظ اور ـــــ اور انسانی جسم کا جو سب سے اہم حصہ ہوتا ہے اُس میں میرے لئے کچھ بھی نہیں سعیدہ صاحبہ؟"

"ارے بھئی تم باتوں میں لگے ہو اور میں کھانے پر انتظار کر رہا ہوں!" سعیدہ کے پاپا نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

سعیدہ شوخی سے چہکی: "پاپا! دیکھئے غفور صاحب ہر وقت اُداس اُداس رہتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے، تو کچھ بتاتے بھی نہیں۔"

"غفور صاحب! آپ تکلف نہ کیجئے گا۔ میرا تو کمبخت پیشہ ایسا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی جو آپ کی مزاج پرسی تک کر سکوں۔ آپ اپنی ہر ضرورت کا اظہار سعیدہ سے کر دیا کیجئے۔ یہ آرٹ کی بڑی قدر دان ہے اور آپ اعلیٰ درجہ کے آرٹسٹ ہیں۔"

میں نے کہا: "آرٹ کی قدر ہوتی ہے۔ آرٹسٹ کو کون پوچھتا ہے!"

"دیکھئے پاپا!" سعیدہ نے بچوں کی طرح روٹھنے کے سے انداز میں کہا: "میں جب بھی ان سے کچھ پوچھتی ہوں بس فلاسفروں کی طرح باتیں کرنے لگتے ہیں۔"

"بھئی غفور صاحب! پاپا پھر بولے: "آپ سعیدہ کی تصویر بنانے کے ساتھ ساتھ اِسے آرٹ بھی سکھا دیں۔ یہ عجیب لڑکی ہے۔ خیر سے بی۔ اے کر چکی ہے۔ لیکن لااُبالی پن ابھی تک نہ گیا۔ ڈرائنگ کی بے حد شوقین اور قدر دان ہے۔ لیکن جب میں کہتا ہوں پینٹنگ سیکھنے کے لئے Paris and Institution میں داخلہ لے لو، تو یہ توجہ ہی نہیں دیتی ہے۔ فوٹو اور تصویر بنوانے کا شوق تو ہے لیکن سیکھنے کا نہیں۔ اچھا چلو پہلے کھانا کھا لیں پھر کبھی فرصت میں بات ہوگی۔ لنچ کے بعد مجھے فوراً اسٹوڈیو جانا ہے۔"

ایک دن میں تصویر بنانے میں منہمک تھا۔ سعیدہ سامنے بیٹھی تھی۔ بیٹھے بیٹھے کہنے لگی: "غفور صاحب! میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ آپ میری تصویر مجھ ہی سے چھپا رہے ہیں!"

"ایسی بات نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ مکمل تصویر دیکھیں۔ ویسے تصویر قریب قریب تیار ہے۔ بس ذرا سی کمی اور رہ گئی ہے۔ وہ بھی اِس وجہ سے کہ سُرخ رنگ میری پسند کا مہیا نہیں ہو رہا ہے۔"

"ارے کمال کرتے ہیں آپ!" سعیدہ نے بہت معصومیت سے کہا: "بھلا بمبئی جیسے شہر میں سُرخ رنگ آپ کو پسند کا نہ ملے گا؟"

میں نے اعتماد سے کہا: "میں نے اپنی سی بہت کوشش کی لیکن جیسا میں چاہتا ہوں مل نہ سکا۔ اس کی کوئی اور ترکیب سوچ رہا ہوں۔"

سعیدہ کچھ سوچتی سی رہی۔ بار بار مجھے عجیب انداز سے دیکھتی رہی۔ پھر چلی گئی۔

ایک دن رات کے بارہ بج رہے تھے اور میں بستر پر اب بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ یہ روزانہ کا معمول سا بن گیا تھا۔ رات کے آخری پہر تک مجھے نیند نہ آتی تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک نے مجھے اُٹھنے پر مجبور کیا۔ دروازہ کھولا تو سعیدہ سامنے کھڑی تھی! اُس کے پپوٹے بھی جاگتے رہنے کی غمازی کر رہے تھے۔ وہ ہلکے سبز رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سلیپنگ گون میں بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت مجسّمے کی طرح میری طرف نظریں جمائے کھڑی رہی، پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی کمرے کے اندر آ گئی۔ میں نے اُسے صوفے پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کر کے کہا: "آپ ابھی سوئی نہیں سعیدہ صاحبہ؟"

"اور آپ بھی تو . . ."

"مجھے نیند نہیں آتی!"

"مجھے بھی نیند نہ آئی!"

"کیوں؟" میں نے اپنے دل کی دھڑکن کو ٹٹولا جو نسبتاً تیز ہو گئی تھی۔

"پچھلی کئی راتوں سے جب بھی آنکھ کھلتی تھی آپ کے کمرے سے نکلنے والی روشنی گلہ کرتی تھی کہ آپ ابھی تک سوئے نہیں! آج میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک آپ نہ سوئیں گے میں بھی نہ سوؤں گی! لیکن اب جاگنا بس سے باہر ہو گیا تو آپ کے پاس چلی آئی۔"

"میری فکر میں آپ اپنی نیند نہ خراب کیجئے سعیدہ صاحبہ!"

"لیکن آپ سوتے کیوں نہیں ہیں؟"

"میں نے کہا نا کہ مجھے نیند نہیں آتی۔"

"تو پھر یہ ایک مرض ہے۔ ڈاکٹر Consult کیجئے۔"

"میں نے ایک ڈاکٹر تجویز کیا تھا۔ اتفاق سے وہ مرض کی تشخیص نہ کر سکا۔ آپ سو رہئے جا کر ورنہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

وہ اُداس سی اُٹھی اور بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف

مُڑ کر اُس نے پھر حیرت سے پوچھا: "ارے آپ کی انگلی میں کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں۔ یونہی بلیڈ سے کٹ گئی تھی۔"
"احتیاط کیا کیجیے۔" اُس نے ہمدردی کا اظہار کیا۔
"احتیاط میں بھی حادثات ہو ہی جاتے ہیں سعیدہ صاحبہ!"

ایک ہفتہ بعد جب میں نے سعیدہ کو بتایا کہ اُس کی تصویر مکمل ہو گئی ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہو گئی اور اشتیاق وبے تابی اُس کی نگاہوں سے چھلک پڑا۔ اُس نے لفظوں کی زبان سے بے پناہ شکریہ کا اظہار کیا۔ میں نے اُسے تصویر کے پاس لے جا کر تصویر کا پردہ اُٹھایا تو وہ کئی لمحے تک تصویر کو اِس طرح دیکھتی رہ گئی جیسے وہ خود ایک بے حس وحرکت حسین تصویر ہے! اور مصور عالمِ اِس کے دلکش وجود سے مُسکرا رہا ہے۔ چند ثانیے بعد وہ چونکی اور خوشی سے پاگل ہو کر بولی۔

"اللہ جانتا ہے منصور صاحب! آپ نے تصویر اتنی خوبصورت بنائی ہے کہ ــــــ کہ تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں! نہ اگواہ ہے آپ نے میرا دل جیت لیا! میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں؟ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے! اب آپ اپنا وعدہ اور میری خواہش پوری کر دیجیے۔ آپ اپنے منہ سے معاوضہ مانگ لیجیے۔ آپ اِس ملکیت میں پسند آنے والی ہر چیز مانگ سکتے ہیں!" وہ جذبات کی رَو میں کہتی چلی گئی۔

میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ اب بھی اُسی انہماک سے تصویر کو دیکھ رہی تھی۔
میں نے کہا: "سعیدہ صاحبہ! جو چیز مجھے پسند آئی ہے وہ آپ دے نہ سکیں گی۔ غور کر لیجیے۔"

اُس نے ایک لمحے کے لئے تصویر سے نگاہیں ہٹا کر مجھے دیکھا اور بے پروائی سے کہا: "آپ مانگ کر تو دیکھیے کہ میں کتنی فراخ دل ہوں۔"
میں سمجھ گیا کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہے وقتی جذبۂ خوشی کے تحت کہہ رہی ہے۔
"اچھا پھر کبھی مانگ لوں گا۔ میری امانت سمجھ کر رہنے دیجیے ابھی۔"
"جیسی آپ کی مرضی!" وہ مُسکرا کر بولی۔

وہ پھر مختلف زاویوں سے تصویر کو دیکھتی رہی۔ خوشی سے اُس کے دل کی دھڑکن کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اُس کے خوبصورت ہونٹ دلکش مسکراہٹ سے اور خوبصورت بن گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ چونکی۔ تصویر سے نگاہیں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور پھر پوچھنے لگی: "ارے میں نے تو غور ہی نہیں کیا تھا یہ سُرخ رنگ تو روشنی اور رنگوں سے مختلف ہے۔ کہاں ملا تھا؟"
"یہاں!" میں نے اپنی انگلی اُس کی طرف بڑھا دی۔

"تو ــــــ تو کیا آپ نے اپنی انگلی کا خون لگایا ہے؟" اُس کی آنکھیں حیرت سے کُھلی رہ گئیں۔ پھر اُن میں کچھ نمی اُبھر آئی۔
میں نے کہا: "رائیگاں نہیں گیا میرا خون۔ آپ کو تصویر پسند آ گئی۔ خون کی قیمت وصول ہو گئی۔"
"لیکن آپ سے یہ کس نے کہا تھا کہ میری تصویر کی دلکشی بڑھانے کے لئے اپنی انگلی کاٹ کر اِس کا خون لگائیں؟"
"کبھی کبھی بغیر کہے بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے سعیدہ صاحبہ!"
دوسرے دن تصویر کو شیشے کے فریم میں لگوا کر اپنے کمرۂ خاص میں آویزاں کرا دیا۔ شب کا ملگجا اندھیرا فضا کو اپنی آغوش میں دبوچ رہا تھا، برقی قمقمے جگمگانے لگے تھے۔ میں اُس کے کمرے میں پہنچا تو وہ تصویر ہی کو دیکھ رہی تھی۔
میں نے کہا: "اب مجھے جانے کی اجازت دیجیے۔ آپ کی تصویر بن گئی، میرا وعدہ پورا ہو گیا اور شکر ہے آپ کو تصویر پسند آ گئی۔"
وہ تڑپ کر پلنگ سے اُٹھ بیٹھی اور بولی: "ایسی بھی جلدی کیا ہے۔ ابھی تک تو آپ تصویر بنانے میں مصروف رہے۔ اب کچھ دن سکون سے رہیے۔ پاپا بھی باہر گئے ہوئے ہیں۔ ایک ہفتہ تک واپس آ جائیں گے تو اُن سے اجازت لے کر چلے جائیے گا۔"
"میں آپ کی اجازت سے آیا تھا۔ میرے خیال میں جانے کے لئے بھی آپ کی اجازت کافی ہے۔ پاپا جب تشریف لائیں تو میری طرف سے معذرت کر لیجیے گا۔ آپ نے میرا جتنا خیال رکھا ہے اُس کے لئے میں بے حد ممنون ہوں۔ آپ کے پاس گزرنے والے اپنی زندگی کے دنوں کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔ مجھے ایک دن جانا ہی ہے پھر آج اور کل کیا کرنا۔ غریب فنکار کا مسکن جھونپڑی ہوتی ہے۔ محلوں کے خواب دیکھنا نادانی ہے۔ اب میں رُک نہیں سکتا۔ راشو کو میں نے خط ڈال رکھا ہے کہ بارہ تاریخ تک داؤد پور پہنچ جاؤں گا۔ اِس لئے مجھے کل چل دینا چاہیے۔"
"راشو کون ہے؟" اُس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔
"داؤد پور میں میرے ہمارے گھر کے پڑوس میں رہتی ہے۔ میں جب بھی بچپن میں داؤد پور جایا کرتا تھا میرے ساتھ کھیلتی تھی۔ میں اور وہ ایک دوسرے سے اب بھی اُسی طرح بھائی بہنوں جیسی محبت کرتے ہیں۔ اُس کے بوڑھے غریب والد کا انتقال چند ماہ پہلے ہو گیا ہے۔ اب اُس کا اِس بھری پُری دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ بے سہارا ہے۔ میں یوں سمجھو کہ میں اُس کا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ محسوس کرتا ہوں۔ اُس نے مجھ سے التجا کی ہے کہ میں وہیں جا کر رہوں۔ مجھے خود بھی وہ جگہ بے حد پسند ہے اور پھر اُس کی خواہش کو بھی ٹھکرا نہیں سکتا، اِس لئے وعدہ کر لیا ہے۔"

سعیدہ نے افسردگی سے کہا "آپ نے جو حالات بتائے ہیں انھوں نے تو میری زبان ہی بند کردی۔ پھر بھی ہو سکے تو چند دن اور رہتے۔ یہ میری خواہش ہے"

"اور اب مجھے چلا ہی جانا چاہئے، یہ میری خواہش ہے، حالات کا تقاضہ ہے"

وہ میرا منہ دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ وہ رنجیدہ نظر آرہی تھی۔ پھر اُس نے ملازم کو میرا سامان وغیرہ پیک کرنے کا حکم دے دیا۔

دوسرے دن میں چلنے لگا تو میں نے اُس کے چہرے پر الم کی پرچھائیاں دیکھیں۔ اُس نے درد سے کہا "آپ ہم لوگوں کو بہت یاد آئیں گے"

میں نے کہا "آپ مجھے نہ یاد رکھیئے گا۔ مسافر کو بھول جانا چاہئے۔ یوں سمجھ لیجئے کسی موڑ پر دو راہی مل گئے، کوئی کچھ کہہ نہ سکا، کوئی کچھ سمجھ نہ سکا۔ یہ ایک حادثہ تھا جو طوفان سے شروع ہوا اور طوفان برپا کر کے ختم ہوگیا۔ راہی اپنی اپنی منزل کی طرف بڑھ گئے"

"اب طوفان کہاں ہے؟" اُس نے گرد و پیش پر سرسری سی نظر ڈالی۔ لیکن نہ جانے کیوں جلد ہی اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔

"یہ طوفان آپ نہ دیکھ سکیں گی سعیدہ صاحبہ!"

"میری ایک آخری خواہش مانیں گی آپ؟" اُس نے انتہائی معصوم لہجے میں کہا۔

"فرمایئے"

"میری خواہش ہے اب آپ اپنا معاوضہ مانگ لیں۔ میں تحفہ سمجھ کر پیش کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن پسند آپ کی اپنی ہوگی"

میں نے غور سے سعیدہ کی طرف دیکھا وہ واقعی خواہش مند معلوم ہو رہی تھی کہ میں معاوضے کے طور پر اپنی پسند کا کوئی تحفہ مانگ لوں۔ میں نے کہا "اچھا آپ کی بھی خواہش ہے، میرا بھی جی چاہ رہا ہے کہ اپنا معاوضہ اب مانگ ہی لوں لیکن ——— سوچ لیجئے سعیدہ صاحبہ! جو میں مانگوں انکار نہ کیجئے گا ورنہ میرا . . ."

"حیرت ہے آپ ابھی تک مجھے سمجھ نہ سکے" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"خدا جانے آپ مجھے نہ سمجھ سکیں یا میں آپ کو نہ سمجھ سکا۔ خیر چھوڑیئے ——— تو پھر مجھے اپنی یہی تصویر دے دیجئے!"

"جی ——— ؟" وہ اِس طرح چونک پڑی جیسے رات کی گھٹا ٹوپ سیاہی میں دہکتا ہوا سورج اُس کے سر پر اُتر آیا ہو۔ آنکھوں کے خوبصورت پپوٹے گہری جھیل کے نہ ملنے والے کناروں کی طرح جُدا ہو کر رہ گئے۔ وہ مجھے اِس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے میں نے سنگین جرم کیا ہے۔

"دیکھیئے میں کہتا نہ تھا جو میں مانگوں گا آپ دے نہ سکیں گی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا فن کی قدر ہوتی ہے فنکار کو کون پوچھتا ہے۔ فنکار غریب ہوتا ہے اور غریب کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی۔ اوّل تو وہ خواہش کے اظہار کی جرأت ہی نہیں کر پاتا۔ اگر جرأت کرتا بھی ہے تو اُسے کچھ ملتا نہیں ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ نے اصرار کیا ——— میں نے مانگ لیا کچھ۔ ورنہ یوں ہی چلا جاتا"

بہت دیر کے بعد اُس نے شکستہ الفاظ میں کہا "میرا مطلب ہے ——— میرا مطلب ہے کچھ اور مانگ لیجئے نا۔ یہ تصویر تو . . ."

"کوئی بات نہیں سعیدہ صاحبہ! شکریہ! جب آپ اپنا عکس نہ دے سکیں ——— اچھا اجازت دیجئے گاڑی کا وقت ہوگیا۔ اگر کبھی دل چاہے تو غریب فنکار کو یاد کر لیجئے گا۔ پتہ یہ ہے"

میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ اُسے کچھ اور بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔

داؤد پور میں ایک ہفتہ بعد سعیدہ کا خط آیا جس میں اُس نے عجیب تحفہ مانگنے کی وجہ جاننا چاہی تھی۔ میں نے اُس کا جواب دیا تو پھر اُس کا کوئی خط نہ آیا۔ ایک سال آہستہ آہستہ گزر گیا۔ زندگی کا وہ پہلا طوفان ختم ہو چکا تھا لیکن اُس کے نقوش اب بھی سینے میں سِسک رہے تھے۔ اُس طوفان کا ملاوا اب بھی دل میں کھول رہا تھا۔

اُسے ابھی تک فراموش نہ کیا جاسکتا تھا۔

دو ہفتہ بعد بمبئی میں پھر نمائش ہونے والی تھی ——— اور میں پھر ایک ماہ سے اپنی یادداشت کے سہارے سعیدہ کی تصویر بنا رہا تھا۔ جس میں اُسے دُلھن کے رُوپ میں پیش کرنے کا ارادہ تھا۔ تصویر بناتے بناتے اکثر سوچنے لگتا تھا ——— کاش سعیدہ اِسی رُوپ میں میری زندگی میں آجاتی!"

"گفورے! پھر وہی، پھر کھو گئے؟" راشو نے آکر یکلخت خیالات کے تار بکھیر دئے۔ میں چونک پڑا۔ وہ کہہ رہی تھی ——— "میں کہتی ہوں تمھیں ہو کیا گیا ہے گفورے؟ پہلے تو جب آتے تھے تو ایسے نہ تھے۔ خوش خوش نظر آوے تھے۔ اب ہر دم اُداس، کھوئے کھوئے۔ میرا تو تمھیں دیکھ دیکھ کر دل کڑھے ہے۔"

کہتے کہتے راشو کی آنکھوں میں آنسو آگئے ——— وہ مُنہ گھما کر دوپٹے کے پلّو سے اُنھیں خُشک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم رو رہی ہو راشو؟"

"اور نہیں تو کیا ہنسوں؟ میرا اب اِس دُنیا میں کون ہے۔ تم ہی تو سب کچھ ہو۔ تمھیں کیا معلوم کہ میں تمھیں کیا سمجھے ہوں۔ تمھیں اُداس دیکھ کر میری آنکھیں ہی نہیں، دل بھی رووے ہے۔ تم تو صرف آنکھوں کا رونا دیکھ سکے ہو۔"

"آج تو میری راشو بڑی ہوشیاری کی باتیں کر رہی ہے۔" میں نے زبردستی مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی۔ روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ میں نے اُس سے تسلی آمیز لہجے میں کہا: "رو ؤ نہیں راشو! اچھا میں وعدہ کرتا ہوں اب کبھی اُداس نہ ہوں گا۔ چلو اب کھانا کھالیں۔ تم بھی ابھی تک بھوکی ہی ہو گی۔"

بہت دیر کے بعد وہ خود پر قابو پا سکی اور بھاری قدموں سے کھانا لینے چلی گئی۔

دوسری صبح ناشتہ کر کے میں پھر تصویر بنانے میں لگا تھا تو راشو میرے پاس آئی۔ بہت دیر تک کبھی تصویر کو اور کبھی مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی: "ایک بات پوچھوں گفورے؟"

"پوچھو!" میں نے اپنی ساری توجہ اُس کی طرف مرکوز کر دی۔

"یہ تصویر کس کی ہے؟"

"تمھیں یہ کیسی لگتی ہے؟"

"مجھے تو میم صاحب لگے ہے۔ تمھیں تو بہت اچھی لگتی ہو گی۔ لیکن ہے کون یہ؟"

نادانستہ ایک آتشیں چنگاریوں کی طرح دہکتی ہوئی آہ میرے ہونٹوں پر پھیل پڑی۔ میں نے بہت ضبط سے کہا: "یہ ایک لڑکی کی تصویر ہے۔ یہ بمبئی میں رہتی ہے۔"

"تم سے اِس کا مطلب؟" راشو نے کُریدا۔

"کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی اُس کی تصویر بنانے میں نہ جانے کیوں سکون ملتا ہے۔ نہ جانے کیوں!"

"اِس کی تصویر دُلھن کی کیوں بنا رہے ہو؟"

"کسی کی دُلھن تو بنے گی ہی۔ میں نے سوچا کاغذ پر پہلے سے ہی بنا دوں۔ ایسے میں ایک دن اپنے ہاتھوں سے اپنی راشو کو دُلھن بناؤں گا۔ پھر اچھا سا دُولھا آئے گا تو اِس کے حوالے کر دوں گا۔"

میں نے مُسکرا کر کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا تو مجھے بے حد افسوس ہوا۔ وہ رو رہی تھی۔

"ارے تم پھر رونے لگیں راشو؟"

"میں تمھیں بہت بُری لگی ہوں نا؟" اُس نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

"نہیں تو! یہ تم نے کیوں سوچ لیا؟"

"جبھی تو دُلھن بنا کر تم مجھے جلدی سے بھگا دینا چاہتے ہو۔ اِس گھر میں، تمھارے دل میں میرے لئے ذرا بھی جگہ نہیں ہے۔"

"ارے پگلی لڑکیوں کا گھر سُسرال اور شوہر کے دل میں ہوتا ہے۔ لڑکی کوئی عمر بھر باپ بھائی کے گھر بیٹھی رہتی ہے۔ میں تو بمبئی سے واپس آکر جلدی سے تیرے لئے اچھا سا بر تلاش کروں گا اور تیرے ہاتھ پیلے کر دوں گا تو چین لوں گا۔"

"تم اپنے چین کا ضرور خیال رکھو گفورے! چاہے مجھے جہنّم میں جانا پڑے!"

راشو سسکیاں بھرتی ہوئی تیزی سے دوسری کوٹھری میں چلی گئی ——— اور میں حیرت و استعجاب کی نظروں سے اُسے گھورتا رہ گیا۔ وہ واقعی مجھ سے اِتنی محبت کرتی تھی کہ مجھ سے بچھڑنے کا خیال کر کے رونا اُس کے لئے فطری بات تھا۔ لیکن ہر بہن کو بچھڑنا پڑتا ہے۔ یہ خیال میرے ضبط کو تقویت دے رہا تھا۔ کئی دن تک میں نے اُس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی کو محسوس کیا۔ وہ بے حد اُداس رہنے لگی تھی۔ وہ دُبلی ہوتی جا رہی تھی جیسے برسوں کی بیمار ہو۔

تصویر مکمل ہو چکی تھی۔ نمائش شروع ہونے میں صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔ میں نے راشو کی دلجوئی کے لئے بمبئی جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا لیکن پھر وہ مجھے بھیجنے پر بضد ہو گئی۔ کہنے لگی اگر آپ کی خوشی ہے تو اُس کا گلا نہ گھونٹئے اور ضرور جائیے

اور یہاں تک کہ اُس نے جانے کے لئے مجھے مجبور کر دیا۔ جس دن جانے کو تیار ہوا تو وہ تصویر مکمل ہو چکی تھی۔ میرے پاس آ کر وہ درد بھرے لہجے میں بولی: "تم جا رہے ہو گفورے اُس میم کے پاس؟"

راشو نے میری دکھتی رگ کو پکڑ لیا تھا احساسات کے تاروں کو جھنجھوڑ دیا۔ میں نے بہت ضبط سے کہا: "میں بمبئی کی نمائش میں جا رہا ہوں یہ تصویر پیش کروں گا۔ بہت سا انعام ملے گا۔ اور اُس روپے سے تیری شادی کے بہت سے گہنے لیتا آؤں گا۔ دیکھو تم فکر نہ کرنا میں بہت جلدی آؤں گا۔"

"کاش تم آ پاؤ!"

"کیسی باتیں کرتی ہو راشو! میں نے کہا ہے نا بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔ دیکھو تم اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ خوش رہنے کی کوشش کرنا۔"

شاید وہ بہت ضبط کر رہی تھی۔ بار بار اُس کی پلکیں آنکھوں کے گوشوں میں مچلنے والے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں ـــــ لیکن جب میں چلنے لگا تو ضبط کے کمزور کنارے ایک پل میں ٹوٹ گئے۔ موتیوں کے آبشار بکھر پڑے۔ آنسوؤں کا تیز رو سیلاب آخر اُمڈ ہی آیا۔ میں نے دور تک اُسے مڑ مڑ کر دیکھا۔ وہ اب بھی ساکت مجسمے کی طرح کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔

نمائش پندرہ دن رہی۔ لیکن اُمید کے خلاف سعیدہ نہ آئی۔ میں نے فیصلہ کیا نمائش ختم ہونے پر اُس سے ضرور ملوں گا۔ اُسے یہ تصویر پیش کروں گا۔ دلہن کے روپ میں بنائی ہوئی تصویر شاید میری زبان بن جائے۔ نمائش ختم ہو گئی۔ میں نے تصویر کی مزید رنگ آمیزی کر کے اور مکمل بنانے کی کوشش کی اور اُسی طرح فلیٹ کو چل دیا۔ وہاں پہنچا تو سعیدہ کا فلیٹ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ جیسے میری بنائی ہوئی تصویر! شاید کوئی فنکشن ہوگا۔ نہ جانے کیوں خیال آیا کہیں سعیدہ نے میرے آنے کی خوشی میں تو یہ اہتمام نہیں کیا ہے۔ اُس نے سوچا ہو نمائش ختم ہونے پر اُس سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ طرح طرح کے خیالات میں غلطاں و پیچاں میں گیٹ تک پہنچ گیا۔ بے شمار جگمگاتے ہوئے برقی قمقموں نے پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ خوش پوش مہمان جیسے لان میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف معلوم ہو رہے تھے۔ سعیدہ کا ملازم ایوب نظر سے گزرا۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکن کو ٹٹول کر کہا: "سعیدہ صاحبہ سے بولو غفور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"معاف کیجئے گا۔ آج آپ بی بی جی سے نہیں مل سکتے۔" بیگم کو تو مجھے ایوب کے بیباک جواب پر سخت غصہ آیا۔ میں نے پھر اُس سے تُرش لہجے سے پوچھا:

"کیوں؟"

"کیونکہ آج بی بی جی کی شادی ہے!"

ایوب کے الفاظ دل کے آشیانے پر برق بن کر گرے اور روح کے تنکے خاکستر ہو گئے۔ وہ پھر کہہ رہا تھا ـــــ "آپ تشریف رکھئے میں صاحب کو آپ کے آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔"

"نہیں ایوب! اب وقت نہیں ہے۔ اپنی بی بی جی کو میری طرف سے شادی کی مبارکباد دے دینا اور یہ تصویر اُن کی خدمت میں پیش کر کے کہنا یہ ایک غریب فنکار کا ناچیز تحفہ ہے قبول کر لو۔"

میں اُس طائر کی طرح داؤد پور واپس چلا گیا جس کا نشیمن صیاد نے پھونک کر بے بال و پر بھی کر دیا ہو۔ میں نے راشو سے انعام میں ملنے والی رقم سے شادی کے گہنے لانے کو کہا تھا۔ لیکن دہشت میں وہ بھی بھول گیا۔ داؤد پور کے اسٹیشن پر اُترا تو نہ جانے کیوں قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جیسے اپنی مُردہ حسرتوں کے بھاری جنازے کا بوجھ ناتواں کندھوں سے سہا نہ جا رہا ہو۔ گھر والی گلی میں مُڑا تو ایک جنازہ اور آ رہا تھا۔ جنازے کے ساتھ پڑوسی اور جانے پہچانے لوگ تھے۔ دیگر پڑوس کی عورتیں دروازوں پر کھڑی رو رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر راشو کی سہیلی مہرن سے پوچھا: "یہ کس کا جنازہ ہے۔ کون مر گیا؟"

"ارے گفورے تم؟" مہرن نے حیرت سے کہا: "اب آئے ہو جب راشو تمہاری راہ تکتے تکتے اِس دنیا سے جا رہی ہے؟"

"کیا ـــــ؟" میری حلق میں چیخ بم کی طرح پھٹ پڑی۔

"ہاں گفورے بابو!" مہرن نے روتے ہوئے کہا: "یہ راشو بیچاری کا جنازہ ہے اور وہ تمہارے کارن مری ہے۔ وہ تم سے پیار کرتی تھی اور تم بمبئی والی میم سے پیار کرتے تھے۔ اُسے جب یہ معلوم ہوا کہ تم اُس سے ویسا پیار نہیں کرتے جیسا وہ چاہتی ہے، تم بمبئی والی میم سے پیار کرتے ہو تو وہ تم کو اپنا پیار بتا نہ سکی۔ وہ تمہاری خوشی چاہتی تھی۔ اِس لئے تمہاری خوشی کے لئے اندر ہی اندر سُلگتی رہی۔ تم جب بمبئی چلے گئے تو اُس کا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ وہ اُس غم میں گھلتی رہی اور گھلتے گھلتے کل چل بسی۔ ڈاکٹر کہتا تھا کسی غم سے اِس کے دل کی رگ پھٹ گئی ہے۔"

غزل

کرشن موہن ایم۔ اے

ایک دورِ شراب ہو جائے
غم کا خانہ خراب ہو جائے

دیکھ کر مصحفِ رُخِ کافر
شیخ بھی لاجواب ہو جائے

دیکھ کر میرے ماہِ تاباں کو
منفعل ماہتاب ہو جائے

عشق کا احتساب ہو جائے
حُسن صرفِ عتاب ہو جائے

ناصحا تیرے ساتھ پینے سے
بادہ بھی زہرِ ناب ہو جائے

ساقیا تیرے پاس ہے وہ دوا
جس سے پیری شباب ہو جائے

میں کہوں گا خدا سے روزِ حساب
میرے غم کا حساب ہو جائے

کتنا بے کیف ہے وہ انساں بھی
جو سراپا کتاب ہو جائے

انتہائے کرم ہے تیرا ستم
ستم بے حساب ہو جائے

دل نہیں اب گُناہ کے قابل
وقفِ کارِ ثواب ہو جائے

اسقدر پی کر عقلِ دُور اندیش
شرم سے آب آب ہو جائے

بھول جائے گا الفتِ آغاز
دل اگر کامیاب ہو جائے

بخشدے مجھ کو شہرتِ جاوید
موت کا سدِّ باب ہو جائے

کرشن موہن بغیر کیفِ جنوں
زندگی اِک عذاب ہو جائے

بیسویں صدی دہلی ستمبر ۱۹۹۹

[redacted]

زندگی، خواب اور حقیقت!

ڈاکٹر کیول دھیر

میڈیکل آفیسر ناگوک (اے ایس آر) پنجاب

بھائی جان!

... حقیقی معنوں میں "بیسویں صدی" ایک عظیم ادارہ ہے جو دُور دراز تک ـــــ بلکہ یوں کہیئے کہ دُنیا کے ہر اُس کونے تک جہاں اُردو کے شیدائی موجود ہیں، دوستی، پیار، برادرانہ خلوص اور باہمی تعاون کا پیغام پہنچاتا ہے۔ گذشتہ افسانہ نمبر میں میرا افسانہ "مواسنتی" شائع ہوا تھا۔ اُس کا مرکزی کردار ایک ڈاکٹر تھا جس کی کہانی نے کویت کے مسٹر اشونی کمار اوپل کو اِتنا متاثر کیا کہ اُنھوں نے اپنے خط میں جذبات کا اظہار تو کیا ہی، ساتھ ہی مبلغ ایک سو روپے کا ڈرافٹ بھی بھیجا تاکہ اِس رقم کو میں "ڈاکٹری مدد" کے طور پر خرچ کر دوں۔ اِن دنوں ہسپتال کی بلڈنگ زیرِ تعمیر ہے جس کے لئے میں فنڈز کی فراہمی میں کوشاں ہوں۔ جب میں نے اشونی بھائی سے اُن کی بھیجی ہوئی رقم زیرِ تعمیر بلڈنگ پر خرچ کرنے کی اجازت مانگی تو اُنھوں نے مزید ایک سو روپے کا ڈرافٹ اِرسال کر دیا ـــــ یہ کتنی بڑی بات ہے بھائی جان! آج کے زمانے میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو کسی نیک مقصد کے لئے کچھ کرنے یا مدد کی بات سوچتے ہیں! اشونی صاحب کے ساتھ ہی میں "بیسویں صدی" کا بھی شکر گزار ہوں جس کے باعث مجھے ایک بہت ہی بھلے انسان سے متعارف ہونے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ اِسی لئے میں کہتا ہوں کہ "بیسویں صدی" ایک عظیم ادارہ ہے جسے قائم کرنے والے عظیم ہاتھ خوشتر گرامی کے ہیں! ـــــ ہسپتال کی بلڈنگ کی تعمیر کا کام نصف سے زیادہ مکمل ہو چکا ہے۔ آپ کو شاید حیرانی ہوگی کہ اب تک لگ بھگ اِس پر پچیس ہزار روپے خرچ ہو چکے ہیں اور اِس رقم کا انتظام گاؤں والوں نے کیا ہے، کچھ مدد دُور دراز رہنے والے میرے مہربان دوستوں نے بھی کی ہے۔ گاؤں کے بھولے بھالے لوگ اِسے مندر یا مسجد سے کم نہیں سمجھتے ـــــ تعمیر کا کام مکمل ہو جائے تو دہلی آؤں گا۔ پچھلی بار جب میں دہلی آیا تھا تو آپ کو یہ شکایت رہی تھی کہ میں نے آپ کے یہاں کیوں نہیں قیام کیا! لیکن اب کی بار ایسا نہ ہوگا اور اِتنے سارے دن آپ کے یہاں رہوں گا کہ آپ پریشان ہو کر کہیں گے کہ جایئے صاحب اب اپنے گھر کی راہ لیجئے ..."

آپ کا بھائی ـــــ کیول دھیر

★

"کیلاش ـــــ!" انجنا کے ہونٹ گُلاب کی پتّیوں کی طرح کپکپائے۔

"ہوں!" کیلاش نے انجنا پر اُچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر سامنے پڑی ہوئی کتاب کے سرورق پر پھیلی سیاہی کی اوٹ سے جھانکتی، لرزتی سی آڑی ترچھی لکیروں میں اُلجھ گیا جن کا مفہوم سمجھنے کی وہ کوشش کر رہا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے اچانک ہی اُس نے محسوس کیا انجنا نے ابھی ابھی اُس سے کوئی بات کہی ہے۔ کتاب کے سرورق پر پھیلی، ایک دوسرے میں مدغم ہوتی ہوئی لکیروں کی اُلجھن کو اپنے ذہن کے کسی گوشے میں پھینکتے ہوئے اُس نے انجنا کو غور سے دیکھا۔ وہ اُس کے بہت قریب، سامنے بیٹھی نہ جانے کن خیالوں میں گُم تھی۔

"تم نے کچھ کہا انجنا؟" کیلاش نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انجنا کو چونکا دیا۔ وہ بیچ میں کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ کیلاش کو اپنی جانب متوجہ پا کر اس نے احساس کی دھڑکنوں کو باندھنے کی کوشش کی اور سامنے پڑی اُسی کتاب کو اٹھا لیا۔ کیلاش جس کے سرورق پر بکھری لکیروں کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انجنا کی نظریں بھی اب اُن لکیروں کے جال میں اُلجھ گئی تھیں۔ کیلاش خاموشی سے صرف دیکھ رہا تھا۔ شاید انجنا کے چہرے پر ابھرتے مٹتے عکس کو پڑھنا چاہ رہا تھا۔ جبھی انجنا کی دھیمی سی آواز اس نے سُنی۔

"زندگی کتنا بڑا فریب ہے ——— ایک جھوٹا فریب!"

"نہیں۔ زندگی ایک حقیقت ہے۔ بہت بڑی حقیقت!" کیلاش نے انجنا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ انجنا نے آنکھیں جھکا لیں لیکن اُمڈ آتے ہوئے آنسوؤں کو وہ چھپا نہ سکی۔ کیلاش نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہا نہیں۔ انجنا کی آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں نے اُسے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ اور بھی اُلجھ گیا جب انجنا کے جذبات سسک کر پھوٹ پڑے۔ کچھ دیر وہ یوں ہی خاموش سا، اُلجھا سا اُسے دیکھتا رہا۔

"انجنا ———!" اس نے بمشکل کہا۔ انجنا نے آبدیدہ نگاہیں اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

"میرے ایک سوال کا جواب دوگے کیلاش؟"

"کہو۔"

"زندگی اگر ایک حقیقت ہے تو تمنا کیا ہے؟"

"تمنا حقیقی زندگی کی بنیاد ہے۔"

"لیکن تمنا اگر حسرت بن جائے، آرزوئیں پامال ہو جائیں تب ———؟"

"تب ———؟" کیلاش کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور خاموشی سے انجنا کو دیکھتا رہا۔

"میرے سوال کا جواب تم نے نہیں دیا۔"

کیلاش اب خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ انجنا کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ایسی زندگی سے کیا موت اچھی نہیں؟"

کیلاش کے اُلجھے ذہن کو جیسے شدید جھٹکا محسوس ہوا ——— "موت!" اس کے احساس کے بربط پر ہتھوڑے کی سی چوٹ پڑی۔

"انجنا ———! زندگی تلخ ہو، جیسی بھی ہو، موت سے پیاری ہے ——— موت کی خواہش زندگی پر ظلم ہے، زندگی سے فرار ہے۔"

انجنا کے چہرے پر پھیلی اُداسی اور افسردگی کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ آنکھیں مُوند کر وہ اپنے آپ ہی میں جیسے اُلجھ گئی۔

"لیکن تم زندگی سے یوں مایوس کیوں ہو؟" کیلاش پریشان دکھائی دے رہا تھا: "اپنی زندگی کے لئے تم نے خود ہی من چاہی راہ اختیار کی ہے۔ قدرت نے تمہیں زندگی کا ہر سُکھ دیا ہے۔ . ." انجنا نے تیز نظروں سے کیلاش کی جانب دیکھا جیسے اس کے دل پر اچانک ہی نشتر لگا ہو ——— "سُکھ . . ." انجنا کی آواز میں طنز تھا ——— "سدھیر سے شادی کا فیصلہ میں نے ہی کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ دیوتا سمجھ کر لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ دولت ان کے قدموں کو چومتی ہے لیکن . . . وہ دیوتا پتھر کے دیوتا ہیں۔ محبت کی شعاعیں کبھی پتھر دل سے اُٹھی ہیں؟" انجنا کی آواز میں تلخی تھی۔ کیلاش کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ انجنا کیا چاہتی ہے ——— وہ کیوں اپنے ماحول سے اُوب گئی ہے؟ وہ ایک ساتھ کئی باتیں سوچنے لگا ——— سدھیر کی زندگی سے وابستہ اور انجنا کے جذبات کی باتیں! کمرے میں اُداس خاموشی چھائی رہی۔ کیلاش اپنے ذہن کی سوچ میں ڈوبا رہا اور انجنا اپنے دل کی ہلچل میں گھری رہی۔

"کیلاش!" خاموش، اُداس ماحول کو چیرتی ہوئی انجنا کی مدھم کپکپاتی آواز اُبھری: "تم نے کبھی اپنے ماضی کی طرف مُڑ کر دیکھا ہے؟"

"میں ہمیشہ ہی اپنے ماضی کو ساتھ لے کر چلتا ہوں۔"

"کبھی تم نے کسی سے پیار کیا تھا؟" انجنا کے اس سوال پر کیلاش چونک گیا۔ اس نے اچانک ہی ماضی کی کتاب کا وہ ورق کھول کر سامنے رکھ دیا تھا جس پر اس کی ناکام محبت کا عکس نمایاں تھا۔ احساس کے درد کو آنکھوں میں سمیٹے ہوئے اس نے انجنا کی طرف دیکھا۔

"گزرے ہوئے لمحات کو مت پکارو انجنا!" اس کی آواز میں بے پناہ درد تھا، التجا بھی تھی۔

"کیا وہی لمحے ایک بار پھر زندہ نہیں ہو سکتے؟" انجنا بے حد جذباتی ہو اٹھی تھی۔

"انجنا!" کیلاش تڑپ اٹھا ——— "نہیں انجنا! گزرے ہوئے اُن لمحوں کو دفن ہی رہنے دو۔ وہ لمحے کب کے مر چکے۔ وہ محبت کب کی دم توڑ چکی۔" کیلاش کے جذبوں کی تڑپ شدت اختیار کر گئی تھی ——— "اب تم کسی کی شریکِ حیات ہو۔ تمھارے جذبے کسی اور کے لئے ہیں۔ تمھاری محبت کا حقدار کوئی اور ہے ——— انجنا نام کی جس لڑکی سے کبھی میں نے محبت کی تھی، محبت سے وابستہ محض ان یادوں پر میرا حق ہے۔" کیلاش جیسے کسی بھیانک طوفان کی

زد میں آگیا تھا۔ انجنا کے جذباتی وجود کو گہری چوٹ لگی تھی اور وہ اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

کیلاش کا ذہن ماضی کی سوچوں میں ڈوب گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بیتی زندگی کے دُھندلے سے سائے تھرتھرانے لگے تھے جو لمحہ بہ لمحہ واضح ہوتے جارہے تھے۔

کئی برس پہلے ـــــ شاید دس برس پہلے انجنا کو اس نے دہرہ دون میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ اپنے ایک دوست کی بہن کی شادی میں شریک ہوا تھا۔ اس کی شوخ فطرت نے سب کو اپنی جانب متوجّہ کر لیا تھا۔ انجنا بھی اس سے متاثر ہوئی تھی۔ اس کی فطرت میں بھی شوخی و شرارت رچی ہوئی تھی۔ اِس لئے بہت سے مہمانوں کے درمیان اُن میں اجنبیت کا احساس فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ لیکن یہ رسمی جان پہچان شادی کی تقریب کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ برات کی رخصتی کے فوراً بعد ہی کیلاش لکھنؤ لوٹ آیا تھا۔ چند ماہ بعد جب اُس کے ڈیڈی ٹرانسفر ہو کر لکھنؤ سے دہلی آئے تو اس نے دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ تب وہ سائنس کا متعلّم تھا اور یہ اس کی تعلیمی زندگی کا آخری سال تھا۔ پہلے ہی دن جب اُس نے یونیورسٹی میں قدم رکھا تو اچانک ہی انجنا سے ملاقات ہو گئی۔ کیلاش کو یہاں دیکھ کر انجنا کو حیرت ہوئی تھی۔ لیکن حیرت خوشی میں بدل گئی جب اُسے پتہ چلا کہ کیلاش نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے۔ دہرہ دون میں ہونے والی ملاقات محض رسمی تھی اور کیلاش اِس سے زیادہ کچھ بھی نہ جانتا تھا کہ اُس کا نام انجنا ہے۔ جب اُس پر یہ راز کُھلا کہ انجنا بھی یونیورسٹی میں بی۔ اے فائنل کی طالبہ ہے تو ساتھ ساتھ رہنے کے تصوّر نے اُسے خوشی عطا کی تھی۔

کیلاش اور انجنا کے تعلّقات اب محض رسمی نہ رہے تھے، بلکہ وہ ایک دوسرے کے کافی قریب آگئے تھے۔ تب کیلاش نے پہلی بار انجنا کے بارے میں سوچا تھا۔ انجنا صرف خوش مزاج ہی لڑکی نہ تھی۔ اُس کی شخصیت بھی بے حد حسین و پُرکشش تھی۔ شبنم سے دُھلے گُلاب کی طرح نِکھرا ہوا اُس کا چہرہ۔ گُلاب کی پتّیوں جیسے ہونٹ، گھنی پلکوں کی اوٹ میں رقصاں شوخ و شریر نگاہیں، فراخ پیشانی، متوازن جسم کے تیکھے تیکھے نقوش، شانوں تک لہراتی ہوئی مُشکبار گھنی زُلفیں، آواز کا نرم و شیریں ترنّم ـــــ سراپا قیامت تھی وہ! اُبھرتے ہوئے شباب کی آغوش میں سِمٹا ہوا اُس کا وجود دریاؤں کی مچلتی ہوئی الھڑ لہروں کی روانی جیسا بے پروا تھا جسے تیز رو آبشاروں کی سی نزاکتوں نے سجایا سنوارا تھا۔

کیلاش کے حسّاس جذبات کو انجنا کی پیاری پیاری شخصیت نے شبنم سی ٹھنڈک بخشی تھی اور انجنا کی چاہت کے اُن مسرور کُن جذبوں نے اُسے مدہوش سا بنا ڈالا تھا۔ انجنا ایک نشہ بن کر اُس کے وجود پر چھاتی چلی گئی تھی۔

کیلاش کی پُروقار شخصیت، فطرت کی شوخی انجنا کو بھی بھا گئی تھی اور اپنے دل میں وہ کیلاش کے لئے چاہ محسوس کرنے لگی تھی۔ یونیورسٹی میں فرصت کا ہر لمحہ ایک ساتھ گزارنے کی بیقراری روز بروز بڑھتی ہی گئی تھی۔ آخر دونوں کے دل ایک دوسرے کے لئے دھڑکنے لگے تھے۔ کسی نے کبھی محبت کا اظہار نہ کیا تھا لیکن دونوں ہی پر ایک دوسرے کی خاموش محبت کا راز کُھل چکا تھا۔

"کیلاش! خواہش، تمنّا، آرزو، چاہت ـــــ یہ سب کیا ہے؟"
ایک دن انجنا نے کیلاش کے اُلجھے بالوں میں اپنی نازک اُنگلیاں اُلجھاتے ہوئے پُوچھا تھا۔

"اِنھیں سب کا نام تو زندگی ہے انجنا!"

"کہتے ہیں تمنّا بر نہیں آتی۔ خواہش، آرزو اور چاہت کبھی پُوری نہیں ہوتی۔"

"کہتے ہوں گے۔ لیکن میرا وِشواس ہے کہ انسان اگر سچّے دِل سے، دِل کی گہرائی سے خواہش کرتا ہے تو یقیناً پُوری ہوتی ہے۔ دعا بھی تو خواہش ہی جیسا ایک جذبہ ہے۔ کسی مفکّر نے کہا ہے: دُعا وہی اثر کرتی ہے جو دل کی تڑپ سے پیدا ہوتی ہے۔ آرزو ہو یا چاہت، ہر جذبے کی تکمیل کے لئے دل کی تڑپ چاہیئے۔"

"محبت بھی تو ایک جذبہ ہے ـــــ ایک خواہش ہے!"

"ہاں!"

"کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟" انجنا کے چہرے کی گُلابی رنگت دہک گئی تھی۔ کیلاش نے مدہوش نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"ہاں!"

"کِس سے؟"

"اپنے دِل سے پُوچھ لو!" اور انجنا شرما گئی تھی۔ اُس کے عارضوں کے گُلاب کِھل اُٹھے تھے۔ نگاہوں میں کلیوں کی سی حیا اُمڈ آئی تھی اور تھرتھراتے عنّابی ہونٹ مُسکان سے بھر گئے تھے۔ کیلاش نے اُس کی گرم سانسوں کی مہک محسوس کی تھی۔ اُس کے احساس کے بربط پر نغمے گونجنے لگے تھے۔

"محبت اپنے دامن سے جھٹک نہ دینا انجنا!" انجنا کے مچلتے دل پر اُس نے جیسے قابو پالیا تھا۔

"ہر حال میں میرا پیار زندہ رہے گا کیلاش!" مچلتے ہوئے چاہت کے جذبے بیقرار ہو اُٹھے تھے۔ آرزوئیں انگڑائیاں لینے لگی تھیں اور دونوں ایک دوسرے کی پُر خمار نگاہوں سے کھیلتے رہے تھے۔

یونیورسٹی کو خیرباد کہہ کر زندگی کی نئی راہوں پر قدم بڑھانے سے پہلے کیلاش نے انجنا سے کہا تھا۔

"مستقبل کے بارے میں تم نے کچھ سوچا؟"

"تم جو بھی فیصلہ کروگے وہی میرا فیصلہ ہوگا!"

"پی ایچ۔ ڈی کے لئے میں برطانیہ جانا چاہتا ہوں۔ لوٹنے میں شاید تین چار برس لگ جائیں گے۔"

"تمہارے لوٹ آنے تک میں منتظر رہوں گی۔"

اور جب کیلاش برطانیہ کے لئے روانہ ہو رہا تھا تو انجنا نے اپنے آپ پر جیسے جبر کرتے ہوئے کہا تھا ــــــ "میری محبت کو وہاں کی رنگینیوں میں دفن نہ کر دینا کیلاش!" کیلاش نے پیار سے انجنا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا تھا: "میرا ہر لمحہ تمہاری یاد کے پھولوں سے معطر رہے گا!"

برطانیہ میں اپنے قیام کے دوران ہر دن، ہر لمحہ کیلاش نے انجنا کو یاد کیا تھا۔ اُس کی یادوں ہی کے سہارے وہ پورے عزم سے آگے بڑھا تھا اور معینہ وقت سے پہلے ہی اُس نے اپنے 'سبجیکٹ' پر تھیسس لکھ دیا تھا۔ یہ اُس کی زندگی کی بڑی کامیابی تھی اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اِس کامیابی کا راز انجنا ہے، اُس کا پیار ہے، اُس کی حسین یادیں ہیں۔

تین برس بعد کیلاش نے وطن آکر جب یہ سُنا کہ انجنا کسی اور کی ہو چکی ہے تو وہ تڑپ اُٹھا۔

"انجنا نے ڈاکٹر سدھیر سے شادی کر لی۔" منورما نے اُسے بتایا تھا ــــــ "تمہارے جانے کے بعد انجنا سیر و تفریح کی غرض سے دارجلنگ گئی تھی۔ وہیں ڈاکٹر سدھیر سے ملاقات ہوگئی اور پھر شادی!"

کیلاش اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس کر رہا تھا اور منورما بتاتی جا رہی تھی۔

"کیلاش میں آخر کمی کیا ہے! اور پھر تم نے اُس سے محبت کی ہے۔"

"ہاں منورما! میں نے کیلاش سے محبت کی تھی ــــــ شادی نہیں۔"

"شادی کا وعدہ تو کیا تھا۔ اُس کے وطن لوٹنے تک انتظار کرنے کا وچن تو دیا تھا۔"

"وہ محض وعدہ تھا۔ تب میں نے شادی کے مسئلے پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا ــــــ اور تب سدھیر سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب میں نے شادی کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا تو میرے ذہن نے کیلاش کی بجائے سدھیر کو چُن لیا۔ . . سدھیر ڈاکٹر ہے، سماج میں پہلی قطار کا فرد اور کیلاش؟ ــــــ وہ آنے والے کل پر منحصر ہے۔ کون جانے اُس کی زندگی سائنس کے تجربوں کی بھینٹ ہو جائے اور میں گمنامی اور افلاس کی آگ میں جھلستی رہوں۔ اپنی زندگی کو میں کیوں خطرے میں ڈالوں؟"

"وہ محبت کیا ہوئی جس میں تم نے اپنی چاہتیں، اپنے جذبے، اپنے ارمان وقف کر دیئے تھے؟"

"محبت ــــــ! محبت پاگل پن سے زیادہ کچھ بھی نہیں! حقیقت کا احساس ہو جانے کے بعد بھلا کون پاگل بننا پسند کرے گا!"

منورما نے کیلاش سے وہ ساری باتیں بیان کی تھیں جو اُس نے انجنا سے کہی تھیں۔ کیلاش خاموشی سے سُنتا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں انگارے رقص کرنے لگے تھے۔ زخمی جذبات کا سارا درد پگھل کر دہکتی آگ جیسا بن گیا تھا لیکن وہ بت کی طرح خاموش بیٹھا رہا تھا۔ اپنے پیار کے جس چمن کو آرزوؤں کی نوخیز کلیوں سے اُس نے سجایا سنوارا تھا، وہ چمن اب لُٹ چکا تھا ــــــ اُجڑ چکا تھا۔ شکست خوردہ تمنائیں اُس کے دل و دماغ میں تناؤ پیدا کرتی رہی تھیں۔ چاہت کی بیکراں آگ جو کبھی اُس کے جذبات کو پیار کی آنچ دینے کا باعث ہوئی تھی، آج شعلے بن کر بھڑک اُٹھی تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا، اُس کا وجود اِسی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔ آنسوؤں کے موٹے قطرے اُس کی آنکھوں سے بہہ کر رخساروں پر لکیریں بناتے ہوئے نیچے لُڑھک گئے تھے۔ ایک طویل، سرد آہ بھرتے ہوئے وہ بُدبُدایا تھا ــــــ "میں نے تمہیں پیار کیا تھا انجنا! اپنی زندگی کے بے کیف لمحوں کو تمہاری یاد سے سجایا تھا میں نے! بہاروں کی مستیوں اور خزاں کی ویرانیوں میں بھی تمہیں یاد کیا تھا لیکن تم نے میرا دل توڑ دیا انجنا! . . . جہاں بھی رہو، خوش رہو انجنا! میری خاموش محبت ہمیشہ تمہاری زندگی کا دامن مسرّتوں سے بھرنے کے لئے دُعا گو رہے گی ــــــ!"

کیلاش کی آنکھیں بے اختیار بھیگ گئی تھیں۔

کیلاش ماضی کے غم دامن میں سمیٹے، بے کیف سی زندگی کا بوجھ اُٹھائے وقت کے دھارے کے ساتھ بہتا رہا تھا۔ برطانیہ سے لوٹتے وقت اُس کے دل میں اُمنگیں تھیں، جذبوں کی بھیڑ تھی۔ لیکن اب دل و دماغ جیسے ماؤف ہو کر رہ گئے تھے۔ سوچ تھی نہ کوئی جذبہ! وطن لوٹے چھ ماہ ہو گئے تھے اور اِس دوران وہ جگہ جگہ کی خاک چھانتا پھرا تھا لیکن کہیں بھی سکون میسّر نہ ہوا تھا۔

آخر حالات کے ساتھ اس نے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اس نے ساری زندگی تنہا رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یادوں کی تلخیاں اس پر حاوی ہو گئی تھیں۔ اس نے محسوس کیا تھا، شاید کسی اور کے لئے اس کے جذبے کبھی نہ مچلیں گے۔ اُس کے اندر کہیں دبا ایک اور انسان اچانک ہی اُبھر کر سامنے آ کھڑا ہوا تھا —— یہ انسان ایک سائنسداں تھا۔ کیلاش کو جیسے سہارا مل گیا تھا —— سائنسداں، جس کی زندگی قوم و مُلک کی زندگی ہوتی ہے —— اُس کے دل کے اندھیروں میں روشنی کی ایک باریک سی لکیر پیدا ہوئی تھی اور اس نے ایک نئے عزم کے ساتھ مستقبل کی نئی راہیں تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کیلاش نے چاہا تھا کہ وطن ہی میں کوئی مناسب ملازمت مل جائے تاکہ اپنے سائنسی موضوع پر وہ ریسرچ کا کام شروع کر سکے لیکن اس کی چاہ پوری نہ ہو سکی تھی۔ تین ماہ کی دوڑ دھوپ کے بعد جب اُسے اپنی ہر کوشش میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو مجبور ہو کر اس نے برطانیہ لوٹ جانے کا ارادہ کر لیا تھا —— اور جلد ہی وہ وطن چھوڑ کر برطانیہ منتقل ہو گیا تھا۔ اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہاں بھی اُسے حالات سازگار دکھائی نہ دئے تھے اِس لئے برطانیہ سے کنیڈا اور پھر امریکہ چلا گیا تھا۔

چھ برس گزر جانے کے بعد ایک دن ساری دُنیا کے لوگوں نے ڈاکٹر کیلاش کی عظیم ترین کامیابی کا ذِکر سُنا۔ اس نے برسوں محنت کے بعد اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل کی تھی اور ریسرچ کے ذریعہ ایک ایسی سائنسی دریافت کی تھی جس سے کئی مہلک و لاعلاج امراض کا مقابلہ کرنے کی سمت میں نئی راہیں کھل گئی تھیں۔ انسانیت کی بقا کے لئے کی گئی اِس اہم ریسرچ کے لئے اُسے دُنیا کا سب سے بڑا اعزاز عطا کیا گیا تھا۔ اِس موقع پر ڈاکٹر کیلاش نے وطن لوٹنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور اِس عظیم ترین کامیابی پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا تھا —— "... یہ کامیابی میری نہیں، اُس پیار کی کامیابی ہے جس نے ہر گام پر مجھے تحریک عطا کی ہے، جس پیار کی یاد نے مجھے ہر کٹھن منزل پر پہنچنے کے لئے عزم و حوصلہ عطا کیا ہے۔"

جلی حروف میں شائع شدہ اِس خبر کو انجنا نے بار بار پڑھا تھا۔ خبر کے ساتھ ہی چھپی ہوئی کیلاش کی تصویر کو اس نے بار بار دیکھا تھا۔ کیلاش کے الفاظ نے اس کے دل میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا کر دی تھی۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ لیکن وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ اُسے خوشی حاصل ہوئی ہے یا درد جاگا ہے؟ اُس کا منتشر اُلجھا اُلجھا ذہن مسرت اور چاہت کے درمیان گم ہو گیا تھا۔

کیلاش وطن لوٹ آیا تھا۔ اُس کا شمار اب دُنیا کی ممتاز و ذہین ترین شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ سارے دیش نے ایک قومی ہیرو کی طرح اس کا سواگت کیا تھا، اس کی عظمتوں کو سراہا تھا اور دیش میں سائنسی ریسرچ کے شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرنے کی اس سے درخواست کی گئی تھی۔ انجنا ہر دن اخبارات میں ایسی خبریں پڑھتی رہی تھی اور آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں پیدا شدہ انتشار کی حالت ختم ہو گئی تھی۔ کیلاش کا ذِکر آتے ہی اب وہ بیقرار سی ہو جاتی تھی۔ اِس بیقراری کی وجہ شاید اس کی ذاتی زندگی کی وہ گھٹن تھی جس میں وہ ڈوب گئی تھی —— جس نے اُسے اپنے حالات سے غیر مطمئن سا بنا دیا تھا۔ اپنے ماضی کے اُن لمحات کو یاد کر کے وہ جیسے دُکھی ہو جاتی تھی۔ اس کے جن جذبوں نے کیلاش کو ٹھکرا کر سدھیر کو اپنایا تھا، یہی جذبے اس کی زندگی میں اب کانٹوں کی چبھن کا احساس دِلا رہے تھے۔ سدھیر ایک کامیاب ڈاکٹر تھا —— ایک مصروف ترین ڈاکٹر! شادی کے بعد جب انجنا کے جذبوں کا خمار اُترا تو اس نے محسوس کیا تھا کہ سدھیر کو اس کی بجائے اپنے مریضوں کا زیادہ خیال ہے۔ انہیں دنوں انجنا کو ہلکا بخار ہو گیا تھا۔ سدھیر تین دن اس کی مزاج پرسی تک نہ کر سکا تھا —— اِس لئے کہ وہ ایک بہت ہی سیریس کیس میں اُلجھا ہوا تھا۔ انجنا دل ہی دل میں تڑپ اُٹھی تھی۔ لیکن سدھیر سے کبھی اس نے گلہ نہ کیا تھا، دل ہی دل میں بے دِلی کے جذبوں کو بڑھنے دیا تھا۔ سدھیر کی معمولی بے پروائی بھی اب اس کے دل پر نشتر زنی کرتی تھی اور آہستہ آہستہ اس کے جذبات مشتعل ہوتے چلے گئے تھے۔ اپنے آپ کو وہ اکثر گھٹے گھٹے سے ماحول میں ایک قیدی کی طرح سمجھنے لگی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں پیدا ہونے والے جس خلاء کا احساس کیا تھا، شاید اسی احساس نے اسے کیلاش کے لئے بیقراری کا جذبہ دیا تھا۔

"انجنا! آج شام کو 'لارڈز' میں ڈاکٹر کیلاش کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی جا رہی ہے۔ چار بجے تم وہاں پہنچ جانا، میں بھی وقت پر آ جاؤں گا۔" ڈاکٹر سدھیر انجنا سے مخاطب تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ انجنا چونک پڑی۔

"کیا —— ؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا "کیلاش یہاں کب؟" جبھی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن سدھیر نے شاید انجنا کے الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں کی تھی۔

"دوپہر تک وہ یہاں پہنچ جائیں گے —— اور ہاں! دو دن وہ ہمارے یہاں قیام کریں گے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ کیلاش میرا دوست ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ہم کلاس فیلو تھے۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر سدھیر باہر چلا گیا اور انجنا ایک بار پھر خیالوں کی دُنیا میں گُم ہو گئی۔ شاید اپنے آپ کو وہ آنے والے لمحات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کر رہی تھی۔ سدھیر نے نہیں دیکھا کہ انجنا کا سارا جسم کانپ گیا تھا۔

بیسویں صدی دہلی ستمبر ۱۹۶۹ء

توبہ

مے سے جب موسم برسات میں چھائی توبہ
بادل اس زور سے گرجا کہ الٰہی توبہ ——— قند گورکھپوری

کافر، خدا کرے کہ وہ تیرا شباب ہو
مرجاؤں میں گناہ سے توبہ کئے بغیر ——— نا معلوم

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا ——— غالب

ہر گنہ سے توبہ کرلی جب جوانی ہوچکی
زاہد و جنت میں جانا کوئی تم سے سیکھ جائے ——— داغ

شیشہ اُٹھا کے طاق سے ہم نے
طاق پہ رکھ دی ساقی توبہ ——— حسن بریلوی

توبہ کر زاہد، کروں توبہ میں ایسے وقت میں
یہ بہار آئی ہوئی، ایسی گھٹا چھائی ہوئی ——— داغ

مرسلہ: ایس، ایس، ہلکاری - ایم - اے - آگرہ

دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں اور بے حد سرد موسم میں بھی اُس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔

شام کی پُر رونق تقریب میں انجنا موجود تھی۔ سدھیر بھی وہیں تھا اور جب اس نے کیلاش اور انجنا کو متعارف کرایا تو کیلاش چونک ——— چونک گیا۔ اُس پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔

"کیا ہوا کیلاش؟" سدھیر گھبرا گیا تھا۔

"کچھ نہیں سدھیر!.." کیلاش نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا تھا۔

"وہ دیکھو ——— سامنے ڈاکٹر فلپس ہیں نا!" سدھیر اُدھر دیکھنے لگا تھا

"ہاں! ڈاکٹر فلپس ہی ہیں!"

"انھیں یہاں دیکھ کر میں چونک گیا تھا ——— کچھ ہی دن پہلے تو امریکہ میں مجھ سے ملے تھے ——— یہاں کب آئے؟"

"شاید ایک ہفتہ پہلے آئے ہیں۔" اور بات وہیں ختم ہوگئی تھی۔

———

کیلاش ڈاکٹر سدھیر کا مہمان تھا۔ رات بھر وہ سو نہ سکا تھا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ انجنا کا شوہر اس کا دوست ڈاکٹر سدھیر ہے۔ اُس کا ذہن ماضی کی غمناک یادوں میں اُلجھ گیا تھا ——— یادیں، جو انجنا سے وابستہ تھیں ——— جو اُس کی اپنی زندگی کی آرزوؤں اور چاہتوں سے وابستہ تھیں! دس برس کے بعد انہی یادوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی آج اچانک ہی اُس کے سامنے انجنا کھڑی ہوئی تھی ——— "نہیں! وہ انجنا کوئی اور تھی ——— وہ کیلاش بھی کوئی دوسرا تھا۔ یہ انجنا تو تمہارے دوست کی انجنا ہے ———!" اُس کے ذہن نے کہا تھا اور طویل ذہنی کشمکش کے بعد سوچ نے جذبات کی کمزوری پر قابو پالیا تھا۔

سدھیر ہسپتال سے ابھی لوٹا نہیں تھا۔ کیلاش سدھیر کے کمرے میں بیٹھا کتابوں سے دل بہلا رہا تھا۔ انجنا تھوڑی ہی دیر پہلے کمرے میں آئی تھی۔

"عظیم کامیابی تمھیں مبارک ہو کیلاش!" انجنا پہلی بار اُس سے بیباک انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔

"تھینک یو انجنا!" کیلاش نے ہونٹوں پر جبری مسکان لانے کی کوشش کی تھی اور پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ کیلاش کی نگاہیں کسی کتاب کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں لیکن ذہن میں کچھ اور تھا۔ بظاہر انجنا بھی سامنے دیوار پر آویزاں تصویر کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن اُس کا ذہن اُن خیالوں کو ترتیب دینے میں محو تھا جو رات بھر وہ اپنے دل و دماغ میں سوچتی رہی تھی۔ بیتی زندگی کے پُر کیف لمحوں کا تصور، دبے دبے سے محبت کے جذبے اُس کی سوچ کے دائرے میں گھِرے اُمڈ، مچل رہے تھے۔ یہی جذبے کبھی اُس کے احساسِ تشنگی سے بھی ٹکرا جاتے تھے اور وہ سدھیر کی گھٹن بھری قید سے فرار کی راہ تلاش کرنے میں کوشاں ہو جاتے تھے۔ آخر کیلاش سے اُس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو اُس کے دل میں تھا ——— جو اُس کے ذہن میں تھا۔ لیکن کیلاش یہ سب سُننے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ انجنا کے الفاظ کی گہرائی تک اُترنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

"بھول جاؤ انجنا کہ تم نے کسی سے محبت کی تھی۔ اپنی زندگی کو چاہت کے اُن جذبوں سے سنوارو جو سدھیر کے دل میں مچلنا چاہتے ہیں۔ تمہاری زندگی سدھیر کی زندگی ہے ——— تمھارے جذبے سدھیر کے جذبے ہیں۔"

"کاش چاہت زندہ رہ پاتی! میری زندگی کے دامن میں اب صرف سسکیاں ہیں ——— آہیں ہیں۔" انجنا کی بھیگی بھیگی سی آواز میں درد کی آمیزش تھی ——— "سدھیر کے سینے میں پتھر کا دل ہے۔"

"تم نے سدھیر کو غلط سمجھا ہے انجنا! وہ میرا دوست ہے۔ وہ کتنا جذباتی ہے، میں جانتا ہوں۔ وہ ایک ڈاکٹر ہے جو دوسروں کو زندگی کی سانسیں عطا کرتا ہے ——— ایک خدا ہے جس نے انسان کی تخلیق کی ہے۔ ایک ڈاکٹر ہے جو خدا کی تخلیق کا محافظ ہے۔ تمھیں فخر ہونا چاہیے کہ تم اُس عظیم انسان کی، اُس دیوتا کی شریک

Kehana

حیات ہو۔"

"کانٹوں کی چبھن کسی کے لئے باعثِ فخر ہو سکتی ہے تو یقیناً مجھے بھی اپنی زندگی پر فخر ہے۔"

"لیکن یہ مت بھولو کہ کانٹوں سے بھری ہوئی شاخ کو صرف ایک ہی پھول خوبصورت بنا دیتا ہے تم بھی ایک پھول ہو انجنا! شدھیر کے چمن میں اسے کھلا رہنے دو۔" کیلاش دل کی گہرائی سے انجنا کی زندگی کو پُر مسرت دیکھنے کا خواہاں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: "جذباتیت کی رَو میں بہہ کر تم صرف اپنے لئے سوچ رہی ہو۔ ذرا اُس انسان کے لئے بھی سوچو جس پر صرف تمہارا ہی نہیں، اوروں کا حق بھی ہے۔ اُسے تمہارے پیار کی ضرورت ہے، تمہارے خلوص اور اعتماد کی ضرورت ہے۔" لیکن انجنا پر اِن باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ تو اپنے ہی جذبات کے تنگ دائرے میں قید تھی۔ اُسے محسوس ہوا تھا کہ اُسے ٹھکرا کر کیلاش اپنی ناکام محبت کا اُس سے بدلہ لینا چاہتا ہے ۔۔۔ اُسے ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ تبھی اُس کے حساس دل نے اپنے آپ کو بے حد حقیر محسوس کیا تھا۔ اپنے آپ کو وہ منوں بوجھ کے نیچے دبی سی محسوس کرنے لگی تھی اور وہ تڑپ اُٹھی تھی۔ دوسرے ہی لمحے جیسے بھاگتی ہوئی سی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ کیلاش پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

انجنا اپنے کمرے میں پلنگ پر گری سی زار و قطار رو رہی تھی۔ آنسو بہا لینے کے بعد دل کا بوجھ کچھ کم ہوا تو اُس کا ذہن ایک نئی سوچ میں اُلجھ گیا تھا۔ دل نے جیسے اچانک ہی کوئی فیصلہ کر لیا تھا اور ذہن اِس فیصلے کے آگے جھک گیا تھا۔ انجنا اُٹھ کر سامنے رکھی اُس تصویر کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی جس میں شدھیر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ یہ وہی تصویر تھی جو دارجلنگ کی حسین ملاقات کی یاد دلاتی تھی۔ انجنا نے فریم اُلٹ دیا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ اُس کے مشتعل جذبات نے یہ آخری فیصلہ کیا تھا کہ آج ہی ۔۔۔ ابھی ۔۔۔ شدھیر سے وہ صاف صاف کہہ دے گی کہ اُن دونوں کی راہیں الگ ہیں ۔۔۔ گھٹن بھری اِس زندگی کی قید سے وہ آزاد ہونا چاہتی ہے ۔۔۔ اور ہمیشہ کے لئے وہ یہاں سے چلی جائے گی ۔۔۔ کہیں بھی! اِس سے زیادہ اُس نے کچھ بھی نہ سوچا تھا۔

انجنا کے قدم ابھی برآمدے ہی میں تھے کہ اُس کے کانوں نے فون کی گھنٹی کی آواز سُنی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے قدم رُک گئے۔ دائیں طرف شدھیر کے کمرے میں سے کیلاش کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔ وہ فون پر کہہ رہا تھا۔

"کیا کہا ۔۔۔ ڈاکٹر شدھیر کو دل کا دورہ پڑا ہے ۔۔۔ اُن کی حالت کیسی ہے ۔۔۔؟ جی ۔۔۔ تشویشناک ۔۔۔!!! اوہ خدا! ۔۔۔ جی ہاں! مسز شدھیر یہیں ہیں۔ میں انھیں لے کر ہسپتال پہنچ رہا ہوں ۔۔۔"

انجنا سر سے پاؤں تک کانپ گئی ۔۔۔ لرز گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا اور بے شدھ سی، بے تحاشہ وہ کیلاش کی طرف لپکی۔ اُس کے ذہن میں جو تناؤ تھا، جو اشتعال تھا، گھٹن کا جو احساس تھا، یک بیک پگھل گیا۔ پتھرائی سی سُونی سُونی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے غم کا پہاڑ اُس پر آ گرا ہو ۔۔۔ جیسے اُس کی دُنیا ہی لُٹنے کو ہو ۔۔۔ پاگلوں کی طرح تڑپ اُٹھی تھی وہ! دوسرے ہی لمحے کیلاش کے ساتھ وہ کار کی طرف بڑھ گئی۔

شدھیر بے ہوش پڑا تھا اور بڑے بڑے ڈاکٹروں کی ٹیم اُس کی تشویشناک حالت پر قابو پانے میں کوشاں تھی۔ انجنا نے بہت دیر تک رو لینے کے بعد اپنے ضبط کو باندھنے کی کوشش کی تھی۔ شدھیر کے قریب بیٹھی وہ اُس کے زرد چہرے کو پریشان ۔۔۔ بے چین سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُنگلیاں شدھیر کے بالوں میں اُلجھ گئی تھیں۔ کبھی کبھی اُس کی اُداس نگاہیں ڈاکٹروں، نرسوں اور ایک کونے میں کھڑے کیلاش کی طرف اُٹھ جاتیں اور پھر شدھیر تک لوٹ آتیں۔ کیلاش شدھیر کو دیکھ رہا تھا۔ انجنا کو دیکھ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا شاید

بہار

بہارِ لالہ و گُل شوخیٔ برق و شرر ہو کر
وہ آئے سامنے لیکن حجاباتِ نظر ہو کر ۔۔۔ جگر مرادآبادی

ظفر خزاں تو بہر حال تھی خزاں لیکن
بہار آئی تو کچھ اور پھول مُرجھائے ۔۔۔ ظفر اکبرآبادی

ہجومِ گُل و لالہ و یاسمن میں
خراماں خراماں بہار آ رہی ہے ۔۔۔ ظفر علی خاں

بہار کیا ہے؟ چمن کی اِک آرزوئے طرب
خزاں چمن کی اُسی آرزو کا ماتم ہے ۔۔۔ نامعلوم

مُدّتیں ہو گئیں خزاں آئے
ہے ابھی تک بہار آنکھوں میں ۔۔۔ نامعلوم

چمن والوں سے صحرا نشیں کی بود و باش اچھی
بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی ۔۔۔ حیدر دہلوی

مرسلہ: نسیم یوسف زئی ایم۔ اے پشاور (پاکستان)

انجنا نے کبھی شدھیر کے دل کی عمیق گہرائیوں تک اترنے کی کوشش نہیں کی۔ کہ شاید کبھی اپنے محدود جذبوں سے الگ ہو کر اس نے شدھیر کو سمجھا نہیں، پرکھا نہیں! شاید کبھی وہ سمجھ نہیں پائی کہ شدھیر ایک ڈاکٹر ہے۔ ایک ایسا انسان ہے جسے مصروفیت کے لمحوں میں کسی کی میٹھی مسکان کی ضرورت ہے، کسی کے پیار کی ضرورت ہے تاکہ اس کے تھکے ماندے ذہن کو، جسم کو سکون حاصل ہو سکے۔ کیلاش کی سنجیدہ نگاہوں نے انجنا کو دیکھا ——— اپنے آپ ہی سے کہہ گیا وہ ——— "نادان لڑکی!"

"نہیں! ایک عورت ——— ایثار و قربانی کا مجسمہ ——— ! پیار اور ممتا کی مورت!!" اس کی نگاہیں انجنا ہی میں، اسی کا، ایک عورت کا، وہ روپ دیکھ رہی تھیں جس کا ہر جذبہ ممتا کا درد بن کر لاوے کی طرح پھوٹ پڑتا ہے ——— جس کی ہر خواہش، ہر آرزو اپنے سہاگ کے لئے تڑپ بن جاتی ہے۔

لگاتار کئی گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد شدھیر نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے لب ہلے ——— "انجنا ———!" اور انجنا کے زرد، اداس چہرے پر خوشی جھلک آئی۔ پتھرائی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ ایک لمحہ کے لئے آنکھیں موند کر اس نے ایک طویل سانس لی، جیسے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ شدھیر پر جھک گئی اور بے اختیار اپنے کپکپاتے گرم ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ آنسوؤں کے دو موٹے قطرے جھکی پلکوں کی اوٹ سے نکل کر شدھیر کی بند پلکوں کو چوم گئے۔

کیلاش کے احساس نے جلترنگ کے سے میٹھے سُروں کی مدہوشی محسوس کی۔ اپنی رگوں میں رواں خون کی جوش بھری گرمی محسوس کی۔ ماحول میں ہوا کے ارتعاش سے پھوٹتے ہوئے نغموں کو روح میں سماتے محسوس کیا جیسے اس کے جذبوں نے تسکین پالی ہو جیسے کسی بھیانک طوفان کا شور تھم گیا ہو! آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی اور ہونٹوں پر مسکان بکھیرے وہ کمرے سے باہر آگیا۔ سامنے لان کی سبز مخملی گھاس پر بیٹھ کر خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس کا دل مچل اٹھا تھا!!

مشہور افسانہ نگار حضرت آسی رام نگری مناسب حق محنت پر اصلاح کا کام بھی کرتے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب خصوصاً نئے لکھنے والے اپنے مضامین، افسانوں اور کتاب پر اصلاح کے لئے مستند ادیب کی خدمات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا ٹکٹ بھیجئے۔

پتہ: حضرت آسی رام نگری مظفر نگر۔ یو۔ پی

مشورہ

پروفیسر ضیا ندیم ایم۔اے

اپنی زلف ولب ورخسار کے دلکش جلوے
میرے آئینۂ اشعار میں دیکھا ہی نہ کر
میری بے کیفیٔ تحریر کا شکوہ ہے عبث
ریگ زاروں میں گلستاں کی تمنا ہی نہ کر

مجھ کو تسلیم کہ میں نے تجھے چاہا تھا کبھی
دل کے ایوان میں ترے رُوپ کے جلتے تھے دیئے
مرمریں جسم کہ شہ پارہ ئیں اجنتا کے صنم
میری راتوں کو جوانی کے نئے خواب دیئے

تیری پازیب کی جھنکار میں رازوں کا طلسم
تیری آنکھوں میں وہ ہلکے سے اشارے کا فسوں
ہائے وہ دعوتِ پیہم کہ شبستاں سے ترے
لاکھ چاہوں پہ کبھی لوٹ کے پھر آ نہ سکوں

ایک عالم ہے مگر تیرے شبستاں سے پرے
زندگی جس میں سسکتی ہے سنورنے کے لئے
ہائے اُن پیار کی کلیوں کا بھیانک انجام
جو مچلتی ہیں جوانی میں مہکنے کے لئے

پیار کے ساز پہ چھیڑی ہوئی رنگین غزل
ضربِ دوراں سے یہ نالوں میں بدل جاتی ہے
شبنمیں زلف کہ ساون کی گھٹاؤں کا سحر
حیف صد حیف کہ شانوں کو ترس جاتی ہے

گلشنِ زیست کی بے کیف فسردہ کلیاں
پہلے اِن کو تو بہاروں کا تبسم دیدوں
زندگی جو ابھی نغموں سے شناسا ہی نہیں
اس کو گھنشیام کی بنسی کا ترنم دیدوں

غزل

ابر احسنی گنوری

اے منعمِ ازل نہیں معراج سر سے ہم
رکھتے ہیں ربط بعد خدا اپنے در سے ہم

کھیلے ہیں ساری عمر اسی نیشتر سے ہم
واقف ہیں خوب لذتِ زخمِ نظر سے ہم

وہ دن قفس میں کاٹ کے محسوس یہ ہوا
جیسے یہیں اسیر رہے عمر بھر سے ہم

دل ڈوبنے لگا ہے تو دنیا بھی ڈوب جائے
سیلاب ایسا لائیں نکیوں چشمِ تر سے ہم

راہِ تصورات دکھاتا اگر نہ عشق
تیرے حریمِ ناز تک آتے کدھر سے ہم

جب سے نظر ملی ہے دھندلکے ہیں ہر طرف
آگاہ شام سے ہیں نہ واقف سحر سے ہم

ہے غیرت اسی میں کہ آگے نکل چلیں
اُمید رہبری نکریں راہبر سے ہم

یوں تو سبھی کے عیبوں سے آگاہ ہیں مگر
اپنی بُرائیوں سے رہے بے خبر سے ہم

کچھ کوندنے لگی ہیں خلاؤں میں بجلیاں
نظریں ملا رہے ہیں یہ کس کی نظر سے ہم

ایوانِ دل کو چھوڑ کے دیر و حرم میں شور
وہ ہیں کدھر پکار رہے ہیں کدھر سے ہم

دامن میں ابر وہ بھی کچھ آکر سمیٹ لیں
موتی لٹا رہے ہیں بہت چشمِ تر سے ہم

[redacted]

نئی منزل

بشیر احمد ریاض رکن ادارہ ہفت روزہ "ایشیا" برمنگھم

۱۴۔ السیسٹر روڈ۔ برمنگھم نمبر ۱۳ (یو۔کے)

برادرِ بزرگ خوشتر صاحب! یادیں

ہمارے عزیز ترین دوست راجہ مہدی علی خاں کے بعد نریش کمار شاد کی اچانک موت آپ اور قارئین "بیسویں صدی" کے لئے ایک المناک حادثہ ہے۔ ابھی راجہ صاحب کی جدائی کا گھاؤ بھرنے نہیں پایا تھا کہ موت ایک اور ذہین فنکار کو کھا گئی۔ شاد کے بچھڑنے سے آپ کو جو رنج پہنچا ہے، اس کا اندازہ آپ کے تازہ خط سے ہوتا ہے۔ انگلستان میں بھی آپ کے اس غم کو قارئین "بیسویں صدی" نے بہت شدت سے محسوس کیا ہے۔ یہاں کے ادبی حلقوں میں شاد کی موت کا ماتم کیا جا رہا ہے اور اس رنج کے آنسو "ایشیا" کے صفحات پر بھی بکھرے ہوتے ہیں۔ خدا مرحوم کی مغفرت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے!! ــــــ جب "بیسویں صدی" ملتا ہے تو بہت سی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور بعض چہرے تصور میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ آپ نے پچھلے سال دہلی میں کئی احباب سے ملایا تھا۔ پرچے میں جب بھی ان کے ناموں کو آنکھیں چومتی ہیں تو دل کے دریچے وا ہو جاتے ہیں اور میں دلی کی شاہراہوں تفریحی جگہوں اور تاریخی مقامات پر آپ کے ساتھ گھومتا پھرتا، یادوں کے قطب مینار پر چڑھنے لگتا ہوں۔ "دلی کا خط لندن کے نام" انہی یادوں ہی کی تو زنجیر ہے ــــــ "ایشیا" دیکھی کے لئے آپ کا یہ سلسلہ مضامین ہمارے لئے باعث افتخار ہے اور یہاں مقیم احباب اسے بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور اب تو قارئین تقاضا کرنے لگے ہیں کہ آپ کا تعارف شائع کیا جائے ــــــ لیجئے طویل غیر حاضری کے بعد بزم "بیسویں صدی" میں "نئی منزل" سے شرکت کر رہا ہوں۔ اس کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا۔ یہ بے لوث چاہت کی کہانی ہے جسے میں نے جذبات کی آبشار تلے غسل دے کر قلمی روپ دیا ہے...

آپ کا ــــــ بشیر ریاض

★

پیہم خشک حالات نے جب میری زندگی بالکل بنجر بنا ڈالی اور میری زندگی کی ہریالی بے راہروی کے بگولوں سے اجڑنے لگی تو میرا دل ویرانہ بن گیا۔ احساسات اور جذبات کے چھلکتے پیمانے ختم ہو گئے اور دل کی دنیا سونی سونی نظر آنے لگی۔ انہی اندھیرے میں میرے قدم غلط راہ کی طرف اٹھنے لگے۔ نہ جانے میں ذلت کے کتنے گہرے غار میں جا گرتا کہ مجھے انجمن نے سنبھال لیا۔ وہ خلوص اور پیار سے مجھے اپنے اصل مقام پر واپس لے آئی۔ انجمن کے ساتھ میں ایسی ہمدردی ہے کہ چلتے چلتے میرے پاؤں نہیں تھکتے۔

انجمن نے درحقیقت مجھے ہمدردی، خلوص، احترام اور ــــــ زاویہ نگاہ دیا ہے۔ میرے دل میں بھی اس کے لئے انس اور صرف لگاؤ ہی نہیں، گہری عقیدت، پُرخلوص احترام اور ایثار کے جذبات روشن ہیں جب میں اسے دیکھ نہیں پاتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے کسی چیز کی تلاش ہے اور جب میری نگاہ اسے ڈھونڈ لیتی ہے، تو میرے دل میں خوشی کی ایسی عجیب سی لہر دوڑ جاتی ہے، جو کیف افزا بھی ہے اور

دل نواز بھی۔

کیا میرے یہ جذبات پیار کی نشانی ہیں؟ میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے میرے دل میں کچھ ایسے بے پناہ جذبات و احساسات اُس پُر کشش ہستی کے لئے ضروری ہیں جو کسی صلہ کے خواستگار نہیں۔ اُن میں صرف ایثار کی تڑپ پائی جاتی ہے۔

ایک گھائل رُوح ہی زخمی دل کا درد سمجھ سکتی ہے اور ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے تعلقات کی معراج بھی یہی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بارے میں عام سطح سے بہت بلند ہو کر سوچ سکتے ہیں۔

زندگی میں بعض لوگ کتنا بڑا سہارا ہوتے ہیں کہ انسان کچھ نہ پانے کے باوجود سب کچھ پا لیتا ہے۔

- قابلِ رشک ہے وہ جسے مال دیا گیا اور مال کو مناسب طریقہ پر خرچ کرنے کی توفیق بھی عطا ہوئی۔ قابلِ رشک ہے وہ جسے عقل بخشی گئی اور وہ اس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیتا ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- تدبیر جیسی کوئی دانائی نہیں۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- اہلِ کرم وہ ہے جو دوسروں کی حاجت کو اپنی حاجت پر مقدم رکھے۔ (حضرت مجدد الف ثانیؒ)
- اللہ اپنے بندوں سے قرض طلب کرتا ہے اور اس کے قاصد سائل لوگ ہیں۔ (حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ)

زندگی نہ جانے کتنے طوفانوں کا شکار ہوئی۔ کتنے حادثات نے دل کی دُنیا سے ہر خوشی کو چھین لیا اور کتنے نامہرباں حالات نے میری رگوں سے جینے کا لُطف نچوڑ لیا۔ میری خوشی آوارہ ہو گئی اور اکیلا خوشیوں کے لئے بھٹکتا رہا۔ سکون کو آواز دیتا رہا۔ ہمدردی کے لئے ہاتھ پھیلاتا رہا۔ لیکن ہمیشہ اُس کا صلہ مایوسی اور سرد مہری سے ملا۔ میری ہر تمنّا نیا زخم بنی اور بالآخر تھک ہار کر خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

دل کی ہر کلی جب مسل دی گئی۔ اپنی کسی بھی منزل کی طرف بڑھنے کا حق مجھ سے چھین لیا گیا، تو میری زندگی راستے کی دھول بن گئی۔ میرا چہرہ اُس گرد سے اَٹ گیا۔ میرے دل سے احساس کی دولت مٹنے لگی، تو قُدرت نے مجھے پھر ایک حسین درد بخش دیا۔ میرے زخموں کا مرہم قُدرت نے مجھے انجمن کی شکل میں عطا کیا ہے۔

جب وہ آہستہ آہستہ میری زندگی میں داخل ہوئی، تو میری زندگی میں کوئی اہلچل نہیں مچی۔ اُس کا ساتھ پا کر مجھے سکون ملنے لگا۔

انجمن سراپا خوبی ہے۔ وہ اتنی عظیم ہے کہ دُنیا کی ساری اچھائیاں اُس کے قدموں کے چھونے کے قابل نہیں۔ وہ اتنی بلند ہے کہ الفاظ کے سہارے اُس کی تعریف ممکن نہیں۔

شاعرانہ انداز میں یوں کہا جا سکے گا کہ پھولوں کی لطافت، کلیوں کی نزاکت، غنچوں کی شوخی اور بہار کے حُسن کے امتزاج سے کوئی پیکر تیار کیا جائے تو وہ انجمن کا رُوپ ہو گا! یہ اظہار ایک حقیقت ہے۔ اگر اُس کے لئے سب کچھ قربان کر دیا جائے تو یہ وہ سب کچھ بھی نہیں جو صرف اُسی کے قدموں پر ہی نچھاور کیا جا سکے۔

انجمن تو اُن خوش نصیبوں میں سے ہے، زندگی کا سارا حُسن جن کے قدم چُومتا ہے اور زندگی جن کا دامن پھولوں سے بھر دیتی ہے۔

اُس کی شیریں گفتاری میں وہ جادو ہے، کہ اُس کا اثر ساری زندگی زائل نہ ہو سکے۔ اُس کے اخلاق کے موتیوں میں اتنی چمک دمک ہے کہ انسان ساری زندگی اُس کے نام کی مالا جپتا رہے۔

انجمن کے پہلو میں اتنا خوبصورت دل ہے جس سے زندگی کی دوپہر ہمیشہ ٹھنڈی رہتی ہے۔ اُس کے پیار بھرے دل میں خلوص کا اتنا بڑا خزانہ ہے کہ کسی اور سے تعلقات کی بھیک کبھی نہ مانگنی پڑے اور اُس کی شخصیت اتنی سحر انگیز ہے کہ اُس سے دوسرے کی زندگی حسین طلسم بن جاتی ہے۔

انجمن کے پھول سے کومل چہرے پر معصوم مُسکراہٹ اُس کے حُسن کی وہ لازوال دولت ہے جو میری زندگی کے لئے ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں اتنی پیاری اور خوبصورت شخصیت سے پیار نہ کرنا پیار اور حُسن کی توہین ہے۔

میں انجمن سے پیار کرنے لگا ہوں۔ اُس کی عظمت سے مجھے پیار ہے۔ اُس کے اخلاق کا میں پرستار ہوں۔ اُس کی حسین عادات نے میرے دل کی گہرائیوں کو چھو لیا ہے۔ انجمن کا پیار میرے لئے رحمت ہے۔

میری آنکھیں اُسے چُومتی ہیں اور میرا دل اُسے سجدے کرتا ہے۔

میں نے اُس کی خوشی کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیا ہے۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب چُکا ہوں۔ یہ گہرائی اتنی پُر لطف ہے کہ میں اوپر اُبھرنا نہیں چاہتا۔ انجمن کی آنکھوں کی اُس گہرائی میں میرے لئے سُراغِ حیات ہے اور ساری کائنات کا حُسن!

میرے دل میں اِس آدرش کے لئے نہ تو خود غرضی مستور ہے اور نہ کوئی

ایسی خواہش جو مجھے انسانیت سے گرا دے۔ میرے ذہن پر تو ہر وقت ایسا حسین اور لطیف سا خیال چھایا رہتا ہے کہ اگر میرے بس میں ہو تو اس کی شخصیت کو پوجا کروں۔ اپنے دل کی دُنیا اس کے حسین تصوّر سے آباد رکھوں اور اسے دل کے کسی محفوظ گوشے میں اس طرح چھپا لوں کہ اس کے چھن جانے کا اندیشہ مجھے کبھی پریشان نہ کر سکے۔

میری کائناتِ دل!

خدا تمھارا نگہبان و محافظ ہو

پھر آ کے رُک گئی ہے دوراہے پہ زندگی
ہوتا ہے کون کون جُدا دیکھتے رہو

بالآخر وہ گھڑی قریب آ رہی ہے جب دل کی دُنیا اُجڑنے کا خوف دامنگیر ہو جاتا ہے۔ دل و دماغ میں پریشان وسوسے جنم لینے لگتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تکلیف دہ یہ تصوّر کہ کوئی بچھڑ رہا ہے! اِس خیال ہی سے دل پر ایسی اُداسی محیط ہو جاتی ہے جس سے دل کا درد زندگی کے ساز پر ایک غمگین گیت بن جاتا ہے اور اُس گیت کا ہر بول بیتے لمحات کی یاد دلا کر بیقراری بڑھاتا رہتا ہے اور جُدائی اُداس کر کے ڈراتی رہتی ہے۔

ہم نے بھی کچھ وقت ایک ساتھ گزارا ہے۔ ایک دوسرے کا دُکھ سُنا، کہا اور سمجھا اور ہمدردی کا یہ جذبہ جب پیار کی حد تک بڑھ گیا ہے تو میری بدنصیبی کہ تم جا رہی ہو۔ میری خوشی مجھ سے رخصت ہو رہی ہے اور غم اور اُداسی مجھے اپنے پاس بُلا رہے ہیں۔

مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز بھی ہے۔ کیونکہ تمھارا قُرب مجھے حاصل رہا ہے۔ تمھاری ہمدردی، اخلاص، لگاؤ اور اُنس، بلکہ ایک طرح کا پیار میرے شاملِ حال رہا ہے اور میرے لئے یہی بہت کچھ ہے۔

میرے شیریں خواب!

تم میرا وہ سُہانا خواب ہو جس کی تعبیر تم سے میرا دلی لگاؤ ہے۔ اِس کی تعبیر وہ پُرخلوص لگن ہے جو خوشی سے بیگانہ دل کو پُرمسرت نشہ سے سرشار کر جاتی ہے اور جس سے میرا اپنا دل تمھارے بارے میں ہمیشہ ایک پُرکیف سوچ میں ڈُوبا رہتا ہے۔

تم میری خوشی بن گئی ہو اور تم سے جُدائی میرے لئے قیامت ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ میرے پاس تمھارے لئے کچھ بھی نہ تھا لیکن تمھاری عظمت اور شخصیت کا اعجاز ہے کہ میرے پاس جو کچھ تھا اور جو نہ تھا وہ سب کچھ ہی تم پر نچھاور کر دیا۔

انجمن! میری رُوح!! میرے دل کی دھڑکن!!!

میں نے اپنا دل تمھارے قدموں پر رکھ دیا ہے اور اپنا سر تمھارے حضور جھکا دیا ہے۔

تمھارا یہ فرمان بالکل بجا اور دُرست کہ وقت کے مرہم سے ہر زخم مُندمل ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ زخم اِتنے گہرے ہوتے ہیں جن کا نشان ہمیشہ باقی رہتا ہے اور میٹھا میٹھا درد ہمیشہ کسی کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

میرے دل میں تمھاری یاد کا جو نہ مٹنے والا نقش ہے وہ مجھے رُلاتا بھی رہے گا اور میرے درد کو کم بھی کرتا رہے گا۔

میری سکونِ روح!

میں نے اپنے دل میں تمھارے پیار کا جو چراغ جلایا ہے وقت کی آندھی اُسے بجھا نہ سکے گی۔ اِس آگ سے دل کا داغ ہمیشہ جلتا رہے گا۔

تمھارے راستے کا پتھر بننے کی مجھ میں بساط کہاں میں تو ایک کنکر بھی نہیں ہوں۔

....

- اے آپس میں لڑنے والو! تم میں ایک دوسرے کے خلاف جو نفرت ہے، اُسے محبت سے دُور کر دو۔ جیسے ماں اپنے بچّوں سے پیار کرتی ہے۔ تم بھی ایک دوسرے سے پیار کرو۔ (وید)
- بُرائی کو بھلائی سے دُور کرو۔ (مہاتما تُلسی داس)
- جس طرح کھیرے کی تلخی دُور کرنے کے لئے اُس کا سر کاٹ کر نمک مِلاتے ہیں، بدزبان اور دریدہ دہن کی بھی یہی سزا ہے۔ (ہندی ادیب)
- محنت وہ سُنہری کُنجی ہے جو قسمت کے دروازے کو کھول دیتی ہے۔ (چانکیہ)
- صبر اور ایمان دونوں لازم ملزوم اور قریب قریب ہیں۔ (ماتا ریحانہ)

....

جس پر سے گزرتے ہوئے شاید تمھیں یہ احساس بھی نہ ہو کہ پتھر کے بے جان ٹکڑے کی طرح ایک دل تمھارے قدموں تلے روندا جا چکا ہے۔

میری ہمدرد!

تم نے وعدہ کیا ہے کہ میرے اُداس شب و روز کو بہلانے کے لئے مجھے خط لکھو گی اور ایک معیّن عرصہ کے بعد ملا کرو گی۔ اس یقین دہانی نے میرے دل کو قدرے ڈھارس دی ہے۔ مجھے یقین سا ہے کہ زندگی کے کسی مرحلہ پر تم مجھے مایوس نہ کرو گی اور نہ میرے اِس اعتماد کو جو مجھے تم پر ہے توڑو گی۔ تمھاری جُدائی کے بعد میں تمھیں بھول جانے کا الزام دینے کی جسارت کروں گا اور نہ تمھاری عدم توجّہی پر کوئی طعنہ دینے کی گستاخی کروں گا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں یہ میرے اپنے اعتماد کی آزمائش ہے۔

جانِ تمنّا!

تمھاری جُدائی کی سوغات قبول کرتے ہوئے میری یہ دعا ہے کہ زندگی کے ہر قدم پر کامرانی تمھاری قدمبوس ہو اور ہر سانس، ہر لمحہ تمھارے لیے نئی خوشی کا پیغام ہو!

میری آنکھیں تمھاری مدبھری آنکھوں، حسین چہرے اور خوبصورت ہونٹوں کو دیکھنے کے لئے بے چین رہیں گی۔ میرے کان تمھاری میٹھی آواز سُننے کے لئے ہمیشہ ترستے رہیں گے۔ میرے دِل اور میری رُوح میں تمھاری یاد ہمیشہ مہکتی رہے گی اور تم سے مِلنے کی تڑپ مجھے ہر دم بیقرار رکھے گی۔

میرے سکون، میری خوشی اور میری تمنّا! اب خدا حافظ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں ؎

اُنھیں اپنا نہیں سکتا مگر اِتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مُدّت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

جب میں اُسے الوداع کہہ رہا تھا تو اُسے پھُول پیش کرتے ہوئے کہا۔

"پھُول تو شاید مُرجھا جائیں، لیکن تمھاری یاد میرے دل میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ یہ نہ تو مُرجھائے گی اور نہ پھُول کی پتّیوں کی طرح بِکھر سکے گی"

اُس وقت میں نے انتہائی ضبط سے آنکھوں میں سیلابِ غم کو روکے رکھا۔ لیکن جب ٹرین لاہور پلیٹ فارم پر آہستہ آہستہ رینگنے لگی اور رفتار پکڑ کر دوڑنے لگی تو میری آنکھوں سے پانی کے دو قطرے ضبط کے باوجود بہہ نکلے۔

اُن آنسوؤں کو میں انجمن کے قدموں پر بہانا چاہتا تھا۔ لیکن میں بے بس تھا۔ یہ میری قسمت میں نہ ہوا۔ میں سمجھا اِن آنسوؤں کی اِتنی قدر و قیمت کہاں جو انجمن کے قدموں کو چھُونے کا شرف حاصِل ہو جائے۔

گھر آ کر میرا وجود تپتے صحرا کی طرح جلنے لگا۔ نڈھال ہو کر میں نے اپنا سر میز پر رکھ دیا۔ انجمن مجھ سے بِچھڑ کر جا چُکی ہے اور میں پھر اکیلا رہ گیا ہوں۔

میرے پاس کچھ نہ تھا۔ پھر بھی میں لُٹ چُکا تھا۔

شاید بدنصیبی میرا مقدر بن چُکی ہے۔ خوشی کے چند لمحات اگر پیار کی شکل میں مِلے بھی ہیں تو جلد ہی یہ خوشی بھی چِھن جاتی ہے۔ بدنصیبی کی ہر منزل نئی حسرتوں کا سندیسہ دے جاتی ہے ـــــ ہر نئی منزل پر پُرانے زخم مِلتے ہیں!!

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجیے بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھیے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی سوہنی)

غزلیں

پروفیسر ن۔ نجمی ایم۔ اے

جب میرا نشہ ٹوٹا اور آ گئی انگڑائی
نجمی! اُسی عالم میں گلشن پہ گھٹا چھائی

کیوں یاس کا ساماں ہو؟ مجھ کو مری تنہائی
میں اپنے ہی جلوؤں کا ہوں خود ہی تماشائی

کچھ زیب نہیں دیتی یہ انجمن آرائی
اک دن تجھے دُنیا ہی خود کہہ دے نہ ہرجائی

اے موت! ترے دل پہ طاری ہُوا لرزہ سا
مر مر کے بھی جینے کی جب ہم نے قسم کھائی

یہ شوق کا عالم بھی کیا طُرفہ تماشا ہے؟
اک خواب کے عالم میں دلشاد ہیں سودائی

پھر اوس پڑی دل پہ پھر سرد ہُوئے ارماں
پھر بزمِ طرب اپنی آلام نے گرمائی

وہ اپنی جفاؤں پر پچھتائے جو رہ رہ کر
خود اپنی وفاؤں پر کچھ مجھ کو بھی شرم آئی

پابندِ وفا نجمی۔ ہر حال میں سرخوش ہے
ہے وجہِ سکوں اُس کو یہ عالمِ تنہائی

سعادت نظیر ایم۔ اے

یہی ہیں آپ کے شام و سحر تو کچھ بھی نہیں
بلاتعینِ منزل سفر تو کچھ بھی نہیں

غمِ فراق، غمِ آرزو، غمِ دوراں
اگر بلند ہو ذوقِ نظر تو کچھ بھی نہیں

سوائے حسرتِ پرواز اور کیا ہے یہاں؟
درِ قفس ہے کھلا، بال و پر تو کچھ بھی نہیں

وہ داغ سینے میں جس کو چھپائے رکھا ہے
نہیں چراغ سرِ رہ گزر تو کچھ بھی نہیں

نگاہِ ناز کے کُشتوں کے ساتھ سب کچھ ہے
جدھر ہیں عقل کے مارے، اُدھر تو کچھ بھی نہیں

مری حدیثِ محبت کے سامنے اے واعظ
ترا یہ تذکرۂ خیر و شر تو کچھ بھی نہیں

گرے جو آنکھ سے آنسو ہمارے دامن پر
تری نظر میں نہیں وہ گہر تو کچھ بھی نہیں

نظیرؔ، فن سے بنائے ہزار بات کوئی
نہ ہو جو آتشِ دل تیز تر تو کچھ بھی نہیں

عرشؔ صہبائی

کیا مستیِ صہبا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں
اک کیف کا دریا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں

کیا کہیئے کہ کیا کیا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں
اک اور ہی دُنیا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں

احساسِ محبت کے کھلتے ہیں کنول جس میں
وُہ باغِ تمنّا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں

اُن نرم سی پلکوں پر بکھری ہُوئی مستی سی
ہر خواب نشیلا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں

کچھ کہیئے مگر اُس کی تفسیر نہیں ہوتی
اک ایسا بھی سپنا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں

پھر اپنی خبر کوئی اُس کو نہ ملی ہرگز
جس نے کبھی جھانکا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں

جیسے کسی وادی میں پَو پھٹنے کا منظر ہو
یُوں رنگِ تمنّا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں

اب دل کے سفینے کا اے عرشؔ خُدا حافظ
جو موج ہے دریا ہے اُن جھیل سی آنکھوں میں

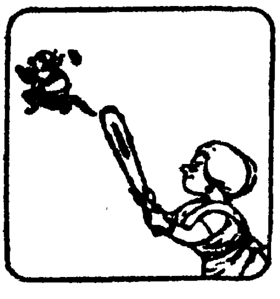
تنگ کالر سے آپ کا دم گھٹتا ہے؟

'سینفورائزڈ' کی مدد لیجئے اور مسٹر شرنک کے شکنجہ سے آزاد ہوئیے

·SANFORIZED·
REGD TD MK



آپ کی قمیص یا قمیص کا کالر دُھلنے کے بعد سکڑ کر تنگ نہ ہوگا اگر وہ ایسے سُوتی یا سُوت ملے کپڑے سے بنایا گیا ہے، جس پر 'سینفورائزڈ' کی چھاپ ہوتی ہے۔ یہ ٹریڈ مارک آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کی گارنٹی ہے۔ 'سینفورائزڈ' چھاپ والے کپڑے کو سلائی سے پیشتر پانی میں بھگونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ 'سینفورائزڈ' کا شہرت یافتہ نام بھارت میں بنے ہوئے کپڑے کی برآمد کی بڑھانے میں قابلِ قدر امداد کرتا ہے۔



رجسٹرڈ ٹریڈ مارک 'سینفورائزڈ' کے مالک کلوئیٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹیڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ایس۔اے میں قائم شدہ) نے جاری کیا۔ اس ٹریڈ مارک کا استعمال صرف اُن جانچ کئے ہوئے کپڑوں کے سلسلے میں کیا جاتا ہے یا کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جو نہ سکڑنے کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

طنزیہ

غالب کی پریس کانفرنس

محمد بدیع الزماں

ڈپٹی مجسٹریٹ۔ گیا

مکرمی خوشتر صاحب! تسلیم

"بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کا یہ پہلا اتفاق ہے۔ ایک طنزیہ فیچر "غالب کی پریس کانفرنس" (صد سالہ برسی کے موقع پر) ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید کہ اِسے اپنے موقر جریدے میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں گے ....

نیاز کیش ——— م ب زماں

غالب: (صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے) "حضرات! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اِس ناچیز کو اِس کی صد سالہ برسی کے موقع پر اِس جلسہ میں شرکت کی دعوت دی۔ جب سے دلّی چھوٹی ہے۔ میں تو ہمیشہ اپنے اِس شعر کو دُہراتا رہتا ہوں:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کیونکہ میں جہاں ہوں وہاں نہ لاسلکی ہے، نہ تار نہ ٹیلیفون۔ اِس برسی کی تقریب کی خبر حال ہی میں دلّی سے آنے والے ایک بزرگ سے ملی اور پھر آپ کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ اِس قدر دانی اور ذرّہ نوازی کے لئے میں آپ سب کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ اب آپ حضرات کو مجھ سے کچھ پوچھنا ہو تو بخوشی پوچھ سکتے ہیں۔ میں حتّی الامکان جواب دینے کی کوشش کروں گا۔"

ایک صحافی: "کہیئے، سفر کیسا رہا؟"

غالب: "کیا بتاؤں۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق!
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

تو داروغۂ جہنم کی منت سماجت کی کہ سفر طویل ہے مجھے ایک ہفتہ کی فرصت دی جائے ...."

ایک صحافی: "داروغۂ جہنم؟"

غالب: (قہقہہ لگا کر) "تو کیا رضواں کا نام لوں؟ بھئی، میں غالب ہوں اقبال نہیں۔ اپنے کئے کی سزا مجھے تو ملنی تھی۔ نماز میں نہ پڑھتا تھا۔ روزے میں نے نہ رکھے۔ شراب تو گھٹی میں پڑی تھی حج میں نے نہیں کیا۔ ایک بار بیت اللہ تک گیا بھی تو آپ جانتے ہی ہیں میری وضع داری ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

خیرات کے لئے شراب سے پیسے نہیں بچتے تھے۔ تو پھر جہنم میں نہ دھکیلا جاتا تو کیا جنت نصیب ہوتی؟"

ایک صحافی: "مگر آپ تو جیتے جی پریزادوں سے خُلد میں انتقام لینے کو کہا کرتے تھے؟"

غالب: "تمنا تو کچھ ایسی ہی تھی مگر ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

تو میں کہہ رہا تھا کہ بڑی منت سماجت کے بعد داروغۂ جہنم نے دس دس لاکھ دینار کے دو ضامنوں کی ذمّے داری پر ایک ہفتہ

کے لئے یہاں آنے کی اجازت دی۔"

ایک صحافی: "تو گویا آپ passport پر یہاں آئے ہیں! مگر اتنی بھاری رقم کے ضامن آپ کو وہاں کیسے مل گئے ؟"

غالب: "بھئی، میں پیرول ویرول تو نہیں سمجھتا۔ مگر آپ کو اتنی بھاری رقم کے ضامنوں کے مل جانے پر تعجب کیوں ہو رہا ہے ؟ یہ کوئی جنت تھوڑی ہی ہے جہاں نان جویں پر فخر کرنے والے مولوی صاحبان رہتے ہوں۔ جہنم میں تو لاکھوں کی ضمانت دینے والے کیا کروڑوں کی ضمانت دینے والے رہتے ہیں۔ یہ تو دنیا کے بڑے بڑے رؤسا، تجار، سیاست داں، بادشاہ سیٹھ، مہاجن اور کارخانہ داروں سے آباد ہے۔"

ایک صحافی: "جی، اسی لئے تو بائیبل میں بھی لکھا ہے:۔

It is easier for a camel to pass through the eyes of a needle, than for a rich man to enter the portals of heaven."

غالب: "بائبل کا ترجمہ تو میں نے بھی پڑھا ہے مگر آپ کیا کہہ گئے میں سمجھا نہیں۔"

ایک صحافی: "اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک اونٹ کے لئے سوئی کے ناکے سے نکل جانا سہل ہے ایک امیر آدمی کا جنت کے دروازوں تک پہنچنا مشکل!"

غالب: "آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی لکھا ہوگا۔ تو میری ضمانت نمرود اور فرعون نے دی۔"

ایک صحافی: "تو گویا وہاں بھی آپ شہ کے مصاحب ہی بنے پھرتے ہیں؟"

غالب: آخر میرا یہ شعر تو مجھ پر ہمیشہ صادق آتا رہا ہے اور آتا رہے گا ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

تو اجازت ملنے پر میں بذریعۂ ہوائی جہاز کلکتہ آیا اور وہاں سے ریل سے سفر کر کے دلی تک پہنچا ہوں۔ اب تو سفر کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ اگلے وقتوں میں لوگ چھکڑوں اور بیل گاڑیوں پر مسافت طے کیا کرتے تھے۔ مگر اب تو ریل کے اوّل درجہ کے ڈبے کیا ہیں جنت کے نمونے ہیں۔ گرمی کا یہ موسم مگر ڈبہ میں وہ ٹھنڈک کہ طبیعت شاد ہو گئی۔ خیال آیا کچھ اشعار موزوں کر لوں۔ مگر دیکھا کہ ڈبے میں اللہ میاں کی خفیہ پولیس کے دونوں بڑے افسر یعنی منکر و نکیر میرے سرہانے موجود ہیں جیسے ہی میں نے کاغذ پنسل اٹھایا دیکھا، وہ بھی کچھ نوٹ کرنے لگے۔ فوراً خیال ترک کیا۔ کیا معلوم پھر کونسی گستاخی سرزد ہو جائے اور جہنم سے بھی کڑی سزا میرے لئے مقرر کر دی جائے۔ دوسرے یہ بھی خیال آیا کہ ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

جب گاڑی دلی اسٹیشن پر رکی تو ڈبہ میں شور ہوا۔ "دلی آ گئی، دلی آ گئی!" میں نے اپنے ہمسفروں سے پوچھا "یہ واقعی دلی ہے کیا؟" ایک ہمسفر نے کھڑکی سے گردن نکال کر جا بجا لگے ہوئے تختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دیکھئے، ان تمام تختوں پر جا بجا "دلی" لکھا ہے۔ اب تو آپ کو یقین آیا؟ میں نے کہا۔ تختے تو دیکھ رہا ہوں۔ کیا لکھا ہے یہ آپ جانیں۔ جب آپ کہتے ہیں تو مجھے ماننا ہی پڑے گا۔" مگر دل میں یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ غالب کی دلی کا اسٹیشن نہیں ہو سکتا۔ مزید شک رفع کرنے کے لئے ایک قلی سے جو ڈبے میں آ گیا تھا پھر میں نے پوچھا "بھئی، یہ دلی ہے ؟" اس نے بھی ان ہی تختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھتے نہیں دلی لکھا ہے۔" قلی کی باتوں پر اسٹیشن کے احاطے میں ایمان لانا ضروری سا ہو جاتا ہے کیونکہ ٹرینوں کے اوقات، پلیٹ فارم کے نمبر، گاڑیوں کے دیر سویر آنے کی خبریں جتنی مصدقہ طور پر قلی سے ملتی ہیں اسٹیشن کے اہلکاروں سے پوچھے جانے پر بھی نہیں ملتیں۔ کلکتہ سے یہاں تک مجھے یہی تجربہ ہوا۔ اس لئے جب اس کی تصدیق قلی سے ہو گئی تو جھٹ اس کے سر پر سامان رکھ کر ڈبہ سے اتر گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک ہجوم "مرحبا گالب جندہ باد! مرحبا گالب جندہ باد! گالب امر ہے! گالب امر ہے!" کے نعرے بلند کرتا ہوا میری طرف آ رہا ہے۔ میں نے سمجھا کچھ ہوگا کیونکہ پلیٹ فارم پر ایسے ہی ہجوم کلکتہ سے دہلی تک بہت جگہ نظر آتے تھے۔ مگر اسی ہجوم میں سے ایک شخص جو کمپنی بہادر کے افسروں کی طرح فرنگی لباس زیب تن کئے اور گلے میں آگے عورتوں کی موباف کی طرح کچھ

لٹکائے تھا میری طرف یہ کہتے ہوئے بڑھے: "معاف کیجئے گا آپ ہی مرزا غالب ہیں؟" میں نے کہا۔ "جی، مرزا غالب تو میں ہی ہوں۔ کہیئے کیا ارشاد ہے؟" اِتنا کہنا تھا کہ مجھ پر ہار گلدستے اور پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ اُن کے اِس بے تکے سوال پر جی میں تو آیا جواب میں یہ شعر پڑھ دوں ؎

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

مگر پھر اپنی وضع داری مانع ہوئی بعد میں مجھے جلوس کے ساتھ میری جائے قیام پہلے جایا گیا۔ جب مجھ سے اُس جلسہ میں چلنے کو کہا گیا تو میں نے راستہ میں اپنے مزار پر عقیدت کے دو پھول چڑھانے کی خواہش ظاہر کی اور وہاں سے ہوتا ہوا آپ تک حاضر ہوا ہوں۔ معلوم ہوا یہ مزار حال ہی میں تعمیر ہوا ہے۔"

ایک صحافی: "وہ تو خیر منائیے کہ آپ کے مقبرہ کا پتہ بھی لگ گیا۔ ملتا کیسے؟ آپ نے تو جیتے جی یہ وصیت کی تھی ؎

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

شاید آپ بھول رہے ہیں۔ محبوب سے تو سر اُڑانے کے وعدے آپ برابر لیا کرتے تھے۔ آپ کا قتل اِس طرح واقع ہوا کہ ایک دن طیش میں آپ یہ کہتے ہوئے محبوب کی گلی میں گھس گئے تھے ؎

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

محبوب کو بھی غصہ آ گیا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ آپ کی گردن اُڑا دی اور راتوں رات آپ کی نعش کو آپ کی وصیت کے مطابق ایک نامعلوم سی جگہ پر دفن کر دیا۔ حسنِ اتفاق آپ کے مقبرہ کے نزدیک ایک پڑوسی کو اپنے مکان کی توسیع کرنی تھی اور بنیاد کی کھدائی کا کام جاری تھا کہ یک بیک کاغذ کی پھڑپھڑاہٹ کی آوازیں مزدوروں کو ملیں۔ انھوں نے جو دیکھا تو کاغذ کا ایک پلندہ ایک کفن سے لپٹا ہے۔ محلّہ والوں کو دکھایا گیا کہ اِس میں کیا لکھا ہے تو سب نے کچھ بتانے سے معذوری ظاہر کی کسی نے کہا — عبرانی زبان معلوم ہوتی ہے۔ کسی نے لاطینی کہا، کسی نے چینی۔ کسی نے کچھ، کسی نے کچھ۔ آخر محلّہ کے ایک بزرگ صورت انسان کے پاس لے جایا گیا جو محلّہ میں آثارِ قدیمہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو اُنہوں نے بتایا کہ یہ غالب کا دیوان ہے۔ لوگ اُنہیں نعش تک پکڑ لائے۔ پیچھے پیچھے محلّے کے لڑکوں کا ایک ہجوم تھا۔ اب جو نعش کے گرد سب جمع ہوئے تو کفن میں کچھ حرکت محسوس ہونے لگی۔ کسی نے کہا بھوت ہے۔ کسی نے کہا پریت

اِک چراغ اور بجھا

مہدی پرتاپگڑھی

موت نے پھر کیا حیات پہ وار
آج ہم میں نہیں نرؔیش کمار
جیتے جی بھی وہ اِک معمّہ تھا
موت بھی ہو گئی پُراسرار

شادؔ ہوتے ہوئے رہا ناشاد
ذوقِ مَے جس کو کر گیا برباد
اب کہاں ہے وہ شاعرِ خوش فکر
موت اِک اور کر گئی بیداد

ہو گیا موت سے وہ ہم آغوش
ایک رندِ تباہ، دریا نوش
بزمِ اُردو میں تھا جو نغمہ سنج
آج وہ عندلیب ہے خاموش

اب کہاں ہے وہ منفرد آواز
جس نے فن کو دیا نیا انداز
وہ کشاکش کہ گھٹ رہا ہے دَم
مر گیا نغمہ اب خموش ہے ساز

ہے! جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر اُن بزرگ کو آپ کے دیوان کے
سارے اشعار ازبر تھے۔ انہوں نے جھٹ دیوان کھولا اور اس
ثبوت میں کہ یہ نعش آپ کی ہے آپ کا یہ شعر پڑھا ؎

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

محلّے میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ غالبؔ کون بلا ہے۔ لوگ
انھیں بزرگ صورت انسان کے پاس جوق در جوق جمع ہونے
لگے تاکہ آپ کے متعلق مزید معلومات فراہم کی جائیں۔ جب
اُن بزرگ صورت کو بہت تنگ کیا جانے لگا تو وہ زیرِ لب
بار بار یہ شعر پڑھنے لگے ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

آخرش اُنھوں نے ساری باتیں بتائیں اور جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ
گئی کہ آپ اِسی دلّی کے سب سے نامور شاعر گذرے ہیں تو پھر
کیا کہنا۔ آپ کی تُربت پر چادریں چڑھائی جانے لگیں۔ چراغاں
کئے جانے لگے اور کچھ اہلِ کرم حضرات نے اسے پختہ بنوا دیا عقیدت
کا یہ عالم کہ اگر آپ نے یہ شعر نہ کہا ہوتا ؎

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تو آج اسی پریس کانفرنس میں آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرنے
والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔

غالبؔ: ”تو داستاں بہت باقی ہے (آہیں بھرتے ہوئے) ؎

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

ایک صحافی: ”کیا آپ اپنے کلام کو زندہ رکھنے کی کوئی تجویز پیش کر سکتے ہیں؟“

غالبؔ: ”کبھی مُردہ بدستِ زندہ! یہ تو آپ جانیں آپ کس طرح میرے
کلام کو زندہ رکھ سکتے ہیں ؎

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں“

ایک صحافی: ”میرے یہاں تو یہ رواج ہے کہ جب کسی عظیم شخصیت کی تعلیمات
وارشادات کو زندۂ جاوید بنانا ہوتا ہے تو ان کی پیدائش اور وفات
کی تاریخوں میں بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا جاتا ہے جلسے
کئے جاتے ہیں۔ دھواں دھار اور گرما گرم تقریریں ہوتی ہیں۔“

غالبؔ: ”تقریریں؟“

ایک صحافی: ”جی، یہ میرے یہاں سب سے بڑی انڈسٹری ہے۔“

غالبؔ: ”میں نے سمجھا نہیں۔“

ایک صحافی: یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ”صنعت“۔ اس
صنعت میں بغیر کسی پونجی اور کل پُرزے کے ایسی نادر اور عجوبۂ
روزگار اشیا تخلیق کی جاتی ہیں کہ دیکھنے والے حیرت میں رہ
جاتے ہیں۔ دوسرے دن یہ تقریریں سارے ملک کے اخبارات
میں پہلے صفحے پر موٹی سُرخیوں سے شائع کی جاتی ہیں۔ پھر
جب دوسری برسی آتی ہے تو اسی سلسلہ کو دُہرایا جاتا ہے۔“

غالبؔ: ”بہت خوب! جو آپ دوسروں کے ساتھ کرتے ہوں وہی
میرے ساتھ بھی کر سکتے ہیں کہنی بات یہ ہے کہ ؎

آبرو کیا خاک اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

ایک صحافی: ”جہنّم کے متعلق تو آپ نے کچھ فرمایا۔ اب ذرا جنّت پر بھی کچھ
روشنی ڈالنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔“

غالبؔ: (قہقہہ لگا کر) ”کیا آپ نے ابلیس کی وہ عرضداشت نہیں پڑھی جسے
اقبالؔ نے بحیثیت سرکاری وکیل کے خدائے ذوالجلال کے حضور
میں پیش کیا تھا؟

کچھ آوازیں: ”کون اقبالؔ؟“

ایک صحافی: ”چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا۔ والے اقبال تو نہیں؟“

غالبؔ: ”جی جنھوں نے ؎ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔
بھی لکھا ہے۔ وہ تو میرے ہموطن تھے۔ آپ اُن کے متعلق اِس
قدر لاعلمی کیوں ظاہر کر رہے ہیں؟“

کچھ صحافی: ”ہم میں سے کچھ اُن کے نام سے واقف ضرور ہیں اُن کا کلام
سُننے یا ایسی کسی ادبی مجلس میں شامل ہونے کا اتفاق نہیں ہوا۔“

غالبؔ: ”خیر۔ میں کہہ رہا تھا ابلیس کی عرضداشت کے متعلق آج سے
چالیس سال پہلے ابلیس نے خدائے پاک کی خدمت میں یہ لکھ
بھیجا تھا ؎

تجھ کو نہیں معلوم کہ حورانِ بہشتی
ویرانیِ جنّت کے تصوّر سے ہیں غمناک!

اور پھر خدا سے اُس نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ اُس کے عہدہ کا اب خاتمہ کر دیا جائے کیونکہ اُس کا کہنا تھا کہ ؎

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک!

خدائے قدوس نے مجلسِ انتظامیہ کی ایک غیر معمولی میٹنگ بُلا کر ایک تو ابلیس کے عہدہ ہی کو یک قلم ختم کر دیا اور دوسری طرف حوروں کی تخفیف شروع کر دی کیونکہ تیس برس سے کچھ زیادہ عرصہ ہو گیا کہ مسلمانوں میں اقبال کے سوا کسی کو جنت کا ٹکٹ نہ مل سکا۔ انتظامیہ کو اُن حوروں پر کافی خسارہ ہو رہا تھا۔ تخفیف پر کچھ جلسے جلوس نکالے گئے۔ توڑ پھوڑ کی حرکتیں بھی ہوئیں۔ کچھ املاک کی بربادی بھی ہوئی۔ ایک ہفتہ تک تو اُن حوروں نے "فقیرِ یزداں" کو گھیراؤ میں رکھا۔ آخرش صلح صفائی اس پر ہوئی کہ ایک "بے گھر والوں کے لئے گھر" کا انعقاد کیا گیا۔"

ایک صحافی: "آپ کے جانے سے یہاں Home for the Homeless کھلے ہیں؟"

غالب: "آپ جو کہتے ہوں۔"

ایک صحافی: "ویرانیٔ جنت کا یہ عالم کیوں ہے؟"

غالب: (قہقہہ لگاتے ہوئے) "جب آپ پوچھتے ہیں تو سُن ہی لیجئے۔ ایک طرف جنت کی یہ ویرانی اور دوسری طرف دوزخ کا یہ عالم کہ آدمی پر آدمی لدے ہیں۔ آبادی اِس قدر بڑھ گئی کہ ابھی حال ہی میں اُس کی توسیع کئے جانے پر بھی وہی حال ہے۔ دوزخ کی توسیع کے لئے اب مزید گنجائش نہیں اس لئے انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ جنت کے ایک خاصہ حصہ کو جو ویران ہے جہنم میں ملا دیا جائے۔ تب جا کر کچھ سہولت ہوئی ہے۔"

ایک صحافی: "آپ نے تو یہ تجویز بہت پہلے پیش کی تھی ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اُس تجویز پر بہت دیر سے عمل ہوا۔"

غالب: "مجھ سے پوچھتے ہیں تو میں تو اس خیال کا رہا کہ ؎

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے"

ایک صحافی: اقبال کے سرکاری وکیل ہونے کے متعلق آپ نے ابھی کچھ فرمایا تھا۔ کیا وہاں بھی Attorney General ہوا کرتے ہیں؟"

غالب: "آپ کا انگریزی لفظ تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر اقبال وہاں سرکاری وکیل بنے۔ مُلّا اور واعظوں سے اُن سے خوب نوک جھونک ہوا کرتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ دامنِ یزداں تک چاک کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اِس بندۂ گستاخ کا مُنہ وہاں بھی بند نہیں رہتا۔"

ایک صحافی: "تو خدا اُسے برداشت کیوں کر کرتا ہے؟"

غالب: (مُسکرا کر) خدا کو ہر وقت اقبال سے بغاوت کا خدشہ ہے۔ خفیہ پولیس اُن کے حرکات و سکنات سے خداوندِ قدوس کو برابر باخبر رکھتی ہے مبادا ؎

یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا!"

ایک صحافی: "مُلّا اور واعظوں سے کیا نوک جھونک رہتی ہے؟"

غالب: "اِن ملّاؤں اور واعظوں کو دن رات یہ شکایت رہتی ہے کہ کافروں کو حور و قصور کیوں دئے جاتے ہیں جب اِس کا وعدہ صرف مسلمانوں سے تھا۔ اقبال استغاثہ کی طرف سے یہ دلیل دیتے ہیں ؎

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

ایک صحافی: "کافروں کو حور و قصور ملنے کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ ذرا وضاحت فرمائیے"

غالب: ایک مشہور مقدمہ میں یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ ؎

مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور

اور پھر بعد میں اقبال کی صلاح سے تعزیراتِ آلٰہیہ میں یہ ترمیم کر دی گئی ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق!"

ایک صحافی: "آپ نے بھی تو اقبال سے بہت قبل کہا تھا ؎

وفاداری بشرطِ اُستواری اصلِ ایماں ہے
مرے بُتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو"

دوسرا صحافی: "کیا یہ بات صحیح ہے کہ آپ کو جہنم میں سو سال ہو گئے اِس لئے آپ کو Remission & Good Conduct ملنے والا ہے۔

غالبؔ: "میں نے یہ سوال سمجھا نہیں۔"
تیسرا صحافی: "مطلب یہ کہ دوزخ میں آپ کے اچھے اطوار کی وجہ سے
میعادِ تعذیر میں تخفیف کی جانے والی ہے؟"
غالبؔ: "بات کچھ حد تک صحیح ہے۔ میں نے ایک بار پھر خدا کے
حضور میں یہ عرضی پیش کی ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

میں نے اپنی صفائی میں یہ بھی کہا کہ رسمِ محبت کو عام کرنے میں
جتنی محنت اقبالؔ نے کی ہے اُس سے کہیں زیادہ جانفشانی
میں نے کی ہے۔ خدائے یکتا کی ذات پر جتنی حمدیں میں نے لکھی
ہے شاید اقبالؔ کی متعدد ضخیم دیوانوں میں نہ ملیں۔ اگر حالیؔ نے
اتنا کہہ دیا ہے

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

تو اللہ اپنی اداؤں پر خود فریفتہ ہو گیا پھر کیا میرا یہ شعر
حالیؔ سے کہیں بلند ہے مجھے جنت بخشی جانے کے لئے
کافی نہیں ہے

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

پھر خدا کی وحدانیت اور رسمِ محبت کے عام کئے جانے کے
ثبوت میں میں نے اپنے یہ اشعار پیش کئے ہے

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

استغاثہ کی طرف سے یہ بھی کہا گیا کہ یہ تو صرف شراب کی خاطر
جنت مل جانے کے درپے ہیں اور اس الزام کے ثبوت میں
میرا یہ شعر پیش کیا گیا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے

اِس الزام کو اور سنگین بنانے کے لئے سارے سبو پیمانے
خم، جن سے ذرا بھی شراب کی بُو آتی تھی ثبوت میں پیش کئے گئے۔"
ایک صحافی: "یعنی Exhibit کے طور پر۔"
غالبؔ: "خیر جہاں تک شراب کا تعلق تھا میں نے اپنی صفائی میں ایک عالیہ
مقدمہ کی نظیر پیش کی جہاں مُجرِم جگرؔ کی یہ خطا اِس لئے معاف کر دی
گئی چونکہ اِس جُرم کے سرزد کئے جانے کا سارا الزام انتظامیہ کے
سر تھوپتے ہوئے اُس نے یہ صفائی دی تھی ہے

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال!
در پردہ چشمِ یار کی شہہ پا کے پی گیا

یہ بات خدائے قدّوس کی سمجھ میں آئی اور اسی بنا پر اس جُرم سے
میری بھی گلو خلاصی کی گئی۔ باقی الزامات کی صفائی میں میں نے
رحم کی درخواست دیتے ہوئے کہا ہے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہئے"

ایک صحافی: "یعنی Mercy Petition؟"
غالبؔ: اُدھر حاضرین چٹکیاں لے رہے تھے ہے

دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

سب کچھ سننے کے بعد رحمت جوش میں آئی۔ سارے سبو پیمانے
خم جو جمع کئے گئے تھے توڑ دینے کا حکم صادر ہوا اور میرے
متعلق یہ فیصلہ صادر کیا گیا کہ "غالبؔ کی ساری خطائیں معاف کی
جاتی ہیں اور انہیں جنت کا منتظمِ اعلیٰ بنایا جاتا ہے۔" فیصلہ سُننا تھا
کہ اقبالؔ میرا یہ شعر پڑھتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے ہے

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

فیصلہ میرے واپس جانے پر عمل میں آئے گا۔"
بہت سی آوازیں: "مرحبا! مرحبا! مرحبا!"
ایک صحافی: "تب تو اقبالؔ کے ایک قریبی رشتہ دار جوہرؔ نے ٹھیک ہی کہا تھا ہے

اُس کی رحمت کو تو خود درکار ہے عذرِ گناہ
لے کے پھر زاہد کا عذرِ بے گناہی کیا کروں

غالبؔ: "خوب کہا ہے!"
ایک صحافی: "ایک سوال اور۔ کیا جہنم Dry ہے؟"

غالب: "کیا مطلب ہے"

دوسرا صحافی: یعنی کیا وہاں نشہ بندی ہے؟"

غالب: (قہقہہ لگاکر) ؎

"غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں"

ایک صحافی: "کیا وہاں بھی smuggling جاری ہے؟"

غالب: "ذرا سوال واضح کریں۔"

دوسرا صحافی: "یعنی کیا ممنوعہ چیزیں چوری چھپے وہاں بھی پہنچ جاتی ہیں؟"

غالب: "(مسکراتے ہوئے)۔ آخر وہاں بھی تو اسی دنیا کے انسان جاکر بسے ہیں۔ اسمیں تعجب کی کیا بات ہے؟"

ایک صحافی: "یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ وہ سارے خم و سبو وغیرہ جو توڑے گئے اُن کا کیا ہوا؟"

غالب: "آپ نے طویل بحث چھیڑ دی۔ اُن گیلی مٹیوں سے روزِ ازل جو کام لیا گیا تھا اُس کے متعلق تو اقبال نے آپ کو بتا ہی دیا ہے کہ ؎

پھر اُن اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

وہی مصرف اُن کا اب بھی لیا گیا اور لیا جاتا رہے گا۔"

ایک صحافی: "اب آئندہ کیا پروگرام ہے؟"

غالب: "بس اپنے مسکن کو واپس! دو چار روز دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور حیدر آباد کی ادبی صحبتوں میں شریک ہونے کا ارادہ ہے۔ ذرا شعر و شاعری کے کچھ چرچے تو دیکھ لوں۔ پھر کب آنا ہو۔"

کئی آوازیں: "اِن شہروں میں تو اب شعراء کے بدلے گیدڑ بولتے ہیں۔ شاعر تو سب بمبئی کو سدھارے۔ جہاں وہ سینما کمپنیوں کے لئے گیت اور گانے لکھتے ہیں اور مکالمے بھی۔ آپ تو پامال دلی کی بوسیدہ گلیوں کے متعلق محجوب ہیں یہ کہہ کر خوش فہمی پیدا کرتے تھے ؎

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اِس قدر آباد نہیں

اب ذرا بمبئی کے "میرین ڈرائیو" اور "جوہو بیچ" کے نظارے دیکھئے تو جنت کے منتظمِ اعلیٰ کا منصب چھوڑ کر آپ اِس پر اُتر آئیں گے ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

غالب: "یا میرے اللہ! یہ شاعر گیت کب سے لکھنے لگے؟ اگلے وقتوں میں تو بھانڈ لکھا کرتے تھے۔ اور شاعروں کو مکالمے سے کیا نسبت!"

ایک صحافی: "تو پھر اُنھیں دو وقت کی روٹی کہاں سے میسر ہو۔ آپ کب کی باتیں کر رہے ہیں۔ معاف کیجیے گا ؎

نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سُنا رہے ہیں"

غالب: "یہ گیت آخر موزوں کیونکر ہوتے ہیں؟"

ایک صحافی: "بمبئی میں دُھن تیار کرنے والی بہت سی کمپنیاں ہیں۔ یہ اُن کی تیار کی ہوئی دُھنوں پر الفاظ بٹھاتے ہیں۔ اسی طرح جس طرح حالی نے کہا تھا کہ شاعر پہلے قافیہ منتخب کرتے ہیں تب اُس کی مناسبت سے شعر وضع کرتے ہیں۔"

غالب: "تو پھر عروض کی پابندی کیوں کر قائم رہتی ہے؟"

ایک صحافی: "عروض تو دُھنیں تیار کرتی ہیں۔ دیکھئے ایک مشہور فلم کا جو بمبئی کے ایک سینما میں پچھلے پانچ برسوں سے لگاتار چل رہی ہے یہ گانا جسے طاہر چند ھیالوی نے رقم کیا ہے۔ یہ دوگانا ہے:-

اداکار "ار... ری گوری، بانکی چھو... ری۔ تری چھب لگی پیاری
.... ار.... ری گوری"

اداکارہ "ار ... رے گورے، بانکے چھو.... رے۔ میں تجھ پر
گئی وا... ری ... ار ... رے گورے"

اداکار "آئیں، آئیں۔ آئیں"

اداکارہ "ٹائیں، ٹائیں، ٹائیں"

اداکار "ار.... ری ... گوری .... ذرا سٹ جا"

غالب: "لاحول ولاقوۃ!"

کچھ صحافی: (دبی زبان سے آپس میں) "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو!"

پہلا صحافی: (گانا جاری رکھتے ہوئے)

اداکار "ار ... ری ... گوری .... ذرا سٹ جا"

اداکارہ "ار.... رے .... گورے .... نا با نا.... تھوڑا ہٹ جا"

اداکار "ہائے میری جا....ن"

اداکارہ "میں تجھ پر قربا...ن"

اداکار "ہوئے، ہوئے، ہوئے"

اداکارہ "سوئے، سوئے، سوئے"

غالب: "کیا بک رہے ہیں آپ لغویات یا خدایا میں کہاں ہوں!"

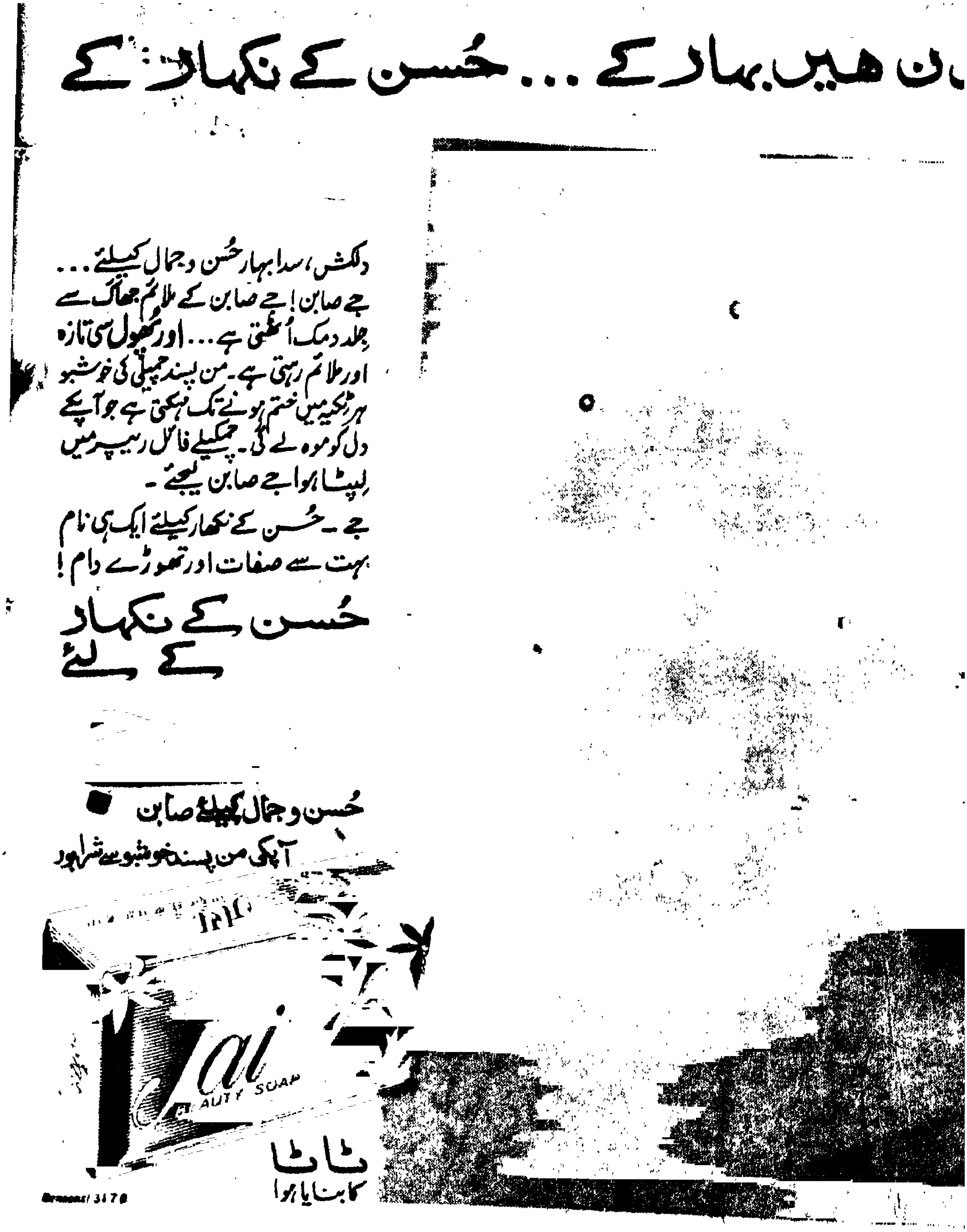
ہیکسمانی: "آپ اسے لغویات کہتے ہیں۔ یہ تو گیت بھی ہے اور غزل بھی۔ قافیہ ردیف کا التزام الگ ہے۔ حقیقت، سادگی اور جوش الگ ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ الفاظ ہیں جیسے کوئی چلتی ہوئی سواری ترنم تغزل، نادر تشبیہ و استعارہ، رمز و ایما کیا اس میں نہیں۔ یہ گیت تو اسکول اور کالج کے نصاب میں شامل کیا جا چکا ہے۔ کتنی جگہ طلبا نے امتحان کی تاریخ اِس فلم کو دیکھنے کے لئے بڑھوائی ہے۔ ریلوے ٹرینوں کو روک کر رکھا جاتا ہے۔ یہ مقبولیت کئی اور شاعروں کو نصیب ہے جیسے زخمی بادشاہ پوری، سیفی کاظمی، وکیل خدا نونی۔"

غالب: (سراسیمگی کے عالم میں) "ذرا گلاس میں پانی لائیے۔ مجھ پہ کچھ غشی کی سی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔ (کچھ وقفہ کے بعد)۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ وقت کافی ہو گیا ہے۔ مجھے خوشترگرامی کے یہاں عشائیہ میں شامل ہونا ہے۔"

اچھا! خدا حافظ ——

پھر ملیں گے اگر خدا لایا"

کچھ آوازیں: "جے ہند"


ن ھیں بہار کے ... حُسن کے نکھار کے
دلکش، سدابہار حُسن وجمال کیلئے ...
جے صابن! جے صابن کے ملائم جھاگ سے
جلد دمک اُٹھتی ہے ... اور پھول سی تازہ
اور ملائم رہتی ہے۔ من پسند چمپئی کی خوشبو
ہر ٹکیہ میں ختم ہونے تک مہکتی ہے جو آپکے
دل کو موہ لے گی۔ چمکیلے فائل ریپر میں
لپٹا ہوا جے صابن لیجئے۔
جے ۔ حُسن کے نکھار کیلئے ایک ہی نام
بہت سے صفات اور تھوڑے دام!
حُسن کے نکھار کے لئے
حُسن وجمال کیلئے صابن
آپکی من پسند خوشبو سے شرابور
BEAUTY SOAP
ٹاٹا
کا بنایا ہوا

افسانہ

گمشدہ فردوس

مس نیلوفر نسرین ایم۔ اے

صباحت ہاؤس سرکٹ ہاؤس روڈ (کیمپ) امراؤتی

بزرگِ محترم! گلہائے عقیدت

ایک عرصے سے "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کی تمنا تھی۔ اپنی چھوٹی بہن نگہت ریحانہ کے اصرار پر ایک کہانی پیشِ خدمت ہے۔ آپ کی شفقتوں سے ناامید نہیں ہوں۔ اگر اس کہانی کو آپ نے شرفِ قبولیت بخشا تو ادب کے افق پر ایک اور ستارہ چمک اُٹھے گا۔ آپ نے مایوس کر دیا تو شاید یہ میری پہلی اور آخری کہانی ہو! ....

خلوص کیش ——— نیلوفر نسرین

★

"ہائے ماشی تو کتنی نکھر آئی ہے شادی کے بعد!"

اور اگلے ہی پل آپا نے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ جیسے میں کوئی گڑیا تھی۔ ننھی منّی سی بچّی تھی جسے ماں فرطِ محبت سے اپنی آغوش میں بھر لیتی ہے۔ ویسے بھی آپا کی آغوش میرے لئے ماں کی آغوش سے کم نہ تھی۔ اسی آغوش سے میں نے حقیقی ماں کا پیار پایا تھا، ورنہ ماں کی محبت تو مجھ سے اُسی وقت چھن گئی تھی جب میں اس پیار کے معنی جاننا تو دُور رہا۔ اس کا احساس بھی نہ کر سکتی تھی۔ میں نے تو آپا ہی کی گود میں سب کچھ پا لیا تھا۔ اس کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں ——— البتہ اتنا ضرور سُنا ہے بلکہ مجھے شدّت سے اس بات کا احساس دلایا گیا ہے کہ میرے وجود نے ہمیشہ دوسروں سے روشنی لے کر اندھیرے دیئے ہیں۔ میری پیدائش سے پہلے ہمارا گھر بھرا پُرا تھا۔ میرے وجود نے گھر میں جنم لیتے ہی تمام روشن چراغوں کو ایک ایک کر کے بجھا دیا۔ صرف ایک بھائی تھا وہ بھی بچپن ہی میں لاپتہ ہو گیا تھا۔ میری بدنصیبی کے اندھیروں کو اپنانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ قریب تھا کہ اپنی نحوست کا میں خود ہی شکار ہو جاتی کہ آپا نے ان اندھیروں میں اپنے پیار کی جوت جگائی اور پھر اس روشنی کے سہارے میں نے زندگی کی کتنی ہی منزلیں طے کر لیں۔ نہ جانے کہاں کہاں سے آپا نے پیار کا یہ خزانہ سمیٹ سمیٹ کر جمع کیا تھا۔ جو بے دریغ مجھ پر نچھاور کر دیا۔ اُن کے پیار کی شبنم نے میرے وجود کے گرد لپٹی نفرت کی چنگاریوں کو بجھا دیا اور مجھے اُن کے پیار کی ٹھنڈی اور گھنیری چھاؤں میں سکون مل گیا۔ اُنھوں نے بہن سے بڑھ کر ماں کا پیار مجھے دیا۔ حالانکہ اُس وقت اُن کی عمر سولہ، سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔

جب میں آپا کے گھر آئی۔ اُس وقت میری عُمر صرف چھ سال تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دس برس بیت گئے۔ میں آپا کی زندگی کا ایک اہم جُز بن گئی۔ ان دس برسوں میں کبھی میں آپا کو سمجھ نہ سکی وہ میرے لئے ایک پہیلی تھیں۔ اکلوتی تھیں۔ چچا چچی اُنھیں بے حد پیار کرتے تھے۔ اُنھیں کے اصرار پر وہ مجھے اپنے گھر لائے تھے۔ اُن کی بے شمار دولت کی مالک آپا ہی تھیں۔ وہ گھر میں باوقار ملکہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سب کی آنکھوں میں اُن کے لئے احترام تھا۔ سب ہی اُن کے گرویدہ تھے۔ یہ سب تھا پھر بھی عجیب بات تھی کہ آپا کو میں نے کبھی خوش نہ دیکھا۔ وہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتیں۔ پہروں خلاؤں میں گھورتی رہتیں۔ کوٹھی میں کبھی اُن کے قہقہے نہ گونجتے، نہ کبھی اُن کی تیز آواز کی گونج سنائی دی۔ وہ سمندر کی سطح کی طرح بظاہر پُرسکون تھیں۔ جس کی تہہ میں ہزاروں لہریں پوشیدہ رہتی ہیں۔ لے دے کے ایک میں ہی اُنکی خوشیوں کا مرکز تھی۔ میں نے محسوس کیا جیسے اُن کے دل کی پنہائیوں میں کوئی گہرا زخم ہے جسے اس دنیا سے اُنھوں نے چھپائے رکھا ہے۔ لیکن جس کی خلش ہر وقت اُنھیں بے چین رکھتی ہے۔

"ہائے اللہ! اس چاند میں یہ داغ کہاں سے لگ گیا؟ میں تخیلات کے

بھری محفل میں ٹھٹھے لگاتی۔ لیکن پھر بھی آپا میرے لئے ایک سوالیہ نشان ہی رہتیں۔ ایک پہیلی جس کا مجھے حل نہ ملتا۔

سادگی حسن اُن کا خاص وصف تھا۔ گہرے اور شوخ رنگوں سے اُنھیں وحشت ہوتی۔ پھیکے رنگ اُنھیں بہت پسند تھے۔ میں نے اُنھیں کبھی سفید اور سیاہ کپڑے پہنے نہیں دیکھا۔ مجھ سے ہمیشہ کہتیں۔

"عاشی! تو یہ سفید اور سیاہ کپڑے نہ پہنا کر۔ یہ بیواؤں کا لباس ہے۔ مجھے وہم آتا ہے"

مجھے حیرت ہوتی جب آپا کو بیوگی سے اتنا خوف ہے تو وہ شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ بیواؤں کی سی ویران زندگی کیوں گذار رہی ہیں۔ اُن کی طبیعت کا یہ تضاد میرے لئے ایک معمہ تھا۔ ایک اور عجیب بات میں نے محسوس کی آپا کو چاندنی سے بے حد نفرت تھی۔ چاندنی راتوں میں وہ ہمیشہ اپنے کمرے کے دروازے اور دریچے بند کر کے اُن پر دبیز پردے پھیلا دیتی۔ سرِ شام ہی کمرے میں بند ہو جاتیں۔ اُن کے کمرے میں ہمیشہ میں نے نیلے اور سبز رنگ کی روشنی دیکھی۔ پیلی روشنی سے اُنھیں بے حد نفرت تھی۔ شاید اس لئے کہ چاندنی کا رنگ بھی یہی ہوتا ہے۔ پوری کوٹھی میں سفید ٹیوب لائیٹ اور نیلے اور سبز قمقمے نظر آتے۔ میں نے جب بھی پوچھا۔ ہمیشہ یہی جواب ملا۔

"عاشی! مجھے اندھیروں سے پیار ہے، دُھندلکے مجھے پسند ہیں!

اپنی شادی کے ذکر ہی سے آپا کو چڑ تھی۔ کسی میں ہمت نہ تھی جو اِس موضوع پر اُن سے گفتگو کر سکتا۔ اچھے اچھے پیغامات لوٹا دیئے گئے۔ میری شادی کا اُنھیں بہت ارمان تھا۔ ہمیشہ کہتیں۔

"عاشی! تیری شادی میں اسی شہر میں کروں گی۔ تاکہ تُو میرے پاس رہے۔ تجھ سے الگ ہونے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ تو ہی میری ساری خوشیوں کا مرکز ہے۔ تُو چلی گئی تو میرے سوگوار اندھیروں میں کون آنا پسند کرے گا!"

اب تک میں آپا ہی کے کمرے میں رہتی تھی۔ لیکن اِدھر کچھ دِنوں سے اُنھوں نے میرا الگ کمرے میں انتظام کر دیا تھا۔ میں نے احتجاج کیا تو بہت پیار سے کہنے لگیں۔

"عاشی! تُو بہت بھولی ہے۔ اِس عمر میں لڑکیاں عجیب و غریب خواب دیکھتی ہیں۔ کچی عمر کے کچے خواب! وہ چاہتی ہیں۔ اِن خوابوں کی بھنک کسی تک نہ پہنچے۔ کچے ہوتے ہیں نا؟ ٹوٹ جانے کا ڈر رہتا ہے۔ تُو نے بھی عمر کے اُس خوشگوار موڑ پہ قدم رکھا ہے۔ جہاں دل اپنی ہی دھڑکن کی آواز پر شرما جاتے ہیں کسی کی نظروں کو اپنے سراپا پر پھیلتی محسوس کر کے جسم لرز اُٹھتے ہیں۔ جذبات کی حدت سے رُخسار تمتما اُٹھتے ہیں۔ پلکوں کی چلمنیں آپ ہی آپ گر جاتی ہیں۔ دل میں عجیب سے نامعلوم جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ کسی کا ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ کسی کو اپنا لینے کو دل مچل اُٹھتا ہے۔ تخیلات کا ایک بحر بے پایاں ہوتا ہے۔ اُن سوچوں میں ڈوب کر اُبھرنے کو دل نہیں چاہتا"

آپا بہت خوابناک لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ جیسے جاگتے میں کوئی سہانا سپنا دیکھ رہی ہوں۔ جیسے اپنے ماضی کو آواز دے رہی ہوں۔

"تو بھی ایسے ہی خواب دیکھتی ہوگی عاشی! میں تیرے خوابوں میں مخل ہونا نہیں چاہتی"

اُن لمحوں کے سحر سے میں بھی بچ نہ رہ سکی اچانک میں پوچھ بیٹھی۔

"آپا! آپ نے بھی ایسے خواب دیکھے ہیں؟

سحر ابھی ٹوٹا نہ تھا۔

"ہاں عاشی! میں نے ایسے خواب دیکھے تھے"

"اُن کی تعبیر!"

میں اُن سحر زدہ لمحوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی۔ رُکتے رُکتے میں نے پوچھ ہی لیا شاید آج اِس پہیلی کا حل مِل جائے۔

"تعبیر! ہر خواب کی تعبیر ضرور ہوتی ہے۔ لیکن سارے خوابوں کی تعبیر ایک سی نہیں ہوتی۔ یہ خواب بہت بے رحم ہوتے ہیں عاشی! یہ سب کا ساتھ نہیں دیتے۔ جو حقیقت کا رُوپ دھارلیں وہی خواب اہم ہوتے ہیں۔ ورنہ اُن کی حیثیت ایک سُراب سے زیادہ نہیں۔ اور پھر میرے خواب! میں نے تو ہمیشہ ادھورے سپنے دیکھے ہیں۔ میرے خواب شبنم کے قطرے تھے۔ جو سورج کے اُجالے میں اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں۔ پانی کے بُلبلے تھے۔ جو پانی کی سطح پر اُبھر کر پھر اُس کی گہرائیوں میں دَم توڑ دیتے ہیں۔ دل کے شیشے کی مانند تھے۔ جو احساس کی ہلکی سی ٹھیس بھی برداشت نہ کر سکے بیوہ کی چوڑیاں تھے جن کا مقدر ہی ٹوٹنا ہے"

اچانک سحر ٹوٹ گیا۔ آپا چونک پڑیں۔

"میں نے کچھ تجھے بتا تو نہیں دیا عاشی؟"

وہ گھبرا گئیں۔ پھر میری محویت دیکھ کر جھلا گئیں۔

"نہ جانے میں کیا کیا بک گئی۔ لیکن تُو اِس طرح کیوں سُن رہی ہے۔ جیسے میں بہت سمجھداری کی باتیں کر رہی تھی" اُنھوں نے مجھے ڈانٹ دیا اور

پھر بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ جیسے اتنا کچھ کہہ کے پچھتا رہی ہوں۔ لیکن اب تو وہ کہہ چکی تھیں۔ جس طرح بیتا لمحہ واپس نہیں آسکتا، اُسی طرح اُس لمحے میں کہی جانے والی بات کبھی واپس نہیں آ سکتی۔ اُس لمحے میں رُونما ہونے والے حالات اور واقعات پلٹ کر نہیں آ سکتے۔ اُسی طرح ہم اپنی قوتِ متخیّلہ سے ماضی کو یاد تو کر سکتے ہیں۔ لیکن اُس کے وجود کو مِٹا نہیں سکتے۔ آپا کی بے بسی پر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں خود پہ قابو نہ پا سکی۔

"اپنے آپ کو پہیلی نہ بنائیے آپا! اِللہ! مجھے تو کچھ بتائیے۔ مجھ سے یہ پردہ کیوں۔ آپ نے میرے دامن میں خوشیوں کا جو گلشن سجا دیا ہے۔ کچھ خوشیاں اپنے لئے بھی رکھ لی ہوتیں۔ یا پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کی آنکھوں میں مُسکراہٹوں کے کنول کھلا سکوں۔ مجھے اپنے زخموں کا مرہم بنا لیجئے۔ ورنہ میرے اپنے زخم ناسُور بن جائیں گے!"

آپا کی درد و کرب میں ڈوبی آواز اُبھری۔

"تو سدا کی پگلی ہے۔ گلشن میں خزاں و بہار کے دور تو آتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن سبھی جانتے ہیں۔ ایک بار مُرجھا کر کوئی پھول پھر نہیں کھِلتا۔ پھر میرے دل پر تو خزاں کا اتنا شدید حملہ ہوا ہے کہ وہ پتھر کی طرح بے جان ہو کر رہ گیا ہے۔ میرے دل کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ وہ بہار کے رنگ کیا جانیں۔ خزاں بیک وقت ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی۔ کہیں خزاں رہتی ہے۔ کہیں بہار آجاتی ہے۔ لیکن کسی کی خزاں کے غم میں کوئی اپنی بہاریں نہیں لُٹا دیتا۔ تُو اپنے ہرے بھرے چمن میں میرے غم کے کانٹے کیوں بچھانا چاہتی ہے۔ بہار مختلف رُوپ میں سب کی زندگی میں آتی ہے۔ کسی کی خوشیوں پہ بہار رہتی ہے۔ میرے غم سدا بہار ہیں۔ یہی ہنستا مُسکراتا غم میرے دل کی دھڑکن بن چکا ہے۔ یہ دھڑکن بند ہو جائے گی تو میرا وجود ہی کہاں باقی رہیگا۔

اُن کی آواز گلو گیر ہو گئی۔ وہ خاموش ہو گئیں۔

اُف! اِتنا درد! آپا نے اپنے دل میں کیا کچھ چھُپا رکھا ہے! کوشش کے باوجود میں اُن کے دل میں جھانک نہ سکی۔

اُس کے بعد آپا نے کبھی اِس موضوع پر مجھ سے بات نہ کی۔ زندگی یونہی گذر رہی تھی کہ آپا کی بظاہر پُر سکون زندگی میں طوفان آ گیا۔ اِس کا سبب میں ہی تھی۔ میری خوشیاں ہمیشہ ہی دوسروں کو غم دیتی آئی ہیں۔ اِس بار بھی یہی ہوا —— ایک دن اچانک نجانے کہاں سے میرے بھائی جان پھر میری دنیا میں لَوٹ آئے۔ میں خوشی سے پاگل ہو گئی۔ میری خوشیوں نے آپا کو غم سے نڈھال کر دیا۔ اُن کی خوشیاں اُن کے ہاتھوں سے چنچل تتلی کی طرح اُڑ گئیں۔ وہ حیرت سے انھیں تکتی رہ گئیں۔ بھیّا مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر مُصر تھے۔ آپا مجھے اپنے پاس رکھنے پر بضد تھیں۔ میں عجیب کشمکش میں تھی۔ آپا کے غم نے میری خوشیوں کو نگل لیا تھا۔ نہ جانے خوشی کے ساتھ یہ غم کیوں چُپکے سے چلے آتے ہیں۔ اور پھر میرا وجود....

یا اللہ! میں کبھی کسی کو خوشی بھی دے سکوں گی یا نہیں۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگی۔

آخر بھیّا مجھے اپنے ساتھ لے ہی گئے۔ آپا کے خواب ایکبار پھر ٹوٹ گئے۔ میں نے بھیّا کی بے ربط زندگی کو چھوٹی سی جنّت میں بدل دیا۔ پھر اِس جنّت میں اِک فرشتے نے قدم رکھا۔ ایک دن بھیّا ظفر کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ بہاریں اتنی سُرعت سے میرے قریب آئیں کہ میں گھبرا گئی! دل نے کہا۔

"یا اللہ! میں اِتنی خوشیوں کا بوجھ سہار بھی سکوں گی یا نہیں!

چند ماہ بعد اچانک ہی بھیّا کا فارن جانے کا پروگرام بن گیا۔ میں نے سوچا شاید وہ مجھے پھر آپا کے پاس چھوڑ دیں۔ لیکن اُنھوں نے مجھے ظفر کی دُلہن بنا دیا اور خود چلے گئے۔ یہ سب کچھ اِتنی جلد ہوا کہ میں آپا کو بھی خبر نہ کر سکی۔ اور پھر میں کیسے یہ سب اُنھیں بتاتی۔ آپا کی محرومی پر میرا دِل رو اُٹھا۔

بیچاری آپا! میرے لئے جیون ساتھی تلاش کر رہی ہوں گی لیکن کیا میں ظفر کے مضبوط بازوؤں کے حلقے سے نِکل پاؤں گی لیکن میں خود کہاں نکلنا چاہتی ہوں۔ میں تو چاہتی ہوں زندگی کی آخری دھڑکنوں تک اِس حلقے سے نکل نہ سکوں۔ میں نے ہمّت کر کے خط سے اُنھیں شادی کی اطلاع دے دی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد میں نے آپا سے ملنے کی ضد کی۔ ظفر تو نہ آسکے مجھے بھیج دیا۔ آپا کو تو جیسے کھوئی ہوئی جنّت مل گئی۔ وہ رات ہم نے ایک ہی بستر پر جاگ کر گذاری۔ آپا کا بس چلتا تو وہ پلک بھی نہ جھپکاتیں۔ رات ہم زمانے بھر کی باتیں کرتے رہے۔ آپا ظفر سے ملنے کے لئے بے چین تھیں۔ میں نے اُنھیں اطمینان دلایا کہ وہ مجھے لینے آئیں گے تب مل لیجئے گا۔ وہ بہت ناراض ہوئیں کہ میں اُن کی تصویر کیوں نہ لائی۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہوتے میری آنکھ لگ گئی۔ بارہ بجے سو کر اُٹھی تو دیکھا آپا کا بستر خالی پڑا ہے۔ چادر پہ ہلکی سی شکن بھی نہ تھی۔ شاید وہ ساری رات نہ سوئیں۔ اِس بجت پر میرا دل

پھر آیا۔ منہ ہاتھ دھوکر ڈائیننگ روم میں آئی تو میز پر طرح طرح کے پکوان سجے تھے۔ آنسو میری پلکوں تک آگئے۔ کچن میں گئی تو دیکھا۔ آپا پریشان سی ادھر اُدھر دوڑ رہی ہیں۔ اُن کے خوبصورت صبیح چہرے پر بال بہت بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے، اور پسینہ سے رُخساروں پر چپک سے گئے تھے۔ ہاتھوں پر آٹا اور کوئلے کی سیاہی لگی ہوئی تھی۔ ساڑی پر جگہ جگہ دھبے تھے اُس وقت آپا مجھے بہت پیاری معلوم ہوئیں میں اُن سے لپٹ گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"آپا! آپ ساری رات نہ سوئیں۔ دیکھئے! آپ کی آنکھیں کتنی سُرخ ہو رہی ہیں۔ یہ کیا حالت بنالی آپ نے آپ کی یہی حالت رہی تو میں آج ہی چلی جاؤں گی۔"

- ایمان دار تاجر کا درجہ عابد سے بلند ہے۔ (حضرت امام شافعیؒ)
- جو خدا سے ڈرتا ہے اُس سے سب ڈرتے ہیں۔
(حضرت فضیل بن عیاضؒ)
- جس کا غصہ زیادہ ہوگا اُس کے دوست کم ہوں گے۔
(حضرت فضیل بن عیاضؒ)
- ایک عداوت کے بدلے میں دو ہزار دوستیاں نہ خریدو۔
(حضرت امام شافعیؒ)
- نیک بخت وہ ہے جو نیکی کرتا ہے، اور ڈرتا رہے۔
(حضرت بایزید بسطامیؒ)

اُنھوں نے گھبرا کر میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا نہ کہو عاشی! آتے ہی جانے کی باتیں کرنے لگیں۔ دو گھڑی تو مجھے خوش ہو لینے دو۔ ابھی سے جانے کا ذکر کر کے میرا دل نہ دُکھاؤ!"

اُن کے خلوص نے میری زبان بند کر دی۔ سارا دن انھیں مصروفیات میں گذر گیا۔ شام ہوتے ہی میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور میں جلد ہی تھک کر سو گئی۔

کوئی دو بجے پتہ نہیں کیسے میں جاگ پڑی، اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ آپا ابھی تک سوئی نہ تھیں۔ وہ کرسی پر بیٹھی رائٹنگ ٹیبل پر دونوں کہنیاں ٹکائے جھکی ہوئی تھیں۔ میں اُٹھی اور دبے پاؤں چلتی اُن کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ میری آہٹ پر وہ چونک پڑیں، بہت سُرعت سے اُنھوں نے دراز میں کچھ ڈال دیا اور اگلے ہی پل اُسے مقفل کر کے میری طرف مُڑیں۔ میں صرف اِتنا ہی جان پائی کہ وہ کسی کی تصویر تھی۔ میں نے اُن کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور ملتجی نظروں سے اُنھیں دیکھنے لگی اور پھر نہ جانے کیسے میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا!

"آپا! آپ کو اِس تصویر کی قسم جو آپ نے ابھی چھپائی ہے مجھے بتا دیجئے!"

"عاشی!" اُن کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔

"دیکھئے آپا! کسی کی قسم کو جھوٹا نہیں کرتے ورنہ ....!"

اُنھوں نے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُن کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ لب ہلے۔

"آگے کچھ نہ کہنا عاشی! اللہ کرے میری عمر اُنھیں لگ جائے!"

پھر اچانک جیسے وہ کراہ اُٹھیں۔ اُن کی پلکوں پر شبنمی قطرے چمک اُٹھے۔ میں نے اُن موتیوں کو اپنے آنچل میں لے لیا۔ اچانک وہ مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پڑیں۔ جیسے آج رو کر پھر کبھی نہ روئیں گی۔ جب آنکھیں برس چکیں۔ بادل چھٹ گئے۔ تب میرے اصرار پر وہ پُرسوز آواز میں کہنے لگیں۔

"آج تو نے مجھے مجبور کر دیا عاشی! ورنہ شاید یہ راز میرے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جاتا۔ عرصہ ہوا میں نے تجھ سے اپنے خوابوں کا ذکر کیا تھا۔ آج اُنھیں خوابوں کو اک لڑی میں پرو کر ایک کہانی بنا رہی ہوں تیرے لئے تجھے سُنانے کے لئے۔ پھر اُنھوں نے اپنے صحیفۂ حیات کے سارے اوراق میرے سامنے اُلٹ دئے۔ کتنی پر درد تھی اُن کی داستان۔ میری آنکھیں بار بار چھلک پڑیں۔ وہ رُک جاتیں اور پھر اپنی زندگی کا ہر واقعہ تفصیل سے بتانے لگتیں، اور جب وہ اُس موڑ پر آئیں جہاں سے اُن کی زندگی کا المیہ شروع ہوتا تھا تو اُن کی آواز تلخ ہو گئی۔

"اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے عاشی! کبھی کبھی ماں باپ بھی اولاد کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ خزاں سے کیا شکوہ کروں۔ مجھے تو اپنی بہاروں نے لُوٹا ہے۔ میرے اپنوں نے مجھے اتنے غم دئے کہ غیروں سے کوئی گلہ نہ رہا۔ میں نے محبت کی تھی۔ کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ یہ تو دِل کے معاملے ہیں۔ اِنھیں دل ہی طے کرتے ہیں۔ اِس میں ہمارا کیا قصور ـــــ یہ ہماری نادانی تھی جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم دونوں کے درمیان خاندانی دشمنی کی آہنی دیوار ہے ایک دوسرے کے ہو بیٹھے ـــــ ایک معصوم لمحے میں ہم دونوں نے سوچا شاید ہمارا ملاپ اِس آہنی دیوار کو گرا دے۔ اور پھر اُسے عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ اور ایک

رات۔ چاند کو گواہ بنا کر ہم نے زندگی کی آخری دھڑکنوں تک ساتھ دینے کی قسمیں کھالیں۔ جیون ساتھی بن گئے اور پھر اُس وقت تک کے لئے جدا ہو گئے جب تک خاندانی اختلافات دُور نہیں ہو جاتے۔ لیکن شادی کا مُقدس بندھن بھی اُس نفرت کی دیوار کو توڑ نہ سکا۔ فاصلے گھٹنے کی بجائے بڑھتے ہی گئے۔ ہمارے پیار کی مہک جب امّی اور ابا تک پہنچی تو میرا کالج جانا بھی بند ہو گیا۔ مجھ پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ میرا راز میرے سینے میں دفن ہو گیا۔ میں نے اپنی زبان بند کر لی۔ میرے اِس ایثار سے امّی، ابا دونوں! بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے میری شادی کر دینی چاہی یہ کیسی دنیا ہے عاشی! جہاں ایک دُلہن کو اُس کے شوہر کی زندگی میں دوسری شادی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ چاند بھی تو گونگا تھا اُس نے سب کچھ دیکھ کر بھی اپنے ہونٹ سی لئے۔ مجھے چاندنی سے نفرت ہو گئی۔ جس کے اُجالوں میں مَیں نے اپنا پیار کھو دیا۔ آخر تھک ہار کر سب نے میری شادی کا ارادہ ترک کر دیا۔ مجھے ناہید سے اُن کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ خطوط بھی آتے رہے۔ پھر ناہید کی شادی ہو گئی اور ایک اُن کے خطوط آنے بند ہو گئے۔ لیکن مجھے اُن پر اَب بھی بھروسہ ہے۔ غم واندوہ کی آندھی بھی میرے اعتماد کی دیواروں کو ہِلا نہ سکی۔ ہم نے ہمیشہ ایک دوسرے کا ہو کر رہنے کی قسم کھائی ہے۔ ہم اب بھی اپنی قسم پر قائم ہیں۔ میری ساری خوشیاں چھین کر گھر والوں نے مجھے ایک دیوی کا درجہ دے دیا۔ لیکن عاشی! میں دیوی بن کر رہنا نہیں چاہتی۔ ایک پجارن بن کر اپنے دیوتا کی پُوجا کرنا چاہتی ہوں۔ ایک عورت بن کر جینا چاہتی ہوں۔ اپنے شوہر کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے آنگن میں ننھے مُنّے پھولوں کو ہنستے دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے یہ عزت و تکریم نہیں چاہیئے۔

میری مجبوری دیکھ! میں خودکشی بھی نہیں کر سکتی۔ اِس لئے کہ میرے محبوب نے مجھ سے اِنتظار کرنے کا وعدہ لیا تھا۔ اسی وعدے کے سہارے میں جی رہی ہوں۔ اِک آس کے سہارے کہ زندگی کے کسی موڑ پر وہ مجھے ملیں گے!!" آپا کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ میں نے بہت مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کاش! آپ مجھے پہلے بتا دیتیں۔ دُنیا اتنی بڑی نہیں آپا کہ ایک آدمی کا پتہ نہ لگایا جا سکے۔ کیا میں اُس قابلِ احترام ہستی کو دیکھ سکتی ہوں؟"

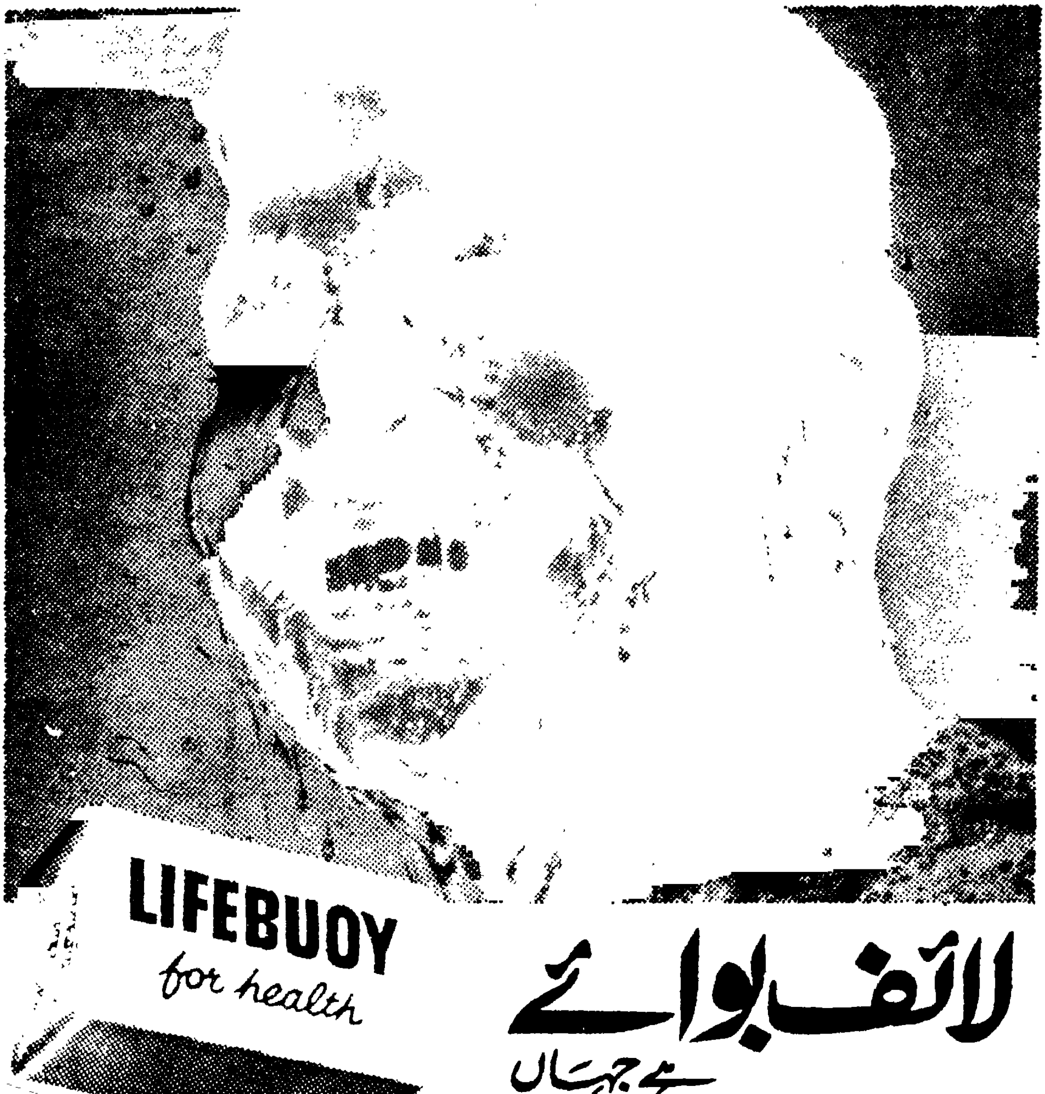
"ہاں عاشی! آج جب سب کچھ بتا دیا تو تصویر بھی دیکھ لے۔ پھر نہ جانے زندگی میں تجھ سا ہمدرد ملے نہ ملے۔ ایک دن تو نے کہا تھا "آپا مجھا پنے زخم سا مرہم بنا لیجئے۔" آ! آج تجھے اپنے زخموں کا مرہم بنا لوں۔"

ایک بے بس سی مُسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر رینگ گئی اُنہوں نے دراز سے ایک تصویر نکالی اور میز پر رکھ کر اُس پر جُھک گئیں میں بھی اشتیاق میں دیکھنے کے لئے جُھکی لیکن جُھک کر میں سیدھی کھڑی نہ ہو سکی۔ میرے احساس پر اِک بجلی سی گری۔ ایک دھماکا ہوا۔ اگلے ہی پل دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ دل کے شیشے کی کرچیاں میرے سینے میں چبھ کر رہ گئیں۔ تکلیف سے رُوح کراہ اُٹھی۔ ایک بے نام سی آہ لبوں پر آکر رُک گئی۔ ہم دونوں تصویر پر جُھکی ہوئی تھیں۔ آپا کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ میز پر جُھکی اپنی جنّت میں کھوئی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک تصویرِ حُسن ہم دونوں کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہی تھی۔ مجھے اپنی مانگ کا سندور مٹتا محسوس ہوا۔ میری آنکھوں کی راہ

- جہاں تک ممکن ہو کسی کو اپنا دُشمن نہ بنائیے۔ کسی مجبور و بیکس کو بھی۔
(سی۔ جی۔ ٹروکان)
- زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ انسان کا کوئی مقصدِ حیات ہو۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- خاموشی سب سے زیادہ آسان اور سب سے نافع عادت ہے۔
(حکیم ارسطاطالیس)
- غریب کو تھوڑی چیزیں اپنی ضروریات کے لئے درکار ہوتی ہیں، آسودہ حال کو بہت۔ (حکیم بقراط)
- اگر آپ عقل مند ہیں تو خوب ہنسا کیجئے۔ (ڈاکٹر مارشل)

بہتا خونِ جگر آپا کی صاف و شفاف مانگ کا سِندور بن گیا۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُن کے آنسوؤں میں اُمیدوں کے اُجالے تھے۔ میرے آنسوؤں میں یاس و حرماں کے اندھیرے! آپا کے آنسو مُسکرا رہے تھے میرے آنسو سِسک رہے تھے۔ اچانک سامنے فرشتہ کا سا مُسکراتا چہرہ میرے آنسوؤں کی دُھند میں کہیں غائب ہو گیا اور میں اپنی جنّت میں تنہا رہ گئی۔ آپا اپنی فردوسِ گمشدہ کے تصوّر میں محو تھیں ——— مجھے تو بس اتنا ہی محسوس ہوا سہارے بے سہارے ہو گئے۔

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر منی آرڈر پر ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۲ لکھنا کافی ہے۔ منیجر



لائف بوائے

ہے جہاں
تندرستی ہے وہاں

لائف بوائے سے نہایئے اور ہر بار تازگی کی ترنگ، تندرستی کی اُمنگ کا
لطف اٹھایئے۔ لائف بوائے سے نہاکر آپ کی طبیعت کھل اُٹھے گی،
کیونکہ اسمیں اعلےٰ صابن کے سبھی اوصاف ہیں اور اپنی مخصوص خوبیاں بھی!

لائف بوائے میل میں چھپے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے

لیور کا L. 51-140-45 UD

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

غزلیں

س زیدؔ اسلام صوفی فتحپوری ایم ۔ اے (علیگ)

لسی صورت سے وحشت کی فراوانی نہیں جاتی
نہیں جاتی مرے دل کی پریشانی نہیں جاتی

بہی گل خود بھی ہیں وارفتگانِ رنگ و بو شاید
کوئی عالم ہو اِن کی چاک دامانی نہیں جاتی

ہے جب مضمر کوئی تعمیر ہر تخریب میں پھر کیوں
دل وحشت زدہ کی خانہ ویرانی نہیں جاتی!

کرے لاکھوں جتن تہذیب حاضر یہ حقیقت ہے
لباسِ مغربی سے تن کی عُریانی نہیں جاتی

نہیں ملتا کسی کو سکوں دل کو نہیں ملتا
نہیں جاتی مرے اشکوں کی طغیانی نہیں جاتی

حقیقت چھپ کہاں سکتی ہے باطل کے اندھیروں میں
گھٹاؤں سے مہِ تاباں کی تابانی نہیں جاتی

ستم ہے کوڑیوں کے مول بکتا ہے ادب اب بھی
رانی میں بھی فن کار علم کی ارزانی نہیں جاتی

تجھے تو گردشِ گردوں نے اے صوفیؔ کچل ڈالا
عزیزوں سے بھی تیری شکل پہچانی نہیں جاتی

رشیؔ پٹیالوی

دیکھا اُنھیں تو پھر نہ کسی پر نظر گئی
دُنیائے رنگ و نُور نظر سے اُتر گئی

ہر جلوہ تیرے عکس کا سایہ نظر پڑا
دیکھو اے جمالِ دوست کہاں تک نظر گئی

جب یہ کھلا کہ غم بھی تمہاری ہی دین ہے
جھولی مری مُراد کی خوشیوں سے بھر گئی

برچھی کہیں کہ اُن کی نظر کو نظر کہیں
کیا دیکھتے ہی دیکھتے دِل تک اُتر گئی

راحت سے بھی سوا ہے مزہ دردِ عشق میں
اچھا ہوا دُعائے شفا بے اثر گئی

سمجھے تھے اہلِ درد جسے درد کی دوا
لو وہ نظر ہی درد سے مانوس کر گئی!

تکتے رہے بہار کا رستہ خزاں نصیب
نکہت سی آکے صحنِ چمن سے گزر گئی

ماتم بھی ہو سکا نہ رشیؔ حالِ زار کا
دِل ہی کے ساتھ اپنی طبیعت بھی مر گئی

شوراج بہارؔ

کیا کہوں تم سے اِلتجا کیا ہے
جان لو خود ہی مُدّعا کیا ہے

کیسے انجان بن گئے ہو تُم
پُوچھتے ہو تجھے ہُوا کیا ہے

اُن کی بے اعتنائیاں توبہ
کیا خبر اِن کی اِنتہا کیا ہے

اب تری یاد بھی نہیں آتی
سوچتا ہُوں یہ ماجرا کیا ہے

زندگی اِک عذاب ہے یارب!
یہ عنایت ہے یا سزا، کیا ہے؟

شوخیاں بھی حیا میں شامِل ہیں
اللہ اللہ یہ ادا کیا ہے

دِل کو آزار عشق کا ہے بہارؔ
میرے اِس درد کی دوا کیا ہے؟




ہر دانش مند
مالکن
ہمیشہ
آرتی نیل
کو ہی
پسند کرتی ہیں
آرتی نیل سے
کپڑے زیادہ پائیدار
زیادہ چمکیلے اور
زیادہ سفید رہتے ہیں
before
after
ARATI ULTRAMARINE
S.C
سیٹھ کیمیکل ورکس
جمنالال بجاج اسٹریٹ کلکتہ
SCW/C 61
میسرز سیٹھ ٹریڈنگ کمپنی - ۲۵۲۹ - چرداوا - تلک بازار - دہلی نمبر ۶

پت جھڑ کے پتّے

ظفر اقبال سہرامی

کیئر آف کیلاش پرشاد جیسوال۔ سرکاری گولہ۔ سہسرام (بہار)

مکرمی!

"پت جھڑ کے پتّے" میں اب تک بھیج چُکا ہوتا۔ لیکن "بُجھ گئے سب در و بام" کے قارئین کی رائے کا مجھے انتظار تھا۔ اُس پر کئی خط آچکے ہیں۔ اُن کے بخشے ہوئے حوصلے کے تحت اِس یقین کے ساتھ یہ افسانہ بھیج رہا ہوں کہ اُنھیں میری خاموشی کی شکایت نہ رہے گی۔ امراوتی کے ایک بھائی نے تو ہر ماہ ایک کہانی لکھنے کو کہا ہے۔ وہ بڑی شدّت سے میری کہانی کا انتظار کرتے ہیں اور فرنٹیئر کے ایک فوجی بھائی نے حُکم دیا ہے کہ میری کہانی میں بہت درد اور تڑپ ہوتی ہے۔ اِس لئے کہ میں عاشی اور جاوید کو نہیں مِلاتا ہوں۔ موت ایک بیکار سی چیز ہے اور جُدائی میں رکھا ہی کیا ہے۔ وصال ہی تو زندگی ہے۔ عاشی اور جاوید کو جُدا نہ کرکے میں اُنھیں مِلا دیا کروں۔ سرِ تسلیم خم! میں بھی اِسی وصال کی جُستجو میں ہوں جو زندگی ہے۔ کہاں ہوگی وہ زندگی ——— اور کب مِلے گی وہ زندگی جس کی یافت کے بعد کوئی جاوید اپنی عاشی سے جُدا نہ ہو! اور عاشی ع

سیم گوں شانے پہ گِرائے ہوئے زُلفوں کی پھوار

اپنی بہار میں نغمہ سنج ہو . . .

نیاز مند ——— ظفر اقبال سہرامی

ڈھلتے ہوئے سُورج کی سُنہری دھوپ کا عکس نقرئی شام پر پڑ رہا تھا۔

عائشہ لان کی ترشی ہوئی گھاس پہ ننگے پاؤں ٹہل رہی تھی۔ گھاس کی خُنکی تلوے کو فرحت بخش رہی تھی اور نارنجی دھوپ میں اُس کا نہایا چہرہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے برسات کی مہکی ہوئی رُت میں گُلاب کھِل رہا تھا۔ فضا خوشگوار تھی اور شام کی ہلکی پھُلکی ہوا کیف آور۔

وہ آہنی گیٹ پر کھڑا اِس جاں نواز منظر کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا قریب پہنچا اور انجان بن کر پُوچھا۔

"ڈاکٹر مسعود صاحب کا یہی گھر ہے؟"

رقصِ سنبل رُکا، غزالی آنکھیں اُٹھیں اور شوخیوں کا موسم آگیا۔

"آپ آؤٹ ڈور پیشنٹ ہیں؟"

"سُنا ہے مسعود صاحب ادب کے ڈاکٹر ہیں!" اُس کی معصومیت برقرار رہی۔

"آپ کی تعریف؟"

"میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں پُوچھ رہا ہوں!"

"اور میں نسیان کے ایک مریض سے سر کھپا رہی ہوں!"

"تعجب ہے۔ ایک معلّمِ ادب کے مکان میں اِتنی بڑی بے ادب!"

اِتنے میں ڈاکٹر مسعود سگریٹ پیتے ہوئے برآمدے میں نظر آئے۔ وہ لپکا۔

"تسلیم عرض کرتا ہوں انکل!"

"جاوید!"

اُنھوں نے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔ عائشہ بھی پیچھے پیچھے آکر کھڑی تھی اور آنٹی بھی اندر سے نکل آئی تھیں۔

"یہ تمھاری آنٹی ہیں۔"

اُس نے آداب کیا۔ آنٹی نے بہت شفقت سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"میرا جاوید کتنا بڑا ہو گیا ——— !"

ابّا اور اماں کے بے پناہ پیار کو دیکھ کر عائشہ حیرت میں تھی۔

"اور یہ میری بیٹی عائشہ پروین! بی۔ اے فائنل کی اسٹوڈنٹ!"

"ڈاکٹر نے عائشہ کی طرف دیکھتے ہوئے تعارف کرایا۔ عائشہ نے ہاتھ آداب کے لئے اٹھایا۔ لیکن اس نے نگلکٹ کر دیا۔ عائشہ نے اپنی توہین محسوس کی اور بُرا سا منہ بنا لیا۔

پھر وہ سب باتیں کرتے اندر آئے۔

جاوید اپنی سروس کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ اس کے ابّا اور مسعود صاحب ایک زمانے تک کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ اس فیلوشپ نے دونوں کو برادرانہ رشتے میں باندھ دیا تھا۔ بدلتے ہوئے حالات کے تحت دونوں جدا ضرور ہوئے۔ لیکن دلوں کے بندھن نے انھیں جدا نہیں کیا اور یہ گاہے گاہے ملتے رہے۔ جاوید کی روانگی کی خبر مسعود صاحب کو اس کے ابّا نے دے دی تھی۔ جاوید کو اب تک آجانا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کے ابّا کی بیماری دیر کا سبب بن گئی تھی۔ انھیں سب باتوں میں وہ صرف انکل اور آنٹی سے مخاطب رہا۔ عائشہ کی طرف دیکھا تک نہیں۔ جاوید کے اس کولڈ بی ہیویر پر وہ اور بھڑکی۔

"ذرا پانی چاہیئے!"

جاوید نے کہا ——— آنٹی اٹھیں تو جاوید نے دبی ہوئی چنگاری کو ہوا دی۔

"آپ بیٹھئے۔ یہ آپ کی میڈ سرونٹ ہیں نا!"

"ڈاکٹر صاحب ذرا مسکرائے۔ لیکن آنٹی کھل کر ہنس پڑیں۔ وہ معصومیت سے کہنے لگا۔

"ابھی لان میں کھڑی کہہ رہی تھیں کہ نئی دائی ہوں!"

عائشہ کا پارہ درجۂ حرارت کی حد کو توڑ بیٹھا۔ وہ تمک کر اٹھی اور درشت لہجے میں بولی۔

"یو بوائے آف فول!"

اور وہ کمرے سے نکل گئی۔ انکل نے کہا۔

"تم نے اسے چھیڑ دیا۔ بہت جلد غصّے میں آجاتی ہے!"

وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔

عائشہ جاوید کے لئے ایک کھلونا بن گئی تھی۔ موقع بے موقع اسے چھیڑ چھیڑ کر لطف اندوز ہوتا رہتا۔ ایک بار وہ کچھ کتابیں لئے اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ اس نے راستہ روک لیا۔

"آپ کتابیں ڈھو سکتی ہیں لیکن مسز اندرا گاندھی نہیں ہو سکتی ہیں!"

"آپ نے کون سا تیر مارا ہے؟" اس کا تیور چڑھ گیا۔

"اور جب ماروں گا تو نشانہ خطا بھی نہ ہو گا!" اس نے بھی اکڑ کر کہا۔

"آئینہ میں اپنی صورت دیکھی ہے؟"

"لوگ دلوں میں جگہ دیتے ہیں!"

"بکواس بند کیجیے۔"

اس کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔

"ایک دن میری بات کے لئے ترسئے گا!"

کہتے ہوئے جاوید آگے بڑھ گیا اور وہ خشمگیں نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

ایک صبح وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اس کے سیاہ ریشمیں بال کالی گھٹاؤں کی طرح جھوم رہے تھے۔ اس کو شرارت سوجھی۔

"ارے سانپ!"

وہ اچھلتا کودتا اس کے قریب پہنچا۔ وہ بھی ڈر گئی اور بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"کہاں؟"

"یہ دیکھو!"

اور بل کھاتے ہوئے بالوں کو اپنے ہاتھ میں سمیٹ لیا! اس شرارت پر وہ کھول اٹھی۔

"چھوڑئے میرے بال!"

"چھوڑ دیا جناب!"

"ایسی حرکتیں کرتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی؟"

"شرمانا عورتوں کا کام ہے!"

"میرے کمرے سے نکل جایئے۔"

"اس سے زیادہ آپ کیا کر سکتی ہیں!"

وہ بھی تنا تنا کمرے سے نکل گیا۔

گھر پر جاوید کا زیادہ تر وقت آنٹی سے باتیں کرنے میں گزرتا تھا۔ انکل سے تو کچھ ضروری ہی موقعوں پر ملا کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ آنٹی کے پاس بیٹھا کچھ ہانک رہا تھا۔ جب تک عائشہ بھی آگئی۔ اسے اماں سے کام تھا۔ جسے جاوید بھانپ گیا اور بولا۔

"میں کہتا ہوں آنٹی کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر اور سر پھری ہو جاتی ہیں۔"

"مردوں سے کم ہی!" عائشہ نے چوٹ محسوس کر لی۔

"وہ کیسے؟" وہ اُلجھنے پر آمادہ ہو گیا۔

"اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آج کل کے فسادات اور خون خرابہ بڑے ہی دماغ کی وجہ سے ہو رہے ہیں اور پھر۔۔"

وہ گھور کر دیکھتی ہوئی چُپ ہو گئی۔

"کہیے کہیے ـــــ"

"اور پھر تاریخ شاہد ہے کہ خدائی کا دعویٰ کرنے والے یہی حضرت مرد ہیں!"

"اور خدا کے حکم کی نافرمانی کرنے والی ـــــ"

"اِتنی بڑی تعداد نہیں ـــــ"

"تعداد پہ کیوں اُتر رہی ہیں۔ گُناہ کی پہلی ترغیب دینے والی آپ ہی تو ہیں!"

"بھئی! تم دونوں لڑنے کیوں لگے؟"

آنٹی نے روکا۔ عاشی کا بخار دو سَو پر تھا۔

"آپ لوگوں نے گھر میں ایسے پاگل کو رکھ لیا ہے جس سے دوسرے کا بھی دماغ خراب ہو رہا ہے!"

"ہمدرد سے ٹانک منگا کر استعمال کیجیے!"

"آپ ہی کیوں نہیں کرتے؟"

"میرا دماغ تو صحیح ہے!"

"اِسی لئے اب تک سروس نہیں مل رہی!"

"عورتیں جب ہار پر آتی ہیں تو طعنوں مہنوں کو اپناتی ہیں!"

"عائشہ تُو چُپ بھی رہے گی!"

اُس کی امّاں نے ڈانٹا۔ وہ خاموش تو ہوئی ضرور لیکن سطحِ آب کے نیچے لہریں مارتی موجیں پُرسکون نہ ہوئی تھیں۔

عائشہ کو نہ جانے اُس سے کیوں اِتنی دشمنی ہو گئی تھی۔ ہر وقت کی نوک جھونک، ہر گھڑی کا اِک ہنگامہ اور جنگ! وہ عاجز ہو چکی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جاوید سے کس طرح بچ کر رہے۔ تاکہ ایک لمحہ اطمینان اور سکون کا ملے۔ اُسے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے گھر کے چپّے چپّے پر جاوید چھایا ہوا ہے۔ اُس سے بچ نہیں سکتی اور اُسے سکون نہیں مل سکتا۔ پھر اُس کا امتحان قریب آ رہا تھا۔ اِس عالم میں وہ کس طرح اسٹڈی کرے۔ اگر جاوید کی حرکتوں کا یہی عالم رہا تو اُس کا سال یقیناً ضائع ہو جائے گا۔ وہ ایک کشمکش میں پڑی رہی۔ کئی دِنوں کی سوچ اور فکر کے بعد وہ اِسی نتیجے پر پہنچی کہ جاوید کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو جائے اور اُس سے امتحان تک کے لئے معافی مانگ لے۔ ہار ہی سہی۔ بعض خواہشوں کی تکمیل کے لئے کچھ قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔

اِس فیصلے سے اُسے کچھ اطمینان تو ضرور ہوا۔ لیکن یہ بھی خدشہ تھا کہ اگر وہ نہ مانا تو اِس کی ذِلّت ہوگی۔ پھر بھی اٹمپٹ کے لئے تیار ہو گئی۔

وہ بیٹھا آنٹی سے معاشی مسئلے پر بات کر رہا تھا۔ باتوں میں سنجیدگی، انداز میں گمبھیرتا اور وجود میں متانت تھی۔ عاشی کو اِس بدلے ہوئے حالات پر حیرت ضرور ہوئی تھی۔ لیکن وہ سوچ رہی تھی۔ نہ جانے کب پٹاخہ چھوٹ پڑے۔ کچھ وقت گزرا۔ اچانک وہ اُس سے مخاطب ہوا۔

"کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھو!"

اور خود کھڑا ہو گیا۔ گھڑی دیکھی "ساری!" کہتا ہوا چلا گیا۔

جاوید کی اِس روش سے عائشہ کو پھر حیرت ہوئی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جاوید زیادہ تر گھر سے باہر رہنے لگا۔ بہت کم نظر آتا۔ کبھی اتّفاق سے سامنا ہو جاتا تو بھی سر جھکائے گزر جاتا۔ پہلے تو وہ خوش ہوئی کہ خدا نے اِس پر رحم کیا اور اُس کے قلب کو پھیر دیا۔ لیکن انسان کی فطرت جتنی عجیب و غریب ہوتی ہے اُتنی ہی فریب کار اور شعبدہ باز بھی۔ ایک طرف عائشہ کو یہ اطمینان ہوا کہ معافی مانگے بغیر اور شکست تسلیم کئے بغیر وہ سیدھی راہ پر آ گیا۔ لیکن اِس کے ساتھ ایک کُرید دیمک کی طرح اِس کے ذہن سے چمٹ گئی کہ آخر کس فکر کی کڑی دھوپ نے جاوید کو شرارتوں اور شوخیوں کی ٹھنک اور فرحت بخش سائے سے محروم کر دیا۔ اُس کا دل چاہا کہ وہ جاوید کو ایک بار پھر چھیڑ دے۔ لیکن اِس چاہت پر شبکی اور خواری کا خیال پہرہ دے رہا تھا۔ ورنہ لاشعوری طور پر وہ اپنی ہار مان چکی تھی اور وہی ہار اُس کے احساس میں اِس طرح گھُل رہی تھی جو پورے طور پر اُبھری نہ تھی۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

جاوید اپنے بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اُس کے خیالات ساکن تھے اور بے خواب آنکھیں نیند سے دُور کچھ سپنوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ پڑے پڑے وہ کتنے سگریٹ پھونک چکا تھا۔ جِس کی تلخی سے مُنہ کا ذائقہ خراب ہو رہا تھا۔ وہ اُٹھا اور اسٹو سُلگایا۔ چائے بنا کر اُس نے اطمینان سے پینا چاہا۔ اُسی لمحے اُسے عائشہ یاد آئی۔ خیالوں کا سکوت ٹوٹا تو رنگ و نُور کی پھواریں دل کو گُدگُدانے لگیں۔



چائے جب بھی پیئیں
للت چائے ہی پیئیں
Lalit
LEAF TEA
TATA FINLAY
ٹاٹا۔ فنلے کی چائے
چائے کا وقت — دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد جب طبیعت کسی ایسی چیز کی خواہش کرتی ہے جو پھرتیلا پن لائے اور امنگ پیدا کرے تو یہی ٹھیک للت چائے کا وقت ہے۔
اس لئے کہ للت چائے اس ڈھنگ سے خاص طور پر مرکب کی گئی ہے کہ آپ میں حقیقتاً ترو تازگی پیدا کرے، آپکی طبیعت میں انشراح اور امنگ لائے جس وقت آپکو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ للت چائے نہایت پسندیدہ قسموں کی چائے سے بنائی جاتی ہے اسی لئے اس کی خوشبو مرغوب اور لذت من پسند ہوتی ہے۔ اسکی پیالی بھر تیز چائے سچ مچ تسلی بخش ہوتی ہے۔
جو واقعی تسکین
سول سیلنگ ایجنٹس : دی ٹاٹا آسٹل ملس کمپنی لمیٹڈ

اُس نے سوچا۔ امتحان سر پر ہے۔ غریب کتابوں میں سر کھپاتی ہو گی۔ اِس خیال کے تحت وہ اُس کے کمرے تک پہنچا۔ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا —— وہ میز پر سر رکھے سو رہی تھی۔ دُودھیا لیمپ کی روشنی میں کمرہ پُر ہول سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سامنے کتاب کھلی پڑی تھی۔ اُنگلیوں میں پھنسا ہوا قلم کاپی پر جھک پڑا تھا۔ جوانی سو رہی تھی، حُسن جاگ رہا تھا۔ وہ حُسن جس کی بے پناہ حدّت سے دیر و حرم کو پسینہ آجائے اور ایک کائنات تپ اُٹھے۔ وہ قریب کھڑا دیکھ رہا تھا۔ شریانوں میں دوڑتے ہوئے لہو آتشیں ہو رہے تھے اور جذبے کی تلاطم خیزی ہوش و خرد کو ڈبو رہی تھی۔ وہ بُت بنا بغیر پلک جھپکائے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے خوبصورت چہرے پر گہری نیند کا سایہ رہزنِ تمکین و ہوش ہو رہا تھا۔ اُس نے چاہا کہ فرشتوں کے اِس مقدّس خواب کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لے۔ رُوح کے دامن میں چھپالے اور دل کے اُس حصّے میں بسالے جہاں دھڑکنیں ہوتی ہیں —— لیکن اُس سے کچھ نہ ہو سکا۔ صرف کنوارے بدن کی جانی پہچانی، بھینی بھینی سی مہک اُس کے جذبے میں اب تک آنچ دے رہی تھی۔ اُسی میں کھویا کھویا اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا۔

"عاشی!"

اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے جاوید تھا۔ جلدی سے اُٹھی اور سر پر آنچل رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ؟"

"جی —— !" وہ مُسکرایا۔ "یہ تم پڑھ رہی ہو؟"

"اِدھر کئی راتوں سے جاگ رہی ہوں۔ اِس لئے نیند آگئی!"

وہ اب بھی نیند کے غلبے میں تھی۔ اگر جاوید نہ ہوتا تو بستر پر مُنہ کے بل پڑ جاتی۔

"جاؤ مُنہ دھو لو۔"

"مجھے نیند آرہی ہے!"

"میں چائے پلاتا ہوں!"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا —— نیند کی مدہوشی میں ذہن و دل کے ساتھ اُس کا وجود اُونگھ رہا تھا۔ لیکن جاوید نے یہ کیسا حُکم دے دیا جس نے ساری مدہوشی کو دھو ڈالا اور دل کی دھڑکن بن کر اُس کی ساری کائنات پر چھا گیا۔ وہ خود کو مجبور سی پا رہی تھی۔

چائے سے فارغ ہو کر جاوید نے سگریٹ سُلگایا اور عائشہ کھُلی ہوئی کتاب کے صفحے اُلٹ پلٹ کرنے لگی۔

اور پھر وہ ضروری ضروری چیزوں پر نوٹس لکھواتا رہا۔ اہم سوالوں کو حل کراتا رہا۔ سمجھاتا رہا اور بتاتا رہا۔ اِس عرصے میں وہ کسی احساس اور خیال کے نرغے میں نہ آئے۔ صرف کتابی مرحلوں سے گزرتے رہے۔

اِس طرح کئی راتیں ایک ساتھ کتابوں اور نوٹوں میں سر کھپاتے گزر گئیں۔

اور وہ سارے لمحے عائشہ کے لئے بے حد قیامت خیز گزرے۔ وہ جاوید کے سامنے لکھنے پڑھنے میں منہمک تھی۔ لیکن پس منظر میں جو انقلاب آیا ہوا تھا اور جاوید کی مارشل لائی قوت اُس کی شعوری اور محسوساتی قلمرو کا تختہ اُلٹ رہی تھی۔ اِس سے وہ ہراساں و پریشان تھی۔ جاوید کا یہ کون سا ڈھکا چھپا پہلو تھا، جس کے بے نقاب ہوتے ہی اُسے مسحور کرنے لگا تھا۔ اِتنی تیزی سے وہ اُس کے ہوش و حواس پر چھا گیا اور اُس کی شخصیت کی خوشبو، اُس کے لہجے کی متانت، بے نیازی، خاموشی اور ایک ساتھی کی بے پناہ محبت اُس کے ویران دل کو آباد کر گئی کہ وہ سمجھ نہ پائی۔ یہ سب کیسے ہو رہا ہے! اور وہ کیوں خاموش اُس کے سراپا کی مہک میں کھو رہی ہے۔ وہ سمجھ نہ سکی۔

ایک دوپہر ——

وہ خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اُس کے کمرے کی طرف سے گزرتی عاشی نے اُسے اُداس اُداس سا دیکھا تو اُس کے پاس آئی۔

"آپ خاموش بیٹھے ہیں؟"

عاشی کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسّم تھا۔ لبوں کی جوت میں رنگین شفق کو جاوید نے دیکھا تو وہ بھی مُسکرا بیٹھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ یہ سروس مجھے مطمئن نہیں کر سکتی۔ اِسے چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں!"

عاشی کے گلابی چہرے پر معاً ہلکا ہلکا دھواں سا تیر اُٹھا۔

"کہاں جایئے گا؟"

"اِس لمبی چوڑی دُنیا میں کسی طرف نکل جاؤں گا۔" اُس کا تیر نشانے پر تھا۔ "اور پھر میرا کون ہے، جسے فِکر ہو گی!"

"آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟"

عاشی بول اُٹھی۔ اُس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ اُنہی نمناک آنکھوں سے وہ جاوید کو اِس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی تھی: "میں تو تمھاری ہوں۔ تمھاری فِکر مجھے نہ ہو گی؟"

"عاشی! میں چاہتا ہوں کہ میرا سامان تم ہی درست کر دو!"

"آپ پھر مجھ سے لڑنا چاہتے ہیں!" عاشی کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"جتنا لڑ چکا ہوں اُس کی سزا بھگتنا چاہتا ہوں!"

"تو مجھے بھی سزا دے دیجئے۔ میں نے آپ کو بہت ستایا ہے!"

"وہ ستانا نہیں تمہارا آزمانا تھا۔"

عاشی نے اِس جملے پر ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ جاوید نے اُس کے دل کے چور کو پکڑ لیا تھا۔ وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔ وہ تکرار نہیں تکرار کی کوکھ سے جنم لینے والی جذباتی وابستگی اور رُومانی محبت تھی۔ جو راز کی طرح چھپ نہ سکی اور آنسو کی طرح بہہ نکلی۔

"یہی سہی! آپ نہیں جا سکتے!"

عاشی کہتی ہوئی چلی تو وہ چِلّا اُٹھا۔

"میم صاحب!"

وہ رُکی، یہ بڑھا۔

"کہیے! اب تو آپ یہ نہ کہیں گی کہ میں نے کون سا تیر مارا؟"

جاوید ہنس رہا تھا۔ عاشی کے چہرے پر مسرت اور حیا کا مِلا جُلا گداز پیدا ہوا اور پھر چہرہ کا رنگ اِس طرح کِھلا جیسے آخر شب کے بعد پو کھِل کر پھٹے اور پھر پھولوں کے شبنمی کٹوروں پر جلترنگ کی سی اِک آواز پیدا ہوئی۔

"آپ جیتے۔ میں ہاری!"

جاوید نے اِک بات ازراہِ مذاق کہی تھی اور وہ بھی عاشی کو چھیڑنے کے لئے۔ اب وہ حقیقت بن گئی۔ اُسے ابّا کی شدید بیماری کا تار مِلا تو دِل نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے سفری بیگ میں ضروری سامان رکھنا ہی پڑا۔ عاشی بھی اُس کی چائے لے کر آ چکی تھی۔

"واقعی آپ جا رہے ہیں؟"

اُس نے نفی میں سر ہِلا دیا اور سامان رکھنے میں مصروف رہا۔ ذہنی تکلیف اور رُوحانی آزردگی سے اُس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ ایک طرف ابّا کی بیماری دل کی دھڑکنوں کو بڑھا رہی تھی تو دوسری طرف عاشی کی جُدائی اُس کے دل کو مجروح کر رہی تھی۔

"بولئے تو سہی۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"گھر ——!" وہ رُکا اور پھر تار دِکھاتے ہوئے بولا "انکل بھی ساتھ ہی چل رہے ہیں۔"

عاشی چُپ ہو گئی۔ لیکن آنکھوں کے گوشے میں چھپے آنسو پھوٹ پڑے۔

"کب تک لَوٹیے گا؟"

"جیسے حالات ہوئے۔"

"آپ کے نہ رہنے سے یہ گھر سُونا ہو جائے گا!"

کہتی ہوئی عاشی اُس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ آنسوؤں کی پھوار میں اُس کا گُلابی چہرہ بھیگ رہا تھا اور عاشی کے جملے سے جاوید کا وجود پگھل رہا تھا۔ عاشی نے پردے ہی پردے میں جیسے کہا تھا "آپ کے نہ رہنے سے وہ سُونی ہو جائے گی"۔ اُس نے اپنے رومال سے عاشی کے آنسو پونچھے اور چاندی سی شفاف پیشانی کو چوم لیا۔ جس کی تقدیس پر چاندنی نماز پڑھ رہی تھی۔

ڈاکٹر مسعود کے ساتھ وہ اپنے ابا کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

اُن کی حالت نازک تھی اور آواز میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو چکی تھی۔ اُن کی آخری خواہش تھی کہ جاوید ناہید کو شریکِ حیات بنا لے جو اُن کی بیوہ بہن کی لڑکی تھی۔ اِس خواہش نے اُس کے سامنے کئی موڑ رکھ دیئے اور ہر موڑ اُس کے ذہنی کرب کو بڑھا رہا تھا۔ جب فضا آتشیں ہو اور طوفانی جھکورے اُس کے وجود کو لرزا رہے ہوں تو وہ کیا جواب دے۔ آخر ایک دن اُس کے ابّا نے فیصلہ کر ہی لینا چاہا۔

"شاید تمہیں میری پسند سے اتفاق نہیں؟"

"آپ کی پسند سے مجھے اتّفاق ہو یا نہ ہو لیکن آپ کی خواہش مجھے عزیز ہے۔"

اور پھر اُن کے سامنے اُس کا نکاح ناہید سے پڑھا دیا گیا۔ وہ جیسے اِسی وقت کے منتظر تھے۔ اِس کے انجام پاتے ہی وہ اپنی آخری آرام گاہ کی طرف چل دیئے۔

اُن کی موت ایک گہری چوٹ تھی۔ لیکن جاوید یہ چوٹ کھا کر بھی اِکدم خاموش ہو چکا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے، لبوں پر آہیں نہ تھیں۔ چوٹوں کی دہکتی آگ میں آنکھیں جل رہی تھیں اور لب سیاہ ہو رہے تھے۔

اُس کا دِل ٹوٹ چکا تھا اور کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔

اِس بڑی ٹریجڈی سے مسعود صاحب بھی متاثر تھے۔ انھوں نے ایک باپ کی شفقت میں اُسے تسلّی دی۔ لیکن ہر تسلّی نے دل پر چرکا ہی لگایا۔ زہر ہی کا گھونٹ پِلایا۔ وہ کیسے اپنا سینہ چیر کر دِل دِکھائے کہ اِس کا دِل کس طرح مسلا اور کچلا ہوا ہے۔ سب لوگ جا چکے تھے —— اور وہ تنہا اپنے کمرے میں پڑا رُوح کی تنہائیوں سے لِپٹا سوچا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی زبانی ساری باتوں کو سُن کر

عاشی کا کیا حال ہوگا؟

"عاشی!"

انتہائی بے بسی اور جانکاہ تنہائی کی قید سے اس نے پکارا اور پھر آنکھوں کے اندر آنسوؤں کے سمندر کی چھپی ہوئی جوار بھاٹا باندھ توڑ بیٹھی۔

ایک دن وہ لُٹا لُٹا سا مسعود صاحب کے ہاں پہنچا۔

اُسے دیکھتے ہی آنٹی نے بڑھ کر سینے سے لگا لیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں اور اپنے آنچل سے اس کا چہرہ صاف کرنے لگیں۔

"مرنا تو سب ہی کو ہے۔ تم اتنے دُکھی نہ ہو۔ ہم سب ابھی تمہارے لئے زندہ ہیں!"

وہ کچھ بولا نہیں ——— اور خاموش اپنے کمرے میں آیا۔ کمرہ بہت صاف تھا اور چیزیں بے حد سلیقے سے تھیں۔ وہ انتہائی دُکھ میں کراہتے ہوئے بڑبڑایا۔

"عاشی! یہ سب تم نے جاوید کے لئے کیا۔ لیکن جاوید بھی تمہارا نہیں رہا!"

اور پلنگ پر لیٹ گیا ——— لیکن اس کی بیتاب نگاہیں عاشی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

عاشی ملی ——— وہ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے موسم بہار کا ایک مرجھایا ہوا پودا جس کے اندر کی جڑیں سوکھ چکی تھیں اور شاخیں بے برگ و بار ہو رہی تھیں۔

"کہاں تھیں عاشی؟"

"ایک بڑے طوفان نے دل کا مندر توڑ دیا۔ اُس ٹوٹے ہوئے مندر میں اپنے بُت کو تلاش کر رہی تھی۔"

"عاشی!"

"وہ بُت مجھے بے حد عزیز تھا۔ اس نے میری نخوت کو توڑا۔ پھر مجھے پیار کرنا سکھایا۔ میری تنہائیوں کے سنّاٹے میں سانسوں سے ملا کر دل کی دھڑکنیں سُنائیں ——— وہ میرا بُت کہاں گیا؟ کون لے گیا اُسے؟؟"

وہ پھوٹ پڑی۔ جاوید کا دل تڑپ اُٹھا۔ اس نے عاشی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"عاشی! تم کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ چُپ ہو گئی۔ لیکن سسکیاں بھرتی ہی رہی۔

"خود کو برباد کرنے سے کیا ملے گا ——— مجھے دیکھو ——— میرا دل بھی تو زخمی ہے!"

وہ اب کچھ سنبھل چکی تھی۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"جیسی بھی ہے ٹھیک ہے۔ جب لُوٹنے والے نے بے خطا میری خوشیاں چھین لیں تو اپنی دُنیا میں زندگی کا چراغ کس لئے جلاؤں؟"

اس نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"تمہیں تو غم کے ساتھ خوشی بھی ملی۔ مسز جاوید کیسی ہیں؟"

اس کا جنون پھر بڑھنے لگا اور وہ ایک موج کی طرح بڑھ کر ساحل سے ٹکرا جانا چاہتی تھی۔ جاوید نے سنبھالا۔

"پھر میں اپنی شرارتیں شروع کر دوں؟"

"ناہیدہ کے ساتھ؟"

"اور تم؟"

"میں؟" وہ جیسے کھوئی ہوئی تھی چونک کر بولی "میں تو غیر ہوں اور غیروں کے ساتھ شرارت کیسی؟ میرا جاوید ——— جاوید!"

اس کی آواز میں زخمی روح کی پکار تھر تھرا رہی تھی۔

اور جاوید کھڑا اس کی آنکھوں کے آنسوؤں کو اپنی پلکوں پہ پا رہا تھا۔

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سُپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶)

قارئین کے مسلسل اصرار پر، اُن کی غلط فہمی دُور کرنے کے لئے ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ادارہ "بیسویں صدی" دہلی کا "بیسویں صدی" لاہور سے کوئی تعلق نہیں۔ سوائے اِس کے کہ وہ ہمارے جملہ مضامین بلا حوالہ نقل کر لیتے ہیں اور ہمارے "تیر و نشتر" اور "صحت و زندگی" کے مضامین بھی اپنے نام سے شائع کر لیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو مغالطہ میں رکھنے کے لئے ہمارے سرورق کا ہو بہو چربہ بھی چھاپ لیتے ہیں۔ منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶

غزل

امر چند قیس جالندھری

جی بھر کے دیکھنے سے میری نظر نہ چوکی
ہم نے بھی دیکھ لی ہے حد شوق و آرزو کی

تابِ نظر سے بڑھ کر ہر چند جستجو کی
آتش بجھی نہ پھر بھی اِس چشمِ آرزو کی

مہربان ہو کر پوچھا تھا حال اُس نے
بات ہوئی نہ پھر بھی اظہارِ آرزو کی

اُس آرزو میں اب تک مر مر کے جی رہا ہوں
دِل میں جو آرزو ہے اِظہارِ آرزو کی

افسوس۔ جتنا شیریں تھا خوابِ آرزو کا
اتنی ہی تلخ ہے اب تعبیر آرزو کی

اے حُسنِ حیرت افزا! اپنا بھی دیکھ عالم
کیا مجھ سے پوچھتا ہے۔ کیوں مَیں نے آرزو کی؟

مِٹ مِٹ کے بن رہی ہے۔ بن بن کے مِٹ رہی ہے
ہر شکل جستجو کی۔ ہر صورت آرزو کی

گو جان پہ بنا دی اُس جانِ آرزو نے
دِل کو ہے پھر بھی حسرت اُس جانِ آرزو کی

اب اُس پہ طعن کیسے؟ اب اُس پہ کیوں ملامت؟
تیری نگاہ نے خود جس دِل کی آرزو کی

تشریحِ آرزو کی کیوں لب تک آئے نوبت؟
خود آنکھ سے عیاں ہو کیفیت آرزو کی

پُرسش کرے نہ مجھ سے، اپنے ہی دِل سے پوچھے
مَیں نے کب آرزو کی اُس بُت کی آرزو کی؟

یہ اِنتہا کہ دِل ہے خود مرقدِ آرزو کا
وہ اِبتدا کہ دِل تھا تصویرِ آرزو کی

ہوش آگیا تو قیس! اب حیرت میں غرق ہوں میں
کس عالمِ جنوں نے تحریکِ آرزو کی

غزل

محمد امیر اڈپی کر

لے چلا ہے، جانے کس عالم کی جانب، دل مجھے
ڈھونڈتی ہے خود غبارِ راہ میں منزل مجھے

اے سُبک سارانِ ساحل! کیا خبر اِس کی تمہیں
مل گیا طوفان کی آغوش میں ساحل مجھے

آگ کو شبنم، تو کانٹے کو گُلِ تر کہہ دیا
کر دیا تھا بے خودیٔ عشق نے غافل مجھے

منظرِ دیر و حرم سے ہٹ گئی میری نظر
میکشوں میں جب سے ساقی نے کیا شامل مجھے

اب لہو روتی ہیں آنکھیں آپ کی محفل سے دُور
خود کہا تھا آپ ہی نے رونقِ محفل مجھے

زُلف کو زنجیر، عارض کو کنول کہنا پڑا
آپ نے جب سے کہا ہے شاعرِ کامل مجھے

اُف یہ شغلِ بادہ نوشی اور پھر اُن کے بغیر
قطرہ قطرہ میں نظر آتا ہے خونِ دل مجھے

جب کبھی تیری بیوفائی کا مجھے آیا خیال
داغ کی صورت نظر آیا مہِ کامل مجھے

شب کی تنہائی میں کھِلتے ہیں حسیں یادوں کے پھول
کاش کر دیتا کوئی احساس سے غافل مجھے

ڈھونڈ لیتا ہوں ہجومِ غم میں سامانِ نشاط!
سعیٔ لاحاصل بھی ہے سرمایۂ حاصل مجھے

آئینہ دارِ جمالِ شاہدِ معنیٰ ہوں مَیں
ڈھونڈتی ہے ورنہ پھر کیوں صبحِ مستقبل مجھے

ہوگیا ہوں خوگرِ اندوہ اتنا اے امیر
اب تو مشکل بھی نظر آتی نہیں مشکل مجھے



بیسویں صدی دہلی ستمبر ۱۹۶۹ء

طنزیہ

میری بھارت یاترا

فکر تونسوی

اچانک ایک دن دہلی کے کافی ہاؤس میں ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ بھارت دیش دیہات میں رہتا ہے۔ یہ سُن کر مجھے اپنی حماقت اور ہندوستانیوں کی دو رنگی پر بہت غصّہ آیا۔ جیسے میں اب تک جہاں جہاں گھومتا رہا، بھارت دیش نہیں تھا کچھ اور تھا۔ میں نے اُن صاحب سے پُوچھا "یہ جو کافی ہاؤس ہے؟ کیا یہ بھارت میں نہیں ہے؟"

"نہیں" وہ بڑے فخر سے اکڑ کر بولا "ہم کافی ہاؤس میں بیٹھنے والے لوگ ہندوستانی نہیں ہیں۔ آپ کی طرح اجنبی ہیں۔ ہم ہندوستان کے متعلّق آپ سے بھی کم جانتے ہیں اور جتنا کچھ بھی جانتے ہیں، آپ ایسے غیر مُلکی سیّاحوں کے سفرناموں کے ذریعے جانتے ہیں۔ اِس کافی ہاؤس میں بیٹھنے والا کوئی ہندوستانی اپنے آپ کو ہندوستانی نہیں کہتا۔ اگر کہہ دے تو اپنی نظروں میں آپ ہی حقیر اور ذلیل ہو جاتا ہے۔ کافی ہاؤس کا ہندوستانی یا تو انگریز ہے یا امریکی ہے یا جاپانی یا چینی یا افریقی۔ کبھی ایک اپنے آپ کو رُوسی بھی کہتے ہیں اور رُوسی کمیونزم کے نام پر یہاں کے سرمایہ داروں سے فلرٹ کرتے ہیں۔ غرض آپ کو اِس کافی ہاؤس میں ہر چیز مِل جائے گی لیکن بھارت نہ ملے گا۔"

میں نے حیران ہو کر پُوچھا "تو آپ لوگوں نے اِس کا نام انڈیا کافی ہاؤس کیوں رکھا ہے؟"

"یہ منیجر کی غلطی ہے۔"

اِس پر کافی ہاؤس کی میز کے اِرد گِرد بیٹھے ہوئے سبھی ہندوستانی اجنبیوں نے بہت زوردار قہقہہ لگایا۔ میں نے ہندوستانی لوگوں میں یہ قابلِ رشک خوبی دیکھی ہے کہ وہ اپنی حماقتوں اور غلطیوں پر پیٹ بھر قہقہے لگاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی غیر ہندوستانی اُن کا مذاق اُڑائے تو اُس کے خلاف ستیہ گرہ شروع کر دیتے ہیں۔ صرف ستیہ گرہ ہی نے ہندوستانیوں کو متّحد کر رکھا ہے۔

قہقہہ لگانے کے بعد وہ ادھیڑ عمر ہندوستانی یکدم سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ "مجھے اُس گلابی سکرٹ پہن کر بیٹھی ہوئی ہپی چھوکری کی قسم! میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ ہم واقعی اپنے بھارت میں اجنبی ہیں۔ مثلاً بتایئے، کیا آپ نے بُلبل دیکھی ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔"

"میں نے بھی نہیں دیکھی۔ لیکن میں نے اپنی شاعری میں سینکڑوں بار بُلبل کو اپنی محبوبہ کے طور پر پیار کیا ہے اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ نہ مجھے بُلبل ملی ہے نہ محبوبہ۔ دونوں سے محرومی اور حسرت میری شاعری کا محور ہے۔"

یہ کہہ کر وہ شاعر اُداس ہو گیا اور گلابی سکرٹ والی ہپی لڑکی کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے وہ بُلبل ہو۔ ہندوستانی ہمیشہ اُس محور کے گرد گھومتے ہیں جو اُن کا اپنا نہیں ہوتا۔ اِس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے فوراً کسی گاؤں کا رُخ کرنا چاہیئے، جہاں حقیقی ہندوستانی رہتا ہے۔

میں نے اُس نوجوان شاعر سے کہا "میں گاؤں جانا چاہتا ہوں۔ بتلایئے، کیسے جاؤں؟"

اُس نے مجھے لاری کے اڈّے کا ایڈریس بتایا، جو گاؤں کو جاتی ہے۔ میں نے ایڈریس بتلانے کے بدلے میں اُس کی کافی کا بِل ادا کر دیا۔ شاعر نے اُسے شاید "ٹِپ" سمجھ کر میرا شکریہ ادا کر دیا۔

میں لاریوں کے اڈّے پر ایک ٹیکسی ڈرائیور کی مدد سے پہنچا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے دس کلومیٹر لمبا چکّر کاٹ کر اڈّے تک لے گیا۔ حالانکہ لاری کا اڈّہ صرف ساڑھے تین کلومیٹر پر تھا۔ اِس سے اُسے تین گُنا زیادہ کرایہ مِل گیا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بال بچّوں والا آدمی ہے۔ ہندوستان میں بال بچّوں والے آدمی دوسروں سے فراڈ کرنے میں کوئی بُرائی نہیں سمجھتے۔

اُس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ گاؤں کا رہنے والا ہے۔ یعنی وہ اصل ہندوستانی تھا۔ اصل ہندوستانی جب گاؤں سے شہر میں آتے ہیں تو اصل ہندوستانی فطرت کو گاؤں ہی میں چھوڑ آتے ہیں اور شہر کی تہذیب اپنا لیتے ہیں، اور مجھے بتا دیا گیا تھا کہ ہندوستان شہر میں نہیں رہتا، گاؤں میں رہتا ہے۔ اِس لئے مجھے ٹیکسی ڈرائیور کے اِس فراڈ پر کوئی خاص غصّہ نہیں آیا ——— غصّہ صرف اِس بات پر کہ شہر کے ہر موڑ پر فیملی پلاننگ کے بورڈ لگے رہتے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود ڈرائیور لوگ بال بچّے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

اور پھر میں گاؤں کو جانے والی لاری پر سوار ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ اِس
ی میں قریب قریب سبھی لوگ دیہات کے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک عجیب و غریب خیال
جس پر میں خود ہی بے وقوفوں کی طرح ہنس دیا کہ یہ سبھی گاؤں والے ہیں تو اِس کا
طلب ہے، ہندوستان گاؤں میں نہیں رہتا، لاری میں رہتا ہے ـــــ اُن سبھوں کے
پر دل پر ایک دردناک سا اضمحلال پھیلا ہوا تھا۔ اُن کے میلے میلے کپڑوں سے ایک بھیانک
ی کھٹی کھٹی بدبُو آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سبھی قحط زدہ لوگ ہیں۔ میں نے
پنے قریب بیٹھے ہوئے دیہاتی سے پُوچھا "تم شہر میں کیا کرنے آئے تھے؟"

وہ بولا "میں گاؤں سے ناجائز شراب سمگل کر کے لایا تھا۔"

"کیا تم گاؤں والے کھیتوں میں اناج نہیں پیدا کرتے، ناجائز شراب اُگاتے ہو؟"

"اناج بھی پیدا کرتا ہوں۔ اناج کا ٹرک بھر کر اُس کے نیچے ناجائز شراب کی بوتلیں رکھ لیتا ہوں۔ کیونکہ شہر کے لوگوں کو اناج کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ناجائز شراب کی بھی! ہم گاؤں والے، شہر کی ہر ضرورت پُوری کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے ایک بیڑی سُلگائی اور اُس کا کثیف اور کڑوا دُھواں لاری میں پھیلا دیا۔ میں نے کہا "وہ سامنے دیکھو، ہماری نشست کے اُوپر لکھا ہوا ہے، سگریٹ بیڑی پینا منع ہے۔"

وہ بے نیازی سے بولا "لکھا ہوگا۔ میں اَن پڑھ ہوں۔"

اور پھر اُس نے لاری کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک مونچھل تھانیدار کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا "سرکار خود سگریٹ پی رہی ہے تو رعایا کو کون روک سکتا ہے!"

میں نے پُوچھا "اگر اُس تھانیدار کو معلوم ہو جائے کہ تم ناجائز شراب کے سمگلر ہو تو...؟"

"تو کیا ہوا؟ یہ تھانیدار اپنے گاؤں کے نمبردار چودھری کرم سنگھ کا بیٹا ہی تو ہے۔ اور چودھری کرم سنگھ کو پچھلے الیکشن میں ہم ناجائز شراب سمگل کرنے والوں نے ووٹ دیئے تھے اور ناجائز شراب کی ڈھائی سو بوتلیں مُفت میں سپلائی کی تھیں۔"

میں خاموش ہو گیا اور لاری کی کھڑکی کے باہر دُور نیلے آسمان کی وُسعتوں میں دیکھنے لگا۔ کیونکہ میں ... پر ایک ملگجی سی، بالکل موت سے مشابہ گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ لیکن ہندوستان کے آسمان کی نیلاہٹ جیسے مرجھکی تھی اور چاروں طرف مضمحل کر دینے والی گرد چھائی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، ہندوستان کی ساری حقیقت سمٹ کر میلی میلی مٹی کے غُبار کی شکل میں، زمین سے اُٹھ کر آسمان پر چھا گئی ہے اور جیسے فریاد کر رہی تھی کہ اجنبی دیس کے جو لوگ میری مٹی میں سے بھارتی تہذیب کی جستجو کرنے آتے ہیں وہ مہربانی فرما کر لَوٹ جائیں۔ کیونکہ ہندوستان کے گاؤں میں ایک نئی تہذیب کی گرد جنم لے رہی ہے۔ اِس گرد میں ناجائز شراب ہے، قانون شکن تھانیدار ہے، چودھری کرم سنگھ ممبر اسمبلی ہے، ووٹ ہیں، الیکشن ہے اور وہ سب کچھ ہے جس سے بھارت کا گاؤں کبھی شناسا نہ تھا۔

لاری اچانک ایک دھچکے کے ساتھ رُکی۔ ایک پینتالیس سال کی موٹی تازی دیہاتن جو پھسکڑا مارے لاری کے فرش پر بیٹھی تھی، بلند آواز میں چیخنے دہاڑنے لگی "نامُراد اُٹھائی گیرا کا بچہ! اِس کی جوانی ٹُوٹے۔ اِس نے میرا پیسوں والا رُومال نِکال لیا!"

اور میں نے دیکھا لاری کا کنڈکٹر اور تین مسافر ایک سیاہ فام اور خاموش طبع نوجوان کو تڑا تڑ گھُونسے جما رہے تھے "نِکال حرامزادے! نِکال پیسے! انہیں تو پیسوں کی بجائے تیری بتّیسی نِکال دیں گے!"

موٹی دیہاتن اپنے وزن سے بھی زیادہ موٹی گالیاں نِکال رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں تین چار میلی دھجیاں تھیں جسے وہ رُومال کا خوبصورت نام دے رہی تھی۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ دیہاتی عورتیں بیک وقت تین چار دھجیوں کی نچلی تہوں میں گرہوں پہ گرہیں دے دے کر پیسے رکھتی ہیں۔ یہ دھجیاں بالکل بنک کے لاکر کی طرح ہوتی ہیں۔ جس پر بندوق والے پہرے دار کی بجائے گرہوں کا پہرہ ہوتا ہے اور پھر وہ اِس لاکر کو اپنے گھاگھرے کے ازار بند سے باندھ لیتی ہیں۔ کسی جیب کترے کے لئے اُس لاکر تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ جب تک وہ دانائے راز نہ ہو۔

لیکن دیہاتن تمام دھجیاں کھول کر لوگوں کو دِکھا رہی تھی اور ہائے واویلا مچاتے ہوئے برابر اُس سیاہ فام نوجوان پر تابڑ توڑ برس رہی تھی، جو بڑی حماقت کے ساتھ مار کھا رہا تھا۔

کنڈکٹر نے اُس سیاہ فام نوجوان کی ساری جیبیں ٹٹول ڈالیں۔ جن میں سے صرف ڈیڑھ روپے کی ریزگاری نِکلی۔

کنڈکٹر نے دیہاتن سے پوچھا: "تمھارے رُومال میں کتنی رقم تھی؟"

وہ بولی: "ڈیڑھ روپیہ"

"پکڑا گیا!" ایک مُسافر نے مجاہدانہ نعرہ لگایا۔

"لیکن یہ تو میرے اپنے ہیں" جیب کترے نے معصومیت سے جواب دیا۔

اِتنے میں تھانیدار اپنی پُوری رعونت کے ساتھ اُٹھ کر آ گیا۔ اُس نے انصاف کا توازن قائم رکھنے کے لئے ایک چانٹا اُس سیاہ فام نوجوان کو لگایا اور دوسرا اُس موٹی دیہاتن کو۔ دونوں ایک ساتھ بلبلا اُٹھے۔

"اُترو تم دونوں اِس لاری سے اور چلو تھانے!"

اور پھر تھانیدار، مُلزم اور مُدّعی تینوں اُتر گئے اور جونہی وہ اُترے، دیہاتن کی گٹھری میں سے ٹائم پیس کا الارم بجنے کی آواز سُنائی دی۔ دیہاتن نے گھبرا کر اپنی گٹھری کو دونوں ہاتھوں سے دبا لیا۔ جیسے الارم کو چُپ کرا رہی ہو۔ لیکن الارم بجتا رہا اور مُسافر ہنستے رہے اور تھانیدار نے دیہاتن کو نوکیلے بُوٹوں سے ایک ٹھڈا لگایا۔ دیہاتن مُنہ کے بل جا گری اور گٹھری میں بجتا ہوا ٹائم پیس خاموش ہو گیا۔ سیاہ فام نوجوان چلّایا۔

"مل گیا! مل گیا! میرا ٹائم پیس مل گیا! مجھے پہلے ہی شک تھا کہ اِس مُشٹنڈی، لفنگی ہی نے میرا ٹائم پیس چُرایا ہے!"

تھانیدار نے دوسرا ٹھڈا سیاہ فام نوجوان کے لگایا اور کہا: "کُتّے کے بچّے! تم یہ ٹائم پیس کہاں سے لائے تھے؟"

"چُرا کر لایا تھا!" ایک دیہاتی کسان نے مذاق کیا اور اپنی بغل میں دبا ہوا ٹرانزسٹر بجانے لگا، جس میں سے ایک فلمی گانا سُنائی دے رہا تھا۔ بول تھے ——

مجھ کو اے جانِ وفا
جب لگی ٹھنڈی ہوا
تم بہت ہی یاد آئے

اور اُس وقت جب فلمی گانے کا ٹیپ ریکارڈ بج رہا تھا اندر باہر گرم ہوا چل رہی تھی اور مجھے محبوبہ کی بجائے اپنا لندن یاد آ رہا تھا۔ جہاں چور بھی ہوتے ہیں اور تھانیدار بھی ہوتے ہیں لیکن جہاں ایک ٹائم پیس نہیں پُوری ٹائم پیس فیکٹری پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے اور جہاں کا انگلینڈ گاؤں میں نہیں بستا اور جہاں گاؤں کا کسان سفر کے دَوران بغل میں ٹرانزسٹر لٹکا کر نہیں چلتا۔ بھارت میں راہ چلتے چلتے ٹرانزسٹر پہ سے فلمی گانے سُننا ترقّی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جس مُلک میں مُلزم اور مُدّعی دونوں چور اور جیب کترے ہوں، وہاں ہر جُرم کے احساس کو ٹرانزسٹر سے اُبھرتے ہوئے فلمی گانے کے شور و غُل میں دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جُرم کو دبانے کی کوشش بھارت کی ترقّی کو ظاہر کرتی ہے اور تھانیدار اِس ترقّی کا محافظ بن کر سارے سماج کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔

میں نے لاری کے کنڈکٹر سے پُوچھا: "ہم گاؤں جانا چاہتے ہیں، جہاں اصل ہندوستان بستا ہے۔ مجھے بتاؤ، یہ لاری کب چلے گی؟"

کنڈکٹر نے جواب دیا: "صاحب! ایک ولایتی سگریٹ پلاؤ، جب بتاؤں گا لاری کب چلے گی۔"

میں نے سگریٹ پیش کر دیا اور کنڈکٹر کی بجائے تھانیدار نے سیٹی بجائی کہ لاری چلا دی جائے۔ کیونکہ اُس نے چوری کا ٹائم پیس اور چوری کا ڈیڑھ روپیہ دونوں اپنے قبضے میں لے لئے تھے۔ لاری چل پڑی۔ دیہاتن اور سیہ فام نوجوان دونوں حسرت سے لاری کو چلتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھر لاری سے اُڑتے ہوئے گرد و غُبار میں گُم ہو گئے۔ چوری کا ٹائم پیس، ڈیڑھ روپیہ اور تھانیدار تینوں گاؤں کی طرف جا رہے تھے!!

اگر یہ کہا جائے کہ خوشتر گرامی اُردو رسائل کی موجودہ صدی میں محبوبِ خوبی کی حیثیت رکھتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ایک مُستقل اور فطری ایڈیٹر ہے۔ اُردو ادب پر کئی کرائسس آئے اور کئی ابھی آئیں گے لیکن خوشتر گرامی کی ادارتی صلاحیتوں پر ہم نے کبھی کرائسس آتے نہیں دیکھا۔ چنانچہ اُردو کے ادبی حلقوں میں اِس امر پر عام اتفاق ہے کہ خوشتر گرامی اور 'بیسویں صدی' دونوں کا رشتہ گوشت اور پوست کا رشتہ ہے۔ ایک کا تصوّر دوسرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا —— اور اِس امر کا ثبوت خوشتر گرامی اور 'بیسویں صدی' کی وہ امٹ روایات ہیں، جو نہ صرف 'بیسویں صدی' کے عام ماہناموں میں بلکہ اِس کے ہر افسانہ نمبر اور سالنامہ نے قائم کی ہیں۔ ۱۹۶۹ء کا زیرِ نظر افسانہ نمبر اُن فنی روایات کی ایک اور کڑی ہے جو نہ صرف ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اُردو افسانہ کس منزل پر ہے، بلکہ یہ بھی کہ ادبی روایات کو آگے بڑھانا اور قائم رکھنا ہر ایڈیٹر کا کام نہیں ہے۔ بالخصوص اِن حالات میں جبکہ اُردو ادب پر دُشمنوں نے چاروں طرف سے یلغار کر رکھی ہو —— ہم اِس افسانہ نمبر کے متعلّق اِس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ اِسے خوشتر گرامی نے مرتّب کیا ہے اور اِس میں ہند اور پاکستان کے اُن تمام بلند پایہ افسانہ نگاروں نے اپنا خونِ جگر صَرف کیا ہے، جنھیں ایک جگہ اکٹھا کرنا صرف خوشتر گرامی ایسے ایڈیٹر کا کام ہے۔ جسے 'بیسویں صدی' اِتنا محبوب نہیں، جتنی اُس کی روایات محبوب ہیں۔ پونے دو سو صفحات کے اِس افسانہ نمبر میں ہر وہ چیز موجود ہے، جس کی ہم خوشتر صاحب سے توقّع رکھتے ہیں۔

روزنامہ ملاپ —— دلّی

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

افسانہ

سیلف پورٹریٹ

گربچن سنگھ

۹/اے، پنجابی لائن، رام داس بھٹہ، جمشید پور ۱۔

محترم خوشتر صاحب آداب

.... "سیلف پورٹریٹ" بھیج رہا ہوں۔ اپنی کہانی کے متعلق میں خود کیا کہوں۔ پڑھنے والے ہی اس کی خوبصورتی کا اندازہ لگا سکتے ہیں....

آپ کا ——— گربچن سنگھ

★

آسمان پر اُس وقت بادل گھر آئے تھے اور لان کی فضا میں اُداسی چھا گئی تھی۔ کرماکر چند لمحات تک نظریں اُٹھائے اُن بادلوں کو دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "کبھی کبھی رنگ بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔"

"کیسے....؟" چلتے چلتے پربھا کے قدم رُک سے گئے۔

"دیکھو ان بادلوں کا رنگ.... کیا یہ برسینگے....؟"

"لیکن آپ کی بات کا مطلب تو کچھ اور ہی نکلتا ہے۔"

"نہیں بات کوئی اتنی پیچیدہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اُس تصویر کو دیکھ کر چونک سا گیا تھا۔"

"شاید مجھے دیکھ کر اور بھی! ہے نا...."

"ہاں! یہ تو مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ تمہارا گھر ہے۔ اور مسٹر جوشی تمہارے خاوند...."

"تب یہاں کیسے چلے آئے....؟"

"کل کافی ہاؤس میں ایک دوست نے مسٹر جوشی سے تعارف کرایا۔ اُنھیں کے منہ سے تمہاری تعریف سُنی۔ اُنہوں نے مجھے دعوت دی اور میں چلا آیا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ مسز جوشی تمہیں ہو۔"

وہ دونوں نرم مخملی گھاس پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ لان کے گوشے میں جوہی کے کچھ پودے تھے۔ اُن میں کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو سے وہاں کی فضا معطر تھی۔ وہ دونوں وہیں رُک کر دُور پہاڑ کی بلند چوٹیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس طرف سے خوشگوار ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔

چند لمحوں کے بعد پربھا بولی "آپ نے مجھے چور تو نہیں سمجھا....؟"

کرماکر نے جواب دیا "میں ایسی جُرات کیسے کر سکتا ہوں!"

"آپ کے سوا اور کوئی یہ نہیں جانتا کہ یہ تصویر میرے ہاتھ کی بنی ہوئی نہیں ہے۔"

کرماکر نے ایک مرتبہ غور سے پربھا کی طرف دیکھا اور پھر اسکی نظریں دُور گھاٹیوں کی طرف گھوم گئیں۔ وہ اِس معاملہ میں کیا کہے! آہستہ سے پوچھ بیٹھا۔

"کیا تمہیں مجھ پر شک ہے کہ میں یہ بات کسی سے کہہ دوں گا؟"

"نہیں!" پربھا کے چہرے پر ایک اُداسی گھر آئی۔

"اِس تصویر پر تو تمہارا ہی نام منعکس ہے۔"

"لیکن یہ میرے ہاتھوں کا کمال نہیں۔"

کرماکر پھر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ہلکی ہلکی پھوار برسنے لگی تھی۔ وہ واپس بنگلے کی طرف مُڑنے لگے۔

وہ بیٹھک میں آکر بیٹھ گئے۔ پربھا چند لمحات کے بعد اُٹھتے ہوئے بولی۔

"آپ کے لئے کافی لاتی ہوں۔"

"نہیں رہنے دو۔ بیٹھو۔ ابھی تو چائے پی تھی۔" کرماکر نے منع کر دیا۔

"کیوں ..... ؟ آپ کو تو کافی پسند ہے نا۔۔۔۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ لے آؤ۔ اب بھی شاید تم پہلے جیسی مزے دار کافی بناتی ہوگی۔"

"ہاں اب بھی ویسی ہی بناتی ہوں۔" کہتی ہوئی پربھا کچن کی طرف چلی گئی۔

کرما کر سامنے لٹکتی ہوئی پربھا کے نام سے موسوم تصویر کو دیکھنے لگا۔ اور اچانک ہی جیسے کینوس پر چہرے بدلنے لگے اور ایک نئی تصویر سامنے آگئی۔

ایک مصوّر بیٹھا تصویر بنا رہا ہے اور پربھا بغل میں کھڑی اُسے دیکھ رہی ہے۔

مصوّر ہاتھ روک کر کہتا ہے۔ "لو برش تھامو۔ یہاں اِن آنکھوں میں یہ رنگ بھرو۔"

"نہیں مجھ سے نہ بھرا جائے گا۔"

"تو سیکھو گی کیسے ..... ؟"

"جو کچھ سیکھنا تھا میں نے سیکھ لیا۔"

"تو کیا یہ تصویر ادھوری رہیگی ؟"

"نہیں اسے آپ مکمل کیجئے۔"

"تمہارے ڈیڈی دیکھینگے تو کیا کہینگے ؟"

"ڈیڈی کو صرف اِس تصویر کے مکمل ہونے کا انتظار ہے۔"

ماضی کی یاد کے چند نقوش ذہن میں اُبھر کر پھر اوجھل ہو گئے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب وہ پربھا کو پینٹنگ سکھانے کے لئے اُس کے گھر جایا کرتا تھا۔ اور گھنٹوں بیٹھا اُس سے باتیں کیا کرتا تھا۔ پربھا اِتنا وقت پینٹنگ سیکھنے میں نہیں دیتی تھی جتنا کہ مصوروں سے متعلق باتیں سننے میں دیتی تھی۔ وہ وقت اب بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ اُس وقت پربھا مِس کپور تھی۔ لیکن آج وہ مسز جوشی ہے۔

برسوں بعد آج اُس سے اچانک ہی ملاقات ہوگئی تھی۔ جس چہرے کی یاد کو اُس نے اپنے دل سے نکال دینے کی کوشش کی تھی اور شاید وہ اِس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ اب اُس نے محسوس کیا، ایک پرانا زخم پھر اُس کے دل میں تازہ ہوگیا ہے۔

جن دنوں وہ پربھا کا پورٹریٹ بنا رہا تھا۔ پربھا کے والد اُسے پربھا کا سیلف پورٹریٹ کہہ کر اپنے دوستوں میں اپنی لڑکی کی تعریف کیا کرتے تھے اور لوگوں کی واہ واہ قبول کر رہے تھے۔

جن رنگوں سے اُس نے یہ تصویر بنائی تھی، اُن میں اُس نے اپنے دل کا درد سمو دیا تھا۔ یہ تصویر اُس نے اِس لئے بنانی شروع کی تھی کہ وہ پربھا کو دیکھ سکے۔ بہت قریب سے دیکھ سکے اور اُس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک سکے۔ دُور تک جھانک سکے۔

"آپ مجھے اِتنے غور سے کیوں دیکھتے ہیں ... ؟" پربھا نے ایک دن مُسکرا کر پوچھا تھا۔

جواب میں اس نے کہا تھا۔ کوئی رنگ نہیں ملتا۔ کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا جس سے صحیح رُوپ کو منعکس کر سکوں۔"

"میں کیا اتنی عجیب ہوں .... ؟"

"کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کاش! تم خود اپنے ہاتھوں سے اِس تصویر کو بناتیں۔"

"تب کیا اِس کا رُوپ کچھ اور ہوتا .... ؟"

"شاید ...."

"کرما کر جی! مصوّری سے مجھے معمولی سا لگاؤ رہا ہے۔ اُتنا ہی جتنا کہ مجھے سنگیت سے ہے۔ اور جتنا کہ میں ناچ سکتی ہوں۔ یہ تو کچھ گھروں کا فیشن ہے۔ اِسے میں نے اپنی زندگی کا آدرش نہیں بنایا۔ نہ اُس کے لئے کوئی ریاضت کی ہے۔ لیکن اب سوچتی ہوں کاش میں نے آپ سے کچھ سیکھ لیا ہوتا۔"

"میں جانتا ہوں پربھا، تم نے مجھ سے کچھ سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں بھی تمہیں مصوّری سکھانے کے لئے نہیں آتا، وقت کاٹنے کے لئے آتا ہوں۔ جس دن یہ تصویر ختم ہوگئی۔ یہاں آنا بند کر دوں گا۔"

"کیوں .... ؟" اچانک پربھا پوچھ بیٹھی تھی۔

"اِس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے پربھا۔ لیکن کیا تم یہ چاہتی ہو، میں یہاں آتا ہی رہوں۔ لیکن کس لئے .... تمہارے ڈیڈی آج ہی پوچھ رہے تھے، یہ تصویر کب ختم ہوگی۔ اور جب یہ مکمل ہوجائیگی مجھے چھٹی دے دینگے۔"

اُس دن جو اُداسی پربھا کے چہرے پر اُبھر آئی تھی، اُس کا سایہ آج بھی اُس پورٹریٹ پر نظر آتا ہے۔

ایک دن یہ تصویر مکمل ہوگئی تھی۔ پربھا کے گھر بہت سارے مہمان آئے تھے۔ سب نے اِس تصویر کی تعریف کی تھی۔ پربھا کو سراہا تھا۔ اُس دن ایک اُستاد کی حیثیت سے اُسے بھی خوشی ہوئی تھی۔ وہ ایک تصویر کو زندگی دینے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

کافی آگئی تھی۔ پربھا کہہ رہی تھی، آپ پلک گرائے بغیر اُدھر ہی دیکھے

جا رہے ہیں۔ آج کی پربھا اور کل کی پربھا میں آپ کو فرق معلوم دے رہا ہے نا؟

نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ ہاں اب تمہارے چہرے پر اُداسی کی جھلک گہری نظر آنے لگی ہے۔ کیا میں اِس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں....؟

"میری عادت ہی کچھ ایسی ہے۔ اُداسیوں میں کھوئے رہنا۔ یہ ایک نشہ ہے اور مجھے پیارا لگتا ہے۔"

"میں پہلے تمہیں اسقدر اُداس نہیں پاتا تھا۔"

"بہت دنوں کے بعد آپ مجھے دیکھ رہے ہیں، اس لئے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"کرماکر نے کافی کی پیالی مُنہ سے لگائی اور ایک چُسکی لیتے ہوئے بولا۔ تمہارے پتی مسٹر جوشی بڑے خوشدل اور ملنسار آدمی ہیں۔"

"میں بھی ایسا ہی محسوس کیا کرتی ہوں۔ مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں لیکن ایک بیوی کے رُوپ میں، میں شاید اُنھیں اتنا کچھ نہ دے سکی جتنا اُنھیں پانے کا حق ہے۔"

"اِس کی وجہ....؟"

پربھا کرماکر کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ "میں اِس کی کیا وجہ بتا سکتی ہوں۔ سوائے اس کے کہ یہ میری ناسمجھی ہو سکتی ہے...."

"کیسی ناسمجھی....؟"

"آپ ہی کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی ہوں۔ پہلے بھی کرتی تھی اور بعد میں بھی۔ یہ بات میرے دل سے نہ جا سکی۔"

"میں نے خُود ہی اُسے مبہم سا بنا دیا تھا۔"

"کیوں....؟"

"ایک ناممکن سی بات کو ممکن بنانے کی کوشش میں مغز ماری کرنے اور سنہرے خوابوں کا محل تعمیر کرنے سے کیا فائدہ ہوتا!"

"ڈیڈی کو ہمارے خیالات اور جذبات کا پتہ چل جاتا تو شاید وہ کبھی انکار نہ کرتے۔"

"ڈیڈی تک پہنچنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔"

"کیوں، کیا مجھ پر یقین نہ تھا....؟"

نہیں! تمہارا یقین پاکر ہی میں کچھ سوچنے لگا تھا۔ لیکن مجھے اپنے آپ پر یقین نہ تھا۔ تم میں اور مجھ میں فرق صرف اِتنا ہی تھا کہ جس شے کو تم اور تمہارے طبقے کے لوگ فیشن کے رُوپ میں قبول کرنے کے عادی ہیں، میرے یا میرے جیسوں کے لئے وہ زندگی کا آدرش ہے۔"

پربھا کے چہرے پر گہری اُداسی اُبھر آئی اور آنکھوں کے کنارے اور بھی بھیگ گئے۔

باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کچھ تیز تھی اور درختوں کی شاخیں ہوا سے اُلجھ اُلجھ کر جیسے قہقہے لگا رہی تھیں۔

کرماکر باہر دیکھنے لگا بڑا حسین اور خوشگوار موسم ہے۔ ایسے موسم میں یا تو کسی دلچسپ کتاب کا مطالعہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یا پھر کافی کی گرم پیالیوں کے مزے لے لے کر گپ لڑانے کو.... وہ چند لمحات باہر کی طرف نظریں جمائے رہا۔

پربھا نے اُس کا دھیان اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا: "یہ تو پوچھنا بھول ہی گئی۔ آپ یہاں کہاں ٹھہرے ہیں...؟"

"ہے ایک جان پہچان کا آدمی۔ اُسی کے یہاں۔"

"ہمارے یہاں آجایئے۔ کچھ دن یہیں رہیئے۔"

"میں ممنون ہوں۔ لیکن کل شب واپس لَوٹ رہا ہوں۔"

اُس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ چار بجنے کو تھے۔ باہر پانی اُسی طرح برس رہا تھا۔

"کیا چند دن اور ٹھہر سکنا آپ کے لئے ممکن نہیں ہے....؟"

"کچھ ایسا ہی سمجھ لو...."

پربھا خاموش رہ گئی۔

پچھلے واقعات سے تعلق رکھنے والی ایک بات اُسے یاد ہے۔ ایک مرتبہ پربھا کی کہیں دعوت تھی۔ اُس کے ڈیڈی کسی کام سے باہر چلے گئے تھے جاتے ہوئے وہ پربھا ہی کو دعوت میں شریک ہونے کو کہہ گئے تھے۔

پربھا وہاں تنہا نہیں جانا چاہتی تھی۔ اُس نے کرماکر سے ساتھ چلنے کی التجا کی تھی۔ اُس نے انکار کر دیا تھا۔ پربھا نے پھر ریکویسٹ کی تھی۔ پھر انکار۔ اِسی طرح پربھا نے اُس سے کئی بار کہا تھا۔ بہت اصرار کیا تھا ساتھ لے جانے کے لئے۔ تب اُس نے کہا تھا۔

"پربھا مجھ پر دباؤ نہ ڈالو...."

دباؤ کا یہ سخت لفظ اُس دن پربھا کے لئے برداشت سے باہر ہو گیا

تھا اور وہ رومال سے اپنے آنسو پونچھنے لگی تھی۔ اُس دن کرماکر کو اِس لفظ سے بہت دُکھ ہوا تھا۔ اور اُس نے فیصلہ کیا تھا اب وہ ایسے الفاظ کبھی زبان پہ نہ لائے گا۔ آج بھی یہ لفظ اُس کی زبان سے نکلنے ہی والا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

وہ پوچھ رہا تھا۔ میرے انکار پر تم بُرا تو نہیں مان گئیں۔

"نہیں بالکل نہیں ....." پربھا کے لبوں پر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ اُبھر آئی۔

"مجھے تمہیں سُکھی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کاش میں مسٹر جوشی کے ساتھ تمہاری ایک تصویر کھینچ سکتا۔"

پربھا خاموش رہی۔

باتوں باتوں میں وہ کافی پینا بھول گیا تھا۔

پربھا ٹھنڈی پیالی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی "میں آپ کے لئے اور کافی لاتی ہوں۔" اور کچن میں جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں رہنے دو۔ اب چلوں گا۔ بارش تھم گئی ہے۔"

لیکن پربھا نہ مانی اور کافی لانے کے لئے چلی گئی۔

بارش واقعی تھم چکی تھی۔ ہلکا سا کوئی بادل آیا تھا، برس کر چلا گیا۔

کافی کی دوسری پیالی بھی آگئی۔

"تم نے ناحق تکلیف کی پربھا! دیکھو بارش تو تھم بھی چکی ہے۔ کافی کی کیا ضرورت تھی۔"

"میں جانتی ہوں، کافی کے ساتھ بارش کا لگاؤ پُرانا ہے۔ لیکن یہ اب بھی مزہ دیگی۔ پیجئے نا۔"

اُسی وقت گھر کا نوکر کمرہ میں داخل ہوا۔ اُس کے کندھے سے ایک چھوٹی سی سیڑھی لٹک رہی تھی۔ لٹکتی ہوئی تصویر کی دیوار کے ساتھ سیڑھی لگا کر وہ اُس پر چڑھ گیا اور تصویر اُتارنے لگا۔

کرماکر سب کچھ دیکھتا رہا اور کافی پیتا رہا۔ اُسے نوکر کی یہ حرکت کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ پربھا سے پوچھ بیٹھا "تصویر کیوں اُتاری جا رہی ہے؟"

وہ مُسکرا کر بولی۔ "یہ غلط جگہ لگی ہوئی تھی۔"

"کیا یہ کہیں اور لگائی جائے گی۔"

"ہاں اِس کی جگہ کہیں اور ہے ....."

نوکر تصویر اور سیڑھی لئے کمرہ سے باہر چلا گیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے پربھا بھی چلی گئی۔

کچھ لمحوں کے بعد جب لوٹ کر آئی تو اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ تھا، جو پُرانے اخبار میں لپٹا ہوا تھا۔ اُس نے وہ پیکٹ کرماکر کے سامنے ایک طرف رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے .....؟" کرماکر نے پوچھا۔

"وہی تصویر!" پربھا آہستہ سے بولی۔

"یہ کس لئے .....؟"

"آپ اِسے اپنے ساتھ لے جائیے۔"

"کیوں .....؟ میں اس کا کیا کروں گا؟"

"یہ تصویر اس گھر میں نہیں جچتی۔ اس کی جگہ آپ کا گھر ہے ....."

کرماکر پربھا کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ "پربھا ابھی کیا کچھ باقی رہ گیا ہے؟"

"ہاں .....!" کہتے ہوئے اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"میں اِسے لے کر کیا کروں گا؟"

"آپکی امانت ہے۔ میں نے اِسے آج تک بڑے جتن سے سنبھال کر رکھا۔ اب سنبھالنا مشکل ہے۔"

"اگر مسٹر جوشی یہ پوچھیں کہ یہ تصویر کہاں گئی تو کیا جواب دوگی۔؟"

"میں صاف کہہ دونگی کہ تصویر آپ کو پسند آئی اور میں نے آپ کے حوالے کر دی۔"

"اُنہیں اِس سے دُکھ ہوگا ....."

"میری مرضی کے خلاف وہ کبھی کچھ نہیں سوچتے۔ دُکھ کیسے ہوگا۔"

کرماکر کچھ دیر تک اُس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اُس کی نظریں کھڑکی کی طرف گھوم گئیں۔ شام کی اُترنے والی اُداسیاں گہری ہو گئیں تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ .....؟"

وہ پھر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ تم تو یہ جانتی ہی ہو پربھا کہ میں نے یہ تصویر اپنے لئے نہیں بنائی تھی۔ تمہارے لئے تیار کی تھی۔ کیونکہ تمہارے پتا اسے تمہارے جہیز کے ساتھ دینا چاہتے تھے۔"

"وقت کے ساتھ اب وہ بات بھی ختم ہو گئی ہے۔" پربھا کی آنکھوں میں ایک التجا تھی۔

"لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اِسے اپنے ساتھ نہ لے جا سکونگا۔"

[redacted]

"کیوں....؟" پربھا کے دل سے جیسے یہ سوال تڑپ کر باہر نکل آیا۔
"میں چاہتا ہوں، یہ ہمیشہ تمہارے پاس ہی رہے۔ شاید میں اسے سنبھال کر نہ رکھ سکوں۔"

پربھا کے مونہہ سے اور کوئی لفظ نہیں نکلا،
"اچھا اب چلوں....!" کہتے ہوئے وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔
پربھا اپنی جگہ بیٹھی ہی رہی۔

جب کرما کمرہ سے باہر چلا گیا تو وہ اُٹھی اور دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔
کرما کر لان پار کرتا ہوا بڑے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور وہ کھڑی کھوئی کھوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شام کی اُداسیاں پھیلنے سی لگی تھیں....!

قطعات

بشیر فاروقی بی اے

یوں مرے جادۂ تمنا پر
تیرے غم کے نشان ملتے ہیں
جیسے دریا میں عکس تاروں کا
جیسے کانٹوں میں پھول کھلتے ہیں

زندگی کی اُداس راہوں میں
رحمتوں کا نزول ہو جاتا
اُس نے کی ہی نہیں نگاہِ کرم
ورنہ کانٹا بھی پھول ہو جاتا

سخت حالات کے اندھیرے میں
آپ ہوتے ہیں ساتھ کچھ ایسے
اِک عبادت گزار کے دل میں
آرزوئے ثواب ہو جیسے

تیرے دیر و حرم کو اے واعظ
کوئی میکش بُرا نہیں کہتا
دیر و کعبہ خدا کے گھر ہیں مگر
تیرے دل میں خدا نہیں رہتا

غزل

نازؔ قادری ایم اے

طرب گاہِ جہاں میں سوچتا ہوں
کسی ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہوں

ہر اِک صورت کو اب یوں دیکھتا ہوں
کہ جیسے تیرا چہرہ ڈھونڈتا ہوں

کروں کیا آپ کے عرفاں کا دعویٰ
کب اپنے آپ کو پہچانتا ہوں

ہزاروں تجھ سے شکوے ہیں تو لیکن
تجھے اے زندگی! میں چاہتا ہوں

فریبِ دوستی کھائے ہیں اتنے
کہ اپنے سائے سے بھی ڈر رہا ہوں

کوئی منزل، نہ کوئی رہنما ہے
کسی کی جستجو میں کھو گیا ہوں

غم و اندوہ کی اس دھوپ میں نازؔ
تری یادوں کے سائے میں کھڑا ہوں


ان آدمیوں کیلئے جو ڈیزائن
اور فنیشن کے ساتھ چستی اور آرام
چاہتے ہیں
اگر آپ ڈیزائن اور فنیشن کے ساتھ ساتھ چستی اور آرام چاہتے
ہیں تو یقیناً آپ یہ جوتے پسند کرینگے۔ باٹا کے اسٹائل اور فنیشن سے
بھرپور دانے دار چمڑے سے بنے ہوئے یہ جوتے شاندار
خوبصورت ٹکاؤ اور مضبوط ہوتے ہیں۔ کام پر جانا ہو یا کسی
سے ملنے جلنے جانا ہو۔ یہ جوتے ہر وقت اور ہر موقعہ کیلئے
کارآمد ہیں۔ چکنا انسول چمکدار تلا اور ایسی
ایڑی کا جس سے چال میں تیزی آتی ہو۔ بناوٹ اتنی
آرام دہ ہے کہ دن بھر آپ تر و تازہ بنے رہتے ہیں اور
تھکاوٹ معلوم نہیں پڑتی۔ آج ہی باٹا کی قریبی
دوکان میں جائیے اور ایک جوڑا خرید کر آرام حاصل کیجئے
گولڈیپ کیزول
۲۸٫۹۵ روپے
گولڈیپ ڈربی
۲۸٫۹۵ روپے
Bata
گولڈیپ
۲۷٫۹۵ روپے
واک ماسٹر
ڈربی ۳۴٫۹۵ روپے
واک ماسٹر
کیزول ۳۴٫۹۵ روپے

صحت و زندگی

۱ • آلو بخارا ــــ موسم گرما کا ایک مفید پھل

آلو بخارا موسم گرما کا ایک مشہور پھل ہے۔ اِس کا مزاج سرد تر ہے۔ یہ بدن کی خُشکی اور گرمی کو دُور کرتا ہے۔ دل کو تقویت دیتا ہے۔ دل کے سارے عوارض، خفقان، اختلاج میں فائدہ بخش ہے۔ معدہ کی تیزابیت اور جلن کے لئے مفید ہے۔ اِسے کھانے سے سینہ کی سوزش دُور ہو جاتی ہے۔

آلو بخارا گرمی کے موسم میں ہونے والی قے اور متلی کا موثر علاج ہے۔ قبض کشا ہے، قبض دُور کرتا ہے۔ قبض کے مریضوں کے لئے بلاشُبہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ گرمی کے موسم میں اِس کا استعمال خاص طور پر مفید ہے۔

آلو بخارا ہر قسم کے بخاروں میں بہت مفید ہے۔ پیاس کو کم کرتا ہے۔ بخار کی حِدّت کو کم کر کے طبیعت میں سکون پیدا کرتا ہے۔ دستوں کے مریض اسے ہرگز استعمال نہ کریں۔ نزلہ، زکام اور کھانسی میں اِس کا استعمال مضر ہے۔

آلو بخارا دوائی اعتبار سے بہت سے خواص کا حامل ہونے کے ساتھ ہی غذائی اجزاء سے بھی بھرپور ہے۔ اِس میں فولاد کی وافر مقدار موجود ہے۔ وٹامن سی کے علاوہ اِس میں دوسرے کئی وٹامنز بھی ہیں۔

۲ • آپ کا جِگر

آپ چاق وچوبند اور صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو اپنے جِگر کی طرف سے کبھی غفلت نہ برتئے۔ انسان کے جسم میں جِگر وہ واحد عضو ہے جسے کئی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جِگر غذا کی فاضل مقدار کے لئے اسٹور کا کام دیتا ہے۔ دواؤں اور تیزابی مادّوں کو ہمارے لئے غیر مضرّت رساں بناتا ہے۔ یہ بعض وٹامنز بھی پیدا کرتا ہے اور ہمیں جریان خون نیز ہماری شریانوں کو پھٹنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ خون کے نئے خلئے پیدا کرنے میں بھی یہ ایک حد تک ہماری مدد کرتا ہے اور از کار رفتہ خلیوں کا اخراج کرتا ہے۔ جِگر پروٹین کو جزو بدن بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جو اجزاء جسم کے نشو و نما میں کوئی مدد نہیں دے سکتے اُنھیں پیشاب یا پاخانے کے ساتھ خارج کر دیتا ہے۔ اِس کے علاوہ جِگر ہی وہ عضو ہے جو بعض خاص طرز کی پروٹین بھی ہمارے لئے تیار کرتا ہے جو مختلف خدمات انجام دیتی ہے۔

جِگر کسی نہ کسی عنوان ہاضمے کی تقریباً ہر کڑی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے جسم کے لئے تمام کیمیاوی اجزاء اِسی فیکٹری میں تیار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جِگر آپ کے محافظ کی بھی خدمات انجام دیتا ہے۔ اِس لئے آپ بھی اپنے جِگر کی حفاظت کیجئے۔ اُس کی طرف سے کبھی غفلت نہ برتئے۔ جِگر کی خرابی سے موت کا ڈر شاید اُتنا نہیں ہوتا جتنا طرح طرح کی تکالیف کا۔ جِگر ایک پیچیدہ عضو ہے۔ اِس کی ذرا سی خرابی بہت سے امراض کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ جیسے ہی کوئی خرابی پیدا ہو اپنی صحت اور غذا کی طرف خاص توجہ دیجئے اور کسی تجربہ کار معالج سے رجوع کیجئے۔

۳ • آپ کے سر کے بال

مرد ہو یا عورت سر کے بال بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ آرائش و زیبائش اور وجاہت و وقار میں بالوں کا بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ بالوں کی قدر اُس سے پُوچھیے جو بالوں سے محروم ہو۔ اِس لئے بالوں کی طرف سے بے پروائی ہرگز نہ برتنی چاہئے۔ سر کے بالوں کے لئے دھُوپ سے بہتر کوئی ٹانک نہیں ہے۔ اِس قدرتی ٹانک کا جواب آج تک کوئی کیمسٹ نہ پیش کر سکا۔

روزانہ ایک گھنٹہ باہر کھُلی ہَوا میں اپنے بالوں کو دھُوپ دے لیجئے۔ خواتین کو چاہیے کہ دھُوپ دیتے وقت بالوں کو ڈھیلا کر کے کھول دیں تاکہ اُن میں سے ہَوا بھی گُزر سکے اور دھُوپ بھی گُزر کر کھوپڑی کی جلد کو سینک دے۔ اگر روزانہ اِس طرح بالوں کو دھُوپ دی جائے تو بالوں کا قدرتی رنگ بھی قائم رہے گا اور وہ وقت سے پہلے سفید نہ ہوں گے۔ اگر کسی کے سر کی جلد پر ایسا محسوس ہو کہ وہ دھُوپ سے جلنے لگی ہے تو

اِس سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ کوئی نقصان نہ ہوگا۔ گرمیوں کے موسم میں بالکل علی الصباح دھوپ لینی چاہیئے اور ایک گھنٹہ کے بجائے آدھ گھنٹہ کافی ہوگا۔

دھوپ اور ہوا دینے سے بالوں کے سارے عوارض جاتے رہیں گے اور بال چمکیلے اور خوبصورت رہیں گے۔ بالوں کو دھوپ اور ہوا دینے کے ساتھ ہی روزانہ برش کرنا چاہیئے۔ اِس سے بالوں میں ریشم کی سی نرمی اور چمک پیدا ہوجاتی ہے۔

۴ • خوف ــــــ ایک بیماری

صحت مند دماغ کا پہلا عمل یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بیدار رکھے اور وہم میں مبتلا ہوکر خیال خواب میں وقت اور صحت برباد نہ کرے۔ جو لوگ بے بنیاد خوف یا اعصابی اضطراب کو اپنے اوپر سوار کرلیتے ہیں، وہ اپنے اندر ایک ایسے خطرناک کیڑے کو پالتے ہیں، جو انھیں اندر ہی اندر گھلاتا اور اُن کا خون چوستا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ اُن کے اعضائے جسمانی اور قوائے عمل کو کمزور اور معطّل کردیتا ہے۔ وہ رات دن سوچ اور خوف میں گرفتار رہتے ہیں۔ اُن کی قوتِ عمل مفقود ہوکر انھیں ناکارہ بنا دیتی ہے۔ کسی بات کو وقت سے پہلے سوچنا سمجھنا اچھا ضرور ہے، لیکن عمل کے بغیر اُس کی سوچ میں پریشان ہوتے رہنا بے سُود اور لاحاصل ہے۔

۵ • پودینہ ــــــ ایک مفید سبزی

اِس میں تریاقیت اور جوہر لطیف ہے۔ اس کا مزاج گرم و خشک ہے۔ یہ بے حد ہاضم اور تقوی معدہ ہے۔ گُردے، معدے اور جگر کو تقویت پہنچاتا ہے۔ بلغم کو چھانٹتا ہے۔ پیٹ کے درد اور اُپھارے میں بہت مفید ہے۔ پیٹ کے کیڑے ہلاک کرتا ہے اور پیشاب کھول کر لاتا ہے۔

پودینہ تپ بلغمی اور فساد خون کو دُور کرتا ہے۔ خاص طور سے مرضِ جذام اور داء الفیل میں مفید ہے۔ شہد کے ساتھ مدر بول و حرق کے لئے مفید ہے۔ سکنجبین کے ساتھ متلی اور قے کا دافع، ہچکی کو نافع اور شہد اور نمک کے ساتھ کرم معدہ کو خارج کرتا ہے۔ انار دانے کے ساتھ پودینہ کی چٹنی بہت خوش ذائقہ اور ہاضم ہے۔ معدے کو اِس سے بہت تقویت ملتی ہے۔

۶ • کیا آپ کو معلوم ہے؟

دودھ کے ساتھ ترش چیز، مچھلی، مولی، لیموں انجیر ــــــ چاول کے ساتھ سرکہ ــــــ خربوزہ کے ساتھ دہی یا میٹھا ــــــ مرغ کے گوشت کے ساتھ مولی ــــــ لسّی کے ساتھ کیلا ــــــ مرغی کے انڈے کے ساتھ مچھلی ــــــ گنّے کے رس کے ساتھ مچھلی ــــــ مونگ کے ساتھ دہی نہ کھانا چاہیئے۔

مولی دہی ایک ساتھ کھانے سے قولنج ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

دودھ ترشی سے دردِ معدہ۔ دودھ، مچھلی اور گنّے کا رس پینے سے جذام۔ گوشت اور سرکہ سے دردِ معدہ۔ دودھ شراب سے نقرس۔ لہسن، شہد اور خربوزہ سے احتراق خون ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

کھانے کے بعد ورزش، دوڑنا، تیرنا، سوار ہونا، کنویں، نہر اور بارش کا پانی ملاکر پینا، مسہل کے بعد سرد پانی پینا مضرِ صحت ہے۔

۷ • خوش نصیب انسان

وہی انسان خوش نصیب نہیں جسے دولت و ثروت حاصل ہوجائے۔ یا کوئی بڑا منصب مل جائے۔ وہ انسان زیادہ خوش نصیب ہے، جسے خدا نے فہم و بصیرت عطا فرمائی ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــــ "اگر آپ اِس کائنات کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اِسے منظم کرنے کے لئے اِس کائنات کے خالق نے کتنی دلچسپی سے کام کیا ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرّے سے لے کر ایک بڑے سے بڑے سیارہ تک میں ایک نظم و ضبط نظر آتا ہے۔ وہ انسان خوش نصیب ہے جو فطرت کی اِس عظیم الشّان کائنات سے سبق حاصل کرتا ہے اور اپنی زندگی میں نظم و ضبط قائم رکھنے کا ہمیشہ بلکہ ہر وقت خیال رکھتا ہے۔"

۸ • خوش حالی کاراز

دُنیا میں کون ہے جو خوشحال نہیں بننا چاہتا۔ آپ بھی یقیناً چاہتے ہوں گے۔ مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن کے اِن حیات افروز خیالات سے خوشحالی کی راہ پانے کے لئے آپ کو یقیناً روشنی ملے گی ـــــ "جس خدا نے ساری کائنات کو مکمّل بنایا ہے۔ اُس کے خزانے میں تمھارے لئے بھی بہت کچھ ہے۔ حدود مقرّر کرنے والے ہم خود ہیں۔ خدا تو ہمیشہ پیاسی روحوں کے لئے امرت برساتا رہتا ہے۔

باہر کے افلاس کو جیتنے کے لئے دل کے افلاس کو جیتنا ہوگا۔ سچّی خوشحالی دل کی خوشحالی سے آتی ہے۔ جس کا جنم اُمید اور مسرّت کے آغوش میں ہوتا ہے۔"

۹ • ایک غلط فہمی

بیشتر لوگ اِس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ کام کی زیادتی اعصاب و صحت کو تباہ کر سکتی ہے۔ یہ حقیقت نہیں۔ لاعلمی کی بنا پر غلط فہمی ہے۔

چوٹی کے ماہرین متّفق ہیں کہ سخت محنت سے ضعفِ دماغ و اعصاب نہیں پیدا ہوسکتا۔ دماغی خستگی اور صحت کی تباہی کے خاص اسباب یہ ہیں ـــــ اپنے کام، پیشے یا ملازمت کے متعلّق خوف، پریشانی، تشویش، یاس و نا اُمید ـــــ درحقیقت کام میں لگے رہنے سے فکر و پریشانی کے لئے وقت ہی نہیں ملتا اور اِس سے ضعفِ اعصاب اور دماغی خستگی کا سدِّ باب ہوتا ہے۔

۱۰ • اگر آپ دماغی کام کرتے ہیں

تحقیقات کے بعد ماہرین کا متّفقہ فیصلہ ہے کہ آپ کا کام زیادہ جسمانی محنت و مشقّت کا ہے تو کامل آرام و سکون کے لئے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر لیٹ جانا چاہیئے۔ لیکن آپ کا کام دماغی محنت کا طالب ہے تو کام کے بعد کامل آرام و سکون مناسب نہیں ہے۔ ورنہ اِس سے آپ کے دماغی قویٰ اتنے شکست ہو جائیں گے کہ پھر کام شروع کرنا مشکل ہو جائے گا۔

اِس لئے دماغی کام کرنے والوں کو آرام کے وقفوں میں کسی ہلکی حرکت والے مشغلوں میں گزارنا چاہیئے۔ جیسے چہل قدمی، سیر، سبزے پر ننگے پاؤں ٹہلنا، یا دوستوں سے گپ شپ، ریڈیو سُننا ـــــ ایسی ہلکی تفریح دماغ کو بیدار رکھتی ہے اور ساتھ ہی عضلات اور دماغ کی تھکن کو دُور کرتی ہے۔

۱۱ • سُنہرا خواب

مشہور مُفکّر کے۔ نوولسن نے لکھا ہے ـــــ "انسانی ترقی کی بنیادیں اِس سُنہرے خواب، اِس خوش فہمی پر استوار کی گئی ہیں کہ ایک دن ایسا آئے گا، جب ہر انسان غم و مصائب اور اندوہ و آلام کے کانٹوں کو اپنی راہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائے گا اور پھر بحرِ زندگی میں انسانی جہاز ایک ہموار سطح پر تیرتا چلا جائے گا۔ ہوسکتا ہے یہ خواب تعبیر آشنا نہ ہو۔ لیکن اِتنا تو ضرور ہوسکے گا کہ ہم اُس خواب کے سہارے اپنی تکالیف، اپنے غم اور دُکھ جھیلنے میں قدرے آسانی محسوس کرنے لگیں گے۔"

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی معاشی تمدنی علمی ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ———— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

سوال و جواب

روشن جبیں۔ کلکتہ

س۔ نازک کسے کہوں دل کو یا پھول کو؟

ج۔ کئی دل پھول سے بھی نازک ہوتے ہیں، کئی دل پتھر سے بھی سخت ہوتے ہیں، جیسے رحمتِ تمام حضرت سیدالانامؐ کا دل، مہاتما بدھ، مہاتما گاندھی کا دل —— اور چین کے چیاؤ ماؤ اور چنگیز و ہلاکو کے دل!

س۔ انسان خودکشی کے لئے کب مجبور ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب حالات سے شکست کھا کر حوصلہ کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

س۔ کسی کو اپنی زندگی سے شدید نفرت ہو گئی ہو تو بتائیں اسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اُسے اس حقیقت پر یقین کرنا چاہئے کہ زندگی جیسی بھی ہے موت سے میٹھی، موت سے پیاری ہے۔

سعیدہ نازؔ۔ کراچی

س۔ بھائی جان! عورت آپ کی نظر میں؟

ج۔ عظمت و احترام کی سزاوار ہے۔ طامس مور نے کہا ہے —— "نیک عورت رات کا تارا اور صبح کا ہیرا ہے" گولڈ اسمتھ نے کہا ہے —— "کانٹوں سے بھری ہوئی شاخ کو ایک پھول خوبصورت بنا دیتا ہے۔ اسی طرح غریب کے دل کو اور گھر کو نیک شعار عورت جنت بنا دیتی ہے۔

احسن عزیز آرزوؔ۔ لکھنؤ

س۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کا کوئی شعر سنائیے

ج۔ شفق، دھنک، مہتاب، گھٹائیں، تارے، نغمے، بجلی، پھول
اُس دامن میں کیا کچھ ہے، وہ دامن ہاتھ میں آئے تو

س۔ احساسِ کمتری؟

ج۔ احساسِ کمتری انسان کی کامیابی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے!

س۔ سکھ کے دن کتنے؟

ج۔ سکھ کے دن اُتنے ہی چھوٹے ہوتے ہیں، دُکھ کی راتیں جتنی بڑی ہوتی ہیں۔

رضا احمد مدہولی۔ حیدرآباد دکن

س۔ دُنیا میں عورت کا وجود نہ ہوتا تو ——؟

ج۔ دُنیا رنگ و بُو سے محروم ہوتی ——
وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

س۔ خوشتر صاحب! اس شعر کو پورا کیجئے ع
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ج۔ پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

س۔ کوئی درد بھرا شعر سنائیے۔

ج۔ ہم کہیں درد دل تو کس سے کہیں
کوئی ہمدرد ہے، نہ درد شناس!

سعیدالدین انصاری۔ اعظم گڑھ

س۔ کچھ اچھی باتیں بتائیے، کچھ نصیحت کیجئے۔

ج۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے ارشاد فرمایا ہے ——
دس چیزیں دس دس چیزوں کو کھا جاتی ہیں ——
رزق کو جھوٹ، نیک اعمال کو غیبت، گناہ کو توبہ، بلا کو صدقہ، عمر کو غم، عقل کو غصہ، علم کو تکبر، سخاوت کو پشیمانی، برائی کو نیکی، ظلم کو انصاف۔

تجمل حسین رضوی۔ رامپور

س۔ آج کل ہر طرف غالبؔ کا ذکر و تذکرہ ہو رہا ہے۔ پھر یہاں کیوں نہ ہو۔ غالبؔ کے مذہب و مسلک پر کچھ روشنی ڈالئے۔

ج۔ اپنے مذہب و مسلک پر خود غالبؔ نے اِن الفاظ میں روشنی ڈالی ہے ؂

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے رافضی وہ اور دہری
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیونکر ہو ماوراء النّہری؟

غالبؔ نے اپنے ایک اور سلام میں کہا ہے ؂

نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے
رکھے امامؑ سے جو بغض، کیا کہیں اُس کو

انجم علی۔ دہلی

س۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ارسطو سقراط کا شاگرد تھا؟

ج۔ ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا۔

س۔ ارسطو کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتایئے۔

ج۔ ارسطو یونان کا سب سے بڑا فلاسفر تھا۔ سکندرِ اعظم کا اُستاد تھا۔ منطق، فلسفہ، اخلاقیات اور الٰہیات کا متبحر عالم تھا۔

یونس انور واٹی۔ موسیٰ ابنی مائینس

س۔ کیا شادی کے بغیر خوشگوار زندگی نہیں گزاری جاسکتی؟

ج۔ جی نہیں۔ زندگی کا طویل سفر تنہا نہیں طے کیا جاسکتا۔

س۔ دُنیا میں فرقہ وارانہ فسادات کس مُلک میں زیادہ ہوتے ہیں؟

ج۔ مہاتما بُدھ اور مہاتما گاندھی کے دیش ہندوستان جنّت نشان میں!

س۔ عورت کا آخری حربہ آنسو ہیں اور مرد کا؟

ج۔ خشمگیں آنکھیں!

عبدالمجید خاں برہان پوری

س۔ آج کل لیڈر پارٹیوں کو لباس کی طرح کیوں بدلتے رہتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ وہ پارٹیوں کو لباس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

س۔ اسرائیل اِتنا بے عنان کیوں ہے؟

ج۔ اُس کے امن دُشمن آقاؤں سے اُسے برابر شہہ ملتی رہتی ہے۔

س۔ غالبؔ کا کوئی شعر سُنایئے۔

ج۔ عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ضیاء بگہاوی۔ بگہا چمپارن

س۔ صبر و تحمل کی حد؟

ج۔ صبر و تحمل کی کوئی حد معین نہیں کی جاسکتی۔ یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

س۔ تکمیل سے کم پر قناعت؟

ج۔ بلند حوصلہ انسان تکمیل سے کم پر قناعت نہیں کرتا۔

س۔ جب انسان جنم لیتا ہے؟

ج۔ جب انسان جنم لیتا ہے تو فرشتوں سے بھی معصوم اور مقدّس ہوتا ہے۔ ایک مغربی مفکّر نے تو یہاں تک کہا ہے ـــــ "بچہ میں خدا بن جانے کی صلاحیت ہے"!

بشیر احمد حسین منگیشور

س۔ آج کا انسان؟

ج۔ آج کا انسان انسان نہ رہا ؂

آدمی آدمی کے پیکر میں
اور کچھ ہوگا آدمی نہ رہا!

س۔ مُلک کی تقسیم کا ذمّہ دار کون؟

ج۔ یہی فرقہ پرست جو آج بھی اقلیتوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے پر تُلے ہوتے ہیں۔ جو نہیں جانتے اُن کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا ـــــ
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے!

> ماہنامہ "بیسویں صدی" انڈوپاک کے اُن معیاری رسائل میں سے ایک ہے جو ادبی دُنیا میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ اِس وقت "بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر ہمارے سامنے ہے۔ طباعت، کتابت اور ٹائیٹل اِس کا ہمیشہ سے دیدہ زیب ہوتا ہے۔ خوشتر گرامی صاحب "مُدیر" بیسویں صدی" کی جدّوجہد کے انڈوپاک میں سبھی معترف ہیں اور واقعی یہ اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ "بیسویں صدی" جیسا صاف ستھرا معیاری اور اعلیٰ جریدہ انتہائی شان و شوکت سے برابر نکال رہے ہیں۔ اُردو دُنیا میں خوشتر صاحب قابلِ فخر ہیں۔ اِن کے "تیر و نشتر" قارئین کی دلچسپی کا بہترین شاہکار ہوتے ہیں۔۔۔ "ندائے اِتحاد" دہلی

سعیدہ ناز۔ بھوپال

س۔ سہائی جان! یہ آموں کا موسم ہے، آموں کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتایئے۔

ج۔ بانو! اِس گوشیاں میں کوئی بات تفصیل سے کیسے بتائی جاسکتی ہے ــــ آم طاقت بخش اور زود ہضم پھل ہے۔ مزاج کے اعتبار سے گرم و تر ہے۔ نیا خون پیدا کرتا ہے۔ اعضائے رئیسہ کو قوت بخشتا ہے۔ جسم کو موٹا کرتا ہے نہار منہ آم کھانا مُضر ہے۔ معدے کو نقصان پہنچاتا اور گرمی پیدا کرتا ہے۔ تُرش آم صحت کے لئے مُضر ہے۔

ثریا جبیں۔ لاہور

س۔ بھائی جان! ایک خوبصورت قطعہ سنائیے۔

ج۔ سُنیئے ؎

چاندنی رات کی خوشی میں
یُوں کوئی مہ جمال آتا ہے
ایک شاعر کے ذہن میں جیسے
خوبصورت خیال آتا ہے

س۔ آپ بتاسکتے ہیں یہ رباعی کس کی ہے؟ میری سہیلی تمیں کہتی ہے، اختر شیرانی کی ہے ؎

ہر کلی مستِ خواب ہو جاتی
پتی پتی گلاب ہو جاتی
تُونے ڈالیں نہ مے فشاں نظریں
ورنہ شبنم شراب ہو جاتی

ج۔ یہ رباعی نہیں، نریش کمار شاد کا قطعہ ہے۔

عبدالقیوم ناصری گنج۔ شاہ آباد

س۔ والدین کی سرپرستی میں مستقبل تاریک نظر آئے تو؟

ج۔ بیٹے کو اپنے عزم و حوصلہ سے روشن و تابناک بنانا چاہیئے۔

س۔ عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم سابق صدر جمہوریۂ ہند کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟

ج۔ ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔

جمیل قریشی۔ الہ آباد

س۔ آپ بتاسکتے ہیں ایٹم بم کس نے اور کب ایجاد کیا؟

ج۔ اٹوہان نے ۱۹۴۱ء میں ایجاد کیا تھا۔

گوردیال بھاٹیہ۔ کانپور

س۔ امریکی گاندھی ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کو کب قتل کیا گیا؟

ج۔ اپریل ۱۹۶۸ء میں

کنول کماری۔ بمبئی

س۔ کیا سیاست مکاروں کی پناہ گاہ ہے؟

ج۔ سیاست مکاروں کی پناہ گاہ نہیں، فریب کاروں کی جولانگاہ ہے!

س۔ دولت سب کچھ نہیں لیکن بہت کچھ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ آج کے دور میں تو دولت ہی سب کچھ ہے۔

نجم الاسلام آزاد۔ علی گڑھ

س۔ کوئی حیات افروز شعر سنائیے۔

ج۔ ایک قطعہ سُنیئے ؎

کون جانے بہار آئے نہ آئے
آؤ خود مسکرائیں پھول کھلائیں
کون منت کشِ بہار بنے
زندگی کے چمن کو خود ہی سجائیں

شوکت حسین۔ دہلی

س۔ کیا آپ بتاسکتے ہیں، ساری دنیا میں ہر روز کتنے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ کتنے لوگ مرتے ہیں؟

ج۔ دُنیا میں ہر گھنٹہ میں ۵۲۴۰ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ۴۶۰۳ آدمی مرتے ہیں —— پُورے دن کا حساب آپ خود لگالیں۔

عابد انصاری۔ کلچرم شریف۔ میدک

س۔ حالات وقت کے تابع ہوتے ہیں یا وقت حالات کے تابع ہوتا ہے؟

ج۔ حالات وقت کے تابع ہوتے ہیں۔

محمد اصغر علی۔ دھنباد

س۔ انسان اپنے آپ سے کب نفرت کرنے لگتا ہے؟

ج۔ جب کسی بُرے کام پر اس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا ہے۔

س۔ خوشتر بھیا! فراق گورکھپوری کا کوئی حسین شعر سُنائیے۔

ج۔ پھیل کر اشکِ شبنم کی اِک بُوند
گُل کے لب پر ہنسی ہوگئی ہے

جلال الدین شکیب۔ لاہور

س۔ گدھے کے سر پر سینگ کیوں نہیں ہوتے؟

ج۔ یہ گدھے کی سرگزشت کے مصنف کرشن چندر جی سے پُوچھیئے۔

س۔ انسان کے سر پر بال زیادہ ہوتے ہیں یا آسمان پر تارے؟

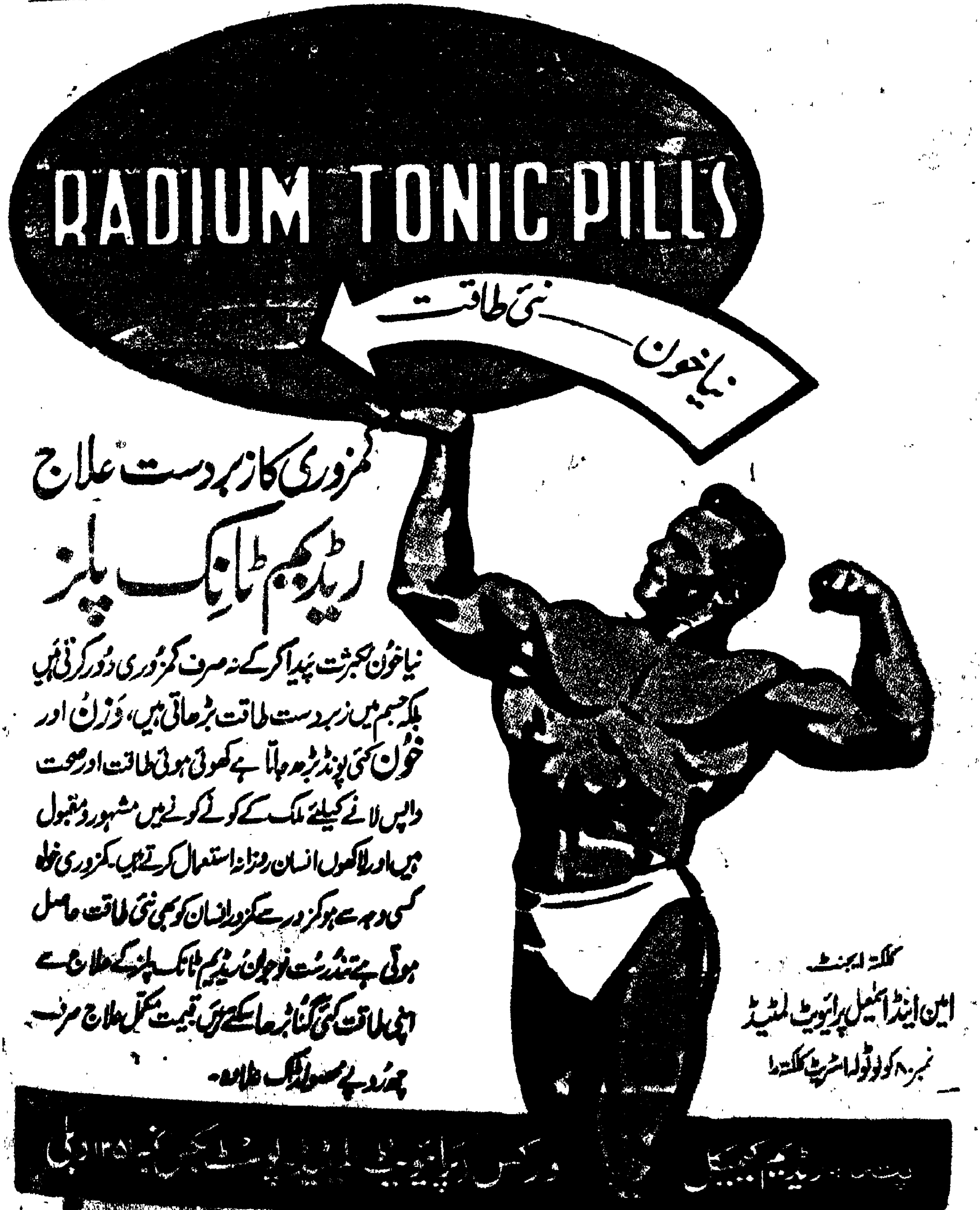
ج۔ دونوں آپ کے سامنے ہیں۔ خود گِن لیجئے۔ ہمیں بھی بتائیے گا۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی —— مطبوعہ: لکشمی پرنٹنگ ورکس، لال کنواں دہلی۔ ٹائیٹل و تصاویر: براڈسٹ پریس صدر بازار دہلی —— پتہ: دفتر بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۲

BISWIN SADI

33rd. YEAR OF PUBLICATION

Telephones Office. 271637 Residence. 619927





نگاہیں خواب کس کے دیکھتی ہیں
تصور میں یہ کون آیا ہوا ہے؟

فوٹو:- سورج این شرما۔ جے پور



جشنِ آزادی کے سلسلہ میں، انجمن عروجِ ادب کے زیرِ اہتمام جنابِ یونس سلیم نائب وزیرِ قانون کی صدارت میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا جس میں دِلّی اور بیرونِ دِلّی کے بلند پایہ شعراء نے شرکت کی ——— جنابِ یونس سلیم نے جنگ آزادی میں شعراء کے حصّے کا ذِکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان کی آزادی کی جدّوجہد میں شعراء کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ شعراء نے اپنی نظموں سے عوام میں جذبۂ آزادی پیدا کیا۔ اس لئے شعراء کو بھی حق ہے کہ جشنِ آزادی پر نازاں اور فرحاں ہوں ——— جنابِ یونس سلیم نے بنکوں کی نیشنلائزیشن کے سلسلہ میں فرمایا کہ آج سارے ملک میں اِس معاشی اِنقلاب کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ شعراء کو بھی معاشی آزادی کے لئے، شعر و فن کے ذریعہ لوگوں کو بیدار کرنا چاہیئے ؏

جشنِ آزادی

ادب دِلّی !!



دِلّی کے مقبول شاعر جناب عزیز وارثی نے اپنے نغمہ آزادی کا آغاز یوں کیا ؎

گلشن کی شاداب فضا ہے پھول کھلے ہیں ڈالی ڈالی
کتنے دلکش برگ و ثمر ہیں کتنی سُندر ہے ہریالی
اِس گلشن میں رہنے والے سب ہیں اس گلشن کے مالی
ہر دن اپنا عید ملن ہے ہر شب اپنے گھر دیوالی
گلشن کی شاداب فضا ہے پھول کھلے ہیں ڈالی ڈالی
ہر دن اپنا عید ملن ہے ہر شب اپنے گھر دیوالی

دیش ہمارا صحن چمن ہے، صحن چمن میں گھوم رہے ہیں
کلیوں پر ہیں دل سے نچھاور، پھولوں کا مُنہ چُوم رہے ہیں
برسوں ہم ناشاد رہے ہیں، صدیوں ہم مغموم رہے ہیں
آج ہے گھر میں جشنِ مسرت فرطِ خوشی سے جھوم رہے ہیں
گلشن کی شاداب فضا ہے پھول کھلے ہیں ڈالی ڈالی
ہر دن اپنا عید ملن ہے ہر شب اپنے گھر دیوالی

جشن طرب ہے جشن طرب میں آؤ اے متوالو آؤ
ذرّوں کو خورشید کی ضو دو، تاروں کو مہتاب بناؤ
گیت سُناؤ، نغمے گاؤ، وجد میں آؤ، جام اُٹھاؤ
ہند کا پرچم سب کا پرچم یہ پرچم گھر گھر لہراؤ
گلشن کی شاداب فضا ہے پھول کھلے ہیں ڈالی ڈالی
ہر دن اپنا عید ملن ہے ہر شب اپنے گھر دیوالی



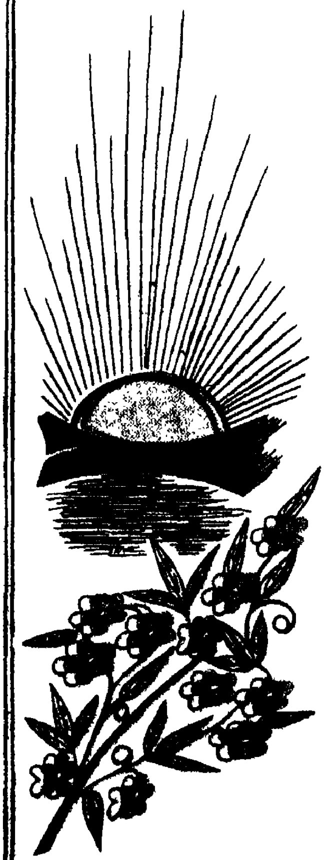
رام کرشن مضطر یوں زمزمہ خواں ہوئے ؎

اب عوامی زندگی میں آئے گا وہ اِنقلاب
جس سے ہو جائے گا پُورا گاندھی و نہرو کا خواب
عکسِ مستقبل ہے یہ، تصویر دَورِ حال کی
بڑھ رہی ہے شان سے بیٹی جواہر لال کی



محترمہ اوم پربھا جین. وزیرِ خزانہ ہریانہ گورنمنٹ نے نامور شاعر اور ادیب جنابِ کشمیری لال ذاکر کو اُن کی قابلِ قدر ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے گورنمنٹ کی طرف سے ایک سپاسنامہ، خلعت اور تھیلی پیش کی ؎

ٹیلیفون دفتر ۔۔۔۔ ۱۶۳۷ء
ٹیلیفون رہائش ۔۔۔۔ ۱۹۹۲۷



تیر و نشتر

خوشتر گرامی

"کانگریس عوام سے کٹ گئی" جگجیون رام —— پتنگ کی طرح۔

"غریبی اور بے روزگاری کے مسئلے حل نہ ہوئے تو انقلاب ناگزیر ہو جائے گا" مسز اندرا گاندھی —— اس انقلاب کو روکنا ہے تو کچھ اور کرپٹ وزیروں کو چلتا کیجئے۔

"شری چوہان سنڈیکیٹ والوں کی اینٹی اتحاد سرگرمیوں سے پریشان" ایک خبر —— اور سنڈیکیٹ والے آنجناب کی قلابازیوں سے پریشان۔

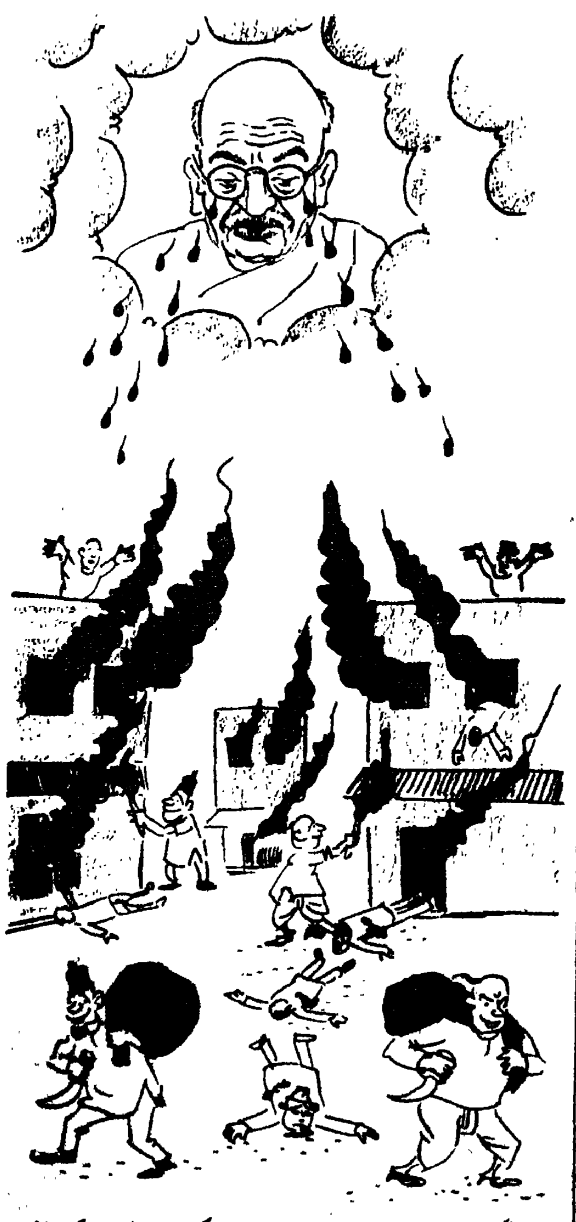
"وسیع پیمانے پر نیشنلائز کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے" مسز اندرا گاندھی —— اچھا ہوا بات صاف ہو گئی۔ اندیشہ یہ تھا کہ کہیں بیوی بچوں کو بھی نیشنلائز نہ کر دیا جائے۔

"شری مرارجی ڈیسائی کا برت" —— پاپوں کے پرائشچت کے لئے۔

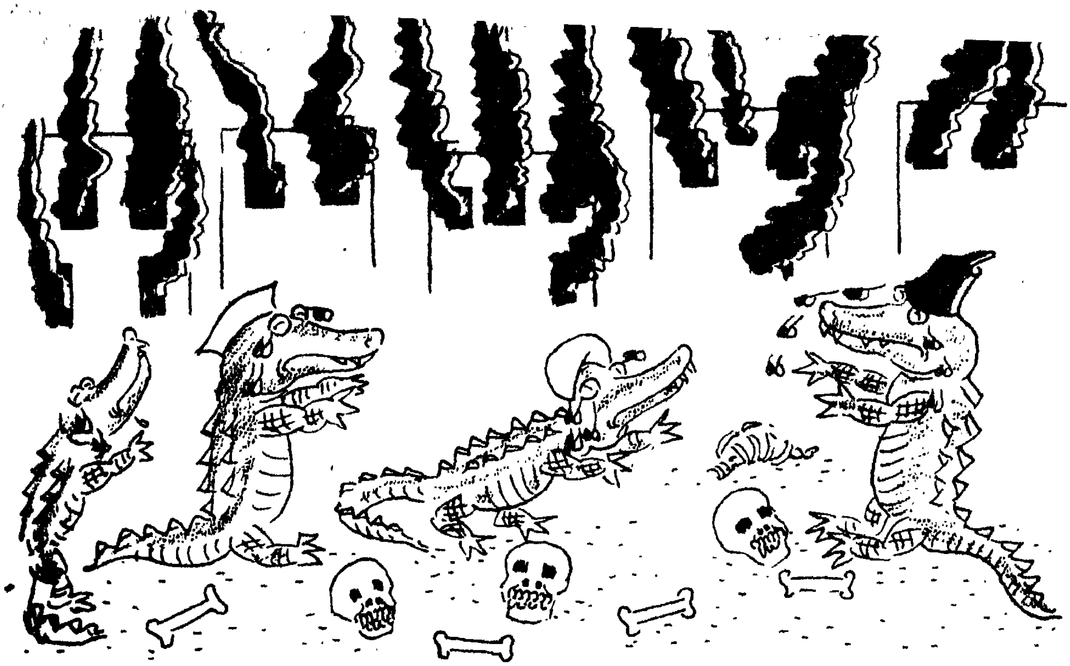
"صرف بنکوں کو نیشنلائز کرنے سے ہی عوام کا بھلا نہ ہوگا" کرشنا مینن کی تقریر —— بلکہ آپ کو بھاشن بھی بند کرنے ہوں گے۔

"کانگریس نے ہندوستان کو رہن رکھ دیا ہے" کرشنا مینن —— اور اس کی ابتدا ۱۹۶۲ء میں ہوئی جب آنجناب کی دوستی میں چین حملہ آور ہوا تھا۔

"جن سنگھ مرکز میں کانگریس کے ساتھ حکومت نہیں بنائے گا" شری باجپئی —— اس لئے کہ انگور کھٹے ہیں۔



"مہاتما گاندھی کے جنم استھان میں فسادات افسوسناک ہیں" لیڈروں کے بیانات۔



مختلف لیڈروں کی طرف سے احمد آباد (گجرات) کے فسادات کی مذمت۔

"کانگریس کو مٹھی بھر لوگوں کے پنجے سے نکال کر عوام کی جماعت بنایا
ہے" مسز اندرا گاندھی ـــــــ یعنی اس پر صرف نجلنگپا، پاٹل، مرارجی ڈیسائی،
نیوا ریڈی، اتلیہ گھوش اور کامراج کا کنٹرول نہ رہے۔

"صوبوں کے گرد و پیش" ایک عنوان ـــــــ لاٹھی، گولی، اشک آور
ں، پتھراؤ، فسادات، بسوں پر حملے، ریلوں میں رکاوٹیں، تار اور ٹیلی فون
ڑ پھوڑ۔

"سردار کپور سنگھ کے خلاف مظاہروں کا پلان" ایک خبر ـــــــ
لئے کہ وہ سنت فتح سنگھ کے مقابلے پر دوکانِ سیاست لگانا چاہتے ہیں۔

"دیش کی سرحدیں فوجی جوانوں کے ہاتھ میں محفوظ ہیں" مسز اندرا
ی ـــــــ مگر اندرونِ دیش آر ایس ایس کے نوجوانوں کی دست درازیوں
پر محفوظ ہے۔

"گجرات میں مرکزی مداخلت سے شری چوہان کا انکار" ایک عنوان
ـــــــ ان کے سیکریٹری یارِ غار مرارجی ڈیسائی کا صوبہ ہے نا!

"فرقہ وارانہ فسادات کو شروع ہی میں کچل دیا جائے" وزرائے
اعلیٰ کا فیصلہ ـــــــ بائیس برس میں یہ بات سمجھ میں آئی۔

"صوبوں کی حالت" ایک عنوان ـــــــ صرف حالت نہیں،
حالتِ زار۔

"گوڑگاؤں میں ہریانہ بند" ایک خبر ـــــــ سائنس کا کمال۔
ایک پورا صوبہ ایک ضلع میں بند ہو گیا۔

"اکالی اور جن سنگھ" ایک عنوان ـــــــ ایک ہی تھیلی کے
چٹے بٹے۔

"فرقہ وارانہ فسادات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے
روائی ہونی چاہئے" لیڈروں کے بیانات —— مگر یہ کارروائی صرف
اشنوں کے ذریعہ نہیں ہو سکتی۔

"سری نگر میں پنجاب اور ہریانہ کے چیف منسٹروں کی آئندہ ملاقات
مکان" ایک خبر —— ٹھنڈے علاقے میں ہوں گے تو ٹھنڈے دل د
اغ سے غور کر سکیں گے۔

"معلوم نہیں یونیورسٹیوں میں جاکر طلباء کو کیا ہو جاتا ہے"
رنر یو۔پی —— کہ وہ

ماں باپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔
اُستادوں کی پگڑی اچھالتے ہیں۔
علانیہ سگریٹ نوشی اور شراب نوشی کرتے ہیں۔
پولیس سے تصادم کرتے ہیں۔
بسوں کو جلاتے ہیں۔
ہڑتالیں اور مظاہرے کرتے ہیں۔

"بریلی میں وزیرِ تعلیم کا پُتلا جلایا گیا" ایک خبر —— کنوکیشن
یا طریقہ۔

"گجرات میں فساد رجعت پسندوں نے کرائے ہیں" روسی
بارات کا تبصرہ —— ذرا اور وضاحت ہو جاتی اگر کہا جاتا ——
سنڈیکیٹوں نے کرائے۔

"سنت فتح سنگھ پنجابیوں کو بے وقوف بنا رہا ہے" سردار
ب سنگھ —— اور آپ حسد سے جل رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ یہ
ن آپ کا تھا۔

"کانگریس میں واپس نہ جائیں گے" ایک عنوان —— اس لئے کہ
گرس نے وزارتیں دینے کا یقین نہیں دلایا۔



مسز اندرا گاندھی کا بنگال اور ناگا لینڈ کا دورہ۔
دوسری طرف نجلنگپا کا دورۂ یو۔پی۔



چنڈی گڑھ کا مسئلہ

"فسادزدہ علاقوں میں دورہ کرنے کے لئے فلم ستاروں کی پیشکش"
ایک خبر ——— فسادیوں کو مخاطب کرکے کہیں گے ع
لگ گئی چوٹ کلیجوا میں ہائے رام

"وزیرِ اعظم کے خیال میں بہار میں پائدار وزارت بننے کا امکان نہیں" ایک عنوان ——— ناپائدار ہی سہی۔ چند روزہ ہی سہی جس طرح بھی ہو بنا ڈالئے خدا کے لئے۔

"خاندانی منصوبہ بندی بذریعہ قانون" ——— ایسا ہوا تو پھر الگ وزارتِ خاندانی منصوبہ بندی بنے گی اور کوئی بانجھ عورت انچارج ہوگی۔
سیکولرزم، سوشلزم کے علاوہ بانجھ ازم بھی ہمارا نعرہ ہوگا اور بانجھ بنانے کے پانچ پانچ سال کے پلان بنائے جائیں گے۔

"اترپردیش کے وزیرِ اعلیٰ سی۔بی گپتا کی بلی کو دودھ پلانے پر ناراضگی" ایک خبر ——— بالکل بجا ہے۔ دودھ پینے والے سیاستداں کیا کریں گے۔

"بکرا منڈی کی تیزی میں عارضی بریک" ایک خبر ——— جو کالے بازار میں لگایا گیا۔

"لدھیانہ میں طلباء اور پولیس میں تصادم" ایک خبر ——— یہاں تو قدم قدم پہ لدھیانہ نظر آتا ہے۔ آپ ایک لدھیانے کا ذکر کرتے ہیں ع
تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

[illegible]

"آسٹریلیا میں بھیڑ اور بکری کی مخلوط نسل" ایک خبر —— ایسی ہو گی جیسے ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس کی مخلوط نسل —— جن سنگھ۔

"ہیڈ ماسٹر کو پیٹ ڈالا" ایک خبر —— طالب علموں کا قابلِ فخر کارنامہ۔

"فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف دلّی میں میر مشتاق احمد کا برت" ایک خبر —— اور دلّی کے فرقہ پرستوں کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے۔

"یہ دلّی ایڈمنسٹریشن ہے" ایک عنوان —— جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔

"ایسے ہوتے ہیں انسان؟" ایک عنوان —— جنھیں دیکھ کے شرمائیں شیطان۔

"ہندوستان کے سرکردہ سادھوؤں کی جگت گورو شنکر آچاریہ سے بغاوت" ایک خبر —— اُنھوں نے کہا جو سماج سے بغاوت کرے ہم اُس سے بغاوت کرتے ہیں۔

"شادی کے نو ماہ بعد بیوی کا قتل" ایک خبر —— انوکھا فیملی پلاننگ۔

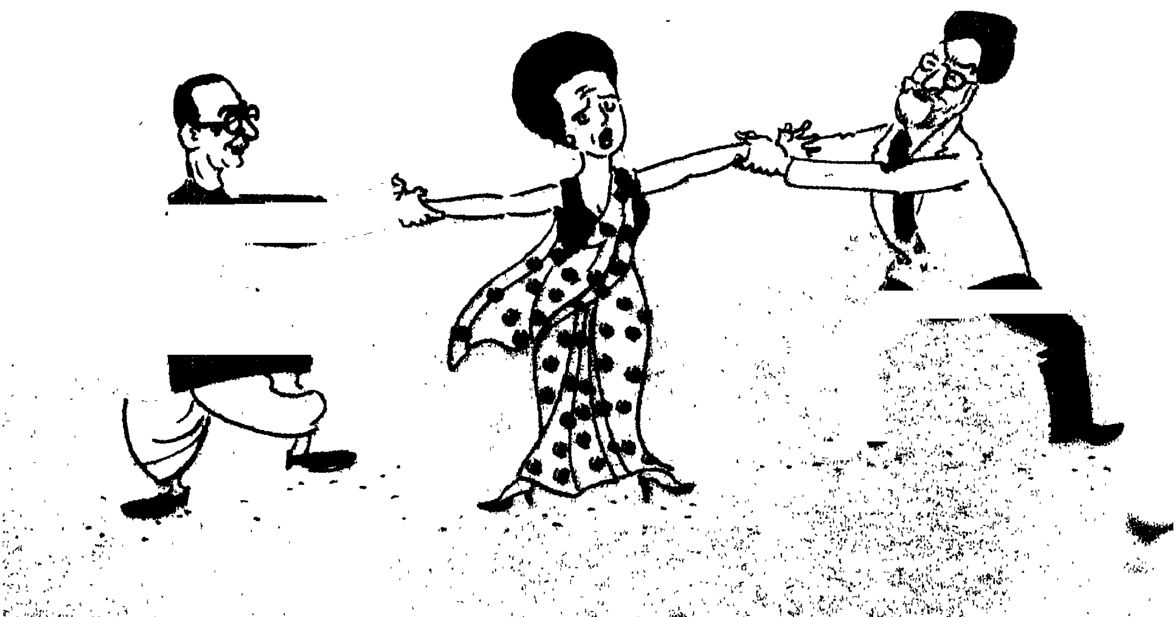
"روسی سامراجیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرو" مشرقی یورپ کو چین کا مشورہ ؏

اندھے کو اندھیرے میں بڑی دُور کی سُوجھی

"لودھی کالونی دلّی میں چلتی پھرتی بھبتی برآمد" ایک خبر —— کمبخت کے پیر نہ ہوتے تو چل کر باہر نہ آتی اور لوگ پکڑے نہ جاتے۔

"اُردو کے لئے جلسہ" —— خالی جلسے سے کام نہیں چلتا ہے ؏

یہ لاتوں کے بھوت ہیں یہاں باتیں نہیں چلتیں



چنڈی گڑھ کے لئے پنجاب اور ہریانہ میں کھینچا تانی

فرقہ پرستی

خوشتر گرامی

رُوسیاہ، فرقہ وارانہ فسادات کی بدولت پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ۔ آنکھوں سے اندھی۔ مگر کوئی نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ ناک ہر فساد میں کٹتی ہے۔ لبوں میں زہر ہے جو دلوں کو کاٹتا ہے۔ ہاتھ فولادی ہیں جو کبھی شل نہیں ہوتے۔ ہر قدم میں غارت گری، ہر حرکت میں بربادی ــــ یہ ہے ہندوستان کو گھُن کی طرح کھانے والی ــــ

فرقہ پرستی

اِس کا کوئی دھرم اور مذہب نہیں۔ اِس کے جھنڈے کے نیچے ہندو بھی ملتے ہیں مسلمان بھی ۔ سِکھ بھی ہری جن بھی ــــ اِس کی کوئی تعریف نہیں ہو سکی۔ یہ آج تک گرفت میں نہیں آسکی۔ بے گناہوں کے خون سے اِس کی پیاس بُجھتی ہے۔ امن کی دشمن، ترقّی کی مخالف، خوشحالی کی حریف ہے۔ آزادی کی جڑیں کھوکھلی کرتی ہے۔ مگر خود اِسے ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ جماعتیں بنانے کی، پرچار کی، تقریر کی، تحریر کی اور سب سے بڑھ کر تخریب کی ــــ پتھر اور سوڈا واٹر کی بوتلیں، چاقو، چھُرے، خنجر تلوار سب اِس کے ہتھیار ہیں۔ لاکھوں سُہاگنوں کا سُہاگ اُجاڑا، معصوموں کو یتیم بنایا، ماں باپ سے اُن کے جگر گوشوں کو جُدا کیا۔ مکانوں کو اُجاڑا، دُکانوں کو لُوٹا، کارخانوں کو تباہ کیا، آگ لگائی ــــ رام اور کرشن کی سرزمین، بُدھ اور گاندھی کی دھرتی، نانک اور چشتی کے وطن کو بدنام کیا ــــ مذہب اور دھرم کا لبادہ اوڑھتی ہے۔ سیاستدانوں کے دِلوں میں پرورش پاتی ہے۔ نہ مندر کو چھوڑتی ہے، نہ مسجد کو، نہ گرجا کو نہ گوردوارہ کو ــــ اِس کا ننگا ناچ کبھی مالدہ اور مالیگاؤں میں دیکھا، کبھی کلکتہ اور مرشد آباد میں، کبھی رانچی میں، کبھی جمشید پور اور جبلپور میں ــــ حال ہی میں اِس نے احمد آباد اور گجرات کے خرمنِ امن کو جلا ڈالا ــــ اور اِس پر بے ساختہ خوشتر گرامی کا دل چیخ اُٹھا ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو



معصوم سی

شاکر کریمی

محلہ گنج نمبر ا۔ نزد بڑی مسجد۔ پوسٹ بتیا (چمپارن) بہار

عظیم المرتبت! سلام و نیاز

"افسانہ نمبر" نظر نواز ہوا۔ ملک کے عظیم فنکاروں کو یکجا کر دینا آپ ہی کا کام ہے۔ اِتنا کامیاب ترین نمبر نکالنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے! ——— "اونچی اڑان" کے بعد "معصوم سی" حاضر ہے۔ یہ اُس معاشرے کی کہانی ہے جس میں مے نوشی فن، بے حیائی فیشن اور عشرت کوشی تفریح سمجھی جاتی ہے . . . اِس کے باوجود نوشابہ قابلِ رحم و معافی ہے ——— اُمید ہے "بیسویں صدی" کے بلند ذوق قارئین اِس کہانی کو پسند فرمائیں گے بشرطیکہ آپ کو پسند آجائے . . .

خلوص کیش ——— شاکر کریمی

★

اپنی نئی نویلی سہیلی شانو کے ساتھ آج وہ پہلی بار کلب جارہی تھی۔ سروقد صندلی جسم پر چاندی جیسی تارکشی کی کامدار ہلکے گلابی رنگ کی ٹیری کاٹ کی ساڑی اور بلاوز، گلے میں ترشے ہوئے سرخ بڑے نگ کی لاکٹ والی بڑی بڑی مومی موتیوں کی نکلس، کانوں میں سرخ بندے، کلائیوں میں جھلمل کرتی دو دو طلائی چوڑیاں، پاؤں میں اونچی نوکیلی ایڑی کا نائلن کا سفید جالی دار سنڈل، نہایت ہی اہتمام سے کھینچی ہوئی ٹیڑھی مانگ اور دائیں آنکھ سے اوپر گچھے دار بالوں کی ایک لٹ، پتلے پتلے رس بھرے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی تہہ، بے داغ اور چکنے رخساروں پر اسنو، پاؤڈر پر انتہائی چابکدستی سے مکس کیا ہوا روز، اور بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں کاجل کی پتلی لکیریں!

آج وہ بلا کی حسین معلوم ہورہی تھی۔ کپڑوں کے انتخاب اور میک اپ میں اگر شانو اُس کا ہاتھ نہ بٹاتی تو اُس کا حسن اِتنا نہ نکھرتا۔ اِن تمام فتنہ سامانیوں سے سج دھج کر جب وہ قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی تو خود ہکا بکا رہ گئی اور شانو کی طرف مڑتی ہوئی شوخی سے بولی۔

"دیکھو تو کیسی لگ رہی ہوں؟"

"قیامت معلوم ہوتی ہو میری جان قیامت! بس جو دیکھے وہ مر ہی تو مٹے!" شانو نے ایک بازاری عاشق کی طرح سینے پر ہاتھ مارا۔

"چُپ بے شرم!" نوشابہ جھینپ گئی۔

"سچ کہتی ہوں، تمھیں دیکھ کر آنکھیں چکاچوند ہوجائیں گی سب کی!"

"یہ بات ہے تو پھر میں نہیں جاتی!" نوشابہ اٹھلائی۔

"اب بنو نہیں، چلو بھی پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے!" اور شانو نوشابہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی باہر لیتی چلی گئی جہاں شانو کی فی ایٹ (FIAT) کلب جانے کے لئے اُن کا انتظار کر رہی تھی۔

کھنکتے ہوئے پیالے گردش کرنا بھول گئے، انگلیوں میں دبے ہوئے سگریٹ ہونٹوں تک جاتے جاتے رُک گئے، قہقہے لگاتے ہوئے چہروں پر حیرت و سنجیدگی طاری ہوگئی اور بے شمار نگاہیں نوشابہ کی طرف اُٹھ گئیں۔

اپنے جسم کے مختلف حصّوں پر اَن گنت نگاہوں کی چُبھن محسوس کرکے نوشابہ کچھ جھینپی، کچھ گھبرائی اور نگاہیں نیچی کرلیں۔

"قیامت ہے!"

"شعلہ ہے!"

"بلا کی حسین ہے!"

"اُف یہ آنکھیں!"

"ساری مستی شراب کی سی ہے!"

ہلکی ہلکی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ نوشابہ کے پیر تھرتھرانے لگے وہ اور گھبرا گئی۔

"ہائے اللہ میں کہاں آ گئی؟" وہ شانو کی طرف کھسک گئی "مجھے دہشت ہو رہی ہے، واپس لے چلو مجھے!"

"گھر کی چار دیواری میں رہتے رہتے تمھیں قید و بند کی زندگی راس آ گئی ہے، زندگی کا لطف چاہتی ہو تو کھلی ہوا میں پرواز کرو ——!" شانو نے سرگوشی کی۔

"لیکن میرے بال و پر جواب دے رہے ہیں، دیکھتی نہیں کتنی حرص و ہوس ہے ان نگاہوں میں!"

شانو ہنس پڑی "غلط سمجھی ہو۔ یہ پتھر نگاہیں تمھارے حسن کی تعریف کر رہی ہیں۔ تمھارا استقبال کر رہی ہیں!"

"نہیں نہیں شانو! میرا دم گھٹ جائے گا، واپس چلو!"

"بالکل گنواروں جیسی باتیں کرتی ہو، تھوڑی دیر اس ماحول میں رہو، پھر تم بھی میری طرح یہاں کی ایک ایک چیز سے مانوس ہو جاؤ گی اور ایسی پارٹی روز روز تھوڑے ہی ہوا کرتی ہے اور ابھی تو تمھیں اپنے میزبان سے ملنا ہے، دیکھنا کتنی گریس فل پرسنالٹی ہے اُس کی اور ..." شانو کی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ پرویز کی آواز نے انھیں اپنی طرف مخاطب کیا۔

پرویز کی جاذب نظر شخصیت، فراخدلی اور دولت کی فراوانی نے اُسے پرویز سے پرنس بنا دیا تھا۔

"ہیلو شانو!"

"ہیلو پرنس! ابھی معاف کرنا ان کی وجہ سے کچھ لیٹ ہو گئی!" شانو نے نوشابہ کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کی تعریف؟" پرنس نے نوشابہ کی طرف پُر اشتیاق نظروں سے دیکھا۔

"نہیں پہچانا، یہی تو ہیں تمھاری نادیدہ مہمان نوشابہ!"

"ونڈرفل! دی گریٹ!!" پرنس نے ٹٹولنے والی نظروں سے سر سے پیر تک نوشابہ کا جائزہ لیا۔

"زہے نصیب، بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر!" پرنس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

غیر ارادی طور پر نوشابہ نے اپنا ہاتھ پرنس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"شانو کی زبانی آپ کی تعریفیں سن سن کر اشتیاق ہوا کہ میں بھی آپ سے ملوں۔ آپ کی بڑی مداح ہے یہ شانو!"

"بکواس کی ہوگی اس نے، ورنہ میں کس قابل ہوں!" نوشابہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ اُس نے محسوس کیا پرنس کے ہاتھ کے لمس سے اُس کے شریانوں میں خون کی روانی بڑھتی جا رہی ہے۔

"آیئے آپ کا تعارف تمام دوستوں سے کراؤں!" اور پرنس شانو کا خیال کیے بغیر نوشابہ کو لے کر ڈانسنگ فلور پر نصب مائک پر آ گیا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! —— آج کلب کے پُرمسرت سالانہ جشن کے موقع پر ایک نئی اور خوبصورت ممبر سے آپ کا تعارف کراتے ہوئے میں بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ ہیں ہمارے کلب کی نئی اور خوبصورت ممبر نو... نوشابہ!"

تالیوں کی آوازوں سے کلب کا وسیع و عریض ہال گونج اُٹھا۔ لیکن صرف دو ہاتھ ان تالیوں میں شریک نہ تھے اور وہ ہاتھ تھے بڑی بڑی نیلی آنکھوں والی یاسمین کے جو کینہ توز نظروں سے نوشابہ کو گھور رہی تھی۔ نہ جانے کیوں!

اور پھر پرنس کی طرف سے دی گئی پارٹی کی کارروائی شروع ہو گئی۔

ڈنر!

رقص!!

سُرور!!

قہقہے!!

اور آرکسٹرا کی مدھر دھنیں مستی بکھیرنے لگیں۔

حسین جوڑے تھرکنے لگے۔

سانسوں کا تبادلہ ہونے لگا۔

شانوں پر زلفیں بکھرنے لگیں۔

بانہوں کے حلقے تنگ ہوتے گئے۔

کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی لپ اسٹک ہلکی ہونے لگی۔

"آیئے ہم بھی چلیں" پرنس نے آخری پیگ لیتے ہوئے نوشابہ کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں!" پرنس کی اس بے تکلفی پر نوشابہ ذرا سمٹی۔

"کیوں؟" پرنس نے مخمور آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔

"میں ڈانس نہیں جانتی!"

"کوئی بات نہیں، میں سکھا دوں گا!" اور وہ پرنس کے ساتھ ڈانسنگ

ٹھنیتی چلی گئی۔

"دایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھئے، یوں، اور یہ بایاں ہاتھ میرے ہاتھ میں دیجئے، ایسے! اب ذرا کھسک آیئے، میرے قریب۔ ارے آپ تو خواہ مخواہ شرما رہی ہیں!" اور پرنس نے اپنا بایاں ہاتھ اُس کی کمر میں ڈال دیا "ذرا اور قریب! ویری گڈ!! آپ تو بہت جلد سیکھ جائیں گی" اور پرنس کی گرم گرم سانسیں اُس کے رُخساروں کو چھونے لگیں۔

اور پھر وہ رنگین و کیف آگیں پروگراموں کے لامتناہی سلسلوں میں ڈوبتی چلی گئی اور جب اُبھری تو وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ اُسے اپنے گھر کا ماحول اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔ جہاں صرف گھٹن ہی گھٹن تھی، اُداسیاں ہی اُداسیاں تھیں۔ بیڈ روم، ڈرائنگ روم، باتھ روم، کچن، فرنیچر ساری چیزیں فرسودہ معلوم ہو رہی تھیں۔ بے کیف، بے رنگ اور . . . اور فیروز کا وجود ایک رِستا ہوا پھوڑا معلوم ہونے لگا تھا۔ اُف! یہ فلسفے کا پروفیسر خشک، خاموش، جیسے پتھر! توبہ یہ بھی کوئی زندگی ہے!!

اور یہ کلب، عیش و مسرت کی آماجگاہ! قہقہے، خوشیاں، اُمنگیں!

دن گزرتے رہے ——

اب وہ میک اپ اور کپڑوں کے انتخاب میں شانو کی محتاج نہیں تھی۔ جیسے دل لبھانے کے سارے انداز آ گئے تھے۔ جسم کے خطوط کی نمائش میں مدد دینے والے چُست کپڑوں کی اچھی پہچان ہو گئی تھی۔ گداز کولھوں، سڈول بازوؤں پر زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔ شباب اور شباب کی اُمنگوں کو دیر تک قائم رکھنے کے لئے میڈیکل چیک اپ کی اہمیت محسوس کرنے لگی تھی، چال میں ہواؤں میں تیرنے کا سا انداز پیدا ہو گیا تھا۔

وہ اِتنی اِسمارٹ ہو گئی تھی کہ سینے سے ڈھلکے ہوئے آنچل کو ہاتھوں سے سنبھالے اِس بات سے بالکل بے خبر رہتی کہ اُس کا یہ انداز دوسروں کے احساس کو گدگدا رہا ہے۔ وہ فلمی، سماجی و سیاسی موضوع کے علاوہ اغوا اور ریپ جیسے موضوع پر اِس طرح ٹھیک ٹھاک باتیں کرتی کہ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے۔ رمی، برج اور فلش کھیلتی تو تاش کے پتّے کو پھینکتے وقت کلائی کو اِس طرح جھٹکتی کہ مقابل کو کھیل ختم ہونے سے پہلے اپنی ہار کا یقین ہو جاتا۔ نقرئی گھنٹیوں کے ترنّم سے ہم آہنگ قہقہے لگاتے وقت اِس طرح جھوم جھوم جاتی جیسے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی ہوا کے جھونکے سے لچک لچک جائے۔ پرنس کے ہونٹوں میں دبے ہوئے سگریٹ سے اپنا سگریٹ اِس طرح سُلگا لیتی کہ فضا میں ایک چنگاری بھی نہ بکھرتی۔

آج وہ اُداس تھی۔ مضمحل، بجھی بجھی سی۔ آنکھوں میں رنج و غم کی جھلک، چہرے سے حُزن و ملال کے آثار نمایاں۔

آرکسٹرا کی دُھنیں رگ و پے میں طوفان برپا کر رہی تھیں۔

حسین جوڑے متحرک رہے تھے۔

اور وہ کلب کے وسیع ہال کے ایک گوشے میں تنہا پرنس کے انتظار میں بیٹھی سوچ رہی تھی ——

فیروز، چار سَو روپے ماہوار پانے والا پروفیسر۔ مفلس، مجبور، عیش و آرام کی زندگی سے بے بہرہ، میری خوشیوں کا دشمن۔ میرے بال ڈپر کاٹ دینا چاہتا ہے۔ گھر کی چہار دیواری میں قید رکھنا چاہتا ہے، تاکہ مجھ میں گھن لگ جائے، میں مدقوق ہو جاؤں، گھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔ نہیں، میں ایسا نہ ہونے دوں گی! میرا اور فیروز کا کیا میل، کتنا فرق ہے ہم دونوں میں —— کاش پرنس فیروز ہوتا یا فیروز پرنس —— اور وہ پرنس کے خیالوں میں کھو گئی۔

کتنی گرینڈ پرسنالٹی ہے ظالم کی! وجیہہ اور شکیل، وسیع النظر، وسیع القلب، خوش مزاج، خوش کلام، قہقہے ہونٹوں کے غلام، صحت مند اور . . . اور حد سے زیادہ دولت مند —— وہ پرنس کے خیالوں میں کھوئی تھی کہ پُشت پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے چونک پڑی۔ پرنس اُس کے پیچھے کھڑا تھا۔ ہونٹوں پر مُسکراہٹ اور آنکھوں میں شوخی لئے!

"ہیلو ڈارلنگ! کس سوچ میں ہو؟"

"سوچتی ہوں زندہ رہنے کے لئے کون سا راستہ بہتر ہے۔ فکر و پریشانی کا یا خوشیوں اور مسرّتوں کا!"

"زندگی کے یہی تو اصول ہیں کھاؤ، پیو اور خوش رہو۔ مر مر کے جینے سے کیا حاصل۔ لیکن آج تم یہ سب کیوں سوچ رہی ہو؟"

"اِس لئے کہ اب میں تنگ آ گئی ہوں گھر کی زندگی سے۔ بس گِلے، شکوے، پابندیاں۔ اُف!"

"بس اِتنی سی بات کے لئے اتنی فکر مند ہو۔ میرے بازوؤں میں آ جاؤ، تمھارے پسند کی ہر چیز ہے یہاں!" پرنس نے اپنے بازو نوشابہ کے سامنے پھیلا دیئے۔

تیسرا پیگ خالی کر کے پرنس نے کہا "ڈارلنگ میں بہت جلد ایک لمبی

تفریح پر جانے والا ہوں، ساتھ دوگی میرا ؟"

"کہاں ؟"

"بیروت، لندن، نیویارک، پیرس اور کئی ایک جگہ !"

"سچ ؟" نوشابہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں، بالکل سچ ڈارلنگ! تم میرا ساتھ دو تو مزہ آجائے۔ خوب گزرے گی جو... !"

آرکسٹرا کی دُھنیں فضا میں تحلیل ہو رہی تھیں۔

حسین جوڑے متحرک رہے تھے!

ایک گوشے میں بیٹھی سراپا قیامت بنی، فیشن کی دلدادہ، بڑی بڑی نیلی آنکھوں والی یاسمین پرنس کو پُراشتیاق اور نوشابہ کو کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی۔

نوشابہ اور پرنس بہت دیر سے والز ناچ رہے تھے۔ دونوں کیف و سُرور کی گہرائیوں میں ڈوبتے جارہے تھے۔ ناچتے ناچتے نوشابہ پرنس کے بازو پر ترچھی ہوکر ڈھلک گئی، کمان کی طرح!

"تھک گئی ہو کیا ؟" پرنس نے اُسے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہاں بہت تھک گئی ہوں میں !"

"آؤ چلیں !"

"پرنس! کیا تم میرا بوجھ اُٹھا سکو گے ؟"

"یہ بھی کہنے کی بات ہے، تم مجھے موقع تو دو !"

"تو پھر مجھے اپنے بازوؤں ہی میں رہنے دو، ہمیشہ ہمیشہ !"

"اوہو! ڈارلنگ میں تو کب سے انتظار کر رہا تھا اِس ایک جُملے کا !"

"کتنے اچھے ہو تم۔ دی گریٹ فیلو ــــــ" پرنس کے بازوؤں کے لمس اور رَم کے کیف آگیں سُرور سے وہ بہکنے لگی "کل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمھارے پاس آجاؤں گی ــــ فیروز کی قید سے آزاد ہوکر !"

"فیروز !" پرنس چونکا۔

"ہاں فیروز! جو میری مرضی کے خلاف میرا سب کچھ ہے !"

"تم اپنے شوہر کی بات کر رہی ہو ؟" پرنس کی حیرت میں اضافہ ہوگیا۔

"شوہر نہیں، صیّاد کہو اُسے صیّاد !" وہ مدہوش ہوتی گئی۔

"لیکن... لیکن تم نے پہلے کبھی نہ بتایا" پرنس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔

"چھوڑو بھی، اب نام نہ لو اُس کا! میں سب کچھ بھول جانا چاہتی ہوں۔ مائی سویٹ فیلو !"

وہ خوش تھی۔ آج سے نئی، عشرتوں سے بھرپور، مسرّتوں سے ہمکنار زندگی کا آغاز ہونے والا تھا۔ وہ خوش آیند مستقبل کے حسین و دلکش تصوّر میں ڈوبی پرنس کا انتظار کر رہی تھی ــــ وہ فیروز، اور فیروز کے ساتھ گزرے ہوئے پانچ سال کی طویل مُدت، سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ آج اُس نے فیروز سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اُس کی زندگی کے کسی بھی گوشے میں ایڈجسٹ نہیں ہوسکتا، دونوں کی نباہ مشکل ہے۔ اور اُس کی ساری باتوں کے جواب میں فیروز نے صرف ایک ہی جُملہ کہا تھا۔

"میں بہر صورت تمھاری خوشی چاہتا ہوں !"

آٹھ، پرنس اب آتا ہی ہوگا۔

نو، اب تک آجانا چاہئے۔

دس، وہ اب تک کیوں نہیں آیا، اِتنی دیر تو کبھی نہ ہوئی! نوشابہ کی اُلجھنیں بڑھ گئیں۔

گیارہ، کلب کی چہل پہل میں کمی ہونے لگی تھی۔ آرکسٹرا کب کا خاموش ہو چکا تھا۔ حسین جوڑے تھک کر نڈھال ہو گئے تھے۔ پیمانوں کی کھنک پر سکوت کا پہرہ لگ گیا تھا۔ بوتلیں خالی پڑی تھیں۔ قہقہوں پر نشہ آلود سنجیدگی طاری ہوگئی تھی ــــ وہ مایوسیوں کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی کہ شانو نے اُسے جھنجھوڑ دیا۔

"گھر نہیں جاؤ گی کیا؟ کب تک پرنس کا انتظار کرو گی۔ گیارہ بج گئے !"

"وہ آج کیوں نہیں آیا ؟" نوشابہ کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔

"اب وہ مہینوں نہ آئے گا"

"کیوں ؟" وہ متحیّر ہوگئی۔

"آج وہ دن کے پلین سے یورپ چلا گیا۔ تنہا نہیں، اُس کے ساتھ یاسمین بھی ہے !!"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے !" نوشابہ اِس طرح چونکی جیسے زمین اُس کے پیروں تلے سے نکل گئی ہو۔

"کیوں نہیں ہوسکتا، اور ہونے کے لئے کیا یہ کم ہے کہ تم مسز ہو اور یاسمین مس !"

"تو کیا پرنس نے مجھے فریب دیا ؟" وہ نڈھال ہوگئی۔

شانو کھلکھلا کر ہنس پڑی "ہماری اِس اونچی سوسائٹی میں محبت، وعدے اور فریب نام کی چیزیں نہیں، یہاں جذبات کی قدر نہیں، جذبات کی تسکین کی جاتی ہے، جس سے جب تک جی چاہے دل بہلایا جائے اور بس —— آؤ چلیں!"

سپنے بکھر گئے، خیالوں کا شیش محل مسمار ہو گیا —— نوشابہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ پرنس کا تصور اُس کے ذہن کو جھنجھوڑتا رہا، گزرے ہوئے دنوں کی یادیں تڑپاتی رہیں، حال ماضی کو کُریدتا رہا اور جب رات کے پچھلے پہر نیند آئی تو گیارہ بجے دن تک سوتی رہی۔ آنکھیں کھُلیں تو ہر طرف اُداسی اور ویرانی بکھری ہوئی تھی۔ فیروز کالج جا چُکا تھا۔

آج وہ محسوس کر رہی تھی گھر کا ماحول اُس کے لئے اجنبی نہیں، وہ خود اِس ماحول سے اجنبی ہو گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر درد و کرب کی بے شُمار لکیریں اُبھر آئیں اور وہ ایک بار پھر سوچ اور فکر کے لامحدود راستے پر چل پڑی۔

—— اور جب خیالوں سے چونکی تو پانچ بج چُکے تھے۔

"اب وہ آتے ہی ہوں گے!" اور وہ بہ عجلت تیار ہو کر انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں فیروز کمرے میں داخل ہوا۔ فلسفے کا پروفیسر، ہر وقت خیالوں میں ڈوبا رہنے والا، خُشک، خاموش!

وہ اُٹھی اور فیروز کا کوٹ اُتارنے لگی۔

"آج تمھیں میرا خیال کیسے آگیا؟" فیروز نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔

"مجھے معاف کر دیجئے!" وہ بدِقت تمام کہہ سکی۔ نگاہیں بارِ ندامت سے جھُک گئیں۔

اور فیروز نے اُسے بازوؤں میں لے لیا جیسے وہ کوئی گڑیا ہو ننھی مُنّی، بے داغ، معصوم سی!!!

استقبال

کرشن موہن ایم۔ اے

مَیں جانتا تھا تُو آئے گی میری زندگی میں
مری شبانہ اُداسیوں کا علاج لے کر
مَیں جانتا تھا مرا شبابِ حزیں بھی اِک دور آئے گا، مُسکرا اُٹھے گا
مرے شبستاں میں ایک چنچل کرن تبسّم فروز ہو گی۔
تُو آگئی ہے
نگاہ و دِل میں سماگئی ہے۔
فضا سرورِ وفا سے معمُور ہو گئی ہے
تری وفا کی ضیا کے دم سے
مری اُداسی کی رات کافور ہو گئی ہے
کہ تیرگی دُور ہو گئی ہے۔

ترے جمالِ سحر نفس نے مرے دلِ یاس آشنا کو
حیات کی کیفیاتِ رخشندہ سے ہم آہنگ کر دیا ہے
مری جوانی کو واقفِ رنگ کر دیا ہے۔

مری فراق آشنا تمنّا کو تازگیِ وصال دے کر
مری غم آہنگ شاعری کو شگفتگیِ خیال دے کر
ترے جمالِ سحر نفس نے سرور آمیز کر دیا ہے
نشاط انگیز کر دیا ہے
مَیں جانتا تھا تو آئے گی میری زندگی میں
مری شبانہ اُداسیوں کا علاج لے کر۔

پیار کی پرچھائیاں

دلشاد علی خاں ایم۔اے (علیگ) ایل۔ایل بی
ڈسٹرکٹ ایمپلائمنٹ ایکس چینج۔ علی گڑھ (یو۔پی)

محترم بھیا! آداب

...میری دیرینہ آرزو تھی کہ آپ کی خدمت میں کچھ لے کر حاضر ہوں۔ لیکن ——— ارادوں کی کمزوری کہئے یا "بیسویں صدی" کا بلند معیار، بہرحال جو بھی وجہ ہو۔ میں ہمیشہ سوچ سوچ کر ہی رہ گیا اور مدتیں گزر گئیں۔ آج سہارا ہی بھی ہیں تو "پیار کی پرچھائیاں" میں نے تو قدم اٹھا لیا ہے، اپنی آرزوؤں کی منزل تک پہنچ پاؤں گا یا نہیں ——— یہ آپ کی ادب شناس نظروں پر منحصر ہے۔ رسید اور رائے کا منتظر ہوں...

خیر اندیش ——— دلشاد

★

لندن

۲۳ر دسمبر ۶۱ء

میری اچھی سیما!

سوچتا ہوں کتنی بے رنگ ہو جاتی یہ زندگی اگر تمھارا تصور نہ ہوتا۔ اِس ہسپتال کا یہ بوجھل سا ماحول، خاموشی اور یہاں کی فضاؤں میں رچی بسی دواؤں کی خوشبو ——— میں تو تنگ آگیا ہوں ایسی بے بسی کی زندگی سے۔ صرف تم سے ملنے کی اُمیدیں مجھے جینے پر مجبور کرتی ہیں ورنہ سیما! ایسی زندگی سے موت لاکھ درجہ پُرسکون ہوتی۔

میری حالت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ہر روز ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سانسوں کے ساتھ ساتھ جینے کی اُمیدیں بھی کم ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر روز صبح شام آکر دلاسہ دے جاتے ہیں لیکن میں تو جانتا ہوں، اب زیادہ عرصے تک ہڈیوں کے اِس ڈھانچے میں قید نہ رہ سکے گی۔ لیکن پھر بھی سیما! موت کے بھیانک تصور کے باوجود تمھیں پالینے کا یقین نہ جانے کیوں اس کے علاوہ کچھ اور نہیں سوچنے دیتا کہ تم ملو گی، تم سے گھنٹوں باتیں کروں گا۔ تم میرے سامنے بیٹھ کر ہنسو گی، مسکراؤ گی اور یہ سلسلہ ——— زندگی کو موت کے خوف سے بہت دُور لے جاتا ہے اور سیما ——— موت اتنی ظالم ہی تو نہیں ہوا کرتی ہوگی کہ پیار کی منزلوں تک پہنچنے سے پہلے وہ ہماری تمنّاؤں کو راستے ہی میں لوٹ لے۔ میں زندہ رہوں گا، میں جیوں گا سیما! کم از کم اُس وقت تک جب تک تمھارا حسین تصور میری آنکھوں میں ہے۔

آج سردی کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میرے کمرے کی کھڑکیوں سے برف کے بوجھ سے آہستہ آہستہ جُھکتی ہوئی درختوں کی شاخیں صاف نظر آرہی ہیں۔ بالکل اِس طرح زمین کی طرف جُھکی جا رہی ہیں۔ جیسے کوئی دوشیزہ کسی ننھے انجانے خیال پہ شرما کر سمٹ رہی ہو۔

اچھا میری اچھوتی تمنّا! خدا حافظ!

ہمیشہ تمھارا ہی ——— اسلم

شملہ

۲۷ر فروری ۶۲ء

بہت اچھے اسلم!

خدا کرے میری عمر تمھیں لگ جائے!!

ہاں! میں جانتی ہوں تم تنہائی میں بہت گھبراتے ہوگے۔ میرا خیال تمھیں پریشان کئے رہتا ہوگا۔ مجھے تو دیکھو اسلم! کتنی بدنصیب ہوں میں کہ کچھ کہہ سکتی ہوں نہ سن سکتی ہوں۔ بس گھٹ گھٹ کے رہ جاتی ہوں۔ تمھارے بغیر ایک ایک پل

صدیوں جیسا طویل معلوم ہوتا ہے! میرا دل نہ جانے کیا کیا سوچ کر گھبراتا ہے۔ کہتے ہوئے یوں ڈر معلوم ہوتا ہے کہ تم اور بے چین ہو جاؤ گے اور دل کی بات تم سے چھپاؤں ——— یہ اپنے بس میں کہاں ہے۔ اب تم ہی بتاؤ اسلم میں کیا کروں؟

تم ہو، جب دیکھو موت کی باتیں! یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تمہاری زندگی کے سہارے ایک بدنصیب تم سے ہزاروں میل دور انتظار کی گھڑیاں گن گن کر جی رہی ہے۔ اسلم! خدا نہ کرے، اگر موت نے میرے تمہارے درمیان فاصلے بڑھانے کی کوشش بھی کی تو ——— تو تمہاری سیما وہاں بھی تمہارا انتظار کرتی ملے گی!

دیکھو تو اسلم! آج میں نے تمہاری پسند کے کپڑے پہنے ہیں تمہیں گلابی رنگ بہت پسند ہے نا۔ میرا جمپر گلابی ہے۔ میں نے گلابی دوپٹہ اوڑھا ہے۔ سفید چُست پاجامہ پہنا ہے، ہاتھوں میں مہندی لگائی ہے۔ بالکل تمہاری پسند کے سانچے میں ڈھال لیا ہے خود کو۔ کاش! اِس وقت تم میرے پاس ہوتے تو میں تمہیں مہندی رچے ہاتھوں کا سہارا دے کر وہیں اُس پہاڑی کے پاس لے جاتی جہاں بیٹھ کر تم اپنے ہاتھوں سے میرے بالوں کو سنوارا کرتے تھے اور میں تمہارے کندھے پر سر رکھ کر گنگنایا کرتی تھی۔

اسلم! وہ دن آئیں گے ضرور آئیں گے جب میرے اور تمہارے ذہنوں سے بے بسی اور مجبوریوں کے پُرخوف سائے دُور چلے جائیں گے۔ تم میرے لئے ہو گے میں تمہارے لئے! اور ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زندگی کی راہ پر آگے بڑھتے جائیں گے، یہاں تک کہ منزل سے ہمکنار ہو جائیں گے۔ اچھا اب اجازت دو۔

صرف تمہاری ——— سیما

لندن

۲۰ر مئی ۶۲ء

سیما! میری پاکیزہ تمنا

معاف کرنا اِس بار تمہیں خط لکھنے میں بہت تاخیر ہو گئی۔ تمہارے بغیر مجھے بھی کہاں سکون ملتا ہے۔ میرے لئے تو سب کچھ تم ہی ہو!

سیما! جب رات تاریکیوں میں لپٹ کر آتی ہے تو تمہاری یادوں کے دیپ جگمگا اُٹھتے ہیں اور میں سب کچھ بھول کر تمہاری یادوں کی دُنیا میں گم ہو جاتا ہوں۔ کتنے خوبصورت ہوتے ہیں وہ لمحات! جب تمہاری یادوں کا معطّر آنچل ذہن کو مدہوش کر کے حقیقت کی دُنیا سے تصوّر کی دُنیا میں لے جاتا ہے۔ تم میرے پاس آکر بیٹھ جاتی ہو، اپنے خوبصورت ہاتھوں سے دوا پلاتی ہو اور میں ——— وہ دوائیں جن سے مجھے نفرت سی ہو گئی ہے، یہ سمجھ کر پی جاتا ہوں کہ تمہارے ہاتھوں کو چھُو کر اِن کی تاثیر بدل جائے گی۔ میری رُوح کو چین ملے گا، میرے تڑپتے ہوئے احساسات کو نیند آجائے گی اور پھر ——— پھر سیما! نیند بھی تمہاری قربت کے احساس کا بوجھ نہیں اُٹھا پاتی ہے، ٹوٹ جاتی ہے۔ رات کِس طرح گزری، کب سُورج کی تھکی ہوئی شعاعیں میرے کمرے میں داخل ہوئیں ——— مجھے کچھ پتہ نہیں رہتا۔ لیکن سیما! یہ سب تو خواب ہوتے ہیں جو ایک پَل ساتھ دے کر چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر وہی تنہائی، وہی کسک اور تمہاری کمی کا احساس آگھیرتا ہے۔ میں کب تک یونہی بے بسی کا شکار رہوں گا؟ تم کہاں تک میری راہ تکو گی؟ تم ہی بتاؤ سیما! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا!

دیکھو میری حالت کے پیشِ نظر مجھے دوسرے ہسپتال میں بھیج دیا گیا ہے اور اگر، جیسا ظاہر ہوتا ہے فائدے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو پھر وہی آخری منزل آجائے گی۔ تنگ اور تاریک سی، جہاں پہنچ کر ساری کہانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہر آرزو اور تمنّا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ پھر کہاں پاؤ گی تم مجھے۔ نہیں، نہیں سیما! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم ایک بار ملو گی، ضرور ملو گی! میرا دل کہتا ہے۔

میرے تکیے کے نیچے تمہارے بہت سے خطوط اکٹھے ہو گئے ہیں۔ لیٹا لیٹا انھیں کو پڑھتا رہتا ہوں۔ کتنی اچھی ہو تم! کتنا خیال رکھتی ہو میرا۔ بخدا سیما! اگر تم نہ ہوتیں تو میں کبھی کا مر چکا ہوتا۔ صرف تمہارے ہی سہارے جی رہا ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں کچھ دن اور سانس لیتا رہوں تو میری خاطر اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا۔ تم ہی ڈگمگا گئیں تو ریت کی دیوار کی طرح اپنا یہ جسم گر جائے گا۔

اب رات بہت ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے منع کیا ہے زیادہ دیر تک ——— جاگنے کو۔ میں آنکھیں بند کئے لیتا ہوں تم آجاؤ سیما! میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

تمہارا منتظر ——— اسلم

شملہ

۳۱ر جولائی ۶۲ء

میری زندگی کے سہارے، میرے پیارے اسلم!

تم سوچو گے آج میں اِتنا خوش کیوں ہو رہی ہوں۔ بتاؤں! سنو گے؟ کل رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ لیکن ٹھہرو، ذرا تمہاری تصویر

اُٹھا لاؤں تاکہ کچھ اور لذت آجائے تمھیں بتلانے میں۔

ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ وہ جھیل ہے نا اسلم! جس کے کنارے پر ایک بہت بڑی سی چٹان ہے جس پر بیٹھ کر ہم باتیں کیا کرتے تھے۔ میں وہیں بیٹھی تمھارا انتظار کر رہی تھی۔ تم اب آئے، اب آئے، بس اسی انتظار میں شام ہو گئی۔ پیڑوں کے سائے لمبے ہو گئے اور بڑھتے بڑھتے رات کے دھندلکوں میں ڈوبنے لگے۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا تمھارے اوپر۔ میں جانے ہی والی تھی کہ میرے پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا تو کسی کے ہاتھوں نے میری آنکھیں بند کر لیں۔

"کون ہے بتاؤ؟" تم نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

"اسلم!" اور تم نے ہنس کر میری آنکھیں کھول دیں۔ سب کچھ بھول گئی۔ سوچ رہی تھی کہ تم آؤ گے تو یوں کہوں گی، یوں کہوں گی، ناراض ہوں گی، بولوں گی نہیں تم سے۔ لیکن تمھاری قربت کا احساس ——— کچھ بھی تو نہیں یاد رہتا مجھے۔ تم نے میرے بالوں کو بگاڑ کر لٹیں میرے چہرے پر بکھیر دیں۔ میں خاموش تمھاری آنکھوں کی بے پناہ گہرائیوں میں گھورتی رہی۔ تم نے مجھ سے کہا۔

"مُنہ میٹھا کرو تو ایک بات سناؤں" اور ——— اور تم نے بتایا کہ ہماری شادی کی تاریخ معین ہو گئی ہے۔ میں خوشی سے جھوم اُٹھی۔ میرے کانوں میں شہنائیوں کی مدھم مدھم سی آوازیں گونج اُٹھیں۔ تمناؤں کی دنیا میں طوفان مچل اُٹھے۔ اور میں سوچنے لگی ——— ہٹو ہم نہیں بتاتے۔ شرم آتی ہے۔

کاش! یہ سب حقیقت بن جائے۔ تم مجھے لینے آؤ۔ میں تمھارے ساتھ چلی جاؤں اس دنیا میں، جہاں صرف پیار ہو، میں ہوں اور میرا اسلم!

اسلم! اتنی ساری باتیں جھوٹ تو نہ ہوں گی۔ خدا جانے وہ لمحات کب آئیں گے، کب یہ خواب پورے ہوں گے!

اچھا میرے دیوتا! اب تم آرام کرو۔ میں جا رہی ہوں۔ پھر ملوں گی۔

صرف تمھاری ——— سیما

لندن

۱۷ اکتوبر ۶۲ء

سیما! میرے خوابوں کی اچھوتی شہزادی

تمھارا تصور بھی تمھاری ہی طرح کتنا شریر ہے۔ ایک پل بھی تو چین نہیں لینے دیتا۔ ہر وقت تمھاری باتیں یاد آتی ہیں۔ تمھاری بھولی معصوم سی صورت تصور میں گھومتی رہتی ہے، تمھارے قہقہے کانوں میں گونجتے ہیں، تمھاری شرارتیں یاد آتی ہیں۔ سچ سیما! ایسا معلوم ہوتا ہے بس ابھی ابھی تم میرے پاس سے اُٹھ کر گئی ہو۔

جب کبھی رات کی خاموشی میں دور سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے ——— تم ہی آ رہی ہو، آہستہ آہستہ میرے کمرے کی طرف! میں بہت غور سے سنتا رہتا ہوں۔

دیکھو ابھی کی بات ہے، تمھارا خط پڑھتے پڑھتے ذرا آنکھ لگی ہی تھی کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا قریب سے تم نے مجھے آواز دی ہو اور ——— میں چونک کر اُٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے لائٹ آن کی تو کوئی بھی نظر نہ آیا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو آسمان پر کہکشاں سے ایک تارہ ٹوٹ کر تاریکیوں میں گم ہوتا ہوا نظر آیا اور سیما ——— نہ جانے کیوں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں تمھارے ہی بارے میں سوچتا رہا۔ حالانکہ بات قصے کہانیوں کی سی معلوم ہوتی ہے، لیکن مجھے وہ بات یاد آتی ہے جو تم نے مجھ سے چلتے وقت کہی تھی کہ اسلم! محبت دو روحوں کا رشتہ ہوا کرتی ہے۔ تم جب بھی مجھے آواز دو گے میں تمھارے پاس آجاؤں گی!' اور سیما! پھر غیر شعوری طور پر میرے مُنہ سے نکل گیا: 'سیما آجاؤ! میں کب سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں!' تم سوچو گی میں نہ جانے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں، لیکن ——— مجھے دروازے پر ایک دم کسی کی آہٹ سی لگی۔ ایسا محسوس ہوا تم آگئی ہو۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ تم میرے سامنے کھڑی تھیں۔

'تم آگئیں سیما؟' میں نے یہ کہہ کر تمھاری طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا۔

'اسلم پلیز۔ آف دی لائٹ۔ یو نیڈ ریسٹ' اور ——— اور نرس اتنا کہہ کر واپس چلی گئی۔ میں حیرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔ پھر اندھیروں نے آکر مجھے گھیر لیا۔ میرا دل نہ مانا اور تمھیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔

اب رات بہت ہو گئی ہے۔ تم بھی سارے دن کی تھکی ماری ہو گی۔ کچھ دیر آرام کر لو۔

تمھارا ہی ——— اسلم

شملہ

۲ جنوری ۶۳ء

میرے بہت اچھے اسلم!

اب تو کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی ہے اپنی۔ کہیں جی لگتا ہی نہیں۔ سہیلیوں میں بیٹھ کر وحشت سی ہوتی ہے۔ گھر میں بھی الگ ——— الگ

صدیوں جیسا طویل معلوم ہوتا ہے! میرا دل نہ جانے کیا کیا سوچ کر گھبراتا ہے۔ لکھتے ہوئے یوں ڈر معلوم ہوتا ہے کہ تم اور بے چین ہو جاؤ گے اور دل کی بات تم سے چھپاؤں —— یہ اپنے بس میں کہاں ہے۔ اب تم ہی بتاؤ اسلم میں کیا کروں؟

تم ہو، جب دیکھو موت کی باتیں! یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تمہاری زندگی کے سہارے ایک بدنصیب تم سے ہزاروں میل دُور انتظار کی گھڑیاں گِن گِن کر جی ہے۔ اسلم! خدا نہ کرے، اگر موت نے میرے تمہارے درمیان فاصلے بڑھانے کی کوشش بھی کی تو —— تو تمہاری سیما وہاں بھی تمہارا انتظار کرتی مِلے گی!

دیکھو تو اسلم! آج میں نے تمہاری پسند کے کپڑے پہنے ہیں تمہیں گلابی رنگ بہت پسند ہے نا۔ میرا جمپر گلابی ہے۔ میں نے گلابی دوپٹہ اوڑھا ہے۔ سفید چُست پاجامہ پہنا ہے، ہاتھوں میں مہندی لگائی ہے۔ بالکل تمہاری پسند کے سانچے میں ڈھال لیا ہے خود کو۔ کاش! اِس وقت تم میرے پاس ہوتے تو میں تمہیں مہندی رچے ہاتھوں کا سہارا دے کر وہیں اُس پہاڑی کے پاس لے جاتی جہاں بیٹھ کر تم اپنے ہاتھوں سے میرے بالوں کو سنوارا کرتے تھے اور میں تمہارے کندھے پر سر رکھ کر گنگنایا کرتی تھی۔

اسلم! وہ دن آئیں گے ضرور آئیں گے جب میرے اور تمہارے ذہنوں سے بے بسی اور مجبوریوں کے یہ منحوس سائے دُور چلے جائیں گے۔ تم میرے لئے ہوگے میں تمہارے لئے! اور ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زندگی کی راہ پر آگے بڑھتے جائیں گے، یہاں تک کہ منزل سے ہمکنار ہو جائیں گے۔ اچھا اب اجازت دو۔

صرف تمہاری —— سیما

لندن

۲۰ مئی ۶۲ء

سیما! میری پاکیزہ تمنّا

معاف کرنا اِس بار تمہیں خط لکھنے میں بہت تاخیر ہو گئی۔ تمہارے بغیر مجھے بھی کہاں سکون مِلتا ہے۔ میرے لئے تو سب کچھ تم ہی ہو!

سیما! جب رات تاریکیوں میں لپٹ کر آتی ہے تو تمہاری یادوں کے دیپ جگمگا اُٹھتے ہیں اور میں سب کچھ بھول کر تمہاری یادوں کی دُنیا میں گُم ہو جاتا ہوں۔ کتنے خوبصورت ہوتے ہیں وہ لمحات! جب تمہاری یادوں کا معطر آنچل ذہن کو مدہوش کر کے حقیقت کی دُنیا سے تصور کی دُنیا میں لے جاتا ہے۔ تم میرے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہو، اپنے خوبصورت ہاتھوں سے دوا پلاتی ہو اور میں —— وہ دوائیں جن سے مجھے نفرت سی ہو گئی ہے، یہ سمجھ کر پی جاتا ہوں کہ تمہارے ہاتھوں کو چھو کر اِن کی تاثیر بدل جائے گی۔ میری رُوح کو چین مِلے گا، میرے تڑپتے ہوئے احساسات کو نیند آ جائے گی اور پھر —— پھر سیما! نیند بھی تمہاری قربت کے احساس کا بوجھ نہیں اُٹھا پاتی ہے، ٹوٹ جاتی ہے۔ رات کس طرح گزُری، کب سُورج کی تھکی ہوئی شعاعیں میرے کمرے میں داخل ہوئیں —— مجھے کچھ پتہ نہیں رہتا۔ لیکن سیما! یہ سب تو خواب ہوتے ہیں جو ایک پَل ساتھ دے کر چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر وہی تنہائی، وہی کسک اور تمہاری کمی کا احساس آ گھیرتا ہے۔ میں کب تک یونہی بے بسی کا شکار رہوں گا؟ تم کہاں تک میری راہ تکو گی؟ تم ہی بتاؤ سیما! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا!

دیکھو میری حالت کے پیشِ نظر مجھے دوسرے ہسپتال میں بھیج دیا گیا ہے اور اگر، جیسا ظاہر ہوتا ہے فائدے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو پھر وہی آخری منزل آ جائے گی۔ تنگ اور تاریک سی، جہاں پہنچ کر ساری کہانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہر آرزو اور تمنّا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ پھر کہاں پاؤ گی تم مجھے۔ نہیں، نہیں سیما! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم ایک بار مِلو گی، ضرور مِلو گی! میرا دل کہتا ہے۔

میرے تکیے کے نیچے تمہارے بہت سے خطوط اِکٹھے ہو گئے ہیں۔ لیٹا لیٹا اُنھیں کو پڑھتا رہتا ہوں۔ کتنی اچھی ہو تم! کتنا خیال رکھتی ہو میرا۔ بخدا سیما! اگر تم نہ ہوتیں تو میں کبھی کا مر چکا ہوتا۔ صرف تمہارے ہی سہارے جی رہا ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں کچھ دن اور سانس لیتا رہوں تو میری خاطر اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا۔ تم ہی ڈگمگا گئیں تو ریت کی دیوار کی طرح اپنا یہ جسم گر جائے گا۔

اب رات بہت ہو گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے منع کیا ہے زیادہ دیر تک جاگنے کو۔ میں آنکھیں بند کئے لیتا ہوں تم آ جاؤ سیما! میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

تمہارا منتظر —— اسلم

شملہ

۳۱ جولائی ۶۲ء

میری زندگی کے سہارے، میرے پیارے اسلم!

تم سوچو گے آج میں اِتنا خوش کیوں ہو رہی ہوں۔ بتاؤں؟ سُنو گے؟ کل رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ لیکن ٹھہرو، ذرا تمہاری تصویر

اُٹھا لاؤں تاکہ کچھ اور لذت آجائے تمھیں بتانے میں۔

ہاں! تو میں کہہ رہی تھی کہ رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ وہ جھیل ہے نا اسلم! جس کے کنارے پر ایک بہت بڑی سی چٹان ہے جس پر بیٹھ کر ہم باتیں کیا کرتے تھے۔ میں وہیں بیٹھی تمھارا انتظار کر رہی تھی۔ تم اب آئے، اب آئے، بس اِسی انتظار میں شام ہو گئی۔ پیڑوں کے سائے لمبے ہو گئے اور بڑھتے بڑھتے رات کے دھندلکوں میں ڈوبنے لگے۔ مجھے بہت غصّہ آرہا تھا تمھارے اوپر۔ میں جانے ہی والی تھی کہ میرے پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا تو کسی کے ہاتھوں نے میری آنکھیں بند کر لیں۔

"کون ہے بتاؤ؟" تم نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

"اسلم!" اور تم نے ہنس کر میری آنکھیں کھول دیں۔ سب کچھ بھول گئی۔ سوچ رہی تھی کہ تم آؤ گے تو یوں کہوں گی، یوں کہوں گی، ناراض ہوں گی، بولوں گی نہیں تم سے۔ لیکن تمھاری قربت کا احساس ـــــ کچھ بھی تو نہیں یاد رہتا مجھے۔ تم نے میرے بالوں کو بگاڑ کر لٹیں میرے چہرے پر بکھیر دیں۔ میں خاموش تمھاری آنکھوں کی بے پناہ گہرائیوں میں گھورتی رہی۔ تم نے مجھ سے کہا۔ "مُنہ میٹھا کرو تو ایک بات سُناؤں" اور ـــــ اور تم نے بتایا کہ ہماری شادی کی تاریخ معیّن ہو گئی ہے۔ میں خوشی سے جھوم اُٹھی۔ میرے کانوں میں شہنائیوں کی مدھم مدھم سی آوازیں گونج اُٹھیں۔ تمنّاؤں کی دُنیا میں طوفان مچل اُٹھے۔

اور میں سوچنے لگی ـــــ ہٹو ہم نہیں بتاتے۔ شرم آتی ہے۔

کاش! یہ سب حقیقت بن جائے۔ تم مجھے لینے آؤ۔ میں تمھارے ساتھ چلی جاؤں اُس دنیا میں، جہاں صرف پیار ہو، میں ہوں اور میرا اسلم!

اسلم! اِتنی ساری باتیں جھوٹ تو نہ ہوں گی۔ خدا جانے وہ لمحات کب آئیں گے، کب یہ خواب پورے ہوں گے!

اچھا میرے دیوتا! اب تم آرام کرو۔ میں جا رہی ہوں۔ پھر ملوں گی۔

صرف تمھاری ـــــ سیما

لندن

۱۷ر اکتوبر ۶۲ء

سیما! میرے خوابوں کی اچھوتی شہزادی

تمھارا تصور بھی تمھاری ہی طرح کتنا شریر ہے۔ ایک پل بھی چین نہیں لینے دیتا۔ ہر وقت تمھاری باتیں یاد آتی ہیں، تمھاری بھولی معصوم سی صورت تصور میں گھومتی رہتی ہے، تمھارے قہقہے کانوں میں گونجتے ہیں، تمھاری شرارتیں یاد آتی ہیں۔ سچ سیما! ایسا معلوم ہوتا ہے بس ابھی ابھی تم میرے پاس سے اُٹھ کر گئی ہو۔

جب کبھی رات کی خاموشی میں دُور سے کسی کے قدموں کی آہٹ سُنائی دیتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے ـــــ تمھی آرہی ہو، آہستہ آہستہ میرے کمرے کی طرف! میں بہت غور سے سُنتا رہتا ہوں۔

دیکھو ابھی کی بات ہے، تمھارا خط پڑھتے پڑھتے ذرا آنکھ لگی ہی تھی کہ اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا قریب سے تم نے مجھے آواز دی ہو اور ـــــ میں چونک کر اُٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے لائٹ آن کی تو کوئی بھی نظر نہ آیا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو آسمان پر کہکشاں سے ایک تارہ ٹوٹ کر تاریکیوں میں گم ہوتا ہوا نظر آیا اور سیما ـــــ نہ جانے کیوں میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں تمھارے ہی بارے میں سوچتا رہا۔ حالانکہ بات قصّے کہانیوں کی سی معلوم ہوتی ہے، لیکن مجھے وہ بات یاد آتی ہے جو تم نے مجھ سے چلتے وقت کہی تھی کہ اسلم! محبت دو رُوحوں کا رشتہ ہوا کرتی ہے۔ تم جب بھی مجھے آواز دو گے میں تمھارے پاس آجاؤں گی!" اور سیما! پھر غیر شعوری طور پر میرے مُنہ سے نِکل گیا "سیما آجاؤ! میں کب سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں!" تم سوچو گی میں نہ جانے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں، لیکن ـــــ مجھے دروازے پر ایک دم کسی کی آہٹ سی لگی۔ ایسا محسوس ہوا تم آگئی ہو۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ تم میرے سامنے کھڑی تھیں۔

"تم آگئیں سیما؟" میں نے یہ کہہ کر تمھاری طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا۔

"اسلم پلیز۔ آف دی لائٹ ڈیو نیڈ ریسٹ" اور ـــــ اور تم اتنا کہہ کر واپس چلی گئیں۔ میں حیرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔ پھر اندھیروں نے آکر مجھے گھیر لیا۔ میرا دل نہ مانا اور تمھیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔

اب رات بہت ہو گئی ہے۔ تم بھی سارے دن کی تھکی ہاری ہو گی، کچھ دیر آرام کر لو۔

تمھارا ہی ـــــ اسلم

شملہ

۲ر جنوری ۶۳ء

میرے بہت اچھے اسلم!

اب تو کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی ہے اپنی۔ کہیں جی لگتا ہی نہیں۔ سہیلیوں میں بیٹھ کر وحشت سی ہوتی ہے۔ گھر میں بھی الگ ـــــ الگ

رہتی ہوں۔ لوگ تو کچھ بھی دیتے ہیں بہت بے مروّت ہوگئی ہے۔ وہ کیا جانیں میری زندگی کا مرکز کون بن گیا ہے۔ میں کس کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہوں۔ آج ہمارے گھر کچھ مہمان آگئے ہیں۔ اِس لئے اِتنا وقت بھی نہ مِلا کہ دو گھڑی تنہائی میں بیٹھ کر تمھارے تصوّر ہی سے باتیں کر لیتی تھوڑی دیر تو یونہی گُنگُناتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔ ریڈیو کھولا تو بہت اچھی کہانی آرہی تھی۔ دو پیار کرنے والے دل سماج کے ہاتھوں مجبور ہو کر جُدا ہو گئے تھے۔ جسم مٹی میں مِل گئے لیکن اُن کی روحیں کسی دُھندلی سی اُمّید کے سہارے بھٹکتی رہیں۔ وہ بار بار جنم لیتے رہے، مرتے رہے۔ پھر ایک جنم میں دونوں مِل گئے۔ اُنھیں اپنے پچھلے جنموں کی باتیں ایک ایک کرکے یاد آگئیں۔

کیوں اسلم! کیا یہ جنم جنم کی کہانیاں سچ ہوتی ہیں؟ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے ضرور اُن میں کوئی صداقت ہوتی ہوگی۔ روحوں کے رشتے امر ہوتے ہوں گے۔ ہماری بھی تو کہیں ایسی ہی کہانی نہیں ہے؟ خیر چھوڑو اِن باتوں کو۔ تم بھی سوچوگے کہ کیا اُلٹی سیدھی باتیں کرتی ہوں میں۔

تم اپنے بارے میں بھی تو کچھ لکھا کرو۔ میری اِتنی تعریف مت کیا کرو۔ ورنہ مغرور ہو جاؤں گی! اور دیکھو تم زیادہ سوچا نہ کرو۔ آرام کیا کرو میں تو تمھاری ہی ہوں کہاں جا رہی ہوں جو اِتنے پریشان ہوتے ہو۔ تم جب بھی آؤگے میں تمھاری راہ تک رہی ہوں گی۔ لیکن اسلم کب آؤگے تم؟ تمھاری راہ دیکھتے دیکھتے اب آنکھیں تھک گئیں۔ آبھی جاؤ نا۔ کیا جبھی آؤگے جب تمھاری سیما مایوس ہو چکی ہوگی۔

اچھا میرے اسلم! خدا حافظ!

تمھاری اپنی ——— سیما

لندن

۱۴؍اپریل ۶۳ء

میری سیما!

تمھیں بہت خوشی ہوگی یہ جان کر کہ اب میری طبیعت بہت بہتر ہے۔ اب تو خود چل کر تھوڑی دُور تک ٹہل بھی آتا ہوں۔ اِس وقت تم ہوتیں تو تمھارا ہاتھ تھامے میں نا اُمیدیوں کی حدود سے بہت آگے تک نکل جاتا۔ لیکن خیر! اب جسم میں کچھ جان آگئی ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت آگئی ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاؤں گا۔ پھر تمھارے پاس آؤں گا، اپنی سیما کے پاس! کیوں سیما! اِتنے دن کی بیماری میں تمھارے ذہن نے میرے تصوّر کو کتنے رُوپوں میں دیکھا ہوگا؟ کبھی کمزوری کی حالت میں بے بسی سے تمھاری راہ تکتے ہوئے، کبھی بے چین اور تڑپتے ہوئے، کبھی تم سوچا کرتی ہوگی میں تمھیں یاد کرکے روتا بھی ہوں گا۔ ہاں سیما! ایسا ہی تھا۔ حالانکہ مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ یہ جنم جنم کی باتیں سچ ہوتی ہوں گی لیکن ——— ایک جھوٹ اِتنا دلکش ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ دیکھو اکثر ایسا ہوا کرتا تھا نا کہ تم جو بات سوچ کر آیا کرتی تھیں میں وہی کہہ دیا کرتا تھا۔ تمھارے آنے سے پہلے ایک عجیب بھینی بھینی سی خوشبو آیا کرتی تھی۔ میں سمجھ لیتا تھا کہ تم آرہی ہو اور تم آجایا کرتی تھیں۔ ایسی ہی باتیں تمھارے ساتھ بھی ہوا کرتی تھیں۔ ضرور سیما! کبھی نہ کبھی میرا تمھارا بہت گہرا رشتہ رہا ہوگا ورنہ یہ سب کچھ ایسا نہ ہوتا۔ یہی باتیں تو ہیں جو ذہن کبھی یہ تصوّر بھی نہیں کر پاتا کہ تم مجھ سے جُدا بھی ہو سکتی ہو۔

سیما! میں نے تمھاری ایک بہت اچھی تصویر بنائی ہے۔ بالکل تمھاری ہی طرح ہے! چہرے پر وہی بھولپن اور شرارت کے مِلے جُلے تاثرات! تمھارے بال کچھ بے ترتیب لیکن خوبصورت سے انداز میں چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں اور تمھاری آنکھوں میں حیا اِس طرح جِھلملاتی ہے جیسے پھولوں پر شبنم کے قطرے کانپ رہے ہوں۔ بہت اچھی بن گئی ہے تمھاری تصویر! آؤں گا تب دکھاؤں گا تمھیں۔

لو، وہ نرس پھر آرہی ہے۔ بہت خیال رکھتی ہے بے چاری!
اب پھر لکھوں گا۔ خدا حافظ میری معصوم تمنّا!

تمھارا ہی ——— اسلم

شملہ

۲۰؍جون ۶۳ء

اسلم! میرے دیوتا

دل تو یہی چاہتا ہے کہ تمھیں لکھتی ہی رہوں۔ لیکن معاف کرنا آج بہت جلدی میں ہوں۔ تمھیں یاد ہوگا وہ ایک لڑکی تھی نا؟ رجنی! وہی جو ہمارے گھر کے سامنے رہا کرتی تھی۔ آج اُس کی شادی ہے۔ ہمارے گھر کے سب لوگ اُس کے گھر جا رہے ہیں۔ میں بھی جاؤں گی۔

سارے راستے دُلھن بنے ہوئے ہیں۔ بہت چہل پہل ہو رہی ہے۔ مجھے بھی نہ جانے کیا سوچ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ تم کہوگے کتنی بے شرم ہوگئی ہے یہ لڑکی! ایک دن ہمارے گھر بھی ایسا ہی ہنگامہ ہوگا۔ بہت سے لوگ اِکٹھے ہوں گے، سب کی آنکھیں کسی کے انتظار میں لگی ہوں گی اور میں ——— کہیں

ایک کونے میں بیٹھی خوابوں کے خوبصورت محلوں میں تمھارے تصوّر کو سجا رہی ہوں گی۔ کتنا اچھا ہوگا وہ دن! ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی ——!!

اچھا میرے ساتھی! اب اجازت دو۔ پھر ملوں گی۔

تمھاری —— سیما

لندن

۱۱ستمبر۶۳ء

میری سیما!

اب میں بالکل اچھا ہوگیا ہوں۔ بس صرف تھوڑا سا آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ کھانے پینے پر بھی زیادہ پابندی نہیں رہی ہے۔ ڈاکٹروں کو بھی زیادہ دلاسہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے سیما! جیسے مجھے دوسری زندگی مل گئی ہے! بالکل نئی زندگی! نا امیدیوں کے گہرے بادل تمناؤں کے آسمانوں سے چھٹ گئے ہیں اور پھر وہی رنگینی سی لوٹ آئی ہے۔ کچھ نہ پوچھو انتظار کی گھڑیاں کتنی مشکل سے کٹ رہی ہیں۔

اب وہ دن دُور نہیں ہے سیما! جب میں اپنے ہندوستان کو واپس آجاؤں گا۔ تم کہا کرتی تھیں نا "جب تم انگلینڈ سے لوٹ کر آؤ گے تو بہت بڑے آدمی ہو گے۔ لوگ تمھیں ہار پہنا کر کاندھوں پر اُٹھا کر گھر کی طرف لائیں گے اور میں —— دُور سے اپنے جیون ساتھی کی کامیابی پر کھڑی مسکرا رہی ہوں گی!" تمھاری باتوں میں کتنی سچائی تھی۔ مجھے لوگوں کے کاندھوں پر سوار دیکھ کر خوشی سے رو مت پڑنا۔ تم مسکرانا، قہقہے لگانا۔ میں بہت خوش ہوں سیما! تم بھی اِتنی ہی خوش ہو گی۔ خدا مجھے اِتنی سکت دے کہ تمھاری خوشیوں کے تصوّر کا بوجھ اُٹھا سکوں۔

اب سیما! تمھیں کچھ لکھنے کی بجائے تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تم میرا انتظار کرنا سیما! خدا حافظ!!

صرف تمھارا —— اسلم

شملہ

۱۸نومبر۶۳ء

اچھے اسلم!

معاف کرنا اِس بار تمھیں خط لکھنے میں بہت تاخیر ہوگئی۔ برسوں ہوگئے تھے شملہ میں رہتے رہتے، دل بھر گیا تھا۔ سوچا کچھ دنوں کے لئے کہیں گھوم آؤں۔ خوب جی بھر کے تفریح کی ہے میں نے اِن دنوں۔ لکھنؤ گئی، الہ آباد گئی۔ واپسی میں دو ہفتے علی گڑھ بھی رُکی۔ کتنا سکون مِلا تھا علی گڑھ میں مجھے!

لیکن اسلم! بہت بدل گیا ہے اپنا علی گڑھ! یونیورسٹی میں نئی نئی بہت شاندار عمارتیں بن گئی ہیں۔ بہت خوبصورت ہوگئی ہے یونیورسٹی۔ لیکن —— مجھے تو ایسا محسوس ہوا اِس نئے حُسن نے پُرانے خلوص کو چُرا لیا ہے۔ خوبصورت عمارتوں کے تلے علی گڑھ کی پُرانی روایتی زندگی دب کر رہ گئی ہے۔ مگر اسلم پھر بھی بہت سکون مِلا کیونکہ وہی تو مقام تھا جہاں میں نے پہلی بار تمھارے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رہنے کی قسم کھائی تھی!

اسلم! میں تو بالکل کھو سی گئی تھی وہاں جاکر۔ حالانکہ جانتی تھی کہ تم بہت دُور ہو لیکن پھر بھی ہر موڑ پر ایسا محسوس ہوتا تھا تم کسی جگہ مِل جاؤ گے۔ اسلم! کِتنا حسین تھا وہ دَور، کِتنے سُہانے تھے وہ دن جب ہم روز مِلا کرتے تھے۔ گھنٹوں تنہائی میں باتیں کیا کرتے تھے۔ یاد ہے تمھیں؟ ایک بار تم نے چُھپ کر میری تصویر بنائی تھی اور جب میں نے دیکھ لیا تو تم گھبرا گئے تھے، کہنے لگے "سیما! تمھاری تصویر بنا لوں میں؟"

"بنا تو لی۔ اب کیا پُوچھ رہے ہیں!" میرے جواب سے تم اور پریشان ہوگئے تھے۔ اب پھر بناؤ گے نا میری تصویر؟ اب کچھ نہ کہوں گی تم سے۔ بالکل بُت بنی بیٹھی رہوں گی تمھارے سامنے۔ جب تمھاری پنسل سے کاغذ پر میرے چہرے کے نقوش اُبھریں گے تو مجھے ایسا محسوس ہوگا —— تمھاری اُنگلیاں میرے چہرے کو چھو رہی ہیں!

اب میں تمھارے بہت قریب ہوجاؤں گی اسلم! اِسی لئے کچھ اطمینان سا ہوگیا ہے۔

تم سے مِلنے کی متمنی —— تمھاری سیما

لندن

۶فروری۶۴ء

سیما!

آج میں نے ایک بہت بھیانک سا خواب دیکھا ہے۔ ایک بہت بڑا سا تالاب تھا۔ اُس میں بہت سی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ لوگ ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف جا جاکر واپس آرہے تھے۔ ہم تم بھی ایک کشتی میں سوار تھے۔ ہماری کشتی آہستہ آہستہ دوسرے کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ ہم بیچ ہی میں پہنچ پائے تھے کہ یکایک —— زبردست طوفان آیا۔ کناروں پر کھڑے ہوئے اونچے اونچے پیڑ ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ جھُولنے لگے۔ ہر طرف ایک شور برپا ہوگیا۔ لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے بھاگنے لگے اور پھر —— جیسے آسمان پھٹ گیا ہو۔ بہت زور کی بارش شروع ہوگئی۔ تم نے ڈر کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے سہم کر پتوار چھوڑ دئے اور تمھارا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہماری

کشتی ہچکولے کھانے لگی اور ـــــ اور ہمیں ڈوبتے ہوئے دیکھ کر کچھ لوگ بچانے آگئے۔ کسی نے تمہارا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا کہ کون تمہیں کِدھر لے گیا۔ میں بے بسی سے خلا میں گھورتا رہا۔ کِتنا بھیانک منظر تھا!

میری کشتی ڈوب گئی۔ "سیما! سیما!!" میں زور زور سے چیختا رہا اور پھر میری آنکھ کھُل گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکتا رہا۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد بھی کہ وہ خواب تھا، مجھے چین نہ آیا اور چین مِلتا بھی کیسے۔ سانس لینے کا وقت مِلا ہی کہاں؟ نرس نے مجھے سہیل کا خط لاکر دے دیا۔ لکھا تھا ـــــ "اسلم تمہاری سیما کی منگنی ہو گئی ہے!"

اری پگلی! اِس میں ایسی کون سی بات تھی جو تم نے چھُپائے رکھی۔ اچھا ہی تو ہوا۔ آخر کہاں تک تم میرا انتظار کرتیں اور پھر میری زندگی کا بھروسہ ہی کیا ہے۔ کون جانے کب کیا ہو جائے!

سیما! محبت میں وفا تو صرف بے بس لوگوں کا سرمایہ ہوا کرتی ہے۔ تم تو میری زندگی کے سُکھ میں، دُکھ میں، سب میں برابر کی شریک رہی ہو۔ ایک بے بسی میں ساتھ نہ دے سکو گی تو کون سی بُری بات ہو جائے گی۔

تم شاید سمجھ نہیں سکیں مجھے۔ ارے مجھ سے کہہ تو دیا ہوتا پگلی! میں تو اپنی سیما کو مبارکباد دیتا، اُس کی خوشی کے لئے میرے ہاتھ تمام عمر اُٹھے رہتے۔ تم دُلہن بنو گی، تمہاری زندگی کا ایک نیا اور خوبصورت دَور شروع ہوگا ـــــ کیا اِس خیال کا تصور میرے لئے کم خوشی کا باعث ہوتا؟ تم اندازہ نہ لگا سکو گی میری خوشی کا!

تم نے تو یہ سوچا ہوگا کہ بتا دوں گی تو میں بدگُمان ہو جاؤں گا تم سے۔ مجھے نفرت ہو جائے گی۔ کتنی ناسمجھی بات؟

بیوقوف کہیں کی! ارے وہ پیار ہی کیا جس میں بدگُمانیاں سما جائیں۔ محبت تو دو روحوں کا وہ پاک رِشتہ ہے جو جِسموں کے جُدا ہو جانے سے بھی نہیں ٹوٹا کرتا۔ میں تو خود سوچا کرتا تھا کہ تم سے کہوں کہ کب تک انتظار کرو گی مگر ـــــ کبھی ہِمّت نہ پڑی سیما! چلو اچھا ہوا مجھے نہ کہنا پڑا۔

کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟ ہمیں بھی بُلاؤ گی نا؟

سیما! میں تم سے ایک بار مِلنا چاہتا تھا لیکن ـــــ اب شاید اِس زندگی میں یہ ممکن نہ ہو سکے گا۔ خیر، میرا تمہارا ساتھ تو جنم جنم کا ہے۔ اب نہ سہی پھر مِلیں گے کبھی!

خدا تمہاری زندگی میں خوشیاں لائے!!

ہمیشہ تمہیں خوش دیکھنے کا متمنی

اسلم

شملہ

۲۶ مارچ ۶۴ء

میری ادھوری تمنّا، میرے اسلم!

کِتنے اچھے ہو تم! اپنی سیما کی خوشی کے لیے کتنی اچھی اچھی باتیں کہتے ہو! تم نے اِتنی تکلیف اُٹھائی۔ میں جانتی ہوں ہر درد کا احساس تمہیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہوگا کہ اِس وقت سیما ہوتی تو سارے دُکھ بانٹ لیتی۔ تم نے مجھ سے نہ جانے کیا کیا پُوچھا لیکن ـــــ میں بدنصیب تمہاری باتوں کا جواب دینے کے بجائے اپنی ہی سُناتی رہی۔ تمہیں اکثر غصہ بھی آجاتا ہوگا۔ کہتے ہوگے کِتنی خود غرض ہے یہ لڑکی!

ہاں اسلم! عورت سچ مچ بہت خود غرض ہوتی ہے۔ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے دُنیا کو بہت بڑے بڑے فریب دے جاتی ہے۔ مجھے ہی دیکھو ـــــ کِتنا بھروسہ کرتے ہو تم مجھ پر اور میں ہوں کہ اپنے اسلم سے بھی وفا نہ کر سکی۔

اسلم! میرا دل چاہتا تھا، تم سے ایک ایک بات کہہ دوں۔ تمہارے سامنے رو دوں۔ لیکن ایک انجانا خوف ہمیشہ میرے ارادوں کو جکڑے رہا۔ میں تمہیں تاریکیوں میں رکھے رہی تاکہ وقت کے ساتھ تمہارے ذہن میں میرا تصور دھُندلا ہوتا رہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نہ بھُول سکے ہوگے مجھے۔

میں نے سماج کے ضابطوں سے ٹکرانے کی کوشِش کی۔ میں تمہاری قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں تمہارے انتظار میں صدیوں آنکھ بچھائے بیٹھی رہتی۔ لیکن دُنیا کی نظروں میں عورت کی بساط ہی کیا! جب چاہا کُچل دیا، جب چاہا جھُوٹی عزّت آبرو کے کفن میں لپیٹ کر اُس کے تقدّس کو خاک میں مِلا دیا۔ اپنی خواہش پُوری کرنی ہو تو اُس کا گلا گھونٹ دیں اور وہ اپنی خوشی سے جینا چاہے تو ـــــ اُس سے سانس لینے کا حق بھی چھین لیں! میں مجبور ہوں میرے اسلم! میرے پاس اِس کے سِوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اپنی بے بسی اور مجبوری کا اعتراف کر لوں اور مجھے یقین ہے کہ میں بے وفا ہی سہی، تم مجھے اپنی سمجھ کر معاف کر دوگے۔ جِسم نہ سہی میری رُوح تو تمہاری ہی ہے! تمہیں دُکھ ہوگا ـــــ میں جانتی ہوں لیکن یہ زخم تو ایسے ہیں کہ چھُپائے بنتی ہے نہ دکھائے!

کل میری برات آئے گی۔ کوئی اپنی تمنّاؤں کی بانہیں پھیلائے تمہاری سیما کو تم سے چھیننے آئے گا اور تمہاری سیما ـــــ میرے اسلم! تم سے وفا کے تمام دعوے توڑ کر، تمہیں اِس دُنیا میں تنہا چھوڑ کر چلی جائے گی۔ معاف کرنا تمہیں دُکھ دیا میں نے۔ لیکن تمہیں بھی نہ بتاتی تو کون روتا میری بے بسی پر!

لیکن اسلم! میں تمھیں دلاسہ بھی تو نہ دے سکوں گی۔ جب تک تمھیں یہ خط ملے گا تمھاری سیما کی ہڈیاں بھی خاک میں مل چکی ہوں گی۔

کتنی اچھی ہے یہ شہناز! جس نے تمھیں سہارا دینے کے لئے مجھے اتنے برس زندہ رکھا۔ کل ڈولی کی بجائے میرا جنازہ اٹھے گا! ہم تو جنم جنم کے ساتھی ہیں پھر ملیں گے اسلم!

سیما

جواب ہمیشہ تمھاری رہے گی

لندن

۱۰ اپریل ۶۴ء

سیما صاحبہ!

فرض اور محبت کتنا بے بس بنا دیتے ہیں انسان کو ——— آج مجھے اس کا احساس ہو رہا ہے۔

سیما صاحبہ! اسلم کو مرے ہوئے کئی مہینے گزر چکے ہیں جس دن آپ کی شادی تھی اسی دن اس نے خودکشی کر لی تھی۔ آپ کے لئے لکھے ہوئے کچھ خطوط میرے سپرد کئے تھے جو میں آپ کو بھیجتا رہا ہوں۔ آپ کو اس کی موت کا صدمہ نہ ہو صرف اسی لئے وہ مر کر بھی کچھ دن آپ کے لئے جینا چاہتا تھا۔

اس کی ہدایت کے مطابق آپ کے آئے ہوئے سارے خطوط اسی طرح بند واپس کر رہا ہوں۔

ایک دوست

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔
ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

غزل

ابرا حسنی گنوری

گزرینگے ہاں ضرور تری رہگزر سے ہم
گزریں براہِ سر کہ گزر جائیں سر سے ہم

یہ لوٹتے ہیں خاص فریبوں سے راہ میں
اب مطمئن نہ ہونگے کسی راہبر سے ہم

اب دل ہے اور کیفِ سیاہ و سفیدِ عشق
آزاد ہو گئے غمِ شام و سحر سے ہم

موجِ جمالِ حسن ہے موجِ ہوائے خلد
منسوب کیوں کریں اسے برق و شرر سے ہم

ہوتی ہے دن چھپے سے سحر تک بس آہ آہ
چھپتا ہے دن جو کرتے ہیں نالے سحر سے ہم

جن سے ہماری شامِ الم جگمگا اُٹھی
تارے وہ لائے توڑ کے چشمانِ تر سے ہم

آنکھوں میں حسن دہر ہے دل میں خیالِ غیر
اب کیا کہوں؟ وہ کہتے ہیں آئیں کدھر سے ہم

اے ساکنو! ہنسو نہ غریب الدیار پر
ملتا اگر سکوں تو نکلتے نہ گھر سے ہم

اُف یہ جنوں، کہ اپنے جنوں کے علاج میں
ان کا مزاج پوچھتے ہیں چارہ گر سے ہم

اب پھر ملے ہیں دہر میں بزمِ ازل کے بعد
پہچانتے ہیں تم کو بہت پیشتر سے ہم

اے ابرؔ اپنی بے ہنری کام آ گئی
بچ تو گئے ندامتِ عرضِ ہنر سے ہم



آٹھویں دن میری جلد بالکل صاف، ملائم اور خوبصورت ہو گئی!

پونڈز کے ۷ دن والے حسن افزا پلان

کی بدولت میرے رنگ و روپ میں نئی زندگی آ گئی۔

میں رنگ کی بھدی اور بے رنگت شکل سے بہت پریشان تھی۔ کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اور سنیل کے ساتھ رات کے کھانے کی خاص دعوت کو صرف ۸ روز باقی رہ گئے تھے۔ میں مایوس ہو گئی۔ اچانک مجھے سنیتا کا خیال آیا جس نے مجھے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ پونڈز کے ۷ دن والے حسن افزا پلان نے اس کے رنگ و روپ کو کس طرح نکھار دیا تھا۔ میں نے بھی اس پلان پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حسن افزا پلان اور اس پر عمل:

ایک ہفتہ تک ہر روز رات کے وقت ایک بار نہیں دو بار میں نے اپنے چہرے پر **پونڈز کولڈ کریم** لگانا شروع کیا۔ پہلی بار اوپری میل اور دن بھر کا میک اپ صاف کرنے کے لیے۔

دوسری بار استعمال سے حسن کا راز کھل گیا!

میں نے جب دوسری بار کریم لگایا تو حسن کا راز مجھ پر کھل گیا۔ کریم مسامات کی گہرائیوں میں سرایت کر گئی اور چھپا ہوا میل صاف ہو گیا، جو پانی اور صابن سے ممکن نہیں تھا۔ اس طرح آپ کی جلد واقعی نرم ملائم اور خوبصورت ہو جائے گی جس طرح کہ میری ہو گئی ہے۔

میری یہ رنگین شام بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ سنیل نے کہا "میں نے تمہارے رنگ و روپ کو اتنا نرم و نازک اور خوبصورت پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

اب میں نے روزانہ رات کے وقت دو بار **پونڈز کریم** کا استعمال اپنا معمول بنا لیا ہے۔

آپ بھی آج رات سے **پونڈز** کے سات دن والے حسن افزا پلان پر عمل شروع کر دیجئے۔ آپ کی جلد بھی انتہائی نرم و نازک اور خوبصورت ہو جائے گی۔





پونڈز کولڈ کریم — جلد کی صفائی کیلئے دنیا میں زیادہ استعمال ہونے والی کریم

چیزبرو پونڈز انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو ایس اے میں تشکیل شدہ)

سولھواں سال

نزہت نوری ایم ۔ اے

معرفت کلام حیدری، جگجیون روڈ، گیا

محترمی! تسلیم

آپ کی بزم میں پہلی بار شریک ہو رہی ہوں ۔ افسانے میں میں نے Adolecent age کی مخصوص الجھن یعنی Transitional period اور اس سے پیدا ہونے والی جذباتی کشمکش کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے ——— پسند آئے تو اسے قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں ۔

خلوص آگیں ——— نزہت نوری

★

میں کون ہوں ———؟ یہ سوال بار بار اب میرے اندر سر اٹھانے لگا ہے ——— کیوں؟ پہلے تو کبھی میں یوں نہ سوچتی تھی ۔ پہلے بھی یہی حالات تھے، یہی شب و روز تھے ——— لیکن آج، ہاں آج کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو ڈھونڈ ہی نکالوں ——— جیسے میری ہستی بادلوں کے دھوئیں میں گم ہو گئی ہے اور یہ کیسی گمشدگی ہے کہ مجھے لطف آ رہا ہے!

ممی کہتی ہیں میں اب سولہ سال کی ہو گئی ——— اونہہ! اسی لئے وہ کہتی ہیں کہ کل اور آج میں اب بڑا فرق آ چکا ہے ۔ کیونکہ کل تک میں ننھی سی تھی (ان کی نظر میں تو میں ہر دم ہی ننھی رہوں گی) مگر اب میں ایک ہوشیار لڑکی بن چکی ہوں ۔ لیکن میں تو سمجھتی ہوں یہ سب محض ان کی لن ترانی ہے، ورنہ وہ تو مجھے اب اور بھی ننھی سی سمجھ بیٹھی ہیں جب ہی تو طرح طرح کی بندشیں لگاتی جا رہی ہیں ۔ کل والی میں تو پھر بھی آزاد تھی ۔ کسی سے ملتی جلتی، کسی سے باتیں کرتی تو ممی یوں آنکھیں نکال کر میری طرف نہ دیکھا کرتی تھیں جیسا کہ وہ اب کرتی ہیں اور اس پر سے ان کا یہ فرمانا کہ میں ایک ہوشیار لڑکی ہو چکی ہوں ۔ چہ خوب! اگر ان کے خیالات اتنے ہی ترقی پسندانہ ہیں تو پھر مجھے آزاد کیوں نہیں چھوڑتی ہیں ۔ یہ پابندیاں، یہ بھول بھلیاں ——— اللہ میری سمجھ میں آنے کی نہیں!

لوگ کہتے ہیں کہ سولھواں سال تو قیامت کا سال ہوتا ہے! قیامت سے ان کی مراد آخر کیا ہے؟ کہیں وہ خواب تو نہیں جو آنکھوں میں ہر دم بادلوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں ۔ کچھ جانے، کچھ انجانے سے خواب! حسین کہانیوں، حسین لمحات، حسین اتفاقات کے خواب ۔ جو میرے وجود کو کسی میٹھے میٹھے جال میں بن لینے کو بے چین رہتے ہیں اور نشیلی بانسری کی لے پر کوئی دور سے ہر وقت پکارتا رہتا ہے ۔ تب میری ہستی ایکدم سُبک ہو کر ہوا کے دوش پر اڑنے لگتی ہے ۔ ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز ——— کسی نامعلوم آسمان کی کھوج میں، کسی بھٹکی ہوئی جنت کی تلاش میں ——— یہ خوابوں کے جزیرے! اور میں ان جزیروں کی تنہا شہزادی بن جاتی ہوں ۔ خود مختار، ہر بندش سے بے پروا، بہکی بہکی، شب و روز سے بیگانہ! یہ خواب کیسے ہیں پھر؟ کیوں آنے لگے ۔ یوں میری زندگی کی معصوم راہوں میں؟ آخر ——— آخر میں کون ہوں ———؟ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے میرے اندر؟ آس اور یاس کے یہ ہجوم ——— جیسے ہر ہر پل کسی پیارے حادثے کا انتظار رہنے لگا ہو مجھے!

پہلے کبھی تو یوں نہ ہوا تھا کہ کسی کی ذرا سی آہٹ پر رُواں رُواں جاگ ——— اٹھتا ہو ۔ کل ہی تو میں برآمدے میں بیٹھی انگریزی کا ایک رومانی ناول پڑھ رہی تھی کہ اشفاق آ گیا ۔ وہ کالج سے سیدھے میرے ہی گھر آیا تھا ۔ عجیب بے پروا سا!

"ہیلو ۔ یو سویٹ سکسٹین!"

"بدتمیز!" اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی ۔ مگر اس کے اس ریمارک نے جیسے اچانک میرے اندر بہت سارے تیز بلب روشن کر دئے اور میں سُرخ سُرخ سی کچھ عجیب تذبذب کے عالم میں کمرے میں کھڑی رہی ۔ پھر وہ ایکدم اطمینان سے

سیٹیاں بجاتا ہوا میرے کمرے میں گھس پڑا اور اچانک سنجیدہ ہو کر اس نے اپنے پاس سے ایک نازک سی شیشی میں فرانسیسی خوشبو کی پیش کش کی۔ میں ایکدم گھبرا گئی!

"تمھاری سالگرہ پر!"

"تھینک یو!" الفاظ بمشکل میرے حلق سے نکل سکے۔ پھر وہ بغیر کچھ کہے سنے چلا گیا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی مگر اسی لمحے دل میں جیسے کوئی پھانس سی اٹک گئی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ بھول جاؤں مگر اس دن ہر لمحہ اشفاق کی وہ بات یاد آتی رہی۔

"ہیلو۔ یو سویٹ سکسٹین!"

تب اسی دن میں نے سارے کواڑ بند کر کے اپنے آپ کو قدِ آدم آئینے میں جا کر دیکھا۔ ایک شرم سی آ گئی۔ میں اب واقعی بڑی سی معلوم ہو رہی تھی۔ میری آنکھیں تو جیسے میری شخصیت کا انمول حصہ نظر آ رہی تھیں۔ میں ان سے ڈر گئی۔ کیونکہ وہ تو دل کی بہت ساری باتیں کہتی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے گھبرا کر پلکیں جھکا لیں —— پھر میرا سراپا، میری رنگت، میرے لب، میرے بال۔ یہ سب کے سب ایک دن میں، ایک ہی پل میں یوں بدل گئے —— آخر کیسے؟

اسی دوپہر کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اشفاق تھا۔ وہ مجھے اور میری سہیلیوں کو پائنیرز پارک میں پکنک کی دعوت دے رہا تھا۔

"نہیں میں نہیں آ سکتی!" نہ جانے کیوں میں نے کہہ دیا۔

"کیوں نہیں آ سکتیں؟؟"

میں خاموش رہی۔ اُدھر وہ بے تاب ہو کر مسلسل ایک ہی سوال دہرا رہا تھا۔

"کیوں —— ہیلو سیما۔ بولو۔ آخر کیوں —— ؟ ہیلو ہیلو، سیما!"

اور میں ریسیور کو ہاتھ میں پکڑے اس آواز کو اپنے کانوں میں انڈیلتی رہی —— جیسے ایک ایک کر کے اس کی بوندیں دل پر گرتی جا رہی ہوں! اور دل ایکدم شہد بن کے پگھلا جا رہا ہو۔ مجھے اس میں بھی لطف آ رہا تھا۔ وہ کچھ جھلا کر پوچھ رہا تھا۔

"تم مجھ سے خفا ہو گئیں؟"

"نہیں ——" اور میں نے اس کے حیران سوالوں کے درمیان ہی فون کو آہستہ سے بند کر دیا۔ پھر دوسرے ہی لمحہ اپنی اس حماقت پر افسوس کرنے لگی۔ پھر یہ افسوس مجھے مارنے لگا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اشفاق کے ساتھ پکنک میں جاؤں۔ اس کے اسکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر اڑن کھٹولے کا لطف لوں۔ پھر ہم دونوں سارے جہاں کو اپنے پیچھے چھوڑ کر بہت دور نکل جائیں جہاں بہار کے نیلے اور سفید پھول بکھرے پڑے ہوں۔ سرسبز جھاڑیوں میں چڑیاں بیٹھی ہوں۔ میلوں میل تک نیلے آسمان کا گنبد ہو اور نیچے دھرتی پر صرف ہم دو ہوں اور ساتھ ہوں میرے اچھوتے سپنے۔ اشفاق میرے بالوں میں نیلے پھول سجائے تو میں کچھ نہ کہوں اور اس کی آنکھوں میں ڈوب کر دو جہاں کو بھول جاؤں!

"ممی! میں پکنک میں جا رہی ہوں!"

"نہیں!" یہ ممی کا حکم تھا۔

"کیوں —— ؟" اور میرے احتجاج کے باوجود وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

"بٹیا! تو اب سیانی ہو گئی نا؟ اب تجھے یوں نہ گھومنا ہوگا۔ آخر دنیا کیا کہے گی؟"

"اوہ ممی ——!" اور میرا جی چاہا ممی سے خوب جھگڑا کروں اور گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ یوں نہ کرو، ووں نہ کرو، یہاں نہ جاؤ، وہاں نہ جاؤ، جب جاؤ تو اکیلی نہ جاؤ —— یہ پابندیاں آخر کیوں؟ ممی پلیز مجھے چھوڑ دو نا؟ بات بات پر یہ نصیحتیں کون سنے گا۔ میں تو بور ہو گئی ہوں اس ماحول سے۔ ایسی بے رس زندگی بھی کوئی زندگی ہوئی۔ کالج سے سیدھے گھر آ کر اور اپنے بستر پہ پڑے پڑے ٹرانسسٹر پر گانے سنا کرتی ہوں۔ موسیقی ہی تو رگِ جان ہے۔ جس کی دھن میں مست ہو کر تصور کی وادیوں میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی رہتی ہوں۔ کیسی ابدی راحت ملتی ہے میرے احساسات کو —— یہ موسیقی کی لہریں کبھی آبشار بن کر، کبھی کہسار بن کر، کبھی رنگین نازک دھنک سی بن کر میرے وجود پر سے گزرتی رہتی ہیں اور روح میں سماتی رہتی ہیں۔ ممی کو اس پر بھی اعتراض ہے! ان کا کہنا ہے کہ ہر چیز کی ایک انتہا لازمی ہے۔ مگر میرے شوق کی جب کوئی انتہا ہی نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ گانے نہ سنوں، ناول نہ پڑھوں، گھومنے نہ نکلوں —— تو آخر میں کیا کروں؟ سولھواں سال نہ ہوا عمر قید ہو گئی! ممی کو کیا خبر کہ میرے اندر جذبات کی کیسی تیز آندھیاں سی اٹھتی رہتی ہیں۔ ان گرم گرم بگولوں کے بیچ میرا وجود ایک بے بس تنکے کی طرح پِستا رہتا ہے۔ کبھی بہاریں گھیر لیتی ہیں تو کبھی ویرانے آن بستے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر جو میں ہے وہ ایک غبار کی طرح بڑھتے بڑھتے سارے عالم پر چھا جائے۔ اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہ ہو۔ میں ایک ساگر بن جاؤں، ایک بجلی، ایک [illegible] ایک آنگن، ایک ارمان، ایک

بل تنفیر شے بن جاؤں ——— اگر اس کے لئے تو تھی آزادی درکار ہے اور آزادی مجھ کہاں نصیب۔ ممی مجھے ایک دیو کی طرح نظر آنے لگتی ہیں جس نے ی بے بس شہزادی کو خواہ مخواہ قید کر رکھا ہو ——— اور تب میرے اندر ادت کی چنگاری چمکنے لگتی ہے۔ ممی پورب چلیں گی تو میں بھی! اس پوشیدہ ماہرۂ جنگ کے بعد مجھے ایک گونہ تسلی مل جاتی ہے اور میں اُدھیڑ بُن کے ئے راستے نکالنے میں لگ جاتی ہوں۔

جبھی فوزیہ نے آکر مجھے بتایا کہ اشفاق اپنے ساتھ پروین کو لے کر نک منانے چلا گیا اور میں ایکدم جل بُھن کر کباب ہو گئی۔ یہ سب ممی کی جہ سے ہوا! سراسر اس میں انہیں کا ہاتھ ہے! میں سوچتی۔ لیکن اشفاق بھی کم سور وار نہیں۔ بھلا ایسی بھی کیا جلدی آن پڑی تھی اُسے کہ پکنک منانے رہ چلا ہی جائے۔ نہ جاتا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی بھلا سب جھوٹ ہے۔ رہ تو جنم جنم کا رسیا ہے۔ میرے پاس آکر یونہی باتیں بناتا ہے۔ بڑا ہیرو بنتا ہے اور وہ پروین کی بچی! مجھے ایک عجیب سی اُلجھن، رشک اور اُداسی نے گھیر لیا۔ جی چاہا چیخ چیخ کر رووں۔ ممی نے میری اُداسی بھانپ لی تھی جبھی تو وہ مجھے خوش کرنے کے بہتیرے جتن کرتی رہیں۔ آخر میں اُنھوں نے بہت ہی چُھبتا ہوا وار کیا۔

"میں نہ کہتی تھی کہ اشفاق کوئی اچھا لڑکا نہیں۔ تم خواہ مخواہ اُسے اتنی اہمیت دیتی ہو ———!"

اُس وقت مجھے ممی کی بات سو فیصدی درست معلوم ہوئی اور میں نے اشفاق کے خیال کو چاہا کہ ایک پھونک مار کر ذہن سے نکال پھینکوں۔ اِس لئے میں خوش ہو کر ممی کے گلے میں جھول گئی اور وہ پیار سے ہنس دیں! اِتنی ہی دیر میں میں نے اپنی زندگی کا ایک چھوٹا سا پلان مرتب کر لیا جس میں اشفاق کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ بس میں تھی اور میری زندگی کے حسین اوقات! تب ایسا محسوس ہوا کہ میں نے بیکار ہی اِتنی سی بات کو اتنی اہمیت دے رکھی تھی۔ ممی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ ممی کی ساری باتیں درست ہیں اور میں اُنھیں کی نصیحت کی محتاج ہوں ورنہ مجھ میں بھلا ابھی یہ شعور کہاں کہ دودھ اور پانی کو الگ الگ کر کے دیکھ سکوں! کہیں ٹھوکر لگ جائے تو؟

اشفاق میرا کوئی نہیں ——— اشفاق فضول سا انسان ہے۔ اشفاق ایکدم فلرٹ ہے۔ میں اب اُس سے کبھی نہ ملوں گی، کبھی نہ بات کروں گی کبھی نہیں ———!!

ناگہاں پھاٹک میں اسکوٹر کا شور سنائی دیا ——— کہ میرے دل میں ایک شور سا مچا۔ میری رُوح سمٹ کر کانوں میں چلی آئی۔ آنکھیں راہ میں بچھنے کو مچل اُٹھیں۔ رُواں رُواں جیسے کسی آہٹ کا منتظر ہو گیا!

دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ———؟" ممی پوچھ رہی تھیں۔

"اشفاق ہے ممی! ——— مجھے لینے آیا ہے!"

اور میں نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے اشفاق ہی تو کھڑا تھا۔ میری پلکیں جھک گئیں۔ ممی بھی کچھ نہ کہہ سکیں اور میں آہستہ سے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر اشفاق کے شانے سے لگ کر بیٹھ گئی اور اسکوٹر ایک دلنواز موسیقی کی طرح بہہ نکلی ———!!



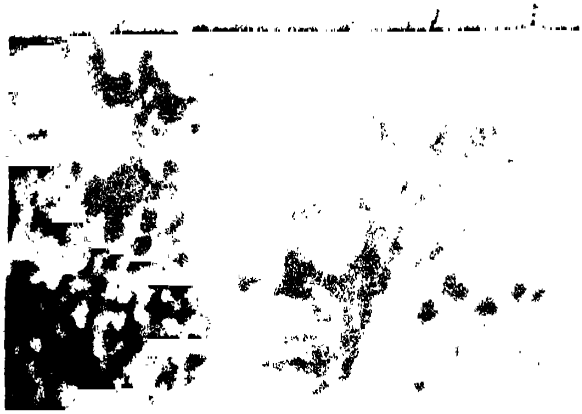
سیبر یڈون

NTA-VT-8488

زندگی اب فقط رات ہی رات ہے

شوق کی رات ہے ناز کی رات ہے
اور تقدیر سے چاندنی رات ہے
مے ہے چاندنی، بادہ ہے چاندنی
آج طوفانِ جذبات کی رات ہے
غم کدہ پھر شبستانِ عشرت بنا
چاند نکلا تو پھر چاندنی رات ہے
اِک پہیلی ہے بُوجھو تو جانیں کہ ہاں
آج کیوں اِس قدر موہنی رات ہے
خود ہی گِن لو مِری زیست کی ساعتیں
آج تم سے مِلے کون سی رات ہے
صبح ہوتے ہی پھر ہم کہاں تم کہاں
بزمِ انجم فقط رات کی رات ہے
ردمِلکے آؤ ہنس بول لیں دو گھڑی
جو نہ آئے گی پھر یہ وہی رات ہے
دردِ دل کہتے سُنتے سحر ہو گئی
کیا خبر تھی کہ یہ آخری رات ہے
شمع گُل ہو گئی، چاند بھی چُھپ گیا
دل سنبھلتا نہیں اور ابھی رات ہے
پُھول ہی پُھول تھے، اشک ہی اشک ہیں
رات کل بھی تھی اور آج بھی رات ہے
وہ ضیائے تبسم کی صبحیں کہاں
زندگی اب فقط رات ہی رات ہے
ہائے کیونکر یہ منظر دِکھاؤں تمھیں
میری پلکوں پہ تاروں بھری رات ہے
کِتنی سُنسان، ویران، اندوہ گیں
یہ وہی کل کی ہنستی ہوئی رات ہے

عندلیب شادانی



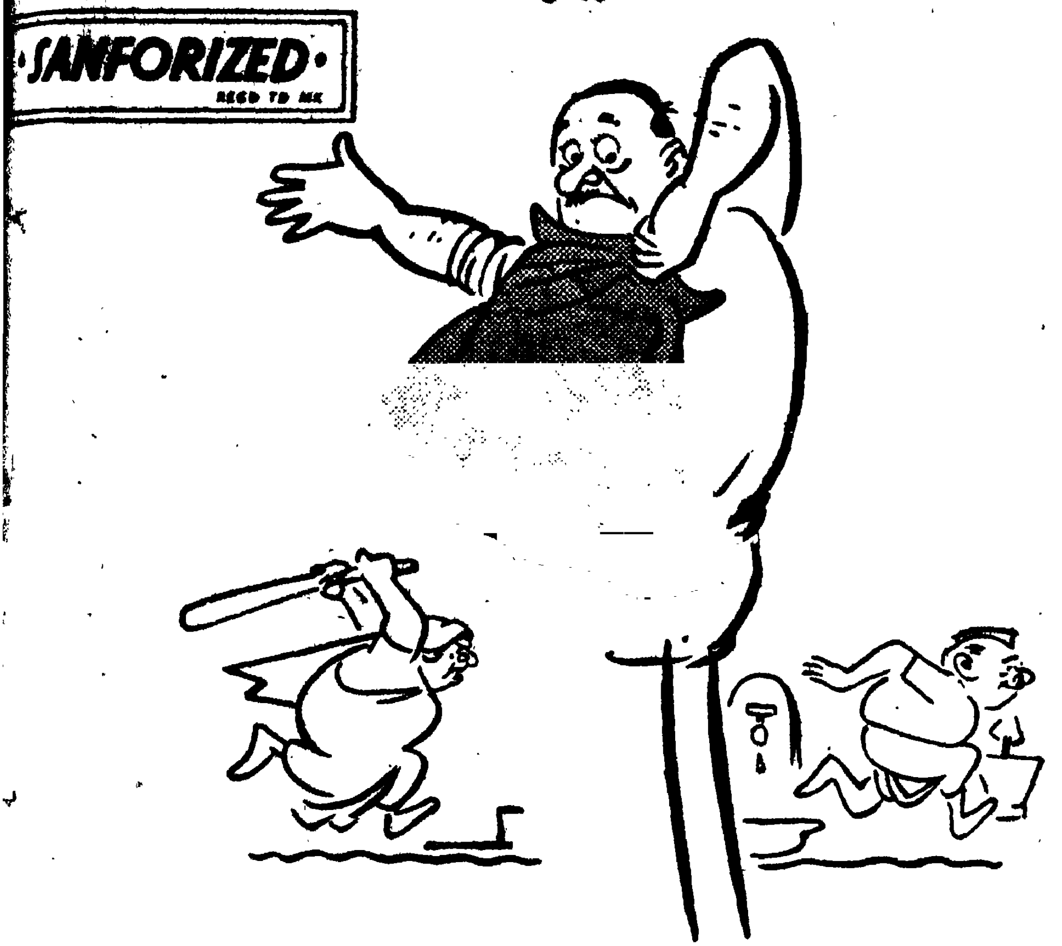
جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی مرحوم و مغفور

جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ غالباً یہ اُن کا آخری کلام ہے جسے اُن کی زخم رسیدہ اہلیۂ محترمہ ——— میری بھابی نے ڈھاکہ سے مجھے بھیجا ہے۔ مُدیرِ "بیسویں صدی" اب ایک چلتی پھرتی لاش اور محترم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، عزیزی نریش کمار شاد اور راجہ مہدی علی خاں ایسے مخلص دوستوں اور عزیزوں کی یادوں کا زندہ قبرستان بن کر رہ گیا ہے۔

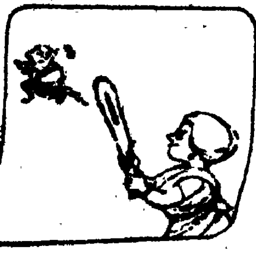
غم زدہ

خوشتر گرامی

سکڑے ہوئے لباس سے آپ کی شان میں فرق آتا ہے
'سینفورائزڈ' کو ساتھ لیجئے اور مسٹر شرنک کو مار بھگایئے



آپ کا لباس کبھی سکڑ کر تنگ نہ ہوگا اگر وہ ایسے سوتی یا سُوت جلے
کپڑوں سے بنا ہے جن پر 'سینفورائزڈ' کی چھاپ ہوتی ہے۔ یہ ٹریڈ مارک
آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کی قابلِ اطمینان گارنٹی ہے۔ 'سینفورائزڈ'
چھاپ والے کپڑے کو سلائی سے پیشتر پانی میں بھگونے کی قطعی ضرورت
نہیں۔ 'سینفورائزڈ' کا شہرت یافتہ نام بھارت میں بنے
ہوئے کپڑے کی برآمدگی بڑھانے میں قابلِ قدر امداد کرتا ہے۔



رجسٹرڈ ٹریڈ مارک 'سینفورائزڈ' کے
مالکان کلیویٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹڈ
(محدود ذمہ داری کے ساتھ) یو۔ ایس
اے۔ میں قائم شدہ) نے جاری کیا۔ اس ٹریڈ
مارک کا استعمال صرف ان مالوں کے ...
کپڑے پہ کیا جاتا ہے جن کو ... کرنے کی اجازت د...
... سکڑنے کی کسوٹی پر پورا ...

سہ سم

Bil. SAN. 8642 UR.

قُرب کی پیاس

عظیم اقبال ایم۔اے

گنج نمبر ۱، بتیا (بہار)

بندہ نواز! تسلیمات

سنا ہے اِدھر آپ پے بہ پے پریشانیوں کے شکار رہے ہیں۔ فلک کی یہ ستم ظریفیاں کیا کبھی ختم بھی ہوں گی؟ افسانہ نمبر نہایت دیدہ زیب ہے۔ اِس کے معیارِ حُسن کو خدا ابد تک سلامت رکھے! میری زیرِ نظر کہانی "قُرب کی پیاس" ایک محسنہ کے استفسارات کا جواب ہے۔ کیا محبت ہمیشہ جنس زدہ ہوتی ہے؟ محبت کا عروج کیا ہے؟ کامیاب ترین وہی کہانی ہوتی ہے جو ہمیشہ ادھوری معلوم ہو، پڑھتے پڑھتے اچانک ختم ہو جائے ـــــ کلائمکس کی آخری سطور حد سے زیادہ Compact ہیں۔ اِس لئے وہ زیادہ غور طلب ہیں۔

نیاز کیش ـــــ عظیم اقبال

وہ دونوں اب بہت پاس پاس کھڑے تھے۔

اِتنے پاس کہ ایک دوسرے کی دھڑکنوں میں سما جائیں، سانسوں کی خوشبو میں تحلیل ہو جائیں اور بدن کی آنچ سے پگھل بھی جائیں۔ فضا کی خنکی کے باوجود اندر ہی اندر دونوں محبوس تھے۔ تپش کی غیر معمولی حالت میں لحظہ بہ لحظہ کانپ بھی رہے تھے ـــــ آگے وہ بہت کچھ چاہ رہا تھا۔ بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ نہیں چاہ رہی تھی۔

ہَوا کا ایک نرم لڑکھڑاتا ہوا جھونکا آیا اور بالوں کی ایک دو لٹیں اُس کی پیشانی پر جھوم گئیں۔ آنچل کا سرا لہرا کر سامنے پھسل گیا۔ اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔ محجوب سی آنکھیں کیسی رنگینیاں بکھیر دیتی ہیں! روبرو جیسے دھنک کی محراب پھیل جائے۔ اُسے ایسا ہی محسوس ہوا۔

ماہتاب کی سُنہری کرنوں سے اُس کے رُخسار تابناک تھے۔ اُن میں جُوہی اور بیلے کی تازگی سمٹ آئی تھی، اور شفق کا رنگ بھی۔ اُس کے ہونٹ ایسے لرز رہے تھے جیسے گُلاب کی پنکھڑیوں میں بادِ نسیم سے ہلکے ہلکے ارتعاش ہو۔ اُس کی پیشانی پر ننھے ننھے قطرے نمایاں ہو چلے تھے، جن میں شبنم کی سی رعنائی تھی۔

دونوں کسی اور تیز و تُند طوفان کے منتظر تھے، جس سے وہ اُسے بازوؤں میں لے لے اور وہ اُس کے سینے سے لگ جائے۔ اُس کے ریشمی بال اُس کے شانوں پر بکھر جائیں اور اُس کی بانہیں اُس کے سراپا کا احاطہ کر لیں۔

ایسی خواہشیں اُن میں اکثر جاگی تھیں۔ ایسے مرحلے بار بار آئے تھے۔ جھجک ـــــ جھجک کر اُس نے اُسے اپنی جانب کھینچا تھا۔ پھُول کی نازک ڈالی کی طرح لہرا لہرا کر وہ اُس کے دامن میں سمٹ گئی تھی۔ وہ کیف و سُرور کی نئی دُنیا پا لیتا۔ لطافت سے وہ سرشار ہو جاتی۔

اُس کے بالوں سے اُٹھتی ہوئی دبی دبی سی خوشبو سے وہ مدہوش سا ہو جاتا۔ یک لخت وہ اضطراری کیفیت محسوس کرتا۔ وہ بھی انگاروں کی طرح تپنے لگتی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا، لیکن کہہ نہ پاتا۔ وہ کچھ سُننا چاہتی، لیکن ترس جاتی۔ خاموشی ہی اُس کی زبان بن جاتی۔ لمس کا احساس ہی اُس کے اظہار کا انداز ہوتا۔ سیاہ راتوں میں اُس کی جبیں کی تابندگی میں اُسے چاند کا رُوپ نظر آتا۔ تنہائی اور ویرانی میں اُسے نغموں کی گُونج سُنائی دیتی۔ برسات کی پھُواروں کے درمیان اُسے محسوس ہوتا جیسے سامنے ہی وہ بالوں کو جھٹک رہی ہو اور شفّاف قطرے اِدھر اُدھر بکھر پڑے ہوں۔ گرم دوپہروں میں وہ اُس کی سانسوں کی ٹھنڈک محسوس کرتی اُس کی مُسکراہٹوں کی دلفریبی اُس کی کلفتوں کے احساس کو دبا دیتی۔ اُس کے بازوؤں کے ہالے میں وہ سارے رنج و الم بھُول جاتی۔ اُس کی ہتھیلیوں کا گداز محسوس کرتے کرتے اُس کی رگوں میں بجلیاں سی کوندنے لگتیں۔

ی کی بارشوں کے سائے میں اُس دُھندلاہٹوں میں گم شام کو اُس کی
انگلیوں میں جکڑی تھیں۔ اُسے محسوس ہوا تھا جیسے اُس کے اندر شعلے لپک
پنی ہی لگائی آگ میں وہ خود جلا تھا۔ نسائیت کے عرق میں، وہ بھیگ

، کی آنکھیں ہمیشہ جھکی جھکی رہتیں۔ ہزاروں منتوں سے جب وہ دھیرے
اُٹھاتی تو وہ اُس وقفہ تک کے لئے گم سُم ہوجاتا جب تک کہ پھر اُس کی
ہوجاتیں۔ کتنی ہی بار سحر کی سپیدی اُس کے رُخسار پر پھیلی دیکھ کر وہ
اُٹھا۔ اُس کے ہونٹوں کے سُرخ گلابوں کی رنگت کو چُرانے کے لئے اُس
ڑپتے ہوئے لمحے بیتے تھے۔
ں روز بہار کے پہلے غنچے چٹکے تھے، اُس کے ارمانوں کی کلیاں بھی مُسکرائی تھیں۔
تاروں کو تکتے تکتے وہ اُن کے جلو میں کہکشاں تک پہنچ گئی تھی۔ فرشتوں کا
وہ وہاں اُس کا منتظر تھا۔ بڑھ کر اُس نے اُسے بازوؤں میں لے لیا۔ زہرہ،
مد کی وادیوں سے گزر کر وہ چاند کی پہنائیوں میں بھی پہنچے تھے۔ وہاں برف
یاں تھیں، اُدھر گنگناتے جھرنے، اُدھر لہلہاتے مرغزار... وہ دونوں اپنی
کھوئے تھے —— وہ اُس کے جلووں میں مگن تھا۔ وہ اُس کی پناہوں

ٹھیلیاں کرتی ہواؤں سے جب ہار سنگھار کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی
دُور خلاؤں سے پرے ستارے جگ مگ کر رہے تھے۔ روشوں سے گزرتے
نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال
ور اُسے ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اِن جھلملاتے ستاروں کی جلوہ سامانی
وں سے کہیں زیادہ ہے، بہت زیادہ! ویسے بھی اُس کی زُلفیں سیاہ راتوں
یادہ سیاہ تھیں، اُمڈتی گھٹاؤں سے کہیں زیادہ گھنگھور تھیں۔ کتنے
ؤں کو اُن شکن در شکن گیسوؤں میں چھپا کر وہ اُس خوبصورت نظارے
تھا —— جیسے تاروں بھری رات سامنے ہو، اپنی حدوں میں، اپنے
ں میں!
سی حسین روپہلی صبح میں اُس نے بکھرے بکھرے پھولوں کو سمیٹ کر اُس کا
یا تھا۔ اُس کی زُلفوں کو سجایا تھا۔ اُس کی کلائیوں میں لڑیاں پروئی تھیں۔
یموں میں کھلتی کلیاں ڈھیر کر دی تھیں۔ پھولوں سے سجا کر اُس نے
وقار بخش دیا تھا۔ سنہری دھوپ میں دوڑ دوڑ کر دونوں نے رنگ
تتلیاں پکڑی تھیں۔ زرد، نیلی، گلابی، سُرخ، سبز، سیاہ، سفید رنگوں کو
ل نازک پروں میں جذب کئے ہوئے روش روش اُڑتی ہوئی تتلیاں ——

جیسے رنگوں کی برسات آگئی ہو! وہ سوچ رہی تھی 'کاش وہ کوئی تتلی ہوتی!' وہ
سوچ رہا تھا 'کاش وہ مُسکراتا ہوا پھول ہی ہوتا!' اُسی کے لئے وہ سجتی سنورتی۔
اُس کی ہر ادا میں اُسی کا عکس تھا —— آنکھوں میں اُسی کی پرچھائیاں تھیں۔ ہونٹوں
پر اُسی کے نغمے تھے، اُسی کے ہاتھوں کے لمس سے بدن میں تھرتھری سی تھی، اُسی کی
سانسیں اُس کی زُلفیں اُڑاتی تھیں۔ اُسے بھی اُس کی شبیہیں قدم قدم پر نظر آتیں۔
پرندوں کی چہکار اُسی کی آواز کی بازگشت تھی۔ چاندنی اُسی کے رُخسار کا پرتو تھی۔
جھومتی مچلتی گُلوں کی شاخیں اُسی کی رفتار سے سرشار تھیں۔ جھیل کی پُرسکوت سطح
میں ہلچل مچا کر گرداب کی لہروں میں اُسی کا رقصِ جنوں خیز وہ دیکھتا۔

ایک دوسرے کے لئے دونوں نے ہزاروں قسمیں کھائی تھیں، ہزاروں عہد و پیمان ہوئے تھے۔ جئیں گے ساتھ! مریں گے ساتھ! زندگی کے ریگ زاروں میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلیں گے۔ کسی پل جُدا نہ ہوں گے! یہ راہیں کتنی کٹھن ہیں! جب ہم ساتھ ساتھ ہوں گے تو منزل دُور نہ ہوگی۔ دشواریاں نہ ہوں گی، سنگلاخیں نہ ہوں گی...

اُنھیں احساس تھا اُن کے درمیان کے فاصلے اب صرف تکلفاتی تھے۔
اِدھر وہ دہشت خیز بن رہا تھا۔ اپنے آپ میں وہ سمٹ جاتی۔

"نہیں، یہ سب نہیں، ابھی نہیں!"

"بھروسہ نہیں مجھ پر؟"

"پاگل نہ بنو!"

"چاہت کی آگ میں کب تک جلتے رہیں؟ آؤ، اب اور نہ تڑپاؤ!"

"مجھے گُمراہ نہ کرو... میں بہک نہ جاؤں! اپنی نظروں سے تو نہ گرنے دو —— خود کو سنبھال لو..."

"میں نے تمھیں اپنی مان لیا، تم نے مجھے اپنا تسلیم کر لیا۔ ہم غیر نہیں رہے، اجنبی نہیں رہے ——"

"نہیں، ابھی یہ گُناہ ہے۔"

"یہ رسمیں، یہ روایتیں ——"

وہ کسی بے جان بُت کی طرح ساکت ہو گیا۔ سہمی ہوئی وہ سامنے کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے شبنمی قطرے چھلک پڑنے کو بیتاب سے تھے —— وہ دونوں اب بھی بہت پاس پاس کھڑے تھے!!

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین نظم و نثر شائع
ہوتے ہیں جن کے آخر میں لفظ "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔

غزل

اعجاز صدیقی

بمبئی - ۱۹؍اگست ۱۹۷۹ء

برادرِ محترم! تسلیم

یہ تو آپ کو پہلے ہی اطلاع کر چکا ہوں کہ برادرم اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" بمبئی اسپتال میں داخل ہیں۔ وہ گئے تو تھے اپنے چیک اپ کے لئے۔ لیکن وہاں پیر ایسا پھسلا کہ سینے کی تین ہڈیاں چٹخ گئیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ہڈیاں جڑنے میں وقت لگے گا۔ ایک ایسے شاعر کو جس کا ذریعۂ معاش علم و ادب کی خدمت کے سوا کچھ نہ ہو ایسے لمحے شاذ ہی میسّر آتے ہیں جب اُسے دل کی اُنگلی پکڑ کر زندگی کے رستے پہ چلنے کی مہلت اور فرصت ملتی ہے اور اُسے جب کبھی ایسے لمحے مل جاتے ہیں تو وہ کربِ تخلیق میں مبتلا ہو کر شعری ادب میں چند ایسی چیزوں کا اضافہ کر دیتا ہے جو نشتر بن کر دلوں میں اُتر جاتی ہیں۔ چنانچہ اسپتال میں داخل ہو کر اور مسلسل جسمانی اذیت پر قابو پا کر جب ایسے چند لمحات اعجاز صاحب کو ملے تو اُنہوں نے دو چار روز میں نصف درجن غزلیں کہہ لیں۔ کہاں یہ صورت کہ چھ چھ مہینے میں ایک غزل مکمل ہوا اور کہاں یہ کہ غزل در غزل ہوتی چلی گئی۔ سچ ہے کہ یہ زمانہ، جب چاند کے سینے پر آدمی اپنے نقوش پا ثبت کر آیا ہے معجزوں کا زمانہ ہے اور خدا کی قسم خوش تر صاحب کہ ہم اور آپ جو اس دور میں سانس لے رہے ہیں بڑے خوش نصیب ہیں۔ تو اعجاز صاحب نے جو ڈھیروں غزلیں کہہ لیں اُس پر مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ البتہ حیرت اس بات پر ہے کہ افراتفری کے اِس دور میں ایسے ذہین و طباع شاعر کو سماجی اور اقتصادی ناموافق حالات نے پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ میں جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں کہ اعجاز صاحب کے دل میں خوش تر گرامی کی قدر ذات اور "بیسویں صدی" کی خدمات کا اعتراف ہے۔ اُن کو جو آپ سے تعلق خاطر ہے اُسی کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے ایک تازہ اور غیر مطبوعہ غزل "بیسویں صدی" کے لئے حاصل کر لی جو بہ رشتہ ارسال خدمت ہے۔ سارہ ودغزل جو نیا موڑ لے رہی ہے یہ غزل اُس کی نشاندہی کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ غزل آپ کو اور قارئین "بیسویں صدی" کو پسند آئے گی۔

نیاز مند ——— ضیا فتح آبادی

ہے کمی لطافت کی، ہم خزاں کے ماروں میں
تازہ کاریاں ورنہ اب کبھی ہیں بہاروں میں

فرق کچھ نہیں پڑتا اِس سے راہ داروں میں
قافلے تو لُٹتے ہیں روز رہگذاروں میں

رہ چکی ہے پھولوں سے رسم و راہ تھوڑی سی
زندگی گُذاری ہے ہم نے خارزاروں میں

ان کی خوش خرامی پر چاند ہنستا رہتا ہے
چشمکیں سی رہتی ہیں رات بھر ستاروں میں

اب تو کھُل کے کہنی ہے، جو بھی بات کہنی ہے
ہو چکیں بہت باتیں آج تک اشاروں میں

یہ خبر نہیں اِن کو موجِ پُرسکوں کیا ہے؟
بہہ رہے ہیں جو تنکے تُند و تیز دھاروں میں

روز روز کے جھگڑے تاکہ ختم ہو جائیں
مے کو بانٹ لیں یکساں، کیوں نہ میگُساروں میں

راستے ہوئے روشن، منزلیں ہوئیں آساں
جتنی ٹھوکریں کھائیں ہم نے رہگُذاروں میں

دھجیوں سے دامن کی، وقت کو سجا ڈالیں
ایسے لوگ بھی ہیں کچھ، ہم جنوں شعاروں میں

ہم سے غنچہ و گُل نے کی ہیں پیار کی باتیں
کھو گئے ہیں ہم اکثر صبح کے نظاروں میں

پی کے ایک دو ساغر یہ بہکنے لگتے ہیں
ظرف کی کمی پائی ہم نے بادہ خواروں میں

زندگی کو پھُولوں کی سیج ہم نے سمجھا تھا!
اور اُلجھ گئے آ کر زندگی کے خاروں میں

آج جن میں گُل بُوٹے ہیں نگاہ کی تسکیں
دُھول اُڑتی رہتی تھی کل اُنہیں دیاروں میں

زندگی کوئی بنجر سرزمیں نہیں اعجاز
کچھ نہ کچھ رہے جاری جھڑ جھڑ جھاڑ یاروں میں



صرف ایک چٹکی
آر تی نیل
بالٹی بھر
دھلے کپڑوں کو
چمکا دے گی
پھر دیکھئے
اپنی کشش
کپڑوں کے
زیادہ سفیدی و
چمکیلے پن
اور بھرپور زندگی کا راز
آرتی نیل
ARATI ULTRAMARINE
SETH CHEMICAL WORKS CALCUTTA
سیٹھ کیمیکل ورکس
۱۶ جمنا لال بجاج اسٹریٹ۔ کلکتہ ۷
میسرز سیٹھ ٹریڈنگ کمپنی ۔ ۲۵۲۹ ۔ چرداراتِلک بازار ۔ دہلی نمبر ۶

فیصلہ

معراج انور
مکان ۶۵۴-۳-۱۷، یاقوت پورہ، حیدرآباد نمبر ۲۳ (آندھرا پردیش)

محترمی! تسلیمات

"فیصلہ" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، یہ تو آپ کے اور قارئینِ "بیسویں صدی" کے فیصلہ پر ہی معلوم ہوگا —— اپنے فیصلہ کا صرف خط ہی بھیج دیجئے . . .

خلوص کے ساتھ

آپ کا —— معراج انور

★

"شکیلہ!"

"ہوں"

"کل سے کالج بند ہیں"

"جانتی ہوں"

"میں کل اپنے گھر جانے کی سوچ رہا ہوں"

"ٹھیک ہے، آپ کا گھر ہی تو ہے"

"سوچ رہا ہوں تم سے بہت دُور ہو جاؤں گا"

"سچ تو ہے، پھر —— ؟"

"کیا تمھاری دُوری برداشت کر سکوں گا؟"

"اپنے دل سے پوچھئے، میرا اختیار نہیں"

"مشکل معلوم ہوتا ہے"

"پھر کیا خیال ہے —— جانا ملتوی؟"

"ملتوی بھی ہو سکتا ہے، تم پر منحصر ہے"

"یہ بوجھ مجھ پر نہ ڈالئے، میں عورت ہوں"

"نسیمہ، شاردا، کلپنا اور رضیہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ بھی عورتیں ہیں"

"سُنا ہے وہ دوسروں سے محبت کرتی ہیں"

"میں نے بھی سُنا ہے"

"اور وہ سب اپنی اپنی پسند کی شادی بھی کرنے والی ہیں"

"میں نہیں سمجھتی"

"کیوں —— ؟"

"سب مشرقی عورتیں ہیں"

"تو کیا ہوا؟"

"اُن میں اتنی جُرأت نہیں ہوتی کہ زمانے کا، حالات کا اور گھر والوں کا مقابلہ کر سکیں"

"چاہیں تو سب کو ٹھکرا سکتی ہیں!"

"بہت مشکل ہے اور یقین سے بعید بھی"

"میں نہیں مانتا"

"ہاں —— کیوں کہ تم مرد ہو"

"تمھیں ایسے حالات کا سامنا ہو تو کیا کرو گی؟"

"میں سب کچھ چاہ کر بھی وہی کروں گی جو سماج چاہتا ہے"

"کیوں؟"

"میں عورت ہوں"

"تمھاری ایک 'نہیں' سب کی آواز بند کر سکتی ہے!"

"مجھے تو ڈر لگتا ہے۔"

"تو ہماری دوستی، صرف دوستی ہی رہ گئی۔"

"اِس سے آگے سوچنا بھی بھول ہے۔"

"تو میں نے غلطی کی تھی؟"

"کِس بات کی؟"

"تم سے دوستی کرکے۔"

"تو کیا میں نے کوئی تحریر لکھ دی تھی کہ وہی کروں گی جو تم چاہو گے۔"

"نہیں میں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔"

"جو سوچا جائے وہ ہونا ضروری تو نہیں۔"

"تو مجھے مایوسی ہوئی؟"

"حالات تو کچھ ایسے ہی ہیں۔"

"تو میں گھر اکیلا ہی لوٹ جاؤں؟"

"ہاں اکیلے آئے تھے اکیلے ہی جائیے۔"

"بہت بے درد ہو!"

"اب بے وفا بھی کہو گے!"

"ہاں ــــ تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔"

"عورت کی مجبوری بے وفائی ٹھہرائی جاتی ہے۔"

"سب کے مقابلہ پر اُتر آؤ۔"

"مشکل ہے، خاص طور سے میرے لئے۔"

"تو میں چلتا ہوں، یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی!"

"تو کیا کالج کھلنے پر آنے کا خیال نہیں ہے؟"

"آؤں گا تو ضرور!"

"تب تو ضرور ملاقات ہوگی۔"

"ہاں ملاقات تو ہوگی، اچھا میں چلتا ہوں۔"

"خدا حافظ!"

"سراج!"

"فرمایئے!"

"اچھے تو ہو؟"

"جی!"

"دن کیسے گزرے؟"

"ٹھیک ہی۔"

"کچھ سنا ہے؟"

"آج ہی تو آرہا ہوں۔"

"نیسمہ، شاردا، کلپنا اور رضیہ نے اپنی اپنی پسند کی شادیاں کرلیں۔"

"اچھا ــــ وہ کیسے؟"

"سب نے حالات کا مقابلہ کیا!"

"مردوں سے ہار رہیں۔"

"ہاں عورت جب کچھ سوچ لیتی ہے تو اپنے فیصلہ پر اٹل ہو جاتی ہے۔"

"خوب ــــ یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"ہاں ــــ!"

"پہلے کیا ہوا تھا؟"

"ڈرتی تھی۔"

"اب کیوں نہیں ڈرتیں؟"

"تمہاری دُوری نے میرے اندر قوت پیدا کردی۔"

"کِس بات کی؟"

"کِسی کو اپنا بنانے کی!"

"اچھا ــــ!"

"میں نے گھر میں اپنا فیصلہ سُنا دیا۔"

"اچھا ــــ پھر ــــ؟"

"گھر والوں کو ماننا پڑا!"

"کیا ــــ؟"

"کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"خوب!"

"تو کب خیال ہے؟"

"بہت دیر کی ــــ"

"کِس بات کی؟"

"اپنا فیصلہ کرنے میں۔"

"کیوں؟"

"میں نے شادی کر لی ہے!!"

مدیرۂ بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہوسکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

غزل

ڈاکٹر سری نواس بٹاکامل ایم اے، پی ایچ۔ ڈی

ہر خوشی محوِ انتقام رہی
غم کی دولت ہی میرے نام رہی

چشمِ ساقی پہ ہے ترا احسان
زندگی مستیوں کا جام رہی

ایک معصوم سی تمنّا سے
نیند اکثر مری حرام رہی

جان تک دے دی آرزو کے لئے
آرزو پھر بھی تلخ کام رہی

عشق نے کر دیا ہمیں بے بس
صبح اپنی رہی نہ شام رہی

دیکھ کر اُن کی مست مست آنکھیں
دِل کی دُنیا تہی جام رہی

اب وہ منزل نہیں نگاہوں میں
مُدّتوں جو مرا مقام رہی

گو خموشی رہی زبانوں پہ
آنکھ سے آنکھ ہم کلام رہی

ہا چلے اور بڑھ گئے کاملؔ
ناصیت ہرچند تیز گام رہی

غزل

سعادت نظیر ایم۔ اے

خدا جانے، یہ کیسی آرزو تھی؟
کہ اُن سے مل کے اُن کی جستجو تھی

جہاں ناقدریٔ جوشِ نمو تھی
بہارِ نو فریبِ رنگ و بو تھی

سمجھ کر بھی نہ سمجھے آپ جس کو
مری نظروں میں ایسی گفتگو تھی

مٹایا تھا نہ تم نے دل کو جب تک
بڑی دلکش حدیثِ آرزو تھی

جو ہیں میری تباہی کا سبب آج
حیات افزا سی اُن کی جستجو تھی

بس اتنا یاد ہے مجھ کو قفس میں
جہاں تم تھے، فضائے رنگ و بو تھی

فسانہ بن گئی تھی جب خموشی
محبت بے نیازِ گفتگو تھی

لرزتا ہوں خوشی کے نام سے اب
کبھی مجھ کو خوشی کی آرزو تھی

نظیرؔ، اُن کو ہنسی آئی تھی جن پر
انھیں اشکوں سے غم کی آبرو تھی

کانٹے

موسیٰ مجروح ایم۔ اے۔ بی۔ کام

۸۰۔بی۔گھوسی پور، نزد اقبال نرسری اسکول۔ گورکھپور

محترم و مکرم جناب خوشتر صاحب! اسلام خلوص

مسلسل چھ ماہ کی کوششوں کا نتیجہ "کانٹے" آپ کی نذر ہے — کشمیر کی گل پوش وادی سے لوگ خوشگوار یادیں، خوبصورت چیزیں، جانکاہ خلشیں، ناتمام خواہشیں . . . اور خدا جانے کیا کیا کچھ لے کر واپس ہوتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے حوصلوں اور دسترس کی بات ہے ؎

زہرِ غم پیتا ہے کوئی اور کوئی پھولوں کا رس اپنا اپنا حوصلہ ہے اپنی اپنی دسترس

میری دسترس کانٹوں تک محدود رہی اس لئے میرے حصہ میں کانٹے ہی آئے — حسین پھولوں سے دامن بھرنے کا خواہش مند دنیا میں کون نہ ہوگا لیکن کانٹوں سے دامن الجھانے کے لئے شاید ہی کوئی تیار ہو۔ میں نے اس کہانی میں خیام کے دامن کو کانٹوں سے الجھا کر ایک بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی اچھوتی اور موضوع عام روش سے بالکل الگ ہٹ کر ہے۔ تجسس کہانی کی روح ہے جو آخری سطور تک قائم رہتا ہے۔ حقائق میں زیب داستان کے لئے کچھ افسانوی رنگوں کی آمیزش کی گئی ہے۔ کہانی کچھ طویل ہو گئی ہے لیکن دلچسپی کہیں بھی کم نہیں ہوتی۔ مجھے یقین ہے، پھول اور کانٹوں کے درمیانی فاصلہ میں بنی گئی یہ کہانی آپ کو پسند آئے گی اور ارباب "بیسویں صدی" کے وسیع حلقہ میں قبولِ عام کی سند حاصل کرے گی — میری اس سے پہلی کہانی "شمع کی صورت" کافی مقبول ہوئی اور پسندیدگی کے بہت سارے خطوط آئے۔ کچھ اداروں اور جریدوں نے مجھ سے کہانی کے لئے بھی فرمائش کی۔ اس سے "بیسویں صدی" کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں ان تمام احباب اور کرمفرماؤں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی . . .

نیاز مند — موسیٰ مجروح

★

کسی حسین کوٹھی میں چاروں طرف کانٹے ہی کانٹے بکھیر دئے جائیں تو اُسے پاگل پن کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

خیام پر بھی بالکل ایسا ہی پاگل پن سوار تھا۔ اُس نے بھی اپنے جدید طرز کے خوبصورت بنگلہ میں ہر طرف کانٹے پھیلا رکھے تھے۔ بنگلہ کے گیٹ سے پورٹیکو تک کی سڑک پر دو رویہ روشں میں، ہرے بھرے لان میں جا بجا چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں، پورٹیکو اور ڈرائنگ روم کے باہر مٹی کے گملوں میں، ڈرائنگ — روم میں خوبصورت گلدانوں میں — اور اپنی خواب گاہ میں پیتل کے ایک آثارِ قدیمہ قسم کے منقش، بڑے جار میں۔ فرق اتنا تھا کہ اُس نے انھیں بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھیرنے کے بجائے اہتمام سے لگا رکھا تھا۔ جیسے اُسے اُن کانٹوں کے علاوہ کچھ اور میسر ہی نہ ہو — اگر وہ کسی ریگ زار میں مقیم ہوتا تو اُس کے اِس انوکھے انتخاب پر کوئی حیرت نہ ہوتی۔ مگر تعجب تو اِس پر ہوتا تھا کہ وہ جنتِ ارض، وادی کشمیر میں رہتا تھا۔

انتظار

انتظار اُن سا عبث اے دلِ مشتاق نہ کر
وہ کسی اور کے مہمان بنے بیٹھے ہیں —— شاد عظیم آبادی

وہ ہمیں بھول گئے اور یہاں ہے یہ حال
ہر گھڑی سامنے آنکھوں کے ہے صورت اُن کی —— بیخود دہلوی

تھک گئے ہم کرتے کرتے انتظار
کیا قیامت اُن کا آنا ہو گیا —— نامعلوم

تصویر تمہاری ہے یا تم ہو خدا جانے
اِک عالمِ حیرت میں ہے پیشِ نظر کوئی —— نسیم عظیم آبادی

خدا جانے وہ آئیں گے یا دیر ہی خدا جانے
ہم نے کلیاں بچھاؤں کہ کلیاں بچھاؤں بستر پہ —— عارف لکھنوی

مرسلہ:- ایس- این- ہنکاری ایم- اے- آگرہ

کشمیر —— جو بجائے خود ایک سر سبز و شاداب گلستاں کی کشش رکھتا ہے۔ جس کا نام ہونٹوں پر آتے ہی عالمِ تصور میں پھولوں کی جنت نگاہ دُنیا آباد ہو جاتی ہے۔ خوبصورت، نرم و نازک، رنگ برنگے پھولوں کی دُنیا! —— اُن کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو مسحور کر دیتی ہے —— مگر اُس نے وادیٔ کشمیر میں کھلنے والے بے شمار خوبصورت پھولوں میں سے کسی کو بھی قابلِ التفات نہ سمجھا۔ بلکہ خود کو اُس خاردار پودے کے لئے وقف کر دیا جو اُس کی زندگی کا جزو بن کر رہ گیا تھا . . .

. . . ایک عجیب و غریب طرح کا پودا —— سر سے پاؤں تک سیاہی مائل ٹہنیوں پر مشتمل کانٹوں کے درمیان مہندی کی پتیوں سے مشابہ چھوٹی چھوٹی ہری پتیاں۔ جن میں بظاہر کوئی دلکشی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اِس کے سوا ٹہنیوں کے آخری سرے پر چھوٹے چھوٹے سُرخ پھولوں کے کچھ خوشے، اُس میں دلکشی کا ایک ہلکا سا رنگ بھر دیتے تھے۔ ہر خوشہ چار سے چھ پھولوں تک محدود اور ہر پھول میں کسی دوشیزہ کے نیم وا سُرخ ہونٹوں کی طرح دو نیم شگفتہ پنکھڑیاں!
خدا جانے اُسے اِن کانٹوں سے کون سا اُنس ہو گیا تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے وہ اُن کا خیال رکھتا۔ یوں تو اُن کانٹوں کی نگرانی کے لئے اُس کا پرانا وفادار نوکر رمضان بھی تھا جو اُس پُراسرار پودے کی آبیاری کرتا، اُس کی جڑوں میں کھاد ڈالتا، خزاں رسیدہ پتیاں چُنتا، کیاریوں میں اُگی ہوئی گھاس نکالتا اور تراشی ہوئی ٹہنیوں کو کسی الگ کیاری میں پلانٹ کیا کرتا . . . لیکن خیام کو محض رمضان کی نگرانی سے تسکین نہ ہوتی۔ وہ صبح کو کلینک جانے سے پہلے اور شام کو واپسی کے بعد ساری کیاریوں کا بغور جائزہ لیتا۔ دو رویہ روِش کی بڑھی اور بکھری ہوئی ٹہنیوں کو خود اپنے ہاتھ سے تراشتا، زرد اور گری ہوئی پتیوں کو چُنتا۔ پورٹیکو اور ڈرائنگ رُوم کے سامنے رکھے ہوئے گملوں کو مختلف زاویوں سے آراستہ کرتا —— ایک ایک پھول کو بہت پاس سے جھک جھک کر دیکھتا جیسے وہ اُن سے پوچھ رہا ہو "میرے غم گسارو! میری غیر حاضری میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہ ہوئی" اور پھر خود ہی بڑبڑا اُٹھتا۔ "ہاں ہاں یقیناً ہوئی ہوگی۔ رمضان کو بھلا کسی کی تکلیف اور آرام سے کیا غرض!" اور آبدیدہ ہو کر بول اُٹھتا۔ "مجھے معاف کر دینا میرے دوستو!" اِتنا کہتے ہوئے اُس کا گلا رُندھ جاتا اور اُداس آنکھوں سے آنسوؤں کی چند بوندیں نکل کر چہرے پر پھیل جاتیں۔ پھر وہ کچھ پھول اِس کیاری سے، کچھ دوسری کیاری سے چُن کر بہت خوش سلیقگی سے گلدستہ بناتا اور اُنھیں ڈرائنگ رُوم میں رکھے ہوئے گلدانوں میں سجاتا۔ گلدانوں سے نکالے گئے باسی پھولوں کو بنگلہ کے ایک گوشے میں بنے ہوئے حوض میں بہت عقیدت سے چھوڑ دیتا، بالکل اُسی طرح جس طرح ارتھی کے پھول مقدس دریاؤں میں بہائے جاتے ہیں۔ خواب گاہ میں بستر پر دراز ہونے کے بعد وہ پیتل کے منقش جار میں کھلے ہوئے پھولوں کو اُس وقت تک گھورتا رہتا جب تک نیند کی دیوی اُسے اپنے آنچل میں نہ چھپا لیتی۔

مجھے اِس وادی میں آتے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ اِس عرصہ میں خیام کے خاموش اور اُداس بنگلہ میں کئی بار آنے کا اتفاق ہوا۔ کبھی اُس کی دعوت پر اور کبھی خود سے۔ جب میں اُس خوبصورت بنگلہ میں داخل ہوتا مجھے اُس کی یکسانیت سے وحشت سی ہونے لگتی۔ وہی خاردار پودے، مہندی سے مشابہ پتیاں، زخموں سے جھانکتی ہوئی سُرخی کی طرح ننھے ننھے سُرخ پھول۔ جن میں بظاہر کوئی کشش نہیں۔

"کشمیر میں اور بھی تو پھول کھلتے ہیں۔ تمہیں یہ کانٹے ہی پسند کیے؟" میں نے ایک دن رمضان کو چھیڑا۔

"مالک کو پسند ہیں حضور! مجھے تو کانٹے کھلتے ہیں۔ میرا بس چلے تو کشمیر کیا دُنیا کے تمام خوبصورت پھولوں سے اِس بنگلہ کو سجا دوں۔" رمضان کی

آواز میں بے بسی اور بے چارگی کا عنصر شامل تھا۔

"تمہارے مالک ہی کو سہی۔ آخر یہ کانٹے کیوں پسند ہیں؟"

"آپ ان کے دوست ہیں حضور! آپ کو تو معلوم ہی ہوگا۔" رمضان نے مجھے ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

"بھئی رمضان ہماری دوستی صرف چند مہینوں کی ہے۔ ابھی ہم اس منزل پر نہیں پہنچے ہیں جہاں دوستوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہ جاتا۔ مجھے تو اب تک کچھ نہ معلوم ہو سکا۔"

حقیقت بھی یہی تھی کہ ابھی ہم اس منزل سے کوسوں دُور تھے جہاں پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ خیام کی اور ہماری دوستی جذباتی ہم آہنگی یا نظریاتی مطابقت کے باعث نہ تھی، بلکہ ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ وہ وادیٔ کشمیر کا مشہور و کامیاب ترین سرجن تھا اور میری حیثیت اس شہر میں نو وارد ڈاکٹر کی تھی۔ کئی موقعوں پر ہم دونوں کا سامنا ہوا۔ باہمی مشورے ہوئے تشخیصیں ہوئیں، مشترکہ آپریشن کئے اور رفتہ رفتہ پیشہ ورانہ ہم مشربی دوستی کی حدود میں داخل ہوگئی۔

"یہ تو ٹھیک ہے حضور! لیکن مجھے مالک کے ساتھ رہتے ہوئے دس سال ہوچکے۔ لیکن اس بنگلہ میں آج تک ان کا کوئی دوست نہیں آیا۔ یوں آنے کے لئے مریض ہزاروں آئے —— آپ چاہیں تو ان کانٹوں کی چاہت کا راز معلوم کر سکتے ہیں۔"

"یہ میں بعد میں معلوم کروں گا۔ اس وقت تم یہ بتاؤ، تم نے کبھی خیام سے دوسرے پھول لگانے کے لئے نہیں کہا؟"

"لگانے کے لئے تو نہیں کہا حضور! البتہ ایک بار میں نے اپنی طبیعت سے کچھ بیلیں اور کچھ پھول کے پودے لاکر لگا دئے تھے۔ کچھ نہ پوچھئے کہ کیا ہوا حضور! بیلیں نوچ ڈالی گئیں اور پھول اُکھاڑ کر پھینک دئے گئے۔ مجھ غریب پر وہ مصیبت ٹوٹی کہ اللہ توبہ! مجھے نکالا نہیں، باقی سب کچھ کر دیا۔ پھر اس کے بعد جانتے ہیں کیا ہوا حضور؟ مالک اپنے کمرے میں جاکر گھنٹوں سِسک سِسک کر روتے رہے۔" رمضان ہر سانس پر ایک بار "حضور" ضرور کہتا۔ "حضور" غالباً اس کا تکیۂ کلام تھا۔

"تم نے کبھی یہ نہ پوچھا کہ حضور یہ کانٹے آپ کو کیوں پسند ہیں؟" میں نے رمضان کے انداز کا خاکہ اُڑایا۔ وہ میری نقّالی پر ہنس پڑا۔

"پوچھنے کو کہتے ہیں حضور —— ہزاروں بار پوچھا۔"

"کیا جواب ملا؟"

چال

سانس لیتی ہے وہ زمین فراق
جس پہ وہ ناز سے گزرتے ہیں —— فراقؔ گورکھپوری

نرمی و آہستگی سے پاؤں رکھنے کی ادا
سیکھ لیں شبنم کے قطرے آپکی رفتار سے —— جوشؔ ملیح آبادی

پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھکر —— یگانہ چنگیزی

خدا جانے کرے گا چاک کس کس کے گریباں کو
ادا سے اُن کا چلنے میں وہ دامن کا اُٹھا لینا —— جرأت

اِسی خرام کو کہتے ہیں فتنۂ محشر
کہ اس گلی میں ہمارا مزار باقی ہے —— نامعلوم

مرسلہ: سراج وجیہہ شوراپوری

"نہ کھلتے ہیں ان سے مجھے پھول ملتے ہیں۔ لیکن حضور! اور بھی تو پودے ہیں جن میں کانٹے ہوتے ہیں۔ ان میں پھول بھی کھلتے ہیں اور خوشبو بھی ہوتی ہے۔ دل اور دماغ کو خوش کر دینے والی خوشبو!" رمضان بہت ہی خوبصورت انداز اور اچھے تلفظ میں گفتگو کر رہا تھا۔ مجھے اس کے خالص لکھنوی طرزِ گفتار پر حیرت ہوئی۔ لیکن اس وقت میں کسی اور خیال میں تھا۔

"یہ باتیں تو تمہیں مالک سے کہنی چاہئیں۔"

"وہ تو میں اُن سے کسی نہ کسی طرح کہتا ہی رہتا ہوں حضور! مگر بیکار، بے فائدہ۔ انسان ہو تو کسی کی باتوں کا اثر ہو۔ لیکن وہ تو چلتے پھرتے بُت ہیں حضور! بُت ——!!" رمضان باتیں کرتا چلا گیا۔ خوبصورت اور دلچسپ دار، مگر کوئی کام کی بات نہ معلوم ہو سکی۔

باہر برف باری ہو رہی تھی۔ برف کے سفید ریزے ہواؤں کے دوش پر اُڑ رہے تھے۔ ہواؤں کی خنکی ہڈیوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ خیام اپنی خوابگاہ میں پشمینہ اوڑھے خوبصورت فنجان میں چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں بیستل

کے منہ تو شن جار ہیں، آنکھوں میں چبھتی ہوئی خاردار ٹہنیاں اپنے بازو پھیلائے کھڑی تھیں ٹہنیوں کے سِروں پر چھوٹے چھوٹے سُرخ پھول زخم خوردہ ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ ایک طرف آتش دان میں آگ سُلگ رہی تھی۔ پورا کمرہ آرائش اور سجاوٹ سے بے نیاز تھا۔ میرے ہاتھوں میں چائے سے لبریز فنجان تھا اور میرا ذہن مولانا آزاد کی تاریخی چائے اور اُسے تیار کرنے کے پُرتکلف اہتمام سے ہمکنار تھا۔ خوبصورت فنجان، چائے کا گہرا زعفرانی رنگ، اس سے اُٹھتی ہوئی بھینی بھینی خوشبو۔ میں ماضی اور حال کے درمیانی فاصلوں میں کھو گیا ـــــ چونکا اُس وقت جب خیام میرے فنجان کو دوبارہ لبریز کر رہا تھا۔

"آئی ایم سوری ڈاکٹر!"

"کہاں گُم ہو گئے تھے؟"

"میں خیام کے بجائے مولانا آزاد کی بزم میں شامل ہو گیا تھا۔"

"مولانا آزاد کی بزم؟"

"ہاں۔ میں احمد نگر جیل میں اُن کے ساتھ وہائٹ جیسمین پی رہا تھا۔"

"بڑے بلند اقبال ہو یار!" خیام نے مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یقیناً ـــــ تمہارے اِس اہتمامِ نادِ و نوش نے اوراقِ پارینہ کو نظروں کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

"کیوں بنانے پر آمادہ ہو۔ میں ویسے ہی کیا کم ستم زدہ ہوں جو اور نمک پاشی کر رہے ہو؟" خیام کے لہجے سے شکست خوردگی عیاں تھی۔

"بخدا بہت حسین چائے پلائی تم نے! آزاد مرحوم پی لیتے تو اپنی وہائٹ جیسمین بھول جاتے!"

"بس اب رہنے بھی دو۔ ورنہ کل ساری پتلونیں تنگ ہو جائیں گی!" خیام مُسکرا رہا تھا۔ دَورانِ گفتگو وہ کمرہ میں یونہی اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ پینٹل کے بڑے جار کے قریب پہنچ کر اُسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ پودے کے اوپر اِس طرح جھک گیا جیسے اُس کا مزاج پوچھ رہا ہو۔ پھر زرد پتیاں چُننے لگا۔ دفعتاً ایک ـــــ ہلکی سی آہ اُبھری۔

"کیا ہوا؟" میں خیام کے قریب پہنچ گیا۔

"کچھ نہیں۔ اِن کی مزاج پُرسی کر رہا تھا۔ میری غیر حاضری اِنھیں بے حد گراں گُزرتی ہے۔ ذرا سی دیر میں افسردہ و کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی ناراضگی میں مجھے زخمی بھی کر دیتے ہیں۔" خیام نے اپنی ایک اُنگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس سے خون رِس رہا تھا۔

"تم نے خواہ مخواہ اِن کانٹوں کو سر چڑھا رکھا ہے۔"

"شی! ـــــ بُرا مان جائیں گے۔" اُس نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے اشارہ سے خاموش رہنے کو کہا۔

"بہت حسّاس معلوم ہوتے ہیں۔"

"بہت ہی زیادہ! بالکل انسانوں کی طرح!"

"تمہاری بے جا ناز برداری نے اِنھیں حسّاس بنا دیا ہے۔"

"ایسا نہ کہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اِن کے ناز اُٹھا ہی نہیں سکتا۔ اِن کی جتنی بھی ناز برداری کی جائے کم ہے۔" خیام کی نِگاہیں زخمی اُنگلی پر مرکوز تھیں۔

"آخر اِن کمبخت کانٹوں میں کیا سُرخاب کے پر لگے ہیں جو تم اِتنی اہمیت دے رہے ہو؟" میں نے اُسے کُریدنے کی کوشش کی۔

"اِن کانٹوں سے مجھے پھول مِلتے ہیں!"

"اور بھی تو کانٹے ہیں جو تمھیں پھول دے سکتے ہیں۔ خوبصورت اور خوب سیرت۔ دل و دماغ کو مسحور کر دینے والے پھول! اِن میں تو کچھ بھی نہیں۔ نہ کوئی خوشبو اور نہ کوئی دلکشی!"

"بالکل یہی بات میں نے بھی کہی تھی۔"

"تم نے بھی یہی بات کہی تھی۔ آخر کس سے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پُوچھا۔

"اُس سے جس نے یہ پھول مجھے دیا تھا۔"

"کس نے دیا تھا یہ پھول تمھیں؟ کب دیا تھا؟ کہاں دیا تھا؟" میں ایک ہی سانس میں کئی سوال کر گیا۔ خیام کچھ دیر تک بالکل خاموش رہا۔ اُس کی آنکھوں میں سمندر میں طوفان آنے سے پہلے کا سکوت تیر رہا تھا۔ ہونٹ جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد اُس کے ہونٹوں میں جُنبش ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا ـــــ

پہلی بار . .

وہ مجھے سرینگر میں ملی تھی۔ آصف کی شادی کے سلسلہ میں میں کشمیر آیا ہوا تھا۔ آصف میرا عزیز ترین دوست تھا۔ بہت مختصر سی برات تھی۔ آصف کے قریبی رشتہ دار اور چند خاص دوست جو اُس کے یونیورسٹی کے ساتھی تھے، مدعو تھے۔ برات ریجنل انجینئرنگ کالج کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرائی گئی تھی۔ جب ہم لوگ ـــــ دلہن کے دروازہ پر گئے تو ایک انوکھی رسم ادا کی گئی۔ . . ایک شوخ و شنگ لڑکی دراز قامت، برف کی سِل کی مانند جھلکتا ہوا بدن، ڈل کی طرح وسیع اور گہری نیلی آنکھیں۔ جن میں نہ جانے کتنی کشتیاں غرقاب ہو چُکی ہوں گی۔ سبز ساری میں ملبوس، سراپا بہارِ گلشنِ کشمیر مرمریں ہاتھوں میں پھولوں سے بھرا طشت لئے وارد ہوئی۔ نیم وا ہونٹوں سے مشابہ سُرخ پھولوں سے بھرا ہوا طشت۔

وہ ایک ایک کرکے سارے براتیوں کے کوٹ کے کالر میں ایک گچھا لگاتی گئی۔ "برف کی بیل" جب میرے پاس آئی تو میں نے پھول کالر میں پن اپ کرنے کے بجائے اُس کے ہاتھ سے لے لیا... اور سونگھنے لگا۔ وہ مجھے پھول سونگھتے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ میں خاموش نہ رہ سکا۔

"غالباً یہ کشمیر کا سب سے خوبصورت پھول ہے!"

"کشمیر کے سبھی پھول خوبصورت ہوتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔" کشمیر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے اُس کا سر غرور سے تن گیا۔ چہرے پر ایک عجیب سُرخی دوڑ گئی جسے احساسِ برتری سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔

"... اور یہ خوبصورت ترین ہے۔" میں نے ذو معنی انداز میں اشارہ کیا۔

"میری نگاہ میں!" وہ بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے دامن بچا گئی۔

"بڑی عجیب و غریب نگاہ ہے آپ کی!"

"جی! میں مطلب نہیں سمجھی؟"

"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ نہ تو اِس میں کوئی خوشبو ہے اور نہ بظاہر اِتنی دلکشی جو کسی کو اپنا گرویدہ بنا سکے۔"

"ہر پھول میں خوشبو کی تلاش؟ بہت عامیانہ ذوق ہے!" اُس نے اپنے ترکش سے ایک تیر پھینکا۔

"عام انسان کا ذوق بھی عام ہوا کرتا ہے۔ ویسے وہ پھول ہی کیا جس میں خوشبو نہ ہو!"

"میں نے صرف عامیانہ ذوق کی بات کہی تھی۔ عوام اور خواص کے ذوق کا فرق نہیں دریافت کیا تھا۔ بہرحال پھول، پھول ہوتا ہے۔ خوبصورت چیز ابدی مسرت کی مصداق۔ خوشبو سے اُس کی خوبصورتی میں ایک قابلِ قدر اضافہ ضرور ہو جاتا ہے۔ جس سے مجھے تو کیا کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر خوشبو ہی سب کچھ تو نہیں۔ پھول کا پیکر بذاتِ خود ایک ایسی دلکشی رکھتا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے اُس میں خوشبو ہو یا نہ ہو۔ اِس لئے اوّلیت پھول کو حاصل ہوئی، نہ کہ خوشبو کو۔ خوشبو بہرحال ثانوی حیثیت کی حامل ہے۔" اُس نے پھول کی حمایت میں ایک خوبصورت اور جامع تقریر کر ڈالی۔ بولتے وقت وہ خود بھی شاخِ گل ہوئی جا رہی تھی۔

"خوب! آپ نے تو اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ اِس طرح جیسے پھولوں پر ریسرچ کر رہی ہوں۔ بہرحال آپ کی شخصیت اور آپ کی پسند دونوں ہی دلچسپ و لاجواب ہیں!" میں نے طنز و تعریف کے مِلے جُلے انداز میں کہا۔

"پھولوں پر ریسرچ؟ آپ نے بھی خوب کہی۔ میں اِسے اپنی تضحیک سمجھوں یا تعریف؟ پھر بھی ممنون ہوں۔ کاش! پھولوں پر ریسرچ کرنا مجھے نصیب ہو سکتا۔ ویسے "خوشبوؤں کے شیدائی" کو میرا مشورہ ہے کہ اگر موقع ملے تو خوشبوؤں کی تلاش میں سرگرداں رہنے کے بجائے کانٹوں سے دامن اُلجھائیں۔ اگر کچھ ہاتھ نہ بھی آیا تو ایک ایسی خلش میسر ہوگی جو تا عمر عزیز ہوگی۔" اِتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

دیر تک میں اُس کی تقریر کی لذّت سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر خیام پھر کہنے لگا۔

دوسری بار...

وہ مجھے سرینگر ہی میں مِلی تھی... اور پھر مسلسل چار سال تک مِلتی رہی۔ میڈیکل کالج میں وہ میری کلاس فیلو تھی۔ شروع شروع میں کچھ دنوں تک وہ اپنے چہرے پر اپنائیت کے آثار پیدا کرکے، مانوس نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ غالباً مجھ میں اپنی دُزدیدہ نِگاہی کا ردِ عمل ڈھونڈتی رہی تھی۔ نِگاہیں دل کی سفیر ہوا کرتی ہیں۔ مگر میں پھر بھی بے نیاز رہا۔ پھر اُس میں ایک انوکھی تبدیلی آئی۔ وہ مجھے کلاس میں اور کلاس سے باہر مختلف طریقوں سے مخاطب کرتی رہی کبھی غزالی آنکھوں سے، کبھی نرم و نازک ہونٹوں سے اور کبھی سحر انگیز موسیقیت میں ڈوبی ہوئی سرگوشیوں سے۔ وہ میرے برابر سے مترنم آواز میں "خوشبوؤں کا شیدائی" کہتی گزر جاتی۔ میں اِن حسین حرکتوں کا مُدعا سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں پہچان بھی نہ سکا تھا کہ یہ وہی شوخ و شنگ لڑکی ہے جو ایک سال پہلے میرے سامنے بے بُو پھولوں کے حُسن و قبح پر تقریر کرکے دادِ سخن لے رہی تھی۔

ایک شام اچانک وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ میں اُس کی شوخیوں سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ میری کلاس کی سب سے زیادہ سیماب صفت لڑکی تھی۔ میں نے کترا کر نکل جانا چاہا مگر اُس کی گھنگروؤں کی جھنکار جیسی آواز میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

"ایکس کیوز می! غالباً آپ خوشبوؤں کے شیدائی ہیں!"

"میں خیام ہوں۔"

"... اور خوشبوؤں کے شیدائی؟"

"اچھا چلئے یونہی سہی۔ لیکن آپ کو یہ سب کیسے معلوم۔ کلاس میں تو صرف رول کال ہوتی ہے۔" میں نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے اُس کی بات ملتے ہوئے کہا۔

"آپ خیام ہیں۔ یہ تو کالج ہی میں معلوم ہوا۔ آپ کے احباب آپ کو خیام کہہ کر پکارا کرتے ہیں۔ اور خوشبوؤں کا شیدائی ہونے کا علم اُس وقت ہوا

جب میں نے اپنی دوست رخسانہ کی شادی میں براتیوں کو پھول پیش کرنے کی رسم ادا کی تھی۔ پھول کوٹ کے کالر میں لگانے کے بجائے آپ نے اپنی قوتِ شامہ کو آواز دی تھی۔" اُس نے ماضی کی گرد جھاڑ کر میرے صحیفۂ حیات کے اوراق میرے سامنے بکھیر دیئے۔ ایک لمحہ کے لئے حال سے بے نیاز ہو کر میں اُس کی گفتار کی لذت میں کھو گیا۔ دوسرے لمحہ مجھ پر احساسِ ندامت غالب تھا۔ اپنی خود فراموشی پر مجھے غصہ آرہا تھا۔

"معاف کیجئے گا محترمہ! میں آپ کو بالکل نہیں پہچان سکا تھا۔" میں نے انتہائی شرمندگی کا اظہار کیا۔

"محترمہ کا لقب کسی اور کے لئے رکھ چھوڑیئے۔ ناچیز کو نرگس جمال کہہ سکتے ہیں۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"مجھے تو آپ نرگس جمال سے کہیں زیادہ 'نرگسِ بیمار' نظر آرہی ہیں۔" اُس کی جاذبیت و دلکشی سے قطعِ نظر میں نے اُس کی آنکھوں میں اُداسی کی تحریر پڑھ کر کہا۔

"عجیب اتفاق ہے۔ جسے دیکھئے وہ نرگس جمال کے بجائے 'نرگسِ بیمار' کہنے پر آمادہ ہے۔ میں اِس اتفاق سے پریشان کُن حد تک حیران ہوں۔ ایسا نہ ہو لوگ مجھے 'نرگسِ بیمار' کہتے کہتے سچ مچ بیمار بنا دیں۔" اور پھر اُس نے بہت ہی معصومیت سے پوچھا۔

"کیا میں واقعی بیمار معلوم ہوتی ہوں؟"

"قطعی نہیں ــــــ البتہ آپ کی آنکھیں صحت مند ہونے کے باوجود کسی کی بیمار معلوم ہوتی ہیں۔ بالکل نرگس کے پھولوں کی طرح جیسے کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک کر بیمار ہو گئی ہوں۔" میں نے 'ڈل' میں جھانکتے ہوئے کہا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ میرے کانوں میں پہاڑی جھرنوں کی موسیقی گھل گئی۔

"میں نے صرف ایک سیدھا سادہ سوال کیا تھا۔۔۔ اور جناب نفسیات کے طالب علم کی طرح تجزیہ کرنے بیٹھ گئے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔" اُس نے میرے مشکوک مطالعہ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ وہ بے حد مسرور نظر آرہی تھی۔

"بالفرض ایسا ہو بھی تو بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" میں نے دبی زبان سے کہہ کر اجازت طلب کی اور پھر ہوسٹل کی طرف چل پڑا۔ اُس روز تمام شب نرگس کی بیمار آنکھیں میرے ذہن و دل کا تعاقب کرتی رہیں۔

اگلی صبح نرگس سرِ تری کے مشہور پروفیسر کامران جمال کے بنگلہ کے سامنے ملی۔ گفتگو کے دوران یہ معلوم ہوا کہ وہ اُن کی لڑکی ہے۔ اُس کی خوبصورت اُنگلیوں کے درمیان وہی نیم وا ہونٹوں سے مشابہ سُرخ پھولوں کا ایک خوبصورت گچھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کے ہونٹوں پر ایک مانوس مسکراہٹ پھیل گئی۔

"خیر تو ہے؟"

"سو فیصدی! جس دن آپ کلاس میں آئے، اُسی دن سے میرے ذہن کے گوشہ میں ایک کمی کھٹک رہی ہے۔"

"کیسی کمی؟" میں سوالیہ نشان بن گیا۔

"یہ سُرخ و سپید رنگ، اور یہ گہرا نیلا سوٹ۔ صرف ایک پھول کی کمی رہ جاتی ہے اور وہی مجھے آج تک کھٹکتی رہی ہے۔" اس مختصر سی وضاحت کے دوران نرگس کے رخسار کئی رنگ بدل چکے تھے۔

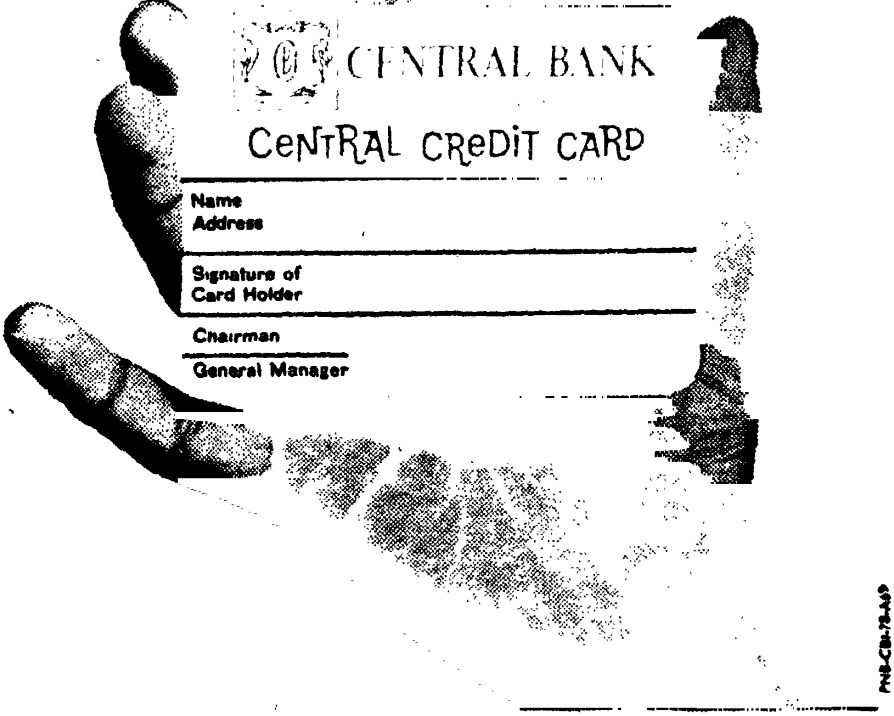
"پھر انتظار کس کا ہے۔ کمی آپ نے محسوس کی۔ دُور بھی آپ ہی کر دیجئے!" میں نے اپنی دھڑکنیں تیز تر ہوتے ہوئے محسوس کیں۔

"انتظار کسی کا بھی نہیں۔ صرف ایک وہم مانع ہے۔ وہ یہ کہ میری پسند عجیب و غریب ہے۔ ایک پھول جس میں نہ کوئی خوشبو ہے اور نہ کوئی ظاہری کشش! آپ خوشبوؤں کے شیدائی۔ میں یہ پھول لگا دوں تو خدا جانے آپ کو پسند بھی آئے کہ نہ آئے۔ ناپسندیدگی کی صورت میں میرا احساس مجروح ہوگا اور اُسے میں اپنی توہین پر محمول کروں گی۔" پھول کی ظاہری کشش اور اُس کی خوشبو کا ذکر کرتے ہوئے نرگس نے اُسے اپنی ناک سے لگا کر بہت لمبی سانس کھینچی۔ نرم و نازک ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُس کی یہ ادا طنز سے معمور ہونے کے باوجود مجھے بے حد پسند آئی۔

"آپ کی پسند میری پسند! وہم کو حقیقت نہ تسلیم کیجئے۔ توہین تو کجا، میں اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی صنفِ نازک سے میں غیر معمولی طور پر نیاز مندانہ سلوک سے پیش آتا ہوں۔ آپ مطمئن رہیئے۔" میں نے وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا۔

"میری پوری قوم کے لئے آپ کے دل میں 'نرم گوشے' ہیں۔ میں اِس 'بین الاقوامی' جذبہ کے لئے ممنون ہوں۔" اِتنا کہتے ہوئے نرگس نے وہ سُرخ پھول میرے کوٹ کے فلاور ہول میں لگا دیا جو اب تک اُس کی اُنگلیوں میں کھیل رہا تھا۔ بالکل فِدویانہ انداز میں سر جھکا کر میں کورنش بجا لایا۔ وہ میرے اِس فعل پر فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی جھیل میں میں نے ارتعاش محسوس کیا جیسے وہ کہنا چاہتی ہوں "کشمیر کے سبھی پھول خوبصورت ہوتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ اور میری نگاہ میں یہ خوبصورت ترین ہے!" میں جھیل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا۔

یہ لیجئے
سنٹرل کا
کریڈٹ کارڈ



فوری کریڈٹ کے لئے
جب بھی آپ کو اِس کی ضرورت درپیش ہو!

- وقار، مالی مضبوطی اور کریڈٹ کے ساکھ کی علامت ہے۔
- سنٹرل بنک کے منظور شدہ گاہکوں کے لئے ہی صرف مخصوص ہے۔
- کارڈ ہولڈر کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ہندوستان میں کسی مقام پر سنٹرل بنک کی کسی برانچ کو زائد چارجز ادا کئے بغیر اپنے چیک مقررہ حد کے اندر کیش کرا سکے۔
- آج ہی "سنٹرل بنک" میں تشریف لایئے اور مزید تفصیلات طلب کیجئے۔

سنٹرل بنک آف انڈیا
ہیڈ آفس: مہاتما گاندھی روڈ، بمبئی-۱

دا بنک جو ہر مقام پر عوام کی خدمت سرانجام دے رہا ہے

بیسویں صدی دہلی نومبر ۱۹۶۹ء

"عالم پناہ! آپ قلعۂ معلّٰی کے دیوانِ عام میں جلوہ افروز نہیں، سری نگر میڈیکل کالج کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ سمندِ شوق کو تازیانہ لگائیے اور کلاس تشریف لے چلئے" میں چونکا تو وہ کِھلکِھلا کر ہنس پڑی۔ یہ ہنسی دیر تک میرے کانوں میں رس گھولتی رہی۔ بالکل اجنتا اور ایلورا کی غاروں میں آوازِ بازگشت کی طرح!

دوسرے دن اُس کی خوبصورت اُنگلیوں میں ایک تازہ پھُول تھا۔ وہ مجھے حیرت اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بات صرف اِتنی تھی کہ میرے کوٹ کا پھُول اُس وقت تک شگفتہ تھا۔

"کِس سے مِلا یہ پھُول؟" اُس کی آواز سے رقابت مترشح تھی۔

"کشمیر میں جتنے خوبصورت پھُول کِھلتے ہیں اُتنے ہی اچھے انسان بھی بستے ہیں۔ پُرخلوص و مہربان!" میں نے اُس کے جذبۂ تجسّس کو اُبھارنے کی کوشش کی۔

"کون ہے وہ مہربان! میں بھی تو جانوں؟"

"یہ کرم فرمائی نرگسِ بیمار کے سوا کون کر سکتا ہے؟"

"مگر یہ تو بالکل تازہ ہے! ایک دم شگفتہ و شاداب!"

"یہ آپ کا اعجازِ مسیحائی ہے!"

"خدارا پہیلیاں نہ بُجھائیے"

"اِن ہاتھوں کا لمس پا کے جب مُردے زندہ ہو سکتے ہیں، بیمار صحت یاب ہو سکتے ہیں تو پھُول بھلا کیونکر مُرجھا سکتے ہیں؟"

"میں اب بھی نہ سمجھ سکی" اُس کے چہرہ سے ایک ناقابلِ بیان التجا عیاں تھی۔

"بات صرف اِتنی ہے کہ میں نے اِسے گذشتہ شب پانی میں رکھ چھوڑا تھا" میں مُسکرا رہا تھا۔

"اوہ! میرے خدا شکر ہے!" اُس نے ایک لمبی سانس لی "مگر یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ اِتنا نایاب تو نہیں؟"

"آپ کے لئے نہ سہی۔ میرے لئے تو ہے۔ نادر و نایاب! میں اِسے اپنی آنکھوں سے مُرجھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا" الفاظ میری گرفت سے باہر ہو رہے تھے۔ جذبات کے دھارے مجھے کہیں اور بہالے جانا چاہتے تھے۔ میں خاموش ہو گیا۔

نرگس نے باسی پھُول میرے کوٹ سے نکال کر بہت احتیاط سے ایک کتاب کے درمیان رکھ لیا اور اُس کی جگہ تازہ پھُول لگا دیا۔ اُس کے ہونٹ بالکل خاموش تھے... مگر نگاہیں کہہ رہی تھیں "اگر تم اِسے مُرجھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تو بھلا میں کیسے پھینک سکتی ہوں۔ میں اِسے تم سے بھی زیادہ عزیز رکھوں گی۔ تاحیات سنبھال کر

رکھوں گی۔ صحیفۂ محبت کی مانند، کسی گرانقدر اور مقدس امانت کی طرح!"

چار سال تک نرگس ہر صبح باسی پھول نکال کر میرے کوٹ میں تازہ پھول لگاتی رہی۔ میری رفاقت میں رہتے رہتے پھول میری زندگی کا جزو بن گیا۔ میری شخصیت کا ایک ناقابلِ فراموش حصہ! نرگس کی خوبصورت انگلیاں میرے سینے سے لگتے لگتے میرے دل اور اس کی دھڑکنوں کا راز پا چکی تھیں۔ آنکھوں کی "ڈل" میں جھانکتے جھانکتے میں اس کی ایک ایک لہر اور ارتعاش سے مانوس ہو چکا تھا۔ جھیل کی موجِ تہہ نشیں میں رواں جذبات کے دھاروں کا مزاج پہچاننے لگا تھا۔ نرگس واقعی بیمار ہو گئی تھی۔ میری محبت کی بیمار! اور میرا وجود اس کی ذات میں ضم ہو کے رہ گیا تھا۔

آخری بار...

نرگس مجھے ڈل کے ساحل پر ملی تھی۔ سینچر کی شام کو رخصت ہوتے وقت۔ اس نے کافی اصرار کے بعد مجھ سے ڈل پر اتوار کی شام کو ملنے کا وعدہ لیا تھا۔ چار سال کے طویل عرصہ رفاقت میں وہ پہلی بار کالج کی وسیع اور پُر رومان حدود سے باہر ملنے کے لئے مُصر تھی۔ مجھے اس روایت سے بغاوت پر سخت حیرت تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے صرف یہ کہا "یکسانیت سے اوب چکی ہوں۔ کبھی کبھی ان سنگ و خشت کی فصیلوں سے باہر کھلی فضا میں سانس لینے کو جی چاہتا ہے... کیا آپ کا دل نہیں چاہتا...؟" اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ ایک شکارہ میں میری منتظر تھی۔ میں اسے دور ہی سے پہچان گیا۔ اس نے کشیدہ کاری کی ہوئی سُرخ رنگ کی شلوار اور قمیص زیبِ تن کر رکھی تھی۔ گھنے ریشمیں بال، سُرخ رومال سے بندھے ہوئے تھے۔ پورا جسم خوبصورت زیورات سے آراستہ تھا۔ اس دن وہ کشمیری دُلہن معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے قریب ہوتے دیکھ کر اس نے اپنے چہرہ پر خوشی کے آثار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میں نے جب شکارہ پر قدم رکھا، شام اپنی سیاہ زلفیں کھول رہی تھی۔ سورج کی شعاعیں ڈل کی بے چین لہروں کا الوداعی بوسہ لے رہی تھیں۔ ساحل پر محوِ خرام بے شمار خوبصورت جوڑے ڈل کی سطح پر رقصاں تھے۔ میں نے شکارہ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آج تو تم بالکل کشمیری دُلہن معلوم ہو رہی ہو!"

"کشمیری تو میں ہوں ہی! اور دُلہن بن کر آئی ہوں۔ پھر معلوم ہونے کا کیا سوال؟" اس نے اپنے حسین چہرہ پر سنجیدگی کی نقاب ڈال رکھی تھی۔

"دُلہن بن کر آئی ہو؟ میں نہیں سمجھ سکا؟" میرے اس ایک سوال میں بے شمار سوال پنہاں تھے۔

"کل میری شادی ہو رہی ہے۔ سوچا شادی سے پہلے آپ کو دُلہن بن کر دکھا دوں" نرگس کی بیمار آنکھیں ہمیشہ سے زیادہ بیمار نظر آ رہی تھیں۔

"شادی؟ اور کل۔ کس سے ہو رہی ہے؟ اور کہاں ہو رہی ہے؟" شادی کے ذکر پر میں تقریباً چیخ پڑا۔

"ہاں۔ کل ہو رہی ہے۔ خالہ زاد بھائی سے۔ پونا میڈیکل کالج میں ہاؤس سرجن ہیں۔ رشتہ میری مرحوم ماں کا طے کیا ہوا ہے۔ ماں کی روح کی تسکین کے لئے یہ ضروری ہے کہ میں سرِ تسلیم خم کر دوں" حسین چہرہ کی سنجیدگی اور بھی گہری ہو گئی۔

"لیکن تم نے کبھی ذکر نہیں کیا؟"

"کیا فرق پڑتا؟"

"ہم اتنے قریب نہ آتے؟"

"دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری دیرینہ رفاقت شعوری کوششوں کی مرہونِ منت ہے؟"

"میرا مطلب ہرگز یہ نہیں۔ پھر بھی کوشش کرتے تو انجام اتنا المناک نہ ہوتا۔"

"کوشش کرنے کے باوجود انجام یہی ہوتا، جو آج سامنے ہے" وہ دور خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ غالباً وہ اس طرح امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تمہاری تعلیم بھی تو ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ ایک سال باقی ہے؟" میں نے طوفان کے مقابلہ میں خس و خاشاک کا سہارا لیا۔

"میرے منگیتر کا کہنا ہے کہ انہیں ایک شریکِ حیات کی ضرورت ہے، فیملی ڈاکٹر کی نہیں۔ وہ خود بھی ڈاکٹر ہیں اور مزید تعلیم کے لئے میونخ (Munich) جا رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اس دور دراز سفر میں ان کی ہمسفر بنوں" یہ کہتے ہوئے نرگس نے میری طرف ایک سیاہی مائل ٹہنی بڑھا دی جو سرے پاؤں تک نوک دار کانٹوں سے بھری تھی۔ کہیں کہیں مہندی سے مشابہ ہری ہری پتیاں ٹہنی کے کانٹوں سے چھلنی جسم کی پردہ پوشی کر رہی تھیں۔

"یہ کیا؟" میں آئینۂ حیرت بن گیا۔

"آئندہ میں پھول نہ پیش کر سکوں گی۔ اس لئے یہ کانٹے لائی ہوں۔ آج تک انہیں کانٹوں سے تمہیں پھول ملتے رہے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا۔ تاحیات یہ تمہیں پھول دیتے رہیں گے۔ میری انوکھی پسند کا مظہر۔ عجیب و غریب پھول!" نرگس کی مہندی رچی ہوئی انگلیوں کے درمیان خار دار ٹہنی دلِ بیتاب کی طرح لرز

رہی تھی۔ کانٹے میری آنکھوں، میری رُوح، میرے سارے وجود پر نشتر زن تھے۔ آنکھوں میں چبھنے کے باوجود میں اُن کانٹوں کو بہت حسرت اور محبّت سے دیکھ رہا تھا۔ معاً میرے کانوں میں ایک سرگوشی ہوئی۔

اِنھیں سے پھول ملے تھے اِنھیں دعائیں دو
جو آج لائے ہیں کانٹے چھپا کے دامن میں

میں نے بہت عقیدت سے خاردار ٹہنی کو لینے کے لئے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔

"جانتے ہو خیام! میری اِس انوکھی پسند کا کیا نام ہے؟" اُس نے ٹہنی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے پوچھا۔ نرگس نے پہلی بار مجھے میرے نام سے پکارا تھا۔ اِس سے پہلے میرے منع کرنے کے باوجود وہ ہمیشہ "آپ" کہہ کر مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی۔

"میرے لئے اِتنا کافی تھا کہ یہ تمھاری پسند ہے۔ پھر نام جاننے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"کِس می کوئنگ" اُس نے بہت ہی رُومانی انداز میں ایک ایک لفظ ادا کیا۔

"کِس می کوئنگ؟" میں نے استعجابانہ انداز میں الفاظ دُہرائے... اور آنکھیں بند کر کے نام کی رُومانویت میں کھو جانے کی کوشش کی۔

واپسی پر میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ڈَل کا سا[illegible] آباد ہو چکا تھا۔ جھیل کی سطح پر رقصاں سائے رات کی تاریکی میں ڈُوب چکے تھے۔ ڈَل کے سینہ پر ہاؤس بوٹس کی روشنیاں زندگی کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ رخصت ہونے سے پہلے نرگس نے میرے ہاتھوں کو الوداعی بوسہ دیا۔ بوسہ دیتے وقت میں نے اپنے سرد ہاتھوں کی جِلد پر گرم گرم آنسوؤں کی حدّت محسوس کی جنھیں رات کی تاریکی کے باوجود میری چشمِ احساس نے دیکھ لیا۔

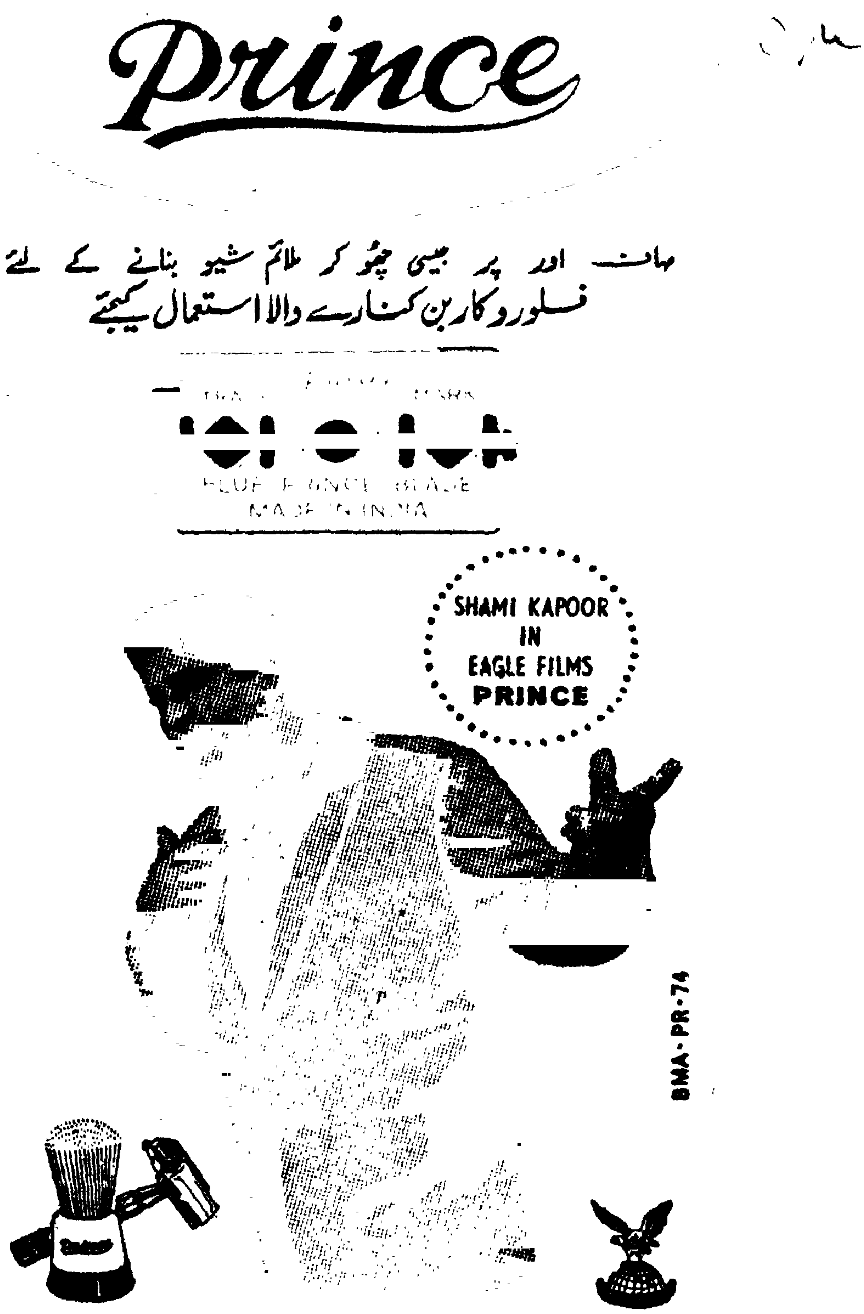
خواب گاہ کا یہ پودا، نرگس کی دی ہوئی شاخ کی موجودہ شکل ہے۔ بنگلہ کے تمام پودے اُسی ایک شاخ کے مرہونِ منّت ہیں۔ دس سال ہوئے مجھے نرگس نے ان کانٹوں کی ذمّہ داری سونپی تھی۔ جب سے میں اِن کے ناز اُٹھا رہا ہوں... اِن کا غم جھیل رہا ہوں۔ اِن کی خوشی، میری خوشی۔ اِن کا غم میرا غم ہے۔ اب یہ کانٹے میری زندگی ہیں... اور... اور... میری زندگی... اِن کی امانت!"

خیام جار کی میز سے لگا کھڑا تھا۔ اُس کی نگاہیں "کِس می کوئنگ" کے ایک خوبصورت پھول پر مرکوز تھیں۔ زخمی اُنگلی سے رِستا ہوا خون کب کا جم چکا تھا۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک کر دامن کو بھگو رہے تھے۔ ہمدردی کے باوجود میں اُس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اُس کی دلجوئی کے لئے محبت کے دو بول بھی نہ بول سکا۔

"شب بخیر" کہہ کر میں اُس کی خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔

باہر کفن کی طرح حدِ نگاہ تک برف ہی برف بچھی ہوئی تھی۔ برف باری تھم چکی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں مزاج پوچھ رہی تھیں... لیکن میرے دل میں جذبات کا آتش فشاں پھوٹ رہا تھا۔ میں اپنی قیام گاہ میں داخل ہوا تو نرگس بے خبر سو رہی تھی۔ بجلی کی مدّھم نیلگوں روشنی میں وہ آسمانوں سے اُتری ہوئی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ رخساروں پر ایک ناقابلِ تشریح تقدس تیر رہی تھی۔ میرا دل چاہا اُس کی صاف شفاف پیشانی چُوم لوں... مگر کِسی نامعلوم قوّت نے مجھے روک دیا۔

کوشش کے باوجود مجھے نیند نہ آئی۔ پُوری رات عالمِ اضطراب میں کروٹیں بدلتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خیام کے بنگلہ کے سارے کانٹے میرے بستر پر بکھیر دیے گئے ہوں!!


Prince
صاف اور پر جیسی چھو کر ملائم شیو بنانے کے لئے
فلورو کاربن کنارے والا استعمال کیجئے
SHAMI KAPOOR
IN
EAGLE FILMS
PRINCE
BMA-PR-74

غزل

حقی حزیں، ایم۔ اے

آنکھ میں یہ نمی ہے کیوں، رُخ پہ ہے یہ ملال کیا
بیٹھے بٹھائے آگیا اُن کو مرا خیال کیا

جُنبشِ لب ہو آپ کے سامنے یہ مجال کیا
حال یہ ہو تو کیجئے جُراُتِ عرضِ حال کیا

عشق ہے بے خودی کا نام خود ہے جو لذّتِ تمام
عشق کو اِس سے کیا غرض، ہجر ہے کیا وصال کیا

اُن کا جوابِ دلنشیں کتنا ہے وجد آفریں
بھول گیا ہوں میں کہ تھا لب پہ مرے سوال کیا

کوشش و جُستجو عبث، گردشِ کو بکو عبث
جس کی نہیں کوئی مثال، س کی کہیں مثال کیا

جیسے وہ جانِ زیست ہوں، روحِ روانِ زیست ہوں
جا نہ سکے گا عمر بھر دل سے یہ احتمال کیا

جب ہو کسی کا انتظار، آئے نہ دل کو جب قرار
لمحۂ یک نفس بہت، عرصۂ ماہ و سال کیا!

آپ کے ہیں کبھی ستم، ہے کبھی زیرِ بارِ غم
یونہی رہے گی زندگی عشق میں پائمال کیا؟

شیوۂ عشق ہے یہی، اُن پہ فدا ہو زندگی
جان بھی دی اگر حزیں تُو نے کیا کمال کیا

غزل

نسیم شاہجہانپوری

واقف ہوں کہ انجان ہمیں یاد رہیں گے
اِس دور کے انسان ہمیں یاد رہیں گے

اے دل ترے ارمان ہمیں یاد رہیں گے
یہ روز کے مہمان ہمیں یاد رہیں گے

لوٹے گئے دانستہ ہمارے ہی نشیمن
گلشن کے نگہبان ہمیں یاد رہیں گے

دنیا میں غنیمت ہے کہ زندہ ہیں ابھی تک
احباب کے احسان ہمیں یاد رہیں گے

یارب تری دنیا میں زر و سیم کے بدلے
بکتے ہوئے ایمان ہمیں یاد رہیں گے

وہ وعدۂ دیدار ہو یا عہدِ وفا ہو
سب آپ کے پیمان ہمیں یاد رہیں گے

ہے حکم نہ پینے کا، کبھی توبہ کی تلقین
واعظ ترے فرمان ہمیں یاد رہیں گے

کس درجہ حریفوں کو شکستوں کا ہے احساس
چہرے یہ پشیمان ہمیں یاد رہیں گے

بھولیں گے نہ ہم اہلِ جنوں فیضِ بہاراں
یہ چاک گریبان ہمیں یاد رہیں گے

ساحل پہ جب آئے ہیں تو ڈوبا ہے سفینہ
بے وقت کے طوفان ہمیں یاد رہیں گے

ہستی کے مراحل جو نسیم آج ہیں درپیش
مشکل ہوں کہ آسان ہمیں یاد رہیں گے



اور ما نگتے ہو کیوں بھائی
ہاتھ میں گلوکو بسکٹ لیکر
ہمیں چاہئے تم بھی کھاؤ
دوڑ سکو تو لے لو آکر
پارلے
گلوکو
بسکٹ
PARLE
BISCUITS
Gluco
★ بڑھیا ذائقہ
★ انوکھی لذت
★ کرکرے ہمیشہ تازہ
★ بے مثال
صحت و قوت

گہرے زخم

ممتاز شکیب بی۔ اے

ایچ - ۹ - ۴۰، آزاد مارگ "سی" اسکیم - جے پور

محترمی خوشتر صاحب اسلام و نیاز

انتہائی معروفیت کے باوجود "بیسویں صدی" کے لئے کہانی لکھنے کا تقاضہ برابر ذہن پر چھایا رہا اور اُدھر مارچ کے شمارے میں شائع ہونے والی میری کہانی "زندگی کی راہیں" پڑھنے والے حضرات بھی مجھ سے دوسری کہانی کی فرمائش کرتے رہے۔ حالانکہ میں گذشتہ چار سالوں سے آل انڈیا ریڈیو جے پور کے لئے ڈرامے لکھ رہا ہوں جن کی وقتاً فوقتاً رائلٹی مجھے مُلک کے دوسرے بڑے اسٹیشنوں سے "ری براڈ کاسٹ" کے بعد برابر ملتی رہتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنی مسرت اِس اقتصادی افادے سے بھی آج تک نہیں ہوئی جتنی آپ کے توسّل گرامی سے لکھے گئے قارئین کے اِن پُرخلوص خطوں سے ہوتی ہے۔ سرحدی علاقوں سے تو نہ صرف فوجی بھائیوں نے میری اُس کہانی کو سراہا بلکہ یہ لکھتے ہوئے آپ کی فراخدلی کا اعتراف کیا کہ آپ انھیں ہر ماہ بغیر کسی قیمت کے سینکڑوں کی تعداد میں اُن کا محبوب جریدہ پابندی کے ساتھ بھیجتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوا کہ آپ اُردو اور اُس کے وطن ——— دونوں کی ایک ساتھ خدمت کرتے ہوئے اُردو نوازی کی یہ تخم ریزی برف پوش چٹانوں سے لےکر برّصغیر کے مرغزاروں تک کر رہے ہیں ——— زیرِ نظر کہانی میں بھی میں نے اپنے مُلک کی اِسی فوجی زندگی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایک خاص نوجوان طبقے کے قومی کردار کو اُجاگر کیا ہے اور اِس کے ساتھ ہی ہندوستانی عورت کی "وحدت" کو آج کی اُس ماڈرن گرل پر واضح کرنے کی سعی کی ہے جس پر آج اپنے روایتی کردار کی عظمت سے زیادہ اپنے حُسن کی نمائش کا غلبہ ہے ——— دیکھنا یہ ہے کہ آپ اور قارئین اِسے کس حد تک پسند فرماتے ہیں . . .

نیاز آگیں ——— ممتاز شکیب

لیفٹیننٹ عبیداللہ بیگ یونیورسٹی میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے سالانہ جلسے کے موقع پر صدارتی تقریر کرتے ہوئے بار بار اُس الٹرا ماڈرن لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے حسین چہرے کی معصومیت سے اُس کا ذہن عہدِ وسطیٰ کی اُس پاکباز دوشیزہ کی طرف راغب ہو رہا تھا جس کی نمائندہ تصویر اُس نے گیلری میں دیکھی تھی۔

بعد لیفٹیننٹ بیگ تاریخ کے پروفیسر حیات سے یونیورسٹی ——— رباب کے نام سے متعارف ہو کر اُس سے بھی گھُل مِل گئی ——— اور اِس عرصے میں اُسے محسوس ہوا جیسے رباب کے حسین چہرے کے جانے پہچانے خدّ و خال ماضی کی یادوں کا روپ دھار کر اُس کے دیرینہ زخم کُریدنے لگے ہیں اور آج جب وہ پروفیسر سے مِل کر یونیورسٹی کے مین گیٹ سے باہر آیا تو رباب اُس کے اسکوٹر کے سامنے کھڑی تھی۔

"تم ———؟!" وہ اُس کے اشارے پر رُک گیا۔

"جی ہاں ——— مجھے سٹی کے مین چوراہے تک لفٹ چاہیئے۔ اگر زحمت نہ ہو تو وہاں تک پہنچا دیجئے" رباب اُس کے قریب آکر بیباکی سے کہہ رہی تھی اور وہ


نہیں بھائی تم بھی کھاؤ
دوڑ سکو تو لے لو آکر
اور مانگتے ہو کیوں بھائی
ہاتھ میں گلوکو بسکٹ لیکر
پارلے گلوکو
بسکٹ
PARLE
Gluco
★ بڑھیا ذائقہ
★ انوکھی لذت
★ کرکرے، ہمیشہ تازہ
★ بے مثال صحت و قوت
اسی لئے تو پارلے گلوکو بھارت کے سب سے زیادہ بکنے والے بسکٹ ہیں!

گہرے زخم

ممتاز شکیب بی۔ اے

ایچ۔ ۹۔ ۴۴، آزاد مارگ "سی" اسکیم۔ جے پور

محترمی خوشتر صاحب! اسلام ونیاز

انتہائی مصروفیت کے باوجود "بیسویں صدی" کے لئے کہانی لکھنے کا تقاضہ برابر ذہن پر چھایا رہا اور اڈ معر مارچ کے شمارے میں شائع ہونے والی میری کہانی "زندگی کی راہیں" پڑھنے والے حضرات بھی مجھ سے دوسری کہانی کی فرمائش کرتے رہے۔ حالانکہ میں گذشتہ چار سالوں سے آل انڈیا ریڈیو جے پور کے لئے ڈرامے لکھ رہا ہوں جن کی وقتاً فوقتاً رائلٹی مجھے ملک کے دوسرے بڑے اسٹیشنوں سے "ری براڈ کاسٹ" کے بعد برابر ملتی رہتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنی مسرت اس اقتصادی افادے سے بھی آج تک نہیں ہوئی جتنی آپ کے توسلِ گرامی سے لکھے گئے قارئین کے ان پُرخلوص خطوں سے ہوتی ہے۔ سرحدی علاقوں سے تو نہ صرف فوجی بھائیوں نے میری اس کہانی کو سراہا بلکہ یہ لکھتے ہوئے آپ کی فراخدلی کا اعتراف کیا کہ آپ اُنھیں ہر ماہ بغیر کسی قیمت کے سینکڑوں کی تعداد میں اُن کا محبوب جریدہ پابندی کے ساتھ بھیجتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوا کہ آپ اُردو اور اس کے وطن — دونوں کی ایک ساتھ خدمت کرتے ہوئے اُردو نوازی کی یہ تخم ریزی برف پوش چٹانوں سے لے کر برِصغیر کے مرغزاروں تک کر رہے ہیں — زیرِ نظر کہانی میں بھی میں نے اپنے ملک کی اسی فوجی زندگی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایک خاص نوجوان طبقے کے قومی کردار کو اُجاگر کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی عورت کی 'دھرت' کو آج کی اُس ماڈرن گرل پر واضح کرنے کی سعی کی ہے جس پر آج اپنے روایتی کردار کی عظمت سے زیادہ اپنے حُسن کی نمائش کا غلبہ ہے — دیکھنا یہ ہے کہ آپ اور قارئین اسے کس حد تک پسند فرماتے ہیں . . .

نیاز آگیں — ممتاز شکیب

لیفٹیننٹ عبیداللہ بیگ یونیورسٹی میں ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے سالانہ جلسے کے موقع پر صدارتی تقریر کرتے ہوئے بار بار اُس الٹرا ماڈرن لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے حسین چہرے کی معصومیت سے اُس کا ذہن عہدِ وسطیٰ کی اُس ہندوستانی پاکباز دوشیزہ کی طرف راغب ہو رہا تھا جس کی نمائندہ تصویر اُس نے کسی 'ماڈرن آرٹ گیلری' میں دیکھی تھی۔

اُس دن کے بعد لیفٹیننٹ بیگ تاریخ کے پروفیسر حیات سے یونیورسٹی جا کر دو تین بار ملا تو وہی لڑکی — رباب کے نام سے متعارف ہو کر اُس سے بھی گھل مل گئی — اور اس عرصے میں اُسے محسوس ہوا جیسے رباب کے حسین چہرے کے جانے پہچانے خدّوخال ماضی کی یادوں کا رُوپ دھار کر اُس کے دیرینہ زخم کُریدنے لگے ہیں اور آج جب وہ پروفیسر سے مل کر یونیورسٹی کے مین گیٹ سے باہر آیا تو رباب اُس کے اسکوٹر کے سامنے کھڑی تھی۔

"تم —؟!" وہ اُس کے اشارے پر رُک گیا۔

"جی ہاں — مجھے سٹی کے مین چوراہے تک لفٹ چاہیئے۔ اگر زحمت نہ ہو تو وہاں تک پہنچا دیجیئے" رباب اُس کے قریب آ کر بیباکی سے کہہ رہی تھی اور وہ

اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں ـــــ ہاں ـــــ ضرور ـــــ!" عبید نے بوکھلاہٹ میں اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور وہ اُس کے پیچھے بیٹھ گئی۔

اسکوٹر صاف شفّاف سڑک پر تیزی سے دوڑ رہا تھا اور رباب کی عطر بیز سانسیں فضا میں نکہتوں کے پرچم اُڑا رہی تھیں۔

"کل آپ ـــــ حیات صاحب کے ساتھ میری سالگرہ کی پارٹی میں شریک ہونے کے لئے تشریف لا رہے ہیں نا؟" رباب نے اپنی آنچ دیتی ہوئی نرم و نازک ہتھیلیاں اُس کے شانوں پر رکھ کر پوچھا۔ لیکن وہ اپنے خیالوں میں کھویا چُپ چاپ سامنے سڑک کی طرف دیکھتا رہا اور جب وہ نئی کالونی کے ایک کراس سے تیزی کے ساتھ ریلوے برج کی طرف مُڑا تو رباب گُنگنا اُٹھی "یہ کل ـــــ شام ـــــ

* * *

- افضل ترین ایمان یہ ہے کہ تُو خدا کو ہر وقت اپنے ساتھ سمجھے۔
(حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ)
- بھلائیاں بُرائیوں کو زائل کر دیتی ہیں۔ (قرآن پاک)
- عالم جاہل کو اِس لئے پہچانتا ہے کہ وہ خود جاہل رہ چکا ہے۔ لیکن جاہل عالم کو نہیں پہچانتا اِس لئے کہ وہ خود عالم نہیں رہا۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- احمق کی صحبت سے بچ، اِس لئے کہ وہ تیری بھلائی کا ارادہ تو کرے گا لیکن اپنی حماقت کے باعث اُلٹا تجھے نقصان پہنچا دے گا۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)

* * *

دیکھیے ـــــ بھُولیے ـــــ گا ـــــ نہیں۔ سروجنی مارگ سہ۔سی!!"

عبید کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی آواز دُور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ صرف اُس کی آواز کا لمس ہے جو مضراب کی طرح اُس کے ماضی کی دُکھتی ہوئی رگیں چھُو رہا ہے۔

تقریباً چھ سال پہلے ـــــ رعنا بھی اِسی طرح اُس کی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھتے ہوئے اُس کی کمر میں اپنی مرمریں باہنیں حمائل کر کے اُس کے شانوں پر اِسی طرح جھُک گئی تھی اور عبید نے اُس روز ـــــ زندگی میں پہلی بار کسی حسین لڑکی کے قُرب کا لمس شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

[illegible]

اسد کے یہاں آکر ٹھہری تھی۔ جس کے آنے سے پہلے عبید کا دوست اسد بار بار رعنا کے حُسن کی تعریف کرتے اُس کے ذہن پر رعنا کی خیالی حسین تصویر بنا چکا تھا۔

"حقیقت یہ ہے عبید!" اسد نے ایک بار رعنا کے شہر سے واپس آکر خالص شاعرانہ انداز میں جھُومتے ہوئے کہا تھا۔

"رعنا ـــــ کی نیم وا آنکھیں اور چہرے کے پریوں جیسے نقوش دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اجنتا یا ایلورا کی دیوار پر بنی کسی ایسی اپسرا کی تصویر ہے جو اپنی آنکھوں میں اپنے پریتم کا والہانہ تصوّر لے کر صدیوں سے اُس کے آنے کا انتظار کر رہی ہے!"

عبید کے دل پر یہ جملہ نقش ہو کر رہ گیا تھا اور جب اسد نے پہلی بار اپنے مکان پر رعنا سے اُس کا تعارف کرایا تو وہ رعنا کی خواب آگیں نیم وا آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈُوبتا ہوا اپنے آپ سے بے نیاز ہوتا جا رہا تھا۔

"اماں ـــــ کہاں ڈُوبے ہو ـــــ اب آنکھیں کھول کر ـــــ اِدھر دیکھو اور ـــــ میری سُنو!!" اسد نے اُسے جھنجھوڑا تو وہ پشیمان سا ہو کر رعنا سے نظریں بچا گیا تھا۔

"دیکھو! مجھے آج ٹُور پر جانا ہے۔ راشدہ اور خانصاحب اپنی لڑکی سے ملنے کے لئے سینٹ زیویرس میں جائیں گے۔ اس لئے تم رعنا کو اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر اُسے یہاں کے تاریخی مقامات کی ایک جھلک دکھا دو!"

"میں ـــــ؟!" عبید نے حیرت سے اسد کی طرف دیکھا تو رعنا کے چہرے پر ایک خفیف سی مُسکراہٹ کا بانکپن نمایاں ہو گیا۔

"ہاں ـــــ بھئی تم ـــــ اور دیکھو رعنا!" وہ عجلت میں رعنا سے مخاطب ہوا تھا "یہ میرا دوست بہت بڑا حُسن پرست اور جذباتی بھی ہے۔ ذرا اِس کا خیال رکھنا ـــــ!!" اسد رعنا کو چھیڑتا ہوا باہر نکل گیا اور عبید نے پھر رعنا کی طرف دیکھا تو وہ اپنے تراشیدہ ہونٹوں میں اپنی مُسکراہٹ کا بانکپن چھُپانے کی سعی کر رہی تھی۔

اسد کے اصرار پر وہ رعنا کو اپنی موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھا کر چلا تو اُس کے جسم میں ایک سنسنی سی دَوڑ گئی۔ اسٹیچو سرکل سے پانچ بتّی کی طرف مُڑتے ہوئے جب رعنا اُس کی کمر سے مس ہو کر اُس کے شانوں پر جھُک گئی تو اُس پر خواب جیسی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ اُس وقت رعنا کی مخلوط رنگوں کی مہین ساڑی کا فضاؤں میں لہراتا ہوا پلّو اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پھول سے لپٹی ہوئی کسی خوشنما تتلی کے رنگ برنگے پر ہوا میں لہرا رہے ہوں [illegible] اس عالم میں [illegible] کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ اِس لئے وہ پہلے [illegible] پر گھومنے کی غرض سے

انداز میں کہہ رہا تھا۔

"وہ دیکھئے سامنے میوزیم ——— یہ رام نواس باغ کے آہنی پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہوئے رعنا سامنے دیکھ رہی تھی۔ "یہاں کے راجوں مہاراجوں کے اس سنگھرالیہ کو اگر ترپولیہ گیٹ کی بلندی سے دیکھا جائے تو مغل اور راجپوت آرٹ کے سنگم کا یہ مجوبہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی فنکار نے اسے ماڈل کے طور پر اس شہر کی خوبصورت ہتھیلی پر رکھ دیا ہے ———"

باغ سے نکل کر وہ ترپولیہ گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ "اور یہ ہوا محل ہے ——— راجپوتی اور ایرانی فن کے امتزاج کی یہ عمارت آج بھی ناچتے ہوئے مور کے پنکھ کی طرح کھڑی ہے، رات کے وقت سرچ لائٹ میں جب اس کی ڈیٹیل نمایاں ہوتی ہے تو سائڈ سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی باوقار راجپوت شہزادی کا چہرہ ہے جو تحفظِ عصمت کے زعم میں فخر کے ساتھ اس شہر کے مکینوں کو تک رہا ہے۔"

"واقعی آپ کا شہر بہت حسین ہے عبید صاحب ———!" شہر کی تاریخی عظمتوں میں گم ہوتی ہوئی رعنا اچانک جذباتی ہو کر بولی تھی۔

"بیشک ——— یہ شہر بہت حسین ہے مس رعنا! کیونکہ اس کی تاریخی عمارتوں سے قدیم راجپوت اور مغل بادشاہوں کے باہمی خلوص اور ان کے بے لوث تعلقات کا حُسن جھلکتا ہے اور نئے قالب میں ڈھلے ہوئے اس شہر کی خوبصورتی سے ماہرِ فن انجینئر مرزا اسمٰعیل کی سچائی اور لگن کی عظمت نمایاں ہوتی ہے۔"

"یہاں سے آمیر ——— کتنی دور ہے؟" جل محل کے سامنے سے گزرتے ہوئے رعنا نے مضطرب ہو کر پوچھا تھا۔

"بس دو رہا ——— آمیر ———" یہ کہتے ہی اس نے اکسیلیٹر کو زور سے دبایا تو رعنا آمیر گھاٹی کی بلندی کے خوف سے عبید کی کمر سے لپٹ گئی تھی۔

"آمیر ——— اور اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی اس مُلک کی تاریخی عمارتیں ہمارے اجداد کا بیش بہا قیمتی سرمایہ ہیں!" وہ اکثر تاریخی عمارتیں دیکھ کر اسی طرح جذباتی ہو جایا کرتا تھا اور اس دن وہ رعنا کے ساتھ اور جذباتی ہو کر ایک قوم پرست لیڈر کی طرح بہکنے لگا تھا اور رعنا کبھی اُسے اور کبھی قلعے کے در و دیوار دیکھنے لگی تھی۔ "آج دُنیا کے چند مصلحت پسند سیاسی حکمراں ایک بار پھر دُنیا میں جنگ کی آگ بھڑکانے کی سعی کر رہے ہیں مس رعنا! جنگ انسان پر خدا کی طرف سے بھیجی گئی وہ لعنت ہے، جو انسانی زندگیوں، اس تہذیب، اس کے تمدن اور اس کے اپنے کلچر کو فنا کر کے رکھ دیتی ہے اِس لئے ایسے نازک دور میں ہمارے اجداد کے اِس انمول سرمائے کی حفاظت کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے!"

"آپ کا مطلب ———!؟" رعنا شیش محل کی دیواروں کے مصنوعی نگینوں میں جگمگاتی ہوئی قندیلوں سے نظریں ہٹا کر اس کے مشتعل چہرے کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"مطلب یہ کہ آج ——— ہمارے مُلک پر بھی جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اجنتا، آمیر، تاج اور قطب مینار خطرے میں ہیں، ہو سکتا ہے کل ——— میں ایک ہسٹری کے لیکچرار کی بجائے اُس تاریخی سرمائے کی حفاظت کے لئے اپنے مُلک کی سرحدوں کا پہریدار بن جاؤں ———!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ———" رعنا کے مُنہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

- میں ہندو ہوں، تم مسلمان ہو، یا میں گجراتی ہوں اور تم مدراسی ہو۔ ہمیں اِس طرح کی تنگ نظری کو یکسر فراموش کر دینا چاہیے۔ ہمیں مشترک بھارتی قومیت میں 'میں' اور 'میرا' کے احساس کو بالکل مِٹا دینا چاہیے۔ ہم تب ہی صحیح معنوں میں آزاد ہو سکیں گے، جب ہمارے عوام ایک ساتھ اُبھرنے اور ایک ساتھ ڈوبنے کا عزم رکھتے ہوں۔
(مہاتما گاندھی)
- غلطی کرنا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا اور پھر اُس سے احتراز کرنا ہی مردانگی ہے۔
(مہاتما گاندھی)

"میں صحیح کہہ رہا ہوں ——— کیونکہ میں نے ملٹری کی سروس کے لئے بھی ایپلائی کر رکھا ہے!"

یہ کہتے ہی عبید نے رعنا کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو اُس کی گھنی پلکوں کے حاشیوں سے آنسوؤں کی ہلکی ہلکی نمی جھانک رہی تھی۔

آمیر کے بعد ——— وہ دونوں بُجھے بُجھے سے گھر لوٹ آئے تھے۔

عبید کے دل پر رعنا ——— اُس دن کی رفاقت کے نہ مِٹنے والے گہرے نقوش چھوڑ کر اُس کے انتہائی قریب آ چکی تھی۔ لیکن دوسرے دن راشدہ کی باتوں پر رعنا کو خاموش دیکھ کر عبید کو یوں محسوس ہوا جیسے رعنا اور اُس کے درمیان نظریاتی اختلاف کی ایک خلیج حائل ہو کر رہ گئی ہے!

دوسرے دن اسد نے راشدہ سے باتوں ہی باتوں میں رعنا اور عبید کو


چائے جب بھی پئیں
للپٹ چائے ہی پئیں
چائے کا وقت — دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد جب
طبیعت کسی ایسی چیز کی خواہش کرتی ہے جو پھر تسلی لائے اور
امنگ پیدا کرے تو یہی۔ ٹھیک للپٹ چائے کا وقت ہے۔
اس لئے کہ للپٹ چائے اس ڈھنگ سے خاص طور پر مرکب کی گئی
ہے کہ آپ میں حقیقتاً تر و تازگی پیدا کرے، آپ کی طبیعت میں
انشراح اور امنگ لائے جس وقت آپ کو اس کی سب سے
زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ للپٹ چائے نہایت پسندیدہ
قسموں کی چائے سے بنائی جاتی ہے اسی لئے اس کی
خوشبو مرغوب اور لذت من پسند ہوتی ہے۔ اس کی پیالی بھر
تیز چائے سچ مچ تسلی بخش ہوتی ہے۔
عالمی۔ شہرت کی چائے
چائے
جو واقعی تسکین بخشے

ہمیشہ کے لئے منسوب کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن راشدہ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ رعنا انتہائی خوبصورت لڑکی ہے جس کی شادی کی بات بمبئی میں ایک بہت بڑی کاسٹیک فرم کے مالک سے چل رہی ہے جو رعنا کو عالمی بیوٹی کمپیٹیشن میں شریک کر کے مس یونیورسل بنانے کا ارادہ رکھتا ہے!

کیوں رعنا ——!" عبید نے چونک کر رعنا کی طرف دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا —— اور عبید کو محسوس ہوا جیسے رعنا کی سسکی خواہش کے اظہار کا یہ اشارہ اس کے دل سے رعنا کی محبت کے گہرے نقوش مٹاتا ہوا گزر گیا ہے۔

"تمہارا کیا خیال ہے عبید! کیا رعنا مس یونیورسل کا اعزاز حاصل کر سکتی ہے ——!؟" عبید کو خاموش دیکھ کر اسد نے چٹکی لی تھی۔

"میرے نزدیک عورت کے حُسن کی یہ نمائش کوئی عزت افزا کارنامہ نہیں ہے مسٹر اسد!" عبید چڑ سا گیا تھا۔

"لیکن عبید صاحب! آج بہت سے ملکوں کی عورتیں اسی حسن کی بدولت اپنے ملک کا نام ساری دنیا میں روشن کر رہی ہیں!" راشدہ تنک کر بولی تھی۔

"وہ محض اپنے حسن سے اپنے گمنام ملک کا نام روشن کر سکی ہیں مسز خان! لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس ملک کی عورت نے ہمیشہ اپنے اعلیٰ کردار اور بے لوث قربانیوں کی عظیم الشان مثالیں قائم کر کے اپنے ملک کا نام روشن کیا ہے!"

"آخر آپ آج کے دور کی اس Beauty Contest کو اتنا بُرا کیوں سمجھتے ہیں عبید صاحب ——!" رعنا نے سوال کیا تھا۔

"اس لئے مس رعنا کہ اس کے نام لیوا محض ظاہری حسن کو دیکھتے ہیں عورت کے کردار یا اس کے اندر چھپی ہوئی اُن خوبیوں کو نہیں پرکھتے جو عورت کی عظمت کو چار چاند لگاتی ہیں!"

"اور رعنا ایسے لاکھ مقابلوں میں شریک ہو کر بھی اپنے اندر کی آن خوبیوں کو نہیں کھو سکتی مسٹر بیگ جنھیں مقابلے کے وقت اس کے نام لیوا کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

"یہ باتیں محض دعووں سے نہیں عمل سے واضح کی جاتی ہیں مس رعنا!"

"اور وقت پڑنے پر یہ رعنا عمل کے ان سخت ترین مرحلوں سے گزرنے کا پہلے ہی سے حوصلہ رکھتی ہے!!"

"بھئی تم بھی عجیب آدمی ہو —— میں تمہاری شادی کی بات کر رہا ہوں اور تم آغا حشر کے ڈرامے کی ریہرسل کرنے لگے!"

"لیکن میں شادی کے لئے کب تیار ہوں ——؟!" عبید برہم ہو کر بولا تھا۔

"کیوں —— تم کیوں تیار نہیں ہو ——؟!" اسد سوالیہ نشان ہو گیا۔

"اس لئے کہ میں بھی —— مس رعنا کی طرح اپنے آپ کو اس مقابلے کے لئے تیار کر رہا ہوں جو میرے اصول اور دعووں کو پرکھنے کی صحیح کسوٹی ہو گا ——!"

"کیا محمد علی کلے یا سونی لسٹن سے لڑو گے ——؟!" اسد نے حسبِ عادت تمسخر سے کام لیا۔

"دیکھ لینا —— وقت آنے دو!"

"آخر اس جذباتیت سے تم کیا واضح کرنا چاہتے ہو ——؟!" اسد نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"یہی کہ مس رعنا اور میں —— دونوں ہی اپنی اپنی خوبیوں کی نمائش کر کے شہرت کے خواہش مند ہیں!" عبید نے رعنا کی طرف دیکھ کر طنز کیا تھا۔

"ایک ہم ہی نہیں —— آج ہر انسان یہی چاہتا ہے مسٹر عبید ——!" رعنا نے جوابی حملہ کیا تھا۔

"آج کے انسان کی خواہشوں کا دائرہ تو بہت وسیع ہے مس رعنا!"

"اور اسی دائرے میں پلتی ہوئی ایک بہت بڑی خواہش محبت بھی ہے عبید صاحب ——؟"

"محبت ——؟!" عبید نے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔

"اچھا بھئی —— ان دونوں کو تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو ——؟ اسد راشدہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا "بھوک لگے گی تو خود ہی خاموش ہو جائیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اسد راشدہ کو لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

"بہر حال عبید صاحب ——!" رعنا اچانک سنجیدہ ہو کر کہنے لگی تھی۔ "اتنا یاد رہے کہ جو لڑکی کسی لڑکے میں اپنا آئیڈیل دیکھ لیتی ہے وہ اُسی سے محبت کرنے لگتی ہے —— اور یہ لڑکی وہی عورت ہے عبید صاحب جو زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے ——!!" یہ کہتے ہوئے رعنا کی آواز بھرا گئی تھی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو ——؟!" عبید نے بے ساختہ رعنا کو پہلی بار "تم" سے مخاطب کیا تھا۔

"اس کا جواب تو اب محض عمل کا وہ "مرحلہ" یا مقابلہ ہی دے سکے گا

جس کے ہم اور آپ دعوے دار ہوتے ہیں ——!!"

یہ کہتے ہی رعنا کرسے باہر چلی گئی اور عبید اُسے دیکھتا رہ گیا

اُس ڈرامائی ملاقات کے بعد رعنا اپنے شہر چلی گئی تھی —— اور ملٹری سے عبید کا انٹرویو لیٹر آگیا تھا۔ انٹرویو سے واپسی پر اُس نے رعنا کو ایک تفصیلی خط لکھا جس کا جواب نہ پاکر اُسے انتہائی دُکھ ہوا —— ہفتوں اُسے یہی محسوس ہوتا رہا جیسے رعنا کے غم نے اُس کے دل کو دبوچ لیا ہے اور وہ ملٹری کی سخت ڈیوٹی کے قابل نہیں ہے۔ اسی بحرانی کیفیت میں ایک دن اُس نے یہ بھی سن لیا کہ ہمالیہ کے سینے پر ایک چنگیز صفت قوم نے ظلم کی سنگین رکھ دی ہے۔ سارے مُلک میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُن ہی دنوں اُسے ملٹری سے کال آگئی اور اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کے کانوں میں چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے ——

"اجنتا، آمیر —— اور تاج خطرے میں ہیں، ایسے نازک دور میں اپنے تاریخی سرمائے کی حفاظت کی ذمّہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے، اس کا جواب وہ مرحلہ یا مقابلہ ہی دے سکتا ہے جس کے ہم دعویدار ہیں ——!!"

پونا سے ایک ذمّے دار فوجی افسر کی ضروری ٹریننگ لینے کے بعد جب وہ مُلک کی شمالی سرحدوں کی طرف جا رہا تھا۔ اُس وقت بھی اُس کے کانوں میں یہی جملے گونج رہے تھے اور رعنا کی بیوفائی کا غم اُسی طرح اُس کے دل کو اندر ہی اندر کھائے چلا جا رہا تھا۔

کچھ دن بعد —— عبید نے اسد کو سرحدی علاقے سے خط تحریر کیا۔ لیکن وہ اچانک تبدیل ہو کر کسی دوسرے شہر منتقل ہو چکا تھا اور پھر وہ سب ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہو کر ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئے تھے۔

تقریباً چھ سال بعد —— دو بیرونی مُلکوں سے نبرد آزمائی کے بعد اُس نے میدانی خطّے کی شکل دیکھی تھی اور وہ شمالی یو۔پی کے ایک تاریخی شہر کی چھاؤنی میں تبادلہ ہو کر آگیا تھا۔

یہاں آکر اُس کی دوستی تاریخ کے پروفیسر حیات اللہ سے ہوئی تھی۔ اور اُس دن یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے اُس کی نظریں رباب پر جم کر رہ گئی تھیں۔ رعنا سے مشابہ یہ وہی لڑکی تھی جو اُس کے سینے میں پھر ایک بار محبت کے سوئے فتنے جگا گئی تھی۔

وہی لڑکی آج اُس کے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی اُس کے ماضی کو آواز دے رہی تھی اور اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اِس لڑکی کے قُرب کی آنچ پاکر رعنا کا تصوّر آگ کے اُس الاؤ کی طرح ہو گیا ہے جس میں اُس کا جسم دہکتی ہوئی سلاخ کی طرح تپ رہا ہے۔

دوسرے دن عبید اپنے ہاتھ میں ایک پیکٹ لئے ہوئے رباب کے مکان پر پہنچ گیا اور جیسے ہی دروازے میں داخل ہوا تو ایک ادھیڑ عمر خاتون اُسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"آپ —— ؟!" عبید کے مُنہ سے بیساختہ نکلا تھا —— اور پھر —— اُس کی آنکھوں میں کئی سال پہلے کی راشدہ کا چہرہ گھومنے لگا۔

"ہاں —— میں ——!!" وہ مہمانوں کا استقبال کرتی ہوئی اُسے گھور رہی تھی۔

"شاید —— میں غلطی —— سے یہاں آگیا ہوں ——!!" یہ کہتے ہی عبید مڑا تو پیچھے سے رباب کی آواز نے اُس کے پیروں کو جکڑ لیا۔

"تشریف لائیے بیگ صاحب!" وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ سے چہکتی ہوئی قریب آئی تو عبید کھٹک گیا۔

"یہ لیفٹیننٹ بیگ ہیں امّی جان ——!"

"میں اِنھیں اچھی طرح جانتی ہوں —— جاؤ تم اپنا کام کرو ——

یہ اب یہاں سے نہیں جاسکتے ——!!" اُس کی امّی نے برہم ہوکر رباب کو پھٹکارا تو وہ سہمی ہوئی سی اپنی سہیلیوں کی طرف چلی گئی اور عبید دونوں کو سنجیدگی سے دیکھتا رہا۔

"آیئے مسٹر عبید —— اور جانے سے پہلے ایک نظر اُس لڑکی کو دیکھتے جایئے جو آج تک آپ کا انتظار کر رہی ہے!"

"کون ہے وہ لڑکی ——؟!" عبید نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

"بھول گئے اُس لڑکی کو جس نے تمھارے لئے اِتنی بڑی قربانیاں دی ہیں!!" وہ بپھری ہوئی سی کہہ رہی تھی۔

"کیسی قربانیاں ——؟!" عبید نے تلملاتے ہوئے پوچھا۔

"آج تم اِتنے انجان ہوکر اُس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے ہو، جس نے تمھاری وجہ سے ایک لکھ پتی شوہر کی بیوی بننے سے انکار کر دیا، اپنے حُسن سے حاصل ہونے والی عالمی شہرت کو ٹھکرایا اور دُنیا کے ہنگاموں سے دُور ہوکر خود کو گھر کی چہار دیواری میں یہ کہہ کر قید کیا کہ عمل کے اِس مرحلے پر وہ اپنے اندر چُھپی ہوئی اُس عورت کو دُنیا پر ظاہر کر کے رہے گی جو زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے!"

"رعنا ——!" وہ پاگلوں کی طرح چیخ اُٹھا۔

"تمھیں آج اِس رعنا کی یاد آئی ہے جبکہ تمھارے غم نے اِس کے جسم سے خون کی ایک ایک بُوند نچوڑ لی ہے!"

"کہاں ہے رعنا ——!" اُس نے مشتعل ہوکر راشدہ کے بازو تھام لئے۔

"آؤ میرے ساتھ —— تمھیں تاریخی کھنڈرات دیکھنے کا شوق رہا ہے اِس لئے تمھیں اُس رعنا کو دکھادوں جسے ڈاکٹروں نے ٹی بی کے پہلے اسٹیج پر بتایا ہے —— اور جسے آج تک ہم اپنے شانوں پر اُٹھائے پھر رہے ہیں ——!!"

"نہیں —— اُسے ٹی بی —— نہیں ہوسکتی!! —— مجھے اُس کے پاس لے چلو ——!!" عبید نے جذباتی ہوکر راشدہ کو جھنجھوڑا اور پھر وہ دونوں —— ہال سے ہوتے ہوئے رعنا کے کمرے کی طرف چلے گئے تھے!

وہ دونوں رعنا کے کمرے میں پہنچے تو رعنا مسہری پر دراز خلاؤں میں تک رہی تھی اور اُس کے زرد چہرے پر یاس کے آثار مسلّط تھے۔ جسم پر نقاہت غالب تھی اور آنکھوں پر جُھکی ہوئی پلکیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ صدیوں کے انتظار کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہیں۔ عبید —— رعنا کو اِس حالت میں دیکھ کر —— سکتے میں کھڑا رہ گیا —— اور راشدہ آگے بڑھ گئی تھی۔

کمرے میں قدموں کی آہٹ سُنتے ہی رعنا نے دروازے کی طرف دیکھا تو اُس کے سامنے عبید کی دُھندلی سی تصویر اُبھر رہی تھی۔

"آ —— پ ——!!" بہت دیر تک اُسے دیکھنے کے بعد رعنا کے خُشک ہونٹ کانپے اور خزاں رسیدہ زرد چہرہ تکیے کے نیلگوں نشیب سے گھٹتے ہوئے زرد چاند کی طرح اُبھرنے لگا

"ہاں —— میں —— عبید ——" رعنا کی آواز پر بیدار ہوتے ہی بجلی کی سُرعت کے ساتھ اُس کی طرف بڑھا "یہ تمھیں —— کیا ہوگیا ہے رعنا ——!" عبید نے اپنی ہتھیلیوں کے درمیان اُس کا بُجھا ہوا چہرہ لے کر جذباتی ہوکر پُوچھنا چاہا تو —— اُس کی آواز بھرّا گئی اور رعنا اُسی طرح اُس کی طرف دیکھتی رہی . . . اُس نے عبید سے بہت کچھ کہنا چاہا لیکن اُس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے، تنفّس تیز ہوگیا —— جذبات کی شدت سے اُس کی زبان اینٹھ سی گئی اور پھر اچانک اُس کا رِقّت انگیز چہرہ تکیے میں دھنس کر رہ گیا۔

"رعنا ——؟!" راشدہ کی ایک چیخ کمرے کی فضا پر چھا گئی تھی۔

ڈاکٹر مسہری پر پڑی ہوئی رعنا کا معائنہ کر رہا تھا۔ خاص مہمان کمرے میں دم سادھے ہوئے کھڑے تھے۔ رباب اور راشدہ حسرت و یاس کا مجسّمہ بنی رعنا کو تک رہی تھیں مسٹر خان خاموشی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہے تھے اور عبید —— رعنا کے پیروں کی طرف کھڑا ہوا اُس کی پھٹی ہوئی آنکھوں پر جُھکی ہوئی گھنی پلکوں کی نوک پر اُبھرے اُن آنسوؤں کے دو قطروں کو غور سے دیکھ رہا تھا جو ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔

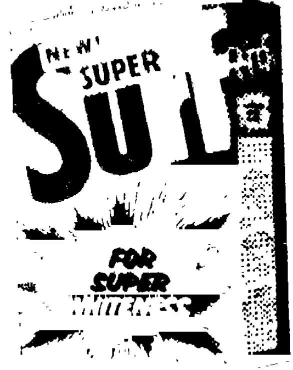
"اچانک خوشی کی بہتات سے —— حرکتِ قلب بند ہوگئی ہے ——!!" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر کھڑا ہوا تو کمرے میں کہرام سا برپا ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے صفِ ماتم سی بچھ گئی۔

ڈاکٹر جا چُکا تھا۔ راشدہ اور رباب ایک دوسرے سے مِل کر رو رہی تھیں، مسٹر خان اُنھیں تسلّی دے رہے تھے، مہمانوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور عبید —— حزن و یاس کا مجسّمہ بنا ہوا مسہری پر دراز رعنا کے پھول سے مُرجھائے ہوئے وجود کو تک رہا تھا اور اُس کے چہرے پر اُس کی پھٹی پھٹی سی آنکھیں دیکھ کر عبید کو محسوس ہو رہا تھا جیسے رعنا اجنتا یا ایلورا کی دیوار پر بنی کسی ایسی اپسرا کی تصویر ہے جو آنکھوں میں اپنے پریتم کا والہانہ تصوّر لئے صدیوں سے اُس کے آنے کا انتظار کر رہی ہے!!

آزمائیے

سُپر سرف سے ایک بار دُھل کر کپڑے جتنے سفید ہوتے ہیں دوسرے پاؤڈروں سے ۲ بار دُھل کر بھی نہیں ہوتے!





تجربہ گاہوں میں بار بار کے تجربات سے ثابت ہوچکا ہے
کہ برابری کے دعویدار پاؤڈروں کی دو دُھلائیوں
کے مقابلے میں سُپر سرف کی صرف ایک دُھلائی
سے کپڑے کہیں زیادہ سفید دُھلتے ہیں۔
خود ہی آزما کر دیکھ لیجئے۔ آپ دوبارہ کوئی
دوسرا کام چلاؤ پاؤڈر لیں گے ہی نہیں۔
آج ہی سُپر سرف خریدیئے...
ہندوستان کا بہترین پاؤڈر۔

سُپر سرف سے کپڑے سب سے سفید دُھلتے ہیں!

(نیل پاؤڈر وغیرہ کی ضرورت نہیں)

ہندوستان لیور کی ایک اعلیٰ پیشکش

لنٹاس SU-76-140-45 UD

غزلیں

ایم۔اے، شمیم سرونجی ایم۔اے

خوابوں میں نظر آئیں دلدار تری آنکھیں
آنکھوں میں لبسالی ہیں اے یار تری آنکھیں

یا زہر کے پیالے ہیں اے یار! تری آنکھیں
یا کیفِ محبت سے سرشار تری آنکھیں

کاجل کی گھٹاؤں سے بجلی سی گری دل پہ
اک حشر اُٹھاتی ہیں دلدار تری آنکھیں

بس ڈوب ہی جائیں ہم یہ دل کی تمنا ہے!
شفاف سی جھیلیں ہیں دلدار تری آنکھیں

تُو حُسنِ سراپا ہے، تُو جانِ تغزل ہے
مطلع ہے جبیں گویا اشعار تری آنکھیں

آنسو بھی اُنھیں کہہ لو، موتی بھی اُنھیں کہہ لو
نادار ہیں یا ما لے زردار تری آنکھیں

یہ تیرا شمیم اک دن مرجائے نہ اس غم میں
دیکھی نہیں جاتی ہیں بیمار تری آنکھیں

اختر بسنوی ایم۔اے

بھرتے ہیں جو آہیں ماضی کے بھولے بسرے افسانوں پر
کیا اُن کو خبر کیا کیا گذری اِس دور میں ہم دیوانوں پر

جذبات کی تابانی کے لئے کافی ہیں تری یادوں کے دیے
احساس کی ویرانی کا اگر سایہ نہ پڑے ارمانوں پر

ساحل پہ خود اپنے ہاتھوں سے کشتی کو ڈبویا ہے بارہ
موجوں سے نہیں شکوہ کوئی، الزام نہیں طوفانوں پر

اربابِ خرد نے دنیا میں وحشت کے وہ نقشے پیش کئے
آشفتہ سروں کو آتی ہے رہ رہ کے ہنسی فرزانوں پر

مٹ کر بھی حیاتِ انسانی دیتی ہے جہاں کو درسِ بقا
قربان کبھی جب ہوتی ہے اک جان ہزاروں جانوں پر

معلوم نہیں کس کو پھونکا، کس کو بخشی سوغاتِ ضیا
اک برق چمکتی دیکھی تھی کچھ دیر ہوئی کاشانوں پر

اختر کی سمجھ میں آنہ سکا یہ کونسا فیضِ بادل ہے
بے آب ہیں سارے باغ و چمن، برسی ہے گھٹا ویرانوں پر

بالا کرشن گوپال مغموم بی۔اے

تصور میں ترے جلووں کی لے کر چاندنی ہم نے
شبِ ہجراں کی مانگ اکثر ستاروں سے بھری ہم نے

یہ وحشت تھی، جنوں تھا، بیخودی تھی، بے نیازی تھی
ہر اک منزل کو ٹھکرایا بہ شانِ گمرہی ہم نے

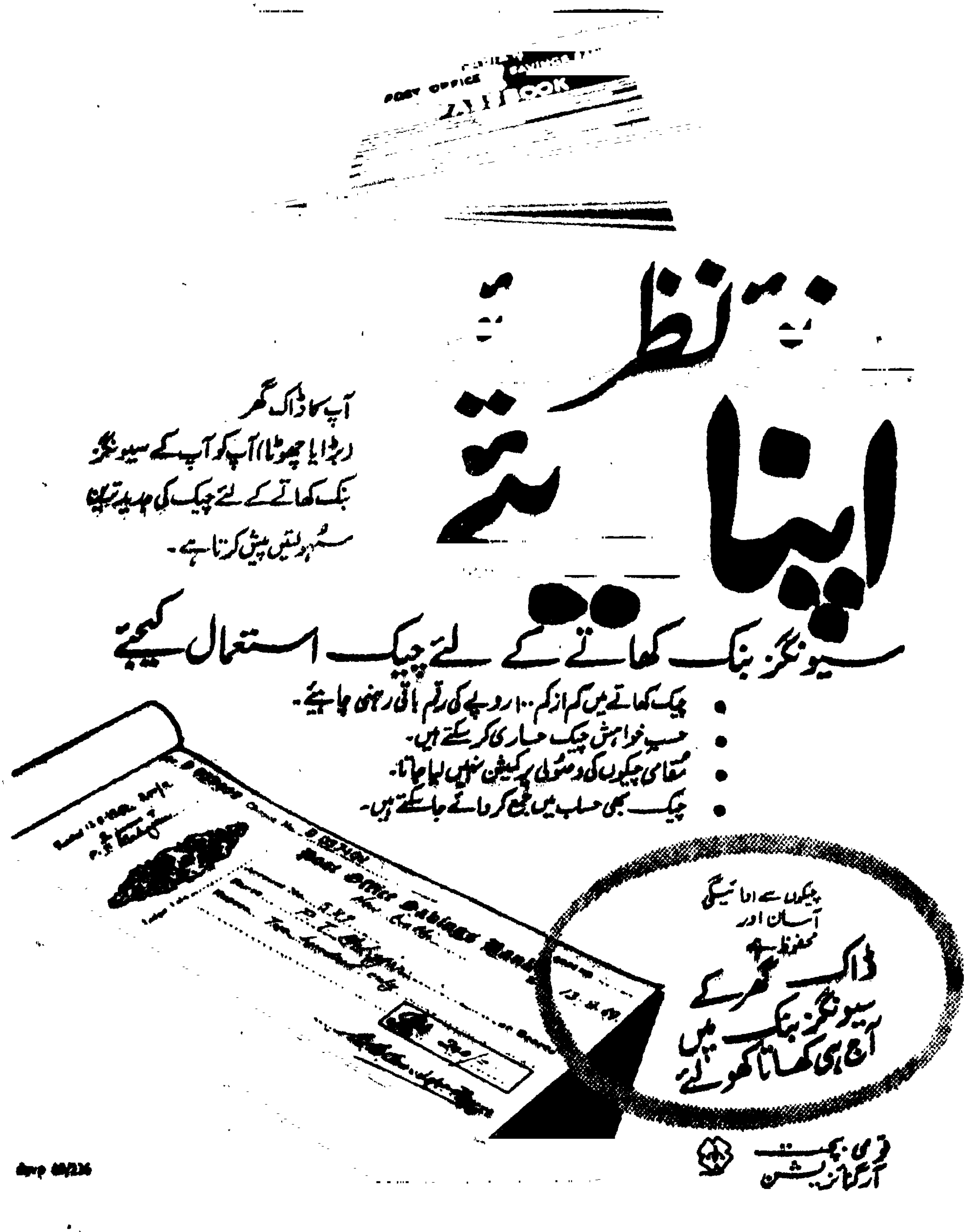
جواباً اک نہ اک دن آئے گی آواز تیری بھی
برابر دل کی خلوت سے تجھے آواز دی ہم نے

دھڑکتا دل، برستے اشک جس کو یاد کرتے ہیں
چھپا رکھی ہے آنکھوں میں وہ شامِ بیکسی ہم نے

کسے معلوم تھا تمہیدِ ہجرِ مستقل ہو گی!
تجھے دیکھا تھا لیکن وائے قسمت اک گھڑی ہم نے

خموشی بھی تو اک طرزِ بیانِ حالتِ دل ہے
لگا رکھی ہے اب ہونٹوں پہ مُہرِ خامشی ہم نے

ہماری زندگی میں یُوں تو اے مغموم سب کچھ تھا
مگر محسوس کی پھر بھی کسی شے کی کمی ہم نے


آپ کا ڈاک گھر
(بڑا یا چھوٹا) آپ کو آپ کے سیونگز
بنک کھاتے کے لئے چیک کی جدید ترین
سہولتیں پیش کرتا ہے۔
سیونگز بنک کھاتے کے لئے چیک استعمال کیجئے
چیک کھاتے میں کم از کم ۱۰۰ روپے کی رقم باقی رہنی چاہیئے۔
حسب خواہش چیک جاری کر سکتے ہیں۔
مقامی چیکوں کی وصولی پر کمیشن نہیں لیا جاتا۔
چیک بھی حساب میں جمع کروائے جا سکتے ہیں۔
چیکوں سے ادائیگی
آسان اور
محفوظ ہے
ڈاک گھر کے
سیونگز بنک میں
آج ہی کھاتا کھولئے
قومی بچت
آرگنائزیشن
POST OFFICE

بھنور

از:- پروفیسر مدن موہن

مترجمہ: نور شاہ

شاہد اکارنرز یڈنسی روڈ، جموں

برادرِ محترم خورشید گرامی صاحب! آداب

.... ڈوگری کے جدید اور عظیم کہانی کار پروفیسر مدن موہن کی ڈوگری کہانی کا اُردو روپ "بھنور" ارسال کر رہا ہوں۔ مدن موہن انگریزی کے پروفیسر ہیں مگر وہ کہانیاں ڈوگری میں لکھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کوئی بھی بات موثر انداز سے کہنے کے لئے مادری زبان سے بہتر اور کوئی ذریعۂ اظہار نہیں۔ اُنہوں نے یہ کہانی ڈگر دیش کے مخصوص پس منظر میں لکھی ہے اور کہانی کا اختتام قاری کو جہاں چونکا دے گا وہاں اُس کی فکر کو بھی گھیرے گا۔ کہانی آپ کو اور قارئین "بیسویں صدی" کو ضرور پسند آئے گی اور میں حسبِ معمول اپنے کرم فرماؤں کی رائے کا شدت سے انتظار کروں گا۔ اُن کی رائے میں پروفیسر صاحب تک بھی پہنچا دوں گا۔

مخلص ——— نور شاہ

نیلی جھیل سی گہری دو آنکھیں، انار کے پھول جیسے لال لال ہونٹوں سے پھوٹتی ہوئی مُسکان سُرخ سیب جیسے گالوں میں پل پل ہنستے مٹتے دو گڑھے!

"یہ گچھیاں ماسٹر جی ہمارے پہاڑوں میں بہت ہوتی ہیں آپ کے بازاروں میں پچاس روپے سیر بھی تو نہیں ملتی ہیں۔"

"جب میں بہت چھوٹی تھی ماسٹر جی تب اپنی چھوٹی چھوٹی بھیڑ بکریوں کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہوئی آکاش جیسے اُونچے اونچے پربتوں پر چڑھ جاتی اور دُھند کے سپید سپید گالوں کو اپنی باہنوں میں بھر لیتی۔ کیسے دن تھے وہ! کہاں چلے گئے وہ دن ——— اب تو میں بوڑھی ہو گئی ہوں!"

"آپ کبھی سدھی گئے ہیں۔ سدھی جانے کے دو راستے ہیں، آج کل اکثر لوگ چینیی کے راستے جاتے ہیں۔ بس جو جانے لگی ہے، لیکن اگر آپ ٹینی ٹاپ کے پاس والے راستے سے جائیں تو گوری کنڈ تک جو راستہ جاتا ہے اُس پر چلتے چلتے جو لُطف آتا ہے وہ اور کہیں نہیں۔ راستے کے بائیں طرف کہیں کہیں کچے مکان اور مکی کے کھیت ہیں۔ دائیں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ اور بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے دیو دار کے گھنے درخت۔ راہ میں کہیں کہیں گُنگناتے پانی کے جھرنے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے سپید رنگ کے سانپ مستی میں آکر زمین پر لوٹ رہے ہوں پر آپ نے تو سپید سانپ بھی کہاں دیکھے ہوں گے۔ میں تو اُنہیں دم سے پکڑ کر دیر تک ہوا میں اُچھالا کرتی تھی۔ میری ماں میرے باپو رکتے تھے مجھے۔ پر میں اتنی چنچل تھی کہ کسی کی بھی نہ سنتی تھی ——— اب تو نام کا گھر ہے ماسٹر جی! پر کبھی ہمارا بھی گھر تھا۔ دو سوا ایکڑ زمین تھی میرے باپو کی۔ میرا باپو جب تک پانچ سات برہمنوں کو کھانا نہ کھلاتا، پانی کا گھونٹ تک نہ پیتا تھا اور اب ستاں ہے اور نہ باپو۔ زمین کچھ سرکار نے چھین لی کچھ اپنے قریبی رشتہ داروں نے۔ اور وہ گھر جس کے آنگن میں، میں کھیلا کرتی تھی اب ویران سا پڑا ہے۔ پچھلے برس چار آئے کہنے لگے گھر اُن کے نام لکھ دوں۔ میں نے لکھ دیا۔ اب کون جائے گا وہاں، جو گھر چھوٹا اُس کا نام لینے سے کیا فائدہ ......"

"ماسٹر جی! آپ دوسروں کے لئے افسر ہوں گے پر میرے اور ریپو کے لئے آپ ماسٹر ہی تو ہیں۔ پہاڑ سے میرا چچیرا بھائی کلہاڑیاں لایا تھا۔ ہمارے پہاڑوں کی یہی تو ایک سوغات ہے۔ یہ رہا آپ کا حصہ۔ میں نے اور ریپو نے تو سینک کر کھائی ہیں لیکن آپ کے لئے گھی میں تل کر لائی ہوں۔ کھائیے اور

پھر ادر ملنگیے پہاب اور ہیں نہیں ——— !"

"ماسٹر جی! میں نے سُنا ہے آپ ہاتھ بھی دیکھتے ہیں۔ پپو کہہ رہا تھا ماسٹر جی نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ میں بڑا آدمی بنوں گا۔ میرا ہاتھ دیکھئے اور سچ سچ بتائیے ابھی اور کتنے دن جینا ہے مجھے۔ آپ بیاہ کیوں نہیں کرتے ماسٹر جی؟ دفتر سے آکر اکیلے پڑے رہتے ہیں۔ کتنا تنہا ہے آپ کا جیون! میری طرف کیوں آپ اتنی زہر بھری مُسکان سے دیکھ رہے ہیں۔ میں تو تھی ہی بدنصیب ——— بھگوان میرے جیسے نصیب کسی اور کو کبھی نہ دینا!"

بڑے بچوکان کی اِس چار منزلہ حویلی میں رہتے ہوئے مجھے چھ ماہ ہو چکے ہیں اور اِن چھ مہینوں میں، میں رانی جی کے کچھ اِتنے ہی رُوپ دیکھ پایا ہوں۔

- ایک اچھے گھر سے بہتر کوئی درس گاہ نہیں ہے اور ایماندار اور پاکباز والدین سے بہتر کوئی اُستاد نہیں۔ (مہاتما گاندھی)
- ضمیر کی آواز خدا کی آواز ہے اور یہی آواز ہر عمل اور ہر خیال کی صداقت کا آخری فیصلہ کرتی ہے۔ (مہاتما گاندھی)
- کسی کا دل دُکھانا سب سے بڑا گناہ ہے۔ (مہاتما بدھ)
- جو لوگ دُکھ کو سُکھ سمجھتے ہیں ان کے لئے کانٹے بھی پھول بن جاتے ہیں۔ (تُلسی داس)
- فقر و درویشی کی کلید خاموشی ہے۔ غیبت کا مُنہ کالا۔ دیانتدار سُرخرو ہے۔ احسان فراموش زرد رُو ہے۔ (گُرو نانک جی)

پینتس برس کی عمر میں رانی جی نے نسوانی زندگی کے باغ کا ہر پھول سونگھ لیا ہے اور اس کے ہر کانٹے کا درد برداشت کیا ہے۔

سب سے پہلے رانی جی کا جو رُوپ میرے سامنے آتا ہے وہ ہے حویلی کی مالکن کا۔ اِس حویلی میں لگ بھگ بارہ کرایہ دار رہتے ہیں۔ اور کرایہ دار کے لئے اس حویلی میں رہنے کی شرائط کا احترام ضروری ہے۔ میرا کمرہ چوتھی چھت پر ہے اور جس کا ایک دروازہ رانی جی کے کمرے کے ساتھ کھلتا ہے۔ مجھے کرایہ پر لینے کے لئے جو شرائط ماننی پڑیں وہ یہ تھیں۔

(کنبہ بڑا نہ ہو (اپنی جنم کُنڈلی میں منگل ہے اور ہتھیلی پر بیاہ کی کوئی لکیر نہیں)

(روز رات کو دس بجے سے پہلے حویلی میں لوٹ آنا (اپنی عمر کے چالیس برسوں میں اس دنیا کا ہر رنگ دیکھ چکا ہوں)

(واقف کاروں کو حویلی کے دروازے ہی سے رخصت کرنا پڑے گا (اس بھری دنیا میں یار کم اور یار مار زیادہ ملے ہیں۔)

(کمرے کی بتی رات کے گیارہ بجے سے پہلے ہی بجھ جانی چاہئے۔ (یہ شرط ذرا کڑی تھی، پر سوچا رہتے رہتے عادت ہو جائے گی)

(کرایہ چالیس روپیہ ہے (تنخواہ کافی ملتی ہے اس لئے کرایہ ادا کرنے کی کوئی فکر نہیں)

یہ پانچ شرطیں ماننے پر مجھے چوتھی منزل پر یہ کمرہ ملا تھا۔ اِس منزل میں میرے اور رانی جی کے سوا اور کوئی نہیں رہتا۔

رانی جی کا دوسرا رُوپ ایک ماں کا ہے۔ دس برس کا پپو اُن کا اپنا نہیں۔ ٹھاکر کرشن سنگھ تب ستر برس کے تھے جب وہ چھنی کے پہاڑوں سے سولہ برس کی ایک لڑکی کو بیاہ کر لائے تھے۔ ٹھاکر کا تعلق شاہی گھرانے سے تھا۔ خود کو راجہ کہتے اور سمجھتے تھے۔ سولہ سال کی اِس بچی کا باپ بہت چیخا، چلایا تھا پر کچھ نہ کر سکا اور وہ لڑکی ابھی اُنیس ہی برس کی تھی کہ ٹھاکر صاحب دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ رانی جی کو ٹھاکر کی وفات پر دُکھ نہ تھا۔ اُنھیں دُکھ تھا تو صرف یہ کہ اُن کے سامنے اُن کی باقی عمر ایک اونچے ویران پہاڑ کی طرح تھی لیکن زندگی چاہے ایک پربت ہو یا ایک پھول، اُسے سینے سے لگانا پڑتا ہے۔ اپنی زندگی کی ویرانیوں میں رنگ بھرنے کے لئے رانی جی نے ایک سالہ پپو کو گود لیا تھا اور اب وہ پپو سے اتنا پیار کرتی ہے کہ دیکھنے والے کو یہ گمان کبھی نہیں ہو سکتا کہ پپو اُن کا اپنا بیٹا نہیں ہے۔ ویسے پپو ہے بھی بڑا پیارا بچہ۔ بالکل دیو مالاؤں کی کہانیوں کا راجکمار معلوم ہوتا ہے۔ کانونٹ کے چوتھے درجے میں پڑھتا ہے۔ کبھی کبھی مجھ سے کوئی سوال یا انگریزی کا لفظ پوچھنے آ جاتا ہے۔ اِس لئے پپو اور رانی جی دونوں مجھے ماسٹر جی کہا کرتے ہیں۔

رانی جی کا تیسرا رُوپ اُس عورت کا ہے جو زندہ پتی کا ہر حکم بجا لانا اپنا دھرم تو سمجھتی ہے لیکن مرحوم شوہر کو دیوتا سے بھی بڑھ کر مانتی ہے۔ راجہ جی کو دُنیا چھوڑے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں۔ ہر روز صبح رانی جی ٹھیک پانچ بجے اُٹھتی ہے، نہا دھو کر سفید رنگ کی ساڑی پہنتی ہے، سامنے دیوار کے پاس کی اونچی مخملی کرسی پر راجہ کرشن سنگھ کی تصویر پر پھول چڑھاتی ہے، پُوجا کرتی ہے اور پھر روتے روتے کہتی ہے ——— "ہے مالک مجھے بھی اپنے پاس بُلا لو، تم نے مجھے تنہا بنا کیا رکھا ہے اِس سنسار میں"۔ میں جب اِس کمرے میں رہنے لگا تو ہر صبح رانی جی کی اِس طرح کی باتیں سُن کر مجھے محسوس ہوا جیسے وہ ایک تصویر سے نہیں، جیتے جاگتے راجہ جی سے باتیں کرتی ہے۔ اصل میں کرسی پر رکھی ہوئی وہ تصویر ہے بھی کچھ ایسی

ہی۔ بہت بڑی تصویر ہے وہ۔ راجہ جی کے سر پہ لگ بھگ دس گز کپڑے کی پگڑی بندھی ہے سپید شیروانی میں راجہ جی بڑے رعب دار نظر آتے ہیں۔ جو کبھی اِس تصویر کو پہلی بار دیکھتا ہے وہ کچھ دیر کے لئے ضرور کسی سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ وہ ایک تصویر کے سامنے ہے یا ایک زندہ راجہ جی کے سامنے کھڑا ہے۔

اور رانی جی کا چوتھا رُوپ اِن تینوں رُوپوں سے مختلف ہے۔ وہ رُوپ ایک ایسی عورت کا ہے جو دن میں کئی سگریٹ پھونکتی ہے، چوری چھپے نہیں سب کے سامنے! اور پھر آدھی رات کے وقت جب ساری دنیا سوئی ہوئی ہوتی ہے، نیند نہ آنے کی وجہ سے ماہیٔ بے آب کی طرح پلنگ پہ پڑی پڑی کراہتی ہے اور پھر بستر سے اُٹھ کر کمرے میں چکر کاٹتی ہے اور کبھی دروازہ کھول کر باہر چھت پہ آ جاتی ہے اور آسمانوں پر کانپتے تاروں اور چاند کے داغ دار سینے کو دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی چھت کے کونے میں بیٹھ کر گھٹنوں میں سر رکھ کر روتی رہتی ہے اور اور جب یہ سب کرنے پر بھی نیند نہیں آتی تو کمرے کے دروازے بند کر کے شاہی کرسی کے ساتھ والی الماری میں سے شراب کی بوتل نکال کر گھٹ گھٹ پی جاتی ہے اور تب تپتی بُجھا کر نڈھال سی پلنگ پہ جا گرتی ہے اور تکیہ میں مُنہ چھپا کر دیر تک سِسکتی رہتی ہے اور اِس طرح روتے سِسکتے نہ جانے کب اُس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ اکثر گلی میں سے گذرتے سادھو فقیروں کو اپنا ہاتھ دکھاتی ہے اور ہر ایک سے سوال کرتی ہے۔

"کتنے دن اور جینا ہے مجھے ——— ؟"

رانی جی کا پانچواں رُوپ تیرہ چودہ برس کی پہاڑی لڑکی کا رُوپ ہے جو اپنی بھیڑ بکریوں کے پیچھے پیچھے دَوڑتی ہوئی آکاش کو چھوتے پہاڑوں پر چڑھ جاتی ہے۔ سپید بادلوں کے ٹکڑوں کو اپنی باہنوں میں بھر لیتی ہے اور اُنھیں اپنے دوپٹے میں باندھنے کی کوشش کرتی ہے اور جو سپید رنگ کے سانپوں کو دُم سے پکڑ کر ہوا میں اُچھالتی ہے ——— رانی جی جب کبھی اِس تیرہ چودہ برس کی پہاڑی لڑکی کا رُوپ اپناتی ہے تو کل کل جھرنے کی سی آواز میں کچھ اور شہد گھل جاتا ہے اور پھر ضد کرکے پرانے کانوں پہ ہاتھ رکھ کر اونچی آواز میں گانے لگتی ہے۔

اور اب میرے سامنے رانی جی کا آخری رُوپ اُبھر رہا ہے۔ اور میرے سامنے ہزاروں لاکھوں پھول ایک ساتھ کھِل اُٹھے ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سپید بادل گھِر گئے ہیں، سنگِ مرمر کے سپید محل آ کھڑے ہوئے ہیں۔ لال رنگ کی وردیاں پہنے بین بجاتے نوجوان دکھائی دینے لگے ہیں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ زندگی قوسِ قزح ہے جس کے رنگ پل پل گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ رانی جی کا یہ رُوپ مجھے اُس وقت پہچان لینا چاہئے تھا جب ایک بار میں دَور سے پرسے رات کے گیارہ بجے گھر لَوٹا تھا اور میرے کھٹکھٹانے پر دروازہ کھولنے رانی جی خود چار چھت نیچے اُتر آئی تھی اور سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے میرا جسم رانی جی کے انگوں سے بار بار چھُو گیا تھا اور جب اوپر پہنچ کر میں نے رانی جی سے کہا تھا کہ میں نے اُنھیں بہت تکلیف دی ہے تو اس نے ہلکی سی مُسکان ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے کہا تھا ——— "تکلیف کیسی ماسٹر جی ———" لیکن تب میں رانی جی کا یہ رُوپ نہیں پہچان پایا تھا اور رانی جی کا یہ رُوپ میں تب بھی نہ پہچان سکا تھا جب وہ دو چار دن کے لئے بیمار پڑ گئی تھی اور میں کچھ تو دفتر کے کام میں زیادہ مصروف رہنے سے اور کچھ اپنے دل کے ان جانے خوف کی وجہ سے اس کا حال پوچھنے کے لئے ایک ہی دو بار اس کے کمرے میں گیا تھا۔ کچھ ہی

• • • ~~~~~~ • • • ~~~~~~ • • •

- دوسروں پر کیچڑ نہ اُچھالو۔ یہ اُن پر پڑے یا نہ پڑے تمھارے ہاتھ ضرور آلودہ ہوں گے۔ (جوزف پارکر)
- لوگ اپنی کرتوتوں کو چھپانے کے لئے زہرِ ہلاہل کی بوتل پر "جوہرِ حیات" کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ (مکیلے)
- تحمل بہترین مسلک ہے۔ (وکٹر ہیوگو)
- میں چاہتا ہوں خدا کی طرف ہو جاؤں اِس لئے کہ خدائی امور ہمیشہ سچائی اور حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ (لنکن)
- سب سے پسندیدہ عبادت خلقِ خدا کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ (بنجمین فرینکلن)

• • • ~~~~~~ • • • ~~~~~~ • • •

لمحے بیٹھ کر چلا آیا تھا اور پھر ایک رات بستر میں لیٹے لیٹے میں نے سُنا تھا (رانی جی پپو سے کہہ کر شاید مجھے سُنا رہی تھی) "پپو تمہارے ماسٹر جی کتنے پتھر دل ہیں اُن کے سامنے بھلے ہی کوئی مر جائے وہ تو بات تک نہیں کرتے!"

لیکن ایک دن رانی جی کا یہ رُوپ میں نے پہچان ہی لیا!

رات کے دس بجے تھے۔ باہر بادل گرج رہے تھے۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ میں بستر پر پڑا کہانیوں کی کوئی کتاب تکیہ کے نیچے رکھ کر سونے ہی لگا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کسی نے کھول دیا۔

"سو گئے ماسٹر جی؟" رانی جی کی کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"نہیں نہیں آیئے" میں اُٹھ بیٹھا۔

"دیا سلائی نہیں مل رہی ہے۔ اپنی دیا سلائی دیجئے۔"

میں اُٹھا۔ کوٹ کی جیب سے دیا سلائی کی ڈبیہ نکال کر رانی جی کی کانپتی ہتھیلی پر رکھتے ہی لگا تھا کہ باہر زور سے بادل گرجے اور پھر نہ جانے کیا ہوا رانی جی کا سر میری چھاتی سے آ لگا۔ پھر رانی جی نے اپنا چہرہ تھوڑا سا اوپر اُٹھایا اور آنسو سے بھیگی آواز میں کہنے لگی۔

"ماسٹر جی مجھے کہیں چھپا لیجئے!" اور یہ کہہ کر وہ پل بھر میری طرف دیکھتی رہی اور پھر آندھی کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

رانی جی کا یہ رُوپ پہچان کر ایک دن میں نے رانی جی کو سُناتے ہوئے پپو سے کہا۔

"اتنے سگریٹ پھونکتی ہے تم منع کیوں نہیں کرتے پپو؟"

اُس دن کے بعد میں نے رانی جی کو سگریٹ پیتے ہوئے کبھی نہ دیکھا۔

پھر ایک صبح میں نے رانی جی سے پوچھا "آپ آدھی رات سے گئے الماری میں سے بوتل نکال کر کیا پی رہی تھیں؟"

جیسے میں نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ اس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ "کچھ بھی نہیں .... کچھ بھی تو نہیں ....." پھر میرے سامنے سوگند کھا کر کہا تھا کہ وہ نشے کے لئے نہیں دوائی کے طور پہ کبھی کبھی برانڈی پی لیا کرتی ہے۔ نیند نہ آنے کی وجہ سے چار سال پہلے ڈاکٹر نے اسے یہی علاج بتایا تھا۔ اور پھر اس نے کہا تھا کہ اگر میں پسند نہیں کرتا تو وہ اُسے اب ہاتھ نہ لگائیگی۔

رانی کا یہ رُوپ دن بدن نکھرتا چلا جا رہا تھا اور وہ میرا پیار پا کر تازہ کھلے ہوئے پھولوں کی طرح کومل ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ پہاڑی جھرنے کی طرح چنچل، پیار بھرے گیت کی طرح ست اور آکاش میں اُڑتے پنچھی کی طرح تیز بنتی جا رہی تھی۔ اس کی زندگی میں اب شاید آکاش کو چھوتے پہاڑوں پر چڑھنے اور ان پر پھیلی دودھ کی طرح سپید دُھند کو اپنی گود میں بھر لینے کے دن ایک بار پھر لوٹ آئے تھے ---!!

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ میں بستر میں لیٹا ہوں اور رانی جی کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے اور بار بار اُن کے وہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں جو آج شام اُنہوں نے مجھ سے کہے تھے --- "ماسٹر جی میں نے ایک سادھو کو ہاتھ دکھایا تھا۔ وہ کہنے لگا رانی جی آپ کے ہاتھ پر تو شادی کی دو لکیریں ہیں۔ آپ کا یہ ہاتھ تھامنے والا آپ کو جلد ہی آملے گا۔ بتاؤں میں نے کیا کہا اُس سے؟ میں نے کہا، وہ کچھ تو جھوٹ اور کچھ سچ بتا رہا ہے۔ جھوٹ یہ کہ میرا ہاتھ تھامنے والا آنے والا نہیں ---- کب کا آ چکا ہے

درسیج یہ کہ .... " اور اس کے آگے رانی جی کچھ نہ بول سکی۔ کانپتی لرزتی اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

باہر بارش ہو رہی ہے۔ بوندیں رسوئی کی ٹین کی چھت پر گر کر ایک سنگیت سا بکھیر رہی ہیں۔ میں یہ سنگیت سُن رہا ہوں اور رانی جی کے الفاظ میرے کانوں میں گونج پیدا کر رہے ہیں اور اُن کا سُندر چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہا ہے۔

میں جاگ رہا ہوں۔ رانی جی بھی کہاں سوئی ہوگی۔ میں اُس کے سپنے دیکھ رہا ہوں۔ وہ میرے سپنے دیکھ رہی ہوگی۔ آج ہم دونوں کے سپنے ایک جیسے ہیں۔ وقت کے اِس بے کنار ساگر میں مشکل ہی سے کچھ لمحے ایسے آتے ہیں جب دو روحوں کے سپنے ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ جب زندگی ایک اُمنگ، ایک دھڑکن، ایک خواہش سی بن جاتی ہے۔

اب مجھے رانی جی کی سسکیاں سُنائی دے رہی ہیں۔ رانی جی کبھی کبھی نیند میں بھی سسک اُٹھتی ہے اور اُس کی یہ سسکیاں سُن کر میرے سامنے پھنکارتا ناگ گھومنے لگتا ہے جس کے درمیان ایک بڑی چٹان پر ایک قلعہ بنا ہوا ہے اور اس قلعے کے اندر ایک دیو نے ایک راجکماری کو قید کر رکھا ہے اور اُسے اپنے راجکمار کا انتظار ہے، قید سے رہا ہونے کے لئے ....!

باہر تیز آندھی چل رہی ہے۔ میرے کمرے کے باہر روشنی نہیں ساری گلی سارا محلہ سویا ہوا ہے صرف میں جاگ رہا ہوں۔

چھن .... ن .... ن ....!

کچھ گرنے اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز اُبھری ہے۔ ہوا کا کوئی جھونکا ضرور اندر جا پہنچا ہے۔ دیو مر گیا ہے۔ کرسی کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ میری رانی تمہاری فتح ہوئی ہے۔ اب تم آزاد ہو۔ آ میرے پاس۔ آ میں تیرے گلے میں اپنے پیار کے پھولوں کی مالا پہناؤں اور تجھے اپنے آرزوؤں کے اُڑن کھٹولے پہ بٹھا کر وہاں لے چلوں جہاں تیرا اپنا گھر ہے۔

رات مر گئی ہے!

بارش تھم چکی ہے!!

دن نکل آیا ہے۔ میں بستر سے اُٹھ بیٹھا ہوں اور سوچ رہا ہوں رانی جی کے کمرے کا دروازہ کھلے اور میں اپنے پاس بُلا کر اُس سے کہہ دوں —— "کل کا سادھو اگر آج آئے تو اُس سے کہنا اُس کی دوسری بات تو جھوٹ نکلی لیکن پہلی آج سچ ہو گئی۔ آپ کا یہ ہاتھ میں تھاموں گا ——!"

رانی جی کا دروازہ کھلا ہے۔ رانی جی تو نہیں اُس کی نوکرانی باہر آئی ہے۔

"ماسٹر جی! رانی جی کی طبیعت اچھی نہیں۔ وہ ساری رات سو نہ سکیں جانے آپ کو بلا رہی ہیں۔"

رانی جی کی حالت سچ مچ ٹھیک نہیں۔ ایک ہی رات میں اُس کا پھول سا چہرہ مُرجھا گیا ہے وہ شاہی کرسی پہ بے ہوش سی پڑی ہے۔ اُس کا سر ایک طرف جھول گیا ہے۔ نیچے پاؤں کے پاس راجہ کی تصویر پڑی ہے۔ تصویر کا شیشہ چُور چُور ہو چکا ہے۔

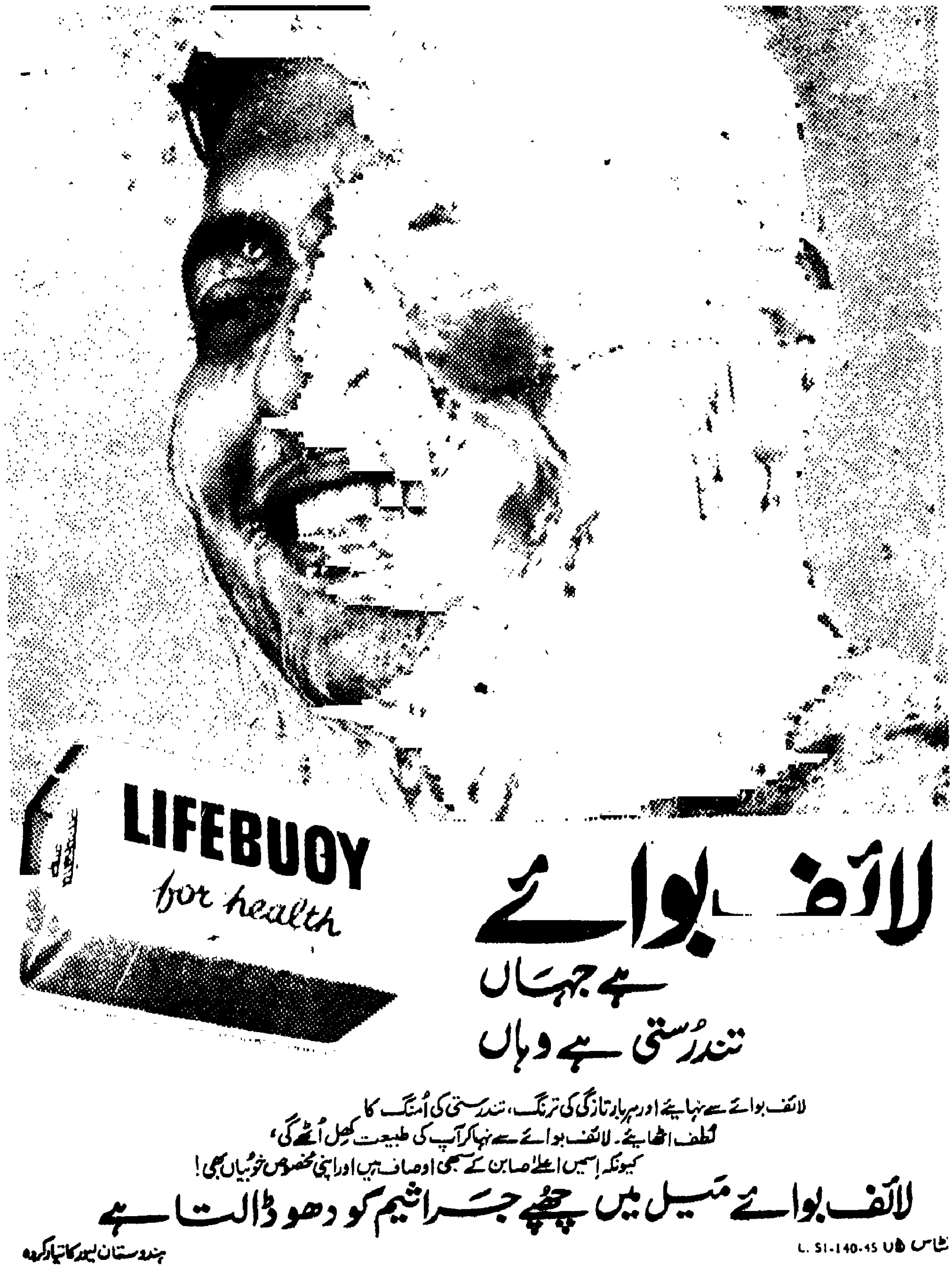
"رانی جی —— ہوش میں آیئے!"

شاید اُس نے میری آواز سُن لی ہے۔ آنکھیں کھول دی ہیں، وہ میری طرف دیکھ دیکھ کر اپنے آپ کو سنبھال رہی ہے۔ اب اچانک اُن آنکھوں میں چمک آگئی ہے، پیلے مُرجھائے گالوں پہ ہلکی سُرخی سی پھیل گئی ہے۔ اُس نے ساڑی کا آنچل ٹھیک کیا ہے اور اب تمکنت سے بیٹھ گئی ہے۔

"ماسٹر جی آپ آج ہی کوئی دوسرا مکان ڈھونڈ لیجئے۔" یہ کہہ کر اُس نے نظریں ہٹالی ہیں اور اب وہ حاکمانہ لہجے میں نوکرانی سے کہہ رہی ہے ——

"ابھی بازار جاؤ اور راجہ جی کی تصویر میں نیا شیشہ لگواؤ!"

اور یہ کہہ کر اُس نے کرسی کی پُشت سے سر جوڑ لیا ہے اور آنکھیں مُوند لی ہیں۔


LIFEBUOY
for health
لائف بوائے
ہے جہاں
تندرستی ہے وہاں
لائف بوائے سے نہایئے اور ہر بار تازگی کی ترنگ، تندرستی کی اُمنگ کا
لطف اٹھایئے۔ لائف بوائے سے نہا کر آپ کی طبیعت کھِل اُٹھے گی،
کیونکہ اِسمیں اعلےٰ صابن کے سبھی اوصاف ہیں اور اپنی مخصوص خوبیاں بھی!
لائف بوائے میل میں چھپے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے
ہندوستان لیور کا تیار کردہ
شاس L. 51-140-45 UD

غزلیں

محمد فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری بی۔ اے

دل انہیں دیکھ کے خوش حد سے سوا ہوتا ہے
یہ محبت نہیں ہوتی ہے، تو کیا ہوتا ہے

پہلے ہر بات پہ شکوؤں کا گلہ تھا اُن کو
اب شکایت نہیں ہوتی یہ گلہ ہوتا ہے

سر جھکے یا نہ جھکے چشمِ نظارہ جھک جائے
وہ بھی سجدہ ہے جو نظروں سے ادا ہوتا ہے

دل سے دلِ یوں کبھی ملتا ہے نظر ملتے ہی
جیسے پہلے سے کہیں ربط رہا ہوتا ہے

تُو نے تدبیر کا لکھا بھی پڑھا ہے کہ نہیں؟
وہ تو سب سچ ہے، جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے

میری منزل ہے ستاروں سے بہت دور کہیں
چاند تو ایک نشانِ کفِ پا ہوتا ہے

بھول جائیں گے سب احباب و اعزا فیاضؔ
کیوں گھڑی بھر کے لئے حشر بپا ہوتا ہے!

چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

وہ دل کشی وہ رونقِ بام و در گئی
تم کیا گئے کہ رونقِ شام و سحر گئی

چشمِ کرم کی خیر، عجب کام کر گئی
بے رنگیٔ حیات میں سو رنگ بھر گئی

میں انتظار ہی میں رہا اور زندگی
چپ چاپ میرے پاس سے ہو کر گزر گئی

اشکوں کی بوند بار کی تصویر دیکھ کر
اوراقِ گُل پہ صورتِ شبنم بکھر گئی

عہدِ وفائے دوست ہو یا انتظارِ دوست
ہر بات اعتبار کی حد سے گذر گئی

اتنا تو میری آہ کا ردِ عمل ہوا
اُن کی جبیں پہ ایک شکن سی اُبھر گئی

جوہرؔ نہ پوچھ عمرِ گریزاں کی سرگذشت
جس طرح بھی گذر گئی آخر گذر گئی

ڈاکٹر مخدوم اشرف اشرفؔ

چمن میں ہر لبِ گُل پر ہے گفتگو تیری
نسیمِ صبح لئے پھر رہی ہے بُو تیری

نگاہ اُٹھ نہ سکی حسنِ ماسوا کی طرف
رہی خیال میں تصویرِ رُوبرُو تیری

دمِ اخیر کچھ اِس طرح تیری یاد آئی
نظر میں کھنچ گئی تصویر ہُو بہُو تیری

خطائیں کرتا ہوں سہواً کبھی اور قصداً بھی
سُنا ہے جب سے خطا بخشا ہے خُو تیری

کبھی حرم میں پکارا کبھی کلیسا میں
رہی ہے ساتھ بہر حال جستجُو تیری

یہ سوچتا ہوں کہ پھر زندگی کہاں ہوگی؟
نکل گئی کبھی دل سے جو آرزُو تیری

گلوں پہ جان نہ دے کس لئے بھلا اشرفؔ
کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بُو تیری



میری بھارت یاترا

فکر تونسوی

ہندوستان کی راجدھانی کا نام دہلی ہے ——— اِسے کس نے بسایا، کب بسایا اور کیوں بسایا؟ اِس کے متعلق مورخین میں اختلاف رائے ہے۔ ہندوستان کے ہر شہری کو اختلاف رائے کا شوق ہے اور جب اِن کا اختلاف رائے اُس منزل پر جا پہنچتا ہے، جب فریقین ایک دوسرے کی گردن پر تلوار رکھ دیتے ہیں تو ایک دم دونوں ہنس پڑتے ہیں۔ . . "ہی ہی ہی! معلوم ہوتا ہے، میں آپ سے مذاق کر رہا ہوں۔"

"بلکہ مجھے یہ شک تھا کہ میں آپ سے مذاق کر رہا تھا۔"

"تو پھر آیئے، دونوں ایک دوسرے کی گردن میں تلواروں کی بجائے باہیں ڈال لیں اور ساتھ بیٹھ کر فوٹو کھنچوائیں۔"

اختلاف رائے کے باوجود ہر ہندوستانی مورخ باہوں میں باہیں ڈالے، اِس بات پر متفق ہو چکا ہے کہ دہلی ہی ہندوستان کی راجدھانی ہے اور اِس سے زیادہ معقول اور حسین راجدھانی ہندوستان کے نصیب میں لکھی ہی نہیں جا سکتی تھی!

مگر مجھے یہ راجدھانی انتہائی نامعقول نظر آئی۔ اِس کی وجہ میری اپنی نامعقولیت بھی ہو سکتی ہے اور ہندوستانیوں کی بھی۔

میں دہلی کے جس گیسٹ ہاؤس میں قیام پذیر ہوا، اُس کی لینڈ لیڈی ایک بیوہ تھی۔ اُس کے پڑوسیوں کا بیان ہے کہ اُس کا خاوند جناردھن گپتا اپنی بیوی کے خلاف تپسیا کرنے کے لئے ہمالیہ کی طرف چلا گیا تھا اور ایک پہاڑی گپھا میں آج بھی موجود ہے۔ لیکن لینڈ لیڈی پربیتا گپتا نے مجھے بتایا کہ میرے پڑوسی میرے خاوند کی بجائے میرے گیسٹ ہاؤس سے حسد کرتے ہیں بلکہ کئی ایک تو مجھ سے شادی کر کے میرے گیسٹ ہاؤس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جناردھن گپتا جو نہ جانے ہمالیہ کی طرف بھاگ گیا ہے یا گنگا جی میں ڈوب مرا ہے، مجھے دل و جان سے پیار کرتا تھا، ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے، شادی کے قائل نہ تھے اور اِسی بنگلے میں عاشق اور محبوبہ کی طرح ساتھ رہتے تھے، بالکل اُسی طرح جیسے گیسٹ ہاؤس میں دو گیسٹ رہتے ہیں۔ مگر لوگ باگ ہمیں میاں بیوی ہی سمجھتے تھے اور ہم لوگوں کی اِس بات کا بُرا نہیں مانتے تھے۔

"لیکن یہ بات تو بُری ہی تھی پربیتا صاحبہ!" میں نے کہا۔

"نہیں، بُرائی من میں ہوتی ہے اور ہم دونوں کے من گنگا جل کی طرح پوتر تھے۔ میں آج پچاس برس کی عمر میں بھی ایک پوتر کنواری ہوں!"

"مگر جناردھن صاحب بھاگ گئے یا انتقال فرما گئے؟"

یہ سُنتے ہی پربیتا گپتا کی دائیں آنکھ میں ایک موٹا سا آنسو اُبھرا (بائیں آنکھ بالکل کنواری رہی) اور بولی: "وہ اچانک ایک رات کو گوتم بدھ کی طرح نروان کی تلاش میں نکل گئے۔ اب نہ جانے اُنھیں زندگی سے نروان پراپت ہو چکا ہے یا ابھی نروان کی کسی درمیانی منزل میں بھٹک رہے ہیں۔ لیکن لوگ مجھے اُس کی بیوہ کہہ کر اپنی تسکین کر لیتے ہیں اور مجھے یہ بات بھی بُری نہیں لگتی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ ہم ہندوستانی لوگ بڑے صلح پسند واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً میرے بیوہ ہونے پر اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتی ہوں کہ میں بیوہ بھی ہوں اور بیوہ نہیں بھی ہوں۔"

میں نے مسکرا کر کہا "پربیتا جی! آپ میں اور دہلی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یعنی دہلی اور آپ دونوں بیوہ بھی ہیں اور بیوہ نہیں بھی ہیں!"

لیکن لینڈ لیڈی نے میرے اِس مزاحیہ تیج کو یوں اُڑا دیا، جیسے کوئی ہاتھ سے مکھی اُڑا دے۔ بہت سنجیدگی سے بلکہ اُس سنجیدگی میں ایک ٹھنڈی سانس کا اضافہ کر کے بولی "ہاں، بات یہ ہے کہ ہم ہندوستانی عورتیں جس مرد کو من ہی من میں اپنا خاوند تسلیم کر لیں اُس کے ساتھ چاہے شادی کریں یا نہ کریں مگر وہ ہمارا خاوند ہی گنا جاتا ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں تو یہ عقیدہ ہے

لہر بیوی جنم جنمانتر سے ایک ہی خاوند کی بیوی بنتی چلی آئی ہے۔ جنا ردھن نہ جانے کتنے جنموں سے میرا ہی خاوند چلا آ رہا تھا اور اب اگلے جنم میں بھی وہی میرا خاوند بنے گا۔"

"اِس کا مطلب ہے، آپ کے کسی پڑوسی کا کوئی چانس نہیں۔ جو خاوند بن کر آپ کی جائداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں؟"

اِس مرتبہ پریتا گپتا کو میرا یہ پنچ پسند آگیا اور وہ خوش ہو کر میرے لئے دودھ کی بنی ہوئی میٹھی برفی کی ایک پلیٹ بھر کر لے آئی اور مجھ سے وعدہ کیا کہ اِس برفی کی قیمت وہ میرے بل میں شامل نہ کرے گی۔

اور دوسری صبح میں نے فیصلہ کیا کہ راجدھانی دہلی کی سیر کی جائے۔ تاکہ میں اِس کی نامعقولیت اور اپنی نامعقولیت دونوں کا موازنہ کر سکوں۔

گیسٹ ہاؤس سے نکل کر میں نے ایک ٹیکسی والے کو آواز دی اور کہا۔

"چلو، مجھے قطب مینار لے چلو!"

ٹیکسی ڈرائیور ایک سکھ جنٹلمین تھا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں نے لفظ جنٹلمین کا استعمال غلط آدمی پر کیا ہے۔ کیونکہ ڈرائیور نے کہا "میری ٹیکسی کا میٹر خراب ہے، اِس لئے قطب مینار تک جانے کا ٹھیکہ کر لو۔"

میں نے کہا "تم اپنا میٹر ٹھیک کئے بغیر سڑک پر ٹیکسی کیوں چلا رہے ہو۔ یہ تو جرم ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور طیش میں آگیا۔ ہندوستان کے لوگ جب جرم کرتے ہیں تو اپنے آپ کو مجرم کہلانا پسند نہیں کرتے، طیش میں آجانا پسند کرتے ہیں۔ وہ آنکھیں نکال کر بولا "جرم کے بچے! ایک گھونسہ دوں گا، دانت توڑ دوں گا!"

میں نے عرض کیا "مگر سردار جی! میں نے تو سُنا تھا کہ ہندوستانی لوگ اہنسا کے قائل ہیں۔ تمھارے ایک ہندوستانی شاستر میں بھی یہی لکھا تھا۔"

اُس نے اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک چھُرا نکالا اور کہا "شاستروں میں ٹیکسی ڈرائیوروں کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ بلکہ اِس چھرے کا ذِکر آیا ہے۔"

اِس لئے میں نے اُس کی ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرنے کا ارادہ فوراً ترک کر دیا اور اُس سے معافی مانگ لی جو اُس نے دے دی اور پھر چھُرا سیٹ کے اندر دوبارہ چھُپاتے ہوئے قہقہہ لگا کر بولا "بادشاہو! آپ تو خواہ مخواہ ڈر گئے۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ بیٹھ جاؤ ٹیکسی میں۔ میں آپ کو قطب مینار تک لے جاؤں گا اور مجھے تم ایک پیسہ بھی نہ دینا۔ جی میں آئے تو میرا انعام دے دینا۔ آپ ہمارے بدیشی مہمان ہیں اور ہم ہندوستانی گھر آئے مہمان کی عزّت کرتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ ٹیکسی میں۔"

"مگر چھُرا...؟" میں نے ہنس کر کہا۔

اُس نے چھُرا نکال کر مجھے دے دیا اور کہا "اِسے اپنے پاس رکھ لو۔ انعام دیتے وقت یہ چھُرا مجھے لوٹا دینا۔"

مجھے اُس ٹیکسی ڈرائیور کی یہ بہادرانہ سپرٹ پسند آگئی لیکن تعجّب بھی ہوا کہ یہ ہندوستانی عجیب لوگ ہیں۔ قانون شکنی کرتے ہیں تو بھی نہیں ڈرتے، اجنبی کو قتل کی دھمکی دیتے ہیں تو بھی نہیں ڈرتے، دُشمن کے ہاتھوں میں اپنا چھُرا دے دیتے ہیں تو بھی نہیں ڈرتے! میٹر کی اُجرت کی بجائے انعام کے پیسے مانگتے ہیں تو بھی نہیں شرماتے ہِنسا اور اہنسا دونوں کو ایک دوسرے میں اِس طرح گڈمڈ کر دیتے ہیں کہ دونوں بیک وقت بیوہ بھی معلوم ہوتی ہیں اور سہاگن بھی!

آدھے راستے میں جا کر ٹیکسی کے انجن میں نقص پیدا ہو گیا جو آدھے گھنٹے تک دُور نہ ہو سکا تو ٹیکسی ڈرائیور نے ایک اور ٹیکسی ڈرائیور کو پہلے ایک گالی دی اور پھر اُس گالی کو تبسّم میں بدلتے ہوئے آواز دے کر روک لیا اور کہا "اِس بدیشی مہمان کو قطب مینار تک لے جاؤ اور خبردار! اِسے راستے میں کوئی گزند پہنچا تو تمھارے دانت توڑ دوں گا!"

میں نے پہلے ٹیکسی ڈرائیور کو چھُرا اور دس روپے دے دئے اور اُس نے دونوں چیزوں کو انعام سمجھ کر قبول کر لیا اور میں دوسری ٹیکسی پر سوار ہو کر قطب مینار پہنچ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے

اپنا کرایہ اور ایک سگریٹ وصول کیا اور پوچھا "صاحب! کیا آپ واپس بھی چلیں گے؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کئی لوگ قطب مینار پر خودکشی کرنے کے لئے آتے ہیں اس لئے واپس نہیں جا سکتے۔ اگر آپ کا ارادہ بھی کچھ اِس قسم کا ہو تو میں کسی اور سواری کو بٹھا کر شہر لوٹ جاؤں۔"

ہندوستان کے ٹیکسی ڈرائیور بڑے ہنس مکھ اور لطیفہ باز ہوتے ہیں۔ مجھے اُس ٹیکسی ڈرائیور کی یہ ادا بہت پسند آئی اور اُسے ایک اور سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا "خودکشی کرنے کے لئے ہمارے اپنے مُلک میں زیادہ سائنٹیفک طریقے ایجاد ہو چکے ہیں اور یوں بھی خودکشی اپنے ہی مُلک میں کرنی چاہیئے کیونکہ دیش بھگتی کا یہی تقاضا ہے۔ اِس لئے تم چلے جاؤ۔"

اور پھر جونہی میں قطب مینار کے مین گیٹ میں داخل ہوا ایک بھینگی آنکھ والے گائیڈ نے طوطے کی طرح رٹے ہوئے فقرے دُہراتے ہوئے کہا "صاحب! آپ کو گائیڈ چاہیئے؟ قطب مینار کس نے بنایا تھا؟ اِس کی سیڑھیاں کتنی ہیں؟ اِس کے کتنے بُرج ہیں؟ سب سے اوپر والا بُرج کیوں نامکمل رہ گیا ہے؟ اشوک کی لاٹ کا فولاد کتنا وزنی ہے؟ یہاں کی دھوپ گھڑی کو بنے ہوئے کتنے ہزار سال گزر گئے اور وہ کتنے ہزار سال تک صحیح وقت دیتی رہے گی...؟ سب کچھ بتاؤں گا، میں خاندانی گائیڈ ہوں صاحب! میرے پردادا جان نے شہنشاہ جارج پنجم کو قطب مینار دکھانے کے لئے گائیڈ گیا تھا، میرے دادا جان نے مہاتما گاندھی کو گائیڈ..."

یہ عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ دُنیا کے ہر تاریخی مقام پر جو گائیڈ ہوتے ہیں، اُن سب کا لب ولہجہ ایک جیسا ہوتا ہے، سبھی طوطے ہوتے ہیں میں نے اُسے بتایا کہ میرے پاس قطب مینار کے متعلق ایک کتابچہ موجود ہے، جو میں نے ایک روپے میں خریدا ہے جس میں اُس سے زیادہ معلومات درج ہیں جو تمہارے دادا جان کو معلوم تھیں اور شہنشاہ جارج پنجم تو ایک اَن پڑھ آدمی تھا اِس لئے اُسے گائیڈ کی ضرورت تھی۔ لیکن تمہارے پردادا اور شہنشاہ جارج پنجم کے بعد تعلیم عام ہو گئی، کتابیں چھپنے لگیں، پرنٹنگ سستی ہو گئی۔ اِس لئے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم گائیڈ کی بجائے قطب مینار کے باہر ایک ٹی سٹال کھول لو۔ ورنہ کتابوں کی سیل کے بھروسے رہو گے تو تم بھوکوں مر جاؤ گے۔"

اور گائیڈ نے میری طرف یوں حقارت اور غصّے سے دیکھا، جیسے میں نے اُسے قطب مینار پر سے دھکّا دے کر نیچے گرا دیا ہو۔ ہندوستانی لوگ اپنے خاندانی پیشے کی توہین برداشت نہیں کر سکتے، چاہے بھوکوں مر جائیں۔ مجھے لکھنؤ شہر کے ایک آدمی نے بتایا تھا کہ وہاں ایک خاندانی رئیس بھیک مانگنے کے لئے اپنے خاندانی ہاتھی پر اپنا قدیم ترین خاندانی لباس پہن کر سوار کرتا تھا۔ جیسا کہ تھا اُن کا خاندانی پیشہ رہا تھا۔ ... ہاتھی کی سواری اُس کی خاندانی روایت تھی اور وہ اُس روایت کو ہر قیمت پر قائم رکھے ہوئے تھا۔ نتیجے کے طور پر ہاتھی اور رئیس دونوں بھوکوں مرتے تھے۔

اور پھر میں نے ہندوستان کے اِس بھُوکے سفید ہاتھی یعنی گائیڈ کی مدد کے بغیر قطب مینار کی سیر کی۔ میں نے وہاں کئی نئے شادی شدہ جوڑے دیکھے جو خودکشی کے لئے نہیں آئے تھے کیونکہ وہاں سرکاری قانون کے مطابق خودکشی کے لئے تین افراد کا ایک ساتھ مینار کی سیڑھیوں پر چڑھنا اور خودکشی کرنا ضروری ہے۔ لیکن شادی شدہ جوڑے ابھی صرف دو افراد پر مشتمل تھے۔ قانون کے خیال میں دو افراد بالخصوص میاں بیوی یا عاشق و محبوب مشترکہ خودکشی پر تو متفق ہو سکتے ہیں لیکن تیسرا آدمی ہمیشہ سدِّ راہ بن جاتا ہے۔ ہندوستان میں قانون بنانے والے ہمیشہ تیسرے آدمی کے بل بوتے پر زندہ رہتے ہیں۔

میں نے ایک شادی شُدہ جوڑے سے درخواست کی کہ آپ مجھے اپنا ماموں، چچا، سُسر کچھ بھی سمجھ کر قطب مینار کے اوپر اپنے ساتھ لے چلیں۔ پہلے تو اُنھوں نے انکار کر دیا۔ لیکن جب میں نے اُنھیں ہندوستانی رواداری یاد دلائی، تو اُنھیں یاد آ گئی اور میں اُن کے ساتھ قطب مینار کی سب سے اوپر کی منزل پر چڑھ گیا۔

مجھے قطب مینار میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ اِس کے سوا کہ یہ اونچا ہے۔ لیکن صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کہ انسان اِتنی اونچی عمارت بھی بنا سکتا ہے، ہندوستانیوں نے سالہا سال کی محنت اور روپیہ برباد کر دیا۔ اِسی طرح کی حماقتیں دوسرے ممالک میں بھی ہوتی ہیں۔ ہندوستان بھی اِس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ حماقتیں بنی نوعِ انسان کا قدرتی خاصہ ہیں۔ اِس اعتبار سے ہندوستانی لوگ بھی بنی نوعِ انسان ہیں۔

کہتے ہیں جس راجہ نے یا بادشاہ نے یہ قطب مینار بنایا تھا اُس کا مقصد صرف اِتنا تھا کہ مینار کی سب سے اوپر کی منزل پر اُس کی بیگمات بیٹھ کر دریائے جمنا کو دیکھ سکیں اور اُسے دُور سے نمسکار کر سکیں۔ میرا خیال ہے، اگر وہ ہر صبح اپنی بگھی پر سوار ہو کر دریائے جمنا تک پہنچ جایا کرتیں تو اُس سے ایک تو اُن کی صبح کی سیر ہو جاتی اور دوسرے دریائے جمنا کے درشن زیادہ نزدیک سے کر سکتیں۔ صرف ایک دریا کا پانی دیکھنے کے لئے کروڑوں روپے ضائع کر دینا بادشاہی شان تو ہو سکتی ہے لیکن دانشمندی نہیں ہو سکتی۔

اور میں نے دریائے جمنا کو بھی دیکھا ہے۔ ہندوستانی اُسے مقدّس ندی کہتے ہیں۔ مگر مجھے تو اُس دریا میں کوئی خاص کشش اور خوبصورتی دکھائی نہیں دی۔ اُس کا پانی بیحد گندا ہے۔ اُسے پینے سے عقل اور ایمان دونوں جسم سے نکل جاتے ہیں۔

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو خط وکتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶" لکھنا کافی ہے۔ منیجر

جیتا سمندر ساگر نیر بھریا تیتے اوگن ہمارے

دیا کرو کچھ مہر اپاؤ ڈبدے پتھر تارے

گورونانک

جیڑا اگن برابر تپنے بھیتر وگے کاتی

پرن وت نانک حکم پچھانے سُکھ ہووے دن راتی

گورونانک

دھنونتا اِو ہی کہے اوری دھن کو جاؤ

نانک نردھن تِت دن جت دن وسرے ناؤ

گورونانک

جے رت لگے کپڑے جاما ہوئے پلیت

جو رت پیوے مانسا تن کیو نرمل چیت

گورونانک

کیا کھاوے کیا پیدھے ہوئے

جا من ناہی سچا سوئے

گورونانک

سو کیوں مندا آکھیے

ـــ بـــ ر ب ن

گورونانک

سماج کی الگ الگ جماعتوں کو نیکی اور پاک زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے گورونانک دیوجی فرماتے ہیں:-

کسانوں کے تئیں

من حالی کرسانی کرنی سرم پانی تن کھیت

نام بیج سنتوکھ سُہاگہ رکھ غریبی دیس

بھاؤ کرم کر جم سی سے گھر بھاگٹھ دیکھ

دُکاندار بھائیوں کے لئے

ہار ہٹ کر آرجا سچ نام کر وتھ

سُرت سوچ کر بھانڈسال تس وچ تس نوں رکھ

ونجاریا سو ونج کرلے لاہا من ہس

تاجروں کے لئے

سُن ساست سوداگری ست گھوڑے لے چل

خرچ بن چنگاریاں مت من جانہے کل

نرنکار کے دیس جاہ تاں سُکھ لہہ محل

ملازمین کے لئے

لائے چِت کر چاکری من نام کر کم

بن بدیاں کر دھاوناں تاں کو آکھے دھن

نانک ویکھے ندر کر چڑھے چوگن ون

جاری کردہ:-

محکمۂ تعلقاتِ عامہ پنجاب

انتساب

تقی حسین خسرو

آندھرا پردیش ہاؤزنگ بورڈ "گرہالکیا" مکرم جاہی روڈ، حیدرآباد۔ اے پی
محترم و مکرم خوشتر گرامی صاحب!

دو بار "بیسویں صدی" میں اشاعت کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ ایک بار ۶۴ء میں اور ایک بار ۶۶ء میں —— اِس بار ایک بہت ہی مختصر افسانہ 'اِنتساب' لے کر حاضر ہو رہا ہوں اور آپ کی حوصلہ افزائی سے متوقع ہوں کہ ایک بار پھر مجھے "بیسویں صدی" میں اشاعت کا شرف حاصل ہو جائے گا —— جون میں دہلی جانے کا موقع ملا تھا۔ لیکن وہاں قیام کچھ اِتنا مختصر رہا کہ آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کی آرزو دل ہی دل میں لئے لَوٹ آیا ....

نیازمند ———— تقی حسین خسرو

★

"سب ہی لکھنے والے اپنی تصنیف کو کسی نہ کسی کے نام منسوب کرتے ... تم اپنی اِس کتاب کا انتساب کس کے نام لکھو گے؟" اُس نے اپنے ... سے سوال کیا۔

پچھلے چھ سات مہینوں کی عرق ریزی کے بعد اُس نے یہ کتاب مکمل کی ... ابھی ابھی اُس نے مسودے کے نیچے 'ختم شد' لکھ کر اپنے دستخط کئے تھے۔

وہ اِنسانیت کا پرستار تھا۔ انسانیت اُس کا مذہب۔ انسانیت اُسکی ... کی تھی۔ جذبۂ انسانیت اُس کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم اور محترم جذبہ ... اُس نے سوچا وہ اپنی اِس کتاب کا انتساب انسانیت کے نام لکھے گا۔ ... انتساب میں کتنی وسعت ہوگی۔ اِنسانیت چاہے افریقہ کی نیم تہذیب ... قوموں میں ہو یا ہمالیہ کی نیم تاریک گھپاؤں میں۔ چاہے وہ مغرب کی ... کی ترقی یافتہ سوسائٹی میں ملے یا مشرق کی پسماندہ توہم پرست برادری ... اُس کی یہ کتاب ملک و قوم کی حدوں اور رنگ و نسل کے اِمتیاز سے ... انسانیت کے نام منسوب ہوگی۔ کتنا عظیم ہوگا یہ انتساب!

لیکن اُس نے سوچا، اپنی عظمت اور وسعت کے باوجود کیا یہ اِنتساب واضح نہ ہوگا؟ کیا اِس اِنتساب سے ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ مصنّف نے ... کے منسوب کرنے میں جان بوجھ کر پہلوتہی سے کام لیا ہو؟ کیا اِنتساب سیدھا سادہ اور زیادہ واضح نہیں ہو سکتا؟ کیا یہ انتساب کسی ایک فرد کے نام نہیں ہو سکتا؟ کسی ایک فرد کے نام! جس نے اِس کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہو۔ اِس اُبلتی ہوئی انسانی آبادی میں ایک فرد لاکھ غیر اہم سہی، اتنا غیر اہم بھی نہیں ہے۔ ایک فرد کا وجود اپنی اَن گنت کوتاہیوں خامیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے بظاہر بہت ہی بے حقیقت اور ناقابلِ اعتنا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہم اِس کی بُنیادی اہمیت سے انکار بھی نہیں کر سکتے۔ یہی ایک فرد اپنی ساری کمزوریوں، خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود مرکزِ دُنیا ہی نہیں مرکزِ کائنات ہے۔ ہم اِس بات سے چاہے جتنا انکار کریں، لیکن ہم میں سے ہر ایک شعوری یا لاشعوری طور پر اِس بات کا نہ صرف قائل ہوتا ہے بلکہ اپنے ہر فعل سے اِس کا عملی ثبوت بھی دیتا ہے۔

اب اُس نے پلٹ کر اپنے ماضی کی طرف نظر کی۔ اُسے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اہم شخصیت کی تلاش تھی۔

وہ شاید ابھی ڈھائی برس کا تھا کہ اُس کے باپ نے اِس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ اُس نے کبھی کسی کو بابا، ابا، پپا یا ڈیڈی کہہ کر نہیں بلایا۔ اُس کی زندگی کے ابتدائی سال اُس کی ماں کے شفیق سائے میں گزرے۔ اُن دِنوں وہ اپنی ماں کے سوا کسی اور کو نہیں پہچانتا تھا۔ جب اُسے ذرا ہوش آیا اور وہ

جیتا سُمند ساگر نیر بھریا تیتے اوگن ہمارے
دیا کرو کچھ مہر اپاؤ ڈُبدے پتھر تارے

گورونانک

جیڑا اگن برابر تپنے بھیتر وگے کاتی
پرن وت نانک حکم پچھانے سُکھ ہووے دن راتی

گورونانک

دھنونتا اِو ہی کہے اوری دھن کو جاؤ
نانک نِردھن تِت دن جِت دن وِسرے ناؤ

گورونانک

جے رَت لگے کپڑے جاما ہوئے پلیت
جو رَت پیوے نانکا تِن کیو نِرمل چیت

گورونانک

کیا کھادے کیا پیدھے ہوئے
جا من ناہی سچا سوئے

گورونانک

سو کیو مندا آکھیئے
جِت جمے راجان

گورونانک

سماج کی الگ الگ جماعتوں کو سچی اور پاک زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے گورونانک دیوجی فرماتے ہیں:۔

کسانوں کے تئیں

من ہالی کرسانی کرنی سرم پانی تن کھیت
نام بیج سنتوکھ سہاگہ رکھ غریبی دیس
بھاؤ کرم کر جمسی سے گھر بھاگٹھ دیکھ

دکاندار بھائیوں کے لئے

ہاں ہٹ کر آرجا سچ نام کر وتھ
سُرت سوچ کر بھانڈسال تس وچ تس نوں رکھ
ونجاریا سو ونج کرلے لاہا من ہس

تاجروں کے لئے

سُن ساست سوداگری ست گھوڑے لے چل
خرچ بن چنگاریاں مت من جانہے کل
نِرنکار کے دیس جاہ تاں سکھ لہہ محل

ملازمین کے لئے

لائے چِت کر چاکری من نام کر کم
بن بدیاں کر دھاونی تاں کو آکھے دھن
نانک ویکھے ندر کر چڑھے چوگن ون

جاری کردہ:۔

محکمہ تعلقات عامہ پنجاب

انتساب

تقی حسین خسرو

آندھرا پردیش ہاؤزنگ بورڈ "گرہالپا" مکرم جاہی روڈ، حیدرآباد۔ اے پی

محترم ومکرم خوشتر گرامی صاحب!

دوبار "بیسویں صدی" میں اشاعت کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ ایک بار ۱۹۶۴ء میں اور ایک بار ۱۹۶۶ء میں ——— اس بار ایک بہت ہی مختصر افسانہ "انتساب" لے کر حاضر ہو رہا ہوں اور آپ کی حوصلہ افزائی سے متوقع ہوں کہ ایک بار پھر مجھے "بیسویں صدی" میں اشاعت کا شرف حاصل ہو جائے گا —— جون میں دہلی جانے کا موقع ملا تھا۔ لیکن وہاں قیام کچھ اتنا مختصر رہا کہ آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کی آرزو دل ہی دل میں لئے لوٹ آیا ....

نیازمند ——— تقی حسین خسرو

★

سب ہی لکھنے والے اپنی تصنیف کو کسی نہ کسی کے نام منسوب کرتے ہیں۔ تم اپنی اِس کتاب کا انتساب کس کے نام لکھو گے؟" اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

پچھلے چھ سات مہینوں کی عرق ریزی کے بعد اُس نے یہ کتاب مکمل کی تھی۔ ابھی ابھی اُس نے مسودے کے نیچے "ختم شد" لکھ کر اپنے دستخط کئے تھے۔

وہ انسانیت کا پرستار تھا۔ انسانیت اُس کا مذہب۔ انسانیت اُسکی زندگی تھی۔ جذبۂ انسانیت اُس کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم اور محترم جذبہ تھا۔ اُس نے سوچا وہ اپنی اِس کتاب کا انتساب انسانیت کے نام لکھے گا۔ اِس انتساب میں کتنی وسعت ہوگی۔ انسانیت چاہے افریقہ کی نیم تہذیب یافتہ قوموں میں ہو یا ہمالیہ کی نیم تاریک گھپاؤں میں۔ چاہے وہ مغرب کی انتہائی ترقی یافتہ سوسائٹی میں ملے یا مشرق کی پسماندہ توہم پرست برادری میں۔ اُس کی یہ کتاب ملک وقوم کی حدود اور رنگ ونسل کے امتیاز سے بلند انسانیت کے نام منسوب ہوگی۔ کتنا عظیم ہوگا یہ انتساب!

لیکن اُس نے سوچا اپنی عظمت اور وسعت کے باوجود کیا یہ انتساب غیر واضح نہ ہوگا؟ کیا اس انتساب سے ایسا نہیں محسوس ہوتا کہ مصنف نے کتاب کے منسوب کرنے میں جان بوجھ کر پہلو تہی سے کام لیا ہو؟ کیا انتساب سیدھا سادہ اور زیادہ واضح نہیں ہو سکتا؟ کیا یہ انتساب کسی ایک فرد کے نام نہیں ہو سکتا؟ کسی ایک فرد کے نام! جس نے اِس کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہو۔ اِس اُبلتی ہوئی انسانی آبادی میں ایک فرد لاکھ غیر اہم سہی، اتنا غیر اہم بھی نہیں ہے۔ ایک فرد کا وجود اپنی اَن گنت کوتاہیوں خامیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے بظاہر بہت ہی بے حقیقت اور ناقابلِ اعتنا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہم اِس کی بُنیادی اہمیت سے انکار بھی نہیں کر سکتے۔ یہی ایک فرد اپنی ساری کمزوریوں، خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود مرکزِ دُنیا ہی نہیں مرکزِ کائنات ہے۔ ہم اِس بات سے چاہے جتنا انکار کریں، لیکن ہم میں سے ہر ایک شعوری یا لاشعوری طور پر اِس بات کا نہ صرف قائل ہوتا ہے بلکہ اپنے ہر فعل سے اِس کا عملی ثبوت بھی دیتا ہے۔

اب اُس نے پلٹ کر اپنے ماضی کی طرف نظر کی۔ اُسے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اہم شخصیت کی تلاش تھی۔

وہ شاید ابھی ڈھائی برس کا تھا کہ اُس کے باپ نے اِس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ اُس نے کبھی کسی کو بابا، ابا، پپا یا ڈیڈی کہہ کر نہیں بلایا۔ اُس کی زندگی کے ابتدائی سال اُس کی ماں کے شفیق سائے میں گزرے۔ اُن دنوں وہ اپنی ماں کے سوا کسی اور کو نہیں پہچانتا تھا۔ جب اُسے ذرا ہوش آیا اور

اسکول جانے لگا تو اُسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ اُس کی ماں دوسروں سے کتنی مختلف ہے۔ اُس وقت کا وہ احساس اُسے آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ دوسرے لوگ کتنے غیر متعلق اور کتنے بے رحم ہوتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے اتنے غیر متعلق اور بے زار رہتے ہیں؟ یہ ہم میں، میں اور تم کا فرق کب اور کیسے پیدا ہوا؟ کیا اِس کی وجہ ہماری کثیر آبادی ہے؟ کیا اِس کی وجہ ہماری انفرادی ضرورتیں ہیں؟ کیا اِس کی وجہ ہمارے تھکے ہوئے دماغ، دُکھے ہوئے دل اور کراہتے ہوئے جسم ہیں کہ ہم اپنے آپ کو کبھی نہیں بھول سکتے اور ہمارے ہر فعل میں شعوری یا لاشعوری طور پہ ہمارے پیشِ نظر محض اپنی بھلائی ہوتی ہے۔ ہمارے دوسروں سے تعلقات بھی ظاہر ہے کہ ہمارے اِسی نظریئے کے پابند ہوتے ہیں لیکن ماں اِس دنیا میں وہ واحد ہستی ہے جو اِس انسانی کمزوری سے اپنی اولاد کے حق میں قطعی مستثنیٰ اور بلند ہے۔

حصولِ تعلیم کے زمانے میں اُس نے بڑے ہی تپتے ہوئے دن دیکھے تھے۔ اُن کی گزر بسر کا واحد ذریعہ اُس کی ماں کا قلیل وظیفہ تھا۔ لیکن اُس کی ماں ہمیشہ ہی یہ کوشش کرتی تھی کہ زمانے کی بے رحم کھلا دینے والی دھوپ اُس تک نہ پہنچنے پائے۔ وہ ہمیشہ ہی کسی سایہ دار درخت کی طرح اس پہ سایہ کیے رہتی۔ اُس کی ماں نے اُسے بڑا کر دیا تھا اور نہ صرف بڑا کر دیا تھا بلکہ پڑھا لکھا کر انسان بھی بنا دیا تھا۔ ڈھونڈنے سے اُسے نوکری بھی مل گئی تھی اور اب اُن کے اچھے دن آ گئے تھے۔ اُس نے سوچا، اُس کا وجود اُس کی زندگی، اُس کی تعلیم اور اُس کا سب کچھ، اُس کی ماں کی شفقتوں اور مہربانیوں کا مرہونِ منت ہے۔ کیا وہ اپنی اِس کتاب کا انتساب اپنی ماں کے نام لکھے؟ کتنا پاکیزہ اور مقدس ہوگا یہ انتساب! یہ انتساب ایک ایسی ہستی کے نام ہوگا جس کا ہر متنفس پہ ایک عظیم احسان ہوتا ہے۔ اِتنا عظیم اِحسان کسی کا کسی پر نہیں ہوتا۔ لیکن کیا ایسا کرنا بے ادبی کے مترادف نہ ہوگا؟ ایک ایسی کتاب کا انتساب ماں کے نام جس میں ساری اُوٹ پٹانگ باتیں لکھی گئی ہوں۔ نہیں نہیں وہ ایسی بے ادبی کبھی نہیں کر سکتا!

اب اُسے وہ لڑکی یاد آئی اور ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا جیسے نظر میں پھول کھِل اُٹھے ہوں اور دل میں شمعیں جل گئی ہوں۔ وہ خواب والی لڑکی جسے اُس نے دس سال پہلے خواب میں دیکھا تھا اور پھر دس سال سے وہ مسلسل اُس کے خوابوں میں آ رہی تھی۔ اُس نے پہلی بار جب اُس لڑکی کو خواب

دیکھا تھا تو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اُس کے اُس خیالی پیکر میں
ڈال دی ہو جس کو اس نے بڑے پیار سے تراشا تھا۔ کہتے ہیں کہ مجسمہ
سازی میں یورپ کے شہرہ آفاق سنگتراش مائیکل آنجلو کا ثانی نہیں پیدا ہوا۔
لیکن اگر وہ کبھی اس کے تراشے ہوئے اس خیالی پیکر کو خواب میں دیکھ لیتا تو اپنے
بنائے ہوئے سارے مجسمے توڑ ڈالتا اور پھر آئندہ مجسمہ سازی سے توبہ کر لیتا۔
بقول فیض۔

"تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی"

اب تو وہ اُس لڑکی سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ اُس کے بغیر اُس کے لئے زندگی کا تصور ہی ناممکن تھا۔ وہ کبھی ہمیشہ اُس کی دلجوئی کا خیال رکھتی اور ہمیشہ ہی نیند کی چوکھٹ پر آ سے اُس کی منتظر ملتی۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رات بھر گھومتے رہتے۔ وہ جب تک اُس کے ساتھ رہتا اپنے ساتھ کی گئی ساری ناانصافیوں کو بھولا رہتا۔ کبھی کبھی تو وہ ایسا محسوس کرتا جیسے وہ لڑکی اُس کی ساری محرومیوں کا بدل ہو۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتا کہ رات کبھی ختم نہ ہو۔ لیکن گریزاں رات روایتی شبِ وصل کی طرح مختصر ثابت ہوتی اور وہ دن بھر کے لئے اپنے مسیحا سے دور کر دیا جاتا۔ کبھی غالب کے لئے "صبح کرنا شام کا" جوئے شیر لانے کے برابر تھا اور آج اُس کے لئے "شام کرنا صبح کا" جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

اُس نے کرسی پہ بیٹھے بیٹھے پلٹ کر دیکھا۔ اُس کی بیوی انجم اور اُس کے چھ بچے سوئے ہوئے تھے۔ دس سال پہلے انجم سے اُس کی شادی ہوئی تھی اور اب اُن کے چھ بچے تھے۔ لیکن آج بھی اُسے اِس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ انجم اُس کی بیوی ہے۔ اُس کے بچوں کی ماں ہے۔ اُس کے دُکھ کو بانٹتی ہے۔ اُس کی خوشیوں کو ہزار گنا بڑھا دیتی ہے۔ اُسے یہ سب خواب کی باتیں معلوم ہوتیں اور وہ یہ سوچ سوچ کر گھبرا اُٹھتا کہ نہیں معلوم کب وہ اِس خواب سے جاگ جائے۔ وہ اپنے آپ کو جھنجھوڑ ڈالتا اور یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ یہ سب کچھ خواب نہیں حقیقت ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو جتنا سمجھاتا اُس کی بے یقینی اُتنی ہی بڑھتی جاتی۔ اُسے یقین نہیں آتا کہ زندگی اُس کے حق میں اِتنی مہربان بھی ہو سکتی ہے!

اُس نے ایک بار پھر انجم کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہی نور و شمع وہی تراشے ہوئے خط و خال، وہی خیالی پیکر۔ اُسے یکبارگی ایسا محسوس ہوا جیسے انجم مسکرا رہی ہو اور جیسے وہ اُس سے آہستہ آہستہ کہہ رہی ہو "میں تمہاری ہوں صرف تمہاری! تمہاری بیوی تمہارے بچوں کی ماں! یہ سب کچھ حقیقت ہے"

اُس نے اپنی کتاب کا اِنتساب لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا۔ دوسرے ہی لمحہ سفید کاغذ پر جیسے یہ الفاظ چمک اُٹھے ہوں: "انجم کے نام"

غزلیں

سید نظر برنی ایم۔ اے

چشمِ کرم ہے اُن کی مگر بے رُخی کے ساتھ
اِک کھیل ہو رہا ہے مری زندگی کے ساتھ

رُسوا نہ کر سکے گا زمانہ اُسے کبھی
دل میں چھپا لیا ہے ترا غم خوشی کے ساتھ

مانا کہ تُو نے ہم کو فراموش کر دیا
وابستگی رہے گی ترے نام ہی کے ساتھ

کیونکر نہ آئے وعدۂ فردا پہ اعتبار
اقرار وہ بھی اُن کا بڑی سادگی کے ساتھ

ہے یاد تیری، دردِ محبت کا اِک علاج
ہوتا ہے درد اب بھی مگر کچھ کمی کے ساتھ

ناحق غمِ حیات سے گھبرا گئے نظرؔ
دنیا میں مشکلیں ہیں ہر اِک آدمی کے ساتھ

ایم۔ایچ۔ دیپکؔ شکوہ آبادی ایم۔اے

کھِلتے ہوئے چہروں پر ہنستی ہوئی رعنائی
سہبا ہے کہ شیشوں میں لیتی ہوئی انگڑائی

جب یاد کوئی آیا ہر شے سے نقاب اُٹھا
دامن پہ خیالوں کے تصویر اُبھر آئی

رِستے ہوئے زخموں نے پھر تازہ لہو تھوکا
کچھ ایسی چلی غم میں ڈوبی ہوئی پُروائی

ہنس ہنس کے چھپاتا ہوں میں اپنے ہر اک غم کو
افسانے بنا لیگی دنیا ہے تماشائی

یوں یاد کوئی آیا ماضی کے دھندلکوں میں
ہو دور کہیں جیسے بجتی ہوئی شہنائی

آنے دو اندھیروں کو آئیں تو مقابل میں
ہر دور میں دیپکؔ نے ظلمت پہ وجے پائی

مسعودہ حیات ایم۔اے، بی ایڈ

نہ ہو جو رنگِ جفا پر وہ شرمسار نہیں
ہمارا دل بھی وفاؤں کو بیقرار نہیں

طلسمِ ذوقِ محبت نہیں تو پھر کیا ہے
کہ اُن کی طرزِ ستم دل کو ناگوار نہیں

نوازشیں ہیں یہ تیرے حسیں تصوّر کی
کہ دردِ ہجر کا عالم بھی ناگوار نہیں

زمانے بھر کے دکھوں کو گلے لگایا ہے
یہ حوصلہ ہے کہ ہم پھر بھی دلفگار نہیں

زمانے بھر کے لیے ہم شریکِ غم ہیں حیاتؔ
بھرے جہاں میں کوئی اپنا غمگسار نہیں

دِلّی کا خط لندن کے نام

خوشتر گرامی

مائی ڈیر لندن!

آج صبح ہی صبح مجھے آپ کی یاد نے ستایا اور قاصد کے آتے آتے ایک خط اور لکھ رکھوں کے مصداق میں کاغذ قلم دوات مہیا کر کے بیٹھ گئی ——— اور سوچا کہ کچھ آپ بیتی اور کچھ جگ بیتی ضبطِ تحریر میں لاؤں۔

اِتنے میں اخبار والا آواز لگاتا اخبار پھینک کر چلتا بنا۔ اخبار اُٹھایا تو پہلی ہی نظر جس خبر پر پڑی اُس کو پڑھتے ہی بے ساختہ زبان سے نکلا ؏

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ذہن کچھ دوسرے تانے بانوں میں لگا تھا کہ اِس خبر نے دل و دماغ کی چولیں ہلا ڈالیں۔ خبر آپ کے پڑوس کی ہے ——— یعنی آپ کے دوست نیو یارک کی۔ وہاں ایک ماڈرن آرٹس میوزیم ہے جس میں آرٹس کے نمونے دیکھنے کے شائقین چلتے پھرتے اور آرٹ کے زندہ نمونے دیکھ کر حیرت میں رہ گئے ——— یہ آٹھ نمونے تھے۔ اِن میں سے دو مردانے تھے اور چھ زنانے ——— یہ لوگ سنگِ مرمر اور پتھر کی مُورتیوں کے درمیان مادر زاد برہنہ گھوم رہے تھے۔

تحقیقات پر پتہ چلا کہ یہ لوگ مظاہرین تھے اور آٹھوں اِس بات پر پروٹسٹ کر رہے تھے کہ میوزیم میں کوئی جِدّت نہیں ——— گویا اِس طرح سے اُنھوں نے میوزیم میں جِدّت پیدا کی تھی۔

پولیس نے اِن انوکھے مظاہرین کو گرفتار کرنے میں "بڑی پریشانی" محسوس کی۔ بہر نوع نصف گھنٹے کی جدّوجہد اور دلیل بازی کے بعد پولیس اِن لوگوں کو کپڑے پہنانے کی ترغیب دینے میں کامیاب ہو سکی۔

ڈیر!

مظاہرے تو ہمارے یہاں بھی بہت ہوتے ہیں اور شاید دُنیا میں سب سے زیادہ ہوتے ہیں اور میرے سینے پر تو اب ہر روز ہی مظاہرین دندناتے رہتے ہیں۔ اِس لئے مظاہرے کی خبر میرے لئے کوئی انوکھی خبر نہیں۔ مگر یہ تو مظاہرہ بھی انوکھا تھا اور مظاہرین بھی انوکھے اور اُن کا مطالبہ بھی انوکھا اور دلچسپ۔

میں ڈرتی ہوں کہ یہاں کے لوگوں پر مظاہرے کی اِس انوکھی تیکنیک کا کیا اثر ہوگا جو یہاں مظاہرے کے لئے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اِس مظاہرے کی خبر پڑھ کر ؏

اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

اور میرا یہ اندیشہ بے سبب بھی نہیں۔ آپ کے یہاں سے جو ہوائیں آتی ہیں وہ اپنے ساتھ بہت سے جراثیم لے کر آتی ہیں اور اِدھر چھوڑتی گُزر جاتی ہیں۔ اب سرِعام بوس و کنار خصوصاً فلموں میں بوسہ بازی اور عریاں مناظر اور ننگوں کے کلب ——— یہ آپ ہی کے پاس پڑوس کی وبائیں تو ہیں جنھیں ہندوستانی فلموں میں اپنانے کی سفارش کی گئی ہے ——— بعض حلقوں کی طرف سے اِس کو ایک قدرتی تقاضہ اور فلموں کو نیچرل بنانے کے بہانے ہندوستانی فلموں میں بوس و کنار کے مناظر کی اجازت دینے کے لئے کہا جا رہا تھا۔ چنانچہ حکومتِ ہند نے اِس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کھوسلہ کمیٹی مقرر کر دی۔ اب اُس کی سفارشات آگئی ہیں۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے ——— "اگر کہانی کو پیش کرنے کے لئے دو کردار والہانہ انداز میں ایک دوسرے کو چومتے ہیں یا کوئی کردار سکرین پر ننگا دکھایا جاتا ہے تو ایسے شاٹ کو فلم سے نکالنے کا سوال پیدا نہیں ہونا چاہیے بشرطیکہ یہ شاٹ منطقی نقطۂ نظر کا حامل ہو اور کہانی کا ایک ضروری اور متعلقہ جُزو ہو۔"

میں سمجھتی ہوں کمیٹی نے بہت چالاکی سے کام لیا ہے۔ اِس نے براہِ راست ذمّہ داری بھی نہیں لی کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ اُس نے بوس و کنار کی اجازت دے دی ہے اور انکار بھی نہیں کیا کہ کوئی کمیٹی پر کٹھ ملّا اور دقیانوسی ہونے کا الزام لگا سکے۔

بہر حال اب فلموں میں علانیہ بوسہ بازی کی اجازت تو مل گئی ؎

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

ان سفارشات نے بحث مباحثے کا ایک دروازہ کھول دیا ہے۔ ہمارے یہاں کے ایکٹروں نے اس کی حمایت کی ہے اور ایکٹریسوں نے اس کی مخالفت۔ اسی طرح دلّی یونیورسٹی میں بھی تقسیم آرا ہوئی ہے۔ کچھ لڑکے تو کھلم کھلا اس کے حامی ہیں۔ کچھ نے اگر مگر کے ساتھ اس کی حمایت کی ہے اور کچھ نے مخالفت کی۔ لیکن لڑکیوں نے واضح الفاظ میں مخالفت کی ہے ــــ ایک منچلے نے دلّی یونیورسٹی میں پہنچ کر اس کا سروے کیا ہے۔ اُس نے لڑکے لڑکیوں دونوں سے سوال پوچھے ہیں۔ لڑکیوں نے عام طور پر فلموں میں ننگے مناظر کی مخالفت کی ہے۔ ایک لڑکی نے جو اگرچہ خود تہذیبِ جدید کا نمونہ تھی بیان دیتے ہوئے کہا کہ "یہ ہماری تہذیب اور تمدّن کے خلاف ہے۔"

اس پر سرویر نے کہا: "یہ نئی تہذیب ہے۔"

لڑکی نے غضبناک ہو کر جواب دیا ؎

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

ایک دوسری لڑکی پاس کھڑی ہوئی بولی: "یہ مشرقی تہذیب نہیں، مغرب کی نقّالی ہوگی۔"

ایک اور لڑکی نے گویا یہی طنز کیا ؎

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے

واں کنٹر سب بلّوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

لڑکوں میں ساٹھ فیصدی تو مخالف تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ ہندوستانی فلموں میں بوس و کنار کے مناظر دیکھنا پسند نہیں کرتے مگر پچیس فیصدی طلبہ نے ایسے مناظر کی حمایت کی۔ باقی پندرہ فیصدی نے کہا کہ ہندوستانی فلموں میں ایسے مناظر رکھنے میں کوئی ہرج نہیں بشرطیکہ یہ فلمیں صرف بالغوں کے لئے ہوں۔ ایک لڑکے نے موجودہ فلموں کو ہدفِ ملامت بناتے ہوئے کہا کہ اگر ہم عام ہندوستانی فلموں میں جنسی اشتعال کے مناظر پیش کر سکتے ہیں جو بوسوں کے مناظر سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں تو ہم اسکرین پر بوس و کنار کے مناظر کیوں مروّج نہیں کر سکتے؟

ایک فلمی ہیرو نما نوجوان نے سگریٹ منہ میں دبائے اور ریز عم خود راجکپور کے انداز میں بڑے طمطراق سے کہا: "میں غیر ملکی فلمیں خصوصاً جیمز بانڈ کی فلمیں دیکھنا پسند کرتا ہوں جن کے بوس و کنار کے مناظر قینچی کی زد سے آزاد ہیں۔"

ایک اور صاحبزادے نے فرمایا: "اگر ہماری حکومت غیر ملکی فلموں کے اس طرح کے مناظر پر پابندی نہیں لگا سکتی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ہندوستانی فلموں پر اس سلسلہ میں کیوں پابندی عائد کرتی ہے" ــــ اُس نے اپنی بات میں مزید وزن پیدا کرنے کی کوشش کی: "یہی وجہ ہے کہ اکثر نوجوان غیر ملکی فلمیں دیکھتے ہیں۔"

بات بوس و کنار اور برہنگی کی تھی ــــ لیجئے اب ذرا تھوں اپنے پڑوسیوں اور دوستوں کی عریانیت پرستی کا حال بھی سن لیجئے ــــ میکسیکو کے ایک چوراہے پر شکار کی دیوی ڈائنا کا ایک برہنہ بُت نصب تھا۔ حال ہی میں اسے مرمّت کی غرض سے بنیاد پر سے ہٹایا گیا تو وہاں ہنگامے برپا ہو گئے۔ ایک طبقہ تو یہ چاہتا تھا کہ اسے کپڑے پہنا دئے جائیں ــــ لیکن اس کے مدّاح پہلے بھی اس بات سے نالاں تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ڈائنا کو جو ہلکے سے کپڑے پہنائے گئے تھے وہ بھی بالکل اُتار دئے جائیں۔ دوسری طرف ایسے لوگوں کی بھی ایک خاصی تعداد تھی جو چاہتی تھی کہ ڈائنا کو لباس پہنا دیا جائے۔ چنانچہ اس کی مزید ستر پوشی کی گئی تو وہاں فسادات بھڑک اُٹھے ... آخر میں جیت عریانیت پسندوں ہی کی ہوئی۔

ان خبروں سے میرا دل دہلا جا رہا ہے اور سوچ رہی ہوں کہ اگر یہاں بھی یہ وبا پھیل گئی تو کیا ہوگا۔

ڈیر لندن!

زندہ دلانِ مغرب کا کیا کہنا۔ وہاں تو اب ڈاکوؤں کے نام پر سڑکوں کے نام رکھے جانے لگے ہیں۔ اُن کی یاد کو زندۂ جاوید بنایا جانے لگا ہے۔ یقین نہیں ہماری مدھیہ پردیش کی سرکار جس کے صوبے میں اگست کے مہینے میں ۲۱ ڈاکو ہلاک ہوئے ہیں اِس خبر کو پڑھ کر کیا فیصلہ کرے گی کہ ہرٹ فورڈ شائر کے ایک باعزّت گھرانے سے تعلق رکھنے والی حسینہ کیتھلین کی یادگار قائم کرنے کے لئے حکومت کو لکھا گیا ہے کہ جس مکان میں کیتھلین رہتی تھی اُس مکان تک پہنچنے والی سڑک کا نام کیتھلین روڈ رکھا جائے اور اس کے مکان کا نام کیتھلین پیلس ــــ حکومت نے اِس تجویز کو فوراً منظور کر لیا ــــ یہ عورت اٹھارہ برس کی عمر میں ڈاکو بن گئی تھی اور سنسان سڑکوں پر ڈاکے مارتی تھی اور لوگوں کو لوٹتی تھی۔ آخر کار گولی مار کر اُسے ہلاک کر دیا گیا تھا۔

یہ ہیں لیل و نہار تہذیبِ جدید اور اس کے پرستاروں کے۔ بس اللہ ہی حافظ ہے۔

میں ہوں آپ کی

دلّی

("ایشیا" ویکلی برمنگھم لندن کے شکریہ کے ساتھ)

ناردرن ریلوے

نئی گاڑیاں جو جاری کی گئیں

یکم اکتوبر 1969ء سے دو نئی گاڑیاں چیتک ایکسپریس (روزانہ) دہلی سرائے روہیلہ اور اودے پور کے درمیان۔ اور اُتکل ایکسپریس (ہفتہ میں دو بار) نئی دہلی اور بھونیشور/پوری براستہ بینا کٹنی۔ بلاسپور جاری کی جائیں گی 211/11 اپ اور 12/ 212 ڈاؤن۔ جے پور سری گنگا نگر ایکسپریس، جے پور، سری گنگا نگر کے درمیان ایکسپریس سروس مہیا کرے گی۔ اور 235 اپ/ 236 ڈاؤن کی بجائے جے پور ہنومان گڑھ پر چلا کریں گی۔

گاڑیاں جن کا رُخ تبدیل کیا گیا/منسوخ کردی گئیں/تقسیم کردی گئیں

گاڑیاں نمبر 81 اپ/ 82 ڈاؤن اے۔ سی ایکسپریس براستہ الہ آباد/جنگھئی/ وارانسی چلا کریں گی۔ 5 ڈاؤن/ 37 اپ پنجاب میل براستہ دہلی چلے گی۔ 51 اپ/ 52 ڈاؤن سیالدہ، پٹھانکوٹ ایکسپریس براستہ جالندھر کینٹ چلے گی۔ کورڈ (CHORD) جالندھر سٹی کو چھوئے بغیر 59 اپ/ 60 ڈاؤن سری نگر ایکسپریس براستہ جالندھر سٹی چلا کرے گی۔ 49 اپ/ 50 ڈاؤن ہوڑہ۔ سلطان پور ایکسپریس/پسنجر جون پور پر ختم ہو جائے گی۔ 107 ڈاؤن/ 108 اپ جھانسی۔ سلطان پور پسنجر لکھنؤ پر اور 1 ایف ٹی ڈی/ 2 ایف ٹی ڈی دہلی فرخ آباد پسنجر ٹونڈلہ پر ختم کردی جائے گی۔ پسنجر کوچز بذریعہ 71 اپ/ 72 ڈاؤن اور 73 اپ/ 74 ڈاؤن پارسل ایکسپریس گاڑیاں جو منسلک تھے۔ دہلی اور مغلسرائے۔ سہارنپور سیکشن پر بالترتیب چل رہی ہیں، واپس لے لی گئی ہیں۔

351 اپ/ 352 ڈاؤن سہارنپور اور لکھنؤ کے درمیان چلیں گی۔ اور آن وارڈ جیسا کہ نمبر 1 اے ایل/ 2 اے ایل مابین لکھنؤ اور الہ آباد بمعہ کنکشن لکھنؤ پر 375 اپ/ 376 ڈاؤن دہلی اور بریلی کے درمیان اور آن وارڈ چلیں گی۔ جیسا کہ 377 اپ/ 378 ڈاؤن مابین بریلی اور الہ آباد بمعہ کنکشن بریلی پر۔ 2 اے ایل جے امرتسر اور لدھیانہ کے درمیان چلیں گی۔ اور ان کا نیا نمبر نہ اے جے ایل ہوگا۔ اور آن وارڈ 6 ایل جے لدھیانہ جا کمل سیکشن پر لدھیانہ کے کنکشن کے ساتھ۔ امرتسر اور ہوشیار پور کے درمیان اِس وقت چل رہی ہے۔ 2 اے ایچ اب امرتسر اور جالندھر سٹی کے درمیان 4 جے ایچ اب امرتسر اور جالندھر سٹی کے درمیان 4 جے اے کے طور پر اور آن وارڈ 14 جے ایچ۔ جالندھر سٹی اور ہوشیار پور کے درمیان

جالندھر سٹی لنکنگ کے ساتھ چلے گی۔ 1 اے ایچ ہوشیار پور۔ امرتسر جالندھر سٹی پر ختم ہوجائے گی اور 349 دہرہ دون۔ امرتسر پسنجر اس کے راستہ پر جالندھر سٹی اور امرتسر چلے گی۔ 1 اے ٹی ایف/ 2 اے ٹی ایف جو اس وقت آگرہ کینٹ اور فرخ آباد کے درمیان چل رہی ہے، اب آگرہ کینٹ اور شکوہ آباد کے درمیان 1 ایس ٹی اے/ 2 ایس ٹی اے اور آن وارڈ بطور 3 ایس ایف/ 4 ایس ایف کے طور پر شکوہ آباد اور فرخ آباد کے درمیان بمعہ لنکنگ شکوہ آباد پر چلیں گی۔

تھرڈ کوچز جو جاری کی گئی ہیں

ایک کمپوزٹ فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ کلاس بوگیاں نئی دہلی اور پونا کے درمیان اور ایک 2 ٹائر سلیپر کوچ اور تھرڈ کلاس بوگی نئی دہلی اور بھوپال کے درمیان بذریعہ 57 اپ/ 58 ڈاؤن امرتسر ایکسپریس ایک تھرڈ کلاس کوچ جو جھانسی اور بھوساول کے درمیان چل رہی ہے۔ 57 اپ/ 58 ڈاؤن امرتسر ایکسپریس نئی دہلی تک بڑھا دی گئی ہے۔ ایک کمپوزٹ فرسٹ اور تھرڈ کلاس کوچ فرخ آباد اور دہلی کے درمیان بذریعہ 1 ٹی ایف/ 83 اور 2/ 84 ٹی ایف۔ ایک فرسٹ کلاس اور ایک 2 ٹائر تھرڈ کلاس بوگی نئی دہلی اور بلاسپور کے درمیان بذریعہ 77/ 78 ہفتہ میں دو بار اُتکل ایکسپریس۔ تین تھرڈ کلاس کوچز نئی دہلی اور ہردوار کے درمیان بذریعہ 19 اپ/ 20 ڈاؤن دہرہ دون ایکسپریس۔ ایک فرسٹ، ایک تھرڈ، ایک 3 ٹائر سلیپر اور ایک کمپوزٹ تھرڈ اور اٹیچ بذریعہ 215/216 چیتک ایکسپریس دہلی سرائے روہیلہ اور رکھنڈوا کے درمیان۔

تھرڈ کوچز جو واپس لے لی گئی ہیں

ایک کمپوزٹ فرسٹ اور تھرڈ کلاس بوگی دہلی اور بریلی کے درمیان بذریعہ 376 ڈاؤن/ 375 اپ۔ ایک تھرڈ کلاس 2 ٹائر سلیپر کوچ اور ایک آرڈنری تھرڈ کلاس کوچ جو ہفتہ میں دو بار دہلی اور وارانسی کے درمیان چل رہی ہے بذریعہ 6 ایم ڈی/ 66 ڈاؤن/ 62 ڈاؤن۔ 61 اپ/ 65 اپ/ 1 ایم ڈی۔ ایک تھرڈ کلاس بوگی دہلی اور دہرہ دون کے درمیان بذریعہ 19 اپ/ 20 ڈاؤن۔ ایک کمپوزٹ فرسٹ کلاس اور تھرڈ کلاس بوگی جو دہلی اور [illegible] جائے گی جبکہ ہفتہ میں دو [illegible] کے درمیان [illegible] پور کے درمیان بذریعہ [illegible] دہلی اور کھنڈوا کے درمیان بذریعہ [illegible]

[illegible] رشید روشن

[illegible] ڈ وقت ٹھوڑ رہے۔

صحت و زندگی

۱• ٹنڈے ـــــ ایک مفید سبزی

یہ ایک خوش ذائقہ مفید سبزی ہے۔ اس کا مزاج سرد تر ہے۔ ماہرین اس پر متفق ہیں کہ ٹنڈے میں کافی غذائی اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اس میں پروٹین، چکنائی، نشاستہ، شکر، چونا، فاسفورس اور فولاد پایا جاتا ہے۔

دوائی اعتبار سے بھی ٹنڈے بہت سے فوائد کے حامل ہیں۔ دماغی کام کرنے والوں کو یہ سبزی خاص طور پر استعمال کرنی چاہیئے۔ اطبا کی رائے میں ٹنڈا دل کے لئے مخصوص غذا ہے۔ خفقان اور اختلاج کے مریضوں کے لئے بھی بہت اچھی غذا ہے۔

ٹنڈے قبض کشا اور زود ہضم ہیں۔ بلڈ پریشر کے مریضوں کے لئے بہت اچھی غذا ہیں۔ خشک کھانسی، پیشاب کی جلن، گرمی کے بخار میں مفید ہیں۔ نزلہ، زکام، کھانسی اور صفراوی مزاج والوں کے لئے مضر ہیں۔ سیاہ مرچ، الائچی اور سیاہ زیرہ ڈال کر پکانے سے ہر مزاج والوں کو موافق آجاتے ہیں۔

۲• انسان کی سب سے بڑی دولت

عام طور پر لوگ دولت و ثروت کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ "ہمارے خیالات ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ اگر ہم اپنے خیالات پر قابو پا سکیں تو اپنے حالات پر بھی پورا پورا قابو حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری سب سے بڑی دولت انداز فکر ہے۔ اگر ہمارا انداز فکر مثبت ہے، اگر ہم دولت، امارت کے انداز میں سوچتے ہیں تو ہمیں یہی چیزیں ملتی ہیں لیکن اگر ہم اس کے برعکس غربت و عسرت، مفلسی، فاقہ کشی کے متعلق سوچتے ہیں تو فاقہ کشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حقیقتیں

خود اعتمادی سے محروم انسان زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا سامنا کرنے سے کتراتا ہے، لیکن زندگی کی تلخ حقیقتیں اس سے نہیں کتراتیں۔ اس لیے اگر آپ زندگی کی بازی گاہ میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے کبھی نہ کترائیے۔ اُن کا مردانہ وار مقابلہ کیجیئے ـــــ مشہور مفکر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے ـــــ "زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا کسی طرح کی عذر خواہی اور خود فریبی کے بغیر سامنا کرنے کی صلاحیت انسان میں اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب محکم رجحان غالب ہو۔ یہ محکم اور ٹھوس رجحان تمام ایسی توقعات، سارے ایسے احساسات کو جو ناکامیوں، نامرادیوں، شکست خوردگیوں کو جنم دیتے ہیں ختم کر دیتا ہے۔"

۴• افکار سے بچیئے

انسان کی صحت اور سکون کو تباہ کرنے کے لئے فکر اور پریشانی سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ـــــ مشہور مفکر سی۔ ٹی۔ ڈوکان نے لکھا ہے ـــــ "موجودہ زندگی میں بہت سے المناک حادثوں کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کا دماغ مسلسل اس کی قوت ارادی کو شکست دیتا چلا جاتا ہے۔ ہر وقت کی فکرمندی اسی کا نتیجہ ہے۔ جو شخص ہر مناسب و نامناسب بات پر فکر کرنے کا عادی ہو جاتا ہے وہ غیر منظم دماغ کی کمزور قوت ارادی پر فتح کی ایک دردناک مثال پیش کرتا ہے۔ اس کی سزا بُری طرح بھگتنی پڑتی ہے۔ ناخوشی، نیند کا اُچاٹ ہو جانا۔ ذہن اور جسم کے بعض حصوں کا نکما ہو جانا اسی کا نتیجہ ہیں۔ کبھی کبھی تو آدمی خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس قوت ارادی یا حکمراں طاقت یا روح کو اپنے دماغ کو اپنے دماغ کا فاتح بنانے کا انعام کوئی چھپی ہوئی حقیقت نہیں ہے۔ تربیت یافتہ دماغ تربیت یافتہ جسم کی طرح صحت، دولت اور خوشی سے زندگی کا دامن بھر دیتا ہے۔"

۵• قدرت کے خزانے سے فائدہ اُٹھائیے

غربت و افلاس کے شکار لوگ قسمت کو کوستے ہیں۔ قدرت

جالندھر سٹی کنکشن کے ساتھ چلے گی۔ 1 ایل ای ہوشیار پور۔ امرتسر جالندھر سٹی پر ختم ہو جائے گی اور 349 دہرہ دون۔ امرتسر پسنجر اس کے راستہ پر جالندھر سٹی اور امرتسر چلے گی۔ 1 اے ٹی ایف/ 2 اے ٹی ایف جو اس وقت آگرہ کینٹ اور فرخ آباد کے درمیان چل رہی ہے، اب آگرہ کینٹ اور شکوہ آباد کے درمیان 1 ایس ٹی اے/ 2 ایس ٹی اے اور آن وارڈ بطور 3 ایس ایف/ 4 ایس ایف کے طور پر شکوہ آباد اور فرخ آباد کے درمیان بمہ کنکشن شکوہ آباد پر چلیں گی۔

تھرو کوچز جو جاری کی گئی ہیں

ایک کمپوزٹ فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ کلاس بوگیاں نئی دہلی اور پونا کے درمیان اور ایک 2 ٹائر سلیپر کوچ اور تھرڈ کلاس بوگی نئی دہلی اور بھوپال کے درمیان بذریعہ 57 اپ/ 58 ڈاؤن امرتسر ایکسپریس ایک تھرڈ کلاس کوچ جو جھانسی اور بھوساول کے درمیان چل رہی ہے۔ 57 اپ/ 58 ڈاؤن امرتسر ایکسپریس نئی دہلی تک بڑھا دی گئی ہے۔ ایک کمپوزٹ فرسٹ اور تھرڈ کلاس کوچ فرخ آباد اور دہلی کے درمیان بذریعہ 1 ٹی ایف/ 83 اور 2/ 84 ٹی ایف۔ ایک فرسٹ کلاس اور ایک 2 ٹائر تھرڈ کلاس بوگی نئی دہلی اور بلاسپور کے درمیان بذریعہ 77/ 78 ہفتہ میں دو بار اٹکل ایکسپریس۔ تین تھرڈ کلاس کوچز نئی دہلی اور ہردوار کے درمیان بذریعہ 19 اپ/ 20 ڈاؤن دہرہ دون ایکسپریس۔ ایک فرسٹ، ایک تھرڈ، ایک 3 ٹائر سلیپر اور ایک کمپوزٹ تھرڈ اور اپنج بذریعہ 215/216 چیتک ایکسپریس دہلی سرائے روہیلہ اور کھنڈوا کے درمیان۔

تھرو کوچز جو واپس لے لی گئی ہیں

ایک کمپوزٹ فرسٹ اور تھرڈ کلاس بوگی دہلی اور بریلی کے درمیان بذریعہ 376 ڈاؤن/ 375 اپ۔ ایک تھرڈ کلاس 2 ٹائر سلیپر کوچ اور ایک آرڈنری تھرڈ کلاس کوچ جو ہفتہ میں دو بار دہلی اور وارانسی کے درمیان چل رہی ہے بذریعہ 6 ایم ڈی/ 66 ڈاؤن/ 62 ڈاؤن۔ 61 اپ/ 65 اپ/ 1 ایم ڈی۔ ایک تھرڈ کلاس بوگی دہلی اور دہرہ دون کے درمیان بذریعہ 19 اپ/ 20 ڈاؤن۔ ایک کمپوزٹ فرسٹ کلاس اور تھرڈ کلاس بوگی جو دہلی اور بھونیشور کے درمیان چل رہی ہے۔ بذریعہ 64/ 63 طوفان ایکسپریس ان ایام پر واپس لے لی جائے گی جبکہ ہفتہ میں دو بار اٹکل ایکسپریس چلا کرے گی۔ ایک کمپوزٹ فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ کلاس بوگی دہلی اور اودے پور کے درمیان بذریعہ 203 اپ/ 204 ڈاؤن (ڈبلیو آر 3 اپ/ 4 ڈاؤن) ایک تھرڈ کلاس بوگی دہلی اور کھنڈوا کے درمیان بذریعہ 203 اپ/ 204 ڈاؤن (ڈبلیو آر 3 اپ/ 4 ڈاؤن)

دیگر تفصیلات کے لئے نیا ٹائم ٹیبل دیکھئے جو ریلوے بکنگ/ ریزرویشن/ انکوائری آفس اور اہم اسٹیشنوں کے بک اسٹالوں پر برائے فروخت موجود ہے۔

R.O.91

صحت و زندگی

۱ • ٹنڈے ــــ ایک مفید سبزی

یہ ایک خوش ذائقہ مفید سبزی ہے۔ اِس کا مزاج سرد تر ہے۔ ماہرین اِس پر متفق ہیں کہ ٹنڈے میں کافی غذائی اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اِس میں پروٹین، چکنائی، نشاستہ، شکر، چونا، فاسفورس اور فولاد پایا جاتا ہے۔

دوائی اعتبار سے بھی ٹنڈے بہت سے فوائد کے حامل ہیں۔ دماغی کام کرنے والوں کو یہ سبزی خاص طور پر استعمال کرنی چاہیئے۔ اطبا کی رائے میں ٹنڈا دل کے لئے مخصوص غذا ہے۔ خفقان اور اختلاج کے مریضوں کے لئے بھی بہت اچھی غذا ہے۔

ٹنڈے قبض کشا اور زود ہضم ہیں۔ بلڈ پریشر کے مریضوں کے لئے بہت اچھی غذا ہیں۔ خشک کھانسی، پیشاب کی جلن، گرمی کے بخار میں مفید ہیں۔ نزلہ، زکام، کھانسی اور صفراوی مزاج والوں کے لئے مُضر ہیں۔ سیاہ مرچ، الائچی اور سیاہ زیرہ ڈال کر پکانے سے ہر مزاج والوں کو موافق آجاتے ہیں۔

۲ • انسان کی سب سے بڑی دولت

عام طور پر لوگ دولت و ثروت کو اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــ "ہمارے خیالات ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ اگر ہم اپنے خیالات پر قابو پا سکیں تو ہم اپنے حالات پر بھی پُورا پُورا قابو حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری سب سے بڑی دولت ہمارا اندازِ فکر ہے۔ اگر ہمارا اندازِ فکر مثبت ہے، اگر ہم دولت، امارت اور کامیابی کے انداز میں سوچتے ہیں تو ہمیں یہی چیزیں ملتی ہیں لیکن اگر ہم اِس کے برعکس، اِس کے برخلاف غربت و عسرت، مفلسی، فاقہ کشی کے متعلق سوچتے ہیں تو غربت و عسرت میں مبتلا ہو کر فاقہ کشی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۳ • زندگی کی ٹھوس حقیقتیں

خود اعتمادی سے محروم انسان زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا سامنا کرنے سے کتراتا ہے، لیکن زندگی کی تلخ حقیقتیں اُس سے نہیں کتراتیں۔ اِس لیے اگر آپ زندگی کی بازی گاہ میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے کبھی نہ کترایئے۔ اُن کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے ــــ مشہور مفکّر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے ــــ "زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا کسی طرح کی عذر خواہی اور خود فریبی کے بغیر سامنا کرنے کی صلاحیت انسان میں اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب محکم رجحان غالب ہو۔ یہ محکم اور ٹھوس رجحان تمام ایسی توقّعات، سارے ایسے احساسات کو جو ناکامیوں، ناشادیوں، شکست خوردگیوں کو جنم دیتے ہیں ختم کر دیتا ہے۔"

۴ • افکار سے بچیے

انسان کی صحت اور سکون کو تباہ کرنے کے لئے فکر اور پریشانی سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ــــ مشہور مفکر سی۔ ڈی۔ ڈروکان نے لکھا ہے ــــ "موجودہ زندگی میں بہت سے المناک حادثوں کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کا دماغ مسلسل اُس کی قوتِ ارادی کو شکست دیتا چلا جاتا ہے۔ ہر وقت کی فکر مندی اُسی کا نتیجہ ہے۔ جو شخص ہر مناسب و نامناسب بات پر فکر کرنے کا عادی ہو جاتا ہے وہ غیر منظّم دماغ کی کمزور قوتِ ارادی پر فتح کی ایک دردناک مثال پیش کرتا ہے۔ اِس کی سزا بُری طرح بھگتنی پڑتی ہے۔ ناخوشی، نیند کا اُچاٹ ہو جانا۔ ذہن اور جسم کے بعض حصّوں کا نِکما ہو جانا اِسی کا نتیجہ ہیں۔ کبھی کبھی تو آدمی خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اِس کے برعکس قوتِ ارادی یا حکمراں طاقت یا رُوح کو اپنے دماغ کو اپنے دماغ کا فاتح بنانے کا انعام کوئی چھپی ہوئی حقیقت نہیں ہے۔ تربیت یافتہ دماغ تربیت یافتہ جسم کی طرح صحت، دولت اور خوشی سے زندگی کا دامن بھر دیتا ہے۔"

۵ • قدرت کے خزانہ سے فائدہ اُٹھایئے

غربت و افلاس کے شکار لوگ قسمت کو کوستے ہیں۔ قدرت کا

گلہ کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اپنی غربت، اپنے افلاس کے وہ خود ذمہ دار ہیں —— مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے —— "افلاس کے خلاف جد و جہد کرتے ہوئے کیا آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ خدا نے آپ کے لئے خوش حالی کے خزانے بھر رکھے ہیں؟ ذرا تصور کیجئے یہ وسیع کائنات اور اس میں بھری ہوئی دولت زندگی کی نعمتیں اور غیر معمولی طاقتیں —— اگر آپ اِن سب کو اپنی کوششوں سے کام میں لے آئیں تب کیا غربت و افلاس کا نام و نشان بھی باقی رہے گا؟ اس وسیع کائنات کے اندر اتنا سرمایہ چھپا پڑا ہے جسے کام میں لاکر انسان اپنی ہر ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ عیش و عشرت کے سامان بھی فراہم ہو سکتے ہیں۔ آپ شاید یقین نہ کریں گے کہ ایسی ناممکن بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن کیا تہذیب و تمدن کا ارتقا کرتے ہوئے انسان نے آج تک یہ سب نہیں کیا ہے؟"

۶ ● ہڑ —— اعضائے رئیسہ کے لئے اکسیر

ہڑ کو ہلیلہ بھی کہتے ہیں۔ یہ معدہ اور آنتوں کے لئے بے حد مفید ہے۔ قبض کو دور کرتی ہے۔ آنتوں کو قوت دیتی ہے۔ قوتِ ہاضمہ کو بڑھاتی ہے۔ دماغ کو قوت دیتی ہے۔ دل کی گھبراہٹ دور کرتی ہے۔ تمام اعضائے رئیسہ کے لئے بہت مفید ہے۔

تمام جسمانی قوتوں میں اضافہ کرنے والی بلکہ بدن کے لئے کیمیا ہے۔ کھانا کھانے سے پہلے ہڑ کھائی جائے تو بھوک بڑھاتی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد کھائی جائے تو غذا جلد ہضم ہو جاتی ہے۔ سونے سے پہلے دودھ کے ساتھ کھائی جائے تو معدے اور آنتوں کا فعل اعتدال پر آجاتا ہے۔

زکام سے بچنے کے لئے ہڑ کا استعمال بہت مفید ہے۔ کوڑھ، سنپات، بخار، جلودھرا اور بادی بواسیر کے لئے اکسیر ہے۔ کف اور سودا کو دور کرتی ہے۔ مالیخولیا کے لئے بہت مفید ہے۔ یہ آنکھوں کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ بصارت کو تیز کرتی ہے۔ آنکھوں کے ہر مرض میں ہڑ کو ٹھنڈے پانی میں بھگو کر آنکھوں کو اس پانی سے دھونے سے آنکھیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں۔ اس کی چھال کو پیس کر سرمہ کی طرح استعمال کرنے سے آنکھوں سے پانی آنا بالکل بند ہو جاتا ہے۔

مختلف موسموں میں موسموں کی رعایت سے ہڑ استعمال کرنی چاہئے۔ برسات کے موسم میں سیندھا نمک کے ساتھ، سردیوں کے موسم میں کھانڈ یا مصری کے ساتھ، موسمِ بہار میں شہد کے ساتھ اور گرمیوں کے موسم میں گڑ کے ساتھ استعمال کرنی چاہئے۔

۷ ● ذہنی صحت کا بھی خیال رکھئے

ذہنی صحت جسمانی صحت سے کم اہم نہیں، بلکہ ذہنی صحت جسمانی صحت سے زیادہ اہم ہے۔ ذہن صحیح اور صحت مند نہ ہو تو جسمانی صحت بھی برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس لئے جسمانی صحت سے زیادہ ذہنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے —— "جس طرح انسانی جسم کے لئے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دماغی غذا کے لئے کتابیں ضروری ہیں۔ ہم جو احتیاط کھانے میں برتتے ہیں تاکہ جسمانی صحت برقرار رہے، وہی احتیاط کتابوں کے انتخاب میں برتنی چاہئے تاکہ ذہنی صحت خراب نہ ہو جائے۔ جو آدمی سارا دن محض اخبار، جاسوسی کہانیاں یا پست لٹریچر پڑھتا رہتا ہے وہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں کر رہا ہے۔"

۸ ● ناکامی کا اندھیرا

اگر آپ اپنی زندگی کے افق سے ناکامی کا اندھیرا دور کرنا چاہتے ہیں تو جادۂ حیات پر چلتے ہوئے مشہور مفکر ڈگلس لرٹن کے ان زرّیں مشوروں کو مشعلِ راہ بنائیے

"حسد، پچھتاوے، خود ترحمی، مایوسی —— یہ تمام احساسات دیمک کی طرح ہیں جو انسان کی خود اعتمادی کو تباہ کرتے ہیں اور احساسِ کمتری پیدا کرتے ہیں اور ان تمام لوگوں کی زندگی کو نقصان پہنچاتے ہیں جو یہ احساسات اپنے اندر پیدا کرتے ہیں اور جو اِن احساسات کے لوگوں سے میل جول رکھتے ہیں۔"

قارئین کے مسلسل اصرار پر، اُن کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ادارہ 'بیسویں صدی' دلّی کا 'بیسویں صدی' لاہور سے کوئی تعلق نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ ہمارے جملہ مضامین بلا حوالہ نقل کر لیتے ہیں اور ہمارے 'تیر و نشتر' اور 'صحت و زندگی' کے مضامین بھی اپنے نام سے شائع کر لیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو مغالطے میں رکھنے کے لئے ہمارے سرورق کا ہو بہو چربہ بھی چھاپ لیتے ہیں۔ — منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶

اگر انسان اپنے گرد و پیش پر نظر نہ رکھے تو وہ زندگی کے میدان میں کامیاب و کامراں نہیں ہو سکتا۔"

۹ • ایک سُنہرا نسخہ

دُنیا میں کون ایسا ہوگا جو بڑھاپے کے تصوّر سے بھی خوف نہ کھاتا ہو، جو ہمیشہ جوان رہنا نہ چاہتا ہو۔

جنرل میکارتھر کا یہ نسخہ عوارضِ پیری سے بچنے کے لئے خوب ہے۔ انھوں نے اِسے لکھوا کر اپنے کمروں میں آویزاں کر رکھا ہے۔ اِسے اِتنی بار پڑھنا اور سُننا چاہیئے کہ جسم کا رُواں رُواں اِسے دُہرانے لگے۔ وہ نسخہ یہ ہے —

"زندگی کے کسی خاص وقت کا نام جوانی نہیں۔ حقیقت میں جوانی دماغ کی ایک حالت ہے، خواہش اور قوتِ ارادی کی ایک کیفیت ہے، تخیّل کی ایک صفت ہے، جذبات کی ایک طاقت ہے، کم ہمّتی اور تذبذب پر دلیری کا غلبہ ہے۔"

تساہل اور آرام طلبی پر اولوالعزمی اور مہمّاتی سرگرمی کی فتح ہے۔ کوئی شخص ایک معیّن مُدّت تک زندہ رہنے سے بُوڑھا نہیں ہو جاتا۔ لوگ اپنے بلند و بالا مقاصد ترک کر کے بُوڑھے ہو جاتے ہیں۔ زمانہ صرف جِلد پر جُھرّیاں ڈالتا ہے۔ لیکن طبعی جوش کی کمی سے رُوح پر جُھرّیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور انسان سمجھتا ہے وہ بُوڑھا ہو گیا۔

۱۰ • کامیابی کا راز

آپ بھی کامیابی کی محبوبہ کو رام کر سکتے ہیں —— آپ بھی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں —— آپ کامیابی کی محبوبہ کو کس طرح رام کر سکتے ہیں؟ آیئے آپ کو بتائیں —— مشہور مفکّر ڈاکٹر نپولین ہِل نے لکھا ہے ——

"صحت ہمارے جِسم کے دوسرے اعضاء کے باہم اشتراک اور تعاون کا دوسرا نام ہے۔ صحت مند انسان وہی ہے جس کے جِسم کے سارے اعضاء صحیح طور پر اپنا کام انجام دیتے رہتے ہیں اور ایک ضابطۂ حیات کے مطابق ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں۔ جس وقت یہ رشتہ اور ربط ٹوٹ جاتا ہے ہمارا تمام نظامِ جِسمانی درہم برہم ہو جاتا ہے، اور ہماری وہ قوت جو ہم جِسم کے مختلف حرکات کے تعاون سے حاصل کرتے ہیں ختم ہو جاتی ہے —— یہی مثال اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ ہماری ساری زندگی پر صادق آتی ہے۔ جس طرح ہمارے نظامِ جِسمانی کو چلانے کے لئے جِسم کے مختلف حصّوں کا اتّحاد اور تعاون ضروری ہے۔ بالکل اُسی طرح زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہمیں زندگی اور ماحول کو ایک دوسرے کے مطابق ڈھالنا چاہیئے۔

۱۱ • ایک ناقابلِ تردید حقیقت

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے —— "سرجن بہت پہلے ہی سے اِس حقیقت کی تحقیق کر چکے ہیں کہ بعض ناسُور ذہنی مایوسی کا نتیجہ ہوتے ہیں جن کے جِسم میں ناسُور کا ذرا بھی شک نہ ہو۔ دل کے رجحان سے اُن میں ناسُور کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ سائنس کی اِس تلاش کی تصدیق بھی اِس رپورٹ سے ہوتی ہے کہ جنگ سے متاثّر لوگوں میں اِس بیماری کی علامتیں بہت جلد پیدا ہوتی دیکھی گئی ہیں۔ عزیزوں کی موت کا غم اُن میں خطرناک بیماریوں کا باعث بن جاتا ہے —— جِلد کی بعض بیماریاں بد ہضمی، جگر کا مرض یا دل اور دماغ کے امراض نفرت یا حسد کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ اِن جذبات سے خون میں زہر سا گھل جاتا ہے جو جِسم کی طاقت اور ہِمّت کو رفتہ رفتہ گھُن کی طرح ضائع کر دیتا ہے۔"

۱۲ • قوّتِ ارادی

زندگی کی بازی گاہ میں ناکامی کے شاکی بہت سے لوگ ہیں۔ لیکن اِس کی وجہ سے بہت کم لوگ واقف ہیں —— مشہور مفکّر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے —— "آپ اُس وقت تک صحیح معنوں میں پُرمسرّت زندگی بسر نہیں کر سکتے، جب تک آپ اپنے اندر چھپی ہوئی طاقت کی اہمیت نہ پہچانیں گے۔ بقول ٹینی سن —— "جن لوگوں کی قوّتِ ارادی مضبوط ہے میں اُنھیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔"

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائیگا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

سوال و جواب

ہلال عباسی شیخوپورہ (پاکستان)

س۔ کیا تدبیر سے انسان بگڑی ہوئی تقدیر بنا سکتا ہے؟

ج۔ جی ہاں ——— حُسنِ تدبیر سے تقدیر سنور جاتی ہے!

س۔ دُنیا میں اگر دولت نہ ہوتی تو؟

ج۔ بہت سی بُرائیاں نہ ہوتیں ——— بہت سی اچھائیاں نہ ہوتیں۔

س۔ خلوص کیا ہے؟

ج۔ وہ بے لوث جذبہ جس میں غرض کا شائبہ نہیں ہوتا۔

اختر الاسلام۔ لائل پور

س۔ کچھ اچھی باتیں بتایئے جو جادۂ حیات پر چلتے ہوئے مشعلِ راہ کا کام دیں۔

ج۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کے اِس ارشادِ گرامی کو آویزۂ گوش بنایئے ——— "جس نے مشورہ کیا نادم نہ ہوا، جس نے میانہ روی اختیار کی تنگ دست نہ ہوا"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے ارشاد فرمایا ہے ——— "حسد کے ساتھ راحت نہیں، انتقام کے ساتھ سرداری نہیں، بے ادبی کے ساتھ بزرگی نہیں، نافرمانی کے ساتھ فلاح نہیں"

محبوب علی وفا۔ بنگلور

س۔ مطلبی انسان آپ کی نظر میں؟

ج۔ ہماری نظر میں ایسا انسان ننگِ انسان ہے!

س۔ جن سنگھ پارٹی آپ کی نظر میں؟

ج۔ مُلک و وطن کی دوست نما دشمن! جس کا دامن پدرِ قوم مہاتما گاندھی کے خون سے داغدار ہے!

س۔ کانگریس کے وعدے کب پُورے ہوں گے؟

ج۔ وفا صاحب! ——— وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا!

سلطان احمد چاند۔ دیسنوی

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت نہ ہوتی تو خدا کو جہنّم نہ بنانا پڑتا؟

ج۔ سچ تو یہ ہے، بقول گولڈ اسمتھ "کانٹوں سے بھری ہوئی شاخ کو ایک پھول خوبصورت بنا دیتا ہے، اِسی طرح غریب کے دل اور گھر کو نیک شعار عورت جنّت بنا دیتی ہے!"

س۔ ہر عورت مرد کی کمزوری کی متلاشی ہوتی ہے؟

ج۔ یہ آپ سے کس احمق نے کہا؟

جاوید احمد قریشی۔ گُلبرگہ

س۔ ہندوستان میں جمہوریت کا مستقبل؟

ج۔ جمہوریت کے دشمنوں کے ہاتھوں تاریک ہے۔

س۔ کیا دولت کا ہونا زندگی کے لئے ضروری ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ اِس لئے کہ غربت سب سے بڑی مصیبت، سب سے بڑی لعنت ہے!

س۔ ماضی عذاب، مستقبل تاریک۔ کیا کروں؟

ج۔ حال کو روشن و قابلِ رشک بنانے کے لئے جدّ و جہد کیجئے۔

مطیع الرحمٰن شاہین۔ لاتور

س۔ جن سنگھ ہندوستان میں کیا کرنا چاہتا ہے؟

ج۔ ایک ایسے خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتا ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا ــــ ہندوستان میں جمہوریت کو ختم کرکے ہندو راج چاہتا ہے۔

س۔ کیا اُردو ہندوستان کی دوسری زبان ہوگی؟

ج۔ اُردو کے تنگ دل بدخواہ ہندوستان میں اُردو کو تیسری زبان کی حیثیت سے بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔

ظہیر الحسن فقیر اخاں۔ اُردو بازار۔ دربھنگہ

س۔ بھیّا! غالب کے وطن میں غالب سے محبت اور غالب کی زبان سے نفرت!! آخر کیوں؟

ج۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

س۔ بھیّا! اقبال اور غالب کی شاعری میں فرق بتائیے۔

ج۔ اتنی تفصیل طلب بات سرگوشیوں میں کیسے بتائی جاسکتی ہے ــــ غالب اور اقبال کی شاعری آپ کے سامنے ہے۔

س۔ علامہ اقبال کی سوویں برسی بھی کبھی دِلّی میں منائی جائے گی؟

ج۔ اقبال اور ٹیگور کی سوویں برسی منائی جائے یا نہ منائی جائے، اُن کی عظمت اِس سے کم نہیں ہوتی۔ عظیم ہستیاں اِن رسمی مظاہروں سے بلند ہوتی ہیں۔

محمد مشتاق خاں بریاتو۔ رانچی

س۔ جن سنگھی اُردو کے دشمن کیوں ہیں؟ اُردو سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ آپ اُن پر یہ الزام کیوں لگا رہے ہیں۔ جن سنگھی اُردو کے دشمن نہیں ہیں۔ یہ اسٹیج کے سوا ہر جگہ اُردو بولتے ہیں، اُردو فلمیں دیکھتے ہیں، اور ریڈیو پر اُردو نغمے سُن کر خود بھی گنگنانے لگتے ہیں۔

س۔ یہ دُنیا جنّت ہے یا دوزخ؟

ج۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے ــــ عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی

اِسی طرح دُنیا بھی عمل سے جنّت یا دوزخ بنتی ہے۔

محمد منیر۔ نذیر۔ الیاس فاروقی۔ اوڈگر۔ محبوب نگر

س۔ بھائی جان! ڈوبتے ہوئے سورج اور ڈوبتے ہوئے دل میں کیا فرق ہوتا ہے؟

ج۔ دل ڈوبنے لگتا ہے تو پلکوں پر آنسوؤں کے ستارے لرزنے لگتے ہیں۔ سورج ڈوب جاتا ہے تب آسمان پر ستارے چمکتے ہیں۔

نعیم الرحمٰن صدّیقی۔ بھوپال

س۔ سبزیوں میں مجھے پرول بہت پسند ہے۔ اِس کے فوائد کے متعلق کچھ بتلایئے۔

ج۔ پرول بہت مفید سبزی ہے۔ یہ زود ہضم، مقوّیِ دل و دماغ ہے، بھوک میں اضافہ کرتا ہے، معدے کو طاقت دیتا اور پیٹ کے کیڑوں کو ہلاک کرتا ہے۔ مریضوں کے لئے زود ہضم اور صحت بخش سبزی ہے۔ خون اور بلغم کی شکایات میں فائدہ بخش ہے۔

چیت رام صالپوری۔ انبالہ کینٹ

س۔ خدا جاہلوں کو ہندوستان ہی میں کیوں پیدا کرتا ہے، جبکہ اور بھی بہت سے ملک ہیں؟

ج۔ بندہ نواز! خدا ہندوستان میں جاہلوں کو نہ پیدا کرتا تو آپ اپنی قابلیت پر ناز کیسے کرسکتے!

س۔ ہندوستان میں گھسی ہوئی جہالت کبھی دُور بھی ہوگی؟

ج۔ ہماری تعلیم گاہوں کے طلباء کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان سے جہالت دُور ہوگئی۔ ابھی تو طلباء اُستادوں کو خاطر میں نہیں لاتے!

حاکم چند سیٹھی۔ گوتم نگر۔ نئی دہلی

س۔ عورت کی پلکوں پر چمکتے ہوئے آنسو زیادہ حسین ہوتے ہیں کہ موتی...؟

ج۔ یہ اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔ کسی کی نظر میں عورت کی پلکوں پر چمکتے ہوئے آنسو زیادہ حسین ہوتے ہیں، کسی کی نظر میں موتی۔

س۔ خواب زندگی تو نہیں بنتا، پھر زندگی خواب کیوں بن جاتی ہے؟

ج۔ زندگی خواب نہیں بنتی۔ زندگی بیدار حقیقت ہے۔

س۔ کیا عورت اور فریب ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟

ج۔ یہ آپ سے کس احمق نے کہا۔ ایک ایرانی مفکر نے کہا ہے ــــ عورت زندگی میں ایک بار محبت کرتی ہے اور مرد کئی بار۔

جمیل الدین۔ لال کنواں۔ دہلی

س۔ مسلم ممالک کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ ۳۴، ۳۵ سے زیادہ۔

سیّد معین الدین علی کٹک (الطیبہ)

س۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل؟
ج۔ جمہوریت کے دشمن تاریک بنا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

روح القدوس، جعفر صاحب، انعامدار بیجاپور

س۔ جس کی زندگی ناکامیوں سے ہمکنار ہو اُسے کیا کرنا چاہیئے؟
ج۔ اُسے کامیاب انسانوں کی زندگی سے روشنی حاصل کرنی چاہیئے۔

خواجہ معین الدین۔ احمد آباد

س۔ محترمہ سلمیٰ صدیقی کا پروفیسر رشید احمد صدیقی سے کیا رشتہ ہے؟
ج۔ یہ موصوف کی صاحبزادی ہیں۔
س۔ فنِ افسانہ نویسی کے متعلق کوئی مستند کتاب اُردو ادب میں ہو تو ازراہِ کرم بتلایئے۔
ج۔ عرصہ ہوا سیّد وقار عظیم نے ایک کتاب لکھی تھی، اُس کا نام غالباً "فنِ افسانہ نویسی" تھا۔ لیکن اب وہ کتاب کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ کتاب مبتدیوں کے لئے کچھ زیادہ مفید بھی نہ تھی۔

محمد حمید الظفر حیدرآباد دکن

س۔ خورشتر بھیا! جب انسان زندگی سے مایوس ہو جائے تو اُسے کیا کرنا چاہیئے؟
ج۔ زندگی کا حُسن ـــــ زندگی کی دلکشی دیکھنے کے لئے بصارت پیدا کرنی چاہیئے۔
س۔ خورشتر بھیا! اِس دور میں دوست کی پہچان کیا ہے؟
ج۔ یہ جاننا چاہتے ہیں تو مجھ سے کے جاؤ سے پوچھیئے۔
س۔ خورشتر بھیا! اپنی پسند کا کوئی شعر سُنایئے۔
ج۔ سُنیئے ؎

ہو وہ گبر یا مُسلماں، ہے مری نظر میں یکساں
مرے دل میں دردِ انساں، مرا دین دردمندی

محفوظ عالم۔ نوادہ۔ گیا

س۔ غالبؔ کا کوئی شعر سُنایئے۔
ج۔ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے
س۔ بھائی جان! زندگی اگر سنگین بن جائے تو؟
ج۔ اُسے عزمِ محکم اور جہدِ پیہم سے رنگین بنانا کچھ مشکل نہیں۔

شمشاد بانو۔ بھوپال

س۔ بھائی جان! مجازؔ کا پورا نام کیا ہے؟
ج۔ اسرار الحق نام۔ مجازؔ تخلص ہے۔

شہناز صدیقی۔ سہسرام

س۔ چچا جان! میں آج کل بہت اُداس رہتی ہوں۔ کیا کوئی علاج ہے جس سے میری اُداسی کا خاتمہ ہو؟
ج۔ بانو! آپ کی اُداسی و مایوسی کا علاج اِس حقیقت پر یقین کرنا ہے ؎

جادۂ زیست میں ہر غم ہے چراغِ منزل
دل ہو روشن تو کہیں تیرگیِ یاس نہیں

س۔ کوئی ایسا شعر سُنایئے جس سے دل کو سکون حاصل ہو۔
ج۔ خوشیوں کے ساتھ غم بھی مِلے ہیں تو کیا ہوا
شبنم کے اشک بھی تو ہیں گُل کی ہنسی کے ساتھ

قاضی محمد شمس الدین۔ چنور۔ آندھرا

س۔ دُنیا میں وہ کون سی چیز ہے جسے زوال نہیں؟
ج۔ نیکی و نیکوکاری!
س۔ غالبؔ سے محبت اور اُن کی زبان اُردو سے نفرت! یہ کیسی ستم ظریفی ہے؟
ج۔ اِس محبت کے قربان جایئے! اِس نوازش، اِس قدر افزائی کے لئے غالبؔ کی رُوح سپاس گزار و شرمسار ہوگی!

مِس شاہد ناز۔ چھپرہ (سارن)

س۔ غالبؔ دل کے شاعر تھے یا دماغ کے؟
ج۔ دونوں کے۔
س۔ وہ کون سا خطرناک نقطہ ہے جہاں سے میاں بیویوں میں شکر رنجی پیدا ہونے لگتی ہے؟
ج۔ بدگمانی ـــــ بے اعتمادی۔

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

افسانہ لکھ رہی ہوں	خورشید باش ایم۔ اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	دو روپے
آگ اور دھواں	م، م راجندر ایم۔ اے	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
داماد	"	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
پگلی	"	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۴۵ "
بادل پتے	کرشن چندر ایم۔ اے	پانچ روپے ۹۵ "
پہلی لڑکی	رازدان ایم۔ اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
انور	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ "
برہمن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ "
ستم	"	چار روپے ۷۵ "
گھائل	"	تین روپے ۹۵ "
ظالم	سعید امرت	دو روپے ۵۰ "
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۵۰ "
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	"	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
حالِ دل	بیگم توقیر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ "
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
خمِ ابرو (نظم)	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ "
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
فریبِ مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	ذکی انور	چھ روپے
برجیس	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
کانٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ "
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ "
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
رہ گزر	انیس مرزا	چار روپے ۷۵ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شاہدہ	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	تین روپے
ناظمہ کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بلگرامی	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دردانہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جلن	"	دو روپے ۵۰ "
رادھا الزبتھ	"	دو روپے ۵۰ "
پاپی	"	چار روپے
سونا گاچی	"	چار روپے ۵۰ "
طوفانوں کی کہانی	"	چار روپے ۵۰ "
جوار بھاٹا	"	چار روپے ۵۰ "

قیامت	ذکی انور	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
سازش	"	دو روپے ۵۰ "
کانٹوں کی سیج	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گھرانہ	قیسی رامپوری	چار روپے ۲۵ نئے پیسے
ناگ دیوتا	مخمور جالندھری	دو روپے ۵۰ "
خون کے چھینٹے	"	دو روپے ۵۰ "
خوابگاہ میں	"	تین روپے ۵۰ "
فراق	رنگین بھارتی	تین روپے ۵۰ "
پیاسا	"	تین روپے ۵۰ "
پُراسرار رقاصہ	"	دو روپے
پُراسرار قاتلہ	"	دو روپے
پیاس	کے۔ ایل نارنگ بی اے	تین روپے ۵۰ "
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مالوا میکسم گورکی ترجمہ	نرنش کمار شاد	ایک روپیہ ۷۵ "
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۷۵ "
جی ہاں بیٹھے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ "
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ "
ملکۂ صحرا	اوم پرکاش نامی	دو روپے ۵۰ "
خاموش نغمہ	"	چار روپے
آتشِ گل (مجموعۂ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیاتِ اقبال "	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) "	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) "	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں "	ساحر	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا آزاد	تین روپے ۵۰ "
کیٹلاگ سازی	حاجی محمد زبیر	تین روپے ۵۰ پیسے

ظہیر الدین شرقی۔ گاندھل نرساپوری

س۔ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب لوگوں کو دونوں ہاتھ جوڑ کر کیوں سلام کرتے تھے؟

ج۔ اِس لئے کہ وہ بھارت کے صدر تھے اور یہی بھارتی تہذیب ہے، اِس لئے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرنے میں یہ اشارہ بھی تھا کہ اُن کے دونوں ہاتھوں کی طرح لوگ اپنے دل جوڑ لیں۔

سیّد اخلاق حسین۔ دہرہ دون

س۔ "بیسویں صدی" کا پہلا شمارہ کب اور کہاں سے نِکلا تھا؟

ج۔ آج سے ۳۲ سال پہلے لاہور سے۔

س۔ شادی کرتے وقت لڑکی میں سیرت کے بعد خوبصورتی دیکھنی چاہیئے یا تعلیم؟

ج۔ تعلیم! لیکن ایسی تعلیم نہیں جو عورت کو چراغ خانہ سے شمعِ محفل بنا دے۔

س۔ اب "بیسویں صدی" میں افسانہ نگاروں کے خطوط سے تاریخ کیوں حذف کر دی جاتی ہے؟

ج۔ افسانوں کے ساتھ شائع ہونے والے بیشتر خطوط میں تاریخ غیر ضروری چیز تھی۔

سیّد مبارک حسین۔ عادل آباد (دکن)

س۔ کیا نئے افسانہ نگار "بیسویں صدی" میں جگہ پاسکتے ہیں؟

ج۔ نئے افسانہ نِگاروں کو "بیسویں صدی" نے سب سے زیادہ جگہ دی ہے۔

س۔ کیا "بیسویں صدی" کے مکتبہ میں "افشاں" نامی کتاب ہے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے مکتبہ میں سارے بڑے مصنّفین کی کتابیں ہیں۔ ہر کتاب کے ساتھ مصنّف کا نام ضرور لکھنا چاہیئے۔ یہ بہت ضروری ہے۔

لال چند۔ الٰہ آباد

س۔ بھائی جان! اپنی پسند کے دو شعر سُنائیے۔

ج۔ سُنیئے ؎

مجھے بدلنا ہے تقدیرِ گُلشن و گلچیں
بلند میرا یقیں میرا عزمِ محکم ہے

کتنے طوفانِ حوادث تھے کہ سر سے گُزرے
ہم مگر خندہ بہ لب گُزرے جِدھر سے گُزرے

اے۔ انجم شاہ پور پٹوری۔ دربھنگہ

س۔ نئے دَور میں لڑکیوں میں تنگ لباس روز بروز بڑھتا کیوں جا رہا ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ نئے دَور کے مَردوں کی یہی پسند ہے۔

ہاجرہ۔ سہار۔ شاہ آباد۔ آرہ

س۔ یہ گاندھی اور نہرو کے ہموطن آپس میں کب تک لڑتے مرتے رہیں گے؟

ج۔ جب تک تباہ ہو کر سامانِ عبرت نہ بن جائیں گے!

س۔ گُناہ کرنے کی تحریک اور گُناہ نہ کرنے کی توفیق فطری ہوتی ہے یا خدا کی طرف سے؟

ج۔ فطری ہوتی ہے۔

محمد شمس الدّین قاضی چتوّر (آندھرا)

س۔ دُنیا کی سب سے اونچی عمارت کہاں ہے؟

ج۔ امریکہ کے مشہور شہر نیویارک میں ہے۔ وہ عمارت ۱۲۰ منزلہ ہے۔ اُس کا نام امپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے۔ وہ عمارت ۱۲۵۰ فٹ بلند ہے۔

س۔ چین میں مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ ۵ کروڑ۔

س۔ میر تقی میرؔ کا کوئی شعر سُنائیے۔

ج۔ سُنیئے ؎

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سَو سَو طرح سے مر دیکھا

رام لعل۔ کانپور

س۔ مرنے اور شہید ہونے میں کیا فرق ہے؟

ج۔ شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے!

س۔ ہندوستان سے رشوت خوری کب ختم ہوگی؟

ج۔ ہندوستان کے لئے یہ لعنت دائمی بنتی جا رہی ہے!

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
طوفان کی کلیاں	″	چار روپے
گدھے کی واپسی	″	تین روپے
اُلٹا درخت	″	دو روپے پچھتر پیسے
دروازہ	″	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
مسٹر ۵۸	″	تین روپے پچاس پیسے
بقراط	″	دو روپے پچاس پیسے
جی ہاں پٹے ہیں	″	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	″	پانچ روپے
داماد	″	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	″	گیارہ روپے
دودھ کی قیمت	″	تین روپے
خاک پروانہ	″	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	″	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	″	ایک روپیہ پچاس پیسے
ستارہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	″	چار روپے
گرد کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	″	دو روپیہ پچاس پیسے
سونا گاچھی	جگناداس اختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	″	دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود ہمایوں	چار روپے پچیس پیسے

شکست ظلمت	مخمور جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	″	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	″	ایک روپیہ پچیس پیسے
خواب گاہ میں	″	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	″	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سید امرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	″	تین روپے
اکبری دروازہ	″	چار روپے
دوشیزۂ روم	″	تین روپے
دیوانہ	″	تین روپے
دو دیوانے	″	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	″	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	″	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	″	تین روپے پچانوے پیسے
مفرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	″	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	″	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	″	پانچ روپے
ریحانہ	″	سات روپے

دعدہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچھتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوشت	حضرت جوش ملسیانی	چھ روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لنکن نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکنیک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
آواز تو پہچانو	″	تین روپے
چراغوں کا سفر	″	چار روپے پچاس پیسے
انتظار کے قیدی	″	دو روپے
کل کی باتیں	″	پانچ روپے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہار اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفےٰ احسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھے نا	ست پرکاش سنگر	دو روپے
ابراہیم لنکن	چندر موہن لانبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابو الکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	جے سی داس ساجد	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	امرتا پریتم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چاند	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۲۳۲۱، دہلی

سید امتیاز حسن۔ نرمل۔ عادل آباد۔ آندھرا
س۔ غیر ممالک میں کہاں کہاں اُردو بولی جاتی ہے؟
ج۔ تقریباً دُنیا کے ہر ملک میں۔

قیوم احسن۔ دمن سار۔ دھنباد
س۔ خوشتر بھائی! کیا دُنیا موت کی مٹھی میں ہے؟
ج۔ یہ اپنے اپنے عزم و حوصلہ کی بات ہے۔ دُنیا موت کی مٹھی میں ہے اور زندگی کے دامن میں بھی؟
س۔ آتشِ انتقام کب سرد ہوتی ہے؟
ج۔ جس کا جیسا دل ہو۔
س۔ رات گزرنے والی ہے؟
ج۔ جی ہاں! مایوس نہ ہونا چاہئے ____ صبح پیدا ہوگی خود تاریکیوں کی شام سے

حمید الظفر لاری۔ شیلانگ (آسام)
س۔ ادب یا شاعری تصورِ حیات ہے یا تنقیدِ حیات؟
ج۔ تنقیدِ حیات!
س۔ اگر عورت سے ایمان اور عصمت میں سے ایک کوئی زبردستی چھیننا ہو تو کس کی حفاظت ہونی چاہئے؟
ج۔ عورت کو اپنی عصمت کی حفاظت کرنی چاہئے۔ ایمان کوئی زبردستی نہیں چھین سکتا۔

اقبال احمد خاں۔ مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ
س۔ کیا اُردو کو ختم کرنے سے اُردو کے بدخواہوں کو سکون حاصل ہو جائے گا؟
ج۔ اُن کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ اِس لئے کہ اُردو کے حامی تو حامی اُردو کے بدخواہ بھی اکثر پر اُردو کی مخالفت کرتے ہیں، اپنے گھروں میں اُردو بولتے ہیں۔
س۔ فلمی دُنیا میں اُردو، ہندی سے زیادہ اہمیت کیوں رکھتی ہے؟
ج۔ اِس لئے کہ اُردو نغموں پر فلموں کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔

کرشن لال۔ کانپور
س۔ بھیّا! جہیز اور تلک مذہبی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے؟
ج۔ یہ انتہائی تکلیف دہ اور تباہ کُن رسم ہے۔
س۔ کیا اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے؟
ج۔ یہ غلط بہتان ہے۔

مِس نسرین شیروانی۔ سہرسہ
س۔ جس کا کوئی نہ ہو وہ کس کے سہارے جیتے؟
ج۔ ناخدا جس کا نہ ہو اُس کا خدا ہوتا ہے!
س۔ عشق کی تعریف؟
ج۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
س۔ حُسن کیا ہے؟
ج۔ اِک پرتوِ دلکش ہے خیالوں کے اثر کا
خود حُسن حقیقت نہیں دھوکا ہے نظر کا
س۔ حیات راس نہ آئے تو کیا کریں؟
ج۔ زندگی اُس کو راس آئی ہے
جس نے غم سے حیات پائی ہے

نجمہ جمیل۔ لائل پور
س۔ بھائی جان! حضرت شیخ سعدی کب اور کہاں پیدا ہوتے تھے؟
ج۔ ایران کے مشہور شہر شیراز میں ۵۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔

ایم۔اے۔ باری رضا۔ گتہ گوڈم۔ آندھرا
س۔ افسانۂ حیات بدل دولے دوست
ورنہ ہم نسل کے حالات بدلنا ہوگا
اِس کا موزوں کوئی شعر سُنائیے۔
ج۔ آپ کے اِس شعر کے مصرعہ اولیٰ کا وزن دُرست نہیں ہے۔ پھر ہم آپ کے شعر کا موزوں شعر کیا سُنائیں۔ اِس شعر میں لفظ "حیات" نہیں آسکتا۔
س۔ "عورت دانشوروں کی نظر میں" اِس عنوان سے دانشوروں کے اقوال بھیجوں تو آپ "بیسویں صدی" میں جگہ دیں گے؟
ج۔ بصد شوق بھیجئے۔ اقوال کے ساتھ دانشوروں کے نام ضرور لکھئے گا۔

محمد محبیب الرحمٰن کٹیہاروی کٹیہار۔ پورنیہ
س۔ انسان کب غلط راہ اختیار کر لیتا ہے؟
ج۔ جب ضمیر کی رہنمائی سے گریز کرنے لگتا ہے۔
س۔ غم ___؟
ج۔ ہے بڑی چیز انبساط مگر
غم نہ ہو تو حیات کچھ بھی نہیں
خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے
ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا

ایم۔اے۔ ناصر۔ کلکتہ ۱۶
س۔ یہ شعر کس کا ہے اور کیسا ہے؟ اپنی گرانقدر رائے سے نوازیں ؎
زُلف کو شانہ سنوارے گا مگر
چاہئے خود کو سنوارے آدمی
ج۔ یہ شعر کسی کا ہو، بہت خوب ہے۔

محمد حسن رضوی۔ جمشید پور

س۔ مشرقی اور مغربی عورت میں کیا فرق ہے؟

ج۔ مشرق نورِ سحر کی وادی
مغرب ظلمتِ شب کا جنگل

س۔ میں نے اپنا ایک افسانہ "مرجھایا ہوا پھول" معہ جوابی لفافہ ارسال کیا تھا لیکن اب تک کوئی پتہ نہیں!

ج۔ آپ کا افسانہ قابلِ اشاعت نہ ہوگا اس لئے معذرت کے ساتھ واپس کر دیا گیا ہوگا۔ دفتر کا یہی اصول ہے۔

رشید احمد انصاری۔ الہ آباد

س۔ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی؟

ج۔ برلن یونیورسٹی سے۔

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب کتنے دنوں تک جامعہ ملّیہ کے وائس چانسلر رہے؟ میرا ایک دوست کہتا ہے ۲۲ سال تک آپ جامعہ ملّیہ کے وائس چانسلر رہے۔

ج۔ ۲۲ سال تک نہیں، ۲۲ سال تک!

شکیل امجد اوگانوی۔ کلکتہ

س۔ میں کہتا ہوں فراق گورکھپوری "فلاسفی" کے پروفیسر ہیں اور میرا دوست کہتا ہے اُردو کے پروفیسر ہیں —— اب فیصلہ آپ پر ہے۔

ج۔ فراق صاحب انگلش کے پروفیسر ہیں اور مفکر و فلسفی بھی ہیں۔

س۔ خوشتر صاحب! زندگی اور موت کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟

ج۔ موت و حیات میں ہے صرف ایک قدم کا فاصلہ!

انوار الحق۔ پورنیہ

س۔ اِس دَور کے سیاست داں سے کیا اُمید رکھنی چاہئے؟

ج۔ یہی کہ دُنیا کو تباہ کرنے کے لئے امنِ عالم کے خرمن پر کب کوئی نئی چنگاری پھینکتا ہے!

س۔ دُنیا میں غریب نہ ہوتے تو امیروں کی کیا حالت ہوتی؟

ج۔ غریبوں سے بھی بدتر!

سیّد عبد الحق فیروز دیوکلوی۔ بہار شریف

س۔ وقت، دولت، محنت، عزّت، شہرت، اِن میں سب سے زیادہ وزن کس لفظ میں ہے؟

ج۔ آج کی دُنیا، آج کے دَور میں لفظ دَولت سب سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔

س۔ کیا انسان کی ہر خواہش پُوری ہو سکتی ہے؟

ج۔ اُس کی تکمیل کے لئے جدّ و جہد کی جائے تو انسان کی ہر خواہش پُوری ہو سکتی ہے۔ صرف ایک خواہش نہیں پُوری ہو سکتی، اور وہ خواہش ہے، جدّ و جہد کے بغیر خواہشات کی تکمیل کی خواہش!

محمد واسم قریشی۔ اورنگ آباد۔ گیا

س۔ وقت؟

ج۔ وقت ہی زندگی ہے! اپنے وقت کا ایک لمحہ ضائع نہ کیجئے۔

س۔ انسان دولت پانے کے بعد پاگل کیوں ہو جاتا ہے؟

ج۔ دولت اندھی ہوتی ہے، اُسے پانے والا پاگل بھی نہ ہو!

س۔ کوئی اچھا سا شعر سُنایئے۔

ج۔ ہے جو گہری سی شکن وقت کی پیشانی پر
تیری خود بینِ جبیں ہے تجھے معلوم نہیں

ضیاء اللہ خاں بی۔ اے۔ پیرو۔ گیا

س۔ خوشتر بھیّا! فیملی پلاننگ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ مُلک گیر پیمانہ پر اِس پر عمل آسان نہیں۔

س۔ ہندوستان میں بیکاری دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے اِس کا اصل سبب کیا ہے؟

ج۔ مُلک میں بڑھتی ہوئی بیکاری کا اصل سبب لوگوں کی تن آسانی ہے۔ محنت سے جی چُراتا ہے۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی —— مطبوعہ: مُشتی پرنٹنگ ورکس، لال کنواں دہلی۔ ٹائیٹل و تصاویر: برائٹ پریس صدر بازار دہلی —— پتہ: دفتر بیسویں صدی دریا گنج، دہلی نمبر ۲

ڈکشنریاں، صنعت وحرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

بیسویں صدی کی کشیدہ کاری	کرشنا کماری ایم اے	چار روپے
زینت کشیدہ کاری	زینت کوثر	پانچ روپے ۵۰ پیسے
شمع	"	چار روپے ۵۰ پیسے
رسیلی	رشیدہ خاتون	تین روپے ۵۰ پیسے
دلہن	زینب انور	دو روپے ۵۰ پیسے
نگین	"	دو روپے ۵۰ پیسے
تبسم	قدسیہ انور	ایک روپیہ
قدسیہ	"	ایک روپیہ
۵ مہان رنگین نمونے	زینب انور	دو روپے
کیک کے اچار	شرف بانو صفدر	دو روپے
زینت کا ویاہ سامان	زینت کوثر	پانچ روپے

انگریزی اُردو میں اپنی قابلیت بڑھایئے

اُردو انگریزی کی کامیاب بہترین ڈکشنریاں

جامع پاکٹ ڈکشنری	انگریزی سے اُردو ہندی	چار روپے
مسلم لغات		تیس روپے
اردو ہندی ڈکشنری		بیس روپے
اردو اللغات	مولوی کریم الدین	دو روپے ۲۵ پیسے
اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری	عبدالحق	بیس روپے
اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری	"	بارہ روپے
لغات کشوری	نول کشور	نو روپے
جامع اللغات		دو روپے ۵۰ پیسے
حیدر السفورڈ ڈکشنری	انگریزی سے اُردو ہندی	تین روپے
اُردو ادبی لغت		آٹھ روپے
فیروز اللغات جدید کلاں		چوبیس روپے
فرہنگ عامرہ		سات روپے ۵۰ پیسے
فیروز اللغات عکسی خورد		چھ روپے ۵۰ پیسے

صنعت وحرفت

الیکٹریکل انجینئرنگ گائڈ	نریندر ناتھ	بارہ روپے
الیکٹرک گائڈ (نیا ایڈیشن)	"	آٹھ روپے
الیکٹرک وائرنگ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
موٹر کار وائرنگ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
بوٹ پالش سازی	"	دو روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک لائٹنگ	"	چھ روپے
بغیر بجلی کا ریڈیو		ایک روپیہ
تجارتی کیمیا خانہ		دو روپے
آئل و گیس انجن گائڈ	"	دس روپے
آئل انجن گائڈ	"	چھ روپے
رہنمائے بجلی	"	تین روپے ۵۰ پیسے
وائرلیس ریڈیو گائڈ	"	چھ روپے
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو میکینک)		آٹھ روپے ۵۰ پیسے
ٹی کا لگانے کا ہنر	"	دو روپے ۵۰ پیسے
چھوٹے ڈائنمو الیکٹرک موٹر بنانا	"	تین روپے ۵۰ پیسے
برقی موٹر وائنڈنگ اے سی ڈی سی		سات روپے ۵۰ پیسے
ریفریجریٹر گائڈ	نریندر ناتھ	آٹھ روپے ۵۰ پیسے
ریڈیو سیور	"	تین روپے
ٹرانسفارمر گائڈ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک موٹرز	"	آٹھ روپے
خراد مشین یعنی ٹرنر گائڈ	"	تین روپے
ورکشاپ گائڈ (فٹر ٹریننگ)	"	تین روپے
خراد اور ورکشاپ گیان	"	چھ روپے
مکینیکل گھڑی سازی	رام اوتار	چار روپے ۵۰ پیسے
سائیکل ریپیرنگ	"	دو روپے ۵۰ پیسے

خانہ داری

عصمتی دسترخوان	آمنہ نازلی	تین روپے
رضیہ کا دسترخوان	رضیہ سلطانہ تمکین	دو روپے ۵۰ پیسے
رنگ سازی	پروفیسر نریندر ناتھ	دو روپے ۵۰ پیسے
پلاسٹک گائڈ		دو روپے ۵۰ پیسے
اسٹینڈرڈ بوٹ پالش ساز		دو روپے ۵۰ پیسے
اسٹینڈرڈ انک ماسٹر / روشنائیاں بنانا		دو روپے ۵۰ پیسے
امیکن انگریزی مٹھائیاں بنانا		دو روپے ۵۰ پیسے
ہیئر آئل (خوشبودار تیل)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
بلیڈ بنانا پلاسٹک بلڈنگ بلاک	"	دو روپے ۵۰ پیسے
بیٹری کا کام	"	پانچ روپے ۵۰ پیسے
فن مصوری (چہرہ کشی)		چار روپے ۵۰ پیسے
پرفیومری ماسٹر		دو روپے ۵۰ پیسے
وارنش ماسٹر (وارنش سازی)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
آتش بازی کا کاروبار		دو روپے ۵۰ پیسے
اچار مربے چٹنی	آتمی رانی گپتا	دو روپے ۵۰ پیسے
صابن ماسٹر	چندر بھان ارگل	دو روپے ۵۰ پیسے
تمباکو کا زردہ (تمباکو کی دکان)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
پان کی دوکان	"	دو روپے ۵۰ پیسے
فاؤنٹین پین رائٹر	"	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
ہندوستانی کھانا پکانا / دیسی انگریزی کھانے	کالی چرن	چار روپے
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں	"	دو روپے ۵۰ پیسے
موم بتی کا کاروبار	"	دو روپے ۵۰ پیسے
ڈیری فارمنگ	"	چار روپے

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج ، دھلی نمبر ۶

NOVEMBER 1969

Regd. No. D. 100

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 630/57

BISWIN SADI

33rd YEARS OF PUBLICATION

Telephones Office. 271637 Residence. 619927



بیسویں صدی

دسمبر



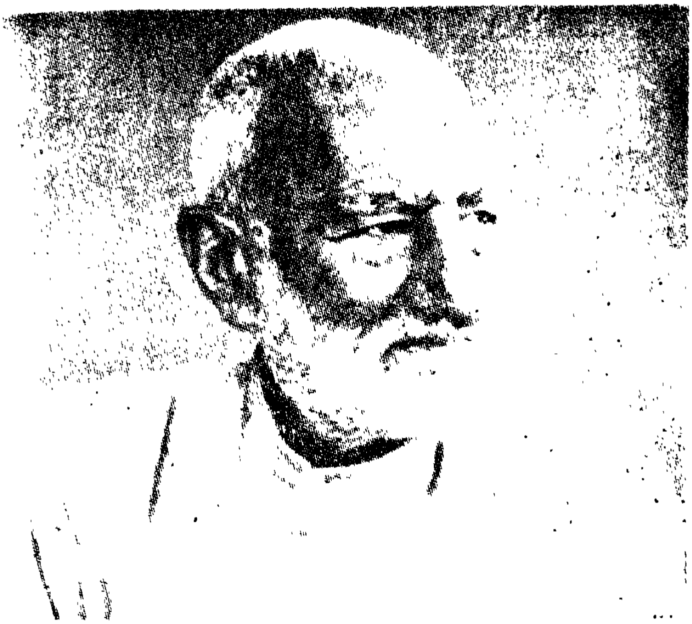
Rs.1-25

Biswin Sadi

DELHI

بادشاہ خان ———

خوشتر گرامی



لمبا قد انسانی عظمتوں کا قطب مینار۔ کتابی چہرہ اسّی سالہ باغیانہ سرگرمیوں اور قید و بند کی روشن تاریخ۔ بڑی بڑی آنکھیں آشتی و محبت کا چشمہ۔ لمبی اُونچی ناک جس نے اِس برصغیر کی ناک اُونچی کی۔ سفید ریش نُور کا فانوس۔ بڑے بڑے کان جنھوں نے زندگی بھر مخالفوں کی ہزلیات سُنیں مگر کبھی چہرہ شکن آلود نہ ہوا ——— یہ ہیں ہمارے جلیل القدر رہنما اور معزز مہمان ———

بادشاہ خان ——— خان عبدالغفّار خان

ملیشیا کی دو قمیصیں اور شلواریں اور دو چادریں کل دنیاوی اثاثہ۔ ایک جوڑا دن میں پہنتے، دوسرا رات کو دھوتے ہیں۔ سادگی کا مجسمہ۔ خلوص کا پیکر۔ سینے میں درد بھرا دل۔ سر میں خدمتِ خلق کا سودا۔ خنجر اور تلوار اور توپ و تفنگ سے کھیلنے والے پٹھانوں کو اہنسا کے سانچے میں ڈھالنے اور قصہ خوانی بازار پشاور میں اُنھیں انگریز کی گولیوں کے سامنے سینہ سپر کرنے والے سردارِ اعظم جیسے ہم پیار سے سرحدی گاندھی اور پٹھان احترام و محبت سے "باچہ خاں" (بادشاہ خانؔ) کہتے ہیں۔ وہ ۲۲ برس بعد آج پھر ہمارے درمیان ہیں۔ جنھوں نے اِس برصغیر کی آزادی کے لئے اَن گنت اور انمول قربانیاں دیں۔ اُن سے اِسی مُلک نے آزادی ملنے پر بے وفائی کی ——— آزادی کے دو قافلہ سالاروں میں سے ایک کو ہم نے سرحد پار پاکستان میں دھکیل دیا اور دوسرے کو گولی سے اُڑا دیا۔ باقی قافلے والے "شاہی محلات" میں کرسی نشیں ہو گئے ——— ہندوستان کی آزادی کے بعد بادشاہ خان کو پندرہ برس پھر جیل میں رہنا پڑا۔ پندرہ برس آزادی سے پہلے اور پندرہ برس آزادی کے بعد۔ زندگی کا ایک تہائی جیلوں کی نذر ہوگیا۔ مگر پہلی جیل ہم سب کی آزادی کے لئے کاٹی اور دوسری ہم سب کی بے وفائی اور غدّاری کے سبب سے ——— انگریز نے اِنہیں فوج کا افسر بنانے کے لئے تاکا تھا۔ مگر قسمت میں قوم کا بے تاج بادشاہ بننا لکھا تھا۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے رابطے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور نوجوان عبدالغفار خان فوج میں بھرتی ہونے کی بجائے انقلابیوں کی صفوں میں آگیا۔ گاندھی نے اُس کا ہاتھ تھاما۔ نہرو اور آزاد نے رفیق بنایا۔ اُس نے کاروانِ آزادی کی ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور اپنی جوانی کی حسین راتوں کو جیل کی کال کوٹھڑی کی نذر کر دیا۔ مگر جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو سارے یارانِ سفر دغا دے چکے تھے اور عبدالغفار خان پھر ایک نئی جدو جہد کے لئے دلِ لخت لخت کو جمع کر رہا تھا۔ پھر قید و بند کا آغاز ہوگیا اور اب وہ کئی سال سے افغانستان میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ مگر گاندھی کے دیش اور گاندھی کے نام لیواؤں کو بھٹکتے دیکھا تو ہماری محبت اُسے یہاں کھینچ لائی اور وہ امن۔ شانتی۔ میل ملاقات۔ بھائی چارہ۔ اتحاد کی صدائیں لگاتا ہندوستان کے کوچہ و بازار میں سرگرداں ہے۔ مگر کون سنتا ہے فغانِ درویش



سرحدی گاندھی ۔ خان بادشاہ خان کی دِلّی میں آمد پر وزیرِاعظم محترمہ اندرا گاندھی نے پالم ہوائی اڈّہ پر اُن کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔

یہ دلنواز نظارہ ، یہ جانفزا منظر • کبھی کے بچھڑے ہوئے دوست آج ملتے ہیں
نفس نفس میں مہک ہے خلوصِ پنہاں کی • نظر نظر میں محبت کے پھول کھلتے ہیں



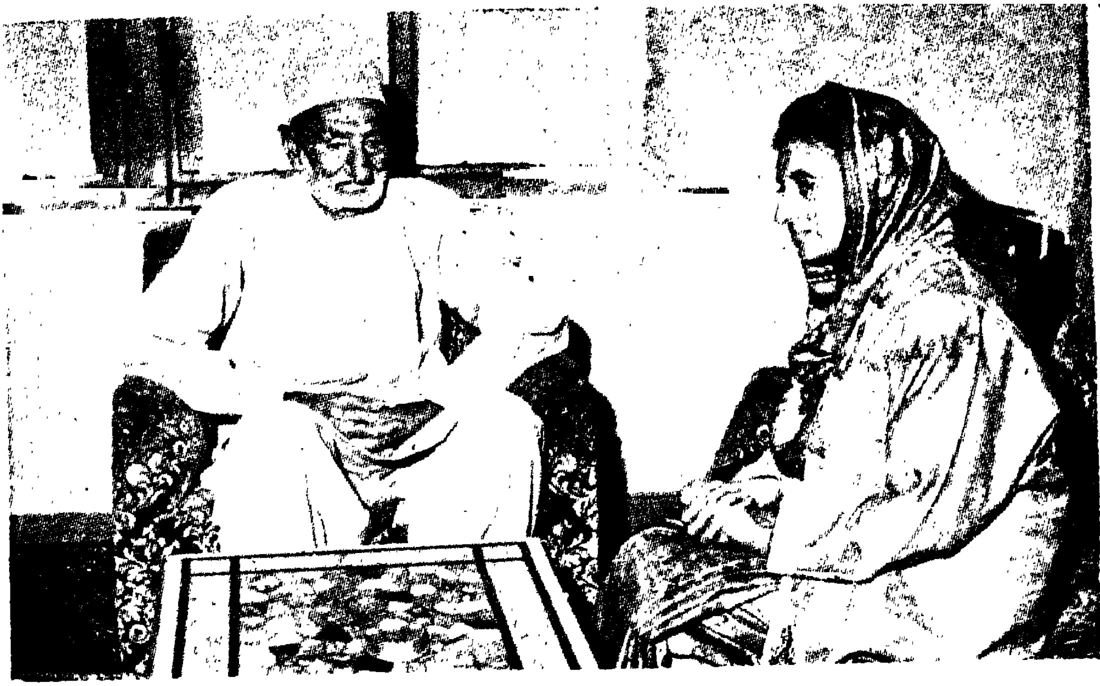
سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان پالم ہوائی اڈہ پر
اپنی کُل کائنات کپڑوں کی ایک پوٹلی کے ساتھ۔

وہ ہمارا رہبرِ عالی مقام • ہے دلوں میں سب کے جس کا احترام
بعد مُدّت کے وہ آیا ہے یہاں • اِس کا استقبال کرتے ہیں عوام
حافظ سہارنپوری



خیر مقدم کو ترسے بیتاب ہیں • سرزمین ہند کے لاکھوں عوام

پالم ہوائی اڈہ پر عوام کے جمِ غفیر نے ناچتے گاتے "سرحدی گاندھی زندہ باد" کے پُرجوش نعروں سے بادشاہ خان کا سواگت کیا جو آزاد ہندوستان میں ۲۲ سال کے بعد پہلی بار تشریف لائے۔ ہندوستان کے لاکھوں عوام نے ان کی راہ میں آنکھیں بچھادیں اور اس طرح استقبال کیا جیسے بھگوان رام ۲۲ برس کے بن باس کے بعد اُجودھیا میں لوٹ کر آئے ہوں ـــــ خان بادشاہ نے دلّی میں قدم رکھتے ہی کہا "آپ نے گاندھی جی کی بات نہیں مانی تو آپ میری کیا سُنیں گے"۔ مختلف تقریروں میں آپ نے فرمایا "یہاں ہر طرف بے ایمانی ہے۔ ہر ایک کو اپنے اپنے پیٹ کی پڑی ہوئی ہے۔ کسی کو ملک اور عوام کی بھلائی کا خیال نہیں۔ لوگ گاندھی جی کا سبق بھول گئے ہیں.... میں خدائی خدمتگار ہوں۔ لوگوں کی خدمت کرنے یہاں آیا ہوں۔ مجھے نہ روپیہ کی ضرورت ہے نہ پختونستان کے لئے امداد.... آپ کو اپنے اندر ایماندار مخلص اور بے غرض کارکن پیدا کرنے چاہئیں جو اپنا خیال کرنے کی بجائے ملک کی بے غرض خدمت کریں۔ میں آپ کو گاندھی جی کا بھولا ہوا اُپدیش یاد دلانے آیا ہوں۔ پیار اور محبت سے رہو۔ باتیں کم کرو عمل زیادہ کرو" ـــــ خان بادشاہ کی ہر تقریر میں دُکھ اور درد ہے۔ ان کی تقریروں نے گاندھی جی کی یاد تازہ کر دی۔ بلا شبہ انہوں نے گاندھی جی کی طرح کھری کھری باتیں کیں۔ آج وہ زندہ ہوتے تو انہیں بھی ہندوستان کے موجودہ حالات سے اتنا ہی دُکھ ہوتا اور وہ بھی اسی طرح ماتم سرائی کرتے ـــ ہندوستان کی آزادی کے لئے بادشاہ خان نے بھی کسی سے کم قربانیاں نہیں کیں۔ ان کا ہندوستان آنا ہم سب کے لئے باعثِ فخر مسرت ہے مگر یہاں آکر اپنے خوابوں کا آزاد ہندوستان نہ دیکھ کر انہیں بہت دُکھ اور قلق ہوا۔ ان کی ہر تقریر میں یہی درد وکرب ہے۔



وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے بہ نفسِ نفیس کابل پہنچ کر خان بادشاہ خان کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔



دارالامان (افغانستان) میں
محترم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم و
مغفور کی خان بادشاہ سے
ایک ملاقات ــــــــــ

دید کے قابل ہے یہ جذبِ محبت، سینہ پاک
یکدلی کے نور سے دونوں کے چہرے تابناک
سامنے نظروں کے ہے وہ عشق سا، ہیں کہ جب
"جا ملے تھے سینہ چاکانِ وطن سے سینہ چاک"

بیسویں صدی دہلی

ٹیلیفون دفتر ۔۔۔۔۔۔ ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ۔۔۔۔۔۔ ۶۱۹۹۲۷

ایڈیٹر ۔ خوشتر گرامی

[illegible] ۱۹۶۱ء



قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ پچیس پیسے
پتہ: رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۲

[illegible]

[illegible]

تیر و نشتر

نوشتر گرامی

"کانگرس کو بے غرض ورکروں کی جماعت بنا دیا جائے" گاندھی جی کی وصیت ـــــ یعنی کانگرسی کرسیوں سے دست بردار ہو جائیں۔ واہ صاحب! یہ وصیت زائد المیعاد قرار دیجئے۔

"بدعنوانی کے الزام میں سات گزیٹیڈ افسروں کو سزا" ایک خبر ـــــ کمبختوں کو بدعنوانیاں کرنی تھیں تو وزیروں کا مقدر لے کر آتے۔

"کرسی اور روپیہ ہی کانگرسیوں کا مقدر بن گیا ہے" نجلنگپا ـــــ جی نہیں۔ کانگرس کی صدارت بھی۔

"گاندھی جی کی تعلیم" ایک عنوان ـــــ پروپگنڈے کے لئے اور دوسروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہے، عمل کے لئے نہیں۔

"بادشاہ خان کے لئے نیا جوتا" ایک خبر ـــــ دن رات اتنے جوتے فرقہ پرست ہندوؤں اور مسلمانوں کو لگائے کہ پرانے گھس گئے اور نئے کی ضرورت پیش آئی۔

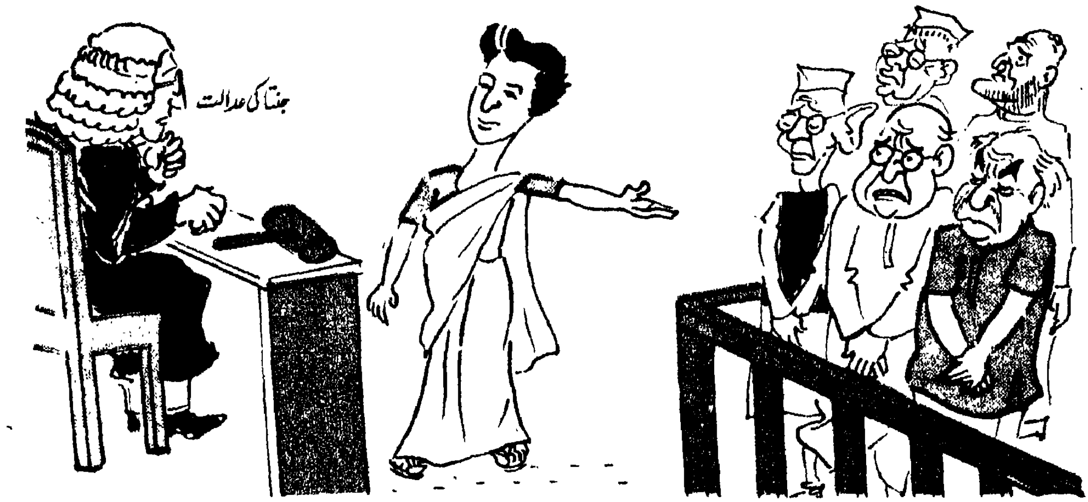
"بمبئی پردیش کانگرس کمیٹی کے سمیلن میں ہاتھا پائی اور گھونسے بازی" ایک خبر ـــــ سرکس کا مزہ آگیا ہوگا دیکھنے والوں کو۔

"گجرات کے فسادات میں افواہوں کو بڑا دخل ہے" ایک عنوان ـــــ اور ان افواہوں کو پھیلنے دیا گیا۔ یہ گجرات سرکار کا کمال ہے۔

"اگر ہمارے قول و فعل یکساں نہیں تو پھر کانگرس کو ختم کر دینا چاہیئے" وزیر اعلیٰ یو۔پی ـــــ کانگرس ختم ہو گئی تو آپ کی وزارت کا کیا ہوگا؟



"یہاں سب کو اپنے پیٹ کی فکر ہے" بادشاہ خان



"کانگریس کو میں نے نہیں کانگریسی آقاؤں نے کمزور کیا ہے" اندرا گاندھی

"چار ارب کا کالا دھن پکڑا جا چکا ہے" ایک خبر ــــــ اِس لئے کہ ڈیسائی مارکہ چھتری غائب ہوگئی ہے۔ جس کے نیچے انھوں نے پناہ لے رکھی تھی۔

"گاندھی جی کے سکّوں کی بلیک" ایک خبر ــــــ گاندھی شتابدی کی تقریبات کے پروگرام کا ایک حصّہ۔

"پنجاب کے مزید تین کانگریسی اکالی دل میں شامل ہوگئے" ــــــ کرسی کی طلب جو ہوئی ــــــ اور کرسی اُدھر ہی ہے۔

"چار وزیروں کی علیٰحدگی" ایک عنوان ــــــ مرار جی کے بعد یہ دوسری قسط تھی۔ باقی آئندہ۔

"اب دنیا کی باگ ڈور عورتوں کے ہاتھ میں آنے والی ہے" ایک عنوان ــــــ اپنی نکیل تو پہلے ہی عورت کے ہاتھ میں ہے۔

"قومی یک جہتی" ایک عنوان ــــــ بتلیئے کہاں بکتی ہے؟ بھارت سرکار خریدار ہے۔

"فسادات طے شدہ اسکیموں کے تحت ہوئے ہیں" ایک عنوان ــــــ اور اسکیم ساز پرانے ہیں یعنی قاتلانِ گاندھی۔

"خواتین فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے کام کریں" بادشاہ خان ــــــ اور وزارتوں، سفارتوں کے چکّر میں نہ پڑیں۔

"جن سنگھ دلّی کا کچھ حصّہ ہریانہ کو دینے کے خلاف ہے" ایک خبر ــــــ جیسے دلّی انھیں ورثے میں ملی ہے۔

"پنجاب کے وزیر کرپٹ ہیں۔ سردار ذیل سنگھ ثبوت فراہم کرنے کو تیار" ــــــ اس کشٹ کی ضرورت نہ تھی۔ یہ تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

"چنڈی گڑھ کے بنک سے اڑھائی لاکھ روپے کی چوری" ایک خبر ——— چوروں نے سوچا۔ نہ جانے چنڈی گڑھ کیدھر جائے۔ جلدی ہاتھ مارو۔

"انسانی مسائل کا حل" ایک عنوان ———

۱۔ آتش زنی
۲۔ چھُرے بازی
۳۔ لوٹ مار، قتل وغارت
۴۔ اغوا، ڈکیتی
۵۔ آنسو گیس، لاٹھی چارج اور فائرنگ

"صدر ایوب خاں نے غیر مُلکی بنکوں میں ۷ کروڑ روپیہ جمع کر لیا" ایک خبر ——— اور فرزندِ ارجمند گوہر ایوب کی جمع الگ ہے۔

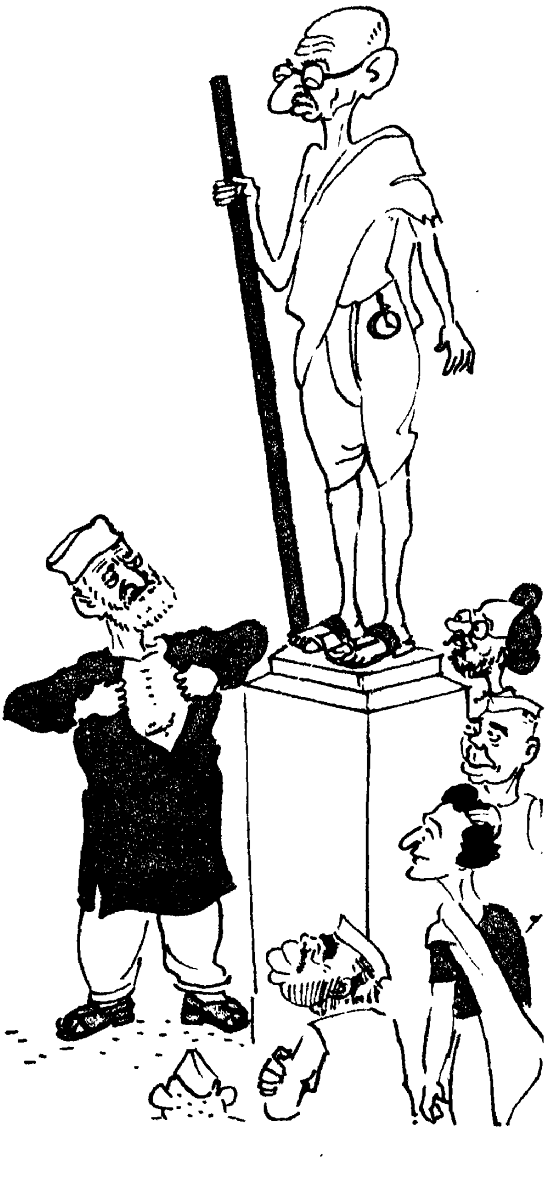
"یہ کہاں کا سوشلزم ہے؟" ایک سوالیہ عنوان ——— یہ ہندوستان کا ہے جہاں جن سنگھ، ہندو مہا سبھا، اکالی دل اور مُسلم لیگ سب کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔

"بادشاہ خان کی طرف سے ویتنام کی جنگ کی مذمت" ———
اب امریکی بادشاہ خان کو کمیونسٹوں کا ایجنٹ بآسانی کہہ سکیں گے۔

"سگریٹ نے جان لے لی" ایک خبر ——— مرنے والے کی سگریٹ فیکٹری میں یادگار قائم کی جائے۔

"اندرا گاندھی نیا سنڈیکیٹ بنا رہی ہیں" نجلنگپا ——— پُرانے اور خود غرضوں کے سنڈیکیٹ میں زلزلہ۔

"چنڈی گڑھ پر کوئی سودا بازی نہیں کی جائے گی" ایک خبر ——— کیا چنڈی گڑھ کی نیلامی ہو رہی تھی۔



"گاندھی جی کی یاد اور آپ کی محبت مجھے ہندوستان کھینچ لائی ہے" بادشاہ خان



"اندرا گاندھی نیا سنڈیکیٹ بنا رہی ہیں" نجلنگپا

"سیواگرام میں گاندھی بھگتوں کی سمادھی پر گیتا کے اشلوک لکھے جائیں گے" ــــــ سیکولرزم کا نیا موڑ۔ ایشور اللہ تیرے نام کو بھلا دیا۔

"اساتذہ کے مسائل" ایک عنوان ــــــ

۱۔ شاگردوں کی زبان درازی اور بدتمیزی۔
۲۔ طلباء کی ہڑتالیں۔
۳۔ اسکولوں اور کالجوں پر پتھراؤ۔
۴۔ ٹیچروں پر دست درازی۔
۵۔ امتحانوں میں نقل۔
۶۔ فیل ہونے کی صورت میں قتل وغارتگری کی دھمکی۔

"گجرات کے لوگوں نے گاندھی جی کا اہنسا ترک کر دیا" بادشاہ خان ــــــ یہ فخر کیا کم ہے کہ یہ گاندھی جی کی جنم بھومی ہے۔ گاندھی جی کے اہنسا کی کیا ضرورت ہے۔

"جن سنگھ ہندوؤں کو بھڑکا کر ہندو راج کا خواب دیکھ رہا ہے" یو۔ پی کانگرس کے صدر کملا پتی ترپاٹھی کا بیان ــــــ اور کانگرس کے سنڈیکیٹ دم بخود تماشا دیکھ رہے ہیں۔

"کانگرس کو صوبائی سطح پر تقسیم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے" نجلنگپا ــــــ آپ کے دور صدارت کا کارنامہ۔

"بنکوں کے نیشنلائزیشن کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنی چاہیے" مرارجی ڈیسائی ــــــ اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو آپ کو کیوں چلتا کیا جاتا۔

"غریب جنتا کی حالت بہتر بنانے کی پوری کوشش کی جائے گی" اندرا گاندھی ــــــ اور بیچارے سیٹھوں کا حال تو یہ سن سن کر ہی پتلا ہوا جا رہا ہے۔

"قومی ایکتا کونسل کی میٹنگ سے جن سنگھ کا واک آوٹ" ایک خبر
—— فساد افزا کونسل کی میٹنگ ہوتی تو ڈٹ کر بیٹھتا۔

"لندن میں مہاتما گاندھی کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا" ایک خبر
—— ایسا ہی جیسا احمد آباد میں پیش کیا جا چکا ہے؟

"اُردو کے طلباء کے ساتھ نا انصافی" ایک خبر —— ہندی رکھشا سمیلن والوں کے گھروں میں گھی کے چراغ۔

"تیلی واڑہ دِلّی میں آتش زنی" ایک خبر —— جلتی پر تیل نے اور کام کیا ہوگا۔

"ہریانہ کے رفیوجی" ایک عنوان —— جو بنسی لال کے دور میں بھی چین کی بنسی نہ بجا سکے۔

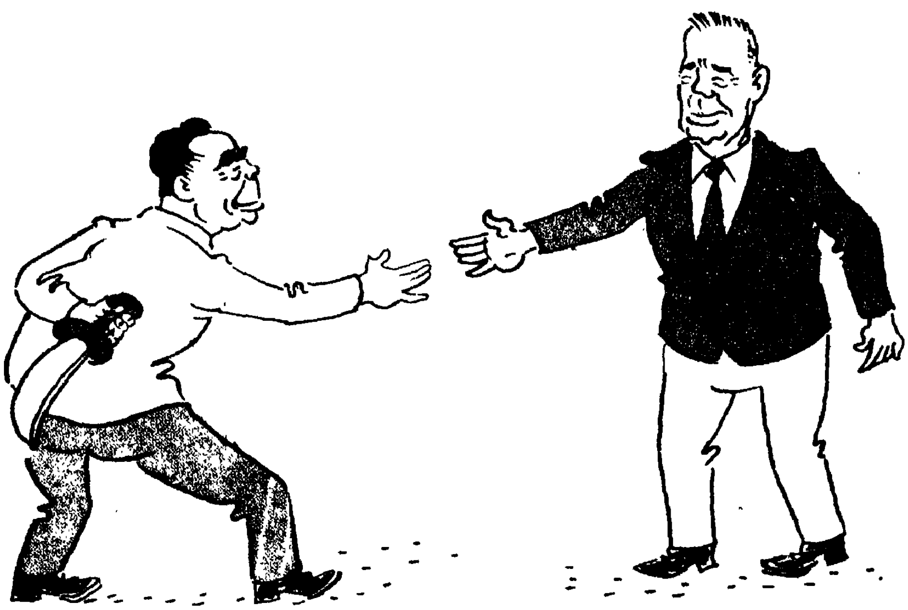
"مسلمان مولوی اور مُلّاؤں کے چکر میں نہ پھنسیں" شیو سینا کے لیڈر کا مشورہ —— بلکہ شیو سینا میں بھرتی ہو کر فتنہ و فساد پھیلائیں۔

"پاکستان کے سابق صدر ایوب خاں لندن جا رہے ہیں" ایک خبر —— اُن سے پہلے صدرِ پاکستان مسٹر اسکندر مرزا وہاں اُن کا استقبال کریں گے اور کہیں گے ؎

خوب گزرے گی جو مِل بیٹھیں گے دیوانے دو

"چینی مِلوں کو بہت گنّا مِلے گا" ایک خبر —— مِلوں کو مژدہ کہ بلیک کا خوب موقع مِلے گا۔

"اچانک بارش سے حیدر آباد میں ہندوستانی ٹیم ہارنے سے بچ گئی" ایک خبر —— بارانِ رحمت اِسے ہی تو کہتے ہیں۔



چو - این - لائی اور کوسی گن میں ملاقات۔

"ہم سب سے پہلے ہندوستانی ہیں" چوہان کی اپیل —— اگر آپ کہیں کہ ہم سب سے پہلے ہندو ہیں اور ہندو راج بنائیں گے تو سارے جن سنگھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔

"اِس سال ۲۱۰ فرقہ وارانہ فسادات ہوئے" ایک تبصرہ —— اور اِس پر بھی ہم گاندھی جی کا نام لیتے ہیں اور اہنسا کا اُپدیش دیتے ہیں۔

"کانگریسی لیڈروں میں ٹکراؤ کا دوسرا راؤنڈ" ایک عنوان —— انجام پہلے راؤنڈ سے بھی بدتر ہوگا۔

"بے روزگاروں کو روزگار دینے کی اسکیم" ایک خبر —— کچھ اور چھوٹے چھوٹے صوبے بن گئے تو اسکیم کی کامیابی میں کسے شبہ ہوسکتا ہے۔

"کانگریس کو بخشو، نجلنگپا کو خط —— یعنی سلیس اُردو میں —— بخشو بِلّی چوہے لنڈورے ہی بھلے۔

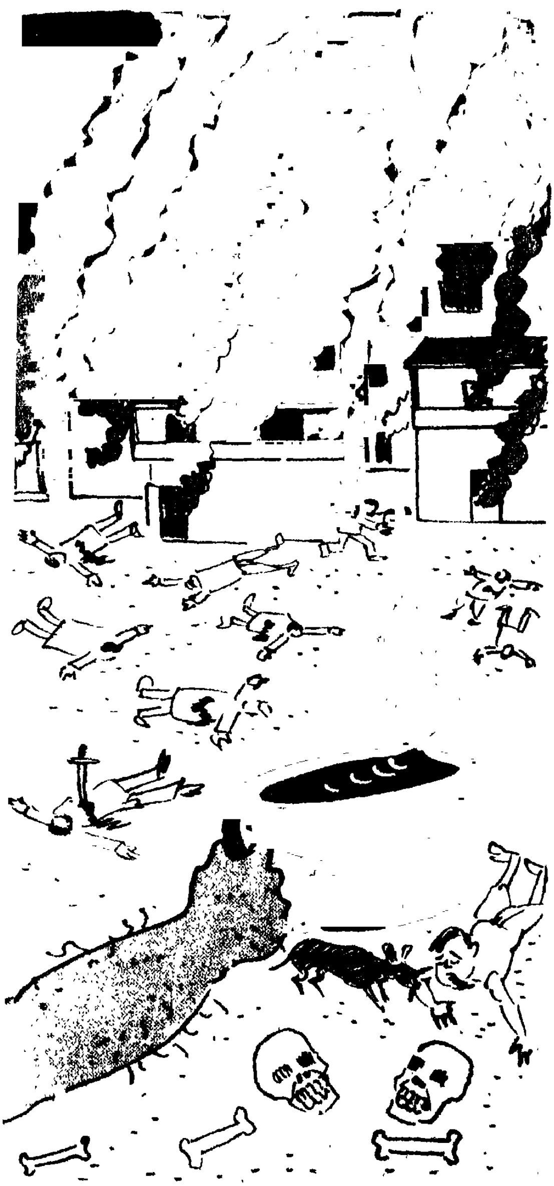
"اِندرا گاندھی کی کوٹھی پر دھرنا" ایک خبر —— جوٹائیں ٹائیں فِس ہوگیا۔

"سکندرآباد میں بم پھٹ گیا" —— دارا اور پورس کی تخریبی کارروائی۔

"قانونِ وراثت میں ترمیم کے خلاف، پنجاب سرکار کے خلاف عورتوں کا دھرنا" —— عورتوں سے حق تلفی اور اندرا کے دَور میں۔

"اِندر پرستھ ہاؤس دِلّی کے تیسرے یونٹ میں آگ لگنے کی تحقیقات" ایک خبر —— تحقیقات کیا، راجہ اِندر کا کام ہے۔

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)



"فسادات میں جن سنگھ کا ہاتھ ہے" ایک عنوان

منگل سُوتر

سلمیٰ صدیقی ایم۔ اے

گوروِنواس، ڈِنشینتھ روڈ۔ کھار، بمبئی ۵۲

خوشتر بھیّا! تسلیم

اپنا تازہ ترین افسانہ بھیج رہی ہوں۔ پسند آئے تو قارئین کی نذر کر دیجئے۔ سالنامہ کے لئے بھی یقیناً افسانہ بھیجوں گی۔ آپ مطمئن رہیں۔ . . آپ خواب کی طرح بمبئی آئے اور چلے گئے۔ آپ سے جی بھر کے باتیں بھی نہ کر سکی۔ اپنی کہہ سکی نہ آپ کی سُن سکی . . .

آپ کی بہن ۔ ـــــــــ سلمیٰ صدیقی

★

ایک بوڑھا آدمی مُردہ گھر میں داخل ہوا۔ لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹائی گئی۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔

پولیس کے آدمی نے پُوچھا" یہ پہچوکری تمہارا ہے سیٹھ؟"

اُس نے ماتھے سے پسینے کے قطرے پونچھے۔ ہونٹ بھینچ کر بولا" یہ میری بیٹی کی لاش نہیں ہے . . . اِس کے گلے میں منگل سُوتر پڑا ہے . . . میں مسلمان ہوں . . . اور میری بیٹی کنواری تھی۔ یہ تو کسی ہندو بیاہتا لڑکی کی لاش ہے!"

بُوڑھا آدمی سر جھکاتے ہوئے چہرہ رُومال سے ڈھانپے ہوئے مُردہ گھر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

ایک جوان مرد مُردہ گھر میں داخل ہوا۔ لاش کے چہرے سے چادر ہٹائی گئی۔ وہ چونک کے ایک قدم آگے بڑھ گیا۔

پولیس کے آدمی نے پُوچھا" یہ تمہارا عورت ہے سیٹھ؟"

اُس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر سوچا۔ آنکھیں بند کر لیں اور سر جھکا کے بولا" میں کنوارا ہوں۔ میرا نام نِرمل کمار ہے۔ یہ عورت تو بیاہتا ہے۔ اِس کے گلے میں تو منگل سُوتر پڑا ہے۔ یہ میری عورت کیسے ہو سکتی ہے بھائی ـــــ؟"

جوان مرد ناک پر رُومال رکھ کے جلدی سے مُردہ گھر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

باہر سے مُردہ گھر کے دروازے میں تالا ڈال دیا گیا اور پھر . . . اچانک اپنے مُنہ پر سے چادر ہٹا کے نَو بیاہتا لڑکی ایک لمبی سی انگڑائی لے کے اُٹھ بیٹھی۔ وہ نیم خوابیدہ سی نظر آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر ہنسی سی آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ برابر پڑی ہوئی لاشیں اُس کے اُٹھ بیٹھنے سے سہمی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن وہ لڑکی اپنی ساتھی لاوارث لاشوں سے بالکل نہ ڈری۔ اُس نے ہنس کے ایک بھکارن کی لاش سے کہا" تو گھبرا مت اے نادار بھکارن! شام تک ضرور کوئی بھکاری تجھے پہچان کے اپنے ساتھ لے جائے گا شمشان گھاٹ تک . . . تیرا ضرور کوئی وارث ہوگا۔ اِس لئے کہ تیری مانگ میں سیندور نہیں ہے اور تیرے گلے میں منگل سُوتر نہیں ہے۔ یعنی تُو بیاہتا نہیں ہے . . ."

اور پھر وہ لڑکی نیم خوابیدہ حالت میں اُس بھکارن کی بدبودار لاش سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

" نہ جانے تمہارا کیا نام ہے بہن۔ لیکن اِس مُردہ گھر میں آنے سے پہلے میرا نام زرینہ تھا۔ زرینہ بیگم ـــــ میری ماں کا نام ریحانہ بیگم تھا۔ لیکن اُسے میں نے کبھی نہیں دیکھا . . . بچپن سے میں نے صرف اپنے باپ کو دیکھا۔ میرا باپ سب باپوں کی طرح بہت چاہنے والا باپ تھا اور یہی چاہت اُس کی، اور میری سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔ چاہت بدنصیبی کا ایک دوسرا نام ہوتا ہے۔"

بھکارن کے مُردہ چہرے پر ایک طنزیہ مُسکراہٹ آئی۔ ناک سکوڑ کے بولی" مجھے بدنصیبی کا دوسرا نام نہیں معلوم۔ بدنصیبی کا صرف ایک ہی نام تھا اور

وہ صرف میرے حصّے میں آئی تھی۔ میں اُس بدنصیبی کو پہچانتی ہوں ۔۔۔ آگے چلو!"
"آگے کہاں چلوں میری سبھاگن بہن . . . ہم تو اب اِتنے آگے چلے آتے ہیں کہ آگے کوئی راہ نہیں ہے چلنے کے لئے . . ."

"میرے باپ نے میری وجہ سے دوسری شادی نہیں کی۔ ہر دم مجھے اپنے ساتھ ساتھ رکھتے تھے ابّا جان۔ تم نے میرے ابّا جان کو دیکھا ہے نا . . . پرسوں شام جب ہم نے ساتھ بیٹھ کر چائے پی تھی تو اُس وقت ابّا جان اِتنے بُوڑھے نہیں تھے۔ آج تو وہ ایکدم سَو سال کے بُوڑھے نظر آ رہے تھے۔ صرف اڑتالیس گھنٹے میں اُنھوں نے پچاس سال کا سفر کیسے طے کر لیا۔ پرسوں شام میں نے اُن سے نِرمل سے شادی کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ وہ میری اور نِرمل کی دوستی سے واقف تھے۔ کچھ اُڑتی اُڑتی خبریں بھی سُن لیا کرتے تھے۔ لیکن میرے مُنہ سے ایسی بات سُننے کی اُنھیں تاب نہ تھی۔ پہلے تو وہ چونک گئے۔ جیسے آج میرے مُردہ چہرے پر سے چادر ہٹنے کے بعد وہ چونکے تھے نا؟ بالکل اِسی طرح پھر اُنھوں نے مجھے ڈانٹ دیا تھا ۔۔۔ "یُو شٹ اپ!" اُنھوں نے بہت گرجدار آواز میں کہا تھا۔ اُن کی آواز سے میرے ہاتھ سے چائے کا کپ چھُوٹ کر نیچے گر پڑا اور بھُوری اور مٹیالی چائے کا گدلا پانی میری قمیص پر بکھر گیا تھا اور میں ڈر کے اور سہم کے رونے لگی تھی۔ یہ میرا آخری حربہ تھا ابّا جان کو منانے کا۔ بہت آزمودہ نسخہ تھا۔ بس ایک ذرا آنکھوں سے دو قطرے پانی کے بہانے نہیں کہ ابّا جان موم بن جاتے تھے۔ فوراً مجھے گلے لگا لیتے تھے اور بس پھر میں اپنی من مانی کروا لیتی تھی۔ لیکن پرسوں شام تو ابّا جان کو نہ جانے کیا ہوا چیخ چیخ کے اُنھوں نے سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیا تھا۔ عبدل باورچی، آیا ماں اور بلڈنگ کا چوکیدار بسنتا سب لوگ سارا کام چھوڑ کے اوپر کی بالکونی میں آ گئے تھے اور سب مِل جُل کے ابّا جان کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ابّا جان کسی کے سنبھالے نہ سنبھل رہے تھے۔ وہ میرا گلا گھونٹ دینا چاہتے تھے اور میں نے اپنا گلا اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ میں مرنے سے نہیں ڈر رہی تھی، لیکن گلا گھونٹنے سے نہیں مرنا چاہتی تھی۔ گلے میں تو مجھے منگل سوتر پہننا تھا نا ۔۔۔؟

آیا ماں جلدی سے پڑوس سے آنٹی دیپا کو بلا لائی۔ دیپا آنٹی میری امّی کی سہیلی تھیں۔ اُن کے ساتھ کی پڑھی ہوئی۔ وہ مجھے بہت چاہتی تھیں۔ ابّا جان بھی دیپا آنٹی کو اپنی سگی بہن کی طرح مانتے تھے۔ لیکن نہ جانے اُس وقت ابّا جان کو کیا ہو گیا تھا۔ دیپا آنٹی کو دیکھ کر چیخ کے بولے "کس نے بُلایا ہے اِس ہندو عورت کو میرے گھر میں! نکل جاؤ۔ سب لوگ نکل جاؤ میرے گھر میں سے! کسی ہندو کو میرے گھر میں رہنے کا حق نہیں ہے۔ میں مُسلمان ہوں! اور میری اَولاد بھی صرف مُسلمان ہی ہو گی۔ آج کے بعد کسی ہندو نے میرے گھر میں قدم رکھا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا!"

عبدل جلدی سے ابّا جان کو اُن کے کمرے میں لے گیا۔ اُس نے جلدی سے ہمارے فیملی ڈاکٹر شرما کو فون کیا۔ لیکن ابّا جان چیخ کر بولے "آج سے میں کسی ہندو ڈاکٹر سے علاج بھی نہ کراؤں گا!"

آنٹی دیپا مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئیں۔ اُنھوں نے ابّا جان کی باتوں کا بُرا نہیں مانا تھا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ پہلی بار میرے سامنے میری ماں کا نام لے کر رو رہی تھیں۔ مجھے بھی پہلی بار اپنی امّی یاد آئی تھیں۔ بچپن ابّا جان کے ساتھ گزار لینے کے بعد میں نے تو جانا تھا زندگی میں بغیر ماں کے بھی بچّے آرام سے پل سکتے ہیں۔ اگر اُن کے باپ ابّا جان جیسے ہوں۔ لیکن کل شام پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ماں صرف ایک رشتہ ہی نہیں ہے، ایک ڈھال بھی ہے جو حملے اور حادثوں سے بچاتی ہے۔ ایک آنچل ہے جو آنسو سُکھاتی ہے۔ ایک چھاؤں ہے جو دھُوپ سے بچاتی ہے۔ اور اُس دن میں نے پہلی بار جانا کہ مذہب ضرور کسی باپ نے ایجاد کیا ہو گا۔ ماں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ یا شاید اُس کا دھرم بھی اُس کا بچّہ ہی ہوتا ہے۔ یقین نہ آئے تو یسوع مسیح کو پاک ماں کی گود میں دیکھ لو . . .

دیپا آنٹی نے نِرمل کو اپنے گھر بُلایا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔ حالانکہ میری تو ساری گھبراہٹ نِرمل کو سامنے دیکھ کے دُور ہو گئی۔ نِرمل چار دن کے بعد مجھ سے مِلا تھا۔ آنٹی دیپا نے کہا تھا "تم دونوں گھبراؤ مت۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ دو ایک دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن نِرمل تو مجھ سے بھی زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ کہنے لگا یہ کل سے اب تک کِتنے ہی گمنام ٹیلیفون آ چکے ہیں میرے نام کہ اگر میں نے کسی مُسلمان لڑکی کی طرف نظر اُٹھائی تو اچھا نہ ہو گا!"

"ارے واہ!" میں کھِلکھِلا کے ہنس پڑی۔ "ایسے ایسے تو جانے کِتنے فون میرے نام آتے ہی رہتے کہ اگر میں نے اُس ہندو لڑکے کے ساتھ میل جول نہ چھوڑا تو اچھا نہ ہو گا!

"ارے کیا اچھا نہ ہو گا بھئی؟"

"بھلا پُوچھئے ٹیلیفون کرنے والے لوگ کون ہوتے ہیں۔ اُنھیں اِتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے ایک ہندو لڑکی اور مُسلمان لڑکے کی یا ایک مُسلمان لڑکی اور ہندو لڑکے کی شادی یا دوستی سے۔ دُنیا کے نظام میں کیا فرق

آجائے گا۔ یہ دکھ سکھ، شادی وغیرہ کتنا ذاتی مسئلہ ہے۔ لیکن نرمل تو بالکل ہی گھبرا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے باپ نے تو اسے گھر سے نکال دینے اور جائداد سے بے دخل کر دینے کو بھی کہا ہے۔

"یہ تو بہت ہی اچھا ہے" میں نے ہنس کے کہا "پھر تو ہم دونوں آزاد ہیں۔ نہ کوئی جائداد، نہ کوئی مذہب ——— بس ہم اور تم!"

آنٹی دیپا نیچے چلی گئی تھیں۔ نرمل اور میں بالکونی کی ریلنگ ——— سے لگے ہوئے دوپہر کے غضبناک سورج کی کرنوں کو سمندر کی شیتل لہروں میں گم ہوتے دیکھ رہے تھے۔ سورج کا چہرہ بالکل میرے ابا جان کے چہرے کی طرح دہکتا نظر آرہا تھا اور میں سورج سے آنکھیں ملاتے ہوئے ڈر رہی تھی جیسے ابا جان کا سامنا کرنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ نرمل کا ہاتھ میں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ بہت ٹھنڈا ہاتھ تھا۔ مجھے غصہ آنے لگا "نرمل تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم کیوں ایسے ہو گئے ہو؟ جیسے میں تم سے پہلی بار مل رہی ہوں"

نرمل سے پہلی بار جوہو کے ساحل پر ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ہولی کا دن تھا۔ رنگ رلیاں منا کے ٹولیاں سمندر میں نہا رہی تھیں۔ ہمارے کالج کے بھی لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک گروپ اس دن جوہو پر موجود تھا۔ نرمل میری سہیلی سنیتا کا بھائی تھا۔ اسی شام کو نرمل سنیتا کے ساتھ میرے گھر آیا تھا۔ وہ کالج چھوڑ چکا تھا اور اپنے باپ کی بزنس کے طور طریقے سیکھنے میں مصروف تھا۔ میرے ابا جان تو وکیل ہیں۔ نہ بہت امیر نہ بہت غریب۔ ہم لوگ بس ایسے ہی تھے۔ نہ کبھی بھوکے رہے۔ نہ کبھی کسی کے گلے کاٹے۔ بس ہماری تقدیر تو وہی تھی جو ہمارے دیش کے کروڑوں درمیانی درجے کے انسانوں کی تقدیر ہے! ویسی ہی غیر یقینی۔ ویسی ہی معمولی۔ ویسی ہی جدّوجہد سے معمور!

نرمل بڑے آدمی کا بیٹا تھا۔ لیکن ہمارے درمیان کبھی اور کچھ آیا ہی نہیں۔ ہمارے درمیان تو ناریل کے سایے تھے۔ سمندر کے ساحل تھے۔ رستوراں کے نیم تاریک گوشے تھے۔ ہم تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے لمبی سیروں کو جاتے تھے اور ناریل کا پانی پیتے تھے اور کھلی ہوا میں جیتے تھے۔ یہی نرمل کی زندگی تھی، یہی میرا جیون تھا۔

ہمارے گھر آنے جانے والے لوگ جدا جدا مذہب کے ماننے والے تھے۔ ابا جان کو دیپا آنٹی راکھی باندھتی تھیں اور ٹیکہ لگاتی تھیں۔ ابا جان انھیں شگون کے روپے دیتے تھے۔ مرلی چاچا عید کے دن ہمارے گھر آتے تو مجھے عیدی دیتے تھے۔ نرمل شب برات کا انتظار کرتا تھا اور نہ جانے کتنا حلوہ مانگ مانگ کر کھا جاتا تھا۔ مجھے دیوالی کا تیوہار کتنا پیارا معلوم ہوتا تھا۔ ہر طرف روشنی اور اجالا ——— اور نکھار ——— عبدل گیارہویں کی نیاز دلواتا تھا اور بسنتا مہالکشمی کے مندر سے لایا ہوا پرساد ہمیں دیتا تھا۔ اس وقت تو ابا جان نے کچھ نہ کہا تھا ——— اور کوئی گمنام ٹیلیفون ہمارے گھر نہ آیا تھا ——— پھر ——— اگر نرمل نے اور میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عید اور دیوالی ہولی اور شب برات ساتھ منانے کا فیصلہ کیا تو کیوں یہ قیامت برپا ہو گئی؟

لیکن مجھے ابا جان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ عام طور سے باپ یہی کرتے ہیں۔ گو انھیں ایسا کرنا نہ چاہیے۔ لیکن نرمل کی بزدلی سے مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں بجھ گئی اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اِس ٹھنڈے ٹھنڈے سے منجمد نرمل کو کیسے ہمت اور حوصلے کی بھٹی میں تپا دوں۔ نرمل سے میں نے کہا "نرمل تمھیں یاد ہے اس دن ہم ہینگنگ گارڈن گئے تھے؟"

"ہوں" نرمل نے کہا۔

"جہاں ہم بیٹھے تھے وہاں سے نیچے میرین ڈرائیو کا منظر کتنا دلکش تھا۔ بمبئی ایک سجی ہوئی دلھن کی طرح نظر آرہی تھی۔ میرین ڈرائیو سے چوپاٹی تک روشنیوں کی لمبی قطار دلھن کے گلے میں پڑے ہوئے منگل سوتر کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ ۔ ۔ معلوم ہو رہی تھی نا؟"

"ہاں" نرمل نے کہا۔

"اور وہیں ہم نے طے کیا تھا کہ جب ہماری شادی ہوگی تو میں اپنے گلے میں خوبصورت سا منگل سوتر پہنوں گی۔ یاد ہے تمھیں ———؟"

"یاد ہے" نرمل نے کہا۔

میں نرمل سے سب کچھ، بہت کچھ کہتی رہی۔ لیکن نرمل خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ ۔ ۔ پھر وہ چلا گیا۔ یہ کہہ کر کہ وہ جلدی ہی میرے پاس آئے گا۔ میں نے اس کا انتظار کیا۔ اسے ٹیلیفون کیا۔ آخر شام کو میں جلترنگ ہوٹل پہنچ گئی۔ اپنے اور نرمل کے پسندیدہ گوشے میں بیٹھ کے میں اس کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہاں تو کوئی اور جوڑا بیٹھا تھا۔

میں دبے پاؤں چپکے چپکے اس کونے تک پہنچ گئی۔ لڑکی خوبصورت تھی اور بہت خوش نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ چمک ——— تھی جو پیار کے پہلے لمحے میں ہوتی ہے۔

لڑکا اٹھا۔

لڑکی بھی اٹھی۔

لڑکی نے مجھے دیکھا۔

میں نے نرمل کو دیکھا۔ نرمل نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ تو اُسی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔۔ ۔ دیکھے جا رہا تھا۔

وہ دونوں چلے گئے۔

میں نے اپنے پرس میں رکھے ہوئے منگل سوتر کو دیکھا۔ پیچھے مڑ کر اپنی بیس سال کی زندگی کو دیکھا۔ جوہو کے ساحل کو دیکھا۔ گلابی شفق کو دیکھا۔ بہتے ہوئے پانی کو دیکھا۔

پھر میں دیر تک اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے پانی کو سمندر کی ریت میں جذب ہوتے دیکھتی رہی۔ ۔ ۔ اور جب سورج ڈوب چلا، اُمید ڈوب چلی تو کسی نے دھیرے سے میرے کان میں کہا "لگن منڈپ کا وقت ہو گیا!"

نیند کی گولیاں میں نے پرس میں سے نکال لیں اور ایک دیوار سے ٹیک لگائے لگائے میں نے اپنے گلے میں منگل سوتر پہن لیا تھا۔"

لڑکی اِتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ وہ چُپ چاپ لیٹ گئی اور اُس نے چادر اپنے مُنہ پر لے لی۔ مُردہ بھکارن نے بھی اپنی آنکھیں موند لیں۔ اچانک ۔۔۔ اُس کے کانوں میں ایک ننھے منے بچے کی کمزور سی آواز آئی

"بھکارن ماں!"

بھکارن نے خوف سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

آواز لڑکی کی چادر میں سے آ رہی تھی "تم نے اِس عورت کی کہانی تو سُن لی ۔۔۔ میں اپنی کہانی کیسے سُناؤں ۔۔۔!!"

مدیرِ "بیسویں صدی" کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

غزل

ڈاکٹر زیدی جعفر رضا ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی (علیگ)

رو میں جذبات کی بہہ گئے
جو نہ کہنا تھا وہ کہہ گئے

چند لفظوں کے طوفان میں
دو دِلوں کے مکاں ڈھہ گئے

زندگی ۔۔ تیری دہلیز پر
حسرتوں کے قدم رہ گئے

غم اُٹھانے کے عادی نہ تھے
جانے کیسے یہ غم سہہ گئے

اپنے اشکوں کے سیلاب میں
تم بھی جعفر نہ کیوں بہہ گئے

غزل

پروفیسر بیتاب پیلی بھیتی۔ ایم۔ کام (علیگ)

کیسے مٹتے ہیں دِل سے وفا کے نقوش
آپ ملتے تو میں پوچھتا آپ سے

اشکِ غم بھی پیے ہونٹ بھی سی لئے
کس نے پھر دردِ دل کہہ دیا آپ سے

دُور رہ کے بھی نظروں سے دل میں رہے
کچھ نہ کچھ تو تعلق رہا آپ سے

دل کے جتنے قریں آپ آتے گئے
اِتنا بڑھتا گیا فاصلہ آپ سے

دِل کی بربادیوں کا ہر اِک سلسلہ
کیا خبر کس طرح جا ملا آپ سے

افسانہ

ہونٹوں تک آئی ہوئی بات

عظیم اقبال ایم۔ اے

گنج ۱، بتیا (بہار)

بندہ نواز! اسلام ورحمت

مزاج کیسا ہے حضور کا؟ آپ چپکے سے افسانے کی رسید بھیج دیتے ہیں اور اپنی خیریت کے چند جملے نہیں لکھ پاتے۔ کیسا ظلم ہے یہ! اکرم فرما! قلمی چہرے لکھ کر کتنوں کو سرِ راہ بے نقاب کریں گے؟ واقعی، السٹریٹڈ ویکلی اور شنکرس ویکلی میں جو شخصیات کے خاکے شائع ہوتے ہیں وہ بھی آپ کی تحریر کی چبھن کو نہیں پا سکتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے چند سطور میں آپ نے متعلقہ شخصیت کی نفسیات اور اس کے صحیفۂ حیات کے سارے اوراق اُلٹ دیئے ہوں۔ دِلّی کا خط لندن کے نام بھی خوب تر ہے۔ تیر و نشتر تو ہمیشہ سے لاجواب ہوتے ہیں ——— میرے بیشتر قارئین مُصر ہیں کہ میں صرف عورت کی نفسیات کی تصویر کشی ہی اپنے افسانوں میں کروں۔ لیجئے، یہ بھی ایک عورت ہی کی کہانی ہے "ہونٹوں تک آئی ہوئی بات" پڑھیئے اور داد دیجئے۔۔۔

خلوص کیش ——— عظیم اقبال

★

کوئی اور تو نہیں تھا وہاں، اس کی اپنی ہی آنکھیں ہر طرف سے جھانک ——— رہی تھیں۔ بند دریچوں سے، بند کواڑوں سے، بلند روشندانوں سے، نیم شفاف دبیز شیشوں سے، مینٹل پیس پر رکھی بند پلکوں والی آبنوسی گوتم بدھ کی مورتی نے بھی شاید اپنی آنکھیں کھول لی تھیں۔ کرشن کنہیا کی بنسری بھی جیسے بج اُٹھنے کے لئے بے قرار تھی۔ آئینہ کے سامنے ہیما کی نگاہیں اپنے سراپا پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ لچکتی ہوئی باہنیں، یہ اُمڈتا ہوا شباب، یہ لپکتے ہوئے شعلے!

اُس کے اندر، رگوں میں، شریانوں میں طوفانی لہریں رواں دواں تھیں۔

چہرہ سُرخ ہو رہا تھا، لویں انگارہ ہو رہی تھیں۔ جیسے دہک دہک کر کوئی لکڑی یکایک سُرخ اُٹھے، اپنے آپ میں وہ کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ اُس کی پوریں آگ اُگل رہی تھیں۔ اُس کے تن بدن میں چنگاریاں سی سُلگ اُٹھی تھیں۔ اندر ہی اندر کہیں دُور، دبی ہوئی برف پگھل کر اب لاوا بن چکی تھیں۔

بیتل کی تپائی پر اپنا ریشمی لبادہ اُتار کر اُس نے رکھ دیا تھا۔ پہلے شرمائی تھی، ذرا جھجکی تھی، اب کُھل کر سامنے تھی۔ اپنی شبیہ کے سارے نشیب و فراز اُس پر عیاں تھے۔ ہلکی ہلکی سپیدی، ہلکی ہلکی زردی، ہلکی ہلکی سُرخی اُس کی جلد میں گھل گئی تھی۔ دائیں طرف شانوں سے نیچے، بہت نیچے، ایک ننھا بھورا سا تِل تھا۔ پھر کولھوں کے پاس بڑا سا سیاہ تِل تھا۔ کمر کو جیسے تراش تراش کر ہموار بنایا گیا تھا۔ کولھوں میں تراش خراش کی اب بھی ضرورت تھی۔

وہ آگے کی طرف جُھکی، اور جُھکتی چلی گئی۔ پھر ایک جھٹکے سے اُٹھی۔ سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ چہرے پر سُرخی جھلک آئی تھی۔ بالوں کو جھٹکتے ہوئے وہ زیرِ لب مُسکرائی۔۔۔ پھر بازوؤں کو لہراتے ہوئے اوپر اُٹھایا، ہتھیلیوں کو مِلایا، تن کر انگڑائی لی۔ اُس کی آنکھیں نشے میں بھیگ گئیں۔ اُن میں سُرخ ڈورے تیر گئے۔ اپنے اندر دھیمی دھیمی لپک وہ محسوس کر رہی تھی۔ مدّھم مدّھم سی سنسنی، تھکی تھکی، بوجھل بوجھل سانسیں اُسے ایک عجیب سی لذّت سے آشنا کر رہی تھیں۔ چاروں طرف اُسی کی شبیہیں جیسے آراستہ پیراستہ ہوں ——— وہی زُلفیں، وہی شلوفہ، وہی بازو، وہی خوبصورت خطوط۔۔۔ جھٹکے سے وہ کپکپا کر رہ گئی جیسے ہزاروں نگاہیں اُس کے روئیں روئیں میں پیوست ہوئی جارہی ہوں۔

جب کبھی وہ اپنے آپ میں کھوئی ہوتی اُسے ایسا ہی محسوس ہوتا۔ ایسی ہی گمنام گھڑیوں میں وہ اپنی اُنگلیاں روئی کی اُنگلیوں سے

ہم آغوش پاتی۔ کومل، لانبی، مُسبک مُسبک انگلیاں، نرم و نازک ہتھیلیاں تپنے لگتیں۔ اُس کی کلائیوں میں چوڑیاں کھنکتیں تو روی کے ہاتھوں کا لمس یاد آجاتا۔ کتنی ہی بار آہستگی سے اُس نے اُس کی چوڑیاں اُتار لی تھیں، آہستگی سے پہنا بھی دی تھیں۔ اچانک ہی کوئی شیشہ ٹوٹ گیا، ذرا سی خراش پڑ گئی تو وہ بے قرار ہو گیا۔ اپنے جلتے، تپتے ہوئے لبوں میں رِستا ہوا خون جذب کر لیا، جیسے زہر چُوس لیا ہو۔ اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ کوئی ننھا سا پھول ہوا کے دوش پر جیسے لہرا لہرا جائے، ویسے ہی وہ جھوم اُٹھی!

کبھی مچلتی اٹھلاتی تنہائی میں اُس نے اُس کا آنچل کھینچ ڈالا ہو، وہ سمٹتی جا رہی ہو، اپنے آپ میں سمائی جا رہی ہو، اُس کے بدن کی ساری تھرکنیں تحلیل ہو کر آنکھوں میں جم سی گئی ہوں۔ اُس نے اپنی گھنیری زلفوں کو اُس کی گردن میں لپیٹ لپیٹ دیا ہو، پیشانی پر بکھرا دیا ہو، رُخساروں پر اُلجھا دیا ہو ——— روی نے اُس کے کانوں میں سُنہری بالیاں پہنا دی ہوں اور بادلوں کے بیچ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے چاند کے ہالے کو نظروں میں اُتار رہا ہو ——— گلے میں شفّاف موتیوں کی لڑی سجا دی ہو اور گردن میں پڑے موہوم سے خم کو چھُو لینے کے لیے اُس کے ہونٹ کانپ رہے ہوں۔

صبح کی ضوفشانی کے جلو میں کلیوں پر، پھُولوں پر، سبزوں پر شبنمی موتیوں کی جھلملاہٹوں میں دونوں گُم ہو جائیں۔ غنچوں کی خندہ زنی اُس کی اپنی ہی تو ہے! پھُولوں کا یہ نکھار، اُس کے اپنے جلوؤں کا پرتو ہی تو ہے!! یہ سُرخ گُلاب ویسے ہی ہیں جیسے اُس کے سُلگتے دہکتے لب! جوہی کی، بیلے کی یہ کلیاں ویسی ہی ہیں جیسے اُس کے چمکتے دمکتے رُخسار! شبنم کے اِن قطروں میں ویسی ہی جھلملاہٹ ہے جیسے اُس کی آنکھوں کی خیرہ کُن جگمگاہٹ!!

جھُلستی ہوئی کوئی دوپہر درختوں کی خُنک چھاؤں میں بیت جائے ——— دُور تک خاموشی ہو، اتھاہ سنّاٹا۔ اُس کے زانوؤں پر اُس کا سر ہو، آنچل ڈھلک گیا ہو، گیسو بکھر گئے ہوں۔ آہستہ آہستہ وہ جھکے، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے، دونوں کے لب مرتعش ہوں، ہتھیلیاں کَستی چلی جائیں، حلقے سمٹنے لگیں۔ وہ اُس کے سینے میں چھُپ جائے ——— اُس کی دھڑکنیں رُک جائیں، سانسیں تھم جائیں . . .

سُرمئی، من موہنی سی کوئی شام اُس کے بغیر اُداس اُداس بن جائے۔ ہواؤں کی اٹھکیلیاں جسم کو گُدگُدا بھی نہ پائیں، غروبِ آفتاب فسردہ معلوم ہو، اُفق کی سُرخی دل آزار سی محسوس ہو، حدِ نظر تک درخشاں ستارے دم توڑتے ہوئے سے معلوم ہوں۔ ماہتاب کی رُوپہلی کرنیں سوتے ہوئے درد کو جگا دیں!!

خوشبوئے انّی، نارِ دل بھری کتنی ہی راتیں بے قرار کروٹوں کی سلوٹوں تلے گُم ہو جائیں۔ نیم وا پلکوں میں وہ ہی وہ، کھُلی آنکھوں میں وہ ہی وہ! تنہائی کی یہ کسک، یہ ہُوک، یہ بے قراری، یہ سوگواری! بدن کی یہ اینٹھن رگ و پے کی جلن، تپش ——— جیسے اندر ہی اندر کہیں آتش فشاں پھٹ پڑنے کے لیے بے قرار ہو! ساون کی گھنگھور گھٹائیں جب جھوم جھوم کر برسیں تو محسوس ہو جیسے اپنی آنکھوں کے سارے قطرے، سارے آنسو فضا میں چھا گئے ہوں!

وہ جیسے درد کے ساز پر چھیڑا ہوا کوئی نغمہ ہو ———!

اپنے جسم پر، اپنے رُخ پر نگاہیں جما کر وہ کھوئی ہوئی سمتیں، گُمنام منزلیں، مبہم سے نقوش تلاش کرتی ——— وہ بِکھلتا ہوا قد، وہ سمٹی سمٹی قوسیں، وہ جاگے جاگے سے خطوط، وہ جھکی ہوئی گردن، وہ تمتماتے ہوئے رُخسار، وہ کھلائی ہوئی آنکھیں، وہ کرنوں سے سجی پیشانی، وہ لہراتے ہوئے گیسو ——— کن وادیوں میں، کن پنہائیوں میں گُم گئے!؟

تو پھر اُس شب تنہائی میں روی نے پیار سے کیوں سرگوشی کی تھی ———

'ہیما! میری جان! تمھاری طرح حسین، دلکش، دلفریب، طرح دار، کوئی دوسری عورت اِس کائنات میں نہیں . . . تم بہت خوبصورت ہو . . . بہت خوبصورت!!'

وہ محسوس کرتی ہے جیسے اُس کا دَم گھُٹ جائے گا۔ نڈھال نڈھال سی ہو کر وہ اپنے آپ میں کھو جاتی ہے!!

غزل

ابرؔ احسنی گنوری

فیض پا چکے ہیں جمالِ بشر سے ہم
بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے متاعِ نظر سے ہم

دونوں میں کس نے لوٹ لیا کچھ پتا نہیں
رہزن پہ شک کریں کہ بچیں راہبر سے ہم

سجدے تمہارے آستاں پہ گوارا نہ کر سکے
پھوڑیں اب اپنے سر کو کہو کس کے در سے ہم

پھر کون موڑ [illegible] رخ بتاؤ
اُتریں اگر [illegible] سے ہم

سب کو ہمارے دفن کی جلدی ہے کس قدر
معلوم اب ہوا کہ زیادہ تھے گھر سے ہم

تاروں میں جس کے ہوں نہ سکوں کی تجلیاں
کرتے کبھی وہ شام بھی پیدا سحر سے ہم

ظلمت بدوش شمس و قمر ہیں تو غم نہیں
روشن کرینگے دہر کو داغِ جگر سے ہم

جو بھی سنے تو سمجھے کہ ہے عیب بھی ہنر
کرتے ہیں اپنے عیب بیاں اس ہنر سے ہم

اُڑنا پڑے گا دے کے قفس بھی کبھی نہیں
پھر ایسے بے نیاز ہیں کیوں بال و پر سے ہم

نہلا گئی شراب میں جب اُٹھ کے جھک گئی
کیا چاہتے ہیں اور کسی کی نظر سے ہم

ملتے ہیں کس لباس میں رہرو کو راہزن؟
یہ راز ابرؔ پوچھیں چلو راہبر سے ہم

غزل

رشیؔ پٹیالوی

بھٹکا ہوا کچھ ایسا منزل سے کارواں ہے
جو بھی ہے کارواں میں گُم کردہ نشاں ہے

جلوے بھی ہیں مقابل آنکھیں بھی ہیں سلامت
لیکن دمِ نظارہ نظروں میں دم کہاں ہے

اے صبح کے اُجالو! اے شام کے دُھندلکو!
میں کس مقام پر ہوں منزل مری کہاں ہے؟

جن بجلیوں کی زد میں کل میرا آشیاں تھا
اُن بجلیوں کا مسکن اب میرا آشیاں ہے

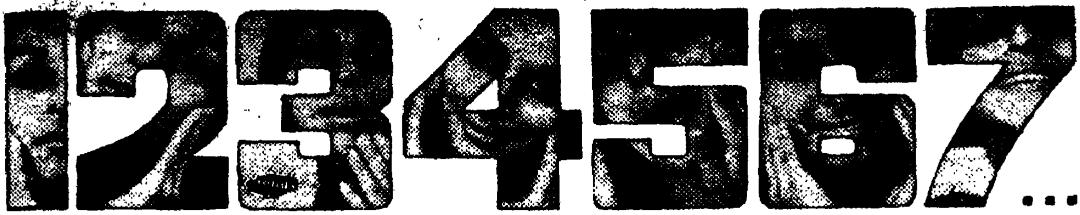
دوہرائی جا رہی ہے عنواں بدل بدل کر
جو داستاں ہے اپنی، دونوں کی داستاں ہے

مجھ کو جواب دے کر اس کا جواب دینا
وہ رسمِ دوستی کا وعدہ ترا کہاں ہے

تارِ نفس کٹے تو کٹ جائے یہ بھی شاید
جو فاصلہ ہمارے دونوں کے درمیاں ہے

یا دل میں آرزو تھی یا آرزو میں دل تھا
وہ دل میں آ گئے تو اب آرزو کہاں ہے

گزرے ہیں وہ جدھر سے وہ سرزمینِ منزل
پوچھو مجھے رشیؔ تو رتبہ میں کہکشاں ہے



آٹھویں دن میری جلد بالکل صاف، ملائم اور خوبصورت ہو گئی

پونڈز کے ۷ دن والے حسن افزا پلان

کی بدولت میرے رنگ و روپ میں نئی زندگی آگئی۔

میں اپنی بھدی اور بے رنگت شکل سے بہت پریشان تھی کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا اور سنیل کے ساتھ رات کے کھانے کی خاص دعوت کو صرف ۸ روز باقی رہ گئے تھے۔ میں مایوس ہو گئی۔ اچانک مجھے سنیتا کا خیال آگیا جس نے مجھے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ پونڈز کے ۷ دن والے حسن افزا پلان نے اس کے رنگ و روپ کو کس طرح نکھار دیا تھا۔ میں نے بھی اس پلان پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حسن افزا پلان اور اس پر عمل :

ایک ہفتہ تک ہر روز رات کے وقت ایک بار نہیں دو بار میں نے اپنے چہرے پر پونڈز کولڈ کریم لگانا شروع کیا۔ پہلی بار دن بھر کی میل اور دن بھر کا میک اپ صاف کرنے کے لیے۔

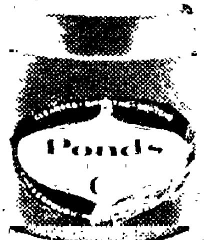
دوسری بار استعمال سے حسن کا راز کھل گیا!

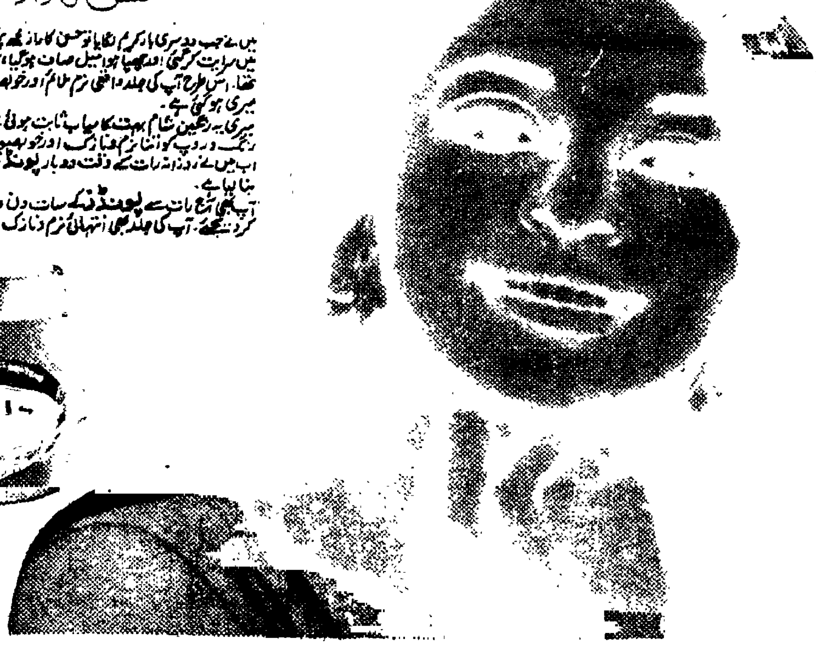
میں نے جب دوسری بار کریم لگایا تو حسن کا راز مجھ پر کھل گیا۔ کریم مسامات کی گہرائیوں میں سرایت کر گئی اور چھپا ہوا میل صاف ہو گیا، جو پانی اور صابن سے نکلتا نہیں تھا۔ اس طرح آپ کی جلد واقعی نرم ملائم اور خوبصورت ہو جائے گی جس طرح کہ میری ہو گئی ہے۔

میری یہ رنگین شام بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ سنیل نے کہا "میں نے تمہارے رنگ و روپ کو اتنا نرم و نازک اور خوبصورت پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

اب میں نے روزانہ رات کے وقت دو بار پونڈز کولڈ کریم کا استعمال اپنا معمول بنا لیا ہے۔

آپ بھی آج رات سے پونڈز کے سات دن والے حسن افزا پلان پر عمل شروع کر دیجیے۔ آپ کی جلد بھی انتہائی نرم و نازک اور خوبصورت ہو جائے گی۔





P 4958A

پونڈز کولڈ کریم — جلد کی صفائی کیلئے دنیا میں زیادہ استعمال ہونے والی کریم

چیزبرو پونڈز انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو ایس اے میں تشکیل شدہ)

افسانہ

یہ نہ تھی ہماری قسمت

ناز قادری ایم۔ اے

یونائیٹیڈ بائیڈ اینڈ اسکن کمپنی۔ برہم پورہ مظفر پور۔

ناز نام، خوش تنہ بھائی، خلوص ہے ہر

بقول مظہر امام سے

آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے چاہا تھا کبھی

اور میں یہ کیسے کہہ دوں کہ آپ مجھے بھول گئے ہیں جب کہ ہر ماہ "بیسویں صدی" پابندیِ وقت کے ساتھ موصول ہو رہا ہے۔ یہ آپ کے اخلاص و محبت کا ثبوت ہے ——— بزم "بیسویں صدی" سے طویل غیر حاضری پر قارئین کو محبت گلہ ہے کہ میں نے لکھنا کیوں ترک کر دیا ہے۔ حالانکہ اس اثنا میں میری تخلیقات کچھ دوسرے رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن اپنے فن کی زندگی کا ثبوت دینا ہے تو "بیسویں صدی" میں بھی لکھنا ناگزیر ہے۔ یہ اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ میری خاموشی کا واحد سبب میرے نام کے بعد کی تبدیلی ہے ——— یہ خبر آپ کے لئے بھی موجبِ مسرت ہوگی کہ میں نے ایم۔ اے کے امتحان میں ٹاپ کیا ہے اور یونیورسٹی کی جانب سے طلائی تمغہ پانے کا افتخار مجھے حاصل ہوا ہے ——— بہر کیف ایک نئی تخلیق ارسالِ خدمت ہے۔ میں نے چند کرداروں کی دُکھتی رگوں پر انگلی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے؟ یہ آپ کی فن شناس نگاہ بتائے گی یا پھر "بیسویں صدی" کے ذہین قارئین . . .

خلوص آگیں ——— ناز قادری

★

اور میری نظریں فرحت پر جم سی گئی ہیں۔

یادوں کے دیئے جگمگا اُٹھے ہیں، ذہن کے پردے پر ماضی کی تصویریں اُجاگر ہو گئی ہیں اور رومال نے مجھے آج سے پانچ سال پیچھے دھکیل دیا ہے ———

کلاس میں پہنچتے ہی کریم کے چاروں طرف طلباء کا ہجوم دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ آج ضرور کوئی نئی بات ہوئی ہے کیوں کہ وہ ایک طرح سے کالج کا نیوز بیورو تھا۔ کس شعبے میں کیا ہو رہا ہے، کہاں کون سا نیا واقعہ ہوا ہے، کس لڑکی کا کردار کیسا ہے، کون پروفیسر کس مولنزا کے تبسم کا شکار ہے اور کس لڑکے کا نام بلیک رجسٹر میں درج ہوا ہے ——— یہ ساری باتیں وقت سے پہلے ہی کریم کو معلوم ہو جاتیں اور پھر جنگل کی آگ کی طرح کالج کی عمارت کے گوشے گوشے میں پھیل جاتیں۔

"کیا بات ہے؟" میں نے کریم کو مخاطب کیا۔

"مولانا! اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بھی ایک بلبل نے داخلہ لیا ہے" کریم نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ——— "اب جان آگئی ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں!!"

یوں تو کالج میں سیکڑوں لڑکیاں تھیں لیکن اردو ڈیپارٹمنٹ قدرت کے اس حسین شاہکار سے محروم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شعبۂ اردو میں آفتاب کی تمازت تھی نہ چاندنی کی ٹھنڈک، گل و لالہ کی خوشبو تھی نہ قوسِ قزح کی رعنائیاں! قدرت کے اس عطیے سے محرومی کا واحد سبب صدرِ شعبہ ڈاکٹر فاروقی کی

مولویت تھی۔ لیکن جب فرحت کے داخلے کی خبر مشہور ہوئی تو جیسے اُجڑے چمن میں بہار آگئی، تپتے صحرا میں پھول کھِل اُٹھے اور طلباء متحیّر تھے کہ ڈاکٹر فاروقی جیسے زاہدِ خشک کی مولویت کہاں چلی گئی؟ لیکن دوسرے ہی دن معلوم ہوا کہ فرحت نے سائیکولوجی میں آنرز لے رکھا ہے۔ اُردو آنرز کے طلباء کے چہروں پر ایک بار مایوسیوں کی گھٹا چھا گئی اور منچلے لڑکوں کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

فرحت بہت جلد کالج میں مقبول ہوگئی۔ وہ جتنی خوبصورت تھی اُس سے کہیں زیادہ اُس کے حُسن کی شہرت ہوئی۔ طلباء ہی نہیں اساتذہ بھی اُس کی شان میں قصیدے پڑھنے لگے۔ ہر شخص اُس کا نام لے کر اپنے دل میں فرحت سی محسوس کرتا۔ اُس کے آتے ہی سارا کالج سُدھا، بھارتی، روزی اور بِملا کو بھول گیا۔ اب تو کوئی غلطی سے بھی نہ کہتا کہ بھارتی کے حُسن کی سادگی میں ایک پُرکاری ہے، سُدھا کے متناسب جسم اور اُبھرتے خطوط میں دلکشی و دلربائی ہے، روزی قیامت ہے اور بِملا کی شخصیت پُروقار ہے۔ فرحت نے بھارتی کے پرستاروں کو اپنا گرویدہ بنالیا، سُدھا پر مرنے والے اُس کے مدّاح ہوگئے، روزی کے شیدائی اُس میں دلچسپی لینے لگے اور بِملا کے چاہنے والوں کے دل فرحت کے لئے بیقرار رہنے لگے۔ کالج کینٹین سے لے کر لائبریری اور کامن رُوم تک فرحت کا ذِکر ہونے لگا۔ وہ کون سی محفل تھی جہاں وہ موضوعِ گفتگو نہ تھی۔ کالج کے در و دیوار سے فرحت! فرحت!! کی صدائیں آنے لگیں جیسے فرحت کا نام لینا ہر شخص کا فریضہ ہو اور اُس کے نام سے اُن سب کو سکون و قرار ملتا ہو۔ لیکن وہ خوددار و غیور لڑکی تھی، وہ کسی کو لفٹ نہ دیتی تھی۔

فرحت عام خد و خال کی حسین لڑکی تھی۔ اُس کا باپ نہ تھا، ایک بہن تھی اور ماں کسی گرلس سکول میں ٹیچر تھی۔ اُن کی معاش کا مدار ماں کی ملازمت پر ہی تھا۔ وہ اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں رہ کر تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ وہ جدید فیشن کی دلدادہ تھی اور ہمیشہ سجی رہتی تھی، جھیل سی آنکھوں میں کاجل، رُخساروں پر غازے کی ہلکی سی تہ اور جسم سے لپٹے ہوئے جدید لباس سے حُسن و شباب کی کرنیں پھوٹتی رہتی تھیں۔ جب وہ ساڑی پہنتی تو اُس کی دلکشی و رعنائی اور بڑھ جاتی۔ وہ آئینہ کی طرح چمکنے لگتی اور اُس کی چال میں عجیب شان و تمکنت پیدا ہو جاتی۔

فرحت کالج کی ہر Activities میں حصّہ لیتی۔ وہ لیڈیز کامن رُوم کی سکریٹری بھی منتخب ہوئی لیکن کسی لڑکے کو مُنہ نہ لگاتی۔ آخرکار اُس کی اِس بے اعتنائی نے افواہوں کو جنم دیا۔

"فرحت پروفیسر سبحانی کی کیپٹ ہے" نیازی انکشاف کرتا۔

"لیکن پرویز اُس سے محبت کرتا ہے!" اعجازی کی آواز اُبھرتی۔

"فرحت بھی شاید پرویز کو چاہتی ہے!" نسیم بولتا۔

"پھر کیا ہوا؟ کیا محبت کوئی جُرم ہے؟" میں کہتا۔

"یہ بات نہیں جناب! توبہ کیجئے اُس کمبخت نے . . ."

"اجی مولانا اِسے آپ محبت کہتے ہیں!؟" ——— کریم نے اعجازی کی بات کاٹتے ہوئے ایک بار مجھ سے کہا ——— "یہ محبت نہیں محض ہوس ہے ہوس!!"

"بھئی اُس کے کئی پرستار ہیں اور وہ ہر ایک میں دلچسپی لیتی ہے" نعیم نے اپنی واقفیت کا اظہار کیا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا" ——— میں نے کہا ——— "عورت صرف ایک سے محبت کرتی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں صرف ایک کو چاہتی ہے، اُس کے من مندر میں ایک ہی دیوتا ہوتا ہے جس کی پُوجا وہ تادمِ حیات کرتی رہتی ہے۔"

"پھر وہی محبت! کہہ تو دیا یہ ہوس ہے!" کریم نے آخری لفظ پر زور دیا۔

فرحت سے پہلی ملاقات سائیکولوجی ڈپارٹمنٹ کے قریب ہوئی تھی۔ میں اُدھر سے گزر رہا تھا کہ ایک ہلکی سی نغمہ بار آواز فضا میں لہرائی۔

"سُنئے!"

اور میں نے مُڑ کر دیکھا تو فرحت سُبک روی سے میری جانب آرہی تھی۔

"کیا آپ میری مدد کرسکتے ہیں؟" اُس کے گلابی ہونٹوں پر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیوں ——— ؟ کیا بات ہے ——— ؟؟"

"آج پریکٹیکل ہے، اگر آپ میرا اسبجکٹ . . ."

"لیکن . . ."

"میں آپ کی ممنون ہوں گی" اُس کے لہجے میں التجا تھی اور ہونٹوں کا تبسّم کافور ہو چکا تھا۔

اور نہ جانے میں کس جذبے کے تحت تیّار ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز چُپکے سے میرے دل کے آنگن میں اُتر آئی ہو۔

میں فرحت سے مِلتا اور اُس سے بے تکلّف ہونا نہیں چاہتا تھا جب کہ دوسرے طلباء ہمیشہ اُس کی قُربت حاصل کرنے کے مواقع تلاش کرتے رہتے تھے مگر وہ کسی کو لفٹ نہ دیتی تھی۔ پھر بھی فرحت سے اکثر میری ملاقات ہو جاتی ——— کبھی لائبریری میں تو کبھی کالج کینٹین میں۔ جب لڑکے مجھے فرحت سے باتیں کرتے اور اُس کے ساتھ کالج کینٹین میں چلتے پھرتے دیکھتے تو اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتیں اور پھر کالج میں فرحت کے ساتھ میرا بھی چرچا ہونے لگا۔

"دل ہی تو ہے اور وہ بھی شاعر کا دل!" اعجازی کہتا۔
"کہئے جناب شاعری خوب ہو رہی ہے نا؟" اسلم بولتا۔

لیکن میں اُن باتوں پر دھیان نہ دیتا کیوں کہ مجھے خود پر اعتماد تھا اور خود اعتمادی زندگی سنوارتی ہے۔

آئے دن فرحت کے بارے میں انکشافات ہوتے رہتے اور اُس کی زندگی کی دھوپ چھاؤں معلوم ہوتی رہتی۔

"فرحت کرپٹیڈ ہے" حیدری رازدارانہ لہجے میں کہتا۔

"لاحول۔ ۔" اسلم عینک صاف کرتا۔

"ارے تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" عابدی کہتا "کچھ بھی ہو تمھیں اس سے کیا مطلب؟"

"ہاں جی چھوڑو اِن باتوں کو۔ کوئی اور موضوع نہیں ہے؟" فہیم کی نحیف آواز اُبھرتی۔

"جدید فیشن نے تو لڑکیوں کو آزاد ہی کر دیا ہے" راشدی نے اظہارِ خیال کیا۔

مجھے یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ عابدی کو بھی غصہ آ گیا۔ اُس نے بغیر کسی تمہید کے راشدی سے کہا۔

"کسی پر کیچڑ اُچھالنا کہاں کی شرافت ہے؟"

راشدی نے خشمگیں نظروں سے عابدی کو دیکھا اور ملائم لہجے میں کہا۔

"فرحت کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے"

"آپ چُپ رہئے، آپ کچھ بھی نہیں جانتے!" عابدی مُنہ سکوڑتے ہوئے بولا۔

نہ جانے کتنی باتیں کالج کی فضا میں پھیلی ہوتی رہیں اور فرحت اُن سب سے بے نیاز اپنی راہ پر گامزن رہی۔

فرحت ہر وقت شگفتہ اور تر و تازہ رہتی۔ شبنم کے قطروں سے دُھلے ہوئے گُلاب کی طرح اُس کے معصوم چہرے پر ہمیشہ مُسکراہٹ کا نُور پھیلا ہوتا لیکن وہ دورانِ گفتگو کبھی کبھی اُداس ہو جاتی۔ مُسکراہٹوں کی چاندنی اور قہقہوں کے جلترنگ کے ساتھ اُداسی کے بادل اور اشکوں کی پھوار دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی۔ اُس کی زندگی مجھے معمّہ معلوم ہونے لگی۔ میرے دل میں یہ راز جاننے کا تجسس جاگ اُٹھا۔ مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ اپنی تکلیف، اپنا دُکھ مُسکراہٹوں میں چُھپانا چاہتی ہے۔ وہ کون سا غم تھا جس کا احساس اُس کے تبسّم اور قہقہوں کو آنسوؤں میں بھگو دیتا۔ کئی بار میرا جی چاہا میں اُس سے پُوچھوں آخر لوگ اُسے بدنام کیوں کرتے ہیں؟ وہ اُداس کیوں رہتی ہے؟ لیکن میں خاموش رہتا۔

اور ایک دن میں نے اُس سے پُوچھ ہی لیا۔ میرے سوال پر وہ اچانک غمگین ہو گئی اور کچھ پریشان سی نظر آنے لگی جیسے اُسے مجھ سے ایسے سوال کی توقّع نہ تھی۔ وہ خاموش رہی پھر خیالات میں کھو سی گئی۔ اُس کی آنکھوں میں بادل اُمڈ آئے اور دوسرے لمحہ اُس کی پلکوں سے ستارے ٹُوٹ ٹُوٹ کر رُخساروں پر بکھرنے لگے۔

"شاید مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں اِس کے لئے معذرت خواہ ہوں" میں گھبرا سا گیا۔

اُس کے ہونٹ کپکپانے لگے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن الفاظ ساتھ نہ دے رہے ہوں۔

"میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکتی" اور اُس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ آنسوؤں کے موتی اپنے آنچل میں سمیٹتے ہوئے پہلے کی طرح مُسکرانے لگی جیسے ابھی ابھی بادل برس کر آسمان کھُل گیا ہو لیکن اُس کی مُسکراہٹ میں غم کی آمیزش تھی اور چہرے پر اُداسی کے ہلکے ہلکے سائے لہرا رہے تھے۔

اِس واقعہ کے بعد میں نے کبھی اُس سے اِس موضوع پر بات نہیں کی۔ وقت کا طائر پرواز کرتا رہا اور دن گزرتے رہے ـــــ آخرکار امتحان آ گیا اور آخری پرچے کے بعد ہم سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

زندگی کے سفر میں بعض لمحات ایسے بھی آتے ہیں جن کی یادیں کبھی کبھی جگنو کی طرح جگمگاتی رہتی ہیں۔ فرحت بھی گاہے گاہے یاد آتی رہی اور آج پانچ سال کے بعد فرحت سے ملاقات ہو گئی ہے۔ میری نظریں اُس پر جم سی گئی ہیں اور یادوں کے نقوش چمکنے لگے ہیں۔

میں اور اسلم "الکا" میں چائے پی رہے ہیں۔ عابدی ہوٹل میں داخل ہوتا ہے۔ اُس کے ساتھ فرحت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ دونوں ہمارے قریب آتے ہیں اور عابدی بہت تپاک سے ملتے ہوئے بتاتا ہے کہ اُس نے فرحت سے شادی کر لی ہے اور دونوں اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش ہیں۔

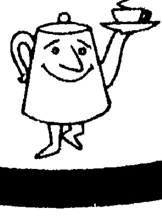
اور مجھے اپنے دل میں ایک عجیب سی کسک کا احساس ہونے لگا ہے جیسے میں نے کوئی عزیز اور قیمتی شے کھو دی ہے۔ میں اسلم کی طرف دیکھتا ہوں، وہ کچھ پریشان سا ہے جیسے کوئی خیال اُس کے دل میں چٹکیاں لے رہا ہے!!

بہترین کافی
کے
بہترین آثار -
کناٹ
پلیس
سُپر بازار

COFFEE BOARD

کافی ہاؤس
سُپر بازار
کناٹ پلیس
نئی دہلی - ۱

کافی میں کافی کچھ ہے ...
کہیں بھی ... کبھی بھی !



غزلیں

مورخہ حیات ایم۔اے۔بی۔ٹی

زندگی سے رہائی نہ ہوتی
بے خودی رنگ لائی نہ ہوتی

محبت میں پیدا نہ ہوتی لطافت
اگر ان سے اکثر جدائی نہ ہوتی

ملتی کبھی عشق کو سرفرازی
حسن میں بیوفائی نہ ہوتی

ہمیں گردشِ چرخ جینے نہ دیتی
اگر تیرے در تک رسائی نہ ہوتی

حیاتؔ اُن سے ہوتا نہ ترکِ تعلق
اگر اتنی قربت بڑھائی نہ ہوتی

سید شکیلؔ دسنوی

دل وفورِ شوق سے سینے سے نکلا جائے ہے
جب وہ آ کر بام پر چلمن ذرا سرکائے ہے

دن پہ دن وہ شوخ مجھ سے جتنا کھنچتا جائے ہے
آتشِ ارمانِ قربت اور کچھ بھڑکائے ہے

جو گیا مانا کہ یارو وہ بہت پچھتائے ہے
اُس کے کوچے میں گئے بن پڑ رہا کب جائے ہے

ہائے وہ بے مہر جو کرتا نہ ہو بھولے سے یاد
روز و شب آ کر تصور میں بہت تڑپائے ہے

زندگی حسرت سے کیوں دیکھے ہے مجھ کو بار بار
آخرِ شب کون یوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے

کیوں چھلک اُٹھے ہے اُن کی چشمِ میگوں اے شکیلؔ
اک خرابِ شعر و مئے کا ذکر جب آ جائے ہے

سعادتؔ نظیر ایم۔اے

کون مرتا ہے زندگی کے لئے
جی رہا ہوں تری خوشی کے لئے

دیکھئے۔ کیا ہے شامِ غم کا حال؟
کوئی بیتاب ہے کسی کے لئے

کس کو تھی انتظار کی فرصت!
پھر بھی تڑپا ہے دل کسی کے لئے

ظلمتِ شب بہت ضروری ہے
چاند تاروں کی روشنی کے لئے

کبھی ہم نے جو خواب دیکھا تھا
دل مچلتا ہے پھر اُسی کے لئے

نذرِ خوشترؔ گرامی کرتا ہوں
یہ غزل "بیسویں صدی" کے لئے

امرا میری

اُس کے نازو ادا کو کیا کہئے
زندگی کہئے یا قضا کہئے

جان کر مجھ سے بن گئے انجان
یہ تغافل ہے یا ادا کہئے

نالہ نالہ ہے اور کچھ بھی نہیں
نارسا کہئے یا رسا کہئے

نکہتِ زلفِ یار کی باتیں
کوبکو کہئے جا بجا کہئے

گفتگو زیرِ لب نہیں ہوتی
کہئے حال اور برملا کہئے

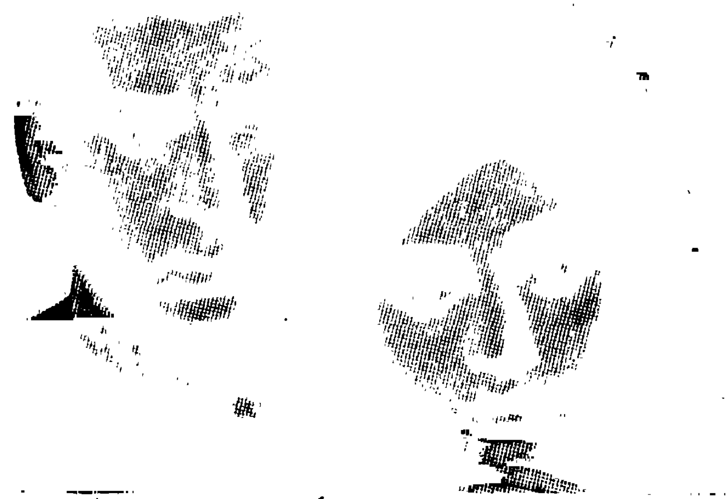
مختلف نام ہم سفر کے ہیں
راہزن کہئے رہنما کہئے

محبت کی داستان ...

Prince

اور پرنس بلیو بلیڈ
رومانس میں اضافہ کرتا ہے

Vyjayanthi and Shammi Kapoor
in Eagle Film's "Prince"



صاف اور پَر جیسی چھو کر ملائم شیو بنانے کے لئے
فلورو کاربن کنارے والا استعمال کیجئے

Our other produc:



PRINCE
SAFETY RAZOR

BMA-PR.76

TRADE MARK

BLUE PRINCE BLADE
MADE IN INDIA

خودکُشی

شاکر کریمی

محلہ گنج ۱ - نزد بڑی مسجد - ڈاکخانہ بتیا (چمپارن) بہار

محترم جناب خوشتر گرامی صاحب اسلام و نیاز

شاد (مرحوم) کے دل میں آپ کے لئے بے پناہ عقیدت تھی اور آپ کے دل میں شاد کے لئے بے انتہا پیار اور شفقت! یقیناً آپ شاد کی حسرت ناک موت پر خون کے آنسو روئے ہوں گے اور آج بھی اُن کی یاد آپ کے دل میں کچوکے لگا رہی ہوگی۔ میں تو شاد کے ساتھ چند گھڑیاں ہی گزار سکا ہوں اور آج اُن کی یاد ذہن میں نشتر بن کر چبھ رہی ہے ــــــ "بیسویں صدی" اگست ۶۹ء کے شمارہ میں جناب رشی پٹیالوی نے آپ کے نام خط میں لکھا ہے کہ "اب سوال اس کی مظلوم بیوہ اور معصوم بچے کی زندگی کا ہے۔ اُس کی گزربسر کا مستقل انتظام ہو جائے اور اُس کی تعلیم و تربیت کا مناسب بندوبست ہو جائے تاکہ وہ باپ دادا کی روایات کو نہ دُہرائے۔" (یقیناً آپ نے اِس سلسلے میں بلا تشہیر بہت کچھ کیا ہوگا، کریں گے اور کرتے رہیں گے) لیکن بات صرف شاد کی بیوہ اور بچے پر ختم نہیں ہوتی، اِس کی کیا ضمانت ہے کہ آئندہ کوئی ادیب یا شاعر شاد کی روایت کو نہ دُہرائے گا؟ شاد کی موت نے ایک ایسا مسئلہ پیدا کر دیا ہے جس پر تمام اہلِ علم و اہلِ قلم کو سوچنے کی دعوت دی جا سکتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ ــــــ جناب رشی پٹیالوی کے مضمون "سرخ حاشیوں کا خالق شاد" نے کچھ ایسا تاثر چھوڑا کہ یہ کہانی "خودکُشی" تخلیق ہوگئی۔ ملاحظہ فرمایئے کہ شاد کی خودکُشی اور اِس کہانی کے "اُس" کی خودکُشی میں کتنی مطابقت ہے۔ یہ کہانی ایک تازیانہ بھی ہے اور ایک مسئلہ بھی ــــــ پسند آجائے تو شریکِ اشاعت فرمالیں۔ آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا . . .

خلوص کیش ــــــ شاکر کریمی

★

شام ہوگئی تو وہ بوجھل قدموں سے گھر کی طرف لَوٹنے لگا، ویسا ہی جیسا صبح کو گھر سے نکلا تھا۔

صبح سے شام تک وہ اَن گِنت دروازے کھٹکھٹا چکا تھا اور اُس ایک دن میں وہ کئی بار اپنی سطح سے گِرا، کئی بار اپنی غیرت کو اپنے ہاتھوں زخمی کیا، کئی بار اُسے اپنے ضمیر کا گلا گھونٹنا پڑا، کئی بار اُسے شرمسار ہو جانا پڑا، کبھی بار اُسے خود کو ننگا کر دینا پڑا۔ لیکن سب بے سود، بیکار۔ اپنی زندگی کے اِن قیمتی سرمایوں کو صرف کر دینے کے باوجود وہ ویسا ہی رہا۔

وہ تو زندگی کے اُس موڑ پر آگیا تھا جہاں اُس کے اپنے بھی اُسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیا کرتے تھے، دوستی کا دَم بھرنے والے دوست اُسے دُور ہی سے دیکھ کر راستہ بدل لیا کرتے تھے، اور کوئی سامنے آ بھی گیا تو اِس طرح کہ اگر جسم پر باریک قمیص ہے اور جیب سے نوٹ جھانک رہے ہیں تو ان کے آگے رُومال یا کوئی کاغذ رکھ لیا۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر اُس کی نظر نوٹوں پر پڑ جائے گی تو وہ قرض مانگ بیٹھے گا اور نہ دینے کی صورت میں دوستی پر آنچ آجائے گی۔

وہ اپنی شاہکار تخلیقات بھی کئی رسالوں کے مدیروں کو سُنا چکا تھا

لیکن اُس کی یہ کوششیں بھی بے نتیجہ رہی تھیں۔

ایک کثیر الاشاعت ماہنامے کے مدیر نے کہا ——

"میں اپنے رسالے کے ذریعے تھکے ہوئے انسانی ذہن کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی یہ تخلیق بیشک شاہکار ہے لیکن میرے رسالے کے مزاج اور معیار سے مختلف ہے۔ مجھے تو آپ کوئی تفریحی کہانی دیجیے، ایسی جس کی ہیروئن بہت خوبصورت ہو، کولہوں پر ساڑی باندھتی ہو، ہپی اسٹائل سے، کھلے ہوئے بازوؤں والا چُست اور مختصر بلاؤز پہنتی ہو، اور چلے تو اِس طرح لچک لچک کر کر کھلے ہوئے پیٹ اور نمایاں کولہوں کے درمیان کسی پوشیدہ اسپرنگ کا گمان ہو!"

ایک ترقی پسند رسالے کے ایڈیٹر نے کہا ——

"آپ کی یہ تخلیق میں اور میرے ہی جیسے چند افراد پڑھ کر استفادہ حاصل کر سکتے ہیں لیکن مجھے تو اپنے مقصد کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آپ کی کہانی کے کردار حقائق کی نقاب کشائی ضرور کرتے ہیں اور نقطۂ عروج بھی چونکا دینے کے لئے کافی ہے لیکن سائنس کی اِس بے پناہ ترقی کے زمانے میں عوام کا ذہن چونک جانے یا متحیّر ہو جانے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔ میں تو اپنے رسالے کے لئے اِس طرح کی نئی کہانیاں چاہتا ہوں جن کے کردار عام انسانی کرداروں سے الگ تھلگ ہوں، جیسے کسی کالی بلّی کے پیکر میں کسی برگزیدہ انسان کی رُوح حلول کر گئی ہو، کسی کُتّے نے کسی عظیم شخصیت کے مقدّس جسم میں پناہ لے لی ہو، جن کے مُنہ سے نکلے ہوئے مکالموں کو سمجھنے کے لئے فلاسفی، بائیلوجی اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی دقیق کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑے اور کہانی اپنے کلائمکس کے ذریعہ ایسا تاثر چھوڑے کہ قارئین انتہائی ذہنی جدّ و جہد کے باوجود کچھ نہ سمجھ سکنے کی صورت میں خود اپنی ہی ذہنی کم مائیگی کا اعتراف کریں۔"

ایک خالص ادب پیش کرنے والے جریدے کے مدیرِ اعظم نے کہا ——

"اُردو ادب کے مستقبل کے موضوع پر آپ کا یہ مضمون یقیناً قیمتی اور اہم ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے رسالے میں لکھنے والوں کی مقررہ فہرست کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔"

اور وہ اِن تمام مرحلوں سے گزر کر گھر لوٹ رہا تھا۔ خالی جیب!

گذشتہ رات اُس نے صرف دو روٹیاں کھائی تھیں جو کب کی تحلیل ہو چکی تھیں اور صبح سے شام تک رسالوں کے دفتروں میں دو تین پیالی چائے ہی پی سکا تھا۔ حالانکہ چائے کے ہر گھونٹ پر اُسے شدّت سے صوفیہ اور بچّوں کا خیال بے چین کرتا رہا جو بھوکے تھے اور بھوک کا واحد علاج تھی روٹی اور روٹی کے لئے ضرورت تھی پیسوں کی اور یہی ایک چیز اُس کے پاس نہ تھی! اور اِس کے حصول کے لئے وہ سارا دن مارا مارا پھرا اور کتنے ہی جاں گسل لمحوں سے گزرا۔

ورنہ اور کسی چیز کی کمی نہ تھی، علم کا خزانہ بھرا پڑا تھا، انسانی شعور کو بیدار کر دینے والے اَن گِنت نسخے تھے اُس کے پاس، سماج کی پُشت پر کلبلاتے ہوئے متعفّن پھوڑے کو چیر کر فاسد مادّے کو نکال باہر کر دینے کے لئے اُس کے ہاتھ میں قلم کا تیز نشتر تھا۔

حصولِ زر کے لئے وہ نہ جانے کتنے ہی دفتروں کے دروازے کھٹکھٹا چکا تھا اور ہر بار اُسے ناکامی اور مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ملازمت دینے والی بڑی بڑی شخصیتیں اُس سے خوب واقف تھیں، اُس کے رشحاتِ قلم سے مانوس تھیں، اُس کی ادبی صلاحیتوں کی معترف تھیں لیکن اُن کے ذہن میں اُٹھنے والا یہ خیال کہ اپنی ہی دُنیا میں مگن رہنے والے اور نئی نئی تخلیقات کی کھوج میں سرگرداں رہنے والے یہ ادیب بھلا دوسروں کا کام کیا کریں گے۔ اُس کی ملازمت کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہوتا رہا۔ اُس نے ٹیوشن کی تلاش میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی لیکن اپنی تمام تر علمی صلاحیتوں کے باوجود وہ ٹیوشن حاصل کرنے میں محض اِس لئے کامیاب نہ ہو سکا کہ ٹیوشن دینے والے لوگوں کو اپنے بچّوں کے اُس کی طرح ادیب ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا۔ وہ انتھک کوششوں کے باوجود شہر کی اچھی آبادی والے علاقے میں کوئی چھوٹا سا مکان بھی کرایہ پر حاصل نہ کر سکا تھا۔ مکانوں کے مالکان کا خیال تھا دال روٹی کی بھی فکر نہ کرنے والا یہ ادیب ہر ماہ مکان کا پُورا کرایہ بھلا کیا دے سکے گا اور مجبوراً اُسے شہر کے کنارے گندی بستی کے ایک بوسیدہ مکان میں پناہ لینی پڑی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کا ذہن کسی نئی اور انوکھی تخلیق کی کھوج کے بجائے بیوی اور بچّوں کے خیال میں اُلجھا ہوا تھا۔ بچّے بھوکے ہوں گے، دن میں چُولھا نہ جلا ہوگا۔ بیوی بچّوں کو دلاسہ دے دے کر میری راہ تک رہی ہوگی کہ کب کچھ لے کر آؤں اور وہ چُولھے میں آگ جلائے۔ لیکن یہ رات بھی یونہی گزر جائے گی۔ میرے بچّے بھی فاقوں کی اذیّت سے دوچار ہو رہے ہیں۔ اُف! کہاں سے لاؤں میں روٹی؟ —— لیکن روٹی کے علاوہ بھی تو اور بہت ساری ضرورتیں پڑی ہیں۔ میرے سارے کپڑے بچّوں کے کام آ گئے ہیں۔ صوفیہ کے بدن پر اب ایک ہی ساڑی رہ گئی ہے! اُس نے اپنے اوپر نظر ڈالی، میلا پائجامہ جس کے پائنچے جھڑنے لگے ہیں۔ میلا کُرتہ کہیں کہیں سے مسکا ہوا اور زندگی کے کڑے سفر میں ساتھ دینے والا یہ چپّل جواب تھک گیا ہے!

لاؤڈ اسپیکر کی تیز آواز نے اُس کے خیالوں کے تسلسل کو توڑ دیا۔ وہ

چترمندر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ چترمندر کے میدان میں اُسے لوگوں کا ٹھٹھ نظر آیا۔ اونچے ڈائس پر کھڑا خوش وضع دیش بھگت لیڈر سنہرے فریم کا چشمہ لگائے، کھادی کے قیمتی کپڑے پہنے دیش کی تعمیر و ترقی کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا۔ اس نے ایک نظر مجمعے پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ اُس کے بھوکے ذہن میں ایک سوال اُبھرا ——— جس مُلک میں تعمیر و ترقی کے علم بردار ہزاروں انجینئر بے روزگار ہوں، تعمیر و ترقی میں ہاتھ بٹانے والے انسانوں کو صحت اور توانائی بخشنے والے لاتعداد ڈاکٹر بیکار ہوں، جس مُلک میں انسانی شعور کو بیدار کرنے اور تعمیر و ترقی کا راستہ دکھانے والے ادیب اور فنکار بھوکے ہوں اُس مُلک کا مستقبل کیا ہوگا !؟ اس کے ہونٹوں پر ایک مُسکراہٹ پھیل گئی۔ ایسی مُسکراہٹ جو دل میں نشتر بن کر اُتر گئی۔ دل تڑپ اُٹھا، بھوکے ذہن میں ایسے کتنے ہی سوالات پوشیدہ ہیں جن کا واحد جواب ہے روٹی! جو بہت مہنگی شے ہے، جو لاکھوں کروڑوں انسانوں کی دسترس سے باہر کی چیز ہو کر رہ گئی ہے!

وہ روٹی کے امکان پر غور کر رہا تھا کہ سامنے حلوائی کی دوکان کے باہر پڑے ہوئے جھوٹے پتّوں کی طرف بھاگتا ہوا ایک مریل سا کُتّا ایک تیز رفتار کار کے نیچے آکر بیچ سڑک پر روٹی ہی کی طرح پھیل گیا۔ روٹی کے حصول کی خاطر ایک زندگی ضائع ہو گئی۔ وہ لرز گیا!

لیکن صرف روٹی ہی کیوں؟ اس کے ذہن نے دوسری کروٹ لی۔

یہاں تو آدرش اور اہنسا کی بات کرنے والے گوتموں کا زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے، یہاں تو مادرِ وطن کی بیڑیاں کاٹنے والے اور آزادی کی زندگی عطا کرنے والے جری انسانوں کے سینوں میں ریوالور کی گولیاں اُتار دی جاتی ہیں، یہاں تو تہذیب و تمدّن، زبان و ادب کو خون سے سینچنے والے کتنے ہی ادیبوں کے پھول جیسے بچے فاقوں کی تمازت سے مُرجھا جاتے ہیں اور وہ خود دوا کے ایک ایک گھونٹ کے لئے تڑپ تڑپ کر خیراتی اسپتالوں میں مر جاتے ہیں۔ یہاں تو خونِ دل میں اُنگلی ڈبو کر ادب کی مانگ سجانے والے مجازوں کے جسم پر پُراسرار نشانات پائے جاتے ہیں، اور . . . اور نریش کمار شاد . . . جس نے بھوکے ذہنوں کو علم کی خوراک مہیا کی، جو لوگوں کو تخریب کی پستی سے نکالنے کے لئے تعمیر کی بلندی کا راستہ بتانے میں ساری زندگی سرگرم رہا، جو اپنا سب کچھ، سُرخ حاشیے، انٹرویو، شانِ نزول، قاشیں اور وجدان جیسی وجد آفریں اور لافانی تخلیقات کی صورت میں لوگوں پر نچھاور کرکے خود ذہنی پریشانیوں اور اُلجھنوں میں مبتلا ہو گیا اور تنہا غموں کا بارِ گراں اُٹھائے زندگی کی سنگلاخ راہوں پر بھٹکنے لگا ——— لیکن زمانے نے اُس کا بوجھ ہلکا نہ کیا، اُس کی پریشانیوں کا سدِّباب نہ کیا اور تھک ہار کر اُسے جمنا کی آغوش میں پناہ لینی پڑی!

اُس کے قدم گھر کی طرف بڑھ رہے تھے اور سوچ اور فکر کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا ———

شاد تنہا اپنی موت کا ذمّہ دار نہیں! اس کی موت کے ذمّہ دار پچاس کروڑ عوام بھی ہیں۔ اگر سارے لوگ شاد کا غم تھوڑا تھوڑا بانٹ لیتے تو کسی کا کچھ نہ بگڑتا اور وہ زندہ رہتا، سب کے لئے!

اچانک اُس کی آنکھوں کے سامنے بہار کے ایک ہفتہ وار پرچے کا وہ صفحہ گھوم گیا جس میں شاد کی بیوہ اور بچّے کی امداد اور اعانت کے لئے چندے کی اپیل کی گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ جس بھرم کو قائم رکھنے کے لئے شاد زندگی کی ساری مصیبتیں جھیل گیا وہ سارا بھرم پاش پاش ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک ادیب کی اِس سے بڑی تذلیل اور کیا ہو سکتی ہے! زبان و ادب کے نام پر دولت جمع کرنے والے ادبی سیٹھوں اور ساہوکاروں کی تو کمی نہیں، کیا شاد کی بیوہ کی دہلیز پر چُپکے سے اِتنی رقم نہیں رکھ دی جا سکتی تھی جس سے اُس کی عمر بسر ہو جاتی اور بچّے کا مستقبل سنور جاتا . . . ؟؟؟

لیکن اب تو سوال ایک شاد کا نہیں!

اُس کی ذہنی رَو بہک گئی۔ اگر میں بھی مر جاؤں تو؟

. . . تمام اخباروں میں میری موت کی خبر جلی حرفوں میں چھپے گی، سیکڑوں روپے خرچ کرکے تعزیتی جلسے ہوں گے۔ پیغاموں، نظموں اور تعزیتی مضامین کے ذریعہ اپنے اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا جائے گا، میری موت کے طفیل کتنے ہی لوگ رسالوں میں چھپ جائیں گے، میری تخلیقات کے گُن گائے جائیں گے، میری بیوی اور بچّوں کی امداد کے لئے چندے کی اپیل کے بعد سَو، پچاس کی رقم منی آرڈر آنے لگے گی اور پھر رفتہ رفتہ منی آرڈروں کی آمد کم ہونے لگے گی۔ پندرہ، دس، پانچ، دو، اور اب میری بیوی کو کئی کئی روز ہو جائیں گے ڈاکیہ کا انتظار کرتے لیکن وہ تو راستہ بھول جائے گا میرے گھر کا۔ یا پھر لوگ اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہوں گے (یا پھر کوئی اور حادثہ ہو جائے گا) میری موت کے غم میں روتے روتے میری وفاشعار بیوی کی آنکھیں جو میری کتنی ہی تخلیقات کی محرک ہیں بے نور ہو جائیں گی۔ بچّوں کے روشن مستقبل کی فکر اُسے دیمک کی طرح چاٹنے لگے گی، میری موت کے دو چار ہی برس بعد میرے فن کو جمالیاتی شعور بخشنے والی میری بیوی ادھیڑ عمر سے بھی زیادہ معلوم ہونے لگے گی،

مالک مکان کرایہ کی ادائیگی نہ ہونے پر گھر سے نکال دے گا۔ وہ سڑک پر آجائے گی، اُس کی سیاہ حلقوں کے بیچ بے نور آنکھوں میں آنسو ہوں گے، بال بکھرے ہوں گے، پھٹی پُرانی ساڑی سے اُس کا جسم جھلکتا ہوگا۔ چھوٹے بچّے کو گود میں لئے منجھلے بچّے کی اُنگلی پکڑے ہوگی اور بڑا بچّہ جو میرے بعد اپنی ماں اور چھوٹے بھائیوں کا واحد سہارا ہے میری ہی کوئی نظم میرے ہی ترنّم میں گا رہا ہوگا . . . !

اُس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ کِتنا کرب ناک تھا یہ تصوّر! کِتنا بھیانک تھا موت کا یہ خیال! وہ مضطرب ہوگیا۔ نہیں نہیں! میں ابھی نہیں مروں گا!! ایک ادیب کے حال و مستقبل کا خیال اِس مُلک کو ہو یا نہ ہو لیکن مجھے تو اپنی بیوی اور بچّوں کی فِکر کرنی ہی ہوگی۔

اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

آفتاب کب کا غروب ہو چُکا تھا۔ برقی قمقموں کی روشنی سے مارکیٹ روڈ جگمگا رہی تھی، ہر طرف چہل پہل تھی۔

دروازے میں قدم رکھتے ہی اُسے صوفیہ کی آواز سُنائی دی۔

"ضد نہیں کرتے بیٹے، کھالو!"

"نہیں ماں، یہ سُوکھی روٹی حلق سے نہیں اُترتی!" بڑا بچّہ کہہ رہا تھا۔

"دیکھو تو یہ تمھارے چھوٹے بھائی کِتنے مزے میں کھا رہے ہیں، تم بھی پانی میں بھگو لو!"

"نہیں ماں، میں تو سالن لوں گا!"

"پھر وہی بات! کھانا اِس وقت پانی میں ڈال کر کھالو، تمھارے ابّو اِتنا سارا پیسہ لانے گئے ہیں۔ کل سویرے اچھی اچھی چیزیں پکا کر کھلاؤں گی!"

"ہمارے ہاں بھی اچھی اچھی چیزیں پکیں گی ماں؟" منجھلے بچّے نے حیرت ظاہر کی۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں، بس اب تم لوگ جلدی جلدی کھا کر سو جاؤ، کل سویرے اُٹھنا ہے!"

اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ سوچنے لگا۔ اِس وقت تو یہ بہل جائیں گے لیکن آنے والی صبح کو اچھے پکوان کا تصوّر انھیں جلد بیدار کردے گا اور سارے دن کی دَوڑ دھوپ اور جُستجو کے بعد بھی اِس کی جیب میں ایک پھُوٹی کوڑی بھی نہیں! اور اچانک اُسے خیال آیا لیکن اِس وقت بچّوں کو روٹی کہاں سے مِل گئی جبکہ گذشتہ شب بہت مشکل سے صرف روٹی کا بندوبست کرسکا تھا۔ جِس میں سے دو چار روٹیاں صوفیہ نے بچّوں کے ناشتہ کے لئے بچالی تھیں۔ اور اُسے یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ یقیناً صوفیہ نے رات روٹی نہیں کھائی تھی۔ اور اپنے حصّے کی بھی روٹی بچا کر رکھ لی تھی یہ سوچ کر کہ شاید دوسرے دن کوئی بندوبست نہ ہوسکے۔ تو کیا وہ رات سے بھُوکی ہے؟ وہ کانپ گیا! کچھ دیر دروازے میں کھڑا سوچتا رہا اور پھر واپس سڑک پر آگیا۔

تیز تیز قدم بڑھاتا وہ مارکیٹ روڈ سے گُزر رہا تھا۔ مینا بازار کے صدر گیٹ کے سامنے رکشوں کی قطار لگی تھی۔

چھاؤنی ایک سواری!

اسٹیشن!

لبرٹی سنیما!

چرچ روڈ!

رکشا والوں کی آوازیں بازار کے ہنگاموں میں سواریوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

"اسٹیشن کا کیا لوگے؟" وہ آگے بڑھا اور اِن میں سے ایک سے کچھ بات کرنے لگا۔

"ایک روپیہ ریٹ ہے صاب وہی دے دیجئے گا!"

"چلو ——— !"

صبح آفتاب طلوع ہونے سے پہلے وہ گھر لَوٹا، پریشان حال، پسینے میں شرابور، بوجھل بوجھل قدموں سے جیسے تھک کر چُور ہوگیا ہو۔

دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھُلا، حسرت و یاس کی تصویر بنی صوفیہ سامنے کھڑی تھی، آنکھیں اُداس، ویران جیسے ساری رات اُس کے انتظار اور بھُوک کی شِدّت سے سو نہ سکی ہو۔ اُس نے آگے بڑھ کر بند مُٹھی صوفیہ کی ہتھیلی پر کھول دی۔

ایک ایک روپے کے سات نوٹ اور کچھ ریزگاری اپنی ہتھیلی پر دیکھ کر صوفیہ کو حیرت ہوئی اور اُس کی طرف اِس طرح دیکھنے لگی جیسے پُوچھ رہی ہو ——— یہ گیلے کپڑے، یہ تھکا ہوا جسم، یہ روپے؟

اُس کے ہونٹوں پر مضمحل سی مُسکراہٹ اُبھر آئی۔ اُس نے دائیں ہاتھ کی پہلی اُنگلی سے پیشانی پر رینگتے ہوئے پسینے کے قطروں کو ایک طرف سمیٹ لیا۔ کِتنے ہی قطرے پیشانی سے چھُوٹ کر زمین پر آگرے۔ جیسے کسی شہنشاہ کے تاج میں جڑے ہوئے قیمتی موتی ٹُوٹ کر بکھر گئے ہوں۔

اُس نے صوفیہ کے بے ترتیب بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"تمھارا قُرب ہی تو میری زندگی کا سرمایہ ہے، کیا ہوا جو مجھے ساری رات رکشا چلانا پڑا!!"

اور صوفیہ کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے ڈھلک کر رُخساروں پر آگئے۔ جیسے واقعی اُس نے خودکشی کر لی ہو!!!

غزل

چندر پرکاش جوہر بجنوری

شوق اگر کامیاب ہو جائے
زندگی لاجواب ہو جائے

ہے یہی انتہائے ناکامی
آدمی کامیاب ہو جائے

پوچھنا کیا ہے پھر مسرّت کا
غم اگر بے حساب ہو جائے

آنکھ مل جائے کاش ساقی سے
یوں بھی دورِ شراب ہو جائے

ہائے وہ دِل جو ایک آہ کے بعد
موردِ صد عتاب ہو جائے

بابِ میخانہ وا ہے اُس کے لئے
جس کو جینا عذاب ہو جائے

پرتوِ حُسن کی کرامت ہے
ذرّہ بھی آفتاب ہو جائے

جس کا کوئی جواب ہو نہ سکے
آپ اپنا جواب ہو جائے

ایک ایسا بھی نام ہے جوہر
ختم جس پر کتاب ہو جائے

غزل

مس غزالہ اشفاق۔ شاہجہانپوری

اے دِل ہم آج کوچۂ جاناں میں آ گئے
یا شہرِ آرزو کے گلستاں میں آ گئے

رُسوائے عشق ہو کے بھی کچھ کام بن گیا
اِس طرح ہم نگاہِ حسیناں میں آ گئے

ہم نے ہزار چاہا نہ جائیں وہاں۔ مگر
پھر گھوم پھر کے کوچۂ جاناں میں آ گئے

بے ساختہ نکل گیا لب سے یہ کس کا نام
محسوس ہو رہا ہے گلستاں میں آ گئے

دورِ شگفتگی میں رہے رونقِ چمن
کھلا گئے تو پھول بیاباں میں آ گئے

کچھ تو گناہ کر لئے شیطان نے قبول
جو بچ گئے وہ حصۂ انساں میں آ گئے

اپنی خطاؤں کا ہمیں جب آ گیا خیال
آنسو اُمنڈ کے چشمِ پشیماں میں آ گئے

جنت میں بھی تھا اس دلِ وحشت زدہ کا ساتھ
مجبور ہو کے عالمِ اِمکاں میں آ گئے

اب کیسے جائیں لوٹ کے دل مانتا نہیں
ہم کس کے ساتھ بزمِ نگاراں میں آ گئے

داور نے لے غزالہ اِرم کی عطا ہمیں
ہم اُٹھ کے سیدھے کوچۂ جاناں میں آ گئے


چائے جب بھی پیئیں
للت چائے ہی پیئیں
صبح ناشتے کے وقت — جب دن بھر کی دوڑ دھوپ کے ساتھ نمٹنے کے لئے پیالی بھر چائے ضروری ہوتی ہے.
تو یہی — ٹھیک للت چائے کا وقت ہے.
اس لئے للت چائے اس ڈھنگ سے خاص طور پر مرکب کی گئی ہے کہ آپ میں حقیقتاً تروتازگی پیدا کرے، آپکی طبیعت میں انشراح اور امنگ لائے جس وقت آپکو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے. للت چائے نہایت پسندیدہ قسم کی چائے سے بنائی جاتی ہے. اسی لئے اس کی خوشبو مرغوب لذت بہت پسند ہوتی ہے. اس کی پیالی بھر تیز چائے تسکین بخش ہوتی ہے.
للت
چائے
جو واقعی تسکین بخش ہے
Lalit
Lalit
شاندار فیصلے کی چائے

نوکر کا چکّر

احمد جمال پاشا ایم۔ اے

سروری منزل۔ کچّا احاطہ۔ لکھنؤ (یو۔ پی)

حضرت سلامت! آداب

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ ایک طنزیہ "نوکر کا چکّر" ارسالِ خدمت ہے۔ بڑے شہروں میں نوکر کا جو مسئلہ ہے۔ اُسے اُبھارنے کی کوشش کی ہے —— ایک افواہ تھی کہ آپ لکھنؤ پر نازل ہونے والے تھے۔ رام لعل اِس افواہ کے راوی تھے۔ لیکن ایک دوسری افواہ کے مطابق آپ کترا کر بنارس نکل گئے۔ دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے؟

نیازمند —— احمد جمال پاشا

★

ہماری آدھی زندگی نوکری ڈھونڈتے گزر گئی اور بقیہ نوکر کی تلاش میں! نوکری ملی بھی تو ایسی کہ گویا بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ یعنی بیٹھے بٹھائے ایک دم سے نوکر ہی نہیں، بڑے ٹھاٹھ دار صاحب بنا دئے گئے! اور ایک ہی زوردار سفارش نے ہماری قسمت کا پانسہ پلٹ دیا۔ آمدنی کے ساتھ ہمیں نوکر کی ضرورت محسوس ہونے لگی تاکہ گھرداری ملازم سنبھال لیں اور ہم بیگم صاحبہ کے ساتھ شہر کے اعلیٰ حلقوں میں سوشل بن کر مقبول ہو سکیں۔

اِس سلسلہ میں ہمیں دو بہت ہی مستعد نوکروں کی ضرورت تھی۔ ہماری نظر میں پُوری دُنیا ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ جس میں سے صرف دو اچھے نوکر اپنے لئے حاصل کر لینا ہمارے لئے بالکل بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اِس لئے ہم نے نہایت حقارت کے ساتھ ڈانٹ اور گھُڑک کر اپنی اُس پُشتینی ماما کو نکال دیا جسے کوئی کام بتلانے کے لئے لاؤڈ اسپیکر کی ضرورت پڑتی تھی اور جو ۳ گھنٹہ فی خدمت کی رفتار سے کام کرتی تھی اور جس کے کفن دفن کی ذمہ داری کا خطرہ پچھلی چوتھائی صدی سے ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ ہماری بہری بُوا روتی پیٹتی اور والدِ مرحوم (جنھیں اُنھوں نے گودوں کھِلایا تھا) کو یاد کرتی چلی گئیں۔ اُس کے بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور دفتر سے فائلیں وغیرہ لانے والے اپنے دونوں چپراسیوں سے کہا۔

"ایک آدھ دن میں نئے نوکر آجائیں گے۔ تب تک تم لوگ ہمارے گھر کا کام کاج دیکھو۔"

چپراسیوں نے نہایت بے رُخی سے جواب دیا۔

"صاحب! ہم دفتر کے کام کے ملازم ہیں۔ نہ کہ گھر کے۔ ہم آپ کے گھر کا کام نہیں کر سکتے!"

چپراسیوں کے اِس گستاخانہ جواب سے ہم غصّہ سے تھر تھر کانپنے لگے اور اُنھیں گھُورتے ہوئے ہم نے ڈانٹ کر پُوچھا۔

"کیا مطلب؟"

دونوں چپراسی فوراً تن کر کھڑے ہو گئے اور بولے:

"صاحب! آنکھیں مت دکھلایئے۔ اگر آپ نے گھر کے کام کے لئے پھر کہا تو ہم آپ کا گھیراؤ شروع کر دیں گے اور سب چپراسی لوگ دفتر میں ہڑتال کر دیں گے۔ آپ جانتے نہیں کہ جب سے ہماری یونین بن گئی ہے ہم سے کوئی بیگار نہیں لے سکتا۔ آپ تو آپ چیف سکریٹری صاحب تک ہم سے کچھ نہیں بول سکتے!"

یونین کا نام اور چپراسیوں کے تیور دیکھ کر ہم ہڑتال اور گھیراؤ کے خوف سے مصلحتاً نرم پڑ گئے اور اِن سے کہا۔

"اچھا ہمیں دو نوکر لادو۔"

نظر

پہلے نظر میں تاب تو پیدا کرے کوئی
پھر اُس کو دیکھنے کی تمنا کرے کوئی ——— حبیب الرحمٰن راہی

فطرتِ عالم رنگ و بو دیکھ کر موسم گُل سے ہم بدگماں ہوگئے
ٹوٹتے ہی طلسمِ فریبِ نظر قدر دانِ ثباتِ خزاں ہوگئے ——— اعجاز وارثی

رنگ لایا اُن کی نظروں کا تصور اے رشی
دل سے ہم بیگانہ ہیں، دل ہم سے بیگانہ ہوا ——— رشی پٹیالوی

تم یہ کیا جانو کہ مجھ میں تابِ نظارہ نہیں
تم نظر آتے ہی کب ہو بے حجابانہ مجھے ——— رضا وارثی

مجالِ جنبشِ لب اُن کی بزم میں توبہ
نظر اٹھانے کا بھی حوصلہ نہیں ہوتا ——— بسمل سعیدی

مرسلہ ——— فریدہ صبور۔ مدراس

یہ بات ہم نے اُن سے بالکل اِس طرح کہی جیسے کہہ رہے ہوں بھاگ کر ——— سامنے والی دُوکان سے دو ڈبّی سگریٹ لے آؤ۔

چپراسیوں نے نہایت حیرت سے ہمارا مُنہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"نوکر؟"

"ہاں ہاں! نوکر نوکر!"

"ارے صاحب اِس مہنگائی میں بر، مکان، نوکری اور نوکر بھی کہیں ڈھونڈے ملتے ہیں۔ ڈھونڈے سے خدا مل سکتا ہے مگر نوکر نہیں مِل سکتا!"

چپراسیوں کے اِس گستاخانہ جواب کے بعد اِس کے سِوا ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ہم اپنا مُنہ نوچ لیں لیکن یہ ہمارے افسرانہ وقار اور مرتبہ کے خلاف تھا۔ دوسرے یونین کے ممبر ہونے کی وجہ سے وہ خود بھی اگر ہمارا مُنہ نوچ لیتے تو ہم کیا کر لیتے۔ اِس لئے خاموشی میں عافیت کے پیشِ نظر ہم گھر کے اندر چلے گئے۔

گھر میں ہماری پیاری بیگم صاحبہ کے سامنے جھُوٹے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چُولھے پر ہانڈی جل رہی تھی وہ مسالہ پیس رہی تھیں۔ مرچوں کی دھانس سے اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اُن کی جوانی پر ترس کھاتے ہوئے ہم برتن مانجھنے اور دھونے لگے۔ اُنھوں نے ہمیں اخلاقاً اِس کارِ خیر سے روکتے ہوئے مسالہ کی رفتار کچھ اِس انداز سے تیز کر دی جیسے ڈُوبتے کو تنکے کا سہارا مل جائے۔ اُنھوں نے سِل پر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"خدا کے لئے نوکر تلاش کیجئے۔ ورنہ ۰۰۰"

ورنہ تک پہنچ کر بیگم خاموش اور ہم ہمہ تن گوش ہوگئے۔ اُنھوں نے جُملہ پُورا کرتے ہوئے کہا۔

"ورنہ پھر بہری بُوا ہی کو واپس بُلوا دیجئے"

ہم نے اطمینان دلاتے ہوئے گوشت کی ہانڈی جو تقریباً کوئلہ ہو چکی تھی اُس میں پانی ڈال کر چلاتے ہوئے کہا۔

"بہری بُوا کے لئے تو اخباروں میں "تلاشِ گُمشدہ" کا اشتہار تک چھپوا چُکا ہوں مگر اُس کا پتہ نہ لگ سکا کہ کس نے اُسے بھٹ سے نوکر رکھ لیا جو اب وہ کہیں ہاتھ نہیں لگ رہی ہے"

غرض جب عزیز، احباب اور دفتر والوں سے نوکر کی فرمائش، فہمائش کی حد تک بے سود ثابت ہوئی تو مجبوراً "ضرورتِ ملازم" کے کالم میں اخباروں میں اشتہار نکلوا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ جلد ہی کچھ درخواستیں بھی آگئیں اور ہم نے درخواست دینے والوں کو بُلوا کر باقاعدہ "انٹرویو لے" ڈالا۔

ایک صاحب سر پر کلاہ باندھے، طُرّہ لگائے، کمر میں پٹکا کسے، مونچھیں اور جُوتے چمکائے، پیشہ ورانہ وقار کے ساتھ ہمارے سامنے آکر بسر و چشم کھڑے ہوگئے۔ پہلے تو اُنھوں نے نہایت مشکوک نظروں سے ہمارا جائزہ لیا کہ ہم میں مالک بننے کی صلاحیت کس حد تک ہے اور ہے بھی یا نہیں؟ اِس کے بعد اُنھوں نے ہمارا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔ ہم پر ترس کھا کر بولے۔

"آپ کتنے پیسے دے سکتے ہیں؟"

"مناسب پیسے دے دیں گے"

"اب تک تو دو سَو روپے مہینہ، کھانے، ناشتے، کپڑے، دُھلائی اور معقول ٹِپ سے کم پر نوکری کا اتفاق نہیں ہوا"

ہم نے کھُجلانے کے بہانے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے دل کڑا کر کے کہا۔

"اچھا ———!"

بولے ———

"آپ کس قسم کا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

ہم نے قسم کی وضاحت چاہی تو سینہ پھُلا کر اور سر اونچا کر کے مونچھوں کو بَل دیتے ہوئے بولے ———

"ہندوستانی، ایرانی، عربستانی، انگلستانی، جاپانی، افغانی جس قسم کا بھی آپ پسند فرمائیں۔"

ہم نے گِھگِھیاتے ہوئے کہا۔

"ہم تو صرف ہندوستانی کھانا کھانے کے عادی ہیں!"

بولے ـــــــــ

"ہندوستان میں تو یو۔پی، سی۔پی، بہار، مہاراشٹر، آندھرا، تلنگانہ، میسور، بنگال، آسام، ناگالینڈ، پنجاب اور کشمیر وغیرہ سبھی کے کھانے آجاتے ہیں۔ صاف صاف بتائیے۔"

عرض کیا ـــــــــ

"زیادہ سے زیادہ یو۔پی اور کم سے کم دہلی دال کھانا ہم کھا سکتے ہیں۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے ہمارا باورچی خانہ اور اِسی بہانے ہمارا گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ باورچی خانہ دیکھ کر بُرا سا مُنہ بناتے ہوئے بولے۔

"نہ اِس میں دُھواں نِکلنے کی چمنی ہے، نہ ڈھلوان نالیاں ہیں کہ اشارے میں سب صاف ہوجائے اور دم نہ گھُٹے۔ یہ تو صحت کے لئے بہت ہی مُضر ہے۔ اِس میں پائپ، واشن بیسن، برتن دھونے کی مشین، گرینڈر مشین، کلیننگ مشین، آئس کریم مشین، کافی مشین، لسّی مشین، پریشر کوکر، گیس چولھا، فین، ایگزاسٹ فین، کوکنگ ریوالونگ اینڈ رولنگ ایزی چیئر اور کوکر ٹیبل وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے، نہ کہیں ٹوسٹر، ہیٹر اور الیکٹرک کیٹل ہی نظر آرہی ہے۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے ہمیں ناپاس کرتے ہوئے فرمایا ـــــــــ

"باورچی خانے کا نہ کمپاؤنڈ ہے، نہ گارڈن نہ کوک کوارٹر، نہ اوپر کے کام کے بیرے۔ یہاں تو کچھ ہے ہی نہیں۔ اِس لئے اگر آپ ہمیں پانچ سو روپیہ مہینہ بھی دیں جب بھی ہم آپ کے یہاں کام نہیں کرسکتے۔"

یہ کہہ کر وہ ہمارا سلام لئے بغیر رائٹ اباوٹ ٹرن ہوکر کوئیک مارچ کرتے ہوئے نکلتے چلے گئے۔

اِن کے جانے کے بعد دوسرے صاحب تشریف لائے۔ دیکھنے میں ہلاکو اور چنگیز کی اولاد معلوم ہو رہے تھے۔ آتے ہی نہایت بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ اطمینان سے سگریٹ سلگا کر اس کے آڑے ترچھے کش لینے کے بعد بولے۔

"آپ کو غالباً کوک کی ضرورت ہے؟"

"جی ہاں!"

"آپ کے یہاں چھوٹی بڑی کے حاضریاں ہوتی ہیں؟"

ہم نے کہا۔

"چار"

اُنھوں نے کبوتر کے خون کی طرح چہرہ لال کرتے ہوئے نہایت حیرت کے ساتھ پُوچھا۔

"صرف چار؟"

"جی ہاں! دو بڑی اور دو چھوٹی یعنی صبح شام ناشتہ، دوپہر اور رات کو کھانا۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے ہم سے پُوچھنا شروع کیا۔

"گھر میں کُل کتنے آدمی ہیں؟ روزانہ آنے جانے والوں اور مہمانوں کی تعداد کا اوسطاً کیا ہے؟ اسپیشل ورائٹی کیا کیا بنواتے ہیں؟ دَورے پر کوک ساتھ جاتا ہے یا نہیں؟ آپ کتنی تنخواہ، مہنگائی بھتہ، سفری الاؤنس، بونس اور چھٹیاں دیتے ہیں؟ گورنر صاحب کے یہاں جب میں کام کرتا تھا تو ہفتہ میں کُل تین حاضریاں تیار کرنی ہوتی تھیں۔ جن کے لئے ہم کو ٹیلیو دین اٹینڈنٹ ملتے تھے۔ آپ کے یہاں کتنے آدمیوں سے کام لینا ہوگا؟ عام طور پر مہمانوں کے ٹِپ کا معیار اور اندازاً مجموعی رقم کتنی ہوتی ہے؟"

وہ ابھی ہمارے نوکر رکھنے کے حوصلے مزید پست کرتے کہ ہم نے بیچ میں اُن کی بات کاٹتے ہوئے اُن سے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ ـــــــــ

خواب

دل لذتِ نگاہِ کرم پا کے رہ گیا
کتنا حسین خواب نظر آ کے رہ گیا ـــــ شکیلؔ بدایونی

خواب میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شبِ غم کوئی کس طرح سحر کرتا ہے ـــــ مومنؔ

رات کا خواب، الٰہی توبہ
آپ سُنئے گا تو شرمائیے گا ـــــ رندؔ

اِک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا ـــــ فانیؔ بدایونی

تا نہ خلل پڑے کہیں آپ کے خوابِ ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں ـــــ یاسؔ ٹونکی

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ ہنکاری ایم۔ اے۔ آگرہ


اُجلے لوگوں کا نشان...
سَن لائٹ کی اُجلی شان
SUNLIGHT
سَن لائٹ کی دُھلائی کِتنی اُجلی ہے!
سَن لائٹ دوسرے صابنوں سے
زیادہ خالص ہے۔
3,64-140-45 UD-لنٹاس

"ٹھیک ہے! ہم اپنے فیصلے سے آپ کو خط کے ذریعہ مطلع کر دیں گے۔"
اور وہ ہم سے شیک ہینڈ کر کے رخصت ہو گئے۔

اس کے بعد تیسرے صاحب چیق اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ ایکدم سوٹیڈ بوٹیڈ گورے چٹے تھے۔ منہ میں چرمل مار کر سگار لگاتے بڑی شان سے آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک کمرے اور ماحول کا جائزہ لینے کے بعد بولے ——

"اگر آپ کے ٹرمس پسند آئے تو تین ماہ کا اپائنٹ منٹ لینا منظور کر لوں گا۔"

پوچھا ——

"صرف تین ماہ کیوں؟"

بولے ——

"گورنمنٹ آف انڈیا کے آفیشل ٹک سپروائزرس ریفریشرز کورس کے لئے امریکہ اور روس دو سال کے لئے جانا ہے۔ اس سے پہلے انگلینڈ اور جرمنی کا کورس مکمل کر چکا ہوں۔ ہلٹن ہوٹل کی ملازمت کی وجہ سے دنیا کے باون ملکوں کے مینو مجھے زبانی یاد ہیں۔ پانچ سو طریقوں سے تو صرف چائے بنا سکتا ہوں۔ ہزاروں کھانے مجھے پکانے آتے ہیں۔"

اس اطمینان کے ساتھ کہ اس سفید ہاتھی کو بھی ہم اپنی ڈیوڑھی میں نہیں باندھ سکتے۔ ہم ان کی باتیں سننے کے بعد اور جل بھن کر کوئلہ ہونے کے بعد کچھ موڈ میں اپنے آپ کو لانے کے لئے بولے۔

"آپ لونگ لتّی بنانا جانتے ہیں؟"

وہ گڑبڑا کر بولے۔ ——

"کیا راجستھانی ہے؟"

"نہیں! خالص بہاری چیز ہے!"

انھوں نے عرش سے فرش پر آتے ہوئے دریافت کیا۔

"مغل ڈش؟"

ہم نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

"نہیں جناب! خالص سوری کوارٹر پلیٹ ہے!"

معذرت کرتے ہوئے انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

"سوری... سو... سوری... اور کوارٹر پلیٹ کیا معنی؟"

ہم نے کہا۔

"لائٹ ریفریشمنٹ میں ڈش کہاں کوارٹر پلیٹ اور ریسپی چلتی ہے۔"

"اور سوری... یا... ساری۔"

"جی نہیں! ساری اس کے لئے جو جانتا نہ ہو اور سوری اس لئے کہ شاہانِ عَوَر اس کے شائق تھے۔ شیر شاہ سوری کے شاہی دسترخوان کی خاص چیز تھی۔"

وہ زِچ ہو کر بولے۔

"اس کی کیا پرپریشن ہوتی ہے؟"

ہم نے پالا مارتے ہوئے اکڑ کر کہا۔

"اب لونگ لتّی بھی آپ کو بنانا سکھاؤں تو باورچی رکھنے سے فائدہ؟ خود ہی کیوں نہ سب کچھ کر لوں؟"

اس کے بعد ہم نے ان سے پوچھا۔

"آپ فرائڈ بھٹاٹا بنانا جانتے ہیں؟"

"بھٹاٹا؟"

"جی ہاں! بھٹاٹا! بھٹاٹا!!"

بولے ——

"اس کا تو میں نے کبھی نام بھی نہیں سنا۔ بھٹاٹا کہ بھاٹا؟"

ہم نے تعجب سے چیخ کر کہا۔

"ارے! آپ بھٹاٹا تک بنانا نہیں جانتے۔ تو پھر نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ جائیے تین ماہ آرام کیجئے اس کے بعد دنیا کا دورہ شروع کر دیجئے۔ بھٹاٹا بھی اسی دنیا کی روزمرّہ کے استعمال کی چیز ہے۔ اس بار اپنا دورہ ممبئی سے شروع کیجئے گا تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ بھٹاٹا اور بھاٹا میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

اور وہ اپنا سا منہ لے کر چل دیتے۔

ان کے بعد چوتھے صاحب تشریف لائے۔ دیکھنے میں بالکل دھان پان، فلمی انداز کا زنخوں والا میک اپ کئے ایک ادائے خاص کے ساتھ جھک کر لکھنوی انداز میں سلام کیا۔ ہم نے ان سے پوچھا۔

"آپ کیا جانتے ہیں؟"

بولے ——

"چاہیں اندر کا کام لے لیجئے، خواہ باہر کا، یا ادھر ادھر کا، بس ایک کام لیجئے۔"

ہم نے پوچھا ——

"یہ اندر باہر اور ادھر ادھر کیا ہوتا ہے؟"

بولے ——

"خواہ کھانا پکوا لیجیے، گھر کے دوسرے کام لے لیجیے مثلاً جھاڑو، برتن، مسالہ وغیرہ یا پھر بازار سے سودا سلف ہی منگا لیجیے۔"

گویا ان کے رکھنے کا مطلب تھا کہ ان کے ساتھ کم از کم دو اور نوکر رکھے جائیں۔ کہ بقیہ دو کام جو یہ نہ کریں وہ دوسرے دونوں ملازم انجام دے دیا کریں۔ ہم نے اِس احتیاط کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔

"صاحب! بات صفا یہ ہے کہ میں بہت اصولی آدمی ہوں اور ہر طرح کے کام میں پھر کوئی اصول نہیں رہ جاتا۔"

ہم نے اُن سے عرض کیا۔

"مگر مجبوری یہ ہے کہ ہم خود بڑے بے اصولے ہیں اور جب بھی کام یاد آتا ہے ملازم سے فوراً وہ کام لے لیتے ہیں۔ کیونکہ ہم ٹائم ٹیبل بنا کر زندگی گزارنے کے عادی نہیں ہیں۔"

ہماری اِس مختصر دل برداشتہ تقریر کا اُن پر اتنا بُرا اثر پڑا کہ وہ ایک صد دفرشی سلام کر کے ہم سے فوراً رخصت ہو گئے۔

اِس کے بعد ایک صاحبہ ہاتھ میں گھڑی باندھے تشریف لائیں۔ شکل صورت اور کلّے ٹھلّے سے ماما سے زیادہ مکائن معلوم ہو رہی تھیں۔ انھوں نے پہلے تو اپنا اطمینان کرنے کے لئے ہم سے تمام ضروری پہلوؤں پر گفتگو کی۔

"آپ زیادہ سے زیادہ کتنی تنخواہ دے سکتے ہیں؟ کم سے کم کتنا کام لے سکتے ہیں؟ روزانہ کتنی دیر رہنا ہوگا——؟"

وقت کی پابندی پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

"اگر آپ کو کھانا پکوانا ہے تو دونوں وقت کا کھانا ایک گھنٹے میں تیار کر کے چلی جایا کروں گی۔ اگر کھانا اور ناشتہ دونوں ضروری ہیں تو ڈیڑھ گھنٹہ رُک جاؤں گی۔ مگر پچیس روپیہ گھنٹے کے حساب سے چارج کروں گی۔"

ہم نے پوچھا۔

"پچیس روپیہ گھنٹہ یومیہ کے حساب سے؟"

ہنستے ہوئے بولیں۔

"جی نہیں! ابھی اتنا اندھیر نہیں بس واجبی واجبی پچیس روپیہ گھنٹہ ماہانہ کافی ہوگا۔"

اِس کے بعد بات صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"جھاڑو نہ دوں گی، برتن نہ مانجھوں گی، مسالہ نہ پیسوں گی، بازار سے سودا نہ لاؤں گی، آٹا پسوانے نہ جاؤں گی، مالکن یا گھر والوں کی باتیں اور جھڑکیاں نہ سنوں گی، بس اپنے کام سے کام، روزانہ ٹھیک صبح چار بجے آ جایا کروں گی اور ساڑھے پانچ بجے صبح واپس چلی جایا کروں گی۔ اگر کھانا پکاؤں گی تو کھانا گھر لے جاؤں گی۔ اگر ناشتہ بناؤں گی تو ناشتہ لیا کروں گی، پکانے کے دوران چائے بنا بنا کر پیا کروں گی۔ دوسرے جب میں آؤں تو کھانے کا سب سامان اور برتن وغیرہ تیار ملیں۔ چولھا جلا ہوا ہو۔"

ہم نے کہا۔

"مگر ہم لوگ تو صبح سات آٹھ بجے تک سو کر ہی اٹھتے ہیں۔ دوسرے باقی وقت میں تم کیا کرو گی؟"

بولیں ——

"تو کیا ہوا۔ جب آپ لوگ سو کر اٹھا کریں گے تو کھانا، ناشتہ تیار مِلا کرے گا۔ چاہیں ناشتہ کریں یا کھانا کھائیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے لئے چائے بڑی کیتلی میں بنا لیا کروں تاکہ آپ لوگوں کو اُٹھتے ہی بیڈ ٹی بھی مِل جایا کرے۔"

پھر بولیں ——

"بقیہ وقت آپ پوچھتے ہیں؟ تو وقت ہی کہاں ہے ہمارے پاس۔ صبح چھ بجے ایک جگہ کام پر جاتی ہوں۔ ساڑھے چھ بجے دوسری جگہ ناشتہ بنانے جاتی ہوں۔ سات بجے تیسری جگہ کھانا پکاتی ہوں۔ آٹھ بجے چوتھی جگہ کھانا اور ناشتہ بناتی ہوں۔ دن کے ساڑھے نو بجے پانچویں جگہ کھانا، ناشتہ بنانے اور اوپر کے کام کے لئے جاتی ہوں۔ ساڑھے گیارہ بجے جن کے یہاں ہم لوگ رہتے ہیں اُن کا کھانا، اوپر کا کام اور سودا سلف کرتی ہوں پھر ڈیڑھ بجے دوپہر سے اپنا گھر بار دیکھتی ہوں اور چراغ جلے آرام کرتی ہوں۔"

ہم نے اُن سے اصرار کیا۔

"ہمارے یہاں دن میں آ کر کام کر دیا کریں۔"

مگر وہ ——

"ٹائم نہیں ہے"—— پھر افسوس کرتی ہوئی چلی گئیں۔

اِس کے بعد ایک باریش اور خوش پوش بزرگ تشریف لائے جو دیکھنے میں باورچی سے زیادہ مصاحب معلوم ہو رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ——

"کھانا پکانے سے بہتر فن وہ کھانا پکوانے اور کھانا کِھلوانے کا جانتے ہیں۔"

کیونکہ یہی وہ دونوں فن تھے جن میں ہم خود طاق تھے۔ اِس لئے ہم نے اُن کی خدمات حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔

اِس کے بعد ایک بڑے صاحب مع ایک عدد بڑی بی کے تشریف لائے اور بولے۔

"حضور جو دے دیں گے وہ ہم لے لیں گے، جو کھلا دیں گے وہ ہم کھا لیں گے۔

اور جو حکم دیں گے وہ فوراً سے پیشتر انجام دیں گے۔"

یہ سنتے ہی ہماری باچھیں کھل گئیں۔ دراصل ایسے ہی شریف اور فرمانبردار ملازم کی ہم تلاش میں تھے۔ اس لئے ہم نے اُنھیں فوراً ہی ملازم رکھتے ہوئے پُوچھا۔

"تنخواہ کیا ہوگی تم دونوں کی؟"

بڑے میاں نے دست بستہ عرض کیا۔

"جو حضور اپنے اوپر سے نچھاور کر دیں گے۔ اُسی سے ہم نہال ہو جائیں گے۔ ہمیں تو سر چھپانے اور عزّت سے دو روٹی کھانے کا آسرا ہے۔"

ہم نے مذاقاً کہا۔

"تم دونوں کو دو روپیہ مہینہ اور کھانا ملے گا۔ بولو منظور ہے؟"

دونوں نے یک زبان ہو کر عرض کیا۔

"منظور ہے۔"

اِس کے بعد ہم نے اُن کی معقول تنخواہ مقرر کر دی۔ ایک کمرے میں رہنے کا انتظام کر دیا اور دونوں میاں بیوی بہت مستعدی سے ہمارے گھر کا کام کاج کرنے لگے۔ دن بھر بڑے مزے مزے کی چیزیں بنا کر کھلائیں اور ایسے سلیقے سے ہر کام کیا کہ بیگم صاحبہ تک ہمارے اِس انتخاب پر پھڑک اُٹھیں۔

دوسرے دن دونوں نوکروں نے ہمارے گھر کی صفائی میں خاصی دلچسپی لی اور پُورے گھر کو آئینہ بنا دیا۔ بکس قاعدے سے سجا کر رکھ دیے۔ الماریوں کے سامان کو ترتیب سے رکھا۔ فرنیچر ایک خاص سلیقے سے ترتیب دیا۔ گملے بالکل ہی نئے ڈھنگ سے سجائے۔ غرض پُورا گھر ڈرائنگ رُوم بنا دیا۔ کھانا پکانے اور گھر کے کام کاج سے ذرا بھی فرصت ملتی تو دونوں گھر کے کونے کونے کا جائزہ لے کر ہر چیز کو ترتیب سے سنوار کر گھر کی سجاوٹ میں اضافہ کر دیتے۔ غرض تین ہی چار دن میں دونوں نوکروں نے گھر کو جنّت کا نمونہ بنا دیا۔

نئے نوکروں کو آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ ایک صبح بیگم نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا اور بولیں۔

"یہ سب دروازے کیسے پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے ہیں؟ کیا آپ بند کرنا بھول گئے تھے؟"

دیکھا تو باہر جانے والا تقریباً ہر دروازہ، کھڑکیاں اور پھاٹک کھلا ہوا تھا۔

میں نے اُٹھ کر جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اتفاقاً ایک آدھ دروازہ یا کھڑکی کھلی رہ سکتی تھی۔ ارے کھڑکی اور پھاٹک تو الگ رہے یہ الماریاں کیسی کھلی پڑی ہیں؟"

ہم نے دوڑ دوڑ کر جلدی جلدی ہر کمرے کا جائزہ لیا۔ تمام الماریاں اور بکس کھلے پڑے تھے اور اِن کا بقیہ سامان انتہائی بے ترتیبی سے کمروں میں بکھرا ہوا تھا۔ سیف کھلی ہوئی تھی اور بالکل خالی نظر آ رہی تھی۔ گھر کا قیمتی مال و اسباب نظر نہیں آ رہا تھا۔ نوکروں کو ہم نے کئی آوازیں دیں۔ اُس کے بعد اُن کے کمرے کی طرف گئے تو دیکھا وہ خالی ہے۔ بیگم نے پُوچھا۔

"دونوں نوکر کہاں ہیں؟"

ہم نے عقلی گدا لگاتے ہوئے کہا۔

"غالباً ہوا خوری کے لئے گئے ہوں گے۔"

اُنھوں نے کہا۔

"اور ہمارا سب سامان لئے کہیں ٹہل رہے ہوں گے!"

"کیا مطلب؟ لیکن وہ تو دیکھنے میں بڑے سیدھے معلوم ہوتے تھے؟"

"جی ہاں! اُنہی کے سیدھے پن سے گھر کتنا ٹیڑھا نظر آ رہا ہے!"

"تو کیا وہ نوکر نہیں چور تھے؟"

"اور نہیں تو شاہ تھے کمبخت کہیں کے؟"

اُس کے بعد ہم بہت اِدھر اُدھر بھاگے، اُنھیں ہر طرف تلاش کیا۔ تھانے میں رپورٹ لکھائی۔ لیکن نوکر ایسے رفو چکر ہوئے تھے کہ پھر ہاتھ نہ لگے۔

بس وہ دن ہے اور آج کا دن، ہم صرف نوکر کے بجائے ایماندار نوکر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ خود اپنے نوکر بنے رہتے ہیں۔ کام کے وقت اپنے نوکر اور خالی اوقات میں مالک معلوم ہوتے ہیں لیکن اب بھی مایوس نہیں ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اگر کبھی قسمت نے یاوری کی تو بالکل ایسے ہی ہمیں نوکر مل جائے گا جیسے کسی کے نام اچانک لاٹری نکل آئے!!

غزلیں

قمر قریشی ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی

کتنی سونی بزمِ تصور شہرِ غم سے لے کے چلے
مدت گذری سناٹوں میں آہٹ کا سنگیت ڈھلے

قطرہ قطرہ یاد کی شبنم ٹپکی سوکھے پتوں پر
لمحہ لمحہ حسن کے جلوے جاگے ہیں کچھ رات ڈھلے

بزمِ یاراں، کوئے نگاراں، چھوڑ کے اونچے رنگ محل
تنہائی کے صحراؤں میں کون ہمارے ساتھ چلے

روح کے بند دریچے کب تک اِک دستک کو ترسیں گے
حسرتِ دید رہے گی یونہی، دن نکلے یا رات ڈھلے

ہم نے تمہاری یاد کو اب تک دل میں یوں محفوظ رکھا
جیسے آندھی اور طوفاں میں لہروں پر اک دیپ جلے

مونسِ تنہائی تو کوئی آج ہے تیرا بھی اے دل!
تو ہی نہیں چپ چاپ سلگتا چاند بھی تنہائی میں جلے

اعجاز وارثی سنبھلی

دستِ وحشت تجھے کرنا ہے ابھی کام بہت
سنگ جب ہاتھ میں ہے، جلوۂ اصنام بہت

ہائے وہ زلف کے سائے میں دمکتے رخسار
یاد آتا ہے ترا حسن سرِ شام بہت

دیکھ ہر گام کو شائستۂ منزل کر لے
ورنہ اِس راہ میں ہیں کشتۂ انجام بہت

طعنہ ہم کو نہ دے محرومیٔ مے کا ساقی
خیر اُن مد بھری آنکھوں کی، ہیں جام بہت

دیکھ لے گردشِ دوراں ہمیں آنکھیں نہ دکھا
شعبدے دیکھے ہیں ہم نے سحر و شام بہت

جادۂ شوق میں ہر گام پہ ہشیار، اعجازؔ
دشمنِ اہلِ وفا ہے روشِ عام بہت

کیف احمد صدیقی

محبت! اور مجھکو راس آئے ہو نہیں سکتا
وہ جانِ آرزو اپنا بنالے ہو نہیں سکتا

یہ ہو سکتا ہے اُس کو بھول جائے اِک جہاں لیکن
ترا دیوانہ تجھکو بھول جائے ہو نہیں سکتا

کسی کی یاد جب ہر گام پہ ہے رہبرِ منزل
قدم راہِ وفا میں ڈگمگائے ہو نہیں سکتا

شبِ فرقت یہی کہہ کہہ کے بہلاتا ہوں دل اپنا
تجھے وہ جانِ حسرت بھول جائے ہو نہیں سکتا

تری نظروں سے کچھ ایسی شرابِ حسن ڈھلتی ہے
کہ جس کو پی کے ساقی ہوش آئے ہو نہیں سکتا

یہی آواز میرے دل کی ہر دھڑکن سے آتی ہے
کسی کو کیفؔ تیری یاد آئے ہو نہیں سکتا

قمر سنبھلی

حال اپنے غم کا اُن کو سُنایا نہ جا سکا
پلکوں تک ایک اشک بھی لایا نہ جا سکا

ترکِ تعلقات کو مدت گزر گئی!
دل سے مگر کسی کو بھلایا نہ جا سکا

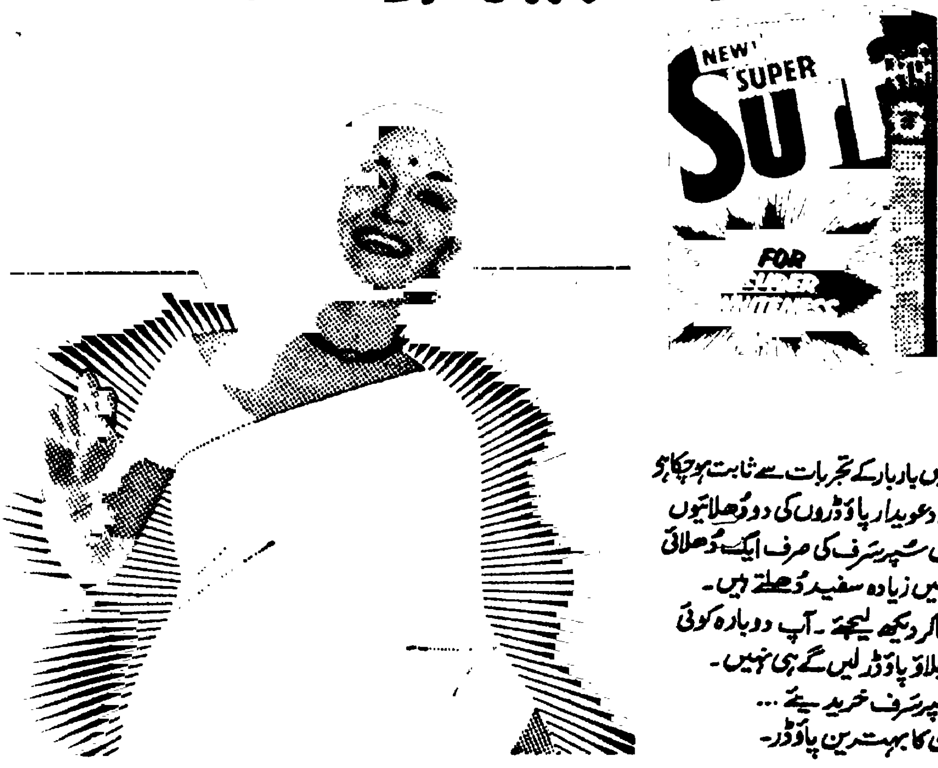
اُن کے حضور آنکھ بھر آئی، جو لب سیے
دل کی تڑپ کو ہم سے چھپایا نہ جا سکا

یہ کون سا مقام ہے اے ذوقِ جستجو؟
آگے قدم جہاں سے بڑھایا نہ جا سکا

روتے ہیں میرے حال پہ دشمن بھی اے قمرؔ
اُن سے مگر اِک اشک بہایا نہ جا سکا

آزمائیے

سپر سرف سے ایک بار دُھل کر کپڑے جتنے سفید ہوتے ہیں دوسرے پاؤڈروں سے ۲ بار دُھل کر بھی نہیں ہوتے !



تجربہ گاہوں میں بار بار کے تجربات سے ثابت ہو چکا ہے
کہ برابری کے دعویدار پاؤڈروں کی دو دُھلائیوں
کے مقابلے میں سپر سرف کی صرف ایک دُھلائی
سے کپڑے کہیں زیادہ سفید دُھلتے ہیں۔
خود ہی آزما کر دیکھ لیجئے۔ آپ دوبارہ کوئی
دوسرا کام چلاؤ پاؤڈر لیں گے ہی نہیں۔
آج ہی سپر سرف خرید یئے ...
ہندوستان کا بہترین پاؤڈر۔

سپر سرف سے کپڑے سب سے سفید دُھلتے ہیں!

(نیل پاؤڈر وغیرہ کی ضرورت نہیں)

ہندوستان لیور کی ایک اعلیٰ پیشکش

لنٹاس HL-76-140-45 UD

پتّھر کے پھُول

رِیاض احمد رضا بی۔ اے

پوسٹ بکس ۲۲۵۔ شارجہ۔ عرب گلف

گرامی قدر خوشتر گرامی صاحب! تسلیمات

ایک طویل عرصے کے بعد "بیسویں صدی" کی بزم میں "پتّھر کے پھُول" لے کر حاضر ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ افسانہ اگر آپ کے شہرۂ آفاق جریدے کے معیار پر پُورا اُترا تو سمجھوں گا میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ مجھے آپ کی اور آپ کے ذہین قارئین کی آراء کا انتظار رہے گا۔ . .

خلوص کیس ——— ریاض احمد رضا

کاشانۂ راحت ۱۱۷/بی، ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی نمبر ۳

۱۵ اپریل ۱۹۶۷ء

محترمی سلیم صاحب! اسلام مسنون

یقیناً آپ کے لئے یہ خبر مسرّت آگیں ہوگی کہ آپ کی تصویر "پتّھر کے پھُول" کو الحمرا آرٹ کونسل نے پہلے انعام کا مستحق قرار دیا۔ میں بھی آرٹ کی طالبہ ہوں، اِس لئے اِس فن کی دل سے قدر کرتی ہوں ——— لیجئے! خلوصِ دل سے مُبارکباد قبول فرمایئے۔ "پتّھر کے پھُول" ایک اچھُوتا خیال ہے

"پتّھر کے پھُول" ایک اچھُوتا خیال ہے اور تصویر کو ہر مکتبِ فکر کے لوگوں نے پسند کیا۔ یہاں اگر میں یہ کہہ دوں کہ آپ کو عنوان تجویز کرنے میں ملکہ حاصل ہے تو اِس میں ستائش کا کوئی پہلو نہیں۔ یہ اظہارِ حقیقت ہے۔ یہی لیجئے! آپ کی انعام یافتہ تخلیق سے اگر عنوان غائب کر دیا جائے تو تصویر بے جان ہو کر رہ جائے۔ اچھُوتے فنکار کے لئے اچھُوتا عنوان ہی زیب دیتا ہے۔

اُمید ہے جواب سے نوازیں گے۔ زیادہ حدِ ادب

——— سلمہ نسرین

کاشانۂ راحت ۱۱۷/بی، ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی نمبر ۳

یکم مئی ۱۹۶۷ء

ڈیر سلیم صاحب! تسلیم

پچھلے دِنوں کِس شِدّت سے آپ کے خط کا انتظار کیا، اِس کیفیت کو احاطۂ تحریر میں لانا جُوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ میں سمجھتی ہوں ایک اچھے آرٹسٹ کو فراغت کے بہت کم لمحے میسّر آتے ہیں لیکن خط کے جواب کے لیے کون سی صدیاں درکار ہیں۔ دو چار لفظ ہی لکھ دیتے ہوتے۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ خط لکھنے والا کتنی بیقراری سے جواب کا انتظار کرتا ہے۔

ابھی کل ہی کی بات ہے۔ آرٹ پر بحث چل نکلی۔ بحث کے دَوران آپ کی انعام یافتہ تخلیق "پتّھر کے پھُول" (جِسے میں خرید چُکی ہوں) پر بحث ہوئی۔ لیکن کِسی ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ سبھی کی یہی رائے تھی کہ اِس میں زندگی کی بھرپُور عکاسی موجود ہے اور پھر اِس مادّہ پرست دُنیا میں سِسکتے ہوئے ارمانوں کے خاموش مدّوجزر اور اخلاقی قدروں کو کون پہچانتا ہے۔ جو چند ایک ہیں وہ عظیم ہیں!

خلوص کیش ——— سلمہ نسرین

کاشانۂ راحت ۱۱۷/بی، ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی نمبر ۳

۵ جون ۱۹۶۷ء

سلیم صاحب! آداب

گذشتہ ہفتے آرٹس سرکل راولپنڈی سے آپ کی ایک تصویر "دھوئیں کی

سیڑھی" الحمراآرٹ کونسل میں موصول ہوئی۔ جسے خاص اہتمام سے صدر دروازے پر آویزاں کیا گیا۔

ایک اہم اور پیچیدہ مسئلے کو کتنی خوبصورتی سے آپ نے "دھوئیں کی سیڑھی" میں سمو دیا۔ یہ آپ ہی کی دُور رس نگاہوں اور تخیّل کا حصّہ ہے — بیکبار سپر پہ لکھنے میں کوئی باک نہیں سمجھتی کہ رنگوں کا حسین امتزاج اور عنوان رکھنے کا سلیقہ کوئی آپ سے سیکھے!

عنقریب موسم گرما کی تعطیلات شروع ہونے والی ہیں۔ شاید لاہور کا کوئی پروگرام بن جائے اور آپ سے نیاز حاصل ہوسکے۔ ویسے آپ انتہا درجہ کے کٹھور اور سنگدل ہیں — پتھر کے پھولوں کے خالق جو ہوتے!

——— سلمہ نسرین

کاشانۂ راحت، ۱۱۷/بی، ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی نمبر ۳

۲۷ر جون ۱۹۶۷ء

سرپھرے سلیم!

کتنے بھولے ہیں وہ لوگ جو تم جیسے آرٹسٹوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ حالانکہ تمھارے فن کے قدر داں نہ ہوں تو تم دو کوڑی کے بھی انسان نہیں ہو — یہ کبھی سوچا تم نے —!!

چند ٹکوں کے عوض اپنا آپ بیچنے والے فنکار کے بچّے! فن کسی کی میراث نہیں! میری ایک سہیلی نے سچ ہی تو کہا تھا — آرٹسٹ کم ظرف ہوتے ہیں۔

میں عنقریب اپنی سہیلی کی شادی کے سلسلے میں لاہور آرہی ہوں۔ اپنے آنے جانے کے اخراجات کے علاوہ میں اس تصویر کی قیمت بھی وصول کروں گی۔ جو میں نے عقیدت کی بنا پر خریدی تھی۔

——— سلمہ نسرین

اقبال منزل، مین بازار، سمن آباد۔ لاہور

۲ر جولائی ۱۹۶۷ء

محترمہ سلمہ صاحبہ! ڈیر سلمہ صاحبہ

سلمہ صاحبہ! اور

سلام مسنون، تسلیم، آداب . . .

آپ کے چاروں خط مجھ تک پہنچے۔ تصویروں کی پسندیدگی کا شکریہ! اسے آپ کچھ بھی سمجھ لیں کہ میں خط کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ بہر حال یہ میرا اصول ہے کہ میں اپنے احباب کا دائرہ وسیع نہیں کرنا چاہتا اور اس سلسلے میں میرا نظریہ ہے کہ جب تک کسی کے چار خط موصول نہ ہو جائیں جواب نہ دیا جائے۔

اس دَوران میں وہ خود ہی تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور میرا اصول برقرار رہتا ہے۔ آخری خط میں جو الفاظ آپ نے میرے اور میری برادری کے لئے استعمال کئے ہیں اُن کے لئے آپ کا ممنون ہوں!

مخلص ——— سلیم اقبال

خط کو لفافے میں بند کر کے سلیم نے رحمت بابا کو آواز دی اور رحمت بابا کہیں دُور سے پکارا

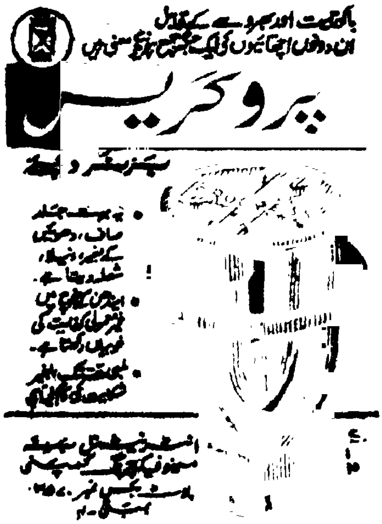
"آیا سلیم بابو!"

"بابا — اِدھر بیٹھو" سلیم نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"کہو سرکار!"

"سرکار ورکار کچھ نہیں بابا!"

"میں آپ کو پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آپ میرے بزرگ ہیں۔ اس لئے یہ حد سے زیادہ عزّت افزا جملے نہ کہا کرو — مجھے اِن سے تکلیف ہوتی ہے۔ اور پھر اذیّت دینے کے لئے دُنیا کے لوگ کیا کم ہیں۔ بابا — میرے من



میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی آکر میرے من میں روشنی کرے "سلیم نے رُندھی آواز میں کہا "مجھے روشنی سے نفرت ہو گئی ہے بابا۔ مجھے کہیں دُور لے چلو۔ ورنہ یہ دُنیا والے مجھے پاگل کر دیں گے۔"

"ایسا نہ کہیے!" رحمت بابا نے التجا آمیز انداز میں کہا۔

"کیوں نہ کہوں ——— میرا سب کچھ چھن گیا۔ اِسی روشنی نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ اب پھر وہی روشنی میری آنکھوں کو چُندھیا رہی ہے ——— یہ سب فریب ہے۔ سب دھوکا ہے۔ آخر یہ دُنیا والے مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ اِن سے کہہ دو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں کسی کو کچھ بھی نہیں دے سکتا! ——— میری زندگی تو اُس پرندے کی مانند ہے جو اونچی پرواز کے دَوران کسی کھائی میں گِر گیا ہو ———"

"بس کرو سلیم ———!" رحمت بابا نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ——— "تمھاری باتیں سُن کر تو پہاڑ بھی رو دیں۔ خدارا! اپنی صحت کا کچھ خیال کرو۔ تمھیں یاد ہوگا۔ تمھارے والدین نے تمھیں میرے سُپرد کیا تھا اور کہا تھا ——— رحمے! اب خدا کے بعد تو ہی سلیم کو دیکھنے والا ہے ——— جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو میں سوچتا ہوں اگر تمھیں کچھ ہو گیا تو میں اُنھیں کیا مُنہ دِکھاؤں گا ——— دیکھو! یہ ہوا کِتنی سرد ہے! اور تم نے پیروں پر سے کمبل بھی اُتار دیا ہے۔ ڈاکٹر کہتا تھا تمھیں مکمّل آرام کی ضرورت ہے" ——— رحمت بابا نے اُٹھ کر کمبل سے سلیم کے پیروں کو ڈھانپ دیا۔

اگلی صبح بمشکل اُٹھا۔ برش اور رنگ وغیرہ دیکھے۔ پھر بڑبڑانے لگا۔

"یہ میری آخری تصویر ہوگی اِس کے بعد میں اپنے ماضی کی طرح اپنے فن کو بھی دفن کر دوں گا۔ جب فن ہی نہ رہا ——— تو فنکار کیسا ———!"

"ناشتہ لے آؤں سلیم ———؟" رحمت بابا نے دروازے ہی سے پُوچھا۔

"ہاں لے آؤ ——— لیکن ذرا تخت پر بیٹھنے میں میری مدد کرو۔"

رحمت بابا ناشتے کے بغیر جلد ہی لَوٹ آیا۔

"سلیم ——— ایک لڑکی مِلنے آئی ہے۔ میں نے اُس سے بہت کہا کہ سلیم کسی سے نہیں مِلتا۔ لیکن وہ بھی ایک ڈھیٹ ہے۔ کہتی ہے ——— بہت دُور سے آئی ہوں اور تمھارے سلیم صاحب سے قرض لینے آئی ہوں۔"

"قرض!" سلیم ہنسا۔

"تو لے آؤ اُن محترمہ کو ———" وہ سِمٹ کر بیٹھ گیا۔ دراز قد، آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے، تنگ لباس میں ملبوس وہ لڑکی اندر آگئی۔

دروازے ہی سے سلیم پُکار اُٹھا ——— "آئیے آئیے ——— اگر میری آنکھیں دھوکا نہ کھا رہی ہوں تو میں آپ کو سلمہ کہہ دوں!"

"بے شک سلمہ ———!" سلمہ نے ہلکی سی مُسکراہٹ سے جواب دیا۔

"اور آپ بھُول بھی کیسے سکتے ہیں!" سلمہ نے طنز سے کہا۔

"بابا ——— اِن کے لئے چائے لے آؤ ———"

"چائے کے لئے تو میں شُکریہ ادا کرتی ہوں۔ آج صبح ہی صبح شالامار کا پروگرام بن گیا۔ میں نے سوچا آپ کو بھی لیتی چلوں ———"

"مجھے ———؟" سلیم نے 'مجھے' ایسے کہا جیسے خلاؤں سے بولا ہو۔

"ہاں ہاں ——— آپ کو!"

"لیکن ——— لیکن ———!"

"لیکن ویکن کچھ نہ سنوں گی ———!"

"اُٹھیے اور پل بھر میں تیار ہو جائیے۔ تب تک میں آپ کی تصویریں دیکھتی ہوں۔"

سلمہ بے تکلّف ہو چُکی تھی۔

"لیکن میں نے کہا نا محترمہ!" یہ کہہ کر سلیم نے پیروں سے کمبل ہٹا دیا۔

سلمہ کو جیسے سانپ سُونگھ گیا ہو!

"یہ آپ کے پَیر ———!" بمشکل اُس کی زبان سے نِکلا۔

"جی ہاں۔ حالیہ جنگ میں کام آگئے۔"

"اوہ ——— تب تو آپ واقعی نہیں جا سکتے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نِکل گئی۔

غزلیں

شو راج بہار

دھجیاں اُڑتی ہیں ہر سمت گریبانوں کی
قابلِ دید ہے وحشت ترے دیوانوں کی

برق کی زد میں رہا خرمنِ اُمید اُن کا
وائے تقدیر ترے سوختہ سامانوں کی

دیکھنا وقتِ سحر گرمیِ محفل کا مآل
خاک تک بھی نظر آئے گی نہ پروانوں کی

قدر واں کیا ہو وہ آسودگیِ ساحل کا
زحمتیں جس نے اُٹھائی نہ ہوں طوفانوں کی

اے غمِ دوست! خدا تجھکو سلامت رکھے
تجھ سے آباد ہے دُنیا مرے ارمانوں کی

کیفِ مے، رنگِ شفق، نورِ سحر، موجِ بہار
سُرخیاں ہیں یہ مرے عشق کے افسانوں کی

ڈوبتوں کو جو کنارے پہ لگاتی ہیں بہار
ایسی موجیں بھی ہوا کرتی ہیں طوفانوں کی

عابد مناوری

آرزو دل میں رہی حسرت ویراں کی طرح
زندگی ہم نے گزاری شبِ ہجراں کی طرح

میرے پہلو میں نہیں ہے وہ گلِ تر جب سے
گلستاں بھی نظر آتا ہے بیاباں کی طرح

زندگانی کا توازن نہ بگڑنے پائے
جام گردش میں رہیں گردشِ دوراں کی طرح

جان جاتے ہیں وہ عنوان سے افسانے کو
لوگ کم فہم نہیں ناصحِ ناداں کی طرح

آرزوؤں کے وہ ہنگامے کہاں اُن کے بغیر
دل ہے سنسان کسی شہرِ خموشاں کی طرح

ہم نے مہکاتے ہیں گل ہائے خلوص و ایثار
ہم نے ڈالی ہے محبت کے گلستاں کی طرح

کتنی پُر نور ہے میری شبِ ہجراں عابدؔ
دل میں ہے یادِ صنم شمعِ فروزاں کی طرح

آزاد گورداسپوری بی۔ اے

موت کا ساماں ہوا ہے زندگی کے نام پر
دل شکن چلے گئے ہیں دلبری کے نام پر

اور بھی تھیں حسن کی دُنیا میں دل کش مورتیں
دل مرا دھڑکا تھا لیکن آپ ہی کے نام پر

دشمنی ہوتی تو ہم ہشیار رہتے ہر طرح
ہم کو تو لُوٹا گیا ہے دوستی کے نام پر

قافلے والے سرِ منزل نہ پہنچیں گے کبھی
رہزنی ہونے لگی ہے رہبری کے نام پر

آپ ہی ہنس ہنس کے دیوانہ بنائیں اور پھر
آپ ہی رسوا کریں دیوانگی کے نام پر

جس کی صورت دیدۂ مشتاق نے دیکھی نہیں
جان دیتا ہے دلِ مضطر اُسی کے نام پر

یہ تو ہے آزادؔ میری وضعداری کے خلاف
میں کرم کی بھیک مانگوں زندگی کے نام پر

انٹرویو

آئینۂ کلام سامنے رکھ کر ــــــــ

نریش کمار شاد سے اِنٹرویو

ــــــــ آذر بارہ بنکوی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

محلہ کٹرہ۔ امام باڑہ۔ بارہ بنکی (یو۔ پی)

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات و نیاز

یوں تو سارے اُردو داں طبقہ اور ادب نواز حضرات کو نریش کمار شاد سے ایک وابستگی تھی۔ لیکن آپ کو اور "بیسویں صدی" کو شاد سے گہرا لگاؤ تھا۔ شاد کی زندگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت تھی جسے موت کی بے رحمیوں نے محض ایک افسانہ بنا دیا۔ شاد کے مر جانے سے "بیسویں صدی" کا مخصوص طور پر ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔ شاد کے "سُرخ حاشیے" اور "اِنٹرویو" "بیسویں صدی" اور اُردو ادب میں ایک خاص مقام اور اہمیت رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ شاد کے مر جانے سے یہ دلچسپ باب ختم ہو گئے ــــــ شاد نے کئی شعراءِ کرام کے اِنٹرویو قارئینِ "بیسویں صدی" کی خدمت میں پیش کئے اور یہ شاد کی شخصیت کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی اگر شاد کا 'اِنٹرویو' نہ پیش کیا جائے۔ شاد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے میں نے ایک کوشش کی ہے۔ مُردہ پرست دُنیا اس کے سِوا اور کر بھی کیا سکتی ہے؟ شاد کی غم زدہ بیوہ کی مدد کے سلسلہ میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ مشاعرے کا انعقاد کیجئے جس میں ٹکٹ لگا دیجئے اور اس کی جملہ آمدنی شاد کی بیوہ کو نذر کر دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی اِس کام کو بہت خوبی سے انجام دے سکتی ہے۔ اِس 'اِنٹرویو' میں آپ کو شاد کی زندگی کا ہلکا پھلکا خاکہ بھی نظر آئے گا۔ اگر یہ اِنٹرویو شاد کے شایانِ شان ہو تو اِسے کسی اشاعت میں ضرور جگہ دیں۔ اِس دور میں آپ مسیحائے اُردو کا کام انجام دے رہے ہیں۔ اُردو آپ پر بجا ناز کرتی ہے . . .

نیاز کیش ــــــ آذر بارہ بنکوی

★

آذر:۔ شاد صاحب! گستاخی معاف میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی تنہائیوں میں مخل ہو گیا۔ آپ نہ جانے خیالوں کی کن حسین وادیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہیں آپ کو میرا اِس طرح اچانک آ جانا ناپسند تو نہیں ہوا؟

شاد:۔ ہم بڑے خود پسند ہیں صاحب
تم ہمیں کیا پسند آؤ گے؟

آذر:۔ خیر جناب! آپ کی خاطرِ نازک پر میں اِس وقت بار سہی، پھر بھی چند سوالات تو آپ سے کرنا ہی ہیں۔ شاد صاحب! آپ کی ادبی خدمات سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ آپ نے نثر و نظم اور نظم میں غزل، رباعیات، قطعات اور سبھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے اور یقیناً بے حد کامیاب! آپ کا اسلوبِ بیان، سوز و گداز اور آپ کی انفرادیت آپ کے فن اور صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ آپ کے کلام کے سرسری مطالعے سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کا دل زخم خوردہ ہے اور آپ کی زندگی، زندگی نہیں ایک المیہ ہے۔ کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے ارمانوں نے گھُٹ گھُٹ کے دَم توڑا ہے؟

شاد:۔ شاد وہی آوارہ شاعر جس نے تجھ سے پیار کیا
نگر نگر میں گھوم رہا ہے ارمانوں کی لاش اُٹھائے

آذر:- بے شک جناب! آپ اعتراف کرتے یا نہ کرتے، خاکسار کا نظریہ آپ کے متعلق پہلے سے یہی تھا اور اب تو آپ نے خود تصدیق فرما دی۔ لیکن یہ تو فرمایئے کہ آپ جن ارمانوں کی لاش اُٹھائے نگر نگر گھوم رہے ہیں اُن ارمانوں کے پردے میں کون سا جذبہ کار فرما ہے۔ میرا مطلب ہے جذبۂ محبت تو نہیں۔ . . اور آپ کو کسی پھول جیسے نرم و نازک چہرے کی یاد تو نہیں ستاتی رہتی ہے؟

شاد:- میرے دامن میں کوئی پھول کہاں
میں مسافر ہوں خارزاروں کا!

آذر:- دیکھئے شاد صاحب! اب آپ اپنا دامن نہیں بچا سکتے، آپ کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی اُداسی اور سُونا پن آپ کے مجروح جذبات کی آئینہ دار ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی "آفاقی مذہب" یعنی محبت کے پرستار ہیں اور آپ کا دل بھی کسی کی شوخ اور مسحور کُن نگاہوں کا نشانہ بن چکا ہے اسی لئے آپ کی زندگی بجائے خود ایک فریاد بن کر رہ گئی ہے؟

شاد:- کاش! کوئی سُن سکتا میرے گھائل جیون کی فریادیں
جو برسوں سے گونج رہی ہیں ان نینوں کے سُونے پن میں

آذر:- کوئی اور سُنے یا نہ سُنے لیکن اُس جانِ آرزو نے تو ضرور سُنی ہوں گی جس کی گھنیری زُلفوں کی چھاؤں میں آپ کی پُر کیف راتیں بسر ہوتی ہیں اور جس کے تصور سے آپ کو میٹھی نیند آجاتی ہے؟

شاد:- ایک شب گزری تھی تیرے گیسوؤں کی چھاؤں میں
عمر بھر بے خوابیاں میرا مقدر ہو گئیں

آذر:- بجا ارشاد! لیکن اگر وصل کی ایک شب عمر بھر کی بے خوابیوں کا باعث بن گئی تو قبلہ! آپ اپنے حسّاس دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محبت کے نقوش مٹا کیوں نہیں دیتے اور اگر عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو مصلحت کا تقاضہ بھی یہی ہے؟

شاد:- مصلحت لاکھ اعتراض کرے
نقش مٹتے نہیں محبت کے

آذر:- یقیناً جناب! آپ کے اس ارشاد سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں حقیقتاً محبت ایک ایسا جذبہ ہے جسے زندگی کے کسی دور میں کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ انسان اپنے آپ کو بھول سکتا ہے، خود مٹ سکتا ہے لیکن دل سے محبت کے نقوش نہیں مٹا سکتا۔ پھر بھی شاد صاحب! آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ آپ کے وفادار دوستوں کا ایک ایسا وسیع حلقہ ہے جن کے درمیان بیٹھ کر آپ اپنا ہر غم، خواہ وہ غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں، آسانی سے بھول سکتے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے وفادار دوست اس زمانے میں سب کو میسّر بھی کہاں ہوتے ہیں؟

شاد:- دوستی اور اس میں رنگِ وفا
بات کرتے ہو کس زمانے کی

آذر:- اچھا تو اسی سلسلہ میں یہ بھی ارشاد فرمایئے کہ آپ کی زندگی میں جب کوئی وقتِ امتحان آیا تو آپ کے دوستوں نے حقِ وفا ادا کیا یا نہیں؟

شاد:- مقامات ایسے بھی غربت میں دیکھے
جہاں پھیر لیں دوستوں نے نگاہیں

آذر:- ہو سکتا ہے آپ کے ذاتی تجربہ میں یہ بات آئی ہو جسے آپ نے غزل کے ایک لطیف شعر میں نہایت حُسن و خوبی سے ڈھال دیا۔ لیکن کیا حقیقتاً آپ اپنے احباب سے اس حد تک بدگمان ہو چکے ہیں کہ ان سے خلوص و محبت کی اُمید نہیں رکھتے؟

شاد:- کتنا بڑا ثبوت مری سادگی کا ہے
احباب سے خلوص کا خواہاں رہا ہوں میں

آذر:- بے شک آپ پیکرِ خلوص و وفا ہیں۔ اس کے باوجود دوستوں کے تغافل سے تنگ آکر کبھی آپ کے دل میں جذبۂ انتقام تو نہیں پیدا ہوا؟

شاد:- یارانِ سرد مہر کا مارا ہوا ہوں میں
لیتا ہوں انتقام مگر اپنی ذات سے

آذر:- کیا کہنا! کتنا اچھا شعر ارشاد فرمایا ہے آپ نے قبلہ! بلاشبہ آپ کی شاعری کا حاوی عنصر غم ہے اور غم تباہیوں اور بربادیوں کا لازمی نتیجہ ہے تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ کی تباہیوں میں آپ کے یارانِ سرد مہر کا ہاتھ ہے؟

شاد:- یاروں کی بے پناہ نوازش کے باوجود
میری تباہیوں میں مرا اپنا ہاتھ ہے

آذر:- حضور گستاخی معاف! بات ابھی صاف نہیں ہوئی، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کسی رشکِ حُور کے جور و ستم نے آپ کا شیشۂ دل چُور کر دیا ہے اور بقول شاعر "سمجھ بوجھ کر چوٹ کھائی گئی ہے"؟

شاد:- کسی کے جور و ستم کا تو اک بہانہ تھا
ہمارے دل کو بہر حال ٹوٹ جانا تھا

آذر:۔ شاد صاحب! میرا اپنا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی ملول، پریشان اور غم زدہ کیوں نہ ہو، خوشی کے موقعوں پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ فطرتاً آہی جاتی ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے آپ کی آنکھوں کی ویرانی اور چہرے کی اداسی اور بڑھتی جا رہی ہے اور خوشی کے وقت بھی آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کوئی لکیر نہیں ابھرتی؟

شاد:۔ دلِ مرگ آشنا میں زندگی مشکل سے آتی ہے
خوشی کے وقت بھی ہم کو ہنسی مشکل سے آتی ہے

آذر:۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! یہ شعر نہیں، شرحِ حیات ہے، جسے سننے کے بعد کوئی اور سوال اِس سلسلہ میں آپ سے کرنا مناسب نہیں۔ پھر بھی شاد صاحب! اچانک میرے دل میں ایک اندیشہ اور خدشہ پیدا ہو گیا اور وہ یہ ہے کہ اکثر یہ اعتراض سنا جاتا ہے کہ اردو شاعری میں اور خصوصاً اردو غزل میں زیادہ تر حسن و عشق، زلف و رخ وغیرہ کے تذکرہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا اور اگر کچھ ہے بھی تو وہ قنوطیت، یاسیت اور ایسے غم انگیز اشعار جو زندگی میں بیداری کی روح پھونکنے کے بجائے ایک ایسا تعطل اور جمود پیدا کر دیتے ہیں جنھیں سن کر دل و دماغ مفلوج اور عزائم اور حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ نے ایسے بھی اشعار کہے ہیں جو اِس اعتراض کو رد کر سکیں؟

شاد:۔ جمود توڑ کوئی اضطراب پیدا کر
سکون سے جو بسر ہو وہ زندگی کیا ہے

آذر:۔ بہت خوب! بہت خوب! اِس سلسلہ میں یہ بھی فرمایئے کہ اگر زندگی کی پُرپیچ راہوں کو گہرے اور وحشت ناک اندھیرے گھیر لیں تو کیا انسان کو تھک ہار کر بیٹھ جانا چاہیئے؟

شاد:۔ یہی تیرگی تو نویدِ سحر ہے
چلا چل رہِ شوق میں والہانہ

آذر:۔ اور اگر سفینۂ حیات موج و طوفاں سے دوچار ہو جائے تو...؟

شاد:۔ جب موج میں آتے ہیں شناور کے عزائم
طوفان کی موجوں سے ابھرتے ہیں کنارے

آذر:۔ آپ کا مطلب ہے کہ اگر منزلِ مقصود حدِّ نظر سے دور بھی ہو تو بھی بلند حوصلہ انسان اُسے پا سکتا ہے؟

شاد:۔ اے شاد! شاد ہو کہ تری منزلِ مراد
حدِّ نظر سے دور سہی، لاپتہ نہیں

آذر:۔ جزاک اللہ شاد صاحب! ہر چند کہ غم آپ کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ پھر بھی آپ کے حوصلے اور عزائم پست نہیں اور آپ غمخانۂ حیات میں غم کی ہنسی بہت والہانہ انداز میں اڑا رہے ہیں۔ آپ نے اپنی منزلِ مقصود پالی ہے۔ میرا خدشہ بھی ابھارتا رہا اور یقیناً آپ بھی مطمئن ہوں گے؟

شاد:۔ منزل پہ آگیا ہوں مگر مطمئن نہیں
میں مطمئن ہوں، عزمِ سفر مطمئن نہیں

آذر:۔ کیا کہنا! اِس بے پناہ ہمت و جسارت کا! کتنا حیات آفریں شعر ہے۔ آپ کی بلند حوصلگی اور جواں ہمتی لائقِ صد ستائش ہے اور آپ کا کلام پڑھنے یا سننے والا آپ کے بے پایاں عزم و استقلال کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے گا۔ مگر اِس جادۂ پُرپیچ میں آپ تنِ تنہا ہیں یا آپ کی للکار سن کر زمانہ بھی آپ کے نقشِ قدم پر گامزن ہے؟

شاد:۔ اب کوئی تازہ حشر اٹھائے گی زندگی
اِس عالمِ کہن سے بشر مطمئن نہیں

آذر:۔ قبلہ! اِس یاس و حرماں کے ماحول میں اور اِس دل شکستگی کے عالم میں عزائم کا یہ بانکپن دیکھ کر حیرت ہوتی ہے؟

شاد:۔ اِس دل شکستگی میں بھی میرا یہ بانکپن!
حیرت سے دیکھتی ہے مری زندگی مجھے

آذر:۔ شاد صاحب! مجھے اِس اعتراف سے بہت خوشی ہوتی ہے کہ موجودہ نسل کے اُن نوجوان شعراء میں آپ کا نام نامی سرِفہرست آتا ہے جنھوں نے اردو شاعری میں نئے نئے تجربات کئے ہیں۔ آپ نے میکسم گورکی کا قول کہ "انسان کا اپنے آپ سے غیر مطمئن ہونا ایک مقدس چیز ہے" غزل کے کسی شعر میں نظم کیا ہے۔ کیا وہ شعر آپ سنانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟

شاد:۔ اُس زندگی کی شانِ تقدس پہ میں نثار
جس زندگی کے شام و سحر مطمئن نہیں

آذر:۔ قبلہ! رات بھیگتی جا رہی ہے اور آپ کا ذوقِ بادہ پرستی اور آپ کی رندی اظہر من الشمس ہے تو آیئے شغلِ جام و مینا نہ سہی، ذکرِ جام و مینا ہی ہو جائے۔ کیونکہ بادہ و جام کے بغیر کیف و مستی ممکن نہیں؟

شاد:۔ بادہ و جام پر نہیں موقوف
تشنگی میں بھی ایک مستی ہے

آذر:۔ خیر یہ تو رہا آپ کا فلسفیانہ [illegible] جو آپ کی وسیع النظری کی دلیل ہے۔ لیکن شراب کے متعلق سنا یہی جاتا ہے کہ یہ انسانی زندگی کے لئے

نقصان دہ اور مضر ہوتی ہے اور اس کا مسلسل استعمال زندگی کو موت کے
دروازہ تک پہنچا دیتا ہے۔ آپ خود کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ میں؟

شاد:- ہم اپنے درد کی توہین کر گئے ہوتے
اگر شراب نہ ہوتی تو مر گئے ہوتے

آذر:- اچھا آپ اسے میری بدنصیبی یا خوش نصیبی جو چاہے کہہ لیجئے لیکن میں خود آپ کی اس 'لال پری' سے براہِ راست متعارف نہیں، آپ ہی جیسے کرمفرماؤں سے سنا ہے کہ فضائے میکدہ میں ادھر رقصِ جام شروع ہوا اور رندانِ بلانوش 'لال پری' سے ہم آغوش ہوئے کہ اضطراب کی جگہ سرمستی اور غم کی جگہ خوشی لے لیتی ہے۔ آپ نے کوئی ایسا قطعہ کہا ہے جو اسی مطلب کا حامل ہے؟

شاد:- زخمِ دل پھول بن ہی جاتے ہیں
روح پُرنور ہو ہی جاتی ہے
لاکھ برہم ہو میکدے کی فضا
زیست مسرور ہو ہی جاتی ہے

آذر:- بہت خوب۔ لیکن کیا ساقیٔ مہوش کی مخمور دمے فشاں نظریں شراب سے زیادہ نشہ خیز ہوتی ہیں۔ کیا کوئی قطعہ سنانے کی زحمت آپ گوارا فرمائیں گے؟

شاد:- ہر کلی مستِ خواب ہو جاتی
پتی پتی گلاب ہو جاتی
تو نے ڈالیں نہ مے فشاں نظریں
ورنہ شبنم شراب ہو جاتی

آذر:- آج یہ بھی بتا دیجئے کہ بادہ خواری آپ کیوں کرتے ہیں؟

شاد:- اپنے اشکوں کو پی رہے ہیں مگر
لوگ کہتے ہیں بادہ خوار ہیں ہم

آذر:- تکلف برطرف شاد صاحب اب یہ بھی بتانے کی زحمت کیجئے کہ آپ نے کبھی شراب سے توبہ بھی کی؟ اور اگر کی تو اس پر قائم بھی رہ سکے؟

شاد:- تکلف برطرف اے دوست جب شام آتی ہے
نہ تقویٰ کام آتا ہے، نہ توبہ کام آتی ہے

آذر:- حضرت جوش ملیح آبادی کا ارشاد کہ "نریش کمار شاد کے معاشقے کی یہ بڑی جوان بختی ہے کہ ان پر غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں نے سازش کر کے ایسا بھرپور وار کیا کہ ان کی شاعری کے تمام تار وقت سے پہلے بڑی شدت کے ساتھ جھنجھنا اٹھے" ایک ایسا ارشاد ہے جس سے کوئی

انکار نہیں کرسکتا اور شاید زندگی کی انھیں تلخ کامیوں اور غم کی اسی شدت کو بھلانے کے لئے آپ نے جام و مینا کا سہارا لیا لیکن کیا اس سے آپ کے سازِ حیات کے تاروں کا ارتعاش کچھ کم ہوا اور آپ نے آزارِ دل میں کوئی تخفیف محسوس کی؟

شاد: اب مرا آزارِ دل منت کشِ درماں کہاں
چارہ گر تیری اُمیدِ خام پہ ہنستا ہوں میں

آذر: اچھا تو اِس غم بے پایاں کی بدولت آپ کے خیالات و نظریات اپنے ہی دائرۂ حیات میں اُلجھ کر رہ گئے یا آپ کا دردمند دل کائنات کے دل کی دھڑکنیں بھی محسوس کرتا ہے؟

شاد: دھڑک رہا ہے مرے دل میں کائنات کا دل
اِس اِک چراغ سے روشن ہیں بے شمار چراغ

آذر: مرحبا صد مرحبا! خاکسار پہلے ہی عرض کرچکا ہے کہ آپ نے اُردو شاعری میں نئے نئے تجربات کئے ہیں۔ آپ کے دُکھے ہوئے دل کو چھیڑنا میرے لئے کچھ مناسب تو نہیں لیکن یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے والدِ بزرگوار حضرت درد نکودری کے اچانک گُم ہوجانے سے اور انتہائی تلاش و کوشش کے باوجود اُن کا کہیں سراغ نہ ملنے سے آپ کو جو صدمۂ جانکاہ ہوا ہے اسی اپنی دردناک ذہنی کیفیت کو آپ نے فنّی چابکدستی کے ساتھ ایک سانیٹ میں ڈھال دیا ہے۔ مناسب ہو تو وہ سانیٹ بھی ضرور سُنا دیجئے کیونکہ اُردو شاعری میں ایسی چیزیں کمیاب ہیں؟

شاد: کہاں کہاں نہیں موجود میرے نقشِ قدم
کہاں کہاں نہیں ٹوٹا مرا دلِ حساس
کہاں کہاں نہیں تڑپی نگاہِ درد شناس
کہاں کہاں نہیں چھلکے یہ دیدۂ پُر نم
کہیں بھی دُھل نہ سکی میرے رُخ سے گردِ ملال
کہیں بھی مِل نہ سکا کوئی جادۂ منزل
کہیں بھی رُک نہ سکا میں مسافرِ غمِ دل
یہی ہوا مری ساری مسافرت کا مآل
گیا جہاں بھی پلٹ کر میں سوگوار آیا
کسی جگہ بھی تو تسکینِ جستجو نہ ہوئی
کہیں بھی تو نہ ملا تجھ سے گفتگو نہ ہوئی
پکارنے کو تجھے ہر طرف پکار آیا
جواب میں وہی آوازِ بازگشت آئی
کہاں ہوئی مری فریاد کی پذیرائی

آذر: بے شک جناب! کون ہے جو اِس سانیٹ کو سُن کر آبدیدہ نہ ہو جائے۔ بلاشبہ آپ کی زندگی میں ناآسودگی، محرومی، بے کیفی، غمِ جاناں، غمِ دوراں، فکرِ معاش اور اسی طرح کے بہت سے تفکرات بہ یک وقت اِس طرح سے یکجا ہوگئے ہیں کہ آپ کی زندگی ایک حادثہ بن کر رہ گئی۔ کیا آپ کوئی ایسا شعر سُنائیں گے جو مجروح جذبات و احساسات اور دُکھ بھری زندگی کی صحیح اور مکمل عکاسی کرسکے؟

شاد: زندگی کو موت کہہ دینا اُسے مشکل نہیں
غور سے دیکھے اگر کوئی ہماری زندگی

آذر: شاد صاحب! یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ آپ کبھی کبھی رات گئے جمنا ندی کی طرف سیر و تفریح کے لئے چلے جایا کرتے ہیں اور اُس کے صاف اور شفاف سینہ پر لوٹتی ہوئی چنچل ر وپہلی موجوں میں آپ کی متجسس نگاہیں نہ جانے کیا تلاش کرتی ہیں اور۔۔۔ آپ کی پھٹی پھٹی آنکھیں اُن موجوں پر اس طرح جم جاتی ہیں جیسے آپ کے دل کا قرار اور آپ کا ابدی سکون جس کے لئے آپ کی رُوح ہمیشہ ہمیشہ سے بے چین ہے، اُنھیں موجوں کی تہہ میں چھپا ہوا ہے۔ جیسے اُن موجوں کا آغوش آپ کے لئے ماں کی گود کی طرح آرام دہ اور راحت بخش ہے۔۔۔ اور اُس وقت آپ کے چہرے کا رنگ یوں بدلنے لگتا ہے اور اضطراب و پریشانی کے آثار یوں نمایاں ہونے لگتے ہیں جیسے آپ موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہوں، ایسی کشمکش جس سے آپ کا ہر نفس ہمہ وقت اندرونی طور پر دوچار رہتا ہے۔ اچھا تو آخر میں موت اور زندگی کی کشمکش کے متعلق ایک شعر سُنا دیجئے اور آپ کی زحمت ختم!

شاد: کشمکش ہوتی رہی دن رات مرگ و زیست میں
اِنتہا یہ ہے موت جیتی اور ہاری زندگی!

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔

اِس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶)



افسانہ

اَندھی آرزو

سحرؔ اُمید بنگلوری

نمبر۱/۲/سی کیپیٹا بلاک ، ایم ۔آر پالیم بنگلور ۶

محترمی ومکرمی برادرم خوشترؔ صاحب! آداب ونیاز

پُورے آٹھ ماہ کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں ۔ دسمبر میں ملاقات کا منظر آج بھی آنکھوں میں ہے۔ لیکن یہ خلش ابھی تک باقی ہے کہ رخصت کے وقت آپ سے گلے نہ مل سکا۔ شاید یہی خلش سینے کی جلن بنی ہوئی ہے اور یقین مانیئے اب بھی اس کا افسوس ہے کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ورنہ ہم نے تو وہ پروگرام مرتب کئے تھے کہ بس! خیال تو یہ تھا کہ آپ اپنی مصروفیتوں سے جیسے ہی چھٹکارا پالیتے ۔میں آپ کو بنگلور شہر کے وہ حصے دکھاتا جنھیں آپ کو دیکھنا ہی چاہیئے ۔ ورنہ بنگلور چند گھنٹوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔ ——— آپ کے لطیفے ۔ سردار سادھو سنگھ جی کے تذکرے چھیڑ تھا ٹھا ر ہے بساختہ قہقہے ابھی تک کانوں میں گونج رہے ہیں ۔ پھر یاد آگیا کہ آپ نے زلیش کمار شادؔ (مرحوم) کے متعلق کس اپنائیت سے ذکر کیا تھا۔ اور پھر اُن کی موت کا منظر آنکھوں میں گھوم گیا۔ کیا اس حادثہ کے لئے افسوس کا اظہار تسلّی دے سکتا ہے ؟ ——— گذشتہ افسانہ "سہارا" کی اشاعت میں میرا پتہ بنگلور ۶ کی بجائے بمبئی ۶ لکھ دیا گیا تھا جس کی وجہ سے خطوط بہت مشکل سے موصول ہوتے رہے....

آپ کا اپنا ——— سحرؔ اُمید بنگلوری

★

تین سال کے بعد ماہنامہ " نئی روشنی " میں جمیل کی عکسی تصویر آ ہی گئی ———

جمیل کی تصویر کو ہر شخص نفرت سے دیکھ رہا تھا، کوئی محوِ حیرت رہ گیا، کوئی گالیاں دے رہا تھا! اُن میں کثرت صنفِ نازک کی تھی ۔کیونکہ جمیل کے ہر افسانہ میں عورت کی بے وفائی مرکزی خیال ہوتا تھا بہت سی لڑکیوں اور عورتوں نے احتجاجاً ماہنامہ " نئی روشنی " کے ایڈیٹر سے بھی تحریری درخواست کی تھی کہ جمیل کے افسانوں کو اپنے رسالے میں جگہ نہ دیں لیکن ایڈیٹر نے کوئی جواب دیا نہ درخواست پر عمل کیا۔ حالانکہ وہ بھی عورت ہی تھی رفعت شکیل ، جس کی تصویر آئے دن رسالے میں شائع ہوا کرتی تھی۔

شہناز ساری رات جمیل کی تصویر کو سینے سے لگائے حسین خوابوں کی دنیا میں کھوئی رہی ۔تین سال سے وہ منتظر رہی تھی کہ کب جمیل کی تصویر دوسرے فنکاروں کے ساتھ آئے گی ۔ وہ جمیل سے ملاقات کرنے سے پہلے اُس کی تصویر دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ نفرت کے پس پردہ کچھ ایسی محبت ہوتی ہے جس کی گہرائی عام محبت سے زیادہ ہوتی ہے ۔جمیل سے وابستہ ایسی ہی محبت ہے جو بظاہر نفرت بن کر سامنے آتی ہے ۔ کالج میں کتنے ہی حسین ، خوبصورت ، امیر گھرانوں کے چراغ اُس کی راہ میں آنکھیں بچھائے رہتے تھے لیکن شہناز کسی سے بات بھی نہ کرتی تھی ۔اکثر وہ اپنی سہیلیوں سے کہتی تھی ہر مرد کی آنکھیں کہتی رہتی ہیں 'میں بے وفا ہوں !

لیکن جب اُس نے جمیل کے افسانوں میں عورت ذات سے نفرت دیکھی تو اُسی لمحہ اُسے یوں محسوس ہوا ، جیسے اُس کی زندگی کی خشک وادی میں بہار آگئی ہو ۔ زندگی کی راہ میں انگنت چراغ جل اُٹھے ہوں ۔ اُس کی روح میں ایک گیت جنم لے چکا ہو اور اُس کی تنہا زندگی میں مُسکراہٹوں کے پھُول بکھر گئے ہوں ۔ یہ محسوس کرکے اُس کے اُس کے انگ انگ میں مسرت کی لہریں دَوڑنے لگیں ۔ دل میں دھڑکن سی پیدا ہو گئی ۔ عجیب وغریب دھڑکن انا معلوم سی دھڑکن !!

اِن تین برسوں میں اُس نے تخیّل میں جمیل کا ایک خاکہ بنالیا تھا اور اُسے پوجنے لگی تھی۔ لیکن جب اُس نے جمیل کی تصویر دیکھی تو وہ اُس کے من مندر کے تخیّلی دیوتا سے بھی حسین نظر آیا۔ وہ جھوم اٹھی۔ حالانکہ جمیل اپنے لکھے ہوئے خطوط میں کبھی اتنا ظاہر نہ ہوا تھا۔ ساری رات وہ سو نہ سکی۔ لیکن رات کے آخری پہر میں نیند کی دیوی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا —— پھر صبح ہوگئی۔ چھ بجے گھڑی کے الارم نے شہناز کو جگا دیا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ مسہری پر لیٹے ہی لیٹے اُس نے کروٹ بدلی اور میز پر سے جمیل کی تصویر اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ تصویر مُسکرا رہی تھی۔ شہناز بھی مُسکرائی۔

"تم تو میرے تصوّر کے جمیل سے بھی خوبصورت ہو ——" وہ یونہی مُسکراتی رہی۔

"کیا دیکھ رہے ہو —— ؟" اُس نے تصویر سے کہا اور خود بخود شرما گئی۔ اُس نے محسوس کیا تصویر اور خوبصورت نظر آنے لگی ہے جمیل یقیناً خوبصورت تھا۔ اُبھرے اُبھرے گال، خوبصورت چہرہ، خوبصورت سی ناک، سادہ لباس، نہ گلے میں ٹائی نہ جسم پر سوٹ، فراخ پیشانی جو اعلیٰ کردار کی غمازی کر رہی تھی اور آنکھیں۔ سنجیدہ، مُسکراتی ہوئی سمندر سے زیادہ گہری اور عمیق نظر آتی تھیں۔ نہ جانے کیا اسرار پوشیدہ تھے اِن میں —— کوئی شے پنہاں تھی ضرور شہناز نے بہت غور کیا لیکن شاید اُس کی محبت نے کسی طرح کی بُرائی تلاش کرنے کی اجازت نہ دی۔ وہ نفسیات کی طالبہ تھی۔ کالج میں ہر کسی کی آنکھوں سے وہ رُوح تک پہنچنے کی کوشش کرتی اور دل کی بتا دیا کرتی تھی۔ لیکن جمیل کو نہ جانے کیوں وہ پہچان نہ سکی تھی۔ اتنا ضرور کہہ چکی تھی کہ اِن آنکھوں میں ایک خوبصورت خواہش، ایک سُہانی آرزو تڑپ رہی ہے۔ ایک اُمید، دلفریب، پُرسکون اُمید مچل رہی ہے۔

"اوہ! جمیل ——" پیار سے بھرپور انداز میں وہ بول اُٹھی اور تصویر میز پر رکھ کر مسہری سے باہر نکل آئی۔ آئینے میں اپنی سیاہ زلفوں پر شانہ پھیرتے ہوئے اُس نے دیکھا آئینہ میں جمیل کا چہرہ نظر آرہا ہے۔ ایک عکس! اُس نے بے اختیار آنکھیں بند کرلیں اور مُسکراتی ہوئی کنکھیوں سے آئینے میں دیکھنے لگی۔ لیکن اب جمیل کا کوئی پتہ نہ تھا۔

نظارے پیچھے کی طرف تیزی سے دَوڑ رہے تھے اور شہناز بھی گذرے ہوئے دِنوں کے خیال میں غرق تھی۔ وہ پیچھے دَوڑ رہی تھی اور ریل گاڑی آگے۔! جمیل کے افسانے پڑھنے کے بعد اُس نے جمیل سے قلمی دوستی پیدا کرلی تھی اور اپنی سچی اور پاک محبت کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ لیکن جواب میں جمیل ہر وقت اُلجھن پیدا کر دیتا تھا اُس کا کوئی جواب ٹھیک نہ ہوتا تھا۔ وہ لکھتا تھا —— "تم بہک رہی ہو۔ تمہاری اِس منزل پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔"

"محبت کا دوسرا نام قربانی ہے۔ تم قربانی کو اپنی محبت بنالو۔"

"تمہاری راتوں کے سہانے خواب حقیقت نہ بن سکیں گے ——"

اور "تمہاری محبت کی سحر اندھیرا لائے گی اِس لئے باز آجاؤ۔"

شہناز کو ان خطوط میں نفرت یا محبت کا نمایاں احساس تک نہ ہوتا تھا۔ ایک جملہ ایک خط ہوتا تھا۔ وہ حیران تھی۔ اور پھر حالیہ خط بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ "تم کسی بھی دن صبح ہونے سے پہلے مجھے مل سکتی ہو اور تم دیکھو گی کہ وہ صبح کتنی اندھیری ہوگی۔"

"لیکن مجھے یقین ہے جمیل! کہ صبح ہوگی اور روشن صبح ہوگی!" وہ بڑبڑانے لگی کبھی کبھی یکلخت تصوّرات کی پرچھائیاں تبدیل ہونے لگتی تھیں۔ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے جمیل اُسے ہاتھوں ہاتھ لے رہا ہو اور کہہ رہا ہو —— "میرے سپنوں کی شہزادی! تم میرے اِس امتحان میں کامیاب نکلیں۔ تم واقعی ...... وہ خوشی سے جھوم اُٹھتی۔ اُسے شہنائیوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں اور پھر .... جیسے وہ لمبا سا گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی ہو۔ کمرے کی فضا پھولوں کی مہک سے معطّر ہو رہی ہو اور جمیل کمرے میں داخل ہوا ہو۔ اُس نے آگے بڑھ کر شہناز کو آواز دی ہو .... اور پھر .... وہ کہیں سے کہیں چلی جاتی۔

"محبت قربانی ہے —— تمہاری سحر اندھیری ہے۔ باز آجاؤ ——"

دفعتہً ذہن کے اوراق پر خط کے جملے اُبھرنے لگے اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے جمیل اُسے دھتکار رہا ہو۔ نفرت کر رہا ہو اور خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہا ہو۔ وہ کانپ اُٹھی —— "نہیں —— ایسا نہیں ہوسکتا —— کبھی نہیں —— خوابوں کی کتنی ہی دنیاؤں سے تمہیں ڈھونڈ نکالا ہے میں نے۔ کتنی کاوشوں کے بعد، کتنی مشکلات اور سعیٔ پیہم کے بعد پایا ہے۔ کیا تم مجھے صرف اِس لئے ٹھکرا دوگے کہ تمہیں عورت سے نفرت ہے ؟ نہیں —— ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا ——"

وہ بڑبڑانے لگی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اُس کے تصوّر میں اِس کی محبّت کی کشتی خوشی اور رنج، اُمید اور مایوسی کی دو متضاد کیفیتوں کے طوفان میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ کبھی تمنّاؤں اور آرزؤں کے پھُول کھِلتے ہوئے نظر آتے اور کبھی غم و اندوہ کی سیاہ بدلیاں چھا جاتیں۔

ٹرین رُک گئی تھی شہناز چونکی اور اُس نے اپنی امّی کو جگایا جو سارے راستہ سوتی رہی تھیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ ٹیکسی کے ذریعے اپنی پھوپی کے

گھر پہنچ گئی۔ جمیل اِسی شہر میں رہتا تھا اور ماہنامہ "نئی روشنی" بھی یہیں سے شائع ہوتا تھا۔ لیکن شہناز نے دل ہی دل میں اپنے دیوتا کی پرستش کی تھی وہ عام لڑکیوں کی طرح سرِ بازار خود کو رُسوا کرنے سے گریز کرنا بہتر سمجھتی تھی۔

اُس رات پھر شہناز سو نہ سکی۔ نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی لیکن وہ سو نہ سکی۔ جیسے ہی اُس کی آنکھیں بند ہوتیں جمیل اُس کی گھنی اور لانبی پلکوں کی جھالر اُٹھا کر آنکھوں میں داخل ہو جاتا اور جب آنکھ کُھلی رہتی تو وہ شہناز کے ذہن کی کسی نہ کسی وادی میں اُڑتا ہوا محسوس ہوتا تھا ــــ صبح پانچ بجے سے پہلے ہی وہ اُٹھ بیٹھی۔ مُنہ ہاتھ دھو کر اپنا پسندیدہ جوڑا پہن لیا اور آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے لگی کہ کوئی کمی تو نہیں رہ گئی ہے اُس نے زلفوں کو سنوارا اور گرم لبادہ اوڑھ کر باہر نکل گئی۔

پائیں باغ میں شبنم کے موتی پتّوں پر بکھرے ہوتے تھے۔ نیم شگفتہ پھُول بے خودی میں جھوم رہے تھے۔ ستاروں کو نیند آنے لگی تھی۔ شہناز پیدل ہی چلی جا رہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ جمیل کے دروازہ پر دستک دے رہی تھی اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے نہ جانے کون ہو؟ کون دروازہ کھولے" انجانی دھڑکن ـ دل میں مسرّت کا ایک عجیب طوفان برپا تھا۔ دروازہ کھُلا اور شہناز چونک پڑی ماہنامہ "نئی روشنی" کی مدیرہ سامنے کھڑی تھیں! ادھیڑ عمر کی نبول صورت سادگی سے مزّین عورت، جس کے بشرے سے ماتا کے جذبات چھلک رہے تھے۔

"آداب ــــ آپ ــــ؟" شہناز کہتے کہتے رُک گئی اور سوچنے لگی تھی رفعت شکیل کا یہاں کیا کام ــــ!

"آؤ ــــ اندر آؤ ــــ غالباً تم شہناز ہی ہو ــــ بیٹھو ــــ"

رفعت نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی لیکن یہ سوچ کر گھبرا رہی تھی کہیں جمیل نے رفعت کو سب کچھ نہ بتا دیا ہو۔

"تم جمیل سے ملنے آئی ہو ــــ؟" رفعت نے سوال کیا اور شہناز نے شرما کر سر جھکا لیا۔ لیکن کچھ نہیں بولی۔

"میں ــــ جمیل کی ماں ہوں ــــ" اُنہوں نے کہا اور شہناز چونک کر اُنہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔

"سُنو شہناز! میں جمیل کے بارے میں تم سے سب کچھ کہہ دینا چاہتی ہوں لیکن۔ اِس سے پہلے ہم تھوڑی سی کافی پی لیں گے۔ آج صبح بہت سرد ہے۔" وہ کہہ رہی تھیں اور شہناز چُپ بیٹھی اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔

تھوڑی دیر کمرے کی فضا میں گہری خاموشی چھائی رہی اور یہ خاموشی اُس وقت ٹوٹی جب خادمہ کافی کی ٹرے لے آئی۔ پھر فضا میں کافی پینے کی چُسکیوں کی آوازیں پھیلنے لگیں۔ لیکن شہناز کے دل میں دھماکے سے ہو رہے تھے اور دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے سوچا یقیناً جمیل نے ہر بات اپنی ماں سے کہہ سُنائی ہے اور ہو سکتا ہے اُس کے ہر خط کے بارے میں بھی بتا دیا ہو۔ پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ جمیل سے وہ بدُ دیانتہ کرے اور پوچھے کہ اِس طرح اُسے شرمندہ کرنے کی ضرورت کیا تھی۔

"پانچ سال پہلے کی باتیں ہیں شہناز بیٹی ــــ" رفعت شکیل کہہ رہی تھیں۔ شہناز کافی ختم کر چکی تھی۔ خالی پیالی ٹرے میں رکھ کر وہ غور سے اُنہیں دیکھنے لگی۔

"جب میں نے دیکھا جمیل کسی طرح شادی کرنے پر راضی نہیں ہے اور میری خواہش یہ ہے کہ جلد سے جلد اُس کی شادی ہو جائے ــــ تو میں بہت پریشان ہو گئی ــــ" وہ کہے جا رہی تھیں۔ "شہناز بیٹی! میری زندگی میں صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اگر کوئی روشنی تھی، کوئی چراغ تھا تو وہ میرا جمیل ہی تھا۔ میرا سہاگ اُس وقت اُجڑا تھا جب جمیل صرف ایک سال کی عمر کا تھا اور میری دنیا اُسی وقت اندھیری ہو گئی تھی ــــ میں نے جمیل کو اپنی زندگی کا مقصد تصور کیا اور اُس کی تعلیم و تربیت میں اپنا غم بھُلانے لگی۔" دفعتاً وہ خاموش ہو کر شہناز کو گھورنے لگیں اور ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگیں۔

"شہناز بیٹی ــــ جانتی ہو میں بغیر کسی تعارف اور تکلّف کے ساری داستان کیوں سُنا رہی ہوں؟"

"جی ــــ!؟" شہناز سٹپٹا گئی وہ بھلا کیا جواب دیتی۔

"ہاں! میں بلا تکلّف و تعارف اِس لئے کہہ رہی ہوں کہ میں جانتی ہوں تمہیں جمیل سے محبت ہے۔" شہناز نے سر جھکا لیا اور آنچل کے گوشہ سے کھیلنے لگی۔

"کیا تم جانتی ہو کہ وہ عورتوں سے نفرت کرتا ہے؟" رفعت نے سوال کیا تو شہناز خود کو سنبھالنے لگی۔

"جی ہاں! اُن کے ہر افسانے میں ایسے کردار ملتے ہیں۔ جو عورت سے نفرت کرتے ہیں اور بجا کرتے ہیں۔" شہناز کہہ رہی تھی "میں نہیں سمجھ سکتی کہ آپ کے ہوتے ہوئے ماتا کے جذبات سے واقف ہو کر بھی وہ عورت سے نفرت کیوں کرتے ہیں۔"

"اپنی چاہ کے لئے ــــ یعنی یہ کہ اُس کے افسانے پڑھنے والی صنفِ نازک اُس سے نفرت کرے۔" رفعت نے کہا "لیکن اِن باتوں کے علم کے باوجود تم اُس سے محبت کیوں کرنے لگی ہو؟ مجھے بلا جھجک جواب دو شہناز ــــ!"

ایک لمحہ شہناز نے اُنہیں دیکھا اور ہمت مجتمع کر کے کہنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ جمیل صاحب کی تحریر میں عورت سے نفرت کے پیچھے حقیقتاً محبت کے اعلیٰ ترین اور مقدّس جذبات کار فرما ہیں۔"

"کیا ——— !؟ اوہ ——— ! شہناز بیٹی ——— !" یکایک رفعت شکیل کی آواز بھرّا گئی اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے شہناز گھبرا گئی اور پریشان بھی ہو گئی۔

"کیا میرا یہ خیال غلط ہے ؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں! نہیں۔" رفعت اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں ——— "وہ ایسی ہی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو اُس کی نفرت میں محبت کی حقیقت کو تلاش کر سکے اور تم ——— تم ——— کتنی بدنصیب ہوں میں ———" وہ ضبط کے باوجود رونے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دل کے پھوڑے پھوٹ گئے ہوں۔

"مجھے افسوس ہے۔ میں آپکا دکھ سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔" شہناز آب دیدہ سی ہونے لگی تھی۔

"کیا تم جمیل سے نفرت نہیں کر سکتیں شہناز ——— ؟" اُنہوں نے شہناز کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ چند لمحے شہناز خاموش بیٹھی رہی پھر بھرّائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"دل و دماغ کی گہرائیوں میں پلنے والے احساسات کو موت تو نہیں آ سکتی۔"

"سنو بیٹی ——— سچائی تو یہ ہے کہ جمیل اندھا ہے ——— کیا تم ایک اندھے سے اپنی زندگی کا دامن باندھ سکو گی ———" شہناز چونک کر اُنہیں گھورنے لگی۔ اُس کے دل کی دھڑکن میں اب طوفان سا پیدا ہو گیا تھا اور وہ ایک بھونچال میں گھِر گئی۔ جمیل کی تصویر کی آنکھیں۔ گہری آنکھیں۔ اُس کے چاروں طرف رقص کرنے لگیں۔ اُس کے تصورات کے محل کی بُنیادیں ہلنے لگیں۔

"پانچ سال پہلے ———" رفعت کہہ رہی تھیں "ایک حادثہ میں اُس کی آنکھیں چلی گئیں۔ وہ اندھا ہو گیا۔ اور اُس کے ساتھ میری آنکھوں کی روشنی بھی غائب سی ہو گئی۔ تم سُن رہی ہو بیٹی ———" رفعت کے سوال پر شہناز نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اُنہیں گھورنے لگی۔

"دو کھیر میں ——— میں نے اُس کے غیر مطبوعہ افسانے اپنے ماہنامے میں شائع کرتی رہی۔ سینکڑوں خطوط آنے لگے اور ہر خط کا جواب میں جمیل کے نام سے دینے لگی کیونکہ میں نے زندگی میں جو آخری آرزو کی تھی وہ یہ کہ ایک بار جمیل کی دُلہن کو جی بھر کر دیکھ لوں۔ اُس دُلہن کو جو جمیل کی نفرت کے باوجود اُس سے محبت کر سکتی ہو ——— پھر تم اپنے خطوں میں جمیل سے اظہار محبت کرنے لگیں تو میں نے تمہیں اشارتاً تنبیہ کی۔ لیکن تم اپنی ضد پر قائم رہیں۔ میں نے سوچا شاید تم ہی وہ لڑکی ہو جسے میں اپنی بہو بنا سکوں۔ کیونکہ جمیل کے خیال کے مطابق تم نے اُس کی نفرت کو چاک کر کے محبت کے جذبات نکالے تھے لیکن تم جانتی نہ تھیں کہ وہ اندھا بھی ہے۔ اب کہو ——— کیا تم اپنی زندگی اُس اندھے کے لئے قربان کر سکتی ہو؟ کیا اپنی صبح کو تاریک بنا سکتی ہو؟ بولو شہناز ——— ! ایک اندھا یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی محبوبہ خوبصورت ہے، تابناک ستارہ ہے جس کے رُخِ زیبا کی تنویر سے زندگی کی روشنی ہے۔ اُس کے گلابی ہونٹوں کا تبسم محسوس کر سکتا ہے نہ آنکھوں کی شراب، زاہد فریب وائیں نہ توبہ شکن چال ——— بیٹی اُس کا اندھا پن تمہاری ہستی کی بربادی ہے۔ تمہاری بربادی ہے شہناز ——— اب بھی وقت ہے تم اِس محبت سے باز آ جاؤ۔"

دیر تک کمرے کی فضا میں موت کا سناٹا چھایا رہا اور پھر شہناز کے دل سے گھبراہٹ اور رنج کے بادل چھٹنے لگے۔ وہ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ آخر اُس نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

"محبت مجھے آنکھیں دے سکتی ہے۔ لیکن دوسرا جمیل نہیں دے سکتی۔ یہ میرا فیصلہ ہے ——— !"

"اوہ ——— شہناز ——— بیٹی ———" رفعت شکیل کی چیخ سے شہناز کا دل بھی دہل گیا اور وہ بے اختیار اُن سے لپٹ گئی۔ لیکن رفعت تو ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ مجبوراً شہناز کو اُنہیں سہارا دے کر صوفے پر لِٹا دینا پڑا ——— وقت گزرتا رہا اور شہناز رفعت کی ہتھیلیاں سہلاتی رہی۔ لیکن اُس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اُبھار رہے تھے۔ اب تک خادمہ بھی دوبارہ نہ آئی تھی اور شہناز اندر سے کسی کو آواز دے کر بھی بُلوا نہ سکی۔ تھوڑی دیر بعد رفعت خود پر قابو پاتے ہوئے اپنی سانس درست کرنے لگیں تو اُسے اطمینان ہوا۔

"شہناز بیٹی ——— وہ دبی دبی آواز میں سسکیوں کے درمیان کہنے لگیں۔ "مجھے معاف کر دو بیٹی۔ مجھے معاف کر دو۔ میری زندگی کی آخری خواہش تھی کہ میں جمیل کے خیالات کے مطابق اُس کی دُلہن دیکھوں اور یہ خواہش جو میری اندھی آرزو ہے پوری ہو گئی۔ لیکن ——— لیکن تمہاری زندگی کی اوّلین آرزو ——— وہ آرزو جو ہر جوان لڑکی کی زندگی ہے وہ بھی موت کے بھیانک ہاتھوں مر چکی ہے۔ شہناز ——— پانچ سال پہلے میرا جمیل ایک حادثے میں آنکھیں کھونے کے ایک ہفتہ بعد مجھے تنہا چھوڑ کر چلا گیا شہناز ———"

"نہیں ——— !" شہناز کی چیخ سے کمرے کی ہر شے کانپ اُٹھی تھی لیکن

رفعت شکیل اُسی لہجے میں کہہ رہی تھیں۔
ہاں بیٹی ــــ وہ مر چکا ہے لیکن میری آرزو ــــ بھوکی آرزو
ر نہیں سکتی ــــ اِسی اندھی آرزو کی خاطر میں نے اُس کی زندگی کا جھوٹا
ناٹک کھیلا تھا ــــ اور میں کامیاب ہو کر اور مایوس ہو گئی ہوں ــــ
گناہ گار ہو گئی ہوں ــــ مجھے معاف کر دو بیٹی ــــ مجھے معاف کر دو
بیٹی ــــ مجھے معاف کر دو ــــ وہ بلک بلک کر رونے لگیں اور
شہناز سوچنے لگی وہ رفعت شکیل کو چھوڑ کر کمرے سے باہر چلی جائے یا
اُن کے پاس رہ جائے۔ لیکن وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کا سر چکرانے
لگا اور وہ وہیں خود کو سنبھالتے ہوئے بیٹھ گئی ــــ!!

غزلیں

ـشد صدیقی۔ ایم۔ اے

ـلِ تعلقات کا پیغام تو نہ دو!
ـہ کو ہی جرمِ عشق کا الزام تو نہ دو

معصوم آرزو کو پکارو نہ کہکے عشق
اِس جانفزا خلش کو کوئی نام تو نہ دو

ـاریکیوں سے لڑنے کا عادی ہوں میں مگر
ـس کی کبھی سحر نہ ہو وہ شام تو نہ دو

کہنا نہیں ہوں میں کہ اُٹھا لو ستم سے ہاتھ
ـبن جائیں جو عذاب وہ آلام تو نہ دو

ارشد نے زندگی میں بہت غم اُٹھائے ہیں
اب تم بھی رنجِ تلخیٔ ایام تو نہ دو

نعیم جمالی ایم۔ اے

ہر مسرت کو اسیرِ دردِ غم پاتا ہوں میں
اب تبسم لب پہ آتا ہے تو گھبراتا ہوں میں

توڑ کر اکثر غم و آلامِ دنیا کی حدیں
حادثوں سے بے نیازانہ گزر جاتا ہوں میں

کھینچتا ہے غم کسی کا میری رگ رگ سے لہو
اِس طرح بھی جرمِ اُلفت کی سزا پاتا ہوں میں

ہر شبِ تاریک دیتی ہے پیامِ صبحِ نو
تیرگی میں اِک کرن اُمید کی پاتا ہوں میں

یوں تو خوش ہر حال میں ہے زندگی لیکن نعیم
جب وہ نظریں پھیر لیتے ہیں تڑپ جاتا ہوں میں

سید نظر برنی ایم۔ اے

یاد اِک حشر جگاتی ہے ترے نام کے بعد
نیند آنکھوں سے چلی جاتی ہے ہر شام کے بعد

یہ بھی سوچا ہے کبھی ظلم کے خوگر تو نے
ایک آغاز بھی ہوتا ہے ہر انجام کے بعد

سجدہ ریزی کے لئے، ٹھوکریں کھانے کیلئے
کون اِس کوچہ میں آیا ترے بدنام کے بعد

چشمِ میگوں سے مئے ناب لٹانے والے
ہوش پینے کا کسے رہتا ہے اِک جام کے بعد

ہم کو معلوم نہیں، سنتے ہیں یہ بات نظر
زندگی عیش بھی دکھلاتی ہے آلام کے بعد


LIFEBUOY
for health

نقشِ سنگ

یٰسین احمد

۳۳۴-۸-۱۷ چھاؤنی نادعلی بیگ حیدرآباد-اے پی

بھائی خوشتر صاحب تسلیم

آج پہلی بار "بیسویں صدی" کے لئے ایک کہانی "نقشِ سنگ" بھیج رہا ہوں۔ دیکھا گیا ہے کہ عورت عموماً اپنی زندگی کے پہلے پیار کو لاکھ کوشش کے باوجود بھلا نہیں پاتی۔ شاہدہ بھی نواز کو بھلا نہ سکی۔ حالانکہ اس نے ظفر کو جو پیار دیا، وفاداری اُس میں بھرپور سچائی تھی۔ صداقت تھی۔ اور پاکیزگی تھی۔ لیکن ——— ؟ اب لاشعور میں بیٹھے ہوئے نواز کی یادکو وہ کیسے مٹاتی ——— !

آپ کا ... ... یٰسین احمد

ظفر نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ شاہدہ کے گردوپیش کے سارے ماحول کو بدل کر رکھ دے گا۔ اُس کے تصرّف میں آنے والی اُن تمام چیزوں کو بدل کر رکھ دے گا، جن کی ذات سے نواز کی یادیں وابستہ تھیں اور جن کے استعمال کرنے یا دیکھنے سے اُسے نواز کی یاد آتی تھی۔

سب سے پہلے اُس نے شاہدہ کے کمرے کی ساری چیزیں بدل دیں اور پھر اُس کے سارے زیورات بدل دیئے۔ اُس کے تمام ملبوسات جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی غریبوں میں بانٹ دیئے۔ اُس کا وہ عروسی جوڑا ایک دُور کے غریب رشتہ دار کی لڑکی کی شادی میں دے دیا۔ جس کو شاہدہ بہت پسند کرتی تھی۔ یہ وہی عروسی جوڑا تھا، جسے شاہدہ نے نواز کی دُلہن بنتے وقت پہنا تھا۔ اُس کے بعد ظفر نے باغیچہ میں لگے ہوئے وہ تمام خوبصورت پودے اکھاڑ پھینکے، جنھیں نواز نے اپنی زندگی میں لگایا تھا۔ جہاں کبھی کبھی وہ تنہائی کی افسردہ گھڑیاں کاٹا کرتی تھی۔

شاہدہ یہ سب کچھ دیکھتی اور یوں چپ ہو جاتی، جیسے جو کچھ ہو رہا ہو اُس کی مرضی سے ہو رہا ہو، یا پھر اِن تمام باتوں سے اُس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اُس نے کبھی ظفر کی اِن حرکتوں کے خلاف احتجاج نہ کیا۔ ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا وہ خوب سمجھتی تھی کہ ظفر کی اِن حرکتوں کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے!؟

آج اُسے صبیب کی نا سازی کی وجہ سے ڈرائنگ روم میں جانا پڑا تھا اور جب وہ وہاں سے لوٹی تو اُس نے دیکھا۔ ڈرائنگ روم میں اوپر منزل کو جانے والی سیڑھیوں کے قریب شیر کی جو خوبصورت کھال ٹنگی رہتی تھی۔ اُسے ظفر نے ہٹا دیا تھا اور اب اُس کی جگہ جدید طرز کی پینٹنگ لگانے کے لئے نوکروں کو ہدایت دے رہا تھا۔

شاہدہ کو وہ کھال بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ اُسے دیکھ کر بہت سی بھولی بسری یادیں ذہن کے پردوں پر اُجاگر ہو جاتی تھیں۔ نواز نے اپنی زندگی میں اِس شیر کا شکار کیا تھا۔ اُس وقت شکار پر وہ بھی اُس کے ساتھ تھی۔

اور اب ظفر نے وہاں سے وہ کھال ہٹا دی تھی تو اسے بے حد دکھ ہوا۔ اور پھر یک بیک ظفر کے خلاف اُس کے دل میں نفرت کا شدید ترین احساس جاگ اُٹھا۔

پینٹنگ کو وہاں لگوا کر ظفر اُس کے قریب چلا آیا اور پھر تصویر کے بارے میں اُسے بتانے لگا۔ اُسے تصویر اتنی پسند آئی کہ پورے پانچ سو روپے دے کر خرید لایا تھا۔ تصویر کا پس منظر، رنگوں کا امتزاج اور علامتیں، اِن سب کے بارے میں وہ اُسے بتاتا رہا۔ شاہدہ خاموش کھڑی سنتی رہی، کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا۔

تب ظفر نے پوچھا "کیا تمہیں تصویر پسند نہیں آئی ——— ؟"

اور پھر اُس کے اندر ہی اندر کھولتا ہوا لاوا جیسے اُبل پڑا۔ "یقیناً پسند آتی اگر اتنی بڑی کوٹھی میں اِسے لگانے کے لئے آپ کسی اور جگہ کا انتخاب کرتے ——!"

"کیا مطلب ——؟"

نوکروں کی موجودگی کی پروا کئے بغیر شاہدہ نے چلّا کر کہا۔ "میں پوچھتی ہوں، نواز کوئی غیر نہ تھے آپ کے چچازاد بھائی تھے۔ آپ کے اپنے چچا کا خون —— اور پھر ایک مرے ہوئے انسان سے دشمنی کیسی ——؟ آپ اُن کی تمام یادوں کو مٹا دینے پر کیوں تُلے ہوئے ہیں ——؟"

"شاہدہ ——!"

ظفر یوں چیخ پڑا، جیسے کسی نے اُس کے جسم کے کسی زخم خوردہ حصے پر پوری بے رحمی سے نشتر لگا دیا ہو اور پھر وہ اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں

- جو انسان قیامت کے دن ایک نیکی لے کر آئے گا، اُسے اُسی طرح کی دس نیکیوں کے برابر ثواب ملے گا اور جو ایک بُرائی لائے گا اُسے اتنی ہی (ایک بُرائی کی) سزا ملے گی۔ (قرآن پاک)
- بد خلقی انسان کے اخلاق کو ایسا تباہ کرتی ہے جیسے سرکہ شہد کو مار دیتا ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم)
- کسی چیز سے بالکل ناواقف ہونے سے اُس کا ادھورا علم بھی غنیمت ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- شراب خوار اپنے ہاتھوں اپنی آبرو ضائع کرتا ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

بھینچ کر کاٹنے لگا۔ اُس کا چہرہ انگاروں کی طرح دہکنے لگا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے شاہدہ وہاں رُکی نہ تھی۔ لمبے لمبے قدم اُٹھاتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں آئی اور پھر بستر پر گِر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

منہ کے بل بستر پر پڑی وہ روتی رہی۔ اور پھر روتے روتے یوں ہی اُس نے سر اُٹھایا تو وہاں ظفر کو پایا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑا شعلہ بار نگاہوں سے اُسے گھور رہا تھا۔ ظفر کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ بیٹھی۔ لیکن اُس کی سسکیاں نہ تھمیں اور نہ پلکوں سے ڈھلکتے ہوئے آنسو رُکے۔

"شاہدہ ——" ظفر نے تلخ لہجہ میں اُسے مخاطب کیا۔ "تم نے میرے ساتھ کسی دباؤ کے تحت شادی نہیں کی تھی۔ تمہاری خوشی، تمہاری مرضی اور رضا معلوم کرنے کے بعد ہی میں نے تمہیں اپنایا تھا اور پھر ——"

شاہدہ نے سسکیوں کے درمیان اُس کی بات کاٹی۔ "اور پھر میں نے کیا کیا ہے؟ کیا نہیں دیا آپ کو ——؟"

"یہ پوچھو کہ کیا دیا ہے ——!" ظفر کا لہجہ انتہائی زہریلا تھا۔ "دنیا میں کچھ عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو شوہر کے ہوتے ہوئے بھی کسی غیر مرد سے واسطہ رکھتی ہیں اور تم —— تم میرے ہوتے ہوئے بھی ایک مرے ہوئے انسان سے محبت کرتی ہو!"

شاہدہ پر یہ الفاظ جیسے بجلی بن کر گِرے۔ وہ یکلخت یوں چُپ ہو گئی، جیسے اُس کی روح سلب کر لی گئی ہو۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہزاروں کی بھیڑ میں کسی نے اُس کے کردار پر ایک گھناؤنا الزام دھر دیا ہو —— یہ کیا بات کہہ دی تھی ظفر نے ——؟ کاش ایسا نہ کہا ہوتا۔ اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ہوتے۔ اُس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا، لیکن ایسے الفاظ اپنی زبان سے نہ نکالے ہوتے۔

ظفر یہ کہہ کر مُڑا اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا وہ جیسے ہی باہر نکلا۔ شاہدہ کے منہ سے ایک گھُٹی گھُٹی سی چیخ نکل گئی اور پھر وہ بے ہوش ہو کر بستر پہ گِر پڑی تھی۔

ظفر انتہا پسند انسان تھا اور یہ انتہا پسندی شاہدہ کے معاملہ میں کھُل کر سامنے آئی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ اُس کے اور شاہدہ کے درمیان کسی تیسرے کی پرچھائیں بھی پڑ جائے۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اُن ہواؤں کا رخ موڑ دیتا جو بہت بیباکی سے شاہدہ کو چوم لیا کرتی تھیں۔

وہ شاہدہ سے بچپن سے محبت کرتا آ رہا تھا۔ اور اُس وقت بھی اُس کی محبت قائم رہی تھی جب حالات نے اُس سے شاہدہ کو چھین لیا اور نواز کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔

نواز اُس کا چچازاد بھائی تھا اور شاہدہ اُس کی پھوپی زاد بہن انہوں نے اِسی کوٹھی میں پرورش پائی تھی۔ ساتھ ہی پروان چڑھ کر جوان ہوئے تھے معصوم بچپن ہی کے حسین لمحوں میں اُس نے محبت کے دئے روشن کئے تھے۔ لیکن وہ محبت میں اشتہار بازی کا قائل نہ تھا۔ خود شاہدہ کو بھی اِس بات کا پتہ نہ چلنے دیا تھا کہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ اپنے تئیں سوچا تھا، وقت آئے گا تو وہ خود آگے بڑھ کر شاہدہ کو اپنا لے گا۔ اپنے حالات کے پیشِ نظر اُسے اعتماد تھا کہ کوئی رُکاوٹ ایسی نہیں ہے جو اُس کے اور شاہدہ کے درمیان حائل ہو۔ حالات، ماں باپ، خاندان کے بزرگ اور شاہدہ، یہ سب اُس کی خواہشات کا احترام کریں گے، اِس کا اسے یقین تھا!

لیکن جب وقت آیا تو اُسے پتہ چلا کہ شاہدہ اور نواز کی شادی طے کی جا رہی ہے۔

بجلی ہی گر پڑی تھی یہ سُن کر اُس پر ـــــــ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا! وہ یہ برداشت نہ کرسکتا تھا کہ وہ دیکھتا رہے اور اُس کے دل کی دنیا ویران کردی جائے۔ وہ اِس اُمڈتے ہوئے طوفان کو روکنا چاہتا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ وہ اس اُمڈتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لئے کچھ کرتا، اِس سے پہلے کہ وہ اپنی خواہش کا اظہار اپنے بزرگوں کے سامنے کرتا، اُس نے ضروری سمجھا تھا کہ شاہدہ کا مدعا بھی معلوم کرلیا جائے۔ شاہدہ کی مرضی اور خوشی بہرحال ضروری اور اہم تھی۔

اور جب وہ شاہدہ کا مدعا جاننے کے لئے اُس کے کمرے میں پہنچا تو.... ہنسی آگئی تھی اُسے اپنے آپ پر ـــــــ یہ خوش فہمی اُسے کیوں ہوگئی تھی کہ شاہدہ بھی اُس سے محبت کرتی ہے۔ اور جبھی اُس نے جانا تھا کہ شاہدہ نواز سے محبت کرتی ہے۔

وہ چپ چاپ شاہدہ کے کمرے سے نکل آیا۔

وہ شاہدہ کو اُس کی پوری خوشی اور مرضی کے ساتھ اپنانا چاہتا تھا اور اب یہ جاننے کے بعد کہ شاہدہ نواز سے محبت کرتی ہے، وہ کیوں کسی تیسرے درجہ کی فلم کے ویلن کی طرح اُس کی خوشیوں کی راہ میں حائل ہوجاتا!

اُس نے نہایت ضبط و تحمّل کے ساتھ اپنی محبت کے جنازے کو دل کے قبرستان میں دفنا دیا اور سوچا تھا کہ زندگی میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو قریب ہوکر بھی انسان کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔ بہت سے دُکھ ایسے ہوتے ہیں، جو ناگہاں انسان پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اُنھیں برداشت کرنا ہی پڑتا ہے اور پھر یہ غم تو اُس کے اپنے خود ساختہ ہیں، برداشت کر ہی لے گا کسی نہ کسی طرح!

اور پھر نواز اور شاہدہ کی شادی ہوگئی تھی۔

شادی کے بعد شاہدہ بے حد مسرور رہا کرتی تھی۔ اُس نے جب بھی شاہدہ کو دیکھا، ہنستے ہوئے، گنگناتے ہوئے، گاتے ہوئے ـــــــ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے اب کوئی حسرت دل میں باقی نہ رہی ہو۔ جیسے دنیا کی ساری مسرتیں اور مسکراہٹیں اُس کے قدموں میں بچھ گئی ہوں۔ ظفر کو سکون ہی ملتا، اور وہ سوچتا، اچھا ہی ہوا کہ اُس نے اپنی خواہش کا اظہار شاہدہ کے سامنے نہیں کیا ـــــــ ورنہ آج وہ یقیناً اتنی خوش نہ رہتی! اگر وہ جلدبازی سے کام لیتا اور اپنی محبت کا اظہار کردیتا تو... ـ ہو سکتا تھا۔ وہ ایثار سے کام لے کر اُسے اپنا لیتی اور پھر ـــــــ کتنا بڑا جُرم سرزد ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اُس سے ـــــــ ظفر سوچتا۔ کیونکہ اُس کی نظر میں مُجرم وہ نہ تھا جو کسی کو قتل کر ڈالتا ہے۔ مجرم وہ تھا جو کسی کی مسرتوں اور خوشیوں کی شہ رگ پر چھُری پھیر دیتا ہے۔ جو کسی کی محبتوں کو قتل کر دیتا ہے اور اگر ایسا ہی جُرم اُس کے ہاتھوں ہو جاتا تو کس طرح اپنے آپ کو معاف کرتا ـــ!؟

وقت کا آتشیں دریا بہتا رہا

نواز شکار کا بے حد شوقین تھا۔ ہفتہ میں ایک دو بار شکار کے لئے نکل ہی جاتا تھا اور ایک دن شکار کے لئے ایسا نکلا کہ خود موت کا شکار ہوگیا! اُدھر جنگل میں اُس کی جیپ اُلٹی تھی اور ٹوٹا ہوا اسٹیرنگ نواز کے سینے میں اُتر گیا تھا اور اِدھر چار مہینے کی دُلہن کی چوڑیاں توڑ دی گئی تھیں۔

ظفر کے سینے میں کوئی ٹوٹی ہوئی شے اتر گئی تھی جب اس نے شاہدہ کی زندگی پر بیوگی کا داغ لگتے دیکھا تھا۔ اس روح فرسا حادثے پر ظفر کو بے حد انتہا رنج و ملال ہوا اور اس نے سوچا تھا، اگر یہی مشیّتِ ایزدی تھی کہ اُس دن کوئی نہ کوئی انسان اس جہاں سے کم ہوجائے تو وہ نواز کی جگہ کام آجاتا کم از کم اس طرح شاہدہ کا سہاگ تو اجڑنے سے بچ جاتا!

- جس سے میٹھی بات سُننا چاہتے ہو تم بھی اُس سے میٹھا بولو۔ (چانکیہ)
- میں سمجھتا تھا میں ہی دُکھی ہوں معلوم ہوا سارا جگ دُکھی ہے۔ جب اونچے سے دیکھا تو نظر آیا گھر گھر آگ لگی ہے۔ (پنجابی ادب)
- اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تمھاری عزت کریں تو اپنی بڑائی کرنا چھوڑ دو۔ (چانکیہ)
- کوئی کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اندھوں کی طرح اُس کے پیچھے نہ چلو۔ (سوامی ویویکانند)
- ضرورت مندوں کو دینے سے دولت کم نہیں ہوتی کہیں ندی سے پانی لینے سے ندی کا پانی گھٹتا ہے۔ (تُلسی داس)

بیوہ ہونے کے بعد شاہدہ بجھ گئی تھی مسکراہٹ، قہقہے، مسرتیں اور خوشیاں سبھی کچھ ایک دردناک سنجیدگی میں ڈوب گئی تھیں۔ ظفر اسے دیکھ کر سوچتا رہتا، کاش! اس کے لئے وہ کچھ کرسکتا ـــــــ؟ جبھی اُس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ شاہدہ کو اپنا لیا جائے ـــــــ اور معاً اسی وقت اسے اپنی بھولی بسری تمنائیں یاد آگئیں، جو اب دم توڑ چکی تھیں۔

وہ شاہدہ کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اسے پوری آزادی کے ساتھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا حق اور موقع دینا چاہتا تھا لیکن اس نے براہِ راست شاہدہ سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے بزرگوں کے سامنے اپنی تجویز رکھ دی۔ لیکن سختی سے تاکید کی کہ اس سلسلے میں شاہدہ کو مجبور نہ کیا جائے۔ اسے پوری آزادی دی جائے تاکہ وہ جو بھی فیصلہ کرے، اُس میں اس

کی مرضی اور خوشی کو پورا پورا دخل رہے۔ اور کئی ہفتوں تک سوچ بچار کے بعد شاہدہ نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ وہ ظفر کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ تھی!

نواز کے انتقال کے پورے ایک سال بعد ظفر نے اسے اپنا لیا۔

شادی ہو جانے کے بعد ظفر کی ہر وقت، ہر پل یہی کوشش رہی تھی کہ شاہدہ کو خوش رکھ سکے۔ وہ اپنے ماضی سے ناطہ توڑ کر حال کی رنگینیوں میں ڈوب جائے۔ اس کے ساتھ گاتے، مسکرائے، قہقہے لگاتے اور زندگی لامتناہی خوشیوں کا ایک طویل سلسلہ بن جائے۔ لیکن شاہدہ پر چھائی ہوئی وہ دردناک سنجیدگی ختم نہ ہو سکی، آنکھوں میں پھیلی ہوئی ویرانی دور نہ ہو سکی۔ اور نہ ہونٹوں پر مسکراہٹوں کا کوئی نور جھلملا سکا۔

ظفر کو نواز سے کوئی بیر نہ تھا۔ لیکن اسے یہ بھی پسند نہ تھا کہ شاہدہ کا جسم ایک بے جان لاش کی طرح اس کے ہاتھوں میں آ جائے اور اس کے دل و دماغ پر نواز چھایا رہے۔ وہ کوشش کرتا رہتا تھا کہ کسی طرح اس کے دماغ سے نواز کی یادوں کے سارے نقوش کھرچ پھینکے۔ وہ تمام چیزیں مٹا ڈالے جو شاہدہ کو نواز کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔

جب اس نے دیکھا کہ شاہدہ ذرا سی تنہائی ملتے ہی چپکے سے باغیچے کی طرف نکل جاتی ہے اور ان پودوں اور درختوں کے نیچے بیٹھ کر سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے، جنہیں نواز نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، تب اس نے وہ سارے درخت کٹوا دیئے اور پھر جب اس نے دیکھا کہ شاہدہ ان ملبوسات اور زیورات کو حسرت سے پہروں تکتی رہتی ہے جنہیں وہ نواز کی زندگی میں پہنا کرتی تھی۔ تب اس نے سارے زیورات کو پگھلا کر دوسرے طرز کے زیورات کی شکل دے دی اور ملبوسات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ غریب اور نادار لوگوں میں بانٹ دیا۔

پچھلے دو تین ہفتوں سے وہ نوٹ کر رہا تھا کہ شاہدہ جب بھی ڈرائنگ روم میں یا زینوں پر سے گذرتی ہے، دیوار سے ٹنگی ہوئی اس شیر کی کھال کو دیکھ کر اداس سی ہو جاتی ہے۔ تب اس نے سوچا کیوں نہ اس کھال کو بھی نکال پھینکا جائے۔ اس لئے آج وہ ایک پینٹنگ خرید لایا اور اس کھال کی جگہ لگوا دی۔

اور پھر جب شاہدہ کو ہوش آیا، تو اس نے دیکھا کمرے میں ہلکا ہلکا سا اندھیرا پھیل چکا ہے اور باہر شام چھا رہی ہے۔ وہ بستر سے اٹھ بیٹھی۔ گذرے ہوئے واقعات کے اثرات ہنوز ذہن پر مرتسم تھے لیکن نفرت اور غصے کا وہ تاثر زائل ہو چکا تھا جو اس وقت ظفر کے لئے دل میں جاگا تھا۔

اور اب آہستہ آہستہ ذہن سوچنے کے قابل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ظفر کی باتوں پر، اس کے رویئے اور سلوک پر غور کرنے لگی اور پھر آہستہ آہستہ یہ احساس اجاگر ہونے لگا کہ ظفر وہی کر رہا یا کہہ رہا تھا جو اس کی جگہ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو کرتا۔ وہ حق بجانب ہے۔ غلطی اسی کی ہے کہ خواہ مخواہ ایک مرے ہوئے انسان سے ایک ذہنی تعلق قائم کر بیٹھی ہے۔ اسے چاہئے کہ نواز کو بھول جائے۔

دیر تک وہ اسی مسئلے پر سوچتی رہی اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ظفر سے معافی مانگ لے گی اور نواز کو سدا کے لئے بھلا دے گی!

وہ بستر سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر حسب معمول وہی چہل پہل نظر آئی۔ اس بھری پری کوٹھی میں کوئی بھی اس سے باخبر نہ تھا کہ کچھ دیر پہلے اس کے کمرے میں کیا کچھ ہوا اور اس کے دل پر کیا کچھ گذری تھی۔

اس بڑے سے ہال میں جسے سٹنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، خاندان کے بڑے بزرگ بیٹھے ادھر ادھر کی گپ شپ لڑا رہے تھے۔ وہ ان سے نظر بچاتی ہوئی برآمدے میں چلی آئی۔ یہاں بچوں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ سب تعلیمی تاش کھیل رہے تھے اور کسی لفظ کے معنی پر آپس میں الجھ پڑے تھے۔

"انٹی.. .. .. انٹی ——" اس کی ایک بھانجی نے اسے دیکھتے ہی چلا کر کہا۔ "نواز کے کیا معنی ہیں؟ یہ رشید کا بچہ غلط سلط معنی بتاتا ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم ——" وہ اکتاہٹ اور بیزاری کے عالم میں بولی۔

اور پھر اس نے نصرت کو اشارے سے اپنے قریب بلایا اور پوچھا۔ "تمہارے بھیا کہاں ہیں —— ؟ تم نے دیکھا —— ؟"

"بھیا —— ؟" نصرت ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے بھابی، بھیا باغیچے کی طرف گئے ہیں۔"

شاہدہ باغیچے کی طرف بڑھ گئی —— باغیچے میں ایک جگہ ظفر اسے دکھائی دیا۔ وہ زمین پر چت لیٹا ہوا تھا اور ایک ہاتھ سر کے نیچے دے رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی دونوں آنکھیں ڈھانپ رکھی تھیں۔ ایک جلتا ہوا سگریٹ ہونٹوں کے درمیان دبا ہوا تھا۔

قریب پہنچ کر شاہدہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آمد سے ظفر بے خبر تھا۔ آہستہ سے شاہدہ اس کے قریب زمین پر بیٹھ گئی اور پھر اس نے ظفر کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔ ظفر نے

اپنا ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹایا، آنکھیں کھولیں، اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔

"میں نادم ہوں، مجھے معاف کر دیجئے" شاہدہ نے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ظفر کچھ نہ بولا، چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا اور پھر اپنی آنکھیں موندیں اور ایک ہاتھ سے انہیں چھپا لیا۔ اس کی اس حرکت پر شاہدہ کا دل کسی زخمی پرندے کی طرح تڑپ اٹھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کیا آپ مجھے معاف نہ کریں گے"؟ اس نے پوچھا۔ وہ بمشکل اپنی سسکیوں پر قابو پا رہی تھی۔ لیکن کہاں تک ———— ضبط کا بند ٹوٹ ہی گیا اور وہ بے اختیار سسک پڑی اور پھر اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے اپنا سر ظفر کی چھاتی سے ٹکا دیا۔ "آپ سچ کہتے ہیں۔ میں نے آپ کو کچھ نہیں دیا، خوشی، وفا اور محبت، کچھ بھی تو نہیں ———— غلطی میری ہی ہے۔"

ظفر نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ لیکن اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اس کی پشت پر رکھ دیا اور اس کی پشت کو اپنے ہاتھ سے سہلاتا رہا اور پھر کچھ دیر کے بعد بولا۔ "نہیں شاہدہ، غلطی تمہاری نہیں میری ہے۔ ابھی تمہارے ذہن سے نواز کی یادیں محو نہیں ہوئی تھیں۔ مجھے شادی میں عجلت نہ کرنی تھی۔"

"نہیں، نہیں خدارا ایسا نہ کہئے"! وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ "میں وعدہ کرتی ہوں کہ آج کے بعد میں سب کچھ بھلا دوں گی، سب کچھ۔ یہ میرا وعدہ ہے"!

ظفر نے جواب میں اپنی آنکھیں کھول کر ذرا سا سر اٹھا کر اسے دیکھا اور چپ رہا۔

کچھ دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

اور پھر شاہدہ نے کہا۔ "میں چاہتی ہوں، کچھ دنوں کے لئے ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں۔"

ظفر فوراً اٹھ بیٹھا۔ اس کے شعور کے کسی گوشے میں بھی یہی بات چھپی بیٹھی تھی۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ کچھ دنوں کے لئے جگہ کی تبدیلی ہو، تاکہ شاہدہ اپنے ماضی کو بھول جائے۔ نواز کو یکسر فراموش کر دے۔

اس نے شاہدہ کی پریشان زلفوں کو سلجھاتے ہوئے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں شاہدہ! ہم دو ایک دنوں میں یہاں سے نکل جائیں گے۔ لیکن جائیں کہاں ————"؟

"کہیں بھی ————" شاہدہ نے اپنا سر اس کی گود سے اٹھائے بغیر کہا۔ "ویسے میں کشمیر جانا چاہتی ہوں۔ میں نے آج تک کشمیر نہیں دیکھا۔"

ظفر کو ہنسی آگئی۔ "ان سردیوں میں کشمیر میں کیا خاک لطف آئے گا۔ ہم بمبئی جائیں گے۔ وہاں میرا ایک دوست بہت دنوں سے اصرار کر رہا ہے کہ میں بمبئی آؤں ————"!

"جیسے آپ کی مرضی" شاہدہ نے کہا۔ "لیکن کیا آپ کو رخصت مل جائے گی"؟

"یقیناً مل جائے گی" ظفر نے جواب دیا۔ "اگر رخصت نہ مل سکی تو میں تمہاری خاطر استعفیٰ دے دوں گا۔"

لیکن ظفر کو استعفیٰ دینے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد وہ طویل رخصت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دوسرے ہی دن وہ شاہدہ کو لے کر بمبئی چلا گیا۔

اگر یہ بات ظفر کو پہلے ہی معلوم ہو گئی ہوتی کہ محض جگہ اور مقام کی تبدیلی شاہدہ کو بدل دے گی تو وہ اسے بہت پہلے اسے لے کر بمبئی چلا آتا۔

بمبئی آتے ہی شاہدہ یکسر بدل گئی تھی۔ تنہائی پسندی، افسردگی اور کھویا کھویا پن حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا تھا۔ وہی الھڑ پن، شرارت اور شوخی پھر مزاج میں عود کر آئی تھی، جو اس کی فطرت تھی۔ اسے دیکھ کر اب یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ کبھی اس کی زندگی کے کسی حصے میں ایک خلا سا آیا تھا، کوئی دردناک حادثہ ہوا تھا۔ بمبئی کی فضا نے اس کے دماغ سے نواز کی ان یادوں کو نوچ پھینکا تھا، جنہیں ظفر سینکڑوں جتن کرنے کے بعد بھی ہٹا نہ سکا تھا۔

ظفر کی مسرتوں کی کوئی انتہا نہ تھی اسے اس کا احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ روز و شب کس طرح گذر رہے ہیں۔ وہ سارا دن تفریحوں میں لگے رہتے۔ فلموں کی شوٹنگ دیکھتے۔ بڑھیا ہوٹلوں میں لنچ اور ڈنر کرتے اور کلبوں میں ناچتے رہتے۔ پورے چار مہینے اس طرح گذر گئے جیسے چار دن! یوں بھی مسرتوں کی گھڑیاں بہت تیزی سے گذر جاتی ہیں۔

سرما آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور گرما کی آمد آمد تھی۔ ایک دن شاہدہ نے اس سے کہا۔ "کیوں نہ کشمیر چلیں ————" ظفر بھلا کیسے اس کی خواہش کو رد کرتا۔ اگر شاہدہ ساتھ دے، اس کی محبت اور وفا ساتھ رہے تو وہ ساری عمر نگری نگری گھومنے کو تیار ہو جاتا۔

اس نے گھر والوں کو اطلاع دی اور شاہدہ کو لے کر کشمیر روانہ ہو گیا۔ ان دنوں کشمیر پر تو جیسے شباب آیا ہوا تھا۔ چاروں طرف بہار ہی بہار

رقصاں تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں کی برف پگھلنے لگی تھی۔ مرغزاروں میں بتا دانی ہی شادابی تھی۔ ہواؤں میں نغمے گھلے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اس رنگ، نور اور نکہت کے سیلاب میں ڈوب گئے۔ شاہدہ خوش تھی کہ اس کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور ظفر خوش تھا کہ شاہدہ کشمیر آتے ہی اس کلی کی طرح کھل اٹھی تھی جو بہار کا پہلا لمس پاتے ہی چٹک جاتی ہے۔ مسرت و انبساط میں ڈوبے ہوئے یہ دن لمحوں کی مانند گذر رہے تھے اور ایک دن نہیں، دو دن نہیں، پورے تین ماہ پلک جھپکتے میں گذر گئے۔!

ایک خوشگوار رات کو وہ دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ باہر ہوائیں نغمہ ریز تھیں اور آسمان کی کوکھ میں چاند ایک بچے کی طرح ہمک رہا تھا مسکرا رہا تھا۔ دفعتاً شاہدہ جیسے گنگنا اٹھی تھی "ایک خوشخبری سناؤں ——— ؟"

ظفر نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ بھر لیا "تمہارا انداز بتا رہا ہے کہ بات یقیناً مسرت بخش ہوگی، جلدی سے بتاؤ۔"

شاہدہ کے چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ دوڑ گئی "آپ... آپ... نہیں... میں... میں..."

اس کے سوا وہ کچھ کہہ نہ سکی اور جھٹ سے شرما کر اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ظفر ہنس پڑا "یہ کیا بات ہوئی؟ آپ آپ، میں میں ———!"

"میں ——— ماں بننے والی ہوں" شاہدہ نے جھٹ سے کہا اور فوراً اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"ارے ———!" ظفر کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور پھر خوشی و مسرت سے بے قابو ہو کر اس نے ایک نعرہ لگا دیا اور جھک کر اپنی دونوں باہوں میں شاہدہ کو اٹھا لیا اور اٹھ کھڑا ہوا "ہا ہا! شریمتی شاہدہ بیگم صاحبہ ہمارے منے کی ماں بنیں گی"!

اس کا چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا۔ وہ ظفر سے نظریں چار نہ کر سکی۔ اپنا منہ اس کے کانوں کے قریب لا کر ظفر نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا "لیکن کتنے دنوں بعد... میرا مطلب ہے... ؟"

شاہدہ لجائی جا رہی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ظفر کے سینے میں چھپاتے ہوئے کہا "یہی کوئی تین چار ماہ بعد..."!

اس کے دوسرے ہی دن ظفر نے خاندان والوں کو اپنی آمد کا تار دے دیا۔

باقی ایام ہنسی آؤ بھگت میں گذرے۔

ظفر ہر وقت اس کی خوشی کا خیال رکھتا۔ اسے اپنی جگہ سے ہلنے جلنے تک نہ دیتا۔ اس کی معمولی ضروریات کے لئے خود دوڑ پڑتا۔ اس کی خوشیوں کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی کے سب سے اہم مقصد و مراد کو پانے والا ہے ——— اور دوسری طرف شاہدہ اس کے اس پیار اور محبت کو دیکھ کر پھولی نہ سماتی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس میں ایک غرور سا آچلا ہے۔

پھر وہ وقت آیا جب کوٹھی پر ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔

شاہدہ کے کمرے میں خاندان کی عمر رسیدہ عورتوں کی آمد و رفت تھی دایا، نرسیں اور لیڈی ڈاکٹر کے قدموں کی آہٹ سے اس کا کمرہ گونج رہا تھا اور وہ باہر چپ چاپ تھا۔ دل ہی دل میں شاہدہ کی زندگی کی سلامتی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ جو بھی اس کے قریب سے گذرتا وہ بے تاب ہو کر شاہدہ کے بارے میں پوچھنے لگتا۔

وہ رات کا وقت تھا اور رات کی شمع بوند بوند پگھلی جا رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ اس کی پریشانی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ باخبر تھا کہ شاہدہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ چپ چاپ دعائیں مانگتا رہا۔

اور پھر جب افق کے جھروکوں سے سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا اور فضاؤں میں اذانوں کا تقدس گونج اٹھا، اس نے اجنبی مہمان کی آمد کی خبر سنی۔ بے اختیار خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے اور وہ شاہدہ کے کمرے کی طرف لپکا تھا۔

وہاں دروازے کے قریب نصرت کھڑی تھی، اسے دیکھتے ہی بولی۔

"آہا ——— بھائی جان اب اتنی جلدی بھی کیا ہے ——— وہاں تو ———"

وہ ایک طرف کھسک گیا، جھینپا جھینپا سا۔

اور پھر جب بہت دیر بعد لیڈی ڈاکٹر اسے مبارکباد دے کر چلی گئی تھی اور شاہدہ کے کمرے سے عورتوں کی بھیڑ چھٹ چلی تھی، تب اسے شاہدہ کے پاس جانے کا موقع ملا تھا۔

اس وقت کمرے میں شاہدہ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اس کے زرد چہرے سے ناتوانی مترشح تھی۔ لیکن آنکھوں میں ایک غیر معمولی وقار اور نور ابھر آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہلکی سی مسکراہٹ شاہدہ کے چہرے پر آگئی۔ ظفر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ سے اس کے ماتھے پر چمکتے ہوئے پسینے کے قطروں کو پونچھنے لگا۔

اور پھر اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کو اپنے ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے وہ مسکرایا اور بڑے شاہانہ انداز میں بولا۔

یکہاں ہے ہمارا مُنا ——— ؟ ہمیں دکھاؤ، تمہارا ظفرِ ثانی ——— اور
ارے بچپن کی تصویر ———"!

شاہدہ اس کے اس انداز پر مسکرا دی اور پھر اپنے دوسرے پہلو کی طرف
یٹے ہوئے بچے کو اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا ——— وہ ننھا منا وجود
ب کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ شاہدہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس نے
بچے کے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور پھر وہ یوں ساکت ہو گیا تھا جیسے اسے
سانپ سونگھ گیا ہو!

اگر وہ توہم پرست ہوتا، اگر اُس وقت اُس کے دماغ میں یہ خیال نہ ہوتا
کہ بچے کو اچانک چھوڑ دینے سے اس کی جان جا سکتی ہے۔ تو وہ یقیناً بچے کو فرش پر
چھوڑ کر ایک چیخ مارتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتا!

وہی شکل و صورت، وہی گھنی گھنی بھویں آپس میں ملی ہوئی اور وہی
دائیں رخسار کے نیچے نمایاں تل! بالکل نواز جیسا!

بچے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نواز نے اس کے ہاں جنم لیا ہو—!

غزلیں

ل ایوبی ٹونکی ———

دلا دھندلا سایہ ماحول رہیگا کب تک
ہونی جو نہیں ہے تو نہ ہو شام تو ہو

سادگی ایسی بھی کیا اے نگہِ فتنہ طراز
نظر اُٹھے تو نظر میں کوئی پیغام تو ہو

نِ گلشن میں بہاروں کے قدم آ تو گئے
ہاں! فیض بہاروں کا مگر عام تو ہو

رند مایوس نہ ہو جائیں کہیں اے ساقی
جام خالی سہی ہاتھوں میں مگر جام تو ہو

دل کی ناکامی کا شکوہ نہیں حسرت یہ ہے
اُس ستمگر کو خیالِ دلِ ناکام تو ہو

——— **اَحمد سعید فیض آبادی۔ ڈھاکہ** ———

گو دل بُجھا بُجھا ہے مِرا میرِ کارواں
منزل کی جستجو میں مگر ہوں رواں دواں

ذکرِ جنوں چھڑا تو مِرا نام آ گیا
ورنہ وہ بزمِ ناز کہاں اور میں کہاں

اہلِ جہاں کے طور سے واقف نہیں ہیں کیا
ہم کیوں ہر اِک سے کہتے پھریں اپنی داستاں

شامل ہے جب ہمارا لہو بھی بہار میں
کیسے نہ پھر کہیں کہ ہمارا ہے گُلستاں

میری شبِ حیات کی تاریکیاں چھٹیں
اَحمد جو مسکرا کے بکھیریں وہ کہکشاں

——— **شبیر خاں عاشق**

موت سے ہر دم جو ٹکراتی نہیں
ہم کو ایسی زندگی بھاتی نہیں

دھیان اُن کا کب نہیں رہتا ہمیں
یاد اُن کی کس گھڑی آتی نہیں

توبہ کر لینے میں پھر پی لیتے ہیں
یک بیک خوئے کہن جاتی نہیں

کیا ہوا گُلشن میں آخر کیا ہوا
کیوں کسی گُل کی مہک آتی نہیں؟

کھو گئے افسوس یارانِ قدیم
اب نظر اُن کو کہیں پاتی نہیں

قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

آتشِ گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
کلیاتِ اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
جنون وہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
آہنگِ حجاز	″	ایک روپیہ
سحرِ غزل	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
دستک	نرش کمار شاد	دو روپے ۲۵ پیسے
سپوار	″	دو روپے ۵۰ پیسے
للکار	″	دو روپے ۲۵ پیسے
قاشیں	″	تین روپے
آیاتِ جنوں	″	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
سنگم	″	تین روپے
سموم وصبا	جوش ملیح آبادی	آٹھ روپے
شکوہ جوابِ شکوہ	ڈاکٹر اقبال	پچیس پیسے
بالِ جبریل	″	تین روپے ۵۰ پیسے
ابھیننددن گرنتھ	جوش ملسیانی	دس روپے
شکنتلا	ساغر نظامی	بارہ روپے
نگاہِ ناز	کرشن موہن	ایک روپیہ
آہنگِ وطن	″	ایک روپیہ
کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی (اول)	اکبر الٰہ آبادی	پانچ روپے
حصہ دوم	″	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم وحرم	″	دو روپے ۲۵ پیسے
گلِ رعنا	جگی رعنا	تین روپے ۵۰ پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
ملہناواں	″	چھ روپے

خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	″	چار روپے
گلنار	″	دو روپے ۲۵ پیسے
قول وقرار	″	تین روپے ۵۰ پیسے
گردشِ جام	″	دو روپے ۲۵ پیسے
بطِ مے	″	دو روپے ۲۵ پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
رسالت مآب	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
اسلام اور عورت	مولانا مظہر الدین	تین روپے
نماز کیا ہے	مولانا محمد علی	دو روپے ۲۵ پیسے
نیا نو دن	راشد سہسوانی	پانچ روپے ۷۰ پیسے
غم دے مستقل	انیس مرزا	چار روپے ۵۰ پیسے
شرارت	جمیل انجم	تین روپے
عشق اور خون	رائیڈن ہگرڈ	سات روپے
سوکھا ساون	انیس مرزا	دو روپے ۵۰ پیسے
محبت اور جرم	انور کمال حسینی	دو روپے ۷۵ پیسے
فن اور تنقید	″	چار روپے ۵۰ پیسے
نوائے دل	منشاء الرحمٰن خاں منشاء	دو روپے ۵۰ پیسے
شاہنامۂ اسلام	حفیظ جالندھری	نو روپے
تلامذۂ غالب	مالک رام	سات روپے ۷۵ پیسے
یادیں	اختر الایمان	چھ روپے
مضراب	شباب للت	تین روپے
تماشائی	کرشن موہن	ایک روپیہ
روپ رس (ہندی رسم الخط میں)	″	ایک روپیہ
نگاہِ ناز	″	ایک روپیہ
تبسمِ غم	وسیم بریلوی	دو روپے ۵۰ پیسے
دیوانِ مصحفی	مرتبہ: نور نقوی	بارہ روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر معہ توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت پانچ روپے

کفر وایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت اختر کا نام ہی اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا ضامن ہے، کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ دردمند دل کی گرمی بھی ہے قیمت چار روپے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں جن میں تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے۔ تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتی سولہ روپے، اب صرف نو روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصولڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

مضراب شباب للت کے ایک ایک شعر میں اس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اس نے سارے جہان کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

گردِ راہ ضیا فتح آبادی کا چوتھا مجموعۂ کلام ... ضیا ایک صاحبِ طرز شاعر ہیں۔ اُن کے اندازِ بیان اور لب ولہجہ میں انفرادیت وندرت ہے قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

آوازیں ابھرتے ہوئے جواں سال شاعر پورن کمار ہوش کے قطعات اور نظموں کا منفرد مجموعہ جس میں رومانی چاشنی کے ساتھ ساتھ آپ کی اپنی آواز بھی ہے قیمت تین روپے

چاندنی اساڑھ کی راج نرائن راز کی نظموں کا مجموعہ لوک گیتوں کی سی سادگی، پُرکاری تازگی اور شگفتگی۔ ان میں ایک نئے انداز کی نغماتی تشنگی بھی ہے۔ سہ رنگا گرد پوش، کاغذ آفسیٹ۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ قیمت صرف تین روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

میری بھارت یاترا

فکر تونسوی

بھارت دیش، خطِ استوا پر واقع ہے۔ اگر یہ خطِ استوا پر واقع نہ ہوتا تو اِس کی سبھیتا وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔ اِس ملک کی سبھیتا خطِ استوا کے گرد گھومتی ہے۔ اگرچہ ایک ہندوستانی نے مجھے بتایا کہ نہیں، خطِ استوا ہماری سبھیتا کے گرد گھومتا ہے۔

پندرہ منٹ بعد اُس ہندوستانی کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ معلوم ہوا کہ مندر کے تہہ خانے میں اُس نے ناجائز شراب کی ایک بھٹی چلا رکھی تھی۔ بھٹی ایک خطِ استوا تھی، جس کے گرد اُس ہندوستانی کی سبھیتا گھوم رہی تھی۔

خطِ استوا پر واقع ہونے کے باعث ہندوستان ایک گرم ملک ہے۔ یہاں سورج براہِ راست انگارے برساتا ہے اور جنھیں ہندوستانی لوگ براہِ راست اپنے ننگے بدن پر سہتے ہیں۔ ہندوستان کا ایک مشہور لیڈر مہاتما گاندھی بھی ننگے بدن رہتا تھا۔ وہ نہایت ذہین انسان تھا۔ بدن کی عریانی کو اُس نے پولٹیکل سمبل بنا دیا۔ اُس نے ساری دُنیا میں پروپگنڈہ کیا کہ بدن کی عریانی، افلاس کی علامت ہے اور انگریز سامراج ہمارے تن کے لباس اُتار اُتار کر انگلینڈ لے گیا ہے۔ اِس انکشاف پر بھوکے ننگے ہندوستانی شیروں کی طرح غرّانے لگے اور انگریز حاکم کپکپا اُٹھے اور گیدڑوں کی طرح ہندوستان سے بھاگ گئے۔

لیکن انگریز سامراج کے بھاگ جانے کے باوجود ہندوستانی آج بھی ننگے بدن رہنا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ سورج کی گرمی اور اُن کے ننگے بدن میں نہایت قدیم رُوحانی رشتہ ہے۔ ننگے بدن سورج کی گرمی کھانے سے اُن کے اندر سہن شکتی پیدا ہوتی ہے۔ اِس گرمی سے کاہلی بھی پیدا ہوتی ہے۔ کاہلی اور سہن شکتی ہندوستانی سبھیتا کے دو بنیادی ستون ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اُنھوں نے بیرونی حملہ آوروں کے بڑے سے بڑے ظلم کو بھی کاہلی اور سہن شکتی کے زور پر برداشت کر لیا۔ کچھ لوگ اِسے ہندوستانیوں کی بزدلی کہتے ہیں لیکن ہندوستانی لوگ اِسے اپنی رواداری کہتے ہیں۔

جب بھی کوئی غیر ملکی فاتح اُن کے شہر میں تخت و تاراج کرتے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ ہندوستانی لوگ جھٹ عبادت گاہوں میں گھس جاتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں "اے اللہ تعالیٰ! ہمیں قوتِ برداشت عطا کر تاکہ ہم ظالم فاتح کے ظلم کو ایسی رواداری سے برداشت کر سکیں کہ فاتح کے ماتھے پر ایک بل بھی نہ آئے۔"

سورج اپنے پورے غیظ و غضب اور جبارانہ صفات کے ساتھ ہندوستانیوں کی جلد بھون کر کباب کر دیتا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود وہ سورج کو دیوتا سمجھتے ہیں۔ ہر صبح جب سورج کی پہلی کرن مشرق سے طلوع ہوتی ہے، ہندوستانی لوگ اُس کی پُوجا کرتے ہیں، اُس کی تعریف و توصیف کے بھجن گاتے ہیں، ہاتھ جوڑ کر اُسے نمسکار کرتے ہیں، پانی کا لوٹا بھر کر اُس کے سامنے دھار کی طرح بہا کر زمین پر گراتے ہیں۔ لیکن صدیوں کی اِس پرستش کے باوجود ابھی تک سورج کا من نہیں پسیجا۔ وہ اُسی طرح ظالم ہے، آگ برساتا ہے، بدن جُھلساتا ہے۔ یہ آتشیں دیوتا اُن کے قابو میں اب تک نہیں آیا۔ میں نے جب ایک ہندوستانی شاعر سے اِس کے متعلق استفسار کیا تو اُس نے کہا "سورج کا اپنا رول ہے، اور ہمارا اپنا! اِس لئے ع

وہ اپنی خُو نہ چھوڑے گا، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں؟

ہندوستان کئی بار غیر مُلکی حملہ آوروں کا غلام بنا لیکن کچھ برس بعد خطِ استوا کی گرمی نے فاتحین کے اندر بھی کاہلی اور سہن شکتی پیدا کر دی اور وہ ہندوستانی سبھیتا کا ایک حصّہ بن کر رہ گئے۔ آج بھی آپ کو ہندوستان میں ایسے انسان نظر آ جائیں گے جو کبھی فاتح بن کر ہندوستان پر راج کرتے تھے اور آج کل پٹڑیوں پر بیٹھ کر گلے سڑے کیلے بیچتے ہیں۔ ہندوستان کی سہن شکتی نے اُنھیں بدولت خود ایک گلا سڑا کیلا بنا ڈالا ہے اور وہ ہر شام ہندوستان کے اِس فلسفیانہ شعر کی مالا جپتے ہوئے گھر لوٹتے ہیں ؎

بیسویں صدی دہلی دسمبر ۱۹۶۹ء

رُوکھی سُوکھی کھائی کے، ٹھنڈا پانی پی
نہ دیکھ پرائی چپڑی، نہ ترسا اپنی جی

ایک دن میرا جی چاہا کہ بھارت دیش کے حکمران افراد سے معلومات کی جائے۔ اِس لئے میں نے اپنے گائڈ سے کہا ــــــ "آج کل ہندوستان کا حاکمِ اعلیٰ کون ہے؟ کیونکہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ خطِ استوا کی گدّی پر بیٹھنے والے کا رنگ ڈھنگ اور حُلیہ کیسا ہے؟"

گائڈ نے میری طرف یوں دیکھا، جیسے کوئی عقل مند ایک احمق کی طرف دیکھتا ہے۔ مجھ پر رحم کھاتے ہوئے وہ بولا "معاف کیجئے، ہندوستان کے عوام ہی ہندوستان کے حاکمِ اعلیٰ ہیں۔ یہاں کا ہر باشندہ ہندوستان کا حاکم ہے۔"

گائڈ کے اِس جواب نے مجھے اُداس کر دیا۔ ہر قوم کا کوئی نہ کوئی حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں قوم کی قوم حاکمِ اعلیٰ ہے۔ یہ کیسا عجیب مُلک ہے۔ جہاں قوم کے افراد ایک دوسرے پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ کیسے ایک دوسرے پر حکومت کرتے ہوں گے؟ میرے لئے یہ ایک پُراسرار معمّہ تھا۔ میں نے ایک آدمی سے جو سڑک پر کھڑا بھیک مانگ رہا تھا، پُوچھا "کیا تم ہندوستان کے حاکمِ اعلیٰ ہو؟"

وہ گردن اکڑا کر بولا "ہاں! میں جس جگہ کھڑا بھیک مانگ رہا ہوں، یہاں کوئی دوسرا آدمی آکر بھیک نہیں مانگ سکتا۔ یہاں صرف میرا حُکم چلتا ہے!"

"اور جب تم خدانخواستہ انتقال کر جاؤ گے؟"

"تو میرا جانشین بیٹا یہاں بھیک مانگا کرے گا!"

"لیکن میں نے تو سُنا ہے تم پُورے بھارت دیش کے حاکم ہو!"

"تم نے ٹھیک سُنا ہے۔ میں بھارت دیش کے کسی بھی شہر میں، کسی بھی جگہ کھڑے ہو کر بھیک مانگ سکتا ہوں۔ مجھے کوئی مائی کا لال نہیں روک سکتا!"

ابھی میں ہندوستان کے اِس حاکمِ اعلیٰ سے عوامی حکومت کے طریقۂ کار پر گفتگو کر ہی رہا تھا کہ ایک سکوٹر ہمارے پاس آکر رُکا۔ سواری اور سکوٹر ڈرائیور دونوں نے ایک دوسرے پر مُکّے تان لئے۔ سواری کہنے لگی "میں تمھیں حُکم دیتا ہوں کہ مجھے چورلیے پر لے چلو۔"

سکوٹر ڈرائیور کہنے لگا "اور میں تمھیں حُکم دیتا ہوں کہ اِسی دوراہے پر اُتر جاؤ!"

"ارے واہ میرے شیر! تم تو یوں بات کرتے ہو، جیسے تم اِس مُلک کے گورنر ہو!"

"اور تم کون سا اپنے آپ کو گورنر سے کم سمجھ رہے ہو!"

اور دونوں گورنر ایک دوسرے سے گُتھم گُتھا ہو گئے۔ بھکاری نے صدا لگائی "اے گورنرو! ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اُتارنے سے پہلے مجھے بھیک دے دو!"

اِتنے میں بہت سے بھارتی اِکٹھے ہو گئے۔ وہ سب آکر مختلف قِسم کے حُکم دینے لگے۔ وہ سبھی حاکم معلوم ہوتے تھے۔ کِسی نے حُکم دیا اِنھیں چھڑا دو، کِسی نے کہا، خبردار! اگر کِسی نے چھڑانے کی کوشش کی، اِنھیں لڑنے دو۔ تیسرے نے حُکم دیا، اِنھیں پولیس اسٹیشن لے جاؤ۔ چوتھے نے حُکم دیا، پولیس اسٹیشن مُردہ باد! پانچویں نے حُکم دیا، پہلے یہ معلوم کرو کہ جھگڑا کس بات پر ہے؟ چھٹے نے کہا، اِنھیں مندر میں لے جاؤ، تاکہ بھگوان کی مُورتی کے سامنے جاکر معافی مانگیں۔

غرض چاروں طرف سے احکام کی بوچھار شروع ہو گئی جس سے کنفیوژن بڑھ گیا۔ میں نے ایک پولیس کانسٹبل سے کہا "تم بیوقوفوں کی طرح کھڑے تماشا کیوں دیکھ رہے ہو۔ دیکھتے نہیں، امنِ عامّہ میں خلل پڑ رہا ہے، تم مداخلت کیوں نہیں کرتے؟"

کانسٹبل بولا "میں مداخلت نہ کروں گا۔ کیوں کہ مجھے میرے اعلیٰ افسران نے حُکم دے رکھا ہے کہ جنتا یہاں کی حاکم ہے۔ اِس لئے جب جنتا آپس میں لڑ رہی ہو تو تم دخل مت دو۔ حاکموں کی لڑائی میں دخل دینا پولیس کا کام نہیں۔"

میں حیرت سے مُنہ میں اُنگلیاں دبا کر رہ گیا۔ ایسی آدرش پولیس میں نے دُنیا کے کسی مُلک میں نہیں دیکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پولیس، حکومت کا سمبل ہوتی ہے اور امن اور قانون کی حفاظت کرتی ہے لیکن یہاں امن اور قانون تباہ و برباد

ہو جاتا ہے لیکن پولیس بربادی کے اس کھنڈر پر کھڑے ہو کر بڑی شرافت سے مُسکراتی رہتی ہے۔ اِس دوران میں میں نے دیکھا، دونوں حاکم ایک دوسرے کا ایک ایک دانت توڑ چکے تھے اور لہو کی دھاروں سے اُن کے کپڑے لہولہان ہو گئے تھے اور پھر اچانک سکوٹر ڈرائیور کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا۔ اُس نے سواری کو حکم دیا: "پیچھے سیٹ پر بیٹھ جاؤ، ہم اور تم دونوں سرکاری ہسپتال چلیں تاکہ مرہم پٹی کرائیں۔"

اور پھر سکوٹر ہوا کی رفتار سے دونوں زخمی گورنروں کو لے کر ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا اور لوگ بالک بھارت دیش کی جنگ اور امن کی عظیم پالیسی کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اپنے راستوں پر چلے گئے۔ صرف پولیس کانسٹبل اکیلا کھڑا رہ گیا۔ وہ اُداس ہو گیا تھا۔ میں نے پُوچھا: "سنتری جی! تم اُداس کیوں ہو گئے ہو؟"

وہ بولا: "مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں لوگوں کے سامنے اُن دونوں فسادیوں سے رشوت کے دو دو روپے دینے کا فرمان جاری نہ کر سکا!"

"کیوں نہ کر سکے؟"

"کیونکہ جنتا یہاں کی حاکم ہے اور حاکم کے سامنے رشوت لیتے ہوئے ذرا شرم آتی ہے۔"

"لیکن تم بھی تو حاکم ہو!"

اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا: "ہاں، کوئی زمانہ تھا جب میرا حکم چلتا تھا۔ میری شکل دیکھتے ہی لوگ تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ لیکن جب سے جنتا کا راج آیا ہے، میں جنتا کا خادم ہو کر رہ گیا ہوں۔ صرف جنتا سے رشوت لے کر پیٹ بھرنے والا خادم!"

یہ کہہ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو کانپنے لگے۔ میں نے اُس کے من کی شانتی کے لئے ایک سگریٹ پیش کیا۔ لیکن شدّتِ جذبات میں اُس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا: "ہم غیر مُلکیوں سے رشوت نہیں لیا کرتے۔ اِس سے ہمارے مُلک کی بدنامی ہوتی ہے۔"

اِس واقعہ کے بعد میں نے بھارت کے متعلق مندرجہ ذیل نتیجے اخذ کئے:-

۱۔ خطِ استوا کے اوپر بسنے والے یہ انسان جتنی جلدی گرم ہو جاتے ہیں، اُتنی جلدی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔

۲۔ اُن کے اندر سُورج کی حرارت نے سہن شکتی پیدا کر دی ہے۔ اگر آج سُورج دیوتا اُن سے ہاتھ کھینچ لے تو وہ دُنیا کی لڑاکا قوم بن جائیں۔

۳۔ وہ انصاف کی حکومت کے قائل ہیں مگر وہ یہ کبھی برداشت نہیں کرتے کہ کوئی دوسرا آدمی اُن کے انصاف کی سپرٹ میں مداخلت کرے۔ اپنا انصاف وہ خود کر لیتے ہیں۔

۴۔ بھیک مانگنے کے باوجود وہ اپنی خودداری ترک نہیں کرتے۔

۵۔ رشوت لینا گُناہ نہیں سمجھتے۔ صرف اِس گُناہ کا بر سرِ عام مظاہرہ کرنا گُناہ سمجھتے ہیں۔

۶۔ غیر مُلکیوں کے سامنے رُسوا ہوتے وقت ایکدم اپنے اخلاق کو بلند کر لیتے ہیں اور سبھی بھارتی رُسوائی سے بچنے کے لئے متّحد ہو جاتے ہیں اور نعرہ لگاتے ہیں ؎

——ہم پچاس کروڑ!!
چڑھتے دریا، رُک نہیں سکتے
کٹ سکتے ہیں، جُھک نہیں سکتے!
دیں گے دشمن کا سر توڑ
ہم پچاس کروڑ!!

اور پھر کئی ہفتوں کی کھوج کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ بھارت دیش میں بھی شاہی افراد کا ایک خاندان موجود ہے، جو قانون کی اصطلاح میں تو مُلک کے حاکمِ اعلیٰ کہلاتے ہیں لیکن وہ کسی کے سامنے یہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اِس مُلک کے حاکم ہیں۔ شاہی خاندان کے ایسے ہی ایک فرد کو میں نے جا پکڑا۔ وہ ایک آراستہ و پیراستہ کوٹھی میں مخمل اور کمخواب کے بستر پر لیٹا ہوا تھا، خوشبوئیں اُس کے چاروں طرف رقص کر رہی تھیں۔ ایک مخملیں صوفے پر اُس کا ایک خوبصورت سا کُتّا بیٹھا، انڈے اور مچھلی اور گوشت کھا رہا تھا۔ میں نے اُس حاکمِ اعلیٰ سے پُوچھا: "کیا آپ ہی اِس مُلک پر حکومت کرتے ہیں؟"

درجن بھر پتّے کی پھلیاں ایک ساتھ اپنے مُنہ میں اُنڈیلتے ہوئے اُس نے بہت عاجزی سے جواب دیا: "جی نہیں، اُلٹے جنتا مجھ پر حکومت کرتی ہے۔ وہ جیسا حُکم دیتی ہے، میں اُس پر بلا چون و چرا عمل کرتا ہوں۔ ورنہ وہ مجھے گدّی سے اُتار دیتی ہے۔ مجھے آپ جنتا کا حاکم نہیں، جنتا کا سیوک ہی سمجھئے۔"

میں نے کہا: "لیکن جنتا تو گلے سڑے کیلے کھا رہی ہے اور آپ کا کُتّا عیش کر رہا ہے۔"

وہ اپنی پھیکی ہنسی کو میٹھی کرتے ہوئے بولا: "یہ کُتّا مجھے میرے جنم دن پر جنتا کے حُکم پر جنتا ہی کی طرف سے بھینٹ کیا گیا تھا اور جنتا ہی کے حُکم پر عیش کر رہا ہے۔ ہی ہی ہی ہی!!"

قضیہ چہار درویش

علی غضنفر ریاض

الیکٹریکل اینڈ ٹیلیفون سیکشن، وزارۃ الزراعتہ۔ ریاض (سعودی عرب)

مکرم و معظم خوشتر گرامی صاحب!

اُردو زبان کے جس نخل کو آپ اپنے خونِ جگر سے سینچ رہے ہیں، اُس کی جڑیں کتنی دُور تک پھیلی ہوئی ہیں؟ اِس کا اندازہ ہمیں ممالکِ غیر ہی میں رہ کر ہو سکتا ہے۔ قابلِ ستائش ہے آپ کی انتھک کوشش جو اُردو کی ڈوبتی ناؤ کو سنبھالے ہوئے ہے ——— آپ کا موقر جریدہ سعودی عرب میں باقاعدگی سے (گو دیر سے) مِل جاتا ہے ——— "بیسویں صدی" کی بزم میں پہلی بار ایک کہانی "قضیہ چہار درویش" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کو اور قارئین کو بھی پسند آئے گی . . .

نیاز کیش ——— علی غضنفر

★

خاورِ مشرق سارے دن کے طویل سفر کے بعد دامنِ مغرب میں چھپنے کو تھا۔ صحرا کی سوندھی سوندھی خوشبوؤں سے معطر خُنک ہواؤں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ جن لوگوں کو صحرا کی راتوں کا کچھ تجربہ ہو وہی بتا سکتے ہیں کہ دشت میں یہ قُدرت کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اِس نعمت سے ہم بھی خوب خوب لُطف اندوز ہوتے ہیں۔

ایسی ہی ایک حسین شام کو ہم فرڈی کی قیام گاہ سے ملحق باغیچہ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ فرڈی بضد تھا کہ ہم چار نہیں، ساڑھے تین ہیں۔ کیونکہ عورت کو درویشی میں پُورا نہیں، نصف سمجھا جاتا ہے اور یوں کورم پُورا نہیں ہوتا اور ہم چار درویش نہیں کہلا سکتے ——— جبکہ کم گو اور خاموش طبع سارڈیسٹ کا خیال تھا کہ گنتی چار سے اوپر ہوتی ہے۔ اُس کا فلسفہ تھا کہ عورت ایک سے زیادہ ہے کیونکہ اکیلا آدم اِس قابل نہ تھا کہ آبادی میں اضافے کا باعث ہوتا۔ اُسے بھی عورت کا سہارا لینا پڑا۔ ہم چاروں میں کبھی اتّفاق رائے نہ ہو پاتا۔ ہر بات وجہِ بحث بنتی جو گھنٹوں جاری رہتی اور پھر بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ختم ہو جاتی۔ مگر ہماری بحثوں کا نتیجہ کبھی تلخ نہ ہوا۔ اِس لیے کہ صحرا میں ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔

سارڈیسٹ فرانسیسی تھا۔ آئل کمپنی میں اُس کا تقرر بطور سائل ایکسپرٹ تھا۔ وہ کم گو اور پُر خلوص شخص تھا۔ ہنسوڑ اور رنگا رنگ طبیعت کا مالک فرڈی اطالیہ کا رہنے والا تھا۔ کمپنی میں چیف کیمیکل انجینئر تھا۔ مِس بیلا کمپنی کی لیڈی ڈاکٹر تھی۔ اُس کا باپ برطانوی اور ماں انڈین تھی۔ بیلا جونز مشرق اور مغرب کے حُسن کا امتزاج تھی۔ بیلا خوشبوؤں کی پرستار اور سارڈیسٹ اُن سے متنفر ——— البتہ فرڈی اِس معاملے میں وقت کی مناسبت سے علیحدہ علیحدہ دونوں کا ہم خیال ہو جاتا۔ ہم سب میں ایک قدر مشترک تھی ——— وہ تھی مشرق سے پیار! فرڈی اور سارڈیسٹ سات سال انڈیا میں رہ چکے تھے۔ اُردو زبان میں اچھی خاصی شُد بُد رکھتے تھے۔ برِ صغیر کی قدیم تہذیب اور قِصّۂ الف لیلیٰ کے بہت مدّاح تھے۔ تینوں عرصے سے اِس کمپنی میں ملازم تھے اور جب ہم سروس کے سلسلے میں یہاں پہنچے تو چند دِنوں کے بعد فرڈی نے اعلان کیا کہ قِصّۂ چہار درویش کے چاروں رُکن اِکٹھے ہو گئے ہیں۔

پہلی بار جب ہم کمپنی کے ذاتی ایرپورٹ پر اُترے تو کمپنی ہی کی طرف سے ہمیں ریسیو کرنے کے لئے فرڈی اور سارڈیسٹ موجود تھے۔ فرڈی نے پہلی نظر ہی میں ہمیں پہچان لیا۔ اُس سے ایک بار پیرس میں ملاقات ہو چکی تھی۔ اُن دِنوں ہم تعلیم کے سلسلے میں پیرس میں رُکے ہوئے تھے۔ فرڈی کی باغ و بہار طبیعت سے ہم واقف تھے اور سچ تو یہ ہے کہ اُسے دیکھ کر خدا کا شُکر ادا کیا کہ صحرا میں ایک ہستی تو

ایسی موجود ہے جس سے ویرانیاں اور اداسیاں کسی حد تک دُور ہو سکتی ہیں۔ ہمیں رہنے کے لئے بہترین سہولتیں میسّر تھیں۔ غیر ملکیوں کی تعداد کم تھی، اِس لئے ہم چاروں جلد ہی پُرانے دوستوں کی طرح رہنے لگے۔ کبھی کبھی سارڈیسٹ کی خاموشی ضرور کھٹکتی۔ مگر اُس کا خیال تھا کہ وہ بیوی (جسے وہ طلاق دے چکا تھا) سے اتنی باتیں کر چکا ہے کہ اب اُس کے پاس باتوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے۔ وہ اکثر اِس خیال سے آبدیدہ ہو جاتا کہ اُس نے اپنی بیوی کو سخت اذیت دی۔ جب وہ باتیں شروع کرتی (جو بقول اُس کے بے تحاشا اور بے معنی ہوتیں) تو وہ خاموش ہو جاتا۔ فرڈی بہت باتونی تھا اور جب کبھی سلسلۂ گفتگو کو طول دیتا تو سارڈیسٹ کو محسوس ہوتا کہ اُس نے ابھی تک اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی ہے۔ فرڈی شادی شُدہ نہ تھا۔ اُس نے بتایا کہ ابھی تک اُسے کوئی آئیڈیل لڑکی نہ ملی (یا وہ کسی لڑکی کے لئے

- بے خوفی رُوحانیت کی پہلی شرط ہے۔ بُزدل آدمی کبھی نیک سیرت نہیں ہو سکتا۔ (مہاتما گاندھی)
- اگر آپ کا دل پاک نہیں ہے اور آپ اپنے جذبات پر قابُو نہیں پا سکتے تو آپ تعلیم یافتہ انسان ہرگز نہیں کہے جا سکتے۔ (مہاتما گاندھی)
- محبت دوستی کی کسوٹی ہے۔ (مہاتما گاندھی)
- عدم تشدد پر وہی قوم عمل کر سکتی ہے جو مضبوط ہو جس کے سامنے کوئی بڑا مقصد ہو اور جس کا ارادہ مضبوط ہو۔ (بادشاہ خان)
- عدم تشدد محبت ہے اور تشدد نفرت۔ (بادشاہ خان)
- عدم تشدد ایک اعلیٰ درجہ کی عملی قوت ہے۔ (بادشاہ خان)

آئیڈیل ثابت نہ ہو سکا) بیلا کی دانست میں فرڈی کے نام میں تھوڑا سا اضافہ ضروری تھا۔ مثلاً فرڈی سے فراڈی! اِسی خیال کے تحت وہ اکثر اُسے فراڈی کہتی۔ جواب میں فرڈی ایک بلند سا قہقہہ لگا کر اطالوی گیت گُنگُنانے لگتا۔

"ردیرا کے کنارے
میں تنہا کھڑی ہوں... سب مجھے چھوڑ گئے
مگر... بیتاب طوفانی لہریں مجھے آج بھی سلام بھیجتی ہیں"

اور بیلا مُسکرا دیتی۔

ہمارے درمیان اکثر معمولی باتوں پر بحث ہوتی جس میں ہر شخص کی رائے الگ ہوتی۔ طویل بحث و مباحثے کے بعد وہ بات یوں ختم ہو جاتی جیسے کہ آخر فیصلہ ہو گیا ہو۔ مگر اگلی ملاقات پر اُسی بحث کا سلسلہ چل نکلتا۔ آج بھی چلتے

کا دَور جاری تھا اور بیلا کی تجویز زیرِ بحث (زیرِ غور نہیں) تھی۔ بیلا کا خیال تھا ہم کمپنی سے رخصت لے کر ہندوستان کی سیاحت کریں۔ گذشتہ نشست میں بحث اِسی تجویز پر شروع ہوئی اور تیل پر ختم ہوئی تھی۔ سارڈیسٹ کا دعویٰ تھا کہ پاکستان میں تیل کے کثیر ذخیرے موجود ہیں اور اگر حقیقی معنوں میں کام کیا جائے تو یہ ذخیرے کسی بھی عرب مُلک سے کم نہ ہوں گے ——— فرڈی کا کہنا تھا کہ اُس نے صرف پاکستان ہی نہیں ہندوستان میں بھی کُھدائی کے بغیر تیل نکلتے دیکھا ہے۔ مگر اُسے ہمیشہ افسوس رہا کہ ایک محور کے گرد اور ایک ہی مدار میں گھومتے ہوئے بیل کا بھی تیل نکل جاتا ہے۔ اُسی نشست میں بیلا خاموشی سے تیل اور تیل کی دھار دیکھتی رہی۔

آج کا موضوع پھر سیاحت تھا۔ ویرانے میں رہتے ہوئے دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ ہنگاموں سے آشنا زندگی سکوت کے بے کراں سمندر کو پار کرنے کو ہر وقت بے چین رہتی۔ ہم چاروں (اندرونی طور پر) یہاں تک متّفق تھے کہ اِس ماحول سے کچھ عرصہ کے لئے ضرور باہر نکل جانا چاہئے ——— مگر کہاں... یہی بات فیصلہ طلب تھی۔ فرڈی نے کہا: "انڈیا بیلا کا ننہال ہے، اِس لئے وہ جانبداری سے کام لے رہی ہے۔" اُس کا خیال تھا کہ قدرت کی رنگینیوں سے لُطف اندوز ہونے کے لئے بغداد سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ مگر بغداد جانے سے پہلے اطالیہ کا ٹرپ ضرور ہونا چاہئے۔ موسم اور حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر ذاتی طور پر ہم بھی سیاحت کی سخت ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ مگر منزل اِس لئے تجویز نہ کر پائے تھے کہ جہاں کہیں تینوں ساتھی متّفق ہوں گے وہیں کے لئے ہماری رائے بھی ہوگی۔ جب سارڈیسٹ سے پُوچھا گیا تو اُس نے بتایا کہ وہ کہیں بھی جانے کے لئے تیار ہے اور یہ کہ وہ اُس وقت تک ہمارا ساتھ دے گا جب تک الگ الگ سب سے بور نہیں ہو جاتا۔ ہم نے رائے دی کہ سوئٹزرلینڈ دیکھا جائے! یہ سُن کر سب سوچ میں ڈُوب گئے (اِس لئے کہ اِس تجویز کی مخالفت کا جواز ڈھونڈ پائیں) ——— اور پھر وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ یعنی کوئی بھی تائید کے لئے تیار نہ تھا۔ بیلا بضد تھی کہ کشمیر سوئٹزرلینڈ سے کسی طرح کم حسین نہیں۔ فرڈی زور دے کر کہہ رہا تھا، بغداد کے شب و روز عجوبۂ روزگار ہیں! سارڈیسٹ نے کہا، سوئٹزرلینڈ چلیں گے، پیرس سے ہوتے ہوئے۔ ہم نے کہا، ہمیں ایک بات پر اتفاق کرنا چاہئے۔ ورنہ یہ حسین موضوع ختم کر دیا جائے۔ ہماری یہ دھمکی سُن کر سارڈیسٹ سوچ میں ڈُوب گیا۔ بیلا صرف مُسکرا رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد بہت ہی رازدارانہ انداز میں سارڈیسٹ کہنے لگا۔ ہم دو دو میں بٹ کر شطرنج کھیلیں گے، جیتنے والے آپس میں کھیلیں گے، اور پھر ... کل اپنا فیصلہ دے گا جو آخری ہوگا۔ ہم سب متّفق ہو گئے

(اور سب حیران تھے) شطرنج کی بساط بچھا دی گئی اور کھیل شروع ہوگیا سارڈیسیٹ اور بیلا کی ایک ٹولی تھی اور دوسری ہم پر اور فرڈی پر مشتمل تھی۔ بیلا نے فرڈی کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اُسے خوف تھا کہ وہ اپنے نام کی مناسبت سے ناجائز فائدہ اُٹھائے گا۔ سارڈیسیٹ بیلا سے بازی لے گیا اور اُس نے کہا کہ وہ کسی بھی عورت سے کسی بھی گیم میں جیت سکتا ہے —— سوائے بحث کے! سارڈیسیٹ نے شام کی چائے پینے کے لئے کہا مگر بیلا نے بتایا کہ ڈنر کا وقت بھی گزر چکا ہے۔ آخری بازی سارڈیسیٹ اور ہمارے درمیان ہوئی سارڈیسیٹ بہت جم کر کھیلا۔ بازی خاصی طویل ہوگئی تھی۔ بالآخر ہم جیت گئے اور کل ہمارا فیصلہ سب کو تسلیم کرنا تھا۔ شطرنج کی بساط سمیٹ لی گئی تو پتہ چلا کہ رات ڈھل چکی ہے اور سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا ہے۔ فرڈی نے کہا دوسرا دن شروع ہو چکا ہے اِس لئے ابھی فیصلہ سے بھی آگاہ کر دیا جائے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اپنا فیصلہ ماننے کے لئے سب کو مجبور کریں۔ اِس لئے ہم نے یہ تجویز کیا کہ بیلٹ سسٹم کر لیا جائے۔ ہم چاروں ایک سے کاغذ کے ٹکڑوں پر مجوزہ مُلک کا نام لکھ کر رکھ دیں۔ کوئی ایک ٹکڑا اُٹھایا جائے گا اور وہی ہماری منزلِ مقصود ہوگی! ایسا ہی کیا گیا۔ ایک پرچی کھولی گئی مگر وہ سادہ تھی۔ اِس پر کچھ بھی تحریر نہ تھا (کیونکہ ہم نے اپنی پرچی سادہ رکھ دی تھی) ایک کے بعد ایک ساری پرچیاں کھولی گئیں۔ اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا (کیونکہ ساری پرچیاں سادہ نکلیں)

اور ایک دن وہ مُبارک گھڑی بھی آگئی کہ ہم سب سفر کے لئے رختِ سفر باندھ رہے تھے۔ قاہرہ تک ہمیں By Road جانا تھا اور پھر گاڑی قاہرہ میں کمپنی کے آفس میں بند کر دی جاتی اور وہاں سے بائی ایر سوئٹزرلینڈ —— ایک حسین شام کو ہم چاروں فرڈی کی فورڈ کنٹری سیڈان میں عازمِ قاہرہ ہو رہے تھے۔ سفر بہت خوشگوار ثابت ہو رہا تھا۔ خصوصاً فرڈی کے لطیفے اور سارڈیسیٹ کی کبھی کبھار کوئی بات، اُس کے ذاتی فلسفے کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ ہم باری باری گاڑی چلا رہے تھے اور اِس طرح سب کو آرام کے لئے وقت مِل جاتا۔ دوسرے دن صبح ایک قہوہ خانہ میں ناشتہ کیا گیا۔ چائے سے ساری رات کی کسلمندی دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک مقامی شخص جو اچھے بھلے کپڑوں میں ملبوس تھا، ہمارے نزدیک آیا اور حلق سے نکلتی ہوئی عربی میں السّلام علیکم داغ کر معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ ہم سب نے اُس سے ہاتھ مِلائے اور پھر وہ ہماری پیشکش کا انتظار کئے بغیر ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ فرڈی نے چائے پیش کی جو قبول کر لی گئی۔ ایک طویل گھونٹ بھر کر ہم سے عام فہم عربی میں مائلِ گفتگو ہوا اور ہم جلد ہی جان گئے کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے۔ سارڈیسیٹ نے موقع کی نزاکت کے مطابق اُسے دو سکّے فی الفور ادا کئے اور نووارد سے بے تعلق ہو کر ہماری طرف متوجہ ہوگیا۔ اُسی لمحہ ایک اور معزز قسم کے مقامی تشریف لائے۔ سلام کرنے کے بعد مزید گفتگو کرنے کے لئے گلا صاف کرنے لگے۔ فرڈی نے اِنھیں چائے پیش نہیں کی اور موصوف جلد ہی پہلے گداگر سے بھیک مانگ بیٹھے۔ پہلے گداگر صاحب جو بہت بے نیازی سے چائے پی رہے تھے اُنھوں نے جیب سے چار عدد سکّے نکال کر دوسرے گداگر کو دیئے اور نفع نقصان کی پروا کئے بغیر ہمیں فی امان اللہ کہا اور چل دیئے۔ سفر پھر جاری ہوگیا۔ اندازہ کے مطابق ہمیں شام تک قاہرہ پہنچ جانا چاہئے تھا۔ فرڈی کی زندہ دِلی نے ہمیں وقت کا احساس نہ ہونے دیا۔ سارڈیسیٹ گاڑی چلا رہا تھا۔ فرڈی نے یکلخت ہماری توجہ سڑک کے ایک طرف کھڑے ٹرک کی طرف مبذول کراتے ہوئے

- جنگ دو طرح سے ہوتی ہے ایک تشدّد سے دوسری عدم تشدّد سے۔ تشدّد کی جنگ میں فتح و شکست دونوں کا احتمال ہے لیکن عدم تشدّد کی جنگ میں شکست کا کوئی امکان نہیں۔ (بادشاہ خان)
- تشدّد کا راستہ اختیار کرنے سے دِلوں میں نفرت، کینہ، عداوت، بغض اور شرارت پیدا ہوتی ہے۔ (بادشاہ خان)
- عدم تشدّد قوموں میں محبت پیدا کرتا ہے۔ (بادشاہ خان)
- محبت۔ اور اِس سے پیدا ہونے والی مستحکم ثابت قدمی ستیہ گرہ کی تلوار ہے۔ (مہاتما گاندھی)
- کمزور انسان عدم تشدّد کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (بادشاہ خان)

بتایا کہ ٹرک کے نیچے دو آدمی آئے ہوئے ہیں چٹائی بچھا کر۔ دوپہر کو ہم نے ایک گاؤں میں آرام کیا اور حسبِ پروگرام شام کو نیل کی حسین وادی میں قدرت کی حُسن کاری کی داد دے رہے تھے۔ نیل کے کنارے ہلتون ہوٹل میں قیام کیا گیا اور غُسل کرنے کے بعد "گاڑی" بیچ کر سو گئے۔

قاہرہ آتے ہوئے ایک ہفتہ بیت چُکا تھا اور بقول سارڈیسیٹ کے ابھی تک اُس کی تھکن دُور نہیں ہوئی تھی۔ سارا دن وہ ہوٹل میں لیٹا اُونگھتا رہتا۔ البتہ شام کو مِصر کے بازاروں میں گھوما کرتے۔ فرڈی مہ وشانِ مِصر کے سحر انگیز حُسن اور آرائشِ رُخ و گیسو کی دل بھر کر داد دیتا کبھی کبھی کسی ریستوران میں بیٹھے ہوئے یہ داد بہت بیتابی سے دی جاتی۔ ہم اُس شہرِ رنگ و بُو سے بہت متاثر ہوتے۔ بیلا نے دو ایک بار مُنہ بسورا اور جواب میں اُسے فرڈی کے خاص گیت کی

گنگناہٹ سُننی پڑی، اور جب سارٹریسٹ کی تکان دُور ہوگئی تو طے پایا کہ اہرامِ مصر دیکھے جائیں۔ قاہرہ میں دیکھنے کو بہت کچھ ہے۔ ایک عرصہ چاہیئے اُس نادر شہر کی سیر کے لئے اور اِدھر ہماری ایک تہائی رخصت ختم ہو چکی تھی۔ سارا دن اہرامِ مصر دیکھتے رہے۔ ہزاروں برس پہلے کے انسان کی صناعی و فن کاری دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی۔ اہرام کے گِرد و نواح جو کبھی خوفناک کہانیوں اور حیرت انگیز داستانوں کی آماجگاہ تھے، اب تفریحی پارک ہے۔ سیاحوں کی ہر ممکن سہولت کے انتظامات خاطر خواہ ہیں۔ شام کو ہم ایک کھُلے ریستوران میں بیٹھے تُرکی قہوہ سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ ریستوران سب سے بڑے احرام کے سامنے ہے۔ اہرام کے ساتھ ہی ابوالہول کا مجسّمہ اُس وقت واقعی خوفناک دِکھائی دیتا جب اُس پر مخفی اور مختلف رنگوں کی روشنیاں ڈالی جاتیں اور پھر اُس اہرام کی ٹیپ کی ہوئی تاریخ جو صیغہ واحد متکلّم میں نشر کی جاتی۔ ہم سحر زدہ سے ایک گوشے میں خاموش بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک فرڈی بیلا سے مخاطب ہوا۔

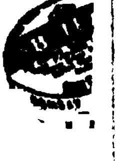
"تمھیں خوف تو نہیں آ رہا؟"

بیلا سے پہلے سارٹریسٹ نے کہا "عورت صرف چھپکلی، چمگادڑ اور کیڑے مکوڑوں سے ڈر سکتی ہے۔" بیلا سِمٹ کر رہ گئی۔ چند لمحوں بعد اُس نے ہماری توجّہ ایک خاتون کی طرف مبذول کرائی، شراب کے نشے سے جس کی خوبصورت آنکھوں میں سُرخ ڈورے مُسکرا رہے تھے۔ وہ بہت نشے میں تھی اور بِلا مقصد اِدھر اُدھر گھُوم رہی تھی ایکدم وہ فرانسیسی زبان میں کچھ بڑبڑائی اور سارٹریسٹ ہم قوم ہونے کے خیال سے اُسے ہماری میز پر گھسیٹ لایا مِس پریزا جو دشتِ سیاحت کی خاک چھانے ہوئے تھی، اپنی معلومات اور تجربے کے بل بُوتے سارٹریسٹ سے خوب بحث کر رہی تھی۔ اُس وقت وہ بالکل ہوش میں دِکھائی دے رہی تھی۔ سارٹریسٹ اُسے باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مِس پریزا کی نسبت زیادہ تجربہ کار ہے۔ گفتگو طول کھینچتی گئی اور پھر یکایک سارٹریسٹ کو اِس طویل گفتگو سے اپنی مطلّقہ بیوی یاد آ گئی اور اُس کا پارہ سب سے بڑے اہرام کی بلندی تک جا پہنچا! وہ خشمگیں سا یوں گویا ہوا "مِس پریزا! اب آپ قطعاً خاموش ہو جائیں۔ مجھے قائل کرنے کی ضرورت نہیں —— اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ جتنی آپ کی عمر ہے اُتنی میں چھٹیاں لے چکا ہوں" اِس کے بعد اُس نے مِس پریزا کو یوں نظر انداز کر دیا جیسے وہ کبھی وہاں تھی ہی نہیں۔ سارٹریسٹ بے تعلّق سا سِگار پیتا اور خلاء میں گھُورتا رہا۔ مِس پریزا اُنگلشتی باندھے سگار کو گھُورتی رہی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا، وہ کوئی اہم مسئلہ حل کر رہی ہے۔ پھر اچانک کرسی سے اُٹھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی "اِس (سِگار کی طرف انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے) کے ایک سرے پر آگ ہے اور دوسرے سرے پر بیوقوف!" اور اُس کے بعد یوں واپس چلی گئی کہ دُنیا میں محض یہ پیغام دینے آئی تھی۔ سارٹریسٹ نے کہا اُس نے اِس بات کا ذرا بھی نوٹس نہیں لیا۔

ہم برابر پانچ دن اہرام دیکھنے جاتے رہے۔ اُس کے بعد تین دن تک تکان دُور کرتے رہے (یہ ہمارا متفقہ فیصلہ تھا) ایک دن میوزیم دیکھنے کی ٹھانی۔ اُسے دیکھنے کے لئے بھی ایک عرصہ درکار تھا۔ اِدھر ہمارے پاس رخصت کے دو ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ مِصر کی سیاحت سے ذوق و نِگاہ کے ابھی کام و دہن تشنہ تھے۔ ہم میوزیم صرف ایک دن گئے دوسرے دن نہ جا سکے کیونکہ سارٹریسٹ نے بتایا کہ ایک عورت کی ممی کا چہرہ اُس کی مطلّقہ بیوی سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا تھا۔

فرڈی کو شیپرڈ کلب بہت پسند آیا۔ بیلا عربِ نازنینوں کا رقص بہت توجّہ سے دیکھتی۔ رقص! جس میں کوکھوں اور شانوں کی بے تحاشا جنبش تھی۔ بیلا کا خیال تھا یہ ایکسرسائز عورت کے لئے موزوں ہے۔ رقص صرف دخترانِ ہند پیش کر سکتی ہیں جن کی آنکھوں، ہاتھوں اور چہرے کے تاثّرات سے دورانِ رقص پُوری کہانی جنم لے کے ختم ہو جاتی ہے۔

سابق شاہِ فاروق کا محل جواب میوزیم کا ایک حصہ ہے، اپنے اندر پُورا شہر بسائے ہوئے تھا۔ انقلاب کے وقت جو چیز جس حالت میں تھی آج بھی



اُسی طرح ہے۔ حمام میں تولیہ، صابن، میکلینز کا ٹوتھ پیسٹ، سونے کے کمرے میں وہی بستر، چادر، تکیہ —— ہر چیز اُسی حالت میں پڑی ہے تاکہ آنے والوں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔

اُسی شام کو ہوٹل میں بیٹھے ہوئے سارڈیسٹ گفتگو کے لئے فرڈی کے اشارۂ ابرو پر تخلیہ میں گیا اور واپسی پر انکشاف ہوا کہ اب ہر شخص ایک ہفتہ کے لئے تنہا سیر و تفریح کے لئے فری ہے! بیلا نے اُسی لمحہ اعلان کیا کہ یہ فرڈی کا فراڈ ہے! مگر فراڈ ہو کر رہا۔ فرڈی نے تنہا سیر و تفریح سے خوب فائدہ اُٹھایا اور اپنی تنہائی کو عرب نازنینوں سے آباد کیا۔ البتہ سارڈیسٹ نے کہا کہ وہ کسی ایک —— عورت کا متلاشی تھا جو ایک چوتھائی گھنٹہ خاموش رہ سکے۔ اِسی جستجو میں ہماری تین چوتھائی رخصت ختم ہو چکی تھی۔ سوئٹزرلینڈ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بیلا نے ہمیں موردِ الزام ٹھہرایا۔ بالآخر ہم جو کسی بات پر متفق کم ہی ہوتے تھے۔ اِس بات پر متفق ہو گئے کہ اب واپس چلنا چاہیے۔

فرڈی روبیرا کی یادیں، سارڈیسٹ پیرس کی رنگینیوں اور بیلا انڈیا کے عُسرت آمیز نظاروں کی حسرتیں لئے سامان سمیٹنے میں مصروف تھے اور ہم دل ہی دل میں اگلے برس کے لئے سوئٹزرلینڈ کا پروگرام بنا رہے تھے۔ واپسی کے احساس سے طبیعتیں مکدر تھیں۔ اِس لئے نہیں کہ ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے بلکہ اِس لئے کہ واپسی پر پھر وہی صحرا کی خشک اور خاموش زندگی ہوگی اور وہی شب و روز کا تسلسل!

گزرے دِنوں کی باتیں دُہراتے اور آئندہ برس کے پروگرام بناتے ہوئے واپسی کا سفر جاری تھا۔ سفر کی ذہنی کلفت دُور کرنے کو فرڈی کی پُر لطف باتیں غنیمت تھیں۔ وہ باری باری سب سے مخاطب ہوتا۔ خود ہنستا اور ہمیں ہنسانے کی کوشش کرتا۔ کمپنی سے کوئی ایک دن کی مسافت باقی تھی کہ فرڈی اور سارڈیسٹ میں بحث شروع ہو گئی۔ فرڈی نے ڈوبتے سورج کے منظر پر، خدا کی حسین تخلیق پر تبصرہ کر کے داد لینی چاہی۔ مگر سارڈیسٹ نے خدا کے وجود کو ماننے سے نہایت خاموشی کے ساتھ انکار کر دیا۔ سفر جاری رہا اور دونوں کے درمیان بحث طول کھینچتی گئی۔ فرڈی نے سینکڑوں فلسفیوں کی مثالوں اور اُن کے اقوال سے خدا کے وجود کو ثابت کرنا چاہا۔ اُس نے ہر جاندار کی تخلیق اور اُس کے ارتقاء کی مثالیں دیں۔ مگر سارڈیسٹ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ بحث ہوتی رہی اور ایک صبح پو پھٹتے ہی ہم اپنے فلیٹ میں پہنچ چکے تھے۔ سفر کی تکان سے ہم سوئے تو ڈوبتے سورج کو بمشکل دیکھ سکے۔ غسل کیا۔ طبیعت ذرا ہلکی ہوئی تو فرڈی کی طرف چل دئے۔ بیلا بھی موجود تھی۔

مگر اُس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ کیونکہ سارڈیسٹ اور فرڈی اِسی بحث میں مشغول تھے۔ گئی رات تک مباحثہ جاری رہا۔ ہم اور بیلا اِس سے تنگ آ چکے تھے۔ اِس لئے واپس ہو لئے اور وہ دونوں اپنے اپنے دلائل سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

دوسری صبح کمپنی میں اپنے اپنے فرائض پر پہنچ گئے۔ سارا دن کام میں جی نہ لگا۔ کسی کسی طرح وقت گزارا اور شام کو مجوزہ پروگرام کے تحت سارڈیسٹ کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ بیلا موجود تھی۔ فرڈی بھی آ گیا۔ مگر ہم تینوں خاموش کھڑے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ سارڈیسٹ اپنا سامان سمیٹ چکا تھا۔ اُس نے چوبیس گھنٹے کے نوٹس پر استعفٰی دے دیا تھا۔ وہ گاڑی کا منتظر تھا۔ گاڑی آئی۔ سامان رکھا گیا اور ہم فلیٹ سے باہر نکل آئے۔ ہم تینوں میں سے کوئی بھی سارڈیسٹ کے اِس فیصلے کی وجہ نہ جان پایا تھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ وہ شام ہمیں بہت مغموم نظر آئی۔ بیلا کے استفسار پر سارڈیسٹ نے بتایا کہ گذشتہ دنوں کی بحث کے بعد وہ صدقِ دل سے خدا کے وجود کا قائل ہو گیا ہے اور اب وہ اپنی مطلقہ بیوی کو ڈھونڈ نکالنے کے بعد پیرس کے مضافات میں باقیماندہ زندگی سکون سے گزار دے گا —— اُس نے سگار کا گہرا کش لگایا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ سب کو ٹاٹا کیا —— اور گاڑی چلی گئی۔ ہمیشہ کا ہنسوڑ اور خوش باش فرڈی رنج و غم کا پیکر تھا —— چند ثانیے ہم ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر کھڑے رہے۔ پھر فرڈی نے نہایت پُراعتماد لہجے میں کہا وہ اِس غیر متوقع سانحے سے خدا کے وجود کا دل سے منکر ہو گیا ہے! یہ کہہ کر وہ صحرا کی طرف چل دیا۔ ہم اور بیلا دُور سے اُس کا گیت سُن رہے تھے۔

"روبیرا کے کنارے . . .

میں تنہا کھڑی ہوں —— سب مجھے چھوڑ گئے

مگر بیتاب طوفانی لہریں مجھے آج بھی سلام بھیجتی ہیں"

بیلا نے مغموم مُسکراہٹ سے ساکن ماحول میں ارتعاش پیدا کیا اور پھر ہم سے مخاطب ہوئی "دو دردیش بچھڑ گئے!"

"ہم گھٹ کر ڈیڑھ رہ گئے!" ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے ہم نے کہا۔ بیلا نے عجیب نظروں سے ہمیں دیکھا اور کہا "کاش ہم ڈیڑھ سے گھٹ کر ایک ہو جائیں!"

اور صحرا کی نیم گرم ریت پر ہم دونوں کا ایک سایہ پڑ رہا تھا!!

"بیسویں صدی کو ہم نے کبھی اشتہاروں کا پلندہ نہیں بنایا۔ اِس میں ۲۰۴ اور لوگس قسم کے وہ اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے جن کا مقصد خریداروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے۔ — منیجر


لک چھلانگ اور لگاؤ
پیارا گلوکو بسکٹ پاؤ
پھر ہم دونوں مِلکر کھائیں
کھیلیں کودیں، دھوم مچائیں
پارلے گلوکو
بسکٹ
PARLE
Gluco
★ بڑھیا ذائقہ
★ انوکھی لذت
★ کرکرے ہمیشہ تازہ
★ بے مثال صحت و قوت
اِسی لئے تو پارلے گلوکو، بھارت کے سب سے زیادہ بکنے والے بسکٹ ہیں!

ل

نیر قریشی گنگوہی

ے خواہیں کانٹوں سے ہمکنار رہا
ن میں چمن کا وفا شعار رہا

مجھے نصیب ازل سے یہ افتخار رہا
کہ میں حریم محبت کا راز دار رہا

شعار تھا، یہ دل وفا شعار رہا
ب کھا کے بھی اُلفت کا پاسدار رہا

گذار دی یونہی رندوں نے عمر اے ساقی
دلوں میں درد، نگاہوں میں انتظار رہا

ز رگیں ہیں کچھ ایسی بھی ساعتیں مجھ پہ
زے جلو میں مجھے تیرا انتظار رہا

یہ رہ گذار ہے، منزل نہیں، یہاں نیر
کسے قرار رہے گا، کسے قرار رہا

غزل

محشر منظری مصطفےٰ آبادی

ہم سمجھے کہ حدِ دار و رسن سے گذر گئے
کتنے ہی ورنہ راہِ محبت میں مر گئے

آخر طلسمِ عیش و طرب ٹوٹ ہی گیا
جتنے خوشی کے جام تھے اشکوں سے بھر گئے

جلووں کا کیا گلہ کہ وفورِ طلب میں ہم
ذوقِ نظر کو آپ ہی بدنام کر گئے

ہم کو کچھ اپنے حالِ پریشاں کا غم نہیں
زلفِ نگارِ وقت کے خم تو سنور گئے

جلووں کی خود نمائی پہ آیا نہ کوئی حرف
الزام سارے اہلِ نظر ہی کے سر گئے

کیوں ٹھوکریں کھائیں مو سکتے، راہِ حیات میں
ایسے کئی مقام نظر سے گذر گئے

غزل

ثمر بسوانی بی اے ایل ایل بی

شاذ ہی اہلِ کرم ہوتے ہیں
ورنہ پتھر کے صنم ہوتے ہیں

ساتھ رہتا ہے تصور اُن کا
کبھی تنہا نہیں ہم ہوتے ہیں

جاذب چشمِ ہنر ہوتا ہے
عیب کیا چاند میں کم ہوتے ہیں

بندگی دل سے ہوا کرتی ہے
سر تو ایواں میں بھی خم ہوتے ہیں

ویسے پتھر کے سوا کچھ بھی نہیں
جب تراشو تو صنم ہوتے ہیں

حُسنِ افکار ثمر کیا کہیئے
اِس طرح اہلِ قلم ہوتے ہیں


اِک چھلانگ اور لگاؤ
پیارا گلوکو بسکٹ پاؤ
پھر ہم دونوں مِلکر کھائیں
کھیلیں کودیں، دھوم مچائیں
پارلے
گلوکو
بسکٹ
PARLE
Gluco
★ بڑھیا ذائقہ
★ انوکھی لذت
★ کرکرے، ہمیشہ تازہ
★ بے مثال
صحت و قوت
اِسی لئے تو پارلے گلوکو، بھارت کے سب سے زیادہ بکنے والے بسکٹ ہیں!

غزل

نیّر قریشی گنگوہی

گلوں سے خواہ میں کانٹوں سے ہمکنار رہا
مگر چمن میں چمن کا وفا شعار رہا

مجھے نصیب ازل سے یہ افتخار رہا
کہ میں حریمِ محبت کا رازدار رہا

وفا شعار تھا، یہ دل وفا شعار رہا
فریب کھا کے بھی اُلفت کا پاسدار رہا

گذار دی یونہی رِندوں نے عمر اے ساقی
دلوں میں درد، نگاہوں میں انتظار رہا

گذر گئیں ہیں کچھ ایسی بھی ساعتیں مجھ پہ
ترے جلو میں مجھے تیرا انتظار رہا

یہ رہگذار ہے، منزل نہیں، یہاں نیّر
کسے قرار رہے گا، کسے قرار رہا

غزل

محشر منظری مصطفےٰ آبادی

ہم تھے کہ حدِ دار و رسن سے گذر گئے
کتنے ہی ورنہ راہِ محبت میں مر گئے

آخر طلسمِ عیش و طرب ٹوٹ ہی گیا
جتنے خوشی کے جام تھے اشکوں سے بھر گئے

جلووں کا کیا گلہ کہ وفورِ طلب میں ہم
ذوقِ نظر کو آپ ہی بدنام کر گئے

ہم کو کچھ اپنے حالِ پریشاں کا غم نہیں
زلفِ نگارِ وقت کے خم تو سنور گئے

جلووں کی خود نمائی پہ آیا نہ کوئی حرف
الزام سارے اہلِ نظر ہی کے سر گئے

کیوں ٹھوکریں کھائیں ہو سکے، راہِ حیات میں
ایسے کئی مقام نظر سے گذر گئے

غزل

ثمر بسوانی بی اے ایل ایل بی

شاذ ہی اہلِ کرم ہوتے ہیں
ورنہ پتّھر کے صنم ہوتے ہیں

ساتھ رہتا ہے تصوّر اُن کا
کبھی تنہا نہیں ہم ہوتے ہیں

جاذبِ چشم ہُنر ہوتا ہے
عیب کیا چاند میں کم ہوتے ہیں

بندگی دل سے ہوا کرتی ہے
سر تو ایواں میں بھی خم ہوتے ہیں

ویسے پتّھر کے سوا کچھ بھی نہیں
جب ترا شو تو صنم ہوتے ہیں

حُسنِ افکار ثمر کیا کہیئے
اِس طرح اہلِ قلم ہوتے ہیں

دامن کی آگ

سیّد وزیر حسین

مکان نمبر ۳۲-۲-۱۷۔ رین بازار حیدرآباد نمبر ۲۳

محترمی خوشتر گرامی صاحب! تسلیم

... افسانہ نمبر پڑھ کر تو میں نے آپ کی محنت اور نظرِ انتخاب کو بے حد سراہا ——— "دامن کی آگ" آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کی بلند نگاہ اور قارئین سے سندِ قبولیت حاصل کر سکے گا۔ افسانے کے بارے میں صرف اِتنا ہی کہنا ہے کہ یہ ایک عام افغانی کی المیہ داستان ہے ...

آپ کا ——— سیّد وزیر حسین

★

وردی خان کو اِن تمام تیاریوں پر کوئی حیرت نہ تھی جو بہت زور و شور سے جاری تھیں۔ اُسے آئے دن اِن تقریبات کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ ایک منسٹر کے وسیع اور خوشنما بنگلے کا چوکیدار ہے لیکن اُسے یہ پتہ نہ تھا کہ منسٹر کا کام یہی ہے کہ وہ خود دعوتیں کھاتا پھرے اور اپنے شہر میں آنے والی معزز اور اہم غیر ملکی شخصیتوں کی دعوتیں کرتا رہے، کیونکہ پہلا شہری ہونے کی وجہ سے غالباً اُس پر یہی ایک فرض واجب تھا۔ آج وردی خان تمام تیاریوں کو ایسے دیکھ رہا جیسے اُس نے کبھی دیکھا ہی نہ ہو خود منسٹر اِن انتظامات میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔

اِس بنگلے میں وردی خان کو چوکیداری کرتے ہوئے پانچ برس بیت چکے تھے۔ اِس مختصر سے عرصے میں وہ یہاں کی ساری چیزوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اُسے چند دن پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ افغانستان کے سفیرِ محترم آج اِس بنگلے میں آنے والے ہیں۔ اُسے یہ اطلاع سُن کر بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ وہ خود بھی افغانی تھا۔ اپنے ڈیل ڈول کو دیکھ کر اُسے یاد آجاتا کہ وہ بھی کبھی کابل میں رہتا تھا لیکن آج گردشِ دوراں سے اُلجھتا ہوا ہندوستان کی سرزمین پر اپنی زندگی کے ماہ و سال گزار رہا ہے۔

وردی خان کی ہزاروں یادیں کابل سے وابستہ تھیں۔ اُس کے ذہن کے گوشہ گوشہ میں کابل کی ایک ایک یاد پنہاں تھی۔ کبھی کبھی کوئی یاد ذہن کے نہاں خانے سے نکل کر نگاہوں میں گھومنے لگتی اور وہ تصوّر میں اپنی محبوبہ خدیجہ خانم کو دیکھتا اور کبھی اپنے بھائی فرہادی خان کو دیکھتا جو اُس سے کہتا نظر آتا۔ کیا تم پاگل تھے کہ بلاوجہ وطن چھوڑ گئے۔ مجھے دیکھو ——— آج بھی اپنے وطن کابل سے لپٹا ہوا ہوں ——— اور خوش ہوں۔"

وردی خان واقعی مفلس ہو چکا تھا اور اب ضعف نے اُس کے بدن کو سُست بنا دیا تھا۔ ذہنی لیاقت کبھی تھی ہی نہیں، اگر تھی تو بڑھتی ہوئی عمر اور فطری مزاج کے کھُردرے پن کے تلے روندی جا چکی تھی۔ اب جو کچھ بھی تھا وہ اُس کی یادوں کا سرمایہ ہی تھا۔ کبھی اُس کے سُرخ و سپید چہرے پر مُسکراہٹ چھا جاتی اور جھُریاں سُکڑنے سمٹنے لگ جاتیں اور کبھی اِسی چہرے پر درد کی لہریں بیدار ہو کر آنکھوں سے رواں ہونے والے اشکوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتیں۔ اِس طرح کے جذبات اُسی وقت پیدا ہوتے جب وہ نسوار چڑھا کر افیون کے نشے میں بھُولی بسری داستانوں کو یاد کرنے لگتا۔ بُوڑھا افغان اپنے مزاج کی درشتی کے باوجود اِس خواہش سے ماورا نہ تھا کہ اُسے ماضی نہ تڑپائے۔

دریائے کابل کا وہ حسین ساحل جہاں اُس کا بچپن گزرا ہے۔ کابل شہر کی وہ سڑکیں جہاں وہ تیز بھاگنے کی مشق کیا کرتا تھا۔ وہ باغ، وہ چمن، وہ ہوٹل جہاں وہ متانت اور سنجیدگی سے جوانی کے دنوں میں تفریح کیا کرتا تھا۔ وہ اُس کا گھر، اپنے ساتھی سب نہ جانے کہاں رہ گئے۔ اب تو اُن کی یاد ہی آجاتی ہے، اُسے ہمیشہ کابل یاد آتا تھا۔

اُس کی ماں نے کن تمنّاؤں سے اُس کی تربیت کی تھی۔ باپ نے اپنے بیٹے وردی خان کو کیا بنانا چاہا تھا لیکن وہ کیا بن گیا ——— ایک چوکیدار! جس پر دولت مند اعتماد کرتے ہیں۔ وہ جب تک ہے رات سکون سے گزرے گی۔ رات بسر کرنے میں کسی چور، اُچکے یا

کسی فضول ملاقاتی سے خلل نہ پڑ سکے گا۔ اِس کے علاوہ چوکیدار کی وجہ سے اُن کی امارت کا مظاہرہ بھی ہوتا رہے گا۔

کاش! وہ اپنے وطن ہی میں چوکیدار بن جاتا اور اِس سے بھی بدتر زندگی دہاں گزارنی پڑتی —— سکون تو میسّر رہتا۔ اپنے گھر والوں کے درمیان اسے وہ خلش تو نہ ہوتی جو پرائے مُلک میں ہو رہی ہے۔ افسوس خود سری سے وہ اِس مقام پر آ گیا جہاں سے واپس جانے کی بھی سکت نہیں۔

ناداری و مفلسی نے اُسے وطن جانے کی اجازت ہی نہ دی ورنہ وہ کبھی کا کابل لوٹ گیا ہوتا اور اب تو وہ جانے کے بارے میں سوچ کر بھی جھلّا جاتا اب وہ کِس مُنہ سے واپس جائے گا۔ اِسی شرمندگی سے اُس نے پہلے بھی کئی مواقع کھوئے تھے۔ اِتنے برسوں کے بعد اِس کے بھائی بہن اور خدیجہ کو اِس میں کیا دلچسپی رہی ہو گی۔ شاید اِس حال سے اِس کی واپسی بھی اُنھیں ناگوار گزرے۔

"افسوس" وہ پشتو میں بڑبڑایا اور پھر چونک کر اپنے مالک کو دیکھنے لگا جو اُسے اشارے سے بُلا رہا تھا۔ وردی خان اپنی پگڑی دُرست کرتا ہوا اسٹول سے اُٹھ گیا "کیا صاب ——" اُس نے قریب جا کر پُوچھا۔

"دیکھو خان —— آج افغانستان کے سفیر آ رہے ہیں اور ٹھیک پانچ بجے سے مہمان آنے لگیں گے۔ تم پھاٹک کھُلا رکھنا۔ اِس کا خاص خیال رکھنا کہ اِدھر اُدھر کے لوگ اندر نہ آنے پائیں —— سمجھ گئے نا؟"

"خو صاب —— ام ایسا ہی کرے گا!" اُس نے ادب سے جواب دیا۔

"اپنے مُلک کے سفیر کی آمد پر تم بھی بہت خوش معلوم ہو رہے ہو" میر مُسکرایا۔

"سچ بولتا صاب —— ام کو بی اچھا خوشی ہے" وردی خان بھی جواباً مُسکرایا اور پھر ایک بار اپنے لباس کا جائزہ لینے لگا۔ آج اُس نے اپنا مخصوص لباس پہن رکھا تھا جسے اُس کے ہم قوم پٹھان عموماً پہنتے تھے۔ سر پر پگڑی، جسم پر لمبا کُرتہ اور گھیرے دار شلوار، اوپر سے مخملی واسکٹ اور پاؤں میں چمڑے کا سینڈل پہن کر وہ بہت مسرّت سے اپنے مُلک کے سفیر کا استقبال کرنے کو تیار تھا۔

اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے اُسے پھر کابل یاد آ گیا۔ وہ اپنے ذہن کو ٹٹولنے لگا۔ کئی کردار اُس کے تصوّر میں ناچنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ ماضی کی بھُول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ وردی خان، عسکری خان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ کابل کے اُس محلّے میں جہاں متوسط طبقہ کے لوگ بستے تھے اُس کا نام بچپن میں شریر لڑکے کی حیثیت سے لیا جاتا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ جوان ہوا لوگ اُسے بدمعاش کے نام سے یاد کرنے لگے۔

لیکن وردی خان بدمعاش نہ تھا۔ اُس نے کسی کو دھوکا دیا نہ کبھی کسی کو بلا وجہ نقصان پہنچایا۔ اِس کا کیا علاج تھا کہ لوگ اُس کی رُومانی طبیعت اور لاُابالی پن کو بدمعاشی سمجھ بیٹھے تھے۔ اسکول سے بار بار نام خارج ہونے کے باوجود عسکا اسکول میں شریک کراتا رہا۔ آخر کب تک ——؟ اُس نے تھک ہار کے وہ پیچھا ہی چھوڑ دیا اور دوسرے بچوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اُس کا دوسرا بیٹا پُوری دلچسپی سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

وردی خان کو تعلیم سے زیادہ سیر و تفریح سے دلچسپی تھی اور وہ وقت خدیجہ خانم سے ملنے میں گزار دیتا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ ایک ہی میں پروان چڑھے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے خوب واقف تھے، اِس طرح محبت بڑھتی گئی۔ شباب میں موسم بہت خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک میں باغ کے ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے وردی خان نے خدیجہ سے اپنی والہانہ محبت اظہار کیا اور اُس کے حُسن کی تعریف کرتے ہوئے اُس نے یہ شعر پڑھا ؎

ندی کل دستا دمخ میغی خوشرنگ
کل جلوہ کا پہ یوہ رنگ تہ پہ سل رنگ

(تیرے رخسار کی طرح کوئی گُلاب نہیں۔ گُلاب تو یک رنگ ہوتا ہے تُو تو صد رنگ۔)

یہ سُن کر خدیجہ شرما گئی۔ پھر جب بھی وردی خان کو موقع ملا اُسے پشتو سُنا سُنا کر اُس کی محبت کا دم بھرتا رہا۔ خدیجہ نے بھی اپنی محبت کا یقین دلاتے ہو

کہا تھا وہ بھی اِس سے شدید محبت کرتی ہے اور ہمیشہ اِسی کی رہے گی اور اِس کے نام پر جیے گی!

دن گزرنے کے لئے ہوتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ عسکری خان کے مرتے ہی اُسے کابل میں سانس لینا بھی دشوار محسوس ہوا۔ اُسے اپنے وطن سے وحشت ہونے لگی۔ کچھ دوستوں کا اصرار تھا وہ اُن کے ساتھ کراچی چلے۔ وہ اپنی ماں اور خدیجہ کی مخالفت کے باوجود کابل سے روانہ ہوگیا۔ اُسے آج بھی ماں کے چیخنے کی آواز آرہی تھی "جار وتل جار وتل —— بھیرتہ راتیل!" (واپس آؤ واپس آؤ —— پشتو) لیکن وہ کیسے واپس ہو جاتا جب کہ اُس کی قسمت میں کسی اور مُلک کا آب و دانہ لکھا تھا۔

کراچی پہنچ کر اُس کے دوست تو اِدھر اُدھر نکل گئے اور وہ تنہا اپنے بل پر آگے بڑھنے لگا۔ اُس نے وہاں کئی تجارتیں کیں لیکن ہر بار خسارہ ہی ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کھانا بھی مشکل سے ملنے لگا۔ اُس نے محنت مزدوری کی اور کچھ عرصہ تک مصیبتیں جھیل کر دہلی جانے کا ارادہ کیا۔ ایک بار پھر رختِ سفر بندھا اور وہ ہندوستان روانہ ہوگیا۔

یہاں آکر اُسے چین تو مل گیا لیکن روزگار کی فکر نے جلد ہی اُس کے سکون کو چھین لیا۔ کابل سے آئے ہوئے ایک دوست یوسفی نے اُسے سرمایہ دینے کی پیشکش کی لیکن اُس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا "ایمان کا سودا کرنے سے یہی بہتر ہے کہ بھوکا مر جایا جائے"۔ سُود پر روپیہ چلانے کے سوا کسی دوسری تجارت پر کوئی روپیہ دینے کو تیار نہ تھا۔ یوسفی سے اُس کے گھر کی خبریں بھی تفصیل سے معلوم ہوئیں۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں مر چکی ہے، اُس کی بہن صفیہ خانم کی شادی کسی سرکاری افسر سے ہوگئی اور اُس کا بھائی فرہادی خان گریجویشن کرنے کے بعد سرکاری ملازم ہوچکا ہے۔ اِن ساری خبروں سے اُس کا دل پھر بیتاب ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کابل جاکر بھائی بہن سے ملے لیکن زندگی کی دوڑ دھوپ نے اُسے اِتنا موقع بھی نہ دیا کہ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک جاسکے۔

یہاں کئی برس گزر گئے۔ اُس کے بال سفید ہونے لگے۔ لحیم شحیم جسم گھلنے لگا۔ چہرے پر جھرّیاں نمودار ہونے لگیں اور کمر خمیدہ سی ہوگئی۔ وہ عمر کے اِس حصّے میں آچکا تھا جو بڑھاپا کہلاتا ہے۔ پانچ برس پہلے اُس نے چوکیداری کرنا قبول کرلیا اور دن چپ چاپ گزرنے لگے۔ اُسے آج بھی خدیجہ یاد آتی اور وہ دل مسوس کر رہ جاتا! کاش وہ اِس کے ساتھ ہوتی!

رفتہ رفتہ وہ گذشتہ زندگی کے دُھندلکوں سے حال کی روشنی میں نکل آیا۔ مہمانوں کے آنے کا وقت ہوچکا تھا۔ وہ پھاٹک کے سامنے جمع ہونے والے غیر ضروری لوگوں کو ہٹانے لگا۔ کاریں آنے لگیں۔ وردی خان اُنھیں سلام کرکے استقبال کرنے لگا۔ آدھ گھنٹے بعد ایک شاندار کار میں سفیرِ محترم تشریف لائے۔ وہ ایک نفیس ترین سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ ہی اُن کی بیوی بیٹھی ہوئی تھیں جو جدید طرز کے بادامی اسکرٹ میں ملبوس تھیں۔ اِس کار کے پیچھے دوسری کاروں میں چند افغانی آفیسر بھی نظر آرہے تھے۔

وردی خان چاق و چوبند ہوگیا۔ اپنے ہم قوم سفیر کی آمد پر وہ اُس پر اپنے عمل سے اچھے سے اچھا اثر ڈالنا چاہتا تھا۔ کار لہراتی ہوئی پھاٹک میں داخل ہوئی۔ وردی خان نے خالص پٹھانی انداز میں ہز ایکسیلینسی کو سلامی دی، اُنھوں نے بہت مُربیانہ انداز میں اِس کے سلام کا جواب دیا اور اپنی شریکِ حیات کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کار اندر داخل ہوچکی تھی۔ وہ مبہوت سا اُدھر ہی دیکھتا رہا۔

میزبان دولوں کا استقبال کرتا ہوا بچھا جا رہا تھا۔ ہز ایکسیلینسی متانت کے ساتھ کار سے اُترے اور اپنی خانم کے ساتھ مہمانوں کے حلقے میں داخل ہوگئے۔ اُن کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وردی خان نے ایک سرد آہ بھری اور سفیر کے نام اور اُن کی بیوی کے چہرے پر غور کرنے لگا "ہز ایکسیلینسی خان فرہادی!" وہ اپنے بھائی کو پہچان چکا تھا۔ تو اُس کا بھائی سفیر بن چکا ہے اور اب وہ فرہادی خان کے بجائے ہز ایکسیلینسی خان فرہادی ہے۔ وہ سوچتا رہا۔

اُس نے اپنے بڑے بھائی وردی خان کو نہیں پہچانا۔ اِس سے زیادہ تو رنج اِس بات کا ہے کہ خدیجہ اب اُس کے چھوٹے بھائی کی بیوی ہے! قسمت نے اُن دونوں کو اُس سے کِس موڑ پر ملایا! ایک لمحہ میں اُس کی نظر اپنی ساری زندگی کے حالات پر چلی گئی اور وہ دل میں بڑھتے ہوئے درد پر قابو نہ رکھ سکا۔ وردی خان اِسٹول پر گر پڑا۔

ہز ایکسیلینسی کو جب پتہ چلا میزبان کا پٹھان چوکیدار اچانک قلب کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا تو اُنھوں نے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے اُس کا آخری دیدار کیا۔ اُنھوں نے مرنے والے بیچارے وردی خان کا پُرسہ میزبان کو دیا جو اُس کی اچانک موت پر یہ سوچ رہا تھا —— بدبخت کو آج ہی مرنا تھا! اچھی خاصی تقریب پر رنگ میں بھنگ پڑ گیا!!

قارئین کے مسلسل اصرار پر، اُن کی غلط فہمی دُور کرنے کے لئے ہم یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ اِدارہ 'بیسویں صدی' دِلّی کا 'بیسویں صدی' لاہور سے کوئی تعلق نہیں۔ سِوائے اِس کے کہ وہ ہمارے جملہ مضامین بلا حوالہ نقل کرلیتے ہیں اور ہمارے 'تیر و نشتر' اور 'صحت و زندگی' کے مضامین بھی اپنے نام سے شائع کرلیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو مغالطہ میں رکھنے کے لئے ہمارے سرورق کا ہو بہو چربہ بھی چھاپ لیتے ہیں۔ منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶


30 لاکھ
عورتیں
غلط
نہیں ہو سکتیں
پچھلے چار برسوں میں 30 لاکھ عورتوں نے اپنی مرضی سے لوپ لگوائے۔
انہیں معلوم ہے، کہ لوپ موثر ہے ۔ یہ حمل روکنے کا سب سے زیادہ قابل اعتبار طریقہ ہے۔
یہ سادہ ہے۔ لیڈی ڈاکٹر اسے چند ہی منٹوں میں لگا دیتی ہے۔
یہ نکلوایا جا سکتا ہے ۔ جب آپ چاہیں کہ آپ کے دوسرا بچہ ہو، تو آپ لوپ نکلوا سکتی ہیں۔
یہ کارآمد ہے ۔ اگر لوپ آپ کو راس ہے، تو آپ کو کسی اور طریقہ کی ضرورت نہیں۔ لوپ آپ کی جنسی مسرت میں دخل انداز نہیں ہوتا۔
یہ بے ضرر ہے ۔ اس سے کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ تکلیف ہو بھی جائے، تو اسے آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے۔
محتاط مطالعہ اور مشاہدے کے بعد ڈاکٹروں نے رائے دی ہے کہ لوپ عورتوں کے لئے موافق ہے۔ جن عورتوں کو لوپ راس نہیں وہ دوسرے طریقوں سے اپنے بچوں کی پیدائش میں وقفہ رکھ سکتی ہیں۔ وہ بچوں کی تعداد بھی اپنے اختیار میں رکھ سکتی ہیں۔
مزید جانکاری اپنے قریب ترین فیملی پلاننگ سینٹر سے حاصل کریں۔
فیملی پلاننگ سے متعلق مشورہ اور خدمت مفت ہے۔
افواہ کا اعتبار نہ کریں
لیڈی ڈاکٹر کا اعتبار کریں

دلّی کا خط لندن کے نام

خوشتر گرامی

مائی ڈیر لندن!

ابھی ابھی اخبار میں یہ خبر نظر سے گزری ہے کہ آپ کے یہاں صفائی کارکنوں کی ہڑتال کو ایک ہفتہ ہو گیا ہے اور سڑکوں اور گلیوں میں کوڑے کرکٹ اور گلی سڑی خوراک کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔ کوڑے کرکٹ سڑاند اور تعفن کے ساتھ ساتھ چوہوں اور مکھیوں کے بہت بڑے پیمانے پر پھیل جانے کا اندیشہ ہے ——— صفائی کارکنوں کا مطالبہ ہے کہ سماج میں اُن کا مرتبہ بلند کیا جائے۔ انھیں بیس پونڈ (تقریباً چار سو روپے) فی ہفتہ اُجرت دی جائے۔ آپ کے ہاں صفائی کرنے والے، سڑکیں صاف کرنے والے اور چوہے پکڑنے والے بھی ہڑتال پر ہیں۔ اِس خبر کو پڑھنے کے بعد میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں ؎

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

یہ بدعت کہئے یا لعنت مغرب ہی سے میرے دیس میں بھی پہنچی۔ یہ اور بات ہے کہ اب اِس معاملے میں آپ کیا مغرب کے دوسرے دیس بھی میری ہمسری نہیں کر سکتے۔ صفائی کارکنوں کے مطالبات سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ابھی بہت بیک ورڈ ہیں اور میں آپ سے بہت فارورڈ ہوں۔ خود میرے یہاں اور میرے وطن میں آئے دن بہت سی ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں۔ اُجرتوں، مہنگائی الاؤنس اور بونس وغیرہ کے مطالبات تو بہت کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ مطالبہ ہمارے صفائی کرمچاریوں کی طرف سے نہیں ہوتا کہ سماج میں اُن کا مرتبہ بلند کیا جائے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں آزادی سے بھی پہلے گاندھی جی نے اِن لوگوں کو سماج کے دوسرے لوگوں کے برابر درجہ دے دیا تھا اور آزادی کے بعد تو اِسے آئین کا جُزو بنا لیا گیا۔ اِنھیں سماج میں آئینی اور اخلاقی طور پر بلند درجہ مِل گیا مگر اُن کی غربت اور افلاس کے خاتمے کی منزل ابھی بہت دُور ہے۔

بات میں بات پیدا ہوتی ہے ——— ڈیر! ایک تجویز ہے۔ مال کے بدلے مال کی تجارت کی اور اِس کے لئے کسی لائسنس اور پرمٹ کی ضرورت نہ ہوگی نہ کوٹے اور زرِ مبادلہ کی۔ میرے یہاں جن چیزوں کی افراط اور بہتات ہے وہ ہیں خود ساختہ، خود غرض، خود نمائی کرنے والے لیڈر ——— ہڑتالیں، مظاہرے، بند، بھوک ہڑتال، برت، مرن برت، جلسے جلوس، گھیراؤ، پتھراؤ، لاٹھی چارج، آنسو گیس، فائرنگ، گرفتاریاں اور دَل بدلی۔ آپ اِن میں سے اپنی پسند کی چند چیزیں یا تمام بخوشی ہمارے یہاں سے درآمد کر سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں کونے کونے میں یہ چیزیں مِل سکتی ہیں۔ اِن کی درآمد کے لئے ہوائی جہاز، سمندری جہاز جو طریقہ آپ استعمال کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ یہ سب چیزیں آپ کے یہاں پہنچ جائیں تو دیکھئے پھر آپ کے یہاں کونے کونے میں کیسی رونق ہوتی ہے اور اخباروں میں کیسی کیسی سُرخیاں جمائی جاتی ہیں۔ مگر ایک خیال اور رکھنا ہوگا کہ اِن کے استعمال کے لئے اِسی قدر پارٹیوں کی بھی ضرورت ہوگی۔ آپ کے یہاں کا پارلیمانی نظام بھی اِس اعتبار سے پسماندہ ہے کہ پارٹیوں کی افراط نہیں ہے۔ ہمیں تو یہی معلوم ہے کہ آپ کے یہاں لیبر اور کنزرویٹو دو ہی پارٹیاں ہیں اور ان پارٹیوں میں یہ بھی نقص ہے کہ اُن میں لیڈر ایک دوسرے کی ٹانگ نہیں کھینچتے اور نہ آپ کے یہاں ایک پارٹی کے بطن سے دوسری پارٹی پیدا ہوتی ہے اور نہ آپ کے لیڈر دَل بدلی کے فن کے کمالات ——— (جنھیں عرفِ عام میں سیاسی قلابازیاں کہتے ہیں) کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ کو یہ فن سیکھنے کے لئے ایک پارلیمانی وفد یہاں بھیجنا ہوگا۔ اِس کے لئے ہمارے یہاں ہریانہ، پنجاب، مدھیہ پردیش اور بہار میں ٹریننگ کیمپ کھلے ہوئے ہیں۔ ہر کوئی فیض یاب ہو سکتا ہے ؎

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

پچھلے دنوں میری سڑکیں بھی کئی دن یہ نظارہ پیش کرتی رہیں اور میرے سینے پر گندگی کے ڈھیر لگے رہے ——— کیا آپ کے یہاں بھی سوک (Civic) انتظامات پر میری طرح جن سنگھ کا قبضہ ہو گیا ہے جو ایٹمی توانائی سے چلنے والے بجلی کے کارخانوں کے دَور میں بھی دیپک جلاتے پھرتے ہیں ——— اور اسی لئے اُن کی بصیرت و بصارت متاثر ہیں۔

آپ کے یہاں مکھیوں اور چوہوں کے پھیل جانے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے اِس لئے یہ بے محل نہیں معلوم ہوتا کہ ہندوستان کے صوبہ مدھیہ پردیش کا مجرّبہ ما نسخہ آپ کو بتا دوں۔ بیتول کے کلکٹر کو سرکاری کاغذات کی حفاظت کے لئے بلّیوں

ضرورت ہے۔ اُن کا ایک اشتہار اخبارات میں شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بِلّیوں کی خوراک کے لئے تیس روپے ماہوار معاوضہ دیا جائے گا۔ حکومت مدھیہ پردیش سرکاری کاغذات کی حفاظت کے لئے آٹھ بلّیاں مستقل طور پر ملازم رکھتی ہے اور اُن کے ساتھ سرکاری ملازموں جیسا سلوک کیا جاتا ہے اور اُن کی خوراک کے لئے سالانہ بجٹ میں باقاعدہ مد رکھی جاتی ہے۔

ڈیر لندن!

ایک اور دلچسپ بات سُنو۔ میرے پڑوس سے تو یہی اطلاع آئی تھی کہ میرٹھ سے چار میل دُور ایک گاؤں میں ایک لڑکی جسے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ ایک ہفتے بعد قبر سے زندہ سلامت نکل آئی۔ مگر پاکستان میں چھ سال بعد مُردہ زندہ ہوا ہے ——

میرٹھ کی لڑکی کا تو یہ واقعہ ہے کہ سانپ کے کاٹنے کے بعد جب لڑکی مر گئی تو اُسے اُسی دن دفن کر دیا گیا۔ ایک ہفتے بعد لڑکی کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ لڑکی زندہ ہے اور وہ کہہ رہی ہے کہ مجھے قبر سے نکال لو۔

ماں نے خواب کا ذکر اپنے شوہر سے کیا اور اصرار کیا کہ لڑکی کو قبر سے نکالا جائے۔ شوہر نے اہلِ محلّہ کو جمع کیا اور طے ہوا کہ قبر کھود دی جائے۔ چنانچہ قبر کھود دی گئی تو لڑکی واقعی زندہ تھی۔ گو وہ نقاہت سے زرد رُو ہو چکی تھی۔

پاکستان کا واقعہ یہ ہے کہ وہاں ایک چہل سالہ ٹیچر نے کراچی کی عدالت میں درخواست دی کہ اُسے زندہ قرار دیا جائے۔ اُسے محکمۂ تعلیم نے چھ سال پہلے مُردہ قرار دے دیا تھا۔

ٹیچر کے بیان کے مطابق اُس نے اپنے تبادلہ کی درخواست دی تھی جس پر حکم ہوا کہ وہ چھ سال قبل مر چکا ہے اور اُس کا پراویڈینٹ فنڈ اور گریچوٹی اُس کے بیوی بچّوں کو دے دی گئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس عورت کو یہ رقم دی گئی ہے اُسے وہ جانتا تک بھی نہیں۔

پچھلے دنوں میرے یہاں ایک خاتون کو گرفتار کیا گیا ہے جو مردانہ لباس یعنی کوٹ پتلون میں ملبوس میرے بازاروں اور پارکوں میں پھرتی نظر آتی تھی۔ پولیس کو کچھ شبہ ہوا تو اُسے ٹوکا گیا۔ جھوٹ کے پاؤں کہاں ہوتے ہیں۔ مردانگی تمام شُد ہوئی اور کوٹ پتلون کے اندر سے ایک خاتونِ محترم برآمد ہوئیں۔ معلوم نہیں اُس نے کیوں مردوں کا رُوپ دھارن کیا تھا —— کاش وہ نفسیاتی جائزے سے متعلق امریکن اکیڈیمی کے صدر ڈاکٹر ایچ کیلسن کا جائزہ پڑھ چکی ہوتی، جس نے لکھا ہے کہ دُنیا کے مستقبل کا دار و مدار اب صرف عورتوں ہی پر ہے۔ نسلِ انسانی کا بار اور تمام تر ذمّہ داریاں اب عورتوں ہی پر پڑنے والی ہیں —— ڈاکٹر کیلسن نے لکھا ہے کہ جب تہذیب کا آغاز ہوا تو عورت کی پُوجا کی جاتی تھی مگر پچھلی بیس صدیوں میں مرد دُنیا پر چھا گئے۔ اب قدرت کا چکّر پھر عورت کو ممتاز رول ادا کرا رہا ہے۔ مرد جنگ کے خوفناک نتائج سہم گئے ہیں۔ حالانکہ جنگ و جدل بھی اُن کے غُرور ہی کا باعث تھی۔ اب مرد عورت کی طرف زیادہ توجّہ دیں گے۔ مَردوں میں شاید زیادہ انسانیت آجائے۔ کیونکہ اب دُنیا کی باگ ڈور عورتوں کے ہاتھ میں آنے والی ہے۔" ڈاکٹر موصوف کی نظر شاید میری اور آپ کی طرف ہیں اور اُنھوں نے میرے اور آپ کے راج سنگھاسن کے آئینے میں آئندہ دُنیا کی تصویر دیکھی ہے —— ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی پیشگوئی دُرست ہو مگر ابھی تو مرد کا غُرور اُسے کچھ نہیں کرنے دیتا اور وہ اپنی مردانگی کے لئے عورت راج کو ایک چیلنج سمجھ رہا ہے اور انسانوں میں انسانیت آنے کی بجائے دن بدن حیوانیت کا رُجحان بڑھتا جا رہا ہے —— عورت مرد کے دل و دماغ پر مسلّط ہو چکی ہے۔ میری دُعا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی پیشگوئی دُرست ہو۔ سرِدست میرے اور آپ کے راج سنگھاسن پر عورت براجمان ہے۔ پھر دُنیا کے کونے کونے میں عورت راج ہو اور مرد اپنے غُرور کی سزا بھگتنے کے لئے کسی قعرِ مذلّت میں پڑا ہو۔

اچھا اب اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

میں ہوں آپ کی

دلّی

("ایشیا" ویکلی برمنگھم لندن کے شکریہ کے ساتھ)

صحت و زندگی

۱ • اخروٹ ــــــ ایک طاقت بخش میوہ

یہ مشہور مقوّی میوہ ہے۔ اِس کا مزاج گرم ہے۔ مغزِ اخروٹ انسان کے دماغ جیسا ہوتا ہے، اِسی لئے اِسے خاص طور پر مقوّیٔ دماغ کہا جاتا ہے۔ یہ مقوّیٔ دماغ ہی نہیں، جملہ اعضائے رئیسہ کو تقویت بخشتا ہے۔ باہ اور معدے کو طاقت دیتا ہے، حافظہ کو تیز کرتا ہے، دماغ کو تقویت بخشنے میں اِس کا درجہ بہت بلند ہے۔ جسم میں گرمی کو بڑھاتا ہے۔ لذیذ اور چکنا ہوتا ہے۔ سردیوں میں دوسرے مغزیات کی طرح بکثرت کھایا جاتا ہے۔ بدن کو غذائیت دیتا اور فربہ کرتا ہے۔ کشمش یا مویز منقیٰ کے ساتھ کھانا خصوصیت سے مقوّیٔ دماغ ہے۔ اِس کا بریاں مغز کھانسی کے لئے فائدہ بخش ہے۔ بچّوں کو شام کے وقت ایک دو اخروٹ کھلانے سے کرمِ شکم (چھونے) مر جاتے ہیں۔

مغزِ اخروٹ قبض کو بھی دُور کرتا ہے۔ نہار مُنہ چبا کر داد پر لگایا جائے تو چند بار لگانے سے داد اچھا ہو جاتا ہے۔

یہ بلغمی مزاج والوں اور بُوڑھوں کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ لیکن حدِ اعتدال سے زیادہ کھانا مُضر ہے۔ زیادہ مقدار میں کھانے سے سر میں درد ہونے لگتا ہے اور جسم میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ مُنہ اور حلق میں پھنسیاں نکل آتی ہیں اور بعض اَوقات زخم ہو جاتے ہیں۔

پُرانا مغزِ اخروٹ ہرگز نہ کھائیں۔ یہ ناقص ہو جاتا ہے۔ اِس کے کھانے سے متلی ہونے لگتی ہے، بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس لئے احتیاط برتنی چاہیئے۔

۲ • غذا سے متعلّق اہم ہدایات

ایسے بہت سے لوگ ہیں جنھیں خدا نے خوش حالی عطا کی ہے۔ اُنھیں اچھی سے اچھی غذائیں میسّر ہیں، پھر بھی اُن کی صحت اچھی نہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غذا سے متعلّق ضروری اصولوں سے ناآشنا ہیں یا آشنا ہیں تو اُن پر عمل نہیں کرتے۔

غذا سے متعلّق اِن ہدایات پر عمل کیجیئے تو آپ کی صحت قابلِ رشک ہو گی:-

- بھوک نہ ہو تو کھانا نہ کھایئے۔ اگر آپ کی طبیعت کچھ کھائے بغیر نہ مانے تو پھل کھانے میں چنداں مضائقہ نہیں۔
- کھانا کھاتے وقت خوش و خرّم رہیئے۔ اِس سے عملِ ہضم میں مدد ملتی ہے۔ اِس کے برعکس فکر و پریشانی، غم و غصّہ اور مطالعہ کی حالت میں کھانا کھایا جائے گا تو ہضمِ غذا میں خلل واقع ہو جائے گا۔
- کھانا کھانے کے دَوران میں زیادہ پانی پینا عملِ ہضم میں فتور پیدا کرتا ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ کھانے کے دَوران بھی اور اِس کے فوراً بعد بھی پانی نہ پیا جائے۔ لیکن موسم اور غذا کا تقاضہ ہی ہو تو تھوڑا سا پانی پی لیا جائے۔ کھانا کھانے سے ایک گھنٹہ بعد پانی پی سکتے ہیں۔
- دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آدھے گھنٹہ قیلولہ کرنا اچھی عادت ہے۔ موقع اور وقت اجازت دے تو اِسے معمول بنا لیجئے۔
- ہفتہ میں ایک دن روزہ رکھنا، نظامِ ہضم پر نہایت ہی صحت مند و خوشگوار اثر مرتّب کرتا ہے۔ کوئی شخص عام جسمانی کمزوری کی وجہ سے مکمّل روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو ہفتہ میں ایک دن صرف پھل کھانا چاہیئے۔ اناج کو ہاتھ نہ لگائیں۔
- دونوں وقت کے کھانوں کے درمیانی وقفے میں مٹھائیوں کا استعمال بھی عملِ ہضم میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اِس بد پرہیزی اور بے عنوانی کو جاری رکھا جائے تو مرض سوءِ ہضمی کی بُنیاد پڑ جاتی ہے۔ اِس درمیانی وقفے میں میٹھے رس دار پھل کھائے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔
- گرم مسالے، زیادہ سُرخ مرچیں، سِرکہ، اچار، چٹنیاں جن کا استعمال معدہ کو جلاتا ہے اگر غذائی معمولات میں شامل ہو جائیں تو ورمِ معدہ، قولنج اور زخمِ معدہ کے علاوہ جگر اور گُردوں کے لئے بھی نقصان دہ ہیں۔

ضرورت ہے۔ اُن کا ایک اشتہار اخبارات میں شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بلّیوں کی خوراک کے لئے تیس روپے ماہوار معاوضہ دیا جائے گا۔ حکومت مدھیہ پردیش سرکاری کاغذات کی حفاظت کے لئے آٹھ بلّیاں مستقل طور پر ملازم رکھتی ہے اور اُن کے ساتھ سرکاری ملازموں جیسا سلوک کیا جاتا ہے اور اُن کی خور ـــ لئے سالانہ بجٹ میں باقاعدہ مد رکھی جاتی ہے۔

ڈیر لسندن!

ایک اور دلچسپ بات سُنو۔ میرے پڑوس سے تو یہی اطلاع آئی تھی کہ میرٹھ سے چار میل دُور ایک گاؤں میں ایک لڑکی جسے سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ ایک ہفتے بعد قبر سے زندہ سلامت نکل آئی۔ مگر پاکستان میں چھ سال بعد مُردہ زندہ ہوا ہے ـــــ میرٹھ کی لڑکی کا تو یہ واقعہ ہے کہ سانپ کے کاٹنے کے بعد جب لڑکی مر گئی تو اُسے اُسی دن دفن کر دیا گیا۔ ایک ہفتے بعد لڑکی کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ لڑکی زندہ ہے اور وہ کہہ رہی ہے کہ مجھے قبر سے نکال لو۔

ماں نے خواب کا ذِکر اپنے شوہر سے کیا اور اصرار کیا کہ لڑکی کو قبر سے نکالا جائے۔ شوہر نے اہلِ محلّہ کو جمع کیا اور طے ہوا کہ قبر کھود دی جائے۔ چنانچہ قبر کھود دی گئی تو لڑکی واقعی زندہ تھی۔ گو وہ نقاہت سے زرد رُو ہو چکی تھی۔

پاکستان کا واقعہ یہ ہے کہ وہاں ایک چہل سالہ ٹیچر نے کراچی کی عدالت میں درخواست دی کہ اُسے زندہ قرار دیا جائے۔ اُسے محکمۂ تعلیم نے چھ سال پہلے مُردہ قرار دے دیا تھا۔

ٹیچر کے بیان کے مطابق اُس نے اپنے تبادلہ کی درخواست دی تھی جس پر حکم ہوا کہ وہ چھ سال قبل مر چکا ہے اور اُس کا پراویڈینٹ فنڈ اور گریجوٹی اُس کے بیوی بچّوں کو دے دی گئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس عورت کو یہ رقم دی گئی ہے اُسے وہ جانتا تک بھی نہیں۔

پچھلے دنوں میرے یہاں ایک خاتون کو گرفتار کیا گیا ہے جو مردانہ لباس یعنی کوٹ پتلون میں ملبوس میرے بازاروں اور پارکوں میں پھرتی نظر آتی تھی۔ پولیس کو کچھ شُبہ ہوا تو اُسے ٹوکا گیا۔ جھوٹ کے پاؤں کہاں ہوتے ہیں۔ مردانگی تمام شُد ہوئی اور کوٹ پتلون کے اندر سے ایک خاتون محترم برآمد ہوئیں۔ معلوم نہیں اُس نے کیوں مردوں کا رُوپ دھارن کیا تھا ـــــ کاش وہ نفسیاتی جائزے سے متعلّق امریکن اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر ایچ کیلمن کا جائزہ پڑھ چکی ہوتی، جس نے لکھا ہے کہ دُنیا کے مستقبل کا دار و مدار اب صرف عورتوں ہی پر ہے۔ نسلِ انسانی کا بار اور تمام تر ذمّہ داریاں اب عورتوں ہی پر پڑنے والی ہیں ـــــ ڈاکٹر کیلمن نے لکھا ہے کہ "جب تہذیب کا آغاز ہوا تو عورت کی پُوجا کی جاتی تھی مگر پچھلی بیس صدیوں میں مرد دُنیا پر چھا گئے۔ اب قُدرت کا چکّر پھر عورت کو ممتاز رول ادا کرا رہا ہے۔ مرد جنگ کے خوفناک نتائج سے سہم گئے ہیں۔ حالانکہ جنگ و جدل بھی اُن کے غرور ہی کا باعث تھی۔ اب مرد عورتوں کی طرف زیادہ توجّہ دیں گے۔ مردوں میں شاید زیادہ انسانیت آ جائے۔ کیونکہ اب دُنیا کی باگ ڈور عورتوں کے ہاتھ میں آنے والی ہے۔" ڈاکٹر موصوف کی نظریں شاید میری اور آپ کی طرف ہیں اور اُنھوں نے میرے اور آپ کے راج سنگھاسن کے آئینے میں آئندہ دُنیا کی تصویر دیکھی ہے ـــــ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی پیشگوئی دُرست ہو مگر ابھی تو مرد کا غُرور اُسے کچھ نہیں کرنے دیتا اور وہ اپنی مردانگی کے لئے عورت راج کو ایک چیلنج سمجھ رہا ہے اور انسانوں میں انسانیت آنے کی بجائے دن بدن حیوانیت کا رُجحان بڑھتا جا رہا ہے ـــــ عورت مرد کے دل و دماغ پر مسلّط ہو چکی ہے۔ میری دُعا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی پیشگوئی دُرست ہو۔ سرِ دست میرے اور آپ کے راج سنگھاسن پر عورت براجمان ہے۔ پھر دُنیا کے کونے کونے میں عورت راج ہو اور مرد اپنے غُرور کی سزا بُھگتنے کے لئے کسی قعر مذلّت میں پڑا ہو۔

اچھا اب اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

میں ہوں آپ کی

دلّی

("ایشیا" ویکلی برمنگھم لسندن کے شُکریہ کے ساتھ)

صحت وزندگی

۱● اخروٹ ـــــ ایک طاقت بخش میوہ

یہ مشہور مقوّی میوہ ہے۔ اِس کا مزاج گرم ہے۔ مغزِ اخروٹ انسان کے دماغ جیسا ہوتا ہے، اِسی لئے اِسے خاص طور پر مقوّی دماغ کہا جاتا ہے۔ یہ مقوّی دماغ ہی نہیں، جُملہ اعضائے رئیسہ کو تقویت بخشتا ہے۔ باہ اور معدے کو طاقت دیتا ہے، حافظہ کو تیز کرتا ہے، دماغ کو تقویت بخشنے میں اِس کا درجہ بہت بلند ہے۔ جسم میں گرمی کو بڑھاتا ہے۔ لذیذ اور چکنا ہوتا ہے۔ سردیوں میں دوسرے مغزیات کی طرح بکثرت کھایا جاتا ہے۔ بدن کو غذائیت دیتا اور فربہ کرتا ہے۔ کشمش یا مویزِ منقّٰی کے ساتھ کھانا خصوصیت سے مقوّی دماغ ہے۔ اِس کا بریاں مغز کھانسی کے لئے فائدہ بخش ہے۔ بچّوں کو شام کے وقت ایک دو اخروٹ کھِلانے سے کرمِ شکم (چھوٹے) مرجاتے ہیں۔

مغزِ اخروٹ قبض کو بھی دُور کرتا ہے۔ نہار مُنہ چبا کر داد پر لگایا جائے تو چند بار لگانے سے داد اچھا ہو جاتا ہے۔

یہ بلغمی مزاج والوں اور بُوڑھوں کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ لیکن حدِ اعتدال سے زیادہ کھانا مُضر ہے۔ زیادہ مقدار میں کھانے سے سر میں درد ہونے لگتا ہے اور جسم میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے۔ مُنہ اور حلق میں پھُنسیاں نکل آتی ہیں اور بعض اوقات زخم ہو جاتے ہیں۔

پُرانا مغزِ اخروٹ ہرگز نہ کھائیں۔ یہ ناقص ہو جاتا ہے۔ اِس کے کھانے سے متلی ہونے لگتی ہے، بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس لئے احتیاط برتنی چاہیئے۔

۲● غذا سے متعلق اہم ہدایات

ایسے بہت سے لوگ ہیں جنھیں خدا نے خوش حالی عطا کی ہے انھیں اچھی سے اچھی غذائیں میسّر ہیں، پھر بھی اُن کی صحت اچھی نہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ غذا سے متعلق ضروری اصولوں سے ناآشنا ہیں یا آشنا ہیں تو اُن پر عمل نہیں کرتے۔

غذا سے متعلق اِن ہدایات پر عمل کیجئے تو آپ کی صحت قابلِ رشک ہوگی :-

- بھوک نہ ہو تو کھانا نہ کھایئے۔ اگر آپ کی طبیعت کچھ کھائے بغیر نہ مانے تو پھل کھانے میں چنداں مضائقہ نہیں۔
- کھانا کھاتے وقت خوش و خرّم رہیئے۔ اِس سے عملِ ہضم میں مدد ملتی ہے۔ اِس کے برعکس فکر و پریشانی، غم و غصّہ اور مطالعہ کی حالت میں کھانا کھایا جائے گا تو ہضمِ غذا میں خلل واقع ہو جائے گا۔
- کھانا کھانے کے دَوران میں زیادہ پانی پینا عملِ ہضم میں فتور پیدا کرتا ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ کھانے کے دَوران بھی اور اُس کے فوراً بعد بھی پانی نہ پیا جائے۔ لیکن موسم اور غذا کا تقاضہ ہی ہو تو تھوڑا سا پانی پی لیا جائے۔ کھانا کھانے سے ایک گھنٹہ بعد پانی پی سکتے ہیں۔
- دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آدھے گھنٹہ قیلولہ کرنا اچھی عادت ہے۔ موقع اور وقت اجازت دے تو اِسے معمول بنا لیجئے۔
- ہفتہ میں ایک دن روزہ رکھنا، نظامِ ہضم پر نہایت ہی صحت مند و خوشگوار اثر مرتّب کرتا ہے۔ کوئی شخص عام جسمانی کمزوری کی وجہ سے مکمّل روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو ہفتہ میں ایک دن صرف پھل کھانا چاہیئے۔ اناج کو ہاتھ نہ لگائیں۔
- دونوں وقت کے کھانوں کے درمیانی وقفے میں مٹھائیوں کا استعمال بھی عملِ ہضم میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اس بدپرہیزی اور بے عنوانی کو جاری رکھا جائے تو مرض سوءِ ہضمی کی بُنیاد پڑ جاتی ہے۔ اِس درمیانی وقفے میں میٹھے رس دار پھل کھائے جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔
- گرم مسالے، زیادہ سُرخ مرچیں، سِرکہ، اچار، چٹنیاں جن کا استعمال معدہ کو جلاتا ہے اگر غذائی معمولات میں شامل ہو جائیں تو ورمِ معدہ، قولنج اور زخمِ معدہ کے علاوہ جگر اور گُردوں کے لئے بھی نقصان دہ ہیں۔

- دیر ہضم، قابض، ثقیل اور مرغن غذائیں صحت کے لئے مضر ہیں۔
- کھانے کے اوقات میں پابندی بھی ہضم غذا میں مدد دیتی ہے۔ اس لئے حتی الامکان اوقاتِ غذا کی پابندی کرنی چاہئے۔ وقت کی کمی کے باعث عجلت کے ساتھ کھانا کھانے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ اس سے سوءِ ہضمی کی شکایت ہو جاتی ہے۔

۲ • مایوسی کے سائے سے بھی بچئے

دُنیا کے بڑے بڑے دانشوروں اور مفکروں نے کہا ہے ـــــ "مایوسی انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے"

مایوس انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی قوتیں معطل ہو جاتی ہیں۔ ذہن مفلوج ہو جاتا ہے۔

اگر آپ زندگی کی بازی جیتنا چاہتے ہیں تو اپنے دل کے دامن پر مایوسی کا سایہ بھی نہ پڑنے دیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ "ہر ڈاکٹر جانتا ہے کہ مریض کے علاج کے لئے مایوسی سے بڑھ کر خطرناک چیز دوسری نہیں۔ ہم ذرا بھی نہیں سوچتے کہ مایوسی اور غم کا خیال دل میں لاتے ہوئے ہم اپنی صحت اور مسرت کو کتنا نقصان پہنچاتے ہیں۔ ہمیں ذرا بھی محسوس نہیں ہوتا کہ مایوسی اور فکر سے ذراتِ حیات یا خلیاتِ حیات کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور دل میں نراجیت اور بے ترتیبی پھیل جاتی ہے"

۳ • حفظِ صحت کے سنہرے اُصول

- افکار و آلام سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کیجئے۔ آج کے دور میں یوں تو ہر آدمی افکار و آلام کا ہدف ہے لیکن یہ جدوجہد ضرور کرنی چاہیے کہ یہ افکار آپ کو صاحبِ فراش نہ بنا دیں۔
- دُنیا اور زندگی سے بیزار ہونے کا احساس اپنے دل میں بیدار نہ ہونے دیجئے۔ ایسا کوئی نہیں ہے جو زندگی کی مشکلات سے دوچار نہ ہو۔ لیکن جو لوگ ضبط و تحمل سے زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں وہ یقیناً حالات اور مشکلات کو شکست دے دیتے ہیں۔
- بے خوابی سے پرہیز کیجئے۔ بے خوابی صحت کی دشمن صحت کے لئے رہزن ہے۔ گہری نیند صحت مند و کامیاب زندگی کی ضامن ہے۔ اس راز سے بہت کم لوگ واقف ہیں اور جو واقف ہیں، وہ بھی اس طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔
- جلد بازی سے پرہیز کیجئے۔ سارے معاملات کو سہولت اور سکون سے طے کیجئے۔ اسباب و علل کی روشنی میں ان پر عمل کیجئے۔
- احساسِ کمتری سے بچیے۔ اپنے اوپر، اپنے کام پر اعتماد کیجئے۔ اپنے اوپر بے اعتمادی سے باز رہیے۔
- لوگوں کی نقل و حرکت کی کھوج لگانے، ان کے اسباب جاننے اور راز کو معلوم کرنے سے پرہیز کیجئے۔
- اپنے میلانات یا جذبات اور انفعالات سے گریز کرنے یا اُن کے خلاف جنگ کرنے سے باز رہیئے۔ ہاں ان کی نسبت مناسب فیصلہ کیجئے اور انہیں قابو میں رکھیئے۔
- خیالات اور حساسیت میں زیادتی سے بچیئے تاکہ آپ ایسی اُلجھنوں میں نہ پھنس جائیں جنہیں سمجھنا دشوار ہو۔
- اپنے اعلیٰ تخیلات میں اُلجھے رہنے سے احتیاط کیجئے تاکہ حقائق سے آپ کو صدمہ نہ پہنچے۔
- اپنے ضمیر کی تعذیب و تخویف سے بچیئے۔ اس کا موقع نہ دیجئے کہ دل مایوسی و ناامیدی کا مسکن بن جائے۔
- ہر حال میں مسرور و مطمئن رہیئے اور مسرور و مطمئن رہنے کی کوشش کیجئے۔ اپنے دل کے دامن پر افسردگی کا سایہ نہ پڑنے دیجئے۔
- مستقبل کے بے بنیاد اندیشوں کو چھوڑ کر حال کے ہنگاموں میں کھو جائیے۔
- بے اعتمادی سے باز رہیئے۔ اپنی ذات پر بھروسہ رکھیئے۔

۵ • کٹھل ـــــ ایک مفید ترکاری

اطبا کے نزدیک کٹھل گرم ہے۔ اس کے کچے پھل کی ترکاری بہت لذیذ ہوتی ہے۔ جو لوگ گوشت نہیں کھاتے، اس سے گوشت کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ کٹھل کے کباب بھی بے حد لذیذ ہوتے ہیں۔

پکا ہوا کٹھل بطور میوہ کھایا جاتا ہے اور بہت لذیذ ہوتا ہے۔ بدن کو غذائیت دیتا اور قوت بخشتا ہے۔ اس کے پھل کے گودے اور بیجوں میں پروٹینز، شکر اور کچھ معدنی اجزاء بھی پائے جاتے ہیں۔

کٹھل دیر ہضم اور قابض ہوتا ہے۔ اس لئے جن لوگوں کا معدہ کمزور ہو انہیں کٹھل ہرگز نہ کھانا چاہیئے۔

کھانا کھانے کے بعد کبھی پھل بطور میوہ نہ کھانا چاہئے۔ اِس طرح بد ہضمی ہو جاتی ہے اور دست آنے لگتے ہیں کیونکہ پھل کھانے کا سب سے اچھا وقت نہار مُنہ ہے۔

۶• دُعا کے نفسیاتی اثرات

اِس نئی روشنی اور مادّہ پرستی کے دَور میں انسان خدا سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ خدا سے دُعا مانگنے پر سے یقین اُٹھتا جا رہا ہے۔ بلکہ بیشتر لوگوں کا یقین اُٹھ گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دُعا میں بڑی طاقت ہے۔ مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ——

"اگر آپ فطرت یا تعلیم و تربیت کے اعتبار سے مذہبی آدمی نہ ہوں، پھر بھی دُعا آپ کے یقین سے زیادہ آپ کی مدد کر سکتی ہے۔ دُعا ہمیں اکیلے نہ ہونے اور اپنے بوجھ کو بٹانے کا احساس دلاتی ہے۔ ہم میں بہت کم لوگ اتنے طاقت ور ہیں کہ بھاری سے بھاری بوجھ اور شدید سے شدید تکلیفوں کو اکیلے برداشت کر سکیں۔ بعض اوقات ہماری پریشانیاں اِس نوعیت کی ہوتی ہیں کہ ہم اُن کا ذِکر اپنے عزیز ترین دوستوں اور رشتے داروں سے بھی نہیں کر سکتے۔ ایسی حالت میں خدا سے دُعا ہی ہمارے پاس آخری وسیلہ رہ جاتا ہے۔ اگر ہم دوسروں سے اپنی تکلیف نہیں کہہ سکتے تو خدا سے تو کہہ سکتے ہیں۔"

"دُعا کا ایک نفسیاتی پہلو یہ بھی ہے کہ دُعا "کرنے" کے عملی اصول کو فعل میں لاتی ہے۔ دُعا کرنا عمل کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ میں نہیں مانتا کہ کوئی انسان اپنے کسی کام کی تکمیل کے لئے دُعا مانگے اور اُس کی آرزو پوری نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں وہ اُسے پورا کرنے کے لئے عملی قدم نہ اُٹھائے۔ ایک شہرۂ آفاق سائنسداں کہتا ہے "انسان دُعا سے زیادہ طاقت ور چیز کوئی پیدا نہیں کر سکتا" پھر کیوں دُعا سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے۔

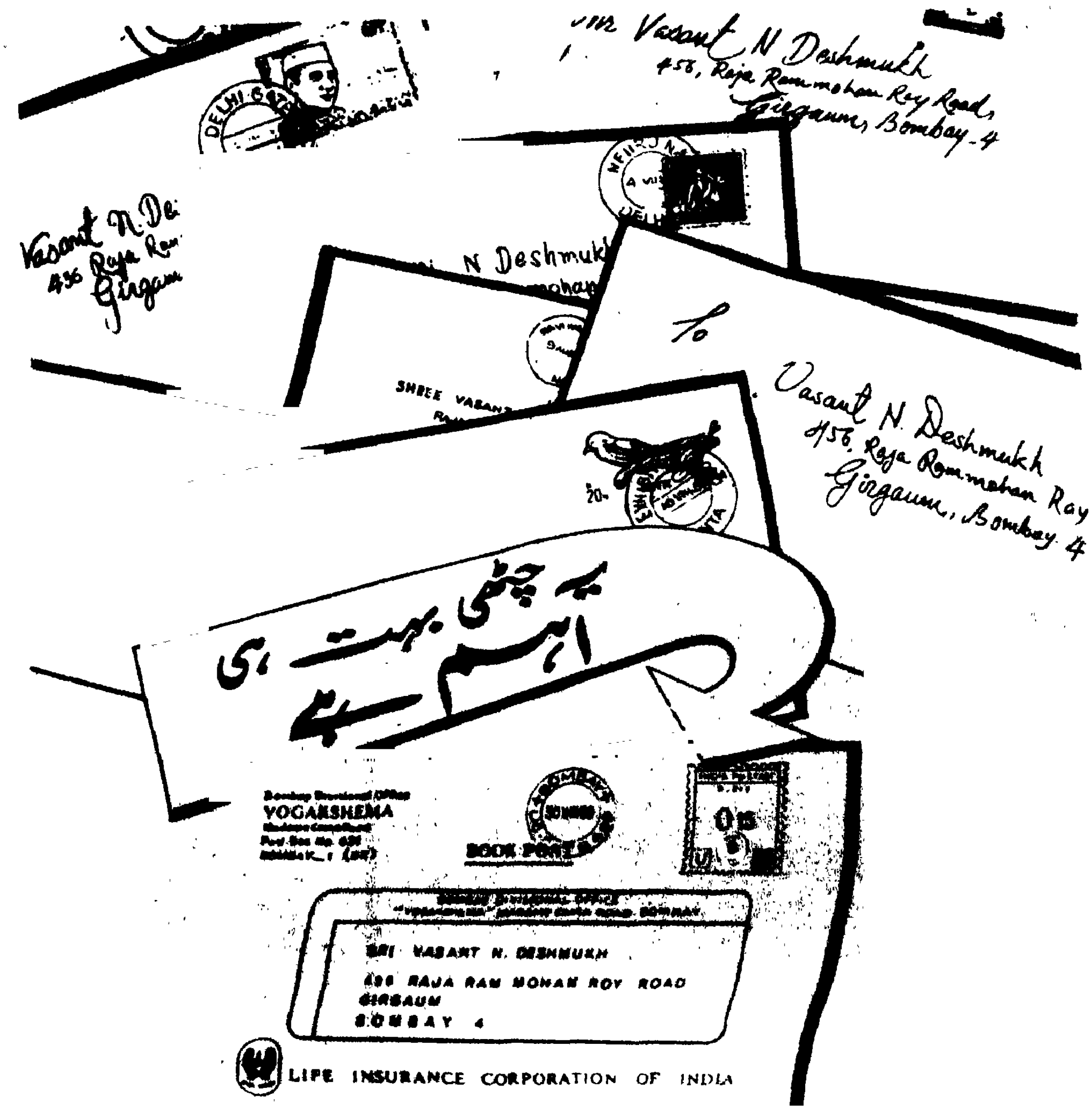
۷• چھوٹی چھوٹی باتیں

زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن ہم اُنھیں نظر انداز کر کے بڑی بڑی باتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بھول ہے۔

مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے —— "دُنیا اور لوگوں کو تبدیل کرنا مشکل ہے۔ لیکن آپ خود کو بدل سکتے ہیں، اُن کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔ جو لوگ زندگی کی شاہراہ سے بھٹک جاتے ہیں، اُنھوں نے خود کو پہچاننے میں غلطی کی ہوتی ہے۔ دوستوں میں رہتے ہوئے بھی وہ خود کو اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ اُنھیں کیا کرنا چاہئے کیا نہ کرنا چاہئے؟ وہ اِس میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اُنھیں اپنی پسند ناپسند کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ لوگ زندگی اِس طرح بسر کرتے ہیں جیسے پانی سے بھرے تالاب میں وہ شخص جسے تیرنا نہیں آتا" دُنیا میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے۔

۸• کام کی طرح آرام بھی ضروری ہے

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کام ضروری ہے۔ بیشتر لوگوں کے کانوں میں صرف ایک آواز گونجتی رہتی ہے —— کام —— کام —— کام!! لیکن حقیقت یہ ہے کہ کام کی طرح آرام بھی ضروری ہے —— مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے —— "زندگی کے گہرے پانیوں میں سے آپ کو تیر کر گزرنا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے آپ کو اپنے ذہن کو آرام دینے کی ضرورت ہے۔ جس طرح نیند جسم کے لئے ضروری ہے، اُسی طرح ذہنی سکون بھی بے حد ضروری ہے اور یہ ذہنی سکون اور اندرونی سکون صرف تنہائی ہی میں میسّر آسکتا ہے۔"



یہ ہے آپ کے بیمۂ زندگی کی پریمیم نوٹس

جب آپ کو بیمۂ زندگی کی پریمیم نوٹس ملتی ہے تو فوراً اس پر دھیان دیجئے۔ وقت پر اور باقاعدہ رقم دیتے رہئے یاد رکھئے جب آپ پریمیم کی ادائیگی ملتوی یا بند کر دیتے ہیں تو آپ خاندان کو اس کے مالی تحفظ سے محروم کر دیتے ہیں اگر کچھ ایسا ویسا ہو جائے تو خاندان کے پاس سہارا نہ رہے گا۔ اگر آپکی پالیسی پیڈاپ یا لیپس ہو گئی ہے تو اس کو دوبارہ چالو کرنے میں جلدی کیجئے۔ ایل آئی سی کی پالیسی دوبارہ چالو کرنے کی اسکیم سے مدد لیجئے۔ اپنے بیمہ ایجنٹ سے ملئے۔ آپ کی مدد کرتے ہوئے انہیں خوشی ہوگی۔

لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

PNB/LIC.51-89 URDU

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

جمیل النّساء۔ ہگلی

س۔ شمع خود جل کر دوسروں کو روشنی دیتی ہے، لیکن اُسے خود کیا ملتا ہے؟

ج۔ دوسروں کو روشنی بخشنے کی مسرت!

س۔ انسانیت۔ اُنس و محبت۔ سماج؟

ج۔ اب سماج کا دامن انسانیت اور اُنس و محبت سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔

س۔ نرم و نازک جسم اور شہد سے شیریں زبان؟

ج۔ قُدرت کی قابلِ رشک دین ہے۔

نگار سُلطانہ۔ لائل پور

س۔ بھائی جان! مجید لاہوری کا کوئی طنزیہ شعر سنایئے۔

ج۔ اُن کی ایک طنزیہ نظم کا ایک بند سُنئے ؎

ہم تو مُردہ باد رہے اور لیڈر زندہ باد رہے
سیفٹی ایکٹ نے ہم کو پکڑا کالے چور آزاد رہے
رنگ محل آباد تھے پہلے رنگ محل آباد رہے
ہم جیسے برباد تھے پہلے ویسے ہی برباد رہے

س۔ اکبر الہ آبادی کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ ایک ہی نہیں دو اشعار سُنئے ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پُوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا!
کہنے لگیں کہ عقل پہ مَردوں کی پڑ گیا

اے۔ آر۔ ایلا سکر کھڑکی (پونہ)

س۔ انسان کی زندگی میں جب کوئی بھی آرزو پُوری نہ ہو تو۔۔۔؟

ج۔ آرزو کی تکمیل کے لئے جدّوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔

س۔ انسان کی رُوح کو سکون کب نصیب ہوتا ہے؟

ج۔ جب وہ اچھے کام کرتا ہے۔

س۔ زندگی انسان پر کب بوجھ بن جاتی ہے؟

ج۔ جب انسان اُسے بوجھ بنا لیتا ہے۔

محمد اصغر علی۔ دھنباد

س۔ غلطی انسان کو کیا سِکھاتی ہے؟

ج۔ انسان پھر غلطی نہ کرے! انسان پھر غلطی کا مُرتکب ہو کر نقصان نہ اُٹھائے، تباہ و برباد نہ ہو، ذلیل و خوار نہ ہو۔

س۔ عورت زہر ہے تو دولت؟

ج۔ عورت زہر نہیں، امرت ہے۔ مشرق و مغرب کے بڑے بڑے مفکرین نے عورت کی عظمت کا اعتراف کیا ہے ——— عورت مہر و وفا کی دیوی ہے۔ دولت جیسی بے مہر کا عورت سے کیا مقابلہ! دولت نے کس کے ساتھ وفا کی۔ دولت آج کسی کے پاس ہے تو کل کسی اور کے پاس!

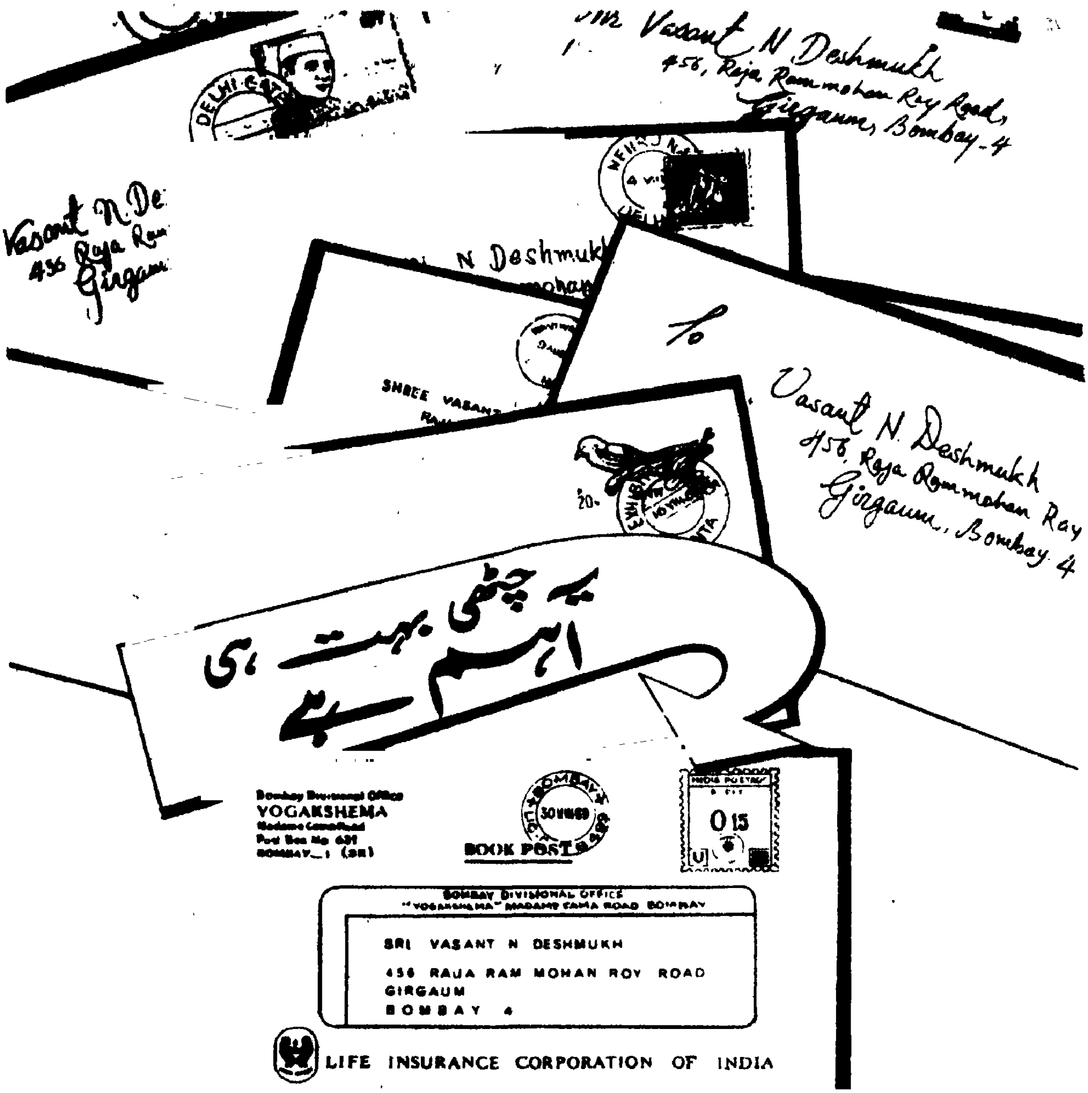
س۔ نریش کمار شاد کی موت کیسے ہوئی؟

ج۔ جمنا میں ڈوب کر!

رضایت علی۔ بھوپال

س۔ اِسٹریٹ کے انتخاب میں ڈاکٹر گری کی کامیابی ڈاکٹر گِری کی کامیابی ہے یا اندرا جی کی فتح؟

ج۔ اِندرا جی کی فتح ہے۔ ہر حق پسند، ہر صداقت پرست کی فتح ہے!



یہ ہے آپ کے بیمہ زندگی کی پریمیم نوٹس

جب آپ کو بیمہ زندگی کی پریمیم نوٹس ملتی ہے تو فوراً اس پر دھیان دیجئے۔ وقت پر اور باقاعدہ رقم دیتے رہئے۔ یاد رکھئے جب آپ پریمیم کی ادائیگی ملتوی یا بند کر دیتے ہیں تو آپ خاندان کو اس کے مالی تحفظ سے محروم کر دیتے ہیں۔ اگر کچھ ایسا ویسا ہو جائے تو خاندان کے پاس سہارا نہ رہے گا۔ اگر آپکی پالیسی پیڈاپ یا لیپس ہوگئی ہے تو اس کو دوبارہ چالو کرنے میں جلدی کیجئے۔ ایل آئی سی کی پالیسی دوبارہ چالو کرنے کی اسکیم سے مدد لیجئے۔ اپنے بیمہ ایجنٹ سے ملئے۔ آپ کی مدد کرتے ہوئے انہیں خوشی ہوگی۔

لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی معاشی تمدنی علمی ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش وعریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

سوال وجواب

جمیل النساء۔ ہگلی

س۔ شمع خود جل کر دوسروں کو روشنی دیتی ہے، لیکن اُسے خود کیا ملتا ہے؟

ج۔ دوسروں کو روشنی بخشنے کی مسرت!

س۔ انسانیت۔ اُنس ومحبت۔ سماج؟

ج۔ اب سماج کا دامن انسانیت اور اُنس و محبت سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔

س۔ نرم ونازک جسم اور شہد سے شیریں زبان؟

ج۔ قدرت کی قابلِ رشک دین ہے۔

نگار سلطانہ۔ لائل پور

س۔ بھائی جان! مجید لاہوری کا کوئی طنزیہ شعر سنایئے۔

ج۔ اُن کی ایک طنزیہ نظم کا ایک بند سُنئے ؎

ہم تو مُردہ باد رہے اور لیڈر زندہ باد رہے
سیفٹی ایکٹ نے ہم کو پکڑا کالے چور آزاد رہے
رنگ محل آباد تھے پہلے رنگ محل آباد رہے
ہم جیسے برباد تھے پہلے ویسے ہی برباد رہے

س۔ اکبر الٰہ آبادی کا کوئی شعر سُنایئے۔

ج۔ ایک ہی نہیں دو اشعار سُنئے ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پُوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا!
کہنے لگیں کہ عقل پہ مَردوں کی پڑ گیا

اے۔ آر۔ ایلا سکر کھڑکی (پونہ)

س۔ انسان کی زندگی میں جب کوئی بھی آرزو پُوری نہ ہو تو۔۔۔؟

ج۔ آرزو کی تکمیل کے لئے جدّوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔

س۔ انسان کی رُوح کو سکون کب نصیب ہوتا ہے؟

ج۔ جب وہ اچھے کام کرتا ہے۔

س۔ زِندگی انسان پر کب بوجھ بن جاتی ہے؟

ج۔ جب انسان اُسے بوجھ بنا لیتا ہے۔

محمد اصغر علی۔ دھنباد

س۔ غلطی انسان کو کیا سِکھاتی ہے؟

ج۔ انسان پھر غلطی نہ کرے! انسان پھر غلطی کا مرتکب ہو کر نقصان نہ اُٹھائے، تباہ وبرباد نہ ہو، ذلیل وخوار نہ ہو۔

س۔ عورت زہر ہے تو دولت؟

ج۔ عورت زہر نہیں، امرت ہے، مشرق ومغرب کے بڑے بڑے مفکّرین نے عورت کی عظمت کا اعتراف کیا ہے ——— عورت مہر ووفا کی دیوی ہے۔ دولت جیسی بے مہر کا عورت سے کیا مقابلہ! دولت نے کِس کے ساتھ وفا کی۔ دولت آج کِسی کے پاس ہے تو کل کِسی اور کے پاس!

س۔ نریش کمار شاد کی موت کیسے ہوئی؟

ج۔ جمنا میں ڈُوب کر!

رضایت علی۔ بھوپال

س۔ راشٹرپتی کے انتخاب میں ڈاکٹر گری کی کامیابی ڈاکٹر گِری کی کامیابی ہے یا اندرا جی کی فتح؟

ج۔ اِندرا جی کی فتح ہے۔ ہر حق پسند، ہر صداقت پرست کی فتح ہے!

شکیلہ قیصر۔ علی گڑھ

س۔ بھائی جان! سبزیوں میں مجھے آلو بہت مرغوب ہیں۔ میری ایک سہیلی کہتی ہے۔ آلو کچھ اچھی چیز نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں آلو کیسی سبزی ہے؟

ج۔ آلو جسم کی پرورش کرنے والی غذا ہے۔ آلو کے متعلق ایک بڑے ڈاکٹر نے لکھا ہے ——— "آلو بہترین غذاؤں میں سے ہے۔ آلو میں فولاد، کیلسیم، پوٹاشیم اور فاسفورس کی مقدار بہت کافی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ آلو میں میگنیشیم، سوڈیم، گندھک، کلورین، آیوڈین اور تانبا وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں انسانی جسم کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے بطور غذا آلو مفید چیز ہے" ——— آلو میں وٹامنز اے، بی اور سی کافی مقدار میں ہوتے ہیں۔ آلو میں وٹامن بی بھی اتنی ہی مقدار میں ہوتا ہے جتنی مقدار میں گیہوں کی روٹی میں ہوتا ہے۔

مس کرشنا سیٹھی۔ الہ آباد

س۔ آج کل متوسط طبقہ کے گھروں میں ایلومونیم کے برتن کثرت سے استعمال ہونے لگے ہیں۔ میری سہیلی لتا کہتی ہے اس کا استعمال بے حد مضر ہے۔ آپ کی رائے میں ایلومونیم کے برتن استعمال کرنے چاہئیں یا نہیں؟

ج۔ ایلومونیم کے برتنوں کا استعمال بے حد مضر ہے۔ ڈاکٹر جارج ڈونلسن نے تجربات کے بعد ثابت کیا ہے کہ ایلومونیم کے برتنوں میں کھانا پکانے سے اس کے بعض اجزا مختلف مہلک قسم کے زہریلے مرکبات میں تبدیل ہو کر کھانے میں مل جاتے ہیں اور مختلف طبائع پر مختلف قسم کے مہلک اثرات کا باعث ہوتے ہیں۔

ہدایت علی ساحل۔ جمری تلیا

س۔ دولت بڑی شے ہے یا ایمان؟

ج۔ آج کے دور میں دولت کے مقابلے میں ایمان کی کیا حقیقت ہے!

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے؟

ج۔ بھائی جان! ہمیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ہم نے کبھی محبت کا کھیل کھیلا نہ کسی سے جنگ کی۔

س۔ شادی کا اصل مقصد کیا ہے؟

ج۔ ادھوری زندگی کی تکمیل۔

سیّد جمشید حسن برہ پوری۔ بھاگلپور

س۔ جس انسان کے مقدر میں ٹھوکریں ہوں وہ کیا کرے؟

ج۔ کسی کے مقدر میں ٹھوکریں نہیں ہوتیں، یہ تو اپنے اپنے عزم و عمل پر موقوف ہے۔ کوئی ٹھوکریں کھائے یا آسمان کو چھولے، چاند تک پہنچ جائے!

سیّد وزیر حسن رضوی۔ علی گڑھ

س۔ اس ترقی کے زمانے میں سب کچھ ہو رہا ہے لیکن آج کا انسان انسان نہیں ہوتا۔ کیوں؟

ج۔ اس لئے کہ آج کے انسان نے انسانیت کا دامن چھوڑ دیا ہے۔ آج ؎

آدمی آدمی کے پیکر میں
اور کچھ ہو گا آدمی نہ رہا

س۔ آپ کی نظر میں عورت کا درجہ بہت بلند ہے، لیکن خداوند کریم نے مرد کو ایسا کیوں بنایا ہے؟

ج۔ اپنے کلام پاک میں خداوند کریم نے ارشاد فرمایا ہے ——— مرد اور عورت ایک دوسرے کا لباس ہیں!

ابراہیم صدیقی۔ ظہیر آباد

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت بے وفا ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں! عورت بے وفا ہوتی ہے! ابھی کتنی عورتیں اپنے پتی کی چتا پر اس کے ساتھ خود بھی جل کر راکھ ہو گئیں! کیا مرد بھی ایسی کوئی ایک مثال پیش کر سکتے ہیں؟

س۔ ہندوستان کو سونے کی چڑیا کب کہا جاتا تھا؟

ج۔ جب ہندوستان سونے کی چڑیا تھا۔

غلام مصطفیٰ نوری۔ سینگر۔ نیپال

س۔ غالب کا کوئی رومانی شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

س۔ جناب خوشتر گرامی صاحب! آپ کی عمر کیا ہو گی؟

ج۔ حکماء نے لکھا ہے ——— اپنی عمر کو دراز کرنا چاہتے ہو تو اپنی گزری ہوئی عمر کے ماہ و سال کا شمار نہ کیا کرو ——— اس لئے ہم سے ہماری عمر نہ پوچھئے، نہ اپنی عمر کے ماہ و سال شمار کیا کیجئے۔

گوروت سنگھ۔ دہلی

س۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے، چین کے پاس سب سے زیادہ فوج ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں چین کے پاس کتنی فوج ہے؟

ج۔ برطانوی فوجی تحقیقات کے ماہرین کی رپورٹ کے مطابق چین کی مسلح فوج کی تعداد ۲۴ لاکھ ۸۶ ہزار ہے

ثروت جہاں۔ بلیماران۔ دہلی

س۔ بھائی جان! آپ بتا سکتے ہیں دُنیا میں کتنے لوگ غیر تعلیم یافتہ ہیں؟

ج۔ بانو! تمھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ دُنیا میں اتنی بڑی بڑی تعلیم گاہوں کے باوجود غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایک بیان میں بتایا گیا ہے کہ دُنیا میں غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد ۷۰ کروڑ سے زیادہ ہے!

س۔ بھائی جان! یہ بھی بتا سکتے ہیں، دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری کہاں ہے؟

ج۔ دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری امریکہ کے شہر واشنگٹن میں ہے ــــ کچھ لوگ کہتے ہیں دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری ماسکو (روس) میں ہے۔

نزہت فاطمہ۔ فرنگی محل۔ لکھنؤ

س۔ خوشتر چچا! آرزو پوری نہ ہو تو ــــ؟

ج۔ بانو! آزردہ نہ ہونا چاہئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس حکیمانہ ارشاد سے سکونِ خاطر حاصل کرنا چاہئے ــــ "ترکِ آرزو ہی تونگری ہے۔" جو لوگ ــــ آرزو کا دامن دراز نہیں کرتے، وہ بہت حد تک مطمئن رہتے ہیں۔

س۔ اپنی زمین پر شورش و ہنگامہ، جنگ و جدل اور چاند کی دُنیا کے لئے امن کا پیغام! ایک ہی وقت میں دو متضاد خیالوں کا اظہار کیا ہے؟

ج۔ شیخ سعدی نے صدیوں پہلے کہا تھا ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

س۔ غموں میں پل کر بھی ہر دم مسکرانے والے کو آپ کیا کہیں گے... بے حس یا باہمت اور بہادر؟

ج۔ باہمت اور بہادر!

سراج منظور صدیقی۔ رائچور

س۔ مستقبل کو روشن و تابناک بنانے کے لئے جدوجہد کرتا ہوں پھر بھی خوش حال زندگی میسّر نہیں۔ کیا کیا جائے؟

ج۔ جدوجہد جاری رکھئے۔ جدوجہد کبھی رائگاں نہیں جاتی۔

س۔ رشک و رقابت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے یا سیاسی لیڈروں میں؟

ج۔ سیاسی لیڈروں میں!

س۔ عورتوں کو کس حد تک پردے میں رکھنا چاہئے؟

ج۔ ماحول کے پیشِ نظر جس حد تک ضروری ہو۔

اکرم نواز۔ اعظم گڑھ

س۔ اِن دنوں خاندانی منصوبہ بندی پر بہت توجہ دی جارہی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ساری دُنیا میں ہر روز کتنے بچے پیدا ہوتے ہیں؟

ج۔ ہر روز کا حساب آپ خود لگا لیجئے۔ ہر گھنٹہ میں ۵۲۴۰ بچے پیدا ہوتے ہیں۔

س۔ کیا آپ یہ بھی بتا سکتے ہیں، دُنیا میں ہر روز کتنے لوگ مرتے ہیں؟

ج۔ ایک بیان میں بتایا گیا ہے ہر گھنٹہ میں ۴۶۰۳ لوگ مرتے ہیں۔

عبدالمجید خاں۔ برہان پور

س۔ خوشتر بھیا! نریش کمار شاد کا کوئی قطعہ سُنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

ہر نفس آہ سرد بھرتا ہے
ہر رگِ گُل میں زہر اُترتا ہے
کیا اسی کو حیات کہتے ہیں
آدمی کیا اسی پہ مرتا ہے

س۔ امن و آشتی کے اوتار گاندھی جی کی جنم شتابدی کے جشن کے دنوں میں اندور میں فساد کیا معنی؟

ج۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

س۔ انگڑائی پر کوئی حسین شعر سُنائیے۔

ج۔ اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

مس شاہدہ ناز۔ چھپرہ۔ بہار

س۔ کیا شاعری سوسائٹی کی تابع ہے؟

ج۔ حقیقی شاعری اور سچا شاعر دونوں سماج اور راج سے بہت بلند ہیں۔

س۔ بُری شاعری سے لٹریچر اور زبان کو کیا نقصان پہنچتا ہے؟

ج۔ ناقابلِ بیان نقصان پہنچتا ہے۔

یعقوب احمد پریمی۔ کلکتہ

س۔ کنور مہندر سنگھ بیدی اور راجندر سنگھ بیدی میں کیا رشتہ ہے؟

ج۔ ادیب و فنکار کے ناطے ہم مشرب و ہم پیشہ ہیں۔ انسانیت کے ناطے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

س۔ کیا آپ فلمی فنکاروں کی تخلیقات 'بیسویں صدی' میں شائع کرتے ہیں؟

ج۔ معیاری تخلیقات ہوں تو بیشک 'بیسویں صدی' میں جگہ پائیں گی۔

پنجاب میں تین سال

کامیابیاں ایک نظر میں

زراعت

	سال 67-1966	سال 69-1968
1۔ گیہوں کی پیداوار	24.61 لاکھ ٹن	43.4 لاکھ ٹن
2۔ اجناسِ خوردنی کی کل پیداوار	41.78 لاکھ ٹن	60.20 لاکھ ٹن

سال 70-1969 کے لئے نشانہ ...... 64.20 لاکھ ٹن

3۔ زیادہ پیداوار دینے والی فصلوں کی قسموں کے تحت رقبہ	1.98 لاکھ ایکڑ	36 لاکھ ایکڑ
4۔ تقسیم شدہ کھادیں	2.58 لاکھ ٹن	8.8 لاکھ ٹن

سال 70-1969 کے لئے نشانہ ...... 14.70 لاکھ ٹن

5۔ چوتھے پانسالہ پلان کے دوران 368 کروڑ روپے کے قرضہ کی سہولیات

6۔ چالو سال کے دوران قرضہ کی بنا پر 19,000 ڈیزل انجنوں اور 50,000 بیج مع کھاد ڈریوں کی دستیابی۔

7۔ 25 فیصدی کی بنا پر اناج کے ذخیرہ کے لئے 10,000 لوہے کے کنستروں کا انتظام۔

8۔ 50 فیصدی کی امدادی گرانٹ کے بنا پر 2 لاکھ ایکڑ رقبہ پر ہوائی چھڑکاؤ۔

9۔ باغبانی اور تحفظِ اراضی کے لئے 3 کروڑ روپے کا بندوبست

صنعت

	سال 1966	سال 1969
1۔ رجسٹرڈ شدہ کل فیکٹریاں	3,694	4,426
2۔ تمام اقسام کے صنعتی یونٹ	15,268	16,718

(مرکزی صنعتی مقامات اور سرحدی علاقوں میں صنعتوں کی قائمی کے لئے متعدد سہولیات دستیاب کی گئیں)

طب اور صحت

	سال 67-1966	سال 69-1968
1۔ ہسپتال	105	116
2۔ ابتدائی صحتی مرکز اور ڈسپنسریاں	382	394
3۔ آیورویدک ہسپتال اور ڈسپنسریاں	184	199
4۔ بستر	8,807	9,791

سال ۱۹۶۱ کی مردم شماری کے مطابق پنجاب میں اوسط عمر 47 سال تھی جبکہ ہندوستان میں یہ 42 سال تھی۔

سال ۱۹۶۹ میں یہ اوسط عمر مزید بڑھ کر 59 سال ہو گئی۔

پشو پالن

	سال 67-1966	سال 69-1968
1۔ وٹرنری ہسپتال	189	213
2۔ مصنوعی حمل کے مراکز	33	66
3۔ سوروں اور مرغی پالن کے سرکاری ترقیاتی یونٹ	10	17

4۔ اگلے 5 سالوں میں مزید تین ملک پلانٹ

بجلی

1۔ بجلی مہیا کردہ قصبہ جات و دیہات	3,623	4,313

2۔ گورو نانک جی کے 500 ویں پرکاش دوس کی تقاریب کے دوران 500 دیہات کو بجلی مہیا کی جائے گی۔

3۔ چوتھے پانسالہ پلان کے دوران 2,00,000 ٹیوب ویلوں کو بجلی دی جائے گی۔

تعلیم

	سال مئی 1966	سال مئی 1969
1۔ پرائمری سکول	6,966	7,194
2۔ مڈل سکول	749	912
3۔ ہائی اور ہائر سکنڈری سکول	919	1,136
4۔ آرٹس و سائنس کالج	55	83
5۔ ٹیچرز ٹریننگ کالج	12	17
6۔ دیگر کالج	27	32
7۔ سکول جانے لائق بچوں کی تعداد	18.17 لاکھ	19.64 لاکھ

مس رفیعہ خطیب بیجاپور (میسور)

س۔ انسان کیا چیز جلد بھول جاتا ہے؟

ج۔ اپنی غلطیاں، اپنی خامیاں!

س۔ آج کی دُنیا میں سب سے خوبصورت کیا چیز ہے؟

ج۔ بانو! سب کے لئے ایک بات نہیں کہی جا سکتی۔ کسی کی نظر میں کوئی چیز خوبصورت ہے، کسی کی نظر میں کوئی چیز!

س۔ انسان کو اپنی زندگی میں کون سی چیز عزیز ہوتی ہے؟

ج۔ کسی کو عزت، کسی کو دولت و امارت، جاہ و حشمت!

رقیہ بانو۔ رامپور

س۔ بھائی جان! کیا یہ سچ ہے کہ غالب فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے؟

ج۔ غالب فارسی کے بھی مایۂ ناز شاعر تھے۔

ارشاد حسین خاں۔ نیمچ سٹی (ایم۔ پی)

س۔ کیا آپ انھیں لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں جو 'بیسویں صدی' کے خریدار ہوتے ہیں؟

ج۔ اس کے لئے 'بیسویں صدی' کا خریدار ہونے کی قید و شرط نہیں۔

ایم۔ اے۔ بیگ۔ بالاگھاٹ حیدرآباد دکن

س۔ کیا خوشی اور مسرت حاصل کرنے کے لئے دوسروں کے غم کو گلے لگانا چاہیئے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ اُلجھن سے نجات کا ذریعہ؟

ج۔ مردانہ وار اُلجھنوں کا مقابلہ کرنا کسی اُلجھن کو اُلجھن نہ سمجھنا!

محمد راشد۔ غازی پور

س۔ آنے والے وقت کا ایک ایک لمحہ انسان کو موت کے قریب کرتا رہتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم موت سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں، ہماری آرزوئیں گھٹنے کے بجائے بڑھتی ہی کیوں رہتی ہیں؟

ج۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔

س۔ فانی بدایونی کا کوئی شعر سنا دیجئے۔

ج۔ سُنیئے ؎

یاس و اُمید سے کام نہ نکلا، دل کی تمنا دل میں رہی
ترکِ تمنا کر نہ سکے، اظہارِ تمنا ہو نہ سکا

خالق حسین۔ برہان پور

س۔ آج کی دُنیا میں اخلاقی گراوٹ کی رفتار کیا ہے؟

ج۔ اتنی تیز کہ آپ کی زبان سے بے اختیار نِکل جائے گا ؎

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

س۔ وہ کون سی چیز ہے جس کے مِل جانے کے بعد بھی اُس کی آرزو رہتی ہے؟

ج۔ ایسی بہت سی چیزیں ہیں —— دولت و ثروت۔ اقتدار و حکومت۔

ایم۔ زخمی۔ سمرہا۔ پورنیہ

س۔ بتایئے نریش کمار شادؔ مرحوم کی خودکشی کی وجہ کیا تھی؟

ج۔ والد کی حسرت ناک موت کا جانکاہ غم!

س۔ علامہ اقبالؔ کا ایک شعر سُنایئے۔

ج۔ خودی کو کر بلند اِتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پُوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

محمد عثمان نواز۔ گولکنڈہ حیدرآباد دکن

س۔ چچا جان! غم سے نجات پانے کا کوئی آسان طریقہ، کوئی آسان تدبیر بتایئے۔

ج۔ اپنے غم کو خوشی بنا لیجئے!

س۔ خوشتر چچا! کیا آپ بتا سکتے ہیں ہمارے مُلک میں خاندانی منصوبہ بندی کس حد تک کامیاب ہو رہی ہے؟

ج۔ صحت و خاندانی منصوبہ بندی کے سکریٹری کے بیان کے مطابق ۷۶ء میں مُلک میں ۱۰ لاکھ ۳۰ ہزار بچے کم پیدا ہوئے۔

س۔ ذرا یہ بھی بتلایئے کہ ۳۰، ۳۵ برس بعد 'بیسویں صدی' کا نام کیا ہوگا؟

ج۔ 'بیسویں صدی' کے پروانے جو نام پسند کریں گے رکھ لیں گے۔

س۔ شاہ طاہر قادری۔ ادونی۔ آندھرا

س۔ بھائی جان! غالبؔ کی دہلی میں رہتے ہوئے آپ نے 'بیسویں صدی' کا "غالبؔ نمبر" نہیں نِکالا۔ کیوں؟

ج۔ ہم غالبؔ کی زبان (اُردو) کے تحفّظ و بقا کے لئے جدّوجہد کرنا 'غالب نمبر' نِکالنے سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔

سیّد ابوالفضل۔ پورنیہ

س۔ کیا آپ شاعر ہیں؟ اگر ہاں تو اپنا ایک شعر سُنایئے۔

ج۔ ہم کبھی شاعر تھے لیکن اب تو صرف تخلّص کے گنہگار ہیں۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں سُننے کے لئے ہمارا کوئی شعر نہ سُنئے۔ ہمارے تیر و نشتر پڑھئے۔

مہدی حسن مکرانی۔ گورکھپور

س۔ اپالو ۱۱ کی کامیابی کا راز؟

ج۔ عزمِ محکم —— جہدِ پیہم!!

س۔ تلاش و جُستجو دل سے ہو تو پھر کوئی شکل مشکل نہیں ہوتی! کیا یہ سچ ہے؟

ج۔ یہ سچ ہے! اِس حقیقت کی صداقت کا ثبوت اپالو ۱۱ کی عظیم کامیابی آپ کے سامنے ہے! دُنیا کے سامنے ہے!!

کمال احمد صابر۔ اورنگ آباد۔ گیا

س۔ زمین سے چاند کا فاصلہ کتنا ہے؟

ج۔ تقریباً دو لاکھ اڑتیس ہزار میل۔

س۔ نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
یہ مصرع غالبؔ کا ہے یا مومنؔ کا؟

ج۔ غالبؔ کا۔

س۔ شادؔ مرحوم نے اپنے والد کی جُدائی میں خودکشی کیوں کر لی؟

ج۔ اپنے والد کی حسرت ناک موت کے غم کی تاب نہ لا سکے۔

گوپال کرشن سیٹھی۔ بمبئی

س۔ بمبئی کی سربفلک عمارتوں کے درمیان چلتے ہوئے اکثر میرے دل میں یہ خیال اُٹھتا ہے۔ دُنیا کی سب سے اونچی عمارت کہاں ہے؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں؟

ج۔ دُنیا کی سب سے اونچی عمارت نیو یارک میں ہے۔ اُس کا نام امپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے۔ اُس کی ۱۰۲ منزلیں ہیں۔

سیّد قیصر انجم۔ پورنیہ

۔ قدرت نے قسمت کو انسان کا مختار کیوں بنا دیا؟

۔ انسان اپنی قسمت کا خود مالک ہے۔ انسان اپنی قسمت خود بناتا بگاڑتا ہے ؎

حُسنِ تدبیر سے تقدیر سنور جاتی ہے

ذکیہ جمال۔ دہلی

س۔ نرش کمار شاد کی ایک رباعی سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

جو محرومِ گلزارِ جہاں ہوتے ہیں
وہ اپنی لطافت کو کہاں کھوتے ہیں
ہنستا ہو اگر ہنستے ہیں غنچے کی طرح
روتے ہیں تو شبنم کی طرح روتے ہیں

ایم شمیم ہاشمی۔ مظفر پور

س۔ انسان کس چیز کو جلد بھول جاتا ہے؟

ج۔ ہر انسان کے لئے ایک بات نہیں کہی جا سکتی۔

س۔ ہر مرد کے لئے عورت کو سمجھنا کب مشکل ہوتا ہے؟

ج۔ جب مرد کی سمجھ اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔

س۔ حسین عورت اپنے حسن کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لئے کیا کرے؟

ج۔ اپنی صحت کا ہمیشہ خیال رکھے۔ اپنے دل کے دامن پر رنج و غم اور فکر و تردد کا سایہ بھی نہ پڑنے دے۔

ثریا جبیں۔ بھوپال

س۔ ہندوستان میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں؟

ج۔ ہندوستان کی مردم شماری کے رجسٹرار اشوک مترا کے بیان کے مطابق ہندوستان میں ۱۲ سو زبانیں بولی جاتی ہیں۔

رُوح القدوس۔ انعامدار۔ بیجاپور

س۔ کیا انسان جذبات کا غلام ہے؟

ج۔ بے سمجھ انسان جذبات کے غلام ہوتے ہیں۔ سمجھ دار انسان کسی کا غلام نہیں ہوتا۔

س۔ عورتوں کے ہاتھ میں عنانِ حکومت آگئی تو؟

ج۔ ہندوستان کی حکومت عورت کے ہاتھ میں آگئی ہے!

س۔ خوشتر بھائی جان! کیا تیسری عالمگیر جنگ ہوگی؟

ج۔ جنگ پسند تو یہی چاہتے ہیں۔

اشتیاق حسین۔ کان پور

س۔ "بیسویں صدی" نکالنے کا مقصد؟

ج۔ ملک و ملت اور زبان و ادب کی پُرخلوص خدمت!

س۔ ادب کیا ہے؟

ج۔ جو آپ ادبی کتابوں اور ادبی جرائد و صحائف میں دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔

شکیلہ خاتون۔ چاند پور

س۔ دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ کہاں ہے؟

ج۔ مصر میں۔ جامعہ ازہر

غیاث الدین نیاز۔ مظفر پور

س۔ آزادی کو محبت کے ہاتھوں فروخت کرنے کی قیمت؟

ج۔ یہ سودا بہت گراں ثابت ہوتا ہے۔

س۔ فلسطین کی سرکاری و قومی زبان کیا ہے؟

ج۔ عربی۔

س۔ ساری دنیا میں کتنے اسلامی ممالک ہیں؟

ج۔ تیس سے زیادہ۔

جے رحمٰن اجمل۔ دیوبند

س۔ شادی ہونے پر مرد اور عورت میں زیادہ خوش کون ہوتا ہے؟

ج۔ بیوی اور شوہر ہم خیال اور پُرخلوص ہوں تو دونوں برابر خوش ہوتے ہیں۔

اے۔ ایچ۔ عادل۔ چمپارن

س۔ اردو کا مستقبل صرف "یوم غالب" منانے سے تابناک ہو گیا؟

ج۔ اردو کے پرستاروں کو حسین فریب دینے والے تو یہی کہتے ہیں۔

ثریا پروین۔ ڈاکٹر جہانگیر جائسی۔ کلکتہ

س۔ آج کی دنیا میں علم اور ہنر میں کس کا مقام بلند ہے؟

ج۔ علم کا۔

س۔ میں اپنی تصویر "بیسویں صدی" میں شائع کرانا چاہتی ہوں۔ کیا آپ شائع کریں گے؟

ج۔ "بیسویں صدی" میں نامور فنکاروں کی تصویریں شائع ہوتی ہیں۔ آپ فنکار ہیں تو تصویر کے ساتھ اپنی تخلیق بھی بھیجئے۔

س۔ غالب کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اقبال احمد خاں۔ کلونا۔ گیا

س۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور قاضی نذر الاسلام میں کس کا درجہ بلند ہے؟

ج۔ ٹیگور کا۔

س۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا کوئی شعر سنایئے جو رُوح کو گرما دے اور قلب کو تڑپا دے۔

ج۔ یارب دلِ مسلم میں وہ زندہ تمنّا دے
جو رُوح کو گرما دے اور قلب کو تڑپا دے

کامریڈ رضی الدین حیدر۔ شملہ

س۔ خوشتر صاحب! اپنی پسند کے دو شعر سنایئے۔

ج۔ سُنیئے ؎

ہاں فطرتِ اربابِ وفا کو رہ کنی ہے
اے بے عملو! لاؤ کوئی کام ہمیں دو
یہ فرشِ گُل و لالہ ہے تو ہیں ہماری
شعلوں پہ کوئی رقص کا پیغام ہمیں دو

محمد سلیم شاداب۔ بھوپال

س۔ نریش کمار شاد کی موت کی وجہ کوئی تو باپ کا غم اور کوئی شراب کی کثرت بتاتا ہے۔ آپ بتاسکتے ہیں حقیقت کیا ہے؟

ج۔ اُن کی موت کی وجہ اُن کے والد کی حسرت ناک موت کا غم بھی ہے اور کثرتِ شراب نوشی بھی۔

س۔ شاد مرحوم کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ جی نہیں عمر بھر خطا جس نے
اُس نے توہین زندگی کی ہے

س۔ کیا آپ ہندوستان کے شاعروں کی تعداد بتاسکتے ہیں؟

ج۔ آپ خود ہی حساب لگالیں۔ ہندوستان کے ہر تین آدمی میں ایک شاعر ہے! آپ کے خیال میں یہ شاعری اور مبالغہ ہے تو پانچ آدمی میں ایک شاعر ہے!

محمد بقاء الرحمٰن۔ اورنگ آباد۔ گیا

س۔ "قیامت" کب آئے گی؟

ج۔ انسان جب مرجاتا ہے، اُس کے لئے قیامت آجاتی ہے۔ ویسے آج کے دَور میں انسان کی زندگی ہی میں کئی بار قیامت آتی ہے! کتنوں کے لئے تو ہوشربا گرانی کے باعث ہر دن قیامت کا دن ہوتا ہے!

اقبال عباس بندگر۔ باندرہ۔ بمبئی

س۔ کیا بیوی ماں کی مامتا اور بہن کا پیار دے سکتی ہے؟

ج۔ جی نہیں۔

س۔ اِس پُر فریب دُنیا میں انسان کا سچا ساتھی؟

ج۔ اُس کا اپنا بلند کردار! بلند حوصلہ!

س۔ نیک اُستاد کے اپنے شاگرد کے بارے میں کیا خیالات ہوتے ہیں؟

ج۔ بے حد نیک! چاہے سعادت مند شاگرد اُنھیں بات بات پر چھرا دکھائیں!

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی — مطبوعہ: یکشن پرنٹنگ ورکس دہلی و پربھات آفسیٹ پریس دہلی۔ ٹائیٹل و تصاویر: برائٹ پریس دہلی — پتہ: دفتر بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

DECEMBER 1969

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 630/57

BISWIN SADI

33rd YEARS OF PUBLICATION

Telephones Office, 271637 Residence. 619927

ADIUM TONIC PILLS

نئی طاقت

نیا خون



کمزوری کا زبردست علا

ریڈیم ٹانک پلز

نیا خون بکثرت پیدا کر کے نہ صرف کمزوری دور کرتی
بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں، وزن او
خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے کھوئی ہوئی طاقت اور صحت
واپس لانے کیلئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و مقبو
ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں کمزوری
کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی نئی طاقت حا
ہوتی ہے تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز کے علاج
اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل علاج صر
چھ روپے محصولڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹ

ایمن اینڈ اسمٰعیل پرائیویٹ لمٹیڈ

نمبر ۸ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ ۱

کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹیڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۱ دہلی